فیوض الرحمٰن

اردو ترجمہ

تفسیر روح البیان

شیخ القرآن والحدیث فیض ملت حضرت علامہ مفتی

محمد فیض احمد اویسی رضوی مدظلہ

مکتبہ اویسیہ رضویہ

سیرانی روڈ بہاول پور

فیوض الرحمن

اردو ترجمہ

روح البیان

پارہ اول، دوئم

تالیف
الامام العالم الفاضل خاتمة المفسرین
حضرت العلامہ الشیخ محمد اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم
عمدۃ المفسرین، استاذالعلماء حضرت علامہ
مولانا محمد فیض احمد اویسی صاحب مدظلہ العالی

سعادت اہتمام
صاحبزادہ عطاء الرسول اویسی

ناشر
مکتبہ اویسیہ رضویہ جامع مسجد سیرانی، سیرانی روڈ بہاولپور پاکستان
Mob. 0300-6843281

نام تفسیر ——— فیوض الرحمٰن ترجمہ اردو روح البیان

پارہ ——— اول، دوئم (جلد اول)

تالیف ——— حضرت الشیخ علامہ محمد اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم ——— شیخ القرآن حضرت علامہ محمد فیض احمد اویسی صاحب مدظلہ

پروف ریڈنگ ——— پروفیسر اللہ نواز ناصر، علامہ عاشق مصطفیٰ قادری

قاری محمد اسلم مہروی، قاری نذیر احمد نقشبندی، محمد طارق اویسی

سن طباعت ——— نومبر 2005ء

سعادت اہتمام ——— صاحبزادہ عطاء الرسول اویسی

نگران اشاعت ——— حافظ محمد فدا الرسول اویسی، محمد شفاعت رسول

سعادت کمپوزنگ ——— محمد صفدر علی صابر، محمد شمس الحق چشتی

0301-7597607   0300-7892820

ناشر ——— مکتبہ اویسیہ رضویہ بہاولپور پاکستان

0300.6843281

ہدیہ ———

انتساب

من بندہ فقیر یہ ھدیہ حقیر[۱] علی جناب سید الثقلین نبی الحرمین امام القبلتین
وسیلتنا فی الدارین راحۃ العاشقین مراد المشتاقین سید الانبیاء والمرسلین
سیدنا ومولانا وشفیعنا یوم الجزاء حضور پرنور
سیدنا **محمد مصطفی** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کی پیارے نام سے معنون کرکے اس بارگاہ بے کس پناہ کو خداوند قدوس کا
واسطہ دے کر اس ناچیز ھدیہ کی قبولیت کی التجا کرتا ھوں -

برگ سبز است ہدیہ درویش

ابوالصالح محمد فیض احمد اویسی غفرلہ
۱۹ صفر المظفر ھ 11 جولائی 1983ء
بروز جمعرات

---

[۱] خدمت ترجمہ تفسیر (مقدمہ مایہ)

تعارف مترجم

از:۔ الحاج چودھری مشتاق محمد خان۔۹ ہربھجن داس سٹریٹ، بیرون موری گیٹ۔لاہور

خدا کے فضل وکرم سے آج بھی بہت سے علماء اور مشائخ تبلیغ اسلام میں سرگرم ہیں۔بعض نے تو اپنے روز وشب محض اسی مقصد کے لئے وقت کر رکھے ہیں کہ ان کا مقصد حیات صرف اور صرف اسلام کی تبلیغ اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیس بیان کرنا ہے۔وہ نور رسالت سے شمع اسلام کے نور میں اضافہ فرما رہے ہیں۔انہی بزرگوں میں عالم ربانی، متکلم لاثانی، کشاف الحقائق، مبین الدقائق، صاحب تصانیف کثیرہ، فیض ملت، حضرت، علامہ، الحاج، الحافظ ابوالصالح مفتی **محمد فیض احمد اویسی** مدظلہ العالی

شیخ الحدیث جامعہ اویسیہ رضویہ ملتان روڈ بہاولپور

کی ذات بابرکات کا شمار ہوتا ہے۔

ولادت باسعادت:۔

علم وعرفان کا یہ پیکر، فاضل نبیل، عالم جلیل ۱۳۵۱ھ/1932ء میں حامد آباد ضلع رحیم یار خاں کے مقام پر پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھا۔

حلیہ مبارک:۔

یہ مرد درویش نہایت ہی سادہ، موزوں قامت، اکہرا جسم، موٹی پرکیف آنکھیں، سر پر سفید رنگ کی دستار، سفید تہبند، ٹخنوں تک نیچا کرتہ، دیسی جوتا، سفید وسیاہ ریش بزرگی کی علامت، طبیعت میں انکسار وتواضع، سرتاپا ایثار ومحبت، درس وتدریس مشغلہ اور تصنیف وتالیف اوڑھنا بچھونا ہے۔مسلک اہل سنت کا داعی وعلمبردار ہے۔

تعلیم:۔

جب آپ چار پانچ سال کے ہوئے تو آپ کے والد محترم نے خود قرآن مجید ناظرہ کرایا۔یوں آپ کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی۔ابتدائی تربیت کے بعد ۱۹۴۳ء میں والد ماجد کی ہدایت اور خواہش کے مطابق حافظ جان محمد صاحب قریہ کنلاں کے پاس حفظ قرآن پاک کے لئے حاضری دی۔ڈیڑھ سال کے عرصہ میں آٹھ پارے حفظ کر لئے۔اس کے بعد حضرت مولانا حافظ سراج احمد صاحب اور حافظ غلام یسین صاحب سے مکمل قرآن کریم حفظ

کرنے کی سعادت حاصل کی۔ پاکستان کے معرض وجود (اگست ۱۹۴۷ء) میں آنے پر آپ نے پہلی محراب سنائی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں پند نامہ سعدی سے فارسی کا آغاز کیا اور حکیم مولانا اللہ بخش سے تعلیم حاصل کی۔ علوم عربیہ کی کتب متداولہ حضرت مولانا الحاج خورشید احمد صاحب سے پڑھنے کے بعد جامعہ رضویہ مظہر الاسلام فیصل آباد میں شیخ القرآن والحدیث علامہ سردار احمد رضوی نور اللہ مرقدہ سے درس حدیث کے لئے حاضری دی۔ حضرت مولانا موصوف کے ہاتھوں سے رسم دستار بندی ہوئی اور انہیں سے سند فراغت حاصل کی۔

اثنائے تعلیم میں بسلسلہ سلوک روحانی قادریہ اویسیہ سلسلہ کے سرچشمہ حضرت خواجہ محکم الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سجادہ نشین الحاج خواجہ محمد الدین صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ ۱۳۸۱ھ میں ان کے وصال کے بعد شیخ الاسلام مقتدائے اہل سنت حضرت مولانا الحاج شاہ مصطفیٰ رضا سجادہ نشین آستانہ عالیہ رضویہ بریلی شریف ومفتی اعظم ہند حضرت مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب بریلوی جگر گوشہ امام اہل سنت مجدد دین وملت شاہ احمد رضا خان بریلوی قدس سرہ العزیز سے بیعت کی درخواست کی جو انہوں نے قبول فرمائی اور آپ کو سلسلہ قادریہ میں سند مجاز مرحمت فرمائی۔

اسمائے گرامی اساتذہ کرام:۔

حضرت مولانا موصوف نے حصول علم کے لئے مندرجہ اساتذہ کرام سے رجوع کیا۔

پرائمری:۔ مولانا خیر محمد صاحب ، مولانا کریم بخش صاحب ، مولانا اللہ بخش صاحب

ناظرہ وحفظ:۔ والد ماجد حضرت مولانا نور احمد صاحب ، مولانا عبد الکریم صاحب ، مولانا خورشید احمد صاحب
مولانا سراج احمد صاحب مکھن بیلوی ، شیخ القرآن والحدیث علامہ سردار احمد رضوی صاحب فیصل آباد

تبلیغ دین:۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے آبائی گاؤں حامد آباد میں ایک تبلیغی ادارہ ''مدرسہ عربیہ منبع الفیوض اویسیہ رضویہ'' قائم کیا، وہاں تقریباً ۱۵ سال تک علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔ چونکہ حامد آباد ایک معمولی سا گاؤں ہے اور آمد ورفت کا معقول انتظام نہیں ہے اس لیے سکونت ترک کر کے ۱۹۶۳ء میں بہاولپور منتقل ہو گئے۔ بہاولپور اس وقت بدعقیدہ لوگوں کی گرفت میں تھا اور اس مرد حق شناس نے جونہی مسلک اہل سنت کی شمع روشن کی اس پر مشکلات کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کی پرخلوص محنتیں بارآور ثابت ہوئیں اور ۱۹۶۷ء میں آپ نے ملتان روڈ پر زمین حاصل کر کے سیرانی مسجد اور جامعہ اویسیہ رضویہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ راقم الحروف ان دنوں بسلسلہ ملازمت بہاولپور میں مقیم تھا اور اویسی صاحب کے درس قرآن سے کئی بار مستفید ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ ان دنوں سے خواہش رہی کہ کبھی ان کے قدموں میں بیٹھ کر خدمت دین کا موقع ملے۔ آخر ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ

نے تمنا کسی حد تک پوری فرمادی۔آپ کی روشن کردہ شمع کے پروانوں کی تعداد متعدد بہ اضافہ ہورہا ہے۔اشاعت دین کے علاوہ حضرت اویسی صاحب ہر سال رمضان المبارک میں اطراف واکناف سے آنے والے طلبہ کو قرآن پاک کی تفسیر بھی پڑھاتے ہیں۔آپ کی سالہاسال کی مسلسل محنت سے ہزاروں فضلاء، علماء اور حفاظ پیدا ہوئے۔جن کی فہرست بہت طویل ہے اور شمار سے باہر ہیں۔نہ صرف پاکستانی بلکہ بیرونی ممالک میں بھی آپ کے تلامذہ ملکی وملی اور دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔چند مشاہیر کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

مشاہیر گرامی:۔

مولانا حافظ عبدالحمید اویسی الہ آباد، مولانا مفتی مختار احمد درانی خانپوری، مولانا حافظ عبدالستار گھوٹکی، مولانا قاری عبدالرحمٰن ٹھٹھہ (سندھ)، مولانا سید محمد یوسف سرحد، مولانا محمد ریاض احمد امریکہ، مولانا حافظ عبدالواحد مدینہ طیبہ، مولانا عبدالرحمٰن سندھی مدینہ طیبہ، مولانا عزیز اللہ لاڑکانہ، مولانا مفتی غلام مصطفیٰ رضوی ملتان، مولانا غلام محمد کوئٹہ، مولانا محمد وارث خضدار بلوچستان، مولانا محمد جمیل الرحمٰن سعودی عرب، مولانا قاری منظور احمد سعودی عرب، مولانا سید معظم الدین میانوالی مولانا محمد قاسم کوئٹہ، مولانا محمد فاروق القادری کراچی، مولانا محمد فاروق احمد قادری گڑھی اختیار خان، مولانا صاجزادہ محمد اسمٰعیل نقشبندی سرگودھا، مولانا مفتی غلام سرور لاہور، مولانا مقصود احمد لاہور، مولانا قاری محمود الحسن کوالمبو سرانڈیپ، مولانا محمد اشرف گجرات، صاجزادہ مولانا علی احمد مانگٹ، مولانا قاری محمد طیب لاہور، مولانا جمال الدین کوئٹہ، مولانا منیر الزماں ابوظہبی [1]

یہ عاشق رسول عقائد کے معاملہ میں بہت متصلب واقع ہوئے اور اہانت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کرنے والوں سے کسی قسم کی رورعایت کے قائل نہیں ہیں۔آپ گستاخانِ رسول کے علاوہ سب کے لئے محبت وایثار کا مجسمہ ہیں۔آپ کے ہاں ہر وقت مسلک تصوف کی محفلیں برپا رہتی ہیں۔

سلسلہ تصانیف:۔

آپ جہاں ایک فاضل مدرس ہیں وہاں تحریر میں بھی خاصی مہارت اور ید طولیٰ رکھتے ہیں۔اب تک ایک تین ہزار کے لگ بھگ کتب ورسائل کی تصنیف فرما چکے ہیں۔[2] ابھی آپ طفل مکتب تھے کہ ایک کتاب ''انگوٹھے چومنے کا بیان'' تالیف فرمائی چند دیگر تصنیفات وتالیفات درج ذیل ہیں۔

فیوض الرحمٰن اردو ترجمہ روح البیان۔۳۰ پارے، نعم الجامی شرح جامی۔۸ جلدیں، فتاوی اویسیہ۔۸ جلدیں، صدائے نودی شرح مثنوی۔۲ جلدیں، شرح مائۃ عامل، شہد سے میٹھا نام محمد، آئینہ شیعہ نما، چشمہ نور افزاء، تفسیر روح البیان کا

[1]۔ان میں بعض وہ حضرات ہیں جو آپ کے زمانہ طالبعلمی کے شاگرد ہیں اور بعض وہ ہیں جنھوں نے آپ سے چند اسباق پڑھے اور بعض مستقل شاگرد ہیں۔ [2]۔علم کے موتی کے عنوان سے آپ کی کتب کی فہرست کراچی اور مکتبہ اویسیہ بہاولپور سے شائع ہو چکی ہے

اردو ترجمہ "فیوض الرحمٰن" کر کے حضرت علامہ اویسی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے دین اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔اس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گوہوں کہ ان کی خدمت دین متین کے لئے عمر دراز عطا فرمائے۔ ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

خدا تعالیٰ ان کی اس کاوش کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین ثم آمین

اولاد امجاد:۔

بفضلہٖ تعالیٰ علامہ اویسی صاحب کے چار صاحبزادے ہیں اور الحمدللہ تعالیٰ چاروں خدمت دین متین میں گوناگوں مصروف ہیں۔

ا۔علامہ حافظ محمد صالح اویسی ،مفتی جامعہ اویسیہ رضویہ بہاولپور،خطیب جامع مسجد

۲۔علامہ حافظ محمد عطاءالرسول اویسی، مدرس جامعہ اویسیہ رضویہ بہاولپور، مدیر اعلیٰ فیض عالم، خطیب جامع مسجد

۳۔علامہ حافظ محمد فیاض احمد اویسی، مدرس جامعہ اویسیہ بہاولپور، ایڈیٹر ماہنامہ فیض عالم، خطیب جامع مسجد

۴۔علامہ حافظ ریاض احمد اویسی، ناظم جامعہ اویسیہ بہاولپور، خطیب جامع مسجد

اور ایک صاحبزادی صاحبہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سب کو اپنے والد مکرم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

مشتاق محمد خان

لاہور

وجہ تالیف تفسیر روح البیان

از:۔ حضرت علامہ مولانا محمد اسماعیل حقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ھ)

الحمد للّٰہ الذی اظھر من نسخۃ حقایقۃ الذاتیۃ الکمالیۃ نقوش العوالم والاعلام واخرج من نون الجمع الفاقی انواع الحروف والکلام انزل من مقام الجمع والتریہ قریٰ انا عربیاً غیر ذی عوج وجعلہ معجزۃ علیٰ وجہ کل زمان ساطعۃ البراھین والحج والصلوۃ والسلام علی من ھو فاتح باب الحضرۃ فی العلم والعین والیقین سیدنا محمد الذی کان نبیاً وآدم بین الماء والطین وعلیٰ الہ واصحابہ المتخلیقین بخلق القراٰن ومن تبعھم باحسان الیٰ اخر الزمان ۔

حمد و درود کے بعد عرض پرداز ہے بندہ فقیر حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام کا ہم نام اسماعیل حقی واعظ مہاجر (رحمۃ اللہ علیہ ،اللہ تعالیٰ انہیں صبح وشام اور دوپہر کے فتنوں کے محفوظ رکھے) جب میرے شیخ امام علامہ اور میرے استاد جو بڑے عالم اور فہیم اور اپنے وقت کے سلطان اور اپنے زمانہ میں بے نظیر ہیں اور وہ علم وعرفان کی وجہ سے مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کی حجت اور انوار عنائت وتوفیق کے مطلع اور اسرار خلافت کے علی التحقیق وارث اور ان کے لئے گیارہویں صدی کے مجدد ہونے پر لوگ متفق ہیں وہ الہام ربانی کے معدن اور حسبی نسبی سید ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہٗ کے ہم نام اور قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے اور ان کے طفیل ہماری امداد فرمائے ،کا ارشاد ہوا کہ تم شہر بروسا (جو اولیاء کرام کا مرکز ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہر شر وفساد سے محفوظ رکھے) کی طرف چلے جاؤ۔ حسب الحکم ۱۰۶۰ھ میں وہاں پہنچا تو وہاں سوائے وعظ ونصیحت کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ یہ سلسلہ جامع مسجد کبیر (جو نورانی عبادت گاہ، مشہور ومعروف مقام ہے) میں ہوا اس سے قبل جب کہ روم کے بعض شہروں میں مقیم تھا تو میرے پاس چند صحیفے جمع تھے ان میں تفاسیر ودیگر علوم جمع کیے گئے تھے۔ وہ بھی سورہ آل عمران سے کچھ تھوڑا سا آگے کی تفسیر پر مشتمل تھا اور ان میں طوالت کے باوجود متفرق اوراق تھے۔ میرا ارادہ ہوا کہ ان کا خلاصہ بیان کروں اور ان میں جو کمی بیشی ہو ترمیم وتنسیخ کروں اور جو مضامین بڑھانے کے لائق ہوں ان کا اضافہ کروں۔ اگر چہ میں قلیل البضاعۃ ہوں لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے مہلت بخشی تو بوقت فرصت اسے تحریر میں لاؤں گا۔ تاکہ میرے لئے یوم آخرت کا ذخیرہ ہو بلکہ میرے لیے سفارشی

بنے اس یوم میں کہ جہاں نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے سوال ہے کہ اسے صالحات الاعمال، خالصات الآثار اور آخر عمر تک باقیات الصالحات سے بنائے۔ کیونکہ وہ کریم جب کسی بندہ سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے اعمال لوگوں کی نظروں میں اچھے بنا دیتا ہے اور اسے ان خیرات کا اہل بنا دیتا ہے جو نہایت اعلیٰ اور مرغوب ہیں اور وہی فیاض ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سبب ترجمہ ھذا

از:۔ شیخ القرآن والحدیث، فیض ملت علامہ مفتی محمد فیض احمد اویسی رضوی مدظلہ العالی

بحمدک یامفیض الجود الخیر علی عبادک الاخیار یاستار ویاغفار اغفر ذنوبنا واستر عیوبنا واعصمنا من فتن المبطلین والاشرار انت الباقی بلا زوال لم یطر علیک ونقص ولا یجری علیک نکص انت القادر والقدیر والمختار علی حبیبک الاعظم ونبیک الاکرم ونورک المعظم وسرک الافخم سید الانبیاء والابرار امام الانبیاء وقدوۃ الاصفیاء وصفوۃ الانام واکرم الکرام ھادم بنیان الکفر والشر والاشرار وعلی الہ الاطھار واصحابہ الصغار والکبار۔

امابعد فقیر ابوالصالح محمد فیض احمد اویسی غفرلہٗ کو عرصہ سے ایک جامع تفسیر تحریر کرنے کا شوق دامن گیر تھا علمی بضاعتی کے علاوہ کم ہمتی بھی مانع تھی اور نہ ہی تفسیروں کا ذخیرہ میسر تھا۔ طویل عرصہ گذر جانے کے بعد تفسیر روح البیان کا مطالعہ نصیب ہوا۔ اس نے میرے شوق سابق کے خوابیدہ تصورات کو بیدار کیا۔ وہی کچھ ملا جو میں تفاسیر شتی سے چاہتا تھا کہ لغت بھی ہو اور فقہ بھی، حدیث بھی ہو اور تفسیر بھی۔ اہل ظواہر بھی فائدہ اٹھائیں، اہل تصوف بھی مستفید ہوں۔ محققین بھی اس سے استفادہ فرمائیں اور مبتدی حضرات بھی۔ جس طرح مدرسین کی نظروں میں منظور ہوا اسی طرح واعظین کا مطمع نظر بھی ہو۔ چنانچہ اس کے ترجمہ کا آغاز یکم جنوری ۱۹۵۸ء سے ہوا اور یکم جنوری ۱۹۵۹ء میں ''ماہ طیبہ'' کوٹلی لوہاراں، ضلع سیالکوٹ کی مسلسل اشاعتوں میں شائع ہوتا رہا۔

فقیر ابوالصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہٗ

روح البیان اور اس کا مصنف مرحوم

مصنف روح البیان جناب اسماعیل حقی قدس سرہٗ العزیز ایک عارف کامل اور علامہ دوراں اور یگانہ زمان تھے جن کے عرفان اور فضل وکمال کا اعتراف مخالفین کو بھی ہے۔ چنانچہ مولوی محمد صدیق حسن خان بھوپالی نے اپنی معروف تصنیف '' اکسیر فی اصول تفسیر '' صفحہ ۸۲ میں لکھا کہ: روح البیان فی تفسیر القرآن للشیخ العارف الکامل الشیخ اسماعیل حقی رحمة الله علیه ـــــ یعنی یہ تفسیر آپ نے اپنے شیخ عارف کامل حضرت عثمان قدس سرہٗ کے حکم سے قسطنطنیہ میں لکھی۔ خود مصنف رحمة اللہ تعالیٰ علیه نے بھی اسی پارہ اول کے مقدمہ میں لکھا۔

تفسیر روح البیان کا تعارف :۔

مولوی بھوپالی ''روح البیان'' کے تعارف میں لکھتا ہے کہ وهو فی ستة مجلدات لم یذکره فی کشف الظنون وقد طبع فی هذا الزمان بمصر القاهره یحتوی علی معارف وحقائق علی لسان التصوف یعنی وہ چھ جلدوں میں ہے اسے کشف الظنون (جو تصانیف پر مشتمل ہے) میں نہیں لایا گیا یہ تفسیر معارف (معرفۃ کی جمع) اور حقائق (حقیقۃ کی جمع) کو حاوی ہے اور تصوف کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔

صدیق حسن بھوپالی کا تعارف :۔

۱۔ مخالفین کا یہی محقق خود اپنے لیے یوں لکھتا ہے :۔ الامام العلامه البحر الفهامه البرکة الشامله لمن هو فی الهند والقهامه الخ

(حاشیہ وہابی مذہب)

۲۔ مولوی اسماعیل سلفی گوجرانوالہ نے لکھا :۔ دقت نظر، وسعتِ مطالعہ، زہد وتقوی کے لحاظ سے ان کا مقام یقیناً اونچا ہے اور فہم قرآن میں ان کا ذہن بے حد صاف ہے بہت اکابر قدماء سے بھی ان کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے۔

(حیات النبی، صفحہ ۴۶، ۴۷)

۳۔ مولوی اشرف سندھو نے لکھا ہے کہ :۔ نواب صدیق حسن خان اہلحدیث مسلک کے علمبردار ہیں اور وسیع النظر محقق ہیں۔

(تاریخ التقلید، صفحہ ۱۴۹)

۴۔ نواب صدیق حسن بھوپالی ''مجدد'' تھے۔

(اہلحدیث امرتسر ۱۹۱۲ء صفحہ ۲۸)

انصاف اے اہل انصاف!

مولوی محمد صدیق حسن خان بھوپالی کی شخصیت سامنے آ گئی اور ان کا اعتراف بھی پڑھ لیا گیا کہ یہ تفسیر معارف وحقائق کا گنجینہ ہے۔ پھر اس کے بعد خلجان کیوں؟ وہ صرف اسی لیے کہ تصوف کے مسائل بھی اس میں موجود ہیں اور پھر اس لیے کہ یہ تفسیر (روح البیان) عارف کامل حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ کے اشعار پر مشتمل ہے اور کے بھی چھ دفتر ہیں اس لیے بعد صدیق حسن مذکور نے دل کی بھڑاس نکالی ہے:

"مزج فيه العربية بالفارسية من غير امتياز بينهما "یعنی مفسر نے عبارت عربی، فارسی ملا کر لکھی ہے۔

جواب:۔

i۔ اولاً تو تفسیر روح البیان پر مذکورہ بالا الزام غلط ہے اس لیے کہ فارسی عبارات تفسیر ہذا میں لائی ضرور گئی ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر اور وہ بھی کسی معتبر اور مستند کتاب، تفسیر کی نقل کے طور پر، اس طرح سے مصنف کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے تفسیر بالرائے سے کام نہیں لیا بلکہ مضمون کو دوسرے محققین اور مستند علما سے مؤید وموثق کیا ہے۔

ii۔ ہمارے دور میں انگریزی زبان علاج عروج پر ہے۔ جو مصنف اپنی تصنیف میں انگریزی حروف وجملے لاتا ہے اسے جدت کا تاج پہنا کر تحسین وآفرین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ صاحب روح البیان کے زمانہ میں فارسی زبان کا طوطی بولتا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی تحریر میں فارسی جملے لائے تا کہ جدت پسند حضرات تفسیر کو سر آنکھوں پر رکھیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ جتنی مقبولیت تفسیر روح البیان کو حاصل ہے کسی دیگر تفسیر کو نصیب نہیں۔

صدیق حسن مذکور نے اور لکھا:۔

والی بارا جیف کثیره لاینبغی الالتفات لاینبغی الیها وفتاوی ضیعة لا یعتمد علیها ولیس فی الحقیقة من التفسیر للکتاب العزیز بشئی واورد فیه اشعار کثیرة من الفرس سیما من مثنوی الشیخ جلال الدین الرومی وهو من توابعه من الاعتقاد والمعرفة الذ اسمعی کل جزء من اجزاء التفسیر بالدفترو اجتراء علی کتاب اللّٰہ بادخال لیس منه ۔

یعنی تفسیر میں اراجیف کثیرہ لایا ہے۔ یاد رہے کہ اراجیف بالفتح ارجاف کی جمع ہے بمعنی بیہودہ لوگ، جھوٹی اور بے بنیاد باتیں۔ (غیاث اللغات)

اویسی کی بھی سنیے:۔

ناظرین! آپ نے دیکھ لیا، اسے کہتے ہیں تعصب اور سچ ہے دروغ را حافظہ نباشد ابھی تو اس تفسیر کو

''معارف وحقائق کا گنجینہ اور مصنف کو عارف لکھا'' اور پھر اس کی تفسیر کو اراجیف جیسے گندے الفاظ جڑ دیے۔ (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون) اور ''فتاوی ضعیفہ'' کا الزام بھی بے بنیاد ہے۔ یہ تعصب کی کاروائی ہے ورنہ الحمدللہ مصنف روح البیان قدس سرہٗ نے حوالہ جات تفسیر میں لکھے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ضعیف حوالہ نہیں۔

مولانا روم کی اقتدا:۔

بھوپالی صاحب نے اپنے تئیں معقول الزام لگایا ہے کہ مصنف روح البیان مولانا روم کا نہ صرف متبع بلکہ اتنا بڑا معتقد ہے کہ تفسیر کو مثنوی کے چھ دفتروں کے مطابق چھ دفتروں میں لکھ دیا۔

عرض اویسی غفرلہٗ:۔

مخالف نے یہ الزام لگا کر اپنی بدمذہبی کا اظہار اور ہمارے ممدوح کی تفسیر پر علم وعرفان سے بھرپور ہونے کی مہر ثبوت لگا دی ہے۔ الحمد للّٰہ علی ذالک

اہل سنت اور صوفیہ کو دعوت مطالعہ:۔

مولانا روم قدس سرہٗ کی مثنوی کے عشاق بخوبی واقف ہیں اس مقدس کتاب کا صرف مطالعہ ہی صاحب عرفان بنا دیتا ہے۔ چنانچہ مولوی اشرف علی تھانوی نے فیوض الرحمٰن (ملفوظات) میں اعتراف کیا ہے کہ صرف مثنوی کے مطالعہ سے بے ایمانوں کو ایمان اور ایمان داروں کو عرفان کی دولت نصیب ہوئی جس کی تفصیل فقیر کی کتاب '' فیض القوی فی فضائل المثنوی '' میں ہے۔ یوں سمجھئے کہ تفسیر روح البیان اہل سنت کے مسلک اور احناف اور تصوف اسلام کا عطر ہے صرف یہی ایک تفسیر ان جملہ برکات کی جامع ہے۔

اہل سنت کے مایہ ناز عالم دین کی تصدیق:۔

حضرت مولانا فقیر محمد جہلمی یوں رقم طراز ہیں:۔ ''شیخ اسماعیل حقی آفندی عارف کامل، فاضل مفسر، متقد سراج العلماء، زبدۃ الفضلاء تھے۔ امام اعظم رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ کے مذہب کی تائید اور اعانت کی اور انہیں کے مذہب کے موافق آیات قرآنی کی تفسیر فرمائی۔'' (حدائق الحنفیہ)

اہل سنت خواص وعوام سے اپیل ہے کہ جب آپ حضرات مسلک سنی اور مذہب حنفی اور تصوف کے متلاشی بلکہ عاشق ہیں۔ تو پھر روح البیان سے بے اعتنائی اور لاپروائی کیوں؟ آپ مخالفین کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر کیوں ہیں؟ جب کہ ان کی تنقید کا نشانہ نہ صرف تفسیر روح البیان ہے بلکہ انہوں نے تو تمہارے اکابر اسلاف صالحین کو بھی معاف نہیں کیا۔ امام اعظم رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہٗ جیسی شخصیت کے لئے کہتے ہیں وہ تو صرف سولہ سترہ احادیث جانتے تھے اور بس اور نبوت وولایت پر تو ان کی تنقید مشہور ہے۔ جب وہ مرکز

کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو پھر مرکز کو مضبوط کرنے والوں کو کب اچھی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔اسی لیے مخالفین اہل سنت اور احناف اور اصفیاء کو اپنی تحریر وتقریر میں ہدف تنقید بناتے ہیں۔

یقین کیجئے!

عوام اہل سنت کو یقین ہونا چاہیے کہ تفسیر روح البیان نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے۔اصول تفسیر کے عین مطابق ہے۔اس کے مفصل دلائل تو فقیر نے " الفیضان " میں لکھے ہیں یہاں بھی چند ایک ملاحظہ ہوں۔

شرائط تفسیر:۔

حضرت امام جلال الدین سیوطی قدس سرہ نے قرآن مجید کی تفسیر کے لیے پندرہ علوم وفنون میں مہارت تامہ کی شرط لگائی ہے اور لکھا ہے کہ جو شخص ان پندرہ علوم وفنون میں سے کسی ایک میں بھی ناقص ہوا سے قرآن مجید کی تفسیر کرنے کا حق نہیں۔ (اتقان) وہ پندرہ علوم یہ ہیں۔

۱۔لغت عربیہ ۲۔علم النحو ۳۔علم الصرف ۴۔علم الاشتقاق ۵۔علم المعانی

۶۔علم البیان ۷۔علم البدیع ۸۔علم القرأت ۹۔قواعد شرعیہ ۱۰۔اصول فقہ

۱۱۔علم اسباب النزول ۱۲۔علم ناسخ ومنسوخ ۱۳۔فقہ ۱۴۔علم الحدیث ۱۵۔علم الموہبہ

بعض دیگر مفسرین نے پچیس علوم کی شرط لگائی ہے۔ان کی تفصیل فقیر نے اپنی کتاب ''احسن البیان'' حصہ اول میں لکھ دی ہے۔

افسوس! کہ آج کل بعض حضرات معمولی عربی گرائمر جاننے والے اور دو چار اردو کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تفسیر کرنے لگ جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں تفسیر قرآن کی کوئی قدر نہیں رہی بلکہ معاملہ الٹا ہو گیا کہ تحقیقی تفاسیر کو ضعیف اور غیر تحقیقی کو قوی سمجھا جا رہا ہے۔مثلاً عوام کے سامنے ''تفسیر ابن کثیر'' کا پرچار کیا جاتا ہے اور اس کا اردو ترجمہ ہاتھوں ہاتھ لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے اور ''تفہیم القرآن'' کے مقابلے میں تمام سابقہ تفاسیر کو ہیچ ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ " تفسیر ابن کثیر " ابن تیمیہ کے مقلد اور خارجی مذہب کے پیروکار کی لکھی ہوئی ہے جس میں ہزاروں بلکہ بے شمار غلط عقائد کو درج کر کے خارجیت کا درس دیا گیا ہے اور ''تفہیم القرآن'' کے مصنف کا تو سب کو پتا ہے کہ وہ ماڈرن دین کا داعی تھا یعنی وہ اسلام کا رخ مدینہ منورہ کی بجائے انگلینڈ اور امریکہ کی طرف پھیرنا چاہتا تھا فلہذا عوام خود سوچ لیں کہ ایسی تفاسیر کے مطالعہ سے انہیں کیا حاصل ہوگا!

ایسے ہی سابقہ تفاسیر میں " تفسیر کبیر " بلند پایہ سہی مگر شرائط مذکورہ سے یکسر خالی۔اسی لیے علماء

کرام نے فرمایا: تفسیر کبیر رازی میں تفسیر کے سوا باقی سب کچھ ہے۔ یعنی فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بہترین مضامین لکھے، لیکن تفسیری مضامین سے یکسر خالی۔ ایسے ہی "تفسیر ابن جریر" کو علماء کرام نے "ام التفاسیر" کا لقب دیا مگر وہ بھی شرائط مذکور پر صحیح نہیں اترتی اسی طرح آپ متعدد تفاسیر پڑھ جائیں گے لیکن تفسیری شرائط ان میں بہت کم ملیں گی۔

شرائط مفسر:۔

مفسر قرآن کے لئے جن شرائط کا ہونا مستند مفسرین نے ضروری قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ ذکی، فہیم ہو۔ قرآن فہمی کی کامل و مکمل مہارت رکھتا ہو۔

۲۔ علوم مذکورہ باضابطہ، ماہر و حاذق اور تجربہ کار اساتذہ سے سبقاً پڑھے ہوں۔

۳۔ علمائے معاصرین اور فضلائے ہم زمان کی نظر میں اس کا علم، فہم اور تقوی مسلم اور معتبر ہو۔

۴۔ خود رائے اور متکبر نہ ہو۔ ۵۔ سنی اور صحیح العقیدہ ہو۔

الحمدللہ جملہ اوصاف صاحب روح البیان رحمہ اللہ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ جس کا اعتراف مخالفین کو تھا اور ہے، ایک حوالہ بھوپالی کا اس کے ثبوت کے لئے پیچھے گذر چکا، تفصیل "الفیضان" میں دیکھئے۔

افسوس، اہل سنت!

بد مذاہب کی تفاسیر کو ہمارے اکابرین رحمہم اللہ تعالی ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے بلکہ اپنے متبعین کو ان کے نہ پڑھنے کا حکم فرماتے۔ مثلاً زمخشری کتنا بڑا افاضل اور علامہ تھا لیکن ہمارے بزرگوں نے اس کے مطالعہ کو زہر قاتل قرار دیا، تو پھر آج کیوں تفسیر ابن کثیر اور بد مذاہب کی تفسیروں کو پڑھتے ہو؟ جب ان میں اہل سنت اور صوفیائے کرام کے خلاف زہر اگلا گیا ہے اور تفسیر روح البیان جو ہمارے سنی مسلک و مذہب حنفی اور مشرب صوفیہ کے عین مطابق ہے اور تفسیری شرائط کے مطابق ہے۔ پھر اس سے بے اعتنائی کیوں؟ صرف اس لیے کہ اسے مخالفین نہیں مانتے وہ کیوں مانیں جب مصنف عارف رومی اور شیخ اکبر اور امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا متبع ہے

قواعد تفسیر:۔

تفسیر کے پانچ قواعد ضروری ہیں۔

۱۔ تفسیر القرآن بالقرآن ۲۔ تفسیر القرآن بالحدیث ۳۔ تفسیر القرآن باقوال الصحابہ

۴۔ تفسیر امور سے جو لغت عربیہ اور قواعد اسلامیہ کے متعلق ہوں۔ ۵۔ تفسیر کی وہ قسم جو وجوہ مذکور میں سے کسی ذریعہ سے ثابت اور متین نہ ہو۔

''روح البیان'' میں جملہ شرائط بدرجہ اتم موجود ہیں۔ طرفہ یہ کہ صاحب تفسیر کوئی مضمون حوالہ دیے بغیر درج نہیں کرتے بلکہ ہر ایک کو شرائط تفسیر کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے احناف کے مسلک کے مطابق اور اہلسنت کے اصول کے مطابق اپنے اشہب قلم کو دوڑایا ہے اور تصوف کے وہ اسرار و رموز جو ہم عارف رومی، سعدی، جامی اور حضرت ابن العربی قدس اسرارھم سے سننا چاہتے تھے وہ صاحب روح البیان نے ''روح البیان'' میں یوں بیان کر دیے گویا کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ''روح البیان'' تفسیری قواعد و ضوابط اور جملہ اصول کی جامع ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ حنفی اور تصوف اسلامی پر مشتمل ہے اور دور حاضرہ کے وہ مسائل جن میں اہلسنت کے ساتھ مخالفین کو اختلاف ہے ان سب کو علمی، تحقیق سے واضح کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس کہ اہل اسلام کو اس کے مطالعہ سے اندھیرے میں رکھا گیا ہے۔ مخالفین تو اپنی عادت پر مجبور ہیں لیکن سخت افسوس ان علمائے اہل سنت پر ہے جنہوں نے اس تفسیر سے بے اعتنائی برتی۔ جس سے عوام اہل اسلام کو یقین ہونے لگا کہ ممکن ہے کہ بقول مخالفین ''روح البیان'' غیر مستند ہو۔ حالانکہ ایسی محقق اور مستند اور کوئی تفسیر نہیں۔ فقیر نے اس تفسیر کے متعلق ایک کتاب " الفیضان علی روح البیان " لکھی ہے۔ جو انشاء اللہ تعالیٰ تفسیر کی تکمیل طباعت کے بعد علیحدہ علیحدہ مقدمہ ہدیہ ناظرین ہوگی!

خصوصیات تفسیر ہذا از مصنف روح البیان قدس سرہٗ

☆ ...... اس تفسیر میں بکثرت وجوہ تفسیر بیان کرنے کے بجائے اختصار کو ملحوظ رکھ کر آیات کے اصل منشاء کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ البتہ متقدمین کی معتبر و مستند تفاسیر کا خلاصہ ضرور بیان کیا جائے گا اس سے میری تفسیر کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

☆ ...... ہر آیت کے تحت مناسب لیکن دلپذیر پند و نصائح ضرور بیان کروں گا تا کہ ان سے قلوب کو جلاء اور ارواح کو سرور حاصل ہو۔

☆ ...... موقعہ کے مطابق فارسی اشعار بھی لکھوں گا تا کہ اہل دل ان سے روحانی تسکین پائیں۔

☆ ...... جن تفاسیر معتبرہ اور کتب فقہ و احادیث مبارکہ کا حوالہ دوں گا حتی المقدور ان کی اصل عبارت لکھنے کی کوشش کی کروں گا۔ البتہ کہیں کہیں بوقت ضرورت صرف عبارات میں ترمیم و اضافہ کروں گا لیکن مطالب و مقاصد میں حبہ بھر فرق نہیں آنے دوں گا۔

☆ ...... بہت کم ایسے مواقع آئیں گے جہاں اپنا نظریہ (بقول الفقیر سے) پیش کروں گا لیکن وہ بھی بحمدہٖ تعالیٰ کسی شیخ کامل اور معتبر ولی اللہ کی تقریر کا خلاصہ ہوگا۔

آغاز تصنیف روح البیان:۔

اس دفتر کا آغاز ۲۲ شعبان ۱۱۰۲ھ میں ہوا۔ پہلے دفتر کی طرح اس کا آغاز شہر بروسہ میں ہوا جب کہ اسی شہر کی طرف ہجرت کر کے مقیم ہو گیا تھا۔ خدا کرے یہ شہر ارواح قدسیہ والے حضرات کا مرکز بنا رہے۔
اے الہ العالمین ! جس طرح تو نے مجھے اس کے دفتر کے اتمام کی توفیق بخشی ہے اپنے فضل و کرم سے اس کے بقایا حصص کی تکمیل بھی توفیق عطا فرما اور میری اس تحریر کو قیامت کے دن میرے چہرے کی سفیدی کا سبب بنا جیسے تیرے اولیاء کرام کے چہرے نورانی ہوں میرا بھی چہرہ نورانی ہو اور اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میرے گناہوں کے سیاہ دفتروں کو دھو ڈال اور میں بھی صبح و شام تا دم زیست تجھ سے دعائیں مانگتا رہوں گا اور اس میں مجھے ناامیدی بھی نہیں۔ فلک الحمد فی الاولی والاخری علی عنایتک الکبری واخر دعواھم ان الحمد للہ رب العالمین۔
سبب تالیف ''فیوض الرحمٰن'' ترجمہ تفسیر ہذا:۔

ناکارہ و آوارہ الفقیر القادری ابوالصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہٗ عرض پرداز ہے کہ فقیر نے زمانہ طالبعلمی میں اپنے اکابر اہل سنت سے تفسیر روح البیان کا غلغلہ سنا۔ مخالفین اہل سنت نے اسے ضعیف اور غیر معتبر گردانا۔ تحصیل علوم و تکمیل فنون کے بعد ۱۳۷۱ھ /۱۹۵۱ء میں اپنے گاؤں حامد آباد ضلع رحیم یار خاں میں تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گیا۔ انہی دنوں تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ عوام میں تاثر پیدا کر دیا گیا کہ یہ زمانہ قدیم کی معتبر تفسیر ہے۔ حالانکہ ابن کثیر ابن تیمیہ کا شاگرد اور اس کے مذہب و مسلک کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے والا ہے۔ اس نے تفسیر ابن کثیر میں اہل سنت کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ یہ تفسیر اہلسنت و جماعت کے عقائد کے بھی خلاف ہے اور مسلک حنفیت کے بھی۔

فقیر قلیل البضاعۃ وعدیم الفرصت کو اتنی جرأت کہاں کہ تفسیر جیسے اہم و مشکل ترین فن کو اپنائے۔ لیکن فضل ایزدی پر امید رکھ کر روح البیان کے ترجمہ کا آغاز کیا۔ یہ تفسیر بحمدہٖ تعالیٰ اصول و ضوابط اور قوانین تفسیر کے عین مطابق ہے اور مخالفین حضرات اسے محض اس لئے غیر معتبر و ضعیف گردانتے ہیں کہ صاحب روح البیان نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صوفیائے کرام میں سے سیدنا ابن العربی اور حضرت مولانا روم قدس سرھما کا مسلک پیش کیا ہے۔ بعینہٖ یہی ہمارا مدعا ہے اور مخالفین کے لئے موت اور سم قاتل۔
تفسیر ابن کثیر نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ اس کا مطالعہ عقائد و مسائلِ احناف کے لئے مضر بھی ہے اور روح البیان کا مطالعہ عقائد اہلسنت و مسائلِ احناف کو جلا بخشے گا اور حضرت مولانا روم اور عارف باللہ سیدنا ابن

العربی قدس سرھما کے عارفانہ کلام سے ارواح کو تازگی بخشے گا۔

معتبر تفسیر روح البیان:۔

کسی کو زبان سے غیر معتبر اور ضعیف کہہ دینا صرف مخالفین کی اپنی بڑ ہے۔ ورنہ مطالعہ کے بعد قاری خود محسوس کرے گا کہ عالم اسلام کی جملہ تفاسیر سے بوجہ اصول وقواعد وضوابط فن تفسیر کے تفسیر ہذا کتنا بلند مرتبہ رکھتی ہے ۔طرفہ یہ کہ جناب اسماعیل حقی قدس سرہٗ نے ہر ایک مضمون کو مشہور و معروف اور نہایت معتبر اور مستند تفاسیر و کتب احادیث وفقہ حنفی کے حوالہ جات سے مزین فرمایا ہے اور صوفیانہ تفسیر کو اصول تفسیر میں حق مانا گیا ہے۔ جس کا مخالفین کے اکابر نے اعتراف کیا ہے۔ اسی لیے تعصب سے بالا ہو کر اس تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو حق واضح اور روشن ہوگا۔

خصوصیات ترجمہ:۔

☆......فقیر نے ترجمہ میں کسی قسم کی ترمیم واضافہ نہیں کیا محض اس نیت سے کہ عوام اس تفسیر کے مطالعہ کے بعد خود اس نتیجہ پر پہنچیں اور سمجھیں کہ گیارھویں صدی میں عقائد ومسائل یہی تھے جن کی امام اہل سنت مجدد دین وملت شیخ الاسلام والمسلمین سیدنا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی قدس سرہٗ نے چودھویں صدی میں ترجمانی کی ہے۔ ان کے دلائل ومسائل کو بدعت کہنا ایسے ہے جیسے امام الانبیاء، حبیب کبریاء، شافع روز جزا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مشرکین عرب نے بدعتی گردانا اور منافقین نے مشرک[1] حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خارجیوں نے مشرک و بدعتی ہونے کا فتوی جڑا۔ اسی طرح ابن تیمیہ کی پارٹی اور عبدالوہاب نجدی نے تمام اہل حق کو مشرک و بدعتی گردانا[1] اب اگر اعلیٰ حضرت بریلوی اور ان کے تلامذہ اور معتقدین ومتعلقین کو وہابی، دیوبندی، مودودی، تبلیغی، پرویزی وغیرہ بدعتی اور مشرک کہیں تو وہ مجبور ہیں

تاریخ گواہ ہے کہ سوائے مشرکین عرب ومنافقین کے باقی ہر دور میں ہمارے اکابر واسلاف صالحین کو بدعتی اور مشرک گرداننے والے اپنے آپ کو موحد (اہل توحید) کہلاتے ہیں۔ تفصیل فقیر کی تصنیف "ابلیس تا دیوبند" میں دیکھئے

☆......چونکہ تفسیر ہذا عربی میں اور دور قدیم کی طرز پر لکھی گئی ہے اس لیے فقیر نے دور حاضرہ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے جگہ بہ جگہ عنوانات قائم کیے ہیں۔ حسب ضرورت کہیں توسین میں کچھ لکھ دیا ہے یا مختصر احواشی میں۔

☆......ادیبانہ طرز پر نہیں اپنے جیسے عوام کی خاطر سادہ اور آسان ترین اردو زبان استعمال کی ہے اور چونکہ فقیر نے صرف پرائمری تک سکول میں تعلیم حاصل کی ہے، پھر حفظ قرآن اور عربی علوم وفنون کی تحصیل کی، پھر ان کی

---

[1] دیکھئے فقیر کی تصنیف "الفیضان علی روح البیان"

تدریس وتعلیم میں مصروف ہو گیا، اس لیے ممکن ہے اردو قواعد میں غلطی ہوئی ہو۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ تفسیر کا اصل منشاء ادا کیا ہے اسے صرف عوام تک پہنچانا مقصود ہے ادباء وعلماء سے داد لینا نہیں بلکہ میں ان سے نہایت عاجزی سے ملتجی ہوں کہ وہ اپنے علوم ودانش کے صدقے فقیر کے ٹیڑھے میڑھے ترجمے سے کیڑے نکالنے کی بجائے اصلاح فرما کر فقیر کو براہ راست مطلع فرما کر شکریے کا موقع دیں فقیر اور عوام الناس کے درمیان روڑے نہ اٹکائیں۔ ممکن ہے مناع للخیر کی وعید ان پر صادق آجائے۔

فقیر نے تفسیر روح البیان کے سمجھنے اور اسے معتبر ومستند تفسیر احناف ثابت کرنے کے لئے کتاب "الفیضان علی روح البیان" لکھی ہے۔ جو زیر طباعت ہے۔

تفسیر صوفیانہ:۔

اس بحث کو لکھنا ضروری ہے کہ صوفیہ کرام کی تفسیر حق ہے یا باطل؟ چونکہ صاحب روح البیان نے تفسیر عالمانہ کے ساتھ تفسیر صوفیانہ بھی بیان کی ہے۔ اس لیے مخالفین یہ تأثر دیتے ہیں کہ روح البیان میں زیادہ تر تفسیر صوفیانہ ہی بیان کی گئی ہے فلہٰذا یہ تفسیر صرف صوفی منش لوگوں کے لئے ہے اور بس۔ یہ ان کی نظروں کا دھوکا اور دماغ کا خلل ہے ورنہ تفسیر ہذا میں تفسیر عالمانہ اور تفسیر صوفیانہ ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور صوفیانہ تفسیر اہل اسلام کے نزدیک حق ہے۔ چنانچہ مخالفین کے معتمد علیہ حضرت آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیہ اور عارفین کا کلام آیات قرآنیہ میں بطریق تفسیر نہیں ہوتا اس لیے کہ تفسیر تو صرف آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اجمعین کی بیان کردہ مراد کا نام ہے۔ بلکہ وہ تو رموز واشارات اور وہ لطائف ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر فائض فرماتا ہے۔ ارباب سلوک کے قلب باطنی ریاضتوں کی وجہ سے منور ہوتے ہیں اور ان پر تجلیات غیبیہ کا ورود ہوتا رہتا ہے تو گاہ بگاہ ان کی زبان سے آیات کلام اللہ کی تشریح میں کچھ ایسے لطائف اور معارف جاری ہوتے ہیں جن کا تعلق ظاہری علوم سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف روحانی تلقین اور تفہیم غیبی ہوتے ہیں۔ یہ باطنی اشارات کلام اللہ کے اس مفہوم اور مدلول قطعی کو برقرار رکھتے ہوئے معتبر ہوں گے جو اصول شریعت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تفسیر سے ثابت ہے اس لیے اگر ارباب تصوف سے کوئی ایسی چیز منقول ہو کہ جس سے ظاہر احکام شریعت اور حدود کا انکار لازم آتا ہو تو وہ ہرگز مقبول اور معتبر نہ ہوگی قابل اعتبار صرف وہی لطائف واشارات ہوں گے جن سے نہ احکام شریعت پر کوئی زد پڑتی ہو اور نہ کسی ایسے امر کا صراحۃً یا دلالۃً رد لازم آتا ہو جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کی تفسیر سے ثابت ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لکل أیة ظھر وبطن
ولکل حرف حد ولکل حد مطلعٌ

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن اور ہر حرف کے لئے ایک حد یعنی حکم شرعی ہوتا ہے اور ہر حکم شرعی کے لیے ایک اطلاع پانے کی جگہ ہوتی ہے۔ (کتاب اللہ میں سے)

ابن النقیب بیان کرتے ہیں ظہر آیات سے وہ معانی ہیں جو اہل علم ظاہری اور قواعد شریعت کے ذریعہ جانتے ہوں اور بطن سے مراد وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ارباب حقائق (اور عارفین) کو مطلع فرماتا ہے اور لکل حرف حد کے معنی یہ ہیں کہ ہر حرف کے معانی اور حقائق کا ایک منتہی ہوتا ہے جو بھی اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے۔ یہی وہ اسرار وحقائق ہیں جن کے بارہ میں فرمایا گیا ہے:

ھو الذی لاتنقضی عجائبه قرآن اللہ کا وہ کلام ہے کہ اس کے عجائب ولطائف کبھی ختم نہ ہوں گے۔

تو مدلول قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی تفاسیر سے مقررہ متعین ہے جس میں ادنیٰ تغیر اور ردوبدل کا امکان نہیں۔ اس مدلول قطعی اور طے شدہ مفہوم (جس پر تمام احکام شریعت کا دارومدار ہے) کے بعد باطنی اسرار ونکات اور معارف کی کوئی حد وانتہا نہیں۔

شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ کتاب "لطائف المنن" میں بیان فرماتے ہیں کہ کلام اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تفسیر وتشریح میں حضرات صوفیہ اور عارفین کے بیان کردہ نکات اور اس قسم کے غرائب بیان کرنا کلام اللہ کو اس کے ظاہر مفہوم سے متغیر کرنا نہیں ہے۔ اس لیے کہ آیت کا ظاہری مفہوم تو وہی مراد ہوتا ہے جس پر آیت ناطق ہے اور وہ قواعد عربیہ اور اصول شریعت سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ غرائب محض رموز واشارات اور باطنی تفہیم ہوتے ہیں جو غیبی طور پر اللہ کی طرف سے ارباب باطن پر القا کئے جاتے ہیں۔[1]

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ آیت اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً کی تفسیر وتشریح فرمانے کے بعد آخر میں اسی نوع کے عارفانہ نکتہ بیان کرتے ہیں:۔

ولعله سبحانه وتعالی اراد من الایت الاخیرة مع مادل علیه الظاهر وسیق الکلام فیه اشارة الی تفصیل خلق الانسان وما افاض علیه من المعانی والصفات علی طریقة

[1] ۔ بحوالہ مفتاح السعادۃ جلد اول صفحہ ۴۴۲

التمثیل فمثل البدن بالارض والنفس باسماء والعقل بالماء وما افاض علیه من الفضائل العلمیه والنظریة المحصلة بوساطة استعمال العقل للحواس وازدواج القویٰ بالنفسانیة والبدنیة بالثمرات المتولدة من ازدواج القویٰ السماویة الفاعلیة والارضیة المنفعلة بقدرة الفاعل المختار فان لکل اٰیة ظهراً وبطناً ولکل حدٍ مطلعاً۔

(تفسیر بیضاوی جلد اول صفحه ۴۳)

اور شاید یہ کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے آیت اخیرہ (یعنی الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء) سے ارادہ فرمایا اس مدلول کے باوجود جس پر ظاہر کلام دلالت کر رہا ہے اور جس مقصد کے لئے کلام جاری فرمایا گیا اشارہ فرمانے کا تخلیق انسانی اور اس پر فائض کردہ اوصاف و معانی اور اس کے فضائل علمیہ اور نظریہ کی تفصیل کی جانب بطریق تمثیل، تو بدن انسانی کو تشبیہ دی گئی ارض (زمین) سے اور اس کے نفس کو سماء (آسمان) سے اور عقل کو ماء (پانی) سے اور انسان کو عطا کردہ فضائل عملیہ اور کمالات نظریہ کو جو حواس کے لئے استعمال عقل کے توسط اور قوائے نفسانیہ اور قوائے بدنیہ کے امتزاج و اختلاط سے حاصل ہوتے ہیں ان ثمرات سے تعبیر فرمایا جو کہ آسمان کی قوت فاعلیہ اور زمین کی قوت منفعلہ (قابلیہ) کے امتزاج کی وجہ سے فاعل مختار کی قدرت سے پیدا ہوتے ہیں (اور یہ اشارہ) اس لیے کہ ہر آیت کے لیے ظہر و بطن ہے اور ہر حکم کے لئے ایک اطلاع کا مقام ہے۔

بہر حال عارفانہ لطائف کا کلام اللہ سے استنباط ایسا ہی ہے جیسا کہ اس شعر سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا نام ''علی'' اخذ کیا جاتا ہے۔

چشم بکشا زلف بشکن اے یار من　　بہر تسکین دل بریان من

انہی لطائف و اسرار کو صاحب روح البیان حضرت علامہ محمد اسماعیل حقی نور اللہ مرقدہ نے بیان فرمایا ہے جسے ہم نے ''تفسیر صوفیانہ'' سے موسوم کیا ہے۔ سیدنا ابن العربی قدس سرہٗ اور ان کے معتقدین نے متعدد تصانیف و تفاسیر لکھیں اور اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے جسے فقیر نے تفاسیر کی بحث اور دیگر مقامات پر عرض کر دیا ہے۔ چونکہ فقیر کو صوفیہ کرام سے عقیدت ہے اور تمنا رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی محبت و عقیدت میں مارے اور انہی کے زمرے میں اٹھائے اور میدان حشر میں ان کی رفاقت نصیب فرمائے۔ اسی لیے مضمون کو انہی کے مقدس ذکر پر ختم کرتا ہوں۔

احب الصالحین ولست منهم　　لعل الله یرزقنی صلاحاً

شنیدم کہ در روز امید و بیم　　بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

۱ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ یَوْمِ

سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا بہت مہربان رحمت والا روز جزاء کا مالک

الدِّیْنِ ﴿۳﴾ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا

ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں ہم کو

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ

سیدھا راستہ چلا راستہ ان کا جن کو تو نے احسان کیا

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴿۷﴾

نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا

تفسیر عالمانہ

قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ شریف پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ اعوذ باللہ شریف ایک قسم کی طلب اجازت اور بمنزلہ دروازہ کھٹکھٹانے کے ہے کیونکہ شاہان زمان کی عادت ہے کہ جب کوئی ان کے حضور میں حاضر ہونا چاہتا ہے کہ اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ پہلے اجازت طلب کرے پھر بارگاہ میں حاضر ہو اس کی طرح جس کا قرآن پاک کی تلاوت کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے محبوب کے ساتھ مناجات کا شرف حاصل کرلوں، تو مناجات جیسی باریابی کے لیے اسے زبان کو پاک و صاف کرنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے کیونکہ فضول کلام کرنے اور کسی پر بہتان باندھنے سے زبان نجس ہوجاتی ہے پھر زبان کو اعوذ باللہ سے پاک کرکے تلاوت شروع کرتا ہے۔ (کیونکہ اس سے زبان پاک ہوجاتی ہے)

تفسیر صوفیانہ اہل معرفت فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ طالبینِ تقرب کا وسیلہ اور خائفین کی مضبوط رسی اور مجربین کی مسرت گاہ اور ہالکین کا مرجع اور محبین کی فرصت ہے۔یعنی خالقِ کائنات کے فرمان (جو کہ سورہ نحل میں ہے)

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (کہ جب تم قرآن پڑھو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو) کی تعمیل ہے)

مسئلہ: تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ اعوذ باللہ شریف قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔

سوال: نحویوں کا قانون ہے کہ جزا شرط کے بعد ہوتی ہے اور (آیت میں) فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ جزا ہے تو چاہیے تعوذ قرآن کی تلاوت کے بعد ہو۔

جواب: آیت اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ کا معنی اذا اردت القرأة ہے۔یعنی تم تلاوت کا ارادہ کرو تو پھر اعوذ باللہ پڑھو۔(گویا آیت مؤول ہے) اور یہ تاویل عام مشہور ہے۔اس تاویل کو حقیقیہ عرفیہ کا قائم مقام کہتے ہیں۔

ف: مختار قول جمہور کا ہے وہ یہ کہ اعوذ باللہ شریف کے الفاظ اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ہیں کیونکہ باعتبار روایت کے یہی الفاظ زیادہ مناسب ہیں۔حدیث شریف میں ہے:

اقرانیه جبریل عن القلم عن اللوح المحفوظ ۔یعنی مجھے جبریل علیہ السلام نے قلم اور لوحِ محفوظ سے اسی طرح نقل کر کے سنایا ہے۔

اگرچہ باعتبار روایت اور مامور بہ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کے مطابق استعیذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ہے۔

شان نزول سب سے پہلے جو چیز جبریل علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کے لئے لائے وہ یہی تعوذ اور بسم اللّٰہ شریف اور آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ہے۔

حل لغات: اعوذ بمعنی التجا ، یعنی پناہ چاہتا ہوں یا بمعنی استجیر یعنی امان چاہتا ہوں۔ یا بمعنی استعین یعنی امداد چاہتا ہوں۔ یا بمعنی استغیث یعنی فریاد چاہتا ہوں۔ عَوْذٌ عِيَاذٌ لَوْ ذٌ و لِيَا ذٌ اور صومٌ و صِيَامٌ کی طرح مصدر ہے۔

ف: تعوذ پڑھنے والے کا قول اعوذ باللّٰہ الخ ایک قسم کی خبر ہے جو دراصل وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کر رہا ہے۔گویا کہہ رہا ہے: اَعِذْنِيْ يَا رَبِّ اے میرے رب! مجھے پناہ دے دے۔

اور انشاء سے خبر کی طرف عدول کرنے میں تفاؤل بالوقوع (یعنی اچھی فال کے واقع ہونے) کا فائدہ حاصل ہوا۔ گویا پناہ مانگنا واقع ہو گیا اور یہ اسی کی خبر دے رہا ہے۔

نکتہ: تفسیر کبیر میں ہے اللہ تعالیٰ اور اس بندے کے مابین ایک وعدہ ہے۔جس کو اللہ نے وَاَوْفُوْا

بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (تم میرا وعدہ پورا کرو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا) میں بیان فرمایا ہے۔ پس گویا بندہ کہتا ہے اے میرے اللہ! میں باوجود نقص بشریت کے اپنا وعدہ عبودیت پورا کر رہا ہوں کہ اعوذ باللہ یا استغفر اللہ کا ورد کر رہا ہوں۔ پس اے کریم! آپ کے شایان شان ہے کہ اپنے عہد ربوبیت کو پورا فرمائیو اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیجیو۔

تفسیر عالمانہ بِاللّٰهِ اہل حق کا مذہب ہے کہ یہ لفظ (اللہ) کسی کلمہ سے مشتق نہیں۔ کیونکہ اس کی کُنہ میں ادراک عاجز ہے۔ اسی لئے علامہ تفتازانی تفسیر کشاف کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ جس طرح اس کی ذات وصفات میں وہم وادارک حیران ہیں اسی طرح اس کے لفظ میں بھی جو اس پر دلالت کرتا ہے کے ادراک میں بھی حیران ہیں کہ نہ معلوم وہ اسم ہے یا صفت، مشتق ہے یا غیر مشتق، علم ہے یا غیر علم۔ واللہ اعلم۔

حضرت مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:۔

ذات او را در تصور کنج کو | تا در آید در تصور مثل او

ترجمہ: اس کی ذات تصورات کے گوشوں میں نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مثل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ف: استعاذہ کے تین کلمات ہیں:۔ ۱۔صفاتیہ ۲۔افعالیہ ۳۔ذاتیہ

حضور سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کو اپنی اس دعا میں جمع فرمایا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرَضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَبِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْکَ۔

ترجمہ: اے اللہ! میں تیری رضا کی بدولت تیری ناراضگی سے اور تیری معافی کی بدولت تیری عقوبت سے اور تیری ذات کی بدولت تجھ سے پناہ چاہتا ہوں۔

تعوذ میں اسم جلالی کو لیا گیا ہے جو جامع ہے تاکہ استعاذہ کی عبارت اپنے جمیع انواع کو شامل ہو جائے۔

ف: تفسیر کبیر میں ہے کہ شرور یا اعتقادیات سے ہیں اور تعوذ میں جمیع مذاہب اور تمام گمراہ فرقوں کے (جو کہ بہتر ہیں) کے عقائد داخل ہو جاتے ہیں۔ یا اعمال بدنیہ سے۔ پھر اعمال بدنیہ بعض تو وہ ہیں جو دین کو نقصان پہنچانے والے ہیں جو دین میں رخنہ تو نہیں ڈالتے مگر ہیں تباہ کن، جیسے امراض، جمیع قسم کے درد، آگ وغیرہ کا جلانا، پانی وغیرہ میں ڈوبنا، مفلسی، اندھاپن، ہاتھ پاؤں کا شل ہونا اور دیگر جملہ بلائیں اور مہلک بیماریاں کہ جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ف: تعوذ تمام اقسام مذکورہ (شرور اعتقادیات، اعمال بدنیہ) کو شامل ہے۔ پس عاقل پر لازم ہے کہ جس وقت اعوذ باللہ شریف پڑھنے کا ارادہ کرے تو ان مذکورہ بالا آفتوں کے جمیع اقسام ثلاثہ اور جمیع اقسام متناولہ کو دل میں لائے اور پہلے بتایا جاچکا ہے کہ امراض کا شمار غیر ممکن ہے اور مخلوق کی قدرت کی بھی اس کے دفع کرنے کے لئے غیر مکتفی ہے تو چاہیے یوں عرض کرے۔

اَعُوْذُ بِا للّٰہِ الْقَادِرِ عَلٰی کُلِّ الْمَقْدُوْرَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْمَھَالِکِ وَالْاٰفَاتِ

(میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں، وہ اللہ جو تمام مقدورات پر قادر ہے، تمام خوفناک مقامات و جمیع آفات سے)

ف: بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علوم باری تعالیٰ نے چہار کتب ساویہ (توارۃ، انجیل، زبور، قرآن مجید) میں جمع فرمائے ہیں اور ان چہار کتب کا علم قرآن پاک میں اور قرآن کا علم سورۃ فاتحہ میں اور سورۃ فاتحہ کا علم بسم اللہ شریف میں اور بسم اللہ شریف کا علم بسم اللہ کی باء میں۔

نکتہ: تفسیر میں ہے کہ جمیع علوم کے بسم اللہ کی باء میں مجتمع ہونے میں یہ حکمت ہے کہ علم میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو اپنے مولا کا وصال نصیب ہوجائے اور بسم اللہ کی باء الصاق کی ہے اور اب معنی یہ ہوا کہ بسم اللہ کی باء بندہ کو اپنے مولا سے ملا رہی ہے۔ اس کے علاوہ باء کے متعلق نکتے ہیں جو بسم اللہ شریف کی تفسیر میں آئیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

مِنَ الشَّیْطٰنِ شیطان بمعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونے والا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب شیطان نے اپنے مالک کی نافرمانی کی تو مالک لم یزل نے اسے اپنی رحمت سے دور فرمایا۔ اسی نافرمانی کی وجہ سے شیطان ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اس نام سے بعد از لعنت موسوم ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے اس کا نام عزازیل یا نائل تھا۔

سوال: تعوذ میں مستعاذ منہ یعنی جس سے پناہ لی گئی ہے یعنی اس کے قبائح اور اس کے نقصانات مثلاً دھوکہ دینا، مکروفریب کرنا، بہکانا، وسوسہ ڈالنا، ناچاقی کرانا وغیرہ وغیرہ کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔

جواب: (مترجم) قانون ہے کہ جب مفعول کا ذکر نہ کیا جائے تو فعل عام ہوجاتا ہے۔ یہاں بھی مفعول کو حذف کیا گیا ہے تاکہ شیطان کی تمام برائیوں سے پناہ کا ارادہ ہو۔

ف: روضۃ الاخیار امام غزالی میں ہے کہ شیطان مذکر بھی ہے مؤنث بھی، بچہ بھی جنتے مگر مرتے نہیں بلکہ ہمیشہ رہیں گے (تا نفخ صور) اور جنات مذکر بھی ہیں اور مؤنث بھی۔ یہ بھی بچہ جنتے ہیں مگر ان پر موت آتی ہے اور فرشتے نہ مذکر ہیں نہ مؤنث، نہ بچے جنتے ہیں نہ کھاتے پیتے ہیں۔ اس سے جنات کی حقیقت اور ان کا وجود

ثابت ہوا اور جنات کے وجود کا سوائے فلسفیوں کی چھوٹی سی جماعت کے بعض جاہل افراد یا بعض اطباء وامثالہا (یعنی ان جیسے اور) کے اور کسی نے انکار نہیں کیا۔

حکایت: ۔محی السنۃ امام غزالی قدس سرہٗ (آپ ثقلین (جن وانس) کے مفتی اعظم تھے) نے ایک دن جنات سے دنیا کے کارناموں کے متعلق پوچھا انہوں نے عرض کی کہ زمخشری ایک کتاب تفسیر لکھ رہا ہے۔ جواب تک نصف حصہ تحریر کر چکا ہے۔ آپ نے فرمایا وہی تحریر کردہ کتاب (تفسیر) لے آئے آپ نے اس کو نقل کر کے واپس کر دیا۔ ایک روز زمخشری کو امام غزالی قدس سرہٗ کے حضور میں حاضری کا شرف ملا تو آپ نے وہی تفسیر زمخشری کو دکھلائی۔ زمخشری دیکھ کر متعجب ہوا اور عرض کی کہ اگر کہوں کہ یہ وہی تفسیر ہے تو پھر یہاں کیسے آئی! اگر کہوں کسی دوسرے کی ہے تو بھی عقل نہیں مانتی کیونکہ اس کے الفاظ ومعانی اور وضع وترتیب بعینہٖ میری کتاب جیسی ہے تو دو مصنفوں کا ایک ہی طرح کے الفاظ ومعانی، وضع وترتیب پر غائبانہ متفق ہو جانا محال ہے۔ امام غزالی نے فرمایا کہ یہ کتاب تیری تفسیر کی نقل ہے۔ ہم کو جنات کے ذریعہ پہنچی ہے۔ زمخشری قبل ازیں جنات کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ اس حیرت انگیز کرشمہ کو دیکھ کر اسی وقت جنات کے وجود کے قائل ہو گئے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جنات کو علم غیب حاصل ہے۔ مولا عزوجل بھی فرماتے ہیں: تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِى الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ یعنی جب سلیمان علیہ السلام زمین پر آئے جنوں کی حقیقت کھل گئی۔ (یعنی وہ غیب نہیں جانتے) اگر غیب جانتے ہوتے تو اس خواری کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔

ف: پھر ان کی حقیقت ان لوگوں کے نزدیک (جو جنات کو مجردات نہیں مانتے یہ ہے) جنات ہوائی اجسام ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ یہ ناری اجسام ہیں۔ یہ مختلف شکلوں میں متشکل ہونے پر قادر ہیں۔ مثلاً، بچھو، کتے، اونٹ، گائے، بکری، گھوڑے، خچر، گدھے اور انسان کی شکل اختیار کرنا بھی ان کے اختیار میں ہے۔ ان میں عقل بھی ہے اور فہم بھی اور بہت بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے محل اور تصویریں اور بڑے حوضوں کے برابر لگن اور لنگر دار دیگیں تیار کرتے تھے اور وہ لوگ جو ان کے مجردات کے قائل ہیں تو وہ ان کی دو اقسام مانتے ہیں۔

i۔ ارضیہ سفلیہ **ii۔ عالیہ**

ارضیہ سفلیہ: ۔ یہ اس لئے کہ مجردات یعنی وہ مجردات جو نہ متحیز ہیں اور کسی متحیز میں حلول کرنے والے ہیں۔

عالیہ: ۔ ان میں بعض وہ عالی ہیں جو اجسام کی تدبیر سے مقدس ہیں اور وہ ملائکہ مقربین ہیں جنہیں مشائین حضرات عقول سے تعبیر کرتے ہیں اور اشراقین صاحبان ان کا انوار عالیہ قاہرہ نام رکھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو

جسم کی تدبیر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو مشائین نفوس سماویہ اور اشراقین انوار مدبرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں ان سب سے برگزیدہ حاملین عرش ہیں جو اس وقت چار ہیں اور قیامت میں آٹھ ہو جائیں گے ان کے بعد وہ جو کہ عرش کے اردگرد کھڑے ہیں۔ پھر کرسی والوں کا درجہ، پھر ساتویں آسمان والوں کا، اسی طرح درجہ بدرجہ آسمانوں کے ملائکہ کا، مثلاً آسمانوں کے ملائکہ میں سب سے اہم درجہ ساتویں آسمانوں والوں کا، اسی طرح اول تک۔ پھر کرہ اثیر اور اس ہوا والوں کا، جو نسیم کی طبع رکھتی ہے۔ پھر کرہ زمہریر والوں کا، پھر پہاڑ والوں کا، پھر ارواح سفلیہ والوں کا، جو نباتات اور حیوانات کے اجسام میں تصرف کرنے والے ہیں اور یہی پچھلے بعض تو نورانی شکل کے ہوتے ہیں اور نہایت درجہ کے صالح ہوتے ہیں جن کو جنات صالحین کہا جاتا ہے اور بعض کالے رنگ اور شریر قسم کے ہوتے ہیں اور شیطان اسی پچھلی قسم سے ہیں۔ (کذافی التفسیر الفاتحہ للفناری) ظاہر یہ ہے کہ لفظ شیطان سے ابلیس اور اس کے خدماء مراد ہیں۔

تفسیر صوفیانہ جو بھی متکبر اور سرکش ہو، جو ذکر الٰہی سے روکے، وہ شیطان ہے، خواہ وہ جن ہو یا انسان۔ کماقال تعالیٰ: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (شیاطین اور انسان بھی ہوتے ہیں اور جن بھی)

تفسیر عالمانہ الرَّجِيْمِ بمعنی فرشتوں کے ہٹانے سے آسمانوں سے زمین کی طرف پھینکا ہوا اور آسمانوں کی چنگاریوں کا مارا ہوا۔ جب کہ وہ آسمانوں کی جانب جانے کا ارادہ کرتا ہے۔

یہ شیطان کی بہت بڑی مذموم صفت ہے۔ قرآن پاک میں شیطان کے اسماء بہت منحوس قسم کے گنے گئے ہیں اور اس کی صفتیں بہت مذموم طرز کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور یہ لفظ رجیم اس کی تمام برائیوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ جتنی عقوبات اس پر عائد ہوتی ہیں یہ لفظ ان سب کا جامع ہے۔ اسی لیے ابتداء میں اس کے اسماء صفات میں اسی لفظ الرَّجِيْمِ کو اختیار کیا گیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ استعاذہ میں فقط زبانی جمع خرچ نہ ہونا چاہئے بلکہ اس وقت حضور قلب کا ہونا نہایت ضروری ہے اور قول حال وفعل کے بالکل مطابق ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو کہہ رہا ہو اعوذ باللہ، مگر حال وفعل کا ورد اعوذ بالشیطان ہو۔

عارف کا استعاذہ: عارف رویت غیر اللہ اور حجاب کثرت سے پناہ سے مانگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان عارف کے نور سے دور بھاگتا ہے۔

حکایت: حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ابلیس کو خواب میں دیکھا تو اسے اپنے عصا سے مارنے کا ارادہ فرمایا شیطان نے عرض کی:۔ اے ابوسعید! میں عصا کی مار سے نہیں ڈرتا۔ ہاں آفتاب معرفت کی

شعاع سے ضرور کانپ جاتا ہوں۔یعنی وہ آفتاب معرفت جو قلب مبارک کے نورانی آسمان سے طلوع ہوتا ہے۔

سوال :۔ شیطان سے پناہ پناہ مانگنا غیر اللہ سے ڈرنا اور یہ عبودیت کے خلاف ہے۔

جواب :۔ دشمن کو دشمن سمجھنا بھی محبت کی نشانی اور غیر اللہ سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا بھی عبودیت کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں طاعت کے لئے تیار ہونا یونہی نصیب ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرتا ہے اس سے ڈرنا اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے جیسا کہ منقول ہے:

اَخَافُ مِنَ اللّٰہِ اللہ سے ڈرتا ہوں یعنی اس کے عذاب وغضب سے

اور منقول ہے: اَخَافُ مِمَّنْ لَا یَخَافُ اللّٰہُ اس سے ڈرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا۔یعنی اس کے برے افعال سے۔مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

آدمی را دشمن پنہاں بسیست آدمی با حذر عاقل کسیست

ترجمہ :۔ آدمی کے چھپے ہوئے دشمن بہت ہیں۔سمجھدار آدمی وہ ہے جو دشمن سے ڈرتا ہو۔

ف:۱۔تفسیر کبیر میں ہے کہ اعوذ باللہ پڑھنا مخلوق سے اعراض اور خالق کی طرف رجوع کرنا ہے اور حاجت کامل (جو نفس کو درپیش ہوتی ہے) سے روگردانی کر کے غنائے تام حقی کے ساتھ جمیع خیرات کے حصول کی طرف راغب ہونا اور اسی کی بدولت تمام بلیات کو دفع کرنا ہے۔یہی راز ہے۔ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ [1] میں اس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب بجز عجز کے حاصل نہیں ہوتا اور عجز سالک کا انتہائی مقام ہے۔

۲۔حضرت حسن فرماتے ہیں جس نے حقیقی طور پر پناہ مانگی،یعنی حضور قلب کے ساتھ،تو اللہ تعالیٰ اس کے اور شیطان کے درمیان تین سو پردے لٹکا دیتا ہے۔ہر پردہ کے مابین زمین آسمان کے درمیان جتنی مسافت ہوتی ہے۔

حدیث در حکایت شیطان خبیث :۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر نکلے تو وہاں ابلیس ملعون کھڑا تھا۔آپ نے فرمایا:۔اے کم بخت!کیا چیز تجھے مسجد کے قریب لائی ہے؟اس نے عرض کی:حضور!مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔آپ نے فرمایا:اللہ تعالیٰ نے تجھے میرے ہاں کیوں بھیجا؟شیطان نے عرض کی حضور!تا کہ آپ مجھ سے حسب منشاء کچھ پوچھیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ پہلے آپ نے اس سے نماز کے متعلق پوچھا،فرمایا کہ اے ملعون!میری امت کو نماز با جماعت سے کیوں روکتا ہے؟عرض کی:حضور!جس وقت آپ کا کوئی امتی نماز با جماعت کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو مجھے تپ محرقہ گھیر لیتا

[1]:۔ترجمہ:پس اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو۔ اویسی غفرلہ

ہے۔ جب تک وہ واپس نہیں ہوتا میں اس مرض میں مبتلا رہتا ہوں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ تو ان کو علم و دعا سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی: اس لئے کہ ان کی دعا سے اندھا اور بہرا ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس وقت شفا ہوتی ہے۔ جب وہ فراغت پاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ان کو قرآن پڑھنے سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی: قرأت سے میں قلعی کی طرح (آگ میں) پگھلتا رہتا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا: ان کو جہاد سے کیوں روکتا ہے جب کہ وہ جہاد کے لئے نکلنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ عرض کی: جب وہ جہاد کے لئے نکلتے ہیں تو اس وقت میرے قدموں میں زنجیر ڈالے جاتے ہیں یہاں تک کہ واپس نہ لوٹیں، اسی طرح جب وہ حج کو جاتے ہیں تو ان کی واپسی تک میرے گلے میں طوق اور پاؤں میں زنجیر ڈالے جاتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ صدقہ کا ارادہ کرتے ہیں تو میرے سر پر کلہاڑے چلتے ہیں جو مجھے ایسے کاٹتے ہیں جیسے لکڑیوں کو کاٹا جاتا ہے۔

روحانی نسخہ: ۱۔ شیطان بنی آدم کی طبعیتوں پر کھانے پینے کی وجہ سے مسلط کیا گیا۔ جب بنی آدم کھانے پینے کو خیر باد کہہ دے تو پیٹ اور فرج کی شہوت کی بیخ کنی ہوگی۔ بعد ازاں شیطان کی مداخلت (یعنی گمراہ کرنا) بھی۔

۲۔ نفس کی اصلاح کا سبب یہی پانچ نمازیں ہیں کہ کیونکہ ان کی فرضیت بھی اصلاح نفس کے لئے ہے، اس لئے کہ نماز میں تین طرح کی عاجزی ہے۔

i۔ بہت بڑے بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔ ii۔ رکوع کر کے عاجزی ظاہر کرنا۔

iii۔ سجدہ کر کے اظہار عجز کرنا اور نفس بھی خشوع و خضوع اور عاجزی سے اصلاح پذیر ہوتا ہے۔

حکایت: ۔ حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں: ۔ کہ جب سیدنا نوح علی نبینا علیہ السلام کشتی سے (بعد از طوفان) باہر تو ابلیس ملعون حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: اے بد بخت! یہ بتا کہ بنی آدم کے کون سے عادات تجھے اور تیرے لشکر کو گمراہ اور ہلاک کرنے میں معاونت کرتے ہیں؟ ابلیس ملعون نے جواب دیا کہ جب ہم بنی آدم کو کنجوس، بخیل، بدخواہ، سرکش اور جلد باز پاتے ہیں تو ہم گھڑی کی طرح اسے جھپٹ لیتے ہیں جب کسی انسان میں یہ تمام مذکورہ عادات جمع ہوتی ہیں تو ہم اس کا شیطان مرید (سرکش) نام رکھتے ہیں۔

اعجوبہ: ۔ حدیث شریف میں ہے کہ ابلیس ملعون کے سامنے ہر روز دنیا پیش ہوتی ہے۔ پھر یہ کم بخت اعلان کرتا ہوا کہتا ہے۔ کہ کوئی ہے جو مجھ سے وہ چیز خریدے جس میں اس کا نقصان اور پریشانی ہو۔ تو دنیا دار لوگ یہ منادی سن کر کہتے ہیں کہ اس کے خریدار ہم ہیں۔ شیطان انہیں سمجھاتا ہوا کہتا ہے: بھائیو! اتنی جلدی نہ کرو، ذرا سوچ لو، یہ تو بڑی عیب دار تجارت ہے۔ دنیا دار کہتے ہیں کوئی بات نہیں ہم اسے ضرور خریدیں گے۔ شیطان کہتا ہے اس کا ثمن نہ دار ہم ہیں نہ دنانیر بلکہ اس کا ثمن تمہارا وہ نیک نصیبہ ہے جو تمہیں بہشت سے عطا ہوگا۔ میں تم

سے تمہارے نصیبہ کو چار چیزیں دے کر خرید تا ہوں:

i۔اللہ تعالیٰ کی لعنت ii۔اس کا غضب iii۔اس کا عذاب iv۔اس کی دوستی سے انقطاع

یہ اشیاء دے کر میں تم سے بہشت خریدوں گا دنیادار سن کر کہتے ہیں۔بسر وچشم۔یعنی ہیں یہ سودا منافع میں ہے۔ پھر شیطان کہتا ہے کہ میری خواہش ہے کہ مجھے ثمن کچھ بڑھا دو(کیونکہ مجھے تجارت میں نقصان معلوم ہوتا ہے) وہ اس طرح کہ اپنے قلوب پر ان اشیاء کا ایسا گھر نہ بناؤ اور پکا ارادہ کرلو کہ اس سے تم ہرگز نہ ہٹو گے۔دنیا دار کہتے ہیں ہم پہلے ہی عزم بالجزم کر چکے ہیں۔یہ کہہ کر دنیادار دنیا لے لیتے ہیں۔شیطان ہنس کر کہتا ہے:

بِئْسَتِ التِّجَارَةُ (یہ بہت بری تجارت ہے)

حافظ شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مجو درستی عہد از جہاں سست نہاد کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد ست

ترجمہ:۔اس جہان کمزور طبیعت سے وفا کی امید نہ رکھو اس لئے کہ اس بڑھیا نامراد کے ہزاروں داماد ہیں۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

بر مرد ہشیار دنیا خسیست کہ ہر مدتے جائے دیگر کسیست

منہ بر جہاں دل کہ بیگانہ ایست کہ مطرب کہ ہر روز در خانہ ایست

نہ لائق بود عشق با دلبرے چو ہر بامدادش بود شوہرے

ترجمہ:۔ ہوشیار مرد کے نزدیک دنیا کوئی شئے نہیں کیونکہ ہر آن اس کی جگہ بدلتی رہتی ہے۔

جہان دنیا سے دل نہ لگا کیونکہ یہ جہان بیگانہ ہے، جیسے کہ سرود بجانے والا ہر روز نئے گھر میں ہوتا ہے۔

اس محبوب سے دل لگانا اچھا نہیں جو ہر صبح نیا شوہر انیتا کے

حدیث شریف: حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے شیطان کے وسوسہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: چور اس گھر میں داخل نہیں ہوتا جس میں کوئی شئے نہ ہو۔یہ وسوسہ تو ایمان کی وجہ سے ہوتا ہے۔

فرمان علی:۔سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ہماری نماز اور کتاب کی نماز میں فرق صرف وسوسہ کی وجہ سے ہے کیونکہ شیطان کفار کے عمل سے تو فارغ ہو چکا ہے۔کفار کا ہر فعل اس کی مرضی کے موافق ہوتا ہے اور مومن چونکہ اس کی مخالفت اور اس کے ساتھ مجادلہ کرتے ہیں تو وہ بھی ان سے مقابلہ کرتا ہے۔یعنی ان کے دلوں میں وسوسہ ڈال کر ان کی مخالفت کرتا ہے۔

حکایت:۔ایک شخص خراسان سے عراق جاتا رہتا تھا اور ہر ایک دفعہ ایک مولوی صاحب کی خدمت میں

حاضری دیتا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے رفتہ رفتہ علم و حکمت کی چار ہزار احادیث یاد کرادیں۔ واپس وطن جانے کے لئے اپنے استاد صاحب سے اجازت طلب کی۔ استاد صاحب نے فرمایا:۔ میں تجھے ایک ایسا کلمہ نہ سکھادوں جو ان احادیث سے بھی زیادہ مفید ہو؟ عرض کیا: ہاں جی، ضرور سکھایئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا: تمہارے خراسان میں شیطان بھی ہے؟ عرض کیا: ہاں جی فرمایا: کیا وسوسہ بھی ڈالتا ہے؟ عرض کیا: ہاں جی۔ فرمایا: تو پھر تم اس کے دفعیہ کے لئے کیا کرتے ہو؟ عرض کیا: اسے ہٹاتے ہیں۔ فرمایا: اگر پھر وسوسہ ڈالے تو؟ عرض کیا: پھر اسے دفع کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا: جب یہ خدا کا دشمن تمہیں تکلیف دے اور عبادت سے روکے تو تم اس کے وسوسہ کے روکنے کے درپے نہ ہو بلکہ ایسے ہو جاؤ جیسے چرواہے کے کتے کے ساتھ کوئی اجنبی آدمی ہوتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو کیونکہ وہ منجملہ کتوں کے ایک کتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے مکر و شر سے بچائے۔ آمین۔

تفسیر عالمانہ

بِسْمِ اللّٰہِ کے نام کے ساتھ۔

مسئلہ:۔ زیادہ صحیح اور مقبول قول متاخرین احناف رحمھم اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ بسم اللہ شریف ایک آیت ہے مگر کسی سورت کا جز نہیں۔ محض سورتوں کے فرق بتانے کے لئے نازل ہوئی ہے ہر کام شروع کرتے وقت اس سے تبرک لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کے ذکر سے تبرک حاصل کیا جاتا ہے۔

ف:۔ ۱۔ بسم اللہ شریف قرآن پاک کی کنجی ہے۔ ۲۔ یہ وہ پہلا کلمہ ہے جو سیدنا آدم علیہ السلام پر نازل ہوا۔

شان نزول: کفار کی عادت تھی کہ ہر کام شروع کرتے وقت اپنے بتوں کے نام لیتے تھے۔ یعنی **بسم اللات والعزّٰی** کہتے۔ پس مومن اہل توحید پر لازم ہوا کہ اپنا ہر کام شروع کرنے سے پہلے **اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک** زبان پر لائے تاکہ اللہ تعالیٰ کا نام مقدس رہے اور فعل مؤخر۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں **فعل مؤخر کر کے محذوف** مانا جاتا ہے۔ یعنی اصل عبارت **بسم اللہ اقراہ یا اتلوا وغیرہ تھی۔**

تفسیر صوفیانہ

مفسرین فرماتے ہیں کہ **جمیع علوم بسم اللہ کی باء میں امانت رکھے گئے ہیں۔ گویا بسم اللہ شریف کا اصل معنی یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے**:۔ **جو کچھ تھا مجھ سے تھا اور جو کچھ ہوگا مجھ سے ہوگا** اور تمام عالم کا ہونا میرے توسط سے ہے اور میرے سوا کسی دوسرے کا وجود نہیں، اگر ہے تو مجازی واہمی۔ یہی مطلب ہے صوفیاء کرام کے اس قول کا، جو فرماتے ہیں میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ جس میں **اللہ تعالیٰ کا جلوہ نہ ہو۔**

حدیث شریف:۔ اور یہی مقصد ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس **حدیث شریف کا فرماتے ہیں**:۔

''دہر کو گالی مت دو، کیونکہ دہر تو اللہ تعالیٰ ہے''

سوال :۔ کیا وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی ابتدا میں جمیع حروف میں سے بأ کو اختیار فرمایا، نہ الف سے بلکہ بسم اللہ شریف میں ہے تو الف کو حذف کر کے بأ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

جواب :۔ اس میں دس حکمتیں ہیں۔

☆......الف میں بلندی، تکبر، تطاول اور بأ میں عجز، تواضع، انکساری ہے۔ پس بمطابق قاعدہ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ بأ الف سے رتبہ میں بڑھ گئی۔

☆......بأ الصاق کے لئے آتی ہے (جس کا معنی ملنا، ملانا ہے) بخلاف اکثر حروف، بالخصوص الف کے کہ وہ حرف قطع سے ہیں (جس کا معنی جدائی ہے)

☆......بأ ہمیشہ مسکور پڑھی جاتی ہے جب کہ اس کے ظاہر و باطن میں عجز و انکسار پایا گیا ہے۔ پس اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عندیت یعنی قرب کا درجہ نصیب ہوا۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں ان قلوب کے قریب ہوں جو میری خاطر ہمیشہ عجز و انکساری میں رہتے ہیں۔

☆......بأ میں بظاہر عجز و انکسار، مگر بہ باطن اس میں بلندی درجات وعلو ہمت ہے اور یہ صفات صدیقین کے ہیں۔ یہ صفات الف میں نہیں ہیں۔ بلندی درجہ تو یہ کہ اس میں نقطہ ہے اور الف میں نہیں اور بلندی ہمت یہ کہ اس کو بہت سے نقطے پیش کیے گئے تو اس نے سوائے ایک کے باقی کو قبول نہیں فرمایا تا کہ اس کا حال اس عاشق صادق جیسا ہو جائے جو صرف ایک محبوب کی طلب رکھتا ہے۔

☆......بأ میں قربت حق کی طلب صادق ہے کیونکہ جب اسے نقطہ ملا تو کو اپنے قدموں میں پھینک دیا اور نقطہ ملنے سے ناز اں بھی نہیں ہوئی۔ جیم اور یا میں یہ بات نہیں اس لیے ان کے نقطے ان کے نیچے نہیں بلکہ باعتبار وضع حروف کے وسط میں ہیں۔ ان کو دوسرے حروف سے ملانے سے ان کے نقطے نیچے ہو جاتے ہیں۔ مگر اس وقت نقطوں کا نیچے ہونا اس لیے ہے کہ جیم کو خأ سے اور یأ کو تأ سے مشابہت نہ ہو جائے بخلاف بأ کے کہ اس کا نقطہ ہمیشہ اس کے نیچے ہوتا ہے خواہ وہ تنہا ہو یا کسی دوسرے حرف سے ملی ہوئی ہو۔

☆......الف حرف علت ہے بخلاف بأ کے۔

☆......بأ باعتبارِ معنی حرف تام اور متبوع ہے اگر چہ باعتبارِ ظاہر کے تابع ہو کر آئی ہے (یعنی حروف کی وضع کے وقت الف کے بعد میں واقع ہوئی ہے اور معنی کے لحاظ سے الف بأ کے تابع ہوا کرتا ہے بخلاف بأ کے کہ وہ الف کے تابع ہو کر نہیں آئی اور جو چیز معنوی اعتبار سے متبوع ہو وہ اقوی ہوتی ہے)

☆......باً حرف عامل اور متصرف اپنے غیر میں ہے۔اسی وجہ سے یہ صاحب قدرت ہے بدیں وجہ ابتداء کے لائق ہوئی بخلاف الف کے وہ عامل نہیں۔

☆......باً اپنے نفسی صفات کے اعتبار سے حرف کامل ہے بایں طور کہ الصاق واستعانت واضافت کے لئے آتی ہے۔دوسری بات اس میں یہ ہے کہ اپنے غیر کو مکمل کرتی ہے۔یعنی اپنے مدخول کو مجرور کرتی ہے اور اسے مکسور بمعنی متواضع بناتی ہے۔ایسا متواضع کہ اپنے صفات اس میں پہنچاتی ہے اسے یہی بلند درجہ اور قدرت حاصل ہے کہ اپنے غیر میں توحید وارشاد کی تکمیل کراتی ہے۔اسی تقریر کے موافق سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا ارشاد ہے کہ میں وہ نقطہ ہوں جو باً کے نیچے ہے۔پس باً کو **ارشاد و دلالۃ علی التوحید** کا مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔

☆......باً حرف شفوی ہے اس کے پڑھنے سے جتنے ہونٹ کھلتے ہیں کسی دوسرے حرف شفوی میں نہیں کھلتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے عالم ارواح میں اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں بَلٰی بولتے وقت پہلے باً سے اپنا منہ کھولا تھا۔پس یہی پہلا حرف ہے جو انسان نے بولا اور اسی سے منہ کھولا (یہ خصوصیات باً کی ہیں) اسی وجہ سے حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ اس کو باقی حروف سے چن لے۔لہٰذا تمام حروف سے اس کو چنا اور اس کی قدر ومنزلت تمام حروف سے بلند فرمائی اور اس کے برہان کو ظاہر کیا اور اس کو کلام وکتاب وخطاب کا مفتح ومبتداء بنایا۔ **(کذافی التاویلات النجمیہ)**

اسم اللہ وہ ہے جو باعتبار ذات یا کسی صفت صفات سلبیہ میں جیسے قدوس (یہ صفت سلبیہ ہے) یا باعتبار کسی صفت صفات ثبوتیہ میں سے جیسے علیم (یہ صفت ثبوتیہ ہے) یا باعتبار کسی فعل اس کے افعال سے جیسے خالق کے اس پر اطلاق کرنا صحیح ہو۔لیکن اس کے اسماء بعض علماء کے نزدیک توقیفیہ ہیں۔ **(شرح المشارق لابن الملک)**

ف : مختار یہ ہے کہ لفظ اسم اعظم ہے۔

سوال :۔ اسم اعظم تو وہ ہے کہ جس کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے جو کچھ طلب کیا جائے وہ عطا فرمادے۔ہم تو اس کے وسیلہ سے بہت کچھ مانگتے ہیں مگر اکثر اوقات محروم رہتے ہیں۔

جواب :۔ دعا کے لئے چند آداب سب سے پہلے باطن کی اصلاح لقمہ اجل حلال سے کی جائے۔جیسا کہ اس کے حق میں کہا گیا ہے: دعا آسمان کی کنجی ہے مگر اس کے دندانے لقمہ اجل ہے۔سب سے آخری شرط اخلاص وحضور قلب ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اللہ کو پکارو نرے اس کے بندے ہو کر)

کیونکہ انسان کا فقط زبان کو متحرک کرنا اور فقط منہ سے آواز نکالنا، جس نکالنا، جس میں حضور قلب نہ ہو۔ دروازے پر ٹھہرنے والے کی طرح محض واویلا کرنا اور چھت پر چڑھ کر کسان کے آواز دینے کی مانند ہے۔ بہر حال قلب حاضر ہو تو حضوری قلب مالک کی بارگاہ میں دعا مانگنے والے کے لئے سفارش کرے گی۔

تحقیق اسم اعظم: ۔حضرت شیخ مؤید الدین جندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں وہ اسم اعظم کہ جس کا ذکر مشہور ہو گیا ہے اور جس کی خبر چار سو پھیل گئی ہے اور جس کا چھپانا لازم اور ظاہر کرنا حرام ہے وہ حقیقۃً ومعنیً عالمِ حقائق و معانی سے ہے اور صورۃً ولفظاً عالم صورت والفاظ سے ہے۔ جمیع حقائق کمالیہ سب کی سب احادیث کا نام حقیقت ہے اور اس کا معنی وہ انسان کامل ہے جو ہر زمانہ میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ قطب الاقطاب جو امانت الٰہیہ کا حامل اور اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے اور اسم اعظم کی صورت ولی کامل کی ظاہری صورت کا نام ہے۔

ف: اسم اعظم کا علم سابقہ امم پر حرام کر دیا گیا تھا جب تک کہ حقیقت انسانیہ کا اپنی اکمل صورت میں ظہور نہ ہوا، بلکہ اس کا ظہور اس زمانہ کے کامل کی قابلیت پر موقوف تھا۔ جس اسم اعظم کا معنی اور اس کی صورت رسول پاک صاحبِ تاج لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مقدس سے پایا گیا تو محض اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ وسلم کے صدقے اسم اعظم کا علم مباح فرما دیا۔

اَلرَّحْمٰنِ رحمت لغت میں رقت یعنی نرمی قلب اور انعطاف یعنی کسی پر مہربانی کرنے کہتے ہیں۔ اسی لیے بچہ دانی کو رحم کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مافیہا پر مہربان ہوتی ہے۔ یہاں فضل واحسان مراد ہے یا بہ نسبت ہمارے سبب بول کر مسبب قریب یا بعید مراد لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء باعتبارِ نتائج لیے جاتے ہیں اور وہ غایات ونتائج افعال ہیں۔ باعتبار مبادی کے اور وہ مبادی انفعلات ہیں اور ذات باری تعالیٰ انفعال سے مبرا ہے۔ پس معنی یہ ہوا کہ وہ اپنی مخلوق پر مہربان فرمانے والا ہے ان کو رزق دینے سے یا ان سے بلیات کو دفع کرنے سے، نہ تو متقی کا رزق بوجہ تقویٰ بڑھاتا ہے نہ اور نہ مجرم کے جرم کو دیکھ کر اس کے رزق میں کمی کرتا ہے بلکہ ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق رزق دیتا ہے۔ **الرَّحِیْم** وہ رحم کرنے والا ہے جس سے سوال کیا جائے تو عنایت کر دے اور جس سے طلب نہ کیا جائے تو غصہ کرے بخلاف بنی آدم کے کہ وہ سوال کیے جانے پر غضب ناک ہوتے ہیں۔

رحمت اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات میں سے ہے اس لیے کہ رحمت بمعنی غیر پر ارادہ خیر کرنا اور اس سے دفع شر کرنا اور ارادہ ذات کی صفت ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اس صفت سے موصوف نہ ہوتا تو جمیع موجودات کو پیدا نہ کرتا۔

پس جب اس نے جمیع مخلوق کو پیدا فرمایا تو ہمیں پتا چلا کہ رحمت اس کی ذاتی صفت ہے کیونکہ خلق بمعنی مخلوق کو وجود کی خیر پہنچانا اور ان کو عدم کے شر سے بچانا اور وجود سب کا بہتر ہے۔

ف: حضرت فرماتے ہیں کہ رحمت صفات الٰہیہ کی ایک صفت ہے اور رحمت ایک حقیقت ہے لیکن دو قسم پر ہے۔

i۔ذاتی ii۔صفاتی

اور اسمائے ذاتی وصفاتی کا تقاضا بھی یہی ہے (کہ رحمت دو قسم ہو) پھر ان دونوں کی دو دو قسمیں ہیں، عام وخاص۔اس اعتبار سے رحمت چار قسم ہوئی۔پھر ان کے کئی انواع ہیں جن کا مجموعہ ایک سو تک پہنچتا ہے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔اللہ تعالیٰ کی ایک سو رحمتیں ہیں۔ان میں سے صرف ایک رحمت تمام اہل دنیا کو عطا فرمائی اور ننانوے آخرت میں اپنے بندوں پر رحم فرمانے کے لئے مخفی رکھی ہیں۔

ف: رحمت عام وخاص ذاتی وہ ہیں کہ جن کا ذکر بسم اللہ شریف کے لفظ رحمٰن ورحیم سے ہوا ہے۔ان میں سے رحمت رحمانیہ عام ہے اس لئے کہ وہ تمام اشیاء کو علما وعینا شامل ہوتی ہے اور رحمت رحیمیہ خاص ہے۔کیونکہ یہ اس رحمت عامہ کی تفصیل ہے جو ہر ایک عین کی تعیین (جو استعداد خاص کے ساتھ فیض اقدس کے حصول کے لئے ہوتی ہے) کی موجب ہے اور رحمت عام وخاص صفاتیہ وہ ہے جو فاتحہ شریف کے رحمٰن ورحیم میں ہے۔ان میں رحمت رحمانیہ عام ہے کیونکہ یہ ان فیوضات (رحمت عامہ ذاتیہ سے وجود عام علمی پر ہوئے) پر مرتب ہے اور دوسری رحمت خاصہ ہے اور اس کی تخصیص اس استعداد اصلی کے مطابق ہے جو ہر ایک عین میں پائی جاتی ہے اور یہ دونوں رحمتیں (صفاتیہ جو فاتحہ کے رحمٰن ورحیم میں ہیں) رحمت ذاتیہ عامہ وخاصہ ہیں۔

فضائل بسم اللہ شریف ☆......بعض روایات سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین ہزار اسماء ہیں۔ایک ہزار کو سوائے ملائکہ کے کوئی نہیں جانتا اور ایک ہزار سوائے انبیاء علیہم السلام کے کسی کو معلوم نہیں اور تین سو تورات میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھا ہے۔پس ان تین ہزار اسماء کا معنی ان تین اسماء اللہ، رحمٰن اور رحیم میں ہے۔جس نے ان تینوں کو جانا یا ان کو پڑھا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے تمام اسماء کے ساتھ یاد کیا۔

☆......حدیث شریف میں ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب مجھے معراج ہوئی تو تمام بہشتیں میرے پیش کی گئیں تو ان میں میں نے چار نہریں دیکھیں۔

i۔پانی کی ii۔دودھ کی iii۔شراب کی iv۔شہد کی

میں نے جبرائیل سے نہروں کے متعلق پوچھا کہ یہ نہریں کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں؟ جبرائیل نے کہا: حضور! جاتی تو حوض کوثر میں ہیں اور یہ مجھے معلوم نہیں کہ آتی کہاں سے ہیں، آپ اپنے رب سے پوچھئے، وہ آپ کو بتائے گا یا دکھادے گا۔حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے التجا کی۔

رب تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ حاضر ہوا، تحفہ سلام پیش کر کے عرض کی: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آنکھیں بند کیجئے میں نے آنکھیں بند کیں۔ پھر عرض کی آنکھیں کھولئے۔ میں نے دیکھا تو مجھے ایک درخت نظر آیا جو مجھے سفید موتی کا ایک قبہ معلوم ہوا۔ اس کا ایک مقفل دروازہ سونے کا تھا اور وہ اتنا وسیع تھا کہ اگر دنیا کے جن وانسان جمع ہو کر اس پر بیٹھیں تو ایسے معلوم ہوں گے جیسے پہاڑ پر ندے بیٹھے ہوں۔ پس میں نے ان نہروں کو دیکھا کہ وہ اس قبہ کے نیچے سے آرہی ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں واپس ہونے لگا۔ فرشتے نے عرض کی: حضور! اس قبہ کے اندر داخل کیوں نہیں ہوتے؟ میں نے کہا: اس میں دخول کیسے ہو، اس پر تو تالا لگا ہوا ہے اور کنجی بھی نہیں ہے۔ اس نے عرض کی: اس کنجی تو بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ پس میں نے تالا کے قریب بسم اللہ شریف پڑھی۔ بجز د بسم اللہ شریف کے میم سے اور دودھ کی اللہ کی ہاَ سے اور شراب کی رحمٰن کے میم سے اور شہد کی رحیم سے اب مجھے معلوم ہوا کہ چار نہروں کا منبع بسم اللہ شریف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم)! جو شخص تیری امت میں ریاَ سے پاک ہو کر خالص نیت سے مجھ کو ان اسماَ سے یاد کرے گا اور کہے گا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو میں اسے چار نہروں سے پانی پلاؤں گا''

☆......حدیث شریف میں ہے۔ وہ دعا مردود نہیں ہوتی جس کے اول میں بسم اللہ شریف ہو۔

☆......حدیث شریف میں ہے کہ: جس نے وہ کاغذ کہ جس پر بسم اللہ شریف لکھی ہو اس کی تعظیم وتکریم اور اللہ تعالیٰ کے نام کی بزرگی کو دیکھ کر گرد وغبار اور کیچڑ وغیرہ سے زمین سے اٹھایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا صدیقین جیسا درجہ ہوگا اور اس کے والدین سے عذاب کی تخفیف کی جائے گی اگرچہ وہ مشرک ہی ہوں۔

☆......احمد بونی لطائف الاشارات میں تحریر فرماتے ہیں کہ شجر وجود بسم اللہ شریف سے متفرع ہوا اور تمام عالم اس کے سبب سے قائم ہے۔ باعتبار اجمال وتفصیل کے یہی وجہ ہے جو شخص اس کا ورد کرتا ہے عالم علوی وسفلی میں اس کی ہیبت چھا جاتی ہے۔

حکایت:۔ ☆......روم کے بادشاہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی طرف عریضہ بھیجا کہ کہ مجھے سر میں ایسا درد ہے کہ اس کے علاج سے اطباء عاجز آگئے ہیں اگر آپ کے پاس کوئی دوا موجود ہے تو ارسال فرمایئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے ایک ٹوپی بھجوائی۔ جب شاہ روم اس کو اپنے سر پر رکھتا تو اس کا درد تھم جاتا جب اسے اتارتا تو درد سر شروع ہو جاتا۔ بڑا متعجب ہوا ٹوپی کو کھولا تو اس میں ایک کاغذ رکھا ہوا پایا جس پر مرقوم تھا۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

☆......شیخ اکبر قدس سرہ العزیز فتوحات میں فرماتے ہیں کہ جب سورت فاتحہ پڑھی جائے تو بسم اللہ شریف کو

اس کے ساتھ ملا کر ایک دم پڑھنی چاہئے فصل درمیان میں ہرگز نہ ہو۔

☆......حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر حضرت جبرائیل سے روایت کرتے ہیں وہ قسم کھا کر حضرت میکائیل سے اور وہ قسم کھا کر حضرت اسرافیل سے اور وہ قسم کھا کر اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے (اسرافیل کو) فرمایا اے اسرافیل! مجھے اپنی عزت وجلالت اور سخاوت کی قسم ہے جس نے ایک بار بسم اللہ شریف کو الحمد شریف کے ساتھ ملا کر پڑھا تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اسے بخش دیا، اس کی تمام نیکیاں قبول فرمائیں اور اس کے گناہ معاف کردیے اور اس کی زبان کو ہرگز نہ جلاؤں گا اور اس کو عذابِ قبر، عذابِ نار، عذابِ قیامت اور بڑے خوف سے نجات دوں گا اور وہ تمام انبیاء واولیاء سے پہلے میرے حضور میں پہنچے گا۔

(واللہ اعلم)

سورة فاتحة الكتاب

اسماء سورة فاتحه مع وجه تسميه

☆......اس کو فاتحہ اس لیے کہتے کہ مصاحف وتعلیم وتلاوتِ قرآن اور نماز کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ یا اس لیے کہ حمد سے ہر کلام کی ابتدا ہوتی ہے۔ یا اس لیے کہ تمام سورتوں سے پہلے نازل ہوئی۔ یا اس لیے کہ لوح محفوظ پر پہلے اسی کو لکھا گیا۔ یا اس لیے کہ دنیا میں ابواب مقاصد کا افتتاح اور آخرت میں عذاب جنان کی ابتداء اسی سے ہے۔ یا اس وجہ سے کہ کتاب اللہ کے ابواب خزائن، اسرار کے کھلنے کا وسیلہ یہی سورت ہے۔ کیونکہ یہ سورت لطائفِ خطاب کے خزانوں کی کنجی ہے۔ یا اس لیے کہ اس کے جلا سے اہل بیان پر قرآن پاک کے مطالب منکشف ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جس نے اس کے معانی سمجھ لیے اس پر متشابہات کے تالے کھل جاتے ہیں اور اس کی نورانیت سے آیات کے انوار کا اقتباس کیا جاتا ہے۔

☆......اس کا نام ام القرآن بھی ہے اور ام شے کے اصل کو کہتے ہیں اور یہ سورت ام القرآن اس لیے ہے کہ قرآن پاک سے چار چیزیں مقصود ہوتی ہیں۔

۱۔الوہیت کا اقرار ۲۔نبوت کا اقرار ۳،۴۔قضاء وقدر کا منجانب اللہ سمجھنا

پس اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الوہیت پر دلالت کرتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یوم آخرت پر اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ جبر وقدر کی نفی کرتا ہے اور قضائے الٰہی کو ثابت کرتا ہے۔

☆......اس کو سبع مثانی بھی کہتے ہیں اس لیے کہ اس کی سات آیات ہیں یا اس لیے کہ اس کی ہر آیت قرآن پاک کے ساتویں حصہ کے برابر ہے یا جس نے اس سورت کو پڑھا گویا اس نے سارے قرآن کر پڑھ لیا یا اس

لیے کہ جس نے ان سات آیات کو پڑھا اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہو گئے۔ یہ سبع کے وجوہ تھے۔ مثانی اس کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ نماز میں دو بار پڑھی جاتی ہے یا مثانی سے مراد یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ ہر رکعت میں حقیقۃً یا حکماً دوسری سورت ہوتی ہے یا اس لیے کہ اس کا نزول دو بار ہوا، پہلی بار مکہ معظمہ میں، دوسری بار مدینہ طیبہ میں۔

☆......اس کا نام سورۃ الصلوۃ ☆......سورۃ الشفاء ☆......الشافیہ ☆......اساس القرآن

☆......الکافیہ ☆......الوافیہ ☆......سورۃ الحمد ☆......سورۃ السوال ☆......سورۃ الشکر

☆......سورۃ الدعا بھی رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اس سورت میں پائی جاتی ہیں۔

☆......اس کو سورۃ الکنز بھی کہتے ہیں۔ حدیث قدسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔[1]

تفسیر عالمانہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَلْحَمْدُ میں لام عہد کی ہے۔ یعنی الحمد بمعنی حمد کامل اور کامل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد خود فرمائی یا وہ ج وانبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے نکلی، یا وہ جو اولیاء ایزدتعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔ یا لام عموم استغراق کے لئے ہے۔ اب الحمد بمعنی جمیع محامد واثنیہ محمود (اصلی) اور ممدوح ماؤل اور معبود حق کے لئے، خواہ حامد عینی ہوں یا عرضی، فرشتوں سے ہوں یا آدمیوں سے یا ان کے غیر سے۔ **کما قال اللّٰہ تعالیٰ۔**

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ مخلوق میں کوئی ایسی شے نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد نہ کرتی ہو۔

تفسیر صوفیانہ صوفیہ کے نزدیک حمد محمود کے کمال ظاہر کرنے کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کا کمال اس کے صفات وافعال اور اس کے آثار ہیں۔ شیخ داؤد قیصری فرماتے ہیں کہ حمد تین قسم ہے۔

۱۔ قولی ۲۔ فعلی ۳۔ حالی

حمد قولی :. زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا، جیسا کہ اس نے اپنی حمد انبیاء علیہم السلام سے کرائی ہے۔

حمد فعلی :. وہ ہے جو اعمال بدنیہ سے ادا کی جائے، خواہ عبادات خیرات سے۔ جس میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس بارگاہ تک پہنچنا مقصود ہو کیونکہ جیسے انسان کو حمد کا زبان سے ادا کرنا لازم ہے اسی طرح ہر عضو کے

[1] اس سورت کے باقی اسماء فقیر کی کتاب "احسن التفسیر" میں ہیں ۱۲ اویسی

مطابق حمد کی ادائیگی ضروری ہے بلکہ اس کے ہر عضو پر حمد کی ادائیگی ایسے لازم ہے جیسے شکر کی ادائیگی ہر عضو پر بلکہ انسان اپنے ہر حال میں حمد کی ادائیگی کا ورد رکھے۔ **کما قال انبیاء علیھم السلام۔**

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد ضروری ہے۔

اور ہر عضو کا حمد بجالانا ناممکن ہے بجز اس کے کہ اپنے ہر عضو کو جس کام کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی عبادت اور تعمیل سمجھ کر وہ مشروع میں استعمال نہ کرے۔ نہ تو اس میں نفس کی لذت کو دخل ہو اور نہ اس کی خوشنودی مقصود ہو۔

حمد حالی :۔ وہ ہے جو روح وقلب سے ادا کی جائے یعنی روح وقلب کا کمالات علمیہ وعملیہ سے موصوف ہونا اور متخلق باخلاق ہونا وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو انبیاء علیھم السلام نے فرمایا کہ وہ ایسے متخلق باخلاق اللہ ہوں کہ کمالات ان کے نفوس وذات کا ملکہ بن جائیں اور دراصل یہ وہی حمد ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقام تفصیلی میں خود اپنی حمد فرمائی۔ جس کو صوفیہ مظاہر کے ساتھ موسوم کرتے ہیں اسے مظاہر سے موسوم کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ ان مظاہر کو اس سے مغایرت نہیں اس کا اپنی حمد ذات کا مقام جمعی میں بطریق حمد قولی کے اپنی حمد کرنا وہ ہے جو اس نے اپنی ذات کے صفات وکمالات اپنے صحائف وکتب میں درج فرمائے ہیں اور اس کی حمد فعلی وہ ہے جو اس نے اپنے کمالات جمالی وجلالی غیوبت سے شہود کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف اور علم سے عین کی طرف اپنی صفات کے میدانوں میں اور اپنے اسماء کی ولایت کے مقاموں میں ظاہر فرمائے ہیں۔

اور حمد حالی وہ تجلیات ہیں جو اس کی ذات میں بطریق فیض اقدس اولیٰ وبطریق ظہور انوار ازلی کے موجود ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حامد بھی وہی ہے اور محمود بھی وہی۔ اجمالاً بھی تفصیلاً بھی۔

کسی شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے :۔

لَقَدْ کُنْتُ دَھْرًا قَبْلَ اَنْ یُّکْشِفَ الْغِطَاءَ ۔۔۔ اَخَاکَ اَنِّی ذَاکِرٌ لَکَ شَاکِرٌ

فلما اضاء اللّیل اصبحت شاھدًا ۔۔۔ بانک مذکورٌ ذکرٌ وَّ ذاکرٌ

ترجمہ :۔ پردہ کھلنے سے پہلے بہت عرصہ میں اس خیال میں رہا کہ شاید میں تیرا شاکر وذاکر ہوں۔ مگر جب اندھیرے سے اجالا ہوا تو دیکھتا ہوں، **سبحان اللہ** ! کہ یا الٰہی ! ذکر بھی تو ہے اور مذکور بھی تو اور ذاکر بھی تو اور ہر حمد قولی

ادا کرنے والا اپنے محمود کو ان صفات کمال سے جانتا ہے جو اس کی طرف منسوب ہیں۔ یہی بات تعریف کو مستلزم ہے

ف: حمد و ثنا شکر و مدح سب کو شامل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو اس سے شروع فرمایا کہ لِلّٰہِ میں اپنی حمد ثناء بیان فرمائی اور شکر کا بیان رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں بیان فرمادیا اور مدح کا ذکر الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں آ گیا۔

تنبیہ: بندے کو چاہیے کہ ان تینوں طریقوں کو حمد حقیقی سمجھ کر حمد نہ کرے بلکہ مقلد بن کر اور مجازی حمد سمجھ کر حمد کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدح وثنا (جس طرح اس کی ذات وصفات کے لائق ہیں) اس کی ذات وصفات کی حقیقت سے واقف ہونے کی فرع ہے اور اس کی ذات وصفات کی معرفت حقیقت ہے۔ کما قال تعالیٰ

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۔ اسے معلوم کرنے پر احاطہ نہیں کر سکتے۔

وقال تعالیٰ: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر شناسی کا حق ادا نہیں کیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج اللہ تعالیٰ کی حمد کا حکم ہوا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! میری حمد فرمائیے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا احصی ثناء علیک مجھ سے تیری تعریف ناممکن ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حمد کی ادائیگی میں صرف تعمیل فرمان اور اظہار عبودیت مقصود ہوتا ہے۔ پھر **لا احصی الخ** کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا:۔ **انت کما اثنیت علی نفسک**

اس سے ثابت ہوا کہ حمد سے مراد یہی تقلیدی حمد ہے اور ہمیں بھی حمد تقلیدی کا حکم ہے۔ **کما قال تعالیٰ:**

وقل الحمد للّٰہ وقال فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم (التاویلات النجمیہ)

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

عطائیست ہر موئے از و برتنم چگونہ بہر موئے شکرے کنم

ترجمہ: میرے جسم کا ہر بال اس کی نعمت ہے پھر مجھ سے کب ممکن ہے کہ میں ہر بال کے لئے علیحدہ طور پر شکر ادا کروں۔

شاہراہ سلوک: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ منہاج العابدین میں فرماتے ہیں کہ حمد و شکر ان سات عقبات کا

آخری عقبہ ہے کہ جن کا عبور سالک کے لئے نہایت ضروری ہے تا کہ اپنے حصول مقاصد پر فتح مند ہو۔سب سے پہلا وہ امر کہ جس کے سبب سے بندہ راہ سلوک پر چلنے کے لیے متحرک ہوتا ہے۔الہام ساویہ وتوفیق خاص الٰہیہ ہے(چنانچہ)اسی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: کہ جس وقت بندے کے دل میں نور داخل ہوتا ہے اس کا دل کھل جاتا ہے۔عرض کیا گیا:یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! کی اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ آپ نے فرمایا:ہاں اس کا پہلا دار غرور سے کنارہ کشی،دوسرا دار خلود کی طرف رجوع،تیسرا موت کے نزول سے پہلے تیار رہنا۔پس جب کہ بندے کے دل میں پہلے یہ بات کھٹکے کہ بے شک میرا ایک منعم ہے جس نے مجھے طرح طرح کی نعمتیں عطا کی ہیں اور پھر وہ مجھ سے ان نعمتوں کا شکرانہ اور خدمت طلب کرے گا، میں ان سے غفلت کروں تو شاید وہ نعمتیں چھین کر مجھے عذاب میں مبتلا کردے۔اس کا یہ کیا تھوڑا احسان ہے کہ اپنے پیغمبران عظام کو معجزات دے کر ہماری طرف بھیجا اور ان کے ذریعہ ہمیں خبر دی کہ ہمارا رب ایک ہے جو عالم اس بات پر قادر ہے کہ مطیع کو ثواب دے اور مجرم کو سزا۔نیکی کا حکم دینے والا بھی وہی ہے اور برائی سے روکنے والا بھی وہی۔انہی خیالات سے بندہ کے دل میں مقام خوف پیدا ہو جاتا ہے۔پھر اس سے خلاصی کی کوئی راہ نہیں بجز اس کے کہ اپنے صانع کی صنعت کو دیکھ کر اس کے وجود پر استدلال نہ ہو۔

اوصاف مذکورہ کی وجہ سے بندہ کو اپنے رب کے وجود کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔اسی کو عقبہ علم ومعرفت کہتے ہیں یہی وہ پہلا عقبہ ہے جو سلوک کو راہ طے کرتے وقت درپیش ہوتا ہے اور اسی کی بدولت علم کے حصول کی بصیرت اور علماء آخرت سے سوال کرنا نصیب ہوتا ہے۔

جب اسے اپنے رب کے وجود کا یقین ہو جاتا ہے تو عبادت کے لئے معرفت اسے برانگیختہ کرتی ہے لیکن وہ عبادت کے طریقہ سے لاعلم ہوتا ہے۔پھر فرائض شرعی ظاہری (جو اس پر لازم ہیں) سیکھتا ہے۔جب علم معرفت کی فرائض سے تکمیل کی تو عبادت کے لیے تیار ہوتا ہے مگر اپنی بدکرداریوں سے شرمسار ہوتا ہے (جیسا کہ عام طور پر لوگوں کی حالت ہے) دل میں کہتا ہے کہ میں اطاعت کے کب لائق ہوں جب کہ مجھ سے بار بار گناہ ہوئے اور جرائم میں سرتاپا ملوث ہوں۔اسی سے اسے خیال آتا ہے کہ کیوں نہ ہو اب تمام برائیوں سے تائب ہو جاؤں تا کہ گناہوں کی قید سے چھوٹ جاؤں اور اپنی برائیوں سے پاک وصاف ہو کر عبادت کے لائق

ہو جاؤں۔یہی ہے وہ عقبہ جو راہ سلوک طے کرتے وقت بندے کے سامنے ہوتا ہے۔جب سالک کو اپنے حقوق وشرائط کے ساتھ یہی توبہ نصیب ہو جاتی ہے۔تو کیا دیکھتا ہے کہ اسے چاروں طرف سے ایسے چند عوائق گھیرے ہوئے ہیں جو اسے عبادت سے مانع ہو رہے ہیں۔غور سے دیکھنے سے یہ چار چیزیں معلوم ہوئیں۔

i۔دنیا ii۔خلق خدا iii۔شیطان iv۔نفس

اسی کو عقبہ عوائق کہتے ہیں۔اسی عقبہ کو طے کرنے کے لیے چار چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

i۔دنیا سے کنارہ کشی ii۔خلق خدا سے علیحدگی iii۔نفس سے جنگ iv۔شیطان سے جنگ

ان سب امور سے نفس کے ساتھ جنگ کرنا سخت مشکل ہے کیونکہ اس سے علیحدگی بھی مشکل ہے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یکبارگی سختی کر کے تابع کیا جائے (جیسا کہ شیطان کو تابع کرنا مشکل ہے) کیونکہ یہ تو ہر وقت سوار اور ہر برائی کا آلہ ہے اور اس سے اطاعت الٰہیہ پر موافقت کی بھی امید نہیں کیونکہ یہ برائی کا خوگر ہے یہی امور خواہشات اور اس کے متعلقات کے اصل الاصول ہیں۔

ہمی تازد ایں نفس سرکش چناں کہ عقلش تواند گرفتن عناں
کہ تا نفس وشیطاں برآید بزور مصاف پلنگاں نیاید زمو

ترجمہ:۔اس نفس سرکش کی جنگ کے لیے تقوی کی لگام کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اسے تابع کر کے نیکی کی راہوں پر بآسانی چلایا جا سکے اور برائی کے مقامات سے اسے روکا جا سکے۔

سالک جب یہ منزل طے کرنے کے بعد فارغ ہوتا ہے تو چند ایسی چیزیں عارض ہوتی ہیں جو عبادت سے رکاوٹ کا موجب بنتی ہیں۔غور سے دیکھا جائے تو یہ چار چیزیں ہیں۔

☆......رزق کہ جس کی طلب میں نفس دوڑتا پھرتا ہے،جس کی سے ضرورت ہے۔

☆......ہر اس شئے سے خائف ہونا کہ جس سے وہ ڈرتا بھی ہے اور اس کے ساتھ امیدیں بھی وابستہ رکھتا ہے۔ اسے چاہتا بھی ہے اور اس سے کراہت بھی کرتا ہے۔اسے یہ بھی علم نہیں کہ امر میں اس کی بہتری ہے یا نقصان.

☆......وہ شدائد وتکالیف جو اس کو ہر سو گھیر لیتی ہیں،بالخصوص وہ مخالفت جو خلق خدا سے خلاف کرنے اور شیطان کی محاربت اور نفس کو نقصان پہنچانے سے لاحق ہوتی ہیں۔

☆......قضائے الٰہی کے مختلف امتحانات، اسی کا نام عقبہ عوارض ہے۔ جب سالک یہ عقبہ پیش آئے تو اس کے قطع کرنے کے لیے ان چار چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

☆۔رزق کے لئے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا ☆۔اپنے جمیع امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا

☆۔قضائے حاجت الٰہی پر راضی ہونا ☆۔صبر کرنا

جب سالک اس عقبہ کو طے کر لیتا ہے تو اپنے نفس کا جائزہ لیتا ہے تو اس کو انتہائی درجہ کا کاہل دست پاتا ہے۔(جیسا کہ اس کے لائق ہے) نہ عبادت میں اس کا جی لگتا ہے اور نہ اس نے اس کو خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ غفلت، دھوکہ بازی اور گمراہی منہمک ہے اور اسراف وفضول کا خوگر ہے (نفس کی اس بڑی خرابی کو دور کرنے کے لیے) اسے ایک راہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی اطاعت کی راہنمائی کرے اور گناہوں سے اسے باز رکھے۔اس کے رہنما خوف ورجا ہیں۔رجا ان کرامات کے لیے ہے جو سالک کو بھلائی کا وعدہ دیا گیا ہے اور خوف ان صعوبتوں سے ہے جو اس کی عقوبات اور اہانات سے دھمکایا گیا ہے۔ یہ عقبہ بواعث ہے جو سالک کو طے کرنا پڑتا ہے۔اس عقبہ کو طے کرتے وقت وہ ان دونوں (خوف ورجا) کا محتاج ہوتا ہے۔

جب اس عقبہ سے فراغت پاتا ہے تو بعد ازاں نہ کوئی شے رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور نہ کوئی مشغلہ۔ بلکہ عبادت کے موجب وباعث حاصل ہو جائیں گے کہ جن کے سبب سے عبادت بڑے شوق سے کرنے کو جی چاہے گا۔لیکن تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ ابھی دو بڑی آفتیں باقی ہیں جن کا نام ریاء و عجب (خود بینی) ہے (اگرچہ عبادت میں جی خوش ہوگا مگر) کبھی اطاعت لوگوں کو دکھاوے کی غرض پر کرے گا۔ کبھی اپنی عبادت کو عظیم الشان تصور کر کے اپنے آپ کا اکرم ترین سمجھے گا۔اسی عقبہ کو عقبہ قوادح کہا جاتا ہے۔اس کے قطع کرنے کے لیے خلوص اور باری تعالیٰ کے احسانات مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

جب اس عقبہ کو باری تعالیٰ کی حسن عصمت وتائید سے طے کرے گا تو اسے عبادت کماحقہٗ ادا کرنے کی توفیق نصیب ہوگی۔اس حال میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دریا میں ڈوبا ہوا دیکھ کر خائف ہوگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے شکر کی ادائیگی میں غفلت ہو جائے اور کفران نعمت سے موصوف ہو کر مرتبہ رفیعہ (جو کہ صالحین کی روحانی غذا ہے) سے گر جائے (اس کی وفا کے لئے حمد وشکر کا دامن تھامے رکھے) یہی عقبہ حمد وشکر ہے جو

سالک کی راہ میں درپیش ہوتا ہے اور سالک اس کے ورد کی کثرت سے عقبہ ہذا کو طے کرتا ہے۔ جب اس عقبہ سے فارغ ہوتا ہے تو اپنے مطلوب و مقصود کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر بقیہ عمر اسی نعمت میں بسر کرتا ہے۔ اس کا ظاہری جسم دنیا میں ہوتا ہے لیکن اس کا دل آخرت میں معلق رہتا ہے اور ہر روز پیک اجل کا انتظار کرتا ہے اور دنیا سے متنفر رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا شوق اس کو ملاء اعلیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ اب رب العالمین کا قاصد آ کر اسے رب تعالیٰ کی خوشنودی کی بشارت دے کر کہتا ہے: مژدہ باد (اے سالک!) تیرا رب تجھ سے ناراض نہیں۔ اسی حال میں ملائکہ اس سے بہت خوش حالت میں ملاقات کرتے ہیں۔ باقی لوگ بھی اس دنیا فانی کو چھوڑ کر بارگاہ ایزدی میں اور جنت کے باغات میں جاگزیں ہوتے ہیں اور یہ سالک اپنے نفس فقیر کو کریم کی نعمتوں اور بہت بڑے ملک میں پاتا ہے۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

عروسی بود نوبت ماتحت　　　　گرت نیک روزی بود خاتمت

ترجمہ:۔ وہ تیرے لیے موج بہار ہوگی جب کہ تیرا خاتمہ ایمان پر ہو۔

حضرت امیر خسرو قدس سرہٗ اپنے وقت وصال فرما رہے تھے: ؎

ز دنیا می رود خسرو بزیر لب ہمی گوید　　　　دلم بگرفت از غربت تمنائے وطن دارم

ترجمہ:۔ بوقت نزع حضرت امیر خسرو آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے کہ دنیا سے جی گھبرا گیا ہے۔ اب دل کو وطن کی تمنا ہے۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ربط: حمد کو اسم ذاتی کے بالمقابل لانے میں جب اس طرف تنبیہ فرمائی کہ جمیع محامد کا بالذات مستحق میں ہوں۔ تو اس کے بعد اسمائے صفاتیہ لائے۔ تاکہ دونوں استحقاق کا یکجا اجتماع ہو جائے اور وہ یعنی رب العالمین اس بات کی برہان ہے کہ جمیع محامد ذاتی و صفاتی اور دنیوی و اخروی کا وہی مستحق ہے۔ رب بمعنی تربیت و اصلاح، عالمین کے حق میں یہ ہے کہ ان کی تربیت کی غذا اور ان کے وجود کو باقی رکھنے کے تمام اسباب تیار فرماتا ہے۔ انسان کی تربیت یہ ہے کہ اس کے ظاہر (نفس) کو نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے اور اس کے باطن (دل) کو اپنی رحمت سے مزین کرتا ہے۔ عابدین کے نفوس کو احکام شریعت سے اور مشتاقین کے قلوب کو آداب طریقت سے، اسرار محبین کو انوار حقیقت سے روشن اور منور کرتا ہے۔ کبھی انسان کی تربیت اس کے نیک اعمال

سے کرتا ہے کبھی فیض کے قوی انوار کو اعضاء تک پہنچاتا ہے۔اس کی بہت بڑی شان ہے کہ اس نے ہڈیوں کو سننے کی، چربی کو دیکھنے کی اور گوشت کو بولنے کی توفیق بخشی۔کبھی انسان کی نباتات کے دانوں اور پھلوں کی غذاؤں سے تربیت کرتا ہے اور حیوانات کے لحوم وشحوم سے، زمینوں کے اشجار وانہار اور آسمانوں کے کواکب وانوار سے انسان کی تربیت کا سامان تیار کرتا ہے۔

نصیحت:۔ اے انسان! تیرا سکون رات میں بنایا۔نقصان پہنچانے والے اور موذیوں کی حرکات کو رات میں چلنے پھرنے سے تیرے لیے روکا اور اپنے فضل کی طلب کے لئے تجھے دن جیسی نعمت بخشی۔اے مغرور انسان! وہ بے پروا کیسی تربیت کرتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا گویا تیرے سوا کوئی عبد نہیں۔مگر تو اس کی خدمت (عبادت) سے گریزاں ہے۔اگر تجھے نصیب بھی ہوتی ہے تو تیرا مطمع نظر کوئی غیر ہوتا ہے۔

العالمین عالم کی جمع ہے اور لفظ عالم ایسی جمع ہے کہ جس کا اپنے لفظ سے کوئی واحد نہیں۔

ف: حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور یہ دنیا ان میں سے ایک ہے اور اس کی آبادی اس کے ویرانے کے مقابلہ میں اتنی مقدار رکھتی ہے جتنی جنگل میں ایک خیمہ۔

ف: حضرت ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کل عالم تین سو ساٹھ ہیں ان میں تین سو ننگے پاؤں اور ننگے جسم والے ہیں اور وہ ایسے ہیں جن کو اپنے خالق کا بھی علم نہیں، وہ جہنم کا ایندھن ہیں اور باقی ساٹھ وہ ہیں جو کپڑے پہنتے ہیں۔ذوالقرنین ان سے ملاقی ہوا ان سے ہم کلام بھی ہوا۔

ف: حضرت کعب الاحبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ عالم کا صحیح انداز کرنا محال ہے۔**کما قال اللہ تعالیٰ**: وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (اور تیرا رب اپنے لشکر کو خود جانتا ہے)

ف: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً مخلوق کو چار قسم بنایا:

۱۔ملائکہ ۲۔شیاطین ۳۔جنات ۴۔انسان

پھر ان سب کے دس اجزا بنائے، ان میں سے نو حصے سالم فرشتگان ہیں، باقی ایک جز انسان وجن وشیاطین ہیں۔پھر ان کے دس اجزا ہوئے۔ان میں نو حصے شیاطین ہیں، باقی ایک حصہ انسان وجنات کا ہے۔پھر ان دونوں کو دس اجزاء پر منقسم فرمایا ان میں سے نو حصے جنات کے ایک حصہ انسان کا ہوا۔پھر انسان کو ایک

سو پچیس اجزاء پر تقسیم فرمایا۔ ان میں سے پورا ایک سو بلاد ہند میں پیدا فرمایا، بعض ان میں سادہ لوح ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کے سر کتوں جیسے ہیں۔ بعض ان میں سے مالوخ ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کی آنکھیں سینہ پر پڑی ہوئی ہیں اور بعض ان میں ماسوخ ہیں یعنی وہ لوگ کہ جن کے کان ہاتھیوں کے کانوں جیسے ہیں اور بعض ان میں مالوف ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کے پاؤں اپنے قابو میں نہیں ان کا نام دوال پاً ہے۔ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان پچیس سے بارہ اجزاء کو بلادِ روم میں بھیجا جو کہ نسطوریہ، ملکانیہ، اسرائیلیہ کے نام سے موسوم ہیں۔ پھر ان ہر ایک کے چار گروہ ہیں۔ ان سب کا ٹھکانا بھی جہنم ہے اور باقی چھ بلاد مشرق میں بھیجے جنہیں یاجوج ماجوج، ترک، خاقان، ترک حدخلیخ، ترک خزر، ترک جریر کہا جاتا ہے اور باقی چھ بلاد مغرب میں بھیجے جوزنج، زط، حبشہ، نوبہ، بربر، مشرکین عرب کے نام سے موسوم ہیں ان سب کا ٹھکانا بھی جہنم ہے اور باقی ایک حصہ بنی نوع انسان سے اہل توحید کا ہے۔ باقی سب کے سب کافر و مشرک ہیں۔ پھر اہل توحید بھی تہتر فرقے ہو گئے بہتر سب کے سب خسارہ میں، یعنی اہل بدعت و ضلالت ہیں، صرف ایک ان میں ناجی ہے اور وہ اہل السنّت والجماعت ہیں اور گمراہ فرقوں کا حساب اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ جنہیں چاہے بخش دے جنہیں چاہے عذاب میں مبتلا کرے

حدیث شریف: میں ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل کے بہتر گروہ ہوئے میری امت تہتر گروہ ہوگی ان میں سے ایک کے سوا باقی دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کی: حضور! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ لوگ ہیں جو میرے اور میرے صحابہ کے تبع ہیں یعنی جس اعتقاد اور قول و فعل کا میں اور میرے صحابہ پابند ہیں وہ بھی اس طرح ہوں گے۔ یہی قول حق ہے اور فلاح تک پہنچانے والی یہی راہ ہے۔ اس کے ماسوا باقی سب طریقے باطل اور دوزخ کی طرف کھینچ لے جانے والے ہیں۔ اگر وہ لوگ ان طریقوں کو جائز و حق سمجھ کر عمل کرتے ہیں تو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ورنہ چند روز۔

تفسیر عالمانہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اس کے تکرار میں کئی وجوہ ہیں۔

☆...... بسم اللہ شریف میں جن دو رحمتوں کا ذکر تھا وہ رحمتیں ذاتی تھیں اور فاتحہ میں دو رحمتیں صفاتیہ، کمالیہ کا بیان کیا جا رہا ہے۔

☆...... تاکہ واضح ہو کہ بسم اللہ شریف سورۃ فاتحہ کا جز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک سورت میں رحمت کا دوبارہ ذکر نہ

ہوتا کیونکہ قاعدہ ہے کہ دو ہم جنس چیزوں کو ایک مقام پر دوبار ذکر کرنا خلاف قاعدہ ہوتا ہے (اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں)

☆...... بندگان الٰہی کے لیے مستحسن ہے کہ اسے بار بار یاد کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کے ذکر کے ساتھ بھی محبت ہو۔ حدیث شریف میں ہے: مَنْ اَحَبَّ شَيْئاً اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ ۔(جو کسی سے محبت کرتا ہے اس کا ذکر بہت زیادہ کرتا ہے)

☆...... جب بندہ نے (فاتحہ کی تلاوت کے وقت) کہا رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو گویا کسی نے پوچھا کہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کون ہے؟ بتایا گیا کہ وہ رحمٰن ہے جو اپنے بندوں کو دنیا میں روزی دیتا ہے اور رحیم ہے جو ان کی قیامت میں مغفرت فرمائے گا۔ یہی نکتہ لفظ رحیم کے بعد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے بیان میں ہے۔ یعنی اس کی ربوبیت رحمانیہ یعنی دنیا میں روزی دینے کی وجہ سے ہے یا رحیمیت یعنی آخرت میں مغفرت فرمانے کی وجہ سے۔

☆...... قاعدہ ہے کہ حمد سے رحمت نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ منقول ہے کہ سب سے پہلے حمد کرنے والے سیدنا آدم علیہ السلام ہیں۔ جب پیدا ہوئے تو انہیں چھینک آئی۔ اس پر انہوں نے کہا الحمد للّٰہ ۔ ملائکہ نے انہیں جواب میں کہا: يَرْحَمُكَ رَبُّكَ وَلِذَالِكَ خَلَقَكَ (تیرے او پر رحم فرمائے اسی لیے اللہ نے آپ پیدا فرمایا) اسی لیے خداوند قدوس نے اپنے بندوں کو حمد سکھائی کہ میری رحمت کا حصول میری حمد سے ہوگا۔

☆...... تکرار تعلیل کے لئے ہے۔ کیونکہ الحمد شریف کو ان اوصاف پر مرتب کرنا ان اوصاف کے ماخذ کی علیت کی علامت ہے۔ مثلاً رحمانیت اور رحیمیت اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ باری تعالیٰ احسان کرنے میں مختار بالذات ہے کسی سبب کا محتاج نہیں۔

رحمٰن اور رحیم میں فرق:۔ رحمٰن ورحیم میں فرق یہ ہے کہ لفظ رحمٰن باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے (کسی دوسرے پر اس کا اطلاق جائز نہیں) یا یہ کہ اس سے رحمت عالم مراد ہوتی ہے (دنیا و آخرت میں) یا یہ کہ اس بہت بڑی نعمتیں مراد ہوتی ہیں۔ پس بہ بنائے وجہ اول رحمٰن وہ صفت ہوگی کہ اس جیسی جنس کا صدور بندگان سے محال ہے اور رحیم وہ صفت ہے کہ اس جیسی جنس کا صدور بندگان سے کچھ نہ کچھ ممکن ہے۔ جیسا کہ ذوالنون مصری رحمة اللہ علیہ کی حکایت ذیل دلالت کرتی ہے۔

حکایت:۔ف: حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک دن ملال ہوا استراحت کے لیے دریائے نیل پر سیر کرنے کے لئے گیا۔ دریائے نیل کے کنارے پر ایک بچھو کو تیز دوڑتا ہوا دیکھا، میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ بچھو مینڈک پر سوار ہو کر دریا عبور کرنے لگا، میں بھی کشتی پر سوار ہو کر پیچھے پیچھے چل دیا۔ بچھو دریا سے نکل کر پھر دوڑنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ بالآخر بچھو ایک نوجوان (جو ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا) کے پاس پہنچا۔ ایک بہت زہریلا سانپ درخت سے نیچے اتر رہا تھا قریب تھا کہ اس نوجوان کو ڈستا مگر بچھو نے جاتے ہی سانپ سے لڑائی شروع کر دی۔ بچھو اور سانپ نے ایک دوسرے کو خوب ڈسا، بالآخر دونوں مر گئے اور اس نوجوان کی جان بچ گئی۔

اعجوبہ:۔ کوے کا بچہ جب انڈے سے باہر نکلتا ہے تو وہ سرخ گوشت کی طرح ہوتا ہے۔ ماں اسے آگ کی چنگاری سمجھ کر چھوڑ جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مچھر اسے آگ جان کر پروانہ بن کر خود بخود اس کے منہ میں گر کر اس کا لقمہ بنتے ہیں یہاں تک کہ اس کے بال و پر اگنے لگتے ہیں۔ اس کی ماں اسے آ کر اپنی پرورش میں لے لیتی ہے۔ اسی رحمت عامہ کا کرشمہ دیکھ کر کہا گیا ہے: **یارزاق الغراب فی عمعه** (اے پروردگار! کوے کے بچے کو آشیانہ میں پالنے والے) یا یہ کہ لفظ رحمٰن لفظ رحیم سے عام ہے۔

سوال :. جب رحمت کا یہی تقاضا ہے تو پھر ہم پر مرض و تکالیف کا نزول کیوں؟ بلکہ ہم قسم قسم کے حوادثات کا نشانہ بنتے ہیں؟

جواب :. بہت سی چیزوں کو ہم رحمت سمجھتے ہیں حالانکہ وہ دراصل زحمت ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اور (جس کو ہم رحمت سمجھتے ہیں اصل میں وہ زحمت ہوتی ہے) اس کے متعلق کوئی شاعر کہتا ہے۔

ان الشباب والفراغ الجدة　　　　مفسدةٌ لکم ای مفسدة

ترجمہ :. بے شک جوانی و فراغت و غنا آدمی کو بہت نقصان پہنچانے والی ہیں۔

دیکھیے بظاہر یہ تینوں (جوانی، فراغت، غنا) رحمت ہیں مگر شاعر انہیں زحمت سے تعبیر کر رہا ہے اور دوسرا یعنی جسے ہم زحمت سمجھتے ہیں حقیقت میں وہ رحمت ہوتی ہے۔ جیسے چھوٹے بچے کو مدرسہ میں مجبور کرتا اور اسے مار پیٹ کر

تعلیم کے زیر بار کرنا، اور آکلہ کے مرض کے ہاتھ کو کاٹنا، بے وقوف تو ان کو برا محسوس کرے گا مگر دانا کی نظر باطنی اسرار پر ہو گی۔ پس مشقت و تکلیف میں رحمت و عطیہ الٰہی مضمر ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے شر کو دیکھ کر خیر کو ترک کر دینا شر کثیر ہے۔

روحانی نسخے:۔ ☆...... تکالیف ارواح کو علائق جسدانیہ سے پاک کرتی اور دوزخ کو پیدا کرنے میں بھی یہی حکم ہے کہ ابرار و اشرار میں تمیز ہو سکے۔ اسی طرح شیطان کی پیدائش میں بھی یہی حکمت ہے کہ بندگان مخلصین و غیر مخلصین میں امتیاز ہو۔ پس محقق کی یہ شان ہے کہ حقائق کو مدنظر رکھے۔ جیسا کہ حضرت خضر و حضرت موسیٰ علیہما السلام کے قصہ میں ہوا۔

☆...... جس سے طبیعت کراہت کرے اس کے تحت بھی مخفی اسرار اور بلیغ حکمتیں مستتر ہوتی ہیں۔ اگر اس کی رحمت نہ ہوتی تو اس کا غضب سبقت کر جاتا ہے۔ تو پھر دنیا میں کوئی وجود بھی نہ ہوتا اور نہ اسم منعم کا ظہور ہوتا۔

ف: بہر حال بڑی نعمتوں کے لئے ہے اس کے بعد اسم رحیم کا ذکر فرمایا تا کہ اسم وہم کا دفعیہ ہو جائے کہ جب اسم رحمٰن بڑی نعمتوں کے لئے ہے تو پھر اس سے حقیر اشیاء کا طلب کرنا بے ادبی ہو گی۔ جیسا کہ دستور ہے کہ کسی بڑے آدمی سے کہا جائے کہ میں آپ سے معمولی چیز کا سوال کرتا ہوں تو وہ فرمائیں گے کہ اگر سوال معمولی ہے تو کسی معمولی آدمی سے طلب کیجئے۔ بنا بریں گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں فقط رحمٰن رہوں تو تم ڈر کے مارے مجھ سے ہر شے مانگنے سے باز رہو گے۔ لیکن تمہیں معلوم ہو کہ میں رحیم بھی ہوں لہذا مجھ سے ہر چیز طلب کرو، یہاں تک کہ اپنے جوتوں کا تسمہ اور ہنڈیا کا نمک بھی مجھ سے مانگو۔ شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

محالست اگر سر بریں در نہی   کہ باز آیدت دست حاجت تہی

ترجمہ: اگر اسی دروازہ پر سر رکھو گے پھر محال ہے کہ اس کے بعد تیری ضرورت پوری نہ ہو۔

تفسیر صوفیانہ اہل حقیقت فرماتے ہیں کہ وہ حضرات کلیہ جو اسم رحمٰن کے ساتھ مخصوص ہیں تین ہیں۔

۱۔ حضرت الظہور   ۲۔ حضرت البطون   ۳۔ حضرت الجمع

اور تمام موجودات کے یہی تین مراتب ہیں اور ان تینوں مراتب سے خالی ہیں اور انہی مراتب کے احکام ذیل کے لوگوں پر منقسم ہیں۔

☆...... سعداء   ☆...... اشقیاء

☆......وہ حضرات جو صرف روحانی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں لیکن جسمانی نعمتوں سے دور رہتے ہیں۔ جیسے ارواح مجردہ۔

☆......اس کے برعکس یعنی صرف جسمانی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور روحانی نعمتوں سے محروم۔

☆......اور جامعین بین الامرین یعنی روحانی اور جسمانی دونوں نعمتوں سے پردامن ہوتے ہیں۔

اسی طرح اہل جنت کی بھی کئی اقسام ہیں:

☆......روحانی اعتبار سے علوم سے منافع یافتہ سعادت مند حضرات، یعنی وہ نہ صرف ظاہری صورتوں سے نفع پانے والے ہیں۔ بلکہ روحانی طور پر بھی مزین ہوتے ہیں کیونکہ ان حضرات نے جنت کے لیے وہ اعمال نہیں کمائے جو صرف ظاہری نعمتوں کا فائدہ پہنچائیں بلکہ انہوں نے باطنی نعمتوں کے لیے بھی کچھ کیا، اگرچہ یہ لوگ بہ نسبت دیگر حضرات کے بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

☆......مذکورہ حضرات کے برعکس، جیسے وہ زاہد و عابد جولاعلم ہیں، کیونکہ ان کی ارواح روحانی نعمتوں سے کم نفع پانے والی ہیں۔ کیونکہ ان کو حضرات علیہ الٰہیہ کے ساتھ کوئی مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ عمل کرتے وقت ان کے ارادے میں سوائے عمل کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اسی عمل کو اپنی غرض و غایت سمجھتے ہیں اسی لیے یہ لوگ موعودہ امور کی رغبت میں اور جن چیزوں سے ڈرایا گیا ہے۔ ان کی رہبت میں رہتے ہیں۔

☆......جامعین حضرات یعنی وہ مقدس گروہ جو روحانی جسمانی نعمتوں کے جامع ہیں۔ وہ علم و عمل کی لذتوں پر فائزالمرام ہیں۔ جیسے انبیاء علیھم السلام اور ان کے کامل وارث یعنی اولیاء کرام علیھم الرحمۃ و الغفران۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

ہر کبوتر می پرد در مذہبے ویں کبوتر جانبے بے جانبے

ترجمہ:۔ ہر کبوتر اپنی راہ چلتا ہے لیکن یہ کبوتر ایسی جانب اڑتا ہے جس کی کوئی جانب اور طرف نہیں۔

تفسیر عالمانہ

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ عرب میں یوم اس وقت کو کہتے ہیں کو مابین طلوع شمس تا غروب واقع ہو اور شریعت میں طلوع فجر یعنی صبح صادق اور غروب شمس کے مابین کا نام ہے اور یہاں مطلق مراد وقت ہے کیونکہ قیامت میں شمس نہیں ہوگا۔ معنی یہ ہوا کہ وہ قیامت میں مالک ہے اور مالک کی یوم کی

طرف اضافت ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے ہے جیسے تمام ظروف کی اضافت ان مظروف فیہ (کہ جن میں حوادثات واقع ہوئے ہیں) کی طرف ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: یوم الاحزاب، یوم الفتح

اور مالک کی اضافت یوم کی طرف، یوم کے عظیم الشان ہونے اور اس کی سختی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یا اس کو علیحدہ کرنے میں یہ راز ہے کہ اس میں صرف احکام جاری ہوں گے۔ باقی جمیع تعلقات مابین مالک و مما لک کے بالکلیہ منقطع ہو جائیں گے۔ (ملک وملک میں ربط) سختی قوت کے لیے ملک کہتے ہیں۔

درحقیقت قوت کاملہ اور ولایت نافذہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکم کا نفوذ اور تصرف کا حق اگر بندگان کو حاصل ہے تو مجازاً کیونکہ ان کی ملک کا ابتداء و انتہاء ہے اور بعض پر کہ کل پر اس طرح جسم پر نہ کہ عرض پر اسی طرح نفس پر نہ کہ روح پر۔ اسی طرح ظاہر پر نہ کہ باطن پر، زندہ پر نہ کہ مردہ پر، بخلاف معبود حق کے کہ نہ اس کے ملک کو زوال ہے نہ انتقال۔

مسئلہ: مالک کو الف کے ساتھ پڑھنے میں الف کے سوا (ملک) پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے۔ کیونکہ مالک میں ایک لفظ زائد ہے۔

حکایت: ف: ابو عبداللہ محمد بن شجاع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

کہ میری عادت تھی کہ میں ہمیشہ مالک کو الف کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک دن کسی ادیب سے سنا کہ ملک (الف کے سوا) مالک (الف کے ساتھ) سے زیادہ بلیغ ہے۔ میں نے سن کر ملک (الف کے سوا) پڑھنا شروع کر دیا۔ نیند میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ تو نے اپنی دس نیکیاں کیوں کم کر دی ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن مجید کا ایک حرف پڑھا تو اسے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں ملیں گی اور اس کے دس گناہ معاف ہوں گے اور دس درجے بلند ہوں گے۔ پھر میں نے برسم سابق مالک کو الف کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے نیند میں کسی کہنے والے نے کہا کہ تو نے ملک (الف کے سوا) کو کیوں ترک کر دیا؟ کیا تو نے حدیث شریف نہیں سنی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: قرآن کو عظیم الشان کر کے اور بلیغ الفاظ سے پڑھو۔

پس میں نے امام قطرب (لغت کے ماہر) کی خدمت میں آ کر مالک اور ملک کا فرق پوچھا۔ انہوں نے

فرمایا ان کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔فرمایا: مالک وہ ہے جو دنیا میں کسی چیز کا مالک ہو اور ملک وہ ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ ہو۔تفسیر ارشاد میں ہے کہ اہل حرمین محترمین ملک کو الف کے بغیر پڑھتے ہیں اور ملک سے مشتق کرتے ہیں۔جس کا معنی ہے سلطان قاہرہ، استیلائے جابر، غلبہ کامل، امور عامہ اور امر ونواہی میں تصرف کلی اور یوم کی طرف اضافت کی وجہ یہی یعنی ملک (الف کے بغیر) زیادہ مناسب ہے۔دونوں کے لئے ترجیح ثابت ہے جو کتب تفاسیر میں مفصلاً مذکور ہے اگر مزید تحقیق مطلوب ہو تو تفاسیر کا مطالعہ کیجئے۔

ربط بین الاسماء الخمسہ:۔ اوصاف خمسہ کو بالترتیب ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! میں نے تجھے پیدا کیا ہے اسی لیے عبادت کا مستحق میں ہوں۔پھر میں نے تجھے نعمتوں سے پالا ہے اسی لیے میں تیرا رب ہوں پھر تو میرا نافرمان ہوا، میں نے تجھے بخش دیا، اسی لیے میں رحیم ہوں۔پھر میں تیرے عمل فعلی وقولی پر تجھے جزو سزا دوں گا اسی لیے میں مالک یوم الدین ہوں۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں اشارہ ہے کہ دین سے مراد اسلام ہے، جیسے کہ اس کا فرمان اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہے) دلالت کرتا ہے۔

اسلام دو قسم کا ہے: ۱۔اسلام ظاہری ۲۔اسلام باطنی

اسلام ظاہری: زبان کے اقرار اور اعضاء کے اعمال کے نام ہے اسی کو اسلام جسدانی کہتے ہیں اور جسدانی ظلمانی ہے اسی لئے رات کو ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔یعنی یہ اسلام درجہ میں کم ہے اور دوسرا اسلام باطنی ہے۔ قلب اور صدر کا نور الٰہ سے منشرح ہونے کا نام اسلام باطنی ہے اور یہ اسلام روحانی نورانی ہے اسی لیے دن کو نور سے تعبیر کرتے ہیں (گویا اسلام دن کی طرح چمکتا دمکتا اور نہایت باطنی ہے) اور یہ اسلام جسدانی کا تقاضا ہے کہ جسم اوامر ونواہی کا پابند ہو جائے اور اسلام روحانی کا تقاضا ہے کہ قلب وروح احکام ازلی اور قضا وقدر کے لیے سر تسلیم خم ہو جائیں۔پس ہر وہ شخص جو اسلام جسدانی تک پہنچا اور اس کو اسلام روحانی کا مرتبہ حاصل نہ ہوا تو وہ دین کی سیر میں متردد ومتحیر رہتا ہے اور اسے کئی ملوک وملاک دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ سیدنا خلیل علی نبینا وعلیہ السلام کا واقعہ ہے کہ جب رات ہوئی اور آپ کو ستارہ نظر پڑا تو کہنے لگے: یہ میرا رب ہے اور جس کی سعادت کا

ستارہ چمک پڑے اور اس کے جبل نفس کی طرف سے جب مشرق قلب سے شمس ایمان نورانی کا طلوع ہو جائے تو وہ رب کے نور تک پہنچا۔ پھر اس پر یوم الدین کے کشف واضح ہو جاتے ہیں۔ پس اس کے وقت کا ورد وَاَصْبَحْنَا اَصْبَحَ الْمُلْکُ (ہم اور اللہ تعالیٰ کا فرشتہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں) پر ہو جاتا ہے۔ پھر عین الیقین بلکہ حق الیقین سے اس بات کا اسے مکاشفہ ہو جاتا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا ملک حقیقی نہیں اور مالک یوم الدین کے سوا کوئی مالک حقیقی نہیں جب اسے نورانی تجلی نصیب ہوئی اور مالک کے آمنے سامنے ہو کر مخاطب ہوا تو بالمشافہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کے مبارک الفاظ سے مناجات کرنے لگ جاتا ہے۔

شتات: ۔ قانون ہے کہ شہنشاہ کی مخالفت جہان کی بربادی اور مخلوق کی تباہی کا باعث ہے۔ پس شاہوں کے شہنشاہ کی مخالفت کا کیا حال ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ مریم میں خود فرماتا ہے: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ (قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں)

۲۔ اطاعت بہت مصالح کا موجب ہے جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں فرماتا ہے۔ نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (ہم تمہیں رزق عطا فرماتے ہیں اور نیک انجام تقویٰ سے نصیب ہوتا ہے) رعیت پر لازم ہے کہ اپنے بادشاہ کی فرمانبردار رہے اور بادشاہ پر واجب ہے کہ شاہوں کے شاہ کی اطاعت میں سرگرم رہے تاکہ تمام عالم کے نظام کا نیک انجام ہو۔

۳۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا تمام ملک عدل وانصاف کے ساتھ ہے۔ **کما قال اللہ تعالیٰ:** وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا (ہم قیامت میں عدل وانصاف کا ترازو رکھیں گے۔ پس کسی پر ذرہ برابر بھی عذاب نہ ہوگا) پس بادشاہ مجازی اگر منصف مزاج ہو تو اس کی شاہی کے تمام انتظامات اچھے رہتے ہیں۔ چنانچہ جانوروں کے تھنوں میں دودھ بکثرت ہو جاتا ہے اور کھیت بکثرت سرسبز ہو جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کی شاہی میں سراسر نقصان ہوتا ہے اور بھلائی دنیا سے اٹھ جاتی ہے۔

حکایت در موجب توبہ نوشیرواں: ۔ نوشیرواں اپنے لشکر سے دور ہو کر ایک باغ میں پہنچا۔ وہاں ایک لڑکا بیٹھا تھا اس سے ایک انار مانگا۔ لڑکے نے انار پیش کیا۔ نوشیرواں نے انار کو توڑا تو اس میں بہت پانی تھا اور میٹھا بھی خوب تھا۔ اسے پینے سے اس کی پیاس بجھ گئی۔ متعجب ہوا اور دل میں ٹھان لی کہ وہ یہ باغ اس سے ضرور چھینے گا۔ دوسری بار لڑکے سے انار مانگا [illegible]

تھوڑا پانی نکلا اور وہ بھی ترش۔ لڑکے سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے عرض کیا: معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا ارادہ ظلم کرنے کا ہو گیا ہے۔ نوشیرواں یہ بات سنتے ہی وہیں تائب ہوا۔ پھر انار طلب کیا۔ لڑکے نے پیش کیا۔ بادشاہ نے توڑا تو پہلے سے بھی زیادہ میٹھا پایا۔ لڑکے نے کہا اغلب امید ہے کہ بادشاہ نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے اور توبہ کر لی ہے۔ نوشیرواں اس راز سے آشنا ہو گیا اور تہ دل سے توبہ کر کے آئندہ ظلم کرنے سے بالکل باز آ گیا، جس کی برکت سے تا ہنوز بادشاہ عادل کے نام سے مشہور ہے اور رہتی دنیا تک مشہور رہے گا یہاں تک کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فخراً یہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں ''میں بادشاہ عادل کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں''

ازالہ:۔ تفسیر فناری نے سورۃ فاتحہ میں تحریر فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ نورانی میں ظہور فرمانے کی وجہ سے فخر فرمایا ہے جس کی دلیل نوشیرواں کے عدل وانصاف کے زمانے کو بنایا۔ کیونکہ وہ کافر کہ جس پر کفر کا غلبہ ہو اس کے اچھے حال یعنی عدل کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ مقاصد حسنہ میں فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ کا کوئی اصل نہیں اور نہ ہی یہ درجہ صحت تک پہنچتی ہے اگر بفرض محال صحیح بھی ہو تو اس پر لفظ عادل کا اطلاق اس کے اسی اسم کے دعویٰ کی وجہ سے ہے نہ اس کو اس سے موصوف کرنا مطلوب ہے اور نہ اس کے عادل ہونے کی شہادت دینا مقصود ہے یا اس کو اس وصف سے موصوف کرنا محض ان کے معتقدین کے اعتقاد کی وجہ سے ہے جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ عادل تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ (بتوں کے متعلق) فرماتا ہے۔ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ (پس انہیں ان کے خداؤں نے نہ بچایا) یہاں معبودانِ باطلہ کو الہ کہا گیا ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص غیر اللہ کے حکم کا پابند ہو اسے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اچھے لفظ سے تعبیر کریں۔

حدیث شریف:۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حاکم وقت کو قیامت میں حاضر کیا جائے گا، حکم ہو گا کہ اس کو پل صراط پر لے جاؤ، جب وہ پل صراط کے قریب جائے گا تو پل صراط اس کو دیکھ کر لرز جائے گا اور اس کا ہر ذرہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ پھر وہ حاکم اگر اللہ تعالیٰ کے فرمان کا پابند ہو کر آیا ہو گا تو پل صراط پر سے بآسانی گذر جائے گا اور اگر نافرمان ہو کر آیا ہو گا تو پل صراط پھٹ جائے گی جس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر پڑے گا اور وہاں پچاس ہزار سال بسر کرے گا۔ کذافی تذکرۃ الموتی لام القرطبی

شیخ سعدی فرماتے ہیں:

مہاز ورمندی مکن بر کہاں	کہ بر یک نمط نماند جہاں
نماند ستم گار بدروز گار	بماند بر ولعنت پائیدار

ترجمہ:۔اے بڑے چھوٹے پر زیادتی مت کر، اس لیے کہ جہاں ایک طرز پر نہیں رہے گا۔ظالم کا وقت بیت جائے گا لیکن اس پر ہمیشہ لعنت برستی رہے گی۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ ربط :اس سے قبل حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کلام کوان چیزوں سے شروع فرمایا جو عارف کے حال وذکر وفکر اور اس کے اسماء میں تاویل کرنا اور اس کی نعمتوں میں نظر کرنا اور اس کے عظیم شان وتاثیر سلطان پر اس کے صنائع سے دلیل پکڑنے کے مساوی ہیں۔اب عارف کے انتہائی امر کا ذکر فرماتا ہے اور اس کا انتہائی امر یہ ہے کہ اس کے کہنہ وصال میں غور وخوض کر کے اہل مشاہدہ سے ہو کر اس کو عین وعیاں دیکھے اس کے ساتھ آمنے سامنے مناجات کرے: اے اللہ تعالیٰ ! ہمیں واصلین سے بنا، ہمیں ان لوگوں میں نہ رکھ جو سنی سنائی باتوں پر خوش رہتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ عابد پر واجب ہے کہ (عبادت سے) پہلے معبود اور اس کی ذات کو دیکھے پھر اس کی عبادت کی طرف رجوع کرے اس حیثیت سے نہیں کہ عبادت اس سے ظاہر ہو رہی ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے نسبت وتعلق ہے۔اس لئے کہ عارف وصال کو اس وقت حق سمجھتا ہے جب کہ جناب قدس کے مشاہدہ میں مستغرق ہو کر ماسوا سے غائب ہو جائے یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی ہرگز نہ دیکھے اور نہ کسی حال پر نگاہ رکھے۔ہاں اس حیثیت سے ملاحظہ کرے کہ یہ اس کے ملاحظہ اور منتسب الیہ ہے۔
اسی لیے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول (جو حکایتاً قرآن نے نقل فرمایا جب کہ آپ نے غار ثور میں فرمایا:۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا خوف نہ کھایئے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔
یہاں حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو ملحوظ رکھا کو سیدنا کلیم علی نبینا وعلیہ السلام کے قول پر فضیلت دی گئی ہے اس لئے کہ انہوں نے اپنا ذکر مقدم رکھا۔

تفسیر عالمانہ مفعول بہ کو مقدم کرنے میں اختصاص مقصود ہے۔معنی یہ ہیں کہ تجھ کو عبادت کے لیے خاص

کرتے ہیں نہ کہ تیرے غیر کو۔ عبادۃ" نہایت درجہ کے خضوع وزاری کو کہتے ہیں (قانون) حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہر جگہ عبادت سے توحید اور تسبیح سے نماز اور قنوت سے طاعت مراد ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ پڑھیے اِیَّاکَ نَعْبُدُ اور اس سے مراد یہ ہو کہ تجھی سے تمنا اور امید رکھتے ہیں نہ کہ تیرے غیر سے۔

مسئلہ :۔ نَعْبُدُ اور نَسْتَعِیْنُ میں جو ضمیر مستتر ہے اس سے قاری اور اس کے ساتھ رہنے والے ملائکہ اور حاضرین نماز باجماعت مراد ہیں یا وہی اور تمام اہل توحید مراد ہیں۔

نکتہ :۔ اپنی عبادت میں اس توحید کو عبادت اور اپنی حاجت میں ان کی حاجت کو داخل کر رہا ہے تا کہ ان کے صدقے اور ان کی برکت سے اس کی عبادت قبول ہو جائے اور اس کی حاجت پوری ہو جائے۔

مسئلہ :۔ اسی نکتہ کی بنا پر نماز کو باجماعت پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

سیدی حضور شیخ الاکبر قدس سرہٗ اپنی کتاب "العظمۃ" میں فرماتے ہیں کہ جب بندہ اپنے نفس کو نَفْعَلُ کے نون سے تعبیر کرتا ہے تو یہ نون عظمت کا نہیں ہوتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کو ضمیر مفرد سے بیان کرتا ہے تو یہ بندہ کے قلب پر سلطان پر توحید کے غلبہ اور تحقیق کی وجہ سے ہے کہ یہ اس کی کلیت میں ایسا سرایت کر چکا ہے کہ اس کے بولنے سے وہ لفظ ظاہر ہو رہا ہے جو کہ اس کے عقیدہ و علم و مشاہدہ و معائنہ میں ہے۔

مسئلہ :۔ نَعْبُدُ کا نون جمع کا ہے کیونکہ بندہ اگرچہ فراوانی الطیفہ اور واحدانی فی الحقیقت ہے مگر دراصل بحیثیت اپنے لطیفہ اور ترکیب و شکل و قالب کے غیر وحدانی و فراوانی ہے۔

مسئلہ :۔ انسان کا کوئی جزا ایسا نہیں کہ جس میں حق تعالیٰ کی حقیقت ربانیہ کا ظہور نہ ہو اور ان اجزاء کی لیاقت کے مطابق ان پر عبادت مقرر فرمائی اور یہ اجزاء اگرچہ مدبرہ ہیں مگر ان کے لئے مخصوص تکلیف (جو کہ ان کے ذاتی اعتبارات کے لئے مناسب ہے) مختص ہے اسی جمعیت کو دیکھ کر بندہ عرض کرتا ہے۔

وَلَکَ نُصَلِّی وَنَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَاِیَّاکَ نَعْبُدُ

(ہم تیرے لئے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں اور تیری طرف رجوع رکھتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں اور تیری رحمت کے امیدوار اور صرف تیری عبادت کرتے ہیں)

ف: اسی طرح تمام خطابات جو قرآن مجید میں آئے ہیں ان کا یہی جواب ہے۔ علماء ظواہر سے کسی نے مجھ سے اس مسئلہ کا سوال کیا اور وہ مسئلہ میں بہت حیران تھا۔ میں نے اسے بہت سے جوابات دیے ان میں ایک جواب یہ بھی تھا۔ بِحَمْدِهٖ تعالی اس کی پوری تشفی ہوگئی۔

نکتہ: عبادت کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے اس لیے مخصوص ہے کہ عبادت نہایت درجہ کے خضوع کو کہتے ہیں اور اس جیسا خضوع اس ذات کے لیے شایان ہے جو نہایت درجہ کا منعم ہو اور وہ باری تعالی ایسا منعم ہے کہ اس نے ہمارے لیے نفع بخش چیزیں پیدا فرمائیں اور ہمیں حیات اعلی عطا فرمائی جس سے ہم نفع اٹھا رہے ہیں۔ کما قال اللہ تعالی: كُنْتُمْ اَمْوَاتًا تم مردہ تھے اور فرمایا: جو زمین میں ہے میں نے تمام تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

نکتہ: بندہ کے احوال تین زمانوں سے خالی نہیں:

۱۔ماضی ۲۔حال ۳۔مستقبل

زمانہ ماضی میں اس کو عدم، موت، عجز، جہالت سے منتقل فرما کر حیات، قدرت، علم کا جامہ پہنایا اور زمانہ حال میں اس پر ابواب حاجات کھول دیے اور اسباب ضروریات لازم کردیے انہی وجوہ سے وہ اپنے بندہ کے لیے رب بھی ہے اور رحمٰن و رحیم بھی اور زمانہ استقبال میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے کہ اپنے بندہ کو اعمال کی جزا دے گا معلوم ہوگیا کہ بندہ کے مصالح ان تین زمانوں سے خالی نہیں اور یہ امور سوائے اللہ تعالیٰ کی امداد کے پورے ہو بھی نہیں سکتے لہذا عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔

لغوی بحث: اس کا اشتقاق یا تو عبادت سے ہے یا عبودیت سے عبادت، عابدیت اور عبودیت، عبدیت کو کہتے ہیں اور صلوۃ بلا غفلت، صوم بلا غیبت، صدقہ بلا منت، حج بلا خصومت، صبر بلا شکایت، یقین بلا شبہت، شہود بلا غیب، ایصال بلا قطعیت عبادت کے اقسام ہیں۔

معتقدات و عبادت کے اقسام عبادت کے اقسام:۔ (جن کو حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب اربعین میں فرمائے ہیں) دس ہیں۔ جیسا کہ ان عبادات کے اقسام سے پہلے معتقدات دس ہیں۔

پس وہ ذات ازلی، ابدی جو کہ صفات جلال واکرام جیسی صفات سے موصوف ہے۔ وہی اول وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن ہے۔ یعنی اول ہے اپنے وجود میں اور آخر ہے اپنے صفات وافعال میں اور ظاہر ہے شہادت ومکونات کے ساتھ اور باطن ہے غیبت ومعلومات کی وجہ سے۔ ۲۔ وہ ان چیزوں سے مقدس ہے جو اس کے کمال کے لائق نہیں اور اس کے جمال کو عیب دار کرتی ہے نقائص ہوں یا رذائل۔ ۳۔ اس کی قدرت تمام ممکنات کو شامل ہے۔ ۴۔ اس کا علم تمام معلومات کو محیط ہے یہاں تک کہ چیونٹی کے سخت پتھر پر اندھیری رات میں چلنے کی آواز بلکہ اس سے زیادہ پوشیدہ باتیں جیسے کہ حرکات وسکنات کے علاوہ جتنی مخفی باتیں ہیں سب کو جانتا ہے۔ ۵۔ اس کا ارادہ تمام کائنات کو شامل ہے کوئی کام قلیل ہو یا کثیر، ملک میں ہو یا ملکوت میں اس کی قضا ومشیت کے سوا جاری ہو ہی نہیں سکتا۔ ۶۔ اشیاء کو اوقات معینہ میں پیدا کرنے میں ازل ہے اور نہ اس کی بصر سے تاریکی حائل ہے کانوں کے سوراخ کے بغیر سنتا ہے اور حدقہ واجفان کے بغیر دیکھتا ہے۔ ۷۔ اس کا کلام ازلی اور قائم بذاتہ ہے اس کے کلام کو آواز کی تجی نہیں جیسا کہ مخلوق کا کلام آواز کا محتاج ہے اور قرآن مقروٗ ومکتوب (پڑھا ہوا اور لکھا ہوا) اور محفوظ ہے باوجود اس کے قدیم اور قائم بذاتہ ہے اور سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام بغیر صورت وحرف کے سنا جیسا کہ اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ مولا کریم کی ذات کو بغیر شکل ورنگ کے دیکھتے ہیں (یعنی خواب میں)۔ ۸۔ اس کے افعال خالص دل سے موصوف ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے فضل بے حادث اور اس کے عدل سے فائز نہ ہو۔ کیونکہ اس کے غیر کی طرف کوئی ملک منسوب نہیں۔ جب ہر شے اُس کی مِلک ہے فلہٰذا اس کے تصرف کو ظلم نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس سے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (یعنی اس سے ظلم ممتنع ہے) اور نہ کوئی اس پر واجب ہے بلکہ اس کی ہر نعمت کو فضل اور اس کے ہر عذاب کو عدل کہا جائے گا ۹۔ یومِ آخرت۔ ۱۰۔ نبوت کہ جس میں ملائکہ کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا بھی اہل ہے اور وہ اس قسم کی عبادات یہ ہیں۔ ۱۔ نماز۔ ۲۔ زکوٰۃ۔ ۳۔ روزہ۔ ۴۔ حج۔ ۵۔ تلاوت قرآن۔ ۶۔ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا۔ ۷۔ طلب حلال۔ ۸۔ مسلمانوں کے حقوق میں پابندی صحت کے حقوق۔ ۹۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ ۱۰۔ اتباع سنت جو دراصل سعادت کی کنجی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت ہے۔ کما قال تعالیٰ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ (اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو)

ف:۔ مولانا جامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

یا نبی السلام علیک	انما الفوز و الفلاح لدیک
گر نہ رفتم طریق سنت تو	ہستم از عاصیاں اُمت تو
ماندہ ام زیرِ بار عصیان پست	رفتم از پائے گر نہ گیری دست

ترجمہ:۔ اے نبی پاک! آپ پر سلام ہو۔ فلاح و بہبود آپ کے پاس ہے اگر میں آپ کی سنت پر عمل نہ کروں تو گنہگار ہو جاؤں۔ گناہوں کے بوجھ سے میں نہایت کمزور ہو گیا ہوں۔ اگر آپ دستگیری نہ فرمائیں تو میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

مراتب عباد اللہ:۔ متوجہین الی اللہ کے مراتب کے بیان میں آیا ہے کہ جب بندہ کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو اس سے اس کا ارادہ غیر حق کا ہو تو وہ ابھی تک حُر ہے بندہ نہیں اور اگر کسی خاص امر کا ارادہ نہیں کیا بلکہ اس ارادہ پر نیکی کرتا ہے کہ یہ اچھا امر ہے یا مامور بہ سمجھ کر اس لیے کر رہا ہے کہ اس کا اسے حکم دیا گیا ہے مگر مطلقاً نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ اپنے آمر کے ہاں حضوری کے حصول کی غرض پر تو وہ مرد ہے اگر اس سے زائد مرتبہ حاصل کیا یعنی امر کی ادائیگی کے وقت غیر حق کا ارادہ نہیں کرتا تو یہ کامل فی الرجولیت ہے۔ اگر مذکورہ بالا امور کے ساتھ ساتھ اپنے فعل میں حضور مع الحق ایسا رکھتا ہو کہ نفس کو بالکل ترک کر کے بعین حق، حق کا مشاہدہ کرتا ہو بایں حیثیت کہ مشہود کی اضافت اسی طرح فعل اور اس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا ہو نہ کہ اپنے نفس کی جانب، تو یہ عبد مخلص ہے اور اس کی عبادت خالص ہے اگر اس میں مذکورہ بالا امور کا غلبہ بھی اور ماقبل کے احکام بھی اس میں پائے جاتے ہوں تو یہ مقام فبی یسمع کا ہے (مگر وہ نہ تو ان مذکورہ اشیاء کی کسی شے سے مقید ہے نہ ان کے مجموعہ سے) جس میں ہر مرتبہ و نسبت میں سریان حکم مشہود واحدی کی شمولیت بھی ہے نہ یہ کہ کسی متعین امر میں ثابت ہے۔ بلکہ اپنی فراخی اور اپنے علم صحیح سے (جس سے وہ موصوف ہوا) اور جس سے وہ ہر وقت و ہر حال میں جدا ہوا ہے (نہ غفلت و حجاب سے) ہر وصف و حکم کو قبول کرنے کی وجہ سے ثابت ہے تو یہ کامل فی العبودیت والخلافۃ و الاحاطۃ والاطلاق ہے۔

(کذا فی تفسیر الفاتحہ للصدر القونوی قدس سرہٗ)

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں (اِیَّاكَ نَعۡبُدُ کی تفسیر میں) مرقوم ہے کہ بندہ کے غیبت سے خطاب کی طرف رجوع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مالک و مملوک کے مابین سوائے مملوک کے نفس

کے ملک کے کوئی حجاب نہیں جب اس نے نفس کے ملک کے حجاب کو طے کرلیا تو مالک کے مشاہدہ کے ملک تک پہنچ گیا۔ جیسا کہ حضرت ابویزید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض مشاہدات میں اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ ''یاالٰہی! تجھ تک پہنچنے کی کون سی راہ ہے؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اپنے نفس کو ترک کر کے میرے پاس چلا آ''۔

نفس کے اوصاف چار ہیں:۔

۱۔امّارہ ۲۔لوّامہ ۳۔ملہمہ ۴۔مطمئنہ

پس عبد مملوک کو بھی چاہیے کہ اپنے مالک کو چار صفتوں سے یاد کرے۔

۱۔الوہیت ۲۔ربوبیت ۳۔رحمانیت ۴۔رحیمیت

پھر بعد از مدح الٰہیت وشکر ربوبیت وثنائے رحمانیت وتجید رحیمیت نفس کے ملک کے صفاتِ اربعہ کے حجابات کو ان چار اوصاف مبارکہ کی قوتِ جاذبہ کے طفیل عبور کرتا ہے۔ پھر اپنے نفس کی خرابی کی شبِ ظلمات سے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صبح صادق کے طلوع سے نجات پاتا ہے۔ ان منازل کو طے کرنے کے بعد عبد مملوک کسی شے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ جماد کی مانند عاجز ہو کر رہ جاتا ہے تو پھر اس پر اس کا مالک رحم فرماتا ہے اور اس کو اپنی لسانِ کرم سے اپنا وعدہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ یاد دلاتا ہے اور اسے اپنے پاس بلاتا ہے اور مخاطب ہو کر فرماتا ہے يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ پھر ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ کے پاک جذبہ سے غیبتِ نفس سے نکال کر شہودِ مالکیت میں کھینچ لیتا ہے جس سے عبد مملوک مشاہدہ جمال مالک حقیقی سے مالا مال ہو کر بندہ عاجز ذلیل، خاشع وخاضع کی طرح سامنے کھڑے ہو کر پکار اٹھتا ہے جیسا کہ بعض قرأت میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ کی نداء کی وجہ سے مٰلِكَ يَوْمِ الدِّيْنِ کو منصوب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

ف:۔ نفس دینوی ہے اور عبادت بھی اپنی خواہشات دینوی کی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اور قلب اُخروی ہے اسی لیے عبادت بھی جنت کی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (نفس کو خواہش سے روکا تو جنت اس کا ٹھکانہ) اور رُوح قربی ہے اس لیے عبادت بھی قربت وعندیت کی کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (مالک قادر کے نزدیک ان کا قیام صدق مقعد میں ہے) اور سر حضرتی ہے عبادت بھی حق

تبارک وتعالیٰ کی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس میں فرمایا ہے: سِر" بینی وبین عبدی لا یسمعه فیه ملک مقرب ولا نبی مرسل

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے عبد کو نعمتِ نماز جیسا انعام بخشا تو اس کو اپنے اور بندہ پر دو حصص پر منقسم فرمایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس پر فرمایا:

قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین فنصفها لی ونصفها لعبدی ولعبدی ماسال

پس بندہ اس نصف سے اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال پر حمد وثناء وشکر ادا کرتا ہوا بارگاہِ لایزال کا قرب حاصل کر لیتا ہے اور پھر وہ مالک قدیم بھی محض اپنے کرم وانعام سے بندہ کے قریب ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود فرماتا ہے:

من تقرب الی تقربت الیه ذراعا (جو میرے قریب ہوا میں اس کے بالشت بھر قریب ہوا)

یہ سب اس کے اس نصف کی بدولت ہے جو اس کی بندگی عبودیت غیر سے نجات ہو رہی ہے۔ پھر اس کو خواہشات نفس بد کے ظُلُمٰتٌ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ سے نکالا جاتا ہے اور قلب کی مراد اور روح کے تعلق کو غیر اللہ سے علیحدہ کر کے نورِ وحدانیت اور شہود وفردانیت کے ساتھ معلق کیا جاتا ہے، جس سے اس کے نفس کی زمین اور روح کا عرش اور راز کی کرسی رب کے نور سے چمکنے لگ جاتے ہیں اور ایسے بندگان اپنے معبودِ حق (جو ان کا خالق بھی ہے اور مالک وملک بھی) کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور ان معبودانِ باطلہ (کہ جن کی پرستش میں شب وروز معروف تھے) سے روگرداں ہو کر بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰی کو تھام کر ایک عبادت میں مشغول ہو کر کہتے ہیں اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ

تفسیر عالمانہ

وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ **سوال**:۔ اِیَّاكَ کو دوبارہ کیوں لایا گیا؟

جواب:۔ تاکہ اس بات پر نص ہو جائے کہ جیسے عبادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اسی طرح استعانت (بالاستقلال) بھی اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اَلۡاِسۡتِعَانَةُ بمعنی طلب عون (مدد طلب کرنا)

قانون:۔ یہ باب با کے ساتھ اور بغیر با کے بنفسہٖ متعدی ہوتا ہے اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیری عبادت کرنے پر یا ان چیزوں پر کہ جن کی ہمیں طاقت نہیں ہے یا شیطان (جو کہ تیری عبادت کے مانع ہے) کی جنگ پر یا ان امور پر جو ہمیں دین ودنیا میں فائدہ پہنچائیں تجھ سے امداد طلب کرتے ہیں اور ان اقوال کے لئے جامع معنی یہ ہے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے امداد مانگتے ہیں کہ ہمیں ادائے حق اور اقامت فرائض اور تحمل تکالیف

اور طلب مصالح کی توفیق بخش۔

سوال :۔ عبادت کو استعانت پر مقدم کیوں لائے؟

جواب :۔ ۱۔ تا کہ آیات کے رؤس موافق رہیں۔

۲۔ اس لئے کہ معلوم ہو جائے کہ طلب کے لئے تقدیم وسیلہ سے اجابت جلد تر ممکن ہوتی ہے۔

ف :۔ جب اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہا گیا تو اس سے تکبر و تعجب پیدا ہو گیا۔ پھر اس کے ازالہ کے لئے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ بولا گیا تا کہ تکبر و تعجب بالکل مٹ جائیں۔

نکتہ :۔ اس آیت میں افتخار و افتقار کو یکجا جمع کیا گیا ہے۔ فخر تو اس طرح کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ پڑھنے سے بندہ کو خیال گزرے گا کہ میں عبد بھی ہوں عابد بھی اور افتقار یوں کہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ عبادت مجھے اللہ تعالیٰ کی امداد توفیق سے نصیب ہوئی۔

مسئلہ :۔ اس آیت سے اہل سنت کے مذہب کی تائید ہوگئی کہ فعل کا کسب بندہ سے ہے اور اس کی توفیق اللہ جل جلالہٗ سے ہے جیسا کہ کسب بندہ سے اور فعل کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ سے ہے اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ سے جبریہ کا رد بھی ہے جو کہ بندہ سے کسی فعل کے صدور کے قائل نہیں ہیں اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں معتزلہ کا رد بھی ہے کہ وہ توفیق و خلق من اللہ کے قائل نہیں ہیں۔ پس حق عبادت و استعانت کا یہ ہے کہ سوائے اس مالِک لم یزل کی بارگاہ کے کسی کے آگے نہ سر جھکائے نہ کسی کو مستقل مستعان سمجھے۔

حکایت :۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے جب آپ نے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پڑھا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے جب ہوش میں آئے تو سبب پوچھا گیا، آپ نے فرمایا کہ جب میں نے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پڑھا تو مجھے ڈر ہوا کہ میں اس وقت کیا جواب دوں گا جب مجھے کہا جائے گا کہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پڑھتا تھا تو پھر اطباء و سلاطین کے دروازہ کو کیوں کھٹکھٹایا تھا!

حکایت و فائدہ :۔ استعانت کو مخصوص باللہ کرنے میں حضرت سیدنا خلیل علیٰ نبینا و علیہ السلام کی اقتداء ہے جبکہ وہ نمرود لعین کی قید میں تھے تو اس وقت ان کی خدمت میں سیدنا جبریل علیہ السلام حاضر ہو کر کہنے لگے

کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا حسبی من سوالی علمه بحالی [1] یہاں عبد عرض کرتا ہے الٰہی! میں اس وقت تیرے خلیل علیہ السلام سے عاجزی میں کچھ کم نہیں ہوں کہ تیرے خلیل علیہ السلام کے صرف دونوں ہاتھوں و پاؤں کو باندھا گیا اور میں سب کا سب باندھا ہوا ہوں کہ نہ پاؤں سے چلتا ہوں اور نہ ہاتھوں سے حرکت کرتا ہوں اور نہ آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور نہ کانوں سے سنتا ہوں اور نہ زبان سے بولتا ہوں باوجود اس کے نارِ جہنم کے کنارے پر ہوں۔ پس جیسا حضرت خلیل علیہ السلام سے تجھ پر کچھ کم نہیں عطا فرماتا چنانچہ ان کے لئے فرمایا تھا قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ [2] اور تجھ کو تو نارِ جہنم سے نجات دے کر بہشت کے باغات بخشے۔ بلکہ کلام قدیم کے سننے کی تجھے توفیق بخشی اور نارِ جہنم کو تیرے لیے مامور فرمایا کہ جب اس کے قریب تیرا گذر ہوگا تو تجھے عرض کرے گی: اے مردِ مؤمن! مجھ سے جلد گذر جا کیونکہ تیرے نور نے میرے شعلوں کو سرد فرمادیا۔ سیدی مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

آتش عشق از یں روائے صفی | می شود دوزخ ضعیف و منطفی
گویدش بگور سبک اے محتشم | ورنہ ز آتشہائے تو مرد آتشم

ترجمہ: ایسے نیک بخت سے دوزخ بھی کمزور ہو کر بجھ جائے گی اور عرض کرے گی یا حضرت! جلد گذر فرمائیے ورنہ آپ کے عشق کے شعلوں سے میری گرمی مٹ جائے گی۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تعلق: ۱۔ امداد مطلوبہ کا بیان ہے گویا کہا گیا ہے (اے میرے بندے) میں تمہاری مدد کیسے کروں؟ تو بندوں نے عرض کی: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۲۔ نیز عبادت کے بعد دعا مانگنا قاعدہ شرعیہ (بھی) ہے۔

ف: ۳۔ تفسیر تیسیر میں ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں توحید کا اظہار ہے اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں توحید کی امداد طلب کرنا ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں دین پر ثابت رہنے کی استدعا تحقیق عبادت اور اس پر ثابت رہنے کا نام ہے۔ کیونکہ ہدایت پر ثابت قدم رہنا جمیع حاجات کا خلاصہ ہے اسی لیے اس کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام علیہم الرضوان نے طلب فرمایا ہے۔ کما قال یوسف علیٰ نبینا وعلیہ

[1] سوالی کی ضرورت نہیں وہ میرے حال کو خوب جانتا ہے۔ [2] اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔

السلام :۔ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا اے اللہ مجھے مسلمان فوت کرنا۔ اور فرعون کے جادوگروں نے (بعد از اسلام) کہا تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ اور صحابہ کرام نے عرض کیا: تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ اے اللہ ہمیں ابرار کے ساتھ فوت کرنا۔

یہ استدعا اس لیے ہے کہ ظاہر حال پر اعتماد نہ کیا جائے کیونکہ انجام کبھی تبدیل ہو جاتا ہے جیسے ابلیس و برصیصا و بلعم بن باعوراء کا حال ہوا۔ سیدی مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں ۔

صد ہزاراں ابلیس و بلعم در جہاں — ہم چنیں بودست پیدا و نہاں

ایں ہر دو را مشہور گردانید اللہ — تا کہ باشند ایں دو بر باقی گواہ

ایں دو دزد آویخت بر دار بلند — ورنہ اندر قہر بس دزداں بدند

ترجمہ :۔ بیشمار ابلیس اور بلعم ایسے ہی پوشیدہ اور چھپے ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے صرف ان دو کو مشہور فرمایا تا کہ ان دو کو دوسروں کی علامت بنائی جائے صرف ان دو کو سولی پر لٹکایا ورنہ ان جیسے ہزاروں چور اور بھی ہیں

تفسیر صوفیانہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں ہے کہ جب اس کلمہ کو عارف واصل باللہ کہتا ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اے اللہ! ہمیں اپنی سیر کے طریق پر چلا تا کہ ہم سے ہمارے احوال کے ظلمات مٹ جائیں اور ہمارے ابدان کے پردے ہم سے ہٹ جائیں پھر ہم تیرے مقدس نور سے نورانی ہو کر تجھی کو دیکھیں۔

مسئلہ :۔ مولانا فناری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیر فی اللہ غیر متناہی ہے جیسا کہ قطب المحققین فرماتے ہیں کہ معلومات و مقدورات الٰہیہ کی کوئی انتہا نہیں، پس جہاں تک معلوم و مقدور ہے نہ بندہ کا شوق سکون پاتا ہے اور نہ وہ زائل ہوتا ہے۔

قانون :۔ فعل ہدایت کو لام اور الی سے متعدی کر کے اس کے ساتھ اختیار (جو کہ قرآن پاک میں وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ واقع ہوا ہے) جیسا معاملہ کیا جاتا ہے (یعنی مفعول ثانی کی طرف بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے)

قانون :۔ صراط مستقیم ملتِ اسلام اور دینِ حق سے استعارہ ہے۔ وسیلہ مقصود کو وسیلہ مقصد سے، محل روحانی کو محل جسمانی سے تشبیہ دینا ہے۔

سوال :۔ دین کو صراط کیوں کہتے ہیں؟

جواب :۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اگرچہ مکانات سے ارفع واعلیٰ ہے مگر چونکہ بندہ کو قطع مسافات و مس آفات اور تکالیف کا نشانہ بنا لازم ہوگا تا کہ وصال و موافات سے نوازا جائے (اور یہ چیزیں دین کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں بنا بریں اس کا نام صراط ہوا) باوجود ہدایت یافتہ ہونے کے پھر ہدایت کی طلب کرنے میں کئی نکتے ہیں:

نکات :۔ ۱۔اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد اس راہِ راست کی معرفت ضروری ہے جو اعمال شہوانیہ و غضبانیہ اور انفاقِ مال کے مابین افراط و تفریط سے پاک ہو اور مطلوب بھی یہی ہے کہ راہِ راست کی ہدایت نصیب ہو۔

۲۔اگرچہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت دلیل سے ثابت ہوگی مگر وہاں دلائل بھی ہوں گے۔تو پھر اِهْدِنَا کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اے اللہ! ہمیں وہ عرفان نصیب فرما جس کی وجہ سے ہر شے میں عین تیری ذات و صفات اور افعال کی معرفت کے دلائل کے جلوے نظر آئیں۔

۳۔اِهْدِنَا کا معنیٰ بموجب قولہ تعالی وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا ماسوا اللہ سے اعراض کی طلب ہے اگرچہ اس کا اپنا نفس کیوں نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف بالکلیہ متوجہ ہونے کی طلب میں اگرچہ بحکمِ ایزدی اپنے پیارے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہو جیسے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کا حکم یا خود ذبح کے لئے تیار ہو جانا پڑے جیسا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ذبح ہونے کے لئے تیار ہو گئے یا اپنے آپ کو دریا میں پھینکنا پڑے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے کیا باوجود اعلیٰ درجات پر فائز ہونے کے تکالیف کا نشانہ بننا پڑے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں قتل یا ٹکڑے ٹکڑے ہونا پڑے تو صبر سے کام لے جیسا کہ حضرت یحییٰ و حضرت زکریا علیہما السلام نے کیا۔

ف :۔ یہ مقام بڑا خطرناک ہے۔اس صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں آسانی ہے بہ نسبت اس کے کہ اگر فرماتے صراط الذین قتلوا وضربوا ،اور اس میں بحیثیت انعام کے انبیاء و اولیاء علیہم السلام کے مقام کی طرف ترغیب ہے۔

استقامت کے فضائل :۔ استقامت اور پھر اس پر ثابت قدم رہنا بڑی مشکل بات ہے۔چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سورۂ ہُود اور اس کی ہم مثل سورتوں نے بوڑھا کیا۔کیونکہ اس میں فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ کا حکم ہے۔وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے قوائے ظاہریہ و باطنیہ سے تین چیزوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔صفات ۲۔اخلاق طبعیہ ۳۔روحانیہ

ان تینوں کے لئے افراط وتفریط کی دو دو طرفیں ہیں تو ان میں سے طرفِ وسط کی پہچان اور اس پر ثابت قدم رہنا ضروری ہوا۔ چنانچہ اسی پر بہت سی آیات ونصوص دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ قال تعالی وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً الخ اس میں بخل واسراف میں اعتدال کی ترغیب ہے۔ ۲۔حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس صحابی کو جس نے گوشہ نشینی اور صیام الدہر وقیامت اللیل کی درخواست پیش کی۔ زجر وتوبیخ کے بعد فرمایا: تجھ پر تیرے نفس کا حق ہے اور تیری زوجہ کا تجھ پر حق ہے اور تیرے ملاقاتیوں کا تجھ پر حق ہے۔ پس روزہ رکھو اور افطار بھی کرو۔ رات کو قیام بھی کرو اور نیند بھی۔ اسی طرح اپنے جمیع امور میں فرمایا:

۳۔ قال تعالیٰ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا (اپنی نماز میں نہ آواز بلند کرو اور نہ پست)

۴۔ وقال تعالی لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (اور نہ ہی وہ حد سے بڑھے اور نہ ہی تنگی، اور وہ اس کے درمیان میانہ رو ہیں)

۵۔وقال تعالی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ (نہ ہی آنکھ ٹیڑھی ہوئی اور نہ بہکی)

۶۔ایک روز حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اونچی آواز سے قرآن پڑھتے سنا تو آپ نے سبب پوچھا۔ عرض کی: حضور! سوتوں کا جگاتا ہوں اور شیطان کو ہٹاتا ہوں آپ نے انہیں فرمایا: آواز ذرا نیچی رکھو پھر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے تو ان کو آہستہ قرأت کرتے پایا۔ ان سے سبب پوچھا عرض کی: حضور! جس ذات سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہے اس کو تو سنا رہا ہوں آپ نے فرمایا اس سے ذرا اونچی آواز سے پڑھا کرو۔ اسی طرح تمام عادات اوخلاق میں میانہ روی چاہیے۔ (مثلاً شجاعت ایک بہتر وصف ہے جو دلیری اور بزدلی کا درمیانہ امر ہے) اسی طرح بلاغت بھی اعلیٰ وصف ہے جو ایجاز ناقص اور اطناب زاید کے مابین ہے۔

ف:۔ ہماری شریعت بھی میزانِ اعتدال کی دلیل ہے ہر ترغیب وترہیب میں اور ہر حکم ووصف وخلق میں یہاں تک کہ صفتِ مذمومہ کے حدود بھی بیان فرمائے۔ مثلاً جس وقت صفتِ مذمومہ کو اس حدِ شرعی کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ صفت مذموم محمود ہو جاتی ہے جیسے کسی کو برائی سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے روکنا یا کسی کے ساتھ اللہ

تعالیٰ کی رضا کے لئے بغض رکھنا (اگر چہ یہ فعل مذموم ہے مگر جب رضائے الٰہی مدنظر ہو تو یہ صفتِ مذموم محمود ہو جائے گی)

مستقیم کے اقسام:۔ مستقیم کئی قسم پر ہے:

۱۔ **مستقیم بفعله وقوله وقلبه**

۲۔ **مستقیم بفعله وقوله دون قوله**

(یعنی کسی کو اپنی استقامت کا پتہ نہ دے۔ ان دونوں کے لئے کامیابی ہے مگر پہلے کا درجہ اعلیٰ ہے)

۳۔ **مستقیم بفعله وقوله دون قبله** (اس کے لئے بھی غیر سے نفع کی امید ہے)

۴۔ **مستقیم بقوله وقلبه دون فعله**

۵۔ **مستقیم بقوله دون فعله وقلبه**

۶۔ **مستقیم بفعله دون قوله وفعله**

۷۔ **مستقیم بفعله دون قوله وقلبه**

ان چاروں (اواخر کے) عامل کو سراسر نقصان ہے ان کو نفع کی امید بھی نہیں چاہیے۔ اگر چہ مراتب میں یہ چاروں ایک دوسرے سے ادنیٰ و اعلیٰ ہیں۔

ف:۔ استقامت بالقول سے یہ مراد نہیں کہ غیبت و چغلی یا ان جیسے اور قبیح افعال کا ترک ہو۔ ان کو تو استقامت بالفعل بھی شامل ہے بلکہ استقامت بالفعل سے یہ مراد ہے کہ کسی کو راہِ راست کی رہنمائی کی جائے۔

ف:۔ جس کی طرف راہ دکھائی جاتی ہے اس بات سے یہ استقامت خالی بھی ہوتی ہے۔ استقامت بالفعل والقول والقلب کے اجتماع کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک مرد مسائل فقہ سے واقف ہے اور پوری تحقیق سے اس کے مسائل کا عالم بن کر کسی کو یہ مسائل سکھادے اس معنیٰ پر یہ شخص مستقیم بالقول ہے اور جب نماز کا وقت آ گیا تو بہ مطابق مسائل ظاہری ارکان کے موافق نماز ادا کی تو اس بنا پر یہ شخص مستقیم بالفعل ہے۔ پھر اسے علم ہوا کہ نماز میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ سے اللہ تعالیٰ کی مراد حضور قلب ہے تو نماز میں حضورِ قلب بھی کیا تو اس اعتبار سے یہ شخص مستقیم بالقلب ہے۔ علیٰ هذا القیاس باقی اقسام۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ ہدایت تینگھ قسم پر ہے۔

ہدایت عامہ: یعنی عام حیوانات کو حصول منافع اور ترک نقصانات کی ہدایت کرنا۔ والیہ اشارہ قولہ تعالیٰ:
الَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی اللہ نے ہر شئے کو صورت عطا کر کے ہدایت دی اور فرمایا
وَهَدَیۡنٰهُ النَّجۡدَیۡنِ ہم نے دو راستے بتائے۔

ہدایت خاصہ: یعنی مؤمنوں کو جنت کی راہ دکھلانا۔ والیہ اشارہ قولہ تعالیٰ: یَهۡدِیۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِاِیۡمَانِهِمۡ
اللہ انہیں ان کے ایمان کی ہدایت دیتا ہے۔

ہدایت اخص: درحقیت ہدایت اسی کا نام ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کی ذات کی رہبری کرنا۔ چنانچہ یہ آیات اس معنیٰ کی طرف اشارہ فرماتی ہیں۔

۱۔ قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی فرمایا بیشک ہدایت صرف اللہ ہی کی ہے۔

۲۔ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں وہی مجھے ہدایت دے گا۔

۳۔ اَللّٰهُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ۴۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی

یعنی آپ اپنے صحرائے وجود میں محوِ خیال تھے تو ہم نے آپ کو اپنے وجود سے طلب فرمایا اور آپ کو اپنے فضل ولطف میں پایا اور اپنے جذبات عنایت ونورِ ہدایت سے آپ کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہوں۔ اب جو آپ کی تابعداری کریں گے اور آپ کی رضا کے طالب ہوں گے تو ان کو بشری وجود کی تاریکیوں سے نکال کر وجودِ روحانی کے نور تک پہنچادوں گا اور ان کو راہِ راست کی ہدایت بھی دوں گا۔ کما قال تعالیٰ:
قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ

صراط مستقیم: وہ دین قویم ہے کہ جس کی شہادت قرآن پاک میں درج ہے یعنی سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خلق مبارک۔ کما قال تعالیٰ: وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ بیشک آپ عظیم خلق والے ہیں

ف: صراط مستقیم سے مراد بہشت کی راہ ہے جو کہ اصحاب یمین کے لئے ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:
وَاللّٰهُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ اور اللہ دار السلام کی دعوت دیتا ہے۔

ف: صراط مستقیم سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کا سلوک جو کہ سابقین مقربین کے لئے ہے کما قال تعالیٰ: اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ

ف:۔ ہر وہ راہ جو اصحاب یمین کو نصیب ہو وہ سابقین مقربین کو بھی حاصل ہے کیونکہ اصحاب یمین کو جو شہود وجمال اور کشف وجلال حاصل ہوئے۔ سابقین مقربین حضرات کو ان سے پہلے نصیب ہوئے اور یہ سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ذات پاک کا خاصہ ہے یا ان کے صدقے ان کے تابعداروں کو بھی ہوا کما قال اللہ تعالیٰ: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں ۔

اگر جز بحق میرود جادہ ات ۔۔۔ بر آتش نشاند سجادہ ات

ترجمہ:۔ تیرا ٹھکانہ جہنم ہے اگر تیرا طریقہ صحیح نہ ہو۔

تفسیر عالمانہ

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یہ جملہ اول جملہ سے بدل الکل ہے اور انعام بمعنی ایصال نعمت ہے اور یہ دراصل اس حالت کا نام ہے جس سے انسان لذت پائے پھر اس کا اس لذت پر اطلاق کیا گیا جو دین سے حاصل ہوتی ہو۔

ف:۔ ابو العباس ابن عطا فرماتے ہیں کہ منعم علیہم (جن حضرات پر انعام کیا گیا) کے کئی طبقات ہیں:

۱:۔ عارفین، ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا انعام کیا۔

۲:۔ اولیاء، ان پر صدق ورضا اور یقین وصفوۃ کا انعام ہوا۔

۳:۔ ابرار، ان پر علم ورافت کا لطف ہوا۔

۴:۔ مریدین، ان کو حلاوت طاعت کا لطف ہوا۔

۵:۔ مؤمنین، ان پر استقامت کا فضل ہوا۔

بعض کہتے ہیں کہ منعم علیہم انبیاء وصدیقین وشہداء وصالحین ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ

ف:۔ یہاں صِرَاط کی اضافت بندوں کی طرف ہے اور وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا میں اللہ تعالیٰ نے صراط کو اپنی طرف مضاف کیا، جیسا کہ دین وہدایت کو بھی اپنی طرف مضاف کیا۔ کما قال تعالیٰ: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ اور اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى اور کبھی بندوں کی طرف بھی کما قال تعالیٰ: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

اور فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ہدایت و دین وصراط کو کبھی اپنی طرف اور کبھی بندوں کی طرف مضاف کرنے چند نکتے ہیں:

نکات: ۱۔ یہ اشیاء اس نے مشروع فرمائیں صرف ہمارے نفع کے لئے۔ کما قال تعالیٰ: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ تمہارے لئے دین شروع فرمایا۔

۲۔ ان میں اس کی رضامندی واختیار ہے اور ہمارا کام ہے ان پر چلنا اور فرماں برداری۔

۳۔ جب اپنی طرف انہیں مضاف کیا تو بندہ کی رعونت کا قلع قمع کیا (کہ سب اشیاء اس کے قبضہ قدرت میں ہیں) پھر بندہ کی طرف مضاف کیا تا کہ اسے تسلی ہو۔

۴۔ بندہ کی طرف مضاف کرنے میں اس کی عزت افزائی کی اور اپنی طرف مضاف کیا تا کہ شیطان کو دخل اندازی کا طمع نہ ہو۔ جیسا کہ منقول ہے کہ جب آیت وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ نازل ہوئی تو شیطان نے کہا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت چھیننے پر قادر نہیں ہوں لیکن مومنین کی عزت ضرور چھین لوں گا تو اللہ تعالیٰ نے فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا فرما کر اسے طمع سے مایوس فرما دیا۔

(كذا في التيسير)

ف: صراط کے تکرار میں اس طرف اشارہ ہے کہ صراط دراصل دو ہیں:۔

۱۔ عبد سے رب کی طرف۔ ۲۔ رب سے عبد کی طرف۔

وہ راستہ جو عبد سے رب کی طرف ہے وہ خطرناک ہے کہ بہت سے قافلے اس میں لٹ گئے اور بہت رہ گیر اس میں رہ گئے اور منادی عزت اہل عزت کو ندا دیتا ہے کہ اس راہ کی طلب مردود اور راہ مسدود ہے کیونکہ اس راہ پر جانے والے پر ڈاکہ زنی ہوتی ہے۔ چنانچہ شیطان ملعون کا قول قرآن پاک میں ہے لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ لیکن وہ راہ جو رب سے عبد کی طرف ہے پر امن ہے اس راہ پر چلنے والے بسلامت جاتے ہیں اور ان کی منزلیں نعمتوں سے پُر ہیں۔ اس راہ پر چلنے والوں کو آسانی میسر ہوتی ہے۔ ان کے قائدین انبیاء و صدیقین اور شہداء وصالحین ہیں۔ یہ وہ قائدین ہیں جن کے قلوب اللہ تعالیٰ کے انوار سے پر اسرار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فیوضات وتجلیات کی بارش کے مورد ہیں اور شیطان کے مکر وفریب اور عیاریوں سے انہیں معصوم ومحفوظ ومامون فرمایا گیا ہے۔

ف: نعمتیں ظاہری ہیں یا باطنی۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کو مع کتابوں کے بھیجنا اوران کی دعوت کو قبول کرنے کی توفیق بخشنا اور اتباع سنت واجتنابِ بدعت اور پھر نفس کو اوامر ونواہی کا پابند کردینا اور صدق پر ثابت قدمی عنایت فرمانا اور عبودیت کالزوم عطا فرمانا وغیرہ۔

تفسیر صوفیانہ ارواح پر ابتدائے فطرت میں اپنے نور کے قطرات برسائے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو ظلمت میں پیدا فرما کر پھران پر اپنے نور کے قطرات برسائے۔ جس شخص پر اس نور سے کچھ پہنچا وہ ہدایت یافتہ ہو گیا اور جو اس سے محروم رہا وہ گمراہ ہو گیا۔ گویا صراط اللہ کی راہ کھلنا اس نور سے ہے اور پہلی بارش وہی قطرات ہیں جس کی وجہ سے مؤمنین برسانے والے کے مشاہدات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں اور ہمیشہ اور ہمیشہ اس ابرِ رحمت کے منتظر ہو کر بارگاہِ لم یزل میں عرض کرتے ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی ہمیں ان لوگوں کی راہ پر چلا کہ جن پر تو نے اپنے الطاف خاص کے دروازے کھولے، جس کی بدولت تیری امداد سے تجھی کو پایا اور انہوں نے تجھے پالیا ان الطاف کے واسطے جو تو نے انہیں عنایت کیے۔ (كذا فی التاویلات النجمیه)

تشریح حدیث شریف: شیخ صدرالدین قونوی قدس سرہٗ اس حدیث کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ وجود محض کے مقابلہ میں عدم (جو وجود کی نقیض ہے) سمجھا جاتا ہے کیونکہ لامحالہ عدم کے لئے تعین متعین ہے اور عدم کے لئے ظلمت ہے جیسا کہ وجود کے لئے نور ہے۔ اس لیے ممکن کو ظلمت سے موصوف کیا جاتا ہے کیونکہ ممکن وجود سے نور پا کر ظاہر ہوتا ہے پس ظلمت ممکن عدم کی ایک وجہ سے ہے جو اسے متصل ہے اور ہر وہ کمی جو ممکن کو لاحق ہوتی ہے (اور اس کمی سے ممکن موصوف بھی ہوتا رہتا ہے) یہ اس نسبت عدمیہ کے احکام سے ہے۔ اسی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مذکورہ میں اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ ۔۔۔۔ الخ، و الخلق فی ظلمة.. الخ (جس کا ترجمہ اوپر گزرا) اشارہ ہے اور اس حدیث شریف میں خلق بمعنیٰ تقدیر ہے کیونکہ ایجاد سے سابق ہے اور رش النور سے ممکنات پر وجود کا پہنچنا مراد ہے۔

تفسیر عالمانہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ یہ الَّذِيْنَ سے بدل ہے معنی یہ ہے کہ منعم علیہم وہ لوگ ہیں جو غضب اور گمراہی سے بچ گئے۔ کلمہ غَيْرِ کے تین معنی ہیں:

۱۔ بمعنیٰ مغایرت، فارسی میں بمعنیٰ جز۔ قال تعالیٰ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ تاکہ تو اس کے سوا ہمیں افترا کرے

۲۔ بمعنیٰ لا، فارسی میں بمعنیٰ نہ، قال تعالیٰ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ تو جو مجبور ہو جائے نہ بغاوت سے نہ حد سے بڑھ کر۔

۳۔ بمعنیٰ الاّ، فارسی میں بمعنیٰ مگر، قال تعالیٰ فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ تو ہم اس میں نہیں پایا سوائے مسلمانون کے گھر کے۔ یہاں ہر سہ معانی کا معنی متحمل ہے۔

ف: جب غَیْرِ بمعنی استثناء (الاّ) ہو تو غَیْرِ کو منصوب پڑھنا ہوگا اور غضب بمعنیٰ بدلہ کے وقت نفس کا جوش کرنے اور دل کے خون سے انتقام کے ارادہ سے حاصل ہوتی ہے اور یہاں بمعنیٰ رضا کی نقیض ہے یا ارادہ انتقام یا تحقیق الوعد یا اخذ الیم یا بطش شدید یا ہتک استار، یا تعذیب بالنار مراد ہے۔ کیونکہ علم تفسیر کا قاعدہ ہے کہ وہ افعال کہ جن کے اوائل بدایات اور اواخر غایات ہوں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف باعتبار ہدایت کے غیر ممکن ہوں تو اسناد کے وقت ان کے غایات کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ جیسے غضب وحیا اور تکبر واستہزا وغیرہ۔ اسی طرح غم وفرحت اور ضحک وبشاشت وغیرہ اور ضلال بمعنی سیدھی راہ سے عمداً یا خطاً ہٹ جانا۔

مسئلہ: الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر غضب کیا گیا) سے بے فرمان اور الضَّآلِّیْنَ سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے جاہل لوگ مراد ہیں۔ کیونکہ منعم علیہم وہ لوگ ہیں جو جامع بین العلم والعمل ہیں۔ اب ان کی نقیض وہ لوگ ہوں گے جو ان دونوں قوتوں عاقلہ وعاملہ میں کسی ایک میں سے ناقص ہوں پس عمل سے ناقص مغضوب علیہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قاتل بالعمد کے متعلق فرماتا ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ تو حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے یہودی مراد ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ان کے حق میں فرماتا ہے: مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ (جس پر اللہ نے لعنت وغضب فرمایا) اور الضَّآلِّیْنَ سے نصاریٰ مراد ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے: قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا اس سے پہلے وہ گمراہ ہوئے اور گمراہ کیا۔

ف: غضب سے یہود کی طرف اور ضال سے نصاریٰ کی طرف منسوب ہونے سے تخصیص مراد نہیں کیونکہ غضب کی نسبت قرآن پاک میں نصاریٰ کی طرف بھی ہوتی ہے اور اسی طرح ضلال کی نسبت یہود کی طرف بھی، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب یہ دونوں متقابل ہوں اور جبکہ غضب بمعنیٰ ارادہ انتقام ہو تو اس معنی یہود زیادہ لائق ہیں۔

کیونکہ یہ لوگ کفر کرنے میں بڑے سرکش ہیں۔ مثلاً حد سے تجاوز کرنا اور انبیاء علیھم السلام کو شہید کرنا اور ان کا یہ قول: لَقَدْ اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ بیشک اللہ فقیر ہے اور ہم غنی۔

سوال:۔ اگر اعتراض پیدا ہو کہ جب منعم علیھم ان دونوں فرقوں کے غیروں کو کہتے ہیں کہ تو پھر منعم علیھم کے بعد صرف ان کے ذکر سے کیا فائدہ۔

جواب:۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ منعم علیھم ایمان کے وصف کو کمال رجاء (جس کو اللہ تعالیٰ نے اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے تعبیر فرمایا ہے) سے بیان کرنے کے بعد ان دونوں فرقوں سے منعم علیھم کے ایمان کے وصف کو کمال خوف سے ذکر کرنا مطلوب ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر مومن کے خوف ورجاء کو تولا جائے تو دونوں برابر ہوں گے۔

ف: غضب الٰہی کا حکم مرتبہ قبضہ بائیں ہاتھ کی تکمیل ہے اگرچہ اس کے دونوں مقدس ہاتھ مبارک ہیں لیکن ہر ایک کا حکم ایک دوسرے کے خلاف ہے تمام زمین اس کی ایک مٹھی ہے اور تمام آسمان اس کے سیدھے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اسی لیے اس کے ایک ہاتھ کے لئے عموم سعادت، رحمت اور نرمی اور دوسرے ہاتھ کے لئے قہر وغضب اور اس کے لوازمات کو منسوب کیا جاتا ہے۔

نکات: ۱۔ غضب کے حکم میں راز وہی تکمیل ہے جس کی طرف دونوں ہاتھوں کے مابین جمع کرنے کا اشارہ کیا گیا ہے

۲۔ غضب کرنے میں اپنے بندے کی حفاظت کرنا مقصود ہے جیسے آکلہ کا مریض جبکہ اس کے کسی عضو کے کاٹنے میں عجلت کریں گے اس لیے کہ اس میں اچھا ہونے کی صلاحیت نہیں رہی۔

۳۔ غضب کرنے سے اپنے بندے کو پاک کرنا ہے، جیسے سونا کہ جس میں قلعی اور تانبہ کی ملاوٹ ہو تو اس سونے کو قلعی وتانبہ کی ملاوٹ سے پاک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سونے کو جلتی آگ میں ڈالا جائے۔

تفسیر صوفیانہ

ضلال حیرت کو کہتے ہیں، یہ دو قسم ہے۔ ۱۔ مذموم۔ ۲۔ محمود۔

حیرت محمودہ کے تین مراتب ہیں:

۱۔ مبتدیوں کی حیرت۔ ۲۔ اہل کشف وحجاب کے متوسطین کی حیرت۔ ۳۔ اکابر محققین کی حیرت۔

پہلی یعنی مبتدیوں کی حیرت پانچ چیزوں سے دفع ہوتی ہے:

i۔ موصل راجح کو متعین کرنا، مثلاً اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے قرب وشہود ذاتی کی طلب۔

ii۔ موصل الی المطلوب کی راہ کی پہچان، مثلاً شریعتِ کاملہ پر ثابت قدم رہنا۔

iii۔ وہ سبب جو مقصود حاصل کرادے، مثلاً مرشد کریم کا دامن پکڑنا۔

iv۔ اپنے مقصود کی تحصیل پر مدد دینے والی چیزوں کا التزام رکھنا، جیسے ذکر وفکر وغیرہ۔

v۔ مقصود سے روکنے والی چیزوں کی معرفت پھر اس کو دفع کرنے کی تجاویز کی پہچان، جب یہ پانچ چیزیں حاصل ہو جائیں گی تو حیرت خود بخود ہٹ جائے گی۔ اور اکابر کی حیرت سب کی سب محمود ہے اس میں گمان بھی نہ لانا کہ ان کی حیرت کا سبب قصور فی الادراک ہے اور کمال جلاوا ستجلاء سے نقص مانع ہے بلکہ یہ ایک ایسی حیرت ہے کہ جس کا حکم بعد کمال تحقیق بالمعروف والشھود اور ہر راز کے وجود کے معائنہ اور احدیت کے وجود پر اطلاع تام کے ہوگا

ف: تفسیر نجمیہ میں ہے کہ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ۬ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو وہ نور مسطورہ بالا نہ مل سکا تو خواہش نفسانی کے جنگل میں گم ہو کر طبع وتقلید کی ظلمتوں میں جا پڑے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہود کی طرح غضب فرمایا اور طرد وتبعید کے ساتھ ملعون بھی ٹھہرایا۔ یہاں تک کہ شرع قویم کی طرف ہدایت نہ پا سکے اور صراطِ مستقیم سے بھی ہٹ گئے یعنی مرتبہ انسانیت (جسے فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس میں انسان کو پیدا کیا گیا ہے) سے دور ہو کر بندر وخنزیر سے مسخ ہو گئے صورتاً بھی اور معناً بھی۔ یا جس وقت راہِ راست سے بھٹک کر سدِ بشریت میں پڑے تو الطافِ ربوبیت کو بھلا دیا۔ اور راہِ توحید سے چوکے تو شیطان نے ان کے شرک کرانے پر تسلط پا لیا جیسے نصاریٰ نے اپنی خواہشات اور دنیا کو معبود سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے لئے کہتے تھے ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلایا تو اللہ تعالیٰ نے بھی بے توجہی فرمائی۔ یہ تقریر بموافق حال اوّل کے ہے۔ اس میں ایک وجہ اور بھی ہے اور اس وجہ میں عارض المآل معتبر ہے وہ وجہ یہ ہے کہ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ ---- الخ سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جس کو حضو کی غیبت اور سرور کے بعد محنت اور نُور کے بعد ظلمت نصیب ہوئی (نعوذ باللہ من الحور بعد الکور)

تفسیر عالمانہ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ یعنی ان لوگوں کی راہ نہ دکھا جنہوں نے فسق وفجور کے غلبہ سے سرور کو سرور کی تبدیلی کی وجہ سے گمراہ ہوئے اس میں تیسری وجہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ (صراط

مستقیم کو) ملک الملوک کی طرف راہ چلنا مراد ہو (اب معنیٰ یوں ہوا کہ یا اللہ! ان لوگوں کی راہ پر نہ چلا کہ منازل کو طے کرنے سے رُک کر قافلوں سے منقطع ہوئے تو تو نے ان پر غضب کیا اور نہ ان گمراہوں کی راہ پر چلا جو مقصود سے دُور ہوئے)

آمِيْنَ آمِيْنَ اسم فعل بمعنیٰ استجب ہے یا بمعنیٰ افعل یا رب ہے۔

قانون:۔ یہ لفظ اَیْنَ اور کَیْفَ کی طرح التقائے ساکنین کی وجہ سے مبنی علی الفتح ہے۔

مسئلہ: سنت یہ ہے کہ اسے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد ایک دفعہ پڑھا جائے جیسا کہ ذیل کی حدیث بتاتی ہے

۱۔حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے جبریل علیہ السّلام نے آمین سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سکھائی اور عرض کیا کہ فاتحہ کے لئے آمِيْنَ ایسی ہے جیسے کتاب کی مُہر۔

ف: سیدنا علی کرم اللہ وجھہ، اس حدیث کی توضیح فرماتے ہیں کہ آمِيْنَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کی مُہر ہے جس سے اپنے بندہ کی دعا پر مہر لگاتا ہے۔

نکتہ:۔ جس طرح مہر لگے ہوئے لفافہ کے بعد مکتوب الیہ بغیر کسی کو مطلع ہونے اور تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اسی طرح آمین بندہ کی دعا کو نقصان سے محفوظ کرتی ہے۔

۲۔حضرت وہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آمین کے ہر حرف سے ایک ایک فرشتہ پیدا کیا جاتا ہے اور وہ فرشتے آمین کہنے والے کے لئے بخشش کی دعا طلب کرتے رہتے ہیں۔

مسئلہ:۔ حدیث شریف میں ہے کہ دعا مانگنے والا اور آمِيْنَ کہنے والا دونوں دعا میں شریک ہیں۔اسی لیے حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے فرمایا: قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا حالانکہ فقط موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور ہارون علیہ السلام نے آمین کہی مگر باری تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف منسوب فرمایا۔

۳۔حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو آمِيْنَ کہو کیونکہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے بعد فرشتے بھی آمین کہتے ہیں پس جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہوگا تو اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اس حدیث کا نکتہ حضرت وہب کے قول میں مذکور ہو چکا ہے۔

شرح:۔ ملائکہ کی موافقت میں علماء کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں زمانہ کی موافقت، بعض کہتے ہیں اخلاص اور توجہ احدی

یعنی انسان کے نگران فرشتے ہیں، بعض کہتے ہیں ان کے غیر ہیں اس کی تائید حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے "فان وافق قوله قول اهل السماء الخ" تو جس کا قول اہل آسمان کے قول کے موافق ہوا

ف: ان دونوں اقوال کا توافق یوں ہوسکتا ہے کہ دونوں مراد ہوں حفظہ بھی اور اہل سماء بھی۔

تفسیر صوفیانہ مولانا فناری رحمۃ اللہ علیہ الباری فاتحہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ فاتحہ اس شخص کے لیے نسخہ کمال ہے جو ظلمتِ عدم سے نکل کر تکمیل تک پہنچا اور استہلاک نور قدم سے خارج ہو کر انوار روحانیت کی طرف چلا۔ پھر نفخ کے واسطہ سے عالمِ جسمانیہ کی طرف پہنچ جائے تا کہ اس مرتبہ انسانیت کی تکمیل ہو جائے کہ جس کی جمعیت میں انانیت کا گمان ہے۔ بدیں وجہ جس راہ سے آیا ہے اس کی طرف ہدایت کی طلب کی محتاجی درپیش ہوئی تا کہ وجود سے عدم کی طرف حدوث سے قدم کی طرف واپسی ہو۔ پس سالک موجود کو ایسا مقصود سمجھے کہ گویا اس کا حاصل ہونا پھر ناممکن ہے (اسی خیال سے) اسے گم شدہ مقصود ایسا حاصل ہو جائے گا کہ پھر اس کے مٹ جانے کا احتمال بھی باقی نہ رہے۔

ف: جب بندوں کو اس سوال کے قبول ہونے کے بعد مرتبہ کمال ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا العبدی ماسأل میں وعدہ تھا پھر اپنی طرف العبدی میں لا تعلیک کے ساتھ مضاف کیا پھر اکرم الا کرمین نے اس دعا کو آمین کی مُہر سے ختم فرمایا:

ف: یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے مخلص ہیں کہ عام دنیا میں کسی کو طاقت نہیں کہ ان پر تصرف کر کے اللہ تعالیٰ کی لگائی ہوئی مہر کو توڑ سکے۔ اسی لیے تو شیطان خبیث (مخلص بندوں سے) ناامید ہو کر **إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ** کہہ چکا ہے۔

مسئلہ: جمہور کے نزدیک بالاجماع فاتحہ کی سات آیتیں ہیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بسم اللہ شریف آیت مستقل نہیں اور آخری آیت **غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ** ہے اور بعض اس کے برعکس بسم اللہ شریف کو مستقل سمجھتے ہیں اور **غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ** سے آیت نہیں سمجھتے بلکہ **صِرَاطَ الَّذِينَ** سے سمجھتے ہیں۔

ف: تفسیر تیسیر میں ہے کہ اس کے کل کلمات پچیس (۲۵) اور کل حروف ایک سو تیس (۱۲۳) ہیں اور عین

معانی میں اس کے کل کلمات ستائیس (۲۷) اور کل حروف ایک سو بیالیس (۱۴۲) بیان فرمائے ہیں۔

فضائل فاتحہ:۔ (۱) جب اس سورہ کو حضرت جبریل علیہ السلام حضور علیہ السلام کی خدمت میں لائے تو ان کے ساتھ اس وقت سات ہزار فرشتے تھے۔

(۲) مروی ہے کہ شام سے ایک قافلہ ابوجہل کے لئے بہت سامال لیکر آیا یہ قافلہ سات گروہ پر مشتمل تھا رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اس قافلہ کو دیکھ رہے تھے اس وقت اکثر صحابہ غریب تھے اس منظر کو دیکھ کر صحابہ کی وجہ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے احساس فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کو نازل کیا اور فرمایا اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ یعنی ابوجہل کے ہر قافلہ کے عوض آپ کو فاتحہ عطا فرمائی پس باوجود آپ کے اس بڑی عطیہ کے ابوجہل آپ کے عطیہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تو آپ بھی اس کی دنیائے کمینہ کو نظرانداز فرمائیے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آرزو جو کہ صرف صحابہ کے لئے تھی نہ کہ اپنے لیے تو ارشاد فرمایا اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! غم نہ کھایئے اس سورت کی برکت اور نفع مال کے نفع سے بہت زاید ہے پس آپ اپنے صحابہ کے لئے اپنے بازو بچھا دیجئے کیونکہ آپ کا تواضع کرنا ان کے لیے ان کی آرزو پوری ہوجانے سے بہت مرغوب ہے۔

(۳) رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر یہ سورت تورات میں ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام کو قوم یہودیت کی طرف میل نہ کرتی اور گر انجیل میں ہوتی تو عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نصرانی نہ ہوتی اور گر زبور میں ہوتی تو داؤد علیہ السلام کی قوم کو مسخ نہ ہوتا۔ پس جس نے اسے پڑھا اللہ تعالیٰ اسے اتنا دے گا کہ گویا اس نے سارا قرآن پاک پڑھا ہے اور گویا اس نے تمام مؤمنین مرد و عورت پر صدقہ (خیرات) کیا ہے۔

(۴) اس کے حروف معجمہ بائیس (۲۲) ہیں اور حضور علیہ السلام کے بعد آغاز وحی بھی بائیس سال تھے۔

(۵) اس میں سات حروف نہیں، ثا ثبور کی، جیم جحیم کی، خا خوف کی، زا زقوم کی، شین شقاوت کی، ظا ظلمت کی، فا فراق کی، پس جو شخص اس سورۃ کو صحیح اعتقاد اور پوری تعظیم سے پڑھے گا تو وہ ان اشیاء مذکورہ سے پرامن رہے گا

(۶) حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجنے کا پختہ ارادہ فرمالیتا ہے مگر جب اس قوم کے بچے مدرسہ میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھتے ہیں

تو اس قوم سے چالیس سال تک عذاب اٹھالیتا ہے۔

(۷) پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جمیع علوم کتب سماویہ میں ہیں اور ان کے علوم قرآن پاک میں ہیں اور قرآن شریف کے علوم سورہ فاتحہ میں ہیں۔ پس گویا جو شخص اس سورت سے واقف ہو اور جس نے اسے پڑھا اس نے تمام علوم کو پڑھا۔

ف: تفسیر کبیر میں ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ مقصود تمام کتب سے علوم اصول فروع، مکاشفات کا حاصل کرنا ہے اور یہ سورت تمام علوم کو شامل ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا۔

خلاصہ سورہ فاتحہ: ۔ مولانا فناری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معلوم ہو چکا ہے کہ فاتحہ کے اوّل سے **یَوْمِ الدِّیْنِ** تک ان عقاید کا بیان ہے جو الٰہیات کے ساتھ ذاتاً وصفۃً وفعلاً متعلق ہیں کیونکہ حمد کا حصر کمالات ذاتیہ وصفاتیہ وافعالیہ کو مقتضی ہے بعد ازاں نبوت وولایت کا بیان ہے کیونکہ یہ سب سے بڑی اور مخصوص نعمتیں ہیں۔ پھر عقاید اخرویہ کا ذکر ہے کیونکہ وہ باری تعالیٰ آخرت کے جمیع امور کا مالک ہے۔ پھر ان دونوں کے مابین **اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** واقع ہے یعنی عبادات کے وہ احکام جو عابد معبود کے مابین رابطہ پیدا کرتے ہیں یہ عبادات یا تو معاملات ہیں یا وعیدات۔ کیونکہ استعانت یا تو حصول نفع کے لئے ہوتی ہے یا نقصان کو دفع کرنے کے لئے۔ پھر اس کے آخری حصہ میں مؤمن کو وجوہ ہدایت کی طلب کا طریقہ ترتیب مذکورہ پر سکھایا گیا ہے۔ مثلاً قسمِ اول میں ایمان کی طرف اور قسم دوم میں اسلام کی طرف اشارہ فرمایا گیا یہی احسان کے وجوہ ہیں۔ یعنی مراتب ثلاثہ جو کہ اخلاق روحانیت محمودہ ہیں۔ پھر ان مراتب معہودہ کا بیان ہے جس کو سیدِ دو جہاں علیہ السلام نے اپنے ارشاد گرامی "ان تعبد ربک کانک تراہ" میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ پھر ان کمالاتِ مشہودہ کا ذکر ہے جو مطالع جلال کے استغراق کے وقت حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ استغراق جو کاف تشبیہ (جو کہ ان تعبد ربک کانک تراہ میں مذکورہ ہے) کو ہٹانے والا اور تنزیہ جبر کے غضب اور نسبت قدر کی گمراہی کا دافع ہے اسی کو علوم مکاشفات سے موسوم کرتے ہیں۔

(واللہ اعلم بااسرار کلیۃ المنطبقات)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۲ ۸۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں

بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

اور نماز قائم رکھیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ

جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا اور آخرت پر یقین رکھیں وہی لوگ

عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں بے شک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى

انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں اللہ نے ان کے دلوں

قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ

پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے اور ان کے لئے بڑا

عَظِيْمٌ ۝۷ ع

عذاب

تفسیر عالمانہ سورہ بقرہ مدینہ ہے اس کی ۲۸۶ آیتیں ہیں۔اہل تفاسیر فرماتے ہیں کہ سب سے لمبی سورت بقرہ اور سب سے چھوٹی سورہ کوثر ہے اور سب سے لمبی آیت آیہ مداینۃ یعنی یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ (آل عمران ۲۸۲) اور سب سے چھوٹی آیت وَالضُّحٰی اور وَالْفَجْرِ ہے اور سب سے لمبا کلمہ فَاَسْقَیْنٰکُمُوْهُ ہے۔

سوال :۔سورہ بقرہ سب سورتوں سے لمبی کیوں ہے،اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب :۔وہ یہ ہے کہ اس میں احکام کو تفصیل وار اور مثالیں دے کر اور دلائل قائم کر کے ذکر فرمایا ہے اور دوسری سورتوں میں یہ طرز نہیں ہے۔اسی لئے اس کا نام فسطاط القرآن بھی ہے۔

ف :۔ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ میں نے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ اس میں ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار حکمتیں اور ایک ہزار خبریں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کی عظمِ فقاہت سے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حفظ کرنے میں آٹھ سال صرف فرمائے (کذافی اسئلۃ الحکم)

حکایت :۔امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں کہہ بیٹھا کہ اس سورہ کریمہ کے فوائد ونفائس سے دس ہزار مسائل اخذ کیے جاسکتے ہیں اس بات کو بعض حاسدین اہل بغی (سرکشوں) نے بہت بعید سمجھا۔جب میں نے قرآن کی تفسیر (کبیر) کی تصنیف کا ارادہ کیا تو پہلے اس کا مقصد لکھا تا کہ یہ مقدمہ تنبیہ کی طرح ہو جائے اس بات پر کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امر ممکن الحصول اور قریب الوصول ہے۔

سوال :۔سورتوں کو لمبا،درمیانہ،چھوٹا کیوں مقرر کیا گیا؟

جواب :۔ تا کہ تنبیہ ہو کہ معجزہ کے لئے سورہ کا لمبا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ سورہ کوثر جس میں صرف تین آیتیں ہیں ایسے ہی معجزہ ہے جیسے سورہ بقرہ۔

ف :۔سورتوں کو مقرر کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ تعلیم میں آسانی اور اطفال کو تدریجاً بڑی سورت پڑھانے میں سہولت ہو جائے۔یہ اللہ کا فضل ہے جو بندوں پر فرمایا اور اس میں ترغیب بھی ہے اور توسیع فضیلت بھی۔نماز میں بھی اور دیگر اعمال میں بھی۔مثلاً سورہ اخلاص کو ایک بار پڑھنے سے قرآن پاک کی تہائی کے برابر ثواب ملتا ہے جس نے یہ راز سمجھا وہ سورتوں کے مقرر کرنے کے بھید سے آشنا ہو گیا۔

سوال :۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ نزولِ قرآن کے متعدد مقامات میں مختلف مشاہد ہیں مثلاً کوئی آیت مکیہ ہے اور کوئی مدینہ، کوئی لیلیہ ہے کوئی نہاریہ، کوئی سفریہ ہے کوئی حضریہ، کوئی شتائیہ ہے کوئی صیفیہ اور کوئی نومیہ کوئی برزخیہ ہے۔ یعنی لیل ونہار کے مابین نازل ہونے والی اور کوئی ارضیہ ہے کوئی سماویہ اور کوئی غاریہ ہے یعنی وہ جو غار میں نازل ہوئی۔ یعنی زمین کے تحت اور برزخیہ وہ جو کہ مکہ شریف ومدینہ طیبہ کے مابین نازل ہوئی اور کوئی عرشیہ معراجیہ ہے یعنی معراجیہ وہ جو معراج میں سورہ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں۔

جواب :۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحیِ الٰہی کا نزول جن مقامات یا اوقات میں ہوا اس سے ان کو شرافت وبزرگی نصیب ہوئی جیسا کہ شبِ معراج کے نکات میں سے ایک نکتہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضور سرورِ انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ان مقامات پر تشریف لے جانا محض ان مقامات کی عزت افزائی کے لئے تھا گویا کہ کون وعرش وجنات کا ہر ہر مقام لسانِ حال سے پکار رہا تھا کہ الٰہی! اپنے حبیب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک قدموں کے قدوم سے ہمیں سرفراز فرما تا کہ اعیان وکبار کی آنکھیں تیرے محبوب سیّد السادات ومفخر الموجودات کی نعلین مبارک کی غبار کو سُرمہ بنالیں تیرا محبوب وہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو نہ کون کو وجود کی خوشبو نصیب ہوتی اور نہ حضرتِ کون سے لمعۂ شہود ظاہر ہوتا۔

حدیث شریف :۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں فرمایا گیا:

لولاک لما خلقت الافلاک یعنی اے محبوب! آپ نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا

(صلی اللہ علیٰ حبیبہ باعث الکونین ووراث الثقلین جدّ الحسن والحسین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین)

الٓمّٓ سوال : سورہ بقرہ کو الٓمّٓ (کلام متشابہ) اور سورہ فاتحہ کو حرف ظاہر (محکم) سے ابتدا فرمانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب :۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اتقان میں فرمایا ہے کہ سورہ بقرہ کو الٓمّٓ سے شروع فرمانے کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کو حرفِ ظاہر سے شروع کیا گیا تا کہ ہر خاص وعام کو اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو تو پھر سورہ بقرہ میں حرف متشابہ لایا گیا تا کہ اس کا مرتبہ عقلاء وحکماء کو معلوم ہوتا کہ وہ اس کے مقابلہ سے عاجز ہو کر کلامِ الٰہی میں ان حروف سے عبرت پکڑ کر اس کی آیات میں تدبّر کریں۔

(کذا فی خواتم الحکم وحل الرموز وکشف الکنوز باللہ للشیخ المعروف بہ علی دده)

ف:۔ مفسرین نے حروفِ مقطعات کے بارے میں بہت کلام کیا اور ان کی مراد میں بہت بڑی لمبی چوڑی بحث کی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ علوم مستورہ واسرار محجوبہ ہیں۔ یعنی ان متشابہات سے ہیں کہ جن کا علم اللہ تعالیٰ نے پوشیدہ رکھا ہے۔ یہ قرآن کا مخفی راز ہے۔ ہمارے لیے ان کے ظاہر پر ایمان لانا ضروری اور ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا لازمی ہے۔ ان کے ذکر کرنے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی ایمان ہونا چاہیے یا یوں کہو کہ الف اللہ کا ہے، لام لطیف کا اور میم مجید کا۔ گویا اللہ تعالیٰ لطیف ومجید ہوں اور الٓرٰ کا معنی کٓهٰیٰعٓصٓ ہے اور قٓ بمعنٰی انا اللہ الکریم الھادی الحکیم الصادق ہے۔[1] اسی طرح نٓ میں اس طرف اشارہ ہے کہ میں اللہ قادر وقاہر ہوں اور اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا میں اشارہ ہے کہ میں اللہ وناصر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ یہ حروفِ مقطعات سب سے سب اللہ تعالیٰ کے کسی اسم سے لیے گئے ہیں اور کلمہ کے بعض حروف کو لیکر باقی کو حذف کرنا کلامِ عرب میں شائع ہے۔ کما قال الشاعر:

قلت لھا قفی فقالت قٓ

یعنی میں نے اسے کہا ٹھہر جا تو اس نے کہا ق وقفت یعنی میں ٹھہر گئی ہوں۔

اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ حروف بعض سورتوں کے اوّل میں ذکر کئے گئے ہیں تاکہ یہ حروف دلالت کریں کہ قرآن پاک ان حروف اب ت ث سے مرکب ہے پھر ان کے بعض علیحدہ ہو کر آئے اور بعض مرکب ہو کر، تاکہ قرآن کے مقابل کو تنبیہ ہو اور یہ آگاہ کرنا بھی مقصود ہے کہ قرآن شریف ان حروف سے مرکب ہے جن سے تم لوگ اپنے کلام مرکب کرتے ہو اگر یہ بشر کی طاقت سے باہر نہ ہوتا اور خالق کائنات کی طرف سے نازل کردہ نہ ہوتا تو وہ لوگ اس جیسا قرآن لانے پر قادر ہوتے یہ وہ تقریر ہے جس پر اہلِ تحقیق کامیاب ہوئے لیکن اس پر ایک اعتراض پڑتا ہے وہ یہ کہ اس تقریر کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معنی واسرار نہیں ہیں حالانکہ سرورِ انبیاء علیہ التحیۃ والثناء کو اولین وآخرین کے علوم دیئے گئے ہیں۔

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اور باقی حروفِ مقطعات ان مواضع ومخفی اسرار سے ہیں کہ جن کے الفاظ سے مابین محبوب ومحب کے پردہ دیا گیا ہے کہ ان کے سوا ان کا علم کسی اور کو نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا علم اپنے پیارے حبیب صلی

---

[1]:۔ میں اللہ کریم ہادی حکیم اور سچا ہوں۔

۱۔قیام: کما قال اللہ تعالیٰ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ (فرمانبردار ہو کر اللہ کے لئے قیام کرو)

۲۔رکوع:۔ کما قال اللہ تعالی وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ (رکوع والوں کے ساتھ رکوع کرو)

۳۔سجود:۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ)

پس الف سے (جوالم میں ہے) قیام کی طرف اشارہ ہے اور لام سے رکوع کی طرف اور میم میں سجدہ کی طرف یعنی جس نے سورۃ فاتحہ (جو کہ نماز میں اللہ تعالی سے ہم کلام ہونا ہے جو کہ مومنین کی معراج ہے) پڑھی تو اللہ تعالیٰ اسے وہ راہ ہدایت عنائت فرمائے گا جو بندہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں طلب کر رہا ہے۔

مسئلہ :۔ تلاوت کا اجر جیسے محکم سے حاصل ہوتا ہے ایسے ہی متشابہ سے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اسے ایک نیکی ملے گی جو کہ دس نیکیوں کے برابر ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف پس الٓمّٓ پڑھنے سے تین نیکیاں (جو کہ تیس کے برابر ہوں گی) عطا ہوں گی۔

تفسیر عالمانہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یہ اشارہ جو ذٰلِكَ سے فرمایا گیا ہے اشارہ بعید ہے حالانکہ یہ کتاب بعید نہیں تو یہ اس لئے ہے کہ یہ کتاب (قرآن) چونکہ موعود تھی اور اس کا کتب سابقہ میں وعدہ کیا گیا تھا۔ اس لیے اس لحاظ سے اسے بعید قرار دے کر فرمایا گیا (کہ وہ کتاب، جس کا وعدہ کتب سابقہ میں کیا گیا تھا)

حدیث شریف: خدا تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تو وہ ایک ہزار سورۃ پر اور ہر سورت ایک ہزار آیت پر مشتمل تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: الٰہی! اس کتاب کو کون پڑھ سکے گا اور کون اسے زبانی یاد کر سکے گا؟ خدا تعالیٰ نے جواب دیا: اے موسیٰ! میں اسے سے بھی زیادہ ضخیم کتاب نازل فرماؤں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: کس پر؟ فرمایا؟ خاتم النبیین پر۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: الٰہی! ان کی امت اسے کیسے پڑھ سکے گی جب ان کی عمریں بہت تھوڑی ہوں گی۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا: میں ان پر وہ کتاب ایسی آسان کردوں گا کہ ان کے چھوٹے بچے بھی اسے پڑھ سکیں گے۔ موسیٰ علیہ

السلام نے عرض کی: الٰہی! اور تو یہ کیسے فرمائے گا؟ فرمایا: میں نے زمین پر ایک سو تین کتابیں نازل فرمائی ہیں پچاس شیث علیہ السلام پر، تیس ادریس پر، بیس ابراہیم پر، تورات تجھ پر، زبور داؤد پر، انجیل عیسیٰ پر اور ساری کائنات کا ان میں میں نے ذکر کیا اور ان ساری کتابوں کے جملہ معانی کو میں محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی کتاب میں ذکر کروں گا اور ان سب حقائق کو میں قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں جمع کردوں گا اور ان سورتوں کو میں تیس پاروں میں اور ان سب کے مطالب کو سورۃ فاتحہ کی سات آیتوں میں اور پھر ان کے معانی کو سات حرفوں میں اور وہ سات حرف بسم اللہ کے ہیں پھر ان سب حقائق کو الٓمّٓ کے الف میں جمع کردوں گا پھر سورۃ بقر شروع فرماؤں گا۔ پس جب توراۃ میں اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا اور پھر حضور علیہ السلام پر نازل فرمایا تو یہودیوں نے اس بات سے انکار کیا کہ یہ وہی کتاب موعود نہیں ہے تو اللہ نے فرمایا:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یعنی یہ وہی کتاب ہے جس کا وعدہ فرمایا گیا تھا۔ (کذافی تفسیر التسیر تحت آیت ھذا)

اس کے علاوہ اعراب کے دیگر وجوہ بھی ہیں جو دیگر تفاسیر میں ہیں۔

لَا رَیْبَ ۚۛ فِیْهِ ۚۛ لفظ ریب لا کا اسم ہے اور فیہ اس کی خبر ہے اور ریب دراصل رابنی الشئی سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ متکلم کو کسی بات کا شک ہو اور نفس کے قلق و اضطراب کو بھی ریب کہتے ہیں اور شک کو بھی ریب اسی لیے کہتے ہیں نفس کو اضطراب میں ڈال کر اس سے اطمینان زائل کر دیتا ہے۔

حدیث شریف: اسی لیے حدیث شریف میں فرمایا گیا:۔

دع ما یریبک الی ما لا یریبک (جو تجھے شک میں ڈالے چھوڑ اس کی طرف متوجہ ہو جو تجھے شک میں نہ ڈالے) اور ہے بھی اسی طرح کہ شک میں اضطراب ہے اور صدق میں اطمینان اسی لغت کی مناسبت سے حوادثات (جس میں خوف ہو) ریب سے تعبیر کرتے ہیں اور ریب شک سے اخص ہے۔ پس ہر ریب کو شک کہا جا سکتا ہے اور ہر شک کو ریب نہیں کہا جا سکتا اور شک اس تردد بین النقیضین کو کہتے ہیں جس میں شک کرنے والا (ایک) نقیض کو دوسری نقیض پر ترجیح نہ دے سکے۔

سوال: ظرف کو یعنی فیہ کو ریب پر کیوں مقدم نہیں کیا گیا؟

جواب: تا کہ یہ گمان نہ ہو کہ دیگر کتب میں تو شک ہے مگر اس میں نہیں۔ کیونکہ قانون ہے کہ ظرف کی تقدیم

سے حصر مقصود ہوتی ہے۔

سوال :۔ کفار کو اس میں شک تھا، چنانچہ وہ اس کے کتاب اللہ ہونے کے منکر تھے اور مبتدعین اہل قبلہ کو متشابہات کے معانی میں شک تھا۔ چنانچہ وہ اس کے ظاہری معنوں کی وجہ سے گمراہ ہو گئے اور علماء کرام کو متشابہات کے وجوہ میں شک ہے۔ چنانچہ وہ کسی یقینی معنی پر نہیں جم سکے اور عوام کو خود متشابہات میں شک ہے کیونکہ وہ ان معانی سے بے خبر ہیں پھر آیت میں لا ریب فرما کر نفی شک کا کیا معنی؟

جواب : یہ نفی کتاب سے ہے نہ کہ لوگوں سے یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کا گزر بھی نہیں ہوا اور نہ اس میں عیب کی گنجائش ہے۔

ف : اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں خبر بمعنی نہی ہو یعنی لا ریب بمعنی فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ جیسا کہ اس آیت میں (نفی بمعنی نہی ہے) بمعنی لا تفسقو ا و لا تجادلو (کذافی الوسیط و العیون)

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ،هُدًى بمعنی رشد و بیان ،للمتقین یعنی یہ قرآن پاک ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جسے ہدایت کی طرف میلان ہے اور اس کی طرف رجوع رکھتے ہیں۔

اسی طرح حدیث میں قتل قتیلا فلہ سلبہٗ کی تقریر ہوگی اور تفسیر الارشاد میں ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں جو حالاً و مالاً تقوی سے موصوف ہیں۔

سوال : ہدایت میں صرف متقین کو کیوں مخصوص کیا گیا؟

جواب :۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس سے نور حاصل کرنے والے اور اس کے آثار سے نفع پانے والے ہیں اگرچہ اس کی ہدایت ہر ناظر مومن و کافر کو شامل ہے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

هُدًى لِّلنَّاسِ یعنی یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے ہدایت یعنی بیان ہے اور راہ دکھانے کی بنا پر (خصوصی طور) متقین کے لیے ہدایت ہے۔

تیسیر میں فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی شئے سے نفع حاصل کرنے والا ہو تو اسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف تیرے لیے ہے یعنی تو اس سے نفع حاصل کرنے والا ہے نہ کوئی اور۔ پس وہ لوگ جو اس کتاب سے ہدایت یاب نہ ہو سکے تو کتاب اللہ کے ہادی ہونے کے منافی نہیں، جیسے سورج سورج ہی ہے اگرچہ نابینا اس کی روشنی سے بے

بہرہ ہے اور شہد شہد ہی ہے اگرچہ صفراوی مزاج اس کے ذائقہ سے محروم ہے اور مشک مشک ہی ہے اگرچہ مزکوم کی ناک اس کی خوشبو سے بے نصیب ہے بہت بڑی خرابی ہے اس بدبخت کے لیے کہ اس کے سامنے بحر ذخار بھی موجود ہے مگر وہ ابھی پیاسا ہے اور ماہ بدر اپنی پوری روشنی میں چمک رہا ہے مگر وہ ابھی اندھیرے میں ہے اور پاک کرنے والا بھی حاضر ہے مگر وہ تاہنوز خباثت سے پاک نہیں ہوسکا۔ باغات پر رونق بھی سامنے ہیں مگر وہ ابھی سوکھا ہے بلکہ بڑی حسرت تو اس بدنصیب کے لئے ہے جو فسق و فجور سے پاک نہیں ہوسکا حالانکہ قرآن جیسا آمر وناہی اور رغبت و رہبت کے فرق بتانے والا (کہ جس کے وعدے متواتر اور اس کی وعیدیں متظاہر ہیں) اس کے گھر کا مہمان ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

المتقی، افتعال کے باب کا اسم فاعل وقایۃ سے مشتق ہے (وقایۃ بمعنی بہت زیادہ بچاؤ) مفسر بغوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اتقاء" سے ماخوذ ہے اور اتقاء دراصل حاجز بین الشیئین کا نام ہے۔ اسی محاورے کو لے کر اہل عرب بولتے ہیں۔

اتقی بترسہ یعنی فلاں شخص نے اپنی ڈھال کو اپنے (اور جس کا وہ ارادہ کر رہا ہے) کے مابین حاجز بنا دیا۔

حدیث شریف:۔ میں ہے: کنا اذا احمر الناس اتقنا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی جب جنگ اپنی شوخی میں آجاتی تو ہم خدا کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دشمنوں کے مابین حاجز ہو جاتے ہیں۔ پس گویا متقی اللہ کی فرمانبرداری اور اس کے نواہی سے اجتناب کو اپنے اور عذاب الٰہی کے مابین حاجز بناتا ہے۔ عرف شرع میں تقویٰ ہر اس چیز سے پوری طرح بچاؤ کو کہتے ہیں جو آخرت میں نقصان پہنچائے اس کے تین درجے ہیں۔

۱۔ کفر سے بری ہو کر ہمیشہ والے عذاب سے بچنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى اور ان تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا۔

۲۔ جو علم یا ترک عمل گناہ میں ڈالیا گرچہ صغائر ہوں (عند البعض) سے کنارہ کشی کرنا۔ یہی تعریف شرع میں متعارف ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اس معنی کی مراد لی گئی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا اگر بستی والے ایمان لائیں اور خدا سے ڈریں۔

۳۔اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ کے راز سے باز رکھے اور اس سے باطل کو جدا کردے۔ درحقیقت یہ وہی تقوی ہے جس کا حکم قرآن پاک کی اس آیت میں دیا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اے ایمان والو اللہ سے خوب ڈرو۔

ف : تقوی کے انتہائی مراتب وہ ہیں جہاں انبیاء کرام علیہم السلام پہنچے جنہوں نے ریاست نبوت وولایت دونوں کو حاصل فرمایا اور ان کو عالم اشباح کی کسی چیز نے عالم ارواح کو پرواز سے نہ روکا اور نہ مصالح خلق کے خلط وملط نے (انہیں) شئون حق کے استغراق سے رکاوٹ کی کیونکہ ان حضرات کے نفوس زکیہ (جو قوت قدسیہ سے تائید دئے گئے ہیں) کمال استعداد رکھتے ہیں۔

مسئلہ : کتاب مبین کی ہدایت ان تمام مذکورہ صاحبان مراتب کو شامل ہے (مثلاً) عوام کو ہدایت اسلام اور خواص کو ہدایت ایقان واحسان اور خاص الخاص کو ہدایت کشف حجاب ومشاہدہ اعیان نصیب ہوتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں جنہوں نے میثاق کے بعد اللہ تعالیٰ کے عہد کی وفا کی اس تقریر کی تائید قرآن کی اس آیت وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ یعنی اے میرے بندے! جب تم نے روز میثاق میں اپنے قول بلی سے میری ربوبیت کا اقرار کیا تھا تو اب تمہیں چاہیے کہ جس کا عہد کر چکے ہو اسے ایفاء کرو اور وہ وعدہ یہ تھا کہ تم خالص میرے عبد ہو جاؤ پھر میں بھی جو تمہارے ساتھ وعدہ کر چکا ہوں اسے پورا کروں گا اور وہ وعدہ یہ تھا کہ میں تمہیں اپنی طرف پہنچاؤں اور سیدھی راہ پر چلاؤں گا۔

حکایات : ☆......رسالہ قشیریہ میں ہے کہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جیسا متقی ہونا چاہیے ان کے متعلق مشہور رہے کہ ان کے پاس گھی کے چالیس بڑے گھڑے تھے ان میں سے ان کے غلام نے چوہا نکالا۔ انہوں نے پوچھا: کس گھڑے سے نکالا؟ غلام نے کہا: یاد نہیں رہا آپ نے یہ سنتے ہی ان تمام گھڑوں کو پانی کی طرح زمین پر بہادیا

☆......حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقروض کے درخت کے سایہ کے نیچے نہ بیٹھتے تھے آپ سے وجہ پوچھی جاتی تو آپ فرماتے حدیث شریف میں ہے: جس قرض سے نفع اٹھایا جائے وہ سود ہے۔

☆......حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جنگل میں اپنا کپڑا دھویا تو آپ کے ساتھی نے عرض کی

کہ سامنے والے باغ کی دیوار میں میخ گاڑ کر کپڑے کو خشک کرلو۔ آپ نے جواب دیا کہ غیر کی دیوار میں میخ گاڑنا درست نہیں ہے۔ پھر اس نے عرض کی: کسی درخت کی ٹہنی پر لٹکا دیجئے آپ نے فرمایا: میرے کپڑے کے بوجھ درخت کی ٹہنیاں ٹوٹ پڑیں گی اور یہ بھی ٹھیک نہیں۔ پھر اس نے عرض کی کہ اس کو زمین پر ڈال دو۔ آپ نے فرمایا: میرے کپڑے کی وجہ سے جانوروں کی گھاس چھپ جائے گی اور یہ بھی نامناسب ہے۔ بالآخر آپ نے اپنی پیٹھ پر کپڑے کو ڈال دیا جس سے ایک جانب کو خشک کیا اسی طرح پھر جانب ثانی کو۔

تفسیر عالمانہ

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ یہ جملہ متقین کی صفت مقیدہ ہے۔ اگر تقوی کی تفسیر ترک ماینبغی سے کی جائے تو اس جملہ کا متقین کے بعد آنا ایسے ہوگا جیسے خالی از زیورات کو زیورات سے آراستہ کیا جائے اور صیقل شدہ لوہے پر تصویر بنائی جائے اور یہ صفت موضحہ بھی ہوسکتی ہے اگر تقوی کی تفسیر ایسی عام ہو جو فعل طاعت و ترک معصیت پر مشتمل ہو کیونکہ یہ تفسیر اصل اعمال و اساس حسنات یعنی ایمان، نماز، صدقہ کو شامل ہے اور یہ تینوں چیزیں اصل و اساس ہیں اس لیے کہ یہ تمام اعمال نفسانیہ اور عبادات بدنیہ و مالیہ کی جڑ ہیں اور تمام گناہوں سے بچنا انہی سے ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ "بے شک نماز فحش اور برائی سے روکتی ہے"

اور حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ "نماز دین کا ستون اور زکوۃ اسلام کا پل ہے"

ف: ایمان تصدیق بالقلب کو کہتے ہیں اور ایمان بمعنی امن دینا۔ چونکہ تصدیق کنندہ مصدق (جس کی تصدیق کی جائے) کو امن دیتا ہے۔ یعنی اپنی تکذیب سے اسے امن والا بنا دیتا ہے یا اس لیے کہ تصدیق کنندہ اسی فعل سے اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچالیتا ہے (اسی لیے ایمان کو ایمان کہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کو مومن اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے فضل سے اپنے بندوں کو عذاب سے امان دینے والا ہے۔

ف: کواشی میں فرماتے ہیں کہ شریعت میں ایمان تصدیق بالجنان و اقرار" باللسان و عمل بالارکان کو کہتے ہیں اور اسلام خضوع و انقیاد کا نام ہے۔ پس ہر اسلام ایمان نہیں۔ جب کہ کسی شخص میں تصدیق نہ ہو۔ مثلاً شخص ظاہر میں تو مسلمان ہے مگر باطن میں غیر مصدق۔

مسئلہ : ف :. ابو سعود رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ایمان شریعت میں نہیں متحقق ہوسکتا جب

تک کہ ضروریات دین (جن کے متعلق معلوم ہو چکا ہو کہ یہ ہمارے سچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی ضروریات سے ہیں) جیسے توحید ورسالت اور قیامت کے بعد اٹھنا اور اس کی جزا وغیرہ کی تصدیق نہ کی جائے۔

ف : پھر اس میں اختلاف ہے کہ کیا اتنا کافی ہے یا اس میں اقرار کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پہلا مسلک شیخ ابوالحسن اشعری اور ان کے تابعین کا ہے اور دوسرا مذہب (سیدنا) امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے اور یہی حق ہے۔ کیونکہ امام صاحب نے ان دونوں کو ایمان کے دو اجزا قرار دیا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اقرار ایسا رکن کہ عذر کے وقت ساقط ہو جانے کا احتمال رکھتا ہے جیسا کہ اکراہ کے وقت ساقط ہو جاتا ہے۔

ف: جمہور محدثین اور معتزلہ وخوارج کا خیال ہے کہ ایمان تین چیزوں کا نام ہے۔

تصدیق بالجنان (دل سے) **اقرار" باللسان** (زبان سے) **عمل بالارکان** (اعضاء سے)

پس جس کے اعتقاد میں خلل ہے وہ منافق ہے اور جس کے اقرار میں نقص ہے وہ کافر ہے اور جس کے عمل میں کمی ہے وہ ہمارے نزدیک بالاتفاق فاسق ہے مگر خوارج کے نزدیک کافر ہے اور معتزلہ کے نزدیک خارج از ایمان ہے مگر درجہ تک تا ہنوز نہیں پہنچا۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ غیب مصدر ہے مگر توسعاً بمعنی غائب ہے۔ جیسے اہل عرب زائر کو "زَوْر" کہتے ہیں اور عرف میں غیب وہ ہے جو حس اور عقل سے ایسا پوشیدہ ہو کہ ان دونوں کے ادراک میں ابتداء بطریق البداہۃ نہ آسکے۔

یہ دو قسم ہے: پہلا وہ کہ جس پر کوئی دلیل نہ ہو۔ وعندہ مفاتح الغیب میں یہی غیب مراد ہے۔

دوسرا وہ کہ جس پر دلیل قائم کی جا سکے۔ جیسے صانع اور اس کے صفات اور نبوات اور اس کے متعلقات جیسے احکام وشرائع اور یوم آخرت جیسے بعث ونشور حساب وجزا اور آیت میں بھی یہی غیب مراد ہے۔

قانون :۔ لفظ باء (بالغیب میں) مفعول کے قائم مقام ہے اگر غائب کو اپنے حال پر چھوڑ کر بمعنی غیبۃ (مصدر) کیا جائے تو باء کا متعلق محذوف ہو کر فاعل سے حال واقع ہوگا۔ گویا اصل عبارت یوں ہے۔

یومنون بالغیب متلبسین بالغیبۃ ایمان لاتے ہیں غیب کے ساتھ حالانکہ وہ غیب سے ملتبس ہیں۔

یا یوں ہے: **یومنون غائبین عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر مشاھدین لما فیہ من شواھد النبوۃ**

اسی معنی پر روایت ذیل دلالت کرتی ہے۔

روایت مع حکایت :۔ حضرت حارث بن نفیر (تابعی) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ (صحابی) سے عرض کی: اے اصحاب محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم! ہم آپ کو اس لیے افضل سمجھتے ہیں کہ تم حضور نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی زیارت وصحبت سے باریاب ہو چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم بھی تمہیں اعلیٰ قدر تصور کرتے ہیں کہ تم نے بغیر زیارت ایمان قبول کیا۔ کیونکہ افضل ایمان وہ ہے جو بغیر دیکھے ہو پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ نے (استشہاداً) یہ آیت **اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ** تلاوت فرمائی۔ (کذافی تفسیر ابی اللیث) یا یہ عبارت یوں ہے:

یؤمنون بالغیب ای غائبین عن المومنین یومنون بالغیب کا معنی ہے اہل ایمان سے وہ غائب ہیں۔ نہ منافقین کی طرح کہ وہ جب مومنین کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم مومن ہیں اور جب اپنے رؤسا کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہم تمہارے ہیں۔

ف : بعض کہتے ہیں کہ غیب سے مراد قلب ہے۔ کیونکہ قلب پوشیدہ یعنی غائب ہے اب معنی یہ ہوئے کہ لوگ دل سے ایمان لاتے ہیں نہ یہ کہ زبان سے تو دعویٰ ایمان مگر قلوب اس کے خلاف۔ پس اس معنی پر بالغیب میں باصرف آلہ کے لئے ہوگی۔

حدیث جبرئیل : حضرت عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن سرور عالم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی محفل پاک میں ہم بیٹھے تھے کہ ایک مرد تشریف لایا جو سفید پوشاک پہنے ہوئے تھا اور نہایت سیاہ بالوں والا تھا۔ اگرچہ دور کا معلوم ہوتا تھا مگر اس پر سفر کے آثار ناپید تھے ہم میں سے کوئی بھی اس کا واقف نہیں تھا تشریف لاتے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریب بیٹھ گیا یہاں تک کہ اس کے گھٹنے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں کو مس کر رہے تھے۔ عرض کی۔

حضور! اسلام کیا شئے ہے؟ آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک اور مجھے اس کا رسول برحق ماننا اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا اور روزہ رمضان رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر وسعت ہو تو۔

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غائب ہو کر ایمان لاتے ہیں یعنی آپ کے شواہد نبوت کا مشاہدہ نہیں کرتے۔

جواب سن کر: صدقت یارسول اللہ[1] صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس کے سوال اور پھر اس کی تصدیق پر بڑا تعجب ہوا۔ پھر عرض کی: حضور ایمان کسے کہتے ہیں؟

آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور موت کے بعد اٹھنے اور جنت ونار پر اور اس کی بری اور بھلی تقدیر پر ایمان لانا۔

جواب سن کر کہا: صدقت (آپ نے سچ فرمایا)

پھر عرض کی: حضور! احسان کے متعلق بھی تشریح فرمادیجئے۔

آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو کم از کم اتنا ضرور خیال ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

عرض کی: صدقت

پھر عرض کی: حضور! قیامت کب آئے گی؟

آپ نے فرمایا کہ جس سے سوال ہورہا ہے وہ سائل سے (اس معاملہ میں) زیادہ عالم نہیں۔

پھر عرض کی: حضور! اس کے علامات تو بیان فرمادیجئے۔

آپ نے فرمایا: قرب قیامت میں لونڈی اپنے سردار کو جنے گی اور ننگے جسم اور ننگے پاؤں والے اور چرواہے تنگدست اپنی اپنی بلڈنگوں پر نازاں ہوں گے۔ عرض کی: صدقت بعد ازاں وہ صاحب تشریف لے گئے۔

تھوڑی دیر بعد مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! جانتے ہو یہ کون شخص تھا؟

میں نے عرض کی: اللہ ورسولہ اعلم

آپ نے فرمایا: یہ جبریل علیہ السلام تھے تمہارے ہاں تشریف لا کر تم کو دین کی باتیں سکھاتے ہیں اور میرے ہاں جس صورت میں تشریف لاتے ہیں میں انہیں پہچان لیتا ہوں اور اب بھی میں نے پہچان لیا تھا۔

[1] یارسول اللہ آپ نے سچ فرمایا۔

ف: غیب[1] دو قسم ہے ایک وہ جو تجھ سے غائب ہے دوسرا وہ جسے تو غائب ہے۔ پس وہ غائب جو تجھ سے غائب ہے وہ عالم ارواح ہے کہ تو اس کے ہاں حاضر تھا جب کہ تو اس عالم میں روح کے ساتھ تھا اور اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ میں ایک ذرہ کی طرح تیرا وجود تھا اور اس وقت حق کے خطاب سن رہا تھا اور آثار ربوبیت کا مطالعہ فرما رہا تھا اور فرشتگان کا مشہود بھی ہوتا تھا اور ارواح انبیاء اور اولیاء وغیرہم سے بھی تعارف ہوتے رہے۔ جب تو عالم جسمانیت سے متعلق ہوا اور جب تو حواس خمسہ کے ساتھ یعنی محسوسات جو کہ عالم اجسام سے ہے کو دیکھنے لگا تو پھر وہ غیب تجھ سے غائب ہوگیا اور وہ دوسرا غیب کہ جس سے تو غائب ہے وہ غیب الغیب ہے یعنی بارگاہ لم یزل کا حضور کہ تو اپنے وجود کے اعتبار سے اس سے غائب ہے مگر وہ اپنے وجود کے اعتبار سے تجھ سے غائب نہیں وہ تیرے ساتھ ہے جہاں بھی تو ہے تو اس سے بعید ہے مگر وہ تیرے ہر وقت قریب ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

دوست نزدیک تر از من بمنست ۔۔۔ وین عجب تر من از وے دورم
چہ کنم باکہ توان گفت کہ او ۔۔۔ در کنار من و من مہجورم

ترجمہ: میرا دوست میری ذات سے بھی زیادہ قریب ہے اور یہ بات اس سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ میں اس سے دور ہوں میں کیا کروں کس سے بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ میری بغل میں ہے اور میں اس سے جدا ہوں

وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ بمعنی الدعا ہے۔ جیسے آیت وَصَلِّ عَلَیْهِمْ میں صلوۃ بمعنی دعا ہے اور بمعنی ثنا بھی آیا ہے کہ میں اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ بمعنی ثنا ہے اور بمعنی قرأۃ بھی جیسا کہ وَلَا تَجْهَرْ

---

[1] ۔ جو شئے ہمیں نظر نہ آئے وہ ہمارے لیے غیب ہے مثلاً فرشتے، یہ ہمیں نظر نہیں آتے یہ ہمارے لیے غیب ہیں۔ ایک ذات پاک ایسی بھی ہے جو ان فرشتوں کے لیے بھی غیب ہے اور وہ ذات پاک خداوند کریم جل شانہ کی ہے گویا خدا تعالیٰ غیب در غیب ہے اور ہمارے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شب معراج اس غیب در غیب کو بھی دیکھ لیا۔ پھر غور فرمائیے کہ جس مبارک آنکھ نے غیب در غیب کو بھی دیکھ لیا ہو اس پیاری آنکھ سے اور کون سی چیز غائب رہ سکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا۔ اور کیا غیب تم سے نہاں ہو بھلا ۔ جب نہ خدا ہی چھپا تم پہ کروڑوں درود (اویسی غفرلہٗ)

بِصَلَاتِكَ میں صلوۃ بمعنی قراءۃ ہے اور بمعنی رحمت بھی جیسا کہ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ میں بمعنی رحمت ہے اور بمعنی مخصوصہ افعال واذکار جنہیں شرع پاک نے مقرر فرمایا ہے اور شرع میں بھی صلوۃ کو صلوۃ اس لیے کہتے ہیں (کہ اس میں معانی مذکورہ پائے جاتے ہیں) مثلاً اس کے قیام میں قراءت ہے اور تعوذ میں ثناودعا ہے اور اس کے عامل کو رحمت نصیب ہوتی ہے اور آیت ہذا میں لفظ صلوۃ اسم جنس ہے جس سے پانچوں نمازوں کا ارادہ کیا گیا ہے اور اقامت بمعنی مواظبت ہے۔ قَامَتِ السُّوق سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ بازار کی رونق گرم ہو جائے یا یہ معنی کہ اس کی ادائیگی میں ایسی جدوجہد کرتے ہیں کہ اس میں فتور وسستی کو راہ تک بھی نہیں ملتی جیسا کہ کہا جاتا ہے: قَامَ الْأَمْرُ اَقَامَهُ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کسی امر کو جدوجہد کے ساتھ کیا جائے اس کی نقیض قعد عن الامر وتقاعد ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی امر میں سستی برتی جائے۔ یا اقامت بمعنی ادائیگی ہے جیسا کہ مؤذن کہتا ہے: قد قامت الصلوۃ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ نماز میں شروع ہو گئے اور ادیگی کو اقامت سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس میں قیام جیسا کہ اسے قنوت اور رکوع وسجود سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس میں یہ اشیاء پائی جاتی ہیں یا اقامت بمعنی تعدیل ارکان وحفاظت ہے یعنی اس کی ایسے حفاظت کرتے ہیں کہ اس کے فرائض وسنن میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس میں یہ اشیاء پائی جاتی ہیں یا اقامت بمعنی تعدیل ارکان وحفاظت ہے۔ یعنی اس کی ایسی حفاظت کرتے ہیں کہ اس کے فرائض وسنن میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا اس کی شہادت اہل عرب کے قول "اقام العود" سے ہوتی ہے کہ وہ اس قول کو اس وقت بولتے ہیں جب کہ لکڑی کو سیدھا اور پورے موقعہ پر کھڑا کیا جائے۔ یہی معنی زیادہ ظاہر ہیں کیونکہ زیادہ مشہور اور اقرب الی الحقیقت ہے اور مندرجہ تنبیہ پر متضمن ہونے کی وجہ سے زیادہ مفید ہے اور مدح کے لائق بھی وہی شخص ہے جو نماز کے حدود ظاہرہ از قسم فرائض وسنن اور حقوق باطنہ جیسے خشوع اور دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہونے کی طرف رعایت کرتا ہے نہ وہ نمازی جو اپنی نمازوں میں غفلت کرتے ہیں۔

ف: حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کسی کو دیکھو کہ نماز پڑھتے وقت رکوع وسجود میں عجلت کر رہا ہے تو اس کے عیال پر رحم کرو (یعنی ایسا کرنے سے معاش میں تنگی ہوتی ہے)

حکایت: حاتم زاہد عاصم بن یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عاصم نے کہا: اے حاتم! تو نے نماز کو کبھی اچھا کر کے ادا کیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ عاصم نے کہا: وہ کیسے؟ حاتم نے کہا: جب نماز کا وقت قریب ہوتا ہے تو کامل وضو کر کے نماز پڑھنے کے مقام پر پہنچ کر اطمینان سے نماز پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ پس نماز کی ادائیگی میں یہ خیال کرتا ہوں کہ گویا کعبہ میرے سامنے ہے اور مقام ابراہیم سینہ کے بالمقابل ہے اور میرا مالک میرے دل کو ملاحظہ فرما رہا ہے اور میرا یہ قدم پل صراط پر ہے اور جنت میرے دائیں اور دوزخ میرے بائیں اور ملک الموت میرے پیچھے ہے اور یہی تصور ہوتا ہے کہ یہ میری آخری نماز ہے۔ پھر تکبیر کہتا ہوں احسان کی اور قرأت پڑھتا ہوں تفکر کی اور رکوع کرتا ہوں تواضع کا اور سجدہ کرتا ہوں خشوع کا پھر قعدہ کرتا ہوں خوف و رجا کے مابین، پھر صبر پر پابند ہوں۔ عاصم نے کہا: اے حاتم! تم ایسے نماز ادا کرتے ہو؟ حاتم نے کہا: ایسے نماز ادا کرتا ہوں، نہ صرف ایک بار بلکہ تیس سال کامل ہو گئے۔ عاصم رو پڑے اور کہنے لگے: ہائے افسوس! میں ایسی نماز کبھی ادا نہ کر سکا۔ (**کذافی تنبیہ الغافلین**)

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

اگر بے وضو در نماز ایستی ۔۔۔ کہ داند چو در بند حق نیستی

فضائل و مسائل نماز: اللہ تعالیٰ نے نماز میں چند چیزوں کا حکم فرمایا ہے۔

۱۔ اقامت کا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: **وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ** نماز قائم کرو

۲۔ محافظت و مداومت کا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: **عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ**

۳۔ پورے وقت میں ادا کرنے کا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: **كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا** نماز اہل ایمان پر فرض ہے۔

۴۔ جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: **وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ** رکوع والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

۵۔ خشوع کے ساتھ ادا کرنے کا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: **الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ** بہ بنائے ایں

وجوہ لوگ بھی چند قسم ہوئے۔

ا۔سرے سے نماز کے منکرین۔ان سب کا سردار ابوجہل ہے اس کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ان کا انجام بھی بیان فرمایا ہے: مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ تا وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۲۔اس کی حقانیت کے قائل تو ہیں مگر ادا نہیں کرتے یہ اہل کتاب ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ خلف سے مراد اہل کتاب ہیں۔پھر فرمایا: اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ پھر ان کے انجام کے متعلق فرمایا: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا عنقریب دوزخ میں داخل ہوگئے۔

ف: لفظ غی متعلق کہا گیا ہے کہ دوزخ کا ایک ایسا طبقہ ہے جو تمام طبقات سے زیادہ سخت ہے جس سے لوگ دن میں کئی بار فریادی ہوتے ہیں بعد ازاں فرمایا: اِلَّا مَنْ تَابَ یعنی یہودیت ونصرانیت سے توبہ کرنے اور فرمایا: وَاٰمَنَ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وَعَمِلَ صَالِحًا یعنی نماز کا پابند ہو جائے تو پھر اس طبقہ سے بچ جائے گا ورنہ نہیں۔

۳۔بعض وہ ہیں کہ بعض نمازیں ادا کرتے ہیں اور بعض قاصر اور کاہل ترین ہوتے ہیں۔یہ لوگ منافق ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى اور ان کا انجام وَيْلٌ ہے اور وَيْلٌ جہنم میں ہے کہ اگر اس میں تمام دنیا کے پہاڑ ڈالے جائیں تو اس کی گرمی سے پگھل جائیں گے۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔جس نے نماز کو چھوڑے رکھا، یہاں تک کہ اس کا وقت چلا گیا تو اس کو جہنم میں ایک حقب تک رکھا جائے گا اور حقب اسی سال کا ہے اور سال تین سو ساٹھ دن کا اور اس کا ہر ایک دن تمہاری گنتی کے ہزار سال جیسا ہے۔

مسئلہ: نماز کو وقت سے بے وقت کر کے پڑھنا گناہ کبیرہ ہے اور کبیرہ گناہوں سے سب سے چھوٹے کے متعلق کہا گیا ہے، کہ گویا اس نے اپنی ماں کے ساتھ ستر بار زنا کیا۔ (کذا فی روضۃ العلماء)

۴۔وہ حضرات ہیں جو اس کی فرضیت کے قائل ہیں اور پورے وقت میں شرائط کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ان

سب کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تم رات کی دو تہائی حصہ قیام کرتے رہو گے اور فرماتا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وہ اہل ایمان کامیاب ہوئے جو نمازوں میں خشوع کرتے ہیں ان کے انجام کے متعلق بھی یہ مژدہ سنایا:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ وہی جنت الفردوس کے وارث ہیں۔

ف: بہشت کا ایک بلند مقام اور پر رونق مقام ہے۔ مومن وہاں پہنچ کر اپنی من بھاتی آرزو پائے گا اور اپنے مالک کے دیدار سے بھی سرشار ہوگا۔

لطیفہ: حکماء فرماتے ہیں کہ: ستارہ ہو جا، اگر تجھے طاقت نہیں تو چاند ہو جا، ورنہ سورج ہو جا۔

تشریح: یعنی ساری رات عبادت میں مصروف رہ جیسا کہ ستارہ تمام رات چمکتا ہے یا چاند کی طرح ہو جیسا کہ وہ رات کے بعض حصہ میں روشن رہتا ہے تو بھی رات کے بعض حصہ میں عبادت گذار ہو ورنہ سورج کی طرح ہو یعنی رات کو اگر تجھے عبادت کا موقع میسر نہیں ہوتا تو دن کی عبادت کو غنیمت سمجھ (کذا فی زھرۃ الریاض)

نماز باجماعت کے مسائل: نماز باجماعت ادا کرنا فرض کفایہ ہے مگر عام علماء کے نزدیک فرض نہیں یہاں تک کہ تنہا نماز پڑھنے سے ان کے نزدیک نماز ہو جاتی ہے مگر جماعت کی فضیلت سے محرومی ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز باجماعت ادا کرنا سنت نہیں بلکہ فرض ہے اگر کسی نے جماعت کے بغیر نماز پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوئی۔

۳۔ لیکن ہمارے (احناف) کے نزدیک اگرچہ نماز باجماعت فرض نہیں مگر مسلمان پر ضروری ہے کہ اس کی حفاظت ومداومت ضرور کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ اے میری قوم اللہ کے داعی کا کہا مانو!

دَاعِيَ اللّٰهِ سے مراد بعض کے نزدیک وہ موذنین ہیں جو پانچوں اوقات نماز کے لئے بلاتے ہیں۔

مسئلہ: شرابی، قاتل ناحق، چغل خور، والدین کے بے فرمان، کاہن، ساحر، گلہ گوان سب سے تارک

جماعت برا ہے۔ توراۃ، انجیل، زبور، قرآن میں اسے ملعون کہا گیا ہے اور ملائکہ اسے ملعون کے نام سے پکارتے ہیں یہ جب بیمار ہو تو اس کی طبع پرسی نہ کرو اور جب مر جائے تو اس کے جنازہ پر بھی نہ جاؤ۔

نماز باجماعت کے فضائل: حدیث شریف:۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تارک جماعت مجھ سے نہیں اور نہ میں اس سے ہوں اور اللہ تعالیٰ نہ اس کی فرضی عبادت قبول کرے گا نہ نفلی اگر اسی حالت میں اس پر موت آ گئی تو وہ جہنم کا مستحق ہوگا۔ (کذافی روضۃ العلماء)

حدیث شریف: نصاب الاحتساب میں ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے خیال آتا ہے کہ کسی کو نماز پڑھانے کا حکم دے کر اس قوم کا معائنہ کروں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتی۔ پس ان کی اس حالت (ترکِ جماعت) کو دیکھ کر ان کے گھروں کو جلا دوں۔

مسئلہ:۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو سنت مؤکدہ کا تارک ہو اس کے گھر کو جلانا جائز ہے۔

تنبیہ:۔ تارک سنت کے لیے اتنا سخت حکم ہے اب تم خود سوچ لو کہ فرض وواجب کے ترک پر کتنی سزا ہوگی۔ [1]

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ معصیت کے آلات کو جلانا جائز بلکہ ضروری ہے۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کلمہ شہادت کے لئے مبعوث فرمایا۔ جب اس کی تصدیق ہوگئی تو نماز کا حکم دیا اس کی تصدیق کے بعد زکوٰۃ کا حکم دیا اس کے بعد روزہ رمضان کا حکم صادر فرمایا۔ پھر حج کا ارشاد نازل فرمایا بعد ازاں جہاد کا اس پر دین متین تکمیل کی ہوگئی۔

ف: حضرت مقاتل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام مکہ معظمہ میں دو رکعت صبح کو اور دو رکعت شام کو پڑھتے تھے پھر جب آپ کو معراج ہوئی تو آپ کو پانچوں نمازوں کا حکم ہو۔ (کذافی روضۃ الاخیار)

سوال: نماز شب معراج میں کیوں فرض ہوئی؟

جواب:۔ چونکہ شب معراج افضل الاوقات اور اشرف الحالات اور اعز المناجات ہے اور نماز بھی بعد از ایمان

---

[1] نیز منقول ہے کہ بے نماز کو قرض بھی نہ دینا چاہئے اس لیے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کا عائد کردہ "قرض" ادا نہیں کرتا تو وہ تمہارا قرض کب ادا کرے گا۔ اویسی غفرلہٗ

افضل الطاعات اور ادائیگی کے لحاظ سے احسن الھیات ہے پس افضل عبادت کو اس افضل وقت (کہ جس میں بندہ کو اپنے رب کا وصال اور اس کا قرب حاصل ہوا) فرض کیا گیا۔

نکات :۔ ۱۔ نماز کی فرضیت میں ایک حکمت یہ ہے کہ جب حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں پر تشریف لے جا کر ملک سموت کے ذرہ ذرہ کی سیر فرمائی اور اس کے مکینوں یعنی ملائکہ کی عبادات کا بھی معائنہ فرمایا تو ان کی کثرت عبادت پر آپ کو رشک ہوا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے امت کے لئے ملائکہ کی عبادت کا عرض کیا اللہ تعالیٰ نے بمطابق معروض تمام ملائکہ کی عبادت کا مجموعہ صلوۃ خمسہ میں جمع فرمادیا۔ بایں طور کہ وہ فرشتے بعض قیام میں تھے اور بعض رکوع میں اور بعض سجدہ میں اور بعض تسبیح کہہ رہے تھے وغیرہ وغیرہ پس اللہ تعالیٰ نے ان تمام ملائکہ کی عبادات کے اجر و ثواب صلوۃ خمسہ کی ادائیگی پر عطا فرمادیے۔

۲۔ نماز دو یا تین، چار رکعت اس لیے فرض ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج بعض ملائکہ کو دیکھا بعض دو پروں والے تھے بعض تین والے بعض چار والے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہیئات کو انوارِ صلوات میں متشکل فرمادیا۔ بایں طور کہ جب اعمال کے ملائکہ ارواح عبادات کو آسمان کی طرف لے جاتے ہیں تو یہ عبادات نورانی شکلوں میں متمثل ہوتی ہیں چنانچہ اس کے متعلق احادیث میں وارد ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے پروں کو تین مراتب میں منقسم فرمایا اور نمازی کو بھی انہی تین قسموں کے پر عطا ہوئے کہ وہ ان سے ملائکہ کے موافق ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرے تاکہ ملائکہ اس کے لیے استغفار کریں۔

۳۔ نماز کو پانچ اوقات میں اس لیے فرض کیا گیا کہ جب حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج اللہ تعالیٰ سے امت کے لیے تخفیف کی عرض کی اور واپسی کا عزم فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یامحمد (صلی اللہ علیہ وسلم) **انھن خمس صلوت کل یوم ولیلۃ بکل صلوۃ عشر حسنات فتلک خمسون صلوۃ** یعنی اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) دن اور رات میں پانچ نمازیں ہیں اور ہر نماز دس کے برابر ہے اس لحاظ سے ان کی پچاس نمازیں ہوئیں۔

ف: ہم سے پہلی امتوں پر پچاس نمازیں فرض تھیں پس شب معراج امت پر تخفیف فرما کر پانچ مقرر کردیں مگر اپنے فضل و کرم سے ثواب پچاس کا عنائت فرمائے گا۔

۴۔سابقہ امتوں پر نماز متفرق طور پر فرض تھی۔پس اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے لیے تفریق کو جمع سے بدل دیا کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین و دنیا کے جمیع فضائل وکمالات کے جامع ہیں۔اسی آپ کی امت سابقہ امم کے اعتبار سے۔

ف:۱۔سب سے پہلے فجر کی نماز سیدنا آدم علیہ السلام نے پڑھی اور ظہر کی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اور عصر کی یونس علیہ السلام نے اور مغرب کی عیسیٰ علیہ السلام نے اور عشاء کی موسیٰ علیہ السلام نے۔

تنبیہ:۔یہی راز ہے نماز کو پانچ اوقات میں ادا کرنے کا۔

۲۔بعض روایات میں ہے کہ ان پانچ نمازوں کو سب سے پہلے ادا کرنے والے سیدنا آدم علیہ السلام ہیں پھر بعد میں انبیاء علیہم السلام متفرق طور پر ادا فرماتے رہے۔

۳۔وتر سب سے پہلے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں ادا فرمائے اسی لیے آپ نے فرمایا: میرے لیے میرے رب نے ایک اور نماز زائد فرمائی ہے۔یعنی پنجگانہ سے یارات کی نماز سے۔

۴۔سب سے پہلے (آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے حکم میں) سجدہ کرنے والے جبریل علیہ السلام ہیں جس کی وجہ سے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے خادم ورفیق مقرر ہوئے۔

۵۔سب سے پہلے سبحان اللہ کہنے والے حضرت جبریل اور الحمدللہ کہنے والے حضرت آدم اور لا الٰہ الا اللہ کہنے والے حضرت ابراہیم اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کہنے والے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔یہ تمام مذکورہ بالا تقاریر **کشف الکنوز و حل الرموز** کی ہیں۔

ف:۶۔حکم شاذلیہ اور اس کی شرح میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ انسان سے کئی مذاہب ظاہر ہوں گے تو پھر (بہ بنائے مصلحت) اس کی طاعات کے انواع بھی کئی مقرر فرمائے۔تاکہ جب ایک نوع سے ملال کرے تو دوسرے نوع میں شروع ہو کر راحت حاصل کرے اور یہ بھی علم تھا کہ انسان میں وہ حرص ہے جو اسے مختلف ملتوں کی طرف کھینچ کر اسے مقصود اعلیٰ تک پہنچنے سے روکے رکھے گا تو پھر اس پر چند واقعات کی پابندی لگادی۔

مثلاً آٹھویں پہروں میں پانچ وقت کی نماز اور سال میں ایک ماہ کا روزہ اور دوسو درہم سے پانچ درہم زکوۃ اور عمر بھر میں صرف ایک دفعہ حج بیت اللہ پھر فرض کی تفاصیل کے لیے وہ وقت ہے جو دوسرے فرض کی صلاحیت

نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ انسان کے لیے رحمت اور اس کے عبد بننے کی سہولت کے موجبات ہیں تا کہ اس سے ان کی ادائیگی کا خیال ہٹ نہ جائے اور اوقات میں وسعت کر دی تا کہ بندہ کو اس میں ادائیگی کا خیال باقی ہو۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں ۔

گر نباشد فعل خلق اندر میاں	پس مگو را چرا کردی چناں
یک مثال اے دل پے فرقے بیار	تا بدانی جبر را از اختیار
دست کاں لرزاں بود از ارتعاش	وانکہ دستے را تو لرزانی ز جاش
ہر دو جنبش آفریدہ حق شناس	لیک نتواں کرد ایں باآں قیاس

ترجمہ: ۱۔ اگر مخلوق کا درمیان میں دخل نہ ہو تو پھر تم آپس میں کیوں کہتے ہو کہ تم نے یہ کیوں کیا۔

۲۔ تمہیں صرف ایک مثال دیتا ہوں کہ تم جبر و اختیار کے درمیان فرق کر سکو۔

۳۔ دیکھئے ایک ہاتھ کانپتا ہے رعشہ کی بیماری سے، لیکن تم اپنا ہاتھ ہلاتے ہو اپنے اختیار سے۔

۴۔ اگر ان دونوں ہاتھوں کی حرکتوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن ایک مجبوراً کانپ رہا ہے دوسرا اختیار سے ہل رہا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ نماز کی ابتداء اقامت سے ہے۔ پھر اس پر مداومت کا حکم ہے نماز کی اقامت کا یہ مطلب ہے کہ اس کو اپنے اوقات میں ادا کرنے اور اس کے رکوع وسجود کو پورا کرنے اور اس کی حدود پر ظاہراً و باطناً پابندی کرنے پر محافظت کی جائے اور نماز پر مداومت کا مطلب یہ ہے کہ اس نفحات ربوبیت کے لئے جمع ہمت کے ساتھ مداومت کرنا اور وہ نفحات نماز میں امانت رکھے گئے ہیں جیسا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز کی ظاہری صورت صورت تعرض ہے اور اس امر کی صورت جذبۃ الحق ہے جو کہ غیر کی عبودیت کے ارتکاب سے روکتا ہے اور نماز کی باطنی صورت حقیقی تعرض ہے پس نماز کی ہر ظاہری شرط اور رکن اور سنت وہیئت میں ایک راز ہے جو حقیقی تعرض کی طرف دلالت کرتا ہے۔

صوفیہ کا وضو۔ نماز کی شرائط میں سے ایک شرط وضو ہے۔ جس کے ہر مستحب و سنت وفرض میں راز ہے جو ایسی طہارت پر دلالت کرتا ہے جس سے اقامت صلوۃ کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہاتھ دھونے میں نفس کو

گناہوں کے کیچڑ اور قلب کو صفات ذمیمہ، حیوانیہ اور سبعیہ، شیطانیہ کے کیچڑ سے صاف کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا ہے۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ یعنی اپنے ثیاب کو پاک کرو۔ تفاسیر میں ثیاب بمعنی قلب بھی آیا ہے اور منہ دھونے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اپنے ارادہ کے منہ کو ظلمتِ حبِ دنیا کی گرد وغبار سے پاک رکھا جائے کیونکہ حبِ دنیا تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

صوفیہ کی نماز:۔ نماز کی شرائط سے ایک شرط استقبال قبلہ بھی ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرب مناجات کے لیے طلب حق کے ماسوا سے اعراض اور حضرتِ ربوبیت کی طرف توجہ ہونی چاہئے اور رفع الیدین میں اس طرف اشارہ ہے کہ ارادوں کے ہاتھ دنیا وآخرت کی طلب سے دور ہوں اور تکبیر میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم مقصود ہو۔ کیونکہ وہ کریم مومن کے دل میں باعتبار طلب ومحبت تعظیم کے سب سے بڑا ہے اور تکبیر کے ساتھ نیت کی۔ مقارنت میں اس طرف اشارہ ہے کہ طلب میں نیت ہو پس بندہ کو چاہیے کہ اس سے سوائے ا؎ ہ کی ذات کے کسی اور کی طلب نہ کرے۔ کیونکہ جس نے اس کے غیر کو طلب کیا تو گویا اس نے اسی کو اپنا بڑا اور م؎ م مطلوب سمجھا نہ کہ اللہ تعالیٰ کو۔ بنا بریں اس کی حقیقۃً نماز جائز نہ ہوگی۔ جیسا کہ بظاہر اس کی نماز سوائے تکبیر تحریمہ کے جائز نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی شخص (بجائے اللہ اکبر کے) **الدینا اکبر یاالعقبی اکبر** کہے تو اس کی نماز جائز نہیں جب تک کہ اللہ اکبر نہ کہے۔ اسی طرح حقیقۃً بھی (نماز صحیح نہ ہوگی) جب تک کہ نماز میں اس کی ذات کو مقصود نہ سمجھے اور سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ اور سینے پر رکھنے میں اشارہ ہے کہ بندے اپنے مالک کے سامنے یونہی پیش ہوتے ہیں اور (سینہ پر ہاتھ رکھنے سے) قلب کو ماسوا اللہ کی محبت سے محفوظ کرنا ہے اور انی وجھت وجھی للذی سے شروع کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حق کی طرف توجہ اور غیر سے اعراض ہونا چاہئے اور اس میں فاتحہ کے وجوب اور قرأۃ کی فرضیت اور ان کے سوا نماز کے عدم جواز میں بندے کی حقیقت تعرض (جو کہ نفحات الطاف ربوبیت کی طلب میں ہوتا ہے) کی طرف اشارہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کو باری تعالیٰ کی حمد وثنا وشکر اور طلب ہدایت سے طلب کیا جائے اور یہ ہدایت دراصل وہ جذبات الٰہیہ ہیں کہ جس کا ایک جذبہ ثقلین کے عمل کے برابر ہے اور بندے کا تقرب نصف نماز میں ہے جو کہ بندہ اور مالک لم یزل کے مابین نصف ونصف تقسیم کی گئی ہے اور قیام ورکوع وسجود میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ کا رجوع عالم ارواح اور مسکن غیب کی طرف ہے اس

لیے کہ یہ (اس عالم وسکن سے آیا ہے) پھر اس کا پہلے تعلق نباتیہ سے ہوا پھر حیوانات سے، پھر انسانیت سے پس قیام انسان کا خاصہ ہے اور رکوع حیوانیت کا اور سجود نباتات کا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ بندے کا ان ہر سہ مراتب سے نفع بھی ہے اور نقصان بھی ہے اور روح علوی جو کہ نورانی ہے اس کا اس جسد سفلی (جو کہ ظلماتی ہے) سے متعلق کرنے میں بھی نفع مقصود ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے۔

حدیث قدسی: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''میں نے مخلوق کو اس لیے پیدا فرمایا کہ وہ مجھ سے بہرہ یاب ہو (نہ اس لئے کہ میں اس سے فائدہ حاصل کروں) تا کہ روح سفلیات کے تمام مراتب سے فائدہ اٹھائے جو کہ وہ مراتب علویات سے نہ پا سکا۔ اگرچہ وہ پہلے خسارہ کی آزمائش میں مبتلا ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی بندہ نور ایمان وعمل صالح سے بلائے خسران (جو کہ مراتب سفلیہ سے ہے) نجات پا کر ان مراتب علویہ کے منافع سے باریاب ہوگا۔ مثلاً نماز کے قیام (جو کہ عاجزی وتواضع کے ساتھ ہو) سے تکبر وتجبر (جو کہ انسان کا فطرتی ہے) سے نجات پا کر کامل انسان ہو جائے گا اور اس کے بعد اس کی زبان انا ربکم الاعلی کہہ اٹھے گی (مگر باجود اینہمہ) علو ہمت کے منافع سے کامیاب ہوگا۔ جو کہ یہ انسانی تکمیل ہے جب اس تکمیل سے کامیاب ہو جاتا ہے تو مکون (یعنی خالق کائنات) کی طلب میں عالم کون کی طرف التفات بھی نہیں کرتا جیسا کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا (شب معراج) حال تھا۔ جس کو قرآن پاک یوں بیان فرماتا ہے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۞ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى نہ آنکھ ٹیڑھی ہوئی اور نہ دوڑے بے شک اپنے رب کی بہت بڑی نشانی دے گی۔ پس جب بندہ تکبر انسانی سے نجات پاتا ہے تو قیام انسانی سے رکوع حیوانی کی طرف رجوع کرتا ہے جو کہ خضوع وانکسار کا حامل ہے۔ پس رکوع کی بدولت صفۃ حیوانیہ کے خسارہ سے نجات پا کر تحمل اذی اور حلم کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ پھر رکوع حیوانی سے فارغ ہو کر سجود نباتی کا رخ کرتا ہے۔ پس سجود کی برکت سے ذلتِ نباتیہ ودنأت سفلیہ کے خسران سے نجات پا کر اس خشوع کے منافع سے بہرہ یاب ہوا۔ جس میں فلاح ابدی ونور سرمدی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۞ خشوع عبودیت کے عروج کا کامل آلہ ہے اسی سے انسان کو جسد نوران سے تعلق نصیب ہوا اور ایسا خشوع عالم میں کسی کو نہیں عنایت ہوا ۔۔۔

راز امانت ہے کہ جس کے تحمل سے ملائکہ وغیرہ نے انکار کر دیا تھا جس کو آیت وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں ذکر کیا گیا ہے۔

کیونکہ اباءِ خشوع کی نقیض ہے اور انسان میں چونکہ استعداد خشوع موجود تھی اس کی بدولت امانت کا بوجھ اٹھالیا اور خشوع کی تکمیل سجدہ سے ہوتی ہے کیونکہ اسی سے صورتِ انسانی وہیئت نماز میں کمال درجہ کے عجز کا اظہار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی سے روح کا عالم سفلی سے قطع تعلق احسن طریق سے ہوتا ہے اور مراتب انسانیہ وحیوانیہ ونباتیہ سے اعراض وعالم روحانی علوی کی طرف اسی انانیت وجود کی بدولت ہوتا ہے اور نفحات الطافِ حق کے لئے تعرض اسی سے ہوتا ہے اور بذل المجھود جو کہ نمازی کے لیے شرط اول ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اسی سے میسر ہوتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ رزق لغت میں بمعنی عطا ہے اور عرف میں اہل سنت کے نزدیک وہ شئے ہے جس سے حیوان نفع اٹھائے خواہ حلال ہو یا حرام اور یہاں قرینہ کی وجہ سے حلال شئے مراد ہے کیونکہ یہ مدح کا مقام ہے اور مفعول کی تقدیم میں دو فائدے ہیں: ۱۔ اہتمام ۲۔ رؤس آیات کی محافظت اور مِن تبعیضیہ داخل کر کے اسراف (جو کہ شرعاً ممنوع ہے) سے منع کیا گیا ہے۔

سوال: رزقنا جمع کا صیغہ ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ناجائز ہے کیونکہ وہ تو وحدہٗ لاشریک ہے۔

جواب: جمع کے صیغے بادشاہوں کے لئے بولے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے اور شاہوں کا شاہ ہے

ف: بادشاہوں کی اپنی گفتگو چار طریقوں سے ہوتی ہے۔

۱۔ صیغہ واحد کے ساتھ، جیسے کوئی بادشاہ کہے: فَعَلْتُ كَذَا میں نے ایسے کیا۔

۲۔ جمع کے ساتھ، جیسے فَعَلْنَا كَذَا ہم نے ایسے کیا۔

۳۔ صیغہ مجہول کے ساتھ، جیسے رُسِمَ لَكُمْ تمہارے لیے کہا گیا۔

۴۔ اپنے آپ کو غائب قرار کر کے فعل کی نسبت اپنے اسم کی طرف کر دینا۔ جیسے خود کہے: اَمَرَ كُمْ سُلْطَانُكُمْ

اور قرآن پاک چونکہ عرب کی لغت میں نازل ہوا، بنابریں اللہ تعالیٰ نے انہی چار طریقوں کو اپنے لیے استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ اپنی ذات سے خبر دیتے ہوئے فرمایا۔ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا یعنی صیغہ واحد کے

ساتھ مجھے اور اسے چھوڑ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔ اور فرمایا: إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ صیغہ جمع کے ساتھ۔ بے شک ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا۔ اور فرمایا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ وغیرہ تم پر روزے فرض ہوئے اور طریقہ غیب بھی کئی بار فرمایا۔ کما قال: ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وغیرہ وغیرہ (کذافی تفسیر التیسیر) وہ جس نے تمہیں پیدا کیا۔

میرے شیخ قدس سرہٗ کی تقریر اس کے متعلق یوں ہے کہ واحد کا صیغہ باعتبار ذات کے ہے اور جمع کا باعتبار اسماء وصفات کے اور کثرت اسماوصفات وحدۃ ذات کے منافی نہیں کیونکہ مآل ہر ایک کا ایک ہی ہے۔ انفاق وانفاد ایک ہی شئے ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ انفاد میں تمام مال خرچ کرنا مراد ہوتا ہے اور انفاق میں ایسا نہیں ہوتا اور یہاں انفاق سے نیک راہ میں خرچ کرنا مقصود ہے فرض ہو یا صدقہ یا نفل اور جس نے صرف زکوۃ مراد لی ہے تو اس نے خیرات کی بہترین نوع اور ان کے اصل کا ذکر کر کے باقیوں کو ترک کر دیا اور زکوۃ مراد لینا موزوں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جمیع عطا کردہ معاون مراد ہیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ اس کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس علم سے کچھ ظاہر نہ کیا جائے اس خزانہ کی طرح ہے کہ جس سے کچھ خرچ نہ کیا جائے اور جن حضرات نے اس آیت کی تفسیر[1] **ومما خصصنا هم به من انوار المعرفة يفيضون** سے کی ہے وہ بھی تعمیم کے قائل ہیں۔ مگر زیادہ مناسب یہ ہے کہ انفاق سے مراد زکوۃ ہے لیکن ہر شئے کی زکوۃ اس کی جنس سے ہوا کرتی ہے۔ جیسا کہ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ دار کی زکوۃ یہ ہے کہ اس میں ایک مہمان خانہ بھی تیار کیا جائے۔

(کذافی الرسالة القشيريه)

تمکین اقوال:۔ ☆.....اہل شرع کا انفاق اموال کی حیثیت سے ہوتا ہے لیکن جاہل اہل حقیقت کا جان سے مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

آں درم دادن سخی را لائق است | جاں سپردن خود سخائے عاشق است

ترجمہ: عوام کی سخاوت پیسے خرچ کرنا اور عاشق کی سخاوت جان جانجاناں کو پیش کرنا ہے۔

---

[1] وہ جنہیں ہم نے انوار معرفت سے مخصوص کیا وہ فیض پہنچاتے ہیں۔

☆......اغنیاء کا انفاق مال سے ہوتا ہے کہ مال کو ضرورت مندوں سے روک نہیں رکھتے اور عابدین کا انفاق نفوس سے ہوتا ہے کہ نفوس کو خدمات کے وظائف سے باز نہیں رکھتے اور عارفین کا انفاق قلوب سے ہوتا ہے کہ قلوب کو مراقبہ کے حقائق سے دور نہیں فرماتے اور عاشقین کا انفاق ارواح سے ہوتا ہے کہ ارواح کو جاری کردہ قضاء سے نہیں روکتے۔

☆......اور یہ بھی کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اغنیاء کا انفاق جیب سے مال نکالنا اور فقراء کا انفاق قلوب سے اغیار کا نکالنا ہے۔

نکتہ: آیت میں اوّلاً ایمان کا ذکر ہے اسے قلوب سے تعلق ہے پھر نماز کا اسے بدن سے، پھر انفاق کا اسے مال سے، اور یہ تینوں عبادات کا مجموعہ ہیں چنانچہ ایمان میں نجات ہے اور صلوٰۃ میں مناجات اور زکوٰۃ میں درجات (یایوں کہو کہ) ایمان میں بشارت ہے اور صلوٰۃ میں کفارہ اور زکوٰۃ میں طہارت (یایوں کہو کہ) ایمان میں عزت ہے اور صلوٰۃ میں قربت اور زکوٰۃ میں زیادۃ۔

شان خلفائے راشدین: آیت ہذا میں چار چیزوں کا بیان ہے۔

۱۔تقوی ۲۔ایمان بالغیب ۳۔اقامت صلوٰۃ ۴۔ انفاق

اور یہی چار اوصاف خلفائے راشدین کے ہیں مثلاً آیت میں مومنین کی فضیلت تقوی سے بیان فرمائی اور یہ صفت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا:۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ اور ایمان بالغیب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفت ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اور اقامت صلوٰۃ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفت ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآىِٕمًا

انفاق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفت ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ

ف: بعض قوم یعنی صوفیہ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک عطا کے لحاظ سے سخاوت پہلا رتبہ ہے۔اس کے

بعد جود، اس کے بعد ایثار، مثلاً کوئی شخص اپنا کچھ مال اپنے لیے رکھ لے اور کچھ خیرات کر دے اسے صاحب سخاوت کہیں گے اور کوئی ایسا شخص ہو کہ کچھ مال اپنے لیے رکھ کر باقی اکثر خرچ کر دے اسے صاحب جود کہا جائے گا اور کوئی ایسا شخص ہو کہ خود تو اپنی ضرورت کے لیے تنگ ہو مگر جو کچھ اسے حاصل ہو وہ دوسروں کے لیے خرچ کر دے اسے صاحب ایثار کہا جائے گا۔ انفاق کے بہت سے فضائل ہیں منجملہ ان کے ایک حکایت ملاحظہ فرمایئے۔

انفاق کے فضائل:۔ حکایت۔ ابوعبداللہ الحارث الرازی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایک نبی کی طرف وحی بھیجی کہ میں نے فلاں شخص کے لیے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ اس کی نصف عمر فقر میں بسر ہو اور نصف دولت مندی میں آپ نے اسے بلا کر پوچھا کہ وہ کس طرح چاہتا ہے اسے بلایا گیا اور سارا ماجرا سن کر عرض کی: مجھے اجازت ہوتا کہ میں اپنی زوجہ سے مشورہ کرلوں اس نے اپنی عورت کو حال سنایا تو اس نے کہا: پہلے دولت مندی کی تمنا ظاہر کرو۔ مرد نے کہا میرا خیال ہے کہ پہلے فقر ہونا چاہئے کیونکہ سکھ کے بعد دکھ مصیبت عظیم ہے اور دکھ کے بعد سکھ نعمت عظمیٰ اور موجب راحت ہے۔ عورت نے کہا: آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر اس بار میرے کہنے پر عمل کرلو اس شخص نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر دولت مندی کی آرزو ظاہر کر دی۔

نبی علیہ السلام کی دعا سے وعدہ پورا ہوا اور وہ شخص صاحب جائیداد ہو گیا۔ عورت نے کہا: اگر تو اس دولت کی پائیداری چاہتا ہے تو اسے خلق خدا پر خرچ کر۔ چنانچہ اس نے اس پر عمل کیا جب وہ کپڑا خریدتا تو دوسرا کسی مسکین کے لیے بھی خرید لیتا۔ جب نصف عمر ختم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ اگرچہ اب اس کی باری فقر کی آگئی مگر چونکہ اس نے میری نعمتوں کا حق ادا کیا فلہٰذا اسے مژدہ سنا دو کہ اس کی باقی عمر بھی دولت مندی میں بسر ہو گی۔ مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ کارد گرد انبارش تہی لیکش اندر مزرعہ باشد بہی
وانکہ در انبار ماند و صرفہ کرد اسپش و موش حوادثہا ش خورد

ترجمہ:۔ کھیتی بوتے وقت بندہ خالی ہاتھ ہو جاتا ہے لیکن اس کا ثمرہ کھیتی پیدا ہو جانے کے وقت ہوتا ہے اور اپنی گندم نہیں بوتا اسے گھر میں رکھ چھوڑتا ہے تو اسے جانور کھا جاتے ہیں یا چوہے، یا دیمک کا شکار ہو جائے گی۔

حضرت حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

احوال گنج قاروں کایام داد برباد باغنچہ باز گوید تازر نہاں ندارد

ترجمہ:۔ قاروں کے خزانے کے حالات سخاوت کے زمانے کی طرح برباد ہیں باغیچے سے کہو کہ وہ اپنا دفینہ پوشیدہ نہ رکھے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ وجود کے اوصاف (جو کہ ہم نے عطا کئے ہیں) اس نماز (جو کہ بندہ اور اس کے مولی کے مابین منقسم ہے) کے حق نصف میں خرچ کرتے ہیں۔ جب کار دشوار ہونے لگتا ہے اور تعرض منتہا کو پہنچتا ہے تو عنایت ازلیہ نفحات الطاف کے ساتھ بندہ کو مدرک ہوتی ہے اور اسے درجات قرب کی ہدایت دی جاتی ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج کے خطابات سے جذبہ حق حاصل ہوا۔ ایسے ہی بندہ کو وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ کے خطابات سے جذبہ حق نصیب ہوتا ہے۔

صوفیہ کی تشہد وفراغت از صلوۃ:۔ سجدہ کے بعد تشہد پڑھنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ حجابات انانیت سے نجات پاکر جذبات ربانیہ کی بدولت شہود جمال حق میں پہنچ رہا ہے اور اس میں الفاظ (مخصوصہ) پڑھنے میں یہ طریقہ سکھایا جارہا ہے کہ بادشاہوں کی بارگاہ میں تحائف ثناء اور اظہار طلب دیدار کے ساتھ حاضری دینی چاہئے اور دائیں بائیں سلام پھیرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دارین پر سلام ہو اور ہر اس داعی جاہل پر بھی جو بندہ کو دائیں جانب سے نعیم جنت کی طرف اور بائیں جانب سے لذات وشہوات کی طرف بلاتا ہے اور بندہ مقام اجابات ومناجات اور درجات قربات کا ہے اور وہ اس وقت بحر کرامات میں مستغرق ہوتا ہے بلکہ (یوں کہئے کہ) جذبات الٰہیہ کی قید میں مقید ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

مسئلہ:۔ اس وقت اہل شرع تو نماز سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اہل حق دائی صلوۃ میں ابھی داخل ہورہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ اور وہ نمازوں پر مداومت کرتے ہیں۔

ف: بعض لوگ ایسے ہیں جو نماز کی حفاظت کرتے ہیں اور نماز ان کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ بے شک نماز فحش اور برائی سے روکتی ہے۔

یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان بالغیب رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے سے ان نعمتوں کے عوض خرچ کرتے ہیں جو ان کے لئے آخرت میں تیار ہے جس کی جزا اللہ تعالیٰ نے دی ہے کہ میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسی اعلیٰ شے تیار کر رکھی ہے کہ جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہمارے لیے وہ شئے تیار کی گئی ہے جو نہ آنکھوں کے ادراک میں آسکتی ہے اور نہ کانوں کے، نہ قلوب کے اور یہ بھی انہیں معلوم نہیں ہوا کہ ان تیار شدہ نعمتوں اور ہمارے مابین سوائے ہمارے اپنے وجود کے کوئی شئے حائل نہیں ہے تو ان کی خواہش ہوئی کہ انہیں وہ نار نصیب ہو (جو ان کے لیے حجاب بنا ہوا ہے) اسے جلا دے۔ چنانچہ انہیں اس صلوۃ کی جانب نار محسوس ہوئی جب وہ اس کے قریب پہنچے تو ندا آئی کہ مبارک ہے وہ شخص جو اس نار کے اندر ہے اور جو اس کے قریب ہے پاکی ہے رب العالمین کے لیے۔ پھر وہ حضرات وجود کے اوصاف کو اس نار کا ایندھن بنا کر وجود کو اسی نار میں جلاتے ہیں۔ اسی طرز پر وہ حضرات نماز میں قائم رہتے ہیں یہاں تک کہ ہاتف غیبی ندا دیتا ہے کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ [1] خلاصہ یہ کہ وجود اور اشیاء جو اس کے لیے تیار کی گئی ہیں، مال ہو، خواہ جاہ، قربت الی اللہ کے راہ پر خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وجود عنائت فرماتا ہے۔ جیسا کہ اپنے حبیب علیہ السلام کو فرمایا: الحق علیک جس کی وجہ سے یہ شخص انانیت الوجود کے ساتھ باقی رہے گا اور اسے اپنے نور سے دائمی صلوۃ نصیب ہوگی جس کی برکت سے یہ شخص انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے گا۔

تفسیر عالمانہ

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ **شان نزول**: یہ آیت اہل کتاب (یعنی جو اہل اسلام ہیں) کے حق میں نازل ہوئی اور اس کا ماقبل وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ تک مومنین عرب کے حق میں نازل ہوا۔ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے سالم قرآن اور تمام شریعت مراد ہے۔

سوال: اگر اس سے تمام قرآن مراد ہو تو پھر اس کو ماضی سے تعبیر کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ اس آیت کے نزول

[1]: اور وہ جسے اللہ کے سوا پوجتے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہیں اور تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔

کے بعد بہت کچھ نازل ہوا۔

جواب :۔ ا۔ یہاں پر تغلیب کا حکم جاری کیا گیا ہے۔ یعنی جو نازل ہو چکا اس کو جو ابھی نازل نہیں ہوا غالب قرار دے کر تمام کو نازل شدہ تصور کیا گیا۔

۲۔ جو ابھی نازل نہیں ہوا اسے بمنزلہ واقع کے قرار دیا گیا جیسا جنات کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا:۔

اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى بے شک ہم نے ایسی کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد اتری یہاں جنات کہہ رہے ہیں کہ ہم نے وہ کتاب سن لی جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی تھی حالانکہ انہوں نے بعض آیات سنیں۔

۳۔ کواشی میں ہے کہ قرآن پاک حکماً ایک شئے ہے کیونکہ اس کے بعض پر ایمان لانا گویا تمام قرآن پر ایمان لانا ہے۔

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ اس سے وہ قرآن مراد ہے جو تلاوت کیا جاتا ہے اور وہ وحی مراد ہے جو تلاوت نہیں کی جاتی اور تلاوت کردہ یہی سورتیں اور آیات ہیں تلاوت نہ کی ہوئی وحی وہ ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تعداد رکعات اور نصاب زکوۃ اور حدود جنایات بیان فرمائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى

ف: آیت ہذا میں اُنْزِلَ بمعنی وحی ہے اور بمعنی اعلاء یعنی نیچے سے اوپر کو جانا اور اگر اُنْزِلَ کو اوپر سے نیچے آنے پر محمول کیا جائے تو معنی یوں ہوگا کہ جبریل علیہ السلام تبلیغ کے لئے اوپر سے نیچے لے آئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ یعنی اُنْزِلَ بمعنی اوپر سے نیچے آنا اور وہ اس طرح ہوا کہ معانی نیچے پہنائے گئے ان ذوات مقدسہ کے توسط سے جو ان معانی کی حامل تھیں۔

ف: باقی کتب الٰہیہ کے نزول کے متعلق صحیح علم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے لوح محفوظ سے حاصل کر کے انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتا تھا پھر وہ حضرات اس فرشتہ سے یاد فرما لیتے وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے توراۃ، انجیل اور دیگر آسمانی کتابیں مراد ہیں۔

مسئلہ :۔ ان کتابوں پر مجملاً ایمان لانا فرض عین ہے اور قرآن پاک پر اس حیثیت سے کہ ہم اس کی تفاصیل

کے مطابق عبادت بجالانے والے ہیں۔ بالتفصیل ایمان لانا فرض کفایہ ہے کیونکہ اس کی تفصیل پر ایمان لانے کا وجوب تمام لوگوں پر خرچ اور معاش میں خلل پڑنے کا موجب ہے۔

ف : تیسیر میں فرمایا ہے کہ تمام کتب پر ایمان لانا باوجود یہ کہ ان کے احکامات ایک دوسرے کے مخالف ہیں دو قسم ہے۔

۱۔اس بات کی تصدیق کرنا کہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

۲۔اوران پر ایمان لانا کہ جن کے احکام منسوخ نہیں ہوئے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ آخر (جو کہ اول کا مقابل ہے) کی تانیث ہے اور معدودات کا وہ اسم ہے جو کسی کا لاحق ہو، اور یہ دراصل دار (محذوف) کی صفت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ اور یہ ان صفات سے ہے جن پر اسمیت غالب ہوتی ہے اور ایسے ہی لفظ الدنیا اور اخر (بفتح الخا) وہ جو اول کے قریب ہے یعنی دوسرا۔

ف : دنیا کو دنیا اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ باعتبار آخرت کے قریب ہے اور آخرت کو اسی لیے آخرت کہتے ہیں کہ وہ مؤخر ہے اور دنیا کے بعد ہے۔

هُمْ يُوْقِنُوْنَ الایقان بمعنی نظر و استدلال سے شک اور شبہ کی نفی کر کے کسی شئے کے علم میں پختگی حاصل کر لینا اسی لیے اللہ تعالیٰ کے علم کو یقین سے موسوم نہیں کیا جاتا اور نہ ہی علوم بدیہہ کو اب **هُمْ يُوْقِنُوْنَ** کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ ایسا یقین رکھتے ہیں کہ ان میں وہ اوہام وشکوک نہیں جو اہل کتاب میں پائے جاتے ہیں جو کہ منجملہ ان کے یہ شکوک بھی ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ بہشت میں یہود ونصاری کے سوا اور کوئی نہیں داخل ہوگا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں نار جہنم مس نہیں کرے گی مگر چند روز، اور ان کا اس بات کا اختلاف کہ کیا بہشت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں کی طرح ہیں یا وہ دیگر نعمتیں ہیں اور کیا یہ نعمتیں دائمی ہیں یا چند روزہ ان میں سے ایک گروہ تو اس بات کا قائل تھا کہ بہشت میں کھانے اور پینے اور نکاح کی اشیاء کی لذتیں دنیوی لذتوں جیسی ہوں گی اور بعض کہتے ہیں نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ دنیا میں ان اشیاء کی محتاجی جسم کے تزاید اور تناسل وتوالد کی بنا پر ہے اور چونکہ اہل جنت ان باتوں سے مستغنی ہوں گے بنابریں صرف وہ نسیم ورواح عقبہ اور سماع لذیذ وسرور کی لذتیں پائیں گے

سوال :. یُوْقِنُوْنَ پر ھُمْ ضمیر کو مقدم کر کے حصر کیوں کیا گیا؟

جواب :. اہل کتاب پر تعریض ہے اس لئے کہ وہ جس طرح امر آخرت کو ثابت کرتے ہیں وہ حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ آخرت کے بارہ میں جو اعتقاد رکھتے ہیں کسی حد تک صحیح نہیں، چہ جائیکہ انہیں مرتبہ یقین حاصل ہو اس سے معلوم ہوا کہ ضمیر کی تقدیم تخصیص کے لیے ہے یعنی جو لوگ قرآن پاک اور کتب سابقہ پر یقین رکھتے ہیں وہ آخرت حقیقت پر متصور جو اس عقیدہ کی طرف متجاوز نہیں کہ جس کا کفار و اہل کتاب اثبات کرتے ہیں۔

ف :۱۔ابو الیث رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یقین تین قسم ہے۔

۱۔یقین عیاں ۲۔یقین خبر ۳۔یقین دلالت

☆...... یقین عیاں وہ ہے جو بجر د کے دیکھنے سے شک زائل ہو جائے۔

☆...... یقین دلالت وہ ہے کہ مثلاً کوئی دور سے دھواں دیکھے تو اس سے اسے آگ کا یقین ہو جائے اگر چہ اُسے آگ دکھائی بھی نہیں دے رہی۔

☆...... یقین خبر وہ ہے کہ کسی ایک کو مثلاً یقین ہے کہ اس عالم دنیا میں ایک شہر ہے جسے بغداد کہا جاتا ہے اگر چہ وہ وہاں تک نہیں پہنچا اور آیت میں یقین خبر اور یقین دلالت مراد ہیں کیونکہ آخرت حق ہے علاوہ ازیں خبر دیکھنے سے معائنہ ہو جاتی ہے۔

ظاہر شریعت کا نام علم الیقین اور اس میں خلوص کرنے کا نام عین الیقین اور اس کے مشاہدہ کا نام حق الیقین ہے علم الیقین وہ علم ہے جو ادراک باطنی کے ساتھ فکر صائب و استدلال سے حاصل ہو اور یہ علم ان علماء کو حاصل ہے جو مومنین بالغیب ہیں اور یہ مرتبہ علمیہ ارواح قدسیہ کی مناسبت کے بغیر زائد نہیں ہوتا اس مرتبہ کے حصول کے بعد یہ علم عین ہو جاتا ہے اور عین کا سوائے اس یقین (جو کہ معلوم کے مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے) کے کوئی مرتبہ نہیں اور یہ مرتبہ زائد نہیں ہوتا کہ دوئی دور نہ ہو پھر یہ مرتبہ حق ہو جائے گا اور اس مرتبہ یعنی حق الیقین کی زیادتی اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کے بعد کو حجاب کا ورود نہ ہو۔

۳۔عین الیقین اولیاء کرام کو حاصل ہوتا ہے اور حق الیقین انبیاء عظام کو۔

روحانی نسخے :۔ یہ درجات و مراتب مجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔ ہمیشہ باوضو رہنا اور تھوڑا طعام کھانا

اور ذکر کثیر کرنا اور ملکوت السموت والارض میں فکر کے ساتھ خاموش رہنا اور سنن وفرائض ادا کرنا اور ماسوائے حق (اغراض نفسانی) کو ترک کرنا۔ اسباب دنیویہ قلیل اور نیند بھی کم اور اکل حلال وصدق مقال کا پابند رہنا اور قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنا یہ امور مذکورہ بالا معائنہ ومشاہدہ کی کنجی ہیں۔

(کذافی شرح النصوص المسمی باسرار البرور بالوهول الی عین النور)

۲۔ آخرت سے عین الیقین کا ثمرہ اس بات میں ہے کہ اس کی تیاری میں رہنا چاہئے۔ چنانچہ بزرگوں کا قول کہ دس آدمی بہت بڑے دھوکہ میں ہیں۔

۱۔ جسے یقین ہے میرا خالق اللہ ہے مگر وہ اس کی عبادت سے قاصر ہے۔

۲۔ جسے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا رازق ہے مگر وہ اس سے غیر مطمئن ہے۔

۳۔ جسے یقین ہے کہ دنیا فانی ہے مگر اس پر سہارا کرتا ہے۔

۴۔ جسے یقین ہے کہ میرے ورثہ میرے دشمن ہیں مگر ان کے لیے مال جمع کر رہا ہو۔

تو با خود ببر تو شہ خوشتن — کہ شفقت نیاید زفرزند وزن

ترجمہ:۔ تو اپنا زادراہ اپنے ساتھ لے جا مرنے کے بعد نہ تیری عورت تیری خبر گیری ہوگی نہ تیرا لڑکا۔

۵۔ جسے یقین ہے کہ موت ہرگز نہیں چھوڑے گی مگر اس کی تیاری نہیں کرتا۔

۶۔ جسے یقین ہے کہ اس کا رہنا سہنا قبر میں ہے مگر اس کی تعمیر نہیں کرتا۔

۷۔ جسے یقین ہے کہ اس کا محاسب اس سے پائی پائی کا حساب لے گا مگر اپنے حساب کو درست نہیں رکھتا۔

۸۔ جسے یقین ہے کہ پل صراط پر سے اس کا گزرنا ہے مگر اپنے گناہوں کے بار کو ہلکا نہیں کرتا۔

۹۔ جسے یقین ہے کہ دوزخ فجار کا مقام ہے مگر اس سے نہیں بھاگتا۔

۱۰۔ جسے یقین ہے کہ جنت نیک لوگوں کی قرار گاہ ہے مگر اس کے لیے نیک عمل نہیں کرتا۔ (کذافی التیسیر)

۳۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یقین قصر امل اور قصر امل زُہد کا موجب ہے اور زہد حکمت پیدا کرتا ہے اور حکمت نیک انجام کی طرف غور کرنے کی توفیق بخشتی ہے۔

ف: حضرت ابوالآفاق رحمہ اللہ تعالیٰ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک (جو کہ آپ

نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے فرمایا ہے کہ اگر وہ ان کا یقین زیادتی میں نہ ہوتا تو وہ ہوا کی طرح نہ اڑتے) کے بارہ میں فرماتے یہ دراصل اپنا حال (جو کہ آپ کے ساتھ شب معراج میں ہوا) بیان فرمایا کیونکہ معراج کے لطائف سے ایک لطیفہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے براق کو دیکھا وہ اڑنے سے ٹھہر گیا مگر ہم اوپر کو جارہے تھے۔

حکایات: ا۔حضرت ابوتراب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک لڑکے کو دیکھا جو خرچ کے بغیر جنگل میں جارہا تھا میں نے دل میں کہا اگر اسے یقین نہ ہوتا تو جنگل میں ہلاک ہو جاتا۔آخر میں نے لڑکے سے پوچھا: اے بیٹے! تو ایسے جنگل میں خرچ کے بغیر کیسے سفر کر رہا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا: اے بزرگ! ذرا سر اٹھا کر غور سے دیکھئے، کیا آپ کو اللہ کا غیر دکھائی دیتا ہے؟ میں نے کہا: بیٹے! جاؤ جہاں دل چاہے، تمہارے لیے بہت کامیابی ہے۔

۲۔حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں معاش کی طلب میں چلا اور خیال تھا کہ اکل حلال نصیب ہو۔اسی اثنا میں مچھلی کا شکار کیا ایک دن میں نے جال دریا میں پھیلایا جس سے ایک مچھلی ہاتھ آئی دوسری بار دوسری ہاتھ آئی۔تیسری بار ارادہ ہوا جس پر ہاتف غیبی نے کہا ”خدا کرے تجھے معاش نصیب نہ ہو۔ تو شکار بھی انہیں کرنے آیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہیں اور تو اللہ کے ذاکرین کو قتل کر رہا ہے“ میں نے یہ آواز سنتے ہی جال کو توڑ ڈالا اور ہمیشہ کے لئے شکار کرنا ترک کر دیا۔

تفسیر صوفیانہ جو شخص حجاب وجودی کی ذلت سے نجات پاتا ہے تو اسے امور اخرویہ کے ایقان کی عزت نصیب ہوتی ہے۔اس سے قبل وہ من وراء الحجاب ایمان رکھتا ہے۔اب حجابات اٹھ جانے سے موقن ہو گیا جیسا کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اگر حجاب ہٹ جائے تو میں یقین میں زیادتی حاصل کرلوں گا کیونکہ جس سے حجابات ہٹ جائیں تو اس کے لئے امور اخرویہ کے پردے حائل نہیں ہوں گے۔حجابات ہٹ جانے سے بندگان خدا مرتبہ ایمان سے خلاص پا کر مرتبہ ایقان تک پہنچ جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

لیکن یہ ایقان خاص ہوگا کیونکہ ایمان باللہ وبالکتب سے ہمیشہ تک خلاص نہیں پاتا یہ ایک راز کی بات ہے

اور میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ ان دونوں مراتب کے مابین فرق کرتا ہو کیونکہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ تمام امور اخرویہ کا دنیا میں کشف کے ساتھ مشاہدہ کرے۔ہاں آخرت میں بطریق مشاہدہ کے ان امور سے ایقان حاصل کرے گا اگر چہ اس سے قبل ان سے صرف ایمان رکھتا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ تو ہم نے تیرا پردہ اٹھایا تو آج تیری آنکھ تیز ہے۔

باقی رہا اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، یہ تو کسی انسان کے امکان میں نہیں کہ ان کا کلی طور پر مشاہدہ کرے کیونکہ وہ کل اور جز سے منزہ ہے اور ارباب مشاہدہ اگر چہ شہود و جمالیہ وجلالیہ کے مشاہدہ سے عین الیقین بلکہ حق الیقین کے ساتھ بہرہ ور ہوئے ہیں۔لیکن وہ مشاہدات کہ جن کے مشاہدہ سے تاہنوز محروم ہیں ان کے ساتھ ایمان رکھنے کے مرتبہ سے انہیں خلاص میسر نہیں ہوا اور نہ تو الی ابد الآباد اس کے علم کو احاطہ کر سکتے ہیں بلکہ اس کے علم میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس کے لئے وہ مالک حقیقی چاہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

تفسیر عالمانہ أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ الخ: أُولٰٓئِكَ یہ جملہ محل رفع میں ہے اگر متقین کے دو موصول سے ایک کو اس سے علیحدہ کیا جائے تو یہ جملہ اس کی خبر ہے (اور وہ مبتداء) گویا کہ جب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہا گیا تو سائل نے پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے کہ یہ لوگ ہدایت سے کیوں مخصوص ہو رہے ہیں تو جواب میں کہا گیا الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ اگر چہ یہ جملہ سابقہ کی خبر نہ ہو تو جملہ مستانفہ قرار دیا جائے گا۔پھر مطلب یہ ہوا کہ یہ جملہ سابقہ احکام اور صفات متقدمہ کا نتیجہ ہوگا اور یہ ایسی جمع ہے کہ اس کا اپنے لفظ سے کوئی واحد نہیں۔یہ مبنی علی الکسر ہے یہ کاف ذٰلِكَ کے کاف کی طرح خطاب ''کا'' ہے یعنی اس سے پہلے جو مذکور ہے۔یعنی وہ متقین جو موصوف بالایمان بالغیب اور باقی دیگر اوصاف کے موصوفین تھے اور اس کے امور میں منسلک ہیں باقی رہا اس میں اسم بعید کے ساتھ اشارہ کرنا سو وہ ان کے بلند درجات اور فضل میں رفع مراتب کی وجہ سے ہے۔ أُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور عَلٰى هُدًى اس کی خبر اور هُدًى میں جو تنکیر سے ابہام سمجھا جا رہا ہے یہ تفخیم شان کے لئے ہے گویا کہا گیا ہے کہ وہ لوگ بڑی ہدایت پر ہیں کہ جس کی کنہ کو نہیں پہنچا جا سکتا اور نہ اس کی قدر معلوم ہو سکتی ہے جیسا کہ محاورہ عرب میں کہا جاتا ہے لَوْ اَبْصَرْتُ فُلَانًا اَبْصَرْتُ رَجُلًا

سوال :۔ لفظ علیٰ کو یہاں لانے سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟

جواب :۔ ان کے حال کو (جو ہدایت کے ساتھ ملابس ہے) اس شخص کے حال سے تشبیہ دینا مقصود ہے جو کسی شئے کو قبول کر کے اس پر ایسا حاوی ہو جائے کہ اس میں وہ جیسے چاہے تصرف کرے۔

روحانی نسخہ :۔ یہ اوصاف یعنی جن کے لئے دلائل قائم کئے گئے ہیں، فکر کو فارغ کر کے ان کی طرف نظر کو دائما متوجہ رکھنے اور نیک عمل میں نفس کے محاسبہ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں یعنی ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں قبل از موت ہدایت دے کر اور فلاح کی راہ جتلا کر مکرم فرمایا ہے۔

مِّنْ رَّبِّهِمْ سے محذوف سے متعلق ہو کر هُدًى کی صفت مبینہ ہے اور اس کی تاکید کر رہی ہے۔ یعنی یہ لوگ اس ہدایت پر ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں نصیب ہوئی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تمام انواع اور اس کی توفیق کے جمیع فنون کو شامل ہے اور اس میں عنوان ربوبیت اور پھر ان کی طرف اضافہ کرنے میں صرف موصوف یعنی ہدایت اور مضاف الیھم یعنی مومنین کی تفخیم شان اور ان کی بزرگی کا اظہار مقصود ہے اور آیت ہذا میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ ہدایت ان لوگوں کے لئے ہے جو ان صفات مذکورہ کے موصوف ہیں اور ان آیات قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا سے لے کر فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا میں اشارہ ہے کہ یہ ہدایت طاعات کے بغیر اقرار اور اعتقاد سے حاصل ہوتی ہے اور یہ فرق اس لئے ہے کہ یہاں پر ایمان کی شرافت اور اس کی قدر سے عظیم شان اور اس کے امر علو کا تذکرہ ہو رہا ہے کیونکہ ایمان میں جب پختگی پائی جائے تو نفس کی مخالفات اسے نقصان نہ پہنچائیں گی بلکہ ان پر قابو پا کر نفس کو گناہوں کی سرکشی کے بعد توبہ کی راہ دکھلائے گی پھر وہ جیسے آج دنیا میں ایمان کی راہ حاصل کرے گا تو کل آخرت میں بہشت کی راہ پر سیدھا چلا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ

بے شک مومن اور نیک لوگوں کو اس ایمان کی دعوت دیتا ہے۔

اس وجہ سے کہ مطلعین کے سامنے اور دائیں جانب ان کے ایمان کا نور دوڑتا ہوگا اور وہ اپنی طاعات کی سواریوں پر سوار ہوں گے اور ملائکہ ان کے استقبال کے لئے آئیں گے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى

الرَّحْمٰنِ وَفْدًا اس دن ہم متقیوں کو وفد بنا کر ہم اس کے ہاں جمع کریں گے اور فرماتا ہے: وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ انہیں ملائکہ ملیں گے اور مجرمین تن تنہا پڑے ہوں گے قیامت کی تکالیف برداشت کر رہے ہوں گے نہ توان کے لئے نور طاعات ہوگا اور نہ ملائکہ استقبال کے لئے آئیں گے پھر نہ انہیں کوئی راہ ملے گی نہ راہ بتانے والا اور انہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے میرے مجرم بندے! جنت والے آج کے دن میوہ خوری میں مشغول ہیں اور وہ اپنے بہترین ثواب کے حصول کی وجہ سے تم سے تمہارے لئے فارغ بھی نہیں اور اہل نار خور شدت عذاب میں مبتلا ہیں وہ بھی تم پر رحم نہیں کر سکتے۔

اے مسکینو! تم پر میری طرف سے سلام ہو۔ اب تم کس حال میں ہو اگرچہ تمہارے ہم جنس لوگ تم سے سبقت لے گئے اور تمہیں ہدایت نہ دے سکے پس اس وقت تمہیں راہ راست دکھاتا ہوں اگر میں وہ معاملہ کروں کہ جس کے تم مستحق ہو پھر میرے کرم کا اظہار نہیں ہوگا۔ (کذافی تفسیر)

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

نہ یوسف کہ چنداں بدر دید بلند — چوں حکمش رواں گشت قدرش بلند

گنہ عفو کرد آل یعقوب را — کہ معنے بود صورت خوب را

بکردار بدشاں مقید نہ کرد — بضاعات فرجات شان رد نکرد

زلطف ہمیں چشم داریم نیز — بریں بے بضاعت بہ بخش اے عزیز

بضاعت نیاوردم اِلَّا اُمید — خدایا ز عفو مکن ناامید

ترجمہ:۔ نہ حضرت یوسف علیہ السلام کہ جنہوں نے جلاوطنی اور قید و بند کی مصیبتوں کو جھیلا جب آپ کا حکم رواں ہوا تو آپ کی قدر بلند ہوگئی۔

۲۔ تمام آل یعقوب کے گناہوں کو معاف کر دیا کیونکہ خوب صورتی کے لئے خوب سیرتی بھی لازمی ہے۔

۳۔ ان کے برے کردار کی وجہ سے ان کو قید نہ کیا، ان کے معمولی سامان کی طرف بھی توجہ نہ کی۔

۴۔ آپ کی مہربانی سے بھی ہم یہی امید رکھتے ہیں کہ اے عزیز! اس بے سروسامان کو بھی کچھ دے دے۔

۵۔ میں امید کے سوا کوئی سامان نہیں لایا۔ اے خدا! مجھے اپنی معافی سے ناامید نہ کر۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

سوال : اُولٰٓئِكَ کا تکرار کیوں؟

جواب :۔ تا کہ دلایت ہو کہ ہدایت یافتہ کی غیروں سے تمیز دینے میں دونوں ضروری ہیں اور حرف عطف میں درمیان میں لانے سے اس طرف تنبیہ ہے کہ دونوں درحقیقت متغایر ہیں اور مبتداء وخبر کے مابین ضمیر فصل کی لانے میں بتایا گیا ہے کہ اس کا مابعد خبر ہے صفت نہیں اور یہ بھی بتایا گیا کہ مسند صرف مسند الیہ کے لئے ثابت ہے نہ اس کے غیر کے لیے اب معنی یہ ہوگا کہ فلاح کی صفت صرف ان لوگوں پر مقصود ہے ان کے ماسوا کسی غیر یعنی یہود ونصاری پر پہنچتی بھی نہیں اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ متقین کی صفت سوائے فلاح کے اور کوئی ہے بھی نہیں یہ قصر قصر الصفت علی الموصوف ہے کہ برعکس جب یہ بات ہے تو مذکورہ خرابی کیوں لازم آئے۔ المفلح فائز المرام کو کہتے ہیں۔ گویا مفلح وہ ہے جس کے لیے کامیابی کے دروازے کھلے ہیں اور ان پر بند نہیں ہوئے۔

قاعدہ : یہ ترکیب (ف ل ح) شق فتح قطع کے معنی پر دلالت کرتی ہے اسی لیے کسان کو فلاح کہتے ہیں کہ وہ زمین کو چیرتا ہے۔ عرب میں کہاوت مشہور ہے۔

اَلحَدِيدُ بِالْحَدِيدُ يُفْلَحُ اَیْ يُقْطَعُ — لوہا لوہے کو کاٹا جاتا ہے۔

اب معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ قیامت میں جنت میں فائز المرام اور دوزخ سے نجات پانے والے ہوں گے۔

مسئلہ :۔ متقین کے لئے دنیا اور آخرت میں فلاح بہبودی قطعی الثبوت اور یقینی ہے۔

ف : فلاح تین قسم ہے۔

ا۔ نفس پر قابو پالینا، بایں طور کہ اس کی خواہشات کی متابعت نہ کرنا اور دنیا کے امور پر قابو پانا، بایں طور کہ اس کے وسوسہ اور برے دوستوں کی صحبت میں مبتلا نہ ہونا ایسے لوگ نفس وشیطان سے محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ کفر اور ضلالت اور بدعت وضلالت اور غرور نفس ووسوسہ شیطان اور زوال وفقدان ایمان اور وحشت قبور اور سہول یوم النشور اور پل صراط کی لغزش اور زبانیہ کی شدید وغلیظ کی تسلیط اور بہشت کی محرومی اور قطع رحمی اور دوستوں کے ساتھ چیں بجبیں کے اسباب سے نجات پانا۔

۳۔ ملک ابدی اور نعمت سرمدی اور لازوال ملک ونعمت غیر منتقلہ کے حصول اور وہ سرور کہ جس میں حزن نہ ہو اور وہ جوانی کہ جس میں بڑھاپا نہ ہو اور راحت کہ جس میں شدت نہ ہو اور وہ صحت کہ جس میں مرض نہ ہو اور وہ

حصول نعمت کہ جس میں حساب نہ ہواور وہ دیدار کہ جس کے سامنے نقاب نہ ہو۔ (کذا فی تفسیر التیسیر)

ف : اسی آیت سے فرقہ وعیدیہ نے فساق اہل قبلہ کا دائمی عتاب میں مبتلا ہونے کا استدلال کیا ہے ان کو جواب یوں دیا جائے گا کہ مفلحون سے مراد کامل فی الفلاح نہیں بنابریں جو لوگ متقین کے ان اوصاف سے موصوف نہیں کہ ان کو فلاح کامل نصیب نہیں نہ یہ کہ انہیں سرے سے فلاح حاصل نہیں۔ (کذا فی التفسیر البیضاوی)

تفسیر صوفیانہ

حضرت شیخ نجم الدین دایہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ هُدًى کو نکرہ کر کے اس لئے لایا گیا ہے تا کہ معلوم ہو کہ وہ لوگ اپنے رب کے کشوف سے ایک کشف اور اس کے انوار سے ایک نور اور اس کے رازوں سے ایک راز اور اس کے الطاف سے ایک لطف اور اس کے حقائق سے ایک حقیقت پر ہیں۔ کیونکہ وہ انعامات جو انبیاء عظام و اولیاء کرام پر اپنے کمال ذات وصفات اور انعام واحسان سے فرماتے ہیں۔ یہ تمام بہ نسبت اس کے جو کہ اس کے ہاں ہے اس کے بحر محیط سے ایک قطرہ ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ خرچ کرنے سے واقعی کمی نہیں ہوتی۔

حدیث شریف :۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ پُر ہے کہ جس کو شب و روز کی سخاوت کم نہیں کرتی۔

اس میں لطیف اشارہ ہے کہ متقین اس ہدایت کے سبب سے بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر بھی انہیں یقین ہے اور وہ ہیں بھی ایسے کامیاب کہ وہ نور نار حیات سے وجود کے حجابات سے نجات پا کر آخرت کا مشاہدہ کر چکے ہیں اور ان کو عنایت ربانی کشش فرما کر مقامات قربت اور اسرار پر عزت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اور کسی مرتبہ کو سوائے فناہیت کے نہیں چھوڑتے۔ ان حضرات نے سعادت عظمی اور مملکت کبری سے کامیابی پائی ہے اور درجہ عالیہ کو حاصل کر چکے ہیں اور قول حق ان کو محقق ہو چکا۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں۔

گر ہمی خواہی کہ بفروزی چوں روز	ہستی ہمچوں شب خود را بسوز
ہستیت دہ بدست آں ہستی نواز	ہمچو مس از کیمیا اندر گداز

ترجمہ :۔ اگر تو چاہتا ہے کہ دن کی طرح چمکے اپنی ہستی کو رات کی طرح جلا دے۔ اپنی ہستی کو اس ہستی نواز کے ہاتھ میں

دے دے جس نے تانبے کو پگھلا کر سونا کر دیا۔

تفسیر عالمانہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ الخ ۔جب خداوند قدوس نے اپنے مخصوص بندوں اور مخلص ولیوں کے ذکر کے ساتھ ان کے ان اوصاف (کہ جن کے سبب سے وہ ہدایت وفلاح کے اہل ہوئے) کا ذکر کیا تو بعد میں ان کے ان اضداد سرکش اور نافرمانوں کو بیان فرمایا کہ جن کو نہ ہدایت نے نفع پہنچایا اور نہ آیات ونذر نے فائدہ دیا۔

ف :اسم موصوف کی تعریف یا تو عہد کے لئے ہے تو اس سے مخصوص آدمی مراد ہیں جیسے ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور احبار یہود وغیرہم ۔یا جنس کے لئے ہے اس صورت میں اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو کفر پر ایسے مُصر ہیں کہ جن کے پھرنے کا امکان بھی نہ ہو اور غیر مُصر دونوں مراد ہو سکتے ہیں ۔مگر یہاں موصول کے مسند سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ مُصرین سے مختص ہونے کی دلیل سے غیر مصرین مراد نہیں ہو سکتے۔

الکفر لغت میں بمعنی تغطیہ وستر ہے اور شریعت میں ان احکامات اور اعتقادات کے انکار کو کہتے ہیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لانا واضح طور پر معلوم ہو چکا ہے۔

سوال :۔لباس اغیار اور شد زنار بلا اضطرار و دیگر وہ شعائر کفریہ (جو ان دونوں کے مشابہ ہیں) کو کفر کیوں شمار کیا گیا ہے؟

جواب :۔ چونکہ یہ چیزیں تکذیب پر دلالت کرتی ہیں بنا بریں یہ بھی کفر میں شمار کی گئی ہیں کیونکہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا دم بھرتا ہے تو اس کو ان اعمال کے ارتکاب کی جرأت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان اعمال کے ارتکاب کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، جیسے زنا، شراب وغیرہ اسی بنا پر یہ کفر میں شمار ہوتے ہیں نہ یہ کہ تمام فی نفسہ کفر ہیں۔

ف :لفظ کافر قرآن پاک میں چار معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

☆...... **نقیض المومن**

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

☆......انکار از وجوب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ وہ جو کفر کرے تو اللہ عالمین سے بے نیاز ہے۔ یہاں پر کفر بمعنی انکار عن وجوب الحج مراد ہے۔

☆...... نقیض الشاکر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ میرا شکر کرو میری ناشکری نہ کرو۔ بری ہونے والا

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ یعنی قیامت میں اے کافرو! تم ایک دوسرے سے برأت ظاہر کرو گے۔ (کذافی التیسیر)

ف: بغوی فرماتے ہیں کہ کفر کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ کفر الانکار۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہو نہ اس کی ذات کا معترف ہو۔

۲۔ کفر الجحود، وہ یہ کہ دل میں تو اللہ تعالیٰ کو خوب جانتا ہو مگر زبان سے معترف نہ ہو۔ جیسے ابلیس کا کفر۔

۳۔ کفر العناد، وہ یہ کہ دل میں تو جانتا ہو مگر زبان سے اقرار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ لیکن اس عدم اعتراف کو اپنا دین نہ سمجھتا ہو۔ جیسے ابوطالب کا کفر چنانچہ وہ کہتا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِيْنَ مُحَمَّدٍ مِنْ خَيْرِ اَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ

لَوْلَا الْمَلَامَةُ اَوْحَذَارَ مُسَبَّةٍ لَوَجَدْتَنِيْ سَمْحًا بِذَالِكَ مُبِيْنًا

یعنی بے شک مجھے علم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دنیا کے تمام ادیان سے بہتر ہے اگر ملامت اور عرب کی گالیوں کا خطرہ نہ ہوتا تو میں اس دین کو واضح طور پر بیان کرتا۔

۴۔ کفر النفاق، وہ یہ کہ زبان سے اقرار، مگر دل میں اعتقاد صحیح نہ رکھتا ہو۔

مسئلہ:۔ ان تمام انواع کا حکم یہ ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہوگا اگر ان چاروں میں سے کوئی ایک قسم اس میں پائی گئی تو اسے اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔

ف: ابوطالب کے متعلق وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کی تفسیر میں مفصل بیان آئے گا۔ انشاء اللہ

تعالیٰ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ میں عَلَيْهِمْ بمعنی عِنْدَهُمْ اور سَوَآءٌ اسم ہے بمعنی اِسْتِوَاء'' یہ بھی بطریق مبالغہ کے دوسرے مصادر کی طرح لغت میں بمعنی مستو واقع ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اس کو مرفوع ہونا ان کی جز کی وجہ سے ہے۔

ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ اس کے مخاطب حضور علیہ السلام ہیں اس کا مرفوع ہونا بہ بنائے فاعلیت ہے۔ کیونکہ ہمزہ اور لفظ اَمْ کو ان کے مدخولین میں اِسْتِوَاء کے معنی کو محقق کرنے کے لئے استفہامیت سے خالی کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ میں امر ونہی کو اپنے معنی سے خالی کیا گیا ہے اور اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا اَيَّتُهَا الْعِصَابَة کو محض تخصیص کے لیے ندا سے خالی کیا گیا ہے گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور علیہ السلام کو کہا گیا ہے جن لوگوں نے کفر کیا ان کو آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ ان زیدا مختصم اخوه وابن عمه الانذار دراصل اس اعلام کو کہتے ہیں کہ جس میں تخویف ہو۔ پس ہر منذر (ڈرایا ہو) معلم (خبر دیا ہوا) ہوتا ہے لیکن ہر معلم منذر نہیں ہوتا۔ (کذافی تفسیر ابی اللیث) یہاں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور معاصی پر سزا ملنے سے خوف دلانا مقصود ہے۔

سوال۔ یہاں بدوں بشارت کے انداز پر اقتصار کیا گیا ہے، کیوں؟

جواب۔ یہ لوگ بشارت کے اہل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں انداز اور نفوس پر زیادہ اثر کن ہے اس لیے کہ دفع ضرر جلب نفع سے اہم ہوتا ہے اور یہ لوگ نہ تو جلب نفع کے پیچھے لگے اور نہ بشارت کی طرف دھیان لگایا۔

سوال۔ یہاں پر سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ کے بجائے سواء'' علیک کیوں نہ فرمایا۔ جیسا کہ بت پرستوں کے لیے فرمایا: سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ پکارو یا چپ رہو تمہارے لیے برابر ہے۔

جواب۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انداز اور اعلام برابر نہیں تھا بلکہ آپ کو انداز کا ثواب ملتا تھا اگرچہ کفار ایمان نہ بھی لائیں بخلاف عبدۃ الاصنام کے کہ ان کے لیے دونوں امر برابر تھے۔ اس کی نظیر امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔ کہ آمر کو تو ثواب حاصل ہوگا خواہ مامور اس پر عمل بھی نہ کرے گویا یہ لوگ ہود علیہ السلام کی قوم کی طرح تھے کہ انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو کہا۔

سَوَآءٌ عَلَيْنَا اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوَاعِظِيْنَ ہمیں نصیحت کرو یا نہ کرو ہمارے لیے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان

کے متعلق فرماتا ہے۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اور یوم قیامت انہیں کہا جائے گا۔

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۱؎ اور اللہ تعالیٰ ان کے قول جو کہ وہ یوم قیامت میں کہتے ہوں گے سے خبر دیتے ہیں۔ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ یعنی ہمارے لیے نصیحت و ترک نصیحت دونوں برابر ہیں۔

ف: جوانی اور بڑھاپے میں یکساں نافرمان رہنا، اسی طرح حالت مرض و صحت میں اور نعمت و محنت میں اپنے مالک سے اعراض کرتے رہنا۔ اسی طرح قریبی و بعیدی رشتہ داروں پر سنگدل رہنا، اسی طرح ظاہر و باطن میں ٹیڑھا رہنا وغیرہ مذکورہ افعال کے مرتکب کو ڈرنا چاہیے کہ جب اسے یہ افعال یکساں معلوم ہوتے ہیں تو کیا اسے ذیل کی باتوں سے کوئی بات بھلی لگتی ہے۔ موت کے وقت توبہ نصیب ہو یا نزع روح کے وقت گناہوں پر اصرار کرنا اور پھر توبہ سے سکوت، اولیاء اللہ کی زیارت یا اس سے محرومی اور مشکل امور میں سفارشی کا ہونا نہ ہونا۔ جب یہ باتیں یکساں اچھی نہیں لگتیں تو اس کے لئے گذشتہ افعال یکساں نہ ہونے چاہئیں بلکہ اچھے اعمال پر استقامت اور برے اعمال سے اجتناب چاہیے۔ (کذافی تفسیر التیسیر)

لَا يُؤْمِنُوْنَ (ترکیب) یہ مستقل اور علیحدہ جملہ اور ماقبل کی تاکید کرنے والا ہے اور ماقبل میں جو استواء کے اعتبار سے اجمال تھا اس کو بیان کرنے والا ہے بنا بریں اس پر اعراب کا کوئی محل نہیں ہے۔

اس میں حضور علیہ السلام کے لیے تخفیف بھی ہے اور ان کو تسلی بھی دلائی جا رہی ہے کہ اے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو معلوم ہو کہ کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بہت طویل مدت نصیحت فرماتے اور دکھ درد اٹھاتے دیکھا تو فرمایا:۔ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ جب نوح علیہ السلام کو اس خبر کا یقین ہوا تو ان کی ہلاکت کے لئے دعا فرمائی۔ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوا۔

ف: اگر اسم موصول سے مخصوص لوگ مراد ہیں تو آیت میں غیبی خبر کا اظہار ہے یہ بھی حضور علیہ السلام کا معجزہ

۱؎ ۔ دوزخ میں داخل ہو کر پھر صبر کرو یا نہ کرو تمہارے لیے برابر ہے کہ تم اپنے کردار کی سزا بھگتو گے۔

ہے کہ قبل از وقت واقعہ کی خبر دے دی۔

مسئلہ :۔ آیت میں بندگان خدا کے افعال کا ثبوت ہے کیونکہ لَا یُؤْمِنُوْنَ کے فاعل بندگان ہی ہیں۔

آیت سے ثابت ہوا کہ بندہ کفر اپنے خیال سے کرتا ہے نہ اس پر جبر ہوتا ہے نہ اکراہ، ورنہ فرماتا: لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ بلکہ فرمایا: لَا یُؤْمِنُوْنَ

سوال : جب اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ کفار ایمان نہیں لائیں گے تو پھر اپنے پیارے محبوب کو تبلیغ کے لئے کیوں تکلیف دی؟

جواب :۔ جاننے کے باوجود انداز کا حکم اتمام حجت کے لیے تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرعون ایمان نہیں لائے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ [ا] اور فرمایا:۔ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَکْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ ہم نے اس سے پہلے انہیں عذاب سے ہلاک کیا تو کہتے کہ ہمارے ہاں رسل کیوں نہ بھیجے کہ ہم تیری آیات کی تابعداری کرتے۔

سوال :۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبر دی کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر خبر دے کر انہیں ہلاک کیوں نہ کیا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو کفار کے حال کی خبر دے کر انہیں ہلاک کر دیا۔

جواب :۔ چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اور فرمایا: وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا کَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ بنابریں نہ انہوں نے عذاب کی دعا مانگی اور نہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر عذاب بھیجا۔

ف : کسی چیز کے وقوع کی خبر دینے سے اس پر بندہ کی قدرت کی نفی نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ اپنے فعل یا کسی بندے کا اس کے اپنے اختیار سے کسی فعل کی خبر دے تو اس سے تکلیف مالایطاق کا جواز لازم نہیں آتا۔

تفسیر صوفیانہ

امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی صفت کے پردہ میں شہود حق سے محجوب ہوتا ہے اس کو یہ دونوں قول (ایک جو اسے حق کی راہ دکھائے، دوسرا وہ جو اسے چلا

[ا] :۔ رسول کرام بھیجے خوشخبری دیں ڈرائیں تاکہ رسل کرام آنے کے بعد اللہ کی لوگوں پر کوئی حجت نہ ہو۔

نفسانی کے منافع حاصل کرنے پر امداد کرے) برابر معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایسا دائمی غفلت کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے اور غفلت کی طرف زیادہ کان دھرتا ہے۔ جیسا کہ کافر (جسے ازل سے بدبختی نصیب ہو وہ) بھی شہود و غیب اور حق سے محجوب رہتا ہے۔ پھر وہ نہ ہو تو راہ راست کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اس پر چلنے کا قصد کرتا ہے اور فرمایا جو شخص وادی ظلمات میں جا پڑتا ہے تو اس کے سامنے ناصح کی نصیحت اور گمراہ کن لوگوں کی گمراہی یکساں معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے احوال سے اللہ تعالیٰ نے انصاف (حق و باطل کی تمیز) کی برکات چھین لی ہیں اسی لیے وہ دائمی ارشاد کی طرف دل بھی نہیں لگاتا جیسا کہ مقولہ مشہور ہے۔ وَعَلَى النَّصُوْحِ نَصِيْحَتِيْ وَعَلٰى عِصْيَانِ النُّصُوْحِ نصوح کو میری نصیحت تو پہنچی لیکن نصوح گناہ پر کمربستہ ہے۔

تفسیر عالمانہ

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ **ربط** :۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار کی صفات اور ان کے حالات ذکر فرمائے تو بعد ازاں ان کی سزاؤں کا بیان شروع فرمایا گویا یہ آیت مضمون سابق کی بمنزلہ تعلیل کے ہے۔

حل لغات :۔ خَتَمَ بمعنی چھپانا۔ شئے کو مہر لگا کر پختہ کرنے کو ختم اس لئے کہا جاتا ہے کہ گویا اسے آخری منزل تک پہنچا کر لوگوں کی نگاہوں سے چھپایا گیا ہے۔ قرآن مجید کے ختم کو بھی اسی لحاظ سے ختم کہا جاتا ہے کہ یہ آخری فعل تھا کہ جہاں ہم اسے جمع کرتے کرتے آخر کو پہنچے، یہاں حقیقۃً ختم کرنے کا معنی نہیں بنتا۔

سوال :۔ کفار کے قلوب پر مہر لگانے کا کیا معنی ہے؟

جواب :۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ایک ایسی ہیئت موجود ہے جو انہیں کفر کو پسند اور گناہوں پر جرأت کرنے اور ایمان اور طاعات کو قبیح سمجھنے پر مجبور کرتی ہے اس لیے کہ ان پر گمراہی سوار ہے اور تقلید کفر میں منہمک ہیں اور صحیح نظر کے استعمال سے دور پھرتے ہیں۔ بنا بریں ان کے قلوب نہ تو اب انداز سے گھبراتے ہیں اور نہ ہی ان پر حق اثر انداز ہوتا ہے استعارۃً اسے ختم سے تعبیر کیا گیا دوسری آیت میں اس ہیئت کو طَبَع'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اللہ نے ان کے قلوب کانوں اور آنکھوں پر مہر لگائی اور ایک مقام پر اسے اغفال (غافل کر دینا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا [illegible]

سے غفلت کی مہر لگائی ہے، اور ایک مقام پر اسے اقساء (دل کھوٹا کرنا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً اور ہم نے ان کے دل کھوٹے بنادئے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ان کا اسناد کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور کبھی کفار کی طرف؟

جواب: چونکہ تمام ممکنات کا وجود اس باری تعالیٰ کی قدرت سے ہے اسی اعتبار سے ان کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور پھر چونکہ ان کے اسباب خود کفار نے بنائے بنابریں ان کی طرف ان کا اسناد ہوتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگائی اور فرمایا بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ بایں وجہ کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے تو ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی۔

ف: یہ آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ الخ ان کی بری صفات کو ظاہر کرنے اور ان کے برے انجام کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

حل اشکال: یہ مہر لگانا ان کے کفر کی جزا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہدایت کے راستے آسان فرمادیے لیکن وہ ان سے عمداً روگرداں رہتے ہیں۔ اب وہ اعتراض خود بخود رفع ہوگیا جو کہا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے تو ہدایت پانے سے تو معذور ہوگئے پھر ان کو سزا کا کیا معنیٰ؟

ف: شیخ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ لفظ ختم کا اسناد اللہ تعالیٰ کی جانب اسی لیے ہے تاکہ تنبیہ ہوجائے کہ کفار کے قلوب وغیرہ پر مہر لگ جانا اہل حق کے نزدیک عقوبت الٰہی ہے جو کہ نہ تو بندے کو ایمان سے روکتی ہے اور نہ یہ کفر پر مجبور کرتی ہے۔ بلکہ یہ انہیں اس بات کی سزا ملی ہے جو انہوں نے اپنے اختیار اور سرکشی سے اختیار کی۔ (یعنی کفر) جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اس لطف سے محروم ہوگئے جو اس نے ان کے لئے راہ ہدایت آسان فرمایا تاکہ اس کی وجہ سے ایمان کی دولت سے نوازے جاتے اور کفر جیسی مصیبت سے محفوظ ہوجاتے۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوگیا کہ ایمان لانے کے خطاب کا جو اللہ تعالیٰ نے عموماً حکم فرمایا:۔

اٰمِنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر میں داخل ہیں اور جو اس نے عموماً کفر

سے اپنے ارشادگرامی میں فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (ان کے لیے کیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے) روکا ہے روکے گئے ہیں۔ اگر وہ ایمان لانے سے مجبور محض اور بالکل عاجز ہوتے تو ان کو نہ ہی خطاب ہوتا نہ ہی زجر و توبیخ کی جاتی جیسے قیامت میں ان کے منہ پر مہر لگ جائے گی اور وہ بول نہ سکیں گے۔ پھر چونکہ وہاں وہ لوگ حقیقۃً کلام کرنے سے عاجز ہوں گے اسی لیے ان سے خطاب نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ بندہ اپنے افعال میں مختار ہے اگرچہ ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

حل لغات: القلوب قلب کی جمع ہے بمعنی دل اور قلب کو اس لیے قلب کہا جاتا ہے کہ وہ جملہ امور میں منقلب اور جملہ اعضا میں متصرف ہے۔ شیخ کی تفسیر میں ہے کہ قلب ایک گوشت کا ٹکڑا ہے صنوبری شکل کا رگ وتین کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا ہے اور وتین ایک رگ ہے جو قلب کے اندر ہے۔ جب بندہ مرتا ہے تو اسے کاٹ دیا جاتا ہے اسے ابہر بھی کہتے ہیں اور تفسیر کواشی میں ہے کہ قلب دل میں کالے رنگ کا ایک گوشت کا ٹکڑا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صنوبری شکل کا ہے جو وتین کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا ہے۔ تعریفات سید میں ہے کہ قلب ایک لطیفہ ربانی ہے اسے اسی دل سے تعلق ہے جو صنوبری شکل کا سینہ کی دائیں جانب رکھا ہوا ہے۔ اور اسی لطیفہ کو ہی حقیقت انسان کہا جاتا ہے۔

عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نیست ایں پیکر مخروطی دل | بلکہ ہست ایں قفس طوطی دل

گر تو طوطی زقفس نشناسی | بخدا انا س نہ نسناسی

ترجمہ: یہ ٹیلے جیسی شکل والا جسم نہیں ہے بلکہ دل کی طوطی کا یہ پنجرہ ہے اگر تو پنجرے میں سے طوطی کو نہ پہچانے خدا کی قسم تو انسان نہیں بلکہ نسناس ہے۔

آیت میں قلب سے دل کی قوت عاقلہ کا محل مراد ہے۔ کبھی اس سے معرفت اور عقل مراد لی جاتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ بے شک اس میں اس کے لئے نصیحت ہے جس کا دل ہے۔ یا مہر لگائی ان کے کانوں پر ان کے کانوں کو ایسا کر دیا کہ وہ حق سننے سے بالکل معطل ہو چکے ہیں اور نہ ہی حق کی طرف لو لگاتے ہیں نہ اسے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں گویا انہیں مہر لگا کر

حق سننے سے محفوظ کر لیے گئے ہیں یہ ان پر سزا ہے بوجہ اس کے کہ انہوں نے برائی کو اختیار کیا اور باطل کی طرف رجوع کیا بلکہ حق پر باطل کو ترجیح دی اور سمع قوت سامعہ کے ادراک کا نام ہے کبھی اس قوت پر اور کبھی اس عضو پر (جو اس قوت کا حامل ہے) پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہی عضو مراد ہے کیونکہ مہر لگانے کا یہی معنی مناسب ہے اور مہر بھی اسی پر لگائی گئی۔

سوال : قلوب کی جمع اور سمع کو واحد کیوں لایا گیا ہے؟

جواب : اس کے کئی جواب ہیں۔ ا۔ سمع دراصل مصدر ہے اور مصدر نہ تثنیہ ہوتا ہے نہ جمع اس لئے کہ مصدر میں ہر سہ معانی یعنی واحد تثنیہ جمع کی صلاحیت ہے۔ **قال تعالیٰ**:

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَأَكِيدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ بے شک وہ مکر کرتے ہیں اور میں ان کے مکر کی انہیں سزا دوں گا۔

سوال : لفظ بصر کو واحد اور جمع کے ساتھ کیوں استعمال کیا گیا حالانکہ وہ بھی تو سمع کی طرح مصدر ہے۔

جواب : بصر عین کا اسم ہے۔ جب وہ اسم ہوا تو مصدریت ختم ہو گئی اس کے بعد اسے جمع لانا بھی جائز ہو گیا۔

۲۔ (برائے سوال نمبر ا) یہاں دراصل مضاف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی۔

ای علی مواضع سمعهم وحواسه (ان کی سمع وحواس کی جگہوں پر)

جیسے اس آیت میں مضاف محذوف ہے۔ **قال تعالیٰ**: **وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ ای اَهْلَ هٰذِهِ الْقَرْيَة** اس محذوف سے ثابت ہوا کہ **سمع** فعل ہے اور فعل پر مہر نہیں بلکہ محل فعل پر لگائی جاتی ہے۔

۳۔ **سمع** سے سارے کان مراد ہیں اس لیے کہ جمع کی طرف مضاف کرنے سے تمام افراد مراد ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں واحد کے صیغے میں التباس نہیں ہوتا، جیسے **كُلُوا فِي بَعْضِ بَطْنِكُمْ اَیْ بُطُوْنِكُمْ** کیونکہ ایک بطن سب کو مشترک نہیں۔

۴۔ سیبویہ کا قول ہے کہ یہ دو جمعوں یعنی قلوب وابصار کے درمیان واقع ہوا ہے فلہٰذا اس کی دلالت بھی جمع پر ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ **يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ای الی الانوار** یہاں **ظلمات** جمع کی وجہ سے نور بمعنی انوار ہو گا۔ (انہیں ظلمات سے انوار کی طرف نکالتا ہے)

سوال : مہر کے لئے قلوب کا ذکر پہلے کیوں؟

جواب : تا کہ پتا چلے کہ ایمان نہ لانے میں اصل دل ہے باقی اعضاء اس کی فرع ہیں۔

سوال : سمع کو ابصار پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟

جواب : اس لئے کہ سمع اور قلوب کا آپس میں اشتراک ہے بخلاف ابصار اور قلوب کے۔

ف: سمع بصر سے افضل ہے کیونکہ قرآن پاک میں اول سمع کا ذکر کیا گیا ہے بعد کو بصر کا۔ دوسرا یہ کہ کوئی نبی بہرا پیدا نہیں کیا گیا۔ اس بنا پر سمع نبوت کی شرط واقع ہوئی بخلاف بصر کے۔ تیسرے یہ کہ سمع بھی عقل کی تکمیل ہے اس لیے کہ وہ حصول عرفان کے لئے عقل کی مدد دیتی ہے۔

وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ ۔ اَبْصَار، بصر کی جمع ہے۔ بصر آنکھ کے ادراک کو کہتے ہیں۔ کبھی مجازاً قوت باصرہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور اس معروف کو بھی کہا جاتا ہے اور یہاں پر یہی مراد ہے اس لئے کہ پردہ آجانے کے لیے عضو کا معنی زیادہ مناسب ہے۔ غِشَاوَةٌ بمعنی پردہ اور یہاں پر حقیقی پردہ مقصود نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی آنکھوں پر ایک ایسی حالت پیدا کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ آنکھیں آیات ربانیہ (جو ان کے نفوس اور زمانہ میں پائی جاتی ہیں) کا ادراک نہیں کر سکتیں جیسے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کا کام ہے گویا کہ ان پر پردہ آ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ اشیاء کو نہیں دیکھ سکتیں۔ غِشَاوَةٌ کو نکرہ لانے میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ ان کی آنکھوں پر ایک قسم کا پردہ ہے جو عرفی معنی کے برعکس ہے یعنی آیات ربانیہ سے اندھا ہو جانا۔ غِشَاوَةٌ مبتدأ مؤخر اور عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ اس کی خبر مقدم ہے۔

سوال : قلوب اور سمع کے لئے مہر اور ابصار کے لئے پردہ۔ اس کا کیا مطلب ہے۔

جواب : قلب اور سمع کا ادراک جمیع جوانب سے ہوتا ہے اسی لئے ان ان پر مہر لگانا جمیع جوانب کے لحاظ سے ہے اور بصر کا ادراک جانب مقابل سے ہوتا ہے اسی لیے اس کے لئے پردہ اس کے مقابلہ کے اعتبار سے ہے۔

ف: تیسیر میں ہے کہ آیت میں قلوب، سمع، ابصار کا ذکر اس لئے ہے کہ خطاب ان تینوں کے اعتبار سے ہے۔

کما قال تعالیٰ :

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (کیا نہیں سمجھتے ہو) اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (کیا نہیں دیکھتے ہو) اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ (کیا نہیں سنتے ہو)

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (**حل لغات**) یعنی وہ عذاب جو شدید القوۃ ہے اسی سے عظم (ہڈی) کو لیا گیا ہے

اور عذاب وزن اور معنی کے لحاظ سے "نکال" کی طرح ہے۔ عرب میں کہتے ہیں:

اعذاب عن الشئی (وہ فلاں شئے سے زیادہ روکنے والا ہے) یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی شے سے روکا جائے اور عذاب کو عذاب بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ عاقل اگر تامل سے کام لے تو یہ عذاب اسے برائی سے روک لیتا ہے اور اسی سے اَلْمَاءُ الْعَذَاب کو لیا گیا ہے کیونکہ میٹھا پانی پیاس کو ہٹا دیتا ہے بخلاف ملح (نمکین پانی) کے کہ وہ پیاس کو الٹا بڑھاتا ہے۔ اس پر یہ علامت بتاتی ہے کہ انہوں نے (میٹھے) پانی کا نام نقاح رکھا ہے کیونکہ یہ پیاس کو ہٹاتا ہے اور فرات کو اسی لیے فرات کہتے ہیں کہ وہ دل کو تسکین بخشتا ہے اور فرات میٹھے پانی کو کہتے ہیں۔ رفت سے ماخوذ ہے یعنی قلب اور بعض نے کہا: عذاب کو عذاب اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ اس کی وہ جزا ہے جس سے اس کا دل خوش ہوا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَنُذُرِ (پس میرے عذاب کو چکھو)

سوال: چکھنا تو اچھی شئے کے لئے ہوتا ہے اور یہاں اچھائی کیسی؟

جواب: یہ اس اچھائی کی جزا ہے جو اس نے دنیا میں اپنی خواہش پوری کرنے پر عمل میں لائی اور العظیم حقیر کی نقیض ہے۔ اسی اعتبار سے عظیم، کبیر سے فوق ہوگا جیسا کہ حقیر، صغیر سے کم ہے۔

ف: تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ عظیم بمعنی کبیر یا کثیر یا دائم ہے یعنی دوزخ میں ہمیشہ کے لئے عذاب دینا۔ چونکہ وہ عذاب بہت بڑا ہوگا اسی وجہ سے اسے عظیم سے موصوف کیا گیا اور اس میں دوزخیوں کی بیڑیاں اور زنجیر بڑے بڑے ہوں گے اس لئے یہ آیت بمنزلہ وعید کے ہوگی اور جس کے وہ آخرت میں مستحق ہیں اس کا بیان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دنیا میں قتل اور قید کی سزا اور آخرت میں جہنم کی آگ میں جلانا اور عظیم سے اسی لیے موصوف کیا گیا کہ اس کے ہم جنس پر قیاس کیا جا سکے اور نکرہ بھی اس لیے کہ ان کو اتنا بڑا عذاب ہوگا کہ جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ سمجھدار کو چاہئے کہ وہ عذاب الیم اور عقاب عظیم سے بچتا رہے یعنی گناہوں پر اصرار نہ کرے اور نہ ہی کسی گناہ کا ارتکاب کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ زبان کو ہر برائی سے روکے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

بگرا ہ گفتن نکو میر دی — گناہ بزرگست و جور قوی

مگر شہد شیریں شکر فانقست — کسی را کہ سقمونیا لانقست

ترجمہ : کسی کو گمراہ کہنا یہ بہت اچھی روش ہے دراصل گناہ بڑا اور ظلم قوی ہے یہ بات مت کہو کہ میٹھا شہد شکر سے بڑھ کر ہے اس شخص کے لئے کہ جس کی طبیعت کے لئے سقمونیا (زہریلی دوائی) زیادہ لائق ہے۔

حدیث شریف :۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔ بنی آدم کے قلوب لوہے کی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ عرض کیا گیا: ان کی صفائی کا کیا علاج ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ۱۔ تلاوت قرآن ۲۔ کثرت ذکر اللہ ۳۔ کثرت ذکر موت

ف : تمام گناہوں کی اصل تین چیزیں ہیں۔ ۱۔ حرص ۲۔ حسد ۳۔ کبر

پھر ان تین چیزوں سے چھ اور حاصل ہو جاتی ہیں جس سے کل نو ہوئیں۔

۱۔ سیر ہو کے کھانا، ۲۔ نیند بہت کرنا، ۳۔ دنیوی راحت کے درپے رہنا، ۴۔ مال، ۵۔ مرتبہ، ۶۔ حکومت کی محبت

حب مال وریاست بہت بڑے گناہ ہیں جو اپنے صاحب کفر وہلاکت کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔

حکایت : ایک نوجوان بادشاہ نے اپنے خادموں سے کہا مجھے بادشاہی کرنے میں بڑی راحت ہوتی ہے (بتاؤ) کیا تم لوگ بھی لذت پاتے ہو یا صرف مجھے اس کی لذت محسوس ہوتی ہے؟ سب نے کہا ہم لوگ بھی بادشاہی سے متلذذ ہوتے ہیں۔ اس نے کہا: تو پھر کیا کوئی ایسی تجویز ہے کہ جس سے مجھ سے یہ بادشاہی نہ چھنے اور میں ہمیشہ کے لئے بادشاہ رہوں۔ انہوں نے کہا: ہاں ایک تجویز ہے۔ وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سرگرم رہیں اور اس کی نافرمانی سے کنارہ کش رہیں۔

اس پر اس نے اپنے شہر کے تمام علماء وصلحاء بلائے اور ان سے کہا کہ تم لوگ میرے نگران رہو، جو کام نیک ہوں ان کا مجھے حکم دو اور جو برے ہوں ان سے مجھے روکے رہو۔ چنانچہ وہ اسی طرح کئی سال عامل رہا جس کی برکت سے اس کو چار سو سال بادشاہی کرنا نصیب ہوئی ایک دن اس کے پاس ابلیس ملعون انسانی شکل میں آپہنچا اور آکر پوچھا؟ آپ کون ہیں؟ بادشاہ نے کہا: بنی نوع انسان سے ایک انسان ہوں۔ اس نے کہا: نہیں اگر آپ بنی آدم سے ہوتے تو جس طرح باقی لوگ مر چکے ہیں آپ بھی مر چکے ہوتے، بلکہ آپ تو معبود ہیں آپ کو چاہئے کہ آپ تمام لوگوں سے اپنی پرستش کرائیں۔ یہ بات بادشاہ کے دل میں اتر گئی۔ چنانچہ اس نے ایک دن منبر پر علی الاعلان کہا کہ اے لوگو! اب تک جو بات میں نے تم سے چھپائے رکھی تھی اب اس کے اظہار

کا وقت آ گیا ہے۔ وہ یہ کہ میں تم لوگوں کا عرصہ دراز سے مالک بنا بیٹھا ہوں۔ اگر میں بھی بنی آدم ہوتا تو مجھ پر موت آ جاتی اس سے ثابت ہوا کہ میں بنی آدم سے نہیں ہوں بلکہ تمہارا خدا ہوں، اب تمہیں میری عبادت کرنی چاہئے اس پر اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ آپ اس بادشاہ کو متنبہ کر دیں کہ میں نے اسے بادشاہی اسی لیے دے رکھی تھی کہ اس نے میری عبادت سے منہ نہیں پھیرا تھا۔ اب جب کہ اس نے میری اطاعت سے منہ پھیر لیا ہے میں بھی اس سے بادشاہی چھین کر اس پر بخت نصر (بادشاہ) کو مسلط کرتا ہوں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا اور اس پر اسی روز سے بخت نصر غالب آ گیا، اس نے اس کی گردن ماری اور اس کے خزانہ کو اٹھانا شروع کیا۔ اس سے ستر کشتیاں سونے کی برآمد ہوئیں (علاوہ دیگر سامان کے)۔

مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں ؎

جز عنایت کے کشد چشم را — جز محبت کے نشاند خشم را

جهد بے توفیق خود کس را مباد — در جہان واللہ اعلم بالرشاد

ترجمہ:۔ مہربانی کے سوا وہ اپنی آنکھ کو کب کھولتا ہے اور محبت کے سوا وہ غصہ کو کب پیتا ہے اس کی توفیق کے بغیر کس کی طاقت ہے کہ دنیا میں ہدایت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

ختم میں سوابق احکام قدر کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا خلیفہ کے لئے بموافق حکمت اور ارادہ ازلیہ سعادت وشقاوت کے ساتھ آغاز ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ (بعض ان میں بد بخت اور بعض نیک بخت ہیں) باوجودیکہ ان میں ایمان وکفر قبول کرنے کی بہتر استعداد پائی جاتی ہے اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ذرات کو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے خطاب سے مخاطب فرمایا تو ان سب نے بَلٰى کہا۔ پھر ان ذرات کو ان کے قلوب میں امانۃً رکھا۔ پھر قلوب کو اجسام میں اور اجسام کو دنیا میں، گویا ذرات کو تین اندھیروں میں بند کیا گیا۔ پھر دل کا دریچہ عالم غیب کی طرف بواسطہ ذرات کے کھلا رہتا ہے جو کہ امانت رکھے ہوئے ہیں جنہوں نے اللہ کے خطاب کو سنا اور کمال حق کا مشاہدہ کیا یہاں تک کہ بچے کی ولادت ہوتی ہے۔

حدیث شریف: جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنائیں یا نصرانی یا مجوسی۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اشقیاء کو والدین کی تربیت میں سپرد فرماتا ہے۔ اَنْتُمْ وَاٰبَاءُ کُمْ فِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ اس بنا پر اس کی شقاوت مقدرہ تقلید اور صفات نفسانیہ، ظلمانیہ اور خواہش وطبیعت میں مضمر تھی۔ پھر اس شقاوت کی تاثیر وظلمت اور میل کچیل دل میں داخل ہو کر اس میں شقاوت اور سیاہی پیدا کر دیتی ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتی ہے یہاں تک کہ وہ دریچہ جو ذرات کی طرف کھلا ہوا تھا اسے بند کر دیتی ہے جس کی وجہ سے دل اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے اسی وجہ سے اہل شقاوت نہ تو ذرات کے ساتھ (جو بجانب حق تھے) دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں۔ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام کا انکار کرتے ہوئے کفر کی وجہ سے ان پر شقاوت کی مہر لگاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگائی)

تقدیر ایک پوشیدہ راز ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سعادت مندی کے آثار سعادت مندوں کے اقرار اور بدبختی کے آثار بدبختوں کے انکار سے ظاہر ہوتے ہیں۔ تقدیر سے انکار کرنے کی مثال بیج جیسی ہے جو زمین میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس کا اظہار شجر کی وجہ سے ہوگا۔ کیونکہ وہ شجرہ میں مستور ہے۔ اب درخت سے خارج ہو کر ٹہنیوں میں جاگزیں ہے لیکن ہے پوشیدہ۔ یہاں تک کہ ٹہنیوں سے خارج ہو کر ثمرہ کی شکل میں آجاتا ہے لیکن اب بھی مخفی ہے۔ یہاں تک کہ ثمرہ سے ظاہر ہو گیا اور بیج کے ظہور کا خاتمہ ہو گیا ثمرہ کی وجہ سے اسی طرح تقدیر کا راز ہے اور یہ بھی سعادت وشقاوت کا بیج ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں پوشیدہ ہے یہاں تک کہ انسان کے وجود کے شجرہ سے ظاہر ہوا۔ پھر اس انسانی شجرہ میں وہی سعادت وشقاوت پوشیدہ رہی پھر اس کا ظہور اخلاق کی ٹہنیوں سے ہوا لیکن وہی بیج اب بھی ان ٹہنیوں میں پوشیدہ ہے اب وہ اعمال کے ثمرہ میں ظاہر ہونے لگی۔ یعنی اقرار وانکار اور ایمان وکفر۔ اب جب کہ ان کا ظہور ہوگا تو تقدیر کے راز پر مہر لگ گئی اور وہی یعنی سعادت وشقاوت ثمرہ ایمان وکفر سے ظاہر ہوئی پس تقدیر کا راز سعادت وشقاوت کی مہر لگانے سے ظاہر ہو گیا۔ پس جن لوگوں کے دلوں پر کفر کی مہر لگائی اگرچہ اس مہر کے نقش احکام ازلیہ اور تقدیر کے راز سے ہیں یہاں تک کہ وصال کی دولت سے محروم ہو گئے اس سے ان کے کانوں پر مہر لگائی کہ اب وہ مالک ذوالجلال کے خطاب کو نہیں سن سکتے اور ان کی آنکھوں پر اندھاپن اور گمراہی کے پردے ہیں کہ اب وہ اس جلال وکمال کو نہیں دیکھ سکتے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

فریب دیا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا

ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے

يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱

جھوٹ کا۔ اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ

سنتا ہے وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے

اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ

اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنتا ہے وہی احمق ہیں مگر

لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا

جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں

اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ

ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یونہی ہنسی کرتے ہیں۔ اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں

طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا

ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو

رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ

ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔ ان کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی

نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ

تو جب اس سے آس پاس جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا

ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ

کہ کچھ نہیں سوجھتا۔ بہرے، گونگے اندھے تو پھر آنے والے نہیں۔ یا جیسے آسمان سے

مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ

اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں

فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩﴾

کڑک کے سبب موت سے ڈرتے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا

بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے

فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ

اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو

بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٠﴾ ع

ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ (ربط) جب باری تعالیٰ نے اپنی مبارک کتاب کے حال کی شرح کا آغاز فرمایا تو اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو اس کی خاطر دین کو خالص

کرنے والے ہیں اور اس معاملہ میں ان کی زبانیں ان کے قلوب کے موافق ہیں۔ پھر دوسرے نمبر ان لوگوں کا بیان ہوا جنہوں نے ظاہراً و باطناً کفر سے حصہ لیا اور تیسرے نمبر پر ان لوگوں کا ذکر ہوا جو نمبر تیسرے میں ہیں۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے صرف زبان سے ایمان کا اظہار کیا لیکن ان کے قلوب نعمتِ ایمان سے بہرہ ور نہیں۔ اس تیسرے گروہ کا بیان تقسیم کی تکمیل کے لئے ہے۔

ف: یہ منافق کفار سے بہت زیادہ خبیث اور اللہ کے نزدیک مبغوض ترین لوگ ہیں کیونکہ انہوں نے فریب اور استہزاء کرتے ہوئے کفر میں خلط و ملط کر دیا اس لیے ان کی خباثت بیان کرنے میں طوالت کی گئی۔

نکتہ: قاشانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ان کفار (جو اپنے کفر پر اصرار کرنے والے ہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے) کے ذکر میں صرف دو آیتوں پر اکتفا کرنے اور منافقین کے اوصاف (قبیحہ) بیان کرنے میں تیرہ آیتوں کو لانے میں نکتہ یہ ہے کہ کفار سے پوری طرح اعراض اس لئے کیا گیا کہ ہے اب ان میں نہ کلام اثر کرتا ہے اور نہ ان کو خطاب فائدہ پہنچاتا ہے بخلاف منافقین کے کہ کبھی ان میں توبیخ و تعبیر اثر کر جاتی ہے اور ان پر طعن و تشنیع اور ان کے اپنے حالات و عادات اور اندرونی امراض و خباثتِ نیت ظاہر کرائے جانے میں ہو سکتا ہے کہ شاید اس طریق سے اپنی بری عادات سے باز آجائیں اور ان کی صورتِ حال کو قبیح طرز میں بیان کرنے اور ان کو ان کے نفوس فرمانبرداری میں آجائیں گے اور وہ رذائل کہ جن میں وہ خراب ہو رہے ہیں ان سے دور ہو جائیں گے پھر وہ اس دائرہ میں آسکیں گے جس کو اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ اَلنَّاسِ انسان کی جمع ہے، انسان کو انسان اس لیے کہا گیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھلا دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا اس معنی پر اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ کی تفسیر میں آیا ہے کہ لَكَنُوْدٌ بمعنی نعمتوں کے بھلا دینے والا اور تکالیف کو بہت زیادہ یاد کرنے والا۔

بعض کہتے ہیں کہ انسان کو انسان اس لیے کہا گیا کہ وہ ان ظہور کی وجہ سے اَنِس بمعنی اَبْصَر سے مشتق ہے اور یہ ظاہر ہیں اور نظر آنے والے ہیں اس لیے ان کو بھی بشر کہتے ہیں جیسا کہ جنات کو جن کہا گیا ہے ان کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے یعنی وہ لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اُنس سے مشتق ہے (جو کہ وحشت

کی ضد ہے) کیونکہ وہ اپنے ہم جنس سے مانوس ہوتے ہیں یا اس لئے کہ ان کے ارواح ان کے اجسام سے ان کے اجسام ان کے ارواح سے مانوس ہیں۔

قانون: النَّاسِ میں لام جنس کی ہے اور مَنْ یَّقُوْلُ میں مَنْ موصوفہ ہے کیونکہ کوئی مخصوص انسان مراد نہیں، گویا کہ کہا گیا ہے و من الناس ناس'' من یقول یعنی صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں۔

۳۔ وہ معنیٰ جو نفس میں متصور ہوتا ہے جسے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۴۔ بمعنیٰ رائی۔ ۵۔ مذہب۔ پچھلے تینوں معانی مجازی ہیں۔

سوال: یَقُوْلُ میں ضمیر واحد کی لائی گئی ہے اور اٰمَنَّا میں جمع کی، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: لفظ مَنْ میں دو اعتبار ہوتے ہیں: **لفظی**، معنوی، اس کے لفظی اعتبار سے یَقُوْلُ میں ضمیر مفرد کی لائی گئی کیونکہ لفظ مَنْ لفظاً مفرد ہے اور اٰمَنَّا میں اس کے معنیٰ کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ مَنْ معناً جمع ہے۔ یا النَّاسِ میں لا عہد کی ہے اور معہود وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور مَنْ موصولہ ہے۔ اس سے مراد عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھی اور اس کے ہم مثل وہ منافقین ہیں کہ جنہوں نے اسلام کا معتقد ہونا اس لیے ظاہر کیا تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کرام علیہم الرضوان سے بچ جاویں حالانکہ ان کے اعتقادات فی الحقیقت ان کے خلاف تھے اکثر ان میں یہودی تھے وہ تو منافقت پر ہمیشہ کمر بستہ رہتے اسی بنا پر ان کو بھی ان کفار میں گنا گیا جن کے قلوب پر مہر لگائی جا چکی ہے اور اس زیادتی سے جو کہ انہوں نے کفر پر زیادتی کی (یعنی منافقت) کی خصوصیت سے ان کا کفار میں داخل ہونے سے انکار کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر جنس کا نوع ہوتا ہے اور یہ بھی چند زیادتیوں سے ان کے بعض بعض سے متنوع ہیں۔ اس تقریر کی بنا پر دوسرے گروہ کی یہ تقسیم ہوئی۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کو صدقِ دل سے مانتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور یوم آخر سے مراد حشر لے کر ابدی مانیا یہ ہے یعنی وقت دائم جو کہ ختم ہونے والے اوقات کا آخری وقت اور اس سے مراد قیامت کا دن ہے یا حشر سے لیکر بہشتیوں کا بہشت میں اور دوزخیوں کا دوزخ میں داخل ہونے تک، کیونکہ ایام معدودہ کا یہ آخری یوم ہے کیونکہ اس کے ماسوا کی کوئی حد نہیں اور اس کو آخر بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا

میں بعد میں آنے والا ہے۔

سوال : ایمان کو ان دونوں یعنی بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ پر کیا تخصیص ہے؟

جواب : وہ لوگ مدعی تھے کہ ہم ایمان کی دونوں جانبین کو حاوی ہیں اور اس کی دونوں اطراف کو احاطہ کرنے والے ہیں اس پر انہیں خبردار کر دیا گیا کہ تم لوگ اپنے اس گمان پر پورے نہیں بلکہ منافقت کر رہے ہو۔ علاوہ ازیں وہ اس قول کے کرنے سے منافقت کر سکتے ہیں کیونکہ یہ لوگ یہودی تھے اور یہودی اگرچہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے مگر ان کا یہ ایمان کالعدم تھا کیونکہ ان میں ذیل کی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے اعتقاد میں یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں سے تشبیہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔

اور کہتے تھے کہ بہشت میں سوائے ہمارے کوئی بھی داخل نہ ہوگا۔

اور کہتے تھے کہ ہم دوزخ میں نہیں ہوں گے مگر چندروز، وغیرہ۔

اور گمان رکھتے تھے کہ وہ ہمارے اور مومنین کے ایمان میں کوئی فرق نہیں۔

ف : ان کی عبارت کو بعینہٖ نقل کرنے میں ان کی کمال خباثت کا بیان کرنا ہے کیونکہ وہ باتیں جو وہ کہا کرتے تھے اگرچہ کبھی ان کے بلا دھوکہ اور فریب صادر بھی ہو جاتیں تو ان کو ایمان نہیں کہا جا سکتا کیسے کہا جائے جبکہ یہی اقوال مومنین کو دھوکا دینے اور ان کے ساتھ استہزاء کرنے کی بنا پر کہہ دیا کرتے تھے تو یہ خالص ان کی خباثت اور نرا کفر ہی کفر ہوگا۔

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ لفظ لَیْسَ کا نائب ہے اس لیے اس کے بعد باء زائدہ آئی ہے اب معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ تصدیق کرنے والے نہیں کیونکہ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اس کا خلاف دل میں رکھتے ہیں بلکہ یہ لوگ منافق ہیں۔

ف : ان پر یہ حکم لگانا کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں ان کے اس دعویٰ کی نفی ہے کہ وہ بالیقین والقطع مدعی تھے کیونکہ ما کی خبر ی باء داخل کر کے ان سے اصل ایمان کی نفی داخل کر دی گئی ہے اس لیے تو **وما هم من المؤمنين** نہیں فرمایا علاوہ ازیں وجہ کے پہلا جملہ یعنی وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ دوسرے یعنی **وما هم من المؤمنين** سے زیادہ بلیغ ہے۔

مسئلہ : اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ دعویٰ مردود ہوتا ہے کہ جس کی صحت پر دلائل صحیح نہ پائے جائیں۔

حکمت : اہل عرب کہتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو اس بات سے سنوارا کہ جو اس میں نہیں ہے تو وہ اپنے

دعویٰ کرنے سے امتحان کے وقت شرمسار ہوگا اور جو شخص اپنی تعریف کرتا ہے ندامت اٹھائے گا اور جو اپنی مذمت کرتا ہے وہ تعریف کیا جائے گا جیسا کہ فرعون نے اپنی مدح میں کہا:

وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (اور میں مسلمانوں سے ہوں) تو اس کی مذمت ان الفاظ سے کی گئی۔

وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (اور تو مفسدوں سے تھا)

اور حضرت یونس علیہ السلام نے تواضعاً فرمایا: اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (بیشک میں ظالموں سے ہوں)

توان کے لئے فرمایا گیا: فَلَوْلَآ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ (اگر وہ نہ ہوتا تسبیح کرنے والوں سے)

حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں تا سیہ رُو شود ہر کہ غش باشد

ترجمہ: اچھا ہے اگر پرکھنے اور امتحان کے لئے کسوٹی درمیان میں ہوتا کہ جس کسی کے اندر کھوٹ ہو وہ سیہ رو ہو جائے۔

حکایت: ایک شخص کا ایک شاگرد ہمیشہ اپنے لیے امانت کا دعویٰ کرتا تھا مگر شیخ کو اس کے خلاف آثار نظر آتے تھے مگر تلمیذ بہت اعتماد سے کہتا کہ مجھے آزما لیجیے۔ اس سے اس کا مقصود یہ تھا کہ مجھے اسرار الٰہیہ سے کسی ایک راز کا انکشاف بخشا جائے گا ایک دن شیخ نے اپنے ایک اور شاگرد جو اس کا ساتھی تھا پکڑ کر اپنے گھر چھپا لیا، اور مینڈھے کو پکڑ کر ذبح کر کے ایک صندوق میں رکھ لیا اس اثنا میں وہی امانت کا مدعی تلمیذ آ گیا استاد صاحب کو دیکھا کو خون آلود ہیں اور صندوق بھی سامنے پڑا ہے اور چھری ہاتھ میں ہے۔ تو عرض کی کہ حضرت جی! یہ کیا ماجرا ہے؟ استاد صاحب نے فرمایا کہ میں نے اس کی خواہشات نفسانیہ کی ایسی بیخ کنی کر دی ہے تاکہ وہ میری مخالفت نہ کرے۔ اس نابکار شاگرد نے سمجھا کہ وہ مقتول تلمیذ اسی صندوق میں ہے۔ پھر استاد صاحب نے اس شاگرد سے فرمایا کہ اے میرے عزیز! اس راز کو اپنے دل میں رکھنا اور اس مقتول تلمیذ کے صندوق کو جو میرے سامنے ہے میرے گھر دفن کر دو۔ (اس امر سے اصل میں نابکار شاگرد کی آزمائش کرنا مقصود تھا) اور بعد ازاں اتنے میں اس گمشدہ تلمیذ کا باپ جو اپنے بیٹے کی تلاش میں تھا وہی نابکار شاگرد اس کے باپ سے کہنے لگا کہ تیرے بیٹے کو ہمارے استاد صاحب نے قتل کر کے اپنے گھر میں دفن کر دیا ہے شدہ شدہ یہ بات سلطانِ زمان تک پہنچی۔ بادشاہ

نے سن کر توقف فرمایا کیونکہ اس بزرگ کی بزرگی سے وہ خوب واقف تھا مگر تاہم شیخ کی خدمت میں قاضی اور دیگر فقہاء کو بھیج کر تفتیش شروع کر دی۔ اس واقعہ سے تلمیذ نابکار بڑا خوش ہوا اور استاد صاحب کا خوب گالیاں دیں اور گواہوں کو ساتھ لیکر آئے تا کہ مذبوح لڑکے کو بچشم خود دیکھ سکیں۔ چنانچہ جب صندوق کو کھولا گیا تو ذبح شدہ مینڈھا اس میں پایا اور اس گھر سے وہ لڑکا صحیح سلامت باہر نکل آیا جس سے اس شاگرد کو سخت شرمندگی اٹھانا پڑی۔ مگر اب ندامت سے کیا فائدہ؟ (کذافی الرسالۃ الموسوم بالحکم المربوط فیمایلزم اھل طریق اللہ من الشروط مصفنہ شیخ الا کبر ابن العربی قدس سرہٗ العزیز)

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ اسرار مینوں کو دیے جاتے ہیں اور انوار ادیبوں کو دیے جاتے ہیں حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

حدیثِ دوست نہ گویم مگر بحضرت دوست ۔۔۔ کہ آشنا سخن آشنا نگہ دارد

ترجمہ : دوست کی بات دوست کو کہی جاتی ہے اس لیے کہ راز دان راز دان کی بات کو با حفاظت رکھتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ مِنَ النَّاسِ میں النَّاسِ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے وعدہ یوم میثاق کو بھلا دیا۔ پھر ان میں بعض تو وہ ہیں جو منہ سے تو کہتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لائے لیکن ان کے قلوب اس کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ ایمان حقیقی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نور سے ہو جس کو اللہ تعالیٰ اپنے خواص کے قلوب میں ڈالتا ہے اور یوم آخر پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نور سے یوم آخرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کے نور سے نہ دیکھا تو اسے عالم غیب کا مشاہدہ بھی نصیب نہ ہوا۔ نہ وہ غیب کو جان سکے گا نہ مومن باللہ ہوگا اور نہ مومن بالیوم الآخر اس لیے تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ یہ وہ لوگ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے نور سے ایمان لاتے ہیں۔ اس آیت کا معنی اور بھی ہے وہ یہ کہ وہ لوگ حقیقی ایمان کی طرف جانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ وہ لوگ نہایت غفلت وخذلان میں ہیں۔

تفسیر عالمانہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (ربط) جملہ سابقہ میں جو يَقُوْلُ گزرا ہے اس کا بیان ہے اور منافقین جو اپنی غرض اٰمَنَّا بِاللّٰهِ بیان کرتے تھے اس کی ان کو توبیخ ہو رہی ہے یا جملہ مستانفہ ہے

جو ایک سوال مقدر کا جواب۔ سوال یہ ہے کہ گویا سائل نے پوچھا کہ ان منافقین کی جزا کیا ہے جو منہ سے تو گواہی دیتے ہیں لیکن وہ مومن نہیں۔ تو اس کے جواب میں یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ معلوم رہے کہ یُخٰدِعُوْنَ بمعنی یَخْدَعُوْنَ ہے۔ فَعَلَ کو فَاعَلَ کے وزن پر مبالغۃً لایا گیا ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اپنے ظاہری معنی پر نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی شے مخفی نہیں اور منافقین کا دھوکہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں بلکہ ان کی غرض دھوکا سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ اس معنی پر مضاف محذوف ہوگا۔ یعنی یخدعون رسول اللہ، یا یوں ہو کہ جو معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جا رہا ہے یہ دراصل اللہ تعالیٰ سے ہو رہا ہے کیونکہ آپ در اصل زمین پر اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں اس کے بندوں کو اسکے اوامر و نواہی سناتے ہیں۔

مسئلہ : ثابت ہوا کہ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ دھوکا کرنے کو اپنے ساتھ دھوکا کرنے سے تعبیر فرما رہا ہے۔

سوال: وہ منافقین تو کفار سے بھی زیادہ خبیث اور **اھل الدرک الا سفل من النار** تھے پھر ان پر مومنین کے احکام جاری کرنے کا کیا معنیٰ ؟

جواب : یہ صرف مہلت دینے کی وجہ سے ہوا۔

سوال : رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین ان کی منافقت کو جانتے ہوئے بھی ان پر اسلام کے احکام جاری کرتے اور ان کے حال کو کسی پر ظاہر نہ کرتے مخفی رکھتے یہ کیوں؟

جواب : اللہ تعالیٰ کے فرمان کو مان کر، تا کہ مخادعہ دونوں جانب سے ہو جائے اگر ان پر یہ احکام جاری نہ ہوتے تو کافروں میں مل جاتے اور پھر ان کو اس دھوکا دہی کی جزا کیسے ملتی۔

حل لغات : خَدَع" بمعنی برائی کے پہنچانے کے ارادہ پر اپنے ساتھی کو اپنے ارادہ کے خلاف پا کر اسے دھوکا میں رکھ کر خود بآسانی مکروہ امر سے نجات پانا۔ اہل عرب کے قول خبّ"، خادع"، و خَدِع" سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ شکاری اپنا ہاتھ گوہ کے ہاتھ میں ڈالے اور سے خیال ہو کہ شاید وہ میری طرف متوجہ ہے حالانکہ وہ کسی دوسرے دروازہ سے نکل جائے یہاں پر دونوں معنی مناسب ہیں کیونکہ منافقین کا ارادہ بھی یہی تھا کہ مومنین کے مخالفین کو راز بتا کر خود تکالیف سے بچ جائیں جو باقی کفار کو مومنین کی جانب سے بوجہ

قتل یا مال چھن جانے اور قید ہو جانے سے پہنچتی تھیں۔ علاوہ ازیں ان کا دنیاوی مصلحتوں کے نظم و نسق کو بھی حاصل کرنا مقصود تھا بایں طور کہ جس طرح مومنین کو عطیہ جات ملتے تھے انہیں بھی ملتے رہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی مومنین سے بھی دھوکا کرتے ہیں جبکہ انہیں دیکھ کر اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کہتے ہیں حالانکہ وہ ایماندار نہیں ہیں۔ اس کا عطف پہلے جملے پر ہے یہاں پر "مُخَادَعَۃ" کا حقیقی معنی ہوگا۔ کیونکہ حقیقی معنی ممکن ہے۔

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ **حل لغات**: نفس" شے کی ذات اور حقیقت کو کہتے ہیں کبھی روح کو بھی نفس کہتے ہیں۔ کیونکہ نفس اسی سے زندہ ہے اور قلب کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ یہ قلب کا محل اور متعلق ہے۔ اور خون کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ نفس کا قوام اسی کے ذریعے سے ہے اور پانی کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ اس کی نفس کو بہت ضرورت ہے یہاں پر پہلا معنی مراد ہے کیونکہ بیان یہ کرنا ہے کہ دھوکا بازی کا نقصان دراصل صرف انہیں ہوگا کیونکہ ان کے فعل کا دائرہ نہیں پر بند ہے۔ جنہوں نے صیغہ (مفاعلہ) کے معنی صحیح رکھنے کا پورا اہتمام رکھا تو وہ اس طرح ترجمہ کریں گے کہ وہ معاملہ جو دھوکا بازوں کے معاملہ سے مشابہ ہے سوائے اپنے نفسوں کے کسی دوسرے کے ساتھ نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ نقصان سوائے ان کے دوسرے کو محیط نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی منافقت کی اطلاع دیدے گا جس کی وجہ سے وہ دنیا میں شرمساری اٹھائیں گے اور آخرت میں سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

بازی تو دیدم اے شطرنج باز　　　بازی خصمت ببیں پہن دراز

ترجمہ: اے شطرنج کھیلنے والے! میں نے تیرا کھیل دیکھا ہے اپنے دشمن کا کھیل بھی دیکھ جس کا میدان وسیع ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ کر رہے ہیں قیامت میں بھی ان سے ایسا ہی کیا جائے گا چنانچہ مروی ہے کہ جب یہ لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے تو عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ سے فریادی ہوں گے اور بخشش کی طلب کریں گے تو کہا جائے گا دروازے کھلے ہیں جہنم سے نکل کر جب بہشت کے قریب پہنچیں گے تو دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور انہیں لوٹا کر شیاطین وطواغیت کے ساتھ دوزخ میں بند کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا (بیشک وہ مکر کرتے ہیں اور میں ان کے مکر کی انہیں جزا دوں گا) (بیشک وہ مکر کرتے ہیں اور ہم بھی ان کے مکر کی انہیں سزا دیں گے)

حدیث شریف: بعض لوگوں کو بہشت میں داخل ہونے کا حکم ہوگا، جب وہ بہشت کے قریب ہوں گے اور اس کی خوشبوئیں ان کے دماغوں میں پہنچیں گے اور اس کے محلات پر نظر کریں گے اور ان اشیاء کو دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ نے بہشت کے لئے تیار فرمائیں انہیں ندا ہوگی کہ بہشت سے دور ہو جاؤ تمہارے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ حسرت وندامت کے ساتھ لوٹیں گے جس طرح ان کی یہ رسوائی ہوگی ایسی نہ پہلے کسی سے ہوئی اور نہ آئندہ کسی سے ہوگی۔ عرض کریں گے: الٰہ العالمین! قبل اس کے کہ وہ اشیاء جو تو نے اپنے اولیاء کے لئے بہشت میں تیار کی ہیں ہمیں دکھاتا اور دوزخ میں داخل فرمالیتا تو اچھا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: یہ میں نے ارادہ کیا ہے کیونکہ تم وہی تو ہو کہ جب تم تنہائی میں ہوتے تو اپنے وساوس سے میرے ساتھ قسم قسم کے جنگ وجدال میں رہتے اور جب مومنوں سے ملتے تو بات کو چھپا کر ریا سے کام لیتے ہوئے کو کچھ دل میں ہوتا اس کے خلاف کا اظہار کرتے تم دنیا والوں سے تو ڈرتے تھے مگر میرا ڈر تم کو کبھی یاد نہ آیا۔ لوگوں کو تم نے بزرگ سمجھا مگر میری بزرگی کا تمہیں لحاظ نہیں تھا اور لوگوں کے لئے تم (غلط روی) کو چھوڑ دیتے مگر میرے لئے تم نے کوئی (برا عمل) نہ چھوڑا پس آج کے دن میں تم کو اپنی نعمتوں سے محروم رکھ کر عذاب شدید میں مبتلا کر رہا ہوں۔ (کذا فی روضۃ العلماء وتنبیہ الغافلین)

وَمَا يَشْعُرُونَ (ربط) یہ جملہ، جملہ **وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ** کی **هُمْ** ضمیر سے حال ہے یعنی اپنے نفوس پر دھوکا کے وبال سے کمی نہیں اور غفلت وغوایت میں منہمک ہونے کی وجہ سے اس خرابی کا انہیں علم بھی نہیں ہوتا۔ طوقِ وبال خداع اور پھر اس کے نقصان کا عود اس کی طرف لوٹنے کے ظہور کو ایسا کا محسوس بیان کیا کہ سوائے ماؤف الحواس کے کسی پر مخفی نہیں۔ ان کو بمنزلہ جمادات کے بنایا گیا، بلکہ بہائم کے رتبے سے بھی انہیں گرا گیا بایں طور کہ ان سے حسن حیوانی سلب کی گئی ہے پس ان کے حق میں کہا جاسکتا ہے **بَلْ هُمْ أَضَلُّ**۔ **وَمَا يَشْعُرُونَ** یہ **لَا يَعْلَمُونَ** سے زیادہ احسن اور بلیغ ہے۔ الشعور بمعنی الاحساس ہے یعنی علم الشئی بمعنی علم حسن ہے اور مشاعر انسان بمعنی حواس، انسان کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا ہر حاسّہ شعور اور نصیحت قبول کرنے کا محل ہے پس منافق جو بھی عمل کرتا ہے اس کا اس کے وبال کا اسے علم بھی نہیں ہوتا اور مومن چونکہ اپنے ہر عمل کے وبال کو جانتا ہے کہ بنابریں اللہ تعالیٰ کے سامنے منافق کو کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔

سوال : اس آیت میں تو اس کے جاننے کی نفی کی گئی اور دوسری آیت میں ان کے جاننے کا ثبوت ہے۔

جواب : اس کا حقیقۃً تو انہیں علم تھا لیکن انہیں اپنے کیے کا علم نہیں ہوتا تھا لہٰذا وہ لاعلم ہی تھے ان کی مثال صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ والی آیت ہے وہ لوگ اگرچہ ناطق اور سامع اور ناظر تو تھے لیکن چونکہ وہ اس سے نفع نہ اٹھا رہے تھے بنابریں گویا وہ گونگے اور بہرے اور اندھے ہیں مثلاً ایک شخص کے پاس ہتھیار ہو مگر وہ اسے استعمال نہیں کرتا تو وہ اور وہ شخص جس کے پاس ہتھیار نہ برابر ہیں۔ اسی طرح وہ عالم جو اپنے علم کے مطابق عامل نہ ہوا اور جاہل برابر ہیں۔ اسی طرح دولت مند جو اپنے مال سے نفع نہیں اٹھاتا وہ اور مفلس برابر ہیں۔ پس کفار کے لئے علم ثابت الزام حجت کے لئے ہے اور ابوجہل کا اثبات ان کی کمی کے اظہار کے لئے ہے بخلاف اہل ایمان کے ان کے لئے علم کا اثبات ان کی کرامت کے اثبات کے لئے اور ذکر جہل معصیت میں معذور ہونے کی تلقین سکھانے کے لئے ہے۔ (کذافی التیسیر)

سبق : مومن کے شایان شان یہ ہے کہ علم و عمل کے زیور سے آراستہ ہو اور خطا و گناہ سے کنارہ کش رہے اور اپنے رب کی خالص رضا کی خاطر اس کی اطاعت کرے اور قلب سلیم سے اس کی عبادت میں معروف ہے۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اپنی امت پر جیسا کہ ان کے شرک اصغر سے خائف ہوں ان کے کسی اور عمل سے خائف نہیں۔ عرض کیا گیا: شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: ریاء (شرک اصغر ہے) قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اعمال کی جزا دے گا تو ریاکار لوگوں کو فرمائے گا کہ تم ان حضرات کے پاس جاؤ جن کے سامنے دنیا میں اپنے اعمال ریاء کے طور پر کرتے تھے کیا تمہارے لیے ان کے پاس کوئی بھلائی ہے (نہیں ہرگز نہیں) یہ ان کو اس لیے کہا جائے گا کہ ان کا یہ عمل بطور دھوکا کے ہوگا بنابریں ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے گا جو دھوکا بازوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ (تنبیہ الغافلین)

شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

چہ قدر آور بندہ ریش   کہ زیر قبا دارد اندام پیش

ترجمہ : اس آدمی کی کیا قدر جو ریاکاری کا لباس پہنے ہوئے ہے کہ وہ اپنی قبا کے نیچے کئی جسم رکھتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ   جب اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کے لئے شقاوت مقدر فرمائی تو پوشیدہ تقدیر کا بیج ان کے

اعمال میں بویا جس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکا بازی کا پھل نمودار ہوا اور یہ اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ دھوکا وہی پوشیدہ تقدیر کے بیج کا نتیجہ ہے جس اس کو نظروں میں زینتِ دنیا اور اس کے قلب میں حُبِّ شہوات کے ذریعہ ظاہر ہو رہا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ

(لوگوں کے لئے شہوات کی محبت سنگاری گئی ہے) تو یہ بندہ زینتِ دنیا اور طلبِ شہوات میں اللہ تعالیٰ اور سعادتِ اخرویہ سے دھوکا کھا بیٹھا پس دراصل وہی دھوکا باز مکر ساز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (وہ اللہ تعالیٰ سے دھوکا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دھوکا کی انہیں سزا دے گا)

اس تقدیر پر اب معنی یہ ہوا کہ یہ لوگ درحقیقت دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو، جس کی حقیقت ان کے اللہ تعالیٰ اور مومنوں کے ساتھ دھوکا دہی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ کفر کی وجہ سے دھوکا دینے سے پہلے دوزخ کے مستحق ہو چکے تھے اگرچہ ان سے ایمان کا امکان تھا مگر چونکہ وہ بطور دھوکا دہی کے منافقت کے اظہار میں شروع ہوئے تو ان کے قدم درک اسفل من النار میں پھسلے جس سے ان کا ایمان قبول کرنا اور ان سے ممکن ہونے کی استعداد ختم ہو گئی پس ان کے دھوکا دینے اور مکر کرنے کا نقصان ان کی طرف راجع ہوتا ہے جس کی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی وَمَا يَشْعُرُوْنَ یعنی انہیں تقدیر ازلی کے راز کا پتہ نہیں کہ ان کا مکر و فریب کرنا اس کی تقدیر کے راز کے نتائج سے ہے وجہ دراصل یہ ہے کہ ان کے قلوب بیمار ہیں اور روحانی مریض تقدیر کے راز سے واقف نہیں ہوتا۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا حل لغات: زاد کبھی متعدی ہو کر آتا ہے جیسا کہ اس آیت شریف میں ہے اور کبھی لازم ہو کر، جیسا کہ آیت وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ [1] میں ہے اور مَرَضٌ درحقیقت اس عارضہ کو کہتے ہیں جو بدن کو لاحق ہوتا ہے اور اس کو حدِّ اعتدال (جو اس کے لائق ہے) سے خارج کر کے اس کے اعضاء میں ایسا خلل واقع پیدا کر دے کہ اسے درجہ موت تک پہنچا دے اور مجازاً عوارض نفسانیہ پر بولا جاتا ہے کہ جن سے انسانی کمالات میں خلل واقع ہو جائے جیسے جہل سوءِ عقیدت، حسد، کینہ گناہوں کی محبت اور حقیقیہ ابدیہ کے زوال کے موجب ہیں اور آیت کریمہ اس مجازی و حقیقی دونوں معنوں کا احتمال رکھتی ہے کیونکہ ان کے قلوب اس ریاست جو انہیں حاصل تھی کے چھن جانے سے جل چکے تھے اور حضور

[1] ہم نے انہیں ایک لاکھ یا اس سے زائد لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر میں ترقی اور ان کی شان میں روز بروز زیادتی سے حسد میں آ کر آزار رسیدہ تھے اور علاوہ ازیں ان کے دل چونکہ کفر اور برے عقائد اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے صدمہ یافتہ ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماریوں میں یوں اضافہ فرمایا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر ثبت فرمائی (کیونکہ اسے علم تھا کہ ان پر نہ تو نصیحت اثر کرے گی اور نہ ہی کسی کا ڈر کارگر ہوگا) اس لیے جب بار بار وحی نازل ہوتی اور تکالیف شرعیہ کا حکم صادر ہوتا اور مسلمانوں کو فتح و نصرت نصیب ہوتی تو ان (منافقین) کے مرض میں اضافہ ہو جاتا ہے پھر جوں جوں تکالیف شرعیہ کا نزول ہوتا جاتا اسی قدر ان کی بیماری، کفر بڑھتی جاتی سب سے بڑا بوجھ ان پر شہادت کے کلمہ شریف کا تھا جس کے پڑھنے سے وہ کتراتے بعد ازاں طاعات کے احکام ہوتے گئے تو وہ بھی کفر میں بڑھتے گئے اسی وجہ سے کل قیامت میں انہیں لحظہ بہ لحظہ عذاب بڑھتا رہے گا کما قال اللہ تعالیٰ: وَزِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (اور ان کا ہم نے عذاب پر عذاب بڑھا دیا) اور اسی طرح مومنین بھی روز بروز ہدایت میں بڑھتے رہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى (اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ہدایت میں بڑھاتا ہے) اس لیے کل قیامت میں انہیں فضل و کرم فراواں نصیب ہوگا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (اور قیامت میں اپنا فضل انہیں بڑھ کر عطا فرمائے گا)

تفسیر صوفیانہ حضرت قطب علامہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ دل کے امراض یا تو دین سے متعلق ہیں جیسے بُرے عقائد اور کفر، یا اخلاق سے متعلق ہیں۔ اخلاق کی دو قسمیں ہیں۔ رذائل فعلیہ، جیسے خیانت، حسد یا رذائل انفعالیہ، جیسے ضعف اور بزدلی پر مرض کو اولاً محمول کیا جائے کفر ہے۔ پھر ہیات فعلیہ پر، پھر ہیات انفعالیہ پر۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ بددعا ہے۔

جواب: یہ مطلب غلط ہے کیونکہ بددعا تو عجز پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ عجز سے پاک ہے۔

ف: بندوں کو دعا کا طریقہ سمجھایا گیا ہے کہ جب تم سے کام نہ بنے تو دعا کو عمل میں لایا کرو اور یہ بھی بتایا گیا کہ منافقین کے لئے بددعا کرنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے درک اسفل تیار کیا ہے اسی طرح محمول ہوں گے قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ و عَفَا اللّٰهُ وغیرہ وغیرہ۔

تفسیر عالمانہ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ یعنی آخرت میں ان کے لئے سخت عذاب ہے اس عذاب کا درد ان کے قلوب تک پہنچے گا اور أَلِيمٌ بمعنیٰ مولم بفتح اللام، اسم مفعول از ایلام عذاب کو أَلِيمٌ سے موصوف کرنا مبالغہ کی بنا پر ہے وہ دراصل معذب بفتح الذال کی صفت ہے جیسا کہ اہل عرب کے قول جد جدہ میں جدّ جادّ کی صفت ہے اور مبالغہ لانے میں وجہ یہ ہے کہ الم ایسے درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ معذب عذاب جو کہ اس کا متعلق بہ ہے کی طرف سرایت کر گیا ہے۔

بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ بــاء سببیت کی ہے یا مقابلہ کی اور ما مصدریہ، دراصل يَكْذِبُونَ پر داخل ہے اور لفظ كَانُوا زائد ہے جو دوام اور تجدید کا فائدہ دے رہا ہے۔ یعنی ان کے کذب متجدد و مستمر جو کہتے ہیں اٰمَنَّا کی وجہ سے (انہیں) دردناک ہوگا اس میں اشارہ ہے کہ کذب قبیح اور بہت برا عمل ہے اور تنبیہ ہے کہ منافقین کو عذاب صرف ان کے کذب کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ عبارت کے ظاہر سے ثابت ہے کہ ان کے عذاب کا سبب صرف کذب ہے۔ حالانکہ سامع کو بخوبی معلوم ہے کہ عذاب مختلف وجوہ سے ہوگا اور صرف کذب کی وجہ پر اقتصار کرنے میں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ کذب نہایت درجہ کا قبیح ہے اس سے کمال درجہ کی نفرت چاہیے۔

ف: واقعہ کے خلاف وقوع کی خبر دینے کا نام کذب ہے۔

سوال: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تین جھوٹ کی روایت کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس روایت میں کذب بمعنیٰ تعریض ہے اور چونکہ ان باتوں کو لفظاً کذب سے مشابہت ہے بنابریں ان پر کذب کا اطلاق کیا گیا۔

سوال: ان تین جھوٹی باتوں کی تفصیل کیا ہے؟

جواب: پہلا وہ قول جو کہ آپ نے کفار کو فرمایا: إِنِّي سَقِيمٌ یعنی میں بیماری یا موت کی جانب جانے والا ہوں یا میں تمہارے برے عمل جو کہ تم جا کر نجوم پرستی کرو گے تو میں غصہ میں آ کر بیمار ہو جاؤں گا یہ آپ نے اس لیے فرمایا تا کہ وہ لوگ انہیں ساتھ لے جانے پر مجبور نہ کریں اور ان سے باز رہ کر ان کے بتوں کو ان کی عدم موجودگی میں پارہ پارہ کر دیں۔ دوسرا ان کا وہ قول ہے جو انہوں نے بتوں کو توڑ کر کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا تو قوم نے پوچھا: یہ خرابی کس نے کی؟ تو آپ نے فرمایا: بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ (بلکہ یہ ان کے بڑے نے کیا ہے)

یہ قول آپ نے علیٰ سبیل الالزام فرمایا کہ بالفرض والتقدیر اگر اسے سمجھا جائے تو یہ کام اس نے ہی کیا ہے کیونکہ جو معبود ہوتا ہے تو اسے قدرت حاصل ہوتی ہے کہ یہ کام کرسکے اگر وہ ایسے کام نہیں کرسکتا تو وہ عاجز ہوگا اور عاجز الوہیت کے درجہ سے محروم ہوتا ہے اور نہ ہی وہ عبودیت کا مستحق ہے جب تم نہیں مانتے تو ان کو سجدہ کرنا بے سود ہے۔ گویا آپ نے یہ قول ان کے ساتھ بطور تمسخر واستہزاء کے فرمایا۔

تیسرا آپ کا وہ قول کہ جب ظالم بطور ظلم مسافرین کو پکڑ کر عورتوں سے بدفعلی کرتا تھا جب اس ظالم کے سپاہی پکڑنے آئے اور آپ سے بی بی سارہ کے متعلق پوچھا کہ یہ آپ کی کیا لگتی ہے تو آپ نے فرمایا ھٰذِہٖ اُخْتِیْ اس سے مراد آپ کی اخوت دینی تھی یہ آپ نے اس لیے فرمایا تا کہ ان کی بیوی اس ظالم کے پنجہ سے بچ جائے کیونکہ اس کی عادت تھی کہ وہ ان عورتوں کو پکڑتا جن کے شوہر موجود ہوتے کیونکہ اس کا خیال یہ تھا کہ جب یہ عورت اپنے شوہر سے راضی ہے تو بادشاہ اس کے شوہر سے زیادہ حقدار ہے اور جن عورتوں کے شوہر نہیں ہوتے تھے ان کی مرضی کے سوا اس کا کوئی چارہ نہیں تھا۔

سوال : سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں اور چاند سورج کو دیکھ کر کیوں فرمایا ھٰذَا رَبِّیْ حالانکہ آپ کو یقین تھا کہ (یہ سورج، چاند، ستارے وغیرہ) معبود نہیں؟

جواب : یہ استدراج ہے یعنی خصم کے ساتھ نرم بات کہہ کر اپنی طرف مائل کرانا یہ بھی تعریض کی ایک قسم ہے کیونکہ اس قول سے آپ کی غرض ان کے قول کی نقل حکایت تھی تا کہ ان کے اپنے قول سے ان کا ابطال ہو جائے

کذب کی مذمت :۔ جھوٹ کبیرہ ذنوب اور بڑے عیوب میں سے اور تمام گناہوں کا سرغنہ ہے اور اسی سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور تمام بری عادتوں سے مبغوض ترین اور ایمان کا بالمقابل بھی کذب ہے۔ بہرحال اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

حدیث شریف : میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں تمہیں جھوٹ میں ایسے گرتا ہوا دیکھتا ہوں جیسے پروانہ آگ میں گرتا ہے۔

مسئلہ : جھوٹ کیسا ہی ہو جھوٹ لکھا جائے گا۔ ہاں تین ایسے جھوٹ ہیں جن کا گناہ نہیں لکھا جاتا۔

۱۔ جنگ میں جھوٹ بولنا اَلْحَرْبُ خَدْعَۃٌ" (جنگ دھوکا ہے) ۲۔ دو آدمیوں کی آپس میں صلح کرانے میں۔

۳۔ اپنی عورت سے ایسی بات کرنا کہ جس سے وہ خوش ہو۔ مثلاً یوں کہے کہ دنیا میں مجھے تجھ سے زیادہ محبوب کوئی نہیں۔ اسی طرح عورت بھی اپنے مرد کو کہہ سکتی ہے۔

یہ تین ایسے فعل ہیں جن کے متعلق احادیث میں صراحۃً استثناء وارد ہوا ہے۔ اسی کے مطابق وہ مسئلہ ثابت کیا گیا ہے کہ اپنے یا غیر کے لئے کوئی ایسی بات خلاف واقعہ کہہ دے کہ جس سے جائز غرض ہو۔ فارسیوں کا مشہور مقولہ ہے: دروغ مصلحت آمیز بہ از راست فتنہ انگیز (جھوٹ مبنی بر مصلحت اس سچ سے بہتر ہے جو فتنہ انگیز ہے)
لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ غیر کی خاطر ہو اگر اپنے لیے ہو تو سچ بولنا ہی اولیٰ ہے۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

تا نیک ندانی کہ سخن عین صوابست — باید کہ گفتن دہن از ہم نکشائی
گر راست سخن گوئی و در بند بمانی — بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

ترجمہ: جب تک تجھے پتہ نہ ہو کہ بات اچھی ہے چاہیے کہ تو اس کے کرنے کے لئے منہ نہ کھولے۔
اگر تو سچی بات کہے اور منہ کو بند رکھے تو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تو جھوٹ کو قید سے رہائی دلائے۔

مسئلہ: کذب درحقیقت کذب فی العبودیت اور قیام بحقوق الربوبیت ہی ہے جیسا کہ منافقین اور ان کے متبعین کا طریقہ تھا جو لوگ جھوٹ کے عادی ہیں ان کی اقتداء نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ ہلاکت اور مالکِ کائنات کی رحمت سے دور ہٹاتے ہیں، مثنوی شریف میں ہے: ؎

صبح کاذب کاروانہا رزدست — کہ بوئے روز بیروں آمدست
صبح کاذب خلق را رہبر مباد — کہ دہد بس کاروانہا را بباد

ترجمہ: صبح کاذب نے بہت سے قافلے مارے اس لئے کہ دن کی خوشبو سے آئی ہے خدا کرے صبح کاذب کی رہبر نہ ہو، اس لئے کہ اس نے بہت سے قافلے برباد کئے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ
علامہ قاشانی علیہ الرحمہ اس آیت کے معنی میں فرماتے ہیں کہ منافقین کے قلوب رذائل نفسانیہ، شیطانیہ اور صفات بشریہ کی وجہ سے تجلیات ربانیہ سے محجوب و مستور ہیں تاویلات نجمیہ میں ہے کہ منافقین کے دلوں میں مرض ہے یعنی وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مرض میں اضافہ فرمایا ہے۔ اس کی توضیح یوں ہے چونکہ وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو کر دھوکا دہی کی بیماری میں

مبتلا ہو گئے ہیں اس وجہ سے وصالِ حق اور دیدارِ رب سے محروم ہوئے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے کہ وصول الی اللہ سے محروم رہیں گے جھوٹ بولنے کی وجہ سے کہ صرف زبانی طور پر کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لائے حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ ایمان حقیقی ایک نور ہے جب کسی مومن کے دل میں داخل ہوتا ہے تو اسے اس کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ جیسے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو مکشوف ہوا کہ حضور علیہ السلام نے ان سے پوچھا: کیف اصبحت یا حارثہ (اے حارثہ! کیسے گزری؟) اس نے جواباً عرض کی: اصبحت مومناً حقاً (میں نے مومن برحق ہو کر گزاری) آپ نے فرمایا: مومن کے ایمان کی ایک حقیقت ہوتی ہے تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کی: میں نے اپنے نفس کو دنیا سے روگرداں کر لیا ہے۔ اب شب و روز نہایت حسین گزر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اب سونا اور پتھر میرے لئے برابر ہیں اور یہ کیفیت ہے کہ بہشت اور دوزخ میرے سامنے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَصَبْتَ فَالْزَمْ۔ ٹھیک ہے اور اسی پر قائم رہ۔

مولانا روم قدس سرہٗ نے فرمایا:

اہل صیقل رستہ انداز بو و رنگ	ہر دمی بینند خوبی بے درنگ
نقش و قشر و علم را بگذاشتند	رایت عین الیقین بفراشتند
برتر اند از عرش و کرسی و خلا	ساکنانِ مقعدِ صدقِ خدا
علم کاں نبود ز ہو بے واسطہ	آں نپاید ہمچوں رنگ ماشطہ

ترجمہ: قلعی گر رنگ و بو سے آزاد ہو گئے ہر سانس میں بغیر کسی انتظار کے خوبی دیکھتے ہیں۔
انہوں نے نقش، چھلکے اور علم کو چھوڑ دیا ہے اور عین الیقین کی ولایت میں جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔
وہ عرش، کرسی اور خلا سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں وہ خدا کی سچائی کی بیٹھک میں رہنے والے ہیں۔
ان کا علم اللہ ہو سے بے واسطہ نہیں ہے۔ وہ کنگھی کرنے والی کے رنگ کی طرح ظاہری زیبائش نہیں ہوتا۔

تفسیر عالمانہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ یعنی جب ان منافقین کو اہلِ اسلام کہتے ہیں کہ زمین میں فساد نہ کرو۔ لَا تُفْسِدُوْا کا اسناد قِيْلَ کی طرف لفظی ہے۔ گویا انہیں یہی قول کہا گیا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے تم کہو کہ یہ الف ان تینوں حرکتوں میں ایک ہے اور فساد بمعنی کسی شے کا اعتدال سے خارج ہونا اور اصلاح کی ضد ہے۔ [illegible]

ہے کہ تم زمین میں جنگ اور ایسے فتنے (جو بندوں کے احوال کی استقامت کا زوال اور ان کی معاش و معاد کے امور میں اختلال کا موجب ہے) برانگیختہ نہ کرو اور جس فعل سے انہیں روکا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ مومنین کے اسرار کو کفار تک پہنچاتے اور پھر ان کو مسلمانوں کی جنگ پر برانگیختہ کرتے۔ علاوہ ازیں طرح طرح کے شرور وفتن کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس عمل سے چونکہ فساد برپا ہو جاتا ہے بنابریں انہیں کہا گیا لَا تُفْسِدُوْا الخ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو کہا جائے۔

لا تقتل نفسک بیدک "یعنی اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو قتل مت کر" یا کہا جاتا ہے **لا تلق نفسک فی النار** "یعنی اپنے آپ کو آگ میں نہ ڈال" یہ جملے اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص ایسا عمل کر رہا ہو جس کا انجام وہی ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

ف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے قبل کھلے بندوں زمین پر معاصی ارتکاب ہوتا آپ کی بعثت شریفہ کی برکت سے وہ فسادات دفع ہو گئے تو پھر نتیجہ یہی ہوا کہ یہ لوگ نیکی و اصلاح کے بعد فساد برپا کرنے والے ہیں۔ (**کذا فی تفسیر ابی اللیث**)

قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ یہ جملہ کا جواب اور ناصح کا علی سبیل المبالغہ رد ہے اب اس عبارت کا معنی یہ ہوا کہ ہمیں ایسی نصیحت کرنا بے سود ہے کیونکہ ہمارا کلام تو اصلاح کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور ہمارا حال فساد کی ملاوٹوں سے بالکل پاک اور مبرا ہے اور ان کا یہ جواب اس لیے تھا کہ انہیں اپنا فساد بصورتِ اصلاح معلوم ہوتا تھا کیونکہ ان کے قلوب فساد کے مرض میں مبتلا تھے جیسا قرآن مجید پاک میں ہے:

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا (تو کیا جس کا برا عمل ایسا سنگارا گیا کہ جسے وہ اچھا سمجھتا ہے) اسی لیے انہوں نے اپنے فعل کو فساد پر محمول کرنے کا انکار کرتے ہوئے اس کے لئے خالص اصلاح کا دعویٰ کر دیا۔

ف: اس جملہ میں اِنَّمَا زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ کی طرح **قصر الموصوف علی الصفۃ** ہے۔ ابن التمجید فرماتے ہیں کہ جب انہیں مسلمانوں نے کہا: لَا تُفْسِدُوْا تو انہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ فساد و اصلاح میں خلط و ملط رکھتے ہیں تو ان کے جواب میں کہہ دیا کہ ہم تو صرف اصلاح کے کاربند ہیں۔ اصلاح سے ہم تجاوز کر کے افساد کی طرف جاتے بھی نہیں ہیں۔ جب ہمارا یہی کام ہے تو ہم میں لزوماً خلط نہ رہا ان کی یہ

تقریر قصر الافراد کے قبیل سے ہوگی کیونکہ یہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مسلمان ہمارے لیے افساد واصلاح کے مابین شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے اس خیال کے جواب میں خداوند قدوس نے فرمایا:

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ خبردار! اے مسلمانو! جان لو کہ بیشک وہ لوگ فساد کرنے والے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے لیے ان دونوں صفات میں سے ایک کا اثبات اور دوسری کی نفی کر کے اس کا اعتقاد ظاہر کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتقاد کا عکس کر کے جس بات کی اثبات کر رہے ہیں اس کی نفی کی اور جس کی وہ نفی کر رہے ہیں اس کا اثبات فرمایا۔ اب معنی یہ ہوا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو فساد میں ڈالنے اور لوگوں کی ایمان سے ہٹانے والے ہیں یہ تو فساد سے نکل کر اصلاح کی طرف جاتے بھی نہیں۔ یہ تقریر قصر الشئی علی الحکم سے ہوگی بس یہ لوگ فساد سے گزر کر دوسری طرف چل بھی نہیں سکتے اس لیے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سوا اور کوئی مفسد بھی نہیں۔ اس کے بعد استدراکا فرمایا وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ اور لیکن انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ہم مفسد ہیں۔ باوجودیکہ انہیں امور محسوسہ کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ تم مفسد ہو لیکن ان میں ایسی حس نہیں کہ جس سے انہیں اپنا فساد محسوس ہو سکے۔

ف: شیخ صاحب اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ شعور کو افساد کے بالمقابل لانا نہایت موزوں ہے کیونکہ ان کا افساد عادۃً کالمحسوس ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے مسلمانوں کی شرافت اور منافقین کی شرارت کا ثبوت ملا۔ منافقین نے جو اعتراضات مسلمانوں پر کیے ان کا جواب خود دیا۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے کہ جب ولید بن مغیرہ نے آپ کو کہا کہ آپ مجنون ہیں تو اس کے قول کی نفی میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ تم اپنے رب کی نعمت کی وجہ سے مجنون نہیں۔ پھر اس ملعون کی مذمت میں فرمایا:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ

یعنی وہ بد بخت حلاف ہے حقیر عیب دار ہے لوگوں کے پاس چغل خوری کی غرض پر جاتا ہے مال کے لیے بخیل اور ظالم وفاجر غلیظ القلب اور خشک انسان ہے علاوہ ازیں ولد الزنا (حرام زادہ) ہے۔ اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بمقتضائے قول باری تعالیٰ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا جس نے خداوند قدوس کو اپنے

معاملات کا کفیل کار سمجھ لیا تو پھر اللہ تعالیٰ بھی آپ کے جملہ امور کی کفایت فرماتا ہے جیسا کہ اہل حقائق فرماتے ہیں کہ خوارق عادات اقطاب اور خلفاء سے بہت سے کم صادر ہوتے ہیں بلکہ زیادہ تر ان کے وزراء اور خلفاء سے صدور ہوتا ہے کیونکہ وہ تو عبودیتِ تامہ میں مستغرق اور فقرِ کلی کے ساتھ موصوف ہوتے ہیں اسی لیے وہ اپنے لیے تصرف کرتے ہی نہیں اور اقطاب کے کمالات اور جو اللہ تعالیٰ کے ان پر الطاف ہوتے ہیں من جملہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہیں جہلاء کی صحبت میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ انہیں علماء، ادباء، امنا کی صحبت نصیب فرماتا ہے۔ پھر یہی لوگ ان کے بار اٹھاتے ہیں اور ان کے احکام واقوال کا اجراء کرتے ہیں ان کی مثال کے لئے آصف بن برخیاء حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر کا واقعہ ہی کافی ہے کہ وہ اس وقت اپنے زمانہ کے قطب اور متصرف فی الامور اور اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اس سے جو ظاہر ہوا وہ ہر ایک کو ہی معلوم ہی ہے کہ بلقیس کا بہت بڑا تخت لے آئے جیسے کہ قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ان دونوں آیتوں وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ کی تحقیق میں اشارہ فرمایا کہ انسان کو اگرچہ ابتداءً زمین کی خلافت کا اہل بنا کر پیدا کیا جاتا ہے مگر وہ ہوا وہوس اور صفات نفسانیہ سے مغلوب ہو کر فساد کی طرف مائل ہو جاتا ہے اسی لیے ملائکہ نے اس کے متعلق کہا: قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا پس شریعت کے اوامر ونواہی ہی سے معدنِ نفس کے چنگل سے نکل کر جوہر خلافت کا اہل بن جاتا ہے پس اہل سعادت تو وہ مومن ہیں جو داعی الی الحق کے فرمانبردار ہو کر اس کے اوامر ونواہی کے پابند ہو جاتے ہیں اور اہل شقاوت وہ کافر، منافق ہیں جو دین سے خروج کر کے نفس کی خواہشات کے خوگر ہو جاتے ہیں جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمیں فساد نہ ڈالو یعنی اپنی حسنِ استعداد وصلاحیت للخلافۃ فی الارض کو خواہشات نفسانیہ کی اتباع اور دنیا کے حصول کے حرص میں آخر ضایع نہ کرو تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تو مصلح ہیں پس اسی دھوکا میں وہ کسی کی نصیحت قبول نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

کسے را پندار در سر بود ۔۔۔ مپندار ہرگز کہ حق شنود

زعلمش ملال آید از وعظ ننگ　　　شقایق بباراں نروید زسنگ

ترجمہ: جس کسی کے دماغ غرور ہوتا ہے تو اس کے متعلق خیال نہ کرو کہ وہ سچی بات سنے گا اسے علم سے ملال پیدا ہوگا اور اسے وعظ سے بدنامین پیدا ہوگی پتھروں کے نیچے باوجود بارش ہونے کے بھی گلِ شقایق نہیں اُگتا۔

ان کے اس غلط خیال کی اللہ تعالیٰ نے تکذیب فرمائی اور فرمایا: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ یعنی آخرت کی بہتری کو دنیا کی بہتری سے خراب کرتے ہیں۔ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ یعنی انہیں اپنے حال کو ضائع کر دینے اور برے اعمال اور بہت بڑے وبال جو کہ اچھے فعل کو خراب کرتا ہے اور پھر اس پر بہتری کے دعویٰ کرنے کا شعور بھی نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا الآیۃ (کیا ہم تمہیں ان لوگوں کی خبر نہ دیں جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارہ والے ہیں)

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

اے کہ خود را شیرِ یزداں خواندہ　　　سالہا شد باسگے در ماندہ

چوں کند ایں سگ برائے شکار　　　چوں شکار سگ شدستی آشکار

ترجمہ: اے فلاں! تو جو اپنے آپ کو خدا کا شیر سمجھتا ہے بہت عرصہ گزر گیا لیکن تا حال کتا ہی رہا، جب تجھے کتا شکار کرتا ہے تو پھر تو کتے کے شکار کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔

تفسیر عالمانہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا یعنی جب مومنین کو جانب سے انہیں بطریق امر بالمعروف ونہی عن المنکر (جو کہ نصیحت کا اتمام اور رہبری کا اکمال ہے) کہا جاتا ہے کیونکہ ایمان کا کمال ان دونوں چیزوں سے ہوتا ہے یعنی جو چیز بندہ کے شایاں نہیں اس سے اعراض کرنا، وہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ میں بیان کیا گیا اور جو چیز حاصل کرنے کے لائق ہے اسے اٰمِنُوْا میں بیان فرمایا ہے۔

نکتہ: مومن بہ کو بیان نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود بخود ظاہر ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ۔

ف: اٰمِنُوْا بمعنی افعلوا الایمان ہے۔

كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یہ کاف محلاً منصوب ہے بایں معنی کہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اب عبارت یوں ہوگی: آمنوا مماثلا لایمانھم یعنی ایمان لاؤ جو کہ مومنین کے ایمان کے مماثل ہو۔

یہ ما مصدریہ کافہ ہے یعنی ایمان کو محقق کرو جیسا کہ مومنین کا ایمان محقق ہے النَّاسُ میں الف لام جنس کا ہے یعنی وہ لوگ جو کامل فی الانسانیۃ اور عامل بمقتضاء العقل ہیں یا الف لام عہد کا ہے اور اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ مراد ہیں یا ان منافقین کے دوست مراد ہیں یعنی ان کے ہم جنس لوگ جیسے عبداللہ بن سلام اور اس کے اصحاب رضی اللہ عنہم اب معنی اس طرح ہوگا کہ وہ ایمان لاؤ جو کہ خالص نفس اور نفاق کی ملاوٹوں سے پاک وصاف اور مومنین کے ایمان کے مماثل ہو یعنی امر بالمعروف سے بالمقابل صاف صاف انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں: قَالُوٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اس جملہ میں ہمزہ انکار کا ہے اور لام کا مشار بہا الناس الکاملین ہیں یا معہودین یا مطلق مومنین اور وہ بھی ان کے گمان فاسد کی بنا پر ان میں داخل ہیں۔ السفہ بمعنی خفۃ العقل اور سخافۃ رائی۔ یہ دونوں چیزیں قصور عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بالمقابل الحلم و الاناۃ مستعمل ہوتے ہیں اور مومنوں کو اس صفت کی منسوب کر رہے ہیں باوجودیکہ وہ حضرات رشد وہدایت ووقار کے انتہائی مراحل طے کیے ہوئے ہیں وہ اس لیے کہ ان لوگوں کے نفوس کمال وجہ کے ساتھ سفاہت میں منہمک اور گمراہی میں غرق ہیں اور وہ برے اعمال کو اچھے سمجھنے والے لوگ ہیں پس جو شخص گمراہی کو ہدایت اور ہدایت کو گمراہی سمجھتا ہو اس کا کیا علاج ہے؟ یا مومنین کو ان کی حقارت کی وجہ سے سفاہت سے منسوب کرتے تھے کیونکہ اکثر مومنین فقراء تہی دست تھے بلکہ بعض ان میں سے ملوک تھے جیسے حضرت صہیب اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما اور محض تکبر اور مومنین کی شان میں لاپرواہی کرتے ہوئے کہہ دیا۔ یہ اس وقت ہوگا جب النَّاسُ سے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان جیسے صحابہ مومنین مراد ہوں (رضی اللہ عنہم)

سوال: جب وہ کھلم کھلا قَالُوٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ کہہ رہے ہیں تو پھر ان کو منافق کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

جواب۔ منافقین لعنہم اللہ تعالیٰ یہ قول اپنے دل میں کہتے نہ کہ زبان سے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے راز فاش فرماتے ہوئے ان کے بھید ظاہر فرما دیے تاکہ ان کی عداوت کی آگیں سرد ہو جائے۔ اس کی مثال مومنین کا حال ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حسن کلام (جو کہ ...) ... [illegible]

ظاہر فرمادیا۔ جیسا کہ سورہ دھر میں فرمایا یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ یَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا۝ وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا حالانکہ یہ قول مومنین کے دل میں تھا، انہوں نے زبان سے کہا تھا مگر خداوند قدوس نے ان کی عزت افزائی اور ان کی شان کو بلند فرماتے ہوئے ظاہر فرمادیا یہ قول صاحب تیسیر کا ہے۔

۲۔ یہ قول منافقین آپس میں کہتے اور مومنین سے بالکل مخفی رکھتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو مطلع فرمادیا۔ یہ قول مفسر بغوی کا ہے۔

۳۔ ابو السعود تفسیر الارشاد میں فرماتے ہیں کہ یہ قول اگرچہ مومنین کے سامنے ظاہر بھی ہو گیا ہو جبکہ انہیں نصیحت کی گئی اور ان کی نصیحت کے جواب میں یہ کہہ دیا ہو تب بھی ان کی منافقت میں فرق نہیں آتا اور نہ ہی انہیں مجاہر کہا جاسکتا ہے کیونکہ کفر کے اقسام ہیں یہ ایک عجیب قسم اور اس کے فنون میں سے ایک عجیب فن ہے کہ اس میں بھی شر کا احتمال ہے اور خیر کا بھی یوں محمول کیا جاسکتا ہے کہ منافقین نے مومنین کو نصیحت کے جواب میں کہا کہ ہم اچھے لوگوں کی طرح ایمان لانے والے ہیں نہیں اور منافقت کی جو تم ہمیں تہمت لگاتے ہو اس سے ہم بری ہیں نہ ہی ہم سفہاء کی طرح ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی پاگلوں کی طرح۔

۴۔ ناصحین کو نصیحت کرنے کے بعد منافقین نے استہزاء کیا۔

۵۔ ریا کرتے ہوئے جواب دیا اس میں ان کا ارادہ خیر بیان کرنے کا تھا اور مومنین تو انہیں پہلے معنی کی وجہ سے ایمان کا حکم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید یوں فرمائی۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ یہی لوگ بیوقوف ہیں، بے وقوفی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنے نقصان کو معلوم نہیں کر سکتے اور مومنین چونکہ ایمان واخلاص کی وجہ سے بیوقوفی سے دور ہو کر علم وحق میں راغب ہیں یہ بنی اسرائیل کے علماء اور ان کے متبعین کا وصف ہے اس جملہ میں ان کے رد اور ان کی جہالت بیان کرنے میں بڑا مبالغہ ہے کیونکہ وہ جاہل جو خلاف واقعہ پر اپنی جہالت پر جما ہوا ہو وہ اس بیوقوف اور معترف بالجهل سے زیادہ گمراہ اور جہالت میں زیادہ مکمل ہے کیونکہ واقف معترف بالجهل کو معذور سمجھا جاتا ہے اور کبھی اسے آیات وعیدات نفع دے دیں گے۔

ف: پہلی آیت وَمَا يَشْعُرُونَ میں ان کی حس کی نفی ہے اور دوسری آیت میں دانائی کی (کہ جس میں صلاح وفساد کے مابین تمیز کی جاتی ہے) اور تیسری آیت میں علم کی نفی ہے اور ان تینوں کی اس طرز سے نفی کرنے میں ایک لطیف اور دقیق معنی پیدا ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے:

۱۔ حس کی نفی تو بدیہی ہے کہ ان کی دھوکا سازی کمال درجہ کی جہالت ہے جو کہ ان کی حس نہ ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ اور دوسری بات میں انہیں پتا نہیں چلتا، اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس بات کا پتہ نہ چلنا انہیں لازم ہے کیونکہ جسے حس نہ ہو تو اس سے دانش خود بخود مفقود ہو جاتی ہے۔

۳۔ تیسری آیت میں علم کی نفی فرمائی۔ یہ بھی اس ملازمہ کی بدولت کہ جسے دانش نہیں اسے علم کی دولت سے بھی محرومی ہوتی ہے۔

مکالمہ جبریل و آدم علی نبینا وعلیہم السلام

جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کو پیدا فرمایا تو جبریل ان کے پاس تین تحفے لائے: ۱۔ علم ۲۔ حیا ۳۔ عقل اور فرمایا: اے آدم! ان تینوں میں جسے دل چاہے اختیار کرو۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عقل کو اختیار فرمالیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے علم وحیا کو اشارہ کیا کہ تم اپنے اپنے مقامات پر واپس چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا عالمِ ارواح میں ہم یکجا تھے اب عالم اشباح میں ایک دوسرے سے جدائی گوارہ نہیں فلہذا اب ہم عقل کے پیچھے ہوتے ہیں جبریل علیہ السلام نے فرمایا: اچھا چلو جاؤ۔ آدم علیہ السلام کے دماغ میں عقل ٹھہر گئی اور دل میں علم اور آنکھ میں حیا۔ مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں: ؎

جملہ حیوان را پئے انسان بکش　　جملہ انسان را بکش از بہر ہُش

ہُش چہ باشد عقل کل ہوشمند　　ہوش جزی ہش بود اما نزند

لطف او عاقل کند مر نیل را　　قہر را ابلہ کند قابیل را

ترجمہ: تمام حیوانات کو انسان پر اور تمام انسانوں پر ہوش پر قربان کیجئے۔ ہوش کیا ہے؟ ہوشمند کی عقل اور وہ ہوش حقیقی کا جز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم نیل کا عاقل بنا دیتا ہے ایسے ہی اس کا قہر قابیل کو بیوقوف بناتا ہے۔

سبق: عاقل کو چاہیے کہ علم ومعرفت کے حصول میں جلدی کرے تاکہ ان کی بدولت توحید الفعل والصفۃ کے

مرتبہ کو پائے۔

ف: امام قشیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: عقل کے نجوم شیطان کے لئے رجوم اور علوم کے لئے چانداور اصل قلب کے انوار واستبصار اور معارف کے سورج ہیں اوران کا عارفین کے اسرار پر طلوع ہے۔

ف: علم لدنی وہ ہے جوکسی خارجی سبب مالوف کے بغیر بیتِ قلوب میں تشریف لائے اور قلب کے دو دروازے ہیں ایک الی الخارج جو کہ حواس سے علم حاصل کرتا ہے اور دوسرا الی الداخل جو الہام کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے دل کی مثال اس حوض جیسی ہے جس میں پانچ نہریں جاری ہوتی ہیں جب تک اس میں نہروں سے پانی پہنچتا رہے گا پانی میلا کچیلا ہوگا بخلاف اس صورت کے کہ اس کا پانی اس کی گہرائی سے لیا جائے تو وہ پانی صاف شفاف ہوگا اسی طرح دل کا حال ہے کہ جب اسے حواس ظاہرہ سے علم ہوتا ہے تو اس میں میل کچیل اور شک وشبہ کی ملاوٹ ہوتی ہے بخلاف اس کے کہ جب اسے صمیم قلب سے بطریق فیض کے حاصل ہو تو وہ نہایت صاف اور افضل واعلیٰ ہوتا ہے اور شیخ زین الدین الحافی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: بڑا تعجب ہے اس شخص کے لئے کہ وہ اس طریقہ میں داخل ہو اور ارادہ کرے کہ حقیقت کی طرف پہنچ جائے اور اسے وہ اصطلاحات بھی نصیب ہو جائیں کہ جن سے وہ قرآن وحدیث سے معانی کا استخراج کرسکتا ہے مگر باوجود اس کے پھر بھی ذکر اللہ ومراقبہ اعراض ماسواء اللہ میں مشغول نہیں تا کہ اس کے دل میں علم لدنیہ کی بارش ہو اگر اسی طرح ہزار برس صرف اصطلاحات کی تدریس وتصنیف میں بسر کرے تو نہ علوم لدنیہ کی خوشبو نصیب ہوگی اور نہ ہی ان کے آثار وانوار سے روشنی میسر ہوگی پس وہ شخص جو عالم بلا عمل ہے وہ عقیم ہے اور عامل بلا علم بیمار اور سقیم ہے اور عمل بالعلم صراطِ مستقیم ہے۔ مثنوی شریف میں ہے:

آنکہ بے ہمت چہ باہمت شدہ   وآنکہ باہمت چہ بانعمت شدہ

ترجمہ: بے ہمت باہمت کیا ہوگا، باہمت نعمت سے بہرہ ور ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ جب اہل غفلت ونسیان کو کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح ایمان لاؤ کہ وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کو بھلا چکے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ہمتوں اور اس کی آیات میں تدبر کرکے سنبھل کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدہ علی التوحید والعبودیۃ

پر ملازمت کر لی جس سے وہی مواعد و مواثیق یاد آ گئے۔ پھر انہوں نے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم (اور جو احکام آپ اپنے ساتھ لائے) پر ایمان لایا تو ان کو اہل شقاوت کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں سفہاء کی طرح اسی طرح غافلین مدعیانِ اسلام کو جب ایمان تقلیدی (جو کہ انہیں آباء واجداد سے وراثت میں ملا ہے) سے ایمان حقیقی کی طرف جو سچی طلب سے حاصل ہوتا ہے اور ترک محبت دنیوی اور ترکِ اتباع ہوا و ہوس اور رجوع الی الخلق اور باطل میں مشغلہ بازی سے چلا جاتا ہے تو اربابِ قلوب واصحاب کرامات عالیہ کو بیوقوفی اور جنوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور انہیں عجز و ذلت وقلت و مسکینی کی حالت میں پا کر حقارت سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم دنیا کو چھوڑ دیں جیسے ان سفہاء، فقراء نے ترک کر دی ہے پس ہم مخلوق کے محتاج رہیں جیسے کہ یہ لوگ مخلوق کے محتاج ہیں اور وہ اس بات سے لاعلم ہیں کہ دراصل وہی بیوقوف ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (خبردار وہی بیوقوف ہیں لیکن وہ نہیں جانتے) یہ لوگ دو وجھوں سے بیوقوف ہیں۔ ایک تو اس طرح کہ یہ لوگ دنیا کو دین میں اور باقی کو فانی کے عوض بوجہ اپنی بیوقوفی اور عدمِ رشد کے بیچتے ہیں۔ دوسرے اس طرح کہ انہوں نے اپنی عقل کو بیوقوفی میں ڈالا اور یہ نہ جانا کہ ان میں قربت ودرجاتِ علیاء کی حسنِ استعداد ہے اس بناء پر وہ حیوٰۃِ دنیا پر راضی ہو کر متقیوں کے مراتب اور عقل والوں کے مشارب سے منہ موڑ دیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ملت ابراہیمی سے بیوقوف ہی روگردانی کرتا ہے۔ کیونکہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا یعنی جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس نے غیر کو بالکل ترک کر دیا اور اہل اللہ و خاصانِ خدا کو پہچان لیا پھر نہ تو ان سے منہ موڑتا ہے نہ انہیں سفاہت کی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ جو فقراء ہیں دراصل وہی تحت آسمان بادشاہ ہیں اور ان کے چہرے اللہ کی بارگاہ میں سورج اور چاند کی طرح نورانی ہوتے ہیں لیکن عزت کے قبوں کے نیچے پوشیدہ اور غیروں کی نظروں سے محجوب ہوتے ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے:

مہر پاکاں درمیاں جاں نشاں ‏ ‏ ‏ دل مدہ الا بمہر دل خوشاں
گر تو سنگ صخرہ مرمر شوی ‏ ‏ ‏ چوں بصاحب دل رسی جوہر شوی
آنہم محبت قبائی آمنون ‏ ‏ ‏ جز کہ یزدانشاں نداند زآزمون

ترجمہ : نیک لوگوں کی محبت میں جان دے دے، دل صرف انہی کو دے جو خوش دل ہیں۔ اگر چہ تو سخت پتھر اور سنگِ مرمر ہے جب اللہ والوں کے ہاں حاضر ہو گا گوہر ہو جائے گا۔ وہ آمنون کی قبا میں مخفی رہتے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے ان کے حالات کو اور کوئی نہیں جانتا۔

تفسیر عالمانہ

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (ربط) اس آیت میں منافقین کے اس معاملہ کا بیان ہے جو کہ وہ مومنین اور کفار کے ساتھ کرتے تھے اور جو باتیں ان سے سرزد ہوئیں ان کا بیان ہے پس اس میں ان کے مذہب کا بیان اور ان کی منافقت کی تمہید ہے۔

ف: اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ آیت مضمون کے لحاظ سے مکرر نہیں یعنی جب مومنین کو دیکھتے ہیں اور ان سے ملاقات اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔

ف: الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد مہاجرین وانصار ہیں۔ قَالُوْٓا بطورِ جھوٹ کہتے ہیں اٰمَنَّا تمہاری طرح ہم ایمان لاتے اور تصدیق کرتے ہیں۔

شان نزول:۔ مروی ہے کہ ایک دن عبداللہ ابن اُبی رئیس المنافقین اور اس کے ساتھی شہر سے باہر نکلے۔ اُدھر صحابہ کرام بھی تشریف لا رہے تھے۔ عبداللہ بن ابی اپنے ساتھویں کو کہنے لگا: دیکھئے میں ان سفہاء کو تم سے کیسے ہٹاتا ہوں۔ چنانچہ صحابہ کرام قریب ہوئے تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑ کر خوشامد کرنے لگا کہ مرحبا، مرحبا! صدیق آپ ہیں بنی تمیم کے قبیلہ کے سردار اور شیخ الاسلام اور ثانی فی الغار ہیں اپنے جان و مال کو اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نثار کرنے والے ہیں، پھر سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ایسے ہی کہنے لگا کہ مرحبا! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور بنی ہاشم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام کے سردار ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ”اے عبداللہ! خدا تعالیٰ سے خوف کر، منافقت چھوڑ دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک منافقین بدترین ہیں“ عبداللہ بن اُبی منافق نے کہا: ”اے ابوالحسن! بات نہ بڑھائیے، واللہ باللہ ہم آپ لوگوں کی طرح ایمان دار ہیں اور لوگوں کو اسلام کی تصدیق کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ“ جب وہ کمبخت اپنے دوستوں سے ملا تو کہتا تھا ”تم نے دیکھ لیا میں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے! اب تم بھی جب ان سے ملو تو ایسا ہی کیا کرو“ اس کے ساتھی اس

کی تعریفیں کرتے ہوئے کہتے تھے کہ خدا کرے جب تک زندہ رہو عیش وآرام سے بسر کرو۔ جب مسلمان حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں واپس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا ماجرا سنایا جس پر یہی آیت اتری۔

وَاِذَا خَلَوْا اور جب وہ اپنی خلوت گاہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اِلٰی بمعنی مع ہے یا یہ معنی ہے کہ جب خلوت میں جاتے ہیں۔ اب اِلٰی بمعنی باء یا مع کے ہوگا۔ اس محاورہ کے مطابق کہا جاتا ہے۔ خلوت بِفُلَانٍ اِلَیْهِ (میں فلاں کے ساتھ خلوت میں رہا) یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ متکلم کسی کے ساتھ خلوت میں جائے۔

اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ جو کہ تمرد وعناد میں ان کے ہم مثل ہیں اور ان کی طرح کفر کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ شیاطین کی اضافت منافقین کی طرف مماثلت فی الکفر کی وجہ سے ہے یا شیاطین سے مراد ان کے سردار ہیں اور قائلین ان کے چھوٹے اور ہر متمرد کو شیطان کہا جاتا ہے۔ امام ضحاک فرماتے ہیں کہ شیاطین سے مراد ان کے کاہن ہیں وہ کاہن بنی قریظہ میں کعب بن اشرف اور بنی اسلم میں ابو بردہ اور جُہینہ میں عبدالدار اور بنی اسد میں عوف بن عامر اور شام میں عبداللہ بن سوداء تھے اور اہل عرب کا ان کے حق میں یہ اعتقاد تھا کہ یہ لوگ غیب پر مطلع ہیں اور پوشیدہ اسرار کو اچھی طرح جانتے اور مریضوں کا علاج کرتے ہیں عرب میں ایسا کوئی کاہن نہ تھا جس کے ساتھ ایک شیطان نہ ہو، جو اس کی طرف کہانت کا القاء نہ کرتا ہو اور ان کا قرآن نے شیطان نام اس لیے رکھا کہ یہ لوگ حق سے دور تھے اور شیطان کا اشتقاق بھی شطون سے ہے بمعنی بُعد (کذافی التیسیر)

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے دین واعتقاد کے موافق ہیں یہاں تک کہ تم میں سے ہم کسی حال میں جدا نہیں ہوں گے۔ ان کی اس تقریر گویا ان پر اعتراض ہوا کہ جب تم لوگ ہمارے ساتھ ہو تو پھر مومنین کے کلمہ شہادت پڑھنے اور ان کی مجلسوں اور مسجدوں میں آنے جانے اور ان کے ساتھ حج کرنے اور جنگ کے لئے جانے میں کیا فائدہ؟ تو ان کے جواب میں کہتے ہیں اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ یعنی مومنین کے ہاں ایمان ظاہر کر کے ہم ان سے استہزاء کرتے ہیں یہاں تک کہ اس وقت ہمارے دلوں میں ایمان کی حقیقت کا خیال بھی نہیں گزرتا۔ انہیں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ظاہراً وباطناً تمہارے ساتھ ہیں حالانکہ ہم ان کے ساتھ صرف ظاہر میں ہیں تاکہ ہم ان سے اموال غنیمت اور ان کی لڑکیوں سے شادیاں اور ان کے پوشیدہ اسرار

سے مطلع اور ان سے اپنے اموال واولاد اور عورتوں کی حفاظت کر سکیں۔

حل لغات: الاستھزاء بمعنی دوسرے کو جاہل سمجھنا اور اس سے مسخری کرنا اور حقیر سمجھنا۔ اب معنی ہوں ہوا کہ ہم اپنا اسلام ظاہر کر کے حضور علیہ السلام اور ان کے اصحاب کو جاہل سمجھ کر ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی مذکورہ تقریر کے رد میں فرمایا: **اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ** یعنی اللہ تعالیٰ انہیں استہزاء کی سزا دے گا یا یہ کہ اس استہزاء کا وبال ان کی طرف لوٹے گا پھر وہی استہزاء کیے ہوئے ٹھہریں گے یا ان پر حقارت وخرابی نازل ہوگی جو کہ استہزاء کو لازم ہے یا ان کے ساتھ مُسْتَھْــــزِی جیسا معاملہ کیا جائے گا یا دنیا میں ان پر مسلمانوں کے احکام جاری کر کے چند روز مہلت دے کر اور نعمتوں میں زیادتی کر کے ان کی سرکشی وطغیانی کر بڑھاتا ہے آخرت میں ان کے ساتھ ایسے ہی ہوگا۔

چنانچہ مروی ہے کہ جب یہ لوگ دوزخ میں ہوں گے تو ان کے لئے بہشت کا دروازہ کھولا جائے گا یہ لوگ بہشت کی طرف دوڑیں گے جب بہشت کے قریب پہنچیں گے تو دروازہ بند کرلیا جائے گا پھر ان کو دوزخ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ مومنین تخت پر بیٹھ کر ان کی اس حالت کو دیکھ کر ہنسیں گے جیسا کہ وہ یہ لوگ دنیا میں مومنین پر ہنستے تھے۔ یہ فعل ان کے ساتھ دنیا کے فعل کے عوض ہوگا۔ اور اسی طرح ان کے ساتھ کئی بار کیا جائے گا۔

وَیَمُدُّھُمْ ان کو بڑھائے گا اور قوت دے گا۔

حل لغات: مَدَّ الْجَیْش و اَمَدَّہٗ سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جبکہ لشکر کو قوت ہو اَمدّ فی العمر (یعنی عمر میں زیادتی کرنا) سے ماخوذ نہیں کیونکہ وہ اُمْلِیْ لَھُمْ کی طرح لام سے متعدی ہوتا ہے۔ اسی پر ابن کثیر کی قرأت دلالت کرتی ہے۔

فِیْ طُغْیَانِھِمْ اس کا متعلق یَمُدُّھُمْ ہے اور طُغْیَان بمعنی امر میں حد سے تجاوز کرنا اس سے سرکشی میں ان کی زیادتی اور ان کا کفر میں غلو کرنا مراد ہے اور طغیان مضاف ہونے میں اس طرف اشارہ ہے کہ سرکشی ان کے ساتھ مخصوص ہے اور اس بات کی تائید ہے کہ ان کے برے اختیار کی وجہ سے انہیں مہلت دی گئی ہے۔

یَعْمَھُوْنَ یعنی گمراہی میں حیران پھرتے ہیں یہ دنیا میں ان کو استہزاء کی سزا ہے اور **ھُمْ** ضمیر منصوب یا مجرور سے حال ہے کیونکہ مصدر مضاف ہے اور وہ حکماً مرفوع ہے اور اَلْعَمَـــہُ بصیرت کا اندھاپن، جیسے عُمیٌ کا

بصارت کا اندھاپن۔ بصیرت کا اندھاپن بمعنی تحیر اور تردد ہے، بایں حیثیت کہ اسے علم نہ ہو کہ وہ کہاں جارہا ہے

تفسیر صوفیانہ ان دونوں آیتوں میں اشارات ہیں قولہ تعالیٰ اِنَّا مَعَکُمْ یہ کہ شخص اپنے ارادہ اور لوگوں کی جبلی عادت کو جمع کرنا چاہے تو یہ محال ہے کیونکہ: اَلضِّدَّانِ لَا یَجْتَمِعَانِ (دو ضدیں کبھی جمع نہیں ہوتی) جس کے ہر طرف دوست ہوں اور اس کا ہر سو دل کا تعلق ہو تو اس کے کئی تصورات ہوں گے اور علائق میں بٹ جائے گا۔

یہی حال منافقین کا ہے کہ وہ ہمیشہ تردد میں رہتے ہیں کفار کے ساتھ رہ کر ان کے مفاسد اور مسلمانوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ کر ان کی بھلائیاں جمع کرنا چاہتے ہیں اور یہ محال ہے جیسے اجتماع النقیضین محال ہے، بنابریں بیچارے دار اور دروازے کے درمیان پھنس رہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ

اسی طرح ان دونوں کا ہے جو چاہتے ہیں لیکن عادت کو نہیں چھوڑتے۔ مقاصدِ دارین کے طالب ہوتے ہیں اور دن کے مراتب کے متمنی ہوتے ہیں لیکن دنیا کی خواہشات میں تر بتر رہتے ہیں اس وجہ سے اپنے مقاصد میں پورے نہیں اترتے۔

حدیث شریف: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ الدِّيْنَ بِالْمُتَمَنِّي (دین صرف آرزو کرنے سے نہیں حاصل ہوتا)

اور فرمایا: بُعِثْتُ لِرَفْعِ الْعَادَاتِ وَدَفْعِ الشَّهَوَاتِ (میں عادات کو بلند کرنے اور خواہشات کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوا ہوں)

حدیث شریف: حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:۔

الدنیا والاخرہ ضرتان (دنیا و آخرت آپس میں سوکنیں ہیں)

جو شخص ان دونوں کو جمع کرنا چاہے وہ دھوکا میں ہے اور فریب خوردہ ہے اور جو شہوت رانی کر کے بلند درجات تک پہنچنے کا خواہش مند ہے اسے مسخرہ سمجھو جو اس راہ پر چلنے کے ساتھ استہزا کرتا ہے نقصان اٹھاتا ہے بہت سے اس راہ پر چلنے والے اس دریا میں غرق ہوئے اللہ تعالیٰ دنیا کے حرص رکھنے والوں کو مہلت دیتا ہے یہاں

تک کہ اس کی طلب میں حد احتیاج سے متجاوز ہو کر دنیاوی مقاصد کے دروازوں پر دستک دینے میں منہمک ہوتے ہیں جس قدر زیادہ دنیاوی امور میں انہماک ہوتا ہے اسی قدر ان کی طلب میں حیران رہتے ہیں۔

کما قال اللہ تعالیٰ: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (بیشک انسان سرکش ہے یہ کہ اسے دیکھا تو بے پرواہ ہو گیا) اس لیے دنیا کی طلب میں قسم قسم کے حیلے کرتے ہیں اس کی سزا استہزاء ہے اور استہزاء کی سزا رسوائی اور مہلت دنیا ہے جس کی وجہ سے وہ سرکشی میں پھنسے اور سرکشی کی سزا حیرانی ہے جو ہمیشہ گمراہی میں حیران پھرتے ہیں جنہیں باطل سے نکلنا اور حق کی طرف رجوع کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ف: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ میں ایک اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مومنین کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا مرتبہ ہے بایں معنیٰ کہ کفار کا ان سے استہزاء کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم لگایا ہے کہ انہیں کفار کے استہزاء کے جواب کے لئے معارضہ کی ضرورت نہ پڑے مومنین کی طرف سے استہزاء کا معاملہ ایسا اتم فرمایا کہ جس کے بعد اس سے اور کوئی مزید بلیغ استہزاء نہیں ہے حالانکہ کسی دوسرے سے استہزاء سے روکا ہے کما قال: لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (کوئی قوم کسی دوسری قوم سے استہزاء نہ کرے) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں استہزاء کو جہالت سے تعبیر فرمایا کما قال: قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (انہوں نے کہا کیا آپ ہمارے ساتھ استہزاء کرتے ہیں) اور فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (میں پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں سے ہو جاؤں)

ف: جب لوگوں سے استہزاء قبیح امر ہے پھر اللہ تعالیٰ سے استہزاء کس قدر قبیح ہوگا۔

حدیث شریف: میں ہے: اَلْمُسْتَغْفِرُ مِنَ الذَّنْبِ وَهُوَ مُصِرٌّ عَلَيْهِ كَالْمُسْتَهْزِئِ بِهٖ (جو گناہوں کی معافی مانگنے بعد پھر اس پر اصرار کرے تو یوں سمجھو کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے استہزاء کیا) تیسرا اشارہ یہ بھی ہے کہ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ سے بتایا گیا ہے کہ بندوں کے لئے لائق نہیں کہ وہ اپنی لمبی لمبی عمروں سے فریب خوردہ ہوں اور مال و اولاد کی زیادتی سے دھوکا کھائیں۔ چنانچہ طویل العمر اور کثیر المال والاولاد دشمنوں کے لئے فرمایا ہے۔ چنانچہ: وَيَمُدُّهُمْ یعنی ان کی عمریں بڑھا دیتا ہے اور اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ یعنی وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کرتے ہیں۔

پھر جتنی زیادتی ہو جائے گی اسی قدر سزا زائد ہوگی۔ کما قال: وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (دنیا میں اپنے دشمن کا مال بڑھاتا ہے) کما قال: مَالًا مَّمْدُوْدًا (مال بڑھا ہوا) (اور اپنے دوستوں کے لئے بہشت کے باغات بڑھائے گا) کما قال: وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (اور سائے دراز)

قصہ معراج کا ایک عطیہ:۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی شب معراج میں فرمایا کہ یہ بھی ایک نعمت ہے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگوں کی عمریں چھوٹی بناؤں گا تاکہ ان کے گناہ زیادہ نہ ہوں اور ان کے مال تھوڑے کردوں گا تاکہ قیامت میں ان کا حساب لمبا نہ ہو اور سب سے پیچھے انہیں اس لیے بھیجا تاکہ قبروں میں انہیں زیادہ دیر نہ رہنا پڑے۔

معراج میں حضور کو حکم ربانی:۔ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ شب معراج میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اے محبوب! (صلی اللہ علیہ وسلم) اچھے لباس اور بہترین طعام اور اعلیٰ بچھونے سے احتراز فرمائیے اس لیے کہ نفس تمام برائیوں کا مرکز اور منبع ہے اسے نیکی کی طرف بلاؤ تو وہ برائی کی طرف کھینچتا ہے اور طاعت کے لئے تو اس کا جی چاہتا ہی نہیں۔ ہاں برائی کا شیدائی ہے اور جب سیر ہوتا ہے تو سرکشی کرتا ہے اور کثیر مال پاتا ہے تو تکبر کرتا ہے جو اچھی بات ہوتی ہے اسے بھلا دیتا ہے عیش و طرب میں غفلت کا خوگر ہے شیطان کا گہرا دوست ہے۔ (کذافی مشکوٰۃ الانوار)

تفسیر عالمانہ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وہ منافقین جن کے اوصاف شنیعہ بیان کیے گئے ہیں اب وہ لوگ اپنے ماسوا سے ایسے علیحدہ ہو چکے ہیں کہ گویا وہ موجود و مشاہد ہیں اور اس میں بُعد کا معنیٰ بوجہ ان کے سوء حال اور شر میں بُعد مرتبہ کے ہے أُولَٰئِكَ بوجہ مبتدا ہونے کے مرفوع ہے اور اس کی خبر الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ ہے۔

حل لغات: اشْتِرَاء دراصل مطلوبہ اشیاء کے حصول میں ثمن خرچ کرنے کا نام ہے۔ پھر اس چیز کے لئے استعارہ کیا گیا ہے جو قبضہ میں ہو۔ دوسرے چیز کے حاصل کرنے کے لئے، پھر اس سے بھی کچھ آگے وسعت دیتے ہوئے کسی شئے میں رغبت کرنا اس طمع پر کہ اس کے عوض کوئی دوسری چیز ملے گی، کے لئے استعمال کیا جاتا

ہے اور یہاں پر اشتراء سے ان کا وہ معاملہ مراد ہے جو ان کے حالات میں گزر چکا ہے۔

اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ ضلالت سے کفر اور حق وصواب کرنا مراد ہے۔ بِالْهُدٰى، هـــدیٰ سے ایمان اور سلوک فی الصــراط المستقیم اور اس پر استقامت پکڑنا مراد ہے۔ اس میں استعارہ کیا گیا ہے۔ یعنی ضلالت میں رغبت کرنے سے ایمان کی بجائے گمراہی لینا ہے اور پھر ایمان سے روگردانی کرنے کا مطلب لیا گیا ہے۔ یعنی انہوں نے ایمان کی بجائے گمراہی کو پسند کیا اور ایمان کو گمراہی سے تبدیل کر لیا اور ایمان کے بجائے گمراہی لے لی

سوال : انہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ کیا ہدایت ان کے ہاتھ میں تھی؟

جواب: استعارہ تو آپ سن چکے، استعارہ کا یہ معنی ہے کہ ہدایت حاصل کرنے کی انہیں قدرت تھی اور وہ وہی استعداد ہے جو ہر شخص میں رکھی گئی ہے پھر انہوں نے گمراہی کی طرف میلان کر کے ہدایت کو ضائع کر دیا۔ یعنی ہدایت کو ترک کر دیا اور باء معاوضات میں متروک شئے پر داخل ہوتی ہے۔

مسئلہ : اس سے ثابت ہوا کہ اگر ایجاب وقبول نہ بھی ہو تب بھی لینے دینے سے بیع ہو جاتی ہے کیونکہ ان لوگوں کو ترکِ ہدایت واخذ ضلالت پر مشتری کہا جا رہا ہے اگرچہ اس تبادلہ میں انہوں نے کوئی کلام بھی نہ کیا۔ کذافی التیسیر

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ یہ مجاز کے لئے ترشیح ہے یعنی انہوں نے اس تجارت میں نفع نہ پایا کیونکہ نفع کا اسناد تو درحقیقت اربابِ تجارت کی طرف ہوتا ہے اور اس میں خود تجارت کی طرف اسناد کرنا بہ بنائے توسع ہے کہ تجارت کو فاعل سے متلبس اور مشابہ کر کے فاعل کا حکم لگا دیا گیا یہاں تک اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ خود تجارت نفع ونقصان کا سبب ہے اور فاء کو اس لیے داخل کیا گیا کہ یہ کلام شرط کے معنی کو متضمن ہے دراصل عبارت یوں تھی و اذا شــروا فـما ربحوا (کواشی) (جب انہیں خریدا تو نفع نہ پایا) اور تجارت تاجروں کی ایک صنعت کا نام ہے جو نفع کے حصول کی غرض سے بیع وشراء کا کام کرتے ہیں اور ربح اس زیادتی کا نام ہے جو راس المال سے زائد ہوتی ہے۔

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ یعنی تجارت کے طریق پر وہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں کیونکہ تجارت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ راس المال بھی بچ جائے اور نفع بھی حاصل ہو۔ اگر ایک نفع دستیاب نہ ہو سکے تو دوسری بیع میں اصل کی بقاء کی وجہ سے جبراً نقصان ہو جائے گا لیکن جس کا اصل مال بھی ضائع ہو جائے اس کی تجارت کا ہے کی اور ان لوگوں نے تو

اپنے راس المال کو ہی ضائع کر رکھا ہے کیونکہ ان کا **راس المال فطرۃ سلیمہ** اور عقل خالص تھا جب انہوں نے ان گمراہیوں کا اعتقاد اپنے میں راسخ کر لیا تو ان کی استعداد باطل اور عقل ختم اور سرے سے راس المال ہی نہ رہا جس سے وہ حق و کمال کو پہنچ کر کچھ فائدہ مند ہوں۔ لیکن اس لحاظ سے وہ خاسر ہو کر اپنے نفع سے ناامید ہو گئے اور اصل کو گم کرتے ہوئے تجارت کی راہ سے ہزاروں کوس دور جا پڑے۔

نکتہ : مہتدی: وہ ہے جو دنیا اور خواہشِ نفسانی ترک کر کے طاعت وعبادت میں مشغول ہو، نہ وہ جو کہ نفسانی خواہش کا حکم کرے تو اس پر عمل کر کے ہدایت کو خواہش سے مخلوط کر دے۔

حکایت: شیخ استاذ ابی علی وقاص رضی اللہ عنہ کا ایک دولت مند تاجر مرید تھا وہ بیمار ہو گیا، شیخ صاحب اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور بیماری کا سبب پوچھا، عرض کی، حضور! رات کو تہجد کی ادائیگی کا ارادہ ہوا اور اٹھ کر وضو کرنے کا قصد کیا تو گرمی کے آثار نمودار ہوئے اور اب یہاں تک نوبت ہے کہ مجھے سخت بخار ہے۔ شیخ نے فرمایا: بیٹے! فضول بات سے بچو، تجھے ایسی تہجد فائدہ نہیں دے گی جب تک کہ تم دنیوی معاملات کو ترک کر کے دنیا کی الفت دل سے خارج نہ کرو گے اب تیرے لیے پہلے یہ ضروری ہے، پھر نوافل ادا کرو۔ درد سر کے اندر ہو اور دوا پاؤں پر ملتے رہو، اسی طرح ہاتھ کو نجاست لگی ہو اور دامن وغیرہ کو دھوتے رہو تو اس سے کے فائدہ! ایسے ہی تم اپنا حال سمجھو۔

ف: بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ خواہشات کی ایک علامت یہ ہے کہ بندہ خیرات ونوافل میں تو تیز ہو مگر واجبات کے حقوق میں سست ہو اور یہ حالت عام مخلوق میں ہے (مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے) چنانچہ تم خود ہی تجربہ کر لو کہ بعض صاحبان ایسے ہوتے ہیں کہ نوافل وادراد غیر واجبہ (جو سخت سے سخت ہوں گے) کی ادائیگی میں بڑے چست وچالاک ہوں گے مگر ضروری فرض کی ادائیگی میں کماحقہ دلچسپی نہیں ہوگی۔ عاقل کو چاہیے کہ اولاً راس المال کو حاصل کرے پھر اس نفع کے حصول میں کوشش کرے کہ جو کہ اصل راس المال سے حاصل ہو اور یہ عمل اختیاری ہے نہ یہ اضطراری اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے معاملہ میں سست و کمزور دیکھ کر اپنی طاعت وعبادت فرض فرمائی ہے کیونکہ انہیں اس کی اطاعت وعبادت کی طرف لے آنے والی کوئی ایسی شے نہیں جو انہیں مجبور کر کے لے آئے لیکن یہ حال اکثر مخلوق کا ہے ہاں اہل اللہ واولیاء کرام اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

اختیار آمد عبادت را نمک — ورنہ میگردد بنا خواہ ایں فلک

گردش او را نہ اجر و نہ عقاب — کہ اختیار آمد ہنر وقتِ حساب

ائتیا کرھا مہار عاقلاں — ائتیا طوعا بہارِ عاشقاں

ایں محب دایہ لیک از بہر شیر — واں دگر دل دادہ بہر آں ستیر

ترجمہ: اختیاری معاملہ عبادت کو فائدہ دیتا ہے ورنہ افلاک تو شب و روز عبادت میں گھوم رہا ہے۔
لیکن بے اختیار ہو کر افلاک کی گردش پر نہ ثواب نہ عذاب اس لیے کہ اختیار سے ہی عبادت لکھی جاتی ہے۔

ائتیا کرھاً (مجبور ہو کر آؤ) عاقلوں کی مہار اور **ائتیا طوعاً** (خود بخود آؤ) عشاق کی دام ہے۔ بچہ دایہ کا عاشق ہے لیکن صرف دودھ کے لئے اور وہ اپنے محبوب کا دائمی عاشق ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ پر اپنی اطاعت واجب فرمائی ہے اور دراصل اس پر طاعت واجب فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بہشت میں داخل ہو کیونکہ اس امر کا مرجع بہشت ہی ہے اور یہ اسباب عدمیہ ہیں اور نفس کی ہمیشہ یہی عادت ہے کہ اچھی باتوں سے ہٹ کر برے کام میں مشغول ہوتا ہے جسے خواہش ہو کہ اسے اللہ تعالیٰ اس خواہشِ نفسانی سے محفوظ رکھے جو نیکیوں سے باز رکھنے والی ہے اور اس غفلت سے بچالے جو اسے بہترین حالات سے دور رکھتی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قادرِ قدیر ہے کہ وہ قادرِ قدیر کی بارگاہ میں گڑگڑائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا** (اور اس کی قدرت ہر شے سے متعلق ہے) اور اس کی نیکی کو پالینا بھی ایک شے ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرمادے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے یہ مقام حاصل ہو تو، تو اپنے جیسے لوگوں کو دیکھ کر انہوں نے ان مراتب کو کیسے حاصل کیا جیسے حضرت ابراہیم بن ادہم و فضیل بن عیاض و ابن المبارک و ذوالنون مصری و مالک بن دینا اور اسی طرح کے دیگر محرم رازِ حق (رضی اللہ عنہم) حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

عاشق کے شند کہ یار بحالش نظر نہ کرد — اے خواجہ درد نیست ورنہ طبیب ہست

ترجمہ: عاشق اپنے معشوق کے ہاں حاضر ہوا لیکن اس نے توجہ نہ فرمائی، اسے کہو کوئی حرج نہیں وردنہ ہوتب بھی طبیب موجود ہے تجھے بفضلہ تعالیٰ درد بھی ہے۔

تفسیر صوفیانہ قاشانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ہدایت سے **نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ** (سورہ نور) کا دوسرا نور مراد ہے اور وہ نورِ فطری ازلی ہے جسے محققین فیض ربانی کی استعداد مراد لیتے

ہیں اور ضلالۃ سے مراد وہ فطرۃ ہے جو اس نور ازلی کے لئے حاجب ہے جو طبیعت فاسدہ اور مقاصد ہیولانیہ فلسفہ خواہشات نفسانیہ اور طوقِ شیطانیہ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور ربح سے مراد وہ نور اول ہے جسے بندگان حاصل کرتے ہیں لیکن توجہ حق واتصال بعالم قدس اور غیر اللہ سے بالکل علیحدگی اختیار کرنے کی وجہ سے اور پھر اس مالک کی قوت کو شاملِ حال سمجھ کر اور غیر وہم ایسا بھول جائے کہ روح صرف مشاہدہ ربانی میں مصروف ہو بلکہ ذاتِ حق کی تجلیات میں ایسا جل بھن جائے کہ ہستی موہوم بالکل رہے بھی نہ اور خسران سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنا دارین کا فائدہ ضائع کر دیا اور اس خرابی سے نورِ حق ان سے محجوب ہو گیا۔ کما قال اللّٰہ تعالیٰ:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ [1] اور

تاویلات نجمیہ میں ہے: ان لوگوں کا سرکشی میں پھنس کر اندھا ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیوی امور میں خوش ہیں اور اس سے مطمئن ہیں۔ اس وجہ سے گمراہی ان اسی وجہ سے گمراہی ان کے دلوں کی گہرائیوں پر اثر کر گئی ہے پھر یہی سزا نصیب ہوئی جس کا ذکر آیت میں ہے اسی لیے آیت اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ میں فعل کی نسبت ان کی طرف ہوئی اشْتَرَاء کا لفظ بھی اسی لیے فرمایا کہ انہوں نے ہدایت کی استعداد اپنے سے بالکل نکال دی ہے اب اس کی طرف راجع ہوتے بھی نہیں اور نہ ہی اس تجارت سے انہیں کوئی نفع ہے اور جو شخص آخرت کی بجائے دنیا سے راضی ہو اس کا نقصان بھی ظاہر ہے اور جو صرف دنیا و عقبیٰ کا طالب ہو اور مولا کا طالب نہ ہو۔ وہ تو بہت زیادہ گھاٹے میں ہے اور اس سے زیادہ محروم کوئی بھی نہیں۔ جب اخروی نعمتوں سے محروم ہو جائے تو اسے جہنم کی سزا ہے پھر جو اپنے محبوب کی طلب اور اس کے دیدار سے محروم ہو تو اس سزا کتنی زیادہ ہو گی اور پھر انہیں ہدایت بھی کب نصیب ہو جبکہ انہوں نے قبولِ ہدایت کی استعداد ہی ختم کر ڈالی ہے۔

تفسیر عالمانہ مَثَلُهُمْ مثل دراصل نظیر کو کہتے ہیں پھر ہر اس قول کو کہا جانے لگا جو اس واقعہ واردہ کے مشابہ ہو اور پھر اس میں کسی قسم کی تبدیلی بھی نہ کی جائے اور مثل بھی ہر اس قول میں بیان کی جاتی ہے جس میں ایک قسم کی غرابت ہو اس لیے سے تغیر سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ پھر استعارہ کیا گیا ہے ہر اس حال یا قصہ یا صفت کے لئے کہ جس میں عجیب و غریب شان اور غرابت ہو جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

---

[1]:۔ خبردار ان کے قلوب پر زنگ چڑھ گیا اس وجہ سے جو وہ عمل کرتے تھے خبردار ایسے لوگ اپنے رب سے حجاب میں ہیں۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ اور وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی یعنی وہ صفت کہ جس میں شانِ عظمت وجلال ہے۔

ربط: جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حال حقیقت بیان فرمائی تو اس کے بعد مزید وضاحت کی خاطر مثا ل دی کیونکہ مثال عقل کا اچھا ذریعہ اور وہم کو قابو کرنے میں اقویٰ وسیلہ ہے۔غبی جاہل کو سمجھانے اور منکر سرکش کے حملہ سے محفوظ ہونے میں کیونکہ نہ ہو جبکہ تمثیل میں منکر کو معروف کی صورت میں دکھایا جاتا ہے اور وحشی کے سامنے ہیئت مالوف میں ظاہر ہون اور خیالی شے کو محقق بنا کر دکھانا اور معقول کو محسوس کی شکل میں پیش کرنا اور معانی کو اشخاص (یعنی ملبوس) کی تصویر میں لانا یعنی مثال سے خفی کو جلی سے اور غائب کو حاضر سے تشبیہ دینا مقصود ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں انہی تمثیلات کو بہت بیان فرمایا ہے اور انجیل میں تو ایک سورۃ کا نام سورۃ الامثال ہے اور قرآن پاک میں ہزار آیات ہیں جن میں امثال وعبرتیں ہیں اور علامہ سیوطی علیہ الرحمہ ''اتقان'' میں لکھتے ہیں کہ قرآن پاک کے اعظم علوم میں سے علم امثال بھی ہے لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔

مَثَلُهُمْ کا معنی یہ ہے کہ ان کا حال عجیب الشان ہے۔

كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ تخفیف کی خاطر اسم موصول کی جمع کی بجائے واحد کو رکھا گیا کیونکہ یہ لفظ الَّذِی اپنے صلہ کی وجہ سے جمع کا معنی دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَخُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا (اور تم نے ان کی طرح غور وخوض کیا جنہوں نے پہلے ایسے کیا تھا) اور الَّذِی بمعنی الـذیـن پر کلام کا ماقبل ومابعد قرینہ ہی ہے علاوہ ازیں اسْتَوْقَدَ نَارًا میں ضمیر واحد کا لایا گیا ہے اس کے ظاہر کا اعتبار کر کے اور باقی آئندہ افعال میں صیغہ جمع کا ہے الَّذِی کے معنی کا اعتبار کر کے اسْتَوْقَدَ نَارًا الاستیقاد بمعنی طلب الوقود اور اس کے حصول میں سعی کرنا یعنی آگ کا روشن کرنا اور اس سے شعلے بلند کرنا نَارًا اور نار ایک جوہر لطیف ہے جو روشنی دینے والی اور جلانے والی شے ہے اور نور اس کے ضوء کا نام ہے اسی طرح ہر نورانی شے کے ضوء کو بھی نور کہتے ہیں جو ظلمت کی نقیض ہے یعنی جنگل میں اندھیری رات میں درندگان وغیرہ کے خوف سے بہت بڑی آگ جلائی فَلَمَّآ اَضَآءَتْ الاضاءۃ یعنی فـرط الانـار ۃ یعنی بہت زیادہ روشن ہونا یا کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا سے پتہ چلتا ہے یعنی ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو آگ جلائے پھر جب روشن ہو جائے

مَا حَوْلَهٗ آگ جلانے والے کے اردگرد جو مکان واشیاء ہیں اگر اَضَآءَتْ متعدی ہو لفظ ما اس کا مفعول ہوگا اور مَا حَوْلَهٗ کی نصب علی الظرفیہ ہوگی اور اگر اسے لازم قرار دیا جائے تو فعل کا اسناد لفظ ما اور تانیث کی طرف ہوگا کیونکہ اس شخص کا گرداگرد وامکنہ واشیاء کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے اور حل بمعنی دوران ہے سال کو بھی اسی لیے حل کہتے ہیں کہ وہ چکر لگاتا ہے اور لـمّـا کا جواب ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ہے یعنی اسے بالکلیہ لے جائے اور اس کی آگ بجھادے جو کہ ان کے نور کا دارومدار ہے۔

سوال: اذھاب کو نور سے کیوں معلق کیا گیا ہے نار سے کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: نار کے جلانے سے مقصود نور ہی ہوتا ہے۔

سوال: اذھاب کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: ۱۔ ہر چیز کا خالق وہی ہے اس اعتبار سے اس کی طرف اسناد کیا گیا۔

۲۔ آگ بجھنا سبب خفی سے ہوا یا کوئی امر سماوی پہنچا جیسے ہوا یا بارش۔

۳۔ یا بطور مبالغہ کے ہے جیسا کہ اسے با سے متعدی کرنے سے پتہ چلتا ہے کیونکہ با میں مصاحبت وامساک کا معنی ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ذھب السلطان بمالہ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ مال بادشاہ لے لے اور جسے اللہ تعالیٰ لے کر بند کر لے پھر اسے کون چھڑانے والا ہے۔ اسی لیے ضوء سے (اگرچہ بہ اقتضائے ظاہر یہی ہونا چاہیے تھا) سے عدول کر کے نور کو اختیار کیا کیونکہ ضیاء کے ذھاب سے نور کا بقاء ہوسکتا ہے کیونکہ ضعیف کا نہ ہونا قوی کے نہ ہونے کو مستلزم نہیں ہے اور یہاں پر مراد اس نور کا بالکلیہ زائل کرنا مراد ہے جیسا کہ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ سے پتہ چلتا ہے کیونکہ ظُلُمٰتٍ بمعنی نور کا نہ ہونا بالخصوص اس وقت جبکہ دوسری (اس کی) تہ بہ تہ ہو کہ اس کے بعض پر ہو جیسا کہ اسے جمع اور تنکیر تضخیمی سے معلوم ہوتا ہے اور اس کا مابعد لَا يُبْصِرُوْنَ کا معنی بھی نہیں محقق ہوسکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ نور کا نام ونشان نہ رہے اور ترک دراصل طرح دخلی کے ہے اسے ایک مفعول چاہیے لیکن صبر کے معنی کو ضمن میں رکھ کر افعالِ قلوب سے ہو کر دو مفعول کا

---

[1] نقیض وہ ضد ہے جو دوسری ضد کو اپنے مقابل نہ آنے دے جیسے دن کی نقیض رات، موت کی نقیض زندگی، یعنی بیک وقت ان میں سے ایک ہی چیز کا ظہور ہوگا تو دوسری چیز مفقود ہوگی دونوں کا بیک وقت واقع ہونا محال ہے (مترجم)

طالب ہوتا ہے اب عبارت یوں ہوئی صیرھم فی ظلمٰت لا یبصرون ما حولھم اس عبارت کے اعتبار سے فِیْ ظُلُمٰتٍ اور لَا یُبْصِرُوْنَ، صیــــر کے دو مفعول ہوں گے اور اگر اسے اپنے اصلی معنیٰ پر لیا جائے یہ دونوں مفعول یعنی ضمیر ھُمْ سے حال ہوں گے مترادفین یا متداخلین اور معنیٰ یوں ہوگا کہ ان کا حال عجیب ہے کہ انہوں نے گمراہی کو خریدا جسے ظلمت کفر و نفاق کہا جاتا ہے جیسے ظلمت غضب الٰہی اور ظلمت یوم قیامت (کہ جس دن دیکھو گے کہ نور ان کے دائیں بائیں دوڑتا ہوگا) اور ظلمت القاب دائمی شامل ہے وہ ہدایت جو ان کو فطری نوری تھی کہ جس سے دلائل حق مشاہدہ کر چکے دے کر ان کا حال اس شخص جیسا ہے جو ایک بہت بڑی آگ جلائے قریب تھا کہ وہ اس سے بہرہ یاب ہو کہ اللہ تعالیٰ اس آگ کو بجھا کر انہیں ان ظلمات میں چھوڑ دے جو ان کے لئے حائل ہوں اور جس سے آنکھوں کو کچھ نظر نہ آسکے۔

التیسیر والعیون میں ہے کہ منافقین نے کلمہ ایمان زبان سے نکالا تو اس کی بدولت نور یاب ہوئے اور اس کی عزت کی وجہ سے عزت پائی اور اس کے سبب سے امن پایا، مسلمان عورتوں سے نکاح کیے مسلمانوں کے وارث بنے اور ان کو غنیمتیں تقسیم کیں اور اپنی اولاد و اموال میں امن پایا جب آخر العمر کو پہنچے تو ان کی زبان گنگ ہوگئی اور ہمیشہ ہمیشہ تک ظلمات کفر میں رہے جس کی وجہ سے خوف و ظلمت کی طرف لوٹے۔

صُمٌّ یعنی وہ منافقین حق کو سننے سے بہرے ہیں یعنی حق کو قبول نہیں کرتے اور جب وہ حق کو قبول نہیں کرتے تو گویا وہ سنتے ہی نہیں اور الصُّمُّ دراصل سننے کے مواضع کے سوراخوں کا ایسا بند ہو جانا کہ وہاں تک ہوا کا گزر بھی نہ ہو سکے کہ اس تموج سے آواز حاصل ہوتی ہے بُکْمٌ حق سے گنگ ہیں کہ اسے بیان نہیں کرتے جبکہ وہ چھپا رکھا ہے اس کے خلاف بولتے ہیں گویا کہ وہ بولتے بھی نہیں ہیں اور گنگ زبان کی ایسی آفت ہے جس کی وجہ سے مواضع الحروف پر اعتماد کرنے سے اسے قدرت نہیں ہوتی عُمْیٌ یعنی انہوں نے وہ آنکھیں گم کر دی ہیں کہ جن سے نظر کریں اور وہ نظر انہیں عبرت دے کر ہدایت کی طرف کھینچ کر لے جائے بلکہ یہ لوگ بصیرت کی بینائی بھی گم کر چکے ہیں کیونکہ جس کی بصیرت مٹ گئی گویا اس کی بصارت بھی مٹ گئی بنا بریں یہاں پر عُمْیٌ عدم البصیرۃ والبصر دونوں کے لئے مستعمل ہے اور یہ صفات ان کے دنیا میں ہیں اسی لیے آخرت میں انہیں ایسی ہی سزا ملے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا اور ہم

نے انہیں قیامت میں چہروں پر گونگے اور اندھے بنا کر اٹھائیں گے اس دن نہ تو وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن سکیں گے نہ اس سے کلام کر سکیں گے اور نہ ہی اس کے دیدار سے مشرف ہوں گے بخلاف اہلِ اسلام کے کہ وہ حق کے سننے والے اور حق کو دیکھنے والے ہیں اسی لیے قیامت میں اللہ تعالیٰ کے خطاب اور دیدار اور اسلام سے نوازے جائیں گے۔ لَا یَرْجِعُوْنَ یعنی بوجہ اوصاف مذکورہ کے وہ لوگ گمراہی سے ہدایت متروکہ کی طرف نہیں لوٹ سکتے یہ آیت تمثیل کا خلاصہ و نتیجہ ہے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ سلامت آلات کی وجہ سے ہدایت کی طرف رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ ہدایت کو ترک کرنے پر مذمت کے مستحق ہوئے اور صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ سے آلاتِ حس کی نفی تو نہیں ان کے استعمال نہ کرنے کی نفی ہے۔ شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

زباں آمد ز بہر سپاس — بغیبت مگردانش حق شناسی

گزرگاہ قرآن و پند است گوش — بہ بہتان باطل شنیدن مکوش

دو چشم از پے صنع باری نکوست — زعیب برادر فرو گیر و دوست

ترجمہ: i۔ زبان صرف شکر کرنے کے لئے ہے لیکن تم اسے کسی کی غیبت میں ملوث نہ کرو۔

ii۔ کان قرآن پاک اور نصیحت سننے کے لئے ہیں لیکن تم انہیں گندی باتوں کے سننے میں مت لگاؤ۔

iii۔ دو آنکھیں اللہ تعالیٰ کی صنعت کے نظاروں کو دیکھنے کے لئے ہیں انہیں اور دونوں ہاتھوں کو غلطیوں سے محفوظ رکھیے۔

ف: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رجوع الی الائتمار بامرہ و انتہا بنہیہ کا اختیار دیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے: وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ اور ایسے ہی ہم آیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ لوٹ آئیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف بالاختیار راجع نہ ہوا تو اسے اس کی طرف موت سے راجع کریں گے کما قال: كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ہر جی موت کا ذائقہ چکھے گا پھر وہ ہماری طرف لوٹ آئیں گے اور جس نے اس کی طرف دنیا میں بفضلہ رجوع کیا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کے قول کو محقق کیا تو اس کا یہ رجوع بالکرامۃ ہوگا اور وہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً کے خطاب سے مشرف ہوگا

حکایت: زمانہ سابقہ میں ایک جبار سرکش تھا جس نے ایک محل تیار کیا اور اسے بڑا پختہ بنوایا اور بہت سجایا پھر قسم کھائی کہ جو شخص اس کے قریب جائے گا یا اس کی طرف بری نظر سے دیکھے گا اسے قتل کرا دے گا اور بعد ازاں

کئی لوگوں کو اس جرم میں قتل کروا دیا گیا ایک شخص اس کے پڑوسیوں میں تھا اسے بڑی نصیحت کی مگر وہ نہ مانا ایک مردِ صالح نے اس شہر سے باہر جا کر ایک جھونپڑی تیار کی جس کا کوئی دروازہ تھا نہ سوراخ عبادت کی خاطر تنہائی اختیار کی ادھر وہ سرکش بادشاہ اس محل میں عیش سے زندگی بسر کر رہا تھا ایک دن محل میں بیٹھا اس کے ساتھی اس کی خدمت میں حاضر تھے ادھر ملک الموت ایک حسین وجمیل نوجوان کی شکل میں تشریف لائے اور محل کے اردگرد گھوم رہے تھے اور بار بار اس کی چوٹیوں کو دیکھ رہے تھے کسی نے بادشاہ سے کہا کہ تیرے محل کو ایک نوجوان دیکھ رہا ہے۔ دیکھا تو کہا یہ پاگل معلوم ہوتا ہے کوئی ناواقف یا مسافر ہے لیکن تم سے کوئی جا کر اسے بلا لائے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص گیا اور سختی سے یوں پیش آیا کہ نیام سے تلوار نکال کر اسے مارنے کا ارادہ کیا تو ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی، جس سے وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ بادشاہ کو کسی نے آ کر کہا وہ دیکھو آپ کے فرستادہ کو ان نوجوان نے مار ڈالا ہے بادشاہ نے غصے میں آخر دوسرے آدمی کو تلوار دے کر حکم دیا کہ جاؤ اسے قتل کر دو اس نے دوسرے کا بھی وہی حال کیا۔ بادشاہ کو اس دوسرے کے قتل ہو جانے کے غیظ وغضب نے محل سے نکلنے پر مجبور کر دیا تلوار پکڑ کر خود باہر آیا اور ملک الموت سے کہنے لگا: تجھے موت کا ڈر نہیں ایک تو تو میرے محل کے قریب گھوم رہا ہے دوسرے دو آدمیوں کو قتل بھی کر ڈالا۔ ملک الموت نے کہا: بادشاہ سلامت! ذرا سوچ کر بولیے آپ کو علم ہے میں کون ہوں! میں قابض ارواح عزرائیل ہوں۔ بادشاہ یہ کلمہ سنتے ہی کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور کہا: ہاں، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ یہ کہہ کر واپس ہونے لگا، ملک الموت نے فرمایا شاہ جی! کہاں جا رہے ہو میں تو آپ کے لئے کھڑا ہوں اب تو آپ نے قبر میں جانا ہے۔ بادشاہ نے کہا: صرف ایک منٹ کی مہلت چاہیے تا کہ میں اپنے اہل وعیال سے کچھ بات چیت کر لوں اور انہیں کچھ وصیت بھی کر لوں ملک الموت نے فرمایا: اب تک آپ کہاں رہے، اب کوئی فرصت نہیں یہ کہہ کر ملک الموت نے روح قبض کر لی اور چلتے بنے مرنے کے بعد رونا کیسا؟

ملک الموت اس فراغت کے بعد سیدھے اس مردِ صالح کے پاس پہنچے اور فرمایا: مبارک باد تمہارا وہ سرکش بادشاہ آج موت کے کڑوے گھونٹ پی کر مر گیا تمام واقعہ سنایا۔ مردِ صالح کا ارادہ ہوا کہ واپس اپنے گھر جائے۔ ملک الموت کو اس کی موت کا حکم آ پہنچا، چنانچہ ملک الموت نے اس مردِ صالح سے کہا: آئیے، اب آپ کی باری بھی

آ گئی۔ مرد صالح نے کہا: سر وچشم، اگر مہلت عنایت ہو سکے تو میں گھر جا کر ان سے کچھ باتیں اور وصیت کرلوں حکم ایزدی ہوا کہ اسے مہلت دیدو، چنانچہ مہلت لے کر چند قدم چلے سوچا اور نادم ہو ملک الموت سے کہا مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر گھر جاؤں تو کہیں کسی برے فعل کا ارتکاب نہ کر بیٹھوں، اللہ تعالیٰ میرے اہل کا آپ مالک ہے وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے آپ میری روح قبض کر لیجئے۔

سبق: بعض عارفین فرماتے ہیں کہ بہت تعجب ہے اس شخص پر جو اس امر سے بھاگتا ہے جو ضروری ہونے والا ہے وہ مالک ہے جس نے بندہ پر ہر بھلائی کی منت اور ہر نعمت عطا فرمائی اور اپنے بندہ سے وہ چیز طلب کرتا ہے جو اس کے ساتھ باقی رہنے والی ہے یعنی خواہشات خواہ وہ دنیا سے متعلق ہیں یا آخرت سے اس لیے کہ بات نہ آنکھیں دیکھ رہی ہیں نہ ہی دل جو سینوں میں پوشیدہ ہے۔

ف: بصیرت کا اندھا ہونے کے تین اسباب ہیں۔

۱۔ اپنے اعضاء کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مطلق العنان کر دینا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت ریا کے طور کرنا۔

۳۔ خلق خدا سے طمع بازی، کیونکہ جب دل اندھا ہو جاتا ہے تو سالک اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ موڑ کر غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ یہ مثال اس سالک کی ہے جو ابھی راہ حق میں گامزن ہوا ہے اور مدت تک آزمائش وتکالیف ومصائب کا نشانہ بنا رہتا ہے پھر وہ طلب کی آگ کو جلاتا ہے اور اپنے اردگرد روشن پاتا ہے جس سے وہ اپنے سعادت وشقاوت کے اسباب دیکھ لیتا ہے تو پھر اسے کسی کامل کی صحبت میسر ہو جاتی ہے اس کی خدمت کرتا ہے خلوت گزیں ہوتا ہے نفس کو دنیا سے دور ہٹاتا ہے خواہشات کا قلع قمع کرتا ہے جس سے اس کا دل شوق کے انوار سے چمک اٹھتا ہے اور اس کی روح ذوق تجلیات سے اجاگر ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مامون ہو جاتا ہے اور نفس کی فریب کاریوں سے بچ جاتا ہے اس کے بعد اسے شیطانی خطرات اور اس کے وساوس اسے گھیر لیتے ہیں اب قہقہہ کے ساتھ الٹے پاؤں لوٹتا ہے یعنی دنیا کی پست حالتوں کو پہنچ جاتا ہے اور دینوی سوچ میں گم ہو جاتا ہے اور نفس کی اندھیریوں میں ڈوب جاتا ہے مقصد تک

پہنچنے سے پیشتر ہی وصال کی رسی ٹوٹ جاتی ہے باوجودیکہ نعمتوں کی جنت میں قدم رکھ پاتا ہے لیکن اس سے اسے نکال لیا جاتا ہے پھر بیچارہ ملال اور تنگدستی کے قدموں پر چل کر برے سے برے حال میں پہنچایا جاتا ہے کما قال: وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ اور اس کے لئے وہ ظاہر ہوا جس کا انہیں گمان نہ تھا صُمٌّ یعنی ان کے دل بہرے ہو چکے ہیں کہ جن سے یوم میثاق کا خطاب سنا تھا اور زبانیں بھی کہ جن سے بلیٰ کا لفظ عرض کیا تھا اور ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں کہ جن سے جمال حق کے دیدار سے مشرف ہوئے اور پھر انہیں اس کا عرفان نصیب ہوا اسی وجہ سے وہ رجوع کرنے والے نہیں خطائر قدس کی منازل کی طرف رجوع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُنس کے باغات کے رجوع سے بھی محروم ہو گئے کیونکہ ان کے دل کا دریچہ جو یوم میثاق کو کھولا گیا عالم قدس کی جانب کھلنے والا ہے اب انہوں نے اسے خود ہی بند کر دیا ہے اور تتبع شہوات اور لذات کے درپے ہو کر اور دھوکا سازی اور منافقت کاری کی وجہ سے اب ان پر نہ تو جناب قدس کا ہوائیں چلتی ہیں اور نہ ہی نفحاتِ ارواح کی نسیم ان کو نصیب ہوتی ہے اس وجہ سے ان کے دل بیمار ہو گئے۔ پھر ان کیلئے ایسا طبیب بھیجا جو اپنے ساتھ بیماری کی شفاء بھی لایا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (اور ہم قرآن نازل کرتے ہیں جو عالمین کے لئے شفا اور رحمت ہے) مومنین سے مراد وہ ہیں جو اطباء کی تصدیق کرتے اور ان کی ادویات کو مانتے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے نہ اطباء کو مانا، نہ ہی ان کی ادویات کو، تو سمجھ لو کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ان کے لیے دوا بیماری بن جائے گی اور شفاء وبا کما قال تعالیٰ: وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (اور ظالموں کا خسارہ بڑھاتا ہے) جب یہ لوگ اہلِ رحمت نہ ہوئے تو ان کو لعنت نے گھیر لیا جو ان کے بہرے اور اندھے ہونے کا سبب بنی۔ کما قال تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ

تفسیر عالمانہ

اَوْ كَصَيِّبٍ یا منافقین کی کہاوت صیّب کی طرح ہے یعنی اصحاب صیّب کی طرح ہے

حل لغات: صَیِّب '' اس بارش کو کہتے ہیں جو موسلا دھار ہو اور اس کا ماخذ الصَّوَابُ ہے اور صَوْب '' بمعنی نزول ہے اور لفظ صَیِّب '' دراصل صیوب '' تھا اور کاف مرفوع المحل ہے جس کا عطف كَمَثَلِ الَّذِیْ کے کاف پر ہے اور تخییر وتساوی کے لئے ہے یعنی منافقین کا حال اور ان دو

قصوں کے مشابہ ہے اور چونکہ یہ دونوں قصے مستقل قصے ہیں اس لیے ہر ایک میں سے منافقین کے لئے مثال دی جائے تو بھی حق ہے اور اگر دونوں کو ان منافقین کے لیے مثال دی جائے تب بھی درست ہے۔

مِّنَ السَّمَآءِ صَیِّب'' کے متعلق ہے اور السَّمَآءِ بمعنی دنیا کی چھت اور اسے معروف باللام لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ بارش کا آنا صرف ایک کنارہ سے نہیں ہوتا کیونکہ ہر ایک کنارہ ان کے کناروں میں سے ہے یعنی ہر اس چیز کو جسے آسمان کا ایک کنارہ احاطہ کرتا ہے اسی کا نام علیحدہ آسمان ہے اب معنی یوں ہوا کہ وہ عام بارش جو بھرے ہوئے بادل سے نازل ہوتی ہے وہ بادل آسمان کے پکڑے ہوئے ہے اور آسمان سے بادل گرتا اور پانی بھی اسی سے لیتا ہے ایسا نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ بادل پانی دریا سے لیتا ہے۔

ف: امام ترمذی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بارش ان بخارات سے حاصل ہوتی ہے جو کہ زمین سے نکل کر ہوا میں اوپر کو جاتے ہیں پھر وہاں خلاء کی ٹھنڈک کی سختی سے جم کر پانی بن کر گرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غلط فہمی کا ابطال من السماء سے فرمایا۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عرش کے نیچے ایک دریا ہے جس سے حیوانات کے رزق نازل ہوتے ہیں۔ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے حسب مشیت ایزد متعال اپنا پانی نیچے والے آسمان کی طرف گراتا ہے پھر وہ نیچے والے کو، اسی طرح سب سے نیچے والے آسمان تک یہی سلسلہ رہتا ہے۔ پھر بادل کو حکم ہوتا ہے کہ تو چھلنی ہو جا، تو وہ چھلنی بن جاتا ہے جس سے وہی پانی قطرات کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر کوئی ایسا قطرہ زمین پر نہیں گرتا جس کے ساتھ ایک فرشتہ نہ ہو، جہاں ضرورت ہو وہی فرشتہ اس قطرہ کے لے کر وہاں پہنچاتا ہے اور یہ بھی ہے کہ ہر قطرہ کیل معلوم کے ساتھ گرتا ہے بخلاف یوم طوفان کے کہ وہ بارش بلا کیل وزن کے تھی۔ (کذافی تفسیر التیسیر)

فِيهِ ظُلُمٰتٌ یعنی بارش میں تاریکیاں ہوتی ہیں یعنی وہ تاریکیاں کئی قسم کی ہیں ان میں سے ایک تاریکی وہ ہے جو بہت سخت گھاٹی ہے بوجہ بارش کے قطرات کے پے در پے ہونے اور پھر بادل کے سایہ کرنے اور رات کی اندھیریوں کی شمولیت کی وجہ سے اور آیت میں ایسی کوئی بات نہیں جو دلالت کرے کہ اس میں رات کی تاریکی مراد نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ اس میں رات کی تاریکی بھی ہو جیسا کہ آنے والی آیت يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ اور

اس کے بعد والی آیت وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ برق کا آنکھ کو جھپک لینا عموماً اندھیری راتوں میں ہوتا ہے اور اسی طرح چلنے والے کا چلنے سے ٹھہرنا اس وقت ہوتا ہے جبکہ رات کی ایسی تاریکی ہو کہ چلنے والے کی آنکھوں کو آگے دیکھنے سے روک لے، بخلاف بادل کا سیاہ ہونا اور پھر اس کا کثیف ہونا دن میں ایسی صورت نہیں پیدا کرتا کہ چلنے والے کو چلنے سے روک دے۔

(کذافی حواشی ابن التمجید)

سوال: بارش ظلمات کا محل کیوں قرار دیا گیا ہے حالانکہ ضروری نہیں کہ بارش میں اندھیریوں کا محل ہو ہاں رات ہو تو پھر اس میں تاریکی کا وہم نہیں ہوتا ہے اس میں رات کی تاریکی کو تابع اور بارش کی تاریکی کو متبوع مقرر کیا گیا ہے حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔

جواب: صرف مبالغہ مقصود ہے اور بارش سے ڈرانا مقصود ہے، تنبیہ کرنا ہے کہ بارش کی تاریکی ایسی سخت ہوتی ہے کہ رات کی تاریکی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے ظلمات کا مرفوع ہونا ظرف کی وجہ سے ہے کیونکہ اس کا اعتماد موصوف پر ہے کیونکہ جملہ محل جر میں ہے اس لئے کہ ایک قول کے مطابق صیب کی صفت ہے۔ وَرَعْدٌ وہ سخت آواز جو بادل سے سنائی دیتی ہے وَبَرْقٌ وہ چمک جو بادل سے (جبکہ اس کے اجزاء ایک دوسے ملیں) حاصل ہوتی ہے۔

سوال: وَرَعْدٌ وَّبَرْقٌ کا محل بارش کو کیوں قرار دیا گیا حالانکہ اس کا محل تو بادل ہے۔

جواب: بادل سے یہ دونوں بارش کے واسطہ سے متعلق ہیں اور اسی واسطہ کے لحاظ سے ان کا محل بارش کو بتایا گیا اور حکماء میں یہ مشہور ہے کہ رَعْد کی وہ آواز ہے جو بادل کے اجرام کے آپس میں ٹکرانے سے نکلتی ہے یا وہ آواز ہے جو ہوا کے جھونکوں سے جب بعض اجزاء بعض سے خارج ہوتے ہیں تو پیدا ہوتی ہے وہی رَعْد ہے لیکن حقیقت وہی ہے جو حضرت امام ترمذی علیہ الرحمہ نے روایت کی ہے۔

حدیث شریف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ فرمایئے: رَعْد کیا شئے ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ فرشتہ ہے جو بادل

پر مقرر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ آگ کا چابک ہے جس سے وہ اس بادل کو ہانکتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ پھر انہوں نے عرض کی: یہ آواز (جو سنائی دیتی ہے) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اس کی زجر ہے جو بادل کو وہاں پہنچنے کا حکم دیتا ہے جہاں پر حکم دیا گیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آیت میں رَعْد سے مراد اس فرشتہ کی آواز ہے نہ کہ خود فرشتہ، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ رَعْد ایک فرشتہ ہے جو بال کے پھیرنے، گھیرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ جو اس بادل کو اس جگہ لے جاتا ہے جس جگہ کا حکم ہوتا ہے اور اپنے انگوٹھے سے پانی جاری کراتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتا ہے جب وہ تسبیح پڑھتا ہے تو آسمان میں کوئی ایسا فرشتہ نہیں ہوتا جو اس کے ساتھ مل کر تسبیح نہ پڑھے تب اس وقت سے پانی کے قطرے گرنے شروع ہو جاتے ہیں اور بَرْقٌ سے مراد چابک ہے جس سے فرشتہ بادل کو مارتا ہے اور مخاریق مخراق کو جمع ہے یہ دراصل اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کو لڑکے لپیٹ کر ایک دوسرے کو مارتے ہیں اور یہاں پر وہ آلہ مراد ہے جس سے فرشتے بادل کو ہانکتے ہیں۔ ساکن جلوتیہ مرجع طریقت شیخ یعنی افتادہ آفندی فرماتے ہیں کہ ان دونوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں ان کی مطابقت یوں ہونی چاہیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ابتداء کا اعتبار کیا اور حکماء نے انتہاء کا۔

يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ یہ تمام ضمائر مضاف محذوف کے لئے ہیں کیونکہ دراصل عبارت یوں ہے۔ او کاصحاب صیب موسلا دھار بارش والوں کی طرح۔ جیسا کہ گزرا اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ جملہ مستانفہ ہو کیونکہ جب رَعْد اور بَرْقٌ وغیرہ کا بیان کیا گیا تو گویا سائل نے پوچھا کہ ایسی حالت میں اصحاب صیب کا کیا حال ہوگا؟ تو جواب میں فرمایا **يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ** اور **اَصَابِعَهُمْ** بمعنی انا ملهم ہے اور اس میں مبالغہ ہے جو انا ملهم کہنے سے ادا نہیں ہو سکتا تھا گویا کہ وہ لوگ شدت حیرت کی وجہ سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے نہ صرف (انگلیاں) انامل جیسا کہ عادت ہے یا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسی کمال حیرت اور سخت دہشت اور ایسے حال کو پہنچے ہوئے تھے کہ وہ اپنے اعضاء کو اصلی صورت پر استعمال کرنے سے عاجز تھے یہی بات ہے کسی خاص انگلی مثلاً سبابہ کے ذکر نہ کرنے میں لیکن یہ اس لئے ہوا کہ ادب کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے کیونکہ وہ سب (گالی دینا) سے مشتق ہے اور قرآن کے آداب میں یہی اولیٰ ہے یہی وجہ ہے کہ

اہلِ عرب اب اسے مسجہ اور مہلکہ وغرہما سے تعبیر کرتے ہیں اور اس جیسے الفاظ کو بھی ذکر نہ کیا. کیونکہ ایسے استعمالات جدیدہ ہیں کہ جس سے عوام بے خبر تھے۔

مِنَ الصَّوَاعِقِ، یَجْعَلُوْنَ کے متعلق ہے یعنی صواعق کی وجہ سے اور صواعق صاعقہ کی جمع ہے رَعْد کی وہ گرج جس سے دل دھڑکتے ہیں پھر اس کے ساتھ ایک شعلہ بھی ہوتا ہے جہاں پھر وہ اپنی لطافت کی وجہ سے فوراً بجھ جاتا ہے۔

حکایت: ایک کھجور پر بجلی گری تو وہ آدھی جل گئی پھر بجھ گئی اس کے بعد لوگ کہتے ہیں کہ کھجور کی چوٹی اور آسمان کے مابین ایک آگ دکھائی دیتی پھر کھجور کی چوٹی ٹکڑے ہونے لگ جاتی جس سے ہلکی سی آواز خارج ہوتی۔

(کذافی روضۃ العلماء)

ف: بعض کہتے ہیں کہ صاعقہ سے مراد آگ کی وہ چنگاریاں ہیں جو بادل کے ٹکڑوں کے آپس میں ٹکرانے سے خارج ہوتی ہیں پھر وہ جب بھی کسی شے پر گریں تو اسے جلا کر رکھ دیتی ہیں پھر زمین کے اندر گھس کر پانی پر پہنچ کر بجھ جاتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جب سورج زمین پر چمکتا ہے تو اس کی چمک سے خشک زمین کے چند اجزاء ناریہ خارج ہوتے ہیں جن کے کچھ ارضی الجزات بھی شامل ہوتے ہیں ان دونوں کے اختلاط کا نام دخان ہے دونوں مل کر اوپر جاتے ہیں اور کرہ باردہ میں پہنچ کر بادل بن جاتے ہیں۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص رَعْد کی آواز سن کر سُبْحٰنَ الَّذِیْ وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ مِنْ خِیْفَتِہٖ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ پڑھے اگر اس کا نقصان ہو تو اس کا تاوان میرے ذمہ ہے۔

گرج کے وقت کی دعا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رَعْد اور اس کی گرج سنتے تو یہ دعا پڑھتے:
اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِکَ وَلَا تُھْلِکْنَا بِعَذَابِکَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِکَ

(کذافی تفسیر الشیخ وشرح الشرعہ)

حَذَرَ الْمَوْتِ کا مفعول لہٗ ہے اسی لیے منصوب ہے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کی علت ہے یعنی ہلاک

ہونے کی وجہ سے۔

ف: موت حیات کی بنیاد کے فساد کا نام ہے۔

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ الاحاطة بمعنی الاحداق بالشئی من جمیع جهاته اور یہ معنیٰ اللہ تعالیٰ کے لئے مجاز ہوگا اب معنی یوں ہوا کہ: والله محدق بعلمه وقدرته [1] بِالْكٰفِرِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ سے کافر نہیں چوک جائیں گے جیسے محیط سے محاط نہیں چوکتا۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ انہیں جمع کر کے عذاب دے گا یہ جملہ معترضہ ہے اس میں تنبیہ ہے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا وغیرہ۔ انہیں عذاب سے نہیں بچائے گا کیونکہ قدر کو حزر نہیں ہٹاتا اور نہ ہی حیلے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دفع کر سکتے ہیں اور هُمْ ضمیر کی بجائے الكفرین لانے میں اشارہ ہے کہ ان کو یہ عذاب وغیر جو پہنچ رہا ہے ان کے کفر کی وجہ سے ہے۔ يَكَادُ الْبَرْقُ، يَكَادُ بمعنی يقرب۔ یہ دوسرا جملہ مستانفہ ہے ایک سوال کا مقدر کے جواب میں واقع ہوا ہے گویا سائل نے پوچھا کہ اس برق میں ان کا کیا حال ہوگا تو اس کے جواب میں فرمایا يَكَادُ الـــخ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ یعنی اپنی شدت ضوء کی وجہ سے ان کی آنکھیں اُچک لے كُلَّمَآ ظرف ہے اس کا عامل اس کا كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ جواب ہے یعنی مَشَوْا اور اَضَآءَ متعدی ہے بمعنی انار البرق الطريق فی اللیلة المظلمة یہ تیسرا جملہ مستانفہ ہے۔ گویا کسی نے پوچھا کہ یہ لوگ بجلی کے ظاہر ہونے اور مٹنے پر کیا کرتے تھے کیا یہاں بھی وہی حالت تھی جو کانوں میں کرتے تھے یا اس کے خلاف، تو جواب میں فرمایا کہ بجلی کی روشنی میں ان کو راہ مل جاتی تھی تو مَشَوْا فِيْهِ اس راہ پر چل پڑتے جہاں پر نور کی شعاعیں پڑتیں تو چند قدم چلتے لیکن یہ خوف انہیں ہر وقت رہتا کہ شاید بجلی آنکھ کی بینائی اچک لے مشی ء" کی بجائے سعی اور رَكَضَ نہ کہا۔ اس میں اشارہ ہے کہ ان پر اتنی دہشت طاری تھی کہ دوڑنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ یعنی جب بجلی گم ہو جاتی تو راستہ پر اندھیرا چھا جاتا قَامُوْا یعنی جہاں ہوتے متحیر ہو کر ٹھہر جاتے دوسری گھڑی کا انتظار کرتے کہ شاید انہیں مقصود تک پہنچنے کی راہ مل جائے یا کوئی پناہ مل جائے کہ جس سے وہ اس تکلیف سے بچ جائیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اگر چاہے کہ ان کے کان جو سر میں ہیں اور بینائی جو آنکھ میں ہے چھین لی جیسے کہ ان کے دل کی

[1] اور اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت سے محیط ہے۔

سمع و بصر چھین لی۔ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ صوتِ رعد اور نورِ برق سے ان کی سمع و بصر چھین لے انہیں سزا دینے کی بنا پر کیونکہ اس سے وہ باری تعالیٰ عاجز نہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ جو بھی ممکنات میں سے موجودات ہیں سب پر قادر ہے اور خود باری تعالیٰ پر اگرچہ شئے کا اطلاق کیا جاسکتا ہے لیکن وہ موجود بالوجوب ہے نہ بالامکان، اور عاقل پر مخفی نہیں کہ اس جیسی عبارت میں شئے سے ماسوا باری تعالیٰ مراد ہے اور دلالت عقل سے آیت ہذا میں جن کو لفظ شئے شامل ہے اللہ تعالیٰ کی ذات مستثنیٰ ہے اب معنیٰ یوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ماسوا پر قادر ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے فلان " امین " یعنی وہ اپنے ماسوا تمام لوگوں میں سے امین ہے اس میں اس کا نفس داخل نہیں اگرچہ یہ بھی منجملۃ الناس ہے۔ (کذافی حواشی ابن التمجید)

ف: ہر شئے کا فاعل اللہ تعالیٰ جس طرح اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ نہ حکمت کی اقتضاء سے کوئی شئے زاید ہوسکتی ہے اور نہ کم اور یہ تمثیل کشف بعد کشف اور ایضاح بعد ایضاح کے پہلی تمثیل سے زیادہ بلیغ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حیرت اور ان کا گمراہی میں مخبوط العقل ہونا اور پھر ان کے امر کی شدت اور ان کی رسوائی وفضیحت کو اس شخص سے تشبیہ دی کہ جیسے اندھیری رات میں بارش نے گھیرا ہو پھر اس میں بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک اور صواعق کا خوف، پھر موت کا ڈر ہو۔ یہ اس وقت ہے کہ جبکہ یہ مثال مرکب ہو اسی وجہ سے قرآن پاک کو بلاغت کا اعلیٰ درجہ دیا جاتا ہے غور سے دیکھا جائے اور پھر اس ہیئت حاصلہ کو بھی کہ جس سے یہ صورت مرکب ہے تو اس میں عجیب قسم کی بلاغت حاصل ہوتی ہے جو مفردات میں نہیں ہے جیسا کہ مجموعہ آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی بارش گھیر لیتی ہے کہ جس میں اندھیریاں ہوں اور بادلوں کی ظلمات ہوں علاوہ ازیں گرج اور کڑک بھی اور بجلی کا گرنا بھی اور جن پر بارش واقع ہو رہی ہے ان کا موت سے گھبرانا بھی تو ایک عجیب امر پیدا ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس وقت پیدا نہیں ہوتی جب کہ ایک ایک شئے سے علیحدہ علیحدہ کو واقع۔

ف: قرآن مجید کے معارف وحقائق پر دائمی حیات کا دار و مدار ہے کہ بارش سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ بارش زمین کی زندگی کا باعث ہے پھر اس بارش کی تکالیف سے جو انسان کو غم والم اور ملال پیش آتا ہے قرآن کی وعیدوں سے تشبیہ دی گئی اور رَعْد سے یہ وہ وعیدیں ہیں کہ جن سے انسان وعیدوں کو سن کر ڈرتا ہے جس کی وجہ سے کانوں میں انگلیاں ٹھونستا ہے حالانکہ اسے اس سے نجات نہیں ہے اور خوش اس لئے ہوتے ہیں کہ اس میں

ان کی خوشی کی باتیں ہیں اور غم اس لیے کہ ان کی وعیدوں کا بیان ہے بعینہٖ یہی منافقین کا حال ہے۔

سبق: دانا کے لئے ضروری ہے کہ شریعتِ مطہر پر ثابت قدم رہے اور اس کے خلاف باتوں سے کنارہ کرے تا کہ خاتمہ ایمانی کی دولت سے نوازا جائے۔

حکایت: حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ آپ ہنس کر فرمانے لگے: مت پوچھیے آپ نے فرمایا: ان لوگوں پر کیا گزرتی ہے جو دریا میں کشتی پر سوار ہوں لیکن کشتی راہ میں ٹوٹ جائے اور ہر ایک اپنے اپنے تختے پر لٹک جائے اب بتایئے ان لوگوں کا کیا حال ہوگا! اس شخص نے کہا: وہ بڑی سخت پریشانی میں ہوں گے، آپ نے فرمایا: میرا اس سے برا حال ہے کیونکہ موت میرا دریا اور حیات میری کشتی ہے اور گناہ تختے ہیں اب تو بتا کہ جس کی یہ حالت ہو اس کا کیا حال ہونا چاہیے فلہٰذا گناہ کو ترک کرتے ہوئے علام الغیوب کی طرف رجوع چاہیے۔

حدیث شریف: جس کی ہجرت اللہ جل شانہ' ورسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہے پس اس کی ہجرت واقعی الٰہی کی طرف ہے اور جس کی طرف ہجرت دنیا کے حصول یا عورت کے بیاہ کے لئے ہے پس جس مقصد کے لئے اس نے ہجرت کی وہی اسے ملے گا۔ دیکھئے اس میں ہر ارادہ والے کو اس کے ارادہ پر کیسے جزا دی گئی ہے اور ہجرت کا مقام ہے کہ دنیا کا دوبارہ ذکر نہیں کیا تا کہ اس کے عدم اعتبار کا پتہ چل سکے اور یہ بھی علم ہو جائے کہ دنیا صرف لہو ولعب کا نام ہے گویا اس کا وجود ہی نہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے:

بہ مرد ہشیار دنیا خسیست ۔۔۔۔ کہ ہر مدتے جائے دیگر کسیست

ترجمہ: ہشیار مرد کے نزدیک کچھ نہیں کیونکہ ہر آن اس کی نئی جگہ ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مقدس فهجرته الى ما هاجر اليه اور اس کا مضمون قابلِ غور ہے کہ ماسواہ کے ترک کا اشارہ ہے اور عورت اور دنیا کے ذکر میں ہر شئے جو دنیا میں شہوانی ہے سب آ گئی اور حدیث شریف کا مقصود یہ ہے کہ دنیا مافیہا سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا چاہیے۔

حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود ۔۔۔۔ ز ہر چہ تعلق پزیرد آزاد است

ترجمہ: یعنی ہر شئے خواہ مال ہو یا اولاد اسباب ہے سب سے تعلق توڑ کر مالکِ لایزال کے ساتھ محبت ہو۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ الخ دو آیتوں کے متعلق یہ اشارہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے تشبیہ دی اس حدیث کے آرزومند اور ذکر میں مشغول ہونے اور ہدایت میں قرآن کے پیچھے لگنے والے اور پھر اس کی طلب میں کوشش کرنے والے اور بعد ازاں جو اس پر عالم غیب کی جو بات ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ نفس کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر وہ فترۃ کی آفت میں جا پڑتا ہے اور وقفہ کو اس کے حال سے کہ اندھیری رات اور برسات میں چلنے والا ہو اور ذکر و قرآن کو مینہ سے تشبیہ دی کیونکہ یہ دل میں ایمان اور حکمت کو جنم دیتا ہے جیسے پانی انگوری کو فِيْهِ ظُلُمٰتٌ یعنی ہم شکل اشیاء اور ملتی جلتی چیزیں جو سالک کو اثناءِ سلوک میں ظاہر ہوتی ہیں اور دقیق معانی کہ جن کا حل اور سمجھنا اور اس کے عہدہ آفات سے خارج ہونا ناممکن ہو سوائے اس کے کہ جس کی عقل تائید رحمٰن سے ایمان کے ساتھ منور ہو کما قال تعالیٰ: اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ رحمٰن نے قرآن سکھایا۔

جیسے اندھیرے میں چلنا سوائے چراغ مشکل ہے اسی طرح قرآن کے حقائق و دقائق کی سیر بھی ناممکن ہے اسی طرح ظلمات بشریہ کی سیر کا حال ہے جب تک ہدایت ربوبیت کی روشنی نصیب نہ ہو اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا یعنی نورِ ہدایت سے چلتے ہیں وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا یعنی جب ظلمات بشریہ ان پر چھا جاتی ہیں۔ وَرَعْدٌ یعنی خوف و خشیت و ہیبت جو ذکر اور قرآن کے جلال کے وجہ سے ہیبت دل میں پہنچتی ہے کما قال تعالیٰ: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ [1]

وَبَرْقٌ یعنی قرآن و ذکر کے انوار کا چمکنا جبکہ قلوب میں سرایت کرتا ہے کہ جس سے ان کو جلود و قلوب ذکرِ الٰہی کے لئے نرم ہو جاتی ہے پھر اس میں قرآن اور دین کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے جسے قلوب پہچانتے ہیں کما قال تعالیٰ: وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ (اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا) اور جب ان پر سعادت کے انوار چمک اٹھتے ہیں تو وہ طبیعت کی ظلمات سے نکل کر ارادہ کی حبل اللہ تھام لیتے ہیں تا کہ کامیاب لوگوں کے درجات کو پالیں۔ لیکن انگلیوں کو کانوں میں ٹھونسنے یعنی اپنے اعمال فاسدہ کی انگلیاں اپنے کانوں

---

[1] اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تم اسے ڈرنے پھٹنے والا دیکھتے اللہ کے ڈر سے ہے۔

میں ٹھونستے یعنی وہ کان جو صواعق اور داعی حق سے ڈرنے والے تھے موت کے خوف سے یعنی نفس کی موت سے کیونکہ نفس مچھلی کی طرح ہے اور دنیا اس کا دریا ہے اور خواہش اس کا پانی اگر اسے اس سے نکالا جائے تو وہ اسی وقت مرجائے گا یہی مطلب ہے قولہ علیہ السلام موتوا قبل ان تموتوا کا۔

وَاللّٰهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِينَ اس میں اشارہ ہے کہ وہ کافر کہ جس کی حیات طبعیہ حیوانیہ ہے اگر مالوفات سے بالارادہ مرجائے تو اسے اللہ تعالیٰ انوارِ شریفہ سے زندہ کرے گا۔ کما قال تعالیٰ: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ اگر وہ بالارادہ نہ مرے تو اللہ کفار کو محیط ہے یعنی انہیں ہلاک کرنے والا ہے اور دنیا میں انہیں صورت وقلب کی موت دینے والا ہے اور آخرت میں عذاب کی موت پھر نہ مریں گے نہ جئیں گے۔ يَكَادُ الْبَرْقُ. یعنی ذکر اور قرآن کا نور يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ یعنی ان کے نفسِ امارہ کے ابصار كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ یعنی ہدایت کا نور مَّشَوْا فِيهِ قدمِ صدق کے ساتھ راہِ حق پر چلتے ہیں وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ یعنی نفس کی صفات کی ظلمات اور خواہشات ان پر غلبہ کرتے اور دنیا کی طرف رغبت کرتے ہیں قَامُوْا یعنی سیر سے ٹھہر جاتے اور متحیر ومتردد ہوتے ہیں اصل وجہ سے ان پر آفات کی بھر مار ہوتی ہے اور فترات ان کو آپہنچتے اور شیطان ان پر قابو پالیتے ہیں اور نفس ان کو خواہشات کی طرف کھینچ لے جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں جاگرتے ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا ان کی ہدایت کا ارادہ ہوجائے لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ تو ان کے کان لے جائے جو شیطان کے وساوس اور اس کے غرور کی طرف لو لگاتے ہیں وَاَبْصَارِهِمْ یعنی ان کی وہ آنکھیں جن سے زینت دنیا کو دیکھتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ: وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا اگر ہم چاہیں تو ہر نفس کو ہدایت دیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ان کی شنوائی وبصارت کو سلب کرلے یہاں تک کہ نہ وہ وساوسِ شیطانی وخطراتِ شہوانی کو سن سکیں اور نہ منقشات دنیوی اور لذات حیوانی کو دیکھ سکیں تاکہ اس سے دھوکہ نہ کھائیں اور نہ دین بیچ کر دنیا خریدیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ سے جس طرح چاہے کرتا ہے اور اپنے غلبہ سے جس طرح چاہتا ہے حکم فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

اے لوگوں اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔

تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ

اور جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے

السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا

پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لئے جان بوجھ کر برابر والے

وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ

نہ ٹھہراؤ۔ اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت

مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا

تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر نہ لا سکو

وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ

اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار رکھی

لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ

ہے کافروں کے لئے اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ

نہریں رواں جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا (صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی

رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا

رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ صورت میں ملتا جلتا انہیں دیا گیا اور ان کے لئے باغوں میں ستھری بیبیاں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ

خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا

رہیں گے۔ بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز وں کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

اس سے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے تو وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے رہے کافر وہ کہتے ہیں

فَیَقُوْلُوْنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا

ایسی کہاوت میں اللہ کا کیا مقصود ہے اللہ بہتوں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت فرماتا ہے اور اس سے

یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ

انہیں گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں۔ وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد

وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ

اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان

الْخٰسِرُوْنَ ۝ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ

میں ہیں۔ بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا

ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ

پھر تمہیں جلائے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف

اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

قصد فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

تفسیر عالمانہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ یہ آیت توحید و رسالت کے اثبات و تحقیق (جو کہ ایمان کی اصل ہیں) کے لئے بیان کی گئی ہے اور لفظ ناس " مومنین اور منافقین کا اسم ہے اور ندا غافلین کی تنبیہ اور

غائبین کے احضار اور ساکنین کی تحریک اور جاہلین کی تعریف اور مشغولین کی تفریغ اور معترضین کی توجیہ اور محبین کی برانگیختی اور مریدین کی تشویق کے لئے ہے۔

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ اب خطاب اس لیے ہو رہا ہے تاکہ بندہ کو جو عبادت سے کلفت واقع ہوئی و ملذّتِ خطاب سے دفع ہو جائے اب معنی یہ ہوا کہ مونس نے میرے انس کو جو کہ قبلِ ولادت تھا نہ بھلایا یہ مطلب ہے کہ اے نسیان کے پتلے! تجھے متنبہ ہو جانا چاہیے اور اس وقت کو فراموش مت کر جبکہ تو ایک بھولا بھلایا تھا بلکہ ایک غیر مذکور شے تھا پھر میں نے تجھے پیدا کیا اور گارے میں تجھے ملا گیا تو ایک نطفہ کے بعد خون بنا پھر گوشت کا ایک لوتھڑا ہوا پھر نوجوان ہوا پھر تمام انتہائی بڑھاپے میں پہنچا ان تمام حالتوں میں میری نعمتوں میں پلتا رہا لیکن افسوس ہے کہ اب تو میرے غیر کی خدمت میں معروف اور نفس و خواہش کی عبادت میں مشغول ہے دین بیچ کر دنیا خرید رہا ہے تجھے چاہیے کہ اسے فراموش نہ کر جس نے تجھے پیدا کیا اور شے غیر مذکور کی حالت سے نکال کر تجھے کریم اور مشکور العمل بنایا۔ تجھے قوت دی تجھے باعزت بنایا اور جو کچھ دینا تھا، دیا، یہ خطاب نفس اور بدن دونوں کو ہے۔

ف: تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ اگر انسان کا ماخذ نسیان ہو تو اس میں عتاب بھی ہے اور تلقین بھی عتاب تو اس لئے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے لوگو! تم نے میری نعمتوں کے عوض ناشکری کی یا یہ کہ میرے حکم کے عوض نافرمانی کا مظاہرہ کیا اور تلقین عذر یوں ہوگی کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ہمارے احکام کے مخالف (نسیان میں آ کر نہ کہ عمداً و سہواً) ہم نے تیرے عذر کر تیرے نسیان کی وجہ سے قبول کر لیا اور تیرے ایمان کی وجہ سے گناہ معاف کر دیے۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمُ کفار کو فرمایا جا رہا ہے اپنے رب کی معرفت میں مخلص ہو جاؤ اور مطیعین کو فرمایا اپنے رب کی معرفت میں ثابت قدم رہو اور یہ لفظ ان تمام معانی کا احتمال رکھتا ہے اور اس کا نام جوامع الکلم ہے۔

(کذا فی التفسیر لابی اللیث)

ف: عبادت کہتے ہیں طاقت کو طاعت کی تکمیل میں خرچ کرنا اور خشیت کے استشعار میں معصیت سے بُعد حاصل کرنا۔ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ یہ صفت ہے، تعظیم و تعلیل کے لئے جاری ہوئی یعنی تم اس اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا کہ تم نیست و نابود تھے اس نے تمہیں ہست کر دیا اور خلق بمعنی اختراع

الشئی یعنی شئے کا شئے سے ایسا پیدا کرنا کہ جس کی پہلے کوئی نظیر نہ ہو وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ اوران لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے تھے یعنی وہ امتیں جو تمہارے زمانے سے پہلے تھیں۔ مِنْ ابتدائیہ ہے اس کا متعلق محذوف ہے اور رَبَّکُمُ کو وصف سے موصوف کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس کی عبادت تم پر واجب ہے یعنی تمہارے اصول کو پیدا کرنا عبادت کے موجبات سے ہے اوراس میں شمول قدرت کی طرف دلالت بھی ہے اور غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کی تنبیہ بھی یعنی وہ لوگ تھے آئے اور ختم ہوئے پس تم مقامِ رجوع کو نہ بھلاؤ اور نہ اس میں کوتاہی کرو۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ، اُعْبُدُوْا کی ضمیر سے حال ہے یعنی اس امید میں رہو کہ شاید تم ان متقین سے ہو جاؤ جو ہدایت وفلاح سے کامیاب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے جوار کے مستحق ہوئے۔ لفظ لَعَلَّ امید اور طمع دلانے کے لئے آتا ہے اور وجوب کے لئے بھی آتا ہے کیونکہ کریم کو کسی قسم کا طمع نہیں ہوتا۔

ف: پہلے اور پچھلے سب اس امر بالتقویٰ میں داخل ہیں اور مخاطبین کو ذکر خاص کر کے غائبین کو تغلیباً داخل کرلیا۔

ف: اس میں تنبیہ یہ کہ تقویٰ سالکین کا انتہائی درجہ ہے اور تقویٰ بمعنی ماسویٰ سے بری ہو جانا۔

سبق: عابد کے لئے لائق ہے کہ وہ اپنی عبادت پر مغرور نہ ہو بلکہ اسے خوف ورجا میں رہنا چاہیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وہ اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے اور اس کی رحمت کی امید کرتے ہوئے شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

اگر مردی از مردی خود مگو — نہ ہر شہسوار بدر برد گوی

ف: یعنی ہر عابد ایسا نہیں کہ وہ اپنی عبادت میں مخلص ہو۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ یہ جملہ رَبَّکُمُ کی دوسری صفت ہے۔

عجائبات دنیا

۱۔ عالم دنیا (کہ جسے بحر محیط گھیرے ہوئے ہے) کی فراخی چوبیس ہزار فرسخ ہے ہر ہر فرسخ تین میل کا اور ہر میل بارہ ہزار ہاتھ کا اور ہر ہاتھ چھتیس انگلی کا ہوتا ہے اور ہر انگلی جَو کے چھ دانوں کی ہوتی ہے اس زمین کے بارہ ہزار فرسخ پر سودان آباد ہیں اور آٹھ ہزار بیضان اور تین ہزار پر اہلِ فارس اور ایک ہزار میل پر اہلِ عرب، یہ اہل لغت کی تحقیق ہے۔ (کذا فی کتاب الملکوت)

ف: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ارض کو اس لیے ارض کہتے ہیں کہ جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے اُسے کھا جاتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ جوافر واقدام سے روندی جاتی ہے اس لیے اسے زمین کہا جاتا ہے۔

فِرَاشًا اسے فراش بنانے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے بعض کو پانی سے ظاہر کر دیا حالانکہ اس کی طبیعت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ بھیگی ہو اور اسے سختی و نرمی میں بین بین بنایا جس پر بیٹھنا اور سونا آرام سے ہو سکتا ہے جیسے بستر بچھا ہوا ہو اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ اس کی سطح حقیقی ہو کیونکہ اس کی کُروی شکل باوجود جسم کی موٹائی کے افراش کا لائق ہے۔

وَّالسَّمَآءَ سماء اسے کہتے ہیں جو اوپر اور سایہ کیے ہوئے ہو۔ بِنَآءً یعنی آسمان تمہارے اوپر قبہ کی طرح بنایا ہوا ہے اور ہر آسمان دوسرے آسمان پر قبہ کی طرح ہے اور جو زمین کے اوپر ہو وہ آسمان ہے اس کے اطراف زمین کی جانب لٹکے ہوئے ہیں۔ (کذافی تفسیر ابی اللیث)

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً یعنی بارش جو کہ آسمان سے بادل پر پھر بادل سے زمین پر گرتی ہے اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو گمان کرتے ہیں کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے۔ فَاَخْرَجَ بِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ انگوری اگاتا ہے اس پانی کے سبب جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ مِنَ الثَّمَرٰتِ یہی جو ہم کھاتے ہیں اناج، میوہ جات وغیرہا، جو زمین اور درختوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ (کذافی التیسیر)

رِزْقًا لَّكُمْ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی میں قوتِ فاعلیت اور زمین میں قوتِ منفعلیت امانت رکھی ہے ان کے آپس میں ملنے سے پھل پھول وغیرہ پیدا ہوتے ہیں آسمان سے زمین پر پانی نازل ہونے کو عقدِ نکاح سے اور پھر اس پانی کے سبب سے اس زمین سے جو ثمر نکلتے ہیں نس سے تشبیہ دی جو کہ حیوانات پیدا ہوتے ہیں یہ سب کچھ انسان کے رزق کا سامان ہے اور مِنَ الثَّمَرٰتِ میں مِن بیانیہ ہے رِزْقًا یعنی تمہارے لیے طعام اور تمہارے جانوروں کے لئے گھاس ہے۔ اب معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر انعام کیا تاکہ تم اس کی خالقیت ورزاقیت کا اقرار کرتے ہوئے اس کی توحید پر کاربند ہو جاؤ۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا۔ اَنْدَادًا کی جمع ہے بمعنی ہم مثل یعنی اللہ تعالیٰ کا ہم مثل کسی کو نہ بناؤ تاکہ ان کی عبادت کرو۔

عقیدہ: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یوں نہ کہو کہ فلاں نہ ہوتا تو مجھے مصیبت نہ آتی اور اگر کتا میرے گھر نہ بھونکتا تو میری چوری ہو جاتی۔

حدیث شریف: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وَلَوْ سے بچو (یعنی گزشتہ بات جس کی تلقین ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی) کیونکہ یہ منافقین کا کام ہے۔ کما قال تعالیٰ: لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا اگر وہ ہمارے ہاں ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ؎

اگر عز و جاہست و اگر ذل و قید ۔۔۔ من از حق شناسم نہ از عمر و زید

ترجمہ: یہ عزّ و جاہ اور قید و بند سب اللہ تعالیٰ سے ہیں نہ کہ زید و عمرو سے۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم جانتے ہو کہ تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو اور آسمان و زمین اور تمہاری روزی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی نہ کہ بتوں نے وہ تو نہ نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔

نصیحت: آیت میں فرمایا: جَعَلَ لَكُمْ اور فرمایا: رِزْقًا لَّكُمْ اگر قیامت میں بندہ سے اللہ تعالیٰ فرمائے کہ یہ سب کچھ تو میں نے تیرے لیے پیدا فرمایا، بتا تو نے میرے لئے کیا کیا؟ اس وقت بندہ کیا جواب دے گا؟

حکایت: ایک دن شیخ شبلی وعظ فرما رہے تھے لوگوں کو قیامت کے احوال و اہوال سے ڈرا رہے تھے ادھر شیخ ابو الحسن نوری گزرے اور فرمایا: انہیں مت دھمکاؤ قیامت میں کوئی اتنا لمبا حساب نہیں ہوگا وہاں تو صرف یہ پوچھا جائے گا کہ: ؎

من ترا بودم تو کرا بودی ۔۔۔ (یعنی میں تو تیرا تھا، بتا اے بندے! تو کس کا تھا)

آیت میں یہ بتایا گیا کہ عبادت میں خلوص چاہیے اغیار دل سے دور ہو اور مالک لایزال کا تصور منقش ہو۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا: ؎

گرت بیخ اخلاص در بوم نیست ۔۔۔ دریں در کسی چوں تو محروم نیست

ترجمہ: اگر تیرے ملک میں اخلاص کی جڑ نہیں تو تیرے جیسا محروم اور کوئی نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ایک دلچسپ وعظ:۔

۱۔ اے معاذ (رضی اللہ عنہ) میں تجھے ایک بات بتاتا ہوں تو نے اسے بھلا دیا تو سمجھ لینا کہ پھر تیری حجت اللہ تعالیٰ سے ختم ہو گئی اے معاذ (رضی اللہ عنہ) اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پہلے سات فرشتے [illegible]

فرمائے ان کو ہر ایک آسمان کے لئے علیحدہ علیحدہ نگران مقرر کیا۔ پھر جب نگہبانانِ عمل بندہ کے عمل جو کہ صبح سے شام تک ہوتے ہیں پہلے آسمان تک لے جاتے ہیں اور عمل کا نور سورج کے نور کی طرح ہوتا ہے جب پہلے آسمان میں پہنچتا ہے تو زیادہ صاف ہو جاتا ہے اور اس کی نورانیت میں اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ جب وہ اوپر کو جانے کا ارادہ کرتے ہیں کہ تو وہی فرشتہ کہتا ہے: ٹھہر جاؤ! اس عمل کو صاحب عمل کے منہ پر دے مارو۔ کیونکہ یہ گلہ گو ہے اور مجھے حکم ہے کہ جس بندہ کی عادت گلہ کی ہو اس کے اعمال اوپر نہ جانے دوں اور یہ بندہ چونکہ گلہ گو ہے بنابریں اس کے اعمال کو واپس زمین پر بھیج دو۔

زبان آمد از بہر شکر و سپاس　　　بغیبت نگرداند حق شناس

ترجمہ: زبان صرف شکر اور تعریف کرنے کے لئے بنی ہے اس کو کسی کی غیبت کے ساتھ حق شناس یعنی خدا کو پہچاننے والی نہیں بنایا جا سکتا۔

۲۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس بندہ کے دیگر اعمال صالحہ حفظہ (فرشتے) لاتے ہیں: جس سے ان اعمال کو اوپر دوسرے آسمان کی جانب جانے کی اجازت ملتی ہے لیکن دوسرے آسمان تک پہنچتے ہی ملک فرشتہ مقرر شدہ آجاتا ہے اور کہتا ہے: یہ عمل صاحب عمل کو لوٹا دو کیونکہ یہ متکبر انسان ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ متکبر کے اعمال اوپر نہ جانے دو اور یہ بندہ اپنے اعمال سے اسبابِ دنیا کے حصول کا خواہشمند ہے۔

چہ زنار مغ در میانت چہ دلق　　　کہ در پوشی از بہر پندار خلق

ف: ہوشمند اور عقلمند انسان عاجزی کو اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے کیونکہ پھل سے بھری ہوئی شاخ اور ٹہنی زمین پر سر رکھے ہوئے ہوتی ہے یعنی جھکی ہوئی ہوتی ہے۔

۳۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پھر اس کے اعمال اوپر چڑھائے جاتے ہیں جنہیں صوم و صدقہ اور صلوٰۃ کی وجہ سے نرالی رونق ہوتی ہے جسے حفظہ (فرشتے) دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں لیکن جب تیسرے آسمان تک پہنچتے ہیں تو فرشتہ مؤکل کہتا ہے: ٹھہر جاؤ اس کے اعمال اوپر نہیں جا سکتے کیونکہ یہ شخص متکبر ہے جہاں بیٹھتا ہے تکبر کرتا ہے اور مجھے حکم ہے کہ ایسے آدمی کے اعمال اوپر نہ جانے دوں فلہٰذا اس کے اعمال اس کے منہ پر دے مارو۔

فروتن بود ہوشمند گزیں　　　نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں

ترجمہ: ہوشمند اور پسندیدہ انسان ہی تواضع والا ہے اس لئے کہ میوہ سے بھرپور ٹہنی ہی سرزمین پر رکھتی ہے۔

۴۔حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پھر اس کے اعمال اوپر چڑھائے جاتے ہیں اس کی صلوٰۃ اور تسبیح وحج وعمرہ کی وجہ سے ستارہ کی طرح اعمال میں رونق ہوتی ہے یہاں تک کہ چوتھے آسمان میں پہنچتے ہیں وہاں پر مقرر شدہ فرشتہ کہتا ہے: ٹھہر جاؤ اس کے اعمال اس کے منہ دے مارو یہ تو خود بینی میں مبتلا ہے اور مجھے حکم ہے کہ خود بین کے اعمال اوپر کو نہ آنے دوں۔

چوں روئے بخدمت نہی برزمیں　　　　خدا را ثنا گوئی خود را مبیں

ترجمہ : جب تم اپنا چہرہ خدمت کے طور پر زمین پر رکھ دو تو پھر خدا کی تعریف کر و اپنے آپ کو نہ دیکھو۔

۵۔حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: جب اسے پانچویں آسمان کی جانب لے جاتے ہیں ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ عمل نئی دلہن ہے جو اپنے دولہا کے ہاں بھیجی جارہی ہے یہاں بھی وہی مؤکل فرشتہ کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ اس کے عمل اس کے منہ پر دے مارو اس میں حسد کا مرض ہے اور مجھے حکم ہے کہ جس میں حسد کی بلا ہے اس کے اعمال اوپر نہ جانے دوں۔

عقبہ زیں صعب تر در راہ نیست　　　　ای خنک آنکس حسد ہمراہ نیست

ترجمہ : کوئی عقبہ راہ سلوک میں اس سے سخت تر نہیں ،وہ خوش قسمت سالک ہے جس کے اندر حسد نہیں۔

۶۔حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ملائکہ عمل صوم وصلوٰۃ وحج وعمرہ کو چھٹے آسمان پر لے جاتے ہیں تو حسب دستور فرشتہ آجاتا ہے کہتا ہے: ٹھہر جاؤ اس کے عمل اس کے منہ پر مارو۔ یہ تو کسی پر رحم نہ کرتا تھا بلکہ انہیں اگر کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو ان کو گالیاں دیتا اور مجھے حکم ہے کہ جو لوگوں پر رحم نہ کرے اس کے عمل اوپر نہ جانے دوں۔

اشک خواہی رحم کن بر اشکبار　　　　رحم خواہی بر ضعیفاں رحم را

ترجمہ : اگر تجھے دائمی راحت مطلوب ہے تو آنسو بہانے پر رحم کر، رحم الٰہی کی طلب ہے تو ضعیفوں پر رحم کیجئے۔

۷۔حضور علیہ السلام نے فرمایا: بندہ کے اعمال کو ساتویں آسمان کی جانب لے جاتے ہیں جو کہ صوم وصلوٰۃ وفقہ واجتہاد وورع پر مشتمل ہوتے ہیں اس کی آواز شہد کی طرح ہوتی ہے اور اس کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح ہوتی ہے اور اس کے ساتھ تین ہزار فرشتے ہوتے ہیں تو مقرر فرشتہ کہتا ہے: ٹھہر جاؤ اس کے عمل اس کے منہ پر مارو کیونکہ یہ تو اس لئے عمل کرتا تھا کہ میرا فقہاء کے سامنے درجہ بلند ہوا۔ علماء پر میرا سکہ جما ہوا ہو شہروں میں میری شہرت ہو بنا بریں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم ہے اور اس کے دل پر مہر لگ چکی ہے اسے میں آگے

نہیں جانے دوں گا کیونکہ مجھے حکم ہے کہ جوریا کار ہوا سے دربارِ خداوندی میں مت آنے دوں۔

بروئے ریا خرقہ سہلست دوخت گرش با خدا در توانی فروخت

ترجمہ : ریا کا خرقہ پہننا آسان ہے لیکن بارگاہِ خداوندی میں ایسے خرقہ کی رسائی نہیں۔

۸۔حضور علیہ السلام فرماتے ہیں بندہ کے اعمال ساتوں آسمان سے گزر کر کے حجابات کو طے کرتے ہوئے مالکِ لایزال کے حضور میں جا پہنچتے ہیں اور ملائکہ عرض کرتے ہیں: اے الٰہ العالمین! یہ صرف تیرے لیے خالص مخلص ہو کر حاضر کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے فرشتو! تم اس کے ظاہر پر نگہبانی کرتے ہو مجھے اس کے دل کے اسرار کا علم ہے یہ تو خالص میرے لئے عمل نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا میرے غیر کی طرف دھیان تھا پس اس پر میری لعنت ہے، فرشتے کہتے ہیں: تیری لعنت ہے تو ہم سب کی بھی اس پر لعنت، بلکہ ساتوں آسمانوں وزمین اور جو ان میں ہے سب اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

معاذ رضی اللہ عنہ کی معروض:۔حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں: حضور! اب تو نجات مشکل ہے کیونکہ ہم میں نہ تو خلوص ہے اور نہ احسن عمل۔ آپ نے فرمایا: اے معاذ! میری اقتداء کو نہ چھوڑ، یقین پختہ رکھ عمل میں کوتاہی ہوا ہی کرتی ہے، اپنی زبان کو اپنے بھائیوں کے گلہ سے بچا، اپنے آپ کو اچھا نہ سمجھ، اور دنیا کے عمل کو اُخروی امور میں داخل مت کر اور لوگوں میں تفریق نہ ڈال تا کہ تجھے دوزخ کے کتے پھاڑ نہ ڈالیں اور اپنے اعمال میں ریاکاری مت کر۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

اے ہنرہا نہادہ بر کف دست . عیبہا برگرفتہ زیر بغل

تا چہ خواہی خریدن اے مغرور روز درماندگی بسیم دغل

ترجمہ : اے فلاں! تو ہنر تو ہاتھ کی ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے لیکن اپنے عیوب بغلوں میں اس سے تجھے کیا حاصل، جبکہ سودا خریدتے وقت تیرا سکہ ہی کھوٹا ہے۔

حکایت: حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ تیس سال متواتر عبادت سے ایک روز میرا جی اُکتا رہا تھا کہ نیند میں کسی کا یہ فرمان سنائی دیا کہ اے ابو یزید! اللہ تعالیٰ کے خزینے عبادت سے پُر ہیں اگر تو اسے ملنا

چاہتا ہے تو عجز اور زاری و ذلت اختیار کر، اسی بنا پر ابو یزید قدس سرہٗ نے عرض کی:

چار چیز آوردہ ام شاہا کہ در گنج تو نیست نیستی و حاجت و جُرم و گناہ آوردہ ام

ترجمہ : اے شاہا! چار چیزیں تیرے خزانے میں نہیں۔۱۔نیستی، ۲۔حاجت، ۳۔جرم، ۴۔گناہ۔

یہ آپ نے اس وقت کہا جبکہ اس پر حقیقت کے مبشرات نے طلوع کر کے کہا کہ ہمیں کچھ دیجئے، جب آپ نے یہی ہدیہ پیش کیا تو کہا گیا واقعی تو نے قابلِ تحسین ہدیہ پیش کیا اب دربار میں داخل ہونے کا مستحق ہے فلہٰذا بڑی خوشی سے دربار میں حاضر ہو جا۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ میں لوگ مخاطب ہیں جو روزِ اول کے عہدِ الوہیت اور اقرارِ ربوبیت کو بھول گئے اور ان کے معاہدہ ہو چکا تھا کہ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ لیکن یہ اس کے برعکس ہوئے اور عہد کو توڑ کر اصنامِ دنیا و خواہش نفسانی اور شیطان کے پیچھے پڑ گئے جس سے ان کے اقدام راہِ توحید سے بھٹک کر شرک و ہلاکت کے گڑھے میں جا پہنچے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف انبیاء و رسل علیہم السلام کتابیں دیکر مبعوث فرمائے جو کہ انہوں نے آ کر نسیان و شرک کی خبر دی اور توحید و عبادت کی دعوت دی اور فرمایا يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی تمہارے اور تم سے پہلے لوگوں کے ارواح پیدا کیے اور تم سے عہد و پیمان لیے فلہٰذا تم اپنے وعدوں کو پورا کرو زبان کو توحید سے تر اور دل کو تجرید سے مزین اور روح کو تفرید سے آراستہ اور ترکِ محظورات اور اقامتِ طاعات سے نفس کا تزکیہ کرو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم غیر اللہ کی عبادت کرنے کے شرک سے بچ جاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا کہ تمہیں دوزخ کے عذاب سے نجات اور جنت میں رفع درجات اور دنیا میں قربات کی کرم بخشی اور آخرت میں کرامات سے نوازش فرمائے گا جیسا تمہیں دنیا میں نوازا کہ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کی تعریف اور بندوں پر منت اور انسان کو جمیع مخلوقات سے فضیلت کا بیان فرمایا۔ اپنی قدرتِ کاملہ کی تعریف الَّذِىْ جَعَلَ میں اور بندوں پر بیان لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً میں یعنی خاص طور پر یہ اشیا تمہارے لیے پیدا فرمائیں اور انسانوں کو جمیع مخلوقات پر فضیلت اس لحاظ سے ہے کہ یہ اشیا تمام ان کے لئے پیدا فرما کر پھر ان کے لئے مسخر فرما دیا۔ کما قال تعالیٰ: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى

مخلوق کا وجود انسان کے وجود کا تابع ہے اور جو شے کسی کی تابع ہو وہ مقصود لذاتہ نہیں ہوا کرتی یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر غیر اللہ کا سجدہ حرام کر دیا ملائکہ اگر چہ آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا ہوئے اور تمام مخلوق سے افضل تھے لیکن جب آدم علیہ السلام پیدا ہوئے تو ملائکہ کے مسجود الیہ اور مخلوقات سے افضل واکرام قرار دیے گئے آدم زادے تمام کے متبوع اور باقی ان کے تابع ہوئے ۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ تحقیق یہ ہے کہ مَآءً سے مراد قرآن شریف ہے اور ثمرات سے ہدایت، تقویٰ، نور، رحمت، شفا، برکت، ویمن، سعادت وقربت، حق الیقین، نجات ورفعت، صلاح وفلاح، حکمت وحلم وعلم، آداب واخلاق، عزت وغنیٰ، المتین عروۃ الوثقیٰ سے تمسک، حبل اللہ کا اعتصام، ہر بھلائی کو جمع کرنا، ہر سعادت پر خاتمہ اور باطل وجود انسانی کا مٹا جبکہ حقیقتِ صفاتِ ربانیہ کی تجلیات کا ورود مراد ہے۔ کما قال عزوجل: قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے سبب سے اپنے بندوں کو قلوب کی زمین میں مذکورہ ثمرات لگائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ثمرات (تمہارے رزق کے لئے) نکالنے پر بندوں پر منت لگائی۔

اگر چہ اس میں حیوانات کا رزق بھی ہے لیکن انسان کے تابع ہو کر، لیکن اس کا ادراک ان عقول کو ہو سکے گا جو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مؤید ہیں۔ اسی لحاظ سے فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا اللہ تعالیٰ کے لئے شریک مت ٹھہراؤ۔

اس میں تین تقریریں ہیں: ا۔ یہ جو میں نے تمہاری پیدائش اور آسمان وزمین اور جو ان میں ہے صرف تمہارے لئے بنائے لیکن یہ میرے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اسی لحاظ سے تمہیں چاہیے کہ میرے لئے شریک مت ٹھہراؤ۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اس کا تمہیں علم بھی ہے۔

۲۔ یہ آسمان وزمین اور سورج وچاند سب تمہارے رزق کے اسباب ہیں اور روزی رساں صرف میں ہی ہوں اب تمہیں چاہیے کہ وسائل مت پوچھو، اس لحاظ سے نہ سورج عبادت کے لائق ہے نہ چاند۔

۳۔ میں نے تمام موجودات کو پیدا کیا اور ہر موجود کے لئے شے دیگر خط مقرر فرمایا اور انسانوں کا خط میری محبت ومعرفت ہے اور قاعدہ ہے کہ جس سے خط منقطع ہو جائے وہ ہلاک ہو جاتی ہے اب تم بھی اپنے خطوط کو منقطع نہ کرو کہ میری محبت ومعرفت سے ہٹ کر بتوں کی محبت میں پھنس رہے ہو اور پھر شرک کے گڑھے میں ہلاک

ہور ہے ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ

اس معنیٰ پر یہاں اَنْدَادًا بمعنی کسی کا محبوب جو اللہ تعالیٰ کا غیر ہو پھر اس کے بعد ان کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے منقطع نہیں ہوئے۔ کما قال عزوجل: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (وہ جو مومن ہیں وہ اللہ کی محبت میں سخت ہیں) یعنی جو لوگ محبت سے غیر اللہ کو معبود ٹھہراتے ہیں وہ حقیقۃً مومن نہیں اگر چہ دعویٰ کرتے ہوں کہ ہم مومن ہیں۔

تنبیہ: اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لے۔ ایمان تقلیدی جو تجھے وراثت میں ملا ہے اس پر مغرور نہ ہو۔

تفسیر عالمانہ

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یعنی وہ قرآن جو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہم نے نازل کیا ہے اگر تم اس میں شک کرتے ہو اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ سے وحی منزل ہے یا نہ۔

حل لغات: تنزیل بمعنیٰ علی سبیل التدریج نازل ہونا، قرآن پاک کو پہلے یکبارگی آسمانِ دنیا میں بیت العزۃ کی طرف نازل کیا گیا۔ پھر اس سے تھوڑا تھوڑا حسبِ ضرورت تیئس سال کے عرصے میں نازل کیا گیا تا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرلیں کیونکہ وہ اُمّی نبی تھے جو نہ لکھتے تھے اور نہ پڑھتے تھے بنا بریں آہستہ آہستہ نازل کیا گیا تا کہ قرآن پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اچھی طرح محفوظ ہو جائے بخلاف باقی انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ لکھے پڑھے تھے ان پر کتاب کے تمام اجزاء یاد کرنا آسان تھا اسی لئے دیگر کتب کو یکبارگی نازل کیا گیا۔

فَاْتُوْا شرط کا جواب ہے اور یہ امر تعجیز کا ہے۔ بِسُوْرَةٍ تو لاؤ ایک سورت۔ سورت قرآن کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کا اول و آخر معلوم ہو اور کم از کم تین آیتیں ہوں، اس کا ماٰخذ سورۃ الاسد و سورۃ الشراب ہے بمعنی قوت ہے اور چونکہ یہ آیت سے زیادہ قوی ہوتی ہے اس لیے اس نام سے موسوم ہوئی لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ واؤ اصلی ہو اگر ہمزہ سے منقلب ہو تو اس کا ماٰخذ سئور بمعنی بقیۃ من الشئی ہوگا اور سورۃ بھی قرآن پاک کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے اور دیگر سورتوں سے جدا ہو کر بمنزلہ بقیہ کے ہوتی ہے اس لیے اس نام سے موسوم ہوئی مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی وہ سورۃ قرآن کی طرح ہو گی غریب بیان اور علو طبقہ اور حسنِ نظم میں مِثْلِهٖ کی ضمیر اَنْزَلْنَا کی

طرف راجع ہوگی یعنی تم اس طرح لے آؤ اگر تمہارے گمان میں یہی ہے کہ یہ کلام بشر کا ہے تم اور وہ جو ہر خلقت وزبان میں برابر ہو وہ پیدائشی حیثیت سے تم سے اولیٰ نہیں ہے۔

مسئلہ : قرآن پاک چونکہ بے نظیر کلام ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت اور اس کا کلام اور وحی ہے اور اس کے صفات کی اس کی ذات کی طرح کوئی شے مثل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے یہ اے کفار! تمہارے گمان کے مطابق اس کی کوئی مثل ہے تو لے آؤ، کیونکہ وہ لوگ کہتے تھے: **لو شئنا لقلنا مثل هذه (كذافي التيسير)** اگر ہم چاہیں تو ایسا کہہ دیں۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ شہداء شہید کی جمع ہے بمعنیٰ حاضر یا **قائم الشهادة** یا ناصر مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ یا تو **اُدْعُوْا** کے متعلق ہے اب معنیٰ یوں ہوگا کہ تم انہیں بلاؤ جو اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمہارے پاس حاضر ہیں جو بھی ہو قرآن کے معارضہ میں تمہاری مدد کریں یا وہ لوگ جو تمہارے مشاہد و محاضر میں تمہارے رؤسا و شرفاء کہ جن کی طرف تم اپنی تکالیف میں گڑگڑاتے اور اپنے دکھ و درد میں ان پر بھروسہ کرتے ہو یا وہ لوگ جو تمہاری شہادت (جو تمہارے مابین جاری ہے) پر قائم ہیں یعنی تمہارے گمان کے مطابق انسان ہیں یا جن تا کہ تمہاری مدد کریں یا یہ تو **اُدْعُوْا** کے متعلق ہے اب اس سے مراد ان کے بُت ہیں۔

ف : دُوْنِ بمعنیٰ تجاوز ہے اور ظرف مستقر ہے جو مخاطبین کی ضمیر سے حال واقع ہوا ہے اور اس کا حال شُهَدَآءَكُمْ کا مدلول ہے اب عبارت یوں ہوگی: **اُدعوا اصناكم اللذين اتخذتموهم الهة وزعمتهم انهم يشهدون لكم يوم القيمة. الخ** یعنی اپنے ان بتوں کو بلاؤ جن کو تم اپنا معبود سمجھتے ہو اور تمہارا گمان ہے کہ وہ قیامت میں تمہارے لیے گواہی دیں گے کہ تم حق پر تھے تم اللہ تعالیٰ کے ماسوا ان کو اپنا معبود سمجھتے ہو۔

مسئلہ : مخلوق سے مدد طلب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی وہ کسی تکلیف کو دفع کر سکیں گے فلہٰذا تمہیں چاہیے کہ اپنے حوائج صرف اس ذات کے سامنے پیش کرو جس پر ضرورت کا پورا کرنا مشکل نہ ہو اور سوال اس سے کرو جس کے خزینے نہ مٹنے والے ہوں اور سہارا صرف اسی پر کرو جو کسی سے عاجز نہ ہو کسی کی مدد کرنے میں کسی دیگر کی امداد نہ مانگے اور وہ ہر طرح کی حفاظت کرے کسی ذریعہ کے بغیر اور مال کے بغیر غنی کو دے اور جب کسی کو مدد کرنا چاہے تو اعداد کثیر قلیل ہو جائیں اور جب کسی کی کفایت کرے تو تھوڑا سا مال کثیر ہو جائے۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم سچے ہو کہ سید عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس قرآن کو اپنی طرف سے بناتے ہیں اور تمہارے معبود بھی تمہارے ساتھ ہیں یہ شرط ہے اس کی جزاء محذوف ہے یعنی فافعلو ا یعنی تم اس جیسا لے آ ؤ اگر تم سچے ہو تو کرو۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا یعنی وہ جو تمہیں قرآن جیسی نظیر لانے کا حکم دیا گیا ہے اگر اپنی جدو جہد کرنے کے بعد بھی تم نہیں کر سکتے وَلَنْ تَفْعَلُوْا اور زمانہ مستقبل میں بھی تم ہرگز نہیں لاسکو گے اس میں قرآن کا معجزہ ظاہر کرنا ہے جو دراصل نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے شرط و جزاء کے مابین جملہ معترضہ لایا گیا ہے اور یہ ایسا معجزہ جو ایسے غیب کی خبر دی گئی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا خاص تھا اور وہ ہو کر رہا کیوں نہ ہوا گر ان لوگوں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معارضہ کیا ہوتا تو سلف سے خلف میں کوئی ناقل اسے نقل کرتا لیکن نہ معارضہ ہوا نہ کسی نے نقل کیا فَاتَّقُوا النَّارَ یعنی جب تم معارضہ قرآن سے عاجز ہو گئے اور اس کی مثال نہ لا سکے تو تم پر حجت لازم ہوگئی کہ اس بات کا اقرار کرو کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم میرے رسول برحق ہیں اور قرآن پاک میری ہی نازل کردہ کتاب ہے کیونکہ تم پر بوجہ لزوم حجت ان کی تصدیق کرنا اور ان پر ایمان لانا لازم ہوگیا اگر تم پھر بھی ایمان نہ لاؤ گے تو تم اہلِ نار ہو گئے پس تم ڈرتے رہو۔

کشاف میں ہے کہ دوزخ سے بچنے کا سبب ترک عناد ہے اس حیثیت سے کہ اس کے نتائج سے جو عناد کو چھوڑے گا وہ دوزخ سے بچ جائے گا اس بنا پر فاتر کو العناد کی بجائے فَاتَّقُوا النَّارَ کہا گیا اَلَّتِیْ وَقُوْدُ، وَقُوْدُ ہر وہ شے (کہ جس سے آگ جلائی جائے) کو کہا جاتا ہے النَّاسُ یعنی مجرم لوگ وَالْحِجَارَةُ یعنی کبریت کا پتھر، اسے اس لئے ایندھن بنایا گیا کہ اس میں آگ جلدی اثر کرتی ہے اور پھر بجھتا دیر سے ہے اور اس میں گرمی بڑی شدت کی اور بدبو ہوتی ہے اور بدن پر جلد چمٹتا ہے یا الْحِجَارَةُ سے مراد کفار کے بُت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے۔

سوال: بُتوں نے کون سا جرم کیا کہ ان کو بلاوجہ عذاب دیا جا رہا ہے؟

جواب: تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ یہ عبادت کے مستحق نہ تھے اور کفار دیکھ لیں کہ جنہیں وہ عزیز ترین سمجھتے تھے دراصل ذلیل ترین ہیں اور کفار نے بتوں کی پرستش کی ان سے اس بات کی امید رکھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے بتوں کو عذاب دیا تاکہ ان کی جہالت کا اظہار اور ان کی بت سے امید منقطع ہو جیسے بڑے لوگوں کے تابعدار ان سے فائدہ کی امید پر ان کی خدمت کرتے ہیں پھر کفار اپنے بتوں سمیت دوزخ میں جائیں گے تاکہ ان پر عذاب کی

شدت ہو اور ان سے امیدیں منقطع ہوں۔

سوال : کیا تمام جہنم کا ایندھن آگ اور پتھر ہوں گے یا مختلف مقامات اور مخصوص طبقات؟

جواب: مخصوص طبقات کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، جیسے کہ نار" کی تنکیر بتاتی ہے۔ کما قال عزوجل قُوٓا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا (خود کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ) اور فرمایا: فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى (میں نے ڈرایا ایسی آگ سے جو شعلہ مارتی ہے) اور ہو سکتا ہے کہ جنات، کفار اور ان کے شیاطین کے لیے قسم کی آگ ہو اور انس کی نسل اور شیاطین کے لئے دوسری قسم کی آگ ہو وہ اس کے ایندھن اس لئے بنائے جائیں گے تاکہ ان کے اعمال کی سزا ملے کیونکہ ہر جنس کا عذاب اعمال کے موافق ہونا چاہیے۔ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ یعنی جہنم ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی جو قرآن کو نہیں مانتے۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ دوزخ مخلوق ہے اور اس وقت موجود ہے معتزلہ فرقہ اس کا منکر ہے۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا پڑھنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار دوزخ سے بچنے کا ثمر ہیں کہ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔

مسئلہ : قرآن اور قرآن خواں کی فضیلت کا بیان بھی ہو گیا چنانچہ علامہ بغوی علیہ الرحمہ فَاْتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ سورۃ سے ایک بلند مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں یہاں تک کہ سورتوں کو ختم کرنے پر تمام مراتب طے کر لیتے ہیں۔

حکایت: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر شام کو ہر شیطان اپنے سردار کی طرف واپس ہو کر اپنے کردار کا پتا دیتا ہے کوئی کہتا ہے میں نے یوں کیا، کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں زاہد کو دھوکا کے در برائی کرالی یہاں تک کہ سب سے ذلیل ترین شیطان کہتا ہے کہ میں نے ایک لڑکے کو قرآن پڑھنے سے روک لیا ہے اس بات پر شیطان اٹھ کر اس کی تعظیم کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ بٹھاتا ہے اور بہت خوش ہوتا ہے۔

مسئلہ : ماں باپ پر اولاد کے تین حقوق ہیں:۔

۱۔ نام اچھا رکھنا ۲۔ قرآن و ادب سکھائیں ۳۔ لڑکے کا ختنہ کرائیں

ف: قرآن سے اصلی غرض اس پر عمل کرنا اور اس کے آداب سے متادب ہونا ہے مراد از نزول قرآن تحصیل

سیرت خوب است نہ ترتیل سورہ مکتوب ۔ **ترجمہ** : (نزول قرآن کا مقصد اچھی سیرت بنانا ہے نہ کہ صرف اچھی ترتیل)

ف : قرآن کا ایک ظاہر اور ایک باطن، پھر اس کا باطن اور باطن کا باطن، یہاں تک کہ سات باطن مثنوی شریف میں ہے:

توز قرآن اے پسر ظاہر مبین　　دیو آدم را نہ بیند جز کہ طین

ظاہر قرآن چو شخص آدمیست　　کہ جسمش ظاہر و جانش خفیست

ترجمہ : اے بیٹے! تو قرآن کے ظاہر کو دیکھ صرف ظاہر تو شیطان نے آدم کی مٹی کا گارا دیکھا۔

ظاہر قرآن کی مثال انسان کے ظاہر چمڑے کی ہے اور اس کے باطن کی مثال اس کی روح کی ہے جو انسان کے اندر پوشیدہ ہے

تفسیر صوفیانہ

شیخ نجم دایہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ قرآن ظاہر تو وہی ہے جس کی تفسیر علماء نے فرمائی اور باطن وہ ہے جس کی حقیقت اہلِ حق نے بیان کی لیکن شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت کے موافق ہو اور قرآن وحدیث اس تفسیر کی شہادت دیں ورنہ نرا الحاد و زندقہ ہے کماقال عزوجل:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ، وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا معترضین کے اعتراض کو اپنے حبیب علیہ السلام کے لئے اپنی غیرت کے نقاب کھڑے کر دیئے تاکہ اس حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نہ کر سکیں اور معترضین کے اعتراض کو اپنے عزت کے پردے متعین کیے تاکہ اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے اسرار سے یہ لوگ محروم رہیں۔

سوال : اپنے صلی اللہ علیہ وسلم پر عبد مطلق کا اطلاق کیوں کیا حالانکہ دیگر عباد کو مقید کر کے یاد فرماتا ہے۔ **کما قال تعالیٰ** : **وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ** اور فرمایا: **وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ** وغیرہما۔ ہمارے عبد ایوب اور داؤد وغیرہما کو یاد کیجئے۔

جواب : کمالِ عبودت کے لئے سوائے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی دوسرا تیار نہیں ہوا اور کمال عبودیت ماسوی اللہ سے آزاد ہونے کا نام ہے اور یہ رتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: **مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ، فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ** سے وہ لوگ مراد ہیں جو یوم میثاق میں تمہارے ساتھ تھے کیونکہ تم اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم **اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ** کا خطاب سننے والے تھے اور بلیٰ

کہنے میں سب شریک تھے پس اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے قرآن بنانے پر قادر ہیں تو تم بھی فطرتِ انسانی میں ان کے برابر ہو فلہٰذا تم بھی قرآن اپنے طور بنا کر لے آؤ۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو پس اگر نہیں کر سکتے اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو آگ سے ڈرو یعنی قہر سے جو غضب حق کی صورت میں ظاہر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ سے فرمایا: ''تو میرا عذاب ہے تیرے سبب سے جسے چاہوں عذاب دوں''

وَقُوْدُهَا النَّاسُ، وَقُوْدُهَا سے مراد انسان کی انانیت ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھلا دے وَالْحِجَارَةُ یعنی سونا کہ جس سے نفس کے شہوات و خواہشات اور اس کی طبعی اغراض حاصل ہوتی ہیں انسان کی انانیت عبادت کرتی ہے اسے الْحِجَارَةُ سے اس لیے تعبیر کیا کہ کفار کے بت اکثر پتھروں کے تھے اور انسان کی انانیت کو النَّاس سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ وہ انانیت معاہدہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ اور حق کو بھلا کر غیر کی پرستش کرتی اور غیر کی طالب رہتی ہے اسی لیے اسے نار کا ایندھن بنایا۔ کما قال عزوجل:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (بیشک تم اور تمہارے بت جہنم کا ایندھن ہیں)

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ خصوصاً وہ آگ صرف کفار کے لئے تیار کی گئی ہے لیکن مجرموں مومنوں کو کفار کی تابعداری میں انہیں پاک کرنے کی خاطر دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

جیسا کہ بہشت پیدا تو متقین کے لئے کی گئی ہے لیکن گنہگار مومن کو دوزخ میں داخل کر کے طاہر و مطہر کر کے داخل کیے جائیں گے متقین کی تابعداری کے لحاظ سے جیسے کہ حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''میں بہشت پیدا کی اور پھر اس کے اہل بھی پیدا کیے جو بہشت والے عمل کر کے بہشت میں داخل ہوتے ہیں اور دوزخ پیدا کی اور اس کے اہل بھی پیدا کیے جو دوزخ والے عمل کر کے دوزخ میں داخل ہوں گے۔''

تفسیر عالمانہ

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا **حل لغات**: بشارۃ ہر اس خبر کو کہتے ہیں جسے سن کر سرور و فرحت حاصل ہو۔ اب معنی یہ ہوا کہ محمد سید عربی صلی اللہ علیہ وسلم جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے ان کے دلوں کو خوش فرمایئے اس معنیٰ کے لحاظ سے خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا۔

(بعض مفسرین) فرماتے ہیں کہ یہ خطاب ہر اس کے لئے ہے جسے یہ خوشخبری ملے گی جیسا کہ حدیث شریف میں

ہے: بشر المشامین الی المساجد الخ۔ (مساجد کو جانے والوں کو خوشخبری دو) یعنی مساجد کی طرف اندھیری راتوں میں جانے والوں کو قیامت میں نورِ تام کی خوشخبری ہو۔ یہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جسے یہ خوشخبری حاصل ہوگی، یہ کسی ایک فردِ مخصوص کو خطاب ہے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک عمل کرتے ہیں اور صالح عمل وہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔

مسئلہ: عمل کے ایمان پر عطف لانے میں اشارہ ہے کہ ایمان و عمل ایک دوسرے کے غیر نہیں اور بتایا جا رہا ہے کہ بہشت کے داخلہ کا دارومدار دونوں پر ہے کیونکہ ایمان بمنزلہ اساس کے ہے اور عمل صالح بمنزلہ تعمیر کے جس اساس پر تعمیر نہ ہو وہ اساس بھی بیکار اور عمل صالح کے بغیر بہشت کی طلب سفہاء کا کام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہشت کے داخلہ کا سبب عمل صالح قرار دیا ہے اگر چہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو صرف ایمان کی وجہ سے بہشت میں داخل کر دے لیکن عمل صالح ایمان کی نورانیت کو بڑھاتا ہے اور اسی سے انسان کا دل روشن ہوتا ہے ان میں سب سے پہلا عقبہ ایمان کا ہے اس میں دیکھا جاتا ہے کہ اس عقبہ سے اس کا ایمان بچ گیا یا نہ، اس لحاظ سے عمل صالح لازم ہوا تاکہ باقی عقبات سہولت سے طے ہوں۔

اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ ان کے لئے باغات ہیں جن میں پھلدار درخت ہیں اور جنت اسے بھی کہتے ہیں جس میں کھجور کے درخت ہوں اور فردوس وہ ہے جس میں انگور ہوں۔ کذا قال الضراء، اور جنت کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسری سے لپٹی ہوتی ہیں اور پھر وہ مقام درختوں سے ڈھکا چھپا ہوتا ہے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک پردہ ہے اور جنّۃ" بروزن فعلۃ" یکبار کرنے کے معنیٰ میں ہے۔

سوال: دار الثواب کو دار الثواب کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ تو ایسی جگہ ہے کہ نہ تو اس کے محلات گنے جا سکتے ہیں اور نہ ہی دریچے۔

جواب: اس لیے کہ یہ نعمتوں کا بہت بڑا ماویٰ وملاذ ہے۔

سوال: جنّات کو جمع اور پھر نکرہ کر کے کیوں لایا گیا؟

جواب: دراصل جنت دار الثواب کے مجموعے کا نام ہے اور اس میں کئی جنتیں ہیں اور عابدین کے مراتب کے مطابق ہر ایک کے درجات مقرر ہیں پھر ان کے ہر الگ الگ طبقہ کا نام جنت ہے اور وہ کُل آٹھ ہیں:

۱۔ دار الجلال: یہ تمام نور ہی نور ہے شہر، گھر، محلات، برتن، دروازے، کھڑکیاں، بالاخانے، اوپر نیچے، پردے اور زیورات غرضیکہ جو شئے بھی اس میں ہے تمام نور کی ہے۔

۲۔ دار القرار : اس میں تمام اشیاء مرجان کی ہیں۔

۳۔ دار السلام : اس میں تمام چیزیں یاقوت احمر کی ہیں۔

۴۔ جنة عدن: اس کی تمام اشیاء زبرجد کی ہیں۔

۵۔ جنة الماویٰ : یہ خالص سونے کی ہے۔

۶۔ جنة الخلد : یہ خالص چاندی کی ہے۔

۷۔ جنة الفردوس : یہ لؤلوء (موتی) کی ہے اور اس کی دیوار کی اینٹیں ایک سونے اور ایک چاندی کی اور ایک یاقوت اور ایک زبرجد کی اور اس کا گارا مشکِ خالص کا ہے اور اس کے محلات یاقوت اور بالاخانے لؤلؤ کے اس کا میدان سونے کا اور زمین چاندی کی اور روڑے مرجان کے اور مٹی مشک کی اور انگوری، زعفران وعنبر کی۔

۸۔ جنة النعیم: یہ زبرجد کی ہے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ جب مومن بہشت میں داخل ہوگا ستر ہزار باغ دیکھے گا اس باغ میں ستر ہزار درخت ہوں گے اور ہر درخت پر ستر ہزار پتے ہوں گے اور ہر پتے پر لکھا ہوگا **لا الہ الا محمد رسول اللہ** (صلی اللہ علیہ وسلم اُمّۃ" مذنبۃ و ربّ" غَفُوْر") اور ہر پتے کی چوڑائی کی مسافت مشرق ومغرب کے مابین فاصلہ ہے۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یہ جملہ جنّات کی صفت ہے اور انھٰر، نھر بفتح الھاء و سکونھا کی جمع ہے یہ جدول سے بڑی اور دریا سے چھوٹی اور پانی کے جاری ہونے کا نام ہے جیسے نہل جو مصر کی نہر ہے اس سے اس کا پانی مراد ہے۔

سوال : باغات کے نیچے نہریں کیسے جاری ہوں گی؟

جواب: آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہروں کے کنارے درخت ہوتے ہیں اور پھر ان کے نیچے پانی جاری ہوتا ہے

اسی طرح بہشت کے باغات ہوں گے۔

ف: مسروق فرماتے ہیں کہ بہشت کی نہریں بغیر گڑھے کے جاری ہوں گی۔

ف: سب سے زیادہ پاکیزہ اور اچھا باغ وہ ہوتا ہے کہ جس کے درخت گھنے اور ان میں نہریں جاری ہوں اس کے بغیر باغ میں حسن وکمال اور راحت وسرور پیدا نہیں ہوتا پھر وہ باغ تصویر کی مانند ہوگا جس میں روح نہ ہو یا مثل اس جسم کے کہ جس میں جان نہ ہو اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں بہشت کا ذکر فرمایا ہے وہاں نہر جاری کا بیان بھی فرمایا۔

ف: نہریں چار قسم کی ہوں گی۔ ۱۔شرب کی ۲۔دودھ کی ۳۔شہد کی ۴۔پانی کی

جب پانی کی نہر سے کچھ پئیں گے تو ان کے بدنوں میں تربیت آجائے گی کہ اس کے بعد پھر کم نہیں ہوں گے جب شہد سے کچھ پئیں گے تو شفاء وتندرستی پائیں گے اس کے بعد پھر بیمار نہیں ہوں گے جب شراب کی نہر سے پئیں گے تو سرور وراحت پائیں گے پھر اس کے بعد غمگین نہیں ہوں گے مثنوی شریف میں ہے:

آبِ صبرت جوئے آب خلد تست ۔۔۔ سوئے شیر خلد مہر تست

ذوق طاعت گشت جوئے انگبیں ۔۔۔ مستی وشوخی تو جوئے خمر بیں

ایں سبہا چوں بفرمان تو بود ۔۔۔ چار جوہم مرترا فرمان بود

ترجمہ: تیرے صبر کا بدلہ خلد بریں ہے خلق پر مہر محبت کا بدلہ بہشت کا دودھ۔

طاعت کی چاشنی کا بدلہ شہد جنت ہے عبادت کی شوخی اور چستی شرابا طہورا ہے۔

فرامین الٰہی کی بجا آوری اس کا سبب ہیں کہ یہ چار نہریں تیرے زیر فرمان ہوں۔

ف: عرش کے پائیں پر چوڑا کر کے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو لکھا گیا ہے بسم کی میم سے پانی کا چشمہ اور اللہ کی ھا سے دودھ کا چشمہ اور الرحمن کی میم سے شراب کا چشمہ اور الرحیم کی میم سے شہد کا چشمہ جاری ہے یہ ان نہروں کا منبع ہے پھر یہ سب کی سب کوثر میں جاتی ہیں جسے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حوض کہتے ہیں وہ ابھی بہشت میں موجود ہے اور قیامت کے میدان میں صرف مومنین کی پیاس بجھانے کے لئے اسے نقل کیا جائے گا پھر وہاں سے اسے بہشت میں پہنچایا جائے گا۔

ف: بہشت میں ایک چشمہ کافور کا ہے دوسرا زنجبیل کا تیسرا سلسبیل کا اور چوتھا رحیق کا کہ جس کا مزا تسنیم سا ہے

ملائکہ کے واسطہ سے اہلِ جنت کو پلایا جائے گا لیکن مومنین کو اللہ تعالیٰ بلاواسطہ شراب طہور خود پلائے گا۔

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا جبکہ دیے جائیں گے بہشت سے روزی یعنی جب کھلائے جائیں گے ثمر میں سے۔ ثمرہ سیب یا انار خاص ہی مراد نہیں ہیں بلکہ انواع اثمار میں سے ایک نوع مراد ہے اور لفظ مِــنْ پہلا اور دوسرا دونوں ابتداء غایت کے لئے ہیں کیونکہ رزق کی ابتداء جنت سے اور جنت کے رزق کی ابتداء ثمرہ سے ہوگی مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا رِزْقًا، رُزِقُوا کا مفعول ہے اور جس طعام سے حیوان نفع اٹھائے اور رزق کہتے ہیں۔ قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ یعنی یہ تو اس کی مثل ہے جو ہم کو اس سے قبل دنیا میں دیا جاتا تھا لیکن چونکہ ان میں مکمل مشابہت ہوگی بنا بریں اسے ایک ہی کہا گیا بہشت کے میووں کو دنیا کے میوہ جات کی مثل اس لیے بنایا گیا تاکہ نفس انہیں دیکھ کر میلان کرے کیونکہ دیکھی ہوئی چیز کی طرف طبائع میل اور غیر معروف شے سے نفرت کرتی ہیں اور یہ بھی ہے کہ بہشت کے ثمرات کی فضیلت ظاہر ہو کیونکہ اگر غیر معہود جنس ہوتی تو گمان ہو سکتا تھا کہ یہ اسی طرح ہی ہوں گے اگرچہ اس سے اچھے ہوں پس جب دنیا کے کسی انار کو دیکھیں گے اور اس کے حجم وغیرہ پر غور کریں گے تو دنیا کے بڑے سے بڑا انار چھوٹے تربوز کے برابر بھی نہیں ہو سکتا لیکن اس کے برعکس جب بہشتی انار کو ایسا بڑا اور موٹا دیکھیں گے تو وہ تمام اہلِ دار کو سیر کر دے گا بنا بریں اس کی فضیلت ظاہر اور سرور و مستی حاصل ہوگی تعجب بھی بڑھے گا کہ موسم نہ ہونے کے باوجود بھی بہشت میں موجود ہے كُلَّمَا کا عموم دلالت کرتا ہے کہ ان کا یہ قول بار بار ہوگا کہ پہلے قول کے بعد مرۃ بعد مرۃ اس سرور و مستی اور فرطِ تعجب کا ظاہر کرتے ہوں گے جو ان کے مابین فرق ہوگا کہ لذت تو بہت بڑی ہے اور شکل و صورت بھی ایک ہے گویا کہیں گے کہ یہ بعینہٖ وہی میوہ جات ہیں جو ہم نے دنیا میں کھائے تھے لیکن یہ رتبہ لذت و خوشبو کا انہیں کہاں سے ملا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اِنَّهُ لَيْسَ فِي الْجَنَّةِ مِنْ اَطْعِمَةِ الدُّنْيَا اِلَّا الْاِسْمُ یعنی بہشتی میوے صرف نام سے ہمارے میووں کے مطابق ہوں گے ورنہ ایں کجا آں کجا۔ بہشت کا میوہ نقصان نہیں دے گا تاکہ معلوم ہو کہ دنیاوی میوہ جات کے مقابلہ میں بہشت کے میوہ جات کتنے نرم، خوشنما اور لذیذ ہیں۔ اس سے وہم نہ ہو کہ دنیا اور بہشت کے میوہ جات کے مابین مشابہت ہی نہیں ہوگی یہ عقلاً بھی محال ہے اس لیے کہ قاعدہ ہے کہ اسماء کا اطلاق اتحاد نوعی کے ساتھ ہوتا ہے۔

وَاُتُوْا بِهٖ وہ رزق یا مرزوق دنیوی اور اُخروی دیئے جائیں گے ضمیر کا مرجع فحوائے کلام ہے جو دارین دیئے گئے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ای بجنس الغنی و الفقیر

مُتَشَابِهًا یعنی رنگ اور جوت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے پس جب اہل بہشت بہشت کے میوہ جات کھائیں گے تو اس کا مزہ غیر پائیں گے کہ بہشتی میوے بہتر اور لذیذ ترین ہوں گے یعنی ان کی کوئی شے ردّی نہیں ہوگی۔

ف: حضرت مسروق سے مروری ہے کہ بہشت کی کھجوریں جڑ سے لے کر ٹہنیوں تک تہ بہ تہ ہوں گی۔ یعنی ان کے بعض بعض پر منضود ہوں گے یعنی متراکب و مجتمع ہوں گے یعنی دنیا کے اشجار کی طرح نہیں ہوں گے ان کی ٹہنیاں اور اثمار متفرق ہوتے ہیں جب اس کے ثمر توڑے جائیں گے تو پھر اس جگہ اور تیار ہوں گے اور ان کے گچھے بارہ ہاتھ کے ہوں گے اگر تمام مخلوق اس کے ایک گچھے پہ جمع ہو جائے تو سیر ہو جائے۔

حکایت: ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے ابوالقاسم! آپ کا گمان ہے کہ اہلِ جنت کھائیں گے بھی اور پئیں گے بھی۔ آپ نے فرمایا ہاں! اللہ کی قسم، جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے بیشک ایک بہشتی کو کھانے پینے اور جماع میں دنیا کے ستر آدمیوں کی طاقت دی جائے گی میں نے کہا جو کھاتا ہے تو قضائے حاجت کی بھی ضرورت ہوتی ہے حالانکہ بہشت اس سے پاک ہے آپ نے فرمایا: وہاں کی قضائے حاجت پسینہ ہے جو کہ مشک سے بھی زیادہ خوشبوناک ہوگا۔

وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ان کے لئے بہشت میں اَزْوَاجٌ یعنی عورتیں اور حوریں ہوں گی۔ مُطَهَّرَةٌ پاک احوال یعنی حیض و نفاس اور بول و غائط اور منی مخاط، بلغم، و ریم، میل و کچیل اور سر کا درد اور دیگر درد اور ولادت اور طبع کی کراہت اور بدخلقی اور طبع کا میلان الی الغیر وغیرہ وغیرہ سے صاف ستھری ہوں گی اور مُطَهَّرَةٌ متطھرۃ وطاھرۃ سے زیادہ بلیغ ہے اور خبر دے رہا ہے کہ انہیں کسی مطہر نے طاہر کیا ہے اور مطہر سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔

ف: حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: دراصل حوریں یہی عورتیں ہوں گی جو دنیا میں تھیں اب

انہیں صاف ستھرا کر کے بہشت میں بھیجا جائے گا۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حور عین پاؤں کی انگلیوں سے لے کر گھٹنوں تک زعفران سے پیدا کی گئی ہے اور پھر گھٹنوں سے پستان تک خالص مشک سے، پھر پستانوں سے گردن تک عنبر اشہب یعنی ابیض سے پھر گردن سے سر تک کافور سے جب متوجہ ہوتی ہے تو اس کے منہ کے نور کی چمک ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے اہلِ دنیا کے لئے سورج کے نور کی چمک۔

وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ہمیشہ زندہ رہیں گے مریں گے نہیں اور نہ ہی بہشت سے نکلیں گے۔

ف: حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اہلِ جنت تیس سال کے جوان معلوم ہوں گے مرد و عورتیں ایک ہی سن کے ہوں گے ان کے قد اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ستر گز قد کے ہوں گے نوجوان اور بے عیب ہوں گے ان پر ستر پوشاکیں ہوں گی پھر ہر پوشاک ہر لحظہ ستر رنگ بدلے گی نہ تھوکیں گے نہ کھنکاریں گے اور نہ ہی بری اور مکروہی شے ان میں پائی جائے گی۔ ہر دن جمال وحسن میں بڑھتے رہیں گے جیسے اہلِ دنیا ہر دن بڑھاپے وکمزوری میں بڑھتے رہتے ہیں نہ ان کا شباب ختم ہوگا نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے۔

ف: جان اے جانِ من! الذات میں سب سے بڑی لذتیں مکان، طعام اور نکاح ہیں جیسے کہ استقراء کا تقاضا ہے اور ان سب کی اعلیٰ لذتِ دوام وثبات ہے کیونکہ ہر وہ نعمت خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو لیکن وہ زوال پذیر ہو تو وہ انسان کے ذوق کے منغص کرنے والی ہوتی ہے اب مومن کو ان نعمتوں کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور ساتھ ہی اور ساتھ فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں ہمیشہ رہیں گی تاکہ ان کی خوشی ورونق میں اضافہ ہو۔

تفسیرِ صوفیانہ

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی انہیں حقیقی ایمان کے بیج اور ان کے اعمال صالحہ قلبیہ اور روحیہ وسریہ جن میں توحید وتجرید حقیقی ہے توکل ویقین وزہد وورع وتقویٰ وصدق واخلاص وہدایت وقناعت وعفت ومروت فتوت ومجاہدہ ومکاہدہ ورغبت ورہبت اور خوف وخشیت اور رجاء وصفاء وطلب وارادہ اور محبت وحیاء اور کرم وسخاوت وشجاعت۔ وعلم ومعرفت وعزت ورفعت وقدرت وعلم وعفو ورحمت وہمت عالیہ وغیرہ جو مقامات واخلاق ہیں کے اشجار۔ قربت کی بہشتیں حاصل ہوتی ہیں جن کے نیچے عنایت وتوفیق اور راحت وعظمت ونقل کی

نہریں جاری ہیں کُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا جب ان کو اشجار کے ثمرات مشاہدات و مکاشفات معائنات سے عنایات ہوتے ہیں۔

رِزْقًا یعنی مہربانی وصحت وعطیہ حاصل ہوتا ہے تو قَالُوا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو اس سے قبل دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اصحاب، مشاہدات ومجاہدات کے ثمرات کی وجہ سے ایک صورت میں مختلف احوال دیکھتے ہیں تو جوان میں متوسط ہیں وہی کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ تو وہی ہے جو پہلے دکھائی دیا حالانکہ اس کی صورت ایک ہوتی ہے اور حقیقت دیگر اس کی نظر یہ ہے کہ سالک نور کو نار دیکھتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نور ہدایت کو نار محسوس کیا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا اِنِّيْ اٰنَسْتُ نَارًا پھر کبھی وہی نار بصورت غضب ناک نمودار ہوتی ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق مشہور ہے کہ آپ جب غصہ میں آتے تو آپ کی ٹوپی مبارک سے آگ کے شعلے نظر آتے تھے اور کبھی آگ محسوس ہوتی تھی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبت کی نار نفس کی محبوب اشیاء میں پہنچ کر انہیں جلا دیتی ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آگ جلانے والی دلوں پر پہنچ کر ان کے وجود کو راکھ کر دیتی ہے پس ان کی شکلیں ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں اسی لیے فرمایا وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا لیکن سالک تو ہر نار سے نرا ذوق اور نئی لذت پاتا ہے وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ یعنی ارباب کے لئے قربات کی جنت میں عورتیں ہیں جو ابکار غیب سے صاف وستھری، جن کو اغیار کی ملاوٹ تو کیا اغیار کی ہوا تک نہ لگی ہوگی وہ ان باکرہ عورتوں کی بکارت میں ہمیشہ رہیں گے جیسا کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: کہ بیشک بعض علوم خالص موتی کی طرح ہوتے ہیں انہیں عارفین باللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا جب وہ ان علوم کو ظاہر کرتے ہیں تو ان کا انکار سوائے جاہلین کے اور کوئی نہیں کرتا۔

ف: ہر وہ شئے جس کا عالم شہادۃ میں مشاہدہ کیا جاتا ہے جیسے اس کی صورت دنیا میں ہوتی ہے اس کا معنی غیب کے عالم میں بھی ہوتا ہے اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں پڑھتے ۔ اللھم ارنا الاشیاء کما ھی ۔ قیامت میں اشیاء کی صورتیں وحقیقتیں حاصل ہوں گی لیکن اس وقت صورت پر معنی وحقیقت غالب ہوگی۔ اس لیے شے کی صورت بعینہٖ نظر آئے گی اسے دیکھ کر کہے گا۔

هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ پھر اس وقت صورت اور معنی ایک شئے ہوں گی جیسے کہ پہلے تھی لیکن ذوق پہلی

صورت کا غیر معلوم ہوگا اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: بہشت میں دنیوی اشیاء کے اسماء کا غیر ہوگا جیسا کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ بندہ جو کلمہ بھی اللہ کی راہ میں بولتا ہے قیامت کے بعد اس کی حالت ایسے ہوگی جیسے کہ کسی کو جسم میں تیر لگے اور اس سے خون جاری ہو۔ اس روز اس کا رنگ تو خون جیسا ہوگا لیکن اس کی خوشبو مشک جیسی۔ آج تو صرف خون کے رنگ کی شکل معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی خوشبو کا پتہ نہیں چلتا لیکن قیامت میں اس کی دنیوی شکل بھی نظر آئے گی اور خوشبو بھی سونگھی جائے گی۔

تفسیر عالمانہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً **شان نزول**: حضرت حسن وقتادہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مکھی اور عنکبوت کا ذکر کتاب مجید میں فرمایا اور اس کے ساتھ کفار ومشرکین کے لئے کہاوت بیان فرمائی تو یہود ہنس پڑے، کہنے لگے کہ اسے اللہ کے کلام الٰہی سے کون سی مشابہت ہے۔

حیاء اس تغیر وانکسار کو کہتے ہیں جو انسان کو (بوجہ اس خوف کے جو اسے عیب دار کرے یا سے مذمت کا نشان بنائے) سے عارض ہوتا ہے یہ بطریق تمثیل کے ہے۔ مچھر کی مثال دینے کو ترک نہیں کیا جاتا اس شخص کی طرح نہیں کہ حقارت بھری چیزوں سے اس کی تمثیل رک جاتی ہے۔ اَنْ یَّضْرِبَ کا محل نصب ہے یعنی بہ بنائے مفعولیت منصوب ہے اور ما اسمیہ ابہامیہ ہے اپنے قریب والے اسم کو ابہام میں بڑھاتا ہے گویا کہا گیا ہے کہ امثلہ میں سے کوئی مثال جس طرح بھی ہو پس یہ اپنے ماقبل کی صفت ہوگی اور بَعُوْضَةً، مَثَلًا سے بدل ہے بَعُوْضَةً چھوٹے مچھر کو کہتے ہیں اور اس نام سے بھی اسی لیے موسوم ہے گویا یہ بڑے مچھر کا بعض ہے۔

فَمَا فَوْقَهَا یعنی خواہ اس سے بڑے کی تمثیل ہو۔ جیسے مکھی اور عنکبوت یا اس سے صغر میں کم۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اضداد میں سے ہے کہ چھوٹے اور بڑے دونوں اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور وہ ایسا جانور ہے کہ وہ ٹھہرنے میں چھپ جاتا ہے اور تحرک میں ظاہر ہوتا ہے یعنی ظاہر نہیں ہوسکتا جب تک اسے تحرک نہ ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے ان کے معبودانِ باطلہ کی تمثیل عنکبوت کے گھر اور مکھی سے تو دی ہے لیکن مچھر کا ذکر کہیں نہیں آیا۔

جواب: ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مچھر سے تمثیل اہلِ دنیا کے لئے عبرت ہے کیونکہ وہ جب

تک بھوکا رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جب سیر ہوتا ہے مرجاتا ہے۔ اسی طرح انسان جب غنی ہوجاتا ہے تو سرکش ہوجاتا ہے اور اسے ردی خیالات حائل ہوتے ہیں۔

ف: امام ابومنصور علیہ الرحمہ فرماتے ہیں یہ ایک عجوبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایک صغیر الجثہ دلالت کررہا ہے اور کبیر الجسم تو بطریق اولیٰ، کیونکہ اگر تمام مخلوق جمع ہوکر مچھر یا مکھی کی شکل کی صورت بنائیں اور وہ ترکیب جس کی اسے ضرورت ہے جیسے منہ، ناک، آنکھ، پاؤں اور ہاتھ اور مدخل ومخرج تو قادر نہیں ہوسکیں گے چہ جائیکہ وہ بہت بڑے اجسام کو تیار کرسکیں علاوہ ازیں مچھر باوجودیکہ حقیر اور صغیر جانور ہے لیکن اسے ہاتھی (جوکہ کثیر الجثہ اور قوی القدرۃ ہے) کی طرح ہے تمام آلات رکھتا ہے۔

ف: اس میں انسان کے حال اور اس کے کمال استعداد کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: انّ اللہ آدم علی صورتہ ای علی صفتہ (بیشک اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت یعنی صفت پر پیدا فرمایا) پس باوجودیکہ انسان ضعیف القدر لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے جمال واجلال کے اوصاف کا ایک نمونہ اور عکس بنایا ہے تاکہ اپنے صفات کے شیشہ میں اللہ تعالیٰ کے صفات کا مشاہدہ کرے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) اور یہ مخصوصہ صفت سوائے انسان کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ الخ مثنوی شریف میں ہے:

آدم خاکی زحق آموخت علم | تا بہفتم آسمان افروخت علم

نام وناموس ملک را در شکست | کوری آنکس کہ در حق شکست

قطرہ دل را یکے گوہر فتاد | کاں بدریا ہا وگردونہا نداد

چند صورت آخر صورت پرست | جان بے معنیت از صورت نرست

گر بصورت آدمی انساں بدے | احمد و بوجہل خود یکساں بدے

ترجمہ: آدم خاکی نے اللہ تعالیٰ سے علم سیکھا اسی لیے تو اس نے ساتویں آسمان پر اپنا جھنڈا گاڑا۔ جس نے فرشتے کا نام

ونا موس کو توڑ دیا وہ بڑا بد بخت ہے اور حق تک نہ پہنچ سکا۔ قطرہ دل میں ایک گوہر پہنچا تو اس نے دریا کو کچھ نہ سمجھا۔ اے صورت پرست! کب تک صورت پرستی میں کب تک رہو گے جان بے معنی ہو تو وہ صورت پرستی نے نجات نہ پا سکے گا۔

اگر صرف انسانی شکل کا نام انسان ہوتا تو حضرت احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابو جہل ایک شے ہوتے۔

ف: بعض فرماتے ہیں کہ ضعیف کے ذکر سے ضعیف قلوب کو قوت بخشی گئی ہے اور مخلوق کو اپنی قوت دکھائی ہے کہ ضعیف جانوروں کو قوی جانوروں کی شکل وہیئت میں پیدا فرمایا گیا ہے کیونکہ مچھر صغیر ہے اور ہاتھی کبیر ہے لیکن ان کی ہیئت ایک ہے بلکہ مچھر میں الثادو پر زاید ہیں پس اس کے کرم سے کچھ بعید نہیں کہ قلیل العمل کو وہ عنایت فرمائے جو کثیر العمل کو عطا فرمائے گا جیسا کہ صغیر الجثہ کو وہ کچھ عطا فرمایا جو کثیر الجثہ کو عنایت ہوا۔

ف: عجیب تربات یہ ہے کہ صغیر الجثہ کبیر الجثہ کو ایذاء پہنچاتا ہے پھر اس کریم کے کرم سے کیا بعید ہے کہ اس نے شیر کو بڑی قوت کے ساتھ پیدا فرمایا اور مچھر نہایت کمزوری میں لیکن مچھر اور مکھی میں اڑنے کی ہمت کے ساتھ وہ جرأت عنایت فرمائی کہ لوگوں کے سامنے اڑتے پھرتے ہیں باوجودیکہ لوگ ان کے ایذا دینے اور ہٹانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں لیکن شیر میں کتنی بزدلی ہے کہ وہ انسانوں سے دور رہتا ہے بلکہ ان کی راہوں کو بھی چھوڑ جاتا ہے اور اگر یہ بھی مچھر اور مکھی کی طرح جرأت دار ہوتا تو لوگ اس کی دلیری سے ہلاک ہو جاتے یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ضعیف میں دلیری پیدا کر دی اور قوی میں بزدلی اور پھر ضعیف پر انسان کو عاجز بنا دیا لیکن قوی پر طاقت پیدا کر دی۔ لاتثیروا الزنابیر الخ یعنی بھڑوں کو مت چھیڑو ایسا نہ ہو کہ تمہیں ڈس دیں۔ اسی طرح جاہلوں کو مت چھیڑو کہ کہیں گالیاں نہ دیں اور انجیل میں ہے لا تدخروز اذخائر کم الخ یعنی اپنے ذخائر جمع نہ کرو کہیں انہیں دیمک نہ چٹ کر جائے اور نہ کہیں جنگلوں میں رکھو کہ چور یا زہر لیے جانور نہ ضائع کریں اور انجیل میں یہ بھی ہے کہ ملکوت السماء کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسان اپنے گاؤں میں شاندار گندم بوئے لیکن جب لوگ سو جائیں تو اس کا دشمن آکر اس میں کڑوا بیج بودے جب کھیتی بڑی ہو تو اس میں اس کڑوے بیج کے پودے بھی ہوں، مالک کو کہا جائے کہ یہ کیا ہوا تم نے تو اس میں گندم کا بیج بویا تھا وہ جواب دے کہ جب گندم کاٹنے کا وقت آئے تو گندم کو کاٹتے جاؤ اور کڑوے بیج کے پودوں کو جلا دو۔ اس تمثیل سے مقصد یہ ہے کہ کسان سے مراد ابو البشر ہیں اور قریہ سے مراد عالم دنیا ہے اور گندم سے مراد طاعت ہے اور کڑوے بیج بونے والا شیطان ہے اور کڑوا بیج نافرمانی ہے اور کاٹنے والے ملائکہ ہیں جو بنی آدم پر موت طاری کرتے ہیں۔

حکایت: مامون بادشاہ خطبہ دے رہے تھے کہ مکھی اس کی آنکھ میں آپڑی کئی دفعہ اسے ہٹایا مگر پھر آگئی یہاں تک کہ خطبہ بند کرنا پڑا جب نماز سے فارغ ہوا تو ابو ہذیل معتزلی کو بلایا اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو کیوں پیدا کیا؟ اس نے کہا: اس لیے کہ سرکش بادشاہوں کو ذلیل کرے اس نے کہا: ٹھیک ہے۔

(کذافی روضۃ الاصفیاء)

ف: مکھی جیسی شئے پیدا کرنے میں لاکھوں حکمتیں و مصلحتیں ہیں۔ حضرت وکیع فرماتے ہیں کہ اگر مکھیاں اور ہوا نہ ہوتیں تو دنیا بدبو سے بھر جاتی اس کے عجائبات سے ایک عجوبہ یہ بھی ہے کہ جب انسان کے منہ پر بیٹھتی ہے تو اس کا دل تنگ ہو جاتا ہے اور عیش فاسد اور باغ باغیچے بے لذت معلوم ہوتے ہیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ باوجودیکہ یہ ضعیف ہے لیکن انسان کو عاجز کر دیتی ہے اور اس کے منہ پر بیٹھنے سے انسان کو عار ہوتی ہے۔ اب انسان سوچے کہ مکھی کے ہٹانے میں انسان کتنی جدوجہد کرتا ہے مگر سے خیال نہیں کہ قبر میں بڑے بڑے سانپ اور بچھو ہوں گے انہیں کیسے ہٹائے گا۔

عقیدہ: امام قشیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے ہر شے کا پیدا کرنا ہوا میں اڑتی ہوئی غبار سے بھی آسان تر ہے بلکہ اس کی قدرت کے آگے مکھی اور عرش کا پیدا کرنا برابر ہے نہ اس پر عرش کا پیدا کرنا مشکل ہے نہ مکھی کا، اس کی ذات عُسر و یُسر کے لحوق سے مقدس ہے۔

ف: حقیر کی حقیر سے مثال دی جاتی ہے، جیسے اعلیٰ کی اعلیٰ سے مثال دی جاتی ہے اگرچہ تمثیل دینے والا بڑی اونچی شان والا ہو، جیسا کہ انجیل میں سینے کے کھوٹ کو آٹے کے چھان سے تمثیل دی۔ کما قال: **لاتکونوا منخل یخرج منہ الدقیق۔ الخ** یعنی چھلنی کی طرح نہ ہونا کہ اس میں سے اچھا آٹا نکل آتا ہے اور چھان اسی میں رہ جاتا ہے اسی طرح تمہارے منہ سے حکمت کی باتیں نکل آتی ہیں لیکن چھان کی طرح کھوٹ اندر رہ جاتا ہے اور بیوقوفوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کو بھڑوں کی چھیڑ چھاڑ سے تشبیہ دی۔ ویسے بھی اہلِ عرب کہاوتیں بیان کرتے ہیں: کما قالوا: **هُوَ جَمْعٌ مَنْ ذَرَّةٍ** (وہ ذرہ کا مجموعہ ہے) ان کا یہ خیال ہے کہ ذرہ میں سات سال کی قوت ہے اور کہتے ہیں: **اَجْرَأُ مِنَ الذُّبَابِ** (وہ مکھی سے زیادہ جرأت مند ہے) کیونکہ مکھی شاہوں کی ناک پر بیٹھنے سے نہیں ڈرتی اور کہتے ہیں: **وَجَفْنُ الْاَسَدِ فَاِذَا ذبَّ آبَ اَیْ اِذَا مُنِعَ رَجَعَ** (شیر کا جملہ ہے کہ اسے

ہٹاؤ تو واپس آجاتا ہے) اور کہتے ہیں: اَسْمَعُ مَنْ قِرَادٍ ان کا خیال ہے کہ یہ اونٹ کی ہلکی سی آواز سات راتوں کے سفر یا سات میل کے سفر سے سن لیتی ہے اور کہتے ہیں: فلاں" اَعْمَرُ مِنْ قِرَادٍ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سات سو سال تک عمر ہوتی ہے اور کہتے ہیں: اَعْمَرُ مِنَ النَّسْرِ (وہ گدھ سے زیادہ عمر والا ہے) کیونکہ اس کی عمر تین سو سال تک ہوتی ہے اور کہتے ہیں: فلاں" اَصْرَدُ مِنْ جَرَادَةٍ کیونکہ ٹڈی سردیوں میں باہر نہیں نکلتی اور اصرد بمعنی ابرد ہے اور کہتے ہیں: اَطْيَشُ مِنْ فِرَاشَةٍ کیونکہ وہ گرم مزاج ہے۔ اور کہتے ہیں: اَعَزُّ مِنْ مُخِّ الْبَعُوضِ کیونکہ مچھر کی چربی ہوتی ہے۔ اسے نادر الوجود شے کے لئے ہی بولا جاتا ہے اور کہتے ہیں: اَضْعَفُ مِنْ بَعُوضَةٍ (مچھر سے زیادہ کمزور ہے) اسی طرح کہتے ہیں: آكَلُ مِنَ السُّوسِ سُوس وہ کیڑا ہے جو گندم اور جو کھاتا ہے اور اس کیڑے کو بھی کہتے ہیں جو اُون وغیرہ کو خراب کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو سمجھانے کے لئے مثالیں دیتا ہے اور حق سے حیاء نہیں فرماتا اور اس کی مثالوں میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں لیکن عقل والوں کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوتی ہیں۔

حضرت جلال الدین رومی قدس سرہ فرماتے ہیں:

بیت من بیت نیست اقلیمست   ہزل من ہزل نیست تعلیمست

ترجمہ: میرے اشعار نہیں بلکہ مستقل اقلیم ہیں، میرا مذاق بھی تعلیم ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی جو لوگ قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ فا دلالت ہے کہ مابعد ماقبل کے مدلول پر مرتب ہے گویا کہا گیا ہے کہ پس یہ مثال بیان کی گئی تو مومن فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ جانتے ہیں کہ یہ مثال جو مچھر، مکھی کے ساتھ دی گئی ہے الْحَقُّ حق ہے یعنی ثابت ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مِنْ رَّبِّهِمْ یہ جملہ جو ضمیر حق کی ضد ہے یا وہ ضمیر (جو مثل کی طرف عائد ہے) سے حال ہے یعنی یہ کہاوت اللہ تعالیٰ سے ہے پس مومن اس حق مثال میں تفکر کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر صغیر و کبیر کو پیدا کرتا ہے یہ سب کچھ اس کی قدرت کے آگے برابر ہے، اس لیے ان کا ایمان ہے۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی یہود اور مشرک فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے یا اس سے کیا شئے اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا اس خسیس تمثیل سے اللہ تعالیٰ نے مراد لی ہے اور اس سے مشار" الیہ کی تحقیر مقصود ہے۔ مثلاً یہ مثال دے کر جب

اس سے الف ولام محذوف کیا گیا تو یہ حال واقع ہوا بمعنیٰ مثلاً یا تمیز کی بنا پر منصوب ہے ان کے جواب میں ارشاد ہوا یُضِلُّ بِهٖ یعنی اس مثال کے سبب سے رسوا کرتا ہے اور اضلال بمعنی حق سے باطل کی طرف پھیرنا اور اضلال کی نسبت بمعنی خلق الضلال اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اشارہ ہے کہ ہر شئے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اگرچہ کسب کے لحاظ سے افعال بندوں کی طرف مسند ہوتے ہیں کَثِیْرًا یعنی بہت سے کفار، اس لیے کہ وہ ان مثالوں کا انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں بڑھ جاتے ہیں۔ وَیَهْدِیْ بِهٖ اس کی بدولت توفیق دیتا ہے۔ کَثِیْرًا بہت سے مومنوں کو کہ وہ اس کی تصدیق کرنے سے ہدایت میں بڑھ جاتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ لوگ گمراہی کو اختیار کریں گے انہیں گمراہ کرتا ہے اور جن کے لئے جانتا تھا کہ ہدایت کو پسند کریں گے انہیں ہدایت دیتا ہے۔

سوال: ہدایت یافتہ لوگوں کو کثرت کا حکم کیوں لگایا، حالانکہ وہ تو قلیل تھے۔

جواب: درحقیقت اہل ہدایت کثیر ہیں اگرچہ وہ قلت سے موصوف ہوتے ہیں اور ان کی قلت اس لیے بیان ہوتی ہے کہ وہ بہ نسبت اہل ضلال کے قلیل ہوتے ہیں۔

عقیدہ: ہدایت یافتہ لوگ اگرچہ بظاہر قلیل ہوں درحقیقت کثیر ہوتے ہیں کیونکہ یہ حق پر ہوتے ہیں اور وہ (گمراہ) باطل پر۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سوادِ اعظم وہ ہے جو حق پر ہو اگرچہ ایک ہو۔

وَمَا یُضِلُّ بِهٖٓ اس مثال کی تکذیب سے رُسوا نہیں کرتا۔ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ مگر ان کافروں کو جو اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتے اور اس کے فرمان سے باہر ہیں۔ فسق لغت میں بمعنی خروج ہے اور عرفِ شرع میں کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے اللہ تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہو جانا۔

مسئلہ: گناہ صغیرہ بار بار کرنے سے کبیرہ ہو جاتا ہے۔

قاعدہ: فسق کی تین اقسام ہیں:

۱۔ تغابی یعنی کسی گناہ کو قبیح سمجھ کر عمل میں لانا۔

۲۔ اس گناہ کے ارتکاب میں منہمک ہونا۔

۳۔ گناہ کا ارتکاب کرنا اس کے قبح کا منکر ہو کر۔

عقیدہ : یہ تیسرا طبقہ کفر کے مراتب سے ہے جب تک فاسق اس تیسرے درجے تک نہ پہنچے اس کا ایمان سلب نہیں ہوتا کیونکہ اس میں تصدیق تو موجود ہے کہ جس پر ایمان کا دارومدار ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کرتے اور اس کے امر کو چھوڑتے ہیں۔ نقض بمعنی فسخ اور ترکیب کا توڑنا۔

سوال : ابطالِ عہد میں نقض کو کیوں استعمال کیا گیا؟

جواب : استعارہ کر کے عہد کو حبل (رسی) کے معنی میں لیا گیا اس لیے کہ دو عہد کرنے والوں کے مابین اتصال (دھاگے) کی طرح ہوتا ہے۔

عقیدہ : اللہ کے عہد تین ہیں:

ا۔ ذُرّیتِ آدم علیہ السلام سے یہ وعدہ لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرنا۔

۲۔ سادات انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لیا گیا کہ اس کے دین کو قائم کریں گے اور اس میں تفرقہ پیدا نہ ہو۔

۳۔ علماءِ کرام سے وعدہ لیا گیا کہ حق ظاہر کریں اور اُسے ہرگز نہ چھپائیں۔

مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ یعنی وعدہ کی توثیق اور اسے قبول کرنے کے بعد۔ اس معنی پر ضمیر کا مرجع عہد ہے یا اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے کتابوں کو نازل کر کے انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر اس وعدہ کو پختہ کیا۔ اس معنی پر ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہوگا اور یہاں میثاق اپنے مصدری میں ہے نہ کہ بمعنی عہد۔

حکایت: حضرت مالک بن دینار علیہ الرحمہ کے چچازاد بادشاہِ زمانہ کا ملازم تھا۔ لوگوں کو ستاتا اور ظلم کرتا تھا وہ ایک دفعہ بیمار ہو گیا اس حالت میں منت مانی اور اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اگر مجھے آرام آ گیا تو ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شفاء دے دی۔ لیکن عہد بھلا کر ملازمت اختیار کر لی اور پہلے سے زیادہ ظلم شروع کر دیا پھر بیمار ہوا اور وہی نذر مانی، آرام آ گیا، پھر پہلے سے بھی زیادہ ظلم ڈھانے لگا اب بہت زیادہ بیمار ہوا۔ حضرت مالک بن دینار علیہ الرحمہ عیادت کے لئے تشریف لائے اور فرمایا: بھائی! کچھ نذر معین مانو اور اللہ تعالیٰ سے پختہ وعدہ کرو کہ آئندہ ہرگز ظلم نہیں کروں گا۔ امید ہے تجھے شفا نصیب ہوگی۔ بیمار نے کہا کہ

آج سے میرا پختہ وعدہ ہے کہ مجھے بیماری سے تندرستی نصیب ہو جائے تو میں ہرگز بادشاہ کی ملازمت اختیار نہیں کروں گا۔ اس حالت میں ہاتف نے ندا دی کہ اے مالک! ہم نے اسے بارہا آزمایا ہے اب اسے نذر کوئی فائدہ نہ دے گی یہ بہت جھوٹا ہے۔ چنانچہ وہ نوجوان اسی حالت میں مر گیا۔ (کذافی روضۃ العلماء)

مثنوی شریف میں ہے:

نقض[1] میثاق و شکست توبہا　　　موجب لعنت شود در انتہا

وَيَقْطَعُونَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ، اَنْ يُّوْصَلَ کا محل نصب ہے کیونکہ یہ موصول کی ضمیر سے بدل ہے یہ ای ما امر اللہ بہ ان یوصل ہے۔ اس سے ہر وہ قطع مراد ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں۔ مثلاً قطع رحمی اور مومنوں کی دوستی سے قطع اور انبیاء کرام علیہم السلام اور کتب سماویہ کے مابین تفرقہ اور فرض جماعات کا ترک اور اسی طرح ہر بھلائی کو چھوڑنا اور ہر برائی کا عمل کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے مابین قطع پیدا کر دینا ہے

احادیث:

۱۔ جب لوگ اپنا علم ظاہر اور عمل ضائع کریں اور زبان سے اُلفت کا اظہار اور دل میں بغض و عداوت اور قطع رحمی کریں تو اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجتا ہے خدا کرے وہ کانوں سے بہرے ہوں اور آنکھوں سے اندھے۔

۲۔ تین انسان ایسے ہیں کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ تلے ہوں گے۔

i۔ وہ عورت جس کا شوہر مر جائے اور اس کے ہاں چھوٹے چھوٹے یتیم ہوں اسے نکاح کے لئے کہا جائے تو وہ یہ کہہ کر انکار کر دے کہ میں اپنے بچوں کی پرورش کروں گی، یہاں تک کہ وہ نوجوان ہوں یا وہ یتیم مر جائے یا وہ عورت۔

ii۔ وہ جس نے اپنے مال سے اچھا طعام تیار کیا اور یتامیٰ و مساکین کو کھلا دیا۔

iii۔ وہ انسان جو صلہ رحمی کرے اس کے رزق میں وسعت کی جائے گی اور اجل میں بھی فراخی دی جائے گی اور قیامت میں عرش کے سایہ میں ہو گا۔

وَيُفْسِدُونَ فِي الْاَرْضِ ایمان سے منع کر کے اور حق کے ساتھ استہزاء کر کے اور اس وصل کا قطع کہ جس پر نظام

[1] میثاق کے خلاف کرنا اور توبہ توڑنا بالآخر لعنت کا سبب بنتا ہے۔

عالم اور اس کے صلاح کا دارومدار ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یہی لوگ آخرت میں بہشت میں پہنچنے کی بجائے عذاب میں مبتلا ہوں گے کیونکہ انہوں نے وفا کی بجائے نقض اور وصل کی بجائے قطع اور اصلاح کی بجائے فساد اور ثواب کی بجائے عتاب کو پسند کیا۔

مسئلہ : ہر مومن و کافر کی بہشت میں ایک منزل ہوتی ہے اور اس میں اس کے اہل و خدام ہوتے ہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ سب کچھ اسے دیا جاتا ہے ورنہ ان اشیاء کا مومن کو وارث بنایا جاتا ہے جس سے اس کافر کو رشک آتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا وَاَمَّا الَّذِيْنَ یعنی جنہیں نورِ ایمانی نصیب ہے وہ معانی و حقائق کا صور و امثلہ میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ حق اور اللہ تعالیٰ سے ہے اور جو لوگ کافر ہیں وہ تو حق کا انکار کرتے ہیں پھر ان کے افکار کی ظلمت کے پردے میں ان کی آنکھوں میں لٹکائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ حقائق کا مشاہدہ امثلہ کی کسوت میں نہیں کر سکتے۔ جیسے عجمی آدمی لغت عربیہ کے حقائق سے ناواقف ہوتا ہے اسی طرح کفار اور جہال حقائق امثال کے ادراک میں متحیر ہو کر کہتے ہیں: مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا پھر اپنے جہل کی وجہ سے انکار میں پڑ جاتے ہیں یہاں تک کہ جہالت کے قدموں کے ساتھ گمراہی کی وادی میں جا گرتے ہیں۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا گمراہ کرتا ہے ان لوگوں کو جو اس نور سے چوک گئے جو روز ازل ہر ایک کو عنایت ہوگا۔

حدیث شریف : میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلمت میں مخلوق کو پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور سے قطرات نازل کیے جنہیں اس نور سے کچھ پہنچا وہ ہدایت یاب ہوئے اور جو اس نور سے محروم رہے وہ گمراہ ہو گئے اور جو عالم ارواح میں اس نور سے محروم رہا اسے دولتِ ایمانی نصیب نہ ہوئی اور جو دولتِ ایمان سے محروم رہے انہیں نورِ قرآن سے محروم رکھا گیا اور جو نورِ قرآن سے دور ہے انہیں ہدایت نہ ملی، اور جن کو عالم ارواح میں وہ نور پہنچا ان کو نورِ ایمان ملا اور جو نورِ ایمان سے بہرہ یاب ہوئے انہیں نورِ ایمان سے نوازا گیا اور جنہیں نورِ قرآن سے نوازا گیا وہ یہی لوگ ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے۔ وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا اسی لیے قرآن بعض لوگوں کے لئے شفاء اور بعض لوگوں کے لئے شقاوت و عذاب ہے۔ کیونکہ یہ اس کا کلام اور اس کی صفت ہے جو لطف اور قہر دونوں پر مشتمل

ہے۔ لطف سے صادقین کو ہدایت نصیب ہوتی ہے اور قہر سے فاسقین گمراہ ہوتے ہیں. کما قال اللہ تعالیٰ: وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ یعنی فاسق وہ جو اس نورِ ازل سے محروم رہے۔ اب ان لوگوں کے نتائج کا پتہ دیتے ہیں جو اس نور سے خارج ہوئے اور عہدِ ازلی کا ایفاء نہ کرسکے۔ کما قال عزوجل: اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ یعنی اس کو توڑتے ہیں جو روزِ میثاق وعدہ کر آئے کہ ہم خلوص سے عبادت واطاعت کریں گے وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ یعنی اس راہِ سلوک پر پورے نہیں اترتے جن کا حکم ہے کہ یہ راہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے اور خلقِ خدا سے دور رہنے کا عمل بجا نہیں لاتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا یعنی غیر اللہ سے بالکلیہ دور ہو جا۔

وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ یعنی اپنی عادات کی زمین میں توحید کے فطری بیج کے ساتھ شرک اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے اور اس توحید کے بیج ایمان وعمل صالح کے پانی سے اعراض کی ملاوٹ کرتے ہیں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یعنی کمال انسان (جو ان میں فطرۃً موجود ہے) سے خسارہ پالیا۔ جیسے وہ گٹھلی کہ جس میں کھجور کے پیدا ہونے کی استعداد تھی زمین میں پہنچ کر پانی نہ ملنے کے سبب خسارہ میں آجاتی ہے۔ کما قال عزوجل: وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

تفسیر عالمانہ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ لفظ كَيْفَ منصوب ہے تَكْفُرُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے یعنی تم سرکش ہو۔ کفر کرتے ہو، یعنی انکار کرتے ہو۔ باللہ اس کی وحدانیت کا، باوجودیکہ تمہارے پاس دلائل انفسیہ وآفاقیہ بھی موجود ہیں جو تمہیں کفر سے ایمان کی طرف لے جانے والے ہیں اور استفہام انکاری ہے نہ بمعنی انکار الوقوع بلکہ بمعنی انکار الواقع ہے۔ یہ استفہام بات کو بعید بتانے اور تعجب میں ڈالنے کے لئے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تعجب یونہی ہوتا ہے کہ بندے کو تعجب میں ڈالے اور اس کا یہی طریقہ ہے کہ بندے کو تعجب کی طرف بلائے۔ گویا فرماتا ہے کہ تم تعجب نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہو۔

(کذا فی تفسیر ابی اللیث)

اور قاضی صاحب فرماتے ہیں یہ استفہام استخباری ہے، گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے خبر دو کہ تم کس حال میں کفر کرتے ہو۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا اموات "میت" کی جمع ہے جیسے اقوال "قِیل" کی جمع ہے یعنی حالانکہ تم مردہ تھے یعنی ایسے جسم تھے کہ ان میں حیات نہ تھی صرف عناصر تھے اغذیہ اور نطفے اور بوٹیاں، نقشہ نہ بنے ہوئے تھے۔

سوال: انہیں مردہ کیسے کہا گیا حالانکہ وہ تو جماد تھے میت تو اسے کہا جاتا ہے کہ جس میں پہلے حیات ہو۔

جواب: یہ غلط ہے بلکہ حیٰوۃ نہ بھی ملی ہوا سے بھی میت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بَلْدَةً مَّيْتًا (شہر ویران)

فَاَحْيَاكُمْ ارواح پیدا کر کے تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تمہاری ارواح پھونکیں۔ پھر دنیا میں بھیجا یہ التزام صرف قیامت میں اٹھنے کے لئے ہے اور فا دلالت کر رہی ہے کہ یہ امور متعاقباً ہوئے کیونکہ زندہ کرنے کا مفہوم تب ہوگا جب ان کو پہلے میت تصور کیا جائے اگرچہ اس حالت میں ان پر مختلف حالات وارد ہوں گے جو یکے بعد دیگرے ہوں گے جیسا کہ ابھی گزرا اور چونکہ دنیا میں کچھ مدت گزرے گی اس لیے ثُمَّ تراخی کا لایا گیا۔ کما قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ یعنی جب تمہارے اجل ختم ہوں گے تو تم پر موت طاری کر دے گا۔

سوال: اِمَاتَت کا قادر کی قدرت پر دال ہونا تو ظاہر ہے لیکن اُسے نعمتوں سے کیسے شمار کیا جا سکتا ہے اور یہاں پر نعمتوں کا بیان ہو رہا ہے۔

جواب: چونکہ یہ موت حیات ابدی کا وسیلہ ہے اسی لیے یہ بھی ایک نعمت ہے۔ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر تمہیں قبروں میں سوال و جواب کے لئے زندہ کریں گے اس وقت بندہ زندہ ہوتا ہے یہاں تک کہ آنے جانے والوں کے لئے جوتوں کی آہٹ اور مَن رَّبک و من نبیک و ما دینک کا سوال سنتا ہے اور ثُمَّ تعقیب (جو علی التراخی کے لئے ہے) اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں پر احیاء سے بعث" مراد نہیں کیونکہ وہ احیاء تو رجوع الی اللہ اور حساب کے لئے ایسے فوراً ہوگا کہ جس میں تراخی کا احتمال بھی نہیں ہے۔

عقیدہ: آیت سے عذاب و راحتِ قبر کا ثبوت ملتا ہے۔ (کذا فی التیسیر)

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ پھر اسی مالک کی طرف تم کو لوٹنا ہوگا، نہ کسی غیر کی طرف، پھر وہ تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں جزا و سزا دے گا۔ اگر نیکی ہوگی تو بھلائی نصیب ہوگی اگر برائی ہوگی تو سزا پاؤ گے۔ اسی کی طرف قبروں سے اٹھو گے۔ اب بڑا تعجب ہے کہ تم اس حال جان کر کفر کر رہے ہو۔

سوال: کفار اس بات کو مانتے تھے کہ ہم پہلے لاشئے تھے پھر پیدا کیے گئے اور پھر مر جائیں گے لیکن یہ نہیں

مانتے تھے کہ مرنے کے بعد اٹھنا اور اللہ تعالیٰ کی حاضری بھی دینی ہے جب وہ اس بات کو مانتے بھی نہیں تھے تو اب انہیں تعجب دلانے کا کیا معنیٰ ؟

جواب: انہیں یہ تو قدرت حاصل تھی کہ دلائل سن سمجھ کر یہ بات مان لیں اب اس کی قدرت کو بمنزلہ علم کے قرار دیا گیا، اس بنا پر ان کے عذر کے ازالہ کے لئے اتنی بات کافی ہے۔

مسئلہ : آیت میں دلیل ہے کہ جو ذات پہلی بار پیدا کرنے پر قدرت رکھتی ہے وہ بارِ دیگر بھی پیدا کرنے پر قادر ہے کیونکہ اس کے لئے بارِ دیگر پہلی بار کی پیدائش سے مشکل نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ **ربط** :۔ یہ دیگر نعمت کا بیان ہے یعنی ان تمام اشیاء کو تمہارے دینی و دنیوی فوائد کے لئے مقدر فرمایا "خَلَقَ" بمعنی تقدیر اس لیے ہے کہ اس وقت تمام اشیاء پیدا نہیں ہوئی تھیں مَا فِی الْاَرْضِ یعنی جو کچھ اس میں ہے۔ جَمِیْعًا منصوب ہے موصول ثانی سے حال ہے۔

قاعدہ : اس آیت سے اِنَّ الْاَصْلَ فِی الْاَشْیَاءِ الْاِبَاحَۃُ (یعنی اشیاء میں دراصل اباحت ہے) والا قاعدہ حاصل ہوا۔ (کذافی الکواشی)

ف: بعض متصوفین اور جہلاء یہاں سے اباحۃ علی الاطلاق کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ نہ کوئی خطرہ ہے اور نہ نہی نہ امر۔ جب معرفت حاصل ہوگئی اور محبت کا حصول ہو چکا تو اب خدمت کا کیا معنیٰ اور محبوب کو محبّ تکلیف نہیں دیتا اور نہ ہی اسے کسی بات سے روکتا ہے ان کی یہ بات صریح کفر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے امور سے نہی فرمائی ہے اور بہت سے احکام کا امر فرمایا ہے اور اس کے اوامر میں خطر بھی ہے اور وعد بھی اور وعید بھی۔ بشارتیں بھی ہیں اور تہدیدات جس پر نصوص ظاہر ہیں اور بے پناہ دلائل موجود ہیں بنا بریں جو شخص اس آیت سے مطلق اباحت کا ثبوت دیتا ہے وہ دین سے خارج ہے۔ (کذافی التیسیر)

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ پھر آسمانوں کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور وہ ارادہ مقدسہ ایسا مضبوط کہ جو نہ کسی پھیرنے والے سے پھرے اور نہ کسی روکنے والے سے رُکے اور جیسے اشیاء کو پیدا فرمایا نہ کسی کے کہنے سے بڑھے اور نہ کم۔

سوال : یہاں پر آسمانوں کی پیدائش کا بیان زمین کی پیدائش کے بعد ہے اور دوسری جگہ فرمایا: **وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰىهَا** اس سے معلوم ہوا کہ زمین کو بعد میں پیدا کیا گیا آیات میں تناقص آ گیا۔

جواب: یہ تناقض نہیں کیونکہ دَحٰهَا[1] دَحو" سے ماخوذ ہے بمعنی بچھانا، اور خَلق" اور دَحو" میں بہت بڑا فرق ہے۔

ف: حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے (جہاں اب بیت المقدس ہے) زمین کو ایک پتھر کی شکل میں پیدا فرمایا جو صرف ایک کفِ دست کے برابر تھا، اس پر ایک دُھواں چمٹا ہوا تھا اُس دُھویں کو اوپر اڑایا جس سے آسمان پیدا کیے اور اس پتھر والی شکل سے زمین بچھائی۔ (کذافی الکواشی)

ف: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک جوہر پیدا فرمایا جس کا طول وعرض ہزار در دہ ہزار سال کی مسافت کا تھا، پھر اس کی طرف ہیبت کی نگاہ فرمائی جس سے وہ جوہر پگھلا اور متحرک ہوا جس سے ایک دُھواں اُڑا اور باقی ماندہ شئے (جوہر) جمع ہو کر جھاگ کی طرح ہو گیا۔ جو پانی پر ٹھہر گیا باری تعالیٰ نے اس جھاگ سے زمین پیدا فرمائی اور اس اڑتے ہوئے دھوئیں سے آسمان بنائے۔ اسی لیے عربی کہتے ہیں: السَّمَاءُ مِنْ دُخَانٍ خُلِقَتْ الخ یعنی آسمان دھوئیں سے پیدا اور ہوا سے اونچے، پھر اشارہ سے متفرق ہوئے اور ستون کے بغیر قائم ہیں اور ایک پھونک سے ٹوٹ جائیں گے۔ **فَسَوّٰىهُنَّ** یعنی انہیں مکمل یعنی ابتداء ہی ٹیڑھے پن سے محفوظ کر کے سیدھا پیدا فرمایا: یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پہلے ٹیڑھے تھے اب انہیں سیدھا کیا گیا۔ اس میں ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ہے اور منصوب علی التمیز ہے جیسے رَجُلًا کا منصوب ہونا علی التمیز ہے۔

ف: حضرت سلمان فرماتے ہیں کہ آسمان سات ہیں:

پہلے آسمان کا نام رقیع ہے جو سبز زمرد کا ہے۔

دوسرے آسمان کا نام ارقلون ہے جو سفید چاندی کا ہے۔

تیسرے کا نام قیدوم ہے جو سرخ یاقوت کا ہے۔

چوتھے کا نام ماعون ہے جو سفید موتیوں کا ہے۔

پانچویں کا نام وبقاء ہے جو سرخ سونے کا ہے۔

---

[1] اس کے بعد یعنی آسمان کی پیدائش کے بعد زمین کو بچھایا۔

چھٹے کا نام وفاء ہے جو زردیا قوت کا ہے۔

ساتویں کا نام عروباء ہے جو نور سے چمک رہا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اس میں علت بیان کی گئی ہے، گویا کہا گیا کہ چونکہ وہ اشیاء کی کُنہ کو جانتا ہے اسی لیے انہیں پیدا کیا، جیسے کہ ان کے لائق اور ان میں نفع تھا اس میں دلیل ہے کہ جس نے ان اشیاء کو بنایا وہ ان کو جانتا بھی ہے کیونکہ افعال کا اتقان واحکام اور احسن وانفع وجہ کے ساتھ خاص وہی کرتا ہے جو علیم وحکیم ورحیم ہو اور اس میں کفار کے وہم کا ازالہ بھی ہے کہ ان کا خیال تھا کہ جب اجسام ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین میں مل جائیں گے بلکہ مٹی ہو جائیں گے پھر کس طرح دوبارہ ان اجزاء کو جمع کیا جائے گا حالانکہ اس کی کوئی شئے باقی نہیں رہے گی اور نہ اس کے ساتھ کسی شئے کو ملایا جا سکتا ہے کہ جس سے وہ پہلی حالت میں عود کر آئے۔

تفسیر صوفیانہ اس آیت میں مراتب روحانیت کی طرف اشارہ ہے۔ پہلا عام ملکوت ارضیہ اور قوائے نفسانیہ کا ہے، دوسرا عالم نفس کا، تیسرا عالم قلب کا ہے، چوتھا عالم عقل کا، پانچواں عالم سِرّ کا، چھٹا عالم روح کا، ساتواں عالم خفا کا ہے جسے سِر روحی کہتے ہیں، اسی طرف سیدنا شیرِ خدا رضی اللہ عنہ اشارہ فرماتے ہیں جیسے زہد، تقویٰ، توکل، رضا وغیرہا"

ف: حضرت شیخ المعروف بافتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "توحید کے بارہ باب ہیں جنہیں صوفیہ جلوتیہ توحید کے ذریعہ طے کرتے ہیں کیونکہ اس کا سِرّ یقین میں ہے اور وہ باب خلوتیہ اسماء کے ذریعہ بھی طے کیے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کا سِرّ برزخ میں ہے کہ جنۃ تین قسم کی ہے:

۱۔ جنۃ الافعال ۲۔ جنۃ الصفات ۳۔ جنۃ الذات

کیونکہ بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جنتیں سات ہیں، ان میں سے چار اہل یقین کے لئے یعنی جلوتیہ کے لئے اور تین اہلِ برزخ کے لئے یعنی خلوتیہ کے لئے وہ یہی تین ہیں۔ یعنی جنۃ الافعال والصفات والذات۔

ف: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ۔ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ یا یہ خطاب توحید کا ہے جو مومنین کو ہو رہا ہے۔ یعنی تم اللہ اور اس کے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم روحانی طور پر آدم علیہ السلام کی پشت

میں تھے پھر تمہیں زندہ کیا یعنی تمہیں پشتِ آدم سے نکالا اور اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ جیسا لذیذ خطاب چکھایا اور اس خطاب کی لذت کے ساتھ تمہیں جواب باصواب کی توفیق بخشی کہ تم نے بَلٰی کہہ دیا طَوْعًا نہ کہ کَرْهًا تمہیں موت بخشی یعنی صلب آدم سے اصلابِ آباء میں پہنچا کر عالمِ طبعیہ انسانیہ کی طرف راجع کیا۔ پھر انبیاء کرام علیہم السلام کی تشریف آوری سے ان کی دعوت قبول کرنے سے پھر تمہیں زندہ کیا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی رہبری سے میری طرف ہی لوٹ آؤ گے۔ یا یہ خطاب تشریف کا ہے جو اولیاء و انبیاء کو ہو رہا ہے یعنی تم کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم اموات یعنی کتمِ عدم میں تھے پھر تمہیں عالمِ ارواح میں زندہ کیا پھر تمہارے ارواح کے گارے کو نورِ عنایت کے پانی سے بنایا جسے محبت کے ہاتھ نے وصال کی چالیس صبح سے تخمیر کیا۔ پھر تمہارے شہود و جمال سے جدا کر کے مقبرہ حسن و خیال کے طرف موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو نورِ وحی سے اور اولیاء کرام کو نورِ ایمان کی روح سے، پھر تم میری طرف لوٹ آؤ گے۔ انبیاء کرام علیہم السلام تو عروج سے اور اولیاء کرام جذباتِ حق کی طرف رجوع کرنے سے۔ کما قال تعالیٰ: اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ (اپنے رب کی طرف لوٹ) جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کی طرف رجوع ضروری ہے یا تو اپنے اختیار سے، جیسے کہ یعقوب کی قرأۃ (بفتح التأ و کسر الجیم) دلالت کرتی ہے یا اضطرار سے جیسے باقی قرأء کی قرأۃ سے معلوم ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا یعنی تمام اشیاء کو تمہارے لیے اور تمہیں صرف اپنی ذات کے لئے پیدا کیا۔ کما قال تعالیٰ: وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ (میں نے تمہیں اپنے لیے چن لیا)

اس کا معنی یہ ہے کہ تو کسی اور کے لئے نہ ہو جب میں سوائے تیرے اور کسی کے لئے نہیں ہوں میں اپنی شان کے ساتھ صرف اور صرف تیرا ہوں جیسے کہ حدیث شریف میں ہے: "جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے"

سبق: موجودات میں کوئی ایسا نہیں جس کا یہ رتبہ ہو کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا اور اللہ تعالیٰ اس کا ہو۔ اس میں راز ہے اور راز کا اظہار کفر ہے۔ اے سالک! تیرے لیے لائق ہے کہ اس کے سوا (کہ جس کے لئے تو ہے) مشغول نہ ہو ورنہ اس کے سوا باقی رہ جائے گا (اور یہ خسارہ ہے)

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اس سے معلوم ہوا کہ ساتوں آسمانوں کا وجود انسان

کے تابع ہے۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ یعنی تمام کی پیدائش جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ انہیں کس لیے پیدا کیا اور مخلوق کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں جو اس کی ذات اور صفات کی حمد نہ کرتا ہو اور اس کی احدیت وصمدیت کی گواہی نہ دیتا ہو۔ ہر شے گواہی دے کر کہتی ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (اے ہمارے رب! تو نے اسے عبث پیدا نہیں کیا تو پاک ہے)

مولانا جامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

در جہاں جلوہ گاہ وحدتِ تو — شہد اللہ گواہ وحدتِ تو

ترجمہ: جہان کی جلوہ گاہ میں تیرا ہی وحدت ہے شہد اللہ تیری وحدت کا گواہ ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں بولے کیا

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے اور ہم تجھے سراہتے ہوئے

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ

تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ تعالیٰ

اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ

نے آدم کو تمام (اشیاء کے نام) سکھائے پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا

بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ

سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ۔ بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں

اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ

مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بیشک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔ فرمایا اے آدم بتا دے

بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ

انہیں سب اشیاء کے نام جب آدم نے انہیں سب کے نام بتا دیئے فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں

اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ

آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے اور

تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ

جو تم چھپاتے ہو۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ

منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔ اور ہم نے فرمایا اے آدم! تو اور تیری بی بی

وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ

اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا

الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا

کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔ تو شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے

مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى

وہاں سے انہیں الگ کر دیا اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت

الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ

تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے۔ پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے

فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ

تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کی بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان۔ ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو کار ہوا سے نہ کوئی

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

اندیشہ نہ کچھ غم اور وہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

ان کو ہمیشہ اس میں رہنا

تفسیر عالمانہ

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرمایا:

سوال: وقت کے ذکر کا حکم کیوں دیا گیا ہے حالانکہ مقصود تو ان حوادث کو یاد کرنا ہے جو ان میں واقع ہوئے۔

جواب: محض مبالغہ ہے کیونکہ جو اس وقت کو یاد کرے گا لامحالہ واقعات بھی اس کے سامنے آ جائیں گے۔

لِلْمَلٰٓئِكَةِ فرشتوں سے۔ لام تبلیغ کے لئے اور جار مجرور کی تقدیم اہتمام کے لئے ہے جیسے مطول میں تفصیلاً مذکور ہے اور مابعد کا شوق دلانا بھی ہے اور ملائکۃ "ملک" کی جمع اور تاء جماعت کی تانیث کی تاکید کے لئے ہے اور وہ اس نام سے اس لیے موسوم ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے مابین پیغام کے لئے مقرر ہیں کیونکہ مَلَک" دراصل ملاک" "مالک" کا مقلوب ہے "اَلُوک" (بمعنی رِسالۃ) سے مشتق ہے اور ملائکہ اکثر مسلمانوں کے نزدیک اجسام لطیفہ ہیں یعنی وہ لطیف اجسام جو مختلف شکلوں میں متشکل ہوتے ہیں دلیل یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام انہیں دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تو فرشتوں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ اوپر کو چڑھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے چل رہے ہیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کہاں جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: مجھے اس کا کوئی علم نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ جب میں پیدا ہوا تو سب سے پہلے انہیں آتے جاتے دیکھا، واللہ! یہ کب سے آ جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک فرشتے سے پوچھا: تم کب پیدا ہوئے؟ انہوں نے کہا: ہمیں بھی کوئی خبر نہیں، صرف اتنا جانتے ہیں کہ اللہ ہر چار ہزار سال کے بعد ایک ستارہ پیدا کرتا ہے اور جب سے میں پیدا ہوا ہوں میرے بعد چار ہزار ستارے پیدا کر چکا ہے۔ پاکی ہے اس ذات کے لئے جس کی اتنی بڑی شان اور اس کا اتنا وسیع ملک ہے۔

ف: جن ملائکہ سے مشورہ لیا گیا وہ زمین کے تھے، اس کی دلیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا تو ملائکہ اور جنات بھی پیدا ہوئے۔ ملائکہ کو آسمان میں ٹھہرایا، جنات کو زمین میں، جنات کا بابا جانّ تھا جس طرح انسانوں کا بابا آدم (علیہ السلام) ہے اور جان صاحب کو ایسی آگ کے شعلہ سے پیدا کیا گیا کہ جس میں دھواں نہیں تھا اُسے زمین پر ٹھہرنے کا حکم ہوا جب پھر اس کی نسل بڑھی۔

ف: معلوم ہوا کہ یہ معاملہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ساٹھ ہزار سال کا ہے اور وہ زمین پر بہت طویل عرصہ تک ٹھہرے رہے، تقریباً ستر ہزار سال، پھر ان میں حسد اور بغاوت پھیلی اور لڑے مرے۔ ان کی طرف فرشتوں کو بھیجا، جن کا امیرِ قوم ابلیس تھا اس کا نام عزازیل تھا، ان سے علم میں زائد تھا، زمین پر اُترتے ہی جنات کو شکست دی اور انہیں زمین سے نکال کر دریاؤں کی غاروں میں بھگا دیا اور خود وہیں رہنے سہنے لگے۔ اب ان پر عبادت آسان ہوگئی کیونکہ قاعدہ ہے کہ ملائکہ جو آسمانوں پر بلند ہیں زیادہ خوف زدہ ہیں اور جو ملائکہ آسمانِ دنیا پر ہیں یہ بہ نسبت دوسروں کے آسانی میں ہیں۔ اس کے بعد ابلیس کو زمین و آسمانِ دنیا کی سلطنت دی گئی اور بہشت کا خزانہ بھی سپرد ہوا، اس کے دو زمرد کے پر تھے بنابریں کبھی زمین پر عبادت کرتا کبھی آسمان پر اور کبھی جنت میں، اسی وجہ سے اسے عجب لاحق ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہی شاہی اس لیے دی کہ مجھ سے زیادہ مکرم ملائکہ میں کوئی ہے نہیں اور قاعدہ ہے کہ جو بھی دنیا میں آکر بستا ہے اس کو ایک وقت ضرور دنیا سے برطرف ہونا پڑتا ہے بنابریں اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور اس کے لشکر کو فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ اِنِّیْ جَاعِلٌ میں بنانے والا ہوں فِی الْاَرْضِ زمین میں، کیونکہ بغاوت اور ظلم زمین پر ہی تھا: خَلِیْفَةً یعنی آدم علیہ السلام کو، کیونکہ جنات کے خلف ہوکر اور ان کے بعد تشریف لانے والے یہی تھے۔ علاوہ ازیں زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ یہی تھے۔ یعنی میرا ارادہ ہے کہ زمین میں تمہارے عوض ایک دوسرا پیدا کروں وہ تم سے ہوگا بھی بلند قدر یہ بات ان ملائکہ کو شاق گزری، کیونکہ یہ دیگر ملائکہ سے عبادت میں آسانی سے تھے۔

ف: اللہ تعالیٰ عالمِ دنیا کو خلیفہ کی بدولت محفوظ فرماتا ہے جیسا کہ خزائن کو مہر سے محفوظ کیا جاتا ہے اور عالمِ دنیا میں ہر زمانہ میں خلیفہ صرف ایک ہوتا ہے جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے اور اس کی انتہاء حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوگی۔ خلیفہ بھیجنے میں ایک حکمت یہ ہوتی ہے کہ مخلوق میں فیض لینے کی استعداد کم ہوتی ہے اور بلاواسطہ برکات لینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ فیض دینے والا تنزہ و تقدس میں ہے اور فیض لینے والے علائق دَنیہ میں پھنسے ہوئے ہیں مثلاً اکل و شرب کا نشہ اور عوائق طبعیہ میں سرگرم اخلاق ذمیمہ میں معروف اور اس سے فیض کا پہنچانا ذوجہتین کے واسطہ سے ہوسکتا ہے جو تجرد میں بھی یکجا ہوا اور تعلق دنیا سے بھی وابستہ ہو اور یہ صفات خلیفہ کی ہونی چاہئیں جو کسی بھی زمانہ میں ہوا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ملائکہ سے نہیں بھیجے کیونکہ

عام انسان ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ وہ اس کی جنس سے نہیں ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ہڈیاں گوشت سے غذا لینے میں عاجز ہیں کیونکہ ان کو آپس میں تباعد ہے تو درمیان میں غضروف (حلق) کو پیدا فرمایا تاکہ گوشت سے طعام لے کہ ہڈیوں تک پہنچائے اسی طرح بادشاہ اور رعایا کے مابین وزیر ہوتا ہے کیونکہ رعایا وزیر سے زیادہ قرب میں ہیں اس سے جلد مستفید ہو سکتے ہیں اسی طرح لکڑی اور آگ کے درمیان توا وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ وغیرہ۔

مسائل : اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے مشورہ چار وجہوں سے لیا:۔

ا۔ مشورہ لینے کی تعلیم ہو جائے کہ اپنے تمام امور میں مشورہ لینا سنتِ الٰہیہ ہے اور مشورہ معتمد علیہ اور خیر خواہی سے لیا جائے اگر چہ باری تعالیٰ اپنے علم وسیع اور حکمتِ بالغہ سے مشورہ لینے سے پاک ہے۔ مولانا روم قدس سرہ' فرماتے ہیں:

مشورت ادراک وہشیاری دہد عقل ہا مر عقل را یاری دہد

گفت پیغمبر بکن رائے زن مشورت کالمستشار موتمن

ترجمہ: ☆...... مشورہ تمہیں ادراک اور ہشیاری دے گا عقل عقل کی مدد کرتی ہے۔

☆...... پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا رائے لے اس لیے کہ مشورہ مفید ہوتا ہے اور جس سے مشورہ لیا جائے وہ زمین ہوتا ہے۔

☆...... سکانِ ملکوت کے سامنے آدم علیہ السلام کے عظم شان کا اظہار مقصود ہے کہ وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے اور خلیفہ کے لقب سے نوازے جا رہے ہیں۔

☆...... اس کے اپنے فضل راجح اور ان کے مفاسد سیئہ مرجوعہ کا اظہار کہ جبکہ انہوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا تو اس کے جواب میں فرمایا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ الخ

☆...... جس میں خیر کا غلبہ ہو وہاں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ شرِ قلیل کے خطرے سے خیر کثیر کو نہ چھوڑا جائے جیسا کہ مرض آکلہ کے ماؤف عضو کو کاٹنا ایک قلیل شر ہے اور تمام بدن کی سلامتی خیر کثیر ہے۔ کیونکہ اگر اس عضو کو نہ کاٹا جائے تو اس مرض کا اثر تمام بدن میں پھیل جائے گا جو کہ موجب ہلاکت اور شرِ کثیر ہے۔

قَالُوْۤا یہ جملہ مستانفہ ہے گویا کہا گیا کہ ملائکہ نے کیا جواب دیا، انہوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا یعنی تو زمین میں

اسے پیدا کرتا جو مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا فساد برپا کرے گا جیسا کہ جنّات نے فساد برپا کیا ظرف کے تکرار سے استبعاد کی تاکید کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ظلماً خون ریزی کرے گا جیسا کہ جنّات نے کیا تھا اور قتل کے بجائے يَسْفِكُ الدِّمَآءَ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قتل کے انواع میں یہ سب سے زیادہ قبیح فعل ہے۔

ف: بعض عارفین فرماتے ہیں کہ آدم کے حق میں جھگڑنے والے ملائکہ نہ جبروتی تھے اور نہ ملکوتی سماوی، کیونکہ وہ تو اپنے نوری غلبہ اور مراقبہ عُلیا کے احاطہ سے انسان کی شرافتِ کاملہ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے بلند مراتب کو جانتے تھے (اگرچہ وہ بھی اس کی اصل حقیقت سے عاجز تھے) بلکہ جھگڑنے والے زمین کے ملائکہ اور وہ جن شیاطین تھے جن پر ظلمت غالب تھی۔

ف: اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً میں صرف لفظی تخصیص بذکر الارض ہے، ورنہ وہ تو درحقیقت تمام عالم کا خلیفہ تھا، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ طاعنین زمینی ملائکہ تھے کیونکہ یہ گمان وہاں صادر ہوتا ہے جو اس منصب کے معرض میں ہو اور اہلِ سماوات تو اس سے بری ہیں اور بلند مرتبہ، اور ملائکہ ارضیہ نے جو کچھ کہا یہ اس کے مطابق تھا جس پر ان کی فطرت تھی کہ منصبِ خلافت فی الارض میں رشک اور اس ملک کے مرتبہ لینے کی غیرت اور اپنی اس عبادت کی وجہ سے تھا جو تسبیح و تقدیس کیا کرتے تھے، برتن سے وہی چیز اچھلتی ہے جو اس میں ہوتی ہے۔

ف: حکیم مطلق کے فعل پر اعتراض کرنا اور اس کی صنعت میں جھگڑنا محض اس کی کمال حکمت اور پختہ صنعت کی وجہ سے اس کے حضور میں معاف ہو جاتا ہے۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

زانکہ ایں دَمہا اگرچہ نالائقست	رحمت من بر غضب سابقست
اپ زپئے اظہار ایں سبق اے ملک	در تو بنہم داعیہ اشکال و شک
تا بہ گوئی در نگیرم بر تو من	منکر حلمم نیارد دم زدن
صد پر صد ما در حلم ما	ہر نفس زاید در افتد در فنا
حلمِ ایشاں کف غیر حلم ماست	کف رود آید ولے دریا بجاست

ترجمہ :☆...... اس وقت وہ اگرچہ لائق ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے ☆......اسی وجہ سے اے میرے بندے! تیرے اندر غلطیاں پیدا کرتا ہوں۔☆......تا کہ تجھے معلوم ہو کہ میں مجرم کی گرفت کرسکتا ہوں لیکن منکر کو یقین ہو کہ میں کتنا بُردبار ہوں۔☆......میرے حوصلہ کے ہزاروں حوادث پیدا ہو کر فنا ہو جاتے ہیں ☆......عوام کے حوصلے تو میرے حوصلہ کے بالمقابل ایسے ہیں جیسے جھاگ کو دریا سے نسبت ہوتی ہے۔

ف: فتوحات شریف میں ہے: آدم کے بارہ میں ہاروت و ماروت نے جھگڑا کیا اسی بنا پر ان پر فساد و خونریزی ظاہر کر کے مبتلا فرمایا: یہی راز ہے حضور علیہ السلام کے اس قول میں کہ اپنے بھائی کو گالی مت دو، ورنہ اللہ تعالیٰ اسے تو معاف کر دے گا اور تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔ طعنہ بازوں میں وہ ملائکہ تھے جو مجاہدین کی نصرت و امداد کے لئے آئے تھے کہ انہیں پتہ چلے کہ انسان کی خونریزی اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی غیرت کے لئے ہے۔ (کذافی حل الرموز والکنوز)

وَنَحْنُ حالانکہ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ تیری تسبیح پڑھتے ہیں یعنی اس چیز سے تیری تنزیہ کرتے ہیں جو تیری شان کے لائق نہیں، یعنی وہ تسبیح جو تیری حمد سے ملتبس ہے اور حمد بھی اس لیے کہ تو نے ہمیں قسما قسم کی نعمتوں سے نوازا۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ تو نے ہمیں اپنی عبادت کو توفیق بخشی پس تسبیح صفات جلالیہ کے اظہار کے لئے اور حمد صفات انعام کی تذکیر کے لئے ہوتی ہے وَنُقَدِّسُ تیری بہت تقدیس کرتے ہیں۔ لَكَ یعنی تیری وہ صفت کرتے ہیں جو تیری بلند شان اور عزت کے لائق ہے، لام بیان کے لئے ہے جیسے سقیالک میں ہے اور یہ مصدر محذوف کے متعلق ہے اور ہو سکتا ہے زائد ہو یعنی نُقَدِّسُكَ

فائدہ : تیسیر میں فرماتے ہیں کہ جو شئے شان کے لائق نہیں اس کی نفی کا نام تسبیح اور جو شئے شان کے لائق ہے اس کے اثبات کا نام تقدیس ہے۔

ف: شیخ داؤد قیصری فرماتے ہیں کہ تسبیح تقدیس سے عام ہے کیونکہ تسبیح کہتے ہیں حدوث و امکان کے نقائص سے حق کو منزہ جاننے کو اور تقدیس کہتے ہیں حدوث و امکان کے نقائص سے بھی اور اکوان کے لوازمات سے بھی منزہ ماننا۔ کیونکہ وہ لوازمات کا اکوان کی جانب منسوب کرنے میں سے اطلاق سے خارج ہو کر تقلید کے واقع ہو جائیں گے۔ ملائکہ نے کہا کہ خلیفہ اسے بنایا جا رہا ہے جس کی اولاد سے فساد صادر ہوگا، حالانکہ خلیفہ سے اس کا صدور نہیں ہونا چاہیے، اس سے ان کا مقصود اپنے احق ہونے کا اظہار اور یہ بھی پوچھنا مقصود تھا کہ بنی آدم

کو کیوں ترجیح دی جا رہی ہے حالانکہ اس سے تو فساد کی توقع ہے، پھر گویا کہا گیا کہ ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا: تو جواب دیا گیا قَالَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی آدم علیہ السلام کے خلیفہ بنانے کی مصلحت و حکمت جو میں جانتا ہوں تمہیں اس کا علم نہیں۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں فرمانبردار بھی ہوں گے اور عاصی بھی پھر عدل وفضل کا مظاہرہ ہوگا۔ تم میری حکمت وتقدیر کے پیچھے نہ پڑو اور نہ ہی میری پوشیدہ تدبیر کا انکشاف کراؤ۔ ہر مخلوق کا کام نہیں کہ خالق کے غیبی راز پر مطلع ہو نہ ہی تمام رعیّت بادشاہ کے راز سے واقف ہوتی ہے۔

مسئلہ: آیت میں سالک کے لئے تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے خلفاء ومشائخ وعلماء کے حضور میں با ادب رہے تاکہ ان کے سامنے انانیت اور علم کا اظہار نہ ہو جائے کیونکہ وہ طریقِ فناء کا سالک ہے اور فانی کو طاؤس کی طرح نہ ہونا چاہیے کہ اپنے آپ پر ہی عاشق ہوتا ہے اور اپنی ذات پر ہی نازاں ہوتا ہے بلکہ اسے چاہیے کہ اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو، اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو اِنِّیْٓ اَعْلَمُ الخ زجر فرما کر نصیحت فرمائی ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

نرود مرغ سوئے دانہ فراز چوں دگر مرغ بیند اندر بند
پند گیر مصائب دیگراں تا نہ گیرند دیگر از تو پند

تفسیر صوفیانہ

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً تاویلات نجمیہ میں ہے کہ آیت میں خالق" کی بجائے جَاعِلٌ فرمانے کی دو وجہیں ہیں۔

۱۔ جاعلیت خالقیت سے اعم ہے اس لیے کہ جاعلیت میں خالقیت کے معنی کے علاوہ ایک اور معنی بھی ہے وہ یہ کہ جسے پیدا کیا جائے اس میں صفت خلافت بھی ہو کیونکہ یہ اختصاص ہر ایک میں نہیں ہوتا۔ جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے لئے فرمایا: یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ یعنی اے داؤد! ہم نے تجھے خلافت کا مستعد بنا کر پیدا کیا پھر تمہیں خلافت عنایت فرمائی۔

۲۔ جاعلیت کو عالمِ امور یعنی ملکوت سے خصوصی تعلق ہے اور یہ عالمِ خلق کی ضد ہے کیونکہ عالمِ اجسام وعالمِ محسوسات کا نام ہے۔ **کما قال تعالیٰ:** اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ یعنی ملک اور ملکوت اسی کے ہیں۔

فائدہ نمبر ۱: جہاں پر عالمِ امر کا تعلق ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے جاعلیت کو استعمال فرمایا ہے کیونکہ عالم

امر عالم خلق سے ممتاز ہے۔ کما قال تعالیٰ: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ آسمان وزمین چونکہ عالمِ اجسام ومحسوسات سے ہیں اس لیے انہیں خلقیۃ سے اور ظلمات ونور عالمِ ملکوت غیر محسوس سے ہیں اس لیے انہیں جاعلیت سے تعبیر فرمایا۔

سوال: ظلمات ونور ملکوتیات سے کیسے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ ظلمات اور نور ملکوتیات سے ہیں، ہاں وہ نور اور ظلمات جو محسوسات سے ہیں وہ آسمان وزمین کے حکم میں ہیں۔

قاعدہ نمبر ۲: جہاں پر صرف آدم علیہ السلام کی روحانیت کا ذکر ہے وہاں جعل کو لایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنِّىۡ خَالِـقٌ ۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ الخ

ف: اِنِّىۡ جَاعِلٌ میں ایک اور اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ ملائکہ پر آدم علیہ السلام کی عزت ظاہر ہو جائے تا کہ اسے بنظرِ تعظیم دیکھیں اور جو اس سے یا اس کی اولاد سے اوصاف بشریت ظاہر ہوتے ہیں دیکھ کر انکار نہ کریں، کیونکہ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا۔

نکات: ۱۔ آدم علیہ السلام کو خلیفہ سے موسوم فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں ایسی کرامت کا شرف سوائے آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کے کسی کو نہیں بخشا۔

☆...... اسے خلیفہ سے موسوم کرنے میں دو وجہیں ہیں۔

۱۔ تمام مخلوق سے بعد میں تشریف لایا۔ ۲۔ اس کے بعد اور کوئی نہیں ہوا۔ اسی میں عالم کی پیدا کردہ روحانیات ہوں یا جسمانیات، سماویات ہوں یا ارضیات دنیویات ہوں یا اخرویات یا جمادات ہوں ملکوتیات کی ہر شئے موجود ہے۔ یہ درحقیقت ہر شئے کا خلیفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس پر خصوصی کرم ہے کہ اس میں اپنی روح بخشی۔ عالم کی کوئی شئے اس سے مکرم تر نہیں۔ بایں معنیٰ وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ میں اشارہ ہے اسی اختصاص کی بنا پر عالم کا کوئی فرد صلاحیت نہیں رکھتا کہ سوائے آدم کے باری تعالیٰ کا خلیفہ بنے۔

۳۔ آدم علیہ السلام باری تعالیٰ کے صورۃً ومعناً خلیفہ اور نائب ہیں۔ صورۃً اس لیے کہ ظاہر انسان کا وجود درحقیقت حق کے وجود (موجود ہونا) کا خلیفہ ہے کیونکہ انسان کا وجود (موجود ہونا) اپنے موجد کے وجود (موجود ہونا)

پر دلالت کرتا ہے، جیسے بنا کی دلالت بانی پر ہوتی ہے اور انسان کی وحدانیت حق کی وحدانیت اور اس کی ذات حق کی ذات اور اس کی صفات کا خلیفہ ہیں۔ اسی طرح اس کی حیات حق کی حیات اور اس کی قدرت حق کی قدرت اور اس کا ارادہ حق کا ارادہ اور اس کی سمع حق کی سمع اور اس کی بصر حق کی بصر اور اس کا کلام حق کا کلام، اس کا علم حق کا علم اور اس کی روح حق کی لامکانیت اور اس کی لاجہتیت لاجہتیت کی خلیفہ ہے۔

ف: مخلوقات کا کوئی نوع حق کا خلیفہ نہیں ہو سکتا جیسے آدم اس کا خلیفہ ہے۔ اگرچہ ان کے بعض میں یہ صفات موجود ہیں لیکن صفات کا حق کا اجتماع سوائے انسان کے کسی اور میں نہیں اور نہ ہی اس کی صفت کا تجلی سوائے انسان کے قلب کے شیشہ کے کسی پر پڑتا ہے اور حیوانات میں اگرچہ بعض صفات موجود ہیں لیکن اپنے موجد کے وجود (وجود ہونا) کا علم نہیں اور ملائکہ کو گو اپنے موجد کے وجود کا علم ہے لیکن ان کے علم کا مبلغ اس مقام کو نہیں پہنچا کہ وہ اپنے نفوس کو اپنے جمیع صفات کے ساتھ پہچانیں۔ وہ حق کو بجمیع صفاتہ نہیں جانتے، اسی لیے تو کہہ بیٹھے سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا تو پاک ہے ہمیں صرف وہی علم ہے جو تو نے ہمیں سکھایا اور یہ انسان کا خاصہ ہے کہ اسے اپنے نفس کے لئے خلافت کے استحقاق کا بھی عرفان ہے اور اسمائے حق تعالیٰ کا بھی اور آدم حق تعالیٰ کا معنًا خلیفہ اور نائب اس لیے ہے کہ عالم میں سوائے انسان کے کوئی ایسا چراغ نہیں کہ نور اللہ کی روشنی سے روشن ہو کر بطور خلافت زمین پر اس کی صفات کے انوار کو ظاہر کرے کیونکہ انسان میں اللہ تعالیٰ کے نور سے فیض قبول کرنے کی استعداد ہے کیونکہ اس کے قلب کے فانوس میں راز حقانی کا چراغ رکھا گیا ہے اور وہ فانوس جسد کے طاق میں ہے اور قلب کے فانوس میں روح کا تیل (زیتون) ہے۔ قریب ہے کہ اس کا تیل صفاتِ عقل سے بھڑک اٹھے اگرچہ اسے نور کی آگ نہ چھوئے اور راز حقانی کے چراغ فتیلہ خفا ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ زمین میں کسی کو خلیفہ بنائے تو سرِّ انسانی کے چراغ کو اپنے جمال کے نور سے جلوہ دیتا ہے۔ پھر اپنے نور سے جس فتیلہ خفا کو چاہتا ہے راہ بتاتا ہے پھر وہ نور الٰہی کی آگ سے روشن ہوتا ہے۔ پس وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔ اسی درجہ سے وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ اس کے صفات کے انوار عالم میں ظاہر کرتا ہے۔ عدل و احسان اور رافت و رحمت کے ساتھ ان کے مستحقین کے لئے اور قہر و غضب و انتقام میں ان کے مستحقین پر۔ چنانچہ فرمایا: يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ

سَبِیْلِ اللّٰهِ اور اپنے حبیب علیہ السلام کے لئے فرمایا: بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ اور پھر اپنے محبوب علیہ السلام اور مؤمنین کے حق میں فرمایا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ایسے صفات کا ظہور نہ حیوانات پر ہوا اور نہ ملائکہ پر۔ اس تقریر کی دلیل کے لئے ہاروت و ماروت کا واقعہ ہی کافی ہے کہ جب انہوں نے اولادِ آدم علیہ السلام پر اتباع ہوئی اور قتل و ظلم و فساد کے متعلق اعتراض کیا اور کہا کہ اگر ہم ان کے بجائے زمین پر خلیفے ہوتے تو جس طرح یہ کر رہے ہیں ہم ہرگز نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں لباس بشریت پہنا کر زمین پر بھیجا اور فرمایا کہ لوگوں کے مابین حق کا فیصلہ کرنا اور شرک نہ کرنا اور نہ ہی ناحق قتل کرنا نہ زناء کا ارتکاب کرنا اور نہ شراب پینا، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان پر ایک ماہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ منہیات کے مرتکب ہو گئے شراب بھی پی لی، خون بھی بہایا، زناء بھی کیا اور ناحق قتل بھی اور بُت کو سجدہ بھی کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ خلافت انسان کا خاصہ ہے اور نورِ الٰہی کے فیضان کو قبول کرنا بھی اس سے مخصوص ہے۔ اگر ملائکہ اس کے اہل ہوتے تو وہ ان اوصافِ مذمومہ بہیمیہ میں مبتلا نہ ہو جاتے۔ دیکھئے انبیاء کرام علیہم السلام ایسے رذیل صفات و خسیس اخلاق سے منزہ و معصوم ہیں۔ اگرچہ ان کے صفاتِ بشریہ کو یہ اوصاف لازم تھے لیکن تجلّیٔ حق کے نور سے ان کے دل کے چراغ روشن ہو چکے اور ان کے قلوب کے نور سے ان کے اجسام کے فانوس نوریاب ہوئے ظاہراً بھی اور باطناً بھی اور ان کی زمین (اجسام و ارواح) اپنے رب کے نور سے جگمگا رہی ہے۔ بناء بریں ان صفاتِ رذیلہ کے ظلمات کو ظہور کی مجال بھی نہیں کیونکہ ان پر انوارِ حق کا غلبہ ہے۔ پس ملائکہ نے جب آدم علیہ السلام کے جسمِ اطہر کو ابتداءً دیکھا تو بنظر ملکوتی الملکی ان کو ملکوت جسد پر ظلمات بشریہ و حیوانیہ و سبعیہ سامنے آگئیں اور یہ صفات ان سے غائب بھی نہیں تھیں بنا بریں کہہ بیٹھے: قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ملائکہ کے اس قول میں چند نکتے ہیں:

۱۔ یہ قول دراصل اللہ تعالیٰ نے ہی ملائکہ سے کہلوایا تاکہ ہمارے لیے متحقق ہو جائے کہ یہ مذموم صفات ہماری طینت میں مُودع ہیں اور ہماری جبلت کی ترکیب انہی سے ہے ہمیں اپنے نفسِ امّارہ کے مکر سے بے خوف نہ رہنا چاہیے اور نہ ہی اسے بے قصور سمجھیں جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ۲۔ تاکہ ہمیں پتہ چل جائے کہ ہر وہ عمل صالح جو ہم بجالاتے ہیں یہ صرف اس کی

مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں نیک عمل کرنے کی توفیق بخشی اور وہ فساد وظلم جو ہم سے سرزد ہوئے اسے اپنی طبعی شامت اور خاصہ فطرت سمجھیں۔ کما قال تعالیٰ: مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ اور ہر وہ فساد وظلم جس سے ہم بچ جاتے ہیں یا ہم اس کے مرتکب نہیں یہ اس کی حفاظت وکرم کا نتیجہ ہے۔ کما قال تعالیٰ: اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۳۔ تاکہ ہمیں معلوم ہوا کہ اس کریم نے اپنے فضل وکرم سے اپنی عبودیت وخلافت کے لئے چن لیا (ورنہ ہم اس کے اہل کب تھے) اور پھر اپنے حسنِ کرم سے ہمارے لیے ملائکہ کو فرمایا: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (ورنہ ہم اس کے لائق کب تھے) تاکہ ہم اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو جائیں اور نہ اس کی خدمت (عبادت) سے دور نہ جا پڑیں۔

۴۔ تاکہ معلوم ہوا کہ استعداد کا فاسد ہونا ایک عظیم امر ہے اور خلافت کی بنا بھی استعدادِ قابلیت پر ہے اور ملائکہ کو بھی یہ استعداد اور قابلیت نصیب نہ ہوئی پھر ہمیں اس سعادتِ عظمیٰ سے غفلت نہ کرنی چاہیے بلکہ اس کے حصول کے لئے سرتوڑ کوشش کرنی چاہیے۔

۵۔ ملائکہ نے اَتَجْعَلُ فِيْهَا الخ اس لیے کہا کہ انہوں نے جسدِ آدم کو قبل از نفخ روح دیکھا اور بنظر مَلَکی اس کے جسد کے ملکوت میں جو کہ عناصر اربعہ متضادہ سے پیدا ہے صفاتِ بشریہ، بہیمیہ اور سبعیہ (جو کہ اضداد وعناصر کی ترکیب میں متولد ہوتی ہیں) کو ملاحظہ فرمایا۔ جیسے کہ وہ حیوانات اور درندگان (پھاڑ کھانے والے) کے اجساد کو ملاحظہ کرتے تھے بلکہ ان سب کا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے قبل معائنہ کر چکے تو آدم علیہ السلام کا ان پر قیاس کر لیا جبکہ آدم علیہ السلام ان احوال کا مشاہدہ محققانہ طور پر کر چکے اور یہ احوال ان سے غیب میں نہیں تھے بلکہ یہ احوال ہم سے غیب ہیں کیونکہ ہم تو بذریعہ حواس معلوم کرتے ہیں اور حس والوں کے لئے ملکوت غیب ہوتا ہے اور بعض ہم میں وہ بھی ہیں جو بنظر ملکوتی دیکھا کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ملائکہ اور روحانی ملکوتیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور فرمایا: اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس لحاظ سے اشیاء غیب نہیں ہوں گی، کیونکہ غیب وہ ہے جو ہم سے پوشیدہ ہو اور جس کا مشاہدہ کر لیں تو وہ غائب نہیں ہوگی بلکہ شہادت (حاضر) ہوگی۔ پس ملکوت ملائکہ کے لئے شہادت ہوگی اور ''الحضرۃ الالھیۃ'' ان کے لئے غیب ہے کیونکہ حضرت الٰہیہ تک ملائکہ کی رسائی نہیں، اور انسان کو عالمِ شہادت محسوسہ سے

صورت حاصل ہوئی اور عالمِ غیب ملکوتی غیر محسوس ہے روح ملی اور ایک رازِ حقانیہ نصیب ہوا۔ جس کی بدولت اسے نورِ الٰہیہ کے فیضان کے قبول کرنے کی استعداد ہے۔ پھر تربیت شیخ سے عالمِ شہادت سے ترقی کر کے عالمِ غیب (جس کا نام عالمِ ملکوت ہے) تک پہنچتا ہے۔ پھر رازِ حقانی کی متابعت اور خصوصیت حقہ سے عالمِ ملکوت سے ترقی کر کے عالمِ جبروت و عظموت جس کا نام غیب الغیب ہے تک پہنچ جاتا ہے پھر نورِ ربانی (جو اسے رازِ حقانی کی متابعت کے ذریعہ نصیب ہوا) کے انوارِ جمال و جلال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس موقعہ پر خلافتِ حق میں غیب و شہادت کا جاننے والا ہو جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا یعنی مخصوص غیب، یعنی غیب الغیب پر اَحَدًا (کسی ایک) یعنی ملائکہ کو مسلط نہیں کرتا۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ مگر جس کسی ایک رسول یعنی انسان کامل سے راضی ہو پس یہی رازِ مخفی ہے جو اس انسان میں مرکوز (جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور ملائکہ سے یہ راز پوشیدہ تھا)

کما قال تعالیٰ: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

۶۔ جب ملائکہ نے اپنی عبادات اور استعداد عصمت اور آدم علیہ السلام کی صفاتِ نفسانیہ کو دیکھا تو اپنے آپ کو اعلیٰ شان اور آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو حقیر سمجھ کر کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا یعنی ان کو زمین کا خلیفہ بنا کر بھیج رہا ہے باوجودیکہ اس سے زمین میں فساد پھیلانے اور خونریزی کا امکان ہے، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس میں مصروف ہیں۔ بنابریں ان اوصاف کی وجہ سے خلافت کے حقدار تو ہم ہیں، ان کا اعتراض بنی اسرائیل کی طرح ہے جبکہ ان پر اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا تو کہنے لگے: یہ ہم پر بادشاہ کیسے بن گیا، بادشاہی کے حقدار تو ہم ہیں کیونکہ اس کے پاس تو اتنا وسیع مال نہیں ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ بادشاہی کا استحقاق مال پر موقوف نہیں بلکہ یہ تو میرا اپنا انتخاب ہے بلحاظ: بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ اسی لئے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ وَ اللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ اسی طرح یہاں بھی اجمالاً ملائکہ کو یونہی فرمایا کہ: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ پھر تفصیل فرمائی کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ بیشک آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا اور فرمایا: وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا آدم علیہ السلام کو کل اسماء سکھائے اور فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اس شئے نے تجھے روکا کہ تو اسے سجدہ کرتا جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا: تاکہ ملائکہ کو پتہ چل جائے کہ ملک خلافت کی استعداد و استحقاق کثرت

طاعات کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ مالک الملک اپنا ملک جسے چاہے دے دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے اور چونکہ ملائکہ نے اپنی طاعات کی وجہ سے آدم علیہ السلام پر فخر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علمِ اسماء سے نوازا تا کہ فرشتگان کو معلوم ہو جائے کہ اگر ہم اہلِ طاعت وخدمت ہیں تو وہ آدم علیہ السلام اہلِ عقل ومنّت ہے۔ اہلِ طاعت وخدمت اور اہلِ عقل ومنّت میں بہت بڑا فرق ہے پس فخر کرنے پر انہیں حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تا کہ انہیں پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عبادت سے مستغنی ہے، اور آدم علیہ السلام پر احسان کی بناء پر ملائکہ کا مسجود بنایا تا کہ انہیں خبر ہو جائے کہ فضل اس کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے دے۔

ف: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں ایک اور اشارہ بھی ہے، وہ یہ کہ جس طرح آدم علیہ السلام کے ایسے فضائل ہیں جن کی ملائکہ کو خبر نہیں، اسی طرح ان کے رذائل اور اوصاف ہیں کہ جن کا ان کو علم نہیں، کیونکہ ان کو پتہ نہیں کہ آدم علیہ السلام کے ان اوصافِ مذمومہ کا جو ان کے جسم کا نتیجہ ہیں جو دیگر حیوانات میں مشترک ہیں، جو اس کے ملکوت میں مُودع ہیں اور یہ ان اوصافِ مذمومہ کے غیر ہیں جو نفسِ امّارہ کے نتائج سے ہیں جو کہ شرع کو استعمال نہ کرتے ہوئے روح کی نظر نفس کے تابع ہوتی ہے جیسے عُجب، ریاء، سمعۃ، حسد، حُبِّ دنیا کو آخرت سے پسند کرنا، بدعۃ، دل کا کھوٹ اور برا اعتقاد اور دیگر وہ معاملات اس کے شریک ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو مٹی کو وحی الہام ہوا کہ تجھ سے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ پیدا ہونے والے ہیں، ان میں بعض تو فرمانبردار ہوں گے جو بہشت میں داخل ہوں گے اور بعض نافرمان، جو دوزخ کا ایندھن ہوں گے، زمین نے عرض کی: کیا مجھ سے بھی نافرمان پیدا ہوں گے اور وہ دوزخ کے بھی مستحق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے حکم ہوا: ہاں، ایسے ہی ہوگا، یہ حکم سن کر زمین روئی جس سے چشمے بہہ نکلے جو قیامت تک جاری رہیں گے۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ جا کر زمین کے چار گوشوں سے سیاہ، سرخ، سفید، اطیب

اخبث، نرم، سخت، پہاڑی ہر قسم کی مٹی لے آؤ۔ جبریل علیہ السلام زمین سے مٹی اٹھانے لگے تو زمین نے کہا: تجھے اس ذات کی قسم ہے جس نے تجھے میرے ہاں بھیجا، مجھ سے ذرہ برابر بھی مٹی نہ اٹھانا کیونکہ بادشاہ کے قرب میں اگرچہ بیشمار منافع ہیں لیکن اس سے خطرات بھی بہت ہیں، جیسے کہ کہا گیا ہے:۔

بدریا در منافع بے شمار است　　　اگر خواہی سلامت بر کنار است

ترجمہ: اگر دریا میں بیشمار منافع ہیں، اگر سلامتی چاہتا ہے تو کنارے پر رہو۔

جبریل علیہ السلام خالی لوٹے اور بارگاہِ لایزال میں عرض کی کہ مجھے زمین نے تیری ذات کی قسم دی ہے اس لیے مٹی اٹھانے میں مجھے شرم محسوس ہوئی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میکائیل علیہ السلام کو بھیجا اس کے ساتھ بھی زمین نے وہی کیا جو جبریل علیہ السلام سے کیا تھا، وہ بھی خالی آگئے اور جبریل علیہ السلام کی طرح معذرت کی، پھر اسرافیل علیہ السلام کو روانہ کیا گیا اس سے بھی زمین نے وہی التجا کی، وہ بھی خالی آئے، اور جبریل و میکائیل علیہما السلام کی طرح معذرت ظاہر کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ملک الموت علیہ السلام کو حکم فرمایا وہ جب مٹی اٹھانے لگے تو زمین نے کہا: میں تجھے اس ذات کا واسطہ دیتی ہوں جس نے تجھے مجھ سے مٹی اٹھانے کے لئے بھیجا، مجھ سے مٹی نہ لے جا کہ اس سے ایسی مخلوق پیدا ہوگی جو اپنے مالک کی نافرمان ہو کر دوزخ کا ایندھن بنے گی، عزرائیل علیہ السلام نے کہا: میں بھی تجھے اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں کہ میں تجھ سے مٹی ضرور اٹھاؤں گا تاکہ مجھے نافرمانوں میں شمار نہ کیا جائے۔ عزرائیل علیہ السلام نے یہ کہہ کر زمین کے چار گوشوں سے چالیس گز برابر مٹی اٹھالی۔ زمین کے مختلف رنگوں کی وجہ سے بنی آدم کے بھی مختلف رنگ ہیں کہ ان میں بعض سفید ہیں، بعض سیاہ، بعض نرم، بعض سخت۔

ف: اس مٹی کا ہر ذرہ ہر انسان کا اصل بدن ہوگیا جس جگہ سے جس انسان کی مٹی کا ذرہ لیا گیا وہاں ہی وہ مدفون ہوگا مٹی لے کر حضرت عزرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عزرائیل! کیا تمہیں زمین کی فریاد سے رحم نہ آیا۔ عرض کی: الٰہی! تیری فرمان کے آگے اس کی زاری کا کیا حق تھا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب آدم کی ارواح قبض کرنے پر تجھے مامور کرتا ہوں۔

میت کو خوشبو لگانے میں حکمت:۔ روضۃ العلماء میں ہے کہ زمین نے شکایت کی: یا اللہ! مٹی اٹھانے سے

تو مجھ میں کمی آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گھبراؤ مت، تجھ میں جب واپس آئے گا تو پہلے سے زیادہ حسین و خوشبودار ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مُردے کو عطر و مشک سے معطر کیا جاتا ہے۔

پھر عزرائیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس کے نصف کو دوزخ اور نصف کو جنت میں ڈبو کر وادی نعمان جو مکہ و طائف کے درمیان ہے جا کر رکھ دو۔ اللہ تعالیٰ نے حسبِ منشاء اس مٹی کو وہاں رکھا۔ بعد ازاں اسے وہاں سے نکال کر اس پر ابرِ کرم کی بارش برسائی جس سے اس مٹی کا لیسدار گارا بن گیا۔ اس سے آدم علیہ السلام کا جسم تیار کیا گیا۔

ف: آدم علیہ السلام کی پیدائش میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ آسمانِ دنیا میں پیدا ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ زمین کے باغات میں سے ایک باغ ہے جو ایک عزت والا مکان ہے جس سے دریائے نیل جاری ہوتا ہے، اسی طرح دیگر نہریں، لیکن اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ جنتِ عدن میں پیدا کئے گئے، پھر وہاں سے نکالے گئے۔ (کذافی کشف الکنوز)

حدیث قدسی: میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے آدم علیہ السلام کی مٹی کو اپنے ہاتھ سے خمیر کیا اور پھر اسے چالیس سال تک چھوڑے رکھا (یاد رہے) کہ اس عرصہ کا ایک دن دنیوی سالوں کے ایک ہزار سال کا تھا، یہاں تک کہ وہ خشک ہو کر صلصال ہوگیا، صَلصَال اس مٹی کو کہتے ہیں جو نہایت خشک ہو کر ٹھیکری کی طرح بجے، پھر اس پر انتالیس سال غم کا مینہ برسایا، بعد ازاں صرف ایک سال راحت و سرور کی بارش ہوئی، یہی وجہ ہے کہ بنی آدم کو غم و الم گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا انجام سرور پر ہوتا ہے، جیسا کہ مقولہ مشہور ہے:

آغاز کا انجام ہوتا ہے — اور ہر دکھ کا آرام ہوتا ہے

اِنَّ مع العُسْرِ یُسرش قفاست — شاد برانم کہ سلامِ خداست

ف: ملائکہ ان کے پاس سے گزرے، ان کی اچھی صورت اور بلند قامت دیکھ کر تعجب کرتے کیونکہ ان کا قد پانچ سو گز کا تھا (واللہ اعلم) گز کتنا لمبا تھا کہ آدم کا سر آسمان کو مس کرتا تھا اور اس سے قبل اُس جیسی شکل انہوں نے دیکھی نہیں تھی۔

ایک روز ابلیس کا بھی گزر ہوا، دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کس وجہ سے پیدا ہوا ہے اپنا ہاتھ ان کے جسم پر مارا تو

کھوکھلا معلوم ہوا، اس کے اندر گھس گیا اور پیچھے سے نکل آیا اور اپنی جماعت (وہ ملائکہ جو اس وقت اس کے ساتھ تھے) سے کہنے لگا یہ (آدم) کھوکھلا پیدا کیا گیا ہے فلہٰذا یہ کسی بت پر ثابت قدم نہ رہ سکے گا۔ اب مجھے بتاؤ اگر اسے تم سے افضل بنایا گیا تو تم کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم اپنے مالک کا فرمان مانیں گے۔ ابلیس ملعون نے اپنے دل میں کہا اگر اسے مجھ سے افضل بنایا گیا تو میں اس کے تابع نہیں رہوں گا۔ (اگر اسے میری فانبرداری میں دیا گیا تو ذلیل کروں گا)

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود ۔۔۔ گرچہ با آدمی بزرگ شود

پھر اپنی تھوک جمع کر کے مقام ناف (آدم علیہ السلام) پر ڈال دی۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اس تھوک کو نافذ سے کرید لیں۔

انسان کی ناف سے کُتے کی پیدائش: ناف کی گہرائی جبرائیل علیہ السلام کے مقامِ ناف (آدم علیہ السلام) سے مٹی کریدنے کی وجہ سے ہے۔ پھر اس کریدی ہوئی مٹی سے کُتے کو پیدا کیا گیا۔ اسی لیے کتے میں تین عادتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ آدمی سے مانوس اس لیے ہے کہ آدم علیہ السلام کی مٹی سے اس کی پیدائش ہوئی۔

۲۔ رات بھر اس لیے بیدار رہتا ہے کہ مٹی کو جبرائیل علیہ السلام نے چھوا۔

۳۔ اس کا انسان وغیرہ کو کاٹنا اور دیگر شرارتیں کرنا شیطان کی تھوک کا اثر ہے۔

ف: حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کی عصر کے بعد پیدا کیا گیا۔

آدم کی وجہ تسمیہ اور روح کا داخلہ: آدم علیہ السلام کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ ان کی ترکیب اذیم الارض یعنی زمین کے مختلف رنگوں سے ہے۔

جب آدم علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے نفخ روح کا ارادہ فرمایا تو روح کو حکم فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے اندر داخل ہو جا۔ روح نے عرض کی: الٰہی! یہ جگہ نہایت گہری اور بہت تاریک مکان ہے، دوسری بار حکم ہوا تو اس نے پھر وہی معذرت کی۔ تیسری بار حکم ہوا تب بھی وہی کہا: اس کے بعد روح آدم علیہ السلام کے اندر خود بخود داخل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلا رضا (مجبورا) داخل ہو رہی ہے تو پھر نکلنے میں سخت دشواری ہو گی۔ یہی

وجہ ہے کہ جب روح نکلتی ہے تو سخت تکلف ہوتی ہے۔ جب نفخ روح کیا گیا تو پہلے سر اور پیشانی اور دونوں کانوں اور زبان میں پہنچی پھر تمام جس میں پھیلنے لگی یہاں تک کہ قدموں تک پہنچی تو آگے کوئی راہ نہ تھی واپس ناک کے سوراخوں سے نکلی تو آدم علیہ السلام کو چھینک آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: کہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ آدم علیہ السلام نے کہی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یرحمک اللّٰہ (اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے) جب روح گھٹنوں کے اندر داخل ہوئی تو آدم علیہ السلام نے چلنے کو چاہا، لیکن چل نہ سکے۔ جب روح قدموں میں پہنچی تو چلنے لگے (آدم علیہ السلام کی عجلت کو دیکھ کر) باری تعالیٰ نے فرمایا: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انسان جلد باز پیدا کیا گیا) اسی سے پورا بشر ہوا، جس میں گوشت، خون، ہڈیاں، عصب، آنتیں وغیرہ جمع کیے گئے۔ پھر ان کو ناخنوں کی طرح کا ایک لباس پہنایا، جس سے آدم علیہ السلام کے حسن میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اسی سے ملبوس تھے اور اسی سے ان کا تاج تھا۔

آدم علیہ السلام کے جسم میں نَو دروازے

اُن میں سات دروازے تو ان کے سر میں رکھے گئے۔ (۲،۱) دو کان جن سے کلام سنیں۔ (۴،۳) دو آنکھیں جن سے اشیاء کو دیکھیں۔ (۶،۵) ناک کے دو سوراخ جن سے ہر بودار شئے کو سونگھیں۔ منہ میں زبان ہے جس سے بولیں۔ (۷) حلق کا باب ہے کہ جس سے ہر شئے کا ذائقہ محسوس ہو۔ (۹،۸) دروازے دیگر جسد میں یعنی قُبل دُبر کہ جس سے طعام کا فضلہ خارج ہو۔ عقل کو دماغ میں اور حرص کو رانوں میں اور غضب کو جگر میں اور شجاعت کو قلب میں اور رغبت کو حلق میں اور ضحک کو طحال میں، خوشی و غم کو منہ میں رکھا گیا، پاک ہے وہ ذات جس نے ہڈی کو سننے کی اور چربی کو دیکھنے کی اور گوشت کو بولنے کی اور خون کو پہچاننے کی طاقت بخشی۔

آدم علیہ السلام کا علم: جب آدم علیہ السلام کے جسم مبارک کی تکمیل ہو گئی تو انہیں تمام اشیاء کے اسماء کا علم دیا یعنی اسماء کا علم ان کے دل پر الہام کیا۔ پھر بات بھی زبان پر ظاہر ہوئی۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جمیع لغات کے تمام مسمیات کے اسماء سکھا دیے۔ بایں معنی کہ جس جنس کو جس طرح پیدا فرمایا اس کو سامنے لا کر فرمایا کہ اس کا نام گھوڑا ہے، اس کا نام اونٹ وغیرہ، ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ ان کو فلاں منافع دینیہ ودنیویہ کے لئے پیدا فرمایا گیا ہے اور تمام ملائکہ کے اسماء بتائے اور تمام (اولاد آدم) کے اسماء اور اسی طرح جمیع

حیوانات و جمادات کے اسماء بتائے اور ہر کاریگری، تمام شہروں اور بستیوں کے نام اور تمام پرندوں اور درختوں کے نام اور ان سے جو ضروریات پوری ہوں گی وغیرہ، اور ہر ذی روح شئے جو بھی قیامت تک پیدا ہوگی، ہر معلوم اور ہر مشروب کے اسماء اور بہشت کی ہر نعمت کا نام، یہاں تک کہ پیالہ اور تھال اور ٹب کے اسماء بتائے۔

مسئلہ: کشف الکنوز میں فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کے جم غفیر نے اجماع کیا ہے کہ تمام اسماء توقیفیہ ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام میں علم ضروری پیدا فرمایا کہ جس سے انہیں الفاظ و معانی کی معرفت ہو جاتی اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ الفاظ فلاں فلاں معانی کے لئے موزوں ہیں۔

حدیث شریف نمبر ۱:۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو اس میں حروف کے اسرار کو پھیلا دیا جبکہ فرشتگاں اس بات سے محروم رہے، پھر حروف آدم علیہ السلام کی زبان سے فنون لغات خارج ہوتے۔ پھر اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کے لئے ان حروف کی صورتیں بنا دیتا جو مختلف اشکال میں متشکل ہو کر ان کے سامنے آجاتے۔

حدیث شریف نمبر ۲: آدم علیہ السلام کو سات لاکھ لغت سکھائی گئیں۔ جب شجرِ ممنوعہ دکھایا تو لغت عربیہ کے سوا باقی تمام لغتیں سلب ہو گئیں۔ پھر جب انہیں نبوت عطا ہوئی تو تمام لغات لوٹا دی گئیں۔ یہ ان کا معجزہ تھا کہ قیامت تک ان کی اولاد جتنی لغات بولے گی سب آدم علیہ السلام جانتے اور بولتے بھی تھے۔ مثلاً عربی، فارسی، رومی، سریانی، یونانی، عبرانی، زنجی وغیرہ۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کاروبار کی ہزار صنعتیں سکھائیں اور فرمایا کہ اپنی اولاد سے کہہ دو کہ ان صنعتوں سے دنیوی فوائد جس قدر چاہیں حاصل کریں، لیکن دین اور احکامِ شرع کو اپنا ذریعہ معاش نہ بنائیں۔

ف: آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے۔[1] نوح علیہ السلام بڑھئی تھے۔ ادریس علیہ السلام درزی۔ صالح علیہ السلام تاجر۔ داؤد علیہ السلام زرہ باف تھے۔ سلیمان علیہ السلام اپنی سلطنت میں زنبیل بنتے اور بیچ کر گزارہ کرتے۔ بیت المال سے ہرگز نہ کھاتے۔ حضرت موسیٰ، حضرت شعیب علیہما السلام اور حضرت محمد

---

[1] تفسیر ''فتح القدیر'' میں ہے کہ اَوَّلَ مَنْ حَاکَ آدَمُ علیہ السلام (سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے کپڑا بنا) اور شیث علیہ السلام بھی کپڑا بنتے تھے۔ (مترجم)

مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رائی تھے اور ہمارے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں اکثر خیاطت کا کام کرتے۔

مسئلہ : حدیث شریف میں ہے کہ مردوں میں ابرار کا کام خیاطت ہے اور عورتوں کا کام چرخہ کاتنا۔

(کذافی روضۃ الاخیار)

ف: علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ، اَلْاَسْمَآءَ استغراق کا تقاضا کرتا ہے اور کُلَّهَا شمول کو واجب کرتا ہے اب جس طرح انہیں مخلوق کے اسماء بتائے اسمائے حق بھی ضرور بتائے ہوں گے۔ اب وہ مخلوق کے اسماء جاننے سے مخصوص ہو کر مسجود ملائکہ ٹھہرے۔ نہ معلوم اسمائے حق جاننے سے انہیں کیا رتبہ ملا ہوگا۔ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ یعنی مسمیات کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا۔

سوال : عَرَضَهُمْ میں ضمیر مذکر کیوں لائی گئی؟

جواب : مسمیات میں عُقلاء بھی شامل ہیں ان کی وجہ سے تغلیباً ضمیر مذکر لائی گئی۔ الغرض بمعنیٰ اظہار الشئی للغیر، تا کہ شئے کا حال معلوم ہو۔

حدیث شریف میں ہے:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سب چیزوں کے نمونے آدم علیہ السلام کے سامنے چھوٹی چھوٹی کیڑیوں کی طرح پیش کیے گئے''

ف: ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کے افراد بطور نمونہ پیش فرمائے ہوں تا کہ اس سے باقیوں کے احوال واحکام معلوم ہوں۔

نکتہ : آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم پھر ملائکہ کے سامنے پیش کرنے میں آدم علیہ السلام کی بلند قدری اور ان کا چناؤ مقصود تھا اور اپنے اسرار اور علوم مکنونہ (جو اس کے مخصوص غیب سے ہیں) جس کی زبان پر چاہے ظاہر کردے وہ باری تعالیٰ آدم صفی اللہ علیہ السلام کو اسماء سکھائے اور مکرم بنایا تا کہ اپنے علم ومعرفت میں کسی فرشتہ وغیرہ کا محتاج نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت ہے جو ہر شئے کو واسع ہے۔ فَقَالَ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو تعجیزاً وتبکیتاً فرمایا:

مسئلہ: تعجیز کا خطاب جائز ہے۔

قاعدہ: خطاب تعجیز وہ ہے جو کسی شئے کے لانے کا حکم کیا جائے لیکن اس شئے کا لانا مقصود نہ ہوتا کہ مخاطب کا عجز ظاہر ہو جائے۔ اگرچہ وہ شئے فی نفسہ محال ہو، جیسے قیامت میں مصورین کو اس صورتوں کے احیاء کا حکم ہوگا کہ بناؤ وہ صورتیں جسے وہ دنیا میں بناتے تھے تا کہ ان کا عجز ظاہر ہو جائے اور انہیں ندامت ہو۔ اگرچہ اس وقت ندامت کام نہیں آئے گی۔

اَنْۢبِئُوْنِیْ مجھے خبر دو۔ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ ان موجودات کی۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم اپنے گمان میں سچے ہو کہ خلافت کے حقدار ہم ہیں۔ جیسے آدم علیہ السلام تمام حالات بتا رہے ہیں تم بھی بتاؤ۔

مسئلہ: علمِ توحید کے بعد علم لغت کا سیکھنا اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آدم علیہ السلام کی فضیلت اس کی وجہ سے ظاہر فرمائی۔

مسئلہ: مدعی سے دعویٰ پر حجت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جیسے ملائکہ نے اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے دلیل کا ارشاد فرمایا۔ انہوں نے غیب کی بحث چھیڑی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مشاہدہ کی بات سے عاجز کیا یعنی جس شئے کو دیکھ کر بھی تم معلوم نہیں کر سکتے، پھر جن کو تم نے دیکھا بھی نہیں ان کے لئے فساد کا دعویٰ کیسے کر رہے ہو۔

تنبیہ: اے لفظی مدعیو! حقیقت کی تلاش کرو، اور اے معرفت کے دعویدارو! محبت کا ہونا تمہارے لیے ضروری ہے اور محبت کا دم بھرنے والو! تمہارے لیے طاعت لازمی ہے۔

نکتہ: حضرت ابوبکر واسطی فرماتے ہیں محال ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچان لے اور اس سے محبت نہ کرے اور پھر محال ہے کہ اس سے محبت تو ہو لیکن اسے یاد نہ کرے اور پھر یہ بھی محال ہے کہ اسے یاد کرے لیکن اسے یاد کرنے میں اس کے ذکر میں حلاوت نہ پائے اور محالات سے ہے کہ اس کے ذکر کی حلاوت پا کر غیر سے مشغول ہو۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا جملہ مستانفہ ہے۔ سوال کا جواب ہے گویا سوال کیا گیا کہ جب انہیں حکم ہوا تو کیا وہ اس حکم سے عہدہ برآ ہوئے یا نہ؟ جواب میں فرمایا گیا: سُبْحٰنَكَ ہم تیری ذات کی تنزیہ بیان کرتے ہیں ان امور سے جو تیری شان اقدس کے لائق نہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی کہ تیرے افعال مصلحتوں اور حکمتوں سے خالی نہیں ہوتے۔

قاعدہ :۔ دراصل یہ کلمہ توبہ سے پہلے لایا جاتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا:۔ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ تو پاک ہے میں نے تیرے ہاں توبہ کی اور یونس علیہ السلام نے کہا:۔ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ پاک ہے تو بے شک میں ظالموں میں سے ہوں۔

قاعدہ :۔ سُبْحٰنَ مصدر کا قائم مقام ہوکر آتا ہے اور اضافت کے بغیر نہیں ہوتا جب اضافت کے بغیر ہو تو اس وقت تسبیح کا علم ہوکر غیر منصرف پڑھا جائے گا بسبب علمیت اور الف ونون زائدتان کے لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ملائکہ کو جس وقت تسبیح کا حکم کیا گیا اس کے لانے سے عجز کا اعتراف کرر ہے ہیں کہ ہمیں صرف اتنا علم ہے جتنا تو نے ہمیں عطا فرمایا۔

مسئلہ :۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا سوال استفسار اً تھا اعتراض کے طور نہ تھا۔ کیونکہ آیت کا معنی یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں مگر وہ جو ہمارے لئے مناسب تھا ہماری قابلیت کے مطابق سکھایا اور جو شئے ہماری استعداد کے دائرہ سے خارج ہے ہماری قدرت میں نہیں۔ اگر ہم اس کے اہل ہوتے تو ہمیں عنائت فرما دیتا۔ ما مصدریہ ہے اب عبارت یوں ہوگی۔ ای لا علمنا علمتنا ہ مگر اتنا کہ تو نے ہمیں سکھایا۔ اس کا محل رفعً ہے ترکیب میں لا، علم کے موضع سے بدل ہے جیسے لا الہ الا اللّٰہ میں۔

اِنَّكَ اَنْتَ ، اَنْتَ ضمیر فصل کی ہے اس پر اعراب کا کوئی محل نہیں اَلْعَلِيْمُ وہ ذات کہ جس پر کوئی شئے مخفی نہیں۔ ملائکہ " اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ " کہہ کر " اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ " کی تحقیق وتوثیق کرر ہے ہیں۔ اَلْحَكِيْمُ اپنی مصنوعات کی حکمتوں کو پختہ کرنے والا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا مگر اس میں بڑی حکمت مضمر ہوتی ہے۔

تنبیہ :۔ بندہ کو چاہیے کہ اپنے نقصان اور اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے غافل نہ ہو اور نہ ہی جس کا اسے علم نہیں اس سے لاعلمی کے اظہار میں عار کرے اور جس کا اسے علم ہے نہ چھپائے اسی ملئے علماء فرماتے ہیں۔ لا ادری (میں نہیں جانتا) کہنا نصف علم ہے۔

حکایت: قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:۔ لا ادری لوگوں نے کہا بیت المال سے اتنا اتنا مال کھاتا ہے اور پھر کہتا ہے: لا ادری آپ نے فرمایا میں تو یہ اپنے علم کے اندازہ کے مطابق کھاتا ہوں۔ اگر جہالت کی وجہ سے مجھے کچھ ملے تو پھر دنیا میرے پاس ان گنت ہوتی۔

حکایت: ایک عالم سے منبر پر ایک مسئلہ پوچھا گیا، انہوں نے فرمایا: لا ادری، لوگوں نے کہا: یہ منبر جاہلوں کے لئے نہیں۔ انہوں نے فرمایا: منبر پر بیٹھنے کا شرف مجھے علم کی وجہ سے ملا ہے۔ اگر مجھے جہالت کی وجہ سے بلندی ملتی تو اب تک میں آسمان پر پہنچ جاتا۔

قَالَ یہ جملہ بھی مستانفہ ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ اے آدم ان کو خبر دے دو بِاَسْمَآىٕهِمْ یعنی وہ اسماء کہ جن کے علم سے فرشتگان نے عاجز آکر اسماء کے مراتب تک پہنچنے تک اپنی ہمت کے قصور کا اعتراف کرلیا۔

فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىٕهِمْ مروی ہے کہ آدم علیہ السلام کو منبر پر بٹھا کر حکم دیا گیا کہ اسماء کی خبر ملائکہ کو دیں۔ جب وہ منبر پر بیٹھے اور ملائکہ ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ آدم علیہ السلام انہیں ہر اسم کا نفع بتا رہے تھے۔ قَالَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یہ استفہام تقریری ہے یعنی بیشک میں نے تمہیں فرمایا تھا کہ جو کچھ زمین و آسمان میں پوشیدہ ہے میں جانتا ہوں، اس غیب پر نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی راہ۔

وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ جو تم ظاہر کر رہے تھے کہ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا اسے میں بھی جانتا ہوں وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ وہ تم اپنے دل میں کہہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ برگزیدہ اور کسی کو پیدا نہیں کرے گا، اس کا بھی علم ہے۔ یہ قول اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی طرح ہے یہ صرف اس سے زیادہ بسیط ہے تا کہ ان پر حجت قائم ہو سکے کیونکہ وہ کریم آسمان و زمین کے جمیع امور و احوال ظواہر و بواطن کو جانتا ہے اور جو کچھ ملائکہ کے علم میں نہیں اسے بھی جانتا ہے۔

ف: اس آیت میں ملائکہ کو ترکِ اولیٰ پر عتاب ہے ان کے لئے اولیٰ یہ تھا کہ فرمان کے منتظر رہتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بات ظاہر کی جاتی۔

مسئلہ: یہ آیات انسان کی شرافت اور اس کے علم کی زیادت اور عبادت کی افضلیت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ ملائکہ آدم سے فضیلت میں زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود خلافت کے مستحق ٹھہرے کیونکہ آدم علیہ السلام ان سے اعلم تھے اور اعلم افضل ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ

تنبیہ: علم ایک اعلیٰ جوہر ہے لیکن بندوں کے لئے ضروری ہے کہ علم کے ہوتے ہوئے عبادت میں مصروف

رہیں کیونکہ علم بمنزلہ شجر کے ہے اور عبادت بمنزلہ ثمر کے۔ اگرچہ بلحاظ اصالت کے شجر کو فضیلت ہے لیکن درخت سے نفع لینا ثمر کی وجہ سے ہوتا ہے۔

حدیث شریف ۱:۔ والد، کعبہ مکرمہ اور قرآن پاک اور عالم دین کی زیارت عبادت ہے:۔ جس نے عالم (دین) کی زیارت کی گویا اس نے میری (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) زیارت کی اور جس نے عالم سے مصافحہ کیا گویا اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ جو عالم کی مجلس میں بیٹھا وہ گویا دنیا میں میری مجلس میں بیٹھا۔ اسے قیامت میں اللہ تعالیٰ میرے ساتھ بٹھائے گا۔

حدیث شریف ۲:۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہ اہل علم کی مجلس میں حاضر ہونا ہزار رکعت پڑھنے اور ہزار مریض کی طبع پرسی اور ہزار جنازہ کی حاضری سے افضل ہے۔ عرض کیا: یارسول اللہ! کیا تلاوتِ قرآن سے بھی؟ آپ نے فرمایا: قرآن علم کے بغیر نفع نہیں دیتا۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

خاتم مُلک سلیمانست علم　　　جملہ عالم صورت و جانست علم

ترجمہ: ملک سلیمان کی مہر علم ہے تمام جہان جسم اور علم جان ہے۔

حدیث شریف ۳:۔ جو چاہے کہ میں دوزخ سے آزاد شدہ لوگوں کو دیکھوں تو وہ دین کے طالب علموں کی زیارت کرے مجھے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضہ قدرت میں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے ہر وہ طالب علم جو علم کے دروازہ پر جاتا ہے اس کے ہر قدم پر سال کی عبادت لکھی جاتی ہے اور ہر قدم پر بہشت میں پورا شہر بنایا جاتا ہے۔ طالب علم زمین پر چلتا ہے زمین اس کے لئے بخشش کی دعا مانگتی ہے اور ہر صبح و شام اسے مغفورین میں شمار کیا جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اسماء تین قسم ہیں:

۱۔ اسماء الروحانیات والملکوتیات۔ ۲۔ اسماء الجسمانیات۔ ۳۔ اسماء الالٰہیات۔

۱۔ اسماء الروحانیات والملکوتیات: یہ ملائکہ کا مقام اور مرتبہ ہے ان کو ان کے بعض کا علم ہوتا ہے اور جن کا

انہیں علم نہیں ہوتا ان کی خبر دینے کی انہیں استعداد ہے کیونکہ روحانیات اور ملکوتیات ان کے لئے ایسے ہیں جیسے ہمارے لیے جسمانیات۔

۲۔ اسماء الجسمانیات: یہ پہلے مرتبہ سے کم درجہ ہے۔ ان کی خبر دینا ملائکہ کے امکان میں ہے کیونکہ جسمانیات ان کے لئے ایسے ہیں جیسے حیوانات ہمارے لئے اس لیے کہ یہ مرتبہ انسان کے مرتبہ سے کم ہے اور انسان کے لئے اس کی خبر دینا ممکن ہے۔

۳۔ اسماء الالٰہیات: یہ ملائکہ کے مرتبہ سے فوق الدرجہ ہے۔ کما قال تعالیٰ: یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ اپنے رب سے اوپر سے ڈرتے ہیں۔

انسان کو ممکن نہیں کہ ان کی خبر دے سکے اور نہ ہی ملائکہ کو۔ جتنا کہ اللہ تعالیٰ نے علم دیا اس سے آگے کچھ بتا سکیں۔ کیونکہ غیب ہے اور انہیں عالمِ غیب کی جانب ترقی نہیں ملتی اس لیے کہ یہ عالم جبروت ہے اور ملائکہ اہلِ ملکوت ہیں ان کا مقام محدود و معلوم ہے اس سے متجاوز نہیں ہوتے۔ جیسا کہ جبریل علیہ السلام نے شبِ معراج سدرۃ المنتہیٰ پر ٹھہر کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اگر میں انگلی کی مقدار آگے بڑھوں تو جل جاؤں گا۔

نکتہ ۱:۔ اس علم سے صرف آدم علیہ السلام کو مخصوص کیا گیا کیونکہ آپ عالم کے خلاصہ ہیں۔ آدم علیہ السلام کی روح شجر عالم کا بیج ہے اور آپ کا جسم شجرہ عالم کا ثمر۔ اسی لیے تمام عالم کی پیدائش کے بعد آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔ جیسے ثمر، درخت کی تکمیل کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

نکتہ ۲:۔ جیسے ثمر تمام درخت کے اجزاء کو عبور کرتا ہوا درخت کے اوپر نمودار ہوتا ہے۔ ایسے ہی آدم علیہ السلام موجودات کے درخت کے اجزاء کو عبور فرمایا۔ خواہ علوی دنیا تھی خواہ سفلی اور موجودات کے ہر جز میں نفع بھی تھا اور مضرت بھی اور مصلحت بھی اور فساد بھی۔ پھر ہر شئے کا نام بمطابق نفع ونقصان رکھا گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا آدم علیہ السلام سکھایا گیا۔ یہ وہ علم تھا جو آدم علیہ السلام کو دیا گیا۔ جس سے ملائکہ لاعلم تھے یہ آدم علیہ السلام کے کمال سے تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کو بمطابق نفع ونقصان معلوم کرلیا۔ پھر غیر کے اسماء کا علم تو ادنیٰ درجہ تھا۔ اسماءِ الٰہی کے علم کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام مخلوق ہیں تو اللہ تعالیٰ خالق ہے اور آدم علیہ السلام مرزوق ہیں تو وہ رازق ہے۔ آدم علیہ السلام عبد ہیں تو وہ معبود ہے۔ آدم معیوب ہیں تو اللہ تعالیٰ

ستار ہے۔ آدم مذنب ہیں تو وہ غفار ہے۔ آدم تائب ہیں تو وہ تواب ہے۔ آدم نفع لینے والے ہیں تو اللہ نافع ہے آدم ضرر پانے والے ہیں تو اللہ ضار ہے۔ آدم علیہ السلام ظالم ہیں تو وہ عادل ہے۔ آدم علیہ السلام مظلوم ہیں تو اللہ تعالیٰ منتقم وغیرہ۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قُلْنَا یعنی یاد کیجئے اے محمد! جبکہ ہم نے۔ لِلْمَلٰٓئِكَةِ تمام ملائکہ کو، جیسا کہ دوسری جگہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کما قال: فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۔ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ میں گر جاؤ۔

حل لغات: السجود: دراصل تذلل مع طمانیت کو کہتے ہیں: اور شرع میں وضع الجهة علی قصد العبادة والمامور به۔ یہاں پر اگر شرعی معنیٰ لیا جائے تو ملائکہ دراصل سجدہ تو اللہ تعالیٰ کو کر رہے تھے اور آدم علیہ السلام کی شان بڑھانے کے لئے ان کو ملائکہ کا قبلہ قرار دیا گیا۔ اگر لغوی معنیٰ مراد ہو تو یہ تواضع پر محمول ہوگا جو ملائکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم میں سجدہ کر رہے تھے وہ ایسے تھے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے سجدہ تحیۃ کیا۔

مسئلہ: سجدہ تحیہ پہلی امتوں میں جائز تھا پھر ہمارے لیے منسوخ ہوا، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو فرمایا جب انہوں نے آپ کو سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا: ''سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو سجدہ کرنا روا نہیں، اگر میں کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے''

مسئلہ: اس امت کا تحیہ السلام علیکم کہنا ہے۔ لیکن سر جھکانا مکروہ ہے کیونکہ اس سے یہود سے تشبیہ ہوتی ہے۔ (کذا فی الدرر)

ف: یہ ارشاد گرامی (سجدہ کا حکم) اسماء کے انباء کے بعد تھا۔

ف: بعض مفسرین فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ملائکہ کو وہم تھا کہ کیا ہم اعلیٰ ہیں یا آدم (علیہ السلام) پھر جب ان سے اسماء کے متعلق پوچھا گیا اور وہ بتا نہ سکے اور حضرت آدم علیہ السلام نے بتا دیا اب انہیں پتا چلا کہ آدم علیہ السلام اعلم ہیں۔ پھر ان کو اشکال ہوا کہ ہم افضل ہیں یا آدم۔ جب ان کو سجدہ کا حکم ہوا تو انہیں معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام افضل ہیں۔

نکتہ : ہمارے باپ کو سجدہ کرایا جارہا ہے لیکن ہمیں ارشاد ہوتا ہے لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا

یہ اس کا خاص کرم ہے جو صرف ہمارے لیے ہے۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اسْجُدُوْا کے تین معانی ہیں:

۱۔ ملائکہ! تم اللہ تعالیٰ کو تو سجدہ باعتبار طبیعت ملکیہ وروحانیہ کرتے ہو اب آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو اگرچہ یہ تمہاری طبیعت کے خلاف ہے۔ یہ بھی انقیاد للامر اور امتثال للحکم ہے۔

۲۔ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اس کی شانِ عظمت کی تعظیم اور مخصوص فضیلت کی تکریم کی وجہ سے نہ اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ پایا جاتا ہے۔ جس نے اسے سجدہ کیا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ بیشک وہ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں بیشک وہ میری بیعت کرتے ہیں۔

۳۔ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ یعنی آدم علیہ السلام کی خاطر سجدہ کرو۔ کیونکہ اس کی طاعت وعبادت ان کے لئے ثواب وترقی درجات کا موجب نہیں بلکہ اس کا فائدہ انسان کی طرف راجع ہوگا۔ اس کی دو وجہیں ہیں اول تو یہ کہ انسان طاعت میں ملائکہ کی اقتدا کرے گا اور امتثال امر میں ان کی عادت سیکھے گا اور طاعت سے اِباء واستکبار سے ملائکہ کو دیکھ کر بچ جائے گا تاکہ لعن وطعن کا مستحق نہ ہو۔ جیسے ابلیس ہوا اور ملائکہ کی طرح اللہ تعالیٰ کا ممدوح ومکرم ومقبول ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے لئے فرمایا: لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے ملائکہ کی طاعت اور تسبیح وتحمید کو انسان کی مغفرت کے لئے متعین فرمایا۔ کما قال تعالیٰ عزوجل: وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ اسی لیے ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا تاکہ انسان عبادت کا طریقہ سیکھے اور پھر ملائکہ کی عبادت انسان کی مغفرت کا سامان بنے۔

تفسیر عالمانہ

فَسَجَدُوْا یعنی ملائکہ نے سجدہ کیا اس لیے وہ نور سے پیدا کیے گئے کما قال علیہ السلام فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور نور کی شان انقیاد وطاعت ہے۔

ف: سب سے پہلے جبریل علیہ السلام نے سجدہ کیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء کرام علیہم السلام خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیام رسانی کا شرف بخشا۔ پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر عزرائیل

پھر تمام ملائکہ نے سجدہ کیا۔

ف: بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سجدہ کرنے والے اسرافیل ہیں۔ جب انہوں نے سجدہ سے سر اٹھایا تو ان کی پیشانی پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ یہ صرف اس سجدہ کی برکت تھی۔

ف: فَسَجَدُوْٓا میں فـــا ان کے امتثال میں عجلت اور عدمِ غفلت کے اظہار کے لئے ہے کہ سجدہ کا حکم سنتے ہی فوراً سجدہ میں گر گئے۔

اِلَّآ اِبْلِیْسَ یعنی ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس لیے کہ اس کی پیدائش نار سے تھی۔ نار کا کام استکبار اور علو کی طلب ہے۔

اس استثناء کے بارہ میں علماء کرام کے دو قول ہیں:

ا۔ استثناء متصل ہے کیونکہ ابلیس اگرچہ جن تھا لیکن ملائکہ کی کروڑوں کی تعداد میں ایک کا کیا شمار اور ان کے اوصاف سے بھی متصف تھا پھر تغلیباً فَسَجَدُوْٓا سے استثناء کیا گیا۔

ف: اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا کیونکہ سجدہ کا خطاب ملائکہ کو ہی تھا۔ بغوی عـلـیـه الرحمه فرماتے ہیں یہی اصح ہے۔

مسئلہ: تیسیر میں فرماتے ہیں کہ ملائکہ کو عدمِ عصیان وعدمِ استکبار کے ساتھ موصوف کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے عصیان کا تصور نہ ہوتا تو ان کو عدمِ عصیان سے موصوف کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ طاعت ان کی فطرت ہے اور عصیان ان سے تکلفاً ہوگا۔ جیسے بشر سے عصیان کا ہونا فطرت ہے اور اطاعت تکلف۔ ملائکہ سے عصیان کا امکان کیوں نہیں جبکہ ہاروت وماروت کا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ مثنوی شریف میں ہے:

امتحان میکردشان زیروزبر ۔ کے بود سرمست راز۔ نہا خبر

ترجمہ: ان کا زیروزبر میں امتحان لینا ہے سرمست کو اس کی کیا خبر!

۲۔ استثناء منقطع ہے کیونکہ وہ ملائکہ سے تو تھا نہیں بلکہ وہ جن تھا۔

کما قال عزوجل: كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ وہ جن تھا کہ اس کے حکم سے پھر گیا۔

ف: حافظ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جن اور ملک ایک جنس ہے فرق صرف اتنا ہے جو طاہر رہتا ہے وہ ملک

ہو جاتا ہے اور جو خبیث رہتا ہے وہ شیطان، اور جو بین بین ہو وہ جن۔

اَبٰی یعنی جس کا سے حکم دیا گیا اس سے رُک گیا اور اِبَــــاء اس انکار کو کہتے ہیں جو اختیار سے کیا جائے۔

وَاسْتَكْبَرَ اور اس نے اپنے آپ کو عظیم الشان سمجھ کر اپنی بڑائی ظاہر کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت و تعظیم و تحیہ کو باطل سے مزین کر کے تکبر کی طلب کی۔

سوال : اِباء کی تقدیم درست نہیں کیونکہ استکبار اباء کا سبب ہے اور ہمیشہ سبب مقدم ہوتا ہے نہ کہ مسبب۔

جواب : اِباء استکبار سے ظاہر ہے اور اس کا اثر واضح ہے بخلاف استکبار کے۔

مثنوی شریف میں ہے: ۔

ایں تکبر چیست غفلت از لباب	منجمد چوں غفلت یخ زآفتاب
چو خبر شد ز آفتابش یخ بماند	نرم گشت و گرم گشت تیز راند

ترجمہ : ا۔ تکبر کیا ہے؟ عقل سے بے خبری۔ منجمد ہے غفلت کی طرح کہ پھر وہ یخ سورج کی گرمی سے پگھلتی ہے۔

۲۔ جب خبر ہوئی کہ سورج کی گرمی ہے تو یخ حالت ہوتی ہے کہ وہ نرم و گرم ہو کر تیز دوڑتی ہے۔

سجدہ میں ملائکہ کا قصہ :۔ جب ملائکہ سجدہ میں گرے تو ابلیس نے آدم علیہ السلام سے منہ پھیر کر پیٹھ کر لی یہاں تک کہ وہ سجدہ سے فارغ ہوئے اور سجدہ میں ایک سو سال تک پڑے رہے۔ بعض روایات میں پانچ سو سال آیا ہے۔ جب انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ابلیس کھڑا ہوا ہے بلکہ اُلٹا آدم علیہ السلام سے منہ پھیرے ہوئے ہے اور اس فعل سے نادم بھی نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا عزم بالجزم میں ہے۔ تو اس کے امتناع اور اپنی فرمانبرداری کی توفیق کی وجہ سے دوبارہ سجدہ میں گرے۔ ان کے لئے دو سجدے ہو گئے۔ ایک آدم علیہ السلام کے لئے، دوسرا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ جب یہ سجدہ کر رہے تھے ابلیس دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت، حالت، صورت، ہیئت، نعمت سب کو متغیر فرمایا۔ **کما قال تعالیٰ:** اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ **ف** : بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا جسم خنزیر کی شکل اور منہ بندر کی طرح مسخ ہو گیا۔

شیطان کی اولاد بھی ہے۔

سوال : جو مسخ ہو جائے اس کی تو اولاد نہیں ہوا کرتی۔

جواب: چونکہ اس نے انظرنی کہہ کر مہلت طلب کر لی۔ بناء بریں اس کے لئے نسل کا سلسلہ بھی باقی رکھا۔

حکایت: اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعد میں شیطان کو حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کر، میں تیری توبہ قبول کر کے تیرے گناہ معاف کر دوں گا۔ شیطان نے عرض کی: جب میں اس کے جسم کو ساجد نہ ہوا تو پھر اس کی قبر اور میت کو کیسے سجدہ کروں!

حدیث شریف: میں ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان کو قیامت میں ہزار سال دوزخ میں رکھنے کے بعد نکال کر آدم علیہ السلام کے سامنے کھڑا کر کے سجدہ کا حکم دے گا تب بھی وہ سجدہ سے انکار کرے گا۔ پھر اسے دوزخ میں ہمیشہ کے لئے داخل کیا جائے گا۔

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ وہ ابلیس اللہ تعالیٰ کے علم میں کافرین میں سے تھا، یا اس وقت کافر ہوا جبکہ یہ اعتقاد رکھ کر کہ میں افضل ہوں اور افضل مفضول کے سامنے نہیں جھکتا اس لیے اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا جبکہ اللہ تعالیٰ کا اسے حکم تھا۔ اس نے امرِ الٰہی کی اہانت کی جیسا کہ اس کا جواب بتاتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے سے فرمایا: **مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ** صرف ترک واجب سے کافر نہیں ہوا۔

عقیدہ: اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ "سعید شقی ہو سکتا ہے" کافر جب اسلام لائے گا وقتِ اسلام تک اسے کافر سمجھا جائے گا، اسلام لانے پر اسے مسلمان کہیں گے۔ اب اس کی سرگزشت کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے اور (معاذ اللہ) جو مسلم کافر ہو جائے اسے بھی وقتِ کفر تک مسلمان کہیں گے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کے گزشتہ اعمال خبط ہو جائیں گے۔

سوال: **كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ** کیوں فرمایا حالانکہ اس وقت سوائے اس مردود کے اور کوئی کافر تھا نہیں۔

جواب: اللہ کے علم میں تھا کہ آنے والی مخلوق میں بہت سے بندے کافر ہوں گے۔ یعنی یہ ابلیس ان لوگوں میں

۲۔آیت میں سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری لازمی ہے اس کے راز میں غور وخوض نہ کیا جائے۔

۳۔امر وجوب کے لئے ہے۔

۴۔جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ کفر پر مرے گا وہ ضرور کافر ہوگا۔کیونکہ دار و مدار خاتمہ پر ہے اگر چہ اس کا ظاہر حال اہلِ ایمان جیسا ہو۔اسے مسئلة الموافاة کہتے ہیں۔یعنی تمام عمر کا اعتبار وفات کے وقت کا ہے۔

اب جبکہ اعتبار خاتمہ کا ہے انسان کو چاہیے کہ طاعاتِ الٰہی بجالانے کی سعی کرے۔کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کے لئے جنت یا دوزخ پیدا کیا گیا اس کے اعمال بھی اس سے سرزد ہوتے ہیں خصوصاً عمر کے آخری سال اور خاتمہ کے وقت، اب نیک عمل کرے تاکہ اس کا خاتمہ نیک اعمال پر ہو۔

حکایت: حضرت رابعہ عدویہ سے سفیان ثوری علیہما الرحمہ نے فرمایا: دنیا میں تو نے چند روز رہنا ہے۔ جب زندگی ایک یوم گزر جائے تو سمجھ لو کہ عمر کا بعض حصہ گزر گیا۔جب عمر کا بعض حصہ گزرا تو اسی طرح تمام عمر گزر جائے گی۔اس کا سب کو علم ہے۔جب یہ کیفیت ہے تو ہمیں نیک عمل کرنے چاہئیں۔اس کا تو ہرگز افسوس نہ کرنا چاہیے کہ میرے پاس مال وجاہ درہم ودینار نہیں، بلکہ اس کا افسوس کرنا چاہیے کہ جو دن گزر گیا اس میں مَیں نے کون سا عمل کیا ہے۔کیونکہ دن گزرنے سے عمر بسر ہوتی ہے۔

حکایت: ایک عابد پر حالتِ نزع تھی اور کہہ رہے تھے کہ مجھے موت سے تو کوئی خطرہ نہیں البتہ اس کا مجھے سخت افسوس ہے کہ جو رات نیند میں گزری اور جو دن روزہ کے بغیر بسر ہوا اور جو گھڑی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر غفلت میں گزار دی۔

سبق: حضرت علاء بن زیاد نے فرمایا: دنیا کا کوئی دن نہیں جو آتے ہی نہ کہتا ہو: ''اے لوگو! میں نیا دن ہوں مجھ میں جو عمل بھی کرو گے قیامت میں اس کی گواہی دوں گا اور جب میرا سورج غروب ہوگا میں تمہارے پاس قیامت تک نہیں لوٹ کر آسکوں گا''

حدیث شریف: میں ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کی: ''یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ فرمایا: ''جس کی عمر لمبی ہو اور اس کے عمل اچھے ہوں'' پھر عرض کیا گیا: ''لوگوں میں بد بخت کون ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''جس کی عمر لمبی لیکن عمل اچھے نہ ہوں۔'' پھر عرض کیا گیا: ''لوگوں میں بد بخت کون ہے؟'' آپ نے فرمایا ''جس کی عمر لمبی ہو لیکن اس کے عمل بُرے ہوں، اس کے شر سے لوگوں کو خطرہ ہو اور اس سے خیر کی کسی کو امید نہ ہو''

حکایت: حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنی مجلس والوں سے فرماتے کہ اے بوڑھے لوگو! بتاؤ جب کھیتی کے پکنے کا وقت آجائے تو اس سے کس بات کی امید کی جا سکتی ہے؟ انہوں نے کہا: کاٹنے کی۔ پھر نوجوانوں سے فرمایا کہ اے نوجوانو! خوب سمجھ لو کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھیتی کو پکنے سے پہلے آفت اور بلا دبوچ لیتی ہے۔ جس سے وہ کھیتی برباد ہو جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب فرمایا:

اَلا مَهِّدْ لِنَفْسِکَ قَبْلَ مَوْتٍ — فَاِنَّ الشَّيْبَ تَمْهِيْدُ الْحِمَام

وَقَدْ جَدَّ الرَّحِيْلَ فَكُنْ مَجِداً — لِحَطِّ الرَّحْلِ فِيْ دَارِ الْمَقَام

ترجمہ: ۱۔ خبردار! موت سے پہلے تیار ہو جا اس لیے کہ بڑھاپا موت کا ہی پیغام ہے۔

۲۔ اور کوچ کا وقت ہر روز ہوتا ہے تمہیں بھی دار مقام میں اپنا سامان جا کر رکھنا ہے۔

سبق: حضرت حسن سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اے ابنِ آدم! سارے سال کا غم مت کھا، اور نہ ہی اس کے لئے سامان جمع کرنے کی تکلیف اٹھا۔ جس دن کو تو طے کر رہا ہے اس کی کفایت تیرے مالک سے ہوگی اگر سال تمام تیری زندگی کا باقی ہے تو اس کا رزق بھی اللہ تعالیٰ تجھے عنایت فرمائے گا۔ اگر تیری عمر ختم ہے تو پھر اس کے لئے کیوں دکھ اٹھا رہا ہے۔ جو تیرے لیے نہیں تو اسے ہرگز نہیں کھا سکے گا، بلکہ بسا اوقات وہ تیرے دشمن کا لقمہ بنے گا۔

حکایت: حضرت ابی درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہر آئے دن میں سورج کے کنارے دو فرشتے ہوتے ہیں اور وہ پکار کر کہتے ہیں (جسے جن وانس کے سوا زمین کے رہنے والے سب سنتے ہیں) اے لوگو! اپنے رب کی طرف دوڑو۔ جو رزق تھوڑے پر کفایت کرے، اس سے بہتر ہے کہ زیادہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے۔ پھر جب سورج غروب ہوتا ہے تو بھی اس کے کنارے پر دو فرشتے پکار کر کہتے ہیں (جسے جن وانس کے سوا تمام

زمین والے سنتے ہیں)''اے اللہ! جو تیری راہ میں خرچ کرتا ہے تو اسے اس کا نعم البدل عطا فرما اور جو تیری راہ سے روکتا ہے تو اس کا مال جلد ضائع فرمایا''

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

نان دہی از بہر حق نانت دہند　　　　جاں دہی از بہر حق جانت دہند

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے نام پر روٹی دو گے تو تجھے روٹی دیں گے حق کے لئے جان دو گے تو تمہیں جان دیں گے۔

وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کفر کے بعد بہشت سے نکال دیا اور اس سے بالکل دور کر دیا بعد ازاں آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ اے آدم! بہشت میں اقامت پذیر ہو جاؤ اور اسے اپنا مسکن بنا لو۔

اُسْكُنْ سے سکون کا محل مراد ہے نہ کہ حرکت کی ضد بلکہ معنیٰ یہ ہے کہ بہشت کو لبث و استقرار گاہ بنا لو۔

وَزَوْجُكَ یعنی بی بی حوا علیٰ نبینا و علیہا السلام۔ عورت کے لئے زوج اور زوجہ دونوں جائز ہیں لیکن زوج زیادہ فصیح ہے۔ **کما قال فی تفسیر ابی اللیث۔**

سوال: اولاً دونوں کو کیوں مخاطب کیا؟

جواب: تاکہ پتہ چل جائے کہ اس خطاب سے مقصود آدم علیہ السلام ہیں اور معطوف علیہ اس کا تابع ہے۔

الْجَنَّةَ مفسرین کا اجماع ہے کہ جنت سے مراد دار الثوب ہے۔ معتزلہ اور قدریہ اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنت سے مراد ایک باغ ہے جو فلسطین میں یا فارس اور کرمان کے مابین واقع ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے امتحان کے لئے پیدا فرمایا اور **ھُبُوط**'' جو کہ **اھْبِطُوْا مِنْهَا** کی تاویل کرتے ہیں کہ انہیں اس باغ سے زمین ہند کی طرف چلے جانے کا حکم فرمایا؛ جیسے **اِهْبِطُوْا مِصْرًا** میں **ھبوط** بمعنیٰ **انتقال** ہے۔ معتزلہ کی تاویل بیکار ہے۔ کیونکہ ہبوط بمعنیٰ انتقال اس وقت ہوتا ہے جبکہ حقیقی معنیٰ ممتنع ہو۔ یہاں پر حقیقی معنیٰ میں کسی قسم کا امتناع نہیں۔

ف: بی بی حوا کی پیدائش میں اختلاف ہے کہ وہ بہشت کے داخلہ سے قبل ہوئی یا بعد؟ پہلے قول کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی ایک جماعت کو

بھیجا کہ آدم و حوا علیہما السلام کو سونے کے تخت (جس کا جڑاؤ یاقوت، لؤلؤ اور زمرد سے تھا) پر بٹھا کر لے آئیں۔ اس وقت آدم علیہ السلام کے سر پر پٹکا تھا جس میں موتیوں اور یاقوت کا جڑاؤ تھا۔ ان دونوں کو بہشت میں لایا گیا۔

دوسرے قول کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بہشت کو پیدا فرمایا اور آدم علیہ السلام اس میں رہنے سہنے لگے تو اس وقت اکیلے تھے۔ ان پر نیند طاری کی گئی۔ ان کی بائیں پسلی سے ایک ٹکڑا لیا گیا، اس کے بجائے گوشت بھرا گیا اس سے بی بی حوا علیہا السلام پیدا کی گئیں۔

سوال: اگر کوئی اعتراض کرے کہ یوں کہنا کہ آدم علیہ السلام کے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر بی بی حوا علیہا السلام پیدا کی گئیں یہ ایک نقص ہے اور انبیاء علیہم السلام ہر نقص سے پاک ہوتے ہیں۔

جواب: بظاہر آدم علیہ السلام کے لئے یہ نقص ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی ایک تکمیل ہے کہ بی بی حوا علیہا السلام سے انہیں سکون ملا، وحشت دور ہوئی، جب آدم علیہ السلام بیدار ہوئے تو بی بی حوا علیہا السلام کو اپنے سرہانے بیٹھا پایا۔ ان سے پوچھا: تو کون ہے؟ بی بی نے کہا: میں عورت ہوں، انہوں نے فرمایا: تو کس لیے پیدا ہوئی؟ بی بی نے کہا: تیرے لیے، تاکہ تو مجھ سے قرار حاصل کرے اور میں تجھ سے سکون پاؤں۔

فرشتوں نے پوچھا: اے آدم! اس کا نام کیا ہو؟ آپ نے فرمایا: حوا (علیہا السلام) فرشتوں نے حوا کہ وجہ تسمیہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ زندہ انسان سے پیدا کی گئی ہے۔ یا اس لیے کہ یہ ہر حی کی اصل ہے۔ یا اس لیے کہ ان کی ذقن میں ایک مائل بسیاہی سرخ رنگ کا نشان تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نشان لب پر تھا۔

ف: عورت کو امرأۃ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ امرأ سے پیدا کی گئی ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام کو اس لیے آدم کہا گیا کہ انہیں ادیم الارض سے پیدا کیا گیا ہے۔ بی بی حوا علیہا السلام آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد سات سال سات ماہ زندہ رہیں۔ اُن کی عمر نو سو ستانوے سال تھی۔

اعجوبہ: اللہ تعالیٰ نے ایک کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا۔ جیسے آدم علیہ السلام اور دوسرے کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا: جیسے عیسیٰ علیہ السلام اور باقی وہ جنہیں ماں اور باپ دونوں کے ذریعے سے پیدا فرمایا۔ جیسے تمام

اولادِ آدم۔ فسبحان من اظهر من عجائب صنعه ما يتحير افيه العقول

حکمتیں:۔ اللہ تعالیٰ نے بی بی کو حوا پیدا فرمایا، اس میں چند حکمتیں ہیں:

۱۔ تا کہ آدم علیہ السلام ان سے قرار پائیں اور ان سے وحشت دور ہو۔ کیونکہ بی بی انہی کی جنس سے تھیں۔

۲۔ تا کہ اولادِ آدم تا قیامت باقی رہے۔ کیونکہ ان کی بقاء انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اور تشریع احکام شرعیہ کا سبب ہے اور یہی اولاد امر معرفتِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا۔

نکاح کرنے کے دنیوی و اخروی بڑے فائدے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی ایک نبی کا ذکر نہیں فرمایا جس نے نکاح نہ کیا ہو۔ یحیٰ علیہ السلام کے لئے بھی منقول ہے کہ انہوں نے نکاح تو کیا تا کہ یہی فضیلت حاصل ہو لیکن جماع نہ کیا۔ کیونکہ ان کی شریعت میں جماع نہ کرنا عزیمت تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح میں حَصُوْرًا ارشاد فرمایا۔

۲۔ اشباہ میں ہے کہ کوئی ایسی عبادت نہیں جو آدم علیہ السلام سے لیکر ہم تک پہنچی ہو اور وہ قیامت تک ہمیشہ رہی ہو صرف نکاح اور ایمان ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔

مسئلہ : شادی شدہ کی غیر شادی شدہ پر ایسے فضیلت ہے جیسے مجاہد کی غیر مجاہد پر۔

مسئلہ : شادی شدہ کی ایک رکعت غیر شادی شدہ کی ستر رکعت سے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شادی (نکاح) بقائے نسل کا سبب اور زنا سے بچنے کا موجب ہے۔

ف: لیکن نکاح کرنے کی ترغیب گیارہ سال تک ہے۔ اس کے بعد نکاح نہ کرنا بہتر ہے۔ کما قال علیہ السلام جب میری امت پر ایک ہزار سال ایک سو اسی سال گزرے تو ان کے لئے نکاح نہ کرنا اور تنہا رہنا اور چوٹی پہاڑوں پر رہنا بہتر ہوگا کیونکہ (ایک ہزار کے بعد) دو سو سال کی مخلوق اہلِ حرب و قتل ہوگی۔ اس وقت بکری کا بچہ آدمی کے بچے کے پالنے سے بہتر ہے اور اگر اس وقت عورت بجائے انسان کے سانپ جنے تو کئی حصے افضل ہے۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

زناں باردار اے مرد ہشیار — اگر وقتِ ولادت مار زانید
ازاں بہ نزدیک خردمن — کہ فرزند نا ہموار زانید

ترجمہ : اے مردِ ہشیار! اگر حاملہ عورت سانپ جنے تو بہتر ہے اس لڑکے سے جو نالائق ہو۔

وَكُلَا مِنْهَا یعنی بہشت سے کھاؤ۔ دونوں کو خطاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مامور بہ کو عمل میں لانے میں دونوں برابر ہیں۔ بی بی حوا علیہا السلام کے کھانے میں برابر کی شریک تھیں بخلاف سکونت کے کہ اس میں آدم علیہ السلام کے وہ تابع تھیں پھر کھانے اور اس میں مشغول ہونے کا حکم دینے کی حکمت یہ تھی (اگرچہ ان کو خلافت کے لئے چنا اور مخصوص کیا) تا کہ پتہ چل جائے کہ آدم علیہ السلام بھی ایک مخلوق ہیں اور مخلوق کے لیے سکونت اور اشیائے خوردنی لازم ہوتے ہیں۔ رَغَدًا یعنی وسیع طور بغیر رکاوٹ اور اندازہ کے۔ بہشت میں جہاں سے چاہو ان کو بہشت کی ہر جگہ سے کھانے کی وسعت اس لیے دی جا رہی ہے تا کہ منہی عنہ شجرہ کے کھانے کے بعد کوئی عذر نہ پیش کر سکیں اور نہ ہی کوئی علت ثابت ہو سکے۔ وَلَا تَقْرَبَا اور اس درخت کے کھانے کے قریب بھی نہ جاؤ اگر صرف درخت کے قرب سے رکاوٹ ہوتی تو راء کو مضموم پڑھا جاتا۔ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ شَجَرَةَ منصوب ہے یا تو هٰذِهِ اسم اشارہ سے بدل ہے یا هٰذِهِ بتاویل اسم مشتق کی صفت ہے یعنی عبارت یوں سمجھی جائے:

هٰذه الحاضرة من الشجرة　　　یہ موجود سامنے والا درخت

یعنی اس درخت سے مت کھانا۔ اس کے قریب نہ جانے سے کھانے کی نہی میں مبالغہ کیا گیا۔

شَجَرَةً سے مراد گندم کا دانہ ہے اور یہی زیادہ مشہور ہے اور صوفیہ کرام کے نزدیک بھی یہی معنیٰ زیادہ موزوں اور جامع ہے کیونکہ نوع انسانی کو گندم کا دانہ سے زیادہ مناسبت ہے اور اس میں ہر قسم کا رنگ موجود ہے اور اس کا ثمر شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ نرم اور برف سے زیادہ سفید ہے اس کا ہر دانہ کلیہ بقرہ (گائے کا گردہ) کی طرح ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسے اولادِ آدم کا رزق بنایا۔ اسی لیے مشہور ہے کہ آدم علیہ السلام نے گندم کا دانہ کھایا۔ اب ان کی اولاد اس کی کھیتی باڑی میں مبتلا ہے یا شجرہ سے مراد انگور ہے اسی لیے اب (اس کا نچوڑ جب شراب بن جائے) حرام ہے یا شجرہ سے مراد زیتون ہے اسی لیے اس کے پتوں کے لباس میں آدم علیہ السلام مبتلا ہوئے۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں لیکن اس کا تعین نہ چاہیے کیونکہ اس کے لئے نص قطعی میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔

فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ لَا تَقْرَبَا پر عطف کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یا اس نہی کا جواب ہے۔ بنابریں منصوب ہے۔

پہلی تقریر کے مطابق یوں ہوگا: لمالایکن منکما قربان الشجرة و کونکما من الظالمین اور بمطابق دوسری تقریر معنیٰ یوں ہوگا۔ ان تقربا هذه الشجرة تکون من الظالمین۔ بہر حال جو بھی ہو مطلب یہ ہے کہ اکل شجرہ کے سبب سے تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔

الظّٰلِمِیْنَ بمعنیٰ وہ لوگ جو نفسوں پر ظلم کریں معصیت کے ارتکاب سے جو عمل ان کی کرامت و نعمت میں خلل انداز ہوا سے عمل میں لا کر اپنے حظوظ میں کمی یا حدود اللہ سے تجاوز کریں۔

ف: امام قرطبی فرماتے ہیں: اربابِ معرفت کا مسلک یہ ہے کہ وَلَا تَقْرَبَا سے اشارہ ہو رہا ہے کہ آدم علیہ السلام سے اس امر کا وقوع ضرور ہوگا اور وہ بہشت سے ضرور نکالے جائیں گے اور اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے کیونکہ جو اس میں ہمیشہ قیام پذیر ہوگا اس پر امر و نہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر دلیل باری تعالیٰ کا یہ قول ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً خلافت کا وقوع زمین پر ہونا تھا۔ اس لیے بہشت سے باہر تشریف لانا پڑی۔

تفسیر صوفیانہ شیخ نجم الدین قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو آزمائشی خطاب سے مخاطب کیا اور عشوہ و ناز کی نہی سے نوازا۔ گویا یوں فرمایا کہ اے آدم! میں تجھے شجرہ کے سوا تمام بہشت عنایت کرتا ہوں یہ درخت چونکہ محبت و معرفت کا ہے اور محبت کے لیے محنت کی سواری لازمی ہے اور اس شجرہ سے رکاوٹ الٹا اس کے کھانے کی تحریص ہے کیونکہ انسان کو جس فعل سے روکا جائے الٹا اس کے ارتکاب پر حرص کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام کا نفس حوا علیہا السلام اور بہشت سے سکون و قرار پذیر ہوا لیکن شجرہ معرفت کا شوق دل میں جاں گزیں رہا کیونکہ یہ قلب کی غذا تھا اور اس میں من وجہ نفس کا حظ بھی تھا۔ بنا بریں اس کا شوق بڑھتا رہا اور اس کے خیال میں رہا۔ یہاں تک کہ اسے چند روز بعد حاصل کر لیا۔ اس سے خلافت، محبت، محنت، راز کھلا، مظاہرِ جلال و جمال، جیسے توّاب، غفور، عفوّ، قہار، ستّار ظہور پذیر ہوئے مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم میں تھا کہ آدم علیہ السلام اس شجرہ کو ضرور کھائیں گے۔ اس پر انہیں اس سے روک دیا گیا تا کہ ان کا کھانا عصیان کا ذریعہ بن جائے۔ جس سے توبہ، محبت، طہارت از تلوث ذنوب ظاہر ہوں گے۔ کما قال عزوجل: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ اور اکل شجرہ سے بسبب نسیان عصیان کے مرتکب ہوئے پھر توبہ عصیان کے ذریعہ وراثت میں دی گئی پھر توبہ سے محبت نصیب میں آئی۔ محبت سے

طہارت کا شرف ملا۔

حدیث شریف: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو گناہ نہیں دیتا۔یعنی اسے گناہ سے محفوظ کرلیتا ہے۔اگر اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو اسے توبہ وندامت کی توفیق مل جاتی ہے اور ہر وہ لغزش کہ جس کا انجام توبہ،تشریف،اجتباء ہوا سے زلۃ تنزیھہ کہتے ہیں۔آدم علیہ السلام کو نہی کے بعد ملامت کی گئی۔یہ نہی تنزیہی اور حسنات الابرار سیئات المقربین سے ہے۔

ف: شیخ نے فرمایا کہ ہمارے طریقہ جلوتیہ جو شیخ ہدائی کی طرف منسوب ہے یہ ہے کہ دعوت الی الجنۃ سے مراد بنی آدم کے وجود دعوت الی مقام الروح ہے گویا قلب انسان کو فرمایا:''اے انسان کے قلب!تو اور تیری زوج یعنی نفس انسانیہ روح میں طاعت وعبادات میں مصروف رہو اور کھاؤ بلا رکاوٹ اس سے یعنی معرفتِ الٰہیہ سے کیونکہ روح مقامِ معرفت ہے جو طاعات وعبادات سے حاصل ہوتی ہے۔

حَيْثُ شِئْتُمَا یعنی وہ عمل جو تمہیں محبوب ہو،خیرات وصالحات سے۔وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ یعنی مخالفت کے شجرہ کے قریب مت جاؤ۔

مسئلہ: یہ خطاب چونکہ قیامت تک آنے والے تمام بندوں کو ہے(صرف آدم وحوا علیہما السلام پر منحصر نہیں) بنا بریں مومن کے لئے ضروری ہے کہ طاعات وعبادات سے اللہ تعالیٰ کی طرف ترقی کرے اور مخالفت سے اجتناب کرے تاکہ مہالک وتکالیف میں نہ پڑے۔

حضرت مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

داروی مری بخور اندر عمل — تا شوی خورشیدِ کرم اندر حمل

جُہد کن تا نور تو رخشاں شود — تا سلوک وخدمت آساں شود

تا جلاء باشد مریں آئینہ را — کہ صفا آید ز طاعت سینہ را

ترجمہ: ا۔عمل میں خوشگوار دوائی کھا تاکہ تو حمل میں خورشیدِ کرم ہو۔

۲۔کوشش کیجئے تاکہ نور چمک اُٹھے اور سلوک وخدمت کی راہ آسان ہو۔

۳۔تاکہ اس شیشہ میں روشنی تیز ہو اس لیے کہ طاعات سے ہی سینہ میں صفائی نصیب ہوتی ہے۔

تفسیر عالمانہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا یعنی آدم اور حوا علیہما السلام کو لے گیا اور بہشت سے دور کیا، جیسے کہا جاتا ہے: زَلَّ عَنِّیْ کَذَا اِذَا ذَهَبَ. اِزْلَال بمعنی اِزْلَاق اور زَلَّة "، بالفتح بمعنیٰ الخطاء یعنی قصد کے بغیر راہِ صواب سے ہٹ جانا۔ مقصد یہ ہے کہ شیطان نے انہیں وسوسہ ودھوکا اور دغا سے خطا پر اکسایا۔

سوال: شیطان کافر ہے اور کافر کا بہشت میں داخلہ ممنوع ہے۔

جواب: بہشت میں اس کا داخلہ علی وجہ التکریم (جیسے ملائکہ داخل ہوتے ہیں) ممنوع ہے نہ کہ آدم وحوا علیہما السلام کے امتحان کی خاطر وسوسہ ڈالنے سے۔

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ جن نعمتوں اور کرامات میں آدم وحوا علیہما السلام تھے ان کو ان سے خارج کرا لیا اور ابلیس کا مقصد ان کو بہشت سے نکالنا نہیں بلکہ ان کو مرتبہ علیا سے گرانا مقصود تھا۔ پورا نہ ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى پس اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر کے راہِ ہدایت بخشی۔

شیخ صدر الدین قدس سرہٗ فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام نے ابلیس کو کہتے سنا: مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ تو آدم وحوا علیہما السلام نے اس کے اس قول کی تصدیق کی۔

صاحب الفکوک کو دو اشکال: ۔ صاحب الفکوک فرماتے ہیں کہ دو اشکال ایسے ہیں جن سے نہ میں متنبہ ہو سکا اور نہ ہی کسی اہلِ علم ظواہر و بواطن سے ان کا حل مل سکا۔

۱۔ جب آدم علیہ السلام کو ملائکہ سجدہ کر رہے تھے اور وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان کو ملائکہ پر ترجیح دی جا رہی ہے اور انہیں تمام اسماء کا علم بھی نصیب ہوا اور خلافت سے بھی نوازے گئے اور وصیت حق کا شرف بھی ملا پھر کیسے ان سے مخالفت وقوع میں آئی اور ابلیس کے قول: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا سے کیوں دھوکا کھا گئے۔

۲۔ انہیں کیوں نہ معلوم ہو سکا کہ جس بہشت کی شریعت نے تعریف فرمائی ہے اس میں جو داخل ہوتا ہے اس سے بھی وہ نہیں نکالا جاتا۔ نیز بہشت کا عالم کون وفساد کو قبول نہیں کرتا کیونکہ اس کی لذات خلود کی مقتضی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہشت وہ بہشت نہیں جس کی چوڑائی ہفت سمٰوات وارضین ہیں اور جس کی زمین کرسی ہے۔ جو آٹھواں آسمان ہے اور جس کی چھت عرشِ رحمٰن ہے۔ اس بہشت میں جو بھی داخل ہو وہ کون و

فساد سے محفوظ ہوجاتا ہے کما لایخفی اور نہ ہی اس کی نعمتیں مقرر وقت تک اور ممکن الانقطاع ہیں کیونکہ وہ ایسا مقام ہے کہ جس میں ایسی معرفت نصیب ہوتی ہے جو حقیقت کو مقتضی ہوتی ہے۔ یعنی ان کی نعمتیں غیر منقطع ہوں، خواہ موت سے یا کسی اور شئے سے۔ کما قال تعالیٰ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ یعنی ایسی نعمتیں جو غیر منقطع اور غیر متناہی ہیں۔

نکتہ: بی بی حوا اور آدم علیہما السلام کا حال بنی اسرائیل جیسا ہے کہ ان کے حق میں فرمایا:
قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ الایۃ اسی مناسبت ومشارکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں آدم علیہ السلام کے قصہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا۔
اگرچہ ان کے مابین بہت طویل مدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حال اور فعل کی مناسبت کی رعایت فرمائی اور زمانے کا کوئی اعتبار نہ فرمایا۔ قرآن مجید کے اسرار میں سے ایک یہ بھی ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے انسان کو ابتداءً بہشت میں کیوں نہ پیدا فرمایا اور پھر اس کی آزمائش بعد خروج از بہشت کیوں ہوئی؟

جواب: ا۔ نعمتوں کی تعظیم بندوں پر واجب ہے۔ اگر دنیا میں ابتداءً نہ پیدا کیے جاتے تو بہشت سے ناواقف رہتے۔

۲۔ تا کہ انہیں معلوم ہو کہ بہشت میں ان کا داخلہ جزاء سے ہو نہ کہ ابتداءً۔

۳۔ تا کہ ہم بعد داخلہ زوال سے بچ جائیں۔

۴۔ ہم دنیا میں اسی لیے پیدا کیے گئے تا کہ طیب وخبیث اور مطیع ومخالف کی تمیز ہو۔

صفات جلالیہ کا تقاضا یونہی تھا کیونکہ بہشت مظاہر جلال کا مقام نہیں۔ اگر ہم بہشت میں پیدا ہو کر بہشت میں رہ جاتے تو صفات جلالیہ کا ظہور نہ ہوتا۔ جیسا کہ ملائکہ میں ظاہر نہیں ہوا۔ اسی لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یونہی ہوا کہ انسان کی پیدائش دنیا میں ہو تا کہ اس میں رحمت وغفران کا ظہور ہو۔ اگر آدم علیہ السلام بہشت میں رہ جاتے تو نصف کمال کا یعنی تجلیات قہریہ ظاہر نہ ہوتیں۔ انسان دنیا میں آیا تا کہ اس سے اسمائے جلال وجمال کے مظاہر کا تحقق ہو۔ پھر اسے عالمِ جنان میں فضائل وکمالات سے کامل ومکمل کر کے لوٹایا جائے۔ اس سے مقصود صرف

یہی تھا کہ خبیث وطیّب کی تمیز ہو جائے۔

نکتہ : اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پشت میں مقدر کر چکا تھا کہ سردارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیائے کرام اور دیگر مومنین پیدا ہوں گے اور پھر ان کی مٹی کے ساتھ ہر مومن وکافر کا بھی خمیر ہوا۔ اب انہیں زمین پر بھیجا تا کہ ان سے وہ خارج ہو جائیں جنہیں بہشت میں داخل نہیں ہونا ہے۔

حکایت: شیخ کامل علی ردّہ کشف الکنوز وحل الرموز کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ سیدی ابن نور الدین کرسی پر جامع مسجد میں وعظ فرما رہے تھے کہ اہل ملحد نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھ کر ضمناً اعتراض کیا اور جواب کا منتظر تھا:

من ملک بودم وفردوس بریں جایم بود   آدم آورد دریں دیرِ خراب آبادم

ترجمہ : میں فرشتہ تھا اور فردوسِ بریں میرا قیام تھا آدم مجھے اس ویران دنیا میں لے آئے۔

شیخ صاحب فوراً اس کی مراد کو پہنچ گئے اور بلا تامل جواب میں فرمایا: ”تو نے آدم علیہ السلام کو بہشت سے نکلوایا اس لیے کہ تو نے فساد والحاد کو ظاہر کرنے کے لئے ان کی پشت مبارک میں ہیجان پیدا کیا۔ پھر وہ اگر بہشت سے نہ نکلتے تو تجھ جیسے فاجر وملحد بہشت میں رہ جاتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی غیرت کا تقاضا ہوا کہ تجھ جیسوں کو بہشت سے خارج کرنے کے لئے چند ایام آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیج دیا۔

سوال : شیخ بومدین قدس سرہٗ سے پوچھا گیا کہ آدم علیہ السلام بہشت سے کیوں نکالے گئے۔ جب وہ جانتے تھے کہ اکل شجرہ سے روکا گیا ہوں پھر اس کا ارتکاب کیوں کیا؟

جواب : اگر آدم علیہ السلام جانتے کہ مجھ سے سیدالانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے تو وہ درخت کا ثمر کیا اس کی جڑیں تک کھا جاتے تا کہ زمین میں جلد تر کمالِ محمدی اور جمالِ احمدی کا ظہور ہو۔

سوالِ خلیل اللہ علیہ السلام:۔

الٰہی! تو نے آدم علیہ السلام کو بہشت سے کیوں نکالا؟

جوابِ باری تعالیٰ:۔ اے خلیل! تو حبیب کا شدید جفا نہیں جانتا

نکتہ : سلسلہ جلوتیہ کے مرجع طریقت شیخ با فتادہ آفندی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانے میں راز یہ ہے کہ آدم علیہ السلام جس مرتبہ میں تھے اس سے توحیدی مرتبہ کا شانِ بلند پایا۔ عرض کی : الٰہی ! یہی مرتبہ عطا کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : یہ مرتبہ آہ وفغان سے ملے گا۔ عرض کی : آہ وفغان مجھے منظور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : بہشت گریہ کا مقام نہیں بلکہ یہ تو سرور ومستی کا مرکز ہے۔ عرض کی : تو پھر مجھے دنیا میں ہی بھیج دے۔ اُن سے اس مرتبہ اعلیٰ کی وجہ سے بطریق حسنات الابرار سیئات المقربین فعل سرزد ہوا جس سے دنیا میں تشریف لائے۔ (کذافی واقعات الھدائی)

تفسیر صوفیانہ شیخ نجم الدین قدس سرہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام جب محمول العنایۃ اور مسجود الملائکۃ قرار پائے اور ان کے سرِ مبارک پر کرامت کا تاج اور لباس سعادت سے ملبوس اور کمر بند قربت اور گردن میں نزدیکی کا طوق ڈالا گیا تو اس سے فوق کوئی مرتبہ اور آپ جیسا ہم مرتبہ کسی کو نہ پایا تو ہر لحظہ ندا آرہی تھی : ”جب قضا آتی ہے تو تمام راستے بند ہو جاتے ہیں“

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں :

چوں قضا آید رود دانش بخواب مہ سیہ گردد بگیرد آفتاب

ترجمہ : جب تقدیر آتی ہے عقل نیند میں چلی جاتی ہے چاند سیہ ہو جاتا ہے اور سورج گرفت میں آجاتا ہے۔

ابھی اسی دور میں تھے کہ ان سے لباس اتار کے ان سے اُنس چھینا جارہا ہے۔ ملائکہ نہایت سختی سے کہہ رہے ہیں کہ ”ابھی بہشت سے نکل جاؤ۔ دیر کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی بحث کا وقت ہے“ اپنی تدبیر سے تقدیر کے ہاتھ ان دونوں کو عزت وقرابت سے نکال رہے تھے اور شیطان مسکین اس امر میں یوسفی بھیڑیئے کی طرح تھا کہ اسے یوسف علیہ السلام کا قاتل قرار دے کر اس کے منہ کو جھوٹے خون سے خون آلود کیا گیا حالانکہ بھائیوں نے انہیں کنویں میں گرا دیا۔ اسی طرح شیطان کی عدمِ عنایت کی وجہ سے گرفت ہوئی اور اس کی سونڈ کو جھوٹی نصیحت سے خون آلود کیا گیا کہ شیطان نے ان دونوں کو سلامت سے نکال کر ملامت میں، خوشی سے نکال کر غم میں اور نعمت سے نکال کر عذاب میں اور محبت سے نکال کر محنت میں اور قربت سے نکال کر غربت میں اور الفت سے نکال کر کلفت میں اور وصال سے نکال کر فراق میں پہنچا دیا۔

اس سے قبل حضرت آدم علیہ السلام ہر شئے سے مانوس تھے اور ہر ایک سے دوستی تھی۔ اس لیے ان کا نام انسان ہے۔ لیکن جب شجرہ محبت کا مزا لیا تو ہر شئے سے غیر مانوس تھے بلکہ ہر ایک کو اپنا دشمن بنا لیا۔

مسئلہ : صحیح محبت میں بھی یہی شرط ہے کہ محبوب کے ماسوا کو دشمن بنا لے۔

جیسے محبوب حقیقی اپنی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرنا نہیں چاہتا اسی طرح محبت میں بھی کسی کی شرکت نہیں چاہتا۔ اسی لیے فرما دیا:

تفسیر عالمانہ اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ابتداء حضرت خلیل علیہ السلام کا یہی حال تھا کہ چاند، ستارہ اور سورج کو دیکھ کر فرماتے: هٰذَا رَبِّيْ یہ میرا رب ہے۔

لیکن جب شجرہ خلت کا مزہ چکھا تو فرمایا: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ میں گم ہونے والے کو دوست نہیں رکھتا اور فرمایا: اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا یہ خطاب حضرت آدم اور بی بی حوا علیہما السلام کو ہے اور جمع کی ضمیر اس لیے کہ وہ تمام جنس کے اصل ہیں۔ گویا وہ دونوں تمام جنس ہیں۔ یا پانچوں کو خطاب ہے، پانچواں مور ہو۔ یہ امر اگرچہ ایک کلمہ سے تمام کو شامل ہے لیکن ان سب کا اترنا یکبارگی نہیں تھا۔ بلکہ ابلیس تب اترا جب اسے لعنت کا طوق پہنایا گیا اور آدم وحوا علیہما السلام بعد کو اترے۔ ہاں یوں کہا جائے کہ ابلیس کو دوبارہ نکالا گیا جب وہ وسوسہ کے لئے داخل ہوا۔

ف : اِهْبِطُوْا سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام جنت الخلد میں تھے جیسا کہ انحدار کے حکم سے ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ انحدار اوپر سے نیچے اترنے کو کہتے ہیں۔ اس کے متعلق سابقہ آیات میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔

آدم علیہ السلام کی زمین پر رہائش میں کیا حکمت تھی:۔

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر اترنے اور پھر اس پر قیام فرمانے میں حکمت ازلیہ کا تقاضا یہ تھا یہ آپ کی اولاد زمین پر پھیلے اور پھر ان کو مکلف بنا کر ان سے آزمائش کر کے ان پر اُخروی سزا و جزا مرتب کی جائے کیونکہ دوزخ اور بہشت دار التکلیف نہیں۔ یہی اصل موجب ہے آدم علیہ السلام کا اکل شجرہ کا پھر بہشت سے نکالے گئے اور زمین پر اتارے گئے۔ کیونکہ ان کی پیدائش

زمین سے تھی اور وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفے بننے والے تھے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس سے کون پوچھنے والا خود بھی فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً بیشک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہی ان کی بڑی منقبت اور فضیلت و بزرگی ہے۔

مختصر یہ کہ آدم علیہ السلام کا بہشت سے زمین پر تشریف لانا الثان کی بزرگی وفضیلت پر دلالت کرتا ہے اور اولاد کے امتحان کے لئے بھی تھا تا کہ سعید و شقی کے مابین فرق ہو جائے۔ جیسا کہ خلافتِ الٰہیہ کا تقاضا ہے۔ اسی طرح کشف الکنوز میں ہے اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اِهْبِطُوْا بمعنی اِنْزِلُوْا اِسْتِخْفَافاً بِکُمْ زمین پر اترو یہ تمہاری خفت ہے لیکن بات وہی صحیح ہے۔

مولانا ابن الکمال رسالہ قضاء وقدر میں فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اَلَمْ اَنْهَکُمَا عَنْ تِلْکُمَا الشَّجَرَۃِ وَاَقُلْ لَّکُمَآ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ میں عتابِ دوستانہ ہے نہ کہ رنج وغصہ کا اور بہشت سے زمین پر اترنا۔ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا کے قبیل سے ہے۔ یہ بھی تکمیل ہے۔ کیونکہ بسا اوقات بُعد بھی قرب ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کے قول سے مراد ہے: سَاَطْلُبُ بُعْدَ الدَّارِ عَنْکُمْ لِتَقْرَبُوْا

(ہم تجھ سے دوری اس لیے اختیار کر رہے ہیں کہ تا کہ تم میرے قریب ہو جاؤ)

بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ یہ جملہ حال ہے لیکن ضمیر سے واؤ سے مستغنی ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے مخالف ہو جاؤ گے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش کرو گے۔ عَدُوٌّ واحد وجمع ہر دو طرح مستعمل ہے۔ اس لیے اعداء نہیں فرمایا جس طرح ابلیس ان دونوں کا دشمن ہے اسی طرح وہ اس کے دشمن ہیں اور سانپ بنی آدم کا دشمن ہے تو بنی آدم اس کے دشمن ہیں۔ وہ بنی آدم کو ڈستا ہے تو وہ بھی اسے زندہ نہیں چھوڑتے اور اگر ابلیس بنی آدم کو گمراہ کرنے سے باز نہیں آتا تو وہ بھی ہمیشہ لعنتی سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح بنی آدم کی آپس میں عداوت کا حال ہے۔ مثلاً دنیوی حسد اور دینی اختلاف۔ ابلیس و بنی آدم کا اختلاف چونکہ دینی ہے اس لیے جب تک دین قائم ہے ان کا اختلاف مٹنے والا نہیں اور سانپ کے ساتھ طبعی دشمنی ہے۔ اسی طرح جب تک طبیعت قائم ہے دشمنی قائم ہے۔ پھر ہماری اور ان کی مخالفت مؤکد ہو چکی ہے۔ لیکن فتح ونصرت اس گروہ کو ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے (یعنی انسان کے ساتھ)

مسئلہ: بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ جملہ خبریہ ہے امر نہیں کہ جس کے حصول میں کوشش کی جائے۔

نکتہ: جب باری تعالیٰ نے لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِی فرمایا تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَنَا لَكُمْ عَدُوٌّ" شکرِ خدا کہ میں تمارا دشمن ہوا۔ عَدُوٌّ اس دشمن کو کہتے ہیں جو اپنے مخالف کی ایذاء میں حد سے تجاوز کر کے دکھ پہنچائے۔ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ یعنی زمین پر قرارگاہ یا قبر میں۔

ف: انسان کی قرارگاہیں تین ہیں:

۱۔ ماں کا پیٹ۔ قال تعالیٰ: فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ یعنی باپ کی پشت میں امانت رکھا گیا۔ البتہ اس کی قرارگاہ ماں کا پیٹ ہے۔

۲۔ دنیا۔ قال تعالیٰ: وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ تمہارے لیے زمین میں قرارگاہ۔

۳۔ عُقبیٰ یا بہشت میں۔ قال تعالیٰ: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا دوزخ کس طرح قرارگاہ ہے۔ قال تعالیٰ: اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا الایۃ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ بیشک وہ دوزخ تمہاری ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ ہے۔ یعنی اسباب جس سے فائدہ اٹھائے اور اس نفع اٹھانا زندگی کے خاتمہ تک ہے۔ یعنی موت تک یا قیامت تک۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اِلٰی حِیْنٍ فرما کر آدم علیہ السلام کو خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ اس دنیا میں آپ چند روز رہ کر پھر بہشت میں تشریف لائیں گے۔

آدم، حوا علیہما السلام سانپ اور شیطان کے زمین پر اترنے کا واقعہ:۔

جب ان سب کو بہشت سے نکال کر دنیا میں اتارا گیا تو آدم علیہ السلام ہند میں سراندیپ کے پہاڑ پر اترے۔ ان کی وجہ سے وہاں کے درخت خوشبوناک ہو گئے کیونکہ آدم علیہ السلام بہشت کی خوشبو ساتھ لائے تھے اور اس وقت بادل آپ کے سر مبارک کو مس کرتا تھا تو اس سے آپ کے بال گر گئے۔ آپ کی اولاد کو اسی سے گنجاپن کی بیماری میں مبتلا کیا گیا اور بی بی حوا علیہا السلام جدہ میں آئیں ان کے مابین سات سو فرسخ کا فاصلہ تھا اور مور کو ہند کے کھیتوں میں اور سانپ کو بجستان کا اصفہان کے علاقے میں اور شیطان کو یاجوج وماجوج کی دیوار کے قریب اتارا گیا۔ اگر بجستان میں عربد نہ ہوتا تو سانپ کو فنا کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ بجستان میں سانپ بہت زیادہ ہیں۔

ف: آدم علیہ السلام کو ہند میں کھیتی باڑی اور دیگر کاروبار میں لگایا گیا اور بی بی حوا حیض اور حمل اور طلاق اور نقصانِ عقل میں مبتلا کی گئیں اور سانپ کے پاؤں کو اس کے پیٹ سے چمٹایا گیا اور اس کی خوراک مٹی مقرر کی گئی اور مور کے پاؤں کو قبیح تر بنایا گیا اور ابلیس کی صورت بھدی بنائی گئی اور اس کو نہایت ذلیل حالت میں رکھا گیا۔

ف: آدم اور حوا علیہما السلام بہشت میں یومِ آخرت کے ایام میں صرف ظہر اور عصر کے مابین کے وقت ٹھہرے اور اس کے ہر یوم کی مقدار دنیا کے ہزار برس کے برابر ہے۔

ف: بہشت میں سانپ آدم علیہ السلام کا خادم تھا لیکن اس نے خیانت کرتے ہوئے شیطان کو پیٹھ پر بٹھا کر بہشت میں پہنچا کر اپنی دشمنی کا ثبوت دیا اور جب دنیا میں اترے تو اب دشمنی اور بڑھ گئی۔ اسی لیے اتارتے وقت کہا گیا تھا کہ تو بنی آدم کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہوں گے۔ جہاں تجھے پائیں گے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

حدیث شریف: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اقتلوا الحیات واقتلوا ذات الطفتین والا بتر فانها یخطفان البصر ویسقطان الحمل

(سانپوں کو قتل کرو خصوصاً ابتر اور ذوطفتین کو کہ وہ آنکھ کو چھین لیتے اور حمل گرا دیتے ہیں)

اگرچہ وہ الحیات کے عموم میں داخل تھے اس لیے ان کا خاص ذکر کیا گیا تا کہ اس کے بہت بڑے ضرر پر تنبیہ ہو جائے۔

مسئلہ: جو سانپ گھروں کے سوا جہاں بھی مل جائے مار دیا جائے کیونکہ امر کے عموم اور ظاہری الفاظ سے ایسے معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ: اور سانپ گھروں میں ہوں انہیں مارنا نہیں چاہیے جب تک تین دن نہ گزریں اور اسے گھر سے نکل جانے کے لئے روزانہ کہہ بھی دیا جائے کہ (سانپ جی! نکل جاؤ)

حدیث شریف: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ شریف میں بعض ایسے جن بھی ہیں جو مسلمان ہو چکے ہیں انہیں دیکھو تو مارنے کی کوشش نہ کرو بلکہ ان کو تین دن کی مہلت دو۔

ف: ابن الملک شرح المشارق میں فرماتے ہیں کہ جن چونکہ لطیف جسم والے ہوتے ہیں اسی لیے وہ سانپوں کی شکل میں بھی آجایا کرتے ہیں اور جو جن سانپوں کی شکل میں آتے ہیں ان کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے اور جو جن سانپ بن کر آتا ہے وہ سفید، چھوٹا ہوتا ہے اور جب چلتا ہے تو پیچھے نہیں مڑتا۔

مسئلہ: اور صحیح یہی ہے کہ سانپ کو گھروں میں مارنے کی ممانعت صرف مدینہ شریف میں ہی مخصوص نہیں بلکہ تمام بلاد میں ہے۔ جس گھر میں ہوں یہی حکم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ

مسئلہ: جب کوئی گھر میں سانپ دیکھے تو اسے یہ سنوائے: اُنْشِدُكُمْ بِالْعَهْدِ الَّذِىْ اَخَذَهٗ عَلَيْكُمْ نُوْحٌ" علیه السلام اُنْشِدُكُمْ بِالْعَهْدِ الَّذِىْ اَخَذَهٗ عَلَيْكُمْ سُلَيْمٰنُ علیه السلام اَنْ لَّا تُؤْذُوْنَا اس دعا کے بعد بھی سانپ اگر گھر کو نہ چھوڑیں تو مار دینا جائز ہے۔ سانپ اور بچھو سے بچنے کے لئے پڑھیے: سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ۞ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ انشاء اللہ اس دعا کی برکت سے حفاظت ہوگی۔

مسئلہ: ہر جانور کی فطرت یہ ہے کہ وہ ایذا دے پس موذی کو قبل از ایذا قتل کر دینا جائز ہے۔ جیسے سانپ، بچھو اور چوہا اور چھپکلی وغیرہ۔ (اس پر تمام امت کا اتفاق ہے)

مسئلہ: حواشی الجنات علی الهدایه میں ہے کہ حیوان کا قتل کرنا دو طرح سے ہے:

۱۔ ضرر دفع کرنے کے لئے۔ ۲۔ نفع حاصل کرنے کے لئے۔

مسئلہ: مذکورہ علت کی بنا پر شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑے وغیرہما کو اگر قتل کیے بغیر ان سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو ان کو قتل کرنا جائز ہے۔

ف: سانپ کی جبلی فطرت خیانت ہے کہ اس نے آدم علیه السلام سے خیانت کرتے ہوئے اس کے دشمن ابلیس کو اپنے جبڑوں کے اندر چھپا کر بہشت میں لایا۔ اگر وہ آدم علیه السلام سے ڈر کر ابلیس کا ساتھ نہ دیتا تو وہ کبھی بہشت میں نہ آتا اور ابلیس نے سانپ کو کہا تھا کہ تو کوئی فکر نہ کر تیری ذمہ داری میرے اوپر رہے گی۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیه وسلم نے سانپ کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔

حدیث شریف: اُقْتُلُوْهَا وَاِنْ كُنْتُمْ فِى الصَّلٰوةِ یعنی سانپ اور بچھو کو جہاں پاؤ قتل کر دو اگرچہ نماز کی

حالت میں ہو۔

ف: چھپکلی دیگر جانوروں کے مابین ابراہیم علیہ السلام کی آگ پر پھونک مارتی تھی اس لیے ملعون ٹھہری۔

حدیث شریف: میں ہے جس نے چھپکلی کو قتل کیا گویا اس نے کافر کو قتل کیا۔

ف: چھپکلی زہردار جانوروں سے ہے۔ اسی لیے طعام اس کے منہ لگانے سے خراب ہوجاتا ہے۔ ورنہ نمکین تو ضرور ہو جاتا ہے۔ اگر طعام کو خراب کرنے کا اسے موقعہ نہیں ملتا تو چھتوں پر چڑھ کر طعام کے بالمقابل گندگی ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ بسا اوقات اس طریق سے کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔

ف: اشیاء کو کاٹنا چوہے کی فطرت ہے۔ چنانچہ جب نوح علیہ السلام کی کشتی میں سے دنیا کی خبر لانے کے لئے بھیجا تو وہ مردار پر ٹوٹ پڑا اور وہاں مست ہو گیا۔

مسئلہ: گدھ اور تمام درندے (پھاڑ کھانے والے) اور باؤلا کتا، تمام کا حکم سانپ کی طرح ہے۔

مسئلہ: اُقتلوا کا امر ارشادی ہے۔ یعنی ان کے ضرر کو دفع کرنے کے لئے انہیں قتل کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

سنگ بر دست و مار بر سنگ — خیرہ رائے بود قیاس و درنگ

ترجمہ: سانپ کو فوراً پتھر مار کر مار ڈالو اس میں دیر کرنا بیوقوفی ہے۔

اور فرماتے ہیں:

ترحم بر پلنگ تیز دنداں — ستمگاری بود بر گوسفنداں

ترجمہ: تیز دانتوں والے چیتے پر رحم کرنا بکریوں پر ظلم کرنا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ محبت کا سانپ آدم علیہ السلام کے دل میں بیج کی طرح مستقر ہوا تو اس کی ذات کی قرار گاہ قلب کو اور زمین کو اس کے جسم کی جائے قیام قرار دی گئی۔ اس لیے فرمایا: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ یعنی محبت کے بیج کو طاعات اور عبودیت کے پانی سے ملا کر ثمرہ معرفت کے حصول تک نفع اٹھاتے رہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا اور تحقیق بات یہ ہے کہ مخلوق کا ثمر صرف معرفتِ الٰہی ہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ یعنی جن و انس کو صرف معرفت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ معرفت کا ثمر اگرچہ

عبادت کی ٹہنیوں پر ظاہر ہوجاتا ہے لیکن اس کی جڑ دراصل محبت کے بیج سے ہی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ یا اللہ! تو نے مخلوق کو کس لیے پیدا کیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: میں ایک مخفی خزانہ ہوں، میں نے اپنی معرفت کے لئے مخلوق کو پیدا کیا مولانا روم قدس سرہ' مثنوی شریف میں فرماتے ہیں: ؎

آفتابِ معرفت را نقل نیست　　مشرق او غیر جان و عقل نیست

ترجمہ: معرفت کے آفتاب کی نقل نہیں اس کا مشرق سوائے جان و عقل کے نہیں۔

تفسیر عالمانہ

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فـا دلالت کر رہی ہے کہ توبہ مامور بہ کے تحقق سے پہلے اور ہبوط کے امر کے بعد قبول ہوئی۔ اسی لیے قرطبی علیہ الرحمہ نے فرمایا: ''آدم علیہ الرحمہ کی توبہ پہلے قبول ہوئی۔ پھر بعد کو زمین پر اُترے۔

اِهْبِطُوْا کو دوبارہ لانے میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہبوط کا امر حقارت یا کسی رنج وغصہ کی وجہ سے نہیں تھا۔ کیونکہ توبہ قبول ہونے کے بعد رنج وغصہ کا ہے کا'' خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ الرحمہ زمین پر بعد میں اترے ان کی توبہ پہلے قبول ہوئی۔ **تلقی الکلمات** کا معنی ہے ان کو حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور قبول ہو گئے اور جب انہیں جان لیا تو ان پر عمل کرنے کی توفیق مل گئی۔

سوال: وہ کلمات کون سے تھے؟

جواب: وہ کلمات وہی تھے جو اللہ تعالیٰ نے خوب بیان فرمائے یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ الآیۃ حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ؎

زاہد در داشت سلامت نبر د راہ　　باندازِ رو نیاز بدار السلام رفت

ترجمہ: زاہد کو غرور تھا اس لیے سلامت نہ جا سکا۔ ہاں راہ نیاز اختیار کرنے سے دار السلام نصیب ہوتا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب وہ کلام ہے جو بابا آدم علیہ السلام نے پڑھا۔ یعنی **سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّاۤ اَنْتَ**۔

وسیلہ نبوی علیٰ صاحبہا السلام:۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے کہا: بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَلِیْ (اے اللہ! مجھے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل بخش دے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَيْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّداً صلی اللہ علیہ وسلم (اے آدم! تو نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پہچانا) آدم علیہ السلام نے کہا: لَمَّا خَلَقْتَنِیْ وَنَفَخْتُ فِی الرُّوْحِ فَتَحْتُ عَیْنِیْ فَرَأَیْتُ عَلٰی سَاقِ الْعَرْشِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَعَلِمْتُ اَنَّهٗ اَكْرَمُ الْخَلْقِ عَلَیْكَ حَتّٰی رَأَیْتُ اِسْمَهٗ بِاِسْمِكَ (اے اللہ! جب تو نے مجھے پیدا کر کے میرے اندر روح پھونکی تو میں نے آنکھ کھول کر عرش پر لکھا دیکھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ تیرے ہاں تمام مخلوق سے برگزیدہ ہیں کہ ان کے اسم گرامی کے ساتھ تیرا نام لکھا ہوا ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَعَمْ (ہاں، ایسے ہی ہے)

ف: آدم علیہ السلام کی توبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسمِ گرامی کے طفیل قبول ہوئی۔

ف: بعض کے نزدیک کلمات سے وہ کلمات مراد ہیں کہ جب آدم علیہ السلام بہشت سے نکلے تو اللہ تعالیٰ سے کہا: یَا رَبِّ اَلَمْ تَخْلُقْنِیْ بِیَدِكَ مِنْ غَیْرِ وَاسِطَةٍ۔ (اے اللہ! کیا تو نے مجھے بلا واسطہ پیدا نہیں فرمایا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں ایسے ہی ہے۔

پھر کہا: یَارَبِّ اَلَمْ تُسْكِنِّیْ جَنَّتَكَ (اے اللہ! کیا تو نے مجھے اپنے بہشت میں نہیں ٹھہرایا)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں ایسے ہی ہے۔

پھر کہا: یَارَبِّ اَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتُكَ غَضَبَكَ

(اے اللہ! کیا تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت نہیں کر گئی)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں، ایسے ہی ہے۔

پھر کہا: یَارَبِّ اَرَأَیْتَ اَنْ اَصْلَحْتُ وَرَجَعْتُ وَتُبْتُ اَرَاجِعٌ اَنْتَ اِلَی الْجَنَّةِ

(اے اللہ! کیا ہو سکتا ہے اگر اپنی اصلاح کر کے تیری طرف رجوع کر لوں اور اپنے کیے کی معافی مانگ لوں پھر تو مجھے بہشت میں جانے دے گا)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ضرور، ایسے ہی ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ کلمات سے عہود انسانیہ اور مواثیق آدمیہ اور وہ مناجات جو بندہ رب سے کرتا ہے۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام نے معصیت سے توبہ کر کے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی خطاء وسہو کا عذر پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔

فَتَابَ عَلَيْهِ یعنی آدم علیہ السلام کی توبہ اپنی رحمت سے قبول فرمائی۔ توبۃ'': دراصل رجوع کو کہتے ہیں، جب وہ بندہ کی طرف منسوب ہو تو بمعنیٰ گناہوں سے طاعت کی طرف رجوع کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو بمعنیٰ عقوبت سے مغفرت کی طرف رجوع فرمانا۔

ف: فاء میں اس طرف اشارہ ہے کہ کلمات کے حصول میں ہی توبہ کی قبولت مضمر تھی۔

توبہ کی شرائط

۱۔ گناہ سے توبہ کے وقت سخت ندامت ظاہر کرے۔

۲۔ گناہ کو اب اور آئندہ بھی تادمِ زندگی چھوڑنے کا پختہ عزم کرے۔

۳۔ حقوقِ عباد واپس کرے۔

۴۔ اپنے خصم کو راضی کرے۔ زبان سے دکھ پہنچایا ہے یا ہاتھ سے، ہر طرح سے معافی مانگے۔

ف: بی بی حوا علیہا السلام کا ذکر آدم علیہ السلام کے ذکر میں تبعاً آ گیا۔ کیونکہ بی بی حوا بابا آدم علیہما السلام کی تابع تھیں۔ اسی لیے قرآن وحدیث میں اکثر جگہ عورتوں کا ذکر نہیں آیا۔ وہاں بھی تبعاً مردوں کے حکم میں ہیں۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ بندوں کی مغرفت کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔ یا بندوں کی توبہ پر زیادہ مدد دینے والا الرَّحِيْمُ بہت رحم کرنے والا۔ ان دو وصفوں کو یکجا بیان کرنے میں تائب کو عفو وغفران کے بہت بڑے وعدے سے نواز اجا رہا ہے۔ یہ جملہ فَتَابَ عَلَيْهِ کے لئے تعلیل ہے۔ مولانا روم مثنوی شریف میں فرماتے ہیں۔

مرکب توبہ عجائب مرکیست　　بر فلک تا بد بیک لحظہ زپست

چوں برآرند از پشیمانی انیں　　عرش لرزد از انیں المذنبیں

ترجمہ: ۱۔ تیرا گھوڑا عجائبات سے مرکب ہے ایک ہی منٹ میں آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔

۲۔ جب وہ پریشانی سے روتے ہیں تو گنہگاروں کے رونے سے عرش لرز جاتا ہے۔

ف: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت حوا وحضرت آدم علیہما السلام بہشت کی نعمتوں کے چھن جانے سے دوسو سال روتے رہے۔ چالیس روز کچھ کھایا نہ پیا اور سو سال آدم علیہ السلام بی بی حوا علیہا السلام کے قریب نہ گئے۔

ف: شہر بن حوشت فرماتے ہیں کہ مجھے ایک روایت ملی ہے کہ جب آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو اللہ تعالیٰ کے حیا سے تین سو سال اوپر سر نہ اٹھایا۔ اگر تمام زمین کے آنسو جمع کیے جائیں تو داؤد علیہ السلام کے آنسوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ پھر داؤد علیہ السلام اور تمام روئے زمین کے آنسو ملائے جائیں تو آدم علیہ السلام کے آنسوؤں کے سامنے کچھ نہیں ہوں گے۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

چوں خدا خواہد کہ بایاری کند — میل مارا جانب زاری کند

اے خنک چشمے کہ آں گریان اوست — اے ہمایوں دل کہ آں بریان اوست

آخر ہر گز بہ آخر خندہ ایست — مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

باش چوں دولاب نالاں چشم تر — تا ز صحن جاں بر روید خضر

ترجمہ ۱۔ جب اللہ تعالیٰ کسی سے یاری کا ارادہ کرتا ہے تو ہماری طبیعت میں زاری کا میلان پیدا فرما دیتا ہے۔

۲۔ وہ آنکھ خوش قسمت ہے جو گریہ کرتی ہے، وہ دل مبارک ہے جو اس کے دل میں ہے۔

۳۔ انجام بکار خوشی حاصل ہوتی ہے، بخیر انجام پر نظر رکھنے والا شخص مبارک ہے۔

۴۔ دولاب کی طرح روتا رہ تا کہ دل کے صحن میں روحانی سبزی پیدا ہو۔

تنبیہ: ۱۔ جب یہ معمولی خطا والے کا کام ہے تو جو گناہوں میں غرق ہو اسے کیسے کرنا چاہیے۔

۲۔ توبہ صابن کی طرح ہے۔ جیسے صابن ظاہر میل کچیل دور کرتا ہے اسی طرح توبہ باطنی خرابیوں کو صاف کر دیتی ہے

۳۔ جب بندہ گناہوں سے رجوع کر کے اپنا حال درست بنائے تو اللہ تعالیٰ بھی اس بندے کا حال اچھا کر دیتا ہے اور چھینی ہوئی نعمت لوٹا دیتا ہے۔

حکایت: حضرت ابراہیم بن ادھم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک مرد نے بکرے کے

سامنے اس کا بچہ ذبح کیا تو فوراً ہی اس کا ہاتھ سوکھ گیا۔ ابھی اس حال میں بیٹھا ہی تھا کہ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر کر نیچے آ پڑا۔ بچے کی ماں بچے کے اردگرد گھومتی پھر رہی تھی اس نے مرد نے اٹھ کر بچے کے گھونسلے میں اسے رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ کو تندرست کر دیا۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ نیکی کرنے سے خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ ہے کہ وہ پہلی انگوری جو محبت کے دانے سے الہاماتِ ربانیہ کی بارش نے قلبِ آدم میں بوئی گئی وہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ تھی کیونکہ آدم علیہ السلام اپنے نورِ ایمان سے بہت زیادہ باخبر تھے کہ وہ ظالم لنفسہٖ ہیں۔ جب انہوں نے محبت کا دانہ کھایا اور محنت و مذمت کے جال میں پھنسے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی کوئی امداد نہ کی جس کی وجہ سے بشریت کی پستی میں جا گرے اور وہ سعادت ازلیہ کہ جس کی استعداد رکھتے تھے وہ بھی چھین لی گئی اس کے بعد اصلی مقام تک نہ پہنچ سکے۔ آخر اللہ تعالیٰ سے فریاد کی اور کہا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا الخ اور اس کے ہبوط میں بھی یہی حکمت تھی کہ وہ مضطرب ہو کر اپنے مالک کو یاد کریں۔ پھر وہ اسے مضطرب دیکھ کر جواب دے اور سابقہ عنایات کی طفیل لطف فرمائے اور اپنی رحمت کی بارش برسائے یعنی توبہ قبول فرمائے اس لیے کہ وہ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ہے۔ کلمات کی انگوری سے اجتباء کا درخت پیدا فرمایا اور اس درخت پر توبہ کے شگوفے اگائے اور ہدایت کے ثمرے سے اسے ثمر کیا۔ یعنی اپنی معرفت عنایت فرمائی جیسے کہ خود فرماتا ہے: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی

تفسیر عالمانہ قُلْنَا یہ نیا جملہ ہے ایک سوال کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ گویا کسی نے پوچھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے بعد کیا حکم ہوا تو فرمایا ہم نے: اهْبِطُوْا مِنْهَا اتر جاؤ بہشت سے۔ جَمِیْعًا سب کے سب۔ جمع کی ضمیر سے حال ہے۔ جماعت (یعنی آدم وحوا علیہما السلام اور سانپ ومور) کے معنیٰ کے لئے تاکید ہے۔ گویا کہا گیا کہ تم سب اتر جاؤ۔ اس سے بیک وقت ان سب کی یکبارگی اترنا ثابت نہیں ہوتا۔ اهْبِطُوْا کے تکرار نے بتایا ہے کہ جو اس کا مقتضیٰ ہے وہ ضرور وقوع پذیر ہوا۔

تنبیہ: ہے کہ آدم علیہ السلام عنقریب توبہ کے پیچھے پڑیں گے اور ان کو معافی بھی مل جائے گی یا اس لیے کہ اهْبِطُوْا کے حکم سے ان کو زمین پر چلے جانے کے لئے ہے کہ وہاں جا کر بسیں گے لیکن اس میں ہمیشہ نہیں

رہیں گے۔ دوسرے اهْبِطُوْا سے اشارہ ہے کہ ان کو دنیا میں مکلف بنا کر ٹھہرانا ہے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں سے مقصود علیحدہ علیحدہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو قریب قریب ذکر کیا جاتا۔ لیکن درمیان میں جملہ معترضہ تلقی الکلمات اور قبول توبہ کا ذکر فرمایا۔ پھر جب اهْبِطُوْا کا تکرار ہوا تو سابقہ مضمون کا ربطہ نہ ٹوٹا۔ یعنی عبادات کا مکلف بنانا اور نیکی سے نجات دینا اور گناہوں پر سزا۔ ارشاد میں ہے کہ دوسرا اهبطوا ایتاء ھُدًی کے وعدہ سے مقرون ہے جو کہ نجاتِ ابدی کی طرف پہنچانے والا ہے اور جو اس میں وعید عقاب ہے وہ ذاتی طور مقصود نہیں بلکہ وہ تو بندے کے برے اختیار کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: آیت سے ثابت ہوا کہ برے عمل سے نعمت چھین لی جاتی ہے کیونکہ بابا آدم علیہ السلام کی ایک خطا سے ان کو بہشت سے باہر بھیجا گیا۔ اس لیے شاعر نے فرمایا:

اِذَا تُمَّ اَمْراً فانقضه توقع زوالا قيل ثم

اذا كنت فى نعمة فارعها فان المعاصى تنزيل النعم

ترجمہ: جب کوئی کام مکمل ہو جاتا ہے تو اس کا نقص بھی قریب ہو جاتا ہے۔ جب کہا جائے کہ کام مکمل ہو گیا تو اس کے زوال کا انتظار کرو۔ جب تجھے کوئی نعمت نصیب ہو جائے تو اس کی حفاظت کر۔ کیونکہ معاصی نعمتوں کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ اگر تمہارے پاس آئے۔ فـا ترتیب کے لئے ہے جو اپنے مابعد کو اهْبِطُوْا کے امر سے مرتبط کر رہی ہے۔ هُدًى نبی علیہ السلام اور کتاب کے ذریعے رشد و ہدایت اور شریعت کا بیان تمہیں نصیب ہو گا اور یہ خطاب آدم علیہ السلام اور شیطان کو ہے۔ ضمناً ان کی اولاد مراد ہے۔ شرط کا جواب شرط ثانی مع جواب شرط اول کا جواب ہے اور نیز قوله تعالیٰ: فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ پس جس نے میری شریعت کی اقتداء کی۔

سوال: هُدًى کا تکرار نہ ہونا چاہیے تھا بلکہ اس کے لئے ضمیر لائی جاتی۔

جواب: دوسری ہدایت عام ہے۔ یعنی وہ احکام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ اقتصادیات و عملیات یا وہ احکام جن کے لئے عقل مقتضی ہو۔ یعنی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کی تابعداری کی وہ احکام جو دلائل آفاقیہ وانفسیہ کے علاوہ عقل کے تقاضا کے مطابق ہیں۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یعنی دونوں جہانوں میں ان کو مکروہ امر سے کوئی خوف نہیں وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ ان سے ان کو کوئی خطرہ ہے کہ جو مطلوب فوت ہو گیا۔

ف: خوف کا اطلاق متوقع امر پر ہوتا ہے اور حزن کا واقعہ پر۔ یعنی ان پر ایسے عوارض وارد نہیں ہوں گے جو خوف و حزن کے موجب ہوں یہ معنیٰ نہیں کہ خوف و حزن کے اسباب ان پر وارد تو ہوتے ہیں لیکن وہ خائف و محزون نہیں ہوتے اور یہ معنیٰ بھی نہیں کہ ان پر کبھی خوف و حزن وارد ہوتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ مسرور و مفروح رہتے ہیں۔ یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ ان پر اللہ تعالیٰ کے جلال کا خوف ہر وقت طاری ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ حقوقِ عبودیت میں سرگرم رہتے ہیں اور یہ کام خواص و مقربین کا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَمَنْ تَبِعَ پر عطف ہے۔ گویا معنیٰ یہ ہیں کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ الخ و من لم يتبع الخ

سوال: و من لم یتبع کو چھوڑ کر وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ کیوں فرمایا؟

جواب: تا کہ ضلالت کے حال کی تقطیع ہو جائے اور اس کے کمال قبح کا اظہار ہو جائے اسم موصول جمع لانے میں اس طرف اشارہ ہے کفار بکثرت ہیں۔ یعنی وہ کفار جنہوں نے ہمارے رسولوں کے ساتھ کفر کیا۔

وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ یعنی جو کتابیں ہم نے ان کی طرف بھیجیں ان کو جھٹلایا۔ اُولٰٓئِكَ اس کا اشارہ الَّذِيْنَ موصول کی طرف ہے باعتبار اس کے کہ وہ کفر و تکذیب سے موصوف ہے کہ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا اس کا صلہ واقع ہوئے ہیں۔

اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی دوزخ سے ایسی ملازمت و ملابست کرنے والے کہ کبھی بھی ان سے جدا نہیں ہوتے۔ چونکہ صحبت میں میل جول ہوتی ہے۔ ان پر وہی اطلاق کیا گیا کہ یہ لوگ اس میں ہمیشہ گزریں گے گویا کہ اس کے مالک ہو کر اس میں ہمیشہ کی زندگی بسر کریں گے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وہ کفار اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جملہ نصب کے سابقہ جملہ کا حال ہے۔

مسئلہ: ان دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ بہشت اوپر کی جانب ہے۔ جیسے اهْبِطُوْا مِنْهَا سے ثابت ہو رہا ہے۔

مسئلہ: جو ہدایت کے متبع ہیں ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مسئلہ: دوزخ کا عذاب دائمی ہے اور کفار اس میں ہمیشہ رہیں گے اور کافر کے بغیر اور کوئی اس میں ہمیشہ نہیں ٹھہرے گا جیسے هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ سے پتا چلا کیونکہ یہ جملہ حصر کا فائدہ دیتا ہے۔

مسئلہ : شرف و بزرگی اتباعِ ہدایت میں ہے۔ جیسا کہ شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

سگِ اصحابِ کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد

ترجمہ : اصحابِ کہف کے لئے نیکیوں کا دامن پکڑا، ان کی صحبت میں رہا تو مرد بن گیا۔

تنبیہ : مؤمن اگر اطاعت کرے گا تو بہشت میں داخل ہوگا۔ اگر نافرمانی کرے گا تو دوزخ میں جائے گا۔ تعجب ہے کہ جمادات اور دیگر غیر مکلف چیزیں تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے خائف رہتی ہیں اور ان کے حقوق کی پابندی کرتی ہیں لیکن مکلف بندے عموماً غفلت میں رہتے ہیں۔

حکایت: حضرت مالک بن دینار علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میرا ایک لڑکے کے پاس سے گزر ہوا جو مٹی سے کھیل رہا تھا کبھی ہنستا اور کبھی روتا تھا۔ میرا ارادہ ہوا کہ اسے السلام علیکم کہوں لیکن نفس نے تکبر دلا کر روکا کہ تو اتنا بڑا، تیرے لیے اس چھوٹے سے بچے کو سلام کرنا درست نہیں۔ میں نے کہا: اے نفس! تجھے معلوم نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر چھوٹے بڑے کو "السلام علیکم" فرماتے تھے۔ میں نے لڑکے کو کہا: السلام علیکم لڑکے نے کہا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ یامالک بن دینار میں نے اسے کہا کہ تو نے مجھے کیسے پہچان لیا، حالانکہ اس سے قبل تو نے مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اس نے کہا آپ کی اور میری روح کی روزِ میثاق ملاقات ہوئی تو میرا اور آپ کا ایک دوسرے سے اللہ تعالیٰ نے تعارف کرایا۔ میں نے کہا: بیٹے! بتایئے، عقل اور نفس میں کیا فرق ہے؟ اس نے کہا: تیرے نفس نے تو السلام علیکم سے روکا۔ لیکن تیری عقل نے تجھے اس عنایت سے سرفرازی بخشی میں نے کہا: پھر مٹی سے کیوں کھیل رہا ہے؟ جواب دیا: اس لیے کہ ہم اس سے پیدا ہوئے اور اسی میں دفن ہوں گے۔ میں نے کہا: کبھی روتے اور کبھی ہنستے ہو، اس کی کیا وجہ؟ اس نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کا عذاب یاد کرتا ہوں تو رونے لگ جاتا ہوں اور جب مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت یاد آجاتی ہے تو ہنسنے لگ جاتا ہوں۔

میں نے کہا: بچے! تو تو گناہوں سے پاک ہے پھر رونے کا کیا معنٰی؟

اس نے کہا: میں نے اپنی امی جان کو آگ جلاتے دیکھا کہ وہ آگ میں پہلے چھوٹی لکڑیاں ڈالتی تھی بعد میں بڑی مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ؎

طفل یک روزہ ہمیں داند طریق کہ بگیریم تا رسد دایہ شفیق

تو نمے دانی کہ دانہ رائیگاں | کم دہد بے گریہ شیر او رائیگاں
گفت فلیبکوا کثیرا گوش دار | تا بریزد شیر فضل کردگار

ترجمہ: ۱۔ چھوٹا بچہ یہ جانتا ہے کہ روؤں گا تو ماں دودھ دے گی۔ ۲۔ تو نہیں جانتا کہ دانہ ضائع ہو رہا ہے اور بچہ جانتا ہے کہ رونے سے دودھ ملے گا۔ ۳۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا زیادہ روؤ تا کہ فضلِ الٰہی کی بارش ہو۔

جب آدم علیہ السلام کو زمین پر اترنے کا حکم ملا تو ساتھ ہی خوشخبری سنائی کہ میرے اور آپ کے مابین رابطہ الہام اور وحی کے ذریعے قائم رہے گا اور تیری اولاد سے ہدایت منقطع نہیں ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیج کر ان کی رہبری کرتا رہوں گا۔ اس کے بعد جب میری ہدایت انہیں پہنچے تو انہوں نے اگر میری ہدایت قبول کر کے تابعداری کی جیسے آدم علیہ السلام نے توبہ سے اور نوح علیہ السلام نے بکاء و استغفار سے تابعداری کی اور جس نے محبت کے بیج بو کر اطاعت اور بندگی سے تربیت کی یہاں تک کہ توحید اور معرفت کا ثمر نکل آئے تو مستقبل میں ان پر کوئی خوف نہیں کہ محبت کے بیج میں صفاتِ حیوانیہ وسبعیہ افساد کا وبال آ جائے یا استعداد سعادت ابدیہ، تمتعاتِ دنیویہ کی وجہ سے باطل ہو جائے اور نہ ان کو کوئی غم اور نہ حزن نیچے اترنے میں ہے کیونکہ ان کے محبت کے بیج تربیت یافتہ ہیں کیونکہ لوگ تو جذبا عنایت اور ہدایت کے تابع ہو کر حظائر قدس کے اعلیٰ مرتبہ کو پہنچے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی اور بیشک اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔

پھر ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جنہوں نے ان کی ہدایت سے کفر کیا اور اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنایا وہ یہ ہیں۔ سے کفر کیا اور اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنایا وہ یہ ہیں وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یعنی جنہوں نے تعلقات شہوات نفسانیہ سے محبت کے بیج کو چھپایا اور جہالتِ انسانیہ کی وجہ سے آیات بینات کی تکذیب کر کے استعداد فطری کو ضائع کر دیا۔ وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ یعنی انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور کتابوں کی تکذیب اور انبیاء علیہم السلام وحی، الہام اور اس رُشد کی تکذیب کی حالانکہ ان سے محبت کے بیج کی تربیت ہوتی ہے اور توحید و معرفت اور بلند درجات کو پہنچا اور نعیم جنات اور عرفات کو حاصل کرنے سے شجرِ انسانیہ باثمر ہوتا۔ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا یعنی نارِ جہنم اور نارِ ہجر میں خٰلِدُوْنَ ہمیشہ رہیں گے کیونکہ وہ خود دنیا میں شہواتِ نفسانیہ کے پیچھے پڑے رہے۔ شریعت کے پانی سے ان کی محبت کا بیج انگوری نہ دے سکا جس کی وجہ سے درجات جحیم اور خسرانِ عظیم میں ہمیشہ ہمیشہ رہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا

اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا

بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝۴۰ وَاٰمِنُوْا بِمَآ

عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو۔ اور ایمان لاؤ اس پر

اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا

جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے ساتھ ہے اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے

بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ

بدلے تھوڑے دام نہ لو اور مجھی سے ڈرو۔ اور حق سے باطل نہ ملاؤ اور دیدہ

تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۲ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

دانستہ حق نہ چھپاؤ۔ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور

اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ

اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں۔ اور صبر اور

وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ

نماز سے مدد چاہو اور بیشک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر نہیں جو میری طرف جھکتے ہیں۔ جنہیں یقین ہے

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۴۶

کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا

تفسیر عالمانہ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ بنون کالفظ مرد وزن دونوں کے لئے مستعمل ہے جب وہ کہیں یکجا واقع ہوں۔ اِسۡرَآءِیۡلَ یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ اِسۡرَآءِیۡلَ کا معنی ہے عبداللہ۔ کیونکہ اِسۡرَآء لغت عبرانیہ میں (اور یہی یہودیوں کی لغت ہے) بمعنی عبد، اور ایل بمعنی اللہ۔ یعنی اے یعقوب علیہ السلام کی اولاد۔ یہ خطاب ان یہودیوں کو ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں موجود تھے جو مدینہ طیبہ کے ارد گرد بنو قریظہ اور بنو نضیر وغیرہ تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔

سوال: صرف ان کے ذکر کرنے کی کیا تخصیص ہے؟

جواب: وہ لوگ اس وقت نعمتوں سے مالا مال تھے اور نعمت کا کفران بھی ان میں زیادہ تھا۔

اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ "ذُکر" بضم الذال، دل کے یاد کرنے سے مختص ہے۔ یعنی وہ حفظ جو نسیان کی ضد ہے اور "ذِکر" بالکسر عام ہے خواہ دل سے ہو یا زبان سے۔ اس میں حکم ہو رہا ہے کہ نعمت کا شکریہ دل سے بھی کرو اور زبان سے بھی۔ اذۡکُرُوۡا بمعنی اِحۡفَظُوۡا وَاشۡکُرُوۡا بِاللِّسَانِ نِعۡمَتِیۡ (یعنی میری نعمت کو دل میں محفوظ رکھو اور زبان سے شکریہ ادا کرو) کیونکہ نعمت اسم جنس بمعنی جمع ہے ہر قسم کی نعمت پر اس کا اطلاق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡهَا

الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے نعمتوں کو ایسا بھلا دیا تھا کہ کبھی بھی ان کے دل پر اس کا خیال نہیں گزرتا تھا۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ ادائیگی شکر میں تساہل کرتے تھے۔ نِعۡمَۃَ کو عَلَیۡکُمۡ سے اس لیے مقید کیا کہ انسان فطرۃً غیرتمند اور حاسد ہے جب کسی دوسرے کو نعمت سے مالا مال دیکھتا ہے تو اسے غیرت اور حسدِ کفران نعمت اور رنج وغصہ پر ابھارتے ہیں۔

حدیث شریف: میں ہے اپنے سے زائد نعمت والے کو نہ دیکھو تا کہ تمہیں پریشانی نہ ہو اور نعمتِ الٰہی سے روحانی نسخے کی ناقدری نہ ہو کیونکہ جس نے اپنے اوپر نعمت کی وجہ سے دیکھا تو اسے نعمت کی محبت رضامندی اور شکر کی ادائیگی پر ابھارے گی۔

نکتہ: اربابِ معانی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نعمت کے ذکر کا حکم دیا اور امتِ محمدیہ علی

صاحبها السلام کو ذکر نعمت سے علیحدہ کر کے صرف اپنے ذکر کا حکم دیا۔ کما قال : فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں) اس میں نکتہ یہ ہے کہ امتیں نعمت کو یاد کر کے منعم تک پہنچیں اور امت محمدیہ علی صاحبها السلام خود ذات کو بلا واسطہ یاد کریں نعمت خود بخود حاضر ہوگی کیونکہ جب منعم ملا تو نعمت کہاں محجوب رہ سکے گی۔

أَوْفُوا بِعَهْدِيٓ یعنی میری نعمت کو پورا کرو اس عہد کا ایفاء کرو جو تم نے روزِ میثاق قبول کیا تھا اور عہد عام ہے۔ تمام اوامر ایمان وطاعت اور نواہی ووصایا مراد ہیں۔ اس میں وہ عہد بھی شامل ہیں جو یہود سے توراۃ میں حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے لیے لیا گیا۔

عہد بمعنی ہر گھڑی شے کی حفاظت ونگرانی کرنا۔ اس سے جمیع وعدے اور وصیتیں مراد ہیں۔ عھد'' مصدر ہے اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔

أُوفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہاری جزا کو مکمل کروں گا بہتر ثواب دے کر، اور اسے قبول کر کے تمہیں بہشت میں داخل کروں گا عہد، معاہد اور معاہد دونوں کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر مفعول کی طرف مضاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دلائل قائم کر کے اور رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے ان سے ایمان وعمل وصالح کا عہد لیا اور پھر ان سے ان کی نیکیوں پر ثواب دینے کا وعدہ کیا۔

مسئلہ : انسان سے اس وعدہ کا پہلا ایفاء کلمہ شہادت اور اس پر ایمان لانا ہے اور اللہ تعالیٰ سے تکمیل عہد یہ ہے کہ وہ ہمارے اموال اور جان کو محفوظ رکھے اور ہمارا آخری عہد یہ ہے کہ ہم توحید میں ایسے مستغرق ہو جائیں کہ غیروں کی خبر تو بجائے ماند اپنے آپ کو بھی بھول جائیں اور اللہ تعالیٰ سے ایفائے عہد یہ ہے کہ وہ ہمیں دائمی بقاء سے باریاب فرمائے۔ چنانچہ رسالہ قشیریہ میں ہے کہ:

أَوْفُوا بِعَهْدِيٓ فِي دَارِ الْجَنَّةِ ، أُوفِ بِعَهْدِكُمْ فِي دَارِ الْقُرْبَةِ الخ

یعنی تم دار جحت میں میرے عہد کی پاسبانی کرو میں دار القربۃ میں تمہارے ساتھ ایفاء عہد کروں گا۔ یعنی وصال کے فرش پر کھڑا کر کے دائمی انس اور رویت سے مالا مال کروں گا اور زمانِ دنیا سے رب رب کہہ کر تم میرے عہد کی پاسداری کرو اور میں تمہیں عبد کہہ کر ایفاءِ عہد کروں گا۔ وَإِيَّايَ محذوف فعل کی وجہ سے منصوب ہے دراصل یوں تھا: وَإِيَّايَ فَارْهَبُوا ، فَارْهَبُونِ اگر تم کسی سے ڈرتے ہو تو صرف مجھ سے ڈرو۔

الرّھبة بمعنیٰ خوف سے تحرز۔

مسئلہ : آیت میں وعدہ بھی ہے، کما قال : اُوْفِ اور وعید بھی، کماقال: وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ اور حکم بھی ہے کہ شکر کی ادائیگی اور ایفائے عہد واجب کیا گیا ہے۔

تنبیہ : مومن کے لئے ضروری ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور سے نہ ڈرے۔ کیونکہ اِیَّایَ کی تقدیم از فعل حصر کا معنیٰ ثابت ہورہا ہے۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ جسے میں نے نازل کیا اے بنی اسرائیل! تم اس پر ایمان لاؤ۔

سوال : جب اَوْفُوْا میں ہر شے مندرج تھی تو اب قرآن کو علیحدہ ذکر کرکے ایمان لانے کا حکم کیا دے رہے ہیں؟

جواب : ایفائے عہد میں یہ سب سے زیادہ اہم ہے یعنی ایمان لاؤ اس قرآن پر جسے میں نے سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ قرآن پاک کی یہ شان ہے کہ وہ تمہاری توراۃ کی بھی تصدیق کرتا ہے کیونکہ یہ اسی کے موافق نازل ہوا ہے کہ جس طرح تمہاری کتاب میں اس کا ذکر ہے۔ اَنْزَلْتُ عَلَيْكُمْ کو مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ نے اس لیے مقدم کیا گیا تاکہ حکم کی فرمانبرداری کے وجوب کی تاکید ہوجائے کیونکہ جس پر ان کا ایمان ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو شئے اس کی تصدیق کرے اس پر بھی ایمان لانا واجب ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ یعنی سب سے پہلے قرآن کے ساتھ تم کافر نہ بنو کیونکہ مقتدی کا گناہ پہلے اس پر ہوتا ہے جس نے اس عمل کی بنیاد رکھی۔ مولانا روم قدس سرہ' فرماتے ہیں ۔

ہرکہ بنہد سنت بد اے فتا	تادر افتد او خلق از عما
جمع گردد بروے آں جملہ بزہ	کاہ سرے بودست وایشاں دم غزہ

ترجمہ : اے عزیز! جو برے طریقے کی بنیاد رکھتا ہے اس خیال پر کہ لوگ بھولے سے بھٹکیں تو تمام گناہ پہلے اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے کیونکہ یہ ان کی اصل ہے اور دوسرے اس کی شاخیں۔

یعنی تم کفر کرنے میں سبقت نہ کرو۔ کیونکہ تمہارا عمل تو یوں ہونا چاہیے کہ تم اس کے سبب سے پہلے ایمان لانے والے ہو، کیونکہ تم اس کی حقیقت اور اس کی شان اپنی کتابوں سے پڑھ، بن کر خوب جانتے ہو۔ جیسے تم اپنی اولاد کو جانتے ہو۔ اس سے قبل اس کی بدولت تم فتح طلب کرتے رہے اور اس کی آمد کے منتظر تھے۔ پس اب اپنی متوقع امید کو ضائع نہ کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو سب سے پہلے ان کی تکذیب کرنے والے مدینہ کے یہودی تھے، پھر بنو قریظہ اور بنو نضیر۔ پھر خیبر والے۔ پھر ان کے تابع ہو کر تمام یہود نے تکذیب کی۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي اپنے نفسوں کے لئے میری آیات کے بدلے ثَمَنًا قَلِيلًا تھوڑا ثمن نہ لو۔ ثمن قلیل سے دنیوی لذتیں مراد ہیں کیونکہ اگرچہ یہ کتنی ہی بڑی ہوں لیکن وہ نعمتیں جو ایمان کی بدولت انہیں ملیں گی اور یہ چھوڑ بیٹھے۔ ان کی نسبت دنیوی نعمتیں نہایت قلیل اور بالکل لاشئے ہیں۔

ف: عام یہود اپنے احبار علماء کو کھیتوں کے پھلوں سے کچھ دیتے تھے اور انہیں ہدایا بھیجتے اور رشوتیں دیتے تاکہ وہ کتاب کے معانی کی تحریف کریں اور ایسے آسان مسائل تیار کریں جو بالکل نرم نرم ہوں۔ اسی طرح شاہانِ وقت بھی انہیں بہت کچھ دیتے تاکہ وہ حق چھپائیں اور کلمات کی تحریف کر ڈالیں۔ احبار کی معاش کا چونکہ صرف یہی ایک ذریعہ تھا انہیں خطرہ لاحق ہوا کہ ہم حق ظاہر کر دیں گے۔ یعنی سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر ان کی تابعداری قبول کریں تو ہماری شان و شوکت اور دنیا و دولت ہاتھ سے نکل جائے گی اگرچہ توراۃ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور صدق کا ذکر بھی تھا لیکن محروم رہے اور ہمیشہ کتاب توراۃ میں تبدیلیاں کرتے رہے۔

شانِ نزول: کعب بن اشرف نے ایک دن احبار یہود کو کہا کہ تم لوگ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کیا جانتے ہو؟ انہوں نے کہا: وہ تو نبی ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) کعب بن اشرف نے کہا: تمہارا وہ انعام اور صلہ جو مجھ سے ملتا تھا آج سے ختم۔ اگر اس کے خلاف ثابت کر دو تو پھر تمہارا انعام وصلہ بدستور جاری رہے گا۔ بعض اہل کتاب عذر کرتے ہوئے جواب دیتے کہ چونکہ انہوں نے ہمیں بلا سوچے سمجھے جواب دیا ہے ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دو ہم تورات کو دیکھ کر جواب دیں گے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کعب بن اشرف

کو تورات دکھائی جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت شریف لکھی تھی وہاں دجال کی تعریف لکھ دی پھر کعب بن اشرف کو سنائی ۔کعب بن اشرف نے ہر ایک کو ایک صاع جَو اور چار گز کپڑا عطیہ دیا۔اسی لیے مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ۔

بود در انجیل نامِ مصطفیٰ	آں سرِ پیغمبراں بحرِ صفا
بود ذکر حلیہا وشکل او	بود ذکر غزو صوم واکل او

ترجمہ : انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی تھا وہ بحرِ صفا اور سرتاجِ رسل ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ اور شکل مذکور تھی آپ کا کھانا پینا اور روزہ وغیرہ مندرج تھا۔

وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ مجھے سے ڈرو ایمان لا کر اور حق کی تابعداری کر کے اور دنیوی طمع سے روگردانی کر کے۔

سوال : فَارْهَبُوْنِ اور فَاتَّقُوْنِ دونوں تقریبا ہم معنیٰ ہیں پھر تکرار کا کیا فائدہ؟

جواب : فَارْهَبُوْنِ کا معنیٰ ہے مجھ سے ڈرو ایفائے عہد کے بارے میں اور فَاتَّقُوْنِ کا معنیٰ ہے کہ مجھ سے ڈرو نعمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چھپانے کی وجہ سے۔یا پہلے کا حکم عام تھا۔ہر ایک مقلد اور عالم کو وہاں رھبت کا حکم دیا گیا کہ سلوک کی یہ پہلی منزل ہے اور دوسرے میں صرف علماء مطلوب ہیں کہ ان کو تقویٰ کا حکم ہوا جو آخری مرحلہ ہے۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ اس کے ماقبل پر عطف ہے۔ **اللبس بالفتح**، بمعنی ملانا، یعنی وہ حق جو منزل من اللہ ہے اس کو باطل سے خلط ملط نہ کرو۔اس باطل کے خلط سے جسے تم حق کے درمیان لکھتے ہو یا تاویل کر کے اسے بیان کرتے ہو۔ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ یہاں پر لا مقدر ہے یا اَن مقدر کی وجہ سے منصوب ہے اور واؤ بمعنیٰ جمع کے ہے۔اب معنیٰ یوں ہوا کہ **لا تجتمعوا لبس بالباطل و کتمانہ** (حق کو باطل سے ملا چھپا کر جمع نہ کرو) لَا تَلْبِسُوا تغیر سے نہی کی گئی ہے اور وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ میں کتمانِ حق سے نہی کی گئی۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ تورات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہمیں نہیں ملی۔اس سے معلوم ہوا کہ لبس اور ہے اور کتمان اور۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تمہارا حال یہ ہے کہ تم جانتے بھی ہو کہ تم حق میں ملاوٹ کر رہے ہو اور اسے چھپا رہے ہو یا یہ کہ تم جانتے بھی ہو کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم برحق نبی ہیں۔حال کا لانا منہی کی تقیید کے لئے ہے بلکہ ان کے حال کی قباحت میں اضافہ مطلوب ہے کیونکہ جاہل بھی معذور ہوتا ہے۔

ف: تیسیر میں ہے کہ یہ خطاب تمام مسلمانوں اور ان کی ہر صنف کو ہے۔ گویا یوں حکم ہے کہ اے شاہانِ وقت! عدل کو جور سے، اور اے قاضیان! حکم کو رشوت سے نہ ملاؤ۔ اسی طرح ہر فریق کو سمجھتے جاؤ اور اگر یہ خطاب صرف بنی اسرائیل کو ہو تو یہ حکم اس کو بھی شامل ہو گا جو ان جیسا عمل کرتے ہوں۔ مثلاً جو حق کی تغیر اور ابطال کے لئے رقم لیتا ہے یا جو کچھ اس پر علم سکھانا واجب ہے، پڑھانے سے رک جاتا ہے یا علم کے باوجود عمل نہیں کرتے۔ سب پر یہی حکم صادر ہو گا۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً لاَ یَنْبَغِیْ بِہٖ وَجْہِ اللّٰہِ لاَ یَتَعَلَّمَہٗ اِلاَّ یُصِیْبَ بِہٖ
غَرْضاً مِّنَ الدُّنْیَا لَمْ یَجِدْ غُرَفَ الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ

(جو شخص علم حاصل کرتا ہے اس میں رضائے الٰہی مقصود نہیں محض دنیا مطلوب ہے تو قیامت میں اسے بہشت کے بالا خانے نصیب نہیں ہوں گے)

تنبیہ: جس نے اللہ تعالیٰ سے ڈر کر تقویٰ کرتے ہوئے اپنے علم کا عوض نہ لیا اور نہ ہی وصیت و نصیحت سے کچھ طمع رکھی بلکہ حق کو ظاہر کرنے میں اسے دکھ و تکلیف بھی آئی تو صبر سے برداشت کی تو وہ اس زمرہ میں داخل ہو گا جن کو نہ خوف ہے نہ غم۔ یعنی اولیاء کے گروہ میں۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاَ یَمْنَعَنَّ اَحَدَکُمْ ھَیْبَۃُ اَحَدٍ اَنْ یَّقُوْلَ اَوْ یَقُوْمَ بِالْحَقِّ حَیْثُ کَانَ
(مجھے کسی کی ہیبت حق بات کہنے سے نہیں روکتی خواہ وہ کیسے ہی ہوں)

قرآن پاک میں ہے: یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلاَ یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور وہ ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

ابو حازم کی گواہی:۔ سلیمان بن عبدالملک مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ راستہ میں مدینہ طیبہ چند روز قیام پذیر ہوا تو لوگوں سے پوچھا: کوئی ایسا آدمی بھی زندہ ہے جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل ہو۔ لوگوں نے کہا: حضرت ابو حازم رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی خدمت میں کسی کو بھیج کر اپنے ہاں بلایا۔ حضرت ابو

حازم تشریف لائے تو خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے ان سے کہا کہ اہلِ مدینہ کے بڑے بڑے لوگ میرے ملنے کے لئے آئے آپ کیوں تشریف نہ لائے۔ آپ نے فرمایا: اس سے قبل نہ آپ مجھ سے متعارف ہیں اور نہ ہی میں آپ کو جانتا ہوں۔

سلیمان نے ساتھ بیٹھے ہوئے محمد بن شہاب زہری کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا: واقعی شیخ سچ فرماتے ہیں: اب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا:

سلیمان: اے ابو حازم! کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو مکروہ سمجھتے ہیں؟

ابو حازم: اس لیے کہ تم نے آخرت کو خراب کر ڈالا اور دنیا کی تعمیر میں لگے رہے۔ اب تمہیں یہ بات شاق گزرتی ہے کہ آبادی کو چھوڑ کر ویران جگہ چلے جاؤ۔

سلیمان: اے ابو حازم! تو نے ٹھیک فرمایا اب بتایئے کل اللہ تعالیٰ سے کیسے ملاقات ہو گی۔

ابو حازم! اگر نیک ہے تو ایسے آئے گا جیسے کوئی گھر سے باہر چلا جائے پھر جب واپسی ہوتی ہے تو اہل و عیال میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اگر بُرا ہے تو ایسے ہو گا جیسے بھاگا ہوا نوکر اپنے آقا کے ہاں لوٹ آئے۔ سلیمان رو پڑا اور کہا نا معلوم ہمارا اللہ تعالیٰ کے ہاں کیسے معاملہ ہو گا؟

ابو حازم: اپنے اعمال کتاب اللہ کے موافق بنانے کی کوشش کرو۔

سلیمان: آخرت میں مجھ سے کون اچھا ہے؟

ابو حازم: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (ابرار بہشت کی نعمتوں میں ہوں گے اور فجار جحیم میں)

سلیمان: اے ابو حازم: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین کے قریب ہے)

سلیمان: اے ابو حازم! اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سا بندہ مکرم ترین ہے؟

ابو حازم: مردہ اور عقل والے۔

سلیمان: کون سا عمل افضل ہے؟

ابو حازم: فرائض کی ادائیگی اور محارم سے اجتناب۔

سلیمان: کون سی دعا زیادہ مستجاب ہے؟

ابوحازم: محسن الیہ کی دعا محسن کے لئے۔

سلیمان: کون سا صدقہ افضل ہے؟

ابوحازم: تنگدست، فقیر اور بڑی سخت تنگی والے کو صدقہ دے کر منت اور احسان نہ جتانا اور نہ ہی اسے ایذا دینا۔

سلیمان: کون سا قول اچھا ہے؟

ابوحازم: جس سے تو ڈرتا ہے یا جس سے کوئی امید وابستہ ہے۔

سلیمان: اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سا مومن اعلیٰ مرتبہ والا ہے؟

ابوحازم: وہ مرد جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور دوسرے کو بھی اس کا حکم دے۔

سلیمان: کون سا مومن احمق ہے؟

ابوحازم: وہ شخص جو خواہشاتِ نفسانیہ پر ٹوٹ پڑے حالانکہ وہ ظالم ہے یہ ایسا احمق ہے کہ غیر کی خاطر اپنی آخرت کو دنیا کے عوض بیچ رہا ہے۔

سلیمان: بہت خوب! لیکن فرمائیے ہم کیسے ہیں؟

ابوحازم: اے امیر المومنین! مجھے اس کے متعلق معاف فرمائیے۔

سلیمان: نہیں، ضرور بتانا پڑے گا۔ یہ ایک نصیحت ہوگی جو مجھے آپ کی طرف سے حاصل ہوگی۔

ابوحازم: اے امیر المومنین! تمہارے آباء نے لوگوں پر تلوار کے ساتھ جبر وتشدد کیا اور لوگوں کے مشورے کے بغیر ظلماً یہ ملک چھینا یہاں تک کہ بہت بڑی خون ریزیاں ہوئیں اور آخر کار لوگ اپنا ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش! تجھے وہ کلمات معلوم ہوتے جو لوگوں نے تیرے آباء کے متعلق کہے۔

ایک ہم نشین نے کہا: اے ابوحازم! تو نے غلط بیانی کی۔

ابوحازم نے فرمایا: کیوں جھوٹ بول رہے ہو، علماء سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا کہ وہ لوگوں کو حق کی بات بتائیں اور حق ہرگز نہ چھپائیں۔

سلیمان: اب ہم اپنی اصلاح کس طرح کریں؟

ابوحازم: لوگوں کو بلا کر مروۃ سے کام لو اور ہر ایک کا حصہ برابر تقسیم کردو۔

سلیمان: ہم مال کہاں سے حاصل کریں؟

ابوحازم: حلال مال کما کر اس کے اہل کو دو۔

سلیمان: اے ابوحازم! چند روز ہمارے ہاں قیام فرمایئے تا کہ ہم آپ سے نصیحت حاصل کریں۔

ابوحازم: پناہ بخدا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی ایسا عمل نہ ہو جائے کہ جس سے مجھے دنیا وآخرت کی رسوائی اٹھانی پڑے۔

سلیمان: کم از کم اپنی ضروریات تو بتا دیجئے تا کہ ہم آپ کی امداد کریں۔

ابوحازم: مجھے جہنم سے نجات دلا کر بہشت میں داخل کرا دیجئے۔

سلیمان: سبحان اللہ! مجھ سا اس کام کو کب کر سکتا ہے!

ابوحازم: میری تو یہی حاجت ہے۔

سلیمان: اچھا، میرے لیے کوئی دعا فرمایئے۔

ابوحازم: یا اللہ! اگر سلیمان تیرا دوست ہے تو اس کی دنیا وآخرت کی بھلائی میں آسانی فرما۔ اگر تیرا دشمن ہے تو اسے تو پکڑ جیسا تو چاہے۔

سلیمان: کچھ نصیحت بھی فرمایئے۔

ابوحازم: اگر تو اہل ہے تو میں تجھے بہت کچھ کہہ چکا اور اگر تو نا اہل ہے تو پھر اب میری کمان میں تیر نہیں۔ یعنی اتنا ہی کافی ہے۔

سلیمان: مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔

ابوحازم: میں تجھے یہ وصیت کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ کو بہت بڑی ذات سمجھنا اور جس عمل کا اس نے تجھے حکم دیا ہے اس کی ادائیگی میں کوشش کرنا اور جس سے تجھے روکا ہے اس سے بچتے رہنا۔ جب ابوحازم گھر جانے لگے تو سلیمان نے سو دینار روانہ کر کے لکھا کہ اسے خرچ کرو، اور اتنا اور بھی آپ کا میرے پاس باقی ہے۔

ابوحازم نے وہ رقم لوٹا کر لکھا کہ اے امیر المومنین! میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ کیا تیرے وہ سوالات مسخری کے طور تھے اور یہ رقم واپس ہے میں اسے نہیں لینا چاہتا۔ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت ادا کی ہے۔

شعیب وموسیٰ کی ملاقات کا ایک واقعہ:۔

جب موسیٰ علیہ السلام مدین میں تشریف لے گئے تو وہاں چرواہوں کو پانی کھینچتا ہوا پایا۔ ادھر دیکھا تو دو لڑکیاں بھی پانی کھینچنا چاہتی تھیں تو آپ نے ان کو کنویں سے پانی نکال دیا۔ آپ نے ان سے پوچھا: تم نے پانی پہلے کیوں نہیں لیا؟ انہوں نے کہا: جب تک یہ لوگ فارغ نہ ہوتے ہم پانی نہیں نکال سکتیں۔ ہمارا باپ (شعیب) بوڑھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پانی بھر کر سایہ کے نیچے بیٹھ کر کہا: ''یا اللہ تو نے مجھے فقر وفقیری میں ہی رکھا'' آپ نے یہ اس لیے کہا کہ آپ بھوکے تھے اور خوف زدہ بھی اور اطمینان بھی نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا اور لوگوں سے کچھ نہ مانگا۔ چرواہوں نے تو کچھ نہ سمجھا لیکن وہ لڑکیاں بھانپ گئیں۔ باپ کے پاس جا کر سارا ماجرا سنایا اور وہ الفاظ بھی سنائے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: تم میں سے ایک جائے اور اسے بلا لائے۔ جب وہ لڑکی موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچی تو منہ چھپائے ہوئے کہا کہ میرا باپ آپ کو بلا رہا ہے تا کہ آپ کو وہ مزدوری دیں جو آپ نے ہمیں پانی بھر کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات ناگوار گزری۔ لیکن جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ پہاڑی علاقہ تھا اور ویسے بھی آپ خوف زدہ تھے۔ جب چل پڑے تو تیز ہوا چلنے لگی۔ راستہ بتانے کے لئے وہ لڑکی آگے آگے چل دی۔ ہوا کے جھونکے سے لڑکی کا کپڑا ادھر ادھر ہوتا تو اس کی رانیں دکھائی دینے لگتیں۔ (اس لڑکی کی رانیں بھی کچھ موٹی تھیں) موسیٰ علیہ السلام نامحرم عورت کو دیکھنا گوارہ نہ کرتے اس لیے کبھی اپنا منہ چھپا لیتے اور کبھی کھول لیتے۔ آخر رہا نہ گیا آپ نے کہا: اے اللہ کی بندی! مجھے آگے چلنے دے اور تو مجھے راستہ بتاتی چل۔ بالآخر حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں وہ دونوں پہنچ گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام اس وقت شام کا کھانا کھانے کے لئے تیار بیٹھے تھے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا: اے بیٹے! بیٹھیے اور طعام کھایئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں آپ کا طعام نہیں کھاؤں گا۔ شعیب علیہ السلام نے فرمایا: آپ بھوکے تو ہیں ہی۔ پھر کھاتے کیوں نہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ''مجھے خطرہ ہے کہ جو کام میں نے فی سبیل اللہ کیا، کہیں یہ کھانا اس کا عوض نہ ہو جائے، کیونکہ میں اس قبیلہ سے ہوں کہ جو اپنے دین کے کسی عمل کو بیچتے نہیں۔ اگر چہ اس کے عوض دنیا کے برابر سونا ملے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں بھی تمہیں اس کا عوض نہیں دے رہا۔ بلکہ میری اور میرے آباء کی

عادت ہے کہ ہم مہمان نوازی کرتے ہیں اور بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے بیٹھ کر طعام تناول فرمایا۔

ف: اس حکایت کے بعد ابوحازم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر یہ سو دینار میرے اس کلام اور نصیحت کی بدولت ہیں تو مجبوری کے وقت خنزیر اور مردار اور دم مسفوح کھا پی لینا اس سے زیادہ بہتر ہے اور اگر بیت المال سے مجھے یہ حق مل رہا ہے تو میرے جیسے اور بہت آپ کو مل جائیں گے انہیں دے دیجئے۔ لیکن یاد رکھیے مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

سبق: امام قرطبی نے اس حکایت کو نقل کر کے فرمایا اسی کا نام ہے **اقتداء بالکتاب و السنة**۔

مسئلہ: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا تعلیم قرآن اور علم پر اجرت لینا اس آیت کی رو سے جرم و گناہ ہے یا نہیں آج کل کے زمانے میں تعلیم قرآن اور فقہ پر اجرت لینا جائز ہے تا کہ تعلیم و دیگر امورِ خیر ضائع نہ ہو جائیں۔

حدیث شریف: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اِنَّ اَحَقَّ مَا اُخِذَ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ** یعنی جس عمل کی تم مزدوری لیتے ہو ان میں سب سے زیادہ حق قرآن کریم کی تعلیم پر ہے۔

مسئلہ: آیت کی وعید اس شخص کے لئے ہے جو اس پر تعین کرے یہاں تک کہ جب تک اسے کچھ نہ ملے تو وہ تعلیم دینا چھوڑ دے اور وہ شخص جو اس پر تعین نہیں کرتا اس کے لئے اجرت لینا اس مذکور حدیث کے مطابق جائز ہے۔ جیسے غسال (مردہ نہلانے والا) کہ وہاں پر سوائے اس کے غسل نہیں دے سکتا۔ جیسے گاؤں اور دور افتادہ علاقوں میں ہوتا ہے تو اس کے لئے اجرت لینا جائز ہے کیونکہ وہاں پر سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ اگر اس کے سوا اور بھی موجود ہوں، جیسے عام شہروں میں ہوتا ہے تو پھر بھی اسے اجرت لینا جائز ہے لیکن تعین نہ کرے اس وقت اگر غسل نہ دے تب بھی گنہگار ہوگا۔

مسئلہ: اگر اس کی وجہِ معاش سوائے اس عمل کے اور کوئی نہیں تو اسے تعلیم پر اجرت مقرر نہیں کرنی چاہیے بلکہ کسی اور صنعت و حرفت کو اجرت کے لئے متعین کرے، اور امام (حاکمِ وقت) کے لئے لازم ہے کہ اس کا کوئی وظیفہ مقرر کر دے ورنہ عام مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کا وظیفہ مقرر کریں۔ کیونکہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلافت سپرد ہوئی تو آپ کے وجہِ معاش کے لئے کچھ بھی نہ تھا کہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں

تو آپ اپنا کپڑا بازار میں بیچنے کے لئے جا رہے تھے لوگوں نے کہا: اس طرح کیوں؟ آپ نے فرمایا: تو پھر میں کہاں سے خرچ کروں؟ لوگوں نے کہا: واپس جایئے ہم اس کا انتظام کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے مل جل کر آپ کی معاش متعین کر دی۔

مسئلہ: اسی طرح امام اور مؤذن وغیرہما کا حکم ہے کہ وہ اجرت اسی طور سے لے سکتے ہیں۔

مسئلہ: قرآن پاک کی بیع و فروخت جائز ہے اس لیے کہ یہ بیع اوراق اور کتابت کی اجرت ہے نہ کہ اصل قرآن کی۔

مسئلہ: ہمارے زمانے میں بعض مسائل کے لئے جواز کی صورت پیدا کرنی پڑی۔ کیونکہ زمان کے تغیر سے مسائل بھی متغیر ہو جاتے ہیں تاکہ علم اور دین نہ مٹ جائے۔ ان مسائل میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ علماء کا سلاطین کی ملازمت اختیار کرنا۔

۲۔ گاؤں میں جا کر اپنی معاش کا سبب تلاش کرنا۔

۳۔ تعلیمِ قرآن اور اذان و امامت کی اجرت لینا۔

۴۔ عزل حرۃ اس کے اذن کے بغیر۔

۵۔ شرابیوں وغیرہ کو السلام علیکم کہنا۔

ف: ان کے لئے جواز کا فتویٰ دیا گیا تاکہ ضرر و نقصان کے وقوع سے حفاظت ہو جائے۔

(کذافی نصاب الاحتساب)

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

عاشقاں را شادمانی و غم اوست — دست مزد و اجرت خدمت ہم اوست

غیر معشوق ار تماشائی بود — عشق نبود ہرزہ سرائی بود

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت — ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے۔ یعنی اسے قبول کرو اور اس کی فرضیت کا اعتقاد رکھتے ہوئے اس کو شرائط و حدود کے ساتھ مسلمانوں کی طرح ادا کرو۔ کیونکہ اس کے سوا نماز نامقبول ہے۔ **وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ** مسلمانوں

کی طرح زکوٰۃ ادا کرو۔ کیونکہ اس کے سوا زکوٰۃ نا قابلِ قبول ہے۔

ف: نفس کو کرم کے ثمرہ سے حصہ مل جائے یا زکوٰۃ بمعنیٰ طہارت ہے۔ کیونکہ یہ مال کو خبث سے اور نفس کو بخل سے پاک کرتی ہے۔

مسئلہ: کفار ان اوامر کے مخاطب نہیں جو سقوط کا احتمال رکھتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ وغیرہ اور عندالاحناف ان کے ترک کرنے پر ان کو سزا نہیں ملے گی۔ ان پر ان کا مکلف ہونا عند الحنفیہ اعتقاد اور قبول کی وجہ سے ہے۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ نماز با جماعت ادا کرو۔

مسئلہ: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے ستائیس درجے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

نکتہ: کیونکہ جماعت میں نفوس قدسیہ کا تعاون ہوتا ہے۔

نکتہ: نماز جنگ کی طرح ہے اسی لیے اس کے لئے محراب ہوتا ہے۔ بمعنیٰ محل حرب اور جنگ میں ضروری ہوتا ہے کہ وہاں جماعت میں صفیں ہوں۔

نکتہ: جماعت میں قوت ہے۔

حدیث شریف: میں ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَا اِجْتَمَعَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ جَمَاعَةٍ اَرْبَعُوْنَ رَجُلاً اِلَّا وَفِيْهِمْ رَجُل" مَغْفُوْر" لَهٗ فَا اللّٰهُ تَعَالٰى اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يَّغْفِرَ لَهٗ

(جہاں بھی مسلمانوں کی جماعت کے چالیس آدمی جمع ہوں گے وہاں ان میں سے ایک ضرور بخشا ہوا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے شان میں نہیں ہے کہ اسے تو بخش دے اور باقیوں کو محروم و خاسر لوٹا دے)

نکتہ: نماز با جماعت کو تنہا پڑھنے سے ستائیس درجے اس لیے فضیلت دی گئی کہ جماعت جمع سے ماخوذ ہے اور جمع کو کم از کم تین پر اطلاق ضرور ہوتا ہے۔ تنہا نماز پڑھنے سے دس نیکیاں ضرور ملتی ہیں ان دسوں میں ایک اصلی نیکی اور باقی نو فضلِ کریم نے عطا ہوئیں۔ جب یہ تضعیفات آپس میں جمع ہوں گے تو ستائیس ہو جائیں گے۔

مسئلہ: امام قرطبی فرماتے ہیں کہ جو شخص با جماعت نماز کے ترک کی ہمیشگی اختیار کرے اور عذر بہ نہ ہو تو اسے سزا دینی چاہیے۔

حکایت: حضرت ابوسلیمان درانی فرماتے ہیں: مجھے چالیس سال گزر گئے مجھے کبھی احتلام نہ ہوا۔ ایک روز میں مکہ مکرمہ میں پہنچا تو وہاں مجھ سے حدث واقع ہوئی۔ اب تو یوں ہوا کہ ہر شب احتلام میں مبتلا ہو جاتا اور حدث کا موجب یہ ہوا کہ ان سے عشاء کی نماز باجماعت ادا نہ ہو سکی۔

حدیث شریف: میں ہے کہ

مَا افْتَرَضَ اللّٰهُ عَلٰی خَلْقِهٖ بَعْدَ التَّوْحِيْدِ فَرْضاً اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنَ الصَّلٰوةِ وَلَوْ كَانَ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنَ الصَّلٰوةِ لِتَعَبَّدَ بِهٖ مَلٰئِكَتَهٗ فَمِنْهُمْ رَاكِعٌ وَسَاجِدٌ وَقَائِمٌ

(اللہ تعالٰی نے توحید کی سب سے زیادہ محبوب عبادت اپنے بندوں کو نماز عنایت فرمائی اور اگر کوئی اور عبادت زیادہ محبوب ہوتی تو ملائکہ کو اسی عبادت کا حکم ہوتا۔ لیکن فرشتے بعض رکوع میں تھے اور بعض سجدہ میں اور بعض قیام میں)

تنبیہ: نمازیوں کے لئے ضروری ہے کہ نماز کو حضور قلب سے ادا کریں۔ سلف صالحین کا طریقہ یہ تھا کہ نماز میں اگر مال کا خیال آجاتا تو اس مال کو اللہ تعالٰی کی راہ میں خرچ کر دیتے تا کہ حضورِ قلب کی فوتید گی کا کفارہ ہو جائے۔ کیونکہ اصلی عبادت عمل باطن ہے۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى [1] یعنی جب تم (حب دنیا کے) نشہ میں یا کسی خیال میں مبتلا ہو جاؤ تو نماز کے قریب [2] نہ جاؤ۔

کیونکہ اللہ تعالٰی صرف اس نمازی کو دیکھتا ہے جو حضورِ قلب سے نماز ادا کر رہا ہو۔ اسی لیے ضروری ہے کہ نماز میں کوئی خطرہ نہ آئے۔

حضرت مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

اول اے جان دفع شرِ موش کن	وانگہ در جمع گندم کوش کن
بشنو از اخبار آں صدر الصدور	لَا صَلٰوةَ تَمَّ اِلَّا بِالْحُضُوْر

1: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (ایمان والو! نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ جب تک۔ اپنی ہوش نہ ہو کہ جو کہو اسے سمجھو اور ناپاکی کی حالت میں نہائے مگر مسافری میں اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا تم سے کوئی قضائے حاجت سے آیا یا تم نے عورتوں کو چھوا اور پانی نہ پایا تو پاک مٹی سے تیمم کرو تو اپنے منہ اور ہاتھوں مسح کرو بیشک اللہ تعالٰی معاف کرنے والا بخشنے والا ہے)

2: قارئین حضرات اس کو ترجمہ قرآن کی تحریف خیال نہ فرمائیں حب دنیا بھی نشہ آور چیز ہے۔ یہ ترجمہ صوفیانہ ہے۔ (مترجم)

ترجمہ : اے عزیز! پہلے اپنے آپ سے چوہے کے شر کو دفع کر، پھر گندم جمع کرنے کی کوشش کر۔ حضور علیہ السلام کی حدیث سن۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز حضورِ قلب کے بغیر نہیں ہوتی۔

نصیحت: حضرت الشیخ الشہیر بافتادہ آفندی اپنے وصایا شریف میں عارف ھدائی قدس سرہما کو فرماتے ہیں کہ جب تم نماز میں شاغل ہو تو اس میں تمہیں اظہارِ عبودیت و تتمیم کے سوا کوئی فکر نہ آئے کیونکہ جب عبودیت مکمل ہوتی ہے تو مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ نماز کے بعد اس ملاحظہ و مراقبہ میں گزار و کہ میں نہیں ہوں بلکہ وہ ذاتِ حق موجود ہے اور بس۔ توحید سے بھی یہی مقصود ہے اور توحید سے کوئی اور عبادت اعلیٰ نہیں اسی لیے بندے کو اولاً اسی کا مکلف بنایا گیا۔ اس کے بعد نماز پھر روزہ کیونکہ ان دونوں میں نفس کی اصلاح ہوتی ہے ان کے بعد زکوٰۃ کا حکم دیا۔ اس سے بخل کو دور کرنے پر نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس کے بعد حج پر مامور ہوا۔ اس میں من وجہ مال خرچ کرنا ہے۔ پہلی تین عبادتوں کو اس لیے مقدم کیا گیا کہ ان میں اغنیاء و فقراء سب برابر ہیں اور باقی دو عبادتوں سے فقراء مستثنیٰ ہیں۔ اگرچہ اغنیاء کے گھر جواہر سے پر ہوتے ہیں تو فقراء کے بطون بھی نور سے معمور ہیں یہاں تک کہ یوم آخرت اغنیاء تمنا کریں گے کہ کاش ہم بھی فقراء ہوتے۔ مثنوی شریف میں ہے:

مکر ہا در کسب دنیا بار و است	مکر ہا در ترک دنیا وار داست
چیست دنیا از خدا غافل بدن	نے قماش نقرہ و فرزند و زن
کوزہ سر بستہ اندر آب رفت	از دل بر باد فوق آب رفت
باد درویشی چوں در باطن بود!	بر سرِ آب جہاں ساکن بود [1]

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ یعنی نماز قائم کرو مراقبہ قلوب و ملازمت خشوع و خضوع کے ساتھ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور زکوٰۃ ادا کرو یعنی نفس کو حرص امور دنیویہ اور اخلاق ذمیمہ سے پورے طور پاک و صاف کرو اور دل کو اعمال سیئہ اور مطالبہ ماسوی اللہ سے پاک کرو، کیونکہ حق کی طلب میں تعدی ہے اور تعدی کمال کے لئے نقصان دہ ہے وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے

ترجمہ : ا۔ دنیوی کاروبار میں دھوکہ نقصان ہے، ترک دنیا کے لئے ہی احکام وارد ہیں۔ ۲۔ دنیا کیا ہے خدا سے غافل ہونا نہ مشاغل میں نہ دولت میں نہ فرزندوں کی مشغولی میں۔ ۳۔ کوزہ سر بستہ پانی لینے گیا دل برباد کر کے پانی کے اوپر خالی ہاتھ تیرتا نظر آیا۔ ۴۔ درویشی کی ہوا باطن میں ہے پانی کے اوپر ہی جہاں ساکن ہے۔

ساتھ یعنی انکسار اور نفی وجود میں ان لوگوں کی اقتدا کرو جو منکسر حال اور موجود کی طلب میں اپنے وجود کو نیست ونابود کرنے والے ہیں۔

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ یہ خطاب یہودیوں کو ہے۔ الامـر بمعنی آپ سے کم درجہ والے کہنا (افـعـل) یہ کام کرو۔ النَّاسَ یہودیوں کے کم طبقہ کے لوگ مراد ہیں۔ بِالْبِرِّ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف اور ادلہ نبوت کی پیروی۔ بِـر " بمعنی خیر میں توسیع اور دراصل برّ واسع فضا کو کہتے ہیں ہمزہ استفہامیہ تقریر مع توبیخ وتعجب کے لئے ہے۔ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ یعنی اپنے نفسوں کو نیکی سے دور رکھتے ہو گویا تمہیں یاد بھی نہیں۔

سہو ونسیان میں فرق:۔ نسیان اور سہو ہر دونوں بمعنی ترک مستعمل ہوتے ہیں لیکن جو چیز پہلے معلوم پھر کسی عارضہ سے اس کی طرف توجہ نہ ہو اسے سہو کہتے ہیں اور نسیان وہ ہے کہ اسے ذہن میں لائے لیکن بوجہ ضعف حافظہ ذہن میں اتر نہ سکے۔

شانِ نزول:۔ احباران فقراء کو کہا کرتے ہیں کہ جن سے انہیں نفع کی قطعاً امید نہ تھی کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لاؤ، کیونکہ یہ وہی برحق نبی ہیں اور دولت مندوں کو کہتے کہ ان میں آخر الزمان نبی کی علامات تو پائی جاتی ہیں اور بعض نہیں ہیں۔ لہٰذا ان بعض کا انتظار کرلو اور خود بالکل دور رہتے، حالانکہ ان کو عزم بھی تھا کہ ان کی تابعداری کرلیں۔

مسئلہ : اسی طرح اس عاصی کا حال ہے جو کہتا ہے کہ بڑھاپے میں گناہوں سے توبہ کریں گے لیکن جب موت کا شکار ہو گیا تو حسرت کا ہاتھ ملتا ہے۔

حضرت حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

آں قہقہہ کبک خراماں حافظ — کہ زسر پنجہ شاہین قضا غافل بود [1]

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ حالانکہ تم تورات پڑھتے بھی ہو۔ اس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت واضح طور پر موجود ہے اور اس میں ان کے ساتھ ایمان لانے کا حکم بھی درج ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم میں عقل نہیں کہ کہ سمجھو کہ بات بہت قبیح ہے کہ اپنی اصلاح تو کرتے ہو لیکن دوسروں کو سمجھانے میں مشغول ہو۔ (اَلْعَقْلُ) اصل

[1] اے حافظ اس کبک ٹہلنے والی (متکبر) کو دیکھ کر تعجب کیجئے کہ وہ فضا میں اڑنے والی شاہین کے حملہ سے غافل ہے۔

میں بمعنی منع وامساک ہے۔ اسی سے عقال ماخوذ ہے۔ یعنی وہ رسی کہ جس سے اونٹ کے پاؤں کو کھنیوں تک باندھا جاتا ہے تا کہ حرکت کرنے سے باز رہے۔ نیز نور روحانی کہ جس سے نفس کو علوم ضروریہ ونظریہ کا ادراک ہوتا ہے۔ کو بھی عقل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ قبیح عمل سے روکتا اور اچھے عمل کو معلوم کرتا ہے اس کا محل دماغ ہے، کیونکہ دماغ حس کا محل ہے اور بعض کے نزدیک ایک کا محل قلب ہے کیونکہ قلب معدن حیٰوۃ اور مادہ حواس ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک نور ہے جو آدمی کے بدن میں ہوتا ہے۔

ف: یہ توبیخ لوگوں کے امر کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس سے برے عمل سے ترک کے لئے ہے۔ انکار وتوبیخ کا دارومدار جملہ معطوف یعنی وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ پر ہے۔ نہ وہ کہ جس پر اس جملہ کا عطف ہے یعنی اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ

ف: اس آیت سے وہ شخص استدلال نہیں کرسکتا جو قائل ہے کہ جو شخص خود عمل کا پابند نہ ہو وہ دوسرے کو امر بالمعروف نہیں کرسکتا بلکہ اس کے لئے لازم ہے کہ نیک عمل پر پابندی کرے اور امر بالمعروف کو بھی نہ چھوڑے

حدیث شریف: ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَاِنْ لَمْ تَعْلَمُوْا بِهٖ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَاِنْ لَمْ تَنْهَوْا عَنْهُ

نیکی کا حکم دو اگر چہ تم خود اس کے کاربند نہ ہو اور برائی سے روکو اگر چہ تم خود اس میں مبتلا ہو۔

مسئلہ: جس نے کسی دوسرے کو امر المعروف کیا اور خود اس کا عامل نہیں تو اس نے صرف ایک واجب کا ترک کیا اور اگر خود امر بالمعروف بھی ترک بیٹھے تو اس نے دو واجبوں کو چھوڑا اور خود امر بالمعروف بھی ایک نیکی ہے اگر چہ اس امر کے مطابق عمل نہیں کرسکتا۔

نصیحت: ہاں یہ ضرور ہے کہ بے عمل واعظ کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔

مسئلہ: جو شخص امر بالعروف کرتا ہے پہلے خود اس کا پابند بنے۔ اسی طرح جو کسی کو برائی سے روکتا ہے اسے چاہیے کہ اس برائی سے پہلے خود باز آئے۔

ف: یہ آیت واعظِ بے عمل کی مذمت کر رہی ہے کہ وہ دوسروں کو برائی سے روکتا ہے لیکن خود اس میں مبتلا رہتا ہے اور اس کے کردار بتاتے ہیں کہ وہ پکا جاہل اور نرا احمق ہے۔

سبق: معلوم باد کہ اس سے مراد یہ ہے کہ واعظ کو چاہیے کہ تزکیہ نفس میں جدوجہد کرے اور اپنی تکمیل کے

لئے کوئی کسر باقی نہ رکھے تاکہ حق قائم ہو اور اس کے قدسی نفس کے طفیل دوسروں کو جلیل مرتبہ نصیب ہو لیکن اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ واعظ فاسق سرے سے وعظ کرنا بھی چھوڑ دے کیونکہ دو مامور بہما میں سے ایک کی کمی دوسرے کے لئے خلل انداز نہیں۔

حکایت: ایک عالم دین بڑے مؤثر الکلام اور قلوب پر تصرف ڈالنے والے تھے۔ ان کے وعظ کی کوئی ایک مجلس خالی نہیں ہوگی کہ ایک یا دو تین اس کے وعظ کی تاثیر سے نہ مرے ہوں اور اس کے شہر کی ایک بڑھیا تھی اس کا نیک لڑکا تھا وہ رقیق القلب اور سریع الانفعال ہمیشہ اپنے بیٹے کو اس عالم کی مجلس میں جانے سے روکتی رہتی تھی۔ ایک روز وہ اپنی ماں سے چوری مجلس وعظ میں جا بیٹھا تو تقدیر الٰہی غالب آگئی آخر وہ مر گیا، ایک روز وہی بڑھیا اسی واعظ کو راستہ میں ملی اور یہ شعر پڑھ کر سنائے۔

اتھدی الانام و لاتھتدی　　الا انّ ذالک لا ینفع

فیا حجر الشحذ حتّٰی متٰی　　تسین الحدید و لا تقطع

ترجمہ: دوسروں کو تو ہدایت دیتا ہے لیکن خود ہدایت سے محروم ہے خبردار! یہ بات نفع مند نہیں۔ اے پتھر! کب تک تیز تر رہے گا کہ لوہے کو تو تیز کرتا ہے لیکن خود کاٹ نہیں سکتا یعنی بیکار ہے۔

جب اس واعظ نے یہ اشعار سنے تو ایک چیخ مار کر گھوڑے سے بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا اسے اٹھا کر گھر لے گئے، اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر کنند　　چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر میکنند

مشکلے دارم ز دانش مند مجلس باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

ترجمہ:۔ ۱۔ یہ واعظین جو محراب و منبر پر جلوہ گر ہوتے ہیں تنہائی میں کچھ اور کام کرتے ہیں۔ ۲۔ پھر ایسے دانشوروں سے باز پرس بھی مشکل ہے دوسروں کو توبہ کی تلقین کرنے والے خود توبہ بہت کم کرتے ہیں۔

عالم بے عمل کی سزا (حدیث شریف)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میرا ایک قوم پر گذر ہوا تو ان کے ہونٹ آگ کی مقراضوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبرائیل! (علیہ السلام) یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل

علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ کی امت کے وہ خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے لیکن خود اس کے کاربند نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے ان کا حصہ جہنم میں ایسے ہی مقرر ہوا۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم وہ ہیں کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے لیکن خود کو کبھی نصیحت نہ کرتے۔

حضرت اوزاعی نے فرمایا کہ نوالین نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کی کہ یا اللہ کفار کے مردار کی بدبو ہمیں سخت تکلیف دے رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بدبو علمائے سوء کے پیٹ کی بدبو سے کہیں اور زیادہ ہے۔

حدیث شریف: حدیث شریف میں ہے:

ما من عبد یخطب خطبة الا و اللّٰہ سائلها عنهما یوم القیامة ما ارادبها

ہر وہ بندہ جو قوم کو خطاب کرتا ہے قیامت میں اللہ تعالیٰ اسے پوچھے گا کہ تیرا اس خطاب سے مطلب کیا تھا۔

ف: حضرت شیخ افتادہ آفندی نے فرمایا کہ اگر واعظ کو معلوم ہوتا کہ میری بھلائی وعظ سنانے کی بجائے سننے میں ہے تو وہ کبھی وعظ کرنے کے درپے نہ ہوتا۔

حدیث شریف: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَمْ مِنْ وَاعِظٍ يَلْعَبُ بِهِ الشَّيْطَانُ بہت سے ایسے واعظ ہیں کہ جن سے شیطان کھیلتا ہے۔

ہاں اگر اس کا یہ ارادہ ہو کہ مجھ سے نفع یاب ہوں اگر اس کے باوجود بھی اسے عذاب ہو تو وہ اس کے لئے ایک قسم کی فنا ہوگی۔ لیکن پھر بھی دھیان رکھے کہ اس میں حظ نفسانی کو دخل بالکل نہ ہو۔ نیز فرمایا کہ لوگوں کو اگر اس لیے وعظ سناتا ہے کہ لوگوں کو اس کا پتہ چل جائے جس کا مجھے پتہ ہے یا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جس کا میں معتقد ہوں ان کو کوئی علم نہ چلے۔ پہلے کو تو وعظ کرنے کی ضرورت نہیں، دوسرا بھی غلطی میں مبتلا ہے کہ لوگوں کو جاہل تصور کرتا ہے اور خود کو فاضل، تو یہ ایک تکبر ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نفس کے حیلے بیشمار ہیں۔ اس سے خلاصی وہ پاسکتا ہے جسے فضلِ الٰہی نصیب ہو۔ کم از کم اس حدیث شریف کا مضمون ملحوظ رہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان اللّٰہ یؤید ھذا الدین بالرجل الفاسق** اللہ تعالیٰ اپنے

دین کی تائید ایک فاسق سے کراتا ہے۔ جب تک سالک حقیقت تک نہ پہنچے تب تک گمراہی میں پڑنے سے خائف رہے۔

حدیث شریف: حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الناس کلھم سکاری الا العالمون (تمام لوگ مخمور ہیں صرف علماء باہوش ہیں)

مخلصین تو ہمیشہ بڑے خطرے میں ہیں۔ البتہ مخلصین (بالفتح) امن وسلامتی میں ہیں۔ مخلص (بالفتح) تو وہ سالک ہے جو توحید حقیقی تک پہنچا اور فانی ہو کر قہر سے محفوظ اور اللہ تعالیٰ کا کرم وجود وعدم کی حد سے باہر ہے۔ اسی کا نام فنا کلی ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ سے یہی لوگ مراد ہیں۔

تنبیہ: ہر مرتبہ میں شریعت کی پاسداری ضروری ہے، کیونکہ کمال اسی کا نام ہے ورنہ شریعت سے روگردان سالک ناقص ہے اسی لیے مجذوب نقصان سے خالی نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی ایک کے متعلق جنون اور سفاہت کا طاری ہونا نہیں سنا گیا کیونکہ وہ مرتبہ کمال میں کامل اور وہ عقل کل کے مالک ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دروازہ کے بند ہونے والی آواز سے بھی وہ ہر حالتِ استغراق میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اوصلنا الی الکمالِ (اے اللہ! ہمیں کمال کے مرتبہ تک پہنچا)

تفسیر عالمانہ

وَاسْتَعِیْنُوْا اے بنی اسرائیل! اپنی ضروریات کو بِالصَّبْرِ صبر سے طلب کر کے فتح یابی کے منتظر رہو لیکن اس میں بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔ یا صبر سے مراد روزہ ہے، کیونکہ روزے میں کھانے پینے والی چیزوں سے صبر کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں کسر شہوت اور تصفیہ نفس ہے۔ وَالصَّلٰوۃِ یعنی نماز کو وسیلہ بناؤ اور اس کے ذریعے سے التجا کرو۔ یہاں تک کہ مقصود کو پہنچ جاؤ اور مصائب وتکالیف سے بچ جاؤ۔

ربط: جب بنی اسرائیل کو ایسے امور یعنی تکلیف اور ریاست ومرتبہ کا ترک اور مال سے روگردانی کا حکم دیا گیا جو ان پر شاق تھے۔ اب ان کا علاج بتایا جا رہا ہے۔

حدیث شریف: حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی امر غم میں ڈالتا تو آپ نماز میں مشغول ہو جاتے۔

حکایت: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سفر میں تھے تو آپ کو لڑکی کی فوتیدگی کی اطلاع ملی۔ آپ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھ کر فرمایا کہ وہ ایک عورت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ڈھانپا اور وہ ایک بوجھ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے میرے لیے آگے محفوظ فرمایا۔ پھر راستہ سے ہٹ کر آپ نے نماز ادا فرمائی اور سواری پر سوار ہو کر پڑھتے تھے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (استعانت حاصل کرو صبر اور نماز سے) وَاِنَّهَا اور بیشک وہ نماز لَكَبِيْرَةٌ بہت بھاری ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے مقرر فرمایا جیسا کہ خود فرمایا: اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ہاں خاشعین پر نماز کوئی بوجھ نہیں۔ خاشعین بمعنی عاجز سوالی لوگ۔

ف: خشوع جوارح سے ہوتا ہے اور خضوع قلب سے۔ یا خشوع بصر سے ہوتا ہے اور خضوع باقی اعضا سے۔

سوال: خاشعین پر نماز کیوں ثقیل نہیں۔

جواب: اس لیے کہ وہ اپنے رب کی مناجات میں ایسے مستغرق ہوتے ہیں کہ ان کو تکالیف اور مشقتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **وقرة عيني في الصلوة** کیونکہ آپ کو نماز کی مشغولی میں راحت و سرور ملتا۔ اسی لیے آپ نے دنیوی امور کو الٹا تکلیف سے تعبیر فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ظن کبھی یقین کا معنی دیتا ہے اور کبھی شک کا، کیونکہ یہ اضداد سے ہے۔ جیسے لفظ رجاء بمعنی امن و خوف کے لئے آتا ہے۔ **(كذا في تفسير الكواشي)**

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں۔ اس میں قیامت کی حاضری کی طرف اور وہاں پر سوال ہونے کا اشارہ ہے یہی وجہ موزوں ہے۔

حدیث شریف:۔

۱۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من احب لقاء الله احب الله لقائه ومن كره لقاء الله كره الله لقائه** ۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ کی زیارت کا اشتیاق ہے، اس کے ملنے کو بھی اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اور جو

اللہ تعالیٰ کو ملنا نہیں چاہتا اسے اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہتا۔اس لقاء سے مراد موت ہے۔

حدیث شریف :۔

۱۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:من احب لقاء اللّٰہ احب اللہ لقاءَ ہ ومن کرہ لقاء اللّٰہ کرہ اللّٰہ لقائہ یعنی جسے اللہ تعالیٰ کی زیارت کا اشتیاق ہے،اس کے ملنے کو بھی اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کو ملنا نہیں چاہتا اسے اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہتا۔اس لقاء سے مراد موت ہے۔

۲۔ لقی اللّٰہ وھو علیہ غضبان ۔یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا،حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو گیا۔اس سے مراد موت ہے۔اب معنیٰ یوں ہوا کہ انہیں یقین ہے کہ وہ عنقریب مریں گے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اور انہیں یقین ہے کہ وہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف واپس ہونے والے ہیں۔یعنی ان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا ملے گی اور جن کو جزا کا یقین نہیں اور نہ ہی ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ ہی عذاب سے ڈرتے ہیں تو پھر یہ نماز ان کے لئے بوجھ ہے۔جیسے منافقین اور ریاکار لوگوں پر بوجھل محسوس ہوتی ہے۔

مسئلہ : طاعات کے دکھ پر صبر کرنا نفس کے ساتھ جہاد کرنا اور اسے شہوات سے روکنا اور لمبی آرزوؤں سے اسے باز رکھنا ہے۔عادات انبیاء اور صالحین کے ہیں۔

ف: حضرت یحییٰ بن ایمان فرماتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مقسوم لکھ دیا ہے اس سے زائد کی طلب نہ کرنا اور رضا یہ ہے کہ جو فیصلہ تقدیر نے دنیا و آخرت کا کر دیا ہے اس پر خوش ہونا اور بس ۔یہ عمل سلوک میں ایسے ہے جیسے تمام بدن کے لئے روح۔

حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر　　　آرے شود ولیک بخونِ جگر شود

ف: اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کی علیحدہ علیحدہ تعریف فرمائی ہے۔اور ہر ایک کی حد و انتہا بیان فرمائی ہے مثلاً فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اور صدقہ فی سبیل اللہ کے متعلق فرمایا: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ الآیۃ اور صابرین کے متعلق اجرِ بے حساب کا وعدہ فرمایا چنانچہ صبر والوں کے متعلق فرمایا: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ اور اپنے لیے صبر کی تعریف فرمائی

جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: لیس بشی ءٍ اجر علی اذی سمعه من الله تعالیٰ انهم لیدعون له ولد او انه لیعافیهم ویرزقهم (اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر والا کوئی نہیں ہوگا کہ وہ اپنے متعلق مکروہ امر سنے اور صبر کرے لوگ میرے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں، لیکن میں ان کو معاف کر دیتا ہوں اور روزی بھی بدستور جاری رکھتا ہوں)

حلیم اور صبور میں فرق:۔

اللہ تعالیٰ کے لئے صبر کا معنیٰ حلم ہے یعنی مستحقین سے عقوبت کی تاخیر خطا کار گناہ کے بعد صبور کے عذاب سے مطمئن نہیں ہوتا، لیکن حلیم کے عذاب سے مطمئن ہوتا ہے۔

ف: خشوع کو کہا گیا کہ تو لوگوں کی امامت کرنا چاہتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ خشوع غصہ پینے کو نہیں کہا جاتا بلکہ خشوع یہ ہے کہ شریف اور کمینہ کو حق میں برابر سمجھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے جو فرض مقرر فرمائے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے پورا خوف دل میں رکھ کر ادا کرنا چاہیے۔ جس نے دل وجان سے خوف خدا نہ کیا اس نے منافقت کا ثبوت دیا۔

ف: حضرت سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ تجھے خشوع کی تکمیل اس وقت ہوگی جب کہ جسم کا ہر بال خوف خدا سے سرشار ہو یہی اعلیٰ درجہ کا خشوع ہے کیونکہ جب دل پر اثر ڈالتا ہے تو اس کا ظہور جسم کے ہر ذرہ پر نمایاں ہوتا ہے پھر وہ جتنا اپنے آپ کو چھپائے نہیں چھپ سکے گا۔ اس کا سرنگوں اور ادب سے بھرپور اور تواضع کا مجسمہ ہوگا۔ سلف صالحین تو ایسے عمل کو چھپانے کی کوشش میں رہتے۔

مسئلہ: خشوع مذموم بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تکلف کر کے رونی شکل بنائے اور سر نیچے رکھے جیسے جاہلوں کی عادت ہے کہ وہ اس طرح کر کے لوگوں کو پھنسانے کی ٹوہ میں رہتے ہیں تاکہ لوگ ہمیں نیک اطوار سمجھیں۔ یہ شیطان کا ایک دھوکہ ہے اور نفس کا ایک مکر ہے۔

ف: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بولتے تو کھلے لفظوں میں اور جب چلتے تو نہایت تیز چلتے اور جب کسی کو سزا دیتے تو سخت ترین اور نہایت درجہ کے عبادت گذار اور صدق کے پتلے اور خشوع سے پُر اور حق کے مظہر تھے۔

(کذافی تفسیر القرطبی)

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے: وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ یعنی نفس کو شہوات اور اس کی خواہش کے

متابعت پر صبر کے ذریعہ مدد طلب کرو۔ وَالصَّلٰوۃِ یعنی بابِ غیب اور بارگاہ رب پر حاضر باشی کا التزام کرو۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ یعنی صبر اور نماز سے استعانت امر عظیم اور سخت ترین شئے ہے۔ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ یعنی ان لوگوں پر سخت نہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی جلوہ گری ہے۔اسی لیے ان کے نفوس قدس اللہ تعالیٰ سے خاشع رہتے ہیں۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:اذا تجلی اللّٰہ شیئا خضع لہٗ ۔جب اللہ تعالیٰ کسی شئے پر جلوہ گری فرماتا ہے تو اسے خضوع نصیب ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا خشوع قلبی تجلی حق مع الحق کا وارث بناتی ہے اور مخلوق سے دوری پیدا کرتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ یعنی وہ لوگ جو تجلی حق کا یقین رکھتے ہیں۔ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ یعنی انہیں یقین ہے کہ انہیں جمال حق کا مشاہدہ نصیب ہوگا۔ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ جذبات حق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور جذباتِ حق کا ایک جذبہ ثقلین کے عمل کے برابر ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ

اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ (کافر کے لئے) کوئی سفارش مانی جائے گی اور

لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ

نہ کچھ لے کر (اس کی) جان چھوڑی جائے اور نہ ان کی مدد ہو۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے

يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ

نجات بخشی کہ تم پر بُرا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں

ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ

تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی (یا بڑا انعام) اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچا لیا

اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ

اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا۔ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے

اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

بچھڑے کو پوجا شروع کر دی اور تم ظالم تھے۔ پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی

ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ

کہ کہیں تم احسان مانو۔ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا

تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ

کہ تم راہ پر آؤ۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی

الْعِجْلَ فَتُوبُوٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ

طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے

عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى

تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔ اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ

اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ

لائیں گے جب تک اعلانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى

اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور انہوں نے کچھ ہمارا نہ بگاڑا ہاں اپنی ہی جانوں کو بگاڑ کرتے تھے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ

اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے داخل ہو

سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں۔ تو ظالموں نے

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ

اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا تو ہم نے آسمان سے

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کی بے حکمی کا۔

ع ۶

تفسیر عالمانہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بنی اسرائیل ذکر کرو یعنی شکر کرو۔ نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ میری ان نعمتوں کو جو میں نے تمہیں عطا فرمائیں۔ مثلاً من و سلوٰی کا نازل کرنا اور بادل کو سایہ بنانا اور پتھر سے پانی نکالنا۔

سوال: یہ انعامات تو ان کے آباؤ اجداد کو ملے ان کو یاد دلانے کا کیا فائدہ؟

جواب: باپ کی شرافت کا اثر بیٹے پر ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ میں نے تمہیں فضیلت دی یعنی فضلت آبائکم (میں نے تمہیں تمہارے آباء و اجداد کو فضیلت دی) نہیں فرمایا، کیونکہ آباء کی فضیلت ہوتی ہے وَ اور یاد کرو۔ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ میں نے تمہیں اہلِ عالم پر فضیلت بخشی۔ یہ عطف الخاص علی العالم ہے۔ صرف ان کی بزرگی کے اظہار کے لئے یعنی میں نے انہیں علم و ایمان اور عمل صالح اور انبیاء اور عاقل بادشاہ بنا کر ان کے ہم زمان لوگوں پر فضیلت دی اور یہ وہی حضرات تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ اقدس میں تھے۔ ان کے بعد والے بھی وہی لوگ مراد ہیں جنہوں نے فساد اور بگاڑ پیدا نہیں کیا اس آیت کی نظیر وہ آیت ہے جو بی بی مریم علیہا السلام کے لئے فرمایا۔ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ تیرے رب نے تجھے تمام عالم سے برگزیدہ فرمایا۔ یعنی تیری ہم زماں عورتوں پر، کیونکہ بی بی خدیجہ اور بی بی عائشہ اور بی بی فاطمہ (رضی اللہ عنہن) ان سے افضل ہیں۔ (صرف مصنف کے خیال کے مطابق، جمہور کے نزدیک توقف بہتر ہے) اسی بنا پر بنی اسرائیل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے فرمایا ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ (تم بہترین امت ہو لوگوں کو نصیحت کے لئے بھیجے گئے ہو) (کذا فی التیسیر)

اس سے معلوم ہوا کہ اَلْعٰلَمِیْنَ استغراقی عرفی ہے حقیقی نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل میں سے جو بھی ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے انہیں دوسرے لوگوں پر فضیلت ہوگی اور انہیں دوہرا اجر ملے گا ایک لحاظ سے کہ وہ اپنے نبی پر ایمان لایا، دوسرا ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے۔

حدیث شریف: حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کو دوہرا ثواب ملتا ہے: ۱۔ جس نے لونڈی خریدی اور اس کی تربیت کر کے اسے مفت آزاد کر دیا اور نکاح بھی کر دیا

۲۔وہ عبد جو اپنے آقا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔

۳۔وہ اہلِ کتاب جو ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہو کر ان کی رسالت کی گواہی دے

ف: امام قشیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی نفوس کی فضیلت کی شہادت دی ہے چنانچہ ان کے متعلق فرمایا: وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو فضل ربی سے تعبیر فرمایا۔ کما قال: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ (فرمایئے! اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے) اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ان کی گواہی دی ان کی نفوس کی وجہ سے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضل کی گواہی دی ہوئی فضل ربی ہے جس فضل میں نفس کو دخل ہو اس پر عجب پیدا ہوتا ہے اور جس فضل میں رب تعالیٰ کی رحمت ہو تو اس میں ایجاب ہوتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

شانِ نزول: یہود کہتے تھے کہ ہم "خلیل اللہ علیہ السلام" کی اولاد سے ہیں اور ہمارا باپ ذبیح اللہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں کی شفاعت ہمارے حق میں قبول فرماتا ہوا ہمیں معاف کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ردّ میں آیت نازل فرمائی:

وَاتَّقُوْا اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ یَوْمًا قیامت کے دن سے یعنی حساب و عذاب کے دن سے۔ یَوْمًا محل کا ذکر کر کے حال کے ارادہ کرنے کے قبیل سے ہے۔ لَّا تَجْزِیْ یعنی اس میں نہ کسی کی کوئی کفایت کرنے والا اور نہ کچھ ادا کرنے والا اور نہ کسی کو بچانے والا ہوگا۔ عائد اس میں محذوف ہے اور یہ جملہ نَفْسٌ کی صفت ہے۔ عَنْ نَّفْسٍ (مؤمن) کافر سے شَیْئًا کسی چیز کا جو اس پر حقوق لازم ہوں گے اس کی نصب مفعول بہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ لفظ نَفْسٌ کو نکرہ لانے میں تعمیم مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ [1] اور یہ نفع بھی کیسے دے سکیں گے جب کہ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ [2] میں حکم عام ہے۔ مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

چوں یفر المرء آید من اخیہ	یہرب المولود من بابیہ
زاں شود بردوست آں ساعت عدو	کہ بت تو بود از رہ مانع او

[1] تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد تمہیں فائدہ نہیں دے گی۔ [2] اس دن مرد اپنے بھائی سے بھاگے گا۔

ترجمہ : یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ قرآن میں آیا ہے کہ بچہ باپ سے بھاگے گا اس وقت دوست دوست کا دشمن ہوگا تیرا باپ راہ حق سے مانع ہے۔

مسئلہ : یہ زجر کفار کے لئے ہے۔ مومن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمایا ہے۔ کما قال : یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ یعنی جو قلب شرک سے خالی ہوگا صرف اسے مال اور اولاد نفع دے گا یعنی قیامت میں۔

وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑانے کے لئے کافر کے حق میں مؤمن کی شفاعت قبول نہیں ہوگی۔ شَفَاعَةٌ شافع اور شفیع کا مصدر ہے۔ شافع و شفیع اسے کہتے ہیں جو دوسرے کی قضائے حاجت کا طلب گار ہو۔ شفیع سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ شخص اپنے نفس کو (جس سے اپنی طلب مراد کر رہا ہے) کا ساتھی بناتا ہے۔

مسئلہ : کافر کے لئے کوئی شفاعت نہیں ہے۔ ہاں مؤمن کی شفاعت ضرور ہوگی۔

حدیث شریف : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میری امت کے اہلِ کبائر کے لئے میری شفاعت ضروری ہوگی۔

مسئلہ : جو آپ کی شفاعت کی تکذیب کرتا ہے اسے شفاعت نصیب نہیں ہوگی۔

قاعدہ : جہاں پر شفاعت کی نفی ہے وہاں کفار مراد ہیں۔

وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا مشفوع لہ سے نہیں لیا جائے گا اور مشفوع لہ سے نفس ثانیہ یعنی عاصی کا رمراد ہے۔ عَدْلٌ فدیہ مال سے یا کوئی دوسرا نفس اس کے عوض یا توبہ جو اسے نار سے نجات دلائے۔ العدل بالفتح شے کا مثل خلاف جنس سے اور (بالکسر) شئے کا مثل اس کی جنس سے اور فدیہ کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ وہ اس کے مساوی اور اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا اور نہ اس وقت ان کے لئے کوئی نافع ہوگا اور نہ شافع اور نہ دافع۔

سوال : ضمیر جمع اور پھر مذکر کی کیوں حالانکہ پہلے نفس کا لفظ مستعمل ہو رہا ہے۔ جو واحد مؤنث ہے؟

جواب : نفس ثانیہ نفی کے تحت واقع ہے جو نفوس کثیرہ پر دال ہے اور چونکہ نفس سے مراد عباد اور انسان مراد ہیں بنا بریں جمع کا صیغہ لایا گیا۔

فائدہ: یہاں پر نصرۃ معونۃ سے عام ہے۔ کیونکہ نصرۃ صرف دفع ضرر سے مخصوص ہے اور معونۃ عام ہے۔ یہ آیت غایت بلاغت میں ہے۔ کیونکہ اس میں ان تمام وجوہ کو جمع کرلیا ہے کہ جن سے انسان دنیوی مصیبتوں سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ چار ہیں:

۱۔ اپنے بوجھ اٹھانے کے لئے دوسرے کو قائم مقام مقرر کردے۔

۲۔ مال دے کر آئی مصیبت سے بچ جائے۔

۳۔ کوئی شخص اس کا سفارشی ہوا جو سفارش کرکے اسے چھوڑا لے۔

۴۔ کوئی مددگار مدد کرکے عذاب سے بچالے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے تمام وسائل سے کفار کو ناامید کردیا۔

روایت بطرز حکایت: حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص قیامت میں اپنے لڑکے کو لپٹ کر بولے گا۔ اے میرے پیارے بیٹے! میں دنیا میں تیرا باپ تھا آج مجھے تیری نیکیوں میں سے صرف رتی برابر ایک نیکی کی ضرورت ہے۔ براہ کرم مجھے دیدے تاکہ میں اس مصیبت سے بچ جاؤں۔ لڑکا جواب دے گا جس طرح آج تجھے خطرہ ہے مجھے بھی ہے لہٰذا مجھ سے دور ہو میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا۔ پھر وہ شخص اپنی زوجہ سے جاکر کہے گا: اے فلانی! دنیا میں تیرا شوہر تھا۔ وہ عورت اسے دیکھ کر اس کی بہت تعریف کرے گی۔ مرد کہے گا: مجھے تیری ایک نیکی درکار ہے، براہ مہربانی ایک نیکی دیدے۔ وہ عورت جواب دے گی کہ اس خوف سے تو میں بھی کانپ رہی ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى یعنی جس پر گناہوں کا بھاری بار آپڑے گا تو اس سے اس کا گناہ کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

[1] برفتند ہر کس درود آنچہ کشت	نماند بجز نام نیکو و زشت
ہر آں خورد سعدی کہ بیخ نشاند	کسے بردخرمن کہ تخمے فشاند

---

[1]: ۱۔ ترجمہ۔ لوگ گئے اور اٹھائیں گے وہی جو بویا دنیا میں یا نیک نامی رہی یا بدنامی۔ ۲۔ اے سعدی! جیسا بیج بویا وہی اٹھائے گا خرمن وہی اٹھائے گا جو بیج بوئے گا۔

تفسیر صوفیانہ

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اس کا ظاہر عام ہے لیکن اس باطن خاص ہے۔اس کا تعلق اس قوم سے ہے جو بنی اسرائیل سے تھی۔اللہ تعالیٰ نے بھلائی جان کر انہیں پوشیدہ طور پر اپنا خطاب سنایا۔جس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کیا جو ان کو عطا ہوئی اور نور کے قطرات کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کی۔جب کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو ظلمت میں پیدا کیا تو پھر اس پر اپنے نور سے قطرات ڈالے اس کی برکت سے انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لایا۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: ''جسے اس نور سے قطرہ نصیب ہوا اسے ہدایت نصیب ہوئی اور جو اس سے چوک گیا وہ بہک گیا''

وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ اس نعمت کی بدولت یعنی میں نے تمہیں حضرات کے ساتھ رفاقت کی فضیلت عطا فرمائی جن پر میرا انعام ہے یعنی انبیاء و صدیقین و شہداء و صالحین بسبب اس نعمت کے جو اس وقت نور کے قطرہ کے عطا ہوئی اور فضیلت ان لوگوں پر ہے جن کو وہ قطرہ نصیب نہیں ہوا۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا یعنی اس دن کے عذاب سے ڈرو کہ جس سے عوام کو اپنے افعال سے ڈراتا ہے جیسا کہ فرمایا: فَاتَّقُوا النَّارَ الخ اور خواص کو اپنے صفات سے، جیسا کہ فرمایا: اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ بیشک ہم جانتے ہیں اسے جو وہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں اور فرمایا: لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ اور سچوں سے ان کے صدق کے متعلق سوال فرمائے گا اور خاص الخاص کو اپنی ذات سے جیسا کہ فرمایا: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ اور فرمایا: اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اور اللہ تعالیٰ سے مکمل طور ڈرو۔

لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ کیونکہ اس دن امر صرف اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ صرف اسی کے حق میں نہ اس کے غیر کے لئے اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر جیسا کہ فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

ترجمہ: کون ہے جو اس کے ہاں سفارش کرے سوا اس کی اجازت کے۔

تفسیر عالمانہ

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ یعنی کوئی فدیہ کیونکہ انسان کو صرف اپنی کمائی ہی ملے گی اور اپنی سعی کو خود ہی دیکھ لے گا اور اسے پتہ چلے گا۔آج کس کی سعی قبول ہے۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ کیونکہ انہوں نے حق کی امداد نہ کی۔اس لیے ان کی مدد نہ کی جائے گی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ اگر اس کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے یعنی یاد کرو جب کہ ہم نے تمہیں یعنی تمہارے آباء کو نجات دی۔ کیونکہ پہلے لوگوں کو نجات دینا پچھلے لوگوں کو نجات دینا ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: قتلنا یوم عکاظ (عکاظ کے دن ہمارے آباء نے تمہارے آباء کو قتل کیا) اور نجوی دراصل اس مکان کو کہتے ہیں جو زمین سے اونچا ہو کیونکہ جو شخص اس پر مکین ہوتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ اب ہر فائز کو ناجی کہتے ہیں، کیونکہ وہ تنگی سے نکل کر فراخی میں جا پہنچتا ہے۔ یعنی ہم نے تمہارے آباء کو ایک محفوظ مکان میں کر دیا اور ایذاء سے اٹھالیا۔ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ فرعون اور اس کے متبعین اور اس کے اہلِ دین سے۔ فِرْعَوْنَ دراصل عمالقہ کے بادشاہوں کا لقب ہے جیسے کسریٰ فارسیوں کے بادشاہوں کا اور قیصر روم کے بادشاہوں کا اور خاقان ترکوں کا اور نجاشی حبشہ کا تبع اہل یمن کا لقب ہوتا ہے۔

ف: عمالقہ ایک جابر قوم تھی جو لاؤ بن ام بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھی۔ ان میں شام کے ساکنین کو جبابرہ اور مصر کے بادشاہوں کو فراعنہ سے تعبیر کیا جاتا۔ جو سرکشی کرتا ہو اسے کہتے ہیں: تفرعن الرجل یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ سرکش اور متمرد ہو جائے۔ یہاں پر استغراق یعنی عموم نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو مصر میں رہتے تھے۔

فرعون کی مختصر سوانح:

موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کا نام ولید بن مصعب بن الریان تھا۔ قبطیوں میں سے تھا۔ اس نے چار سو سال عمر گذاری منقول ہے کہ وہ اصفہانی عطار تھا۔ اس پر قرض غالب آ گئے۔ تنگ آ کر اپنے اصلی مسکن کو چھوڑ کر شام میں چلا گیا۔ وہاں بھی اسے آسانی میسر نہ ہوئی۔ پھر مصر میں جا بسا۔ وہاں کی ایک الٹی چال دیکھی کہ گاؤں میں تو سالم بوری تربوز کی صرف ایک درہم میں دستیاب ہو جائے لیکن بازار میں صرف ایک درہم سے ایک تربوز بکتا تھا۔ دل میں خیال کیا کہ اس طریق سے میرا قرض بہ آسانی ادا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ گاؤں سے ایک بوری ایک درہم میں خریدی۔ راستہ میں ایک ایک درہم میں خریداروں کو بیچتا جاتا پھر بازار میں ایک ایک درہم میں ایک ایک تربوز بیچتا۔ اسی طرح کئی روز کرتا رہا۔ لیکن شہریوں وغیرہ کو دیکھا کہ بھولے بھالے ہیں کسی کو کسی سے خطرہ نہیں اور نہ ہی وہ سیاسی امور سے واقف ہیں۔ اچانک شہر میں وباء پھیلی موت بکثرت واقع ہونے لگی۔

گورستان میں جا بیٹھا اور اہل اموات سے کہتا کہ قبرستان میں میت دفن کرنے کی اجازت نہیں جب تک پانچ درہم تاوان نہ ادا کرو۔ چنانچہ ہر ایک نے بغیر سوچے تاوان ادا کر دیا اور کئی عرصہ تک ادا کرتے رہے اور اس کے پاس تین، ماہ کے عرصہ تک ادا کرتے رہے اور اس کے پاس تین ماہ کے عرصہ میں بہت دنیا جمع ہو گئی کوئی بھی اسے پوچھنے والا نہیں تھا۔ بالآخر ایک روز اسی شہر کے لوگ آئے اور حسب دستور ان سے تاوان مانگا۔ انہوں نے انکار کیا اس نے بھی ضد کی۔ آخر بادشاہِ مصر (جس کا لقب فرعون تھا) اس تک نوبت پہنچی اسے بلایا گیا۔ اس نے کہا تمہیں کس نے تاوان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اس نے کہا: مجھے کسی نے مقرر نہیں کیا اور نہ ہی مجھے یہ دنیا درکار ہے یہ بہانہ اس لیے کیا کہ کسی طرح میں آپ کے ہاں بلایا جاؤں اور حاضر ہو کر آپ کو آگاہ کروں کہ آپ کی قوم بڑی نااہل ہے اور تو ان سے بالکل بے خبر ہے۔ دیکھئے! یہ مال میں نے اسی معمولی ڈھنگ سے جمع کر لیا ہے۔ لیجئے! یہ آپ کا ہے لیکن مجھے اپنی سلطنت کا متولی مقرر کر دیجئے۔ میں نہایت دیانت داری و وفاداری سے کام کروں گا۔ چنانچہ اس نے تمام امور اس کے سپرد کر دیئے۔ اس نے ایسی احسن کارکردگی دکھائی کہ لشکر کے مصالح نہایت منتظم ہو گئے اور رعیت کا حال بھی بالکل ٹھیک ہو گیا۔ ان میں کافی عرصہ رہا عدل و انصاف میں بے نظیر ثابت ہوا یہاں تک کہ وہاں کا بادشاہ مر گیا۔ اس کے بعد سلطنت کا مالک اسی کو قرار دیا گیا۔ پھر جس عروج کو وہ پہنچا دنیا جانتی ہے۔

ف: حضرت یوسف علیہ السلام کے فرعون کا نام ریان تھا لیکن اس فرعون اور موسوی فرعون کے مابین چار سو سال سے کچھ زائد عرصہ کا فاصلہ ہے۔ **يَسُومُونَكُمْ** تم سے طلب کرتے۔ **سُوٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ** برا عذاب اور سب سے زیادہ قبیح بہ نسبت دیگر امور کے اس کا تمہارے لیے ارادہ کرتے اور اعمال شاقہ کا مکلف بناتے، تمہیں عذاب چکھاتے اور اسی پر مداومت کرتے۔ **يَسُومُونَكُمْ** سام السلعة سے ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب سامان طلب کرے اور "سوم" بمعنیٰ یبغی ہے۔ بلاواسطہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے اسی لیے **سُوٓءَ الْعَذَابِ يَسُومُونَكُمْ** سے منصوب اور مفعول بہ ہے اور جملہ **نَجَّيْنَٰكُم** کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔ اب معنیٰ یہ ہے: تم اقبح عذاب کے لئے طلب کیے گئے تھے۔ اس کی نظیر اہلِ عرب کا وہ قول ہے جو کہتے ہیں: رایت زید یضربه عمر۔ یعنی میں نے زید کو اس حال میں دیکھا کہ وہ عمرو کا مضروب تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے انہیں خادم اور نوکر بنا رکھا تھا۔ بعض ان میں سے اس کے ملازم اور بعض ان سے مکانات کے معمار اور بعض ان میں سے کسان تھے جو کھیتی باڑی کرتے اور بعض ان میں سے اس کی ہر وقت خدمت میں رہتے اور جو کوئی خدمت نہ کرتا اس سے جزیہ لیا جاتا۔

ف: حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل فرعون کی مختلف خدمات پر متعین تھے۔ جو بہت بڑی قوت والے ہوتے وہ پہاڑوں کو کھود کر چٹانیں سر پر اٹھا کر لاتے یہاں تک کہ ان کی گردنیں اور ہاتھ زخمی اور ان کی پیٹھیں پھٹ گئیں اور بعض ان میں سے وہ تھے جو پتھر اور گارا اٹھا کر مکانات کی تعمیر کرتے۔ بعض ان میں سے وہ تھے جو کچی اینٹیں تیار کر کے پھر انہیں پختہ کرتے۔ بعض ان میں سے درودگر تھے۔ بعض لوہار اور جو کمزور تھے وہ روزانہ جزیہ ادا کرتے۔ اگر سورج ڈوبنے سے پہلے نہ ادا کر سکتے تو ان کے ہاتھ گردن سے منہ تک باندھے جاتے اور ان کی عورتوں سے چرخہ کا کام لیا جاتا اور کاتنے کے بعد وہ سوت بنتیں۔

ف: بعض کہتے ہیں: یَسُوْمُوْنَكُمْ کی تفسیر یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ ہے۔ گویا انہوں نے کہا: فرعونی کون سا عذاب ہم پر کرتے۔ تو جواب میں فرمایا: یُذَبِّحُوْنَ الــخ یعنی انہیں مار ڈالتے تھے اور تشدید تکثیر کے لئے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ **فتحت الابواب** اور ابناء سے مراد صرف مذکر نہیں۔ اگرچہ یہ لفظ نر و مادہ دونوں کے لئے بولا جاتا ہے جیسا کہ لفظ بنین یا بنی اسرائیل سے معلوم ہوتا ہے اور ابناء سے مراد لڑکے ہیں اور وہ بھی چھوٹے نہ بڑے۔ کیونکہ وہ صرف چھوٹوں کو ذبح کرتے تھے۔ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ لڑکیوں سے سبقت کر جاتے یعنی انہیں زندہ چھوڑتے۔

سوال : یہاں پر نِسَآءَ کیونکہ بولا گیا ہے حالانکہ نساء بڑی عورتوں کو کہتے ہیں اور یہاں پر چھوٹی لڑکیاں مراد ہیں؟

جواب : مال وانجام کے اعتبار سے نِسَآءَ بولا گیا ہے۔ کیونکہ جب انہیں زندہ چھوڑا گیا تو وہ لامحالہ بڑی ہی ہوئیں۔ علاوہ ازیں وہ لڑکیوں سے درگذر کرتے تو ان کی مائیں بھی بچ جاتیں اور قاعدہ ہے کہ اختلاط کے وقت بڑی اور چھوٹی دونوں پر لفظ نِسَآءَ بولا جاتا ہے۔

فرعون کے ظلم کا آغاز: ۔ فرعون نے خواب میں ایک آگ کو دیکھا کہ بیت المقدس سے آئی ہے اور مصر کو

احاطہ کرتے ہوئے قبطیوں کو مصر سے نکال لیا، لیکن بنی اسرائیل کو کچھ نہ کہا۔ یہ بات اسے بہت خوفناک معلوم ہوئی۔ کاہنوں اور جادوگروں سے تعبیر پوچھی۔ انہوں نے کہا: بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو تمہاری ہلاکت کا موجب ہوگا اور تمہارا ملک تم سے چھین لے گا۔ اس پر فرعون نے ہر بنی اسرائیل کے نومولود بچے کو مار ڈالنے کا حکم دیدیا اور شہر کی ہر دایہ کو بلایا اور کہا کہ بنی اسرائیل کے ہر نومولود بچے کو مارتی جاؤ اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑتی جاؤ۔ انہوں نے حکم بجالایا۔ حتیٰ کہ اس نومولود یعنی موسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کے ارادہ پر بارہ ہزار زندہ موجود اور نوے ہزار نومولود لڑکے مارے گئے۔

ف: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان تمام لڑکوں کی قوت دی گئی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان سب کی قوت اور موسیٰ علیہ السلام کی قوت برابر ہوتی۔ اسی وجہ سے ان کے معجزات میں ایک معجزہ ان کا زوربازو بھی تھا۔ بہرحال ادھر لڑکوں کی کثرت خون ادھر بڑے بڑے مرنے لگے۔ قبطیوں کے سردار فرعون کے پاس پہنچے اور کہنے لگے: بڑوں کو موت فنا کر رہی ہے اور چھوٹوں کو تو مروا رہا ہے۔ عنقریب یہ تمام امور ہمارے سروں پر آجائیں گے فرعون نے یہ سن کر حکم جاری کر دیا کہ ایک سال بچوں کو مارو اور ایک سال زندہ رہنے دو۔

جس سال کے بچے زندہ رکھے جاتے تھے ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور جس دوسرے سال مارے جاتے تھے موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قضا ان کی کوشش پر غالب آگئی چنانچہ فرعون نے کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ قضا سے سبقت کر جائے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادہ کی تکمیل فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام بچ ہی گئے۔ وَفِي ذٰلِكُم یہ اشارہ ذبح اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کی طرف ہے۔ بَلَآءٌ مشقت اور بلاء اور لڑکیوں کو زندہ رکھنا ان کے لئے تکلیف اور بلاء تھی۔ باوجودیکہ بظاہر معافی اور ترک عذاب تھا کیونکہ بعد میں انہیں لونڈیاں بنایا جاتا اور بہت بڑے مشقت بھرے امور میں انہیں لگایا جاتا۔ یا اس لیے کہ نرینہ اولاد کے قتل ہونے کے بعد لڑکیوں کے بچ جانے میں آباء کے لئے مصیبت عظیم تھی۔ مِنْ رَّبِّكُمْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا تم پر مسلط ہو جانا عَظِيْمٌ بلاء کی صفت ہے اور دونوں کا نکرہ ہونا تفخیم کے لئے ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذٰلِكُم کا اشارہ فرعون سے نجات دینے کی طرف ہے اور بَلَآءٌ بمعنی نعمت ہو کیونکہ دراصل بَلَآءٌ آزمائش کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی نعمت دے کر آزمائش کرتا ہے تاکہ بندے شکر کریں۔ پھر وہی آزمائش عطیہ اور نعمت

ہو جاتی ہے اور کبھی مصائب کے ساتھ آزماتا ہے تاکہ صبر کریں پھر وہی آزمائش محبت ہو جاتی ہے اور آزمائش خیر وشر دونوں میں ہوتی ہے۔ کما قال تعالیٰ: وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ الخ ہم تمہیں خیر وشر سے آزماتے ہیں۔
مِنْ رَبِّكُمْ میں اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھیج کر اور انہیں توفیق دے کر تمہیں فرعون سے نجات دیں گے

تفسیر صوفیانہ آلِ فرعون سے نجات میں نفس امارہ سے نجات دینے کی طرف اشارہ ہے اس سے نجات کا یہ مطلب ہے کہ اس کے صفات ذمیمہ اور اخلاق رذیلہ سے نجات ملی۔ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یعنی روح کے صفات روحانیہ حمیدیہ کو ذبح کر کے ان کی خدمات بجالانے کے لئے قدرت حیوانیہ کے اعمال میں اس کے بعض صفات جلیلہ کو باقی رکھنا اور صفاتِ ذمیمہ سے نجات پا جانا سوائے اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''تم میں کسی کو عمل نہیں نجات دلانے کا'' صحابہ کرام نے عرض کی: حضور! آپ بھی۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں، میں بھی لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل میں لے لیا ہے۔
وَفِيْ ذٰلِكُمْ یعنی نفس صفات کا غلبہ روح وقلب پر بلاء عظیم بڑا امتحان ہے۔ خیر وشر میں بڑا امتحان ہے جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور اس کے حال کو بہتر بنا دے تو اسے نجات دینے میں لطف فرماتا ہے اور وہ نجات پا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ گمراہ اور رسوا کرے تو وہ زمین میں رہ کر نفس کی اتباع کرتا ہے پھر اس کا انجام برا ہوتا ہے۔
سبق: آیت میں تنبیہ ہے کہ بندہ کو جو دکھ اور سکھ پہنچے تو وہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش سمجھے۔ اسے چاہئے کہ راحت میں شکر اور مصیبت میں صبر کرے۔
حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اگر

بلطف بخوانی مزید الطافست[1] وگر بقہر برانی درون ما صاف است

اور اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ ہے کہ اپنے بندوں کو اپنی عبادت کی طرف رزق فراخ اور دائمی عافیت دے کر بلاتا ہے تاکہ اس کی طرف اس کی نعمت سے رجوع کریں۔ پس اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر انہیں دکھ اور سکھ میں مبتلا کرتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف راجع ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ اس کے بندے اس کی طرف طوعاً یا

۱۔ اگر لطف سے بلاؤ تو بڑی مہربانی، اگر ہٹا دو تو بھی ہمارا دل صاف ہے۔

کر ھا رجوع کریں۔ لیکن پہلا طریقہ احرار کا ہے اور طریقہ ثانی اغیار کا۔

حکایت: داؤد بن رشید جو کہ محمد بن حسن کے تلامذہ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ میں ایک رات نماز کے قیام میں تھا کہ سردی نے آن گھیرا میں اپنی مفلسی پر رو پڑا۔ آخر مجھے نیند آ گئی۔ خواب میں مجھے کوئی کہہ رہا ہے: اے داؤد! ہم نے تجھے قیام کی توفیق دی اور دوسروں کو نیند دیدی۔ اس کے بعد داؤد بن رشید رات کو کبھی نہ سوتے تھے۔ (کذا فی روضۃ الاخیار)

مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

در دو چشم داد حق تا من زخواب	بر جہم در نیم شب با سوز و تاب
در دہا بخشید حق از لطف خویش	تا نخسم جملہ شب چو گاؤ میش

حدیث شریف: مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں میں سے کسی ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا: میں نے اپنے بندے پر بلاء نازل فرمائی ہے اس پر اس نے مجھے پکارا۔ لیکن میں نے اس میں تاخیر کی جس پر وہ شکایت کرنے لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں اے میرے بندے! میں اس سے اور کس طرح رحم کروں۔

نسخہ روحانیہ: اگر کوئی تکلیف سے یہ سمجھے کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ کا لطف دور ہو گیا ہے تو وہ نہایت غلطی کا شکار ہو گیا عقلاً بھی عادتاً بھی اور شرعاً بھی۔ عقلاً تو اس طرح کہ عقل کے امکان میں ہے کہ اس سے بہت بڑی مصیبت میں اپنے بندے کو مبتلا کر دے اور آخرت میں کافر کو اس سے کہیں اور زیادہ عذاب دے تو وہ قادر ہے جب وہ اتنی بڑی قدرت والے نے بڑے عذاب یا مصیبت سے بچا کر معمولی میں مبتلا کیا ہے تو یہ بھی اس کی نوازش ہے اس سے زیادہ دکھ پہنچاتا تو اس سے کون پوچھتا اور عادتاً اس طرح کہ ہر دکھ اور تکلیف کا انجام نیک ہوتا ہے اور یہ بھی ہے کہ اسے دوسری بڑی مصیبت میں مبتلا نہیں کیا گیا۔ مثلاً جو جذام میں مبتلا ہے وہ نابینائی کی مصیبت سے اچھا ہے۔ اگر دونوں میں مبتلا ہو جائے تب بھی فقر و افلاس کا تو شکار نہیں اور اگر فقر و افلاس بھی گھیر لے تب بھی اسے خوش ہونا چاہئے کہ اس کا دین تو محفوظ ہے اور شرعاً اس طرح کہ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ اپنا محبوب بناتا ہے تو اسے کسی مصیبت میں

مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر وہ اس پر صبر کرتا تو اس پر راضی ہوتا ہے، تو اسے اپنے خاص بندوں میں داخل فرمالیتا ہے۔

سبق: مصیبت میں گرفتار بندے کو یہ بات معمولی نہ سمجھنی چاہیے کہ اسے مصیبت میں کس نے مبتلا کیا اور پھر اس پر جو اس نے عطیات اور اجر و ثواب مقرر فرمایا ہے اس کے مقابلے میں یہ دکھ درد کیا حقیقت رکھتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَاِذْ فَرَقْنَا اور یاد کرو اے بنی اسرائیل! جب کہ ہم نے بِكُمُ تمہاری نجات کے لئے دریا کو چیرا۔ باء سببیت کی ہے اور یہی اولیٰ ہے۔ کیونکہ یہاں پر اپنے احسانات و انعامات شمار فرما رہے ہیں اور سببیت میں ان کی تعظیم بھی ہے اور یہ بھی منجملہ انعامات کے ہے اور بعض کہتے ہیں: بـاء بمعنیٰ لام کے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ میں ہے۔ الْبَحْرَ دریائے قلزم مراد ہے جو فارس کے دریاؤں میں سے ایک دریا ہے۔ یا کوئی اور دریا تھا جس کا نام اساف ہے یہاں تک کہ اس میں بنی اسرائیل کے اسباط کی گنتی کے مطابق بارہ راستے ہو گئے۔

ف: سبط پوتے کو کہتے ہیں اور اسباط بنی اسرائیل میں عرب کی طرح قبائل کو کہا جاتا ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔

فَاَنْجَيْنٰكُمْ یعنی تم کو کنارے لگا کر غرق نہ ہونے دیا۔ وَاَغْرَقْنَا غرق بہنے والی شئے میں ڈوبنے کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح رسوب چنانچہ اہلِ عرب کہتے ہیں:

رسب الشئی فی الماء رسوبا۔ یہ اس وقت ہیں جب کہ کوئی چیز پانی میں نیچے ہو جائے۔ الاغراق بمعنی پانی میں ہلاک کرنا۔ اٰلَ فِرْعَوْنَ فرعون اور اس کی قوم مراد ہے۔ کیونکہ اس میں وہی داخل ہوئے اور یہی مراد لینا اولیٰ ہے۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ تم آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جب تم دریا میں چلے تو وہ پھٹ گیا اور جب وہ آئے تو دریا ان پر بہہ چلا اور تم بسلامت پار کنارے لگ گئے اور تم دیکھ رہے تھے کہ ان کے مردے غرق ہو کر دریا کے کنارے سے باہر نکالے جا رہے تھے۔

ف: امام قرطبی فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا تو بنی اسرائیل کہنے لگے: اے موسیٰ علیہ السلام! ہمارے قلوب تاہنوز مطمئن نہیں کہ فرعون غرق ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا کہ فرعون کو باہر پھینک دو۔

فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے کا مختصر حال: مروی ہے کہ جب فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ اپنی قوم کو رات کے وقت مصر سے لے چلیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام کو رات کو چلنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ قبطیوں سے زیورات عاریۃً لے لیں۔ لیکن جب نکلیں تو ایک دوسرے کو بلائیں نہیں اور صبح سے پہلے تک منتظر رہیں اور جب نکلیں تو اپنے گھروں کے دروازوں کو خون سے آلودہ کر کے چلیں تا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ بنی اسرائیل اپنے گھروں سے چل چکے ہیں۔ چنانچہ رات کا نکل چلے۔ اس وقت وہ چھ لاکھ اور بیس ہزار جنگی تھے۔ بیس سال کے لڑکے اور ساٹھ سال کے بوڑھے ان کے علاوہ تھے۔ قبطی اس سے بے خبر تھے اور ان پر موت واقع ہوگئی اور وہ مردگان کے دفن میں مصروف ہوئے جس سے ان کی طلب میں رک گئے۔

مزار یوسف علیہ السلام:۔

بنی اسرائیل جب رات کو چلے تو آگے جنگل میں جا کر راستہ بھول گئے اور انہیں پتہ نہ چل سکا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے بوڑھوں کو بلا کر سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو اپنے بھائیوں سے وعدہ لیا کہ جب مصر سے باہر نکلو تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔ اس وجہ سے راستہ بندر ہے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: ان کا مزار کہاں ہے؟ ان کے مزار کا علم سوائے ایک بڑھیا کے کسی کو نہ تھا۔ اس بڑھیا سے دریافت کیا گیا۔ تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی: اگر میں بتا دوں تو کیا میری منہ مانگی بات مان لو گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ سے پوچھتا ہوں جیسا کہ فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معاملہ پیش کیا تو حکم ہوا کہ اسے کہہ دیجئے کہ تیرا سوال پورا کیا جائے گا۔ بوڑھی نے کہا: میں ایک طویل عمر بوڑھی ہوں چل نہیں سکتی مجھے ایک سواری عطا ہو اور مصر سے مجھے بھی نکال لے چلو۔ یہ تو دنیاوی سوال ہے اور آخرت میں یہ چاہتی ہوں کہ جہاں تیری قیام گاہ ہو میں تیرے ساتھ رہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تیرے سوال دونوں پورے کیے جائیں گے۔ بوڑھی نے کہا: یوسف علیہ السلام کی مزار دریائے نیل کے اندر ہے۔ دعا فرمایئے! اس سے پانی ہٹ جائے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی اور ساتھ یہ بھی عرض کی کہ طلوع فجر نہ ہو جب تک کہ ہم یوسف علیہ السلام کا مزار

تلاش کر کے انہیں ساتھ نہ لے چلیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ کو کھدوا کر قبر سے صندوق مبارک (جو صنوبر کا تھا) نکال لیا۔

ف: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کا صندوق دریا کی موج سے اللہ کی دی ہوئی توفیق سے نکالا۔ یہ وہ پہلا علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا اور سب سے پہلے یہ علم حضرت آدم علیہ السلام کو عنایت ہوا پھر تو راثاً عطا ہوتا رہا۔ آخر یوسف علیہ السلام کے صندوق کو اٹھایا گیا اور شام میں جا کر دفن کیا گیا۔ اس کے بعد ان پر راہ کھل گئی اور چل پڑے۔ حضرت ہارون علیہ السلام قوم کے آگے اور موسیٰ علیہ السلام قوم کے پیچھے پیچھے۔ [1] جب فرعون کو علم ہوا تو قوم کو جمع کر کے بنی اسرائیل کے تعاقب کو نکلا۔ ان سب کے آگے والے لشکر (جو کہ ستر لاکھ تھا) میں ہامان کو بھیج کر روانہ کیا کہ جس میں تمام گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان میں کوئی مادہ گھوڑی نہ تھی اور ہر ایک کے سر پر خود اور ہاتھ میں تلوار تھی۔ ادھر بنی اسرائیل چل کر جب دریا کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ دریا اپنی پوری طغیانی میں تھا۔ یہاں تک کہ فرعون کا لشکر قریب آ گیا۔ اشراق کا وقت تھا فرعون نے بنی اسرائیل کو دیکھ کر اپنی جماعت سے کہا: یہ تو بہت قلیل جماعت ہے۔ ادھر بنی اسرائیل فرعونیوں کو دیکھ کر گھبرائے اور حیرانگی میں موسیٰ علیہ السلام کو کہنے لگے: اے موسیٰ علیہ السلام! تم ابھی پیدا نہیں ہوئے تو بھی ہم دکھ میں تھے اور اب تمہاری پیدائش کے بعد بھی ہمیں تکلیف سے نجات نہیں، کیونکہ ہمارے دریا آگے ہے اگر آگے بڑھیں تو ڈوبتے ہیں اور پیچھے فرعون ہمارے قریب آ پہنچا ہے جو ہمیں مارے بغیر نہیں رہے گا۔ اب کیا کیا جائے؟ بتایئے تمہارے رب کا وعدہ کہاں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: گھبرایئے مت۔ میرا رب عنقریب اور ضرور بالضرورت کوئی راہِ نجات نکالے گا۔ ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ انہوں نے عصا مارا لیکن کچھ نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے پھر حکم ہوا کہ اب مارو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے عصا بھی مارا اور کہا: راستہ دیجئے اے ابو خالد! اتنا کہنے پر دریا پھٹ دیا اور اس میں بارہ راستے بن گئے اور ہر راستہ پہاڑ

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قوم کے پیچھے پیچھے چلنے کا مقصد یہ تھا کہ قوم کو پیچھے سے تعاقب کرنے والوں کا خطرہ تھا اس لیے اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہر وقت اور سب سے پہلے نفس بہ نفس تیار رہے۔ کاش! آج کل کے رہنما اس اصول کو سمجھیں اور اپنائیں۔ (اویسی غفرلہٗ)

برابر تھا اور ہر ایک علیحدہ علیحدہ بارہ قبیلوں کے لئے، جن پر وہ لوگ گذرے۔ دریا پھٹنے پر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو چلنے کا حکم دیا اور دھوپ تیز کردی جس سے وہ بالکل خشک ہو گئے۔ بنی اسرائیل اس میں کود پڑے۔ لیکن ہر ایک کے راہ کے آگے پہاڑ کے برابر پانی حائل ہو گیا جس سے ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکتے تھے کہنے لگے: کیا بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بھائی مارے گئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: چلو وہ بسلامت چل رہے ہیں۔ ان کا راستہ بھی تمہارے جیسا ہے۔ لیکن انہوں نے نہ مانا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا اللہ! تو ان کی بری عادتوں کو دیکھ رہا ہے۔ جس طرح کہتے ہیں اسی طرح کردے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ اپنا عصا دائیں بائیں دریا کے پانی میں مارو۔ چنانچہ ایسا کرنے پر ہر ایک قبیلہ کے مابین چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہو گئیں۔ (سوراخوں کی طرح) جن سے وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر باتیں سن رہے تھے اسی طرح چلتے چلتے آخر کار دریا کو عبور کر گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم دریا سے پار ہو گئی تو فرعون کا لشکر دریا کے کنارے آپہنچا اور دیکھا پہاڑ پھٹا ہوا تھا۔ فرعون لشکر کو کہنے لگا: دیکھو! یہ میرے خوف سے پھٹ گیا ہے قوم نے کہا: اگر تو خدا ہے تو دریا میں چل جیسے موسیٰ علیہ السلام چلے۔ فرعون سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور لشکر میں کسی کی بھی مادہ گھوڑی نہ تھی۔ جبریل علیہ السلام ایک تیز رو گھوڑی پر سوار ہو کر آگے سے گذرے فرعون کے گھوڑے نے اس کی بو سونگھی اور پیچھے دوڑا۔ جبریل علیہ السلام دریا میں چلے گئے اور فرعون کا گھوڑا بھی چلا آیا۔ فرعون نے بہت روکا مگر وہ نہ رکا۔ گھوڑا دریا میں کود پڑا۔ قوم نے فرعون کو دریا میں جاتے دیکھ کر اپنے گھوڑے پیچھے پیچھے کر لیے اور وہ جبریل علیہ السلام نہ دیکھ سکا اور میکائیل علیہ السلام ایک اور گھوڑے پر ان سب کے پیچھے تمام قوم کو ہانکتے ہوئے دریا میں لائے یہاں تک کہ ایک بھی باقی نہ رہا۔ سب کے سب دریا میں کود پڑے۔ ادھر فرعون کا لشکر تمام داخل ہوا ادھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم دریا سے باہر نکلی فرعون کا پہلا لشکر دریا سے باہر نکلنے والا تھا کہ دریا موج مارتا ہوا ان سب کو ڈبو گیا۔

فرعون نے ڈوبتے وقت کہا: ''میں مانتا ہوں کہ معبود وہی ایک ہے اور میں ایمان لایا ہوں اس معبود پر جس پر بنی اسرائیل نے ایمان لایا اور میں سچا پکا مسلمان ہوں'' ادھر بنی اسرائیل دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ اب فرعون باہر آکر ہمیں قتل کردے گا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے چھ سوبیس ہزار افراد دریا سے باہر نکلے جن کے سروں پر لوہے کے زنجیر جکڑے ہوئے تھے اور فرعون کی لاش بھی باہر پھینکی گئی۔ جس کو دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سرخ بیل ہے۔ اس کے بعد ڈوبے کو پانی سے ظاہر کر دیا۔ یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا ایک بہت بڑا معجزہ تھا اور ان کی نعمت کے لئے ادائیگی شکر کا موجب تھا۔

نبی علیہ السلام کا علمِ غیب اور معجزہ:

بعینہٖ یہی قصہ ہمارے نبی علیہ السلام کا معجزہ جلیلہ ہے کہ اس سے ہر منکر کا دل اور عقل مند کی عقل مطمئن ہو سکتی ہے۔ انہیں چاہیے کہ بطیب خاطرا سے قبول کریں، کیونکہ ہمارے نبی علیہ السلام نے باوجودیکہ آپ امّی تھے خبر دی۔ حالانکہ آپ نے کسی کتاب سے پڑھا اور نہ ہی کسی سے سنا۔ یہ ایک غیب ہے، جس کا اہلِ عرب کو علم نہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی خبر دینا دلیل ہے کہ آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور یہی بات نبوت کی پختہ علامت ہے۔

ف: جس طرح بنی اسرائیل کے اسلاف اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود دریا سے نجات پا جانے کے بعد بچھڑے کی پرستش میں مبتلا ہو گئے اور بعد میں سادات انبیاء ورسل علیہم السّلام کو قتل کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان کیا لیکن احسان کا بدلہ عجیب دیا کہ نافرمان ہو گئے۔ دین سے دور جا پڑے اور بُرے اخلاق کے خوگر ہو گئے اسی طرح ان کے اسلاف کا حال ہے کہ وہ واقعہ صحیح ماننے کے باوجود اثر پذیر نہ ہوئے بلکہ الٹا تورات کو بدل ڈالا اور اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے بہتان باندھے اور اپنی مرضی کے مطابق قوانین بنا ڈالے۔ صرف کوڑی کے چند ٹکوں کے طمع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں تل گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سبق: آیت میں کافروں کو تہدید کی جا رہی ہے تاکہ ایمان لائیں اور مومنوں کو تنبیہ ہو رہی ہے تاکہ عبرت پکڑیں اور ہر وقت گناہوں سے بچ جائیں خصوصاً اس روز جب کہ موسیٰ علیہ السلام کو مع بنی اسرائیل کے غرقابی سے نجات ملی۔ یعنی دسویں محرم کا دن۔

عاشورہ کے فضائل و مسائل:۔ حدیث شریف:۔ ۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہودیوں کو دسویں محرم کے دن روزہ

رکھتے دیکھ کر فرمایا: ماھذا الیوم الذی تصومونه (اس دن تمہارے روزہ رکھنے کا موجب کیا ہے) تو انہوں نے کہا: وہ بڑا دن ہے۔ جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو دریا سے نجات ملی اور فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ادائیگی شکر پر روزہ رکھا ہم بھی ان کی اقتداء کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نحن احق و اولی بموسیٰ منکم و امر بصیامه (رواہ مسلم) (ہم موسیٰ علیہ السلام کی اقتداء کے زیادہ لائق وحقدار ہیں بہ نسبت تمہارے اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز روزہ رکھنے کا حکم دیا)

ف: اس حدیث شریف کی اقتداء کرتے ہوئے خود بھی روزہ رکھا اور امت کو بھی حکم دیا۔ حالانکہ یہ اس حدیث شریف کے خلاف ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا کہ عاشورہ کا وہ مقدس دن ہے کہ جاہلیت میں اس روز قریش روزہ رکھتے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قبل از دعویٰ نبوت تا ہجرت اس روز روزہ رکھا اور صحابہ کرام کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن جب رمضان شریف کے روزوں کی فرضیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورہ کا روزہ چھوڑ دیا اور فرمایا جو چاہے عاشورہ کا روزہ رکھے اور جو چاہے ترک کر دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرضیت کے منسوخ ہونے کے بعد صرف اباحت باقی تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے بعد وہ اباحت سنت سے بدل گئی اس سے دو متضاد روایتوں میں تطبیق واضح ہوگئی۔

حدیث شریف:۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"التمسوا فضله فانه مبارک اختاره اللہ من الایام من صام ذالک الیوم جعل اللہ له نصیبا من عبادة جمیع من عبده من الملائکة و الانبیاء و المرسلین و الشهداء و الصالحین"

(اس دن کی فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ یہ وہ مبارک دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے باقی ایام پر فضیلت بخشی ہے (سوائے رمضان شریف کے) جس نے اس دن روزہ رکھا تو اللہ تعالیٰ اس کی عبادت کو وہ حصہ عطا فرمائے گا جو ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام اور صدیقین و صالحین کو عطا فرمایا۔ یعنی وہ عبادت مقبول ہوگی۔ یہ فضائل روزے کے متعلق تھے۔ نماز کے متعلق بھی فضائل وارد ہیں۔

عاشورہ کے دن نماز:۔ عاشورہ کے دن کی نماز کے متعلق حضور غوث پاک سیدنا محی الدین شیخ عبدالقادر

جیلانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنی ایک طویل حدیث میں فرماتے ہیں کہ جس نے عاشورہ کے دن چار رکعت نماز اس طریق سے پڑھی کہ ہر رکعت میں ایک دفعہ فاتحہ شریف اور پچاس دفعہ سورہ اخلاص تو اس کے آئندہ زندگی کی پچاس سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور ملاء اعلیٰ میں اس کے لئے نور کے ہزار منبر بنائے جائیں گے۔

مسئلہ : عاشورہ کی ساری رات جاگنا مستحب ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

"من احیا لیلۃ عاشورا فکانما عبد اللہ بعبادۃ ملائکۃ القربین "

(جو عاشورہ کی ساری رات جاگتا رہا اس نے گویا مقربین ملائکہ جیسی عبادتِ الٰہی بجالائی)

تفسیر صوفیانہ بحر سے مراد دنیا ہے اور اس کا پانی لذات وشہوات ہیں اور موسیٰ سے قلب اور قوم سے صفات مطلوب ہیں۔ فرعون نفس امارہ ہے اور اس کی قوم سے نفس کے صفات مراد ہیں۔ یہ سب موسیٰ (قلب) اور اس کی قوم کے اعداء ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کو بالکل مٹا دیں اور قلب اور اس کے صفات اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والے ہیں اور ان کا دشمن ان کے پیچھے ہے اور دنیا کا دریا ان کے آگے ہے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف اس دریا کو عبور کر کے جانا اور دریا کا پار کرنا ہے۔ **لا الہ الا اللہ** کے عصا کی ضرب کے بغیر پہنچانا ناممکن ہے اور وہ عصا موسیٰ (قلب) کے ہاتھ میں ہے کیونکہ اس کا بھی سفید ہاتھ ہے اگر وہ عصا اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو وہ غرق ہو جاتے فرعون اور اس کی قوم غرق ہو گئی اور اگر یہی عصا فرعون اور اس کی قوم (نفس امارہ اور اس کے صفات) کے ہاتھ میں ہوتا تو یہ معجزہ دریا کا پھٹنا ان سے سرزد نہ ہوتا۔ جب موسیٰ کا ذکر کا عصا مارتا ہے تو بحر (دنیا) اور اس کا پانی (شہوات ولذات) دائیں بائیں ہٹ جاتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے لطف کی ہوا اور ہدایت کے سورج کو دنیا کے دریا کے گڑھے پر چلاتا ہے تو وہ دریا (دنیا) شہوات ولذات کے پانی سے خشک ہو جاتا ہے۔ پھر موسیٰ (قلب) اور اس کی قوم (صفات) دریا میں کود پڑتے ہیں اور دنیا کے دریا کو صحیح وسالم ہو کر عبور کر جاتے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کے لطف نے نجات بخشی اور کنارے پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ واصل ہوئے پھر فرعون (نفس) اور اس کی قوم (شہوات) کو حکم ہوا کہ تم ڈوب کر جہنم کی آگ میں داخل ہو جاؤ۔

(کذا قال صاحب التاویلات النجمیہ قدس اللہ تعالیٰ نفسہ اکذ کیہ)

تفسیر عالمانہ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اور یاد کرو اے بنی اسرائیل! جب کہ ہم نے وعدہ دیا۔ مفاعلہ کا صیغہ بمعنیٰ ثلاثی ہے یا اپنے اصل پر ہے۔ کیونکہ یہ وعدہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اسے قبول کیا تھا اور قبول کرنا وعدہ کرنے کے مشابہ ہے یا اس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وحی بھیجنے کا وعدہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے طور پہاڑ پر حاضری کا وعدہ کیا۔

مُوْسٰى، وٰعَدْنَا کا مفعول ثانی ہے۔

موسیٰ کی وجہ تسمیہ:۔ عبرانی لغت میں مُو بمعنیٰ آپ اور شی بمعنیٰ شجر، شین کو عربیت میں سین سے تبدیل کیا گیا ہے اور اس نام سے اس لیے موسوم ہوئے کہ ان کی امی جان نے فرعون کے ڈر سے انہیں صندوق میں رکھ کر پھینک دیا۔ پھر دریا کی موجوں نے انہیں فرعون کے گھر کے قریب درختوں کے مابین کھڑا کر دیا۔ آسیہ (فرعون کی گھر والی) کی نوکرانیاں نہانے کے لئے آئیں تو صندوق کو دیکھ کر فرعون کے گھر لے گئیں۔ بنابریں اس مکان کی وجہ سے کہ جس میں وہ پائے گئے۔ اس سے موسوم ہوئے اس لیے کہ وہاں پانی اور شجر تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کا نسب نامہ:۔

موسیٰ بن عمران بن یصہر بن فاہث بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔

اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً چالیس راتوں کو مکمل کرنا۔ یہاں دراصل مضاف محذوف ہے۔ دراصل (تمام اربعین لیلة) تھا یہ وٰعَدْنَا کا مفعول ثانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا اور وہ ذیقعدہ کا مہینہ تھا۔ پھر اس پر دس دن ذوالحج کے اور بڑھائے اور انہیں لَیْلَةً سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ مہینوں کی ابتداء رات سے ہوتی ہے اور عرب کے مہینوں کی وضع بھی چاند کی سیر پر وضع کی گئی ہے۔ اسی لیے تاریخ پر واقع ہوتی ہے۔ اسی حیثیت سے مہینوں میں اصل رات ہے دن اس کے تابع ہوتے ہیں۔ یا اس لیے کہ ظلمت روشنی سے پہلے ہوتی ہے۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ عِجْلَ بقرہ گائے کے بچے کو کہتے ہیں۔ یعنی سامری نے بچھڑے کا مصنوعی معبود بنا کر پیش کیا تو تم نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ مِنْ بَعْدِهٖ وعدہ کے وقت گذرنے کے بعد اور لفظ ثُمَّ اس لیے لایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وعدہ دیا کہ تم طور پر تشریف لاؤ تمہیں تورات دی جائے گی جس میں بنی اسرائیل کی فضیلت ہے تاکہ خاصری کو بلند درجات پر تنبیہ اور غائبین کے لئے تعریف اور

دین کی تکمیل ثابت ہو چونکہ توراۃ بہت بڑی نعمتوں سے ایک نعمت تھی۔ جب انہوں نے سب سے زیادہ قبیح قسم کا کفر و جہل کا عمل کیا تو یہ بات محل تعجب ہوئی کہ بڑے انعام کے بعد بڑی بے فرمانی کیوں اس لیے ان کی عقل کی قباحت کی دلالت پر لفظ ثُمَّ لائے اس کی مثال ہوگی کہ جیسے کوئی شخص کسی کو کہے کہ میں نے تجھ پر احسان کیا اور فلاں فلاں انعام دیئے۔ لیکن تو نے میرے لیے فلاں برائی اور نقصان کا ارادہ کیا۔

وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ اور تم ظالم ہو شریک ٹھہرانے اور عبادت کو اپنے محل سے غیر محل میں رکھنے کی وجہ سے یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت کرتے ہو۔ یہ جملہ اتَّخَذۡتُمُ کی ضمیر سے حال ہے۔

ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنۡكُمۡ توبہ کے بعد ہم نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ بچھڑے کی پرستش کے بعد جو قبح میں انتہائی درجہ کا عمل بد تھا۔ اس پر ہم نے تمہیں کوئی سزا نہ دی۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک مہلت دیدی۔ انہوں نے آکر تمہیں متنبہ فرما کر اور تمہارے گناہوں کے کفارہ کی خبر دی۔ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ تاکہ تم نعمت کی معافی کا شکریہ ادا کرو اور اس کے بعد طاعت پر دوام حاصل کرو کیونکہ انعام شکر کا موجب ہے۔ دراصل شکر کہتے ہیں: نعمت کے تصور و اظہار کو اور اس کی حقیقت یہی ہے کہ شکر سے اپنا عجز ظاہر کرے۔

شیخ سعدی قدس سرہ فرماتے ہیں:

خردمن طبعان منت شناس بدوزند نعمت بمیخ سپاس

ترجمہ: منت شناس اور دانا طبع لوگ شکر کی میخ سے ہی نعمت کو سیتے ہیں۔

وَاِذۡ اٰتَيۡنَا اور جب کہ ہم نے دیا۔ مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَالۡفُرۡقَانَ تورات جو اس بات میں جامع تھی کہ وہ کتاب بھی تھی اور حق و باطل کے فرق بتانے میں حجت بھی۔ جیسے کوئی کہتا ہے: لقیت الغیث و اللیث یعنی میں اس شخص کو ملا جو دو جرأت جامع ہے۔ اس لحاظ سے کتاب و فرقان سے ایک ہی شئے مراد ہے۔ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ تاکہ اس میں تدبر اور جو اس میں موجود ہے اس پر عمل کرو۔ یہ جملہ حکمت بیان کرنے کے لئے ہے نہ کہ علت بیان کرنے کے لئے یعنی اس میں نازل کرنے کی ایک حکمت یہ ہے کہ تم اس میں تدبر کرتے ہوئے عمل کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے اس لیے نازل کیا تاکہ نبی علیہ السلام کی نبوت کی صحت پر دلالت کرے۔ پھر تم اس کی ہدایت کی اتباع میں کوشش کرو۔ جب تم یہ عمل کرو گے تو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لا چکے

کیونکہ یہ بھی معجزات لے آئے ہیں جو ان کے دعویٰ نبوت کی صحت پر دلالت کر رہے ہیں۔

تورات کا شانِ نزول:۔ مروی ہے کہ جب بنی اسرائیل اپنے دشمن سے بے خوف ہوئے کیونکہ وہ تو دریا میں غرق ہو گیا اور یہ مصر میں آئے تو ان کے پاس کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی شریعت کہ جس سے اپنے دینی و دنیوی مسائل کا حل سوچیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات دینے کا وعدہ فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے پاس کتاب لانے کے لئے جاتا ہوں جس میں تمہارے لیے اوامر ونواہی کا بیان ہوگا اور چالیس روز کا وعدہ فرمایا اور ان پر ہارون علیہ السلام کو خلیفہ مقرر فرمایا۔ جب وعدہ کا دن آ گیا تو جبریل علیہ السلام ایک گھوڑے پر تشریف لائے (جسے فرس الحیاۃ) کہا جاتا ہے کہ جس شئے پر اس کا قدم آتا تو وہ زندہ ہو جاتا۔ اس گھوڑے پر وہ موسیٰ علیہ السلام کو لینے آئے تھے۔

سامری نے بچھڑا کس طرح تیار کیا:۔ جب سامری نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کی یہ کیفیت دیکھی اور تھا وہ سنار اہل باجرمی کے قبیلہ سے تھا۔ اس کا نام میجا تھا۔ گھوڑے کی یہ کیفیت دیکھی کہ جہاں بھی قدم رکھتا ہے وہ جگہ سرسبز ہو جاتی ہے وہ دراصل منافق تھا اور اس قوم سے تھا جو گاؤپرست تھی جب گھوڑے کا وہ کرشمہ دیکھ چکا تو دل میں سوچا کہ اس میں ضرور کچھ ہے۔ چنانچہ اس کے قدموں سے ایک مٹھی بھر مٹی لے لی۔

جبریل کا موسیٰ:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ جبریل علیہ السلام کو پہچانتا تھا، کیونکہ یہ بھی اس سال پیدا ہوا کہ جس سال فرعون کے زمانہ میں بچوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں نے خوف کے مارے جنگل میں جنم لیا۔ تو جبریل علیہ السلام آ کر اسے غذا دے جاتے۔ چنانچہ وہ سیدھے انگوٹھے کو چوستا تو اس سے شہد پیتا اور بائیں انگوٹھے سے دودھ (یہاں تک کہ جوان ہو کر واپس قوم میں چلا گیا) جب دریا عبور کرتے وقت جبریل علیہ السلام کو پہچانا تو اس کی گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے ایک مٹھی بھر مٹی لے لی اور اپنے قابو میں رکھی یہاں تک کہ اسے یہ وقت میسر ہوا

بچھڑے کی صفت و پرستش اور موسیٰ علیہ السلام کی واپسی:۔

جب موسیٰ علیہ السلام طور کی طرف چلے تو یہی سامری بنی اسرائیل کا وقت یاد رکھتا تھا جب کہ ان کا ایک قوم پر گذر ہوا (جو بت کی پرستش میں مست تھی) دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کو کہنے لگے: ہمارا خدا بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے ان لوگوں کا معبود ہے۔ سامری کو یہ قول یاد تھا اور خیال رکھتا تھا کہ اسی ذریعہ سے بنی اسرائیل کو گمراہ

کروں گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی روانگی کے بعد وہ زیورات جو بنی اسرائیل نے فرعونیوں سے ایک شادی کے لئے مانگے تھے وہ ان کے پاس موجود تھے۔ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے وعدہ کو گنتے رہے اور بیس دن گزرنے پر کہنے لگے: اب موسیٰ علیہ السلام کا وعدہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے رات اور دن علیحدہ علیحدہ ایک ایک یوم قرار دیا۔ کہنے لگے: موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ خلافی فرمائی۔ سامری نے کہا: وہ زیورات مجھے دو جو تم فرعونیوں سے لے آئے تھے۔ وہ دراصل موسیٰ علیہ السلام نے جمع کر کے ایک گڑھے میں دفن کرا دیئے تھے۔ سامری نے وہ اٹھا کر تین دنوں کے اندر بچھڑا تیار کر لیا اور اس میں وہی مٹی ڈال دی جو کہ جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے اٹھائی تھی۔ اس سے وہ بچھڑا نہایت خوبصورت تیار ہو گیا اور اس سے بچھڑے جیسی آواز نکلتی تھی۔ اس میں گوشت پوست خون بال وغیرہ سب کچھ تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ آواز پیچھے سے داخل ہو کر آگے منہ سے نکلتی تو بچھڑے کی آواز کے مشابہ ہو جاتی۔

بچھڑے کو سامنے لا کر قوم سے کہنے لگا: یہ تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے۔ موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں۔ یعنی انہیں راستہ نہیں ملا۔ حالانکہ ان کا معبود تو یہیں پر تھا۔ سب کے سب بچھڑے کی عبادت میں ٹوٹ پڑے سوائے حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے بارہ ہزار متبعین کے۔ ہارون علیہ السلام نے انہیں بہت روکا اور کہا: اے میری قوم! تم اس گناہ میں مبتلا ہو چکے ہو۔ تمہارا رب رحمٰن ہے۔ تم میری اتباع کرو اور میرا کہا مانو۔ انہوں نے کہا: نہیں ہم تو اس کی پرستش کو نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک موسیٰ علیہ السلام واپس نہیں آئیں گے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں: موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تیس دنوں کا وعدہ دے کر گئے تھے پھر دس دن بعد میں بڑھا دیئے گئے۔ انہی دس دنوں میں قوم گمراہ ہوئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پر تیس دن گذرے اور واپس نہ آئے تو قوم نے سمجھا کہ فوت ہو گئے۔ ادھر بچھڑے کی خوبصورتی اور سامری کی گمراہ کن باتوں سے بہک گئے اور بچھڑے کی عبادت میں منہمک ہو گئے۔ **(کذا فی تفسیر امام ابی اللیث اور فرمایا یہی طریق صحیح ہے)**

جب موسیٰ علیہ السلام واپس ہوئے تو قوم کی اس حالت کو دیکھ کر غصہ میں آ گئے اور تختیاں پھینک دیں ان میں سے چھ جز آسمان پر اٹھا لیے گئے صرف ایک جز باقی رہ گیا کہ جس میں حلال و حرام تھا اور جس کی طرف ان کی ضرورت تھی پھر بچھڑے کو آگ میں جلا دیا اور اسے ذرہ ذرہ کر کے دریا میں پھینکا گیا۔ لوگوں نے اس سے پانی

پیا، صرف بچھڑے کی محبت سے اس کا اثر ان کے ہونٹوں سے زردی کی طرح ظاہر ہوا۔ پھر پیٹ پھول گئے۔
اس کے بعد توبہ ظاہر کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب توبہ اس طرح قبول ہو سکتی ہے کہ تم اپنے آپ کو قتل کر ڈالو۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

مسئلہ : گذشتہ حکم موسوی امت کے لئے تھا۔ ہمارے لیے ظاہری جسم کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے نفس امارہ کو قتل کرنے کا حکم ہے جو کہ خواہش کے بچھڑے کی پرستش کرتا ہے۔

مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

اے شہاں کشتیم ما خصم برون — ماند خصمے زو بتر در اندرون
کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست — شیر باطن سخرہ خرگوش نیست
نفس اژدھاست او کے مردہ است — از غم و بے آلتی افسردہ است
گر بیابد آلتِ فرعون او — کہ بامرادِ ہی رفت آب جو
آنکہ او بنیاد فرعونی کند! — راہ صد موسیٰ وصد ہاروں زند [1]

عدد چالیس کے فضائل:۔

چونکہ چالیس کو درجہ کمال حاصل ہے اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس روز تورات کے لئے ٹھہرایا گیا۔ اس کی فضیلت کی چند وجوہ ہیں:۔

۱۔ گنتی کے اعداد اصول حیثیت سے صرف چار ہیں۔
۲۔ احاد (یعنی ایک سے نو تک) عشرات (یعنی بیس، تیس، چالیس تا نوے) ۳۔ مآت (یعنی سو، دوسو، تین سو تا نو سو)
۴۔ الوف (یعنی ایک ہزار، دو ہزار تا نوے ہزار۔ عشر کا عدد خود کامل ہے۔ کما قال تعالیٰ: تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ
جب عشرہ کے عدد کو چار بار دہرا کیا جائے (گنتی کے اعداد کا کمال اسی میں ہے) تو چالیس ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام

---

[1] **ترجمہ** :۔ ۱۔ اے بزرگو! ہم نے باہر دشمنوں کو تو ختم کر ڈالا لیکن اندرونی دشمن نہیں مر سکا حالانکہ اس سے بدتر ہے۔ ۲۔ اس کا مارنا عقل و ہوش کا کام نہیں شیر باطنی کو خرگوش مارے یہ کوئی مذاق ہے۔ ۳۔ نفس اژدھا ہے اسے مردہ کیسے ہو سکتا ہے اور غم و صلح نہ کرنے سے دور ہے۔ ۴۔ اگر اسے فرعون کی قوت مل جائے تو اس کے حکم سے امور طے ہوں گے ۵۔ وہ اس وقت فرعونت کرتا ہے اور وہ کئی سینکڑے گمراہ کرے گا۔

کمال الکمال ہے۔

ا۔حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کی تخمیر چالیس روز ہوئی جیسے کہ حدیث قدسی ہے:

طینت طینة آدم بیدی اربعین صباحاً۔(میں نے آدم علیہ السلام کی مٹی کو چالیس روز تک خمیر میں رکھا)

۲۔چالیس کے عدد میں ایسی تاثیر رکھی گئی ہے جو دوسرے اعداد میں نہیں۔جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:ان خلق احدکم مجمع فی بطن اُمه اربعین یوماً نطفة ثم یکون علقة مثل ذالک ثم یکون مفغة مثل ذالک ۔(الحدیث)

ترجمہ : تم سب کی تخلیق کے آغاز کا حصہ تمہاری ماؤں کے پیٹ میں نطفہ کی صورت میں چالیس روز تک جمع رہتا ہے۔ پھر وہ علقہ بنتا ہے تو وہ بھی چالیس روز میں، پھر گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے تو بھی چالیس روز میں اسی طرح وغیرہ وغیرہ۔

۳۔جس کے طلسم کو کنز روحانی کا کا پتلا بنانے میں بھی چالیس روز لگتے ہیں۔

۴۔پھر اسے صحیح کرنے میں بھی چالیس روز صرف ہوتے ہیں۔یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا دستور ہے کہ کبھی اس کے برعکس ہونے والا نہیں۔

اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً میں رات کی تخصیص کی دو وجوہ ہیں:

ا۔رات صرف تعبد وتقرب الٰہی کے لئے مخصوص ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ان اقرب مایکون العبد من الرب فی جوف اللیل (بندے کا اپنے مولیٰ سے قرب کا بہترین وقت آدھی رات ہے)

دوسرے حدیث شریف میں ہے: ینزل اللّٰه کل لیلة الی السماء الدنیا (الحدیث)

(اللہ تعالیٰ کی (رحمت خاص) کا ہر شب آسمانِ دنیا میں نزول ہوتا ہے) اسی معنیٰ کو لے کر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الآیة) (اور رات کو تہجد پڑھیے اور آپ کے لئے زائد ہے) اور فرمایا: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (الآیة) (پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے عبد مقدس کو راتوں رات مسجد حرام سے سیر کرائی)

۲۔اگر لَیْلَةً کی بجائے دن کا ذکر کیا جاتا تو وہم پیدا ہوتا کہ شاید عبادت صرف دن کو کی جائے اور رات محض استراحت کے لیے ہے۔کما قال تعالیٰ :هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (وہ اللہ تعالیٰ جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون کرو اور دن کو بنایا تاکہ تم دیکھو)

جب رات کا نام لیا گیا تو موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ جس طرح عبادت دن کو کی جاتی ہے اسی طرح رات کو بھی کی جائے۔(کذا فی تاویلاتِ النجمیہ)

مسئلہ: شیخ شہیر با فتادہ آفندی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس روز کو عبادت کے لئے متعین نہیں فرمایا بلکہ آپ نے رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف اختیار فرمایا۔ ہاں، ہاں موسیٰ علیہ السلام کے عمل کا بھی اس سے ثبوت ملتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ (اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں کا وعدہ دیا اور ہم نے اسے دس راتوں کو مکمل کیا) جو حضرات خلوت میں بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

(کذا فی واقعات الشیخ الهدائی قدس سرہٗ اللہ نفسہ الزاکیہ)

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ شکر تین وجوہ سے کیا جاتا ہے:

۱۔ اقوال سے ۲۔ اعمال سے ۳۔ احوال سے

اقوال سے تو اس طرح کہ نعمت کا بیان یوں کیا جائے کہ نفس کو اس نعمت کا اقرار ہو اور لوگوں کے سامنے اظہار ہو اور اپنے مالک کے سامنے اپنی عاجزی کا اعتراف ہو۔ کما قال تعالیٰ: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التحدث بالنعم شکر (یعنی نعمت کو بیان کرنا بھی شکر ہے) اور اعمال سے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس کی اطاعت میں صرف کیا جائے اور بے فرمانی سے بچے اور جو طاعات اس سے رہ گئیں ان کے تدارک میں کوشش کی جائے اور گناہوں سے کنارہ کشی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (اے آل داؤد شکر کا کام کرو) احوال سے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ صفت شکور یہ سے اپنے نفس کو معمور کرے۔ ہر نعمت میں اپنے منعم کے سوا کسی دوسرے کا تصور نہ کرے اور شکر میں صرف شکور کا خیال ہو۔ نعمتوں میں منعم کو دیکھے اور نعمت کو منعم سے سمجھے اور اسی طرح شکور کو شکر میں دیکھے اور شکر کو شکور سے۔ اس اعتبار سے منعم کا تصور اور شکر کو دو نعمتیں خیال کرے یہ نعمت بھی میرے منعم سے مجھے ملی۔ جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وجودِ نعمت منعم کے جمال کا آئینہ ہے اور نعمت کا شکر شکور کے جمال کے آئینہ ہے پھر منعم اور نعمت کا دیکھنا دیگر نعمت ہو جائے گی۔ الی غیر نہایۃ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے شکر کی ادائیگی نہیں ہو سکتی اور اس کا شکر

شکور کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ (اور جو نیکی کا کام کرتا ہے ہم اس کو نیکی میں بڑھاتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ غفور و شکور ہے)

تفسیر عالمانہ

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ یہ پانچواں انعام ہے یعنی جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس قوم کو جو بچھڑے کی پجاری تھی سے فرمایا کہ تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ يَا قَوْمِ کی اضافت شفقت کے لئے ہے۔ جانوں پر ظلم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے عذاب کو واجب کر کے ضرر پہنچایا اور اس ثواب کو جو موسیٰ علیہ السلام کی خدمت گذاری سے نصیب ہوتا تھا اسے کم دیا۔ بِاتِّخَاذِكُمُ بچھڑے کو معبود بنا کر۔ اس کے بعد انہوں نے عرض کی: اب ہم کیا کریں؟ تو فرمایا: فَتُوبُوا یعنی توبہ کا پختہ ارادہ کرلو۔ فاء سببیت کی ہے کیونکہ ظلم توبہ کا سبب تھا۔ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ یعنی جس نے تمہیں پیدا کیا جو تمام عیوب ونقائص اور تفاوت سے بری ہے اور تمہارے بعض کو بعض سے مختلف ہیات اور شکلوں میں ممتز کیا اور لفظ بـاری'' اس طرف اشارہ کررہا ہے کہ یہ لوگ جہالت اور عبادت کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں کہ اس علیم وحکیم کی عبادت کو چھوڑ بیٹھے کہ جس نے انہیں پیدا کیا۔ اپنی لطیف حکمت سے جو تمام تفاوت وتنافر سے بری ہے اور اس بچھڑے کی عبادت میں مصروف ہوئے جو عبادت میں مشہور ہے اور جو شخص اپنے منعم حقیقی کے حقوق کو پہچانے تو اس کا مستحق ہے کہ اس سے نعمتیں چھینی جائیں۔ اسی لیے وہ خود آپ کو قتل کرنے اور ترکیب انسانی کو توڑنے پر مامور ہوئے پھر انہوں نے عرض کی: ہم کیسے توبہ کریں تو جواب میں فرمایا: فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ یعنی تمہارا بے گناہ تمہارے مجرم کو قتل کریں اور أَنفُسَكُمْ اس لیے فرمایا کہ مومن آپس میں بھائی ہوتے ہیں اور بھائی گویا دوسرے بھائی کی جان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ یعنی اپنے بھائی مسلمان کے شکوے مت کرو۔ (کذا فی السیر)

تفسیر ابی اللیث میں ہے کہ فاء تعقیب کی ہے اور ان کی توبہ کا نام نفس کا قتل ہے یعنی توبہ کا پختہ ارادہ کر کے اپنے نفسوں کو قتل کرو۔ (کذا فی الکشاف)

تفسیر کبیر میں ہے کہ توبہ کی تفسیر قتل نفس نہیں بلکہ قتل نفس اس توبہ کا بیان ہے۔ گویا فرمایا کہ تمہاری توبہ نہیں مکمل ہوسکتی جب تک کہ تم اپنے نفسوں کو قتل نہ کرو۔ وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ

مرتد کی توبہ کی تکمیل قتل میں ہے۔

ذٰلِكُمْ تمہاری توبہ اور قتل خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ اللہ تعالیٰ کے دربار میں زیادہ نافع ہے تمہارے اس فعل سے رک جانے سے جو سراسر عذاب ہے اور قتل شرک کے لئے طہارت اور دائمی زندگی اور سرمدی رونق کا وسیلہ ہے۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ یہ خطاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یعنی تم جس کے مامور ہوئے اسے بجالاؤ۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تم سے درگذر فرمایا۔

سوال :فتاب علیھم کیوں نہ فرمایا تا کہ ضمیر قوم کی طرف لوٹائی جاتی؟

جواب : چونکہ یہ نعمت کی تذکیر ہو رہی ہے اور یہ زیادہ مناسب مخاطبین کے لئے ہے نہ کہ گذشتہ لوگوں کے لئے

سوال : اللہ تعالیٰ نے تو انہیں قتل کرنے کا حکم دیا اور قتل کرنا نعمت نہیں؟

جواب : اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت بڑے گناہ پر متنبہ اور اس پر آگاہ فرمایا کہ اس بڑی مصیبت سے یوں چھوٹ سکتے ہو اور یہ بھی دینی نعمتوں سے ایک نعمت ہے۔

اِنَّهٗ وہ اللہ تعالیٰ: هُوَ التَّوَّابُ بندوں کی توبہ کی بکثرت توفیق دینے والا اور ان کی توبہ کو بہت قبول کرنے والا ہے الرَّحِيْمُ مطیعین کے لئے کثیر الرحمۃ ہے یہاں پر ان کے قتل کو ان کے گناہوں کا کفارہ مقرر فرمایا۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

تضرع کنانرا بدعوت مجیب فروماندگان را برحمت قریب

ترجمہ : عاجزوں کو رحمت سے قریب ہے عاجزوں کی دعا کو قبول کرنے والا ہے۔

بنی اسرائیل کی توبہ کا واقعہ :۔ مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے قتل کا حکم فرمایا تو وہ جنگل میں نہایت عاجزی وانکساری سے بیٹھ گئے اور انہیں کہا کہ جو بھی اپنے قاتل کی طرف ہاتھ بڑھائے گا یا اسے دیکھے گا یا اپنے ہاتھ یا پاؤں سے اسے ہٹانا چاہے گا وہ ملعون اور مردود التوبہ ہوگا۔ پھر وہ اپنی گردنوں کو اوپر اٹھاتے تا کہ آسانی سے مارنے والے گردن اڑائیں لیکن مارنے والے کے سامنے کسی کا بیٹا ہوتا کسی کا باپ کسی کا بھائی۔ کسی کا دوست تو مارنے سے ہاتھ رک جاتے اور موسیٰ علیہ السلام کو عرض کی: اب کیا کیا جائے اس پر اللہ تعالیٰ نے سیاہ بادل بھیجا تا کہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ چنانچہ شام تک اسی طرح قتل کرتے رہے

جب کشت وخون بکثرت ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے رب سے دعا مانگی اور رونے لگے زاری سے کہا: یا اللہ! بنی اسرائیل بہت مارے گئے اب انہیں کچھ تو باقی رکھ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بادل ہٹا لیا اور توبہ قبول فرمائی اور انہیں قتل کرنے سے روکا گیا۔ اس وقت ستر ہزار افراد قتل ہو چکے تھے۔ جو مر گئے وہ شہید کے حکم میں اور جو بچ گئے ان کے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ قاتل ومقتول دونوں بہشت میں داخل کیے جائیں گے یہ اس روایت کے مطابق ہے جس میں ہے کہ مجرم کو مجرم قتل کرے۔ اب فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا یہ معنیٰ ہوا کہ مجرم ایک دوسرے کو قتل کریں ورنہ گذشتہ روایت کے مطابق قاتل سے مراد وہ مرد ہے جو بے گناہ تھا۔

سابقہ امتوں کے مسائل:۔

مسئلہ : اپنے نفسوں کو قتل کرنا وہ سخت امر ہے جو انہیں اس پر عمل کرنا لازم تھا۔ اسے اغلال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مسئلہ : جس عضو سے خطا ہو جاتی اسے کاٹنا ضروری تھا۔

مسئلہ : نماز سوائے مسجد کے اور جگہ جائز نہ تھی۔

مسئلہ : پانی کے بغیر ان کی طہارت نہیں ہو سکتی تھی۔

مسئلہ : روزے دار کو شام کے افطار کے بعد اگر نیند آ جائے پھر طعام کھانا حرام تھا۔

مسئلہ : گناہوں کی وجہ سے بہت پاک چیزیں ان پر حرام ہو گئیں۔ اسی وجہ سے من وسلویٰ کی بندش ہوئی۔

مسئلہ : زکوٰۃ تمام مال سے چوتھائی حصہ دینا لازم تھی۔

مسئلہ : جو گناہ ان سے رات کے وقت سرزد ہوتا تو صبح کے وقت ان کے دروازوں پر لکھ دیا جاتا۔

مسئلہ : مروی ہے کہ بنی اسرائیل جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اُون کا موٹا لباس پہنتے اور اپنے ہاتھوں کو گردنوں سے باندھ دیتے۔

مسئلہ : یوں بھی ہوتا کہ کھوپڑی میں سوراخ نکال کر لوہے کی زنجیر اس پر رکھ کر ستون سے باندھ دیتے اور اس حالت میں عبادت ادا کرتے۔

ان سب امور کو ''اصر'' یعنی اعمال شاقی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ف : یہ تمام امور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہم سے اٹھا لیے گئے۔

توبہ کے مراتب :۔توبہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو خداوند قدوس نے صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت فرمائی ورنہ اگلی امتیں اس طرح کی توبہ سے محروم رہیں۔اس کے چار مراتب ہیں:۔

۱۔پہلے مرتبہ کا نام توبہ ہے اور سالک کی یہ پہلی منزل ہے اور یہ نفس امارہ کے لئے مقرر کی گئی ہے اور یہ ہے بھی عوام کے لئے ۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام برائیوں سے رک کر ماموراتِ الٰہی بجالانے پر مستعد ہو جائے اور فوت شدہ نماز وغیرہ کو ادا کرے اور جن کے حقوق دینے ہیں انہیں واپس لوٹائے جن لوگوں کو ناراض کیا ہے انہیں راضی کرے اور گذشتہ بُرے اعمال پر افسوس کا اظہار کرے اور پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ کسی برائی کے نزدیک نہ جائے گا۔

۲۔توبہ کے دوسرے مرتبہ کا نام اِنَابَۃ" ہے(یعنی رجوع الی اللہ) یہ نفسِ امارہ کے لئے ہے اور ہے بھی خواص مومنین اولیاء اللہ کے لئے ۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو اور دنیا سے روگردانی اور اس کے اسباب سے بالکل دوری اور عاداتِ سنجیدہ کا اختیار اور نفس کو بری عادات سے باز رکھ کر اس کا تزکیہ اور اس کی خواہشات کی مخالفت اور اس کے ساتھ جہاد کرنے پر مداومت کرنا کیونکہ نفس جب رجوع الی اللہ کا خوگر ہو جاتا ہے تو قلب کے حکم میں اور اس کے اوصاف سے موصوف ہو جاتا ہے۔کیونکہ رجوع الی اللہ قلب کی صفت ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ الخ

۳۔تیسرے مرتبہ کا نام رَوْبَۃ" (رغبت الی اللہ ہے) اور یہ مرتبہ خواص الیاء کا ہے اور رغبت الی اللہ شوق لقائے الٰہی کی علامات سے ہے جب نفس رغبت الی اللہ سے تکمیل پاتا ہے تو وہ روح کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور راغب الی اللہ مشتاق لقائے الٰہی کی علامات سے ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنی طبعی عادت کو تنہائی کا عادی کرے اور بظاہر نشست و برخاست دوستوں سے رکھے مخلوق سے دور رہے اور حق سے انس پیدا کرے اور نفس سے کونین کے تعلقات قطع کرنے کے لئے سخت جہاد کرے۔

۴۔چوتھا مرتبہ یہ نفس مطمئنہ کو نصیب ہوتا ہے اور یہ مقام بھی سادات حضرات انبیاء علیہم السلام اور اخص الخواص اولیاء کا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ یہ ایک جذبہ عنایت ربانیہ ہے جو انبیاء

علیھم السلام اور اخص اولیاء کے نفوس قدسیہ کا انانیت سے کھینچ کر ھُوِیَّتِ حق کی جانب پہنچاتی ہے یعنی ان کے نفوس طاعتِ الٰہی میں لقائے ربانی کے لئے مطیع رہتے ہیں پھر ان کو اسیر الی اللہ کی راہ میں چلنے کا موقع ملتا ہے۔

گویا اپنے نفوسِ قدسیہ کو مشاہدہ لقائے ربانی میں مٹا کر دُوئی کا تصور ختم کر کے دائمی لقا حاصل کر لیتے ہیں۔

حکایت: جب حضرت حلاج علیہ الرحمہ کو قتل گاہ میں لایا گیا تو پہلے ان کا دایاں ہاتھ کاٹا گیا تو آپ ہنس پڑے۔ پھر دوسرے ہاتھ کو کاٹا گیا تو بہت ہنسے اور خیال کیا کہ شاید خون سے منہ میں تغیر نہ آئے تو اپنے منہ کو جہاں سے خون بہہ رہا تھا اس کے آگے کر دیا جس سے اس کا رخِ مبارک خون آلود ہو رہا تھا اور آپ اشعار ذیل پڑھ رہے تھے۔

اَللّٰہُ یَعْلَمُ اَنَّ الرُّوْحَ قَدْ تَلَفَتْ ۔۔۔ شَوْقاً اِلَیْکَ وَلٰکِنِّیْ اُمَنِّیْھَا

وَنَظْرُکَ یَا سُؤْلِیْ وَیَا اَمَلِیْ ۔۔۔ اَشْیٰ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا

یَا قَوْمِ اِنِّیْ غَرِیْبٌ فِیْ دِیَارِکُمْ ۔۔۔ سَلَّمْتُ رُوْحِیْ اِلَیْکُمْ فَاحْکُمُوْا فِیْھَا

مَا اُسَلِّمُ النَّفْسَ لِلْاِسْقَامِ تَتْلَفُھَا ۔۔۔ اِلَّا لِعِلْمِیْ بِاَنَّ الْوَصْلَ یُحْیِیْھَا

نَفْسُ الْمُحِبِّ عَلَی الْاٰلَامِ صَابِرَۃٌ ۔۔۔ لَعَلَّ مُسْقِمَھَا یَوْماً اَرِمُلِیْھَا

ترجمہ ۱۔ اے اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں اپنی روح کو تیرے شوق میں خرچ کر رہا ہوں اور میری آرزو بھی یہی ہے۔ ۲۔ اے میرے محبوب! اور میری تمنا تیری ہی نظر میرے لیے دنیا اور مافیہا سے زیادہ پیاری ہے۔ ۳۔ اے قوم! میں تمہارے دیار میں اجنبی ہوں اور میں نے اپنی روح تمہیں دیدی اب تمہاری مرضی جس طرح چاہو کرو۔ ۴۔ میں اپنے نفس کو ان بیماریوں سے دور رکھنا چاہتا ہوں جو اسے مٹا رہی ہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وصال کے بعد میرا نفس ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جائے گا۔ ۵۔ عاشق دکھ اور درد سے صبر کرتا ہے امید پر کہ جس نے زخمی کیا وہ کبھی تو مرہم بھی لگائے گا۔

اس کے بعد حضرت حلاج نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا: اے میرے آقا! میں تیرے بندوں میں ایک اجنبی ہوں اور تیرا ذکر مجھ سے غریب ہے اور غریب کو غریب سے محبت ہوتی ہے۔ اسی حال میں ایک مرد نے ان سے پوچھا: یَا شَیْخُ مَا الْعِشْقُ عشق کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس کے ظاہر کو تم دیکھ رہے ہو لیکن

اس کا باطن مخلوق سے نہایت ہی مخفی راز ہے۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ ہر قوم کا ایک بچھڑا ہوتا ہے جو اس کی پرستش کرتے ہیں اور وہ دراہم وہ ہیں کہ جن کی پرستش میں ہر وقت لگے رہتے ہیں اور دوسری ایک قوم ہے جو شہوات کے بچھڑے کی پرستش کرتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو جاہ و جلال کے بچھڑے کی پرستش میں سرمست ہیں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض ترین ہیں پھر اللہ تعالیٰ ہر سعید کے موسیٰ (قلب) پر الہام کرتا ہے اور فرماتا ہے: یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِکُمْ اے قوم! ماسوائے دور رہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور یہ سوائے نفس کو مارنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ شہوات نفس کی حیات ہے۔ انہی شہوات کی وجہ سے فرعون ربوبیت کا مدعی ہوا اور بنی اسرائیل بھی شہوات کی وجہ سے بچھڑے کے پجاری بنے اور شہوات سے ہی شیطان نے سجدہ سے انکار کیا اور متکبر بنا یا یہ معنیٰ ہے کہ نفس کو منہیات سے دور رکھ کر اسے قتل کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے قتل کرو۔ کیونکہ نفس کو ظاہری قتل کرنا مومن اور کافر کے لئے آسان ہے لیکن باطن میں بڑا مشکل امر ہے صرف خواص اولیاء کے لئے سہل ہے جو صدق کی تلوار لے کر نفس کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے قتل کرتے ہیں اسی لیے صدیقین کا مرتبہ شہداء سے بلند ہے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ سے واپس لوٹتے تو فرماتے: رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ (ہم جہاد اصغر سے فارغ ہو کر اب جہاد اکبر کی طرف جا رہے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہد جب کافر کی تلوار سے مارا جاتا ہے تو وہ دکھ سے صرف ایک بار راحت پاتا ہے۔ لیکن جب صدق کی تلوار سے مارا جائے تو وہ دن میں ہزار بار نفس کو زندہ کرتا ہے اور ہر بار اسے نئی بصیرت نصیب ہوتی ہے اور نفس کے مکر میں ہر بار اضافہ ہوتا ہے۔ اسی لیے مجاہد اس جہاد سے آنکھ جھپکنے کی دیر بھی راحت نہیں پا سکتا اور نہ ہی اس کے مکر سے اسے اطمینان ہوتا ہے۔ اصل صورت یہ ہے کہ نفس تدبیر حق کی ایک صورت ہے اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر خفی سے صرف خاسرین ہی مطمئن رہتے ہیں۔ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ یعنی نفس کو صدق کی تلوار سے قتل کرنا تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ ہر ایک قتل کے وقت مالک کے ہاں تمہارے لیے رفع درجات ہوتے ہیں کیونکہ نفس کو قتل کرنے اور شہوات کے دور کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور قرب توبہ کی توفیق سے نصیب ہوتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جیسے

حدیث قدسی میں ہے: مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْراً تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعاً ۔ جو بندہ میرے ہاں ایک بالشت نزدیک ہوتا ہے میں اس کے ایک گز قریب ہو جاتا ہوں ۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَابَ عَلَیْکُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

مثنوی شریف میں ہے:۔

ثمرا گر بگذشت بخش ایں دم است — آب تر بش دہ اگر او بے نم است

بیخ عمرت را بدہ آب حیات — تا درختِ عمر گردد با نبات [1]

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قُلْتُمْ یہ چھٹا انعام ہے یعنی یاد کرو ۔ اے بنی اسرائیل! اپنے اسلاف کے ان ستر افراد کے قول کو کہ جب موسیٰ علیہ السلام انہیں کوہ طور پر گوسالہ پرستی کے عذر پیش کرنے کے لئے لے گئے تھے لیکن یہ ستر افراد ان ستر افراد کے غیر ہیں ۔ جن کو فرعون کے غرق ہونے کے بعد تورات لینے کے لئے کوہ طور پر پہلی بار لے گئے تھے ۔ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ ہم تیرے اس قول کی تصدیق نہیں کریں گے یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور میں نے اس کا کلام سنا ہے اور تیرا یہ کہنا کہ ہمیں اس کتاب کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ یہاں تک کہ اسے ایسا ظاہر دیکھ لیں کہ اس کے اور ہمارے مابین کوئی چیز حائل نہ ہو۔

ف: جہر مسموعات میں ہوتا ہے جس طرح معائنہ مبصرات میں ہوتا ہے۔

ف: اس کا نصب علی المصدریہ ہے ۔ کیونکہ یہ بھی رؤیت ہے کی ایک قسم سے ہے گویا کہ فعل ناصب کا مصدر ہے یا فاعل سے حال ہے ۔ ای حتی نری اللّٰه مجاهراً (بفتح الهاء)

فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَةُ ، الصّٰعِقَةُ اس جلانے والی آگ کو کہتے ہیں کہ جس میں آواز ہو اور وہ آسمان سے نازل ہو اور دراصل ہر اس امر کو کہتے ہیں جو ڈرانے والا مار دینے والا یا عقل وفہم کو زائل کرنے والا ہو ۔ اس میں آواز بھی ہوتی ہے اور آگ بھی وغیرہ وغیرہ۔

فائدہ: انہیں صاعقہ نے اس لیے جلایا کہ انہوں نے وہ سوال کیا جو کہ دنیا میں محال ہے یا اس لیے کہ ان کی سرکشی اور ضد حد سے بڑھ گئی۔

---

[1] **ترجمہ**:۔ اگر ثمر گیا جڑ تو باقی ہے اسے تر پانی سے تروتازہ کر کہ نمی سے خالی نہیں ہے ۔ ۲۔ اپنی زندگی کی جڑ کو آب حیات دے تا کہ تیرے ثمر کا درخت پھل دے سکے۔

عقیدہ : رؤیت مقدسہ بحیثیت کیفیت کے مومنین کو نصیب ہوتی لیکن آخرت میں بعض انبیاء کو دنیا میں باعتبار بعض احوال کے دنیا میں حاصل ہوئی۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ تم اس صاعقہ کو آسمان سے نازل ہوئے دیکھ رہے تھے اگر وہ نار تھی تو پھر تمام نے دیکھا اگر وہ آواز تھی تو پھر جو مر گئے ان کے بقایا نے سنی دیکھی جو مر گئے۔ اسے مجاز اَرُؤیۃ الموت سے موسوم کرتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا۔ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ اس صاعقہ سے سبب تمہاری موت کے بعد۔

سوال : بعث کو مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ سے کیوں مقدم کیا گیا حالانکہ بعث بھی موت کے بعد اٹھنے کا نام ہے؟

جواب : کبھی بعث کا اطلاق اغماء اور نیند پر بھی ہوتا ہے اس لیے وہم پیدا ہوتا ہے کہ یہاں بھی یہی معنیٰ ہے۔ اس وہم کے زائل کرنے پر من بعد بیوتیم اضافہ کیا گیا۔

ف : حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: انہیں زندہ اس لیے فرمایا تاکہ وہ اپنی بقایا زندگی اور رزق پورا کر لیں کیونکہ ان کی یہ موت وقت سے پہلے تھی اور ان کے حق میں یہ موت ایسے تھی جیسے دوسروں کے لئے سکتہ طاری ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی میعاد پر مرتے تو پھر قیامت تک نہ اٹھتے۔

سوال : موت کے بعد مکلف بنانا اگر جائز ہے تو پھر آخرت میں بعد از موت کیوں نہیں مکلف بنایا جاتا؟

جواب : ان کے مکلف بننے سے مرنے کے بعد زندہ ہونے سے مانع ہے کہ انہیں قیامت کے دن بہشت کی لذتوں اور دوزخ کی تکالیف کی معرفت پر مجبور کیا گیا۔ علم بدیہی کے بعد تکلیف ہٹ جاتی ہے اور ان کو علم بدیہی حاصل نہ تھا اور نہ ہی معرفت۔ قیامت بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کی تکالیف کی معرفت پر ان کو مجبور کیا گیا۔ بلکہ موت کے بعد زندہ ہونا بمنزلہ نوم واغماء کے تھا اب ان کو مکلف بنانے میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔

لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ تاکہ تم اس کی نعمتوں کا اظہار اور اس کی توحید بیان کر کے اور فرمانبردار ہو کر صاعقہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دیکھ کر ایمان کی نعمت کا شکریہ ادا کرو بعد اس کے کہ تم حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً کہہ کر کافر ہو چکے تھے۔ کیونکہ نعمت کی زیادتی کی طلب میں نعمت کا ترک کفرانِ نعمت ہے۔ یعنی تم ایمان کی نعمت کا شکریہ ادا کرو۔ پس اس معجزہ کے ظہور کے بعد کسی اور شئے کی طلب ہرگز ہرگز نہ کرنا۔

بنی اسرائیل پر صاعقہ کا وقوع :۔ جب موسیٰ علیہ السلام طور سے واپس قوم کے ہاں پہنچے تو ان کی قمیع

حالت کو دیکھ کر اپنے بھائی اور سامری سے جو گفتگو فرمائی وہ مشہور ہے۔ پھر بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں ڈال دی۔ اب قوم نے نادم ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی: اگر ہمارے رب نے ہمارے گناہ نہ بخشے تو ہم خاسرین سے ہوں گے۔ آپ ہمارے لیے سفارش فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: آپ ان کو لے کر ان کی کوتاہی کی معافی چاہیں۔ چنانچہ آپ نے ان میں سے برگزیدہ ستر افراد کو چن لیا۔ جب کوہ طور کے قریب پہنچے تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے لیکن ہوا یوں کہ ہم اس کا کلام بلا واسطہ سن لیں۔ موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور کے قریب گئے تو آپ کو ایک بادل نے گھیر لیا آپ خود اس میں داخل تھے اور قوم کو بھی فرمایا کہ تم بھی اس میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ بھی داخل ہوئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔ جس میں امر و نہی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام کی پیشانی سے ایک نور چمکا کہ جس کو وہ ستر آدمی دیکھ نہ سکتے تھے۔ جب انہیں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلامِ الٰہی کے سننے کا شرف حاصل ہوا اور اوامر و نواہی کے فرامینِ مقدسہ سنے تو دیدارِ الٰہی میں طمع ظاہر کر بیٹھے۔ اس پر انہیں صاعقہ نے گھیرا تو بیہوش ہو کر گر پڑے اور ایک دن اور ایک رات مرے رہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام روئے اور اللہ تعالیٰ کے دربار اقدس میں گڑگڑاتے ہوئے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر عرض کرتے ہیں کہ الٰہی میں نے بنی اسرائیل کے برگزیدہ ستر آدمی چنے تاکہ ان کی توبہ قبول ہونے پر وہ میرے گواہ بنیں۔ اب میں ان کے پاس جا کر کیا جواب دوں گا؟ تو نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اگر انہیں بچھڑے والوں کے ساتھ ہلاک کر دیتا تو اچھا ہوتا۔ کیا تو مجھے قوم کے ذریعہ ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ ان کی عجز و زاری سے اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرمایا۔ ان کے ارواح واپس لوٹائے۔ اب توبہ کی قبولیت اس شرط میں مشروط ہوئی کہ وہ لوگ اپنے آپ کو قتل کریں۔

سوال: موسیٰ علیہ السلام نے بھی تو دیدار کا سوال کیا تھا۔ لیکن ان پر موت طاری نہ ہوئی کیونکہ ان پر جو بیہوشی طاری ہوئی وہ موت نہیں تھی بلکہ غشی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَمَّآ اَفَاقَ لیکن قوم کا کونسا جرم تھا کہ جب اپنی توبہ قبول کرانے جا رہے ہیں اور اس میں دیدار کا سوال کر بیٹھے جس پر ان بے چاروں کو موت کا تیر کھانا پڑا۔

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال محض اشتیاق اور عاجزی کے اظہار کی بناء پر تھا اور قوم کا سوال

تکذیب اور گستاخی پر مبنی تھا۔ ان کا سوال استرشادی نہ تھا۔ بلکہ عنادی تھا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید باری تعالیٰ کسی جسم میں متشکل ہے اس ظن کے مطابق اس کے دیدار کو جسم کی شکل میں تصور کر کے دیدار کا شوق کر بیٹھے اور یہ بات محال تھی۔

مسئلہ : آیت سے نفی رویت کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ اس میں الٹا رویت کے امکان کو ثبوت مل رہا ہے۔ کیونکہ ان ستر افراد نے دیدار کی تمنا ظاہر کی تو انہیں اس سے روکا نہ گیا۔ اسی طرح خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رویت کی التجا کی تھی۔ ان کو بھی منع نہیں کیا گیا۔ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ رویت کو استقرار مکان پر معلق کر کے ثبوت دیا جا رہا ہے کہ رویت از قبیل ممکنات ہے۔

دنیا میں دیدار الٰہی کے امتناع کے وجوہ:۔

۱۔ دنیا دار الاعداد ہے اسی لیے اسے جنت الکافر سے تعبیر کیا گیا ہے اور اغیار میں محبوب کا جلوہ نہیں دکھایا جاتا۔

۲۔ اگر مومن کو دیدار نصیب ہو جائے تو کافر کہیں گے کہ ہم بھی اگر اسے دیکھ لیں تو اس کی عبادت کریں گے۔ اب سلسلہ مساوی ہو تو پھر ان دونوں میں کیا فرق رہے گا۔

۳۔ جو مزا (غیب) انتظار میں ہے وہ (عین) دیدار میں نہیں۔

۴۔ دنیا محل معشیت ہے اگر اس کا دیدار نصیب ہو جائے تو پھر معاش اور بود و باش کے سلسلہ میں خلل پڑ جائے گا

۵۔ اس زیارت کو قلب سے متعلق کیا گیا تا کہ ملائکہ کو مومنین کے قلب کی صفائی کا اندازہ ہو۔

۶۔ اس کی شان کی رفعت مطلوب ہے۔ کیونکہ جس امر سے روکا جائے تو اس کے حصول میں طبیعت کا اشتیاق زوروں پر ہوتا ہے۔

۷۔ اس دیدار کی ممانعت سے بھی بندوں پر رحم کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ دنیا میں بندوں کی فطرت کو غیرت سے مزین کیا گیا ہے اگر دیدار الٰہی ان کے علاوہ کسی دوسرے کو نصیب ہو جائے تو ان کے دل پھٹ جاتے ہیں جیسے پہاڑ سے ان کی کیفیت ہوئی کہ اسے دیدار الٰہی کے جلوے تو نصیب تھے ہی لیکن جب موسیٰ علیہ السلام نے بھی شرکت چاہی تو پہاڑ غیرت سے پاش پاش ہو گیا۔

ف : دیدار کا مطالبہ کر کے پھر اس کے دیکھنے سے غفلت کر جانا بڑی بے ادبی اور ترک تعظیم تھی اور یہ بعیدی اور

شقاوتِ قلبی کی علامات سے ہے اس کے بعد عدل کی بناء پر جلالِ الٰہی نے ان کو صاعقہ سے گرفت کر کے ان پر نعمتوں سے نوازا۔ کمال قال تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

اس میں بھی اپنے فضل کا اظہار فرمایا سعادت اور قرب کی ایک علامت و دلالت یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کے جلووں کے مکاشفے حاصل کرتا جائے اور ساتھ اس کے الطافِ کریمانہ کا ملتجی رہے۔

ف: جس کے حال کی اصلاح باری تعالیٰ فرماتا ہے اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ لسانِ جہل کو بند کر کے رحمت کے دروازے پر سوالی بن کر سوال و جواب میں ادب کو ملحوظ رکھتا ہے۔

مثنوی شریف میں ہے:

پیش شاہاں میکنی ترک ادب ۔۔۔ نار شہوات را از اں کشی حطب

چوں نداری فطنت و نور ہدیٰ ۔۔۔ بہر کوراں روئے را میزن جلا

ترجمہ: ا۔ بادشاہوں کے سامنے ترک ادب کرتا ہے وہ یہ نار شہوت کی لکڑیاں جمع کر رہا ہے۔ ۲۔ جب تیرے ہاں سمجھداری اور نور ہدایت نہیں تمہیں اندھوں کے لئے کوئی روشنی تیار کرنی چاہیے۔

نفس امارہ کو قتل کرنا ضروری ہے۔ اسے قتل کر کے عالم حقیقت میں جو چاہے حکم دے۔ امام قشیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: توبہ میں نفوس کو قتل کرنے کا حکم اس امت کے لئے منسوخ نہیں ہوا صرف فرق یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو نفوس کا قتل کرنا ظاہری طور پر تھا اور ہم اپنے نفوس کو قتل کرنے میں اپنے تک محدود رکھتے ہوئے باطنی طور پر یہ حکم بجالائیں۔ اس سے صرف اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور نفس کا خرابیوں سے نکلنا مقصود ہو۔ بعض کا یہ گمان ہے کہ توبہ میں بنی اسرائیل کے لئے نفوس کا قتل کرنا سخت امر تھا۔ یہ غلط ہے بلکہ ہمارے لیے یہ حکم سخت ہے۔ کیونکہ وہ تو ایک بار قتل ہو کر جان چھڑا گئے لیکن خواص اولیاء کے لئے ہر آن اپنے نفوس کو قتل کرنے کا حکم ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

لَيْسَ مَنْ مَّاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَيِّتٍ ۔۔۔ اِنَّ الْمَيِّتَ مَيِّتُ الْاَحْيَاءِ

ترجمہ: یعنی جو مر گیا اسے میت مت کہو وہ تو مر کر جان چھڑا گیا بلکہ موت اس کے لئے ہے جو زندہ ہو کر ہر موت کا مزا چکھتا ہے

مثنوی شریف میں ہے:

قوت از حق خواہم و توفیق ولاف ۔۔۔ تا بسوزن بر کنم ایں کوہ قاف

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ سے ہی قوت و توفیق و مدد چاہتا ہوں۔ تاکہ سوئی سے کوہ قاف کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکوں۔

تفسیر عالمانہ

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یہ ساتواں انعام ہے۔ یعنی اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر بادل کو سایہ بنایا۔ واقعہ یوں ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور دریا عبور کر کے آگے جنگل میں (جو کہ مصر و شام کے درمیان ہے) جا پڑے اس میں کوئی مکان وغیرہ نہ تھا اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ جبارین کے شہر میں داخل ہو کر ان سے لڑو۔ اس حکم کو قبول کرتے ہوئے جب شہر کے قریب پہنچے تو سنا کہ وہاں کے لوگ بڑے سرکش اور سنگ دل اور بڑے لمبے قد والے ہیں۔ ہر ایک کا قد ستر گز کا تھا ان سے لڑنے کیلئے رک گئے اور کہا: اے موسیٰ! تو اور تیرا رب جا کر ان سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سزا مقرر فرمائی کہ چالیس سال جنگل میں حیران پھرتے رہیں اور وہ جنگل بارہ فرسخ یعنی چھتیس میل لمبا چوڑا تھا۔ اس سے انہیں سخت گرمی پہنچی اور بھوک نے ستایا تو موسیٰ علیہ السلام کو عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا کہ آسمان سے نور کا ستون نازل فرمایا۔ جو رات کو ان کے ساتھ رہتا اور جس رات چاند نہ ہوتا بجائے چاند کے چمکتا رہتا اور ان پر ایک سفید بادل نرم نرم بھی بھیجا جو برسانے والے بادلوں سے نہایت اطیب تھا جو انہیں سورج کی گرمی سے بچاتا چھتری کی طرح ان کے اوپر رہتا۔ بادل کو غمام اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آسمان کو چھپا لیتا ہے اور حزن کو بھی غم اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ قلب کو ڈھانپ لیتا ہے بعد ازاں انہوں نے طعام طلب کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی۔ دعا مستجاب ہوئی۔ چنانچہ فرمایا: وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ یعنی ہم نے ترنجبین (بفتح الراء و تسکین النون) اتاری۔ یہ سفید رنگ برف کی طرف ایک طعام جو شہد جیسی گھی سے مرکب غذا تھی۔ یا مَـــن ان نعمتوں کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر بلا تکلیف اور بغیر کھیتی باڑی کرنے کے عنایت فرمائیں۔

کھمبی کے فضائل:۔ یہ بھی اسی مَن سے ہے جس کے متعلق حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: اَلْكَمْاَةُ مَنٌّ۔ یعنی کھمبی مَنٌّ سے ہے جس کا پانی آنکھوں کی شفا ہے۔

ف: ظاہر بات یہ ہے کہ صرف اس کا پانی بغیر کسی دوسری چیز کی ملاوٹ کے آنکھوں کی شفا ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے بلا قید ذکر فرمایا۔ جس میں کسی چیز کی ملاوٹ کا بیان نہیں۔

حکایت: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے تین کھمیاں نچوڑیں اوران کا پانی ایک شیشی میں بند کر کے رکھ دیا۔ اس سے میری لونڈی نے سرمہ کی طرح استعمال کیا جواللہ تعالیٰ کے فضل سے صحت یاب ہوگئی۔

بقایا واقعہ: جب وہ لوگ اس سے اکتا گئے تو کہنے لگے: اے موسیٰ علیہ السلام! ہم اس کی چاشنی سے تنگ آ گئے ہیں ہمیں گوشت چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سلویٰ نازل فرمایا۔ وَالسَّلْوٰى یعنی سلویٰ کو جنوب کی ہوا جمع کر کے ان کے سامنے کر دیتی۔ ہوا سے ان کا حلق کاٹا جاتا اور پیٹ چیرا جاتا اور بادل دور ہو جاتے۔ پھر سورج کی گرمی سے پک جاتا۔ اس کے بعد اس مَنّ کے ساتھ کھاتے (گویا سلویٰ ایک پرندہ تھا)

ف: اکثر مفسرین یوں فرماتے ہیں کہ انہیں پکڑ کر ذبح کرتے اور مَنّ برف کی طرح طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک آسمان سے نازل ہوتی رہتی اور سلویٰ بھی۔ ہر شخص کل تک کی کفایت کا روزینہ لے لیتا۔ صرف جمعہ کے روز دونوں کا اکٹھا لیتے کیونکہ ہفتہ ان کی عبادت کا دن تھا اور نہ ہی ہفتہ کو نازل کیا جاتا۔ اگر کوئی شخص روزینہ کفایت سے زائد لیتا تو وہ گل سڑ کر بدبودار ہو جاتا۔

كُلُوْا اور ہم نے کہا: کھاؤ۔ مِنْ طَيِّبٰتِ حلال چیزوں سے۔ مَا رَزَقْنٰكُمْ جو کچھ ہم نے عطا فرمایا۔ مــن و سـلـویٰ سے۔ لیکن یاد رہے کہ اسے ذخیرہ بنانے کی خاطر نہ اٹھانا اور نہ ہی میری نافرمانی کرنا لیکن انہوں نے ضرورت سے زائد اٹھایا اور گوشت کو خشک کر کے رکھا۔ اس خطرہ سے کہ شاید ختم ہو جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہمیشہ تک جاری رہتا۔ طیب ہر اس شئے کو کہتے ہیں کہ جس سے نہ طبع نفرت کرے اور نہ شرع کراہت کرے۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا اور ہم نے ظلم نہ کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اس بہت بڑی نعمت سے ناشکری کر دی اور رکاوٹ کے باوجود بھی اسے ذخیرہ کرنے لگے اور نہ ہی ہمارے حق کا خیال رکھا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے کہ میرے عذاب کی طلب کی اور وہ رزق جو ان پر بلا مشقت و بلا تکلیف نازل ہوتا تھا۔ ناشکری کر کے اسے بند کرا دیا۔ وہ طعام ایسا تھا کہ نہ دنیا میں انہیں تکلیف اور نہ آخرت میں ان سے حساب ہم نے وہ طعام ان سے ہٹا لیا جب کہ انہوں نے ہم سے بھروسہ چھوڑ دیا۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

سالہاں خوردی وکم نامد زخور ترک مستقبل کن و ماضی رانگر

ترجمہ: تو نے بہت سال کھایا لیکن کم نہ ہوا مستقبل کا خیال چھوڑ کر ماضی کوغور سے دیکھ۔

حدیث شریف:۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو نہ کوئی طعام بدبودار ہوتا اور نہ گوشت خراب ہوتا اور اگر بی بی حوا علیہا السلام کی خیانت نہ ہوتی تو ہمیشہ تک عورتیں اپنے شوہروں کی خیانت نہ کرتیں۔ کیونکہ بدبو اس وقت سے شروع ہوئی۔

قاعدہ یہ کہ جو شخص کسی امر کی ابتداء کرتا ہے تو وہ امر دوسرے کے لئے سبب بنتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کے لئے خیانت جاری رہے گی۔ ان کی ماں نے سب سے پہلے یوں خیانت کی کہ ابلیس کی بات مان کر گندم کا دانہ کھالیا پھر آدم علیہ السلام کے پاس آ کر انہیں طرح طرح کی باتوں سے رغبت دلا کر گندم کا دانہ کھلا دیا۔ اسی روز سے عورتوں کی خیانتیں اپنے شوہروں کے لئے شروع ہوئیں۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

کرا خانہ آباد وہمخوابہ دوست خدارا برحمت نظر سوئے اوست

ترجمہ: کسی کا گھر آباد اور گھر والی موافق ہے تو سمجھو کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے۔

مسئلہ: (الاشباہ والنظائر) میں فرماتے ہیں کہ طعام جب متغیر ہو جائے اور اس کا تغیر بڑھ جائے تو وہ نجس ہے اس کا استعمال حرام ہے۔

مسئلہ: تیل، دودھ اور گھی جب بدبودار ہو جائیں تو ان کا استعمال حرام نہیں۔

تفسیر صوفیانہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو غربت کی سزا دی تو عین اس غم میں رحمت سے بھی نوازا اور انعامات عنایت فرمائے کہ ان کے سروں پر بادل کو سایہ اور من وسلویٰ جیسے بہشتی طعام بھجوائے۔ اس سفر میں نہ تو ان کے بال لمبے ہوئے اور نہ ہی ناخن بڑھے اور نہ ہی ان کے کپڑے پھٹے۔ بلکہ میل کچیل سے بھی صاف ستھرے رہے اور جو صغیر لڑکے تھے جوں جوں وہ بڑے ہوتے کپڑے بھی ان کے جسموں کے مطابق بڑھتے رہے اور سورج بھی اپنی شوخی سے باز رہا۔ اسی طرح اس کا حال ہے جس نے اپنا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ تو اس کے لئے بھلائی کے اسباب تیار ہو جاتے ہیں لیکن بنی اسرائیل کی

شومئ قسمت کہ وہ الٹا خرابیوں کی طرف جھک گئے۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ یعنی امر شرع کے مطابق تم ہمارے رزق کو کھاؤ۔ وَمَا ظَلَمُوْنَا یعنی جب کہ انہوں نے شرعی امور میں اپنی طبع کے مطابق تصرف کرنا شروع کیا تو انہوں نے ہمارا کیا بگاڑا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ انہوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا حرصِ دنیا اور شہواتِ نفسانیہ کی طرف جھک گئے۔

ف: تنویر میں فرماتے ہیں کہ جس امر میں تمہارا داخلہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتا ہے تو اس کی تولیت اللہ تعالیٰ خود اپنے ذمہ کرم لگا لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے تجھے اس کی امداد شاملِ حال رہتی ہے اور اگر تو اپنی مرضی کے مطابق اس امر کو شروع کرتا ہے تو پھر تجھے نفس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ (پھر وہ جس گھڑے میں ڈال دے)

حکایت:۔ ایک شخص جنگل میں جا رہا تھا اسے پیاس نے ستایا تو بڑی تلاش کے بعد اسے کنواں مل گیا۔ کنویں پر پہنچا تو پانی خود بخود باہر آ گیا۔ اب وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہنے لگا یا الٰہ العالمین! مجھے یقین ہے کہ تو اس پر قادر ہے، لیکن مجھے تو اتنی طاقت بھی نہیں کہ اس سے پانی اٹھا کر پیوں۔ براہ کرم کسی اعرابی کو بھیج تا کہ وہ اس سے چلو بھر کر میرے منہ میں ڈالے مجھے یقین ہے کہ یہ بھی تیرے الطاف خفیفہ سے ہے۔ لیکن میں تیری تدبیر سے بھی بے خوف نہیں ہوں۔

سبق: بندے کو اس کی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مغرور نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے چاہیے کہ اس کی نعمتوں کے شکر کی ادائیگی میں جدوجہد کرے اور نعمتوں کو فرمانبرداری میں صرف کرنے کی کوشش کرے ورنہ گمراہ ہو کر بدبختی کا شکار ہو جائے گا۔

حضرت شیخ ابو عبد اللہ قرشی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جو شخص (ولی) اور خوارق عادات سے کراہت نہیں کرتا جیسے عامی آدمی اپنے گناہوں سے کراہت نہیں کرتا وہ حق کے مابین حجاب اور رحمت و نعمت کے لئے اس سے پردہ بن کر ثابت ہو گی جیسے وہ کبھی سعادت کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح وہ شقاوت و استدراج کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔

جیسے کہ مثنوی شریف میں ہے:۔

بندہ می نالد بحق از درد و نیش   صد شکایت میکند از رنج خویش

حق ہمی گوید کہ آخر رنج و درد | مرترا لابہ کناں اودوست کرد
این گلہ زاں نعمتی کن کت زند | از یا ددر مطرودت کند!

ترجمہ :۔ ا۔بندہ اپنے درد والم سے حق کے آگے روتا ہے اپنے درد و رنج کی ہزاروں شکایتیں عرض کرتا ہے۔۲۔حق تعالیٰ اسے کہتا ہے کہ رنج و درد تیرے ساتھ مذاق کرتے ہیں کہ یہ تو مجھے دوست سے نصیب ہوتے ہیں۔۳۔یہ گلہ تجھے نعمت سے ہونا چاہیے جو تجھے حق تعالیٰ سے مردود بناتی ہے۔

سبق: مومن سالک کے لئے ضروری ہے کہ ذات وصفات وافعال سے مستغنیٰ ہوکر امر ونہی پر ہر حال میں عمل پیرا ہوتا کہ وہ صدیقین اور اہلِ یقین سے ہوجائے۔اے اللہ ہمیں ان لوگوں سے بنادے جو ہر آن تیرے ساتھ ہوتے ہیں اور اپنے تمام معاملات میں تجھے مقدم رکھتے ہیں۔ آمین آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم۔

تفسیر صوفیانہ وَاِذْ قُلْنَا یہ آٹھواں انعام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر شہر کا داخلہ مباح کر کے جنگل کی وحشت دور فرمائی یعنی یاد کرواے بنی اسرائیل! جب کہ تمہارے آباء کو جنگل کی تکلیف سے نجات پانے کے بعد ہم نے فرمایا: اُدْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ اس گاؤں میں داخل ہوجاؤ۔قریہ کی نصب علی الظرفیہ ہے۔بیت المقدس کو قریہ سے تعبیر فرمایا اور قریہ کے قاف کو بالفتح و بالکسر وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہوں قری (بمعنی جمع ہونا) سے ماخوذ ہے۔ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا بغیر روک ٹوک کے خوشگوار جہاں سے چاہو کھاؤ۔

رَغَدًا کی نصب علی المصدریہ ہے۔ كُلُوْا سے حال ہے۔ ای راغدین متوسعین اس میں اشارہ ہے کہ انہیں داخلہ کا حکم اقامت وسکنیٰ کے لئے تھا۔ تیسیر میں فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے ہر شئے مباح کی اور تم پر فراخی کردی کہ اس میں عیش کرو۔ جہاں سے چاہو نہ کوئی تنگی ہے اور نہ کوئی رکاوٹ۔ ہر شئے کا مالک کردیا۔ بطریق غنیمت کے اور صرف کھانے کا ذکر اس لیے ہے کہ اصلی مقصود وہی ہے۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ یعنی قریہ کے ابواب کے کسی دروازہ سے داخل ہوجاؤ اس کے اس وقت سات دروازے تھے اور اس سے مراد دوسرا باب ہے جسے ہمارے زمانہ میں باب الحطہ اور باب القبہ کہتے ہیں۔جس میں موسیٰ وہارون علیہما السلام عبادت کرتے اور بنی اسرائیل ساتھ ہوکر اس میں نماز ادا کرتے۔ سُجَّدًا یعنی سر کو تواضعاً نیچے

کرتے ہوئے جب کہ اس کا حقیقی معنی کیا جائے یا یہ سجدے کرتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری میں کہ اس نے تمہیں جنگل سے نکالا تو یہ معنی شرعی ہوگا۔

وَقُولُوا حِطَّةٌ حطہ بالخبر یہ مرفوع ہے۔ اس کا مبتدا محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی۔ مَسْئَلَتُنَا مِنَ اللّٰهِ اَنْ يُّحطَّ ذُنُوبَنَا۔ یا منصوب ہے۔ "اَیْ حُطَّ عَنَّا ذُنُوبَنَا حِطَّةً بعض کہتے ہیں کہ اس سے کلمہ شہادت مراد ہے۔ یعنی تم وہ کلمہ شہادت کہو جو گناہوں کو گرا دینے والا ہے۔ یعنی اور کہو: حِطَّةٌ

نَغْفِرْ لَكُمْ مجزوم ہے۔ اس لیے کہ امر کا جواب ہے۔ نغفر غفر سے مشتق ہے بمعنیٰ ستر ای نستر علیکم۔ ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے۔ خَطٰيٰكُمْ خطية۔ خطاء سے (جو کہ صواب کی ضد ہے) مشتق ہے۔ یعنی اس کے طفیل تمہیں سزا نہیں دی جائے گی۔ جب کہ تم اس سجدہ اور دعا کے امر کو بجا لاؤ گے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اور پھر تائب ہوئے۔ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ہم ان میں محسنین کو اپنے فضل سے ثواب میں بڑھائیں گے اور ان سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے گوسالہ پرستی نہ کی۔ الْمُحْسِنِيْنَ اسے کہتے ہیں جو اپنے اور غیر کے فعل میں نیکی کرے۔ بعض کہتے ہیں: محسن وہ ہے جو عقیدہ توحید پر مداومت کرے اور اپنے نفس کے جملہ امور کو ٹھیک رکھے اور ادائیگی فرائض میں چست و چالاک رہے اور برائیوں سے رُکے۔ بعض کہتے ہیں: محسن وہ ہے جو ان اعمال پہ پابند ہو جو نفس کو سنواریں اور شرعاً محمود ہوں۔

ف: اس جملہ کو امر کے جواب سے بدل بنا کر وعدہ کے ساتھ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ محسن دائماً زیادتی ثواب کے در پے رہتا ہے۔ اگر چہ حِطَّةٌ نہ بھی کہے اور استغفار کرے پھر تو سبحان اللہ! مختصر یہ کہ ان کو دو چیزوں کا حکم ہوا۔ عمل یسیر اور قول صغیر ہے یعنی داخلہ کے وقت سر جھکا کر منہ سے حِطَّةٌ پکاریں تا کہ گناہ معاف اور حسنات میں زیادتی نصیب ہو۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی ظالموں نے استغفار اور توبہ کے لفظ کو معصیت سے تبدیل کر ڈالا۔ قَوْلًا یعنی دوسرا وہ جو مامور بہ کے خلاف تھا (بدل) کا مفعول ثانی محذوف ہے۔ غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ، غَيْرَ الَّذِيْ قَوْلًا کی صفت ہے۔

سوال: بدل میں مغایرت کا مفہوم تو نکل سکتا تھا، اسے دوبارہ ذکر کرنے میں کیا فائدہ؟

جواب: تا کہ ان کی مخالفت پر نص ہو اور معلوم ہو جائے کہ ان کی مخالفت ہر طرح تھی قولاً بھی اور فعلاً بھی۔

ف: مروی ہے کہ انہوں نے حِطَّۃٌ کی بجائے حنطۃ (گندم) کہا۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بولی میں حِطَّۃٌ کے بجائے حطا سمقانا (یعنی سرخ گندم) اور اس سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی حقارت مقصود تھی۔

ف: حضرت مجاہد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ قریہ کا دروازہ بہت نیچے رکھا گیا تا کہ وہ داخل ہوتے وقت اپنے سر سجدہ کے لئے جھکا دیں۔ لیکن چونکہ وہ سجدہ کے منکر تھے اسی لیے اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ اس وقت انہوں نے قولاً کی طرح فعلاً بھی حکم کی مخالفت کی اور نیک لوگوں نے ہر طرح کی فرمانبرداری کی اسی لیے: فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا الخ فرمایا ورنہ فبدلوا ہونا موزوں تھا۔

ف: ظاہری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف قولاً مخالفت کی عملاً نہیں جیسا کہ بعض جماعت کا خیال ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی مخالفت جس طرح قولاً تھی اسی طرح عملاً بھی۔ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اس امر کو تبدیل کیا جس کا انہیں حکم ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا امر بھی تو ایک قول ہے۔ اس بنا پر انہوں نے تمام امر الٰہی کی مخالفت کی۔ فَاَنْزَلْنَا۔ ان کی مخالفت کے بعد۔ عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ہم نے ظالموں پر نازل کیا یعنی ان لوگوں پر جنہوں نے ہمارے فرمان کو تبدیل کیا۔

سوال: عَلَيْهِمْ کیوں نہ فرمایا تا کہ کلام مختصر ہوتا۔ حالانکہ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اس سے قبل بھی گذر چکا ہے؟

جواب: اس سے تکرار لازم آیا۔ اس سے قبل الْمُحْسِنِيْنَ کا لفظ بھی گذرا ہے۔ اگر عَلَيْهِمْ کہتے تو الْمُحْسِنِيْنَ کے دخول کا احتمال ہوتا اور الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا سے تکرار لازم نہیں آتا اس لیے کہ ظلم کا اطلاق صغیرہ اور کبیرہ ہر دونوں پر ہوتا ہے اور فسق صرف کبائر کے لئے مستعمل ہوتا ہے یہاں ظلم سے کبیرہ گناہ مراد ہیں کیونکہ اس کے بعد فسق کا ذکر آ گیا۔ اس قرینہ سے ظلم کا معنیٰ گناہ کبیرہ ہوگا اور پہلے ظلم سے صغیرہ مراد ہے۔

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ ہم نے ان پر وہ عذاب مقدر کیا جو آسمان سے نازل ہوا۔ رِجْزًا کی تنوین تہویل و تفخیم کے لئے ہے بِمَا یہ ما مصدریہ ہے۔ كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ یعنی یہ عذاب انہیں اس لیے مل رہا ہے کہ وہ طاعتِ الٰہی سے نکل گئے۔ رِجْزًا دراصل اس مکروہ شئے کو کہتے ہیں جس سے طبیعت نفرت کرے۔ اسی طرح رجس سے یہاں طاعون مراد ہے۔ مروی ہے کہ صرف ایک گھڑی میں چوبیس ہزار افراد مر گئے اور یہ بیماری ان کے لئے لگاتار رہی یہاں تک کہ ستر ہزار افراد فوت ہوئے۔

طاعون کے فضائل و مسائل:۔

حدیث شریف:۔ حدیث شریف میں ہے کہ طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر یا پہلے لوگوں پر نازل کیا گیا۔ جس گاؤں کے متعلق تمہیں معلوم نہیں وہاں طاعون ہے تو اس گاؤں میں ہرگز نہ جاؤ اور اگر تمہارے گاؤں میں طاعون آجائے تو اس سے ہرگز نہ نکلو۔

حدیث شریف:۔ حدیث شریف میں ہے کہ میرے پاس حضرت جبریل علیہ السلام بخار اور طاعون دونوں کو لائے۔ میں نے بخار کو مدینہ شریف میں رہنے کا حکم دیا اور طاعون کو شام کی طرف بھیج دیا پس طاعون میری امت کے لئے رحمت ہے اور کافروں کے عذاب۔

مسئلہ : طاعون میں مرنے والا شہید ہے اور قبر کے عذاب سے بھی محفوظ رہے گا اسی طرح طاعون میں صبر کرنے والا اگر چہ طاعون کے بغیر کسی دوسری بیماری میں مرجائے تو قبر کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔ کیونکہ وہ مرابط فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔ خلاصہ یہ کہ طاعون کی بیماری اور اسہال اور استسقاء سے مرنے والا بھی شہید ہے کیونکہ مرتے دم تک اس کا ذہن اور عقل صحیح رہتا ہے۔

مسئلہ : سل کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے اسی طرح پانی میں غرق ہونے والا اور دیوار کے نیچے دب کر مرنے والا شہید ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرنے والا تو شہید ہے ہی۔

مسئلہ : ذات الجنب اور جل کر مرنے والا شہید ہے جو عورت وضع حمل کے وقت مرجائے وہ بھی شہید کے حکم میں ہے۔

مسئلہ : جو اچانک کی موت مرے اور سرسام یا برسام اور بخارات اور قولنج اور پتھری سے مرنے والے شہید کے حکم میں داخل نہیں۔ اس لیے کہ ان کی عقلیں شدت درد سے مختل اور دماغوں پر ورم اور مزاجوں میں فساد آجاتا ہے۔

ف : طاعون ایک مرض ہے جو لوگوں میں اکثر واقع ہوتا ہے لیکن وہ صرف ایک قسم کی بیماری ہے اور وباء عام بیماری ہے کبھی تو وہ طاعون کے ساتھ آجاتی ہے اور کبھی اس کے بغیر۔

حدیث شریف:۔ حدیث شریف میں ہے: فناء امتی بالطعن و الطاعون

(میری امت طعن اور طاعون سے فنا ہوگی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے پوچھا کہ طعن تو ہم جانتے ہیں اور طاعون کیا شئے ہے؟ آپ نے فرمایا: ورجزا عدائکم من الجن (تمہارے اعداء جنوں کی سزا کو طاعون کہا جاتا ہے) لیکن ہر دونوں سے مرنے والا شہید ہوگا۔

ف: ابن الاثیر فرماتے ہیں: طعن بمعنی تیر سے قتل کرنا اور رِجزًا بمعنی طعن بلا نفاذ ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے منافی نہیں جو آپ نے فرمایا: غدۃ کغدۃ البعیر تخرج فی مراق البطن طاعون اونٹ کے غدہ کی طرح ایک غدہ ہے جو مراق بطن سے خارج ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن مراق بطن کی رگ میں نشتر لگاتا ہے اس کی نشتر اندازی سے ایک غدہ نکلتا ہے جن کی نشتر اندازی غدہ کے خروج کا سبب بنتی ہے اور غدہ گوشت کے اندر سے نکلتا ہے اور مراق پیٹ کے نچلے حصہ پر ہے۔

حدیث شریف:۔ حدیث شریف میں ہے: اذا بخس المکیال حبس القطر اذا کثر الزنیٰ کثر القتل و اذا کثر الکذب الھرج یعنی جب تول میں کمی ہوگی تو بارش بند ہو جائے گی اور جب زنا بکثر ہو جائے گا تو خون ریزی بہت واقع ہوگی اور جب جھوٹ عام پھیل جائے گا تو فتنے اور فساد برپا ہو جائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ زنا سے جیتے جی کو مار ڈالنا ہے کیونکہ جو نطفہ زنا سے ٹھہرا وہ حکمی طور پر مارا گیا۔ اسی لیے اس کی سزا فوری موت مقرر ہے۔ (یعنی سنگساری) کیونکہ عمل کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔ اسی لیے تو کم تولنے کی سزا بارش کی بندش بندوں کے رزقوں کی کمی کا باعث ہے یونہی کذب کو سمجھو کہ وہ بندوں میں تفرقہ اور عداوت کا موجب ہے۔ اس لیے اس کی سزا بھی ہرج متعین ہوئی جو کہ فتنہ اور فساد کا سبب ہے۔

سوال: طاعون اس جیسی اور بیماری کو عام کیوں کر دیا جاتا ہے؟

جواب: تاکہ وہ بیماری شیطانوں کے لئے عذاب اور اہلِ ایمان کے لئے شہادت اور رحمت ثابت ہو۔ کیونکہ موت مومن کے لئے تحفہ اور فاسق کے لئے حسرت ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہر ایک کو قیامت میں اعمالِ دنیا کے مطابق اٹھائے گا اور اجر و سزا ہوگی۔

مسئلہ : طاعون سے بھاگنا حرام ہے۔ کیونکہ طاعون سے بھاگنا اپنے مالکِ مختار کو فراموش کرنے کا ثبوت دینا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ طاعون سے بھاگنے والے اور مقیم کے لئے خود طاعون فتنہ ہے بھاگنے والا کہے گا کہ مجھے اس سے بھاگنے سے نجات ملی اور مقیم کہے گا کہ میں ٹھہر گیا اس لیے مجھے موت آئی۔

حدیث شریف :۔ حدیث شریف میں ہے کہ طاعون سے بھاگنے والا جنگ سے بھاگنے والے کی طرح ہے اور اس میں صبر کرنے والا جنگ میں صبر کرنے والے کی طرح ہے۔

ف: زحف سے وہ جنگ مراد ہے جس میں مخالف کی جماعت بکثرت معلوم ہوتی ہو اس فرار سے لشکر سے جنگ میں بھاگ جانا مراد ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ اسے مثل اور ضعف سے مقید کیا جائے۔

مسئلہ : اس حدیث سے ثابت ہوا کہ طاعون سے بھاگنا حرام ہے کیونکہ یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔

نکتہ : ہوسکتا ہے کہ اس جنگ سے بھاگنا کوتاہی عمر کا سبب بن جائے جیسے کہ جہاد سے بھاگنا قصر عمر کا سبب بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (فرمایئے تمہیں بھاگنا نفع نہ دے گا اگر موت یا قتل سے بھاگو گے تو اس وقت تم زندگی کا نفع نہ اٹھاؤ گے مگر تھوڑا)

مسئلہ : فرار کی نیت کے بغیر کسی اور وجہ سے چلا جانا جائز ہے۔ لیکن رخصت کے لئے چند شرائط ہیں اور ہیں بھی سخت۔ صرف محدود افراد اس پر کامیاب ہوسکیں گے۔

۱۔ اعتقاد کی حفاظت۔ ۲۔ مرض کے اسباب عادیہ سے احتراز مثلاً چلنے سے یہ نہ سمجھے کہ بیماری اسی ہوا سے پھیلی ہے وغیرہ وغیرہ۔ موت سے بچنے کے لئے مختلف تدابیر سوچنا بیوقوفی اور عبث فعل ہے۔ اس کی حرمت کو عوام الناس جانتے ہیں پھر خواص کا کیا کہنا۔

ف: بعض بیماریاں متعدی ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں بھی اذنِ الٰہی کا تصور ذہن میں ضرور رہے حدیث شریف میں ہے: حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان من القرف التلف یعنی بعض ملاقاتیں ہلاکت ہیں قرف بالتحریک بمعنی بیماروں سے ملنا جلنا۔

سوال: حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا عدویٰ۔ یعنی کسی ایک کی

بیماری دوسرے کو نہیں لگتی۔ یہ تو پہلی حدیث کے خلاف ہے؟

جواب : اس میں طبعی تعدی کی نفی ہے۔ مطلقاً سرایت کی نفی نہیں چونکہ جاہلیت کے لوگ تعدی کے قائل تھے اس لیے ان کے غلط نظریہ کو دور کرنے کے لئے یہ ارشاد ہوا عوام اور مبتدی سالک کی ایک اسباب پر نظر ہونی چاہیے اور متوسطین کو توکل کا کاربند ہونا چاہیے اور کاملین کے احوال کسی معاملہ کے پابند نہیں۔ توکل اور تسبب ان کے ہاں یکساں ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے:

در حذر شوریدن شور و سراست ۔۔۔ رو توکل کن توکل بہتر است

با قضا پنجہ مزن اے تند و تیز ۔۔۔ تا نہ گیرد ہم قضا با تو ستیز

مردہ باید بود پیش حکمِ حق! ۔۔۔ تا نیاید زخم از رب الفلق

ترجمہ : ۔ا۔ خطرہ کے وقت شور مچانا شور و فغان ہے جا توکل کر اس لیے کہ توکل بہتر ہے۔ ۲۔ اے تند و تیز مزاج قضا سے پنجہ نہ اڑا تا کہ تیرے ساتھ قدر کی جنگ نہ ہو جائے۔ ۳۔ حکم الٰہی کے آگے مردہ کی طرح ہونا چاہیے تا کہ تجھے رب الفلق سے سزا نہ ہو۔

حکایت : جالینوس نے اپنے شاگردوں کو دو ٹکیاں فندق کے برابر کی دے کر فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد ایک کو لوہے کی سنان پر رکھ دینا اور دوسری کو پانی کے بھرے ہوئے گھڑے میں ڈال کو توڑ دینا۔ اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا تو جس گولی کو لوہے کے سنان پر رکھا گیا تو لوہے کی طرح بہ کر نیست و نابود ہو گیا اور جسے پانی میں ڈالا گیا تو پانی منجمد ہو کر پتھر بن گیا۔

حکماء فرماتے ہیں: جالینوس کا اس سے مطلب یہ تھا کہ میرے پاس وہ ادویہ موجود ہیں جو لوہے جیسی شدید شے کو پانی پانی کر سکتی ہیں اور بہتے ہوئے پانی کو بہنے سے روک سکتی ہیں لیکن موت ایک ایسا مرض ہے کہ جس کا کوئی علاج نہیں کسی نے کیا خوب فرمایا:

الا یا ایہا المغرور رتب من غیر تاخیر ۔۔۔ فان الموت قدیاتی ولو میرت قارونا

بسل مات ارسطالیس بقراط بافلاج ۔۔۔ وافلاطون بسرسامٍ وجالینوس مبطوفاً

ترجمہ : ۔ اے دھوکہ میں آیا ہوا انسان جلد گناہوں سے توبہ کر لے۔ کیونکہ موت ضرور آئے گی۔ اگر چہ قارون جیسا بھی مالدار بن جائے۔ ارسطو سل سے مرا اور بقراط فالج سے اور افلاطون برسام سے اور جالینوس اسہال سے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو فوراً اس میں سے

مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن

بارہ چشمے بہہ نکلے ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا کھاؤ اور پیو خدا کا دیا

رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن

اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو ۔ اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے

نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ

تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں

مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ

ہمارے لئے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو

الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ

بہتر کے بدلے مانگتے ہو اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ

جو تم نے مانگا اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلہ تھا

بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ

اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے

ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور حد سے بڑھنے کا۔

تفسیر عالمانہ

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى یہ دیگر نعمت ہے جس کا بنی اسرائیل نے کفران کیا۔ یعنی یاد کرو اے بنی اسرائیل! جب موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی طلب کی۔ لِقَوْمِهٖ اپنی قوم کی خاطر یہ اس وقت تھا جب جنگل میں پیاس سے مر رہے تھے تو موسیٰ علیہ السلام کے ہاں فریادی ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے پانی طلب کیا فَقُلْنَا پس ہم نے وحی کے ذریعہ فرمایا کہ: اضْرِبْ بِّعَصَاكَ اپنے عصا کو مارو وہ جنت کے مورد کے درخت سے تیار شدہ تھا جس کا طول بمطابق موسیٰ علیہ السلام کے قد مبارک کے دس گز تھا اس کی شاخیں تھیں جو اندھیرے میں روشن ہو جاتی تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بہشت سے اٹھایا تھا۔ نوارثاً انبیاء علیہم السلام کو ملتا رہا۔ یہاں تک کہ شعیب علیہ السلام کے ہاں پہنچا پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیدیا۔ الْحَجَرَ لام عہد کی ہے۔ مخصوص پتھر کی طرف اشارہ ہے۔

حجرِ موسوی کا واقعہ: ۔ مروی ہے کہ یہ پتھر طوری تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ اٹھا رکھا تھا بالکل ہلکا اور آدمی کے سر کی طرح چوڑا تھا۔ اس کی طرفین چار تھیں اور ہر طرف میں تین آنکھیں تھیں۔ یا یہ وہ پتھر تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے اٹھا کر بھاگ گیا تھا جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے نہاتے وقت اپنے کپڑے اس پر رکھے اور وہ قوم کے پاس پہنچا۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے اس کی برأت ظاہر کی ہے جس کے متعلق قوم موسیٰ علیہ السلام کو ایک عیب لگاتی تھی۔ جبریل علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ اس کو اٹھا لیجئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور تیرے لیے معجزہ بن کر رہے گا۔

حدیث شریف: ۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

بنی اسرائیل کی عادت تھی کہ وہ نہاتے وقت ایک دوسرے کے ستر کو دیکھا کرتے لیکن موسیٰ علیہ السلام اس قبیح عادت سے بَری تھے۔ وہ اکیلے جا کر غسل فرماتے ایک دن اپنے کپڑے پتھر پر رکھے تو وہ کپڑے لے کر بھاگا اور موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے ہو لیے جب قوم کے نزدیک پہنچے تو انہیں دیکھ کر کہنے لگے کہ انہیں تو اُدرہ نہیں ہے اور وہ بالضم خصیہ کی پھونک (موٹاپن) کو کہا جاتا ہے۔ یا الحجر کی لام جنس کی ہے یعنی اپنا عصا ایسی شئے کو مارو جو کہ پتھر کی جنس سے ہو اور حجۃ میں یہی زیادہ ظاہر ہے کیونکہ کسی ایک پتھر پر عصا مار کر پانی نکالنا زیادہ دلالت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ثبوت میں بہ نسبت معین پتھر کے کیونکہ احتمال ہوگا کہ

شاید اس مخصوص پتھر میں پانی کی تاثیر موجود ہو جیسا کہ مخصوص پتھر میں مقناطیس ہوتا ہے کہ لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔

فَانْفَجَرَتْ پس انہوں نے مارا جس سے بہ نکلے۔ اضْرِبْ محذوف کے ساتھ متعلق ہے اور انفجار بمعنی انسکاب اور بخاس بمعنی ترشح۔ پہلے پانی اچھلتا ہے پھر بہتا ہے۔ مِنْهُ اس پتھر سے۔ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا بارہ چشمے میٹھے پانی کے۔ قوم کی تعداد کے مطابق بہ نکلے تاکہ ہر قبیلہ کا علیحدہ چشمہ ہو۔

فائدہ: جب کسی جگہ پر نازل ہوتے تو عصا مارتے تو پانی بہنا شروع ہو جاتا۔ جب کوچ کرتے تب بھی عصا مارتے تو پانی بند ہو جاتا۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ ہر ایک نے بارہ قبیلوں میں سے جان لیا۔ مَشْرَبَهُمْ یعنی اپنا خاص چشمہ یا اپنے پانی پینے کی جگہ تاکہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے پانی پر نہ جائے۔ مشرب مصدر میمی ہے یا ظرف مکان ہے۔

بارہ چشمے کیوں تھے:۔ چونکہ ان بارہ قبیلوں کی اپنی اپنی جماعت تھی اور ایک دوسرے پر فوقیت رکھنے کا شوق رکھتے تھے اسی لیے ایک قبیلہ کا آدمی دوسرے قبیلہ میں عقد نکاح نہ کرسکتا تھا۔ محض طبعی فاخرانہ عادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے ہر ایک قبیلہ کے لئے علیحدہ علیحدہ نہر تیار کردی تاکہ خود بھی پئیں اور جانوروں کو بھی پلائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نہ لڑیں نہ جھگڑیں اور پتھر کے ہر ایک گوشے کی تین راہوں سے ایک ایک چشمہ بہتا ہوا نہروں کی شکل بنکر ہر قبیلہ کے پاس پہنچتا اور وہ چھ ہزار افراد تھے اور لشکر بارہ میل تک پھیلا ہوا تھا۔

سوال: اللہ تعالیٰ قادر ہے بغیر پتھر کے پانی جاری کرسکتا تھا اور عصا کی ضرورت کے بغیر نہریں جاری فرما سکتا تھا۔ عصا کے ذریعے پانی بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: یہ اس کی حکمتِ بالغہ ہے کہ مسببات کو اسباب سے متعلق کرتا ہے تاکہ بندے اپنی مراد کو اسباب سے حاصل کریں پھر ان اسباب کے ذریعہ ان کے لئے ثواب مرتب ہو اور آخرت میں سزا و جزا مقرر ہو سکے۔

منکر معجزہ کی تردید:۔ جو شخص اس جیسے معجزہ کا منکر ہے وہ اپنی جہالت و قلب تدبر کا ثبوت دیتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کریمہ سے یہ بات بعید سمجھی کیونکہ جب پتھر سے یہ بات ممکن مانتا ہے کہ پھر بال کاٹ اور لوہے کو کھینچ سکتا ہے تو کون سی شئے مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں زمین میں سے پانی نکالنے کی قدرت پیدا کردے یا ہوا کو اطراف سے کھینچ لے جس میں تدبر کی قدرت ہے اس کے سبب سے پانی ٹھنڈا ہو جائے۔

محمدی وموسوی معجزہ کا موازنہ:۔

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں سے جو معجزات دکھلائے وہ بہت بڑے معجزات شمار کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ رات دن پتھروں سے پانی نکل رہا ہے۔ لیکن جو معجزہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا وہ پہلے کسی نبی علیہ السلام سے ہرگز ہرگز ظاہر نہیں ہوا۔ کیونکہ گوشت اور خون سے پانی کا نکلنا ایک لاحل عقدہ ہے اس بات کی [1] تہہ کو پہنچنے والا نہ کوئی دماغ اور نہ کوئی میٹر آج تک پیدا ہوا نہ آئندہ ہوگا عجز کے سوا چارہ نہیں گویا حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بھی تا قیامت اس قدر پر زور عاجز کن ہیں کہ کسی کو کچھ کہنے کی مجال ہی نہیں۔ كُلُوْا یہاں قُلْنَا مقدر ہے یعنی ہم نے کہا یا انہیں کہا گیا کہ کھاؤ۔ وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وہ جو ہم نے من و سلویٰ اور پانی عنایت فرمایا کھاؤ اور پیو۔ اکل کا تعلق پہلے دو یعنی من و سلویٰ سے اور شرب کا تعلق پانی سے ہے۔

سوال: من رزقنا کیوں نہ فرمایا۔ حالانکہ فَقُلْنَا سابقہ کا تقاضا یونہی ہے کہ رزقنا ہونا چاہیے۔؟

جواب: اشارہ ہے کہ اکل وشرب کا حکم بذریعہ خطاب نہ تھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے تھا۔

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ ''عثی'' بمعنی سخت فساد برپا کرنا یعنی انہیں کہا گیا کہ فساد میں سرکشی مت کرو۔ درآنحالیکہ تم فساد کرنے والے ہو۔ اس حال سے ان کی تعریف مقصود ہے کہ وہ فساد میں رہتے ہیں۔ عامل کو مقید کرنا مطلوب نہیں ورنہ معنیٰ یوں ہوگا۔ تمادوا فی العناد حال کونکم مصلحین اور یہ بالکل ناجائز ہے۔ نیز یوں ہو کہ عَثٰی کا اصل معنیٰ ہے: مطلقاً تعدی۔ اگرچہ بمعنیٰ فساد میں اکثر آتا ہے پس حال سے مقید کرنا عامل کے معنیٰ کو خاص کرنا ہے۔

امتِ محمدی کی امتِ موسوی وغیرہ پر فضیلت:

آیت سے امتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام کی فضیلت پر دلالت ہو رہی ہے کہ بنی اسرائیل جب پانی کے محتاج ہوں تو موسیٰ علیہ السلام کو عرض کریں اسی طرح بقل و قثاء وغیرہ کے محتاج ہو کر موسیٰ علیہ السلام کو

[1] ۔ یہ عبارت ہماری ہے بطور تبصرہ بر تفسیر امام قرطبی علیہ الرحمہ ۔اویسی غفرلہٗ

کہتے رہے۔لیکن ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ تم جب محتاج ہو تو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کرو۔ چنانچہ فرمایا: اُدْعُونِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یہ بہت بڑی بشارت ہے۔ دوسرا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی وغیرہ طلب کیا اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے مائدہ مانگا۔لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے مغفرت چاہی اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ چنانچہ فرمایا: وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طلب پر قوم کی ضرورت پوری کردی تو ہمیں بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال پورا فرمالیا ہوگا۔

مسئلہ: آیت سے ثابت ہوا کہ پانی طلب کرنے کے لئے دعائیں کرنا جائز ہے۔ یہ اس وقت جبکہ بارش نہ ہوئی ہو اور اس کی ضرورت سخت ہو پس اس وقت حکم ہے کہ اپنی عبودیت اور فقیری و مسکینی و ذلت کو ظاہر کریں کیونکہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی عیدگاہ کی طرف متواضع و متذلل ہو و متخشع و متوسل و متضرع ہو کر پانی کی طلب میں کئی بار تشریف لے گئے۔

معجزہ:۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن ایک اعرابی حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور: **ھلکت الکراع والمواشی واجدبت الارض** (ہماری بھیڑ بکریاں جانور مرتے جا رہے ہیں اور زمین سوکھی پڑ گئی) دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ ہمیں بارش عطا فرمائے۔ حضور علیہ السلام نے ہاتھ اٹھائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت آسمان گویا شیشہ تھا یعنی بادل کا نشان بھی نہیں تھا ادھر ہاتھ اٹھے ادھر بادل اٹھا اور لگا برسنے۔ دوسرے جمعہ تک لگاتار بارش ہوتی رہی۔

مثنوی شریف میں ہے:

تا فرود آید بلا بے دافعے چوں نباشد از تضرع شافعے

تا سقاہم ربہم آید خطاب تشنہ باش اللہ اعلم بالصواب

ترجمہ: ۱۔ نہ ٹلنے والی بلا جب نازل ہو تو درگاہ حق میں تضرع کے سوا کوئی بہتر سفارشی نہیں۔

۲۔ پیاسا رہ تاکہ سقاہم ربہم (انہیں انکا رب پلائے گا) کا خطاب آئے۔

مسئلہ: دکھ دور کرنے کے لئے دعا نہ مانگنا اہل طریقت کے نزدیک بہت برا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ

کے ساتھ مقابلہ کرنا اوراس کی تکالیف کو برداشت کرنے کا دعویٰ کرنا ہے۔

شیخ محقق ابن الفارض قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

ویحسن اظهار التجلد للعدی ویقبح غیر المعجز عنه الا حبة

(دشمن کے سامنے اپنی طاقت ظاہر کرنا ضروری ہے، لیکن دوستوں کے سامنے قوت کا اظہار قبیح ہے)

حدیث شریف:۔

زمین چالیس مردوں سے (جو کہ خلیل الرحمٰن علیہ السلام کی طرح ہوں گے) خالی نہیں رہے گی۔ ان کی بدولت تمہیں بارش حاصل ہوتی ہے اوران کے صدقے تم مدد دیئے جاتے ہو ان میں سے جب ایک فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض دوسرا مقرر فرما دیتا ہے۔ ؎

گر نہ داری تو دم خوش دردعا رودعا ے خواہ از اخوان صفا

ترجمہ : اگر تمہیں دعا کا کوئی طریقہ نہیں آتا تو جاؤ محبوبان خدا سے دعا مانگنے کا عرض کرو۔

حدیث شریف:۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی سال دوسرے سال سے بارش میں کم نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی قوم گناہوں میں زیادہ مبتلا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان سے بارش کو پھیر کر دوسرے لوگوں کو دے دیتا ہے۔ جب سب لوگ گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش کو جنگلوں اور ویرانوں میں برساتا ہے۔

مسئلہ : شیخ با فتادہ آفندی فرماتے ہیں کہ سالک کی ترقی سنن مصطفویہ علیٰ صاحبها التحیة والثناء پر مداومت کرنے میں ہوتی ہے۔

حکایت : ایک سال حجاج کے زمانہ میں بارش بند ہوگئی۔ لوگ کئی بار نماز استسقاء پڑھ چکے لیکن کچھ نہ ہوا۔ انہیں کسی ذریعہ سے فرمایا گیا کہ اگر وہ شخص دعا کرے کہ جس کی عصر اور عشاء سے پہلی والی چار رکعتیں ترک نہ ہوئی ہوں، تو بارش ہو جائے گی ورنہ اگر چالیس سال دعا مانگتے رہو گے تب بھی بارش نہیں ہوگی۔ ایسی عادت کا

انسان بہت تلاش کیا گیا لیکن مل نہ سکا آخر حجاج نے ظاہر کیا کہ مجھ سے کبھی یہ سنتیں ترک نہیں ہوئیں۔ اس نے دعا مانگی تو فوراً بارش شروع ہوگئی۔

سبق: دیکھئے! یہ حجاج کتنا ظالم تھا، لیکن سنتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے بارش حاصل ہوگئی۔

مسائلِ استسقاء:۔

مسئلہ: استسقاء سے پہلے سب لوگ گناہوں سے توبہ کریں اور حسبِ توفیق خیرات کریں اور روزے رکھیں اور نیک لوگوں کو سفارشی بنائیں اور پانی جانوروں اور بہائم اور ضعیف لڑکوں کے لئے طلب کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے پانی عطا فرمائے گا۔

مسئلہ: داعی دعا کے وقت یقین رکھے کہ میری دعا ضرور مستجاب ہوگی۔ کیونکہ دعا قبول نہ ہونے کے تین اسباب ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ اجابت دعا سے عاجز ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کا کرم بالکل نہیں یا اللہ تعالیٰ داعی کی دعا سے بے خبر ہے اور یہ سب امور اللہ تعالیٰ کے لئے منفی ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کریم ہے عالم ہے قادر ہے۔ اجابت دعا سے عاجز ہرگز نہیں۔ وہ مومنین کے بالکل قریب ہے وہ دعا سنتا ہے اور زاری قبول کرتا ہے۔ دعا جب بھی ہو ہر وقت اجازت ہوتی ہے۔

مسئلہ: چاہیے کہ دعا کے لئے ان نیک لوگوں کو ساتھ لے جائیں جن کی اجابت میں قوی امید ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بعض کی دعا قبول فرمائے گا تو اس کے کرم کے خلاف ہے کہ باقیوں کی دعا کو رد کرے۔

حدیث شریف:۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان زبانوں سے دعا کراؤ کہ جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوئی ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی: حضور! ہم میں وہ کون ہیں جو ایسی زبانیں رکھتے ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: تمہارے بعض تمہارے بعض کے لئے دعا کریں کیونکہ نہ تو نے اس کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی بے فرمانی کی ہے اور نہ اس نے تیری زبان سے۔

مسئلہ: تفسیر الفاتحہ للفناری میں ہے کہ طلب کے وقت توجہ میں استقامت اور دعا کے وقت ندا کا ہونا ضروری ہے تا کہ قبولیت حاصل ہو۔ اس میں پھر اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اللہ تعالیٰ کو اجابت کے لئے نہ

پکار سکا کیونکہ اس کا خیال تو ان تصورات کی طرف مبذول ہے جو اس پر غالب ہیں۔ پھر اجابت دعا کا کیا معنیٰ۔

حکایت: فرعون نے قبل از دعویٰ الوہیت حکم دیا تھا کہ اس کے دروازہ پر بسم اللہ شریف لکھ دی جائے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پر وہ ایمان نہ لایا تو موسیٰ علیہ السلام نے اس پر عذاب کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی لیکن اس سے کچھ نہ ہوا۔ پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کی: یا اللہ! میں اس کے لئے التجا کر رہا ہوں، لیکن تو توجہ نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیرا خیال تو یہ ہے کہ اسے عذاب میں مبتلا کروں لیکن تو اس کے کفر کو دیکھ رہا ہے اور میں اس کے ان کلمات کو دیکھ رہا ہوں جو اس کے مکان کے دروازے پر لکھے ہوئے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسانی روح اور اس کے صفات عالم قلب میں بمنزلہ موسیٰ علیہ السلام کے ہیں کہ وہ اپنے رب سے پانی اس لیے طلب کرتے ہیں تا کہ وہ حکمت اور معرفت سے معمور ہو جائیں اور اسے **لا الہ الا اللّٰہ** والے عصا کی ضرب کا حکم ہے اور اس عصا کی دو طرفیں نفی اور اثبات کی ہیں جن سے نور چمکتا ہے جب کہ صفاتِ نفس کی تاریکیاں حملہ آور ہوتی ہیں اور اس عصا کو حضرت باری تعالیٰ کی جنت سے اٹھایا گیا اور حجرِ قلب پر مارا جاتا ہے اور یہ قلب پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ پھر اس سے بارہ چشمے حکمت کے پانی کے بہ نکلے، کیونکہ **لا الہ الا اللّٰہ** کے حروف ہیں کہ انسانی صفات کی ہر صفت نے اپنا گھاٹ معلوم کر کے **لا الہ الا اللّٰہ** کے ہر حرف کو اپنا سائق اور قائد بنالیا۔ **لا الہ الا اللّٰہ** کے چشموں سے کسی کا گھاٹ میٹھا اور اعلیٰ ذائقہ دار ہے اور کسی کا کڑوا اور بے لذت ہے۔ نفس کا چشمہ تو خواہشات وشہوات کا ہے اور قلب تقویٰ وطہارت اور اطاعت سے پیاس بجھاتی ہے اور روح کی سیرابی کشف ومشاہدہ اور اسرار سے ہوتی ہے جو اسے حقائق کے چشموں سے تجلی صفات کے پیالے ساقی کے ہاتھوں نصیب ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو باری تعالیٰ شراب میں حقیقتِ ذات کے جلوے ملا کر خوب سیراب کرتا ہے۔

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا اے حقیقت شناس لوگو! اللہ تعالیٰ کے امر سے اس کے رزق کو خوب کھاؤ اور پیؤ۔ **وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ** لیکن اس کے امر کی نافرمانی اور گناہوں کو اختیار کر کے اور دین کو دنیا سے بیچ کر کے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہوئے اور ان دونوں کو اپنے مولیٰ سے اعلیٰ سمجھ کر زمین پر فساد مت پھیلاؤ۔

(کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قُلْتُمْ ان کے اسلاف کی اور خرابی کی یاد دہانی ہو رہی ہے کہ انہوں نے نعمتِ الٰہی کیناشکری کی۔ موجودہ اہل کتاب کو بمنزلہ گذشتہ اہلِ کتاب کے قرار دے کر ان سے خطاب فرمایا، کیونکہ ان کے اور ان کے مابین اتحاد ہے اور اس قول کے قائلین وہ لوگ تھے جو جنگل سے نکل کر مــن وسـلـویٰ عطا کیے گئے۔ جب وہ اس کھانے سے اکتا گئے اور انسان کی فطرت کا تقاضا بھی یونہی ہے کہ جب ایک شئے پر مداومت کرتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ انہیں وہی پہلی معاش یاد آ گئی جو انہیں مصر میں حاصل تھی اور تھے وہ جاٹ اسی لیے ان کی طبیعتوں نے اپنی عادات کی طرف شوق کیا تو کہنے لگے: یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ طعام وہ ہے جو غذا کے کام آئے۔ اس سے مراد منّ و سلویٰ ہے۔

سوال: طَعَامٍ وَّاحِدٍ کہہ رہے ہیں حالانکہ وہ تو دو تھے۔ منّ و سلویٰ؟

جواب: ان کو آپس میں ملا کر کھاتے۔ اسی لیے واحد کہا۔ یا طعام واحد اس لیے کہا کہ اس میں تبدل و اختلاف نہ تھا۔ اگر ایک شخص کے دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے نہ ہوں ہو تو اچھا ہے، تو اس کے لئے کہا جاتا کہ ایک طعام پر اکتفا کرتا ہے۔ تفسیر بغوی میں ہے کہ عرب کی عادت ہے کہ دو چیزوں کو ایک سے تعبیر کرتے ہیں جیسے قرآن شریف میں ہے: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ حالانکہ لؤلؤ اور مرجان نمکین پانی سے خارج ہوئے تھے نہ کہ میٹھے سے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: انہوں نے کہا ہم دولت مندی پر اکتفا نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم سب غنی ہیں تو اس لحاظ سے ایک دوسرے کی امداد نہیں کرتے کیونکہ ہر ایک دولت مند ہے یہی ہیں سب سے پہلے نوکر و خادم مقرر کرنے والے۔

فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے سوال کیجئے۔ فاء سببیت کی ہے یعنی دعا سے صبر نہ کرنے کے سبب سے يُخْرِجْ لَنَا یعنی ہمارے لیے ظاہر کرے اور کوئی شئے پیدا کرے۔ مفعول محذوف ہے اور جزم امر کے جواب کے لیے ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا اجابت کا سبب تھی یعنی اگر آپ نے اپنے رب سے ہمارے لیے دعا مانگیں تو آپ کو رب ہمارے لیے ظاہر کرے۔

مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ یہ اسناد مجازی ہے۔ قابل (ارض) کو فاعل (اللہ) کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ مــن تبـعـیضیہ

اور ما موصولہ ہے۔ مِنۡ بَقۡلِهَا مِن بیانیہ ہے۔ ضمیر سے حال کے قائم مقام ہے۔ ای مما تنبت کائنا من بقلها بقل وہ سبزی جوزمین اگاتی ہے۔ لیکن یہاں پر مطلق سبزیاں مراد ہیں اور وہ چیزیں جنہیں لوگ عمل میں لاتے ہیں جیسے پودینہ وکرفہ اور گندنا وغیرہ وغیرہ۔

وَقِثَّآئِهَا کھیرا۔ یہ ایک شئے ہے جو ککڑی کے مشابہ ہوتی ہے۔ وَفُوۡمِهَا یعنی گندم۔ کیونکہ عدس، کا ذکر دلالت کرتا ہے کہ یہاں پر گندم مراد ہو۔ کیونکہ وہ اس کی جنس ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "فوم" سے مراد تھوم ہے کیونکہ بصل کا ذکر دلالت کرتا ہے کیونکہ تھوم پیاز کی جنس سے ہے۔

ابن التمجید فرماتے ہیں کہ فوم سے تھوم مراد لینا زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس کے قریب قریب بصل اور عدس کا ذکر ہوا اور عدس کو پیاز اور تھوم سے پکایا جاتا ہے۔ وَعَدَسِهَا مشہور دانہ ہے کہ جس کی کیل وزن برابر ہی ہے وَبَصَلِهَا مشہور سبزی ہے۔ اس سے ہانڈیوں یعنی سالن کو درست کیا جاتا ہے۔ قَالَ جملہ مستانفہ ہے۔ سوال مقدر کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ گویا پوچھا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یا موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کیا جواب دیا تو کہا گیا کہ اس نے بطور انکار فرمایا: اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ اپنے نفسوں کے لئے بدلتے ہو اور وہ چیز پسند کرتے ہو۔ الَّذِىۡ هُوَ اَدۡنٰى جو نہایت کم مرتبہ اور گھٹیا درجہ کی ہے۔ بِالَّذِىۡ هُوَ خَيۡرٌ اس کے عوض میں اچھی چیز کیونکہ "باء" زائل شئے کی مصاحبت میں آتی ہے نہ کہ جو شئے آنے والی ہو۔ من وسلویٰ کی لذت اور بلا مشقت حاصل ہونے کی خیریت بیّن ہے اور تھوم اور مسور اور پیاز وغیرہ کی خساست بھی ظاہر ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ گندم اگرچہ من وسلویٰ سے افضل ہے لیکن اب تو قیمت کے لحاظ سے کم ہے۔ آیت سے قطعی ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ ارادہ کیا ہو کہ من وسلویٰ بالکل نہ ہوں اور ان کے عوض وہ اشیاء ہوں اور استبدال صرف صوری ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کبھی من وسلویٰ ہو اور کبھی یہ چیزیں اسی لیے تو انہوں نے کہا: لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ

اِهۡبِطُوۡا جنگل سے نکلو اگر تمہارا ارادہ ان اشیاء کے حصول کا ہے۔ مِصۡرًا کسی ایک شہر میں۔ کیونکہ تم جنگل میں ہو اور جس چیز کے خواہشمند ہو وہ یہاں نہیں مل سکے گی۔ بلکہ اس کا حصول آبادیوں میں ہے۔

فوائد:۔ ف: ۱۔ اس مصر سے مصرِ فرعون مراد نہیں کیونکہ انہیں فرمایا گیا: يٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِىۡ

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ جب انہیں اس ارض مقدسہ کے داخلہ کا حکم دیا گیا تو اب مصر کا فرعون مراد لینا کیسے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہی مطلب زیادہ مناسب ہے۔

ف: ۲۔ مصر ہر بڑے شہر کو کہتے ہیں۔ مصر الشیء یمصرہ سے ماخوذ ہے بمعنیٰ انقطاع۔ چونکہ مصر اپنی عمارت کے اعتبار سے خالی میدان سے منقطع ہوتا ہے۔ بنابریں اس نام سے موسوم ہوا۔

ف: ۳۔ کبھی قریہ کو مصر کہا جاتا ہے جیسے کبھی مصر کو قریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ف: ۴۔ مصر منصرف بھی ہوتا ہے اور غیر منصرف بھی۔ یہاں پر منصرف ہے کیونکہ ایک غیر معیں شہر مراد ہے۔

ف: ۵۔ بعض مفسرین کہتے ہیں یہاں پر مصر فرعون ہی مراد ہے۔ لیکن اس کا منصرف ہونا سکون الاوسط کی وجہ سے ہے۔ جیسے ہِنْد" و دَعْد" اور نُوح" ہیں۔ یا تاویلاً منصرف ہے کہ اس سے شہروں سے کوئی شہر مراد ہے نہ خاص مصر پھر اس میں صرف علیت پائی گئی بنابریں منصرف ہے۔

فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ شہر میں چلے جانے کی علت ہے۔ یعنی اب تمہارے لیے وہی زمین سے اگائی ہوئی سبزیاں ہیں جن کی تمہیں طلب ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ ذلت اور خواری وَالْمَسْكَنَةُ فقر و افلاس۔

ف: فقیر کو مسکین اس لیے کہا جاتا ہے کہ فقر اسے ساکن کر دیتا ہے اور گویا چلنے پھرنے سے بٹھا دیتا ہے یعنی انہیں ہر دونوں قبلہ کی طرف محیط ہو گئے یا انہیں چمٹ گئے اور انہیں ذلت و فقر اس لیے لازم کیا گیا کہ انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ اس کی سزا یہ ملی کہ ذلت و فقر کا نشانہ ہو گئے۔ جیسے گارا دیوار کو لازم ہوتا ہے انہیں بھی فقر و افلاس یونہی لازم ہوا کہ اب یہود کو دیکھا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ دولت مند ہوتے ہیں لیکن فقراء معلوم ہوتے ہیں۔

وَبَآءُوْ راجع ہوئے۔ بِغَضَبٍ بڑے بڑے رنج کے ساتھ۔ مِّنَ اللّٰهِ جو اللہ تعالیٰ سے ہوا۔ اس کے مستحق ہوئے اور ان کو لازم ہو گیا۔ اسی محاورہ سے حضور علیہ السلام کا قول ہے: اَبُوْءُ بِنِعْمَتِكَ علی یعنی اپنے نفس پر تیری نعمت کا لازم پکڑنا اور نفس کو اس کے قریب کرتا ہوں۔

ف: اللہ تعالیٰ کے غضب کا یہ معنی ہے کہ دنیا میں ان کی مذمت کی اور آخرت میں انہیں بُری سزا دے گا۔

ذٰلِكَ ذلت و مسکنت اور عظیم غضب کا لازم ہونا۔ بِاَنَّهُمْ اس سبب سے ہے کہ یہود كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے آیات سے کفر کرتے ہیں۔ آیات سے یہی معجزات مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوئے اور یہ بھی ہے کہ وہ قرآن پاک اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صفات جو تورات میں تھیں ان کا انکار کرتے اور عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو جھٹلاتے ہیں۔ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ نبیوں کو ناحق شہید کرتے تھے جیسے شعیب و زکریا و یحییٰ علیہم السلام کو شہید کر دیا تھا۔

ف: بِغَيْرِ الْحَقِّ کی قید سے اشارہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا قتل حق کی وجہ سے محال ہے اور وہ کفار قاتلین بھی ان کے قتل کو قتلِ ناحق سمجھتے تھے۔

سوال: انبیاء علیہم السلام کی شان بڑھانا اور ان کے مراتب میں اضافہ تھا تا کہ ان سے وہ معاملہ ہو جو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں نہ کہ اس میں معاذ اللہ ان کی رسوائی مطلوب ہوتی۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قتل وہ انبیاء علیہم السلام ہوئے جنہیں جہاد کرنے کا حکم نہیں ملا تھا اور جنہیں جہاد کرنے کی اجازت تھی۔ ان میں سے کوئی نبی بھی شہید نہیں ہوا۔ اس تقریر سے ثابت ہوا کہ آیات ذیل میں تعارض نہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق شہید کرتے تھے) اور فرمایا: إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا (ہم اپنے رسولوں کی مدد کریں گے) اور فرمایا: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ (اور بیشک ہمارا کلمہ ہمارے بندوں یعنی رسل کرام پر سبقت کر گیا اور مدد کیے جائیں گے) علاوہ گزشتہ تقریر کے یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ نصر سے حجۃ اور حق کا بیان مراد ہے۔ اس معنیٰ سے تمام انبیاء علیہم السلام مدد دیئے ہوئے تھے۔

ف: مروی ہے کہ صرف ایک دن میں ستر نبی شہید ہوئے (علیہم السلام) مولانا روم قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

چوں سفیہاں راست ایں کار و کیا — لازم آید یقتلون الانبیاء
انبیاء را گفتہ قوم راہ گم — از سفہ انا تطیرنا بکم

ذٰلِكَ یہ جو مذکور ہوا۔ یعنی ان کا آیات عظام سے کفر اور انبیاء علیہم السلام کو شہید کرنا۔ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ بسبب اس کے ہے کہ وہ میرے امر سے متجاوز ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے محارم کے مرتکب ہو بیٹھے۔ یعنی انہیں چھوٹے گناہوں نے ان بڑے گناہوں اور سرکشی کی طرف کھینچا کہ جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے

کیونکہ قاعدہ ہے کہ چھوٹے گناہوں کی مداومت سے بڑے گناہوں کا ارتکاب ہو جاتا ہے جیسا کہ چھوٹی عبادات کی عادات سے بڑی عبادت ادا کرنے کی طلب حاصل ہو جاتی ہے۔

نسخہ روحانی:۔ قلب کی غفلت ایک بیماری ہے جو ایمان کی لذت سے محروم رکھتی ہے کیونکہ بیمار بسا اوقات میٹھے کو کڑوا محسوس کرتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ غفلت دل کے لئے زہر قاتل ہے جس طرح ہم زہر دار طعام سے کوسوں دور بھاگتے ہیں اسی طرح اللہ والے غفلت سے دور رہتے ہیں۔

ف: بندے اور مولیٰ کی مراد میں بہت بڑا فرق ہے۔ جس چیز کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اس میں بھلائی ہوتی ہے بخلاف بندے کے کہ ضروری نہیں کہ اس کے ہر ارادے میں بھلائی ہو۔

ف: اگر بنی اسرائیل کے بجائے امت محمدیہ علی صاحبھا التحیۃ والثناء ہوتی تو یہ بنی اسرائیل کی طرح باتیں نہ بناتے کیونکہ ان کے قلوب انوار سے معمور اور سینے اسرار سے مسرور ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں فرمایا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

تفسیر صوفیانہ جس طرح بنی اسرائیل ایک طعام پر صبر نہ کرتے ہوئے غیر معقول باتیں کہہ بیٹھے۔ اسی طرح انسان کا نفس اپنی کم ہمتی کی بنا پر اس طعام (یعنی اسرار غیبی جو اللہ تعالیٰ سے اسے نصیب ہوتے ہیں) کہتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبر کرتے جب کہ آپ پر واردات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: لَسْتُ كَاَحَدِكُمْ فَاِنِّیْ اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّیْ يُطْعِمُنِیْ وَيَسْقِيْنِیْ

(مجھ جیسے تم کب ہو سکتے ہو مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے)

بلکہ یہ انسان صبر نہ کر کے قلب موسیٰ سے کہتا ہے: فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہمیں بشریت کی زمین شہوات حیوانیہ کی سبزی اور لذات جسمانیہ کی ککڑی عنایت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَتَسْتَبْدِلُوْنَ کیا تم باقی پر فانی کو ترجیح دیتے ہو۔ اِهْبِطُوْا مقامات روحانی علوی سے اتر کر قالب سفلی کے شہر میں چلے جاؤ۔ فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ تمہیں وہی کچھ ملے گا جو تم نے خسیس مطالب طلب کیے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ جانوروں اور حیوانوں کی طرح تم پر ذلت و خواری مسلط کی جائے گی بلکہ اس سے بھی زیادہ ذلیل رہو گے کیونکہ تمہارا انجام اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستعد ہو چکا ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یہ

اس لیے کہ وہ لوگ وارداتِ غیبیہ اور مکاشفات روحانیہ سے کفر کرنے والے تھے۔ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ اور عالمِ غیب سے انبیاء علیھم السلام کے مقام سے جو کچھ ان کو عطیہ ملا اس کا باطل قرار دیتے اور ان کے اسرار کا انکار کرتے ہیں اور یہ خرابیاں انہیں ان کی شامتِ اعمال ہیں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توڑ کر اپنی جدوجہد طاعت کے بجائے معصیت میں جاری رکھی اور حق کی طلب کے بجائے ماسوا کی تمنا میں رہتے ہیں

مسئلہ : آیت سے ثابت ہوا کہ اچھا اور لذیذ طعام کھانا جائز ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میٹھے طعام اور شہد کو محبوب رکھتے اور ٹھنڈا میٹھا پانی نوش فرماتے تھے۔

مسئلہ : مسور کی دال اور زیتون صالحین کا طعام ہے۔

مسور کی دال کے فضائل:۔

۱۔ حدیث شریف میں ہے: عَلَيْكُمْ بِالْعَدَسِ فَاِنَّهٗ مُقَدَّسٌ" مسور کی دال کو لازم پکڑو اس لیے کہ وہ مبارک اور مقدس اناج ہے۔ اس لیے کہ وہ قلب کو رقیق کرتی اور آنکھوں سے آنسو لاتی ہے۔ اس کے لئے ستر انبیاء اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی ہے۔

۲۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ کا معمول تھا کہ ایک روز زیتون سے، ایک روز مسور کی دال سے، ایک روز گوشت سے کھانا کھاتے تھے۔ اگر اس میں کچھ فضیلت نہ ہوتی تو ان کا یہ معمول نہ ہوتا۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کا کوئی طعام ضیافت سے خالی نہ تھا جس میں مسور کی دال نہ ہو۔

۴۔ اس کا خاصہ ہے کہ جسم کو ہلکا پھلکا رکھتی ہے جس سے عبادت میں راحت میسر ہوتی ہے۔

۵۔ اس سے شہوتِ نفسانیہ میں اضافہ نہیں ہوتا جیسے گوشت اور گندم سے ہوتا ہے۔

مسئلہ : پیاز اور لہسن کی طرح ہر بدبودار پاک شئے کا کھانا مباح ہے۔

حدیث شریف میں ہے: مَنْ اَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَكُرَّاثَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا

(جس نے پیاز، لہسن اور گندنا کھایا وہ ہماری مساجد کے قریب نہ آئے)

کیونکہ جس طرح بدبو سے بنی آدم کو دکھ ہوتا ہے اسی طرح ملائکہ کو بھی ہوتا ہے۔

ف: اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو عبادت کے وقت اترتے ہیں نہ کہ وہ فرشتے جو بندوں کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں

ف: ملائکہ کو بدبو سے دکھ ہونا انہی مخصوص اشیاء سے یا عام ہر بدبودار شئے سے ہوتا ہے اس کا علم شارع کو ہے۔

مسئلہ: اس علّت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں اگرچہ کوئی بھی نہ ہو تب بھی یہ اشیاء کھا کر نہ جانا چاہیے۔ کیونکہ مسجدیں فرشتوں کی نزول گاہ ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنْ کُنْتُمْ لَابُدَّ لَکُمْ مِنْ اَکْلِهَا فَاَمِیْتُوْهَا طَبْخاً

(یعنی اگر تمہیں ضرور کھانا ہی ہے تو ان کی بدبو کو مٹا کر، یعنی پکا کر کھاؤ)

مسئلہ: اسی سے فقہاء نے مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جہاں بھی لوگ جمع ہوتے ہوں وہاں بدبودار چیزیں کھا کر نہیں جانا چاہیے۔

مسئلہ: اسی طرح لہسن و پیاز پر قیاس کرتے ہوئے ہر بودار شے کے مسئلے کا قیاس کیا گیا ہے۔

نکتہ: حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پیاز وغیرہ سے اس لیے کراہت فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آیا کرتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم رب تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے لیکن اپنے ماسوا باقیوں کے لئے مباح فرما دیا۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں اسے بیانِ جواز کی خاطر تناول فرمایا۔

مسئلہ: رخصت کے ساتھ سالک کے لئے عزیمت (اعلیٰ طریقہ) یہ ہے کہ اپنے قول و فعل و حال میں اپنے نبی پاک شہِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرے۔ حضرت عارف رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ ۔۔۔ اِنَّمَا الْفَوْزُ وَالْفَلَاحُ لَدَیْکَ

گر نرفتم طریقِ سنت تو ۔۔۔ ہستم از عاصیانِ امت تو

ماندہ ام زیر بار عصیاں پست ۔۔۔ رفتم از پا نگیری دست

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ

بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ

لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ

اور نہ کچھ غم۔ اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا

خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ

تو جو کچھ تم کو دیتے ہیں زور سے اور اس کے مضمون کو یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔ پھر اس کے بعد تم پھر گئے

مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ

تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں سے ہو جاتے۔

الْخَاسِرِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے کہ تم میں کے وہ جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے ان سے

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا

فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے۔ تو ہم نے (اس بستی کا) یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لئے عبرت کردیا

وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ

اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو

تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ

بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ کہ میں

الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا

جاہلوں سے ہوں۔ بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے گائے کیسی کہاوہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے

بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

نہ بوڑھی اور نہ ادسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتادے اس کا رنگ کیا ہے کہاوہ فرماتا ہے وہ ایک پیلی گائے ہے

صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ

جس کی رنگت ڈہڈہاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی۔ بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف

لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

بیان کردے وہ گائے کیسی ہے بیشک گایوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ

کہاوہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا

بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے

يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

معلوم نہ ہوتے تھے۔

تفسیر عالمانہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی وہ لوگ جو صرف زبان سے ایمان رکھتے ہیں لیکن دل ان کے موافق نہیں وہ منافق ہیں جیسا کہ انہیں کفار کے بیان میں ذکر کرنے کا قرینہ بتاتا ہے اور

انہیں ایمان کے ساتھ تعبیر اور نفاق کی تصریح نہ کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگر چہ ان کو مومن کہا جا رہا ہے لیکن ان کو ایمان کوئی فائدہ نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں کفر کے گڑھے سے بچا سکتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ هَادُوْا یہ لفظ یا تو عربی ہے هَـادَ سے مشتق ہے۔ یہ لفظ اس بولتے ہیں جب کوئی برے فعل سے توبہ کرلے اور ان کو یہود اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے گوسالہ پرستی سے توبہ کی تھی اور ان کو اس نام سے اس لیے خاص کیا گیا کہ ان کی ایسی توبہ تھی کہ جان دینے پر قبول ہوئی۔ یا یہودا کا معرب ہے گویا یعقوب علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے کے نام سے منسوب ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انہیں یہود اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب ان کے پاس نبی یا رسول تشریف لاتے تو اسے بادشاہ کی طرف لا کر شہید کر دیتے۔

وَالنَّصٰرٰی، نَصـرانٌ" کی جمع ہے جیسے نَـدمٰی، نـدمـان کی جمع ہے۔ اس نام سے اس لیے موسوم ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی نصرت کی تھی یا اس لیے کہ وہ عیسٰی علیہ السلام کے ساتھ اس بستی میں تھے جس کا نام ناصرہ ہے یا وہ نصرت کی طرف منسوب ہیں کہ وہ ایک بستی ہے کہ جس میں عیسٰی علیہ السلام اتریں گے۔

وَالصّٰبِئِیْنَ، صَبـاءَ" سے مشتق ہے۔ یہ اسے کہتے ہیں جو دین سے خارج ہو جائے اور انہیں صابی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ یہودیت و نصرانیت سے خارج ہو کر ستارہ و ملائکہ پرستی میں مشغول ہو گئے۔

مسئلہ : ان کا بُت پرستوں جیسا حکم ہے کہ نہ کہ ان کے ذبائح کھائے جائیں اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے اگر چہ وہ زبور بھی پڑھتے تھے۔

حدیث شریف :۔ ایک اعرابی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: حضور! صائبین کو صائبین کیوں کہا جاتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وجہ یہ ہے کہ جب ان کے پاس کوئی نبی یا رسول تشریف لاتا تو وہ انہیں گرفتار کر لیتے اور پانی گرم کر کے ان کے سروں پر ڈالتے رہتے یہاں تک کہ وہ زخمی ہو کر پھٹ جاتا۔ (کذافی روضۃ العلماء)

مَنْ مبتدا ہے اور اس کی خبر فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ ہے پھر یہ جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔ اٰمَنَ جو بھی ایمان لایا ان کفار میں سے بِاللّٰهِ اللہ اور تمام نبیوں پر اور جو کچھ ان پر نازل کیا گیا (اس پر بھی ایمان لایا) وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یوم قیامت پر یعنی جو

شخص ایمان ظاہر کرے مبدا اور معاد کے لئے لائق طریق پر اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جائے۔

وَعَمِلَ اور عمل کرے صَالِحًا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ فَلَهُمْ فــــا سببیت کی ہے۔ پس ان کے لئے اَجْرُهُمْ ان کا اجر جس کا ان کو وعدہ دیا گیا ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کے مالک کے نزدیک اور ان کا انجام کمال لائق کی طرف ہوگا اور عِنْدَ کا متعلق وہ ثبت (فعل) ہے جو لھم کا متعلق ہے اس میں خبر دی جا رہی ہے کہ ان میں سے جو بھی ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان سے برے اعمال اور ان کے آباء کی غلطیوں کا مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کے ثواب میں کچھ کمی ہوگی۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ اس کا عطف جملہ پر ہے۔ ای فلھم اجرھم ولا خوف علیھم یعنی انہیں اس وقت کوئی خوف نہیں ہوگا جبکہ کفار خوف سے ڈرتے ہوں گے۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ ہی انہیں کوئی ڈر ہوگا اس وقت جبکہ قصوروار لوگ عمر کو ضائع کرنے اور ثواب کے فوت ہو جانے سے ڈر رہے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے ان سے خوف و حزن اٹھا لیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ جو بھی مخلص ہو کر ایمان لائے اور اچھے عمل کرے اسے بہشت میں داخل کیا جائے گا۔

ف: اسلام کے حسن کی دھاک تو ہر نفس میں سمائی ہوئی ہے اس سے روگردانی بشری بیماری یا اندھی تقلید سے کی جاتی ہے کیونکہ پیدائش کے وقت فطرتاً اور طبعاً ہر ایک میں دین موجود ہوتا ہے اگر اسے اسی حالت میں چھوڑا جائے تو سوائے دین کے اور کچھ اس سے سرزد بھی نہ ہو۔ جیسے کہ حدیث شریف میں ہے:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ

یعنی ہر نومولود میں فطرۃ اسلامی موجود ہوتی ہے پھر ماں باپ کی مرضی کہ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنائیں

ف: ابن الملک اس حدیث شریف کی شرح میں فرماتے ہیں کہ فطرتِ اسلام سے مراد وہ لفظ بَلٰی ہے جو روزِ میثاق بندوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں فرمایا۔

سوال: جس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا اس کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی فطرت میں کفر سمایا ہوا ہے اور حدیث ان کے خلاف ہے۔

جواب: حضرت خضر علیہ السلام نے اس کی فطرۃ کے متعلق نہیں فرمایا بلکہ آپ فرما رہے ہیں کہ پیدائش سے

اس کے متعلق کفر لکھا جا چکا ہے اور حدیث شریف کا اشارہ اس سے قبل یعنی یثاق کی طرف ہے۔ چنانچہ تحقیق یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ذریت آدم علیہ السلام کو ان کی پشت سے ظاہر کر کے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ فرمایا اس وقت تو ذاتِ باری تعالیٰ کے مشاہدہ سے ہر ایک نے ایمان ظاہر کر دیا لیکن کفار کو اس قول سے نفع نہ ہوا کیونکہ وہ تو اس سے قبل ہی ایمان کے دائرہ سے خارج تھے۔ اس وقت سے مومن اور کافر سب ایک ہو گئے ان کے مابین کوئی تمیز نہ تھی جب اپنی اپنی ماؤں کے بطون میں آئے تو اس وقت کافر و مومن کے مابین امتیاز نہ ہوا کیونکہ وہ فرشتہ جو اس وقت شقاوت و سعادت لکھنے پر متعین ہے اس نے بطونِ امہات میں سعید و شقی اس لحاظ سے لکھا کہ انہوں نے آگے چل کر مومن بننا ہے یا کافر۔ اقرار والے قول کا اعتبار نہیں کرتا۔ اب اسی فطرت یعنی بلیٰ والے قول پر پیدا ہوتے ہیں۔

مقاماتِ اربع کی تحقیق: ۔ مقامِ اول، علمِ الٰہی، اسے بطن معنوی اور صوفیہ کی اصطلاح میں **بطن الام** اور **بطن ام الکتاب** کہتے ہیں۔ مقامِ ثانی، مقامِ بلیٰ ہے اسے مولودِ معنوی کہا جاتا ہے۔ مقامِ ثالث **بطن الام الصوری** ہے۔ مقامِ رابع مولود صوری یعنی صورۃ مولود معنوی۔ اس مقام پر سعید و شقی میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ جیسے عالم اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ میں امتیاز نہیں تھا البتہ بطن صوری جسے صورۃ علم اللہ کہا جاتا ہے اس وقت سعید و شقی کے مابین امتیاز ہوا کرتا ہے۔ یہاں حدیث شریف: **اَلسَّعِيْدُ سَعِيْدٌ "فِىْ بَطْنِ اُمِّهٖ وَالشَّقِىُّ شَقِىٌّ" فِىْ بَطْنِ اُمِّهٖ** (سعادت مند اپنی ماں کے پیٹ سے ہی سعید ہے اور بد بخت اپنی ماں کے پیٹ میں بد بخت ہے) کا معنیٰ واضح ہو گیا اور اس حدیث کا مطلب بھی ظاہر ہو گیا کہ فرمایا گیا ہے: **السعید قد یشقیٰ و الشقی قد یسعد۔** یعنی سعید کبھی بد بخت ہو جاتا ہے اور کبھی شقی کو بھی سعادت نصیب ہو جاتی ہے اور **کل مولودٍ یولود علی فطرۃ الاسلام** کا مفہوم بھی سامنے آ گیا۔ (کذاحققه الشیخ بالی الصوفیوی قدس سرہٗ)

صاحبِ روح البیان کی تحقیق: ۔ میں (اسماعیل حقی علیہ الرحمہ) کہتا ہوں کہ میرے شیخ **کتاب اللاتحات الباقیات** میں فرماتے ہیں کہ **بطن الام** اہل مشرب کے نزدیک **باطن الغیب المطلق الذاتی** کا نام ہے۔ یعنی **السعید سعید** باطنی غیب مطلق ہے۔ ازلاً اور ظاہر شہادت مطلقہ میں ابداً ان دونوں حالتوں میں اس کی سعادت میں شقاوت بالکل داخل نہیں ہو سکے گی اور **اَلشَّقِىُّ شَقِىٌّ** غیب مطلق کے باطن میں ازلاً اور شہادۃ

مطلقہ کے ظاہر میں ابداً ان دونوں حالتوں میں اس کی شقاوت میں سعادت کو کسی قسم کا دخل نہیں البتہ عالمِ برزخ جوان دونوں کا جامع ہے کبھی سعادت مند کی سعادت میں شقاوت اور شقی کی شقاوت میں سعادت داخل ہو سکے گی۔اس لحاظ سے سعادت مند ذاتی اعتبار سے سعید ہوگا اور عارضی طور پر شقی ہوگا اور شقی ذاتی طور پر شقی ہوگا اور عارضی طور پر سعید۔پھر اس کا خاتمہ ذاتی اعتبار پر ہوگا۔اگر وہ ذاتی طور پر سعید ہے تو اس کی عارضی شقاوت دور ہو جائے گی اور سعادت ذاتی کا غلبہ ہو جائے گا جس کی وجہ سے خاتمہ خیر پر ہوگا اور اسے سعید لوگوں میں داخل کیا جائے گا اور جس کی شقاوت ذاتی ہے اور سعادت عارضی تو خاتمہ کے وقت سعادت دور ہو جائے گی اور شقاوت ذاتی کے غلبہ سے اشقیاء کے زمرہ میں داخل ہوگا۔یہی مطلب ہے اس حدیث شریف کا،جس میں فرمایا:السعید قد یشقی و الشقی قد یسعد۔معلوم ہوا کہ تبدل عارضی میں ہے نہ کہ ذاتی میں اور اعتبار ذاتی کا ہوتا ہے نہ کہ عارضی کا۔

تفسیر صوفیانہ جس کے قلب کا انشراح اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوتا ہے تو اس کا ایمان تقلیدی نہیں ہوتا اور نہ کسی رسم وعادت اور آباء کی اقتداء سے ہوتا ہے ایسے لوگوں کے لئے فرمایا گیا: لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ یعنی ان کو انانیت کے حجاب سے کوئی خوف نہیں۔ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ اور نہ ان کو دوئی کا خطرہ ہے کیونکہ وہ تو وحدیت اور ھُویت کے نور سے حاصل ہو چکے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ اہلِ کتاب کے اسلاف کی دیگر خیانت کا تذکرہ ہے یعنی اے بنی اسرائیل!یاد کرو جب ہم نے تمہارے اسلاف سے وعدہ لیا کہ تورات پر عمل کرو۔

ف: یہ حکم جنگل میں جانے سے پہلے کا ہے جب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے اور غرقابی سے نجات پائی۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ چھتری کی طرح بلند کیا۔یہاں تک کہ تم نے احکام قبول کر لیے اور وعدے لیے گئے۔طور سریانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔

واقعہ یوں ہوا کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس تورات لے کر آئے تو اس میں دیکھا کہ تکالیف اور مشقت بھرے احکام ہیں تو قبول کرنے سے انکار کر گئے۔اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ پہاڑ کو ان کے سروں پر چھتری کی طرح لا کر کھڑا کر دیں۔اب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:اگر احکام قبول کر لو تو درست (چنانچہ

پہاڑ ان کے سروں پر کھڑا کر دیا) ورنہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ جب انہوں نے سوائے قبول کرنے کے کوئی چارہ نہ دیکھا تو قبول کر لیا اور سجدہ میں گر گئے لیکن آنکھ کے گوشہ سے پہاڑ کو دیکھتے رہے۔ اب بھی یہود کی یہی عادت ہے منہ کی ایک طرف سے سجدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے بڑوں سے اسی طرح سجدہ سے عذاب ہٹا تھا لہٰذا ہم ایسے ہی سجدہ کرتے رہیں گے لیکن یہ رفع طور اس لیے نہیں تھا کہ وہ تورات کو قبول کر لیں کیونکہ یہ تو جبر ہے اور اسلام میں جبر نہیں اور جبر اختیار کو سلب کر لیتا ہے۔ یہ امر تشریعی ہے جیسا کہ کفار کے لئے جنگ کرنے کا حکم ہے۔

سوال: یہ جبر ہی تو ہے اور قرآن پاک فرماتا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ دین میں جبر و اکراہ نہیں؟

جواب: یہ آیت لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ آیۃ قتال سے منسوخ ہے۔

ف: ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سجدہ کے وقت ایمان پر مجبور فرمایا۔ بظاہر مجبوراً ایمان قبول کر رہے تھے اور قلوب غیر مطمئن تھے۔

خُذُوْا یہاں قولوا مقدر ہے یعنی ہم نے فرمایا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ جو حکم ہم نے کتاب میں دیا اسے لے لو۔ بِقُوَّةٍ ساتھ جد و جہد و عزیمت و مواظبت کے وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ حفظ کر لو جو کچھ اس میں ہے اور اس سے پڑھو نہ اسے بھلاؤ نہ اس سے غفلت کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تم کو امید وار ہونا چاہیے کہ تم متقی ہو جاؤ گے۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ پھر تم نے میثاق اور اس کے ایفاء اور اس کی مداومت سے اعراض کیا مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ بعد پختہ وعدہ ہو جانے کے۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ اس کا عطف مہلت دینے اور عذاب کی تاخیر کی وجہ سے ہے۔ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ہو جاتے تم خاسرین میں سے۔ لیکن تم پر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ طور کو اٹھایا یہاں تک کہ تم نے توبہ کی پھر تم سے ہٹ گیا اگر اس کا فضل نہ ہوتا تو تم پر گر پڑتا اور تم مارے جاتے۔ الخسران دراصل راس المال کے چلے جانے کو کہتے ہیں۔ یہاں پر ہلاکتِ نفس مراد ہے۔

ف: اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام پر فضل فرمایا ہے کہ احکام یکے بعد دیگرے فرض فرمائے جب ایک کا استقرار ان کے دلوں پر ہو جاتا پھر دوسرا نازل ہوتا اور بنی اسرائیل پر احکام یکبارگی فرض ہوئے۔ بنابریں ان پر شاق گذرا جس کی وجہ سے منکر ہو گئے۔ یہاں تک کہ عذاب دیکھ کر قبول کیا۔

مسئلہ : اللہ تعالیٰ نے آیت میں چار چیزوں کا حکم دیا:

۱۔حفظ الاحکام۔ ۲۔ان پر عمل کرنا۔ ۳۔ان کو فراموش نہ کرنا۔ ۴۔انہیں ضائع نہ کرنا۔

پھر فرمایا: وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ کتب الٰہیہ سے مقصود بھی یہی ہوتا ہے کیونکہ ان کا مقتضیٰ صرف تلاوت و ترتیب ہی نہیں بلکہ ان پر عمل کرنا مطلوب ہے۔

عجیب تمثیل :۔اس کی مثال یوں ہے کہ بادشاہ اپنے کسی ملازم کی طرف مراسلہ بھیجے کہ اتنے عرصے کے اندر ایک عظیم الشان کوٹھی تیار کرادو۔اب اس مراسلہ کو ملازم صاحب پڑھتے تو روزانہ ہیں لیکن کوٹھی تیار نہیں کراتے یہاں بادشاہ تشریف لائے اب وہ اس ملازم کو صرف زجر و توبیخ نہیں فرمائیں گے بلکہ سخت سزا دیں گے۔اسی طرح قرآن بھی ہمیں اپنے مالک کی طرف سے اس حکم کو لایا ہے کہ ہم اس کے ارکانِ اسلام یعنی نماز، روزہ وغیرہما کی تعمیر کریں ورنہ سزا پائیں گے۔اس کی محض تلاوت پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس پر عمل کرنے کی جدوجہد کریں۔مثنوی شریف میں ہے:

هست قرآن حالهائے انبیاء ماهیان بحرِ پاک کبریا

در بخوانی و نہ قرآن پذیر انبیاء والیاء راہ دیدہ گیر

ترجمہ : قرآن انبیاء کے حالات ہیں وہ بحرِ کبریا کے شناور ہیں اگر قرآن پڑھو یا نہ پڑھو کوئی فرق نہیں پڑتا انبیاء و اولیاء وابستگی پیدا کرو۔

حدیث شریف :۔حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا: یہ وہ وقت ہے جس میں لوگوں سے علم چھینا جائے گا یہاں تک کہ اس سے تھوڑی سی مقدار پر بھی قابو نہیں پا سکیں گے حضرت زید بن لبید انصاری نے عرض کی کہ حضور! ہم سے کیسا علم چھینا جائے گا جبکہ قرآن کو ہم خود بھی پڑھتے اور اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی پڑھاتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے زیاد! تجھے تیری ماں روئے، یہی تورات اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس نہیں تھی، پھر ان کو ان سے کیا فائدہ ہوا؟

حکایت : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کسی کو فرما رہے تھے کہ تو ایسے زمانے میں ہے کہ جس میں فقہاء کثیر ہیں اور قراء قلیل۔اس وقت قرآن کے حدود کی حفاظت کی جاتی ہے اگرچہ حروف کی نگہداشت نہیں

ہو رہی۔ اس وقت سائل تھوڑے ہیں اور عطا کرنے والے بکثرت ہیں۔ لمبی نمازیں پڑھنے والے ہیں اور خطبہ میں اختصار کرنے والے ہیں۔ اعمال پہلے اور خواہشات بعد میں ظاہر کرتے ہیں۔ ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں فقہاء قلیل ہوں گے اور قراءٗ بکثرت اس وقت قرآن کے حروف کی تو بڑی حفاظت کی جائے گی لیکن حدود کی پابندی بالکل نہ ہوگی۔ سوالی بکثرت ہوں گے اور معطی تھوڑے۔ خطبے لمبے لمبے اور نمازوں میں اختصار کریں گے اور اعمال سے پہلے اپنی خواہشات ظاہر کریں گے۔

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ وعدہ لینا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ میں عام تھا پھر بعض نے دل وجان سے قبول کیا اور بعض نے خوف سے۔ یہ وعدہ اس لیے کیا تا کہ ثابت ہو کہ ہر حال میں تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں جسے چاہے ہدایت کا خطاب سنائے اور جسے چاہے گمراہی کا۔ کیونکہ کوئی برہان رفع طور سے زیادہ اظہر نہیں جو کہ ان کے سروں پر کھلم کھلا تھا۔ شومی قسمت سے جب وہ ذلیل وخوار ہوئے تو اظہارِ برہان نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اوامر ونواہی اور طاعات کو لینا قوتِ انسانیہ کے بس کی بات نہیں جب تک کہ اس میں تائیدِ الٰہی اور قوتِ ربانی نہ ہو۔ وَاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ اس میں جو رموز واشارات اور دقائق وحقائق ہیں ان کو یاد کرو۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تا کہ تم ماسوا اللہ کے کسی سے نہ ڈرو۔ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی اس کے بعد تم نے اتباعِ شرع اور طریقِ حق سے طبعیہ کے غلبہ کی وجہ سے باوجود یہ کہ تم سے وعدہ بھی لیا گیا اور طریقِ حق پر چلایا گیا لیکن تم نے روگردانی کی۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ یعنی ابتداء میں سبقت عنایت اور وسط میں اخذ میثاق بالقوۃ کی توفیق اور انتہا میں قبول توبہ اور اس کی توفیق پھر اس پر ثابت قدم رکھنا نہ ہوتا لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ تو تم گناہوں پر اصرار کرنے والے اور عقوبت وخسران میں گرفتار اور دنیا وآخرت کو چھین کر عذاب دنیا وآخرت میں مبتلا ہو جاتے۔ جیسا کہ تم میں سے بعض کو یہ تمام خرابیاں پیش آئیں۔

تفسیر عالمانہ

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ یہ خطاب حضور علیہ السلام کے ہم زمان یہود سے ہے۔ ای باللہ قد عرفتم الخ۔ اللہ تعالیٰ کی قسم کہ اے بنی اسرائیل! بیشک تمہیں معلوم ہے۔

الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ (ظلما) حد سے بڑھ گئے تمہارے اسلاف میں سے۔ مِنْكُمْ کا محل نصب ہے کیونکہ حال ہے فِي السَّبْتِ ہفتہ کے دن یعنی تجاوز کر گئے اس حد سے جو ان کے لیے مقرر کی گئی کہ صرف عبادت کے لئے مستعدر ہیں اور اس کی تعظیم کریں لیکن شکار میں مشغول ہوئے۔

ف: سبت: دراصل قطع کو کہتے ہیں اور یہود کو بھی یہی حکم تھا کہ وہ دیگر اعمال سے قطع تعلق کر کے صرف عبادت میں مشغول رہیں اور نیند کو بھی سُبات اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی حرکاتِ اختیار کو قطع کرتی ہے۔

سبق: اس میں تحذیر و تہدید ہے گویا فرماتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ ایسا انہیں کیسا عذاب پہنچا۔ پس تم بھی بچو شاید تم پر بھی ان کی طرح عذاب آ پہنچے۔

واقعہ یوں ہے کہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ اقدس میں ایلہ (ایک مقام ہے دریائے قلزم کے کنارے پر شام و مدینہ کے مابین) کے ساکنین پر اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار حرام فرما دیا اور ادھر یہ ہوا کہ سوائے ہفتہ کے باقی تمام دنوں میں مچھلی چھپی رہتی اور ہفتہ کے روز ظاہر ہوتی تاکہ ان کی آزمائش ہو یا اس لیے کہ اسی دن اس مچھلی (کہ جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو پیٹ میں محفوظ رکھا) کی زیارت کے لئے تمام دریا کی مچھلیاں حاضر ہوتیں چنانچہ ہفتہ کے دن اتنا ہجوم ہوتا کہ پانی کے اوپر مچھلی ہی مچھلی ہوتی پانی کی ایک بوند بھی نظر نہ آتی۔ ہفتہ کے دن کے بعد متفرق ہو کر دریا کے اندر ایسی گم ہو جاتی کہ کہیں مچھلی کی بو تک نہ آتی۔

بالآخر شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے لئے ہفتہ کے روز شکار حرام ہے نہ کہ کوئی اور امر۔ چنانچہ انہوں نے دریا کے کنارے گہرے گڑھے کھود لیے اور جمعہ کی شام کو ان گڑھوں کی طرف دریا سے نالیاں بنالیں۔ اب صبح ہفتہ کو مچھلیاں ان گڑھوں میں آ پہنچتی تھیں لیکن ان کی گہرائی کی وجہ سے باہر نہ نکل سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے اتوار کے دن ان مقید مچھلیوں کو پکڑنا، بیچنا اور اپنے کھانے میں لانا شروع کر دیا جس سے انہیں بکثرت مال حاصل ہوتا۔ اب اس طرح ان کی عادت ہو گئی یہاں تک کہ چالیس سال یا ستر سال تک یہی عمل جاری رہا۔

لیکن کوئی عذاب نازل نہ ہوا وہ خائف ضرور تھے مگر جب کچھ نہ ہوا تو خوش ہوئے اور یقین کر لیا کہ اب ہفتہ کا شکار ان کے لئے حلال ہے۔ بنابریں دیگر گناہوں پر بھی جرأت کرتے گئے۔ یہی طریقہ ان کی اولاد میں جاری

رہا۔ اگر وہ ایک دو بار کرتے تو انہیں کچھ نہ ہوتا۔ جب یہ عمل کیا تو اس وقت ستر ہزار اس کے مرتکب تھے۔ ان کے تین گروہ ہو گئے ایک تو اس کام سے کلی طور پر باز آ گیا بلکہ دوسروں کو بھی روکا۔ دوسرے گروہ والے خود تو رک گئے لیکن دوسروں کو نہ روک سکے۔ تیسرا گروہ کہ جنہوں نے فرمانِ ایزدی کی بے قدری کی۔ روکنے والے گروہ کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ انہوں نے کہا اے بھائیو! تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور سنتِ نبی کے خلاف کیا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ ایسی برائی سے رک جاؤ قبل اس کے کہ ہم پر کوئی عذاب نازل ہو۔ انہوں نے سُنی اَن سنی کر دی اور ان کی نصیحت کو قبول نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔

فَقُلْنَا لَهُمْ پس ہم نے بطور قہر کے فرمایا: كُوْنُوْا قِرَدَةً بندر ہو جاؤ۔ قرد کی جمع ہے جیسے دیکۃ دیک" کی جمع ہے۔ فارسی میں اسے بوزینہ (بندر) کہتے ہیں۔

ف: یہ امر تحویل کا ہے کیونکہ انہیں ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف بدلنے کی قدرت تو نہیں تھی اس میں اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ کی طرف اشارہ ہے جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ یہ شئے ہو جائے تو وہ ہمارے ارادہ کے مطابق کسی رکاوٹ اور تاخیر کے بغیر فوراً ہو جاتی ہے۔

خٰسِئِیْنَ یہ اور قِرَدَةً دونوں كُوْنُوْا کی خبریں ہیں ای کونوا جامعین بین القردۃ والخسیء اور خٰسِئِیْنَ خسیء سے ہے بمعنی صغار و طرد" یعنی ذلت وخواری۔

واقعہ یوں ہوا کہ مجرمین نے نصیحت قبول کرنے سے انکار کیا تو روکنے والوں نے کہا ہم تمہارے ساتھ اس بستی میں نہیں ٹھہرتے۔ چنانچہ بستی میں ایک دیوار کھینچی گئی۔ اس کے بعد داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت کی اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا صرف ان کے گناہ پر اصرار کی وجہ سے رات کے وقت ان کی شکلیں بگڑیں۔ صبح کو روکنے کے لئے سارا گروہ ان کے گھروں میں گیا۔ دروازے بند تھے اب نہ ان سے کوئی آواز آتی نہ ان کے گھروں سے آگ کا دھواں ظاہر ہوتا۔ دیواروں کو پھاند کر اندر داخل ہو گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے نوجوان بندر بنے بیٹھے ہیں اور بوڑھے خنزیر، ان کے کان بھی ہیں اور بندروں اور خنزیر جیسی آواز بھی، اس گروہ نے انہیں نہ پہچانا لیکن ان بندروں اور خنزیروں نے انہیں پہچان لیا۔ اب وہ بندر اور سور اپنے رشتہ داروں کے قریب ہوتے ہوئے ان کے کپڑے سونگھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں وہ انہیں جواب میں کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تمہیں روکا

نہیں تھا؟ لیکن تم نے نہ مانا۔ وہ سروں کو ہلا کر نعم کا اشارہ کرے اور آنسو بہاتے۔

مسئلہ : اس سے ثابت ہوا کہ بعد از مسخ ان میں فہم وعقل باقی تھا۔

ف: بندروں کی ابتداء یہاں سے نہ ہوئی بلکہ اس سے پہلے بھی بندر تھے۔ یہ صرف ان جیسی شکل میں تبدیل ہوئے کیونکہ یہ شکل قبیح ہے اور ان کے اعمال وافعال بھی قبیح ہیں اور وہ تین دن کے بعد مر گئے ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ یہ بندر جو دنیائے عالم میں پھیلے ہوئے ان بندروں کی اولاد ہیں جو ان سے پہلے موجود تھے۔

فَجَعَلْنٰهَا پس ہم نے اس امت کے مسخ وعقوبت کو نکالاً عبرت بنایا۔ اس سے عبرت پکڑے جو عبرت کا ارادہ رکھتا ہے۔ یعنی یہ عبرت ان جیسے عمل کرنے سے روک لے گی۔ **نَکَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا** یعنی جو امم وقرون پہلے تھے اور جو بعد میں آئیں گے۔ کیونکہ ان کے مسخ کا ذکر پہلے لوگوں کی کتابوں میں آیا ہے۔ تو انہوں نے عبرت پکڑی اور وہ بھی عبرت حاصل کریں گے جو بعد میں آئیں گے۔ پس **مَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا** ماضی کے لئے **وَمَا خَلْفَهَا** مستقبل کے لئے مستعار ہیں۔

وَمَوْعِظَةً اور نصیحت ہے **لِّلْمُتَّقِیْنَ** متقیوں کے لئے۔ وہ نیک لوگ جنہوں نے ایسے برے عمل سے روکا تھا یا ہر وہ متقی جو اس واقعہ کو سنے گا۔ پس بہر دو تقدیر لام استغراقی عرفی کے لئے ہے۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

نرود مُرغ سوئے دانہ فراز چوں دگر مرغ بیند اندر بند

پند گیر از مصائب دگراں تانہ گیرند دیگر از تو پند

ترجمہ :۔ ا۔ پرندہ اس دانے کی طرف نہیں جاتا جب وہ دیکھتا ہے کہ دوسرا اسی وجہ سے پھنسا ہے۔ ۲۔ دوسروں کی مصیبتوں سے نصیحت حاصل کر، نہ کہ دوسرے تجھ سے نصیحت پائیں۔

تفسیر صوفیانہ یہ سزا ان لوگوں کے لئے ہے جو احسان کی قدر نہیں جانتے نہ ہی منعم کی نعمتوں کا بدلہ بجائے شکر کے ناشکری سے دیتے ہیں۔ پس انہیں وصال کی عزت سے ہجر کی ذلت میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ اگلی امتوں کو جسموں کے خسف ومسخ سے سزا دی جاتی اور اس امت کی سزا قلوب پر ہوتی ہے

اور قلوب کی سزا اجسام کی سزا سے شدید تر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ (اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیتے ہیں)

اسی طرح وہ سزا کا مستوجب ہے جو بادشاہوں کی خدمت میں پورا نہیں اترتا اور سلوک کی راہ میں صحیح طور پر نہیں چلتا اور جو شخص قربت کے فرش پر حرمت کے قدموں سے نہیں چلتا تو وہ محرومی اور خسارہ اٹھاتا ہے اور بادشاہ کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

ف: مسخ کی علامت خنزیر جیسی ہے اور وہ حرام کھاتا ہے جسے حرام کا کھاتا دیکھو، یقین کرلو کہ اس کا دل مسخ ہو چکا ہے۔ قلب کے مسخ کی تین علامتیں ہیں:

۱۔ طاعت کی لذت نہ پائے۔ ۲۔ بلا خوف و خطر نافرمانی کرے۔ ۳۔ کسی کی موت سے عبرت نہ لے بلکہ ہر روز وہ دنیوی امور میں منہمک رہے۔ **(کذا فی زھرۃ الریاض)**

ف: حضرت عوف بن عبد اللہ اہلِ خیر سے تھے جسے کچھ لکھتے تو تین نصیحتیں فرماتے:

۱۔ جو آخرت کے کام میں مصروف ہو اس کی دنیوی معاش خود بخود درست ہوگی۔

۲۔ جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مابین نیک اطوار بنائے اللہ تعالیٰ اس کے لئے لوگوں کے مابین اچھائی پیدا کردے گا۔ ۳۔ جو اپنے باطن کو درست رکھے گا اس کے ظاہر کو اللہ تعالیٰ درست کردے گا۔

ف: محمد بن علی ترمذی فرماتے ہیں: صلاح کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ لڑکوں کی اصلاح کتابوں سے ہوتی ہے۔ ۲۔ ڈاکوؤں کی اصلاح قید خانے سے۔ ۳۔ عورتوں کی گھر میں۔

۴۔ بوڑھوں کی مساجد میں۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ بنی اسرائیل کے اسلاف کی غلط کاریاں یاد دلا کر زجر و توبیخ فرمائی جا رہی ہے۔ یعنی یاد کرو اپنے آباء و اجداد کے اس وقت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

لِقَوْمِهٖٓ اپنی قوم سے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً اللہ تعالیٰ تمہیں بقرہ (گائے) ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ف: بیل کی قسموں سے ایک مادہ گائے کو بقرہ کہتے ہیں۔ یا بقرہ کا واحد ہے۔ خواہ مذکر ہو یا مؤنث۔ بقراً سے مشتق ہے بمعنی چیرنا۔ اس نام سے اس لیے موسوم ہے کہ یہ بھی زمین کو کھیتی کے لئے چیرتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بوڑھا دولت مند تھا اسے اس کے چچا زاد بھائیوں نے میراث کی طمع میں قتل کر کے شہر کے دروازے کے سامنے یا کسی دوسری بستی کے قریب میدان میں چھوڑ آئے اور پھر خود ہی آ کر واویلا کرتے ہوئے اس کی دیت کے مطالبے کے درپے ہوئے۔ بلکہ چندلوگوں پر اس کے قتل کا الزام لگا دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا وہ منکر ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات شاق گزری اور یہ واقعہ قسامۃ[1] کے حکم کے نزول سے پہلے کا ہے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی التجا کی تا کہ بات ظاہر ہو کہ کس نے قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک گائے ذبح کر کے اس کے بعض حصہ کو مقتول کے جسم پر لگاؤ وہ زندہ ہو کر خود بتا دے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ قَالُوْٓا گویا سوال کیا گیا کہ پھر انہوں نے اس حکم پر کیا کیا۔ کیا فرمانبرداری کی یا رک گئے؟ تو جواب میں کہا: قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا تو ہمیں ٹھٹھا کی جگہ خیال کر کے ہمارے ساتھ استہزاء کرتا ہے۔ ہم قتیل کے بارے میں پوچھتے ہیں تم گائے کے ذبح کا حکم دیتے ہو ان کے مابین مناسبت بھی نہیں ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ جواب انہوں نے جہالت کی وجہ سے دیا، نہ تو ان کا فرمانبرداری کا ارادہ تھا اور نہ ہی ذبح کرنے کا خیال تھا۔

قَالَ جملہ مستانفہ ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ پناہ کا طالب ہوں کہ میں جاہلین میں سے ہو جاؤں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ میں استہزاء کرنا جہل اور بیوقوفی ہے۔

مسئلہ : اس سے ثابت ہوا کہ دین کے مسائل میں استہزاء کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

مسئلہ : اسی طرح اہلِ اسلام سے استہزاء کرنا بھی گناہِ کبیرہ ہے۔

مسئلہ : اسی طرح صاحب عزت و تعظیم سے استہزاء کرنا گناہِ کبیرہ ہے کیونکہ یہ جہالت ہے اور استہزاء کرنے والا مستحق وعید ہے۔

مسئلہ : مزاح استہزاء سے نہیں کیونکہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایسا مزاح کہ اس سے انسان غصہ آور شکل سے بچ جانے کے لئے کرے تو جائز ہے۔

---

[1] ادائیگی دیت کا حکم۔

حکایت: ایک شخص عبید اللہ بن حسین کوفہ کے قاضی کے پاس آیا تو اس پر اون کا جبہ تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا: یہ جبہ مادہ کی اون سے ہے یا نر کی اون سے؟ اس نے کہا: اے قاضی! تو تو جاہل ہے۔ عبید اللہ قاضی نے پوچھا: تجھے کیسے معلوم ہوا کہ مزاح بھی جہالت ہے۔ تو اس نے یہی آیت پڑھی۔ قاضی صاحب نے اس سے روگردانی کی اور کہا کہ یہ ایسا جاہل ہے کہ اسے تمیز نہیں کہ استہزاء کیا ہے اور مزاح کیا ہے۔

ف: قوم نے جب دیکھا کہ بقرہ کا ذبح کرنا ضروری ہے تو اس کی صفتیں پوچھنے لگے: جیسا کہ مفصل بیان ہوتا ہے اگر وہ کوئی گائے بھی ذبح کر لیتے تو جائز ہوتا۔ لیکن چونکہ انہوں نے جتنی زیادہ کرید کی سختی بڑھتی گئی لیکن اس کے تحت ایک حکمت تھی۔

ایک ولی کی کرامت کا بیان: ۔ بنی اسرائیل میں ایک مرد صالح تھا اس کا ایک چھوٹا لڑکا اور ایک بچھیا تھی بچھیا کو جنگل میں لے جا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کی:

اللّٰھم انّی استودعک ھٰذہ العجلۃ لِابنِیْ حتّٰی یکبو

(اے اللہ! میرا لڑکا جب تک جوان نہ ہو یہ بچھیا تیری امان میں ہے)

اس کے بعد وہ فوت ہو گیا اور وہ بچھیا جنگل میں جوان ہوئی اور اس کی عادت تھی کہ جس آدمی کو دیکھتی تو بھاگ جاتی یہاں تک کہ لڑکا جوان ہو گیا اور تھا بہت نیک۔ اپنی ماں کا بڑا خدمت گزار تھا۔ رات کے تین حصے کرتا، ایک حصہ میں نماز ادا کرتا، ایک حصہ میں نیند کرتا اور ایک حصہ ماں کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ صبح کو لکڑیاں جمع کر کے بازار میں بیچ کر جو کچھ حاصل کرتا ایک حصہ اللہ کی راہ میں، ایک حصہ خرچ کرتا، ایک ماں کی خدمت میں حاضر کرتا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا: بیٹا! تیرے باپ نے تیرے لیے ایک بچھیا چھوڑی تھی اور فلاں جنگل میں ہے۔ جا اور ابراہیم واسحٰق علیہما السلام کے معبود سے دعا مانگ، امید ہے کہ وہ تیرے پاس آ جائے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ جب تو اسے دور سے دیکھے گا تو تجھے ایسا معلوم ہو گا کہ اس کے چمڑے سے شعاعیں نکل رہی ہیں اس کی خوب صورتی اور زردی کی وجہ سے اس کا نام مُذھبہ بھی تھا۔ کیونکہ اس کی حسن کی تھی نہ کہ عیب کی۔ نوجوان جب جنگل میں آیا تو اسے دیکھا گھاس چر رہی ہے آواز دیتے ہوئے (تجھے ابراہیم واسحٰق ویعقوب علیہم السلام کے رب کی قسم دیتا ہوں) میرے پاس آ جا۔ چنانچہ وہ سن کر دوڑتی ہوا

کے پاس آ کر ٹھہری۔ نوجوان اس کی گردن کو پکڑے ہوئے روانہ ہوا۔ گائے بول پڑی۔ کہنے لگی: حضور! مجھ پر سوار ہو جائیے۔ یہ تیرے لیے زیادہ سہولت کی بات ہے۔ نوجوان نے کہا: میری ماں نے مجھے سوار ہونے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ فرمایا تھا کہ گردن سے پکڑ کر گھر لے آؤں۔ گائے نے کہا: بنی اسرائیل کے رب کی قسم! اگر تو مجھ پر سوار ہو جاتا تو میں کبھی تیرے قابو میں نہ آتی، اب کے بعد اگر تو پہاڑ کو بھی حکم دے کہ اپنی جگہ سے ہٹ جا۔ تو وہ ہٹ جائے گا کیونکہ یہ سب کچھ تجھے اپنی والدہ کی خدمت گزاری سے مل رہا ہے۔ آخر وہ گائے کو اپنی والدہ کے پاس لے آیا۔ ماں نے کہا! بیٹا! تو مفلس ہے اور بہت دکھ اٹھاتا ہے، رات کو قیام کرتا اور دن کو لکڑیاں اکٹھی کرتا ہے، جاؤ اسے بیچ آؤ۔ عرض کی: کتنے میں بیچوں؟ ماں نے کہا: صرف تین دینار میں۔ لیکن پھر بھی مجھ سے مشورہ کر لینا۔ دراصل اس کی قیمت تھی بھی صرف تین دینار ہی۔ وہ اسے فروخت کرنے کے لئے بازار میں لیے جا رہا تھا ادھر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو بھیجا یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ لڑکا ماں کا کہا مانتا ہے یا دنیا کی لالچ میں آ جاتا ہے اگرچہ وہ علیم وخبیر ہے تاہم لڑکے کی آزمائش کے لئے فرشتہ بھیج دیا۔ فرشتے نے لڑکے کے پاس آ کر کہا: اے نوجوان! اس گائے کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا: صرف تین دینار، لیکن شرط خیار ہے کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ کر بیچوں گا۔ فرشتے نے کہا: چھ دینار لے لے مگر والدہ سے مشورہ مت لے۔ نوجوان نے کہا: اگر اس گائے کو سونے سے تول کر بھی قیمت دے دو تب بھی ماں کے مشورہ کے بغیر نہیں دے سکتا۔ ماں کے پاس پہنچ کر ماجرا سنایا۔ ماں نے کہا: چلو چھ دینار میں بیچ دو لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھ لینا۔ نوجوان نے واپس آ کر فرشتے سے کہا: مجھے چھ دینار منظور ہیں لیکن شرط وہی ہے۔ فرشتے نے کہا: بارہ دینار لے لے مگر ماں سے مشورہ لینے کے لئے مت جا۔ نوجوان نے کہا: ہرگز نہیں، مشورہ تو ضروری ہے۔ نوجوان پھر ماں کے پاس پہنچا۔ ماں نے کہا: بیٹا! جو خریدار ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ہے، جو تیرے امتحان کے لئے آدمی کی شکل بن کر آیا ہے۔ اب جاؤ اسے کہو کہ میری ماں کہتی ہے کہ اس گائے کو بیچ دیا جائے یا نہ؟ نوجوان نے واپس جا کر اس آدم نما فرشتے سے کہا: میری ماں یوں کہتی ہے۔ اس نے کہا: اسے اب فروخت نہ کرو اسے موسیٰ بن عمران علیہما السلام بنی اسرائیل کے ایک مقتول کے لئے خریدیں گے تو اسے دنانیر سے تول کر فروخت کرنا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ سے بنی اسرائیل کے لئے جُوں جُوں صفات پوچھتے گئے اللہ تعالیٰ اس گائے کی صفتیں بیان فرماتا

گیا۔ یہاں تک کہ اس گائے کی صفات مکمل ہو گئیں۔

ف: یہ صلہ ماں کی خدمت گزاری کا ہے جو اس نوجوان کو نصیب ہوا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل ہے۔

سوال: جانوروں سے اس گائے کی تخصیص کس لیے؟

جواب: وہ گائے اور بچھیا کے پجاری تھے۔ اس کی محبت میں وارفتہ تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت گھر کر گئی۔

پھر تائب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں مشغول رہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی محبوب شئے کے ذبح کا حکم دیا تاکہ ان سے توبہ کی حقیقت کا اظہار ہو اور وہ چیز ہٹ جائے جس کی محبت میں مبتلا تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ گائے کا حکم اس لیے ہوا کہ ان دنوں ان کے ہاں بہترین قربانی گائے کی تھی تاکہ تقرب افضل واعلیٰ شئے سے ہو۔

قَالُوا گویا سوال ہوا کہ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کیا جواب دیا؟ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ وہ لوگ حکم کی تعمیل کی طرف مائل ہوئے اور کہا اے موسیٰ! ادْعُ لَنَا ہمارے لیے دعا کیجئے رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا اپنے رب سے کہ واضح کرے اور ہمیں بتائے مَا هِيَ۔ مَا مبتدا ہے اور هِيَ اس کی خبر ہے اور جملہ محل نصب میں ہے۔ یعنی بیان کرے ہمارے اس سوال کو۔ انہوں نے اس کے حال اور صفت سے سوال کیا جبکہ انہوں نے اسکی گائے کا ذکر سنا کہ جس کا بعض حصہ لگانے سے مردہ زندہ ہو جائے۔ پس لفظ مَا اس جگہ صفت وحال سے سوال کے لئے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ماز ید'' ؟ تو جواب میں کہتے ہیں: طیب او عالم یعنی انہوں نے پوچھا کہ اس کا سن اور اس کی صفت کیسی ہے؟ چھوٹی ہے یا بڑی؟ قَالَ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے کہا بعد اس کے کہ انہوں نے دعا فرمائی اور وحی آئی حکم ہوا۔ اِنَّهٗ کہ وہ اللہ تعالیٰ يَقُوْلُ اِنَّهَا فرماتا ہے وہ ذبح کرو کہ جس کے متعلق ذبح کرنے کا حکم ہے۔ بَقَرَةٌ وہ گائے ہے۔ لَّا فَارِضٌ بوڑھی سن رسیدہ نہیں۔

فرض سے مشتق ہے بمعنی قطع۔ گویا وہ سن کو قطع کر کے آخر وقت کو پہنچ چکی ہے۔ وَّلَا بِكْرٌ اور نہ ہی چھوٹی ہے

سوال: بِكْرٌ اور فَارِضٌ پر تانیث کیوں نہ لائی گئی؟

جواب: یہ لفظ حائض کی طرح مؤنث کے لئے خاص ہے اس لیے تانیث کی حاجت نہیں ہوئی۔

عَوَانٌ درمیانی ہے۔ بَيْنَ ذٰلِكَ اس ذکر کردہ فَارِضٌ و بِكْرٌ کے مابین فَافْعَلُوْا یہ امر موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہے۔ مامور بہ مذکور کی صفت بیان کرنے پر متفرع ہے۔ مَاتُؤْمَرُوْنَ، مَاتُؤْمَرُوْنَ بہ کے حکم میں ہے۔ یعنی جس کا حکم تمہیں دیا گیا ہے۔ گائے کے ذبح کرنے کا۔ اس فعل میں جارہ کا حذف کرنا عام ہو چکا ہے یہاں تک کہ متعدی بدو فعل کے احکام میں لاحق ہو چکا ہے۔ قَالُوْا گویا پوچھا گیا۔ اس بیان ثانی اور امر متکرر کے بعد انہوں نے کیا کیا تو جواب میں فرمایا: ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا دعا فرمایئے تا کہ ہمیں پتہ چلے کہ اس کے الوان میں سے کون سالون ہے جس کا ہمیں حکم دیا جارہا ہے۔ لَوْن عرض مشاہد کو کہتے ہیں۔ جو بعض جوہر میں پایا جاتا ہے۔ قَالَ موسیٰ علیہ السلام نے بعد از مناجات کے فرمایا: اِنَّهٗ وہ اللہ تعالیٰ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی گائے ہے۔ صفرۃ وہ رنگ ہے جو بیاض وسواد کے مابین ہوتا ہے اور مشہور رنگ ہے اور یہاں پر صفرۃ سے سیاہ رنگ مراد نہیں جیسا کہ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ میں صُفْرٌ سے سیاہ رنگ والے اونٹ مراد ہیں اور اس میں سواد کو صُفْرٌ سے تعبیر کرنا اس لیے ہے کہ صفرۃ سواد کے مقدمات سے ہے یا اس لیے کہ اونٹوں کی سیاہی زردی کے اوپر ہوتی ہے۔ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا مبتدا اور خبر ہے اور یہ جملہ بَقَرَةٌ کی صفات ہے فقوع بمعنیٰ زردی کی اور اس کا خالص ہونا تاکید میں کہا جاتا ہے۔ اصفر فاقع جیسا کہ کہتے ہیں اَسْوَدُ حَالِکٌ''۔

سوال: فَاقِعٌ کا اسناد لون کی طرف کیوں ہے حالانکہ یہ بھی تو ملوّن یعنی گائے کے احوال سے ہے۔

جواب: فَاقِعٌ کو لون سے ملابست ہے جیسا کہ اس کی تاکید بتاتی ہے۔ گویا دراصل عبارت یوں تھی: صفراء **شدیدا لصفرۃ صفرتھا** ۔ جیسا کہ جدّ جدّہ کہنا صحیح ہے۔ یعنی اس کا رنگ پکا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں وہ گائے تمام زرد تھی یہاں تک کہ اس کے سینگ اور کھر بھی۔

تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ دیکھنے والے اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں یعنی اس کا حسن اور اس کے رنگ کی صفائی دیکھنے والوں کو بھاتی اور دلوں کو لبھاتی تھی بوجہ تکمیل خلقت اور سینگوں اور کھروں کی لطافت کے، اور السرور نفع کے حصول یا اس کی امید سے دل میں لذت پانا۔

مسئلہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس نے زرد رنگ کا جوتا پہنا اس کے غم قلیل ہو جاتے ہیں کے

کیونکہ اس رنگ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے۔

مسئلہ : حضرت ابن الزبیر اور محمد بن کثیر سیاہ رنگ کے جوتے پہننے سے روکتے تھے کیونکہ سیاہ رنگ غم والم ڈالتا ہے۔

مسئلہ : مذکورہ حضرات فرماتے ہیں کہ سرخ رنگ کا موزہ فرعون کا تھا۔ اس کے وزیر ہامان کا سفید رنگ کا۔

مسئلہ : علماء کا موزہ سیاہ ہونا چاہیے کیونکہ مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا موزہ سیاہ رنگ کا تھا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ کیا وہ گائے سائمہ ہے یا کام کرنے والی اور کشاف میں ہے کہ سوالات کا تکرار صرف اس کے حال اور صفت کے پوچھنے اور زاید معلومات کے انکشاف کے لئے تھا تا کہ اس کے وصف معلوم کرنے میں تزاید حاصل ہو۔

مسئلہ : کسی بات کے کھوج میں پڑنا نحوست ہے۔

حکایت : عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ نے اپنے خادم سے فرمایا: اگر میں تجھے کہتا ہوں میرے پاس فلاں بکری لے آ، تو تم پوچھنا شروع کر دیتے ہو اَضَائِن'' اَمْ مَاعِز۔ اگر میں بیان کر دیتا ہوں تو تم پھر پوچھتے تو نر یا مادہ۔ اگر اس کی بھی خبر دے دیتا ہوں تو پھر کہتے ہو: سیاہ یا سفید۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ پس جب میں کہوں لے آؤ تو پھر بار بار سوال نہ کرو، جو مرضی ہو لے آؤ۔

حدیث شریف : میں ہے: بہت بڑا مجرم وہ شخص ہے کہ اس شئے کے متعلق پوچھتا ہے جس کی تحریم نازل نہیں ہوئی پھر اس کے سوال کی وجہ سے حرام ہو جائے۔

اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا یعنی گائے مذکورہ کی جنس باعتبار عوان ہونے اور زرد ہونے کے ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ کیا کیا جائے۔

سوال : پہلے بَقَرَةٌ بولتے رہے اب بقر کیوں بول رہے ہیں؟

جواب : اس لیے کہ اس سے بقرہ کی جنس مراد ہے یا اس لیے کہ قاعدہ ہے کہ جمع کے حروف اپنے واحد سے کم ہو جائیں تو اس سے مذکر و مؤنث دونوں مراد لینا جائز ہوتا ہے۔

وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ یعنی ہمیں گائے ذبح کرنے کی ہدایت نصیب ہو جائے گی۔

حدیث شریف میں ہے: اگر استثناء یعنی اِنْ شَآءَ اللّٰهُ نہ کہتے تو ان کے لئے گائے کا بیان کبھی نہ ہوتا۔

قَالَ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اِنَّهٗ کہ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ یعنی وہ ایسی گائے نہیں کہ کام کاج سے ذلیل وخوار ہو۔

ف: عرب کہتے ہیں: دَابَّة ''ذَلُوْل'' بَيِّنَةُ الذِّلَّة ۔صعوبۃ کی ضد کا نام ہے۔ یہ بقرہ کی صفت ہے یعنی وہ گائے غیر ذلول ہے۔

سوال: ذلولة کیوں نہ کہا؟

جواب: فعول جب وصف ہوکر واقع ہو تو اس وقت اس پر تاء تانیث داخل نہیں ہوتی۔ جیسے صبور وغیرہ۔

تُثِيْرُ الْاَرْضَ زمین کو کھیتی کے لئے چیرتی ہے اور یہ ذَلُوْلٌ کی صفت ہے گویا کہا گیا **لا ذَلُوْلٌ مُثِيْرَة**''۔

وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ یعنی وہ سانیہ نہیں ہے کہ جس پر پانی لادا جاتا ہو۔

ترکیب: پہلا لَا نافیہ ہے اور دوسرا تاکید کے لئے، اور یہ لَا زاید ہے پہلے کی تاکید کر رہا ہے۔ کیونکہ معنیٰ یہ ہے کہ **انه ذلول تثير وتسقي**۔ علاوہ ازیں یہ دونوں فعل ذَلُوْلٌ کی صفت ہیں۔ گویا کہا گیا ہے۔ **لا ذلول مثيرة وساقية** ۔(**كذا في الكشاف**)

ف: امام ابومنصور فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گائے نہیں تھی بلکہ بیل تھا کہ زمین کا چیرنا اور کھیتی کا پلانا بیل کا کام ہے نہ کہ گائے کا۔ باقی رہا تانیث کے ساتھ افعال کا لانا صرف لفظ کی وجہ سے ہے نہ کہ تانیث کی وجہ سے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ تانیث جو افعال میں بیان ہوتی رہی وحدت کے لئے ہے۔

لیکن امام ابویوسف علیہ الرحمہ بعد از تسلیم کہ **اثارة الارض واسقا الحرث** بیل کا نام ہے۔ ابومنصور کے خلاف ہوکر فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ گائے سے کھیتی وغیرہ کا کام لیتے ہوں جیسا کہ ہمارے زمانے میں بیل سے کام لیتے ہیں۔

مُسَلَّمَةٌ اسے اللہ تعالیٰ نے عیوب سے پاک رکھا اور کام کاج سے محفوظ فرمایا۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ اس کا رنگ خالص ہے ''سلم'' سے مشتق ہے یہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ جبکہ سمجھا جائے کہ ایسی خالص تھی کہ اس میں کسی

دوسری قسم کی ملاوٹ نہ تھی۔ اس کی تائید اگلا لفظ کرتا ہے لَا شِيَةَ فِيهَا کوئی دوسرا رنگ نہیں، جو کہ اس کے چمڑے کے رنگ کے مخالف ہو یہ زرد رنگ کی تھی یہاں تک کہ سینگ اور کھر بھی، شِیَة" کا اصل وشی" تھا جیسے عدة وصفة وزنة" کا اصل وعد" اور وصف" اور وزن" تھا اس کا ماخذ وشیُ الثوب ہے بمعنی استعمال الوان الغزل فی نسجه۔

قَالُوا ان اوصاف کے سننے کے بعد کہنے لگے: الْئٰنَ یہ اسم اشارہ کے معنیٰ کو متضمن ہونے کی وجہ سے مبنی ہے۔ جِئْتَ بِالْحَقِّ گائے کا حقیقی وصف اب بیان کیا ہے اس سے پہلے تمام اشکال کا بیان تھا۔ فَذَبَحُوهَا فا فصیحیہ ہے یعنی انہوں نے اوصافِ مذکورہ جیسی گائے حاصل کر لی جو ایک نوجوان کے پاس تھی اسے سونے کے برابر خریدا گیا۔ وَمَا كَادُوْا نہیں قریب تھا۔ يَفْعَلُوْنَ کہ یہ عمل کرتے۔ یہ جملہ ذَبَحُوا کی ضمیر سے حال ہے۔

ای ذبحوا والحال انهم کانوا الخ یعنی اسے ذبح کر دیا۔ لیکن اس سے قبل اس سے بچنے کے در پے تھے یعنی بعد توقف اور بہت دیر کے ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے۔

ف: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سوالات کرنے میں از ابتداء تا انتہا چالیس سال گزر گئے۔

سبق: عاقل پر لازم ہے کہ سنتے ہی فرماں برداری کا عمل شروع کر دے اس میں کھوج میں نہ پڑے۔ کیونکہ توحید کا اصلی مقصد اسی کا مقتضی ہے۔

مثنوی شریف میں ہے:

تا خیالِ دوست در اسرارِ ماست　　　چاکری و جاں سپاری کارِ ماست

ترجمہ: جب تک دوست کا تصور ہمارے دل میں ہے تو غلامی اور جاں سپاری ہمارا کام رہے گا۔

تفسیر صوفیانہ

حکم عطائیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو صرف اپنا عبد بنانے کے لئے اسے بشریت کے ہر منافق وصف سے خارج کر لیا تاکہ وہ اپنے معبود کی نداء کا جواب دے اور اس کے قہر سے بچ کر اس کے قُرب کا اہل ہو جائے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی حفاظت کاملہ پر موقوف ہے۔ یہ اس وقت ہے جب کسی معصیت کا مرتکب نہ ہو۔ اگر کسی وقت ارتکاب ہو جائے تو اس پر اصرار نہ کرے کیونکہ اصطلاح میں حفظ الٰہی اسی کا نام ہے کہ بندہ گناہوں سے دور رہے لیکن ان کا صدور اس سے ممکن ہو بخلاف

عصمت کے کہ وہاں گناہوں کا صدور محال ہوتا ہے۔ اسی لیے اصطلاحاً عصمت انبیاء علیہم السلام کے لئے اور حفظ اولیاء کرام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اَلْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ دلالت کرتا ہے کہ بندہ اپنی غلطیوں اور ان پر اصرار نہ کرنے کی بنا پر کہتا ہے، اسی کا نام ایمان خالص ہے۔

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً اس میں نفس بہیمیہ کے ذبح کا حکم ہے کیونکہ اس کے ذبح سے قلب روحانی کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔ یہی وہ جہادِ اکبر ہے جس کے متعلق سرورِ عالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر**

(جہاد اصغر سے فارغ ہو کر جہاد اکبر کی طرف جا رہے ہیں)

اور فرمایا: **المجاهد من جاهد نفسه** (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے)

اور فرمایا: **مُوتو اقبل انت مُوتوا** (مرنے سے پہلے مرجاؤ)

اسی معنیٰ کی طرف اشارہ ہے: اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا تم ذبح نفس کے بارے میں ہمارے ساتھ استہزاء کرتے ہو۔ نفس کو ذبح کرنا ہر ذی ہمت کا کام نہیں۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ یعنی میری پناہ ان جاہلوں سے جو گمان کرتے ہیں کہ نفس کو ذبح کرنا بیکار بات ہے۔ یہ بات وہ کہیں گے جو نفس کے تابع اور دنیا کے طالب ہیں قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے دعا فرمایئے کہ وہ نفس کون سا ہے جسے صدق کی تلوار سے ذبح کیا جائے اب اس کی صفتوں کو بیان فرمایا کہ: لَا فَارِضٌ وہ نہ تو بوڑھا ہو کہ بڑھاپے کے ضعف اور نفسانی قویٰ کی کمزوری سے سلوک کی راہ طے نہ کر سکے جیسا کہ صوفیہ کرام فرماتے ہیں:

"اَلصُّوفِيُّ بَعْدَ الْاَرْبَعِيْنَ بَارِدٌ" (صوفی چالیس سال کے بعد ٹھنڈا پڑ جاتا ہے)

وَلَا بِكْرٌ اور نہ ہی ایسا نوجوان ہو کہ جوانی کی مستی سے سلوک کی باتوں سے روگردانی کرے۔ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ یعنی کامل العقل ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (یہاں تک کہ جوانی کو پہنچے اور چالیس سال کا ہو جائے)

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ پس جس کا تمہیں حکم ہوا ہے بجا لاؤ۔ جب تم اس کے قریب ہو گے تو وہ بھی تمہارے

قریب ہو جائے گا کیونکہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ جوان ہو یا بوڑھا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا انہوں نے کہا کہ ہمارا رب بیان فرمائے کہ وہ نفس کس طرز کا ہو جو جہاد کے کام آ سکے۔ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فرمایا کہ اس کا حکم ہے کہ وہ نفس زرد رنگ کا ہو، اس میں ریاضت کرنے والوں کے منہ کی زردی اور مجاہدہ کرنے والوں کی نشانی کی طرف اشارہ ہے۔ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا اس کا رنگ پکا ہے یعنی ان کا یہ رنگ زینت ہے نہ کہ عیب۔ جیسا کہ ولیوں کے دیدار سے نصیب ہوتا ہے کہ ان کے رخساروں سے رونقِ بہار معلوم ہوتی ہے جو جماعت الٰہی کی غمازی کر رہی ہوتی ہے اور ان کے چہروں سے شواہد غیب کے آثار ٹپکتے ہیں کہ انہوں نے سینے میں بشریت کے اوصاف کو مٹا کر ربوبیت کے اوصاف کو اپنا لیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کے رخساروں میں سجدوں کے آثار چمکتے ہیں)

اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا بیشک بقرہ کے آثار ہم پر ملتبس ہو گئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ بہت سے گمراہ طالبانِ حق کے لباس میں پھرتے ہیں ان کا بھیس بدل کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ بیشک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہمیں راہِ راست نصیب ہو جائے گا۔ یعنی کسی اللہ والے کو پالیں گے جب تیری مشیت نے ہمارا ساتھ دیا۔ جیسے موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی ملاقات نہ ہوتی۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ اس میں اشارہ ہے کہ طالب صادق وہ ہے جو حرص سے دنیا حاصل کرتا ہوا خواہشاتِ نفسانیہ اور دنیا کی رونقوں کے پیچھے نہ پڑے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عَزَّ مَنْ قَنِعَ وَذَلَّ مَنْ طَمِعَ (جس نے قناعت کی وہ عزت پائے گا اور جس نے طمع کیا وہ ذلیل ہوگا)

اور فرمایا: لَيْسَ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يُّذِلَّ نَفْسَهٗ۔ (مومن اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرتا)

وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ دنیا کی کھیتی کے لئے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ نہیں رکھتا۔

چنانچہ فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ

(جو دنیا کی کھیتی کا خواہشمند ہوگا اسے ہم دنیا میں دیں گے لیکن آخرت میں اسے کچھ نہیں ملے گا)

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا یعنی نفوس قدسیہ ایسے ہیں جو نفسی صفات سے بالکل آزاد ہو کر خالص مخلص ہو کر اللہ تعالیٰ

کے احکام کے پابند رہتے ہیں ان کی طلب اور ان کا مقصد صرف ذاتِ حق ہے۔ جیسا کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا

(ان فقراء کے لئے جو روکے گئے اور سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے جاہل انہیں دولت مند سمجھتے ہیں تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان جاؤ گے وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے)

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ انہوں نے ذبح کیا لیکن قریب تھا کہ ذبح نہ کرتے۔ اس میں اشارہ ہے کہ نفس کو ذبح کرنا طبیعتِ انسانیہ کے خلاف ہے لیکن صادق لوگوں نے صدق کی تلوار سے اسے ذبح کر دیا لیکن یہ بھی صرف اس کے فضل اور حسنِ توفیق کی بدولت دورنہ طبیعتِ انسانیہ کی رُو سے وہ ہرگز نفس کو ذبح نہ کرتے۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾

اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا جو تم چھپاتے تھے

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ

تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ یوں ہی مردے جلائے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ

دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں

اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا

بلکہ ان سے بھی زیادہ کرّے جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں

لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ

جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾ اَفَتَطْمَعُونَ اَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ

اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں تو اے مسلمانو! کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے

كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهٗ مِنْ بَعْدِ

اور ان میں کا تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد

مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِينَ اٰمَنُوا قَالُوا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا

اسے دانستہ بدل دیتے اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوا اَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوكُمْ

اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت

بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ

حجت لائیں کیا تمہیں عقل نہیں۔ کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے

مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ

جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر

اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ

زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں۔ تو خرابی ہے ان کے لئے جو کتاب

بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا

اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوْا

تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے۔ اور بولے

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا

ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرما دو کہ خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے

فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ

جب تو اللہ ہرگز اپنا عہد خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ ہاں کیوں نہیں جو گناہ

سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

کمائے اور اس کی خطا اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا یہ مضمون لفظاً مؤخر ہے لیکن معناً مقدم ہے کیونکہ مذکورہ بالا کی ابتدا اسی سے ہے۔ یعنی یاد کرو بنی اسرائیل مقتول کو قتل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر اس کے متعلق سوال کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے۔ انہوں نے کہا: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ الآیۃ ۔

سوال: یہ آیت قصہ کی ابتدا میں کیوں مذکور نہ ہوئی؟

جواب: کیونکہ اس مضمون سے قصہ بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ گائے ذبح کر کے مقتول کا پتہ دینا مطلوب ہے۔ پھر جو شے مقصود اور مدنظر ہو وہی مقدم ہوا کرتی ہے۔

سوال: حضور علیہ السلام کے ہم عصر یہود کی طرف یہ قصہ کیوں منسوب کیا جا رہا ہے؟

جواب: یہ لوگ اپنے اسلاف کے اس فعل سے راضی تھے۔

سوال: جمع کو کیوں مخاطب کر رہے ہیں حالانکہ قتل کرنے والی کوئی جماعت تو نہ تھی؟

جواب: مقتول جماعت میں ملا تھا۔ القتل اس بنیاد کو توڑنا جس سے زندگی ختم ہو جائے۔ یعنی یاد کرو اے بنی اسرائیل! اپنے اسلاف کے برے عمل کو، جبکہ انہوں نے ایک نفس محرمہ کو قتل کیا۔

ف: مقتول کا نام عامیل بن شراحیل تھا۔

فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا، فَادّٰرَءْتُمْ دراصل تدارءتم تھا۔ درء سے مشتق ہے۔ بمعنی دفع، ای تدافعتم وتخاصمتم فی شانها۔ یعنی اس کے حق میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے تھے کیونکہ عصماء میں سے ہر ایک مدافعت کرتا اور کہتا میں تو اس فعل سے بری ہوں کوئی اور ہوگا۔ وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ وہ جو تم چھپاتے تھے اسے اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ یعنی وہ جو تم چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ اسے مستور و مکتوم نہیں رکھے گا بلکہ ظاہر کر دے گا۔

سوال: مُخْرِجٌ کا عمل کیسے صحیح ہو سکتا ہے حالانکہ وہ ماضی کے معنی میں ہے؟

جواب: گویا یہ حکایت ہے جو کہ آئندہ تدارء" میں ہوگا بمعنی حاضر کے، جیسے باسط ذراعیہ میں حکایت ہے۔

فَقُلْنَا ۔ فَادّٰرَءْتُمْ پر عطف ہے۔ درمیان میں کلام بطور جملہ معترضہ کے استعمال کیا گیا ہے۔ اِضْرِبُوْهُ اس

نفس کو مارو۔

سوال: نفس مؤنث سماعی کے لئے ضمیر مذکر کیوں لایا گیا؟

جواب: بتاویل شخص اور انسان کے۔

بِبَعْضِهَا بقرہ کے بعض کے ساتھ جو بھی ہو یا اس کی زبان سے۔ کیونکہ وہ کلام کا آلہ ہے۔ یا ذم کی ہڈی کیونکہ یہی سب سے پہلے پیدا ہوتی ہے اور سب کے بعد گلتی سڑتی ہے اور اسی پر دیگر تمام اعضاء کی تخلیق کی ترکیب ہوتی ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور عضو مراد ہے۔

ف: بعض نصف سے کم کو کہتے ہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ پھر انہوں نے اسے مارا جس سے وہ زندہ ہو گیا۔

سوال: اس میں عبارت فضربوا فیحیٰ کیوں محذوف ہے؟

جواب: چونکہ کَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى دال موجود ہے مدلول کا ذکر نہیں کیا گیا۔

واقعہ: مروی ہے کہ انہوں نے وہی ٹکڑا جسم سے لگایا تو وہ مردہ باذن اللہ تعالیٰ زندہ ہوا اور اس کی رگوں سے بدستور خون جاری تھا اور کہا مجھے فلاں بن فلاں نے قتل کیا ہے جو کہ اس کے چچازاد بھائی تھے پھر وہ مر گیا۔ پھر ان دونوں کو پکڑ کر قتل کیا گیا اور انہیں مقتول کی وراثت سے محروم کیا گیا۔

سوال: موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس کے ٹکڑے لگانے کا حکم دیا خود کیوں نہ لگایا۔

جواب: تا کہ ان کی طرف سحر یا حیلہ کی نسبت نہ ہو۔ کَذٰلِكَ یہاں قلنا مقدر ہے۔ یعنی جب انہوں نے مارا اور وہ زندہ ہوا تو ہم نے کہا: کَذٰلِكَ اسی طرح کَذٰلِكَ کا خطا ان لوگوں کو ہے جو مقتول کے زندہ ہونے کے وقت موجود تھے یعنی مثل اس زندہ کرنے عجیب کے۔ یُحْیِ ا الْمَوْتٰى قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زندہ کرے گا۔

سوال: بنی اسرائیل کو تو قیامت میں اٹھنے کا اقرار تھا تو پھر انہیں کَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ کہہ کر کیوں الزام لگایا جا رہا ہے؟

جواب: واقعی وہ قولاً اور تقلیداً تو اقراری تھے لیکن انہیں عیان وایقان کے طور ثبوت دے رہے ہیں۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کا قول لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي اعیان وایقان کے لئے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب ان لوگوں کو ہو جو منکرین

قیامت حضور علیہ السلام کے ہم زمان آیات مبارکہ نزول کے وقت موجود تھے۔ اب دیگر تاویلات کی ضرورت نہیں بلکہ حکایت کا ببعضہا ختم ہو جاتا ہے۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ اپنے دلائل تمہیں دکھاتا ہے کہ بیشک وہی ہر شئے پر قادر ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ عقل کا مادہ عَقَلْتُ نَفْسِي عَنْ كَذَا ہے یعنی میں نے نفس کو اس سے روکا۔ یعنی یہ اس لئے ہوا تا کہ تمہارے عقول کی تکمیل ہو جائے اور تم جان لو کہ وہ جب ایک نفس کے زندہ کرنے پر قادر ہے تو وہ تمام نفوس کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

سوال: اس قتیل کے زندہ کرنے میں اتنی شرائط بیان فرمانے میں کیا حکمت تھی کہ گائے ذبح ہو پھر اس کا ایک ٹکڑا مقتول کے بعض حصہ کو لگایا جائے جبکہ وہ باری تعالیٰ بلا واسطہ اس کے زندہ کرنے پر قادر ہے؟

جواب: اس میں تقرب الی اللہ کا اشتمال اور ادائے واجب اور یتیم کو تجارت سے نفع دینا اور اللہ تعالیٰ پر متوکل ہونے کی برکت اور اولاد پر شفقت کرنا اور والدہ کے خدمت گزار کو فائدہ دینے کی وجہ سے بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ: سالک کو چاہیے کہ اپنی قربانی مالک کے حضور پیش کرے۔ اسے یہ بھی لائق ہے کہ اچھی قربانی کرے اور قیمتی ہو۔ جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دُنبہ تین سو دینار کی قیمت کا ذبح کیا تھا۔

عقیدہ: مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اسباب تاثیر کے صرف علامات ہیں ان میں کسی قسم کی تاثیر نہیں ہوتی کیونکہ دو موتیں جو دو جسموں (مقتول بنی اسرائیل اور گائے) سے حاصل ہوئیں کسی لحاظ سے بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے حیات پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ قادر ہے اس نے حیات پیدا کر دی۔

تفسیر صوفیانہ جسے چاہیے کہ میں اپنے سب سے بڑے دشمن کی حقیقت معلوم کر لوں جو کہ میری حقیقی موت کے درپے رہتا ہے تو اسے اپنے نفس کی خواہشات کو مٹانا چاہیے۔ جب اس سے طفولیت کی حرص زائل ہو جائے گی کیونکہ اس کے بعد اس کا حال عجیب اور خوش منظر طلب دنیا سے دور اس کی گرد وغبار سے ایسا صاف ہو جائے گا کہ خود نفس ایسی باتوں کو قبول کرے گا جس کی وجہ سے اسے حیات طیبہ نصیب ہو جائے گی اور احوال اس کے سامنے منکشف ہو جائیں گے اور عقل و وہم کا جھگڑا بھی دور ہو جائے گا۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا الخ۔ اس میں بعض عارفین فرماتے ہیں کہ جو شخص چاہتا ہے کہ مجھے احیاء قلب نصیب

ہوجائے تو اسے چاہیے کہ اپنے نفس کی خواہشات کو مٹا دے کیونکہ جس نے نفس کی خواہشات کو ریاضاتِ شاقی کے ذریعے سے مٹایا تو اس کے دل کو اللہ تعالیٰ انوارِ مشاہدات سے زندہ کردے گا۔ جو نفسانی خواہشات کو مٹا کر طبعی موت سے مرے گا اسے حقیقی حیات نصیب ہوگی۔ پھر جیسے گائے کے ذبح کے بعد اس کی زبان مقتول کو ماری گئی اور وہ زندہ ہوگیا اور کہا کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے۔ اسی طرح جس نے نفس کو جو کہ سچائی کے چھرے سے مذبوح ہو اس کی زبان کو دائمی ذکر کے ساتھ مقتول کے قلب پر مارا جائے تو بھی اس دل کو اللہ تعالیٰ اپنے نور سے زندہ کرے گا پھر وہ بندہ کہے گا: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

شخصم بچشم آدمیاں خوب منظر است — وزخبثِ باطنم سر خجلت فتادہ پیش
طاؤس رانقش ونگاری کہ ہست خلق — تحسین کنند او خجل از پائے زشت خویش

ترجمہ: ا۔ میرا ظاہر تو لوگوں کو اچھا نظر آتا ہے لیکن میں اپنی اندرونی خباثت کی وجہ سے شرمساری سے سر جھکائے ہوئے ہوں۔ ۲۔ مور کی حسین وجمیل شکل پر لوگ تحسین کہتے ہیں وہ اپنے پاؤں کی وجہ سے شرمسار ہے۔

قاعدہ صوفیہ:۔ کسی بزرگ سے اسلام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:۔

''مخالفت کر کے نفس کو ذبح کرنا اور نفس کی مخالفت کا مطلب ہے کہ اسے خواہشات سے دور رکھنا''

حکایت:ا۔ حضرت سرّی سقطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: مجھ سے تیس یا چالیس سال نفس مطالبہ کرتا رہا کہ میں اخروٹ کو کھجور کے شیرہ میں ملا کر کھاؤں لیکن میں نے اسے اس خواہش سے محروم رکھا۔

حکایت:۲۔ ایک مرد کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھ کر اس سے پوچھا کہ آپ نے یہ مرتبہ کہاں سے پایا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب سے میں نے خواہشاتِ نفسانی کو چھوڑا اللہ تعالیٰ نے ہوا کو میرے تابع کردیا ہے۔

نسخہ روحانی: کسی نے بزرگ سے پوچھا کہ مجھے ایسا طریقہ بتاؤ جس سے میں تجریدی حج ادا کروں۔ بزرگ نے فرمایا: پہلے دل کو سہو سے صاف کرو۔ پھر نفس کو لہو ولعب سے دور رکھو۔ اس کے بعد زبان کو لغویات سے بچاؤ

پھر جہاں چاہو جاؤ۔

تفسیر عالمانہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ یہ خطاب اہلِ کتاب کے ان علماء کو ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زمان تھے۔ ثُمَّ ان کی قساوتِ قلبی کے بعد کی وجہ سے ہے کہ بعد ذکر کرنے یعنی باوجودیکہ ہم نے تمہیں وہ امور بتائے ہیں جو دل کو نرم کرتے ہیں اور اس میں رقت پیدا کرتے ہیں لیکن پھر بھی تم شک میں ہو۔

ف: قسوۃ'' اور قساۃ'' غلیظ وشدید ہونے کو کہتے ہیں جیسے کہ پتھر میں ہوتی ہے اور قلوب کو اس سے اس لیے موصوف کیا گیا کہ وہ عبرت پکڑنے سے دور ہیں اور نصائح ان پر اثر نہیں کرتے۔

مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ بعد ان واقعات کے سننے کے کہ مقتول زندہ ہوا اور وہ لوگ بندر وخنزیر ہوئے اور پہاڑ ان کے سروں پر آیا اور دیگر آیاتِ بینات اور وہ حالات کہ جن کو سن کر پہاڑ پگھل جائیں اور پتھر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

فَهِیَ پس یہ قلوب كَالْحِجَارَةِ اپنی شدت وقساوۃ کی وجہ سے پتھر کی طرح ہیں۔ فاء تفریع کے لئے ہے جو قلوب کو پتھر سے مشابہت دی گئی ہے کہ وہ قساوت میں برابر ہیں یہ **التشبیہ علیٰ وجه الشبه** کے قبیل سے ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ اَحْمَرُ خُدُّهٗ فَهُوَ كَالْوَرْدِ (اس کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ ہے)

اَوْ اَشَدُّ یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ قَسْوَةً تمیز ہے اور اَوْ بمعنی بَلْ ہے یا تخییر کے لئے ہے۔ یعنی اگر تم چاہو اس سے بھی زیادہ سخت شئے۔ مثلاً لوہے سے تشبیہ دو تب بھی موزونیت سے خالی نہیں۔

سوال: اَوْ کا اصلی معنی یعنی شک وتردد کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: شک وتردد اللہ تعالیٰ علام الغیوب سے محال ہے۔

سوال: اَشَدُّ قَسْوَةً کیوں کہا گیا تو یہ ان افعال میں ہوتا ہے جن سے **افعل التفضیل و افعل التعجب** کی بنانہ ہو سکے حالانکہ یہ مجرد کا فعل ہے اور اس سے **افعل التفضیل و افعل التعجب** دونوں مشتق ہو سکتے ہیں؟

جواب: یہی معنی مراد پر زیادہ ظاہر اور قسوۃ کی زیادتی پر زیادہ دال ہے کیونکہ اس میں جو لفظ یعنی قسوۃ بھی موجود ہے اور پھر زیادتی کے معنی کے لئے لفظ اَشَدُّ بھی بخلاف اقسیٰ کے کہ اس میں صرف جوہر کلمہ یعنی قَسْوَةً کی دلالت ہوگی۔

سوال: قساوۃ کی تشبیہ حجارۃ سے کیوں ہے حالانکہ اس سے بہت بڑے سخت لوہا اور تانبہ تو موجود ہیں۔

جواب: وہ آگ وغیرہ سے نرم ہو جاتے ہیں مثلاً لوہے کو آگ نرم کر دیتی ہے اس میں نرمی کا مادہ ہے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں نرم ہو جاتا تھا اور تانبے سے برتن وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں بخلاف پتھر کے کہ نہ اسے آگ نرم کر سکے اور نہ کوئی اور شئے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو اس سے تشبیہ دی۔ اللہ تعالیٰ عالم ہے کہ تشبیہ دے رہا ہے اور اسے علم ہے کہ یہ قوم ایمان نہیں لائے گی۔

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ **ربط**: اب ان کے دلوں کی پتھر سے زیادہ سختی کا بیان فرماتے ہیں کہ کفار کے قلوب کس طرح پتھر سے شدت میں زیادہ ہیں۔ گویا اب اَشَدُّ قَسْوَةً کی دلیل کو زیادہ پختہ بنانا مطلوب ہے۔

ترکیب: مِنَ الْحِجَارَةِ، اِنَّ کی خبر ہے اور اس کا اسم لَمَا الخ ہے۔ لام تاکید کے لئے ہے اور ما سے مراد پتھر ہے۔

لَمَا يَتَفَجَّرُ بہت بار پھٹ جاتا ہے۔ مِنْهُ اس کی ضمیر ما کی طرف راجع ہے۔ الْاَنْهٰرُ نہر کی جمع ہے۔ نہر پانی کے جاری ہونے کے مقامات سے ایک جاری ہونے کی وسیع جگہ کا نام ہے۔ یعنی بعض پتھر وہ ہیں کہ ان میں پھٹنا ہوتا ہے کہ جس سے پانی فراوانی سے نکل کر بہتا ہے۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ اور بعض پتھروں میں سے وہ ہیں لَمَا يَشَّقَّقُ یہ دراصل يَتَشَقَّقُ تھا یعنی پھٹ جاتے ہیں اور صدع بمعنی شئے کے اطراف کو چیرنا۔

فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ اس سے پانی طول یا عرض میں چلتا ہے اور اس سے پانی اُبلتا ہے۔ اس سے چشمے مراد ہیں نہ کہ نہریں۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ پہاڑ کی اونچائی سے گر کر نیچے آتا ہے مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ خشیۃ اس خوف کو کہتے ہیں جو علم سے ہو۔ یہاں مجاز ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی وجہ سے اور یہ ممتنع نہیں جس کا ارادہ کیا جا رہا ہے اور کفار وہ ہیں کہ نہ وہ تابعدار ہوتے ہیں اور نہ ہی نرم اور اور نہ ہی ڈرتے ہیں اور نہ وہ جس کے مامور ہیں اس پر عمل کرتے ہیں وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ اور اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے۔ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی جو تم عمل کر رہے ہو اس سے بے خبر نہیں۔ یہ شدید وعید ہے اس عمل کی وجہ سے جس پر ان کے قلوب ہیں اور اعمالِ سیئہ کی وجہ سے جن پر یہ وعید مرتب ہو رہی ہے۔

نکتہ: کافر کا دل پتھر سے پختہ اس لیے ہے کہ پتھر میں فہم و فراست کے اسباب و خطاب نہ ہونے کے باوجود

اللہ سے ڈر رہا ہے اور اس کے لئے فرمانبردار ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

اور کافر کا دل باوجودیکہ اس میں عقل وفہم کے اسباب ہیں اور قبول کرنے کی ہیئت بھی موجود ہے، نہ ڈرتا ہے اور نہ نرم ہوتا ہے۔

مسئلہ: معتزلہ کہتے ہیں: "خشية الحجر على وجه المثل" یعنی اگر ان میں عقل ہوتی تو وہ عمل ضرور کرتے اور اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں: پتھر اگرچہ جماد ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے فہم دیتا ہے اور الہام فرماتا ہے پھر اس الہام کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جمادات اور تمام حیوانات میں علم رکھا ہے (خلافاً للعقلاء) اور اس کے سوا دیگر کوئی واقف نہیں ہوتا، ان کی صلوٰۃ بھی ہے اور تسبیح وخشیت بھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ اور فرمایا: وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ اور كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ

سبق: سالک کے لئے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لائے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔

معجزاتِ محمدی: ۔ا۔ حضور علیہ السلام ایک دن کوہِ ثبیر پر تھے اور کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں تھے۔ کوہِ ثبیر نے عرض کی: مجھ سے اتر جائیے، ایسا نہ ہو کہ کافر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ لیں اور میں اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤں۔ اُدھر حرا پہاڑ نے عرض کی: حضور! میرے ہاں تشریف لے آیئے۔

۲۔ جس کھجور کے تنے کا، جو کہ مسجد کے ستونوں میں سے ایک تھا، آپ سہارا لے کر وعظ فرماتے۔ منبر تیار ہونے پر آپ نے اس سے ٹیک لگانا چھوڑ دیا تو وہ آپ کے فراق میں رو پڑا اور اونٹنی کی طرح اس سے چیخ وپکار کی آواز آ رہی تھی یہاں تک کہ عام مسجد والوں نے سنا۔ آپ نے نیچے اتر کر اسے گلے سے لگایا۔ تب اسے سکون نصیب ہوا۔ [۱] مثنوی شریف میں مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

آنکہ اورا نبود اسرار داد | کے کند تصدیق او نالہ جماد

ترجمہ: جسے عطیہ ایزدی سے اسرار نصیب نہ ہوں وہ جماد کے نالہ کی کب تصدیق کرتا ہے۔

۳۔ ایک یہودی بکریاں چرا رہا تھا کہ بھیڑیئے نے بکری پر حملہ کر کے بکری اٹھالی۔ وہی یہودی اس کے پیچھے بھاگا اور اس سے بکری چھڑالی۔ بھیڑیا یہودی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ ان کا چرواہا

[۱]: ۔ فقیر نے اس واقعہ کو شرح مثنوی شریف میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اویسی غفرلہٗ۔

میرے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ لوگوں نے کہا سبحان اللہ! بھیڑیا بھی کلام کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو ایمان رکھتا ہوں اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی۔ بھیڑیئے کا بولنا کونسی عجیب بات ہے قیامت کے دن کفار کے چمڑے بولیں گے۔

۴۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کنکریاں تسبیح پڑھتی تھیں۔

۵۔ زہر آلود بکری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بول پڑی۔

۶۔ دو درخت چل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے (اور جھک گئے) جن کی اوٹ میں بیٹھ کر آپ نے قضاءِ حاجت فرمائی پھر وہ اپنی جگہوں پر چلے گئے۔ وغیرہ۔ اس طرح کے بیشمار واقعات ہیں۔[1]

حکایت: قطب وقت شیخ ہدائی اسکداری کے واقعات میں ہے کہ پانی جاری میں چلتے وقت پانی کا ذکر یا دائم یادائم اپنے کانوں سے سنتے تھے۔

حضرت مولانا روم مثنوی شریف میں فرماتے ہیں:

نطق آب ونطق خاک ونطق گل ہست محسوس حواس اہلِ دل
فلسفی کو منکر حنانہ است از حواسِ اولیاء بیگانہ است
ہر کرا در دل شک و پیچا نیست درجہان او فلسفی پنہا نیست

ترجمہ: ۱۔ پانی مٹی اور گارے کا بولنا اہلِ دل کے حواس کو محسوس ہوتا ہے۔ ۲۔ وہ فلسفی جو حنانہ کے نالہ کا منکر ہے وہ حواسِ اولیاء سے بیگانہ ہے۔ ۳۔ جس کے دل میں شک اور ٹیڑھا پن نہیں جہان میں اس کے نزدیک فلسفی بے عقل ہے۔

ف: بعض حکماء فرماتے ہیں کہ: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ کا معنی یبس" بمعنی خشکی ہے۔ یعنی تمہارے دل خشک ہو گئے اور دل کی خشکی کا یہ مطلب ہے کہ دل دو پانیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

ایک اللہ تعالیٰ کے خوف کے پانی سے، دوسرا مخلوق پر شفقت کے پانی سے۔

جس دل میں نہ خوفِ خدا ہو اور نہ مخلوق پر شفقت، تو وہ دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔

---

[1] تفصیلی معجزات کے لئے فقیر کی کتاب "المعجزات" پڑھیے۔ اویسی غفرلہٗ۔

روحانی نسخہ:۔ حدیث شریف: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کثرتِ کلام سے بچو۔ اس لیے کہ ذکرِ الٰہی کے بغیر کثرتِ کلام سے دل سخت ہو جاتا ہے اور جس کا دل سخت ہو وہ اللہ تعالیٰ کے قرب سے دور ہو جاتا ہے۔

حدیث شریف: فرمایا: چار چیزیں بدبختی کی علامت ہیں:

ا۔ آنکھ کا خوفِ خدا سے آنسو نہ بہانا۔ ۲۔ دل کا سخت ہو جانا۔ ۳۔ طویل آرزو۔ ۴۔ دنیوی معاملات میں حریص ہونا۔

ف: آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہودیوں نے جبکہ بہت بڑے بڑے معجزات دیکھے لیکن چونکہ عنایت ربانی ان کے شامل نہ ہوئی اسی لیے سختی قلت کے سوا انہیں کچھ نصیب نہ ہوا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آیاتِ ظاہرہ تو دکھائے اور انہوں نے ظاہری حواس سے انہیں دیکھا لیکن انہیں اس برہان سے محروم رکھا جسے قلب سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی بات ان کے لئے آڑ بن گئی اور ان سے تکذیب وانکار سرزد ہوا۔ چنانچہ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ سے معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ کچھ یہی کیفیت ان بعض سالکین کی ہے کہ جب وہ ریاضت میں شاغل ہوتے ہیں تو روحانیت کی صفائی کی وجہ سے ان پر بعض آیات کا ظہور ہو جاتا ہے اور ان سے خرق عادات کرامات سرزد ہونے لگتے ہیں پھر جبکہ عنایت ربانی ان کے شامل حال نہیں ہوتی تو پھر سوائے عجب وغرور کے انہیں کچھ نصیب نہیں ہوتا اور یہ واردات عموماً رہبانیوں کو حاصل ہوتے ہیں اور ان فلسفیوں کو بھی جنہیں اللہ تعالیٰ خسارہ میں ڈالنے کی وجہ سے مہلت دیتا ہے اور انہیں اس کا علم تک نہیں ہوتا اسی لیے گمراہی میں بڑھتے رہتے ہیں۔

سوال: قلوب کو پتھر سے کیوں تشبیہ دی گئی ہے؟

جواب: جیسے پتھر نرم نہیں ہو سکتا اسی طرح یہ دل بھی ذکرِ حقیقی سے نرم نہیں ہو سکتے۔ ذکرِ حقیقی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اہتمام سے بیان فرمایا: فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا)

اقسامِ قلب:۔ سختی کے لحاظ سے دل کئی قسم کے ہیں: ا۔ بعض اس پتھر کی طرح ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہوتی ہیں یہ وہ ہیں جن میں صفائی کی وجہ سے روح کے انوار کے غلبوں سے بعض ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جو

خرق عادات کے مشابہ ہوتے ہیں اور یہ راہبوں اور کاہنوں میں ہوتا ہے۔

۲۔ بعض ان پتھروں کی طرح ہیں کہ جن کے پھٹنے سے پانی نکلتا ہے۔ یہ وہ ہیں جن پر بعض اوقات (جبکہ بشریت کے حجابات انوارِ روح سے دور ہو جاتے ہیں) وہ بعض آیات اور معانی کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور یہ بعض فلسفیوں اور بعض شعراء کو حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ بعض ان پتھروں کی طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر جاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن میں بعض صفائی ہوتی ہے کہ وہ بقدر صفائی قلب حجابات سے آگے بڑھ کر روح کے انوار کے عکس کے قابل ہوتے ہیں ان میں خوفِ الٰہی بھی ہوتا ہے اور خشیت بھی۔ یہ بات بعض اھلِ الادیان و الملل میں ہوتی ہے۔ یہ مراتب مشترک ہیں اہلِ اسلام میں ہوتے ہیں اور ان کے غیروں میں بھی۔

سوال : جب یہ مراتب مسلم وغیر مسلم میں مشترک ہیں تو پھر فرق کیا رہا؟

جواب : یہ مراتب اہلِ اسلام کو ایمان کی تائید سے نصیب ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ کرامات وفراسات کی وجہ سے اپنے قرب میں بڑھتے رہتے ہیں اور ان کی یہ کرامات وغیرہ تجلی انوار حق سے ظاہر ہوتی ہیں۔ کما قال تعالیٰ: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ

(جس کا اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے سینہ کھول دیتا ہے تو وہ اپنے رب کے نور پر ہوتا ہے)

۴۔ بعض قلوب ایسے پتھر کی مانند ہیں کہ نہ ان پر قرآن کا اثر ہوتا ہے اور نہ احادیث کا اور نہ ہی وعظ ونصیحت کا اور نہ ہی حکمت کا اور یہ قلوب کفار اور منافقین کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ قلوب ہیں جن پر مہر لگ چکی ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں تمہیں یا تو جلد از جلد سزا دے گا یا دیر سے۔ جلد سزا یوں کہ تمہارے انکار کو تمہاری قساوۃ قلبی کا سبب بنا دے گا جس سے تم انکار کیے جاؤ گے اور تمہارے قلوب کا میلان اعمالِ فاسدہ کی طرف رہے گا پھر تمہارے اس انکار کی وجہ سے تمہارے قلوب پر یہ مہر لگ جائے گی۔

حدیث شریف:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر ولی اللہ تعالیٰ کی انگلیوں (قدرت) میں ہے، چاہے تو وہ تمہارے دلوں کو سیدھا رکھے یا انہیں ٹیڑھا کر دے''

اور دیر سے سزا دینے کا مطلب یہ ہے کہ کل قیامت میں تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہیں سزا دے گا۔

(کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ

اَفَتَطْمَعُوْنَ ربط: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت الی الحق اور کفار کو اس کے قبول کرنے کے بڑے حریص تھے پھر ان کے عناد اور سرکشی سے آپ کا سینہ تنگ ہو جاتا یعنی ملال میں پڑ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی اسرائیل کے گذشتہ حالات سنوائے کہ باوجود آیات کے مشاہدات کے، پھر بھی انہوں نے نہ مانا۔ اس میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود تھا اس بارے میں کہ آپ کے ہمعصر اسرائیل حق قبول نہیں کر رہے تو کیا ہوا۔ آپ سے پہلے بھی ایسے ہوتا رہا۔ یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام سے ہے اور ہمزہ واقعہ کے انکار و استبعاد کی وجہ سے ہے جیسے کہتے ہیں:

"اَتَضْرِبُ اَبَاکَ" (کیا تو اپنے باپ کو مار رہا ہے؟)

یعنی یہ ہمزہ انکاری ہے نہ کہ وقوع کے انکار کے لئے جیسے کہا جاتا ہے: "ءَ اَضْرِبُ اَبِیْ" اور فاء عطف کے لئے جو مقدر پر عطف ہے جس کا مقام مقتضی ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی اَتَسْمَعُوْنَ اَخْبَارَهُمْ وَتَعْلَمُوْنَ اَحْوَالَهُمْ فَتَطْمَعُوْنَ خلاصہ کلام یہ کہ تم ان کے مایوس کن احوال کی تفصیل جانتے ہو پھر بھی تم طمع رکھتے ہو کہ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ ایمان لے آئیں گے تمام یہود یا ان کے علماء۔ کیونکہ یہ شدت طمع اور اخلاق ذمیمہ میں ان کے برابر ہیں۔ لہٰذا ان میں سے سوائے ان اعمال کے جو ان اسلاف سے صادر ہوئے کچھ نہیں حاصل ہوگا۔ پس ان کی تکذیب پر غم نہ کھاؤ اور لام لَکُمْ میں استجابت کے معنیٰ کی تضمین کی وجہ سے ہے ای فی ایمانھم مستجیبین لکم، یا تعلیل کے لئے ہے ای فی ان یحدثوا الایمان لاجل دعوتکم، واؤ حالیہ ہے۔ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک گروہ پہلے تھا۔ فَرِيْقٌ ایک ایسی جمع ہے جس کا اپنے لفظ سے واحد نہیں ہے۔ جیسے رھط"۔ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ جو تورات سے کلام الٰہی سنتے تھے۔ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ اس میں جو احکام تھے انہیں تبدیل کرتے جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور آیہ رجم۔ بعض کہتے ہیں کہ ستر منتخب شدہ یہود نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا جبکہ طور پر موسیٰ علیہ السلام نے سنا، جس میں امر و نہی تھا۔ پھر انہوں نے کہا ہم نے اللہ تعالیٰ سے

کلام سنا تو اس نے آخر میں فرمایا اگر تم سے ہو سکے تو اسے عمل میں لانا اگر نہ ہو سکے تو کوئی حرج نہیں۔

(کذافی التیسیر)

ازالہ وہم :۔لیکن بات یہ ہے کہ انہوں نے بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں سنا تھا کیونکہ یہ تو موسیٰ علیہ السلام کا خاصہ تھا۔ان کے ساتھ دنیا میں کسی کی شرکت نہیں تھی۔اب معنیٰ یوں ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کا کلام یعنی تورات سنتے تھے جبکہ موسیٰ علیہ السلام پڑھتے تھے۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ یعنی بعد اس کے کہ انہوں نے عقل سے اس کلام کو سمجھا اور ضبط کیا کہ ان کو کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہا۔ معنیٰ یہ ہے کہ لوگ کیسے ایمان لا سکتے ہیں جبکہ یہ اپنے اسلاف کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ بھی ان اہلِ سوء سے ہیں جو پہلے گذر چکے ہیں لہٰذا ان سے ایمان لانے کی طمع نہ کرو۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ جسے تحریف کرتے ہیں انہیں علم تھا کہ ہم کاذب ومفتری ہیں۔ وَاِذَا لَقُوا جب یہود ملاقی ہوتے ہیں۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ان لوگوں سے جو ایمان دار ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قَالُوْٓا منافقین کہتے ہیں اٰمَنَّا ہم بھی تمہاری طرح ایمان رکھتے ہیں کہ حضور سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی رسول مبشر بہ ہیں۔ وَاِذَا خَلَا جب واپس چلے جاتے ہیں بَعْضُهُمْ وہ لوگ جو منافق نہیں ہیں یعنی جب فارغ ہوتے ہیں مومنین کے مشغلہ سے اور متوجہ اور ملنے والے ہوتے ہیں اِلٰى بَعْضٍ ان لوگوں کی طرف جو منافق ہیں اس وقت کہ ان کے نزدیک سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ قَالُوْٓا تو وہ گھر میں بیٹھنے والے عتاب دیتے ہیں اس نے اس عمل پر اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ کیا تم خبر دیتے ہو۔استفہام بمعنیٰ نہی ہے۔یعنی مومنین کو خبر مت دو۔ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ وہ باتیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں خصوصی طور پر تورات میں بتائی ہیں یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف۔ فتح' سے اس لیے تعبیر کر رہے ہیں کہ وہ ایک پوشیدہ راز اور بند دروازہ کی طرح ہے کہ کوئی اس سے واقف نہیں ہے۔ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ لام تحدیث سے متعلق ہے نہ کہ فتح سے، اور ضمیر بہ میں بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ کی طرف راجع ہے یعنی تاکہ وہ حجت پکڑیں۔ پس تم پر حجت قائم کرتے ہوئے تمہیں عاجز کر دیں گے۔

عِنْدَ رَبِّكُمْ اس کے حکم اور کتاب میں جیسے کہتے ہیں۔ھو عند اللہ اس کی کتاب اور شریعت میں۔اس واقعہ کو سن کر یہود وغیرہ اگرچہ اس غرض کو حاصل نہیں کر سکتے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے حجت بازی کرنا لیکن ان کی حماقت اور بیوقوفی کے اظہار کے لئے ایسے ہی بیان فرمایا۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ان کے کلام سے متصل ہے بطور

توبیخ وعتاب کے ہے یعنی کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ پھر اس ظاہر فاحش کو معلوم کرلو گے۔ ان کا یہی بیان تم پر حجت ہوجائے گا۔ اس اعتبار سے ان کا عدمِ تعقل ابتداءً ہوگا۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ کیا یہ عمل تم کرتے ہو اور فاحش ظاہر کو سمجھتے بھی نہیں ہو جبکہ یہ بات بالکل واضح ہے اس لحاظ سے ان کا عدمِ تعقل فعل کے بعد ہوگا۔ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ ہمزہ انکار وتوبیخ کا ہے اور واؤ عاطفہ ہے اس کا عطف مقدر ہے کہ جس کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے اور ضمیر توبیخ دینے والوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی حجت کے خطرہ پر انہیں بیان کرنے پر کیوں ملامت کرتے ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمام وہ جو چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ کفر کو چھپاتے تھے اور ایمان کو ظاہر کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ مومنین پر اپنے نبی علیہ السلام کی طرف وحی بھیج کر ظاہر کردے گا۔ اہلِ ایمان حجت پکڑ کر کفار کو عاجز کردینے پر قادر ہوجائیں گے۔ جیسے کہ رجم کی آیت اور بعض محرمات کو حرام قرار دینے کی آیات سے ہوا۔ پس ملامت وعتاب کرنے میں کیا فائدہ؟ وَمِنْهُمْ اور یہودیوں میں سے بعض اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ تورات کو نہیں جانتے کہ مطالعہ کرکے نبوت کے دلائل کی تحقیق کرکے ایمان لائیں۔ اِلَّآ اَمَانِیَّ اُمْنِیَّة" کی جمع ہے تمنّی سے ماخوذ ہے اور استثناء منقطع ہے کیونکہ وہ جنس کتاب سے نہیں۔ یعنی نہیں جانتے سوائے شہوات باطلہ کے جو ان کے ہاں ہیں اور وہ مفتریات جن کے وہ مرتکب ہوئے۔ مثلاً: ا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کی تبدیلی۔ ۲۔ ہمیں (یہود کو) چند دنوں کے سوا عذاب نہیں مس کرے گا۔ ۳۔ انبیاء علیہم السلام ہماری شفاعت کریں گے۔ ۴۔ اللہ تعالیٰ ہمارے (یہود کے) گناہوں پر مواخذہ نہیں کرے گا بلکہ ہم پر رحم فرمائے گا۔ یہ اقوال ایسے ہیں کہ ان کی کوئی دلیل ان کے پاس موجود نہیں تھی۔

وَاِنْ هُمْ اور نہیں ہیں وہ اِلَّا یَظُنُّوْنَ مگر گمان کرتے ہیں، ان پر یقین نہیں رکھتے، یعنی وہ نہیں ہیں مگر قصوروار۔ یعنی ان کا امر گمان اور تقلید پر مبنی ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسا امر نہیں کہ جس سے وہ مرتبہ علم کو پہنچ سکیں۔ جب ایسی بات ہے تو پھر ان سے ایسے ایمان کی امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ جس کی بنیاد یقین پر ہو۔ فَوَیْلٌ ۔ ویل " یہ وہ کلمہ ہے جو ہلاکت میں پڑنے والا کہتا ہے۔ یعنی کسی کے لئے عذاب کی دعا مانگنا بمعنیٰ بہت بڑی سزا۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اس کا مابعد ہے۔

حدیث شریف:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَیْل " جہنم کی ایک وادی ہے جس میں کافر کو ڈالا جائے گا تو چالیس سال تک وہ اس کی تہ تک نہیں پہنچ پائے گا۔

قولِ حضرت سعید رضی اللہ عنہ:۔ حضرت سعید بن المسیّب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وَیل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں اگر دنیا کے پہاڑ ڈالے جائیں تو جل کر راکھ ہو جائیں۔

لِلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ ان کے لئے خرابی ہے جو تحریف شدہ کتاب کو لکھتے ہیں: بِاَیْدِیْهِمْ اپنے ہاتھوں سے۔ بِاَیْدِیْهِمْ تاکید ہے۔ تاکہ کسی کو یہاں مجازی معنیٰ کا وہم نہ ہو۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ کَتَبْتُ اِلٰی فُلَانٍ (میں نے فلاں کو لکھا) اس میں مجازی معنیٰ کا وہم ہے کہ اس نے دوسرے کو لکھنے کو حکم دیا اگرچہ اس نے خود نہیں لکھا لیکن امرِ کتابت کو اپنی کتابت سے تعبیر کیا ہے۔ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ پھر عوام کو کہتے ہیں ھٰذَا یہ تحریف شدہ کتاب مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یعنی یوں کہتے ہیں کہ یہی وہ اصل توراۃ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی۔

شانِ نزول:۔ جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو یہود کے علماء کو خطرہ لاحق ہوا کہ آپ کے اوصاف جو توراۃ میں درج ہیں عوام کو معلوم ہو گئے تو پھر ہمارے کھانے پینے اور عز و جاہ کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ انہوں نے توراۃ کے اندر جو حضور علیہ السلام کے اوصاف درج تھے تبدیل کر ڈالے عوام کو وہی تحریف شدہ اوصاف سناتے جو حضور علیہ السلام کے اوصاف کے برعکس تھے۔ اسی لیے ان کے عوام حضور علیہ السلام کی تکذیب کرتے رہے۔ اس حیلہ سے ان یہودی علماء کے حلوے مانڈے بحال رہے۔ [1]

اصل توراۃ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک:۔

حسین چہرے والے، گھنگھریالے بالوں والے، شرمیلی آنکھوں والے اور متوسط قد والے صلی اللہ علیہ وسلم بقدر حسن جمالہ وعلی آلہ وبارک وسلم۔

تحریف شدہ حلیہ کا ذکر: لمبے قد والے، نیلی آنکھوں والے، لٹکے ہوئے اور سیدھے بالوں والے (معاذ اللہ)

---

[1] اس سے وہ لیڈر نما مولوی عبرت پکڑیں جو احکامِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر امراء و احکام کی خوشنودی کے لئے مسائل بتاتے ہیں ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ اویسی غفرلہٗ۔

ف: توارۃ میں حضور علیہ السلام کا بیان تھا اور آپ کے حسن و جمال کا ذکر بھی۔ جب یہود اپنے علماء سے پوچھتے تو وہ پچھلے اوصاف سناتے جس کی وجہ سے عوام یہود حضور علیہ السلام کی پیروی سے محروم رہے۔

لِيَشْتَرُوْا بِهٖ تاکہ یہودی علماء تحریف شدہ مسائل کے عوض میں اپنے لیے حاصل کریں ثَمَنًا روپے، پیسے۔ ثمن وہ رشوت مراد ہے جو تحریف اور غلط تاویل کے عوض مال لیتے تھے۔

سوال: ثمن تو وسیلہ ہوتا ہے اور مقصود مبیع۔ یہاں اس کے برعکس کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: ان کی غلطی کے اظہار کے لئے کہ جو شئے مقصود بالذات تھی اسے انہوں نے وسیلہ بنایا اور وسیلہ کو اصل مقصود سمجھا ان کی الٹی چال کی وجہ سے آیت میں یوں ذکر ہوا۔ قَلِيْلًا اتنا تھوڑا کہ وہ کسی شمار میں نہ ہو۔

سوال: یہود کے علماء تو بہت مال حاصل کرتے تھے آیت میں اسے قلیل سے تعبیر کیا گیا ہے؟

جواب: اس کا قلیل ہونا یا تو اس کے فناہ ہو جانے کی وجہ سے ہے یا اس لیے کہ اس کا انہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا بلکہ الٹا عذاب۔ یا اس لیے کہ وہ حرام تھا اور حرام میں برکت نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حرام مال کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ (کذافی تفسیر القرطبی)

فَوَيْلٌ لَّهُمْ ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا۔ یعنی انہیں یہ سزا ان کی تحریف کی وجہ سے ہے وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ اور انہیں بڑا سخت عذاب ان کے برے عمل کی وجہ سے۔ مثلاً رشوت لینا اور گناہوں کا ارتکاب کرنا وغیرہ۔

اَلْكَسْبُ: اصل میں ایسا فعل جو حصولِ نفع اور دفعِ ضرر کے لئے کیا جائے۔ اسی لیے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہیں ہوتا۔

فوائد و لطائف: ۔ آیات مذکورہ میں چند لطیف اشارے ہیں: ۔

☆...... بندے کا علم اور یقین اور معرفت اور اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہو جانا وغیرہ اسے اس وقت تک فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا

(اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو تم سے کوئی ایک بھی نہ بچ سکتا)

یہ بات حق ہے، دیکھئے شیطان ابلیس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ کلام کیا اور اس سے مخاطب ہوا۔ کما قال تعالیٰ: يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (اے ابلیس! میں نے تجھے حکم دیا میرے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کو سجدہ کیوں نہ کیا) ابلیس کو اتنی قدر افزائی کے باوجود اسے ایمان حقیقی نے فائدہ نہ بخشا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے شاملِ حال نہ تھا۔ وہ ابلیس مشاہدہ کے باوجود ایمان پر ثابت قدم نہ رہ سکا تو برہان دیکھنے والوں کی کیا امید رکھی جائے مثنوی شریف میں ہے:

جز عنایت کے کشاید چشم را — جز محبت کہ نشاید خشم را
جهد بے توفیق خود کس را مباد — در جہاں واللہ اعلم بالسداد
جهد فرعونے چو بے توفیق بود — ہر چہ او می دوخت آں تفتیق بود

ترجمہ: ۱۔ عنایت الٰہی کے سوا کب آنکھ کھل سکتی ہے جہاں محبت ہو وہاں غصہ کیسا۔ ۲۔ بے توفیق الٰہی کوشش نہ ہو جہاں میں کوشش سے راہ سیدھی نصیب نہیں ہوتی۔ ۳۔ چونکہ فرعون کی کوشش توفیقِ الٰہی سے نہ تھی اسی لیے اس نے جو کچھ کیا ضائع ہوا۔

☆...... عالم بے عمل (سرکش) اور عوام گمراہی میں برابر ہیں۔ کیونکہ عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل پر کاربند ہو اور عوام کو چاہیے کہ ایمان وعقائد میں کسی کی تقلید نہ کریں اور نہ ہی گمان کی راہ پر چلیں کیونکہ ایمان صرف آرزو کا نام نہیں بلکہ تحقیق کا نام ہے۔ جو لوگ محض تقلید آبائی کے پابند ہیں اور اپنے ظنونِ فاسدہ پر عمل کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو پیشوا مانتے ہیں انہیں اپنی کتابوں سے سوائے ظاہری قرأت کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا نہ انہیں معانی کی معرفت نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی اسرار وحقائق کا ادراک حاصل ہوتا ہے ہمارے زمانہ کے اکثر لوگوں کا یہی حال ہے کہ ادھر دیکھو تو اسلام کے علمبردار ہیں لیکن اسلام کی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں ایسے مدعی اور صرف اسلام کے متمنی کا انجام برا ہوتا ہے۔ انہیں سوائے خسران اور گمراہی اور حسرت وندامت وو بال کے اور کچھ نصیب نہیں ہوگا۔ مثنوی شریف میں ہے:

تشنہ را گر ذوق آید از سراب — چوں رسد در وے گریزد جوید آب
مفلساں گر خوش شوند از زر قلب — لیکن آں رسوا شود در دار ضرب

ترجمہ : ۱۔ پیاسے کو اگر چہ سراب سے پیاس بجھانے میں مزہ محسوس ہوتا ہے لیکن جب اس کے قریب پہنچ کر اسے خالی پاتا ہے تو پانی کی تلاش کرتا ہے۔ ۲۔ اگر چہ کھوٹے سونے سے تنگدست خوش ہو جاتا ہے لیکن جب کسوٹی پر پرکھتا ہے تو سرمسار ہوتا ہے۔

☆...... جس نے دین کے کسی مسئلہ کو تبدیل کیا یا تحریف کی یا اس میں وہ عمل بدعت کے طور پر شامل کیا جو اصول دین سے خارج ہے تو وہ بھی اس آیت کی وعید میں داخل ہے۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے آخری دور کے لوگوں کے حالات کو معلوم کر کے فرمایا کہ خبردار! تم میں سے جو اہلِ کتاب تھے بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ وہ سب کے سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے کہ وہ بہشتی ہوگا۔

ف: حدیث شریف میں اس طرف اشارہ ہے کہ دین میں اپنی طرف سے ایجاد بندہ شامل نہ کرو جو کتاب اللہ سنتِ رسول اور سنتِ صحابہ کے خلاف ہو جس سے لوگ گمراہ ہو جائیں۔ جن باتوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرایا وہی باتیں ان میں گھس گئیں اور جہان میں وہ بیماریاں عام ہو گئیں۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

نخواہی کہ نفرین کنند از پست — نکو باش تابد نگوید کست

نہ ہر آدمی زادہ از دو بہست — کہ دوز آدمی زادہ بد بہست

ترجمہ : ۱۔ اگر تو چاہتا ہے تیرے بعد تجھے کوئی برانہ کہے تو نیک ہو جا تا کہ کوئی تیری برائی نہ کرے۔ ۲۔ ہر آدمی جانور سے اچھا نہیں، ظالم آدمی سے جانور بہتر ہے۔

☆...... بعض لوگ نمائشی صوفی بن کر اولیاء اور اہلِ دل لوگوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن ان کا دل ان کے طریقوں سے دور ہوتا ہے اور وہ غفلت کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ ان کے اقوال غمازی کرتے ہیں کہ یہ ان میں سے نہیں اور وہ ہمیشہ اپنی خواہشات کے پابند ہوتے ہیں جہاں خواہشات لے جاتی ہیں وہ اُدھر بھاگ جاتے ہیں۔ اگر انہیں احکامِ الٰہی کی طرف بلایا جائے تو اس سے کتراتے ہیں ان کو اولیاء اللہ کے طریقوں سے ذرہ بھر بھی حصہ نصیب نہیں ہوتا۔ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ان کی ان خرابیوں کا انہیں بہت عذاب ہوگا اور وہ جو الحاد عن الحق اور بُرے عقائد اور مخلوق کو دھوکا دینے اور انہیں

گمراہ کرنے کا عمل کرتے ہیں، تو اس وجہ سے انہیں وعیدِ شدید ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے:

صد ہزاراں دام ودانہ است اے خدا — ماچو مرغانِ حریص بے نوا

دمبدم مابستہ دام نویم — ہر یکے گر باز وسیمرغ شویم

ترجمہ: ۱۔لاکھوں دام ودانے ہیں اے اللہ! ہم پرندے کی طرح حریصِ بے نوا ہیں۔ ۲۔ہم ہر لحظہ نئے دام میں پھنسے ہیں خواہ ہم باز وسیمرغ ہو جائیں تب بھی دام سے نہیں بچ سکتے۔

تفسیر صوفیانہ سالک کے لئے ضروری ہے کہ موجود حق کی طرف پہنچنے کی کوشش کرے اور موہوم مطلق سے بچے بطون امتیازات سے غافل ہو کر حالات کے دھوکہ میں نہ آجائے۔ اس لیے راہِ حق ہر دقیق سے دقیق اور ماءِ عمیق سے زیادہ گہرا اور دور دراز راہوں سے بھی زیادہ دور ہے۔

ف: سب سے بڑا جاہل وہ آدمی ہے جو نفس کی شرارتوں کے یقین ہونے پر لوگوں کی مدح کی وجہ سے نفس کی اصلاح ترک کر دیتا ہے۔ حضرت حارث بن اسد المحاسبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو شخص کسی کی مدح سے خوش ہوتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جس کی مسخریاں کی جاتی ہیں۔ اسے یوں کیوں نہ کہا جائے کہ تیرے پیٹ سے جو فضلات خارج ہوتے ہیں وہ بڑے خوشبودار ہیں۔ کیا اس بات سے خوش ہوگا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تو ایسے ہی مدح سن کر خوش ہونے والے کی کیفیت ہے۔

سبق: دانا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی باتوں کی طرف دھیان نہ کرے بلکہ وہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

ف: اس واعظ کے لئے بھی خرابی ہے جو لوگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے پر تکبر کرتا ہے اور فخر محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں ان لوگوں سے افضل ہوں ایسا شخص صرف مدح وذم کی خرابیوں میں مقید رہتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ جس کے دل سے ایسے باطل خیالات دور فرمادے تو وہ بچ جائے گا ورنہ مشکل ہے۔

نسخہ: اچھے لوگوں کے پرکھنے کا خاص طریقہ یہ ہے کہ انہیں تعریف کرنے والے اور طمانچہ مارنے والے برابر

نظر آئیں اور غلط طریقے والے اس کے برعکس ہیں۔

حکایت: حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ اگر میں نے حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد نہ سنا ہوتا کہ: اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فاجر بندے سے کراتا ہے) تو میں کبھی وعظ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اب مجھے سہارا مل گیا کہ وہی فاجر میں سہی دین کو تو فائدہ ہے۔

تفسیر عالمانہ وَقَالُوْا اور یہودیوں نے اپنے گمان پر کہا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔ یعنی آخرت میں ہمارے ہاں آگ نہیں پہنچے گی۔ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ہاں چند گنتی کے دنوں تک وہ یا تو سات دن ہوں گے اس لحاظ سے کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور دنیا کے ایک ہزار کے مقابلے میں ایک دن سزا ملے گی اس کا مجموعہ سات یوم ہے یا چالیس یوم مراد ہیں اتنی مقدار کہ ان کے آباء نے بچھڑے کی پرستش کی۔

ف: حضرت ابو منصور علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے ان ایام کو سمجھ رکھا جتنے دن ان کے آباء نے نافرمانی میں گزارے۔ یہ لوگ فرقہ جہمیہ کے عقیدہ کی طرح خلود نار کے قائل نہیں یا اس لیے کہ انہوں نے ایامِ قلیل سے تعبیر کیا کہ ان کا عقیدہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ابناء اور احباء ہیں اور باپ بیٹے کو اور دوست دوست کو اتنا بڑا عذاب نہیں پہنچاتا۔ ہاں کسی وقت زجر و توبیخ ہوتی تو مختصر وقت میں پھر وہ اس سے راضی ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: ان کا یہ مذکورہ خیال فاسد ہے کیونکہ کفر کی سزا دائمی ہے۔ جیسا کہ ایمان کی جزاء دائمی ہے۔ اس لیے جو بھی اپنے کسی دین پر عقیدہ رکھتا ہے تو وہ عقیدہ اس کا دائمی ہوتا ہے نہ کہ مذبذب۔ اسی طرح پھر اس کی جزا کا حال ہے کہ وہ بھی دائمی ہونی چاہیے۔

قُلْ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! انہیں تبکیتاً و زجراً فرمایئے اَتَّخَذْتُمْ، اَتَّخَذْتُمْ کا ہمزہ قطعی ہے کیونکہ یہ ہمزہ استفہامیہ ہے بمعنیٰ توبیخ کے اور ہمزہ وصلی کلام کے ادراج سے گر گیا ہے۔ دراصل ءِ اِتَّخَذْتُمْ تھا۔

عِنْدَ اللّٰہِ عَهْدًا کیا اللہ تعالیٰ سے تم نے کوئی وعدہ لے رکھا ہے۔ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی کوئی خبر پہنچی ہے یا تمہارے گمان کے مطابق کوئی تمہارے ہاں اللہ تعالیٰ کا عہد نامہ ہے کیونکہ یہ باتیں کسی عہد قوی کی بنا پر کہی جا سکتی ہیں۔ اس لیے اسے عہد سے تعبیر کیا گیا ہے فَلَنْ یہ فاء فصیحیہ ہے شرط محذوف کا پتہ دے رہی ہے دراصل

عبارت یوں تھی۔ اِنِ اتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰہِ عَھْدًا وَ اَمَانًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ۔ یعنی اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد و پیمان ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا۔ یُخْلِفَ اللّٰہُ اخلاف سے ہے یعنی وعدہ توڑنا۔ عَھْدَہٗ یعنی وہ عہد جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کر رکھا ہے۔ یعنی وہ تو اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔

ف: امام منصور علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: اس آیت میں دو وجہیں ہیں:

ا۔ کیا تمہارے پاس اے اہلِ کتاب! اللہ تعالیٰ سے کوئی خبر آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دائمی عذاب میں مبتلا نہیں فرمائے گا اگر کچھ تمہارے پاس خبر ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے عہد و پیمان کے خلاف نہیں کرتا۔

۲۔ تمہارے پاس کوئی ایسے نیک اعمال ہیں جن کی وجہ سے تمہیں اللہ تعالیٰ نے بہشت کا وعدہ دے رکھا ہے اس اعتبار سے بھی وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ کیا تم افتراء کہہ رہے ہو۔ عَلَى اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ پر ایسا افتراء کر رہے ہیں جس کا تمہیں علم تک نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ یہ اَمْ ہمزہ استفہام کے مضمون کو برابر کرنے کے لئے ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ ان دو امروں میں سے ایک بات تو ضرور ہوگی کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ ہے تو وہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا لیکن اس کا تمہارے ساتھ کوئی وعدہ نہیں تم اپنے خیالی پلاؤ میں مست ہو۔

حدیث شریف میں ہے:۔ جب قیامت میں ان پر یہی گنتی کے ایام گزریں گے تو جہنم کا داروغہ جہنمیوں کو فرمائے گا اے اللہ تعالیٰ کے دشمنو! تمہارے گمان کے مطابق تو وہ مدت ختم ہوگئی اور تم جہنم میں پڑے ہو، یقین کر لو کہ تم نے اس جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے۔

بَلٰی یہ لفظ نفی کے بعد اثبات کے لئے آتا ہے۔ گویا کہ یہ نفی کا جواب ہے۔ (اثباتا) اور لفظ نعم ایجاب کے جواب میں آتا ہے یعنی اے یہودیو! تم کہتے ہو کہ ہمیں صرف چند روز جہنم میں رہنا ہوگا۔ تمہارا یہ گمان غلط ہے تم نے ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے۔ جیسا کہ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ کا جملہ بتاتا ہے اسی لیے اس مضمون کو شرط و جزا کے طریقہ پر بیان فرمایا۔ مَنْ مرفوع اور مبتدا ہے متضمن بمعنی الشـرط کے۔ اسی لیے اس کی خبر میں فاء داخل ہوئی ہے اگرچہ یہ جزا ہے شرط کی کَسَبَ اَلْکَسْبُ بمعنی اِستجلابُ النفع کے ہے۔ یعنی نفع کمانا۔

سوال : کفار کے لئے کون سا نفع ہے؟

جواب : مجازاً نقصان حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا گیا بطریق تحکم کے۔ جیسے ان کے لئے سیئۃ تحکما استعمال ہوا ہے۔ سَیِّئَۃً کوئی بڑا گناہ، کبائر سے کوئی ایک کبیرہ وَّاَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـئَتُہٗ اور اسے وہ گناہ محیط ہو گیا۔ اس کی جمیع جوانب کو یعنی قلب، زبان ہاتھ کو محیط ہو گیا۔ جیسے دشمن گھیر لیتا ہے۔ یہ معنیٰ صرف کافر کے لئے ہو سکتا ہے اسی لیے اسلاف نے سَیِّئَۃً کا ترجمہ کفر کیا ہے۔ فَاُولٰٓئِکَ یہ مذکورہ لوگ کہ جنہوں نے برے اعمال کیے اور خطایا وغیرہ ان کے محیط ہو گئے۔

سوال: یہ اشارہ جمع کے لئے اور مَنۡ کے لیے صیغہ واحد استعمال ہوتا آ رہا ہے؟

جواب : مَنۡ میں دو پہلو ہیں:

۱۔ لفظاً مفرد اسی لیے اس کے لئے ضمائر واحد لگائے گئے ہیں۔ ۲۔ معناً جمع۔

اَصۡحٰبُ النَّارِ جہنم کے ساتھی۔

سوال : کفار کو جہنم کا ساتھ کیوں کہا گیا ہے؟

جواب : ساتھی، ساتھی کے ساتھ رہتا ہے وہ لوگ ہمیشہ اسی میں رہیں گے جیسے دنیا میں جہنم کے اسباب کے ساتھ رہے بنا بریں انہیں جہنم کا ساتھی کہا گیا۔

جہنم کے داخلہ کے اسباب :۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کی تحریف۔ ۳۔ اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی وغیرہ۔

ترکیب: اَصۡحٰبُ النَّارِ، اُولٰٓئِکَ کی خبر ہے اور جملہ مبتداء گذشتہ کی خبر ہے۔

ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے نہ ان کو ساتویں دن چھٹکارا نصیب ہو گا نہ چالیسویں دن۔ جیسا کہ ان کا گمان ہے۔ یہ جملہ نصب علی الحالیہ کے موقعہ پر ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اسے صراحۃً حال بنایا گیا۔ کما قال : اَصۡحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا اس آیت سے کبیرہ کے مرتکب کے لئے جہنم کا خلود ثابت نہ ہوا کیونکہ یہ آیت تو خاص کفار کے لئے ہے۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تہ دل سے تصدیق کرتے ہیں وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور اچھے عمل کرتے ہیں یعنی

فرائض کی ادائیگی کرتے اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ یہی لوگ بہشتی ہیں اور وہ اس میں رہیں گے۔ یعنی ان پر نہ موت ہوگی نہ ہی اس سے نکالے جائیں گے۔

سوال: جہنمیوں کے ذکر کے بعد بہشتیوں کے ذکر کی ضرورت کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے کہ وعدہ کرتا ہے تو وعید کو بھی ساتھ ذکر کر دیتا ہے جیسا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ بندوں کو صحیح راستہ بتانے پر کبھی ترغیب دے دے تو کبھی ترہیب کبھی خوش کر دیا تو کبھی ڈرا دیا۔ نرمی و درشتی سے انسان کمال کو پہنچتا ہے اور اسی طریق سے جمال و جلال کے جلووں سے نوازا جاتا ہے۔

حکایت: ایک شیخ نے اپنے مرید سے فرمایا کہ اگر تو حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمہ کی زیارت کر لے تو تیرے لیے اس شغل سے بہتر ہے کہ جس میں تو مشغول ہے۔ مرید نے کہا حضرت بایزید کا دیکھنا کیسے بہتر ہو سکتا ہے جبکہ وہ ایک مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے جلوے ہر روز ہمیں ستر بار دکھائی دیتے ہیں اور جو آخرت میں نصیب ہوں گے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ایک دن شیخ موصوف اپنے اس مرید کو لے کر حضرت بایزید کی زیارت کے لئے انکے درِ اقدس پر پہنچے۔ پتہ کیا تو ان کی محترمہ نے فرمایا: اس کی کیا زیارت کرو گے وہ تو ایک عام آدمی ہے ابھی آجاتا ہے گھر کے لیے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنے گیا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت بایزید کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ دور سے دیکھا کہ حضرت بایزید لکڑیاں شیر پر لادے آرہے ہیں چابک کی جگہ ان کے ہاتھ میں ایک اژدہا ہے، شیر کو اس چابک (اژدہا) سے کبھی کبھی مارتے ہیں۔ مرید حضرت بایزید کی اس کیفیت کو دیکھ کر جاں بحق ہو گیا۔ حضرت بایزید نے اس کے شیخ سے فرمایا کہ تو نے جہاں مرید کو تجلیاتِ جمالیہ کی تلقین کی تھی وہاں اسے تجلیاتِ جلالیہ کی تلقین بھی کرنا تھی اب وہ اسی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ تجلیاتِ جلالیہ کا پرتو برداشت نہ کر سکا۔ آئندہ محتاط رہنا۔ مریدوں کو تجلیات جلالیہ کا مشاہدہ بھی کروایا کرو۔

ف: حضرت الشیخ مشہود با فتادہ آفندی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ حضرت بایزید چونکہ تجلیاتِ جمالیہ اور جلالیہ دونوں کے مظہر تھے اس لیے وہ مرید آپ کی تجلیات جلالیہ کا بوجھ نہ اٹھا سکا۔

حضرت مولانا روم قدس سرہٗ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں:

عاشقم بر قہر و بر لطفش بجد　　بوالعجب من عاشق ایں ہر دو ضد

واللہ ارزیں خار دربستاں شوم	ہچو بلبل زیں سبب نالاں شوم
ایں عجب بلبل کہ بکشاید دہاں	تا خورد اوراخاررا باگلستاں
ایں چہ بلبل ایں نہنگ آتشیت	جملہ ناخوش ماز عشق اورا خوشیت

ترجمہ : ا۔میں محبوب کے لطف وقہر دونوں پر بہ دل عاشق ہوں مجھ پر تعجب بھی ہے کہ میں دو متضاد باتوں کا عاشق ہوں۔ ۲۔بخدا اگر میں اس کانٹے سے نکالا جاؤں اور باغ میں پہنچایا جاؤں تو اس کی جدائی سے بلبل کی طرح گریہ کروں گا۔۳۔اس بلبل پر تعجب ہے جو باغ کے گل کے ساتھ کانٹے کو بھی کھا جائے۔۴۔یہ بلبل تو نہ ہوئی بلکہ آتشیں مگر مچھ ہوا اس سے تمام لوگ ناخوش ہیں لیکن وہ عشقِ محبوب میں خوش ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیات سے ثابت ہوا کہ بعض مغرورین بالعقل جیسے فلاسفر اور طبایعیہ وغیرہ کو غلط فہمی ہے جو کہتے ہیں کہ روح کی صفائی کو افعال واقوال اور اعمال کی قباحت کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔جب ارواح اپنے اجسام سے نکل جاتی ہیں تو یَرۡجِعُ کُلُّ شَیۡءٍ " اِلٰی اَصۡلِہٖ (ہر شئے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) کے مطابق اجساد وعناصر میں مل جاتے ہیں اور ارواحِ حظائر قدس میں پہنچتی ہیں۔بنابریں ارواح کو اعمال کے نتائج مزاحم نہیں ہاں صرف چند ایام کے لئے۔لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ حسًا اور عقلاً جانتا ہے کہ شہواتِ حیوانیہ کی تابعداری اور لذاتِ نفسانیہ کو پورا کرنا اخلاق ذمیمہ (حرص، آرزو، حسد، کینہ، بغض، بخل تکبر، کذب، افتراء وغیرہ) پیدا کرتا ہے اور یہ صفات نفس امارہ کے ہیں جو ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے۔ارواح کا ان سے متعلق ہونا ان کی صفائی میں تکدر پیدا کر دیتا ہے۔وہ اپنے اخلاق (حلم، کرم، مروّت، صدق، حیاء، عفت، صبر شکر وغیرہ) سے تبدیل ہو کر اخلاقِ حیوانیہ شیطانیہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ہاں خواہشاتِ نفسانیہ کا قلع قمع کرتا ہے۔ تو اس کو مکارمِ اخلاق سے حصہ نصیب ہوتا ہے اور اس کی روح کو بھی صفائی نصیب ہوتی ہے اور پھر وہ اپنے اصلی وطن کی طرف لوٹنے کا متمنی رہتا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔اس بیّن فرق کو معلوم کرنے کے بعد وہ روح جو ہمیشہ نفس امارہ کی تابع ہو جیسے عوام کی کیفیت ہے اس روح کا کب مقابلہ کر سکتی ہے جو الہامات حق کے تابع ہے جیسے خواص اولیاء اللہ کی ارواح کا حال ہے۔

ف: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ارواح اگرچہ دنیا میں چند خرابیوں میں مبتلا رہیں لیکن جب اجسام سے جدا ہوتی ہیں

تو جس قدر ان کو خواہشات طبعیہ سے تعلق تھا اسی قدر چند روز عذاب میں مبتلا ہوں گی جب اس کے کدورت دنیویہ اور خواہشات نفسانیہ زائل ہوجائیں گے تو پھر وہ اپنی اصلی حالت پر آجائیں گے۔ان لوگوں کا خیال بھی باطل ہے کیونکہ اس کے اس خیال کا رد قرآن پاک نے کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا: بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ یعنی جب گناہوں کا قلب پر غلبہ ہوجاتا ہے تو گناہوں کی مقدار قلب پر ایک سیاہی جم جاتی ہے۔اگر بندہ اس گناہ سے توبہ کرلے تو اس کی وہ سیاہی دور ہوجاتی ہے اگر وہ اس گناہ پر ڈٹا رہے تو وہ سیاہی دل کو گھیر لیتی ہے یہاں تک کہ اس سے فطری صفائی بھی دور ہوجاتی ہے اور نورِ ایمان سے فارغ اور اعمال کی روشنی سے محروم ہوجاتا ہے۔ پھر خطیاٰت جب اس کا احاطہ کرلیتی ہیں تو وہ جہنمی ہوجاتا ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔

ف: ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بعض سالکین اثنا طلبِ سلوک میں شہوات کی طرف اگر میل کرے تو شیطان اس پر غالب ہوکر اپنے زہد کا دھوکا دیکر عُجب وکبر میں ڈال دیتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو معظم الشان اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اسی وجہ سے پھر وہ مارا جاتا ہے۔

بعض سالکین کو یوں دھوکا لگتا ہے کہ سلوک اثناء میں اسے بعض کرامات اور رؤیاء صالحہ نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اسے مشاہدات اور مکاشفات روحانیہ سے نوازا جاتا ہے نہ کہ رحمانیہ سے۔ تو اسے گمان ہوتا ہے کہ اب عبادت کی منزل طے ہوگئی اور میں کامل اولیاء کے مرتبہ کو پہنچ گیا ہوں فلہٰذا مجھے اب عبادت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔اس سے دھوکا کھا کر وہ سلوک کی منازل طے کرنے سے رک جاتا ہے اسی وجہ سے اس پر آفات کا حملہ ہوتا ہے تو گرتا ہوا اپنی حالت پر لوٹ آتا ہے۔ ہاں جو مومنین اہلِ طلب ہیں اور قانونِ شریعت پر اپنے شیخ کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ حقیقت تک پہنچنے والے ہیں۔اسی لیے یہی لوگ اصحابِ وصول ہیں۔ جنات الاصول تک انہیں راستہ مل جائے گا اور وہ اس میں سیر کرتے رہیں گے اگرچہ منازل ومقاصد کی حد اور انتہا ہے لیکن سیر فی المقصد کی کوئی حد اور انتہا نہیں بخلاف ان لوگوں کے جن پر خطاؤں نے گھیرا پالیا۔ وہ جدائی کے نار میں جلتے رہیں گے۔ نہ ان کے مجاہدات فائدہ دیں گے اور نہ استدلالات بالشبہات انہیں مقصد تک پہنچائیں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ۫ وَبِالْوَالِدَیْنِ

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ

اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا

بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو

وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم

مُّعْرِضُوْنَ۝۸۳ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ

روگردان ہو۔ اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اپنوں کو اپنی

اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝۸۴ ثُمَّ اَنْتُمْ

بستیوں سے نہ نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم گواہ ہو پھر یہ جو تم ہو

هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ٘ تَظٰهَرُوْنَ

اپنوں کو قتل کرنے لگے اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو ان پر

عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِؕ وَاِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ

مدد دیتے ہو (ان کے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلہ دے کر چھڑا لیتے اور

اِخْرَاجُهُمْؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍۚ فَمَا جَزَآءُ

ان کا نکالنا تم پر حرام ہے تو کیا خدا کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو تو جو تم

مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَاۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ

میں ایسا کرے اس کا بدلہ کیا ہے مگر یہ کہ دنیا میں رسوا ہو اور قیامت

يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے داؤ سے بے خبر نہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ

اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ

جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی تو نہ ان پر عذاب ہلکا ہوگا

يُنْصَرُوْنَ ۝

اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ یاد کرو جب کہ تورات میں ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا۔ **مِیْثَاق** پختہ وعدہ کو کہتے ہیں۔ وہ دو قسم کا ہے:

۱:۔ عہدِ خلقت وفطرت ۲:۔ عہدِ نبوت ورسالت

اور اِذْ منصوب بفعل اذکر مقدر ہے۔ ہمارے نبی علیہ السلام اور اہل ایمان کو خطاب ہے تاکہ انہیں ان لوگوں کے ایمان لانے سے طمع منقطع ہو جبکہ ان کے اسلاف نے ایمان نہ لایا کیونکہ سانپ سے سانپ پیدا ہوتا ہے۔

سچ ہے: اِذَا طَابَ اَصْلُ الْمَرْءِ طَابَتْ فُرُوْعُهٗ (جب مرد کا جوہر اچھا ہو تو اس کی تمام نسل اچھی ہوگی)

یا وہ یہود جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زبان تھے مراد ہیں انہیں زجر کی جارہی ہے کہ تمہارے اسلاف کا یہ عمل قبیح تھا۔ یعنی یاد کرو جبکہ ہم نے ان سے وعدہ لیا کہ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

۱:۔ اَنْ گرایا گیا تو تَعْبُدُوْنَ کو مرفوع پڑھا گیا۔ ۲:۔ اس لئے کہ ناصب نہیں رہا۔ ۳:۔ اس لئے کہ مضارع بمعنی نہی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے تَذْهَبُ اِلٰى فُلَانٍ تَقُوْلُ كَذَا ۔ اس مضارع سے بھی امر مراد لیا گیا ہے۔ یعنی تَذْهَبُ بمعنی اِذْهَبْ ہے۔

۴:۔ یہ کہ امر ونہی سے زیادہ بلیغ ہے۔

اس لئے کہ اس میں ابہام ہے کہ ممنوع انسان پر لازم ہے کہ جس فعل سے اسے روکا گیا ہے اس سے رکنے کے لئے

اتنی عجلت کرے کہ جسے نہی کے صدور کے بعد کہا جا سکے وہ رک چکا ہے اور اس کی خبر ناہی دے رہا ہے۔اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی توحید کے قائل نہ ہو اور نہ ہی اس کے سوا کسی کے لئے الوہیت ثابت کرو۔بعض کہتے ہیں کہ یہ قسم کا جواب ہے۔چنانچہ اس کا معنیٰ اس پر دلالت کرتا ہے۔گویا کہا گیا ہے۔وَاَحلفنا ھُم وَقُلنَا باللّٰہِ الخ

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ای تُحسِنُونَ اِحسَاناً بمعنیٰ تعبدون ۔کیونکہ یہ جملہ خبریہ ہے یا اَحسِنُوا یہاں محذوف ہے جبکہ اسے جملہ انشائیہ قرار دیا جائے۔یعنی بہت احسان اور بہت بڑی خدمت اور ان کے فرمان کی پابندی کرو جبکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو۔وَذِی الْقُرْبٰی یعنی قرابت داروں کے ساتھ بھی احسان کرو۔قُربٰی ،حُسنٰی کی طرح مصدر ہے۔وَالْيَتٰمٰى یتیم کی جمع ہے۔یتیم اس چھوٹے بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ اس کے بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو جائے اور حیوانات میں وہ چھوٹا بچہ جس کی ماں مرگئی ہو۔ان سے احسان کا یہ معنیٰ ہے کہ ان کی تربیت اچھی طرح کرو اور ان کے حقوق کو ضائع نہ ہونے دو۔وَالْمَسٰكِيْنِ مِسکِین" کی جمع ہے،سُکُون" سے مشتق ہے۔گویا اسے فقر نے حرکت سے اور چلنے پھرنے سے عاجز کر دیا ہے اور ہم نے کہا وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ لوگوں سے کہو حُسْنًا اچھا قول۔اس قول کو حسن سے موسوم کرنے سے مبالغہ مطلوب ہے اس کے زیادہ حسن میں احسان کرنے کا مخصوص قوم کے لئے حکم دیا گیا ہے۔وہ والدین،اقربا،یتامیٰ اور مساکین ہیں اور چونکہ مال تمام کے لئے اکتفا نہیں کر سکتا اس لئے حسنِ قول کا حکم دیا گیا کہ اس سے عقلمند عاجز نہیں ہیں۔اب معنیٰ یہ ہوا کہ ان کے ساتھ حسنِ معاشرت اور حسنِ قول سے نرمی کرو اور انہیں نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو یعنی اے یہودیو!تم سچ اور حق بات کہو۔میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سچ اور حق بات کہو۔جو شخص تم سے ان کے متعلق کوئی بات پوچھے تو سچ بولو اور ان کی جو صفت ہے صحیح طور پر بیان کر دو۔ان کے فضائل مت چھپاؤ۔وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور نماز قائم کرو زکوٰۃ دو جیسے کہ ان کی شریعت میں تھی انہیں علیحدہ بیان فرمایا۔اگرچہ یہ بھی تمیماً عبادت مذکورہ میں داخل تھیں۔

خلاصہ : یہ کہ ہم نے تم سے اے بنی اسرائیل!مذکورہ احکام کا وعدہ لیا،تم نے قبول کر لیا اور تم ان پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوئے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ بطریقہ التفات، یعنی پھر تم نے اعراض کیا ان کی ادائیگی سے باقتضائے میثاق اور وعدہ کو ترک کردیا۔ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ مگر تم میں سے چند ایک نے ایفائے عہد کیا اسلام میں سے جو یہودیت پر قائم رہے اور اخلاف میں سے جو مسلمان ہوئے، جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ یہ جملہ تذلیلیہ ہے یعنی تمہاری عادت ہے کہ اطاعت سے منہ پھیرتے رہے ہو اور حقوق کی رعایت نہیں کرتے۔ یہ واؤ حالیہ نہیں ہے کیونکہ اعراض اور تَـوَلّـی ایک شئے ہیں۔ یہ جملہ معترضہ ہے، توبیخ کی خاطر تاکیداً لایا گیا ہے۔ اعراض دراصل بجائے سامنے سے بجانب عرض چلے جانے کو کہتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر : آیت میں چند مسائل بیان ہوئے۔

۱:۔**عبادت** :عبادت کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ بندہ صرف معبود کی عبادت کے لئے تفرد اختیار کرے اور ہر مقصود سے متجرد ہو جائے۔ پس جو شخص اپنی عبادت میں مخلوق کا خیال رکھتا ہے اور اپنی تعریف کا خواہشمند ہے اور اخروی و دنیوی فوائد میں سے اپنے نفس کے لئے عبادت کی آڑ میں کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی اور وجہ کو مخلوط کرتا ہے تو وہ اخلاص سے گرا ہوا ہے۔

حجاب راہ توئی حافظ از میاں برخیز　　　خوشا کسے کہ ازیں راہ بے حجاب رود

ترجمہ : اے حافظ! حجاب راہ تو خود ہے وہ انسان بڑا خوش قسمت ہے جو اس راہ بلا حجاب جاتا ہے۔

۲:۔ **احسان الی الوالدین** : اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کی عظمت فرمائی کہ ان کے حقوق کو اپنے حقوق سے ملا کر قرآن پاک میں جابجا بیان فرمایا کیونکہ پہلی نشاۃ تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہوئی ہے اور نشاۃ ثانیہ والدین سے اور نشاۃ ثانیہ یہی تربیت ہے جو والدین کرتے ہیں۔

ف: مفسرین فرماتے ہیں کہ تین آیات ایک ساتھ نازل ہوئی ہیں جو ایک کو دوسری سے ملائے بغیر قبول نہیں کی جاتی

۱:۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ　۲:۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ　۳:۔ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ

مسئلہ : والدین سے احسان کا معنیٰ یہ ہے کہ ان سے معاشرہ اچھا ہو اور ان کے ساتھ تواضع ہو اور ان کے فرمان کی پابندی اور ان کے دوستوں اور تعلق داروں سے پیار اور ان کی وفات کے بعد مغفرت کی دعائیں کرنا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

سالہا تو بگور دکہ گزر نکنی سوئے تربت پدرت
تو بجائے پدر چہ کردی خیر تاہماں چشم داری از پسرت

ترجمہ: کئی سال گزر جاتے ہیں تیرا باپ کی قبر پر گزر نہیں ہوتا۔ بتایئے تو نے باپ سے کون سی بھلائی کی ہے جو اپنے بیٹے سے امید رکھتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام مخلوق میں زیادہ معزز ماں باپ ہیں کیونکہ بندہ کے ظاہری وجود کے یہی سبب ہیں لیکن ان کی خدمت کا حق عبودیت الٰہیہ سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ہے کیونکہ درحقیقت سب کے وجود کا موجد وہی اللہ تعالیٰ ہے۔

سبق: جب والدین کے حقوق سے ذاتِ حق کی عبادت مقدم ہے پھر دیگر معاملات کس قطار میں؟ فلہٰذا بندہ کو چاہیے کہ عبادتِ الٰہی میں غیر کا وہم بھی ختم کر دے۔ دوسرا حکم یتامٰی کی پرورش کے متعلق ہے۔

برحمت بکن آبش از دیدہ پاک بشفقت بیفشانش از چہرہ پاک

ترجمہ: رحمت سے یتیم کے منہ سے آنسو پوچھ اور شفقت سے اس کے چہرے سے گرد صاف کر۔

فضائل یتامٰی: حدیث شریف: جس قوم کے دستر خوان میں یتیم شامل ہوں اس کے دستر خوان کے قریب شیطان نہیں بھٹکتا۔

حدیث شریف: جس نے کسی یتیم کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا اور اسے گھر کا ایک فرد سمجھا یہاں تک کہ وہ بڑا اور کاروبار کرنے کے لائق ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے گناہ ضرور بخش دے گا۔ ہاں کوئی ایسا عمل اس کے اعمال نامے میں نہ ہو جو بخشش کے لائق نہ ہو۔ (یعنی شرک وغیرہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ جس شخص کی دو پیاری چیزیں لے لے اور وہ اس پر صبر کرے اور اسے ثواب جانے تو اس کے بھی گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ دو پیاری چیزیں کون کونسی ہیں؟ آپ نے فرمایا: دو آنکھیں، یعنی وہ نابینا ہو جائے۔ اسی طرح جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں ان پر وہ خرچ کرے اور ان کے ساتھ احسان کرے یہاں تک کہ وہ بڑی ہو جائیں یا مر جائیں تو اس شخص کے بھی گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ہاں کوئی ایسا عمل اس کے سرزد نہ ہوا ہو جو

بخشش کے لائق نہ ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سن کر ایک اعرابی مہاجر نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر کسی کی دو لڑکیاں یا دو بہنیں ہوں ان کے لئے کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی، یعنی اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

حدیث شریف: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یتیم کی پرورش کرنے والا اور میں بہشت میں اکٹھے ہوں گے جیسا یہ دو انگلیاں'' آپ نے درمیانی انگلی اور سبابہ کی جانب اشارہ فرمایا۔ (سبابہ اس انگلی کو کہتے ہیں جو انگوٹھے کے ساتھ ہے) اس کا یہ نام زمانہ جاہلیت میں پڑا کہ کسی کو گالی دیتا تو اس انگلی سے اشارہ کرکے اسلام کے ظہور پر اس نام کو اہلِ اسلام نے مکروہ سمجھا تو اس کا نام مشیرہ رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کرتے وقت اہلِ اسلام اسی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔

ف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشیرہ انگلی مبارک دوسری انگلیوں سے بڑی تھی پھر درمیان والی انگلی پھر اس کے ساتھ والی بنصر یعنی چھوٹی انگلی۔

سوال: اس حدیث شریف نے یتیم کو تربیت کرنے والے کو اپنے قریب بتایا حالانکہ دوسری میں تو یوں ہے: اَحْشُرُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ هٰكَذَا۔ (میں اور ابوبکر اور عمر قیامت میں یوں ہی اٹھیں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تین انگلیوں سے اشارہ کیا۔ یہ تناقض ہے۔

جواب: تناقض نہیں اس لئے کہ قیامت میں منازل و مراتب مختلف ہوں گے اور جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے تعلق نہیں تو وہ انضمام اور اقتراب کو قربت پر محمول کرتا ہے جو مقصد کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ رسل کرام، انبیاء عظام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے درجات مختلف ہوں گے، پھر یہ مرتبہ کِفل الیتیم کا کہاں، اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کا مرتبہ کہاں، صرف مطلق فضیلت ہی مطلوب ہے۔

(كذا في تفسير القرطبي)

ف: آیت میں تیسرا حکم مساکین پروری کا ہے۔ مساکین وہ لوگ ہیں جنہیں حالات کی جستجو آیاتِ مذکورہ کے خاص موضوع ہیں۔

حدیث شریف: بے شوہر عورتوں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے:

ف: حضرت طاؤس علیہ الرحمہ اپنی بہنوں کی خبر گیری کرنے کو جہاد سے افضل سمجھتے تھے۔

نخواہی کہ باشی پراگندہ دل — پراگندہ را از خاطر مہل

پریشان کن امروز گنجینہ چست — کہ فردا کلیدش نہ در دست تست

ترجمہ: اگر نہیں چاہتے کہ تمہیں پریشانی ہو تو پریشانوں کی خبر گیری کر۔ آج ہی اپنا خزانہ لٹا دے کیونکہ مرنے کے بعد تیرے ہاتھ میں کچھ نہ ہوگا۔

ف: آیت میں چوتھا حکم قولِ حسن ہے۔ جب بندہ عبودیت کے حق کی ادائیگی سے عہدہ برا ہوا اور اس کی رحمت وشفقت اپنے والدین وغیرہ پر عام ہوئی تو اس پر لازم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرکے لوگوں کو نرم گفتگو سے حکمت اور موعظ حسنہ کی طرف بلائے اور حق کا راستہ دکھائے بایں طور کہ بات نرم اور چہرہ کشادہ اور نیک اور برے کے ساتھ نرم لہجہ سے پیش آئے خواہ مذہباً سنّی ہو یا متبدع، اسے منہ پر شرمسار نہ کرے اور ہاں متبدع سے ایسی بات کرے کہ اسے محسوس ہو کہ تم اس کے مذہب سے راضی نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ وہارون علی نبینا وعلیہما السلام کو فرعون کے بارے میں فرمایا: فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا (اس کے ساتھ نرم کلام کرنا) دنیا میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام سے (بعض انبیاء کے سوا) کون افضل ہوسکتا ہے اور فرعون جیسا کوئی اور کمینہ کون! حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ نرم کلام کرنے کا حکم دیا اور یہ حکم یہود ونصاریٰ کے لئے بھی ہے جب ایسے گمراہوں کے لئے یہی حکم ہے تو پھر اپنے مذہب سے نرم کلامی تو بطریق اولیٰ ہے۔ حضرت حافظ شیرازی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست — با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ترجمہ: دونوں جہان کی آسائش صرف دو لفظوں میں ہے: دوستوں پر لطف اور دشمن کی خاطر مدارات (دنیوی امور میں)

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ فرماتے ہیں:

درشتی نہ گیرد خردمن پیش — نہ سستی کہ ناقص کند قدر خویش

ترجمہ: دانا سخت گیری کو عمل میں نہیں لاتا، نہ اتنی سستی کہ اس کی اپنی قدر گھٹ جائے۔

تفسیر عالمانہ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ اے یہود! اس وقت کو یاد کرو جبکہ تورات میں ہم نے تم سے اقرار

اور وعدہ لیا اور تمہیں کہا کہ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ بعض تمہارا بعض کی خونریزی مت کرے۔

ف: غیر کو اپنا قرار دیا گیا اصل نسبت کی وجہ سے یا دین کی وجہ سے۔ اس لئے کہ جب اتصال قوی، نسبی اور دینی انہیں بیان کر دیا گیا تو پھر ان کے ہر ایک کو اپنا نفس قرار دیا گیا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جب کسی نے اپنے غیر کو قتل کیا گویا اس نے اپنے نفس کو قتل کیا۔ کیونکہ اس سے اس کا قصاص لیا جائے گا اور یہ خبر بھی بمعنیٰ نہی کے ہے اس لیے کہ فعل سے رکنے میں اتنی عجلت ہوئی کہ گویا وہ فعل ہو بھی ہو گیا اور پھر اس کی خبر بھی دی گئی۔

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ تم میں سے کوئی کسی کو اس کے گھر سے نہ نکالے یا یہ کہ اپنے ہمسایوں کو گالی مت دو ایسا نہ ہو کہ وہ تنگ آ کر گھروں سے نکل جائیں۔ اخراج الدیار کو قتل کے ساتھ ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ اخراج بمنزلہ قتل کے ہے۔ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ پھر تم نے میثاق کا اقرار کیا اور معترف ہوئے کہ واقعی یہ میثاق ہم پر لازم و واجب ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اور اس پر تم شاہد ہو یہ اقرار کی تاکید ہے۔

جیسے کہا جاتا ہے: فلان" مقر علٰی نفسه هكذا شاهد" عليها۔ یا یہ کہ تم اے یہودیو! آج اپنے اسلاف کے اقرار پر شاہد ہو کہ انہوں نے واقعی پختہ وعدہ کیا تھا۔

ثُمَّ اَنْتُمْ مبتدا ہے۔ هٰٓؤُلَآءِ خبر ہے اور صفات ہونے کے افادہ کا دارومدار اس پر ہے کہ اختلافات صفات بمنزلہ اختلاف ذات کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: رجعت بغير الوجه الذى خرجت به۔ اب معنیٰ یوں ہوا کہ اس کے بعد تم شاہدین، ناقضین، متناقضین ہوئے۔ یعنی تم لوگ ان اقرار کنندگان کے غیر ہو۔ گویا انہوں نے پوچھا کہ ہم کیسے ہیں؟ جواب میں فرمایا: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ تم انہیں قتل کرتے تھے جو تمہارے نفوس کے قائم مقام تھے اور یہ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ کا بیان ہے۔ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ کا مرجع فریق ہے اور اس سے مراد ایک طائفہ ہے۔ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ اس میں ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔

تُخْرِجُوْنَ کے ضمیر سے حال ہے یا اس کے مفعول سے اخراج کی کیفیت کے بیان کرنے کے لئے یہ حال لایا گیا یا اس وہم کو مٹانے کے لئے ہے کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ اخراج کی حرمت صرف بطریق اصالۃ و استقلال کی وجہ سے ہے اور مظاہرہ سے کوئی گناہ نہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ ان پر غلبہ پانے کی وجہ سے تم اپنی تمام قوت خرچ کرتے ہو۔

بِالْاِثْمِ، تَظٰهَرُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ متلبسین بالاثم اور اثم وہ فعل ہے کہ جس کا فاعل ذم

وملامت کا مستحق ہو۔ وَالْعُدْوَانِ بمعنیٰ ظلم میں تجاوز کرنا۔ یعنی گناہ اور تجاوز کر کے ان پر مظاہرہ کرتے ہو۔

مسئلہ : جیسے ظلم کرنا گناہ ہے اسی طرح ظلم اعانت بھی گناہ ہے۔ (کذا فی التفسیر الکبیر)

وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آتے ہیں۔ یعنی تمہارے سامنے اسی حالت میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس میں اختیاری طور پر حاضر ہونا مراد نہیں۔

حلِ لغات : اُسٰرٰی اور اَسْرٰی، اَسِیر کی جمع ہیں۔ اَسِیر وہ ہے جسے قہراً پکڑا جائے۔ فعیل بمعنیٰ مفعول ہے اَسر بمعنیٰ شَدّ" اور اِیْثَاق" سے ماخوذ ہے۔ اُسٰرٰی اور اَسرٰی میں فرق یہ ہے کہ جب قیدیوں کو باندھ کر لاتے تو اسے اُسرٰی کہتے اور جب بغیر باندھنے کے پکڑ کر لاتے تو اس کا نام اَسرٰی رکھتے۔

تُفٰدُوْھُمْ یعنی انہیں قید سے نکالتے ہو فدیہ دے کر۔

ف: فدیہ قیدی اور قابلِ فدیہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔

وَھُوَ مبتدا ہے اور یہ ضمیر شان کا ہے۔ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ تم پر ان کا نکالنا حرام تھا۔ مُحَرَّمٌ میں ایک ضمیر ہے جو فاعل کے قائم مقام ہے اور یہ اخراج کے لئے خبر واقع ہوئی ہے اور جملہ ضمیر شان کی خبر ہے۔

واقعہ : اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں وعدہ لیا کہ:

۱:۔ ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا۔ ۲:۔ ایک دوسرے کو گھروں سے نہ نکالنا۔

۳:۔ بنی اسرائیل کے کسی عبد یا لونڈی کو جہاں دیکھو اسے خرید کر مفت آزاد کرنا۔

یہود میں سے دو گروہ قریظہ اور نضیر دونوں بھائی تھے۔ اسی طرح اوس اور خزرج، اور تھے مشرک، بتوں کے پجاری نہ ہی قیامت کو جانتے نہ ہی جنت و دوزخ کو اور نہ ہی حلال و حرام کو۔ ان کی آپس میں جنگ چھڑ گئی۔ بنو قریظہ اوس کے معین و حلیف بن گئے اور نضیر خزرج کے۔ پھر جب اوس اور خزرج کے مابین جنگ ہوتی تو بنو قریظہ اوس کے ساتھ اور بنو نضیرہ خزرج کے ساتھ ہو جاتے۔ پھر ہر قوم اپنے خلفاء کی مدد کرتی جس سے خوب خوں ریزی ہوتی۔ جب کوئی گروہ کسی دوسرے پر غالب آ جاتا تو ان کے گھروں کو خراب کرتے اور انہیں وہاں سے نکال دیتے۔ حالانکہ ان کے پاس تورات بھی تھی جس میں ہر قسم کی جزا و سزا کا بیان تھا۔ جب جنگ ختم ہو جاتی تو قریظہ خزرج کو اپنے حلفاء کا ہدیہ دے کر ان کے قیدی چھڑا لیتے اور نضیر اوس کو فدیہ دے کر اپنے حلفاء

کے قیدی چھڑا لیتے۔ جب عرب انہیں عار دلاتے ہوئے کہتے کہ تم ان کے ساتھ قتال کی امداد کیوں نہیں کرتے بلکہ فدیہ دے دیتے ہو۔ تو جواباً کہتے اس لئے کہ ہم صرف فدیہ دینے پر مامور ہیں اور جنگ کرنا ہمارے لئے حرام ہے پھر وہ کہتے کہ تم ان کے ساتھ جنگ بھی تو کرتے ہو۔ تو جواباً کہتے کہ جنگ اس لیے کرتے ہیں تا کہ ہمارے حلفاء ذلیل وخوار نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس منافقت کی مذمت فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تم لوگ ہر ایک حکم سے اعراض کرتے ہو صرف فدیہ دینے پر رضامند ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کا وعدہ لیا۔

۱:۔ ترک القتل ۲:۔ ترک الاخراج ۳:۔ ترک المظاهره علیهم مع اعدائهم ۴:۔ فداء اُساریٰ

مگر انہوں نے فدیہ کے سوا تمام امور سے اعراض کیا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ اس سے فدیہ مراد ہے اور ہمزہ توبیخی انکار کے لئے ہے اور فاء کا مقدر فعل پر عطف ہے۔ یعنی دراصل عبارت یوں تھی: اَتَفْعَلُوْنَ ذٰلِکَ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ۔ یعنی تم ان جملہ امور کے خلاف مرتکب ہو کر کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو۔ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ اس سے مراد حرمۃ قتال واخراج ہے۔ لیکن چونکہ میثاق کا دارومدار تمام احکام پر تھا اس لئے بعض سے انکار اور بعض پر ایمان لانے پر توبیخ کی گئی۔ فَمَا جَزَآءُ نفی ہے یعنی نہیں جزاء مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ وہ جو ایسا کرتا ہے یعنی بعض کے ساتھ کفر اور بعض پر ایمان۔ مِنْكُمْ اے یہودیو! تم میں سے۔ يَفْعَلُ کے فاعل سے حال ہے۔ اِلَّا خِزْيٌ استثناء مفرغ ہے جو مبتدا کی خبر واقع ہوا ہے۔

حل لغات: خِزْيٌ بمعنی ذلت وخواری۔ یہ کہ بنو قریظہ قتل کئے گئے اور قیدی ہوئے اور بنو نضیر، اذرعات اور ریحا (جو کہ شام سے ہیں) کی طرف جلاوطن ہوئے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خِزْيٌ سے جزیہ لینا مراد ہے۔ یعنی ان کی جزا صرف رسوائی اور ذلت وخواری ہے۔

فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حیاۃ دنیا میں خزی کی صفت ہے بطریق قصر مذکورہ کے ان کی جزا کا بیان ہے تا کہ انہیں اپنے (جو کہ بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں) سے ناامیدی ہو اور ظاہر کرنا ہے کہ بعض کو کتاب سے کفر کرنے کی وجہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت میں سزائیں ملیں گی يُرَدُّوْنَ لوٹائے جائیں گے۔

حل لغات: الردّ بمعنیٰ الرجع بعد الاخذ۔ (پکڑ کر لوٹانا)

اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ سخت ترین عذاب کی طرف۔ یعنی جہنم کے عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ دنیا کی رسوائی کے علاوہ قیامت میں ہر وہ عذاب انہیں ملے گا جو انہیں پہلے دنیا میں مل چکا ہے۔ ہر دوسرا اس سے سخت تر ہو گا۔ کیونکہ پہلے والے عذاب منقطع ہو گئے اور یہ منقطع نہیں ہو گا۔

حدیث شریف: میں ہے: ''دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی سے کم تر ہے'' اس لئے کہ ان کی معصیت سب معصیتوں سے سخت تر ہے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

ہر کہ ظالم تر جہش با ہولتر ۔۔۔ عدل فرموداست بدتر رابتر

ترجمہ: جو بڑا ظالم ہے اس کی جگہ (آخرت میں) ہولناک ہے عدل ایسے آدمی کو بدتر سے بدتر کہتا ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں۔ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اس سے جو تم برے عمل کرتے ہو۔ منجملہ ان کے یہ برا عمل بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے تمہارے اعمال سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ اس کی قیامت میں تمہیں سزا دے گا۔ یہ تہدید شدید ہے تاکہ گناہوں سے بچے رہیں اور طاعت پر بشارتِ عظیم سنائی جا رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے غفلت ممتنع ہے اور ہر شئے پر قادر ہے۔ اسی بناء پر تمام حقوق ان کے مستحقین کو ضرور پہنچیں گے۔ اُولٰٓئِكَ وہ لوگ جو اوصافِ قبیحہ مذکورہ سے موصوف ہیں اَلَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا دنیا سے تبادلہ کی خواہش رکھتے ہیں۔ بِالْاٰخِرَةِ آخرت کے عوض میں یعنی آخرت سے اعراض کرتے ہیں باوجودیکہ اس کے حاصل کرنے پر قادر ہیں کیونکہ مذکورہ احکام میں بعض سے کفر کرنا صرف حلفاء کی رعایت کی وجہ سے تھا وہ اس لئے کہ ان سے ان کو دینی یا دنیوی منافع حاصل ہوتے تھے۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ان سے نہ دنیوی عذاب ہلکا ہو گا اور نہ ہی اخروی وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ان سے عذاب نہیں روکا جائے گا۔ کیونکہ ان کا عذاب نہ کسی کی سفارش سے ٹلنے والا ہے اور نہ کسی کے جبر سے۔ لذاتِ دنیوی و اخروی کو جمع کرنا ممتنع اور غیر ممکن ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو یہ قدرت دی ہے کہ ان میں کسی ایک کو حاصل کرے جسے چاہے۔ پس جب ایک کے حصول میں مشغول ہوتا ہے تو دوسرے کو اپنے اوپر حرام کرتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہود کے اعراض عن الایمان بمافی کتبھم اور ان کے حصول مافی ایدیھم اور

لذات دنیا کو بیع وشرا ٔ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس میں اہل کتاب کی بہت بڑی مذمت بیان کی گئی ہے کیونکہ دنیوی کاروبار میں جسے خسارہ ہوتا ہے وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر سمجھا جاتا ہے۔تو جو آخرت کے امور میں خسارہ میں ہو اس کو تو حقیر سمجھنا بطریقِ اولیٰ ہے۔

تفسیر صوفیانہ سالک پر لازم ہے کہ وہ آخرت کی بہتر تجارت کی کوشش کرے اور فقط دنیوی امور کی طرف نہ جھکے اور نہ ہی خواہشاتِ نفسانیہ سے شیطان کے کہنے پر کسی کا خون بہائے اور نہ ہی اصل فطرت کے ملک سے ہٹے۔ اگر ایسا کرے گا تو گمراہ اور بدبخت ہو جائے گا لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ میں ایک لطیف اشارہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو کسی مصیبت یا دکھ کی وجہ سے قتل نہ کرے اور نہ جنگلوں میں حیران وسرگردان پھرے۔ اگر ایسا کرتے تو وہ اپنے دین سے جہالت کا ثبوت دیتا ہے اور کم عقلی کی دلیل بنتا ہے اسی طرح جمیع باتوں کو سمجھئے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ارادہ ہوا کہ وہ کپڑوں کے بجائے ٹاٹ لپیٹیں اور گھروں میں رہنے کی بجائے جنگلوں میں چلے جائیں اور پھر وہ واپس نہ آئیں اور نہ ہی گوشت کھائیں اور نہ اپنی بیویوں سے ہم بستری کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نماز پڑھتا ہوں اور نفلی روزہ کبھی رکھتا ہوں کبھی نہیں رکھتا اور بیویوں کے پاس جاتا ہوں اور گھروں میں گزارتا ہوں اور گوشت کھاتا ہوں۔ یہ سارے کام میری سنتیں ہیں، جو بھی میری سنتوں سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔ جب صحابہ کرام علیہم الرضوان نے سنا تو ارادوں کو ترک کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَاٰتِ كُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ (اور صاحب حق کا حق ادا کرو)

کمال صرف اسی میں ہے کہ قیود سے تجاوز کر کے عالمِ شہود تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ عارف کامل تو ہر شئے میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ کس سے مانگوں اور کہاں بھاگوں جبکہ اسی کا حکم ہے:

اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (جہاں جاؤ گے وہاں اللہ تعالیٰ ہی ہوگا)

یہاں پر مقولہ مشہور ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے علم حاصل کرتا ہے اسے اگر کہا جائے کہ تو کل مر جائے گا تو پھر بھی کتاب کو نہیں چھوڑتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں پڑھتا تو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے ہوں فلہٰذا بقیہ زندگی

تک کتاب کیوں چھوڑ دوں۔ اسی لئے طالبِ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی نیت کو خالص رکھے کیونکہ خلوصِ نیت سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں پھر کیوں نہ نیت کو خالص رکھا جائے تا کہ اسی نیک نیتی پر موت آئے۔

قیدی کئی قسم کے ہیں:

ا:۔ بعض وہ جو اپنی خواہشات کے پابند ہیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں راہِ حق کی رہبری کی جائے۔

۲:۔ بعض وہ ہیں جو دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں موت بار بار یاد دلائی جائے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

ذکرِ حق کن بانگ غولاں رابسوز ‏ ‏ ‏ چشم نرگس رازیں کرگس بدوز

ترجمہ: ذکرِ الٰہی ایسا کر کہ الو (نفس) کی آواز دب جائے نرگس کی آنکھ کو اس گدھ سے دور رکھ۔

۳:۔ بعض وہ ہیں جو وسوسہ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ایسے لوگوں پر شیطان ہر وقت سوار رہتا ہے۔ ان کا علاج یہ ہے کہ دلائل اور براہین کے ذریعے انہیں یقین کا راستہ دکھایا جائے تا کہ وہ شکوک وظنیات اور اندازہ سے بچ جائیں اور تقلید آبائی سے نجات پا کر درجہ یقین کو پہنچ جائیں۔

۴:۔ بعض اپنے صفات کے خیالات اور اپنے وجود کے توہمات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ انکا علاج یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو وجودِ حق کا ایسے طریق سے سمجھایا جائے کہ وہ اپنی ہستی موہوم کو تصور میں بھی نہ لاسکیں۔

۵:۔ بعض ایسے قیدی ہیں جو بے مثال ذات کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔ ایسے قیدی کا نہ کوئی علاج ہے اور نہ ہی نجات کا امکان اور نہ ہی کسی کو ان کے چھڑانے کی طاقت اور نہ ہی ان کے لئے کوئی فدیہ یا بدلہ اور نہ ہی وہاں کسی کی رسائی، بلکہ ان تک پہنچنا ممکن ہی نہیں اور نہ ان کو وہاں سے بھاگنے کا چارہ۔ یہ اولیاء کاملین کا مقام ہے جس نے یہ طریقہ اختیار کیا وہ اپنے مطلوب تک پہنچ جائے گا اور وہ دل کے اندھاپن سے جائے گا۔ مشاہدہ حق سے باریاب ہو کر دنیا و آخرت کی اندھیریوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

اصل صد یوسف جمال ذوالجلال ‏ ‏ ‏ اے کم از زن شو فدائے آں جمال

اصل بیند دیدہ چوں اکمل بود ‏ ‏ ‏ فرع بیند چونکہ مرد احول بود

سرمہ توحید از کحالِ حال ‏ ‏ ‏ یافتہ رستہ زعلت واعتدال

ترجمہ: ہزاروں یوسف (حسین) کے جمال کے ذات ذوالجلال ہے عورت سے کم نہ ہو تو بھی جمال حقیقی کا فدائی بن جا۔ سرمہ والی آنکھ اصل دیکھتی ہے جس کی آنکھ ہے وہ فرع (مجازی حسن) کو دیکھتی ہے۔ تجھے اگر حال کا سرمہ نصیب ہوا تو علت واعتدال تو نجات پا جائے گا۔

نسخہ: طریق حق کے لئے عشق ضروری ہے۔

حکایت: ایک بڑھیا دھاگے کی انٹی لے کر بازار کو چلی اور کہہ رہی تھی مجھے بھی یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں شامل کرلو تاکہ قیامت میں میرا نام بھی یوسف علیہ السلام کے عشاق میں لکھا جائے۔

دعا: اے اللہ! ہمیں اپنی ذات اور اپنے جمال سے دور نہ رکھنا اور ہمیں ان لوگوں میں پہنچا جو تیرے وصال سے نوازے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ

عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں اور پاک روح سے اس کی مدد کی تو کیا جب تمہارے پاس

رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا

کوئی رسول وہ لے کر آئے جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ

تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا

شہید کرتے ہو اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب تو ان میں تھوڑے

مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

ایمان لاتے ہیں اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (توریت) کی تصدیق فرماتی ہے

مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا

اور اس سے پہلے ہوا سی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا

جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ

ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر۔ کس برے مولوں انہوں نے اپنی جانوں

اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ

کو خریدا کہ اللہ کے اتارے سے منکر ہوں اس کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے

فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ

پر چاہے وحی اتارے تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے

وَلِلْكٰفِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٩٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوا بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ

اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اتارے پر ایمان لاؤ

قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَآ أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ

تو کہتے ہیں کہ وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں اور باقی سے منکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِن قَبْلُ إِن

ان کے پاس والے کی تصدیق فرماتا ہوا تم فرماؤ کہ پھر اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا اگر تمہیں اپنی کتاب

كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُم مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

پر ایمان تھا اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر تشریف لایا پھر تم نے

الْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهٖ وَأَنتُمْ ظٰلِمُونَ ﴿٩٢﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ

اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ظالم تھے اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۖ خُذُوا مَآ اٰتَيْنٰكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا

اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو بولے ہم نے سنا

وَعَصَيْنَا ۗ وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا

اور نہ مانا اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا ان کے کفر کے سبب تم فرما دو کیا برا حکم دیتا ہے

يَأْمُرُكُم بِهٖٓ إِيمٰنُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾ قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ

تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو۔ تم فرماؤ اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک

الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِندَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

خالص تمہارے لئے ہو نہ اوروں کے لئے تو بھلا موت کی آرزو تو کرو

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ

اگر سچے ہو — اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے

عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ

ظالموں کو — اور بے شک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ

اور مشرکوں میں سے ایک کو تمنا ہے کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے عذاب سے دور نہ کرے گا

مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۰

اتنی عمر دیا جانا — اور اللہ ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اور اللہ تعالیٰ کی قسم بیشک اے بنی اسرائیل ہم نے مُوْسٰى موسیٰ علیہ السلام کو۔ موسیٰ عبرانی لغت کا کلمہ ہے۔ اس کی تفصیل وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى میں گزر چکی ہے۔ الْكِتٰبَ تورات یکبارگی وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ان کے لئے پے درپے ہم نے رسول بھیجے قَفَّيْنَا، قفا به سے ہے بمعنیٰ کسی کو کسی کے بعد بھیجنا۔ اب اس جملہ کا معنیٰ یوں ہوا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد پے درپے رسول بھیجے اور وہ یہ حضرات ہیں: یوشع، شمویل، داؤد، سلیمان، شمعون، شعیا، ارمیا، عزیز، حزقیل، الیاس الیسع، یونس، زکریا، یحییٰ وغیرہم علی نبینا وعلیہم السلام وَاٰتَيْنَا عِيْسَى اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیا۔ عیسیٰ جنہیں سریانی میں الیسوع کہا جاتا ہے بمعنیٰ مبارک۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ اور اس طرح اور اسماء جو عربیت میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی سے مشتق نہیں۔ ابنَ کے الف کو ثابت رکھ کر پڑھنا چاہیے۔ جیسے عبداللہ ابن عمر۔ اگر الف نہ لکھا جائے تو بھی جائز ہے۔

سوال: لفظ ابنَ کا قاعدہ ہے کہ جب دو ناموں کے درمیان واقع ہو تو اس کا الف نہیں لکھا جاتا، یہاں اس کے برعکس ہے۔

جواب : ان اسموں کے مابین الف گرتا ہے جہاں ابن باپ کی طرف مضاف ہو جب ماں کی طرف ہو۔ جیسے یہاں ہوا تو الف نہیں گرتا۔

مَرْیَمَ سریانی لغت میں بمعنیٰ خادمہ وعابدہ، چونکہ ان کی والدہ نے انہیں بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کیا اور کثیر العبادۃ بھی واقع ہوئیں۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے ساتھ اپنی کتاب میں سات بار ذکر فرمایا اور اس کا نام مریم رکھا اور اس سے خطاب اسی طرح فرمایا جیسے انبیاء کرام علیہم السلام سے خطاب کیا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ۝ یہاں بی بی مریم کو مردوں کے ساتھ شریک کیا۔ الْبَیِّنٰتِ اس سے معجزات مراد ہیں۔ جیسے مردے زندہ کرنا، برص والوں اور کوڑھیوں کو تندرست کرنا اور غیبی خبریں دینا اور انجیل۔ وَاَیَّدْنٰهُ اور ان کو ہم نے قوت دی۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ روح اقدس سے یہ اضافۃ الموصوف الی الصفۃ کے قبیل سے ہے۔ اصل بالروح المقدسۃ المطھرۃ تھا۔ اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی روح مراد ہے۔ قدس سے کرامت کے وجہ سے موصوف کیا گیا ہے۔ کیونکہ قدس اللہ تعالیٰ خود ہے یا جبریل علیہ السلام ہیں اور انہیں مطہرہ سے اس لیے موصوف کیا گیا ہے کہ ان سے گناہ کبھی سرزد نہیں ہوا تھا اور جبریل علیہ السلام کو روح اس لیے کہا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے پاس ایسے امور پیش کرتے جن میں قلوب کی زندگی کے اسباب ہیں اور انہیں تقویت دینے کا یہ معنیٰ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے لے کر بڑھاپے تک شیطان سے محفوظ رکھا۔ یہاں تک کہ بوقتِ ولادت بھی ان کے قریب نہ جا سکا اور جب یہودیوں نے ان کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو انہیں آسمان پر اٹھالیا۔

سوال : ایسی تقویت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص کیوں، کہ صرف ان کو عطیہ معجزات اور تائید بروح القدس سے موصوف کیا گیا ہے؟

جواب : باقی حضرات صرف تورات کے احکام کے اجراء کے لئے بھیجے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت سے احکام منسوخ کرنے پر مامور کیا گیا اور ان کے زمانہ کے لوگوں کے جتنے غلط عقیدے اور بری رسمیں تھیں ان سب کو مٹانے کا حکم دیا۔ پھر ظاہر ہے کہ غلط عقائد اور بری رسموں کے مٹانے پر مردِ میدان کی ضرورت ہے اور وہ بغیر تائید ایزدی کے مشکل ہے۔

ف: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے مابین چار ہزار نبی بھیجے گئے۔ بعض کے نزدیک ستر ہزار
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهۡوٰٓى یہ خطاب ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زمان اہل کتاب کو ہے
مذکورہ امور ان کے بڑوں سے سرزد ہوئے۔ ان سے صرف تکبر کا ارتکاب ہوا۔ لیکن چونکہ ان کے ان امور سے
یہ راضی تھے اس لیے ان کو مخاطب کیا گیا۔ یہ فاء عاطفہ ہے، مناسب مقام کے لحاظ سے فعل مقدر ہے۔ مثلاً:
ای لم تطیعوهم افکلما جاء کم رسول" بمالا تهوىٰ۔ تمہارے پاس رسول علیہ السلام وہ احکام لے
آئے جن کو تمہارے نفوس نہیں چاہتے۔
اَنۡفُسُكُمُ ان کے لائے ہوئے احکام تمہاری خواہش کے مطابق نہیں اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ تمہیں ان کی فرمانبرداری اور
ان پر ایمان لانے سے انکار ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر فَفَرِيۡقًا ایک گروہ کی (ان انبیاء علیہم السلام میں سے)
كَذَّبۡتُمۡ تم نے تکذیب کی جیسے عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وَفَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ
ایک گروہ کو تم قتل کرتے تھے جیسے زکریا و یحییٰ وغیرہما علیٰ نبینا وعلیہم السلام۔

سوال: دونوں مقامات میں فریق کو کیوں مقدم کیا گیا ہے؟

جواب: اہتمام کے لئے، تا کہ سامع کو شوق ہو جائے کہ انہوں نے ان حضرات سے کیا کیا۔ قصر کے لئے نہیں
کہ صرف یہ مانا جائے کہ انبیاء علیہم السلام صرف یہی دو گروہ تھے اور بس۔

سوال: قَتَلۡتُمۡ ماضی کی بجائے مضارع کیوں استعمال کیا گیا ہے۔؟

جواب: ۱۔ مضارع استعمال کیا گیا ہے لیکن مراد تو ماضی ہے۔ ان کو اس حال پر ان کی رسوائی کا اظہار کرنے
کی وجہ سے مضارع لایا گیا ہے۔ یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ معاملہ اگرچہ گزر گیا لیکن وہ چونکہ انتہائی طریق سے برا تھا
گویا ابھی حاضر ہے اور یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ اس واقعہ کی تذکیر سے عمل کرنے والوں اور ان کی اولاد کو عار دی جائے
۲۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایک گروہ کو تم قتل کرو گے اور ابھی تک وہ تمہاری نیت تمہارے دل کی گواہی دے رہی ہے
کیونکہ تمہیں تو ہو کہ میرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبے بناتے تھے۔ اگر میری
حفاظت ان کے شاملِ حال نہ ہوتی تو عرصہ سے ان کا کام تمام کر ڈالتے۔ اسی طرح تم نے ان پر جادو چلایا اور
پھر ان کے کھانے (بکری کے گوشت) میں زہر ملا دیا یہاں تک کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے وصال

شریف کے وقت فرمایا "ہمیشہ میرے حلق میں خیبر والا لقمہ عود کرتا رہا اب میری رگِ جاں کے ٹوٹنے کا وقت آ گیا"

ف: ابہر وہ رگ ہے جو دل کے اندر ہے جب وہ ٹوٹ جائے تو انسان مر جاتا ہے۔

یہودیوں کے زہر دینے کا واقعہ

واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ جب خیبر (ایک مشہور مقام کا نام ہے جو حجاز میں واقع ہے) فتح ہوا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بکری کا گوشت ہدیۃً پیش کیا گیا۔ اس میں زہر ملائی گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے فرمایا: میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، کیا تم سچ کہو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم سچ بولیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں اس بکری کے گوشت میں زہر ملانے کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟ انہوں نے کہا: بات دراصل یوں ہے کہ ہم نے سوچا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹے ہیں تو زہر سے مر جائیں گے ہماری جان چھوٹ جائے گی اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو زہر آپ کو نقصان نہ دے سکے گی۔

تفسیر صوفیانہ یہود اس لیے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اختیار نہ کرتے کہ انہیں اپنے جاہ و جلال اور دنیوی شوکت چھن جانے کا خطرہ تھا اسی طرح جب دل میں دنیا کی محبت ہو ایمان کامل نصیب نہیں ہو سکتا۔

ف: نفس کی سات صفتیں نہایت گندی ہیں:

۱۔ عجب۔ ۲۔ تکبر۔ ۳۔ غضب۔ ۴۔ ریاء۔ ۵۔ حسد۔ ۶۔ مال کی محبت۔ ۷۔ مرتبہ کی محبت۔

اور جہنم کے بھی سات دروازے ہیں جس نے اپنے نفس سے یہ سات گندی عادات دور کیں تو قیامت میں اس سے دوزخ کے ساتوں دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور وہ بہشت میں داخل کیا جائے گا۔

حکایت: حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض خلفاء کو فرمایا:

كُنْ ذَنَبًا وَلَا تَكُنْ رَأْسًا (دم بن سر نہ بن)

یعنی سرداری ترک کر کے کسی کا نوکر بن کر رہنا کیونکہ بوقتِ حادثہ سر کٹ جاتا ہے لیکن دم بچ جاتی ہے۔

مثنوی شریف میں ہے:

تاتوانی بندہ شو سلطاں مباش — زخم کش چوں گوئی شو چوگاں مباش

اشتہار خلق بند محکمت — در رہ ایں از بندہ آہن کے کم است

ترجمہ : ا۔حتی الامکان نوکر بنا بادشاہ نہ بنا، گیند کی طرح چوٹیں کھاتا رہ لیکن ڈنڈہ نہ بنا۔ ۲۔مخلوق میں مشہور ہونا ایک مضبوط قید ہے اس راہ میں ایسی قید لوہے کی بیڑی سے کم نہیں۔

حکایت : بعض مشائخ نقشبندیہ سے منقول ہے کہ وہ شیخ المعروف بدوہ عمر روشتی کی طبع پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ چونکہ ان کے دل میں کچھ حبِ ریاست گھر کر چکی تھی اس لیے کہ شہر تبریز میں مرجع اصاغر واکابر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے ان کا حال دگرگوں تھا۔ ڈر کے مارے خوفزدہ تھے کہ کہیں موت کے بعد ان کا نتیجہ برا نہ ہو۔

ف: شرح حکم میں ہے کہ اپنے وجود کو یعنی وہ امور جو مخلوق میں شہرت کا سبب بنتے ہیں جیسے علم اور حال، گمنامی کی زمین میں دفن کر دے اور وہ بھی تین باتیں ہیں:

ا۔اپنے آپ کو ہمیشہ گھاٹے میں سمجھ اور جو تیرے علم سے ظاہر ہو اس پر مت اعتبار کرتا کہ اس سے تیرے نفس کی خرابیاں تجھے خرابی میں نہ ڈالیں۔

۲۔اپنے آپ کو اس حیثیت سے دیکھ جیسے کہ تو ہے، اپنی اس حیثیت کو نہ دیکھ کہ جس حیثیت سے چند القابات سے نوازا گیا ہے کیونکہ یہ بھی گھاٹے والی بات ہے کہ تو اپنے آپ کو القابات کی حیثیت سے دیکھے۔ اپنے مالک کو ہر کمال سے موصوف سمجھ۔ جو کچھ تم سے ظاہر ہوتا ہے اسے مالک کی مہربانی سمجھ۔ اپنی طرف کسی بات کو منسوب نہ کر۔ اس سے گمنامی کی صفت حاصل ہو جائے گی۔

۳۔نفس کے ہر دعوی کو مٹا دے اسے کوئی بات نہ ظاہر کرنے دے۔ جس سے عُجب پیدا ہو وہ تجھے خرابی میں لے جائے گی۔ جیسے بیج ایسی زمین میں ڈالا جاتا ہے جو زرخیز ہو نہ کہ رڈی۔

تفسیر عالمانہ

وَقَالُوْا وہ یہودی جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں موجود تھے کہتے تھے کہ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ غُلف، اَغلف کی جمع ہے۔ اس اغلف (جلد پردہ دار) سے مستعار ہے جو ابھی ختنہ نہ کیا گیا ہو۔ یعنی ہمارے دل جبلی پردوں سے مستور ہیں ان کی طرف (جو احکام نبی پاک صلی

اللہ علیہ وسلم لے آئے ہیں) نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی وہ انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی کہ ان کے دل ایسے ہی پیدا نہیں ہوئے کیونکہ وہ تو فطرت اور قبول کے تمکن پر پیدا کیے گئے ہیں ان کے اس قول سے اعراض فرماتے ہوئے کہا: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ انہیں رسوائی میں ڈالا ہے اور اپنے دربار سے انہیں ہٹا دیا ہے۔ ان کا یہ حال ان کے کفر کی وجہ سے ہے جو انہیں عارض ہوا اور استعداد کو ایک بار نہ قبول کرتے ہوئے اپنے برے اختیار اور باطل کردینے کی وجہ سے ہے۔ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ فاء زائدہ ہے مبالغہ کے لئے لائی گئی ہے۔ یعنی تھوڑا ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو بعض کتاب سے ایمان تھا اور بعض سے کفر۔ فاء سببیت لعنت کے لئے جو انہیں ایمان نہ لانے کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ كِتٰبٌ سے مراد قرآن مجید ہے اور اسے مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سے موصوف کرنا عزت سے مخصوص بڑھانے کے لئے ہے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ یعنی تورات اور توحید اور بعض شرائع کے موافق ہے۔ ابن التمجید فرماتے ہیں کہ مُصَدِّقٌ صرف بعثت نبویہ علی صاحبہا السلام کے ساتھ اور ان کی علامات صفات سے مخصوص ہے نہ کہ شرائع واحکام سے۔ کیونکہ قرآن تو اس کے اکثر احکام و شرائع کا ناسخ ہے۔ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ جلیلہ سے مشرکینِ عرب اور کفار مکہ فتح ونصرت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ کہا جاتا تھا:

اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا بِالنَّبِيِّ الْمَبْعُوْثِ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ الَّذِيْ نَجِدُ نَعْتَهُ فِي التَّوْرَاةِ [1]

اور اپنے اعدا سے کہتے کہ وہ وقت قریب ہے کہ نبی آخر الزماں تشریف لائیں گے اور ہماری تصدیق کریں گے ہم ان کے ساتھ ہو کر تمہیں عاد وارم کی طرح قتل کریں گے۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا وہ جو کتاب سے جانتے تھے کیونکہ مَا اُنْزِلَ کی معرفت دراصل مَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ کی معرفت ہے۔ اور فاء دلالت کر رہی ہے کہ ان کی طلب فتح کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری میں کوئی لمبی مدت نہ گزری تھی کہ وہ اس بات کو بھول جاتے۔ كَفَرُوْا بِهٖ حسد اور حرص علی الریاسۃ کی وجہ سے ان کے ساتھ کفر کیا اور ان کی صفت کو بدل ڈالا اور یہ

[1]: اے اللہ! اس نبی علیہ السلام کی برکت سے ہماری مدد فرما جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوں گے جن کا ذکر خیر ہم تورات میں پاتے ہیں۔

جملہ لَمَّا اُولٰی کا جواب ہے اور لَمَّا ثانیہ محض لما اولی کی تائید و تکریر کے لئے ہے۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ لعنة الله علیهم (ضمیر) کے بجائے اسم ظاہر لایا گیا۔ اس دلالت کی بنا پر کہ لعنت انہیں صرف ان کے کفر کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے اور فاء اس دلالت کے لئے ہے کہ لعنت کا ورود کفر کے بعد ہے۔

ف: کفار پر لعنت کا معنیٰ طـــرد" اور رحمت اور جنت سے مطلقاً دور کرنا اور مومنین جو گنہگار ہیں ان کے لئے لعنت سے یہ مطلب ہے کہ انہیں اس کرامت سے دور کرنا جو ان گناہوں سے پاک ہیں اور انہیں کرامت کا وعدہ دیا گیا جو اس گناہ سے بری ہیں۔

حدیث شریف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "جس نے احتکار کیا وہ ملعون ہے"

یعنی وہ شخص جو کسی چیز کو خرید ے اور اس لئے جمع رکھ دے کہ اسے مہنگائی کے وقت بیچے گا تو وہ شخص ابرار کے درجہ سے دور ہے نہ رحمت غفار سے۔

تحقیق لعنت علی الغیر:۔ وہ صفات کہ جن کی وجہ سے لعنت کی جاتی ہے تین ہیں:

۱۔کفر ۲۔بدعت ۳۔فسق اور ان میں سے ہر ایک کے تین مراتب ہیں۔

۱۔وصف اعم کو لے کر لعنت کرنا۔ جیسے کہا جائے: لعنة الله على الكفرين او المبتدعة او الفسقة۔ کافرین یا مبتدعین یا فاسق پر لعنت۔

۲۔وصف اعم سے اخص کو لے کر لعنت کرنا جیسے کہا جائے: لعنة الله على اليهود و النصارىٰ او على القدرية والخوارج و الروافض او على الزناة و الظلمة و اٰكل الربٰوا۔ اس طرح سب پر مطلقاً لعنت کرنا جائز ہے

۳۔ایک متعین شخص پر لعنت کرنا۔ یہ اس وقت جائز ہے جبکہ کفر شرعاً اس سے ثابت ہو چکا ہو بشرطیکہ اس میں کسی مسلم پر ایذاء کا موجب نہ بنے اور اگر ان کا کفر شرعاً ثابت نہ ہو، جیسے کہا جائے: لعنة الله على زيد او عمرو وغیرھما۔ معین اشخاص پر لعنت کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس کے خاتمہ کا حال غیر معلوم ہے۔ بہت بار کا مشاہدہ ہے کہ جسے ہم کافر سمجھتے ہیں وہ مرنے سے پہلے اسلام لاتا ہے یا اپنی غلطی سے توبہ کر کے مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہو جاتا ہے۔ اس بناء پر اس پر لعنت کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے۔

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا

لیکن پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے جنت کی بشارت دی اور یہی حجت پکڑتے ہیں جو لوگ یزید پر لعنت نہ کرنے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس نے توبہ کی ہو اور پنے کیے ہوئے فعل سے رجوع کر لیا ہو اس احتمال سے اس پر لعنت نہ کرنا چاہیے اور جو لوگ لعنت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ یزید کا کفر مشہور ہے اور اس کے شدید شر کی خبر متواتر ہے اس لیے کہ جب اس نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا تو اس نے کفر کیا علاوہ ازیں اس قول سے کافر ہوا جیسا کہ اس نے شراب نوشی کے وقت کہا: فَاِنْ حُرِمَتْ یَوْماً عَلٰی دِیْنِ اَحْمَدْ. فَخُذْھَا عَلٰی دِیْنِ الْمَسِیْحِ ابْنِ مَرْیَمْ ۔یعنی آج یہ شراب احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی وجہ سے حرام ہے تو اسے دین عیسوی کی وجہ لے کر پی لے۔

اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل اور ان کے قتل کے آمر اور مجوز اور راضی ہونے والے تمام پر لعنت جائز ہے۔ جیسا کہ سعد الملۃ والدین التفتازانی فرماتے ہیں:

”حق بات یہ ہے کہ یزید کا قتلِ حسین رضی اللہ عنہ پر راضی ہونا، اس سے خوش ہونا اور اہلِ بیت کی اہانت کرنا اگرچہ اس کے تفاصیل احاد تواتر بالمعنی ہیں“ تو پھر ہم اس کے شان بلکہ ایمان میں کیا شک کریں بلکہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اور اس کے انصار و اعوان پر لعنت بھیجے۔ الصاحب بن عباد کی عادت تھی کہ جب پانی میں برف ملا کر پیتے تو یہ شعر پڑھتے:

قَعْقَعَۃُ الثَّلْجِ بِمَاءٍ عَذْبٍ ۔۔۔ تَسْتَخْرِجُ الْحَمْدُ مِنَ الْصَی الْقَلْبِ

یعنی برف میٹھے پانی کے ساتھ حمد کو اقصیٰ قلب سے نکالتی ہے۔

پھر کہتے: اَللّٰھُمَّ جَدِّدِ اللَّعْنَ عَلٰی یَزِیْدَ ۔۔۔ اے اللہ! یزید پر لعنت کی تجدید فرما۔

عقیدہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی لعنت سے زبان کو روکا جائے کیونکہ اس میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہے اس لیے کہ کاتبِ وحی اور ذو السابقہ اور صاحبِ فتوحات کثیرہ تھے۔ فاروق وعثمان رضی اللہ عنہما کے عامل تھے لیکن ان سے اجتہادی غلطی سرزد ہوئی اور وہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت کے طفیل معاف فرما دے گا۔

حکایت: خیاط علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: مجھے آج تک کسی نے لاجواب نہیں کیا صرف ایک لڑکے سے لاجواب ہو گیا تھا جبکہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں تیرا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا اس کے بارے میں توقف کرتا ہوں۔ پھر اس نے پوچھا: اس کے بیٹے یزید کے حق میں کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ پھر پوچھا: جو یزید سے محبت رکھتا ہو اس کے متعلق کیا گمان ہے؟ میں نے کہا: اس پر بھی لعنت۔ لڑکے نے کہا: یقین جانئے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کو دوست نہیں رکھتے تھے۔ (کذا فی روضۃ الاخیار)

مسئلہ: لعنت پھر لعنت ادا کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے جبکہ جس پر لعنت کی جائے وہ اس کا اہل نہ ہو۔

مسئلہ: کسی شئے پر لعنت کرنے سے بسا اوقات اس سے برکت چھن جاتی ہے۔

مسئلہ: اللہ کی مخلوق میں کسی شے پر لعنت نہ کی جائے یہاں تک کہ نہ جماد پر نہ حیوان پر اور نہ انسان پر۔

حدیث شریف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے دوزخ دکھائی گئی تو میں نے اس میں زیادہ عورتوں کو پایا وہ لعنت بکثرت بھیجتی ہیں اور اپنے شوہروں کی نافرمانی کرتی ہیں اگرچہ زمانہ بھر ان کے ساتھ احسان کرتے رہو جب کسی وقت کسی قسم کی کمی دیکھیں گی تو کہیں گی: میں نے تجھ سے کبھی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔

مسئلہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

''جو شخص علم کے بغیر فتویٰ دیتا ہے تو اسے آسمان و زمین لعنت کرتے ہیں''

حکایت: علی بلخی کی بیٹی نے اپنے باپ سے پوچھا کہ جب قے حلق تک خارج ہو کیا وضو باقی رہتا ہے؟ علی بلخی نے کہا: نہیں، بلکہ اس پر وضو کا اعادہ ضروری ہے۔ پھر علی بلخی کے ہاں خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: نہیں اے علی بلخی! وضو نہیں ٹوٹتا جب تک قے سے منہ بھرا نہ ہو۔ میں نے یقین کر لیا کہ ہر فتویٰ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں میں نے قسم اٹھالی کہ آئندہ کسی قسم کا فتویٰ نہیں دوں گا۔ (کذا فی الروضۃ)

بِئْسَمَا ما نکرہ منصوب بئس کے فاعل کے لئے مفسر ہے ای بئس شیئا۔ اشْتَرَوْا صفت ہے۔ اشتری بمعنی

باع و ابتاع۔ یہاں پر پہلا معنیٰ مراد ہے۔ بِہٖٓ اس شئے کے سبب سے۔ای بذلک الشئی۔ اَنْفُسَهُمْ اس سے مراد ایمان ہے نفس کو ایمان کی بجائے ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس کی خلقت علم وعمل کے لئے ہے۔ جسے ایمان کے لئے تعبیر کیا جاتا ہے اور جبکہ انہوں نے ایمان کو چھوڑ کر کفر کا جامہ پہنا تو گویا کہ انہوں نے نفسوں کو کفر سے تبدیل کیا اور مخصوص بالام ہے۔ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کتاب (جو ان کے احکام کا تعین کرتی ہے) کے ساتھ کفر کرتے ہیں باوجودیکہ اس کی حقیقت جانتے ہیں۔ بَغْیًا ، اَنْ یَّكْفُرُوْا کی علت ہے۔

ف: حسد اس چیز کو طلب کرنا جو اس کے پاس نہ ہو۔ حاسک کا کام ہے جو مرتبہ وقدر اور خصلت حمید محسود کو حاصل ہے وہ چاہتا ہے وہی مجھے مل جائیں اور باغی وہ ظالم ہے جو اس فعل کو بوجہ حسد کے کرتا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ بہت بری شئے ہے یہ کہ انہوں نے ایمان دے کر کفر خریدا۔ جس میں بغی کے سوا اور کچھ ہے نہیں اور وہ بغی اس لیے اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ یا حسد اس لئے کہ اَنْ یُّنَزِّلَ الخ کیونکہ حسد کا صلہ علی آتا ہے یعنی نازل کرے مِنْ فَضْلِهٖ اپنے فضل سے عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ جسے چاہے اور جسے چن لے مِنْ عِبَادِهٖ اپنے بندوں میں سے۔ یعنی اس کے وہ بندگان جو اعبائے رسالت کے تحمل کے اہل ہیں۔ اس سے مراد سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ف: یہود کا عقیدہ تھا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے ہیں لیکن آرزومند تھے کہ سیدنا اسحٰق علیہ السلام کی اولاد سے ہوں۔ جب حضور علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے تشریف لائے تو یہود کو حسد ہوا کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسرائیل سے ظاہر ہونا چاہیے تھا لیکن ان کے غیر میں ظاہر ہوا ہے۔

فَبَآءُوْ لوٹے جو ملبس ہیں۔ بِغَضَبٍ ساتھ غضب کے جو ہونے والا ہے۔ عَلٰى غَضَبٍ پے در پے غضب اور لعنت در لعنت کے مستحق ہوئے موافق اس کے کہ انہوں نے کفر در کفر کیا کیونکہ نبی برحق کے ساتھ کفر کیا اور بغاوت کی۔ وَلِلْكٰفِرِیْنَ ضمیر کے بجائے اسم ظاہر میں اس طرف اشارہ ہے کہ کفر انہیں محیط تھا عَذَابٌ مُّهِیْنٌ اور کفار کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اس سے کفار کی اہانت اور ذلت مراد ہے کیونکہ انہیں لالچ تھا کہ قرآن کا نزول ہماری قوم میں ہوتا۔ اب دوسری قوم میں نازل ہوا تو ان میں حسد پیدا ہو گیا۔ تو اس کی یہ سزا ملی جس ذات سے حسد کرتے ہو ان کی وجہ سے ہی تمہیں ذلیل وخوار کیا جا رہا ہے۔

ف: اس سے ثابت ہوا کہ مومنین کا عذاب ان کو ادب سکھانے اور گناہوں سے پاک کرنے کے لئے اور کافروں کو عذاب ان کو ذلیل اور ان پر سختی کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ف: دین و دنیا کا فیض و فضل اللہ تعالیٰ کے کرم پر مبنی ہے۔ کسی پر فیض و فضل ہو جائے تو دوسرے کو اس پر حسد نہیں کرنا چاہیے اور پھر نبوت اور ولایت امور اکتسابیہ سے نہیں کہ بندہ جدو جہد اور خاص اہتمام سے انہیں حاصل کرے۔ نبوت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو بھیجے۔ تجلی جو اعیان فی العلم کی موجب ہے عنایت کر کے جسے ہی بنا دے اور یہ اس کا ایک فیض ہے جسے جو چاہے دے دے۔ [1]

اسی طرح ولایت بھی ایک خاص عطیہ ہے جسے کسب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ تمام مقامات علیا کو یونہی سمجھو کہ وہ اختصاصیہ عطائیہ ہیں کسبیہ نہیں اسے نصیب ہوتے ہیں جس کو فیضِ الٰہی منتخب فرمائے۔ [2]

سوال: عام طور پر مشہور ہے کہ ولایت کسبی ہے اور آپ اسے بھی عطائی کہہ رہے ہیں۔

جواب: چونکہ اس کا ظہور چند شرائط و اسباب کے تحت ہوتا ہے اور وہ شرائط و اسباب آہستگی پذیر ہوتے ہیں اسی لیے محجوب انسان سمجھتا ہے کہ ولایت کسبی ہے حالانکہ ولایت بھی عطائی ہے۔

ف: حسد کرنے سے کیا بنتا ہے صرف اتنا ہوتا ہے کہ جہاں زبانی باتوں سے اپنے محسود کو کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھتے ہیں اس سے محسود کو کون سا نقصان پہنچا، بلکہ اسے تو فائدہ ہوا کہ حاسد کے حسد سے اس کے درجات بڑھ گئے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کا طریقہ جاری ہے کہ اہل جمال سے اہل جلال ملائے رکھتا ہے تاکہ کمال کا ظہور اچھی طرح ہو۔

حافظ مرحوم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

دریں چمن گل بے خار کس نچید آرے ۔۔۔ چراغ مصطفوی با شرار بولہبیست

ترجمہ: اس چمن میں کوئی گل کانٹے کے بغیر نہیں مصطفیٰ کے چراغ کے ساتھ ابولہب کی چنگاری بھی تھی۔

حکایت: حضرت عارف رومی علیہ الرحمہ جب حضرت شمس تبریز علیہ الرحمہ سے جدا ہوئے تو ان کی تلاش میں گرمی کی پروا کیے بغیر بڑے بڑے شہر چھان مارے۔ ایک سنار کی دکان کے آگے سے گزرے اور وہ

[1]: اس سے مرزائیوں کے عقیدے کی تردید ہوئی کہ وہ قائل ہیں کہ نبوت بھی کسبی ہے۔

[2]: اگرچہ اس میں کسب عمل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اویسی غفرلہ

دکان شیخ صلاح الدین زرکوب کی تھی۔آپ کو شیخ موصوف نے فرمایا: مولانا! کیوں حیران پھر رہے ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ فلک جب اپنے آفتاب کو گم پاتا ہے تو وہ حیران وششدر ہو کر چکر لگاتا ہے تاکہ اپنے سورج کو پاکر ظلمت کے دکھ سے بچ جائے۔شیخ موصوف نے فرمایا: میں تیرا سورج ہوں میرے قریب آجایئے۔مولانا نے فرمایا: میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ میرے شمس ہیں۔شیخ موصوف نے مولانا کو ان کے مراتب کو پوری تفصیل بتادی کہ جن مراتب سے حضرت شمس تبریز نے مولانا کو آگاہ فرمایا تھا۔مولانا نے شیخ موصوف کے ہاتھ چوم لیے اور معذرت کی اور کہا میرے شمس نے پہلے مجھے اپنی جھلک دکھائی اب مجھے اپنے چہرے کی جانب سے نوازا اس کے بعد مولانا ان کے ہاں رہنے لگے اور بہت بڑے مراتب حاصل کیے۔مولانا کے بعض ہوا خواہوں کو معلوم ہوا تا حسد کے طور شیخ موصوف کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔لیکن مولانا نے اپنے سلطان ولد کو بھیج کر ان کو اس ارادہ بد سے روکا۔شیخ موصوف نے فرمایا: مولانا! فکر مت کیجئے اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی طاقت بخشی ہے کہ آسمان کو زمین پر دے ماروں اور اپنے حاسدوں کو پاش پاش کردوں لیکن بہتر ہے کہ اس میں صبر کروں۔آیئے مل کر ان کی اصلاح کی دعا کریں۔شیخ نے دعا فرمائی تو ان لوگوں کے ارادے ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ اس ارادہ بد سے تائب ہو کر استغفار کرنے لگے۔مثنوی شریف میں ہے: ؎

چوں کنی بر بے حسد مکر وحسد ۔۔۔ زاں حسد دل را سیاہیہا رسد

خاک شو مردان حق را زیر پا ۔۔۔ خاک بر فرق حسد کن ہمچوں ما

ترجمہ: جب بے حسد پر مکر وحسد کرو گے تو اس سے تیرے دل کی سیاہی بڑھے گی۔مردان خدا کا خاکپا اور زیر ہو جا ہماری طرح حسد کے سر پر مٹی پھینک۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ اور اس کے گردونواح کے یہودیوں کو کہتے ہیں اور لام بمعنی انہاء تبلیغ کے ہے۔**اٰمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ** تمام کتب الٰہیہ پر ایمان لاؤ۔**قَالُوا نُؤْمِنُ** کہتے ہیں ہم ایمان پر استمرار رکھتے ہیں۔**بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا** اس سے مراد تورات اور جو کچھ بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہوا اس کے ماسوا ہم پر نازل ہوتا ہے کیونکہ اس پر عمل کرنا ان کو لازم ہوتا ہے۔**وَ** اور وہ **يَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ** ماسوا اس کے جو ان پر نازل ہوا، کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔**وَهُوَ** حالانکہ تورات کے ماسوا قرآن **الْحَقُّ** حق ہے۔یعنی معروف

بالحقیقت ہے اور اس کو لائق ہے کہ علی الاطلاق حق کا اسم اس کے لئے خاص ہو۔ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ تورات کی تصدیق کرتا ہے اس کا مخالف نہیں۔ حق سے حال مؤکدہ ہے اور اس کا عامل فعل ہے اور ذوالحال وہ ضمیر ہے جس پر کلام دلالت کرتا ہے۔ یعنی اُحِقُّہٗ مُصَدِّقًا یعنی اس کا حال یہ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کنندہ ہے اس میں ان کے اپنے قول کی تردید بھی ہے۔ کیونکہ جب اس کا انکار کر رہے ہیں جو تورات کا انکار ہے اس کے بعد اعتراض فرمایا کہ تم نے انبیاء علیہم السلام کو شہید کر دیا باوجودیکہ تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم ایمان دار ہیں۔ حالانکہ تورات میں کسی نبی کے قتل کی اجازت نہیں تھی۔ قُلْ اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایئے۔ یہ امر تبکیت کا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان کے متناقض اقوال کی وجہ سے۔ فَلِمَ دراصل لِمَا تھا۔ اس کی لام تعلیل کی ہے جو ما استفہامیہ پر داخل ہوئی ہے۔ الف گر گیا ہے تاکہ استفہامیہ و خبریہ کے مابین فرق رہے۔ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ استقبال صیغہ حکایت حال ماضیہ کے لئے ہے اور یہ جواب ہے شرط محذوف کے لئے۔ دراصل عبارت یوں تھی: قل لهم ان كنتم مؤمنين بالتورات. الخ آپ فرمایئے کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو پھر اس سے قبل کس وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو شہید کرتے تھے۔ حالانکہ یہ فعل تورات میں بھی حرام ہے۔ ان کے آباء کے فعل یعنی قتل کا اسناد اِبْنَـــا کی طرف صرف ان کی آپس میں ملابست کی وجہ سے ہے۔

مسئلہ : ابواللیث علیہ الرحمہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ گناہ سے راضی ہونے والا گویا اس کا مرتکب ہوا ہے۔ کیونکہ یہود اپنے آباء کے انبیاء کے قتل کرنے پر راضی تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں قاتل الانبیاء قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا: فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ الخ

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ شرط کا جواب محذوف ہے جیسا کہ گزشتہ مضمون دلالت کرتا ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی: ان كنتم مؤمنين فلم تقتلوهم۔ اعتراض کا تکرار محض الزام کی تاکید اور تشدید تہدید کے لئے ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ تبکیت وتوبیخ کا تکملہ ہے۔ یہ بھی امر کے تحت داخل ہے اور یہ لام قسم کی ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی: باللّٰهِ قَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى الخ۔ اللہ تعالیٰ کی قسم بیشک موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس معجزات لائے جو ظاہر اور واضح تھے۔ یعنی عصا اور ہاتھ کا نورانی ہونا اور دریا کا پھٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ مِنْۢ بَعْدِهٖ بعد ان معجزات لانے کے اور ثُمَّ رتبہ کی تراخی کے لئے ہے اور اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کا یہ عمل نہایت قبیح تھا۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ یہ حال ہے۔ اِتَّخَذْتُمْ کی ضمیر سے۔ یعنی تم بچھڑے کے پجاری ہوئے حالانکہ تم عبادت کو اس کے غیر محل میں رکھنے والے تھے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ تم میں سے وعدہ لیا۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ تم پر پہاڑ کھڑا کر دیا اور ہم نے کہا: خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ اسے بڑی جدوجہد سے پکڑو۔ وَاسْمَعُوْا اور جو کچھ تورات میں ہے اسے قبول کرو اور اطاعت کرو۔ گویا قَالُوْا پوچھا گیا کہ پھر انہوں نے کیا جواب دیا تو فرمایا: قَالُوْا انہوں نے کہا: سَمِعْنَا ہم نے تیرا قول سنا تو ہے لیکن ہم عمل نہیں کریں گے۔ وَعَصَيْنَا بلکہ تیرے امر کے خلاف کریں گے۔ اگر پہاڑ کے گرنے کا خطرہ نہ ہوتو ظاہراً بھی نہ مانتے جب ان کے اسلاف کا یہ حال ہے کہ تو غور فرمایئے کہ ان کے اخلاف کا کیا حال ہوگا۔

فردوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

زبد گوہراں بدنباشد عجب	سیاہی نباشد بریدن زشب
زبد چشم بہی داشتن	بود خاک در دیدہ پناستن

ترجمہ:

۱۔ بدگوہروں سے برائی نہ ہو تعجب ہے کیا رات سے بھی سیاہی مٹائی جاسکتی ہے؟

۲۔ برے سے بھلائی کی امید رکھنا ایسے ہے جیسے آنکھوں میں مٹی ڈالنا۔

وَاُشْرِبُوْا بیشک وہ پلائے گئے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمُ یہ ان کے پلانے کے مقام کا بیان ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔ الْعِجْلَ بچھڑے کی محبت۔ مضاف محذوف ہے۔ کہا جاتا ہے: اُشْرِبَ قَلْبُهٗ كَذَا ای مَحَلَّ الشَّرَابِ۔ یا معنی ہے کہ ان میں بچھڑے کی محبت مخلوط ہوگئی۔ جیسے رنگ کپڑے میں مل جاتا ہے۔ دراصل اُشْرِبَهٗ اور جَعَلَهٗ شَارِبًا ۔ کا ایک ہی معنی ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے بچھڑے کی محبت کو پی لیا تھا اور بچھڑے کی محبت ان کے دل میں ایسے سرایت کر گئی جیسے پانی جسم میں مل جاتا ہے۔

ف: امام راغب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اہل عرب کی عادت ہے کہ جب کسی شئے کی محبت یا بغض کسی میں دیکھتے ہیں تو پینے کے فعل کو اس کے لئے استعمال کرتے ہیں کیونکہ پینے کی شئے جسم کے ذرہ ذرہ میں سرایت

کر جاتی ہے۔ اسی لئے اطباء نے کہا ہے کہ پانی اغذیہ اور ادویہ کی سواری ہے۔

بِكُفْرِهِمْ ان کے کفر کی وجہ سے جو ان سے پہلے سرزد ہوا وہی اس برے عمل کا سبب بنا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ مجسمہ یا حلولیہ مذہب کے لوگ تھے اور بچھڑے کا جسم نہایت اچھا لگا اس لیے اس کی طرف جھک گئے اور ان کا دل بچھڑے سے لگ گیا۔ ادھر سامری نے بھی غلط فہمی میں ڈال دیا۔ ان کی لذت پرستش کو (جو ان کو بچھڑے سے حاصل ہوئی) کفر سے مجازاً تعبیر کیا گیا ہے۔

حکایت: حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس واپس تشریف لائے تو بچھڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرا کر تمام نہروں میں ذرہ ذرہ کر کے ڈالا پھر فرمایا کہ تم ان نہروں سے پانی پی لو۔ جس کے دل میں بچھڑے کی محبت رچی ہوئی تھی اس کے منہ سے سونے کا پانی ظاہر ہو جاتا۔

قُلْ یہ توبیخی امر ہے اور ان یہودیوں سے خطاب ہے جو حضور علیہ السلام کے ہم زمان تھے صرف اس ارادہ پر کہ وہ اپنے آباء و اجداد کی تقلید میں پھنس کر صرف ان کے اعمال کی اقتداء کرتے تھے۔ بِئْسَمَا برا ہے وہ فعل يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ جو تمہیں ایسی قباحتوں کا حکم دیتا ہے۔ اِيْمَانُكُمْ تمہارا وہ ایمان جو تم نے اپنی بنائی ہوئی تورات سے تیار کیا ہے۔ مخصوص بالذم محذوف ہے۔ یعنی وہ مضمون جو پہلے مذکور ہوا۔ جیسے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اور ان کا بچھڑے کو پوجنا۔ ایمان کی طرف ان کے فعل کی نسبت محض تہکماً ہے اور پھر ایمان کو ان کی طرف مضاف کرنے میں اشارہ ہے۔

کہ ان کا در حقیقت ایمان ہی نہیں کیونکہ ایمان ان کا اپنا تیار کردہ ہے۔ چنانچہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے یعنی اگر تم صحیح معنی پر تورات پر ایمان لاؤ تو تورات تمہیں ایسی قباحتوں سے روک لے گی۔ لیکن تمہاری یہ کیفیت بتاتی ہے کہ تم مؤمن نہیں ہو۔

مسئلہ: جو منہ سے کہے کہ مومن ہوں۔ اس کا عمل بھی تصدیق کرے کہ واقعہ وہ مومن ہے ورنہ وہ کامل مومن نہیں۔

سبق: حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ صوفیہ کرام کے نزدیک توحید کا مطلب یہ ہے کہ بندہ

حدوث سے ہٹ کر قدم میں پہنچے۔ اس عالم کے بکھیڑوں اور دلی تمناؤں کو مٹا کر عمل اور جہل سے دو ہو کر ذاتِ حق کے ملک میں جا بسیرا کرے۔

طالبِ توحید را باید قدم بہ لا زدن ۔۔۔ بعد ازاں در عالم وحدت دم الا زدن

ترجمہ: طالب توحید کو پہلا قدم لا پر رکھنا ہے پھر عالمِ وحدت میں الاّ کا دعویٰ کرنا۔

حکایت: حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب قاصد نے خوشخبری سنائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندہ ہیں، تو آپ نے اس سے پوچھا: زندہ تو ہیں لیکن یہ بھی تجھے خبر ہے کہ ان کا دین کیا ہے؟ اس نے کہا: ان کا دین اسلام ہے۔ تو آپ نے فرمایا: الحمد للہ! اب میں خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی تکمیل ہو گئی۔

ف: آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ توحید اصل الاصول ہے اور قبولیت کا دارومدار اسی پر ہے اور اس سے گناہوں کی معافی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطائیں اسی سے نصیب ہوتی ہیں۔

اسلامِ دحیہ کلبی: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ دحیہ کلبی مسلمان ہو جائے۔ کیونکہ اس کے ماتحت ستر قبیلے تھے اس کے اسلام لانے سے وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ دِحْيَةَ الْكَلْبِيَّ الْاِسْلَامَ ۔ (اے اللہ! دحیہ کلبی کو دولت اسلام سے نواز) اس کے بعد جب دحیہ کلبی نے اسلام لانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی بھیجی اس وقت حضور علیہ السلام صبح کی نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بعد سلام ارشاد فرمایا کہ اے پیارے حبیب! ابھی آپ کے پاس دحیہ کلبی حاضر ہو گا۔ لیکن آپ کے صحابہ میں سے بعض کی زمانہ جاہلیت سے اس کے ساتھ ناراضگی ہے فلہذا خیال رہے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے جب سنا تو دل سے یہ بات نکال دی اگرچہ حضور علیہ السلام نے انہیں نہیں فرمایا تھا۔ چنانچہ جب حضرت دحیہ کلبی مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور فرمایا کہ اس پر بیٹھ جاؤ۔ حضرت دحیہ کلبی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کو دیکھ کر رونے لگے اور آپ کی چادر مبارک کو اٹھا کر چوما اور اسے آنکھوں سے لگایا اور ادب سے اسے سر پر رکھ لیا اور عرض کی: حضور! مجھے اسلام کے شرائط بتایئے۔ آپ نے فرمایا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دحیہ نے کلمہ

شریف پڑھا۔اس کے بعد زار و قطار رونے لگے۔آپ نے فرمایا: دولتِ اسلام کے حصول کے بعد اب رونے کا کیا معنیٰ؟ عرض کی: اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہوں تو بے ساختہ رونا آتا ہے اس کا کفارہ جو ہوگا میں ادا کروں گا اپنے رب سے پوچھیے۔اس کے عوض مجھے اپنے آپ کو قتل بھی کرنا پڑا تو کروں گا۔اگر سارا مال بھی خرچ کرنا پڑے تو دریغ نہ کروں گا۔آپ نے فرمایا: وہ گناہ کیسا ہے؟ عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہے کہ میں ایک بادشاہ ہوں اور مجھے عار تھی کہ میں اپنی لڑکیوں کو کسی کے نکاح میں دوں۔اسی لیے میں نے یکے بعد دیگرے اپنی ستر لڑکیوں کو قتل کیا ہے۔اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم متحیر ہوئے۔اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کی: اللہ تعالیٰ سلام کے بعد فرماتا ہے کہ دحیہ کو فرما دیجئے: مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم! جبکہ تو نے کلمہ پڑھا ہے ہم نے تمہارا ساٹھ سال کا کفر اور ساٹھ سال کے تمام گناہ بخش دیئے۔اسی طرح لڑکیوں کے مارنے کے گناہ بھی بخش دیئے۔اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان آبدیدہ ہوگئے اور کہنے لگے: یا اللہ! جب تو دحیہ کلبی کے گناہ ایک بار کلمہ شریف پڑھنے سے بخش دیتا ہے تو مومنین تو کئی بار یہ کلمہ شہادت پڑھیں گے پھر کیوں نہ ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے کیونکہ وہ صدقِ دل اور خالص عمل سے یہ کلمہ شریف پڑھیں گے۔مثنوی شریف میں ہے:۔

اُذْکُرُوا اللّٰہَ کار ہر اوباش نیست ۔۔۔ اِرْجِعِیْ بر پائے ہر قلاش نیست

ترجمہ: اللہ کا ذکر ہر اوباش کو نصیب نہیں اور ارجعی کا خطاب بھی ہر قلاش کو نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ سعدی نور اللہ مرقدہ' نے فرمایا ہے:۔

گر بحشر خطاب قہر کند ۔۔۔ انبیاء۔ راچہ جائے معذرتست

پردہ از روئے لطف معذرتست ۔۔۔ کا شقیا را امید مغفرتست

ترجمہ:

۱۔اگر قیامت میں قہر کا خطاب ہو تو انبیاء بھی معذرت نہ کرسکیں گے۔

۲۔لطف سے پردہ اٹھایئے اس لیے کہ اب تو اشقیاء بھی مغفرت کی امید میں ہیں۔

قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ فرمایئے اگر تمہارے لیے آخرت یعنی بہشت خاص ہے۔عِنْدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً اللہ

تعالیٰ کے نزدیک ظرف جز میں استقرار کے لئے ہے لکمؔ حال ہے دار'' سے۔ یعنی سالم اور خالص تمہارے لیے۔ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ سوائے لوگوں کے۔ یہ خَالِصَةً سے مل کر محل نصب میں ہے یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے سوا۔ لام عہد کے لئے ہے اور یہ اختصاص کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: هٰذَا لِيْ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ ۔ یعنی میں اس کے ساتھ مخصوص ہوں۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ اگر تمہارا قول صحیح ہے کہ بہشت میں یہود کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوگا۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ تو موت کو محبوب سمجھو اور اس کا بہ دل وجان سوال کرو اور کہو: اَللّٰهُمَّ مَيِّتْنَا ۔ (اے اللہ! ہمیں موت دے دے) کیونکہ جسے بہشت کے داخلہ کا یقین ہوتا ہے وہ لامحالہ موت کا اشتیاق ظاہر کرتا ہے اور اس کی نعمتوں کی طرف جلد پہنچنے کا متمنی ہوتا ہے اور خواہش رکھتا ہے کہ اس دار ہلاکت اور پریشانیوں کی قرارگاہ سے چھوٹ جائے۔ اس کی طرف پہنچنے کی کوئی راہ نہیں سوائے موت کے۔ بناء بریں اے یہود! تم اس کی آرزو میں جلدی کرو۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اپنے قول میں (کہ بہشت صرف تمہارے لیے ہی ہے) سچے ہو تو اس کی آرزو کرو۔ تَمَنِّیْ دراصل نفس میں کسی شئے کو مقدر کرنے کا نام ہے اور اکثر اس میں استعمال ہوتی ہے کہ جس کی کوئی حقیقت نہ ہو وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اور اس موت کی ہرگز آرزو نہیں کریں گے۔ اَبَدًا ہمیشہ، یعنی زمان مستقبل میں۔ کیونکہ لفظ اَبَدًا مستقبل کے جمیع اوقات کے لئے آتا ہے جیسے لفظ قط ماضی کے جمیع اوقات کے لئے ہوتا ہے اور یہ دلیل ہے کہ لفظ لَنْ تابید کے لئے نہیں۔ کیونکہ آخرت میں تو موت کی آرزو ضرور کریں گے اگرچہ دنیا میں نہیں کرتے۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ بسبب اس کے کہ وہ برے عمل کرتے ہیں جو نار کے موجب ہیں۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے ساتھ کفر کرنا اور تورات کی تحریف کرنا اور ہاتھوں کی تخصیص اس لیے ہے کہ عموماً اعمال انہیں سے ہوتے ہیں اور انسان کے جوارح میں عام صنائع اور اکثر منافع کا دارومدار انہیں اور ان سے جو صادر ہوتا ہے جاننے والا ہے۔ یہ تہدید ہے۔

حدیث شریف: اگر یہود موت کی آرزو کرتے تو اپنی تھوک نگلنے کے فوراً بعد مر جاتے۔ اس کے بعد پھر کوئی یہودی روئے زمین پر زندہ نہ رہتا۔

پس وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ معجزات سے ہے کیونکہ یہ لَنْ تَفْعَلُوْا کی طرح غیبی خبر ہے اور اگر کسی ایک نے موت کی آرزو کی

ہوتی تو ضرور منقول ہو کر مشہور ہوتا۔

سوال: تمنیٰ قلب سے ہوتی ہے کیا پتہ انہوں نے آرزو کی ہو۔

جواب: آرزو قلب سے نہیں ہوتی بلکہ زبان سے ہوتی ہے۔ جیسے کوئی آرزو کرتے ہوئے کہتا ہے: لَیۡتَ لِیۡ کَذَا۔

حکایت: حضرت نافع فرماتے ہیں کہ ہم ایک یہودی کے پاس بیٹھے تھے وہ ہمارے ساتھ جھگڑ رہا تھا کہ تمہاری کتاب میں فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ ہے اور میں موت کی آرزو کرتا ہوں لیکن مجھ پر موت واقع نہیں ہوگی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سنا تو گھر میں داخل ہو کر تلوار لٹکائے ہوئے باہر آئے تو یہودی فوراً بھاگ گیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر میرے آنے تک ٹھہرتا تو اس کی گردن ضرور اڑاتا۔ کیونکہ یہ جاہل خیال رکھتا ہے کہ یہ حکم یہود کے لئے ہر آن کے لئے ہرگز نہیں وہ تو صرف ان لوگوں کے لئے تھا جو اس وقت قرآن پاک کی مخالفت اور نبوت کا انکار کرتے تھے جبکہ انہیں نہیں تھا۔

سوال: مؤمن بھی تو یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ جنت کا سوائے ان کے کوئی مستحق نہیں لیکن ان یہود سے ایسی آرزو کسی نے منقول نہیں۔ پھر یہود پر یہ حجت قائم کرنا کیسا؟

جواب: ۱۔ مومنین یہ دعویٰ نہیں رکھتے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑے فضل و شرف اور مرتبہ والے ہیں جیسا کہ یہود کا اپنے لیے دعویٰ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ابناء اور احباء ہیں اور جنت صرف ہمارے لئے ہی ہے اور انسان جس سے محبت رکھتا ہے اس سے ملنے سے کراہت نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے انتقام سے خوف رکھتا ہے بلکہ وہ تو اپنے محبوب تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس جب کہا گیا کہ اے یہود! تم موت کی آرزو کرو۔ جب انہوں نے آرزو سے گریز کیا تو ان کے اپنے دعوی از خود ختم ہو گئے اور ان کا کذب ظاہر ہو گیا۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی آرزو سے روکا ہے۔ فرمایا:

"کوئی تم میں سے دکھ کی وجہ سے موت کی آرزو نہ کرے، لیکن یوں کہہ سکتا ہے اے اللہ! مجھے زندہ رکھ اگر میرے لیے زندگی بہتر ہو اور اگر میرے لیے موت بہتر ہے تو مجھے موت دے دے"

حضرت مقاتل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

لَوْلَا بَنَاتِیْ وَ سَیِّئَاتِیْ لَذُبْتُ شَوْقًا اِلَی الْمَمَاتِیْ

یعنی اگر میری لڑکیاں اور میرے گناہ نہ ہوتے تو میں موت کی ضرور کرتا۔

اسی وجہ سے جوالزام یہود پر ہوا وہ مومنین پر نہیں آسکتا۔

مسئلہ : حضرت عبداللہ تستری قدس سرہٗ فرماتے ہیں: تین آدمیوں کے سوا موت کی آرزو کوئی شخص نہیں کرتا

۱:۔موت کے بعد حالات سے بے خبر۔

۲:۔اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنے والا۔

۳:۔اللہ تعالیٰ کے دیدار کا مشتاق۔

مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

شد ہوائے مرگ طوق صادقاں کہ جہوداں را بدیں دم امتحاں

ترجمہ : موت کی آرزو سچوں کے گلے کا طوق ہے کیونکہ یہودیت کے لئے تو موت ذلت ہے۔

حکایت: حضرت مولانا روم قدس سرہٗ کا جب انتقال قریب ہوا تو حضرت ملک الموت متمثل ہو کر سامنے ہوئے تو آپ نے فرمایا:۔

پیشتر آ پیشتر آ جانِ من پیک در حضرت سلطانِ من

ترجمہ : اے حبیب! آگے آیئے کیونکہ تو تو میرے سرکار کا پیام ہے۔

حکایت: ابو حازم کو کسی بادشاہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی حاضری کیسے ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا کہ فرماں بردار تو ایسے حاضر ہوگا جیسے کوئی غائب اپنے گھر والوں کے پاس جو اس کے مشتاق ہوں اور مجرم کی حاضری ایسے ہوگی جیسے بھاگا ہوا نوکر اپنے غصہ ور مالک کے پاس لوٹے۔

انبیاء رانگ آمد ایں جہاں چوں شہاں رفتند اندر لامکاں

چوں مرا سوئے اجل عشق و ہواست نہی لا تلقوا بایدیکم مراست

زانکہ نہی از دانہ شیریں بود تلخ راخود نہی حاجت کے شود

ترجمہ :ا:۔انبیاء علیہم السلام کو یہ جہاں تنگ نظر آتا تھا بادشاہوں کی طرح لامکاں کو تشریف لے گئے۔
۲:۔چونکہ ہماری خواہش وتمنا موت کی ہے اسی لیے ہمیں لا تلقوا (ہلاکت کی طرف ہاتھ نہ بڑھاؤ) کا حکم ہے۔
۳:۔اس لیے کہ میٹھے میوے سے ہی روکا جاتا ہے کڑوے پھل کی رکاوٹ کی ضرورت ہی نہیں۔

ف: موت ایک مصیبت عظمیٰ اور بڑی آزمائش کا نام ہے۔سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس سے غفلت کی جائے اور اس کے ذکر سے اعراض کیا جائے اور اس کے بارے میں کوئی فکر بھی نہ ہو۔اس کے لئے کوئی عمل بھی نہ ہو۔صرف اسی کے متعلق بڑی عبرت نصیب ہو۔اگر کوئی عبرت کرے تو اس میں فکر کیا جائے تو بہت کچھ نصیب ہوتا ہے۔چنانچہ مروی ہے کہ ''موت ہی بڑا واعظ ہے اور موت کے ذکر سے لذتِ نفسانیہ کا قلع قمع ہوتا ہے اور مستقبل کی آرزو ختم ہو جاتی ہے۔پھر جتنی بھی دنیاوی تمنائیں ہوتی ہیں سب مٹ کر رہ جاتی ہیں۔اگرچہ غافل دل بہت بڑے واعظ کی محتاج ہیں اور ان کے لئے کچھ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اَكْثِرُوْا ذِكْرَهَا ذَمَّ اللَّذَّاتِ لذتوں کو مٹانے والی موت کو زیادہ یاد کرو) اور كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (ہر جی موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے) جیسے ارشادات سمجھدار کے لئے کافی ہیں۔

سبق: دانا کو ضروری ہے کہ مرنے سے پہلے ہی اپنی تیاری کر لے نہ کہ اس وقت جبکہ موت سر پر آجائے۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے:۔

اے برادر چو عاقبت خاکست ۔۔۔۔ خاک شو پیش ازانکہ خاک شوی [1]

دعا: اے اللہ! ہمارا راستہ آسان فرما۔ آمین۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ ،ولتجدن وجدانِ عقل سے ہے اور وہ علم کے قائم مقام ہوتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ وجدان تجربہ وغیرہ کے بعد استعمال ہوتا ہے۔لام قسم کی ہے اصل عبارت یوں تھی وَ اللّٰهِ لَتَجِدَنَّ الْيَهُوْدَ الخ ۔اے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم! آپ یہود کو لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ عَلٰى حَيٰوةٍ وہ موت کی آرزو ہرگز نہیں کریں گے اور حَيٰوةٍ کی تنکیر نوعی ہے اور اس حَيٰوةٍ سے متادولہ مراد ہے اور یہ حَيٰوةٌ وہ ہے جس میں لوگ بسر کر رہے ہیں کیونکہ وہ بھی مطلق الحیاۃ کی ایک نوع ہے۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا معنوی لحاظ

---

[1] اے بھائی! جب انجام خاک ہے اس سے پہلے خاک ہو جا جبکہ تجھے خاک میں جانا ہے۔

سے ماقبل پر عطف ہے گویا یوں کہا گیا ہے: اَحْرَصُ مِنَ النَّاسِ ۔

سوال : جب مشرکین بھی ناس کے افراد میں سے ہیں تو پھر انہیں علیحدہ کیوں ذکر کیا گیا ہے؟

جواب : ۱۔ مشرکین سب سے زیادہ حیاۃ ظاہری کے حریص ہیں۔

۲۔ یہودیوں کو توبیخ بھی ہے کہ مشرکین اگرچہ حیوۃ ظاہری کے حریص ہیں تو ہوں کیونکہ ان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ مرنا تو ہے ہی نہیں اور ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور یہ حیات ان کے لئے جنت ہے اس لیے ان کا حریص ہونا بجا ہے لیکن اہل کتاب کے حریص ہونے سے تعجب ہے کہ ان کے پاس کتاب ہے جس میں مرقوم ہے کہ یہ حیوۃ عارضی ہے۔

سوال : پھر یہودیوں کو مشرکین سے زیادہ حریص کہنے کا کیا معنیٰ ؟

جواب : مشرکین کا تو حریص ہونا بجا ہے کہ وہ جاہل ہیں اور یہ یہود عالم ہونے کے باوجود حیات کے لئے حرص کرتے ہیں فلہٰذا یہ ان سے زیادہ حریص ہوئے۔

یَوَدُّ اَحَدُهُمْ ان کی حرص کا بیان ہے اور جملہ مستانفہ ہے یعنی ان مشرکین میں سے ایک فرد آرزو رکھتا ہے۔

لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ کاش ہزار سال عمر دیا جائے۔ یہ ان کی آرزو کی حکایت ہے۔ اگر یہ جملہ تمنائیہ ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: لَوْ اُعَمَّرُ الخ ۔ لیکن غائب کا صیغہ لایا گیا ہے۔ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ کی وجہ سے جیسے کہا جاتا ہے: حَلَفَ بِاللّٰهِ لَيَفْعَلَنَّ۔ یہ جملہ محلاً منصوب ہے کہ یود کا معمول ہے۔ قَالَ يَقُوْلُ کے باب کا قانون جاری کیا گیا اس لیے کہ یَوَدُّ قلبی فعل ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ وہ مشرکین ہزار سال زندہ رہنے کی آرزو کرتے ہیں۔ یہ دراصل مجوس سے خاص ہے۔

سوال : ہزار سال کی حد بندی کیوں، حالانکہ وہ دائمی بقا چاہتے تھے۔

جواب : یہ ان کے اپنے قول کے مطابق ہے کہ جب ان میں سے کسی کو چھینک آتی تو دوسرا دعا دیتے ہوئے یوں کہتا: عِشْ اَلْفَ سَنَةٍ (تو ہزار سال زندہ رہ) اور علیک سلیک کے وقت بھی یونہی کہتے یا یوں کہتے: عِشْ الف نوروز والف مهرجان۔ جس کا فارسی میں ترجمہ ہوگا: زی ہزار سال (ہزار سال تک زندہ رہ)

سوال : مجوس کو مشرک کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب : مجوس دو خداؤں کے قائل تھے، خالق نور اللہ اور خالق ظلمة اهر من۔

وَمَا هُوَ اہل حجاز کے قانون پر مشبہ بلیس ہے اس کا اسم هُوَ ہے یعنی کوئی ایک ان میں بِمُزَحْزِحِهٖ لفظ مَا کی خبر اور باء زائدہ ہے۔ زَحْزَحَ یعنی بعید کرنا۔ یعنی اسے بچانے والا نہیں۔ مِنَ الْعَذَابِ عذاب سے اَنْ يُّعَمَّرَ یہ کہ اسے عمر دی جائے۔ یہ جملہ مُزَحْزِحِهٖ کا فاعل ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال دیکھتا ہے۔ بصیر وہ ہے جو شئے کی کنہ کو جانے اور خبیر وہ ہے جو شئے کی کنہ سے باخبر ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کی کنہ کو جانتا ہے۔ اس سے کوئی شئے مخفی نہیں۔ دنیا میں ان کو رسوائی اور ذلت کی سزا دے گا اور آخرت میں انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرے گا یہ حیاۃ چند دنوں کے بعد ختم ہو جائے گی خواہ کوئی ہزار سال یا اس سے زائد عمر گزارے۔

مسئلہ: جو بڑی عمر صرف اس لیے چاہتا ہے کہ اس میں نیکی ہی کرتا رہے تو وہ کامیاب لوگوں میں سے ہے۔ حدیث شریف میں ہے: طُوْبٰى لِمَنْ طَالَ عُمُرُهٗ وَاَحْسَنَ عَمَلُهٗ۔ (مبارک ہو اس بندے کو جس کی عمر لمبی ہو اور عمل نیک ہوں)

مسئلہ: جو لمبی عمر صرف گناہوں کے لئے چاہے اس جیسا بدبخت کوئی اور نہ ہوگا۔ موت سے ڈرنے سے کیا فائدہ آخر اس نے ایک دن آ کر ہی رہنا ہے۔

مسئلہ: تمام امت کا اتفاق ہے کہ موت کا کوئی سن مقرر نہیں، نہ ہی میعاد متعین ہے۔ نہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مرض میں موت ہے اور فلاں میں نہیں۔ یہ صرف اس لیے کہ مرد اس کی تیاری میں ہر وقت مستعد رہے۔

حکایت: ایک بزرگ ہمیشہ شہر کے قلعہ کے اردگرد چکر لگا کر کہتے تھے: الرحیل الرحیل (لوگو! موت کی تیاری کرلو) جب وہ فوت ہو گئے تو اس شہر کے امیر نے پوچھا اب اس بندہ خدا کی آواز نہیں آتی۔ لوگوں نے کہا: وہ فوت ہو گئے ہیں۔ امیر نے کہا: ؎

ما زال یلہج بالرحیل وذکرہ ۔ حتی اناخ ببابہ الجمال
فاصابہ متیقظا متشمرا ۔ فارہبۃ لم تلہہ الآمال

ترجمہ: ا۔ وہ بزرگ ہمیشہ کوچ کا اعلان کیا کرتے تھے آخر موت نے ان کے دروازے پر اونٹ لا کر بٹھا دیا۔

۲:۔ موت نے انکو بیدار اور جانے کے لئے بالکل تیار پایا کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سے رختِ سفر باندھ رکھا تھا انہیں دنیا کی آرزوؤں نے غافل نہیں کیا تھا۔

بانگ طبلت نمی کند بیدار   تو مگر مردہ نہ در خوابی

تو چراغے نہادہ درراہ باد   خانہ درمر سیلابی

ترجمہ:

۱:۔ تجھے نقارہ کی آواز بیدار نہیں کرتی تو خواب میں نہیں بلکہ مردہ ہے۔ ۲:۔ تو نے ہوا کے راستہ چراغ رکھا ہوا ہے اور تیرا گھر سیلاب کی گزرگاہ میں ہے۔

سبق: موت کا آنا حق ہے اگرچہ طویل عمر ہی کیوں نہ گزرے آخرکار وہ آکر ہی رہے گی۔ کوئی اسے چاہے یا نہ چاہے۔

حکایت: شارح خطیب حضرت وہب بن منبہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت دانیال علیہ السلام ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ آواز آئی یا دانیال قف ترعجبا (اے دانیال! ذرا ٹھہریئے ایک کرشمہ دیکھتے جایئے) دانیال علیہ السلام نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ دوبارہ ندا آئی۔ دانیال علیہ السلام کہتے ہیں میں ٹھہر گیا اور دیکھا کہ ایک گھر سے مجھے کوئی بلا رہا ہے۔ میں اندر گیا تو دیکھا کہ ایک چارپائی موتیوں اور یاقوت سے مرصع ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا چارپائی کے اوپر سے آواز آئی: اے دانیال! آپ عجیب معاملہ دیکھنے والے ہیں۔ میں چارپائی کے اوپر چڑھ گیا اور اس کے اوپر سنہری بستر بچھا ہوا پایا جو مشک اور عبر سے پُر ہے اور اس کے اوپر ایک نوجوان مرا پڑا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آرام فرما رہا ہے۔ اس کے اوپر نہایت شاندار پوشاکیں اور زیورات تھے جن کا وصف بیان سے باہر ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی اور سر پر سونے کا تاج تھا اور کمر میں سبز رنگ کی ایک تلوار بندھی تھی۔ وہ کہنے لگا: ''اس تلوار کو اٹھایئے اور اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھیے'' میں نے دیکھا کہ اس پر یہ عبارت مرقوم ہے ''یہ تلوار صمصام بن عوج بن عنق بن عاد بن ارم کی ہے'' پھر کہا: میں نے ایک ہزار سات سو برس عمر پائی اور بارہ ہزار باکرہ عورتوں سے شادی کی اور چالیس ہزار شہر بنوائے۔ افسوس! کہ یہ زندگی ظلم وتشدد اور بے انصافی اور بے وقوفی سے گزری۔ میرے خزانے کی چابیاں چار سو خچر اٹھاتے اور دنیا کے بادشاہ مجھے خراج ادا کرتے اور میری شاہی میں کوئی میرا ہمسر نہ تھا۔ بنابریں میں نے ربوبیت کا دعویٰ

کردیا۔ آج مجھے بھوک نے ستایا میں نے ایک ہزار موتی صرف جوار کے ایک دانہ کے عوض دے کر طلب کیا۔ لیکن افسوس کہ آج میں بھوک سے مر گیا ہوں۔ اے دنیا والو! میری موت سے نصیحت پکڑو۔ موت کو بکثرت یاد کرو۔ کسی دھوکے میں نہ رہو میری طرح مارے جاؤ گے۔ اب میرے اقارب میرے گناہوں کی ڈھال نہیں بن سکے۔ حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:۔

چوں ہمہ نیک وبد بباید مرد — خنک آنکس کہ گوئی نیک برد
برگ عیشے بگور خویش فرست — کس نیارد زپیش فرست

ترجمہ : ۱:۔ جب تمام نیک اور بروں نے مرنا ہے اسے مبارک جو نیکی کی گیند لے گیا۔ ۲:۔ عیش کا سامان اپنی قبر میں بھیج تیرے پیچھے اور کوئی نہ لائے گا تو اپنا سامان خود بھیج۔

غافل قلوب کا علاج :۔ پانچ باتوں سے ہوتا ہے :۱۔ وعظ ونصیحت ۔۲۔ تخویف ۔۳۔ ترغیب کی مجالس میں بیٹھنا، اولیاء اللہ کے واقعات سننا۔ اس طریق سے دل نرم پڑ جاتے ہیں اور شاغل الی اللہ ہو جاتے ہیں۔ ۴۔ موت کو بکثرت یاد کرنا کیونکہ اس سے نفس کی خواہشات مٹتی ہیں اس لیے موت کا کام بھی ہے کہ جماعتوں کو منتشر کرتی ہے اور بچوں کو یتیم کرتی ہے۔ ۵۔ جس کو سکرات جاری ہو اس کو دیکھنا۔ کیونکہ موت والے اور اس کی سکرات پر نگاہ ڈالنا نفس کی لذتوں کو ختم کرتا ہے اور دل کی خوشیوں کو بھگاتا ہے اور نیند کو دفع کرتا ہے اور خوشی کو دور کرتا ہے نیک عمل کے لئے برانگیختہ کرتا ہے اور موت کے لئے تیار رہتا ہے کیونکہ یہ کیفیت بھی یکھا ایسی ہے۔

حکایت : حضرت کعب سے پوچھا گیا کہ آپ موت کی کیفیت بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ موت ایسے ہے جیسے کانٹا انسان کے پیٹ میں دیا جائے پھر ہر کانٹے کے ساتھ ایک ایک کر کے آنتوں کو اس طرح نکالا جائے کہ انہیں سختی سے ایک بڑے زور والا آدمی کھینچے۔ اب خود اندازہ لگائیے کہ انسان کی اس وقت حالت کیا ہو گی۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر میت کا درد صرف بال برابر اھل السمٰوٰت والارض پر رکھا جائے تو اس کی سختی سے سب مر جائیں۔ قیامت میں ستر قسم کے درد ہوں گے۔ ان میں سب سے معمولی کی یہ کیفیت ہے کہ سکرات موت کے درد سے ستر گناہ زیادہ ہوں گے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

تم فرمادو جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اس (جبریل) نے تو تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾ مَن

یہ قرآن اتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا اور ہدایت و بشارت مسلمانوں کو

كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ

جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کو تو اللہ دشمن ہے

عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ﴿٩٨﴾ وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا

کافروں کو اور بیشک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اتاریں اور ان کے منکر نہ ہوں گے مگر

الْفَاسِقُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم ۚ بَلْ

فاسق لوگ اور کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں ان کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے بلکہ

أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ

ان میں بہتیروں کو ایمان نہیں اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ان کی کتابوں کی

لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ

تصدیق فرماتا تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب اپنے پیٹھ پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم

ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ

ہی نہیں رکھتے اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے

عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا

سلطنت سلیمان کے زمانہ میں اور سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں شیطان کافر ہوئے

يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ

لوگوں کو جادو سکھاتے اور وہ (جادو) جو بابل میں دو فرشتوں

هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۖ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُولَآ إِنَّمَا نَحْنُ

ہاروت وماروت پر اترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری

فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۖ

آزمائش ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ

اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا

وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ

نفع نہ دے گا اور بیشک ضرور انہیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا اور آخرت میں اسکا کچھ حصہ نہیں

خَلَاقٍ ۖ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ أَنْفُسَهُمْ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۲﴾

اور بیشک کیا بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح انہیں علم ہوتا

وَلَوْ أَنَّهُمْ اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۖ لَوْ كَانُوا

اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے کسی طرح

يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۳﴾

انہیں علم ہوتا۔

تفسیر عالمانہ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ شانِ نزول: جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ابن صوریا یہودی نے (جو فدک میں رہتا تھا) حاضر ہو کر عرض کی:

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی نیند کیسی ہے کیونکہ ہمیں علم دیا گیا ہے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نیندیوں ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری آنکھیں نیند کرتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے''
اس نے کہا: ''صَدَقْتَ'' پھر پوچھا: ''فرمایئے بچہ باپ سے ہوتا ہے یا ماں سے'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہڈیاں، عصب، عروق باپ سے ہوتے ہیں اور خون، گوشت، ناخن، بال ماں سے ہوتے ہیں''
اس نے کہا: ''صَدَقْتَ'' پھر پوچھا: کیا وجہ ہے کہ بچہ کبھی اپنے چچاؤں کے مشابہ ہوتا ہے جس میں اخوال (ماموں) کی کوئی علامت بھی اس میں نہیں ہوتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ماموں کی مشابہت تو ہوتی ہے لیکن چچا صاحبان کی کوئی ایک علامت بھی نہیں ہوتی'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کا پانی غالب ہوگیا اسی سے مشابہت ہوگی'' اس نے کہا: ''صَدَقْتَ'' اور اس طعام کے متعلق پوچھا جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لیے حرام قرار دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام سخت بیمار ہوئے تو آپ نے منت مانی کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ شفا دے تو میں اپنے لیے اپنا محبوب ترین طعام (اونٹ کا گوشت) اور محبوب ترین مشروب (اونٹنی کا دودھ) حرام قرار دوں گا۔ اس نے کہا: ''صَدَقْتَ یَامُحَمَّد'' پھر پوچھا کہ بہشت میں سب سے پہلے کون کونسا طعام ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مچھلی'' اس نے کہا: ''صَدَقْتَ'' اس نے کہا: ''باقی صرف ایک سوال رہ گیا ہے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا صحیح جواب دے دیا تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا اور آپ کی فرمانبرداری بھی کروں گا۔ وہ یہ کہ آپ کے پاس کونسا فرشتہ آتا ہے جو کہ عرض کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جبریل علیہ السلام ہیں'' اس نے کہا: وہ تو ہمارا دشمن ہے کیونکہ عذاب کا فرشتہ ہے جو قتال وعذاب اور کشتیوں کے ٹوٹنے اور تکالیف کے احکام نازل کرتا ہے ہمارے احکام لانے والا فرشتہ تو حضرت میکائیل علیہ السلام ہے کیونکہ وہ رحمت کا فرشتہ ہے جو برسات اور خوشخبریاں اور فراخی رزق کے احکام نازل فرماتا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کب سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تمہارے ساتھ عداوت شروع ہوئی۔
اس نے کہا: اس نے تو کئی بار ہمارے ساتھ دشمنی کی اور ہم سے سخت عداوت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم سنایا کہ بیت المقدس ایک مرد کے زمانہ میں خراب ہوگا جس کا نام بخت نصر ہے۔

پھر جب اس کی خرابی کا وقت آیا تب بھی ہمیں بتایا جب اس نے خرابی کی خبر دی تو ہم نے اپنے بنی اسرائیل میں سے ایک بہادر آدمی اس کی طلب میں بھیجا تو وہ اس کی طلب میں بابل پہنچا تو وہاں ایک لڑکا پایا جو نہایت کمزور تھا اس نے اسے پکڑ کر مارنے کا ارادہ کیا تو اسے جبریل علیہ السلام نے روکا اور کہا اگر اس کریم نے اسی کو تمہاری ہلاکت کے لئے مسلط کیا ہے تو تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر بلا وجہ کیوں مارتے ہو۔ تو ہمارے فرستادہ اس بات کو مان کر واپس آئے اور بخت نصر جوان ہوا اور بادشاہ بن کر ہمارے ساتھ لڑا اور بیت المقدس کو خراب کر ڈالا اور ہمارا قتال کیا۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نبوت کے لئے حکم فرمایا کہ بنی اسرائیل کو دے تو اس نے ہماری بجائے کسی اور دیدی۔ اس وجہ سے ہم اسے دشمن سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں میکائیل علیہ السلام بھی اس کے دشمن ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے تم کہتے ہو ایسے نہیں ہے وہ تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ تم حمیر سے زیادہ کافر اور ایک اگر دوسرے کا دشمن ہے تو وہ ضرور اس کا دشمن ہوگا اور جوان دونوں کا دشمن ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں: مَنْ كَانَ الخ میں مَنْ کا جواب محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی: ای من عادیٰ جبریل من اھل الکتاب الخ یعنی جو اہل کتاب یہود میں سے حضرت جبریل علیہ السلام کا دشمن ہے تو اس کی دشمنی کی کوئی وجہ نہیں کہ بلکہ اس کی محبت واجب ہے۔

فَاِنَّهٗ پس جبریل علیہ السلام نے قرآن کو نازل کیا۔ قرآن کو مضمر کر کے بیان کیا اس کی کمال شہرت کی وجہ سے عَلٰى قَلْبِكَ تمہارے دل پر۔ تنزیل کی زیادہ تقریر اور محل وحی کا بیان ہے کیونکہ وہ وحی کا سب سے پہلے قبول کرنے والا ہے اور حفظ و فہم کا مرکز ہے۔ یعنی اس نے آپ کو یاد کر کے سنایا اور سمجھایا کہ کلام کا حق یہ ہے کہ عَلٰى قَلْبِكَ کے بجائے عَلٰى قَلْبِىْ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکایتِ کلام واقع ہوا تو وہ جس طرح کلام کرے گا ویسے ہی بیان ہوگا کیونکہ نقل میں عبارت کا بعینہٖ آنا مضمون میں زیادتی کا موجب ہوتا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ كَمَا تَكَلَّمْتُ الخ۔ یعنی آپ وہ بیان فرمایئے جو میں نے فرمایا ہے کہ اس نے آپ کے قلب انور پر اتارا۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے امر و تیسیر سے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ جو کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے نازل ہوئیں ان کے موافق ہے۔ توحید اور بعض شرائع کے بیان میں یہ نَزَّلَهٗ کی ضمیر مفعول

سے حال ہے۔ وَهُدًى دین حق کی طرف ہادی ہے۔ وَبُشْرٰى اور جنت کی خوشخبری دینے والا ہے۔ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اہل ایمان کے لئے۔ اس بنا پر اس کی دشمنی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ اگر انصاف کریں تو اسے محبوب سمجھیں بلکہ اس انزال کتب سے (جو ان کے لئے نفع بخش اور ان کے نازل شدہ احکام کا مصحح ہے) کا شکریہ ادا کریں بعد ازاں شرط و جزاء کی تعمیم سے تردید فرمائی کہ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ جو اللہ کے امر کا بوجہ عناد کے مخالف اور بوجہ مکابرہ کے اس کی اطاعت سے خارج ہے۔ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ ان دونوں کو علیحدہ ان کے افضل شان کے اظہار کی وجہ سے بیان فرمایا گیا گویا وہ کسی اور جنس سے ہیں۔ جو دوسرے ملائکہ سے افضل ہیں کبھی تغایر فی الاوصاف تغایر فی الجنس کا سبب بن جاتا ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے۔

ف: حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ جبر و میک و اسراف سریانی لغت میں بمعنی عبد ہیں اور ایل اور آئیل اللہ تعالیٰ کو کہتے ہیں۔ اب معنیٰ ہوا: عبد اللہ یا عبد الرحمٰن۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ شرط کا جواب ہے اور فَاِنَّهٗ نہیں فرمایا تا کہ اس ضمیر کے متعلق وہم نہ ہو کہ اس کا مرجع جبریل و مکائیل ہیں۔ لِلْكٰفِرِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان کا دشمن ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ جو ان کو دشمن رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دشمن رکھتا ہے انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن صوریا نے کہا: آپ کونسی چیز لائے ہیں کہ جس سے ہم اسے پہچانیں؟ اور آپ کے پاس کونسی دلیل ہے کہ جس پر ہم آپ کی فرمانبرداری کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ واضح دلیلیں جو معانی اور اس بات پر دلالت کرنے والی ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اور ان آیات کے ساتھ جو حلال و حرام کو واضح کرنے والی اور حدود و احکام کی تفصیل کرنے والی ہیں ان کے کفر سے نہیں کرتا اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ مگر معردین الکفر اور خارجین عن الحدود۔ کیونکہ جو شخص اہل کتاب کی طرف ہو۔ حضرت حسن فرماتے ہیں ہ جب فسق معاصی کے کسی نوع میں استعمال ہو تو اس کے بڑے نوع کفر وغیرہ پر واقع ہوا کرتا ہے۔

ف: قرآن پاک ایک نور الٰہی ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تاریکیوں کو دور فرمایا۔ یہود اسے بجھانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے۔ اس میں انہیں سوائے رسوائی اور شرمساری کے کچھ حاصل نہیں

ہوتا۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے لوگ اندھیری رات میں حمام میں داخل ہوں اور اس میں اچھے بھی ہوں اور برے بھی۔اس کے بعد کوئی شخص روشن چراغ لے آئے تو اس کے بجھانے کے لئے سوائے اہلِ عیوب کے کوئی عجلت نہیں کرے گا اس خطرہ پر کہ ان کے عیوب ظاہر نہ ہوں اور نہ اسے خرابی کا نشانہ بننا پڑے۔

شمع درخشندہ دراں جمع نخواہند کہ تا — عیب شاں در شب تاریک بماند مستور

وائے آں وقتیکہ روشن شود ایں راز چو روز — پردہ بر خود ایں باید بظہور

ترجمہ: ا۔روشن شمع میں نہیں آئیں گے اس لیے کہ ان کے عیوب اندھیری رات میں پوشیدہ رہتے ہیں۔

۲۔افسوس اس وقت ہوگا جب یہ پوشیدہ رازوں کی روشنی کی طرح روشن ہوگا پردہ اٹھے گا تو یہ ظاہر ہو جائے گا۔

اَوَ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور باقتضائے کلام مقدر فعل پر عطف ہے۔یعنی اکفروا بالآیات البینات (کیا کفر کرتے ہیں ان آیات بینات کے ساتھ جو نہایت واضح ہیں) كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا یہ مفعول مطلق ہے۔فعل عٰهَدُوْا کی تاکید کے لئے واقع ہوا ہے۔ نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ انہوں نے عہد کو توڑ ڈالا۔

ف: فریق طائفہ کو کہتے ہیں جو قلیل وکثیر کو شامل ہوتا ہے۔ نَبَذَ کا اسناد بعض کی طرف اس لیے ہے کہ ان میں بعض نے عہد نہیں توڑا تھا۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ بلکہ ان کے اکثر تورات پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ دین میں سے کوئی شئے نہیں اس لیے عہد کے توڑنے کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس کی پرواہ کرتے ہیں اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو وہم کرتے ہیں کہ عہد توڑنے والے تھوڑے تھے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ جب ان کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ کی طرف سے۔ جَآءَ کے متعلق ہے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ان کی کتاب تورات کی تصدیق فرماتے ہیں۔ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتاب کو پھینک مارا۔ کتاب سے مراد تورات ہے۔ كِتٰبَ اللّٰهِ، نَبَذَ کا مفعول ہے یعنی وہ شئے جو ان کو عطا ہوئی ہے۔یعنی تورات۔ کیونکہ جب انہوں نے رسول علیہ السلام سے کفر کیا جو ان کی تورات کا مصدق ہے تو گویا انہوں نے تورات کو چھوڑا۔ باوجودیکہ اس میں موجود تھا کہ سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور وہ یہ بھی

جانتے تھے کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تشریف لائے ہیں وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ عناد کی وجہ سے تورات کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور انہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کے تارک اور روگردان کی مثال اس کے ساتھ دی جو کسی چیز کو اس کی لاپرواہی کی وجہ سے اور اس سے روگردانی کرتے ہوئے پس پشت ڈال دیا جائے۔

كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ جملہ حالیہ ہے یعنی اسے پسِ پشت ڈالا ان کا یہ حال تھا کہ انہیں اس کے ساتھ مشابہت تھی جو نہ جانتا ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

ف: یہود کے چار گروہ تھے:

۱۔ تورات پر ایمان والے اور اس کے حقوق پر پابندی کرنے والے جیسے مومنین اہل کتاب، وہ بہت تھوڑے تھے جس کا اشارہ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ میں ہوا۔

۲۔ کھلم کھلا عہد کو توڑ کر متمرد اور فاسق ہوئے نَبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ سے یہی گروہ مراد ہے۔

۳۔ کھلم کھلا عہد کو توڑا لیکن بوجہ جہالت یہی اکثر و بیشتر تھے۔

۴۔ تورات پر بظاہر تو عمل کیا لیکن خفیہ طور پر عہد توڑتے رہے۔ اپنے کو متجاہل کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص جاہلوں جیسا عمل کرے اور باوجود جاننے کے عمداً خلاف کرے تو اسے بھی جاہلوں میں سے سمجھا جاتا ہے یہی اور جاہل رتبہ میں برابر ہیں۔ جیسے جاہل سے نیکی کا ظہور مشکل ہے اسی طرح عالم بے عمل سے بھی خیر کی امید نہیں کرنی چاہیے۔

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ زبانی واعظ کا کلام ضائع ہے اور قلبی واعظ کا تیر چلنے والا ہے۔ پہلے مراد عالم بے عمل ہے اور دوسرے سے مراد عالم باعمل ہے کہ جس کا کلام دل پر اثر کرتا ہے اور اس کی بات حکمت و عبرت و فکر انگیز ہوتی ہے۔ عاقل کے لئے ضروری ہے کہ ذوالجلال کی گرفت کے خوف سے فرمانبرداری کی طرف جلدی کرے۔

ف: ندامت چار قسم ہے۔

۱۔ ندامت یومی، یعنی وہ شخص جو گھر سے بغیر کھائے پیے نکلے۔

۲۔ ندامت سال بھر، یعنی وہ شخص جو موقع پر کھیتی نہ کر سکے۔

۳۔ندامت عمر بھر، یعنی وہ شخص جو اپنی غیر مواقع عورت سے بیاہ کرے۔

۴۔ندامت ابدی، یعنی وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے فرمان پر نہ چلے۔

ف: تریاق ظاہر کا کتاب سے مطالعہ کرنا باطل کی زہر کو دور نہیں کرتا، بلکہ اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص بیمار ہوا اور طب کی کتابوں کو صرف لکھتا رہے تو بیکار ہے جب تک علاج نہ کرے گا ادویہ کا محض دیکھنا کسی کام کا نہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔یعنی اس کے اوامر پر عمل فرماتے اور اس کے نواہی سے بچتے۔

ف: علوم ظاہری پر عمل کرنا ناممکن ہے جب تک چار مراتب حاصل نہ ہوں۔مثلاً علم ظاہری سے یہ جانے کہ زانی کا حکم رجم وجلا وطنی ہے۔لیکن بایں معنیٰ کہ جو انسان کے اندر ایک ایسی فطرت بھی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جماع، زنا میں مشغول ہو دانا لوگ سرے سے اس بری خصلت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اسی طرح کھانے پینے کے متعلق سمجھے کہ انسان میں کھانے پینے کا بھی ایک محل ہے سمجھدار آدمی اس پر محل پر قابو پاتا ہے جس سے اسے خواہشات پریشان نہیں کرتیں۔انسان کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو اور ماہر فی الفنون ہو۔سب کچھ ہو لیکن جب تک اپنے علم پر عمل نہ کرے اس سے اس کا جہل بہتر ہے۔کسی نے کیا خوب کہا ہے:

حَفِظْتُ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءَ

(تو نے ایک شئے کو تو قابو کر لیا لیکن بہت سی تجھ سے نکل گئیں)

حکایت: نصیر الدین طوسی ولی اللہ کی خدمت میں زیارت کے لئے حاضر ہوا ان کی خدمت میں عرض کیا گیا: یہ بہت بڑے عالم ہیں جن کا نام نصیر الدین طوسی ہے۔ولی اللہ نے پوچھا: ان کا کیا کمال ہے؟ لوگوں نے کہا: نجوم میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ولی اللہ نے فرمایا: سفید گدھا اس سے زیادہ عالم ہے۔طوسی سن کر لوٹ آیا۔ان کی مجلس میں بیٹھنا بھی گوارہ نہ کیا۔آئندہ شب آٹے کی چکی کے دروازے پر شب باشی کا اتفاق ہوا آٹا پیسنے والے نے کہا: مولانا گھر کے اندر تشریف لائیے اگر آپ نے دروازہ بند نہ کیا تو آپ کو برسات گھیر لے گی۔ مولانا نے اس سے پوچھا: بھائی! تجھے کیسے معلوم ہوا ہے؟ اس نے کہا: میرا ایک سفید گدھا ہے جب وہ اپنی دم آسمان کی طرف تین بار ہلاتا ہے تو بارش نہیں ہوتی اور جب زمین کی طرف ہلاتا ہے تو بارش ہو جاتی ہے۔جب

طوسی نے سنا تو اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے ولی اللہ کی تصدیق کی اور ان کے متعلق رنج وغصہ زائل ہو گیا۔

حکایت: ایک ولی اللہ نے ابنِ سینا سے فرمایا: تو نے اپنی عمر علومِ عقلیہ میں ضائع کردی بتایئے تو اس وقت تک کس مرتبہ کو پہنچا ہے؟ اس نے کہا: ہاں مجھے ایک گھڑی معلوم ہوئی ہے جس میں لوہا مٹی ہو جاتا ہے۔ ولی اللہ نے فرمایا: اس گھڑی کے متعلق مجھے بتایئے۔ جب وہ وقت آیا تو خبر دیتے ہوئے لوہے میں انگلی دبا دی۔ انگلی اس کے اندر دھنس گئی۔ وہ گھڑی گزرنے کے بعد ولی اللہ نے فرمایا: اب بھی انگلی لوہے کے اندر دبائی جاسکتی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، کیونکہ وہ اس گھڑی کی خصوصیات سے ہے اب تو کوئی امکان نہیں۔ ولی اللہ نے لوہا پکڑا اور اپنی انگلی اس میں دبا دی۔

سبق: عاقل کے لئے ضروری ہے کہ اپنی عمر مٹنے والی اشیاء میں ضائع نہ کرے۔ جیسا کہ ابن سینا نے طریقِ وصول میں استقلال العقل کا دعویٰ کیا تو وہ نار کا مستحق بنا۔

اسی طرح یہود (اللہ ان کو رسوا کرے) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے روگردانی کی اور استقلال کا دعویٰ کیا جس کی وجہ سے نقصان وخسارا میں پڑے اور جہل وکفر کی ظلمت میں رہے۔ مثنوی شریف میں ہے:۔

اے کہ اندر چشمہ شواست جات تو چہ دانی شط جیحون وفرات
وائے آنکہ زندہ کہ بامرہ نشست مردہ گشت وزندگی ازوے برست

ترجمہ: اے فلاں! چشمہ شور میں تیری جگہ ہے تو کیا جانے کہ شط جیحون وفرات کیا ہیں۔
۲۔ اس زندہ پر افسوس کہ مردہ کی صحبت میں بیٹھ کر مردہ ہو گیا اور اس سے زندگی چلی گئی۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ یہود نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالا اور جادوگروں کی کتابوں کی فرمانبرداری کی جنہیں شیاطین پڑھتے اور عمل کرتے۔ شیٰطین سے مراد سرکش جن ہیں۔ تَتْلُوا ماضی حال کی حکایت ہے اور اتباع سے مراد تحمل وتحمص اور اس کی طرف اچھی طرح متوجہ ہونا مراد ہے۔ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ ان کے ملک کے زمانہ میں، یہاں پر مضاف محذوف ہے اور عَلٰی بمعنیٰ فِی ہے۔

حضرت سُدی فرماتے ہیں کہ شیاطین آسمان کی طرف چڑھ جاتے تھے تو ملائکہ کی وہ باتیں سن لیتے جو زمین پر موت وغیرہ سے متعلق واقعات ہونے والے ہوتے۔ پھر جادوگروں کے پاس آکر سنی ہوئی ایک ایک بات کے ساتھ ستر جھوٹ ملا لیتے اور خبر دیتے۔ ان باتوں کو لوگ لکھ لیتے۔ بنی اسرائیل میں مشہور ہوگیا کہ جنات غیب جانتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں کے ذریعہ وہ کتابیں جمع فرمائیں اور ایک صندوق میں بند کر کے کرسی کے نیچے دفن کر دیں اور فرمایا: میں آئندہ کسی سے یہ نہ سننے پاؤں کہ جنات غیب جانتے ہیں۔ جو یہ کہے گا اس کی گردن مار دوں گا۔ پھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہوگیا اور دیگر متعدد علماء بھی خدا کو پیارے ہوگئے جو سلیمان علیہ السلام کے فرمان اور کتابوں کے دفن کے مقام کو جانتے تھے۔ صرف نااہل لوگ باقی رہ گئے تو شیطان بصورتِ انسان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ کیا میں تمہیں ایسے خزانے کی نشان دہی نہ کروں جو تم ہمیشہ کھاتے رہو تب بھی ختم نہ ہو؟ انہوں نے کہا: ضرور، ہمیں اور کیا چاہیے۔ اس نے کہا: کرسی کے نیچے سے کھودو۔ وہ خود بھی ساتھ تھا انہیں وہ جگہ دکھا دی اور خود دور کھڑا رہا۔ انہوں نے کہا: آپ بھی ہمارے قریب آجایئے۔ اس نے کہا: نہیں، میں یہیں ٹھہرتا ہوں اور تم گڑھا کھودو اگر وہ خزانہ نہ ملے تو بیشک میرا سرتن سے جدا کر دینا۔ اس کے خود قریب نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی شیطان اس کرسی کے قریب ہوتا تو جل جاتا۔ چنانچہ اس کے حکم کے مطابق گڑھا کھودا گیا اور اس میں وہ کتابیں نکال لی گئیں۔ شیطان نے کہا: سلیمان علیہ السلام جن وانس وشیطان وپرندوں کو انہی کتابوں کے ذریعے قابو کر لیتے تھے۔ بعد ازاں یہ بات کہہ کر شیطان اڑ گیا اور لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے۔

بنی اسرائیل نے یہ کتابیں لے لیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہود میں اکثر جادو پایا جاتا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت فرمائی: اِتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ۔

وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ سلیمان علیہ السلام سحر کے علم سے کافر نہیں تھے یعنی وہ ساحر نہیں تھے۔ ساحر کافر ہوتا ہے۔ جادو کو تاکیداً کفر کرنے کی وجہ یہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت پاکیزہ انسان تھے انہیں کفر سے کیا واسطہ!

یہ سب کذب بیانی یہود کی ہے۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا لیکن شیاطین جادو کے استعمال اور اس کی تعلیم وتدوین کی وجہ سے کافر ہوئے۔ يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ انہوں نے کفر کیا اس لحاظ سے یہ وہ لوگوں کو اغواء وضلالت کے لئے سکھاتے تھے۔ مروی ہے کہ سحر شیطان کا استخراج ہے اس لیے کہ شیطان کا جوہر لطیف ہے اور فہم وذکاء دقیق دمًا اور سکھاتے تھے لوگوں کو وہ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ دو فرشتوں پر نازل کیا گیا۔ یعنی جو انہیں الہام سے معلوم ہوا۔ یعنی علم سحر۔ وہ دونوں لوگوں کے امتحان کے لئے اتر کر جادو سکھانے آئے جو بھی اسے سیکھتا اور عمل کرتا تو وہ کافر ہوجاتا اور جو اس کو سیکھ کر کنارہ کش ہوتا یا سیکھ تو لیتا اور اس پر عمل پیرا نہ ہوتا اور اس سے بچتا تو وہ مومن ہوتا۔

عَرَفْتُ الشَّرَّ لَا لِلشَّرِّ وَلٰكِنْ لِلتَّوَقِّيَةِ

(میں شر کو شر کی خاطر نہیں بلکہ بچاؤ کی خاطر سیکھتا ہوں)

مسئلہ: اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کاہن کے پاس آئے صرف بطور امتحان اس سے سوال کرے تاکہ اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے صدق وکذب کی تہ تک پہنچے تو یہ جائز ہے۔

ف: امام فخر الدین فرماتے ہیں کہ ان کے نازل کرنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ جادوگر شیطان سے باتیں چرا لیتے پھر جو کچھ سنتے اس میں خلط ملط کر کے لوگوں کو سناتے۔ یہ وحی نازل علی الانبیاء پر اشتباہ کا سبب بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو فرشتوں کو نازل کیا تاکہ لوگوں کو جادو کی کیفیات سکھائیں تاکہ انہیں جادو اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں فرق معلوم ہو۔

بِبَابِلَ باء بمعنی فِی ہے۔ اُنْزِلَ کے ساتھ یا محذوف سے متعلق ہے۔ الْمَلَكَيْنِ سے حال ہے۔ اس بابل سے مراد عراق یا بابل ارض کوفہ مراد ہے۔

اس کا غیر منصرف ہونا عجمیت اور علمیت کی وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ میں قول حسن یہ ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام جودی پہاڑ سے نیچے اترے تو آپ نے ایک گاؤں تیار کرایا جس کا نام ثمانین رکھا۔ ایک دن اٹھے تو ان کی اسی بولیاں ہوگئیں۔ ان میں سے ایک لغت عربی تھی اور وہ ایک دوسرے کی بولی نہ سمجھتے تھے۔ (کذافی القرطبی) گویا یہ تَبَلْبُل" بمعنی مختلف ہونا ہے۔ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، الْمَلَكَيْنِ سے عطف بیان ہے۔ یہ ان دونوں فرشتوں کا نام ہے اور ان کا منع صرف ہونا عجمیت اور علمیت کی وجہ سے ہے ہاروت وماروت کے متعلق بہترین

توضیح ان کے متعلق جو مشہور ہے کہ (معاذ اللہ) انہوں نے شراب پی اور خونریزی کی اور زنا کیا اور ایک شخص کو قتل کیا اور بت کو بھی سجدہ کیا۔ یہ بات قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ اس کا دارومدار یہود کی روایت پر ہے۔ علاوہ ازیں دلائلِ عقلیہ ونقلیہ کے بھی خلاف ہے۔

تفسیر صوفیانہ یہ مقولہ امثال اور موز سے ہے جس میں دانا اور سمجھدار کے لئے ارشاد کی خاطر ترغیب و ترتیب کی گئی ہے اس لیے کہ اَلْمَلَكَيْنِ سے عقل نظری اور علمی مراد ہے اور زہرہ عورت سے نفسِ ناطقہ مراد ہے۔ نشاۃِ اولیٰ میں ظاہر ہے کہ یہ دونوں اس کی تعلیم کے لئے معترض ہوتے ہیں جو نشاۃِ ثانیہ میں اس کی استعداد ہے۔ لیکن وہ نفس انہیں گناہ کی طرف رغبت دلاتا ہے اپنی اصلی عادت کے مطابق جو کہ اس کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ ردی امور کی طرف جائے اور آسمان کی طرف اس کا اڑ جانا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ نفس جب ان دونوں سے کچھ سیکھ لیتا ہے تو وہ ملاءُ الاعلیٰ کی جماعت سے مل جاتا ہے کیونکہ وہ قدوسین کے اوصاف سے موصوف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض صوفیہ کرام نے فرمایا ہے۔

ہاروت وماروت کے متعلق صاحب روح البیان کا نظریہ:۔

ان مجلس کا جامع فقیر کاتب الحروف (حقی) عرض کرتا ہے کہ میں نے بڑی بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے خواہ وہ صوفیہ کرام ہوں یا اہلِ شرع، سب اس بات پر متفق ہیں کہ ہاروت وماروت کا واقعہ درست ہے۔ پھر یہ بات دور ہے کہ تمام لوگ یہود کے غلط نظریہ پر اتفاق کریں۔ ہاں میرا نظریہ اس میں یہ ہے کہ ان سے عصیان کا وقوع ممکن ہے۔ اگرچہ بالتکلف ان کی فطرت میں طاعت ہے۔ جیسے انسان کی فطرۃ عصیان ہے لیکن اس سے نیکی بالتکلف ہوتی ہے دلیل اس کی یہی آیات ذیل ہیں جنہیں جمہور نے بیان کیا ہے۔

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (وہ رات دن اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ اس سے تھکتے نہیں)

اور فرمایا: وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (اور وہی عمل کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ہوا ہے) دیکھئے ان سے گناہ کا سرزد ہونا ممکن نہ ہوتا تو ان کی مدح کیوں ہوتی۔ مدح تو اس فعل پر ہوتی ہے جس کا کرنا ممتنع نہ ہو۔ (کذا فی التیسیر)

شانِ نزول:۔ قطع نظر اس کے شانِ نزول سے بھی یونہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ادریس علیہ السلام کے زمانے میں جب ملائکہ کرام نے بنی آدم پر عار کا اظہار کیا کہ یہ لوگ گناہ زیادہ کرتے ہیں اور نیکی کم۔ پھر ان

کے درجات بھی جلد بلند ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم ان کی جگہ ہوتے اور تمہارے اندر بھی ان کی طرح شہوات ہوتے تو تم سے بھی گناہ سرزد ہوتے۔ فرشتوں نے کہا: نہیں یا رب! ہرگز نہیں ہم سے ایسا ہونا غیر متوقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے سے اپنی پسند کے دو فرشتے لو جنہیں میں زمین پر بھیج دوں۔ انہوں نے ہاروت و ماروت کو چنا۔ یہ دونوں تمام فرشتوں سے زیادہ نیک اور عبادت گزار تھے۔ ان دونوں کو بشری خواہش دے کر زمین پر اتارا گیا پھر اس نے وہی کچھ سرزد ہوا جو ان کے بارے میں مشہور ہے اور یہ کوئی بعید بھی نہیں۔ ویسے فرشتوں کا زمین پر اترنا گناہ کے لئے نہیں جب تک ان میں بشری تقاضے پیدا نہ کیے جائیں۔ ابلیس میں شہوت کا مادہ رکھا گیا ہے اور اس کی ضروریات میں بھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ملائکہ میں شمار ہوتا ہے جیسے کہ بعض کا قول ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ شہوات اس میں اس وقت رکھی گئی جبکہ اس کا نام فرشتوں سے کاٹا گیا۔ اسی اعتبار سے جائز ہے کہ ہاروت اور ماروت میں زمین پر اتارتے وقت شہوت رکھی گئی ہوتا کہ ان میں ترکیب بشریت کا مادہ پایا جائے اور ان کا امتحان لیا جا سکے۔

ف: آکام المرجان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان، فرشتہ اور جن میں فرق رکھا ہے صورت میں بھی اور شکل میں بھی۔ یہاں تک کہ اگر فرشتے کو انسان کی صورت میں تبدیل کر دے تو ملکیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شیطان کو انسان کی صورت میں تبدیل کر دے تو وہ شیطانیت سے خارج ہو جائے گا۔

حکایت: ہاروت و ماروت سے جب غلطی سرزد ہوئی تو حضرت ادریس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ان کے متعلق سفارش کی کہ ان کے لئے تخفیف کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان سے پوچھئے کہ آخرت اور دنیا کے عذاب سے جسے چاہیں انہیں دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں دنیا کا عذاب دیا جائے کیونکہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے کم تر ہے۔ چنانچہ اب وہ بابل کے ایک کنوئیں میں لٹکے ہوئے ہیں اور ان کو ان کے بالوں سے لٹکایا گیا اور انہیں قیامت تک ایسے ہی رکھا جائے گا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کنوئیں کو آگ سے بھر دیا گیا ہے پھر اس میں ان کو لٹکایا گیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ انہیں الٹا لٹکایا گیا ہے ان کی زبان اور پانی کے درمیان چار انگل کا فاصلہ ہے اس طرح وہ پیاس کے عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں۔

ف: حضرت شیخ مشہور با فتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ وہ موم جو چربی سے تیار ہو اس کی بدبو بہت گندی ہوتی ہے ملائکہ کو اس کی بدبو سے سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ بنا بریں ہاروت و ماروت کو اس بدبو سے عذاب دیا جاتا ہے ہاں وہ موم جو شہد سے حاصل ہوتی ہے اس کی بو اچھی ہوتی ہے۔ (کذا فی واقعات الھرائی)

حدیث شریف: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا سے بچو، اللہ کی قسم وہ ہاروت و مارت سے بھی زیادہ جادو رکھتی ہے''

ف: علماء فرماتے ہیں کہ دنیا شہوت اس لیے زیادہ رکھتی ہے کہ اس سے دنیوی خواہشات بڑھتی ہیں اور ان کی رغبت زیادہ ہوتی ہے اسے جمع کرنے نہ کرنے کا یہی نتیجہ ہے کہ جو اسے جمع کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت اور اس کے دیدار سے محروم ہو جاتا ہے اور جو اسے اپنے سے دور رکھتا ہے وہ اللہ کی اطاعت اور اس کے دیدار سے سرشار ہوتا ہے۔

ف: دنیا کے سحر کا معنیٰ یہ ہے کہ دنیا کی محبت اور اس کی لذتوں میں مبتلا ہو جانا اور پھر اس کے ذریعے جھوٹی آرزوئیں سر ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اس کا دل پر قبضہ ہو جائے اس لیے حدیث شریف میں ہے:

''جب تیری کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر تو نہ اس کے عیب کو دیکھ سکتا ہے اور نہ اس کے عیب سن سکتا ہے''

ف: اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ دنیا کی محبت میں نہ حق کا راستہ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی حق کی بابت سنی جا سکتی ہے اور ہے بھی اسی طرح جب کسی کی محبت غالب ہو جاتی ہے اور عقلی دلائل بھی اس سے منع کرنے والے نہ ہوں تو وہ حق سے اندھا ہو جاتا ہے۔ کسی شئے کی محبت سے روکنے کا یہی معنیٰ ہے کہ اس کی محبت میں مستغرق نہ ہو جاؤ۔

حضرت امیر خسرو دہلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

برایں مردار چندت گاہ زاری گاہ زور چوں غلیوانی کہ شش ماہ مادہ و شش ماہ نرست

ترجمہ: اس مردار پر کتنی مدت گزارے گا کبھی اس کے لئے زاری کرتا ہے کبھی زور لگاتا ہے جیسے چیل کہ وہ چھ ماہ نر رہتی ہے اور چھ ماہ مادہ۔

سبق: اس قصہ میں اشارہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل پر بھروسا ہو اور بس اور کسی گناہ سے بچاؤ ہو تو بھی اس کی مہربانی سے ہے۔ مثنوی شریف میں ہے:

ہمچو ہاروت و ماروت شہر | از بطف خوردند زہر آلود تیر
اعتماد بود شان بر قدس خویش | چیست بر شیر اعتماد گاؤمیش
گرچہ او با شاخ صد چارکند | شاخ شاخش شیر نر پارہ کند
گر شود پر شاخ ہمچوں خارپشت | شیر خواہد گاؤ رانا چار مشت

ترجمہ: ا۔مشہور ہاروت وماروت کی طرح انہوں نے کبر سے زہر آلود تیر کھایا۔۲۔انہیں اپنے تقدس پر ناز تھا، گائے کوشیر پر اعتماد کیسا۔۳۔اگر چہ وہ اپنی سوشاخوں سے کئی سیکڑے بھی لائے تب بھی شیر اسے پاش پاش کردے گا۔۴۔بلکہ وہ سراپا سینگ بن کر بھی شیر کا مقابلہ کرے تب بھی شیر اسے دبوچ لے گا۔

تفسیر عالمانہ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ مفعول بہ ہے اور مِنْ زائدہ ہے۔وہ استغراق (جو کہ احد سے معلوم ہورہا ہے) تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔لیکن شیاطین نے کفر کیا کہ لوگوں کو وہی باتیں سکھاتے ہیں اور اکسانے کے لئے فرشتے لے آئے تاکہ لوگ سخت گمراہ ہوجائیں اور وہ فرشتے بھی لوگوں کو جادو نہ سکھاتے۔ حَتّٰی یہاں تک کہ پہلے نصیحت کرتے اور اسے عمل سے روکتے تھے۔ يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بن کر آئے ہیں جس نے ہم سے جادو سیکھ کر اس کی حقیقت کا اعتماد رکھا تو وہ کافر ہوجائے گا اور جو اس پر عمل کرنے سے بچا بلکہ اسے دھوکہ دہی سے بچنے کا ذریعہ سمجھا تو وہ ایمان پر باقی رہے گا۔

اَلْفِتْنَةُ آزمائش و امتحان کو کہتے ہیں۔مثلاً اہل عرب کہتے ہیں فَتَنْتُ الذَّهَبَ بِالنَّارِ ۔یہ اس وقت بولتے ہیں جب سونے کو پوری طرح پرکھ لیا جائے پھر کہا جاسکے کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا۔اس فتنہ سے وہ افعال مراد ہیں جو مکروہ ہیں۔جو اللہ تعالیٰ یا بندوں کی طرف سے آئیں بلاء، مصیبت، قتل، عذاب وغیرہ۔کبھی یہ فتنہ دین میں بھی ہوتا ہے۔جیسے ارتداد و معاصی، اور کسی کو معاصی پر مجبور کرنا۔

سوال: فِتْنَةٌ واحد ہے اسے تثنیہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ فرشتے دو تھے؟

جواب: فِتْنَةٌ مصدر ہے اور مصدر میں تثنیہ نہیں ہوتا۔

سوال: مصدر کسی پر محمول نہیں ہوتا؟

جواب: جب مبالغہ مقصود ہو تو جائز ہے۔ یہاں مبالغہ مقصود ہے۔

فَلَا تَكْفُرْ اس کی حقیقت کا اعتماد رکھ کر یہ کفر نہ کر۔ یہ اس لیے کہ اس کا سیکھنا گویا فتنہ کا عین ہے۔

سوال: فرشتے فتنہ نہیں تھے حالانکہ آیت میں ان کو صرف فتنہ کہا گیا ہے؟

جواب: چونکہ اس وقت ان کا یہی کام تھا اس لیے ان کو صرف فتنہ کہا گیا ہے۔ جادوگراہی نہیں اور نہ ہی اس پر عمل کرنا گمراہی ہے اگر ہے تو اس کو حق سمجھنے میں، یہ قول کفر مت کر اس کو سات بار کہتے، اور اگر وہ کہتا کہ ضرور سیکھوں گا تو اسے سکھاتے۔

فَيَتَعَلَّمُونَ جملہ منفیہ پر عطف ہے کیونکہ یہ مثبت کی قوت میں ہے۔ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ کہنے کے بعد اسے سکھاتے اور ضمیر واحد کے لئے جو معنوی اعتبار سے النَّاس کے لئے ہے یعنی لوگ سیکھتے تھے۔

مِنْهُمَا ان فرشتوں سے مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ اس کے سبب اور استعمال سے بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وہ جو زن وشوہر کے درمیان تفریق ڈالے بایں طور کہ اللہ تعالیٰ ان کے مابین تفرقہ اور نافرمانی پیدا کر دے جبکہ وہ سحر استعمال کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ مسبات کے بعد اسباب عادیہ پیدا کرتا ہے آزمائش کی خاطر، کیونکہ بظاہر وہی سحر مؤثر تھا۔

جادو سیکھنے کے بعد لوگوں کی کیفیت:۔

حضرت سُدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی جادو سیکھنے آتا تو اسے کہتے کہ ہم سے جادو مت سیکھ کیونکہ ہم فتنہ ہیں۔ اگر وہ نہ مانتا تو اس کے سامنے راکھ رکھ کر اس پر پیشاب کر دے۔ جب اس پر وہ پیشاب کرتا تو اس سے آسمان کی طرف نور چمک اٹھتا۔ وہ ایمان ومعرفت ہوتا اور ایک سیاہ چیز دھوئیں کی طرح آسمان سے نازل ہوتی جو اس کے کانوں میں داخل ہو جاتی وہ کفر اور غضب الٰہی ہوتا۔ جب وہ فرشتے اسے خبر دیتے تو وہی بات ہوتی جو مرد وعورت کے مابین جدائی ڈالنے والی تھی ویسے وہ اس سے مزید بھی جانتے تھے چونکہ وہ لوگ زیادہ تر یہی سوال کرتے تھے اس لیے وہ بھی یہی سکھاتے۔

بعض کہتے ہیں کہ جادو کے ذریعے مرد پر گرفت یوں ہوتی کہ وہ اپنی عورت سے جماع پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔

جادو کی علامت:۔ نصاب الاحتساب میں ہے کہ جو شخص دیکھے کہ میں اپنی اہلیہ سے جماع پر قادر نہیں ہوں لیکن غیر سے یہ قدرت حاصل ہے تو سمجھ لے کہ اس پر جادو کیا گیا ہے۔

جادو دفع کرنے کا طریقہ:۔ سرکنڈے (کانے) جمع کر کے یعنی ایک گٹھڑی بنا کر اس کے درمیان کلہاڑا رکھ کر آگ سلگا دو۔ جب کلہاڑا گرم ہو جائے تو اسے نکال کر اس پر پیشاب کر دو، اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ اور نہیں وہ جادوگر نقصان پہنچانے والے جو کچھ کہ وہ عمل کریں یا لوگوں کو سکھائیں۔

مِنْ اَحَدٍ کسی ایک کو اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر استثناء مفرغ ہے۔ اور باء کا متعلق محذوف ہے۔ اور ضارین کی ضمیر سے حال ہے یا اس کے مفعول سے، اگرچہ نکرہ ہے لیکن اسے نفی پر اعتماد ہے اسی لیے: والحال بننے کے لائق ہے۔ یا بِهٖ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ یعنی وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے اور فحشاء کا امر نہیں فرماتا اس لحاظ سے جادو قضاء ساتھ نہ ہو اس کے امر سے کیونکہ اللہ تعالیٰ کفر اور کسی کو نقصان پہنچانے اور فحشاء کا امر نہیں فرماتا۔ اس لحاظ سے جادو کا کام ساحرت کا ہے لیکن اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جب جادوگر جادو کا عمل کرتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اسے پیدا فرماتا ہے۔ یہ صرف بندوں کی آزمائش کی خاطر پیدا کرتا ہے۔ گویا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں کہ سحر سے دلوں میں محبت و بغض اور شرور وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ بندہ کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے بڑے بڑے دکھوں اور بیماریوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے اس کا انکار ہٹ دھرمی ہے۔

سحر کی تحقیق:۔ جادو ایک ایسا امر ہے جو خارق للعادۃ ہے۔ لیکن ایسے نفس سے جو شرارت کا مجسمہ ہو اور وہ مخصوص اعمال کو عمل میں لا کر اس میں تعلیم و تعلم کو بھی دخل ہے ان دو باتوں سے معجزہ و کرامت اور سحر میں فرق ہو گیا۔ خارج میں اس کے ثبوت میں اختلاف ہے۔ علمائے اہل حق اس کے خارج کے وجود کے قائل ہیں اور معتزلہ منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خارج میں سحر کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ ایسا کوئی ثبوت ہے بلکہ وہ ایک شعبدہ بازی اور خیالی بات ہے اور وہ صرف ایسے ہوتا ہے کہ آنکھوں میں ایسی باتیں دکھائی جاتی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ مثلاً رسیوں کا سانپ بن جانا اور وہ دفعۃً معلوم کر لینے کی بات ہے جس کا سبب صرف ہاتھ کی چالاکی اور اپنے حیلوں کو دیکھنے والوں سے پوشیدہ رکھنا ہے اور بس۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى

(اب کے خیال میں تھا کہ یہ رسیاں سانپ ہیں جو بھاگتے ہوئے نظر آئے)

معتزلہ کی تردید:۔ اہل حق معتزلہ کی تردید میں فرماتے ہیں کہ جادو کے خارج میں موجود ہونے کی دو دلیلیں ہیں:۱۔ جادو فی نفسہٖ ممکن الوقوع ہے جس میں قدرتِ ایزدی کو دخل ہے کیونکہ جادوگر تو صرف سبب ہے۔ خالق تو اس کا پروردگار ہے۔۲۔ آیہ مذکورہ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ اس کا مؤثر حقیقی میں ہوں فلہٰذا یہ محض خیالی بات نہیں بلکہ فی الواقع امر ہے۔

فائدہ عجیبہ:۔ شعبدہ بازی یا ایسے امور ظاہر کرنا جن میں ہاتھ کی چالاکی کو دخل ہو، یا ادویہ کے ذریعے عجیب و غریب امور ظاہر کرنا، یا ہندسہ کے آلات کے سبب سے یا کسی پتھر کے خواص سے کوئی بات دکھائی جائے یہ معاملہ اور ہے جسے جادو سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ مجاز ہے۔ حقیقی جادو اور ہے۔ یہ باتیں دراصل ایسی ہیں کہ جن کا ماخذ دقیق اور سبب لطیف ہے جو ہر ایک نہیں جان سکتا۔ بعض لحاظ سے جادو حلال بھی ہوتا ہے۔

جادوگروں کے اقسام:۔ عام طور پر جادو عورتوں سے زیادہ ہوتا ہے خصوصاً حالتِ حیض میں اور یہ ہوتا ہی ان ارواحِ خبیثہ میں ہے جن کی طبائع خرابیوں اور فساد کی طرف راغب ہوں۔ اس کے لئے کسی قسم کی ریاضت بھی نہیں ہوتی۔ اس قسم کی عادت عورتوں، بچوں اور مخنثوں میں ہوتی ہے۔ جب کسی انسان کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے تو وہ ایسی باتوں کی طرف میلان رکھتا ہے جو نقصان دہ ہوں اور انہی سے اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔ بہت بار دیکھا گیا ہے کہ وہ ایسی باتوں کا عاشق ہوتا ہے، اس سے وہ اپنی عقل، دین، شکل و صورت جسم و جان اور مال کو برباد کر ڈالتا ہے۔ شیطان کی خباثت مشہور ہے جب دیکھتا ہے کہ کسی میں اس قسم کی خرابی ہو گئی ہے تو اس کا حامی ہو جاتا ہے اور وہ امور کی طبیعت میں گھس جاتے ہیں جیسے راشی کو رشوت کی عادت ہوتی ہے پھر ان کے ذریعے اپنے مقاصد پورے کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کو مال دے کر کہا جائے کہ فلاں کو جا کر قتل کر دو یا برائی پر اعانت کی نیت سے مال دیا جائے۔ اس وجہ سے جادوگر اور ایسے بدمعاش لوگ آیاتِ کلام الٰہی کو نجاسات اور خون سے لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی دوسرے غلیظ طریقے استعمال کرتے ہیں اور دھونیاں وغیرہ بھی دیتے ہیں۔ نماز و روزے کے قریب نہیں جاتے، ناجائز طریقے سے ناحق قتل کرا دیتے ہیں۔ ذی محرم عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک کو نجاست میں پھینکنے سے گریز نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے برے اعمال کا

وہ ارتکاب کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ جب وہ کوئی برا عمل کرتے ہیں تو شیطان ان کی مدد کرتا ہے۔ بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ وہ پانی پر تیرتے ہیں، ہوا میں اڑتے ہیں، دور دور کے مقامات پر پہنچ جاتے ہیں۔ لوگوں کے مال جمع کر کے لا دیتے ہیں، بعض کے دشمنوں کو مروا دیتے ہیں، بعض کو بیمار کر ڈالتے ہیں، بسا اوقات جادوگر عرفات میں حاجیوں کے سامنے نظر آتا ہے کہ تا کہ لوگوں کو نیک گمان ہو کہ فلاں صاحب بڑے بزرگ ہیں۔ حالانکہ وہ شیطان جادوگر کی صورت میں متصور ہو کر جاتا ہے۔ بظاہر وہ لوگوں کو کرامات محسوس ہوتی ہیں لیکن ہوتا وہ شیطان کی مکاری کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادات واجبات سے ہیں یا مستحبات، لیکن یہ جادوگری کے اعمال نہ واجبات سے ہیں نہ مستحبات سے بلکہ ان افعال سے تو منع کیا گیا ہے اور انہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے حرام اعتقادات سے بچائے۔

جادوگروں کی رہائشی علامتیں:۔ گمراہ لوگوں کی عبادات بھی عجیب وغریب ہوتی ہیں ان کے تمام امور غیر مشروع ہوتے ہیں۔ پھر ان سے کبھی کبھار مکاشفات کا ظہور بھی ہوتا ہے اور عجیب تاثیریں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ ایسے مقامات پر بسر کرتے ہیں جو شیاطین کے مسکن ہیں۔ مثلاً: ۱۔ جہاں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ ۲۔ حمام۔ ۳۔ کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہیں۔ ۴۔ اونٹوں وغیرہ کے بیٹھنے کے مقامات۔ ۵۔ نجاست آلود مقامات۔

ایسے مقامات پر شیطان ان سے ملتا اور انہیں اپنی باتیں بتاتا ہے جیسے وہ بتوں کے اندر گھس کر کفار کو عجیب وغریب باتیں بتاتا تھا۔

مسئلہ: علماء فرماتے ہیں کہ جادو کے عمل سے اگر ایمان کے شرائط میں سے کوئی فعلی یا قولی شرط ضائع ہوتی ہو تو ایسے جادو کو اپنانا کفر ہے ورنہ نہیں۔

مسئلہ: عوام کے جھاڑ پھونک کے بعض طریقے ایسے ہیں جن کا کوئی معنیٰ ومطلب معلوم نہیں ہوتا یا وہ شرکیہ کلمات ہوتے ہیں یا جنات کی تعظیم کے الفاظ ہوتے ہیں۔ علمائے اسلام نے ایسی جھاڑ پھونک سے روکا ہے کیونکہ ان میں شرکیہ الفاظ کا خطرہ ہے اگرچہ جھاڑ پھونک والے کو معلوم بھی نہ ہو کہ یہ شرک ہے یا نہیں۔

مسئلہ: حدیث صحیح سے جھاڑ پھونک کی اجازت ثابت ہے جبکہ اس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں اور حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جہاں تک ہو سکے اپنے مسلمان بھائی کو نفع پہنچاؤ۔

مسئلہ: ہمارے نزدیک بیمار کے لئے آیاتِ الٰہی لکھنا جائز ہے بشرطیکہ سیاہی میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو۔ [1]

مسئلہ: اسی طرح آیات کو دھو کر پلانا یا لکھ کر گلے میں تعویذ کے طور پر ڈالنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے اسماء میں شیطان کو دفع اور ذلیل کرنے کی تاثیر ہے۔

مسئلہ: بزرگوں کی جھاڑ پھونک اور دم کرنے میں بڑی برکتیں ہیں کیونکہ ان حضرات نے جب سے شہرت کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت شرعی احکام کے مطابق بجالائی تو آیت قرآنیہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کا حکم ان کے لئے ثابت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اور شیاطین ان حضرات کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کی ایسے ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جیسے وہ سلیمان علیہ السلام کی کرتے تھے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے ہوتا ہے۔

حکایت: حضرت الہدائی قدس سرہٗ اپنے واقعات میں اپنے شیخ حضرت الشیخ مشہور با فتادہ آفندی قدس سرہٗ سے بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنا ایک خط جنات کے بادشاہ کو لکھا کہ فلاں شخص کو تمہارے ایک جن نے پکڑا ہوا ہے اسے حکم دو کہ اسے چھوڑ دے۔ چنانچہ جنات کے بادشاہ نے حکم مان لیا اور ان کے لکھے کی تعظیم کی کہ پکڑنے والے جن کی گرفت کی، جس پر بیمار تندرست ہو گیا۔ مثنوی شریف میں ہے:

ہم پیمبر فرد آمد در جہاں	فرد بود وصد جہانش درنہاں
عالم کبریٰ بقدرت سحر کرد	گرد خودرا کہن نقش لورد
ابلہانش فرد دیدند وضیف	کے ضعیفت آنکہ باشد خریف

ترجمہ: ا۔ پیغمبر زمین پر تشریف لاتا ہے، ہوتا تو وہ ایک فرد ہے لیکن اس میں کئی عالم پوشیدہ ہوتے ہیں۔

۲۔ قدرتِ الٰہی کے ساتھ عالم کبریٰ نے ظہور فرمایا ہے اپنے آپ پرانے نقش میں لپیٹا ہے۔

۳۔ بیوقوفوں نے اسے کمزور دیکھا وہ ضعیف کیسے ہو سکتا ہے جو ہر وقت تازہ ہو۔

مسئلہ: جادوگر کو قتل کرنا واجب ہے۔ وہ مرد ہو یا عورت، جبکہ ان کا طریقہ زمین میں فساد اور نقصان ڈالنے کا

---

[1] اسی لیے مرشدی مفتی اعظم سیدنا حضرت مصطفیٰ رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور استاذی مولانا سردار احمد لائلپوری قدس سرہٗ چین کی سیاہی استعمال نہیں فرماتے تھے۔ ایسے ہی دیگر اولیاء کرام کا طریقہ منقول ہے۔ اویسی غفرلہٗ

ہو۔ اگر ان کا مقصد کفر پھیلانا ہو تو صرف مرد کو قتل کرنا چاہیے عورت کو صرف سخت سزا دے کر اسے قید کیا جائے۔
کیونکہ ساحر کافر ہوتا ہے اور کافر کو قتل کرنا واجب ہے اور کافرہ عورت اہل حرب سے نہیں۔ جب اسے اصل کفر کی وجہ سے قتل نہیں کیا جاتا تو پھر عارضی کفر کی وجہ سے اسے کیوں قتل کیا جائے۔

مسئلہ: اگر ساحر گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے تو توبہ قبول، ورنہ نہیں۔

نبوت وصحابیت کے بے ادب کی سزا:۔

اشباہ (فقہ کی کتاب) میں ہے کہ ہر کافر کی توبہ دنیا میں قابل معافی ہے لیکن جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرے یا شیخین (صدیق و عمر رضی اللہ عنہما) کو گالی دے یا ان پر جادو کا عمل کرے اس کی توبہ قبول نہیں جبکہ توبہ سے پہلے گرفتار کرلیا جائے۔ اگرچہ عورت ہی ہو اور وہ بے دینی پھیلائے۔

ف: زندیق وہ ہے جو زمانہ کو قدیم سمجھے اور تمام حوادث کو اس کی طرف منسوب کرے اگر وہ نبوت کا اقرار کرے اور شریعت کا بھی قائل ہو۔ گزشتہ مضامین میں زیادہ تر آکام المرجان سے منقول ہیں، ان مضامین کو دل پر لکھئے

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ اور سیکھتے تھے وہ باتیں جو انہیں نقصان پہنچاتی ہیں کیونکہ ان کا اس سے عمل کا ارادہ تھا یا اس لیے کہ علم اکثر عمل کی طرف کھینچتا ہے۔ وَلَا يَنفَعُهُمْ اور انہیں نفع نہ دیتیں۔ اس کی تصریح اس لیے فرمائی تاکہ پتہ چل جائے کہ وہ ان امور سے نہیں جن میں خیر وشر دونوں ہوں بلکہ اس میں خالص شر اور ضرر محض ہے کیونکہ وہ لوگ اس سے یہ ارادہ نہیں رکھتے تھے کہ جادو سے جھوٹے نبی کی خرابیوں سے بچ جائیں یا لوگوں کو اس سے بچائیں گے۔ اس لحاظ سے اس میں کسی قسم کا نفع نہ ہو بلکہ سراسر نقصان ہی نقصان۔

مسئلہ: جس علم میں اس کی خرابیوں سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اس سے اجتناب بہتر ہے۔ جیسے فلسفہ کا پڑھنا، اس کے پڑھنے سے گمراہی میں پڑنے سے نہیں بچا جا سکتا۔ اگرچہ کسی شاعر نے کہا:

عَرَفْتُ الشَّرَّ لٰكِنْ لِلتَّوَقِّيهِ (میں نے شر کو شر کی وجہ سے نہیں سیکھا لیکن صرف بچنے کی خاطر)

اور جو شخص شر کو نہیں جانتا وہ ضرور شر میں واقع ہوگا۔

مسئلہ: تجنیس میں ہے: نجوم کا سیکھنا حرام ہے۔ ہاں قبلہ کی طرف پہچاننے اور سایہ اصلی کی خاطر سیکھا جائے تو جائز ہے۔

حدیث شریف: مصابیح کی بعض احادیث سے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ جس نے نجوم کے علم سے سیکھا تو وہ سمجھ لے کہ اس نے سحر کے شعبہ کو سیکھا۔

مسئلہ: جب اس علم کے سیکھنے میں کچھ بھلائی نہیں تو جن کتابوں میں فلاسفہ وغیرہ کے بیانات ہوں تو اپنے پاس رکھنا بلکہ ان کی طرف دیکھنا بھی ناجائز ہے۔ (کذافی نصاب الاحتساب)

وَلَقَدْ عَلِمُوْا ان یہود نے تورات سے جان لیا تھا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ کہ جس نے سحر اختیار کیا شیطان کی باتوں کو کتاب اللہ کے عوض لیتے تھے۔ پہلی لام قسم محذوف کا جواب ہے اور دوسری لام ابتدا کی ہے۔ مَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ اس کے لئے آخرۃ میں کوئی حصہ نہیں۔ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ البتہ بُری شے ہے وہ جو انہوں نے خریدی۔ کیونہ شراء اضداد میں سے ہے اور لام قسم محذوف کا جواب ہے اور مخصوص بالذم بھی محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی۔ وَاللّٰهُ لَبِئْسَ مَابَاعُوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمُ السِّحْرَ وَالْكُفْرَ اور ایمان کو نفس سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ نفس صرف علم وعمل اور ایمان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ لَوْ کا جواب محذوف ہے۔ ای لَمَا فَعَلُوْا یعنی اگر انہیں علم ہوتا تو وہ سحر اور اس پر عمل کرنا نہ سیکھتے۔

سوال: پہلے ان کے لیے علم ثابت کیا پھر اسکی ان سے نفی کر دی۔

جواب: اس لیے جب اپنے علم پر عمل نہ کیا تو گویا حقیقۃً انہوں نے کچھ نہ پڑھا تو یہاں پر علم سے نفع لینے کی نفی ہے نہ کہ علم کی نفی۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اور اگر وہ یہود اٰمَنُوْا ایمان لاتے نبی علیہ السلام پر اور قرآن پر وَاتَّقَوْا اور بچتے سحر اور شرک سے لَمَثُوْبَةٌ تو ان کے لئے ثواب ہے۔ لمثوبۃ بروزن مَفْعَلَة اس کی گردان ثَابَ يَثُوْبُ بمعنیٰ رَجَعَ ہوگی اور جزاء کو ثواب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ نیکی کرنے والے کے اس اجر کا بدلہ ہے جو اس کی طرف لوٹتا ہے۔ مبتدا ہے اور لَوْ کا جواب محذوف ہے اور تنکیر تقلیل کے لئے ہے۔ یعنی ثواب سے شئے قلیل جو ہونے والی ہے۔

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر۔ یہ مبتدا کی خبر ہے۔ مطلب یہ کہ انہوں نے اللہ سے کوئی خیر کا اجر پایا اس کے عوض ان کے نفوس نے خریدا۔ یہاں فعل محذوف ہے۔ عبارت کے طریقہ کو تبدیل کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کے لئے خیریت کا ہونا یقینی ہے۔ مفضل علیہ کو محذوف کرنے میں مفضل کی شان بلند کرنا

مطلوب ہے تاکہ ہر بات اسی کی طرف منسوب ہو۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اگر جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے ثواب میں بہتری ہے

ف: صرف زبان پر علم کو محدود رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں جب تک اس کا دل پر اثر نہ ہو اور دل پر تاثیر کی نشانی یہی ہے کہ اس پر عمل کرنے کو جی چاہے اور کتاب وسنت کی پابندی کرے۔ جو اپنے اوپر کتاب وسنت مسلط کرلے اس سے حکیمانہ باتیں سرزد ہوتی ہیں اور جو اپنے اوپر خواہشاتِ نفسانیہ کو مسلط کرلے اس سے بدعت کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

علم نافع کی علامت:۔

حضرت شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ علم کہ جس میں خطراتِ نفسانیہ اور تصورات غلط دور ہوں اور روحانی امور بھی اس میں شامل ہوں اور طبیعت کو بھی اس سے لذت نصیب ہو تو اسے حاصل کر۔ یہ وہی علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام پر نازل فرمایا۔ نبی علیہ السلام اور خلفاء راشدین وتابعین وتبع تابعین اور ائمہ دین (جو خواہشات نفسانیہ سے مبرا ہیں) کی اقتدا میں اپنی نجات سمجھو۔

ان کی فرمانبرداری ظنون وشکوک واوہام اور غلط دعاوی سے بچاتی ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کا خالص بندہ بنے تو علم وعمل میں کسی کی اقتدا حاصل کر۔ ورنہ گمراہی ہے۔ پہلے وہ علم سیکھ جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان ہو اور عمل بھی وہی مقبول ہے جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول علیہ السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت ہو اور اہل السنۃ والجماعت کے اعتقادات کے مطابق اعتقاد رکھ ورنہ عمل بیکار ہے۔

ف: بعض علماء کرام نے فرمایا کہ برے آدمی میں علم کا اضافہ ایسے ہے جیسے اندرائن کو پانی دیا جائے اسے جتنا پانی دیا جائے گا اس کا کڑوا پن بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح جس نے علمِ دین صرف اس لئے پڑھا کہ وہ دنیوی کاروبار چلائے گا اور اس سے دنیاوی فوائد حاصل کرے گا، تو وہ شخص ایسے ہے جیسے گندگی کو یاقوت کے آسے اٹھائے۔ یہ بہت برا وسیلہ ہے۔ اصل بات تو یوں ہے کہ بندے کو چاہیے کہ اپنی آخرت پر تمام دنیا کے امور کو قربان کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

ف: اگر تو یہ جانتا ہے کہ اللہ کے ہاں تیرا مرتبہ کیا ہے تو اپنے اعمال کی طرف دیکھ۔ یہی اعمال علامات اور احوال کرامات اللہ تعالیٰ کے قرب کی دلیلیں ہیں۔ علوم تو صرف وسیلہ ہیں۔

تفسیر صوفیانہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص معلوم کرے کہ میرا اللہ تعالیٰ کے ہاں کتنا مرتبہ ہے تو اپنے دل کو غور سے دیکھے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتنی عظمت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اتنی الفت کرتا ہے جتنی بندے کو اس سے الفت ہے، انسان تو لطیفہ ربانی ہے۔ واردات الٰہیہ کے قابل صرف یہی ہے اس کا نچلا حصہ ملکی ہے اور اوپر والا ملکوتی ہے یا یوں کہو کہ طبیعت اور نفس ملکی اور سر و روح ملکوتی ہیں۔ جو شخص عبادت حقانیہ سے علائق کو توڑ لیتا ہے تو وہ ملک وملکوت میں پورا تصرف کرتا ہے اور یہ دونوں اس کے وجود میں ملک ملکوت عالم خارج میں ہیں وہ اسی کے دروازہ ہیں۔

ف: علماء بقدر علوم واستدلال قرب حق تک پہنچتے ہیں لیکن اولیاء اللہ اپنے مشاہدہ ومعائنہ کے مطابق قرب حاصل کرتے ہیں۔ مگر یہ مشاہدہ وہ نہیں جو دوسری اشیاء کا ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایسی تشبیہات سے منزہ ہے کہ اس کے لئے کیف یا این کہا جاسکے۔ بلکہ یہ مشاہدہ ہے کہ دیکھنے والا پہلے اپنے وجود کو فنا کردے۔

ف: سالک کو سب سے پہلے افعال کی تجلی نصیب ہوتی ہے۔ پھر صفات کی ذات کی تجلی تو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب کلی فنا حاصل ہو۔ لیکن وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی اور وہ فنا بقا کا عین ہوتی ہے صرف لفظی فرق ہے۔ حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں اخلاص صرف ان فقراء کے لئے مانتا ہوں جنہیں فنا کا درس حاصل ہے۔ حضرت چراغ الشہاب کہ از خود بجو قندیل اداب۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ

اے ایمان والو! راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی سے بغور سنو

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے

وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے رب کے پاس سے اور اللہ

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ

جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے کیا تجھے

تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے آسمانوں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

وزمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی نہ مددگار۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْــَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ

کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے ہوا تھا

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ سے بہک گیا۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا

بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بدلے کفر کی طرف پھیر دیں

مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا

اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑو

وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾

اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اپنی جانوں کے لئے جو بھلائی آگے بھیجو گے

تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾ وَقَالُوا لَن

اسے اللہ کے یہاں پاؤ گے بیشک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔ اور اہل کتاب بولے

يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ

ہرگز نہیں جنت میں جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو یہ ان کی خیال بندیاں ہیں تم فرماؤ

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ

لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو۔ ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کے لئے

وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

وہ محسن نیکوکار ہے اور اس کا نیگ اس کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کچھ اندیشہ ہو اور نہ

يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾

کچھ غم۔

تفسیر عالمانہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا اے ایمان والو! رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو رَاعِنَا مت کہو۔ اس میں مومنین کو راہِ خیر کی رہبری کی جا رہی ہے۔ رَاعِنَا مُرَاعَاۃ'' سے رَعْی'' کا مبالغہ ہے بمعنی حِفْظُ الْغَیْرِ اور اس کے امور کی تدبیر اور اس کے مصالح کا تدارک۔

شانِ نزول: مومنین کا طریقہ تھا کہ جب ان پر کوئی علمی خیر بیان ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و عرض کرتے رَاعِنَا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہماری رعایت اور ہماری طرف توجہ فرمائیے تاکہ آپ کا چہرہ ہماری طرف ہو اور ہم آپ کا کلام اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس سے یہود کو موقعہ مل گیا کہ ان کے ہاں لفظ رَاعِنَا لغت عبرانیہ یا سریانیہ میں گالیوں کا کلمہ تھا جو ایک دوسرے کو اس سے گالیاں دیتے تھے۔ جب انہوں نے یہ کلمہ مومنین کے منہ سے سنا تو موقع پا کر اس کلمہ سے حضور علیہ السلام کو بلانے لگے اور ان کا مقصد اس سے گالیوں کا ہوتا۔ مومنین کو اس کلمہ سے روکا گیا کیونکہ اس میں یہود کی زبان سے التباس ہوتا تھا اور انہیں حکم ہوا کہ اس کے ہم معنی لفظ کو استعمال کریں کہ جس میں کسی قسم کا التباس نہ ہو۔

وَقُوْلُوا انْظُرْنَا ہماری طرف توجہ فرمائیے۔ نَظَرَہٗ سے ماخوذ ہے بمعنی اِنْتَظَرَہٗ وَاسْمَعُوْا اور اس طرح سنو وہ کلام جو تمہارے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور ان مسائل کو یاد کر لو جو آپ تمہیں فرماتے ہیں صرف یاد ہی نہیں بلکہ انہیں دل میں جگہ دو یہاں تک کہ تم استعداد اور طلب مراعات کے محتاج نہ رہو۔ وَلِلْكٰفِرِيْنَ یہود کے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی اور انہیں گالیاں دیں عَذَابٌ اَلِيْمٌ عذاب دردناک ہے جبکہ انہوں نے بہت بڑی گالیاں دینے پر جرأت کی۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ایسے لفظ سے احتراز کیا جائے جن میں تعریض ہو۔

سوال: فقہاء کرام فرماتے ہیں: لَا بَاْسَ بِالْمَعَارِیْضِ ۔(یعنی کلمے استعمال کرنا جائز ہے) تم کہتے ہو تعریض کلمات کا استعمال ناجائز ہے؟

جواب: تعریض اسے کہتے ہیں کہ انسان منہ سے ایسا کلمہ بولے جس کا ظاہر تو کچھ اور ہو اور مراد کچھ اور۔ یہ اس وقت ہے جب انسان کو جھوٹ بولنے سے بچاؤ حاصل ہو ورنہ بلا ضرورت ایسے کلمات کا استعمال ہرگز جائز نہیں

حدیث شریف: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ

سے مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچے' یعنی ان کی عزت و حرمت کے در پے نہ رہے۔

ف: حدیث شریف میں زبان کو ہاتھ سے اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ زبان سے عموماً ایسی بات سرزد ہوتی رہتی ہے پھر باقی اعضاء سے ہاتھ کو دکھ دینے میں زیادہ دخل ہے اسی لئے ہاتھ کا ذکر حدیث شریف میں صراحۃً ہوا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے:

ایں زباں چوں سنگ وہم آہن وش است	وآنچہ بجہد از زباں آتش است
سنگ وآہن رامزن برہم گزاف	کہ زروئے نقل وگاہ ازروئے لاف
زاں کہ تاریک است وہر سو پنبہ زار	درمیان پنبہ چوں باشد شرار
عالمے رایک سخن ویراں کند	روبہاں مردہ راشیراں کند

ترجمہ: ۱۔ یہ زبان پتھر اور لوہے کی طرح ہے جو کچھ زبان سے نکلتا ہے وہ آگ ہے۔

۲۔ پتھر اور لوہے کو ایک دوسرے پر خواہ مخواہ نہ مار' نہ ہی کسی کی نقل کر کے نہ ہی لاف وگزار سے۔

۳۔ اس لیے کہ ہر طرف سے تاریکی اور روئی پڑی ہے روئی پر انگارہ پڑ جائے تو بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

۴۔ صرف ایک سخن جہاں کو ویران کر ڈالتا ہے بلکہ یہ مردہ لومڑیوں کو شیر بنا دیتا ہے۔

آیت سے دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ فعل کے صدور کے ذرائع اور اسباب اور وہ اعمال جو اس کی حمایت کرتے ہوں ان کو بند کرنا ضروری ہے۔

ف: ذریعہ وہ شئے ہے جو فی نفسہٖ غیر ممنوع تو نہ ہو لیکن اس کے عمل سے دوسرے ممنوع فعل کا صدور لازم آتا ہو۔ وجہ استدلال یوں ہے کہ یہود اس کلمہ کو اپنی لغت میں گالیوں پر اطلاق کرے۔ اللہ تعالیٰ نے روک دیا کہ یہ کلمہ چونکہ گالیوں کا سبب اور ذریعہ ہے فلہٰذا مسلمانوں کو بھی اس کا ایسے اطلاق نہ کرنا چاہیے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ

(تم کفار کو گالی مت دو ورنہ لاعلمی میں وہ تمہارے معبودوں کو گالیاں دیں گے)

اس آیت میں ان معبودوں کو گالیوں سے اس لیے روکا گیا ہے کہ یہ عمل معبود حقیقی کو گالیوں کا سبب بنتا ہے اور فرمایا: وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ (ان سے سوال کیجئے اس گاؤں کے بارے میں جو دریا کے کنارے پر تھا)

حکایت: واقعہ یوں ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن شکار کرنے سے منع کیا۔ قدرت کی شان کہ ہفتہ کے روز مچھلیاں زیادہ آنے لگیں جنہیں وہ گڑھوں کی مدد سے شکار کرنے لگے، چونکہ ہفتہ کے دن شکار کی ممانعت ذریعہ اور سبب بنا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر اور خنزیر کی صورت میں بدل دیا۔

حدیث شریف: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بی بی ام حبیبہ اور بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر حبشہ کے گرجا میں دیکھی۔ اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا ان لوگوں کا طریقہ تھا کہ جب کوئی ان کا کوئی نیک آدمی فوت ہوتا تو اس کی قبر کے اوپر مسجد بنا کر اس نیک آدمی کی تصویر کھنچوا کر اس مسجد میں آویزاں کر دیتے۔ ایسے لوگ اللہ کے نزدیک بہت برے ہیں۔

ف: علماء کرام فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے صالحین کی تصاویر اس لئے بنائیں تاکہ وہ لوگوں کو دکھائی جائیں اور لوگ انہیں دیکھ کر ان کے حالات دریافت کریں اور ان کی طرح عبادت کرنے کی سعی کریں۔ یہی طریقہ ان کے سابقین کا تھا کہ تصاویر قبروں پر آویزاں ہوتیں اور لوگ انہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ بعد ازاں نا اہل پیدا ہو گئے ان کو اپنے اسلاف کے اطوار کا صحیح علم نہ تھا شیطان نے انہیں وسوسہ میں ڈالا کہ تمہارے آباؤ اجداد ان تصاویر کی پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ وہ شیاطین کے بہکاوے میں آ گئے اور ان کی پرستش کرنے لگ گئے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصاویر کھنچوانے سے روک دیا اور اس پر سخت وعیدیں سنائیں اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہے ان لوگوں پر جو اپنے انبیاء و اولیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بناتے ہیں"

اور فرمایا: "یا اللہ! میری قبر کو نہ بنانا کہ اس کی پرستش ہو" اور فرمایا: بندہ متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ امور ترک نہ کر دے جو اباحت کا حکم تو رکھتے ہوں لیکن ان میں خطرہ ہو" اور فرمایا: "گناہ کبیرہ ہے اس شخص کے لئے جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے" عرض کیا: "کون بد بخت ہے جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں جو کسی کے باپ کو گالیاں دیتا ہے تو وہ بھی اس کے باپ کو گالیاں دے گا" اس میں ماں باپ کی گالیوں کے سبب اور ذریعہ کو بھی روکا گیا ہے اور فرمایا: حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی لیکن ان کے درمیان چند مشتبہات ہیں جو ان مشتبہات سے بچتا ہے اس نے اپنے دین اور عزت کو

بچالیا۔ جوان کا ارتکاب کرتا ہے وہ حرام کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی راعی چراگاہ کے ارد گرد پھرے تو کسی نہ کسی طریق سے اس میں واقع ہو جائے گا" اس میں حرام سے بچنے سے پہلے ان کے اسباب مشتبہات سے بھی روکا ہے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ عینہ کی بیع کرنے لگو گے اور گاؤ کے دُم سینے پر لگاؤ گے اور کھیتی باڑی میں انتہائی مصروف ہو جاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر ذلت مسلط کر دے گا۔ جس سے تم مرتد ہو جاؤ گے۔

ف: عینہ وہ بیع ہے کہ کسی کو کوئی چیز میعادِ مقررہ تک بیچ دی جائے پھر تھوڑے پیسے نقد دے کر واپس لے لی جائے
۲۔ اسے بیع عینہ اس لئے کہتے ہیں کہ صاحبِ بیع کو نقد رقم مل جاتی ہے اور مشتری اس لئے خریدتا ہے کہ اسے وہ نقد رقم جو اسے فوراً مل جائے۔ عینہ حاضر شئے کو کہتے ہیں۔
۳۔ اس حدیث میں زراعت کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ اس وقت ہے جب زراعت جہاد کے ترک کا سبب بنے۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے گھر میں کھیتی باڑی کا سامان ملاحظہ فرمایا تو ارشاد فرمایا: "یہ وہ گھر ہے جس میں ذلت آئے گی" اس کی وجہ یہ ہے کہ کھیتی دنیا کے کاروبار سے ہے اور جہاد سے روکنے کا سبب ہے اس لیے اس کی مذمت کی گئی ہے اور دنیوی کاروبار میں زیادہ منہمک رہنا کافروں کا کام ہے۔ مسلمان کے لئے تو یہ ایک عارضی عمل ہے کیونکہ مسلمان تو اس عمل کو صرف آخرت کا سبب سمجھتا ہے اور کفار اسے زیب و زینت سمجھتے ہیں انہیں آخرت سے غفلت ہے۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے فرمایا: "دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت" یعنی بہ نسبت اس کے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آخرت کی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔ یہ دنیا کافر کے لئے جنت ہے۔ یعنی بہ نسبت اس کے کہ جو عذاب اس کے لئے آخرت میں تیار ہے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا دوست نہیں رکھتے وہ لوگ جو کافر ہیں۔

شانِ نزول: یہود کا ایک گروہ تھا جو مومنین کے لئے محبت کا اظہار کرتا اور دعویٰ کرتا کہ ہم تمہارے لئے بھلائی

کا ارادہ رکھتے ہیں۔ان کی تکذیب کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلْــــوُدُّ: کسی شئے کی آرزو رکھتے ہوئے محبوب رکھنا۔محبت کی نفی سے کراہت مقصود ہے۔یعنی دوست نہیں وہ لوگ جو کافر ہیں۔ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ، مِنْ بیانیہ ہے کیونکہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا جنس ہے کے تحت دو نوع ہیں۔

ا۔اہلِ کتاب ۲۔مشرکین۔

یوں کہا گیا ہے کہ دوست نہیں رکھتے وہ لوگ جو کافر ہیں۔یعنی اہل کتاب اور مشرکین۔پھر بیان کیا کہ وہ جو کافر ہیں وہ عموم میں باقی ہیں یعنی ہر دو نوع مراد ہیں۔اب معنیٰ یہ ہوا کہ کفار دوست نہیں رکھتے۔

اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ یہ کہ تمہارے نبی علیہ السلام پر کچھ نازل ہو۔کیونکہ جو نبی علیہ السلام پر نازل ہوا وہی امت پر نازل ہوا۔ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فاعل کے قائم مقام ہے۔اور مِنْ زائدہ ہے۔ خَيْرٍ کے استغراق کے لئے اور خَيْرٍ سے وحی اور قرآن اور نصرۃ مراد ہے۔ مِنْ ابتداغایت کے لئے ہے۔معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو تو زیادہ حقدار سمجھتے ہیں کہ وحی ہم پر نازل ہونی چاہیے تھی یہ تمہارے ساتھ حسد کرتے ہیں اور مکروہ سمجھتے ہیں کہ تم پر وحی کی کوئی شئے نازل ہو۔یہود تو اس لئے حسد کرتے ہیں کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا خاندان وحی کا گہوارہ رہا اور تم لوگ عموماً ان پڑھ رہے اور مشرکین اس سے حسد کرتے ہیں کہ ان میں اکثر ذی مرتبہ اور مالدار ہیں اور ان کا گمان تھا کہ دنیوی منصب کی طرح منصب نبوت بھی صرف انہی کو ملتا ہے جو ذی مرتبہ اور صاحب جائیداد اور جس کے پاس ظاہری اسباب بہت زیادہ ہوں۔اسی لئے وہ کہتے تھے: وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (یہ قرآن دو گاؤں کے درمیان رہنے والے بڑی شوکت مرد پر کیوں نہ اترا)

اس سے طائف کا نعیم بن مسعود ثقفی یا مکہ کا ولید بن مغیرہ مراد ہے۔ان دونوں کی آرزو یہی تھی کہ نبوت ان میں سے کسی ایک کو ملتی۔ان کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص فرماتا ہے۔

حل لغات: عربی میں کہتے ہیں: خَصَّهٗ بِالشَّيْءِ وَاخْتَصَّهٗ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی معاملہ میں صرف اسی کو مخصوص کیا جائے۔

مَنْ يَّشَآءُ کا مفعول بہ محذوف ہے۔رحمۃ سے نبوت، وحی، حکمت اور نصرت مراد ہے۔اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ

تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے نوازتا ہے اور اپنا خاص فضل وکرم صرف اسی کو عطا کرتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ جسے چاہے نوازے۔ نہ ہی یہ اس پر واجب اور نہ ہی کسی کا کوئی حق اس پر واجب ہے۔

سوال: بعض مشائخ کی عبارات میں واقع ہوا ہے کہ فلاں بات واجب ہے؟

جواب: اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس شئے کا حق اسی طرح تھا کہ وہ مستحقین کے لئے واجب ہے اور ثابت نہ ہو کہ اللہ پر دوسرے واجب کرنے والے سے واجب ہے۔

وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل وکرم سے نبوت ووحی کے لئے چن لیتا ہے۔ اس سے معتزلہ پر حجت قائم ہوگئی کہ کسی پر اس کا فضل وکرم کرنا اس کا اپنا احسان ہے اس پر کوئی شئے واجب نہیں کیونکہ جس پر کوئی شئے واجب ہوتی ہے اسے قاضی مَاوَجَبَ کو ادا کرنے والا کہا جاتا ہے نہ کہ فضل واحسان کرنے والا اور یہ بھی ہے کہ جس پر بہتر فضل کا عمل میں لانا واجب ہوتا ہے تو وہ ذوالجلال کہا جاتا ہے نہ کہ ذوالفضل۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبوت ووحی کے لئے کسی بندے کو چن لینا اس کا فضل محض ہے اور ان کے علاوہ دوسروں کو اس نعمت سے محروم رکھنا فضل وکرم کی تنگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی اپنی مشیت وحکمت ہے۔ پھر جو شخص اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے سے اعراض کرتا ہے تو وہ اس کی حماقت وجہالت ہے۔

ف: اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے دو قسم کے ہیں: ۱: وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حق کی تائید وحمایت کے لئے منتخب فرمایا مخصوص عباد وزہاد اور اہل الاعمال والا وراد ہیں۔ ۲: وہ حضرات جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لئے مخصوص فرمایا ہے وہ اہل محبت اور اہل عشق ہیں وہ سب کے سب اس کی خدمت کے لئے اور اس کے حکم کے ماتحت ہیں کیونکہ ان سب کا مقصد اور توجہ وہی ذات ہے اور بس اور عبودیت ایک ایسی صفت ہے کہ بندہ جب تک زندہ رہے اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی اور عبودیت کے اسرار میں سے ایک یہ ہے کہ قلب سے حسد کو خارج کردے۔

ف: بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ حاسد اللہ تعالیٰ سے پانچ وجوہ سے مقابلہ کررہا ہے۔

۱: اس نے اللہ تعالیٰ کی ہر اس نعمت سے بغض کیا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے غیر کو عطا فرمائی۔ ۲: اللہ تعالیٰ کی تقسیم سے غصہ کیا۔ گویا اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے یارب! تو نے یہ تقسیم غلط کی تجھے چاہیے تھا کہ یوں تقسیم کرتا۔

۳: اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے دیتا ہے اور حاسد اللہ تعالیٰ کے فضل فراوان سے بخل کرتا ہے۔ ۴: جس پر اللہ تعالیٰ کی عطا ہوئی تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کا منتخب بندہ ہے اور حاسد اسے رسوا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے زوالِ نعمت کا خواہاں ہوتا ہے۔ ۵: حاسد اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس کی مدد کر رہا ہے کہ وہ بھی آدم علیہ السلام پر حسد کر کے رسوا ہوا۔ حسد کا روحانی نقصان اور عالمِ مثال میں اس کی مثال: جان اے جان من! حسد کا نقصان تیرے دشمن پر تو اثر انداز نہیں ہوگا البتہ اس کا خمیازہ تجھے بھگتنا پڑے گا۔

اے بھائی! اگر حسد کی خرابی تیرے سامنے منکشف ہو جائے تو خواہ بیداری میں یا خواب میں، تو تجھے نظر آئے گا حسد سے تو ایک بھاری پتھر اٹھا کر جس پر حسد کر رہا ہے اس کو مارنا چاہتا ہے جو تو اس پتھر کو اپنے دشمن کی طرف پھینکتا ہے تو وہ تیری دائیں آنکھ کو پھوڑ دیتا ہے۔ پھر تیرا غضب بڑھ جاتا ہے پھر دوبارہ زور سے مارتا ہے تو تیری بائیں آنکھ پر لگتا ہے جس سے تو اندھا ہو جاتا ہے بعد ازاں پھر غصہ سے اور زور لگا کر مارتا ہے تو تیرا سر پھوڑ دیتا ہے۔ اس سے تیرے دشمن کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن تو نے اپنا بیڑا غرق کر لیا جس سے تیرے اردگرد تیرے دشمن خوش گپیاں اڑاتے ہیں۔ یہ انجام ہے حسد کرنے کا۔ دراصل یہ شیطان کا کھلونا ہے۔

حکایت: شیخ ابوبکر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص بادشاہ کے پاس آیا کرتا تھا اور کہتا کہ محسن پر احسان کر، تاکہ برے کی برائی تیرے اوپر اثر انداز نہ ہو سکے۔ ایک شخص میں حسد جاگا اور تدبیر سوچی کہ اس کو اس مرتبہ سے گرائے۔ اس نے بادشاہ سے کہا جو شخص تجھ سے ہم کلام ہوتا ہے کہتا ہے کہ بادشاہ کے منہ سے بدبو آتی ہے۔ بادشاہ نے کہا: کیسے یقین ہو کہ وہ ایسے کہتا ہے۔ حاسد نے کہا: آزمائش شرط ہے، دیکھنا کل جب وہ آپ کے قریب آئے گا کلام کرتے وقت اپنے منہ پر رومال ڈال کر بات کرے گا۔ وہ صرف تیرے منہ کی بدبو کی وجہ سے ایسا کرے گا۔ ادھر حاسد بادشاہ کو یہ الفاظ کہنے کے بجائے سیدھا اس شخص کے پاس پہنچا اور اپنے گھر اسے دعوت پر بلایا اس نے دعوت قبول کر لی۔ حاسد نے طعام میں کچھ کچا لہسن ملا دیا۔ طعام سے فارغ ہو کر وہ سیدھا بادشاہ کے ہاں چلا گیا اور حسبِ دستور کلام شروع کر دیا لیکن قدرے دور کھڑا ہو کر۔ بادشاہ نے فرمایا: ذرا قریب ہو جایئے۔ اس نے اس خطرہ سے کہ بادشاہ کو اس کے منہ سے لہسن کی بدبو کی وجہ سے نفرت نہ ہو اپنے منہ پر رومال ڈال دیا۔ بادشاہ کو حاسد کی بات کا یقین آ گیا۔ چنانچہ غصہ میں آ کر ایک خط لکھا اور اسے کہا

کہ یہ خط فلاں حاکم کو دے آؤ۔ اس میں لکھا تھا کہ جب یہ شخص تمہارے پاس آئے اسے قتل کر دو اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھال اتار کر میرے ہاں بھیج دو۔ یہ شخص خط لے کر باہر نکلا تو راستے میں وہی حاسد مل گیا۔ ماجرا پوچھا تو اس شخص نے کہا: مجھے بادشاہ نے یہ خط دیا ہے تاکہ فلاں حاکم کو پہنچاؤں۔ حاسد نے نہایت عجز و انکساری سے خط مانگا اس لالچ سے کہ شاید اس میں انعام و اکرام لکھا ہو جیسا کہ اس سے قبل بادشاہ کی عادت تھی۔ اس شخص نے حاسد کے عجز کو دیکھ کر خط حاسد کو دے دیا۔ جب حاسد نے خط حاکم کو پہنچایا۔ حاکم نے خط پڑھا اور حاسد کو بتایا اس میں لکھا ہے کہ تمہیں قتل کروں اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھال اتار کر بادشاہ کو بھیجوں حاسد چیخا چلایا اور قسمیں کھائیں کہ یہ خط میرے نام کا نہیں دوسرے شخص کا ہے چلیے بادشاہ سے تحقیق کر لیجئے۔ حاکم نے کہا: یہ میرے بس کی بات نہیں۔ حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھال اتار کر بادشاہ کو بھیج دیئے۔ اگلے روز حسب معمول وہ شخص بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ متعجب ہوا اور پوچھا کل جو میں نے تجھے خط دیا تھا اس کا کیا ہوا؟ عرض کیا: فلاں شخص مجھ سے بہ منت ساجت لے گیا۔ بادشاہ نے پوچھا: کل مجھ سے ہم کلام ہوتے وقت تو نے منہ پر رومال کیوں ڈالا؟ عرض کی: حضور! اسی شخص نے مجھے طعام کھلایا جس میں کچا لہسن تھا۔ ادھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بات کرتے ہوئے شرم آئی کہ کہیں میرے منہ کی بدبو آپ کو تکلیف نہ دے میں نے منہ پر رومال ڈال لیا۔ بادشاہ ہنس دیا اور کہنے لگا: واقعہ برے کا انجام برا ہوتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا: ؎

ہر کہ او نیک مے کند یابد   نیک و بد ہر چہ مے کند یابد

ترجمہ: جو بھی نیکی یا برائی کرتا ہے نیکی یا برائی جیسی کرے گا ویسی پائے گا۔

مَا شرطیہ اور جازم ہے اور بہ بنائے مفعولیت منصوب ہے۔ بمعنی ای شئی **نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ** کا محل نصب ہے۔ لفظ **نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ** کی تمیز ہے نسخ لغت میں ازالہ اور نقل کو کہتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: **نَسَخْتُ الْكِتٰبَ اَیْ مِنْ نُسْخَةٍ اِلٰی نُسْخَةٍ** اور آیت کا نسخ بمعنی عبادت کے وقت کا انتہاء قراءۃ، یا وہ حکم جو منسوخ ہو جو اس قراءۃ سے حاصل ہو۔

اقسامِ نسخ:۔ نسخ کی کئی قسمیں ہیں: ۱: صرف قراءۃ کا منسوخ ہونا، جیسے آیہ رجم۔ مروی ہے کہ یہ آیت یوں تھی

اِنَّ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجِمُوْهُمَا اب یہ آیت منسوخ التلاوت ہے لیکن حکم موجود ہے اور اس کا نسخ کا معنیٰ یہ ہے کہ نسخ تلاوت کے وقت اس کی قراۃ کی تکلیف اٹھالی گئی۔

۲۔حکم منسوخ، جیسے متوفی عنھا زوجھا کی عدت کا ایک سال ہونا۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ یہ غیر اخرج ہے اس کا حکم منسوخ ہے، آیت ہے کہ جس میں حکم ہے کہ متوفی عنھا زوجھا کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔کما قال تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ پہلے حکم تھا کہ ایک فرد مسلمان دس کفار کے ساتھ صبر کرے۔بعد میں یہ منسوخ ہو کر حکم ہوا کہ ایک دو کے ساتھ صبر کرے۔اسے منسوخ الحکم کہا جاتا ہے لیکن اس کی تلاوت موجود ہے۔یہی قسم نسخ فی القرآن میں زیادہ مشہور ہے۔آیتِ ناسخہ و منسوخہ دونوں میں تلاوت میں ثابت ہوگی لیکن منسوخہ آیت پر عمل ہرگز نہیں کیا جائے گا۔

اس جیسے نسخ کا معنی یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ جو بندہ کو مکلف بنایا گیا تھا اس آیت سے اس کے انتہاء کا حکم بیان کیا گیا ہے۔حکم منسوخ ہوجانے کے بعد تلاوت کا حکم باقی رکھا گیا تا کہ اس کی قرأت سے بندوں کو ثواب حاصل ہو کیونکہ قرآن کو جس طرح کہ اس کے حکم کی وجہ سے حفظ کیا جاتا ہے تا کہ اس پر عمل کرنا باآسانی نصیب ہو اسی طرح اس کی تلاوت اس لیے کی جاتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس پر اسے ثواب حاصل ہوتا ہے۔جس کا حکم و تلاوت دونوں منسوخ ہوجائیں۔جیسے بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کتاب اللہ میں پہلے دس رضعات یعنی دودھ چوسنے کا حکم تھا پھر پانچ کا کہ جس سے تحریم نکاح ثابت ہوجائے۔اس قول کے مطابق اب یہ حکم بھی منسوخ ہے اور قرأت بھی اس جیسے نسخ کا مطلب یہ ہے کہ اس قرأت اور اس سے جو حکم حاصل ہورہا تھا کی تکلیف بندہ سے اٹھالی گئی۔یہ آیت منسوخ ہوئی۔

قاعدہ: امام قرطبی فرماتے ہیں کہ جمہور کا اتفاق ہے کہ نسخ اوامر و نواہی میں ہوتا ہے نہ کہ اخبار میں۔تا کہ اللہ تعالیٰ پر کذب کا احتمال نہ ہو۔(کذب اللہ تعالیٰ سے محال ہے) اَوْ نُنْسِهَا یا ان کے دلوں سے آیات مٹادیں۔

شانِ نزول:۔ا:مروی ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنھم رات گزرنے کے بعد صبح کو جب اٹھے کہ سورۃ پڑھیں لیکن انہیں وہ سورۃ سوائے بسم اللہ کے اور کچھ یاد نہ تھا۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال بتائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سورۃ اب منسوخ ہو گئی ہے اب نہ اس کی تلاوت ہو گی نہ ہی اس کا حکم باقی رہا۔

۲: مروی ہے کہ مشرکین اور یہود نے کہا کہ نبی علیہ السلام کی عجیب کیفیت ہے کہ ایک دن صحابہ کو کہتے ہیں کہ یہ کام کرو۔ پھر اسی سے انہیں روک دیتے ہیں بلکہ بسا اوقات اس حکم کے خلاف امر فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں ان کا اپنا من گھڑت ہے۔ مثلاً آج کوئی بات کہی اور کل اس سے رجوع فرمالیا۔ مثلاً زنا کی سزا پہلے یوں بتائی کہ زانی مرد وعورت کو زبانی سزا کافی ہے۔ چنانچہ کہا: فَاٰذُوْهُمَا (انہیں زبانی سزا دو) پھر حکم فرمایا کہ انہیں ان کے مرتے دم تک گھروں سے باہر نہ جانے دو۔

پھر یہ فرمایا: فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ یعنی انہیں سو کوڑے لگاؤ۔ اس سے یہودیوں کا مقصد صرف اسلام پر طعن و تشنیع کے سوا اور کچھ نہیں تھا تاکہ جو لوگ بھی اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس ارادہ سے باز آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وجہ سے آیات منسوخ ہونے کی حکمت بتائی۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ جس آیت اللہ تعالیٰ منسوخ کرتا ہے اس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے کہ اس کی تلاوت یا حکم دونوں منسوخ کر دے۔ پھر اس کے عوض دوسری آیت وغیرہ نازل فرمائے یا نہ۔ یہ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اس سے اور بہتر حکم (جو بندوں کی مصلحت کے مطابق ہے) لاتے ہیں کہ منسوخ ہونے والی آیت کے بجائے اس آیت میں بندوں کا نفع اور ثواب زائد ہے۔

ازالہ وہم: ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آیتِ ناسخہ آیتِ منسوخہ سے افضل ہے یا بہتر ہے، بلکہ دونوں شان میں برابر ہیں کیونکہ دونوں اللہ تعالیٰ کے کلام ہیں اور اسی کی کتاب ہیں۔ صرف چونکہ بندہ کے فوائد ومنافع اور ثواب ناسخہ آیات میں زائد ہیں۔ اسی لئے ان کو برقرار رکھا گیا اور ان منسوخہ آیات کو اٹھالیا گیا۔

اَوْ مِثْلِهَا یا یہ کہ آیتِ منسوخہ کی مثل نفع اور ثواب کے لحاظ سے دوسری آیت نازل کی گئی۔ اس کے دو طریقے ہیں

۱: آیت ناسخہ عمل کے لحاظ سے منسوخہ آیت سے آسان ہے۔

۲: آیت ناسخہ میں عملی لحاظ سے مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اسی لئے اس میں منسوخہ آیت کی نسبت زائد ثواب ہے۔

پہلے کی مثال جیسے عورت معتوفی عنہا الزوج کی عدت کا ایک سال کی بجائے چار ماہ دس دن کا حکم ہے۔

دوسرے کی مثال کفار سے پہلے جنگ کرنا اختیاری تھا پھر واجب ہو گیا۔

۳۔ان دو صورتوں کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے، یہ کہ منسوخہ اور ناسخہ آیات مشقت یا آسانی میں برابر ہوں جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا۔

مسئلہ: ضروری نہیں کہ نسخ آیت یا اس سے زائد پر جاری ہو بلکہ آیت کے کسی ایک ٹکڑے کو بھی منسوخ کیا جاتا ہے۔

سوال: آیت میں تو پوری آیت کا حکم ہے اور تم نے ایک ٹکڑے کا حکم کہاں سے ثابت کر لیا؟

جواب: آیت کا حکم بیان کرنا اغلبیت کے لحاظ سے ہے کہ اکثر نسخ تو آیت یا اس سے زائد میں ہوتا ہے لیکن کبھی کم میں بھی نسخ جاری ہو جاتا ہے۔

عقیدہ: ہر حکم کا حقیقی ناسخ اللہ تعالیٰ ہے یا خطابِ شرعی کو مجازاً ناسخ کہا جاتا ہے کیونکہ نسخ اسی سبب سے ہوا۔ بنا بریں فعل کا اسناد اسی کی طرف کیا جاتا ہے۔

ف: منسوخ وہی حکم ہے جو بندوں سے ہٹایا گیا ہے اور منسوخ عنہ وہ بندہ ہے جسے اس حکم کے ہٹائے ہوئے سے دور رکھا گیا ہے۔ یعنی بندہ مکلف عاقل بالغ۔

نسخ کی حکمت:[1]

تم نے اطباء کو دیکھا ہوگا کہ مریض کے مزاج کے مطابق ادویہ اور اغذیہ تبدیل کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام ہمارے روحانی معالج ہیں۔ ہمارے نفوس کے کوائف کو دیکھ کر اعمالِ شرعیہ اور احکامِ خلقیہ کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ارواح کو بھی اس کی ضرورت ہے۔ جیسے اجسام کو اغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اعمال و احکام ارواح کی اغذیہ ہیں۔ انہیں مزاجوں کے مطابق تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ دیکھئے کسی وقت ایک دوائی کسی انسان کے لئے مفید ہوتی ہے اور وہی دوائی کسی دوسرے وقت اسی انسان کے لئے زہر قاتل بن جاتی ہے۔ اسی طرح اعمال کے کوائف ہیں کہ کسی وقت مفید ہوتے ہیں اور کسی وقت نقصان دہ۔ کچھ ایسی ہی کیفیت پیر و مرید کی بھی ہے کہ سلوک کی راہ میں مختلف عادات و اطوار انہیں استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا علم اسے ہے جس نے کسی مرشد کا دامن پکڑا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے:

[1] نسخ کی مزید تفصیل فقیر کی کتاب "القول الراسخ فی تحقیق المنسوخ والناسخ" یا "احسن البیان" کا حصہ اول میں پڑھیے۔ اویسی۔

رمز ننسخ آیت او ننسها ... نات خیراً درعقب می دان مها

ہر شریعت را کہ حق منسوخ کرد ... او کیا بر دو عوض آوردہ ورد

اندریں شہر حوادث میرا وست ... در ممالک مالک تدبیر اوست

آنکہ داند دوخت او داند درید ... ہر چہ رابفروخت نیکو تر خرید

ترجمہ:

۱:۔رمز آیت ننسخ او ننسها پڑھ،اس کے بعد نات بخیر کو بھی۔اے میرے عزیز! سمجھ۔

۲:۔جس شریعت کو حق تعالیٰ نے منسوخ کیا،لکڑی کو لے لیا لیکن پھول عطا فرمایا۔

۳۔اس شہر میں حوادث ہیں جن کا مالک وہی ہے اپنے ملکوں کی تدابیر کا خود مالک ہے۔

۴۔جو سینا جانتا ہے وہ پھاڑ بھی سکتا ہے۔جو کچھ بیچا اس سے بہتر خریدا۔

الم تعلم یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور استفہام تقریری ہے یعنی بیشک آپ جانتے ہیں کہ ان اللہ علی کل شیء قدیر وہ ہر شئے پر قادر ہے۔جب وہ ہر شئے پر قادر ہے تو نسخ کر کے آیۂ منسوخ کی طرح دوسری آیت یا اس سے بہتر لانے پر بھی قادر ہے۔الم تعلم کیا تو نہیں جانتا۔

سوال: اس خطاب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں خاص فرمایا؟ حالانکہ غیر بھی اس میں شامل ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ خطاب سے مذکور شئے کے متعلق مخاطب کے علم کی تقریر مطلوب ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی بشر زیادہ عالم نہیں ہے کیونکہ ملک السموٰت والارض کے اسرار کے عالم آپ ہیں۔کسی دوسرے کو کیا خبر!

علم غیب کا بیان: اذ قد وقف من اسرار ملکوت السموٰت علی ما یطلع علیه غیره وعلم غیره بالنسبة الی علمه علیه السلام ملحق با لعدم لان علم الاولیاء من علم الانبیاء بمنزلة قطرة من مبعة ابحر وعلم الانبیاء من علم نبینا علیه السلام بهذه المنزلة وعلم نبینا من علم الحق سبحانه بهذه المنزلة . (روح البیان جلد ا،صفحہ ۱۳۷)

کیونکہ آسمان وزمین کے ملکوت کے اسرار جو کچھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں کسی

دوسرے کو ہوا بھی نہیں لگی کیونکہ دوسروں کے علم آپ کے علم کے سامنے کالعدم ہیں اسی لئے اولیاء کرام کے علوم انبیاء علیہم السلام کے علوم کے آگے ایسے ہیں جیسے قطرہ کو دریا سے نسبت ہے پھر انبیاء علیہم السلام کے علم کے سامنے ایسے ہے جیسے حضور کے علم کو اللہ تعالیٰ کے علم کے آگے اسی طرح۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور حکم دیتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔ بیشک آسمانوں اور زمین کے ملک اسی کے ہیں۔ یہ آیت عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کے بمنزلہ دلیل کے لئے ہے۔ مُلْكُ بمعنی تمام القدرۃ اور اس پر قابض ہونا۔

سوال: اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی تخصیص بالذکر کیوں ہے حالانکہ تمام دنیا و آخرت اس کے قبضہ قدرت میں ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی مصنوعات سے یہ دونوں اعظم بالشان اور عجیب ترین ہیں۔

وَمَا لَكُمْ تمہارے لئے نہیں اے مومنو! مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ کے ماسوا۔ یہ جملہ وَلِیٍّ سے حال ہونے کی وجہ سے نصب کے محل میں ہے۔ دراصل وَلِیٍّ کی صفت ہونا چاہیے تھا لیکن چونکہ وہ مقدم واقع ہوا ہے بنابریں اسے منصوب ہونا زیادہ لائق ہے۔ مِنْ استغراق کے لئے اور وہ زائد ہے۔ وَلِیٍّ بمعنی قریب وصدیق، بعض کہتے ہیں وَلِیٍّ بمعنی والی۔ یعنی وہ جو امر کی درستی کرنے والا ہو وَلَا نَصِیْرٍ یعنی معین و ناصر۔

ف: وَلِیٍّ اور نَصِیْرٍ میں فرق یہ ہے کہ ولی کبھی مدد کرنے سے ضعیف ہو جاتا ہے اور نصیر نہیں ہوتا اور نصیر کبھی اجنبی ہوتا ہے اور ولی نہیں ہوتا۔ اس میں مومنین کو تسکین دی گئی ہے کہ تمہارا یار و مددگار اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ **فلہذا** اس کے ماسوا کسی دوسرے پر اعتماد مت کرو اور اس کے ماسوا کسی سے التجا بھی نہیں کرنی چاہیے۔

عقیدہ: خلاصہ یہ ہے کہ تین امور کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ ۱: اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ ۲: اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں زمین و آسمان ہیں۔ ۳: اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی حامی و ناصر نہیں۔

اور یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ دینی اور دنیوی معاملات میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں کرے گا اور اس آیت پر عمل کا موجب ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا چاہیے اور ہر امر اس کے سپرد کرنا چاہیے۔ کفار کی طرف نہ دھیان کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کے شک آمیز اقوال (منجملہ ان کے امر نسخ بھی ہے) کی طرف خیال کرنا چاہیے۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ یہ لفظ اَمْ ہمزہ استفہام جو اَلَمْ تَعْلَمْ میں واقع ہے کہ وجہ سے ہے۔ یعنی اے لوگو! کیا تمہیں معلوم

نہیں کہ اللہ تعالیٰ جملہ امور کا مالک ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔ وہ امر و نہی جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ کیا تم عمداً سوال کرتے ہو جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو تنبیہ ہو جائے کہ وہ اپنے امور خصوصاً نسخ کے معاملہ میں مضبوط ہو جائیں اور اس کی تحقیق و تفتیش کے در پے نہ ہوں اور نہ ہی سوچے سمجھے بغیر اعتراض کریں۔

اَنْ تَسْئَلُوْا یہ کہ تم اے مسلمانو! سوال کر بیٹھو رَسُوْلَكُمْ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ ان کی شان بہت بلند ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی خواہشات سے مغلوب ہو کر ان سے ناجائز سوال کر بیٹھو۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر۔ وہ جو کچھ تمہارے پاس بھیجتا ہے یہ اس کا فضل ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کے اسرار سے کیا خبر۔ یہ ان کو اس وقت فرمایا جب صحابہ خواہ مخواہ نسخ کے احکام کی حکمتوں اور اس کی تفصیل کے پیچھے پڑ گئے۔

كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى یہ ما مصدریہ ہے اور یہ فعل مصدر بن کر تشبیہ کا فائدہ دے رہا ہے۔ اسی لیے اسے مصدر تشبیہ کہتے ہیں۔ پھر یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اور اصل عبارت یوں تھی سوالا مشبها بسوال موسیٰ علیہ السلام۔ یعنی ایسا سوال نہ کرو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کے مشابہ ہو۔

وہ سوال یہ تھا کہ ان کے متبعین نے جب دیکھا کہ بعض لوگ گوسالہ پرستی کرتے ہیں تو انہوں نے بھی کہہ دیا: اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (ہمارا معبود بھی ایسا ہونا چاہیے) دوسرا سوال یہ کیا کہ ہمیں اپنا خدا دکھاؤ اور وہ بالکل آمنے سامنے ہو کر آئے علاوہ ازیں وہی سوالات کیے جو اس پارہ کے اول میں گزرے۔

مِنْ قَبْلُ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے۔ یہ سُئِلَ کے متعلق اور تاکید کے لئے ہے۔

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ جو کفر کو اپنے لئے اختیار کرتا ہے۔ بِالْاِيْمَانِ ایمان کی بجائے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ آیات جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مصلحت کے لئے نازل ہوتی ہیں اگرچہ وہ ناسخہ سہی۔ ان پر جو شخص بھی اعتبار نہ کرے۔ (حالانکہ یہ اس وقت تمہاری بہبودی اور خالص حق کے لئے ہیں) ان کے برعکس چاہے۔ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ یعنی ایسے راستے سے بھٹکا جو ہدایت اور حق کا راستہ ہے اور وہ خواہشاتِ نفسانیہ کے چنگل میں پھنس گیا اور ہلاکت کے گڑھے میں جا گرا۔

ف: سَوَآءَ السَّبِيْلِ ہر وہ راستہ جو زیادتی و کمی سے پاک ہو اور وہی حق کی راہ ہے۔

شانِ نزول: یہودیوں نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید یکبارگی کیوں نہیں اترتا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات یکبارگی نازل ہوئی۔ تب یہ آیت اتری۔

کما قال اللہ تعالیٰ: يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً اس لحاظ سے اَمْ تُرِيْدُوْنَ کے مخاطب یہود ہوں گے۔

سوال: رَسُوْلَكُمْ کا خطاب تو اسی تفسیر کے خلاف ہے کیونکہ حضور علیہ السلام یہودیوں کے بھی تو رسول تھے۔

جواب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسالتِ عامہ میں وہ بھی شامل ہیں کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت میں داخل ہیں۔ ان کے تبدّلِ کفر کا یہ معنیٰ ہے کہ انہوں نے اپنی قدرت کو صرف کرنے کو ترک کیا انہیں قدرت حاصل ہونے کے باوجود وہ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں: یہی تفسیر زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت مدنیہ ہے اور اس سورۃ کے ابتداء يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ تک ان کی حکایت نقل ہے اور ان پر جو حجت قائم کرنی تھی قائم کردی۔

مسئلہ: اس آیت میں آدابِ غلامانہ بھی سمجھائے گئے ہیں جو اپنے آقا اور رسول اور خلیفہ کا ادب نہیں کرتا وہ سمجھ لو کہ وہ کفر کو پسند کر رہا ہے۔

ف: ادب کا معنیٰ یہ ہے کہ بھلائی کو جمع کر لیا جائے۔

حدیث شریف: میں ہے: حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"والد پر اولاد کے حقوق میں سے ہے کہ اولاد کا اچھا نام رکھے اور اسے اچھی عورت کا دودھ پلائے اور اسے اچھے آداب سکھائے ورنہ اس سے قیامت میں سوال ہوگا اور گرفت ہوگی اگر اس نے ان کے حقوق میں کمی کی۔"

ف: بستان العارفین میں ہے کہ ایمان کی مثال ایک ایسے شہر کی ہے کہ جس کے پانچ دروازے ہوں:

۱۔ سونے کا۔ ۲۔ چاندی کا۔ ۳۔ لوہے کا۔ ۴۔ تانبے کا۔ ۵۔ کچی اینٹ کا۔

جب تک شہر والے اس شہر کے پانچویں دروازے کی حفاظت کریں گے دشمن ان پر حملہ نہیں کر سکے گا جب اس کی حفاظت سے غفلت کریں گے تو دشمن اس میں گھس کر سارے شہر کو تباہ کر ڈالے گا۔

اسی طرح ایمان کے پانچ قلعے ہیں۔ ۱۔ یقین۔ ۲۔ اخلاص۔ ۳۔ اداء الفرائض۔ ۴۔ اتمام سنن۔ ۵۔ مستحبات۔

جب مستحبات کی پابندی کی جائے تو شیطان دور رہتا ہے۔ جب مستحبات کو ترک کر دیا جائے تو شیطان کو حملہ کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ پھر وہ سنت کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔اس کے بعد فرائض، پھر اخلاص میں خلل ڈالتا ہے، پھر یقین ختم کرالیتا ہے۔

سبق: سالک کو چاہیے کہ مستحبات کی پابندی کرے۔ کسی ایک معاملہ میں وضو ہو یا نماز بیع شراء ہو یا دوستی رفاقت وغیرہ، کوتاہی نہ کرے۔

ف: شریعت احکام کا نام ہے۔طریقت ادب کو کہتے ہیں۔ جتنے گمراہ ہوئے ادب کے ترک کرنے کی وجہ سے ہوئے۔ مثال کے طور پر ابلیس کو دیکھئے۔ایسے ہی دوسرے گمراہیوں کو جانیے:

بے ادب مرد کے شود مہتر　　گرچہ اورا جلالت نسب است
باادب باش تا بزرگ شوی　　کہ بزرگی نتیجہ ادب است

ترجمہ:

۱: بے ادب کب سردار بن سکتا ہے، چاہے اس کی نسبت کتنی ہی بزرگ ہو۔

۲۔ باادب ہوتا کہ بزرگی نصیب ہو کیونکہ بزرگی ادب کا نتیجہ ہے۔

ف: حضرت ابن سیر رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ کون سا ادب اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی معرفت اُس کی طاعت پر عمل اور ہر سکھ پر حمد اور دکھ پر صبر۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ یہ لوگ علماءِ یہود کا ایک گروہ تھا۔

شانِ نزول: مروی ہے کہ فنحاص بن عازوا اور زید بن قیس یہود کے چند افراد حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو جنگِ احد کے بعد کہنے لگے: ''کیا تم سوچتے نہیں کہ تمہیں اس موقع پر کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں شکست نہ ہوتی۔ بنابریں تمہیں چاہئے کہ ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے۔ہم تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں''

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارے نزدیک عہد شکنی کتنا گناہ ہے؟'' انہوں نے کہا: ''گناہ کبیرہ ہے''

حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اب تم جواب دو کہ میں عہد کر چکا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر نہیں کروں گا''

یہود نے کہا: ''افسوس! کہ عمار ہمارے دین سے صابی ہو گیا اور ایسا خارج ہو گیا کہ اب اس کے لوٹنے کی امید بھی نہیں ہے۔'' پھر پوچھا: ''اے حذیفہ! تیرا کیا حال ہے؟'' انہوں نے فرمایا: ''میں اللہ کے رب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے اور اسلام کے دین اور قرآن کے امام اور کعبہ کے قبلہ اور مومنین کے بھائی ہونے پر راضی ہوں'' یہود نے کہا: ''اس رب کی قسم جو موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے تم دونوں کے دلوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے'' وہ دونوں حضور علیہ السلام کے حضور میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے بہت اچھا جواب دیا اور بڑی کامیابی حاصل کی''

خلاصہ یہ کہ بہت سے یہود لَوْيَرُدُّوْنَكُمْ تمہارے دین سے پھر جانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ کیونکہ لَوْ مصدریہ ہے یہ جب فعل کے بعد واقع ہوتا ہے تو اس میں تمنّی کا معنی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ یعنی آرزو رکھتے ہیں کہ تمہارے لئے توحید سے پھر جانے کا۔

مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ اے مومنین کے گروہ كُفَّارًا کہ تمہیں مرتد بنا دیں۔ لفظ كُفَّارًا، يَرُدُّوْنَكُمْ کی ضمیر مخاطب سے حال ہے اور ہو سکتا ہے کہ يَرُدُّوْنَكُمْ کا مفعول ثانی ہو جبکہ وہ يُصَيِّرُوْنَكُمْ کے معنیٰ کو متضمن ہو۔

حَسَدًا یہ فعل وَدَّ کی علت ہے۔ گویا کہا گیا ہے کہ حسد کی وجہ سے بہت سے یہود تمہارے مرتد ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ فعل وَدَّ کے متعلق ہو تو بھی جائز ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے نفسوں کی آرزو اور خواہش کے مطابق تمہارے مرتد ہونے کے متمنی ہیں نہ کہ بحیثیت دین کی تائید اور میل الی الحق کی خاطر۔ اگرچہ ان کا یہی خیال ہے کہ ہم دین کی محبت سے یہ آرزو رکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ کیونکہ جب ان کی ذاتی خواہش ہے تو دعویٰ حق کا کیا مطلب اور جائز ہے کہ حَسَدًا کے متعلق ہو۔ اب معنیٰ یہ ہوگا کہ یہ خواہش ان کے اصل نفسوں سے حسد کی وجہ سے بھڑک اٹھتی ہے اور حسد کے انتہائی درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ بعد اس کے کہ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق رسول

ہیں۔ان کا ہر قول برحق ہے اور ان کا دین بھی حق ہے۔اس لیے کہ ان کی تائید معجزات سے بھی ہو رہی ہے اور ان کی کتاب تورات میں بھی ان کے اوصاف درج ہیں۔ فَاعْفُوْا پس در گزر کرو۔

حل لغات: عفو بمعنی ترک عقوبت المذنب۔جیسے کہا جاتا ہے: عَفَتِ الرِّیْحُ الْمَنْزِلَ یعنی گھر کو ہوا نے مٹا دیا اور کہتے ہیں: عفا المنزل ویعفو بمعنی دَرَسَ متعدی ولازم دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور مجرم کے گناہ کو ترک کرنا۔گویا اس کے گناہ کو مٹا دینا ہے۔اس حیثیت سے کہ اس سے بدلہ لینے اور اسے سزا دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔چونکہ یہ معنی صَفح کو مستلزم نہیں،اسی لیے فرمایا: وَاصْفَحُوْا کیونکہ انسان کبھی معاف تو کر دیتا ہے لیکن اعراض نہیں کرتا۔

حل لغات: الصفح بمعنی ترک التقریع باللسان او الاستقصاء فی اللوم ۔جیسا کہ کہتے ہیں: صفحت عن فلان۔یہ اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ اس کے گناہ سے بالکل روگردانی کی جائے۔

اور اہل عرب کہتے ہیں: قَدْ ضَرَبْتُ عَنْهُ صَفْحاً (یعنی میں نے اس سے اعراض کر لیا اور اسے چھوڑ دیا)

اور عفو و صفح سے یہ مراد نہیں کہ ان کے افعال سے رضا کا اظہار کیا جائے۔کیونکہ انہوں نے تو اللہ تعالیٰ سے کفر کیا اور کفر کا اللہ تعالیٰ حکم نہیں دے گا۔ بلکہ مراد ہے کہ ان سے جنگ کرنا ان کی بری باتوں کا جواب دینا چھوڑ دو۔

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اللہ تعالیٰ اس حکم کے ساتھ حکم دیتا ہے جو اذنِ بالقتال اور جزیہ کا مقرر کرنا یا بنی قریظہ کو قتل کرنا اور بنی نضیر کو جلاوطن کرنا وغیرہ۔

شانِ نزول: مروی ہے کہ صحابہ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور کہا کہ ہمیں اجازت دے دیں کہ جن یہود نے کفر کیا اور مسلمانوں کو کفر کی طرف بلایا ہم ان سے لڑیں۔یہ آیت نازل ہوئی اور حکم کیا گیا کہ جنگ ترک کر دو اور ان کے مقابلہ سے روگردانی کر دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ آپ سے انتقام لینے پر قادر ہے اور جب وقت آئے گا تو ان سے ضرور انتقام لے گا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اس کا فَاعْفُوْا پر عطف ہے۔گویا انہیں صبر اور استقامت اور عبادت و نیکی کی طرف

رجوع کرنے کا حکم ہوا۔ مراد یہ ہے کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں فرائض وواجبات وتطوعات میں سرگرم رہو جیسا کہ قرینہ بتاتا ہے۔ وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ اگرچہ خیر تمام عبادات کو شامل ہے لیکن نماز اور زکوٰۃ کو خصوصی طور پر بیان فرمایا۔ ان کے عظیم الشان اور بلند قدر ہونے نے پر متنبہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ نماز عبادت بدنیہ ہے تاکہ انسان کا ہر عضو عبادت کر کے اللہ تعالیٰ کی نعمت عطا کردہ کی شکرگزاری کرے اور زکوٰۃ عبادتِ مالیہ ہے۔ اس میں اغنیاء کو ان نعمتوں کی شکرگزاری کا موقع مل جائے جو انہیں لذیذ عیش کی وسعت نصیب ہوئی وَمَا تُقَدِّمُوا جملہ شرطیہ ہے یعنی جو خیرات بھی ہو خواہ نماز ہو یا زکوٰۃ وغیرہ اپنی بہتری کے لئے آخرت کی طرف بھیجو۔ تَجِدُوْهُ یعنی عمل کا ثواب وجزاء نہ وہی بعینہٖ کیونکہ وہ باقی نہیں رہتے۔ علاوہ ازیں ان اعمال کے عین کے حصول میں رغبت دلائی جاتی۔ عِنْدَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے ہاں یعنی آخرت میں محفوظ پاؤ گے۔ یعنی اس کا ثمرہ جو کہ ایک لقمہ جو کہ احد پہاڑ کے برابر ہو جائیں گے۔ تقدیم (آگے بھیجنے کے حکم) میں اشارہ ہے کہ جو انعام اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرمائے ہیں۔ ان سے مقصد اصلی یہ ہے کہ اپنے لیے آخرت کا سامان بھیجیں اور آنے والے دن کے لئے ذخیرہ بنائیں۔

حدیث شریف: جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

جب بندہ مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کیا چھوڑا؟ فرشتے کہتے ہیں اس نے آخرت کے لئے کیا بھیجا۔ یعنی لوگ دنیا کی باتیں کرتے ہیں، فرشتے آخرت کے متعلق۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کو جانتا ہے خواہ تمہارے اعمال قلیل ہوں یا کثیر۔

ف: عمل کا لفظ عام ہے۔ نیک ہو یا برا۔ ترغیب ہو یا ترہیب۔ اعمال کی ترغیب اسی لیے ہونی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر نیک عمل پر اچھی جزا دیتا ہے۔ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ جیسے کہ برے کی سزا دے گا۔ خواہ وہ برا عمل تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اس کی بارگاہ میں کوئی عمل ضائع نہیں جاتا۔

حکایت: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جنت البقیع سے گزر ہوا تو فرمایا: "السلام علیکم یا اھل القبور" ہمارے حالات سنتے ہیں تو سن لو۔ وہ یہ کہ تمہاری عورتوں کے نکاح کر دیے گئے اور تمہارے مکانات میں اور لوگ بسنے لگے ہیں اور تمہارے مال تقسیم ہو گئے" آپ کے ان کلمات کے بعد ہاتف نے جواب دیا: اے ابن

الخطاب! ہمارا حال یہ ہے کہ جو اعمال ہم نے کیے ان کی ہمیں جزا مل گئی اور جو مال ہم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اس کا اچھا بدلہ مل گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم جو مال پیچھے چھوڑ آئے وہ گھاٹے میں ہے۔

کسی نے کیا خوب فرمایا ہے:

قدّم لنفسک قبل موتک صالحاً   واعمل فلیس الی الخلود سبیل

ترجمہ: اپنے لئے اگلے ملک میں موت سے پہلے کوئی نیکی بھیج اور اچھے عمل کر اس دنیا میں کسی نے نہیں رہنا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

تو غافل د۔ اندیشہ سود و مال   کہ سرمایہ عمر شد پائمال

غبار ہوا چشم عقلت بدوخت   سموم ہوا کشتِ عمرت بسوخت

بکن سرمہ غفلت از چشم پاک   کہ فردا شوی سرمہ در چشم خاک

ترجمہ:

۱: سود و مال کے فکر میں غافل ہو گیا، اسی طرح زندگی کا سرمایہ ضائع ہو گیا۔

۲: خواہشات کی غبار نے تیری عقل کی آنکھ سی دی، خواہشات کی زہریلی ہوا نے تیری کھیتی جلادی۔

۳۔ غفلت کا سرمہ آنکھ سے صاف کر، عن قریب تو خود خاک کی آنکھ کا سرمہ بننے والا ہے۔

ف: دنیا کے ہر عمل کا ثواب مرنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ صرف چند اعمال ایسے ہیں جن کا مرنے کے بعد ثواب ملتا رہتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ پہلا اپنی نیک کمائی سے مسجد بنوانا۔ پل تعمیر کروانا۔ رباط اور اوقاف فقراء کے لئے مقرر کر جانا۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ اپنی بوستاں میں فرماتے ہیں:

ازاں کس کہ خیرے بماند رواں   دمادم رسد رحمتش بر رواں

نمرد آنکہ ماند پس از وے بجائے   پل و مسجد و خان و مہمان سرائے

ہر آنکو نماند از پسش یادگار   درخت وجودش نیاورد بار

دگر رفت و آثار خیرش نماند   نشاید پس مرگ الحمد خواند

ترجمہ: جس کی مرنے کے بعد خیرات (نیکی) جاری رہی ہر لحظہ اس پر رحمت کی بارش ہوتی رہے گی۔ وہ مرتا نہیں جس کے

پیچھے پل، مسجد اور خیرات اور مہمان خانہ باقی رہا۔ جس کی مرنے کے بعد کوئی یادگار نہ ہو اس کے وجود کا درخت پھل نہ لائے گا۔ کوئی مرا اور نیکی چھوڑ کر نہ گیا اس کے پیچھے فاتحہ بھی نہ پڑھنی چاہئے۔

حدیث شریف: اسی طرح حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اپنے اعمال کی جزا ختم ہو جاتی ہے صرف تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب ملتا رہتا ہے دوسرا یہ کہ وہ عقل راجح سے فائدہ اٹھائے (یعنی علم پڑھے اور اس پر عمل کرے) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: اَوْعِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهٖ۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ قوتِ عقلیہ جس سے شرعی امور کا مخصوص قرآن وحدیث سے استنباط کرے۔ صحیح یہ ہے کہ حکم عام ہے خواہ علم کا فائدہ تصنیف سے ہو یا تعلیم و تدریس سے، لیکن علوم شرعیہ میں یا ایسے علوم ہیں جن سے شرعی امور متعلق ہیں۔ علم کو مفید ہونے کی قید اس لئے لگائی جاتی ہے کہ وہ علم جو کہ غیر مفید ہو اس سے ثمرہ کے حصول کا کیا معنی، وہ الٹا وبالِ جان اور موجبِ عذاب بنے گا۔

حدیث شریف: من كتم علما يعلمه الجم يوم القيمة بلجام من النار

(جو شخص اپنے علم کو چھپاتا ہے قیامت میں اس کے منہ میں جہنم کی لگام دی جائے گی)

امام سخاوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: یہ وعید اس شخص کے لئے بھی ہے جو اپنی کتاب کسی کو مطالعہ کے لئے نہیں دیتا۔ تیسرا وہ جو اس کے وجود سے صادر ہوں، جیسے نیک اولاد چھوڑ جائے حدیث شریف میں اسی طرف اشارہ ہے۔ وولد صالح يدعو له (یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعائے خیر کرے)

ولد کو صالح سے اس لیے مقید کیا گیا ہے کہ غیر صالح اولاد سے فائدہ کے حصول کا کیا معنیٰ؟

مسئلہ: اولاد کا گناہ والد کے نام نہیں لکھا جائے گا جبکہ اس کا ارادہ نیک ہو کہ اس کی اولاد نیک ہو۔ لیکن اولاد بد نکلی "يدعو له" کی قید میں ہر اولاد کو تنبیہ ہے کہ وہ اپنے والدین کے لئے ہر وقت دعائیں مانگیں نہ یہ کہ صرف مرنے کے بعد۔

مسئلہ: اولاد نیک دعا مانگے یا نہ مانگے والدین کو تو ثواب ضرور ملے گا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص درخت بوئے اور اس کی نیت لوگوں کو اس کے ثمرات سے فائدہ پہنچانے کی ہو تو اس کو اس کی نیت سے ثواب ملے گا خواہ لوگ اس کے ثمرات کھا کر اس کے لئے دعا مانگیں یا نہ مانگیں۔

مسئلہ : حدیث کے حکم میں اولاد کے ثواب میں ماں بھی داخل ہے۔

سوال : حدیث مذکورہ کو اس حدیث سے کیا مطابقت ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فلهٗ اجرها و اجر من عمل بها الی یوم القیٰمة

(جس نے کوئی نیک طریقہ اسلام میں جاری کیا اس کا ثواب اور اس پر عمل کرنے والے کا ثواب بھی اسے قیامت تک ملتا رہے گا)

پہلی حدیث میں تین شخصوں کے لئے مرنے کے بعد ثواب ملنے کا وعدہ تھا اب ایک اور بھی نکل آیا۔ اسی طرح

دوسری حدیث میں ہے: **من مات بختم عمله الا المرابط فی سبیل الله فانه له عمله الی یوم القیٰمة**۔

(جو شخص مرجاتا ہے اس کے عمل کے ثواب پر مہر لگ جاتی ہے (یعنی عمل کا ثواب آگے کوئی نہیں ملتا) ہاں مجاہد فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک بڑھتا رہے گا)

جواب : پہلی حدیث میں جو کہا گیا کہ جس نے اچھا طریقہ جاری کیا وہ علم مفید کے کھاتے میں شامل ہو گیا اور مجاہد فی سبیل اللہ کے عمل میں بڑھنے کا یہ معنی ہے کہ عمل تو اس کا وہی ہے جو اس نے زندگی میں کیا لیکن اس عمل کے ثواب میں برکت ہوگی اور حدیث میں ان اعمال کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کے مرنے کا اثر موجود ہے۔ اسی عمل سے ہی اس کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔

چوتھا یہ کہ اس کی روح کی پرورش سے اولاد معنوی پیدا ہو۔ مثلاً پیران عظام، مشائخ کرام، صوفیہ حضرات کہ جنہوں نے شریعتِ مطہرہ کے قواعد کے مطابق اپنے مریدین کی تربیت فرمائی تو ان کو بھی ان کے مرنے کے بعد ثواب ملے گا۔ ممکن ہے یہ حدیث کی پہلی قسم میں داخل ہو۔

وَقَالُوْا اور کہتے ہیں:

شانِ نزول : یہ آیت نجران کے وفد کے حق میں نازل ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں نصاریٰ مع یہود جمع ہو کر ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ یہودی بنی نجران کے متعلق کہتے ہیں کہ نصاریٰ بہشت میں نہ جائیں گے۔ یہود نے کہا ہمارے سوا کوئی بہشت میں داخل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے یہود و نصاریٰ کہتے ہیں: لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى

مَنْ كَانَ کے بجائے كَانُوْا نہیں فرمایا: مَنْ کے لفظاً مفرد ہونے کی جانب پر محمول کر کے اور خبر کو جمع لایا گیا۔ لفظ

مَن کے معنی پر محمول کرتے ہوئے اور هُودًا، ھائد کی جمع ہے۔ بمعنی تائب۔ جیسے فرمایا "هُدْنَا اِلَيْكَ" پہلے تو مدح کے طور پر ان لوگوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا جنہوں نے گوسالہ پرستی سے توبہ کی تھی لیکن پھر جب ان کی شریعت منسوخ ہوئی تو اب ایک جماعت لازمی پر استعمال ہونے کی وجہ سے اس کا اسم علم کی طرح ہو گیا۔

نَصٰرٰی: منصران کی جمع ہے۔ جیسے سکریٰ، سکران کی جمع ہے۔

تِلْكَ یعنی وہ غلط دعویٰ جو کرتے پھرتے ہیں کہ بہشت میں سوائے یہود ونصاریٰ کے اور کوئی داخل نہیں ہو گا۔

اَمَانِيُّهُمْ یہ صرف ان کی خواہشاتِ فاسدہ ہیں کہ جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں آرزوئیں پیش کرتے ہیں۔

حل لغات: اَمَانِيُّهُمْ، "اُمْنِيَة" کی جمع ہے۔ بمعنی وہ شئے کہ جس کی آرزو کی جائے۔ بروزن افعوله، اعجوبه کی طرح ہے۔ اہلِ عرب ہر اس چیز کو، جس میں کسی قسم کی دلیل نہ ہو، مجازاً تمنی وغرور واضلال واحلام سے موسوم کرتے ہیں۔

ف: اَمَانِيُّهُمْ جمع اس لیے لایا گیا کہ یہ تمنائیں دونوں یعنی یہود ونصاریٰ سے صادر ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کی لسانِ مبارک سے ان کے اقوال کے بطلان کی طرف اشارہ فرمایا۔

قُلْ هَاتُوْا **حل لغات:** هَاتُوْا دراصل اٰتُوْا تھا۔ ہمزہ سے تبدیل کیا گیا اور یہ عجمی امر ہے۔ ای احضروا۔

بُرْهَانَكُمْ یعنی وہ حجت پیش کرو جس میں ثابت ہو کہ بہشت میں صرف تم لوگ داخل ہو گے۔

سوال: براہین کو جمع کر کے کیوں نہ لایا گیا؟

جواب: ان سب کا دعویٰ ایک تھا وہ یہ کہ بہشت میں ہمارا غیر داخل نہیں ہو گا۔ فلہٰذا اس دعویٰ پر حجت ایک ہی پیش ہو گی۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، کیونکہ جس دعویٰ پر کوئی دلیل نہ ہو وہ دعویٰ ثابت نہیں ہوا کرتا۔

بَلٰى ان کا قول لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ الــــخ اثبات اور نفی دونوں پر مشتمل تھا۔ اثبات اس طرح کہ کہتے ہیں بہشت میں یہود ونصاریٰ داخل ہوں گے اور نفی اس طرح کہ وہ قائل تھے کہ ہمارے سوا اور کوئی بہشت میں داخل نہیں ہو گا۔

لفظ بَلیٰ اس کلام کے اثبات کے لئے آتا ہے جس کی وہ نفی کر رہے تھے۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص کرے کہ اس میں دوسرے کی شرکت نہ ہو۔ اَسْلَمَ ایک شئے کو دوسری شئے کے لئے خاص کرنا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ سالم اسی کے لئے مخصوص کرنا کہ اس میں کسی دوسرے کا حق نہ ہو۔ نہ بحیثیت تخلیق کے نہ بحیثیت مالکیت کے نہ بحیثیت استحقاق عبادت و تعظیم کے۔

سوال: اسے وَجْهَهٗ سے کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب: یہ تمام اعضاء سے اشرف ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ تمام حواس اور فکر و تخیل کا معدن ہے۔ یہ وہ مجاز ہے کہ جز کا ذکر کر کے کل مراد لیا گیا ہے۔ کَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ اسی سے ہے جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ "وجہ" کے اخلاص سے مراد ذات کا اخلاص کرنا مراد ہو کیونکہ جو شخص اپنے منہ سے سخاوت کرتا ہے وہ اپنے دیگر اعضاء سے بخل نہیں کرتا۔ اب "وجہ" سے مراد عضو مخصوص ہی ہوگا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ، اَسْلَمَ کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی وہ شخص اپنے اخلاص اور نفس کو اللہ تعالیٰ کی طرف خضوع و فرمانبرداری کے ساتھ سپرد کرنے کی وجہ سے تمام اعمال میں محسن ہے بایں طور کہ جو عمل بھی کرتا ہے وہ ٹھیک ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرنا اسے مستلزم نہیں ہے کہ وہ شرعاً بھی مستحسن ہو اور حقیقۃً احسان اور عمل کی ادائیگی علی الوجوہ اللائق یہی حسن صفاتی ہے جو حسن ذاتی کے تابع ہے۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبادت ایسے کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اگر ایسے نہیں ہوسکتا تو اتنا ضرور خیال رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یہی ایمان کی حقیقت اور احسان کا ظاہری معنی ہے اور احسان کا باطنی معنی وہی ہے جو حدیث قدسی میں فرمایا گیا:

کُنْتُ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ۔ (میں بندے کا کان اور آنکھ بن جاتا ہوں)

اور یہ مرتبہ نوافل کی ادائیگی سے ملتا ہے وہ یہی ذات حق اور اس کی ہستی بندہ کے صفات کا آئینہ بن جاتی ہے اور بندہ کے احوال ذات حق کا آئینہ اور اس کی ہستی کا مظہر ہوتے ہیں۔ بندہ باعتبار قرب النوافل کے ظاہر مرئی اور مشہور ہوتا ہے اور باعتبار قرب الفرائض کے حق ہوتا ہے۔

فَلَهٗ اَجْرُهٗ اسے اس کا ثواب ملے گا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بہشت کا وعدہ فرمایا ہے۔ گویا وہی اعمال بہشت

میں اس کے داخلہ کا سبب ہیں۔ان کے بغیر اس کا داخلہ قطعی محال ہے۔ عِنْدَ رَبِّہٖ اس کے اعمال اس کے مالک کے پاس محفوظ ہیں۔وہ اس کے امور کی تدبیر کرنے اور انہیں کمال تک پہنچانے والا ہے۔وہ نہ کسی کے اعمال کو ضائع کرتا ہے اور نہ ہی گھٹاتا ہے۔یہ عِنْدَ شریفیہ ہے ورنہ عِنْدَ مکانیت کا مقتضی ہے اور اللہ تعالیٰ مکانیت سے پاک ہے۔یہ جملہ مَنْ کا جواب ہے اگر اسے شرطیہ سمجھا جائے۔ورنہ خبر ہے اگر اسے موصولہ بنایا جائے اور چونکہ وہ متضمن بمعنی الشرط ہے اسی لیے اس کی خبر میں فاء آئی ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ نہ انہیں دنیا کا ڈر ہے اور نہ وہ آخرت میں غمگین ہوں گے جبکہ انہیں بہشت میں داخل کیا جائے گا۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بہشت میں داخل ہونے کے خبر دی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ

(سب تعریف ہے اس ذات کے لئے جس نے ہم سے تمام غم اور حزن دور فرمائے ہیں)

دنیا میں انہیں غم تھا کہ شاید زندگی میں کوئی مصائب اور تکالیف ہوں اور انہیں غم ہوتا ہے کہ جو اعمال کرنے کے لائق تھے وہ ان سے رہ گئے۔اسی طرح ایسی عبادات سے وہ جنت کا غم رکھتے ہیں کہ جن کی ادائیگی سے دائمی سعادت نصیب ہوتی ہے اس لئے کہ مومن کامل جس طرح اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتا اس طرح اس کے غضب اور عذاب سے بھی بے خوف نہیں ہوتا اور کوتاہ اندیش تو ضائع شدہ عمر اور ثواب کی محرومی سے روئیں گے کیونکہ خوف اسے کہا جاتا ہے کہ جس کی مستقبل میں امید ہو اور حزن وہ ہے جو زمانہ ماضی میں واقع ہو۔جو دنیا میں بے خوف ہو کر گزرے وہ آخرت میں غمگین ہوگا۔

مثنوی شریف میں ہے:

لاتخافوا ہست نزل خائفاں	ہست درخور از برائے خائف
ہر کہ ترسد مرد را ایمن کنند	آں مر دل ترسندہ را ساکن کنند
آنکہ خوفش نیست چوں گوئی مترس	درس چہ دہی نیست او محتاج درس

ترجمہ:

۱:۔خائفین کی مہمانی ہے لا تخافوا (نہ ڈرو) خائف اس مہمانی کے لائق بھی ہے۔

۲:۔جو ڈرتا ہے اسے بے خوف بناتے ہیں خوف والے دل کو تسکین بخشتے ہیں۔

۳:۔جسے خوف نہ ہو اس کے لئے بے سود ہے کہ کہا جائے نہ ڈر، اسے سبق کیا دیا جائے وہ سبق کے لائق نہیں ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ

اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے

الْيَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

یہودی کچھ نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح جاہلوں نے ان کی

مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

سی بات کہی تو اللہ قیامت کے دن ان میں فیصلہ کردے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے اور ان کی ویرانی

فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ

میں کوشش کرے ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے

فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ

دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب اور پورب

وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَقَالُوا

پچھم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) ہے بیشک اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ اور بولے

اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ

خدا نے اپنے لئے اولاد رکھی پاکی ہے اسے بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کے حضور

قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ

گردن ڈالے ہیں۔ نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ

كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ

ہوجا وہ فوراً ہوجاتی ہے ۔اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمیں کوئی نشانی ملے

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ

ان سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات ان کے دل ایک سے ہیں بیشک

بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ

ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے ۔ بیشک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا

وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا

اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا ۔ اور ہرگز تم سے یہود اور

النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ

نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو تم فرمادو اللہ ہی کی ہدایت ، ہدایت ہے اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو

اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ

ان کی خواہشوں کا پیروکار ہوا بعد اس کے کہ تجھے علم آچکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا

وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ

اور نہ مددگار ۔ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جیسی چاہئے اس کی تلاوت کرتے ہیں وہی

يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے منکر ہوں تو وہی زیاں کار ہیں ۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ اس میں ہر ایک فریق یہود و نصاریٰ کے ایک دوسرے پر گمراہی کا فتویٰ دینے کا بیان ہے عموم کے بعد خصوص ہے کہ اس میں علی العموم ہر ایک اپنے ماسوا تمام کو

گمراہی کا فتویٰ دے رہا تھا۔ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ یعنی نصاریٰ ایسے امر پر نہیں کہ جو صحیح قابل اعتماد ہو وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ ہر ایک نے کہا حالانکہ ہر ایک يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کتاب پڑھتا ہے الْكِتٰبَ میں الف لام جنس کا ہے۔ یعنی بے شک وہ اہل علم واہلِ کتاب واہلِ تلاوت ہیں اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں دوسری کتاب کی تلاوت کرتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ وہ باقی کتب کی تکفیر نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر ایک کتاب میں دوسری کی تصدیق ہوتی ہے۔ كَذٰلِكَ مثل اس قول کے کہ جو گمراہ علماء کا تم نے سنا ہے۔ یہ معنیٰ اس وقت درست ہے جبکہ کاف مثلیہ ہو اور اس کا محل نصب اور قَالَ کا مفعول بہ ہو۔

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ کہتے ہیں وہ لوگ جو لاعلم ہیں یعنی بتوں کے پجاری اور فرقہ معطلہ و دیگر گروہ گمراہ فرقے یعنی ہر ایک گروہ کہتا ہے کہ دیگر ہر ایک کسی قطار میں نہیں۔ مِثْلَ قَوْلِهِمْ کاف کے محل سے بدل اور اس میں بڑی توبیخ ہے اس حیثیت سے کہ ان کے نفوس کو باوجودیکہ اہلِ علم ہیں ان جاہلوں کے ساتھ ملا دیا گیا جو علم سے بالکل بے خبر ہیں۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ان فریقوں کے مابین فیصلہ فرمائے گا۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ اس میں کہ اختلاف کرتے ہیں قیامت میں فِيْمَا الخ کا متعلق يَخْتَلِفُوْنَ ہے اس کو مقدم صرف آیات کی محافظت کے لئے کیا گیا ہے۔ يَخْتَلِفُوْنَ اختلاف کرتے ہیں امرِ دین میں۔

سوال: اللہ تعالیٰ ان کے مابین کیسے فیصلہ فرمائے گا؟

جواب: گروہ کے لائق سزا مقرر فرمائے گا۔

ف: فعل يَحْكُمُ باء اور فِی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

هكذا حكم الحاكم في هذه القضية۔ (فلاں حاکم نے اس قضیہ کا فیصلہ یونہی فرمایا ہے)

آیت میں صرف محکوم فی کا ذکر ہے محکوم بہ کا ذکر نہیں۔

ف: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (ہر گروہ صرف اپنے معاملے پر خوش ہے)

یہ صرف گمراہ فرقوں میں نہیں بلکہ ہر شعبہ میں یہ خیالات جاری وساری ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صوفی اپنے مشن کو دوسرے کے مشن سے بہترین سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہر شیخ اپنے طریقے کو دوسرے کے طریقے سے اعلیٰ سمجھتا ہے اسی طرح ہر عالم اپنے مسلک کو دوسرے کے مسلک سے نمایاں محسوس کرتا ہے اور پھر ایک جماعت دوسری

جماعت کو غلط کار کہتی ہے اور یہ طریقہ ہمیشہ سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ راہِ ہدایت پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے جس سے فائدہ بھی ہو۔

ف: جو شخص دعویٰ کرے کہ وہی صاحبِ ارشاد اور اہلِ دل ہے لیکن تزکیہ نفس سے محروم اور اسے مبداء کا علم ہے نہ معاد کا، یقین کرو کہ یہ سب کچھ دنیوی لالچ میں کرتا ہے۔ ایسے آدمیوں کو ان عورتوں سے بھی زیادہ عذاب ہوگا جنہیں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں دیکھا کہ ان کے سینے کاٹے جا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ انہوں نے عرض کی: یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے زنا کیے اور حرام بچے جنے اور دعویٰ دلیل کے بغیر باطل ہے اور ایسا مدعی خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرے گا۔ اسے اسی زانیہ عورت کی طرح سمجھو اور اسی کی طرح وہ خواہش نفسانی میں گرفتار ہے۔ اسی عورت کا یہ ولد الحرام حقیقۃً ہلاک ہونے والا ہے کہ اس کی کوئی تربیت نہیں کرے گا اور بدعتی گمراہ کی فرمانبرداری بھی ایسے ہی ہے کہ اس سے بدعتِ سیۂ اور بے دینی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

حکایت: حضرت شیخ صدرالدین تبریزی سے عرض کیا گیا کہ تبریز میں ایک بہت مشہور شخص ہے اور علمِ عرفان میں یکتا ہے۔ اسی لیے لوگ اسے عارف کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ایک دن وہی شخص کسی ایک بزرگ کامل کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ عرض کی: نام تو محمود ہے لیکن لوگ مجھے عارف کہتے ہیں۔ اس بزرگ نے فرمایا: تجھے اپنی حقیقت معلوم ہے؟ اس نے کہا: میں نے بڑے بڑے مشائخ اور صوفیہ کی کتابیں اور مقالے پڑھے ہیں۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے عارف کہلاتا ہوں۔ بزرگ نے فرمایا: ان کا کلام تو حق ہے لیکن بتا تجھے اس سے کیا فائدہ!

پر خویش باید کرد پرواز　　　ببال دیگر نتواں پریدن

ترجمہ: اپنے پروں سے اڑنا چاہیے دوسروں کے پروں سے اڑنا ناممکن ہے۔

ف: نسخہ پر جب تک عمل نہ کیا جائے صرف اس کے لکھنے سے کیا فائدہ؟ یہ تو ایسے ہے جیسے کسی تاجر کو غلام لکھے کہ میں نے فلاں شہر سے فلاں فلاں سامان خریدا ہے۔ اب تاجر اعلان کردے کہ میرے ہاں فلاں فلاں سامان ہے اب جب تک وہ سامان اس کے پاس نہیں پہنچے گا صرف غلام کا لکھا ہوا کیا کام دے گا۔ اعلان کے مطابق

تک اس میں وہی مقصود حاصل نہ ہوگا۔ گویا وہ گری ہوئی اور خراب شدہ ہے اور مسجد کی تعمیر جیسے بناو اصلاح سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی حاضری ولزوم بھی تعمیر سمجھی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے: فُلَانٌ عَمَّرَ مَسْجِدَ فُلَانٍ (فلاں شخص فلاں مسجد میں حاضر ہوا کرتا ہے) آسمانوں کے ملائکہ کے مکینوں کو عمار یعنی تعمیر کنندگان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فضائلِ حاضری مسجد

حدیث شریف: ☆......حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جسے دیکھو کہ اسے مسجد کی حاضری کی عادت ہے اس کے متعلق ایمان کی گواہی دو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ مسجد کی حاضری کو تعمیر قرار دیا گیا ہے۔

☆......حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:۔ چھ خصلتیں حاصل کرو۔ تین سفر کی، تین حضر کی۔

تین حضر کی جو حاصل کرنی چاہئیں۔

☆......تلاوت قرآن ☆......مسجد کی حاضری ☆......اللہ تعالیٰ کی محبت میں دوست بنانا

تین سفر کی جو حاصل کرنی چاہئیں۔

☆......خرچ ☆......خوش خلقی ☆......خوش طبعی، بشرطیکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو۔

قیامت کی علامات میں سے ہے مساجد کے مینار بلند کرنا، انہیں منقش کرنا اور سنگارنا، لیکن حاضری نہ دینا اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غیر آباد رکھنا، اللہ تعالیٰ کی مساجد کو صلوٰۃ و تلاوت قرآن سے غیر آباد رکھنا اور ان میں شعائرِ اسلام ظاہر نہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بالخصوص جب دیکھو کہ شراب کے ابواب کھلے ہوئے اور مساجد کے دروازے بند ہیں وغیرہ۔ ہم نے اپنے زمانے میں روم کے اکثر بلاد کا مشاہدہ کیا ہے۔ اب تو دین کی غربت پر رونا چاہیے بلکہ خون کے آنسو بہانے چاہئیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

تفسیر صوفیانہ حضرت امام قشیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔ اس شخص سے کون زیادہ ظالم ہے جو شہوت سے عبادات کے مقامات کو ویران کرتا ہے۔ یعنی عبادت گزار لوگوں کے قلوب کو غلط آرزو اور گندے تعلقات سے خراب کرے اور محبت کے اوطان کو لذاتِ نفسانیہ اور خواہشات نفسانیہ سے تباہ کرنے والا بھی بڑا ظالم ہے اور اوطان المحبۃ سے وجد والوں کے ارواح مراد ہیں اور غیروں کی طرف متوجہ ہو کر

مشاہدات کے مقامات کو خراب کرنے والا بھی بہت ظالم ہے۔ اور اوطان المشاہدات اہلِ توحید کے قلوب ہیں۔

ف: آیت سے بیت المقدس اور بیت اللہ کی فضیلت بھی ثابت ہوئی۔

حدیث شریف: میں ہے: ''جو شخص ثواب کی نیت سے بیت المقدس کی زیارت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ہزار شہید کا ثواب عطا فرمائے گا اور اس پر آتشِ جہنم حرام ہے۔ اسی طرح جو شخص عالم باعمل کی زیارت کرتا ہے گویا اس نے بیت المقدس کی زیارت کی'' (کذافی مشکوٰۃ الانوار)

مسئلہ: قنیہ (کتاب) میں ہے کہ بیت اللہ شریف کی مسجد تمام مساجد سے افضل ہے۔ پھر مدینہ طیبہ کی مسجد، پھر بیت القدس کی مسجد، پھر دنیا کی جامع مساجد (جن میں جمعہ ادا کیا جاتا ہے) پھر اپنے محلہ کی مسجد، پھر شارع عام پر واقع ہونے والی مسجدیں، مرتبہ میں یہی مسجدیں کم درجہ والی ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں اعتکاف بیٹھنا بھی جائز نہیں اگر ان میں امام اور مؤذن مقرر نہ ہوں۔ ان کے بعد جو مساجد جو گھروں میں بنائی جاتی ہیں ان میں مردوں کو اعتکاف بیٹھنا جائز نہیں البتہ ان میں عورتیں اعتکاف بیٹھ سکتی ہیں۔

مسئلہ: حضرت شیخ مشہور با فتادہ آفندی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مسجد حرام اور مسجد مدینہ اور مسجد بیت المقدس کے بعد تمام مقامات کی مساجد سے زیادہ افضل شہر بروسہ کی بڑی جامع مسجد ہے۔ اس لیے کہ یہ جگہ اس بڑھیا کے مکان کی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لائی لیکن کشتی پر سوار نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اسے طوفان سے بچالیا۔ یہ بات کسی اہل کشف بزرگ کو کشف کے ذریعے معلوم ہوئی۔

مسئلہ: جو شخص یہاں (یعنی بروسہ کی جامع مسجد میں) عبادت میں مشغول ہو تو اللہ تعالیٰ اسے غفلت سے بچالے گا

مسئلہ: مکہ مکرمہ میں صرف ایک دن نہایت خشوع و خضوع سے عبادت کی جائے تو باقی مقامات کی ایک سال کی عبادت جیسی ترقی نصیب ہوتی ہے اور فرمایا: ہمارے ملک میں شغلِ عبادت کے دو بہترین مقام ہیں۔

۱:۔ شہر بروسہ میں سید بخاری علیہ الرحمہ کی جامع مسجد۔

۲:۔ قسطنطنیہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں۔

؎ عابد اندر نماز و عارفاں اندر نیاز عاشقاں از شوقِ وصل یار در سوز و گداز

ترجمہ: عابد نماز میں، عارف نیاز میں، عاشق محبوب کے شوقِ وصال کے سوز و گداز میں۔

دعا: یا اللہ! ہمیں ان لوگوں سے بنا جو تیرے شوق میں مستغرق ہیں۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اس سے زمین کی دو طرفیں مراد ہیں کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صرف مشرق و مغرب مراد لیے جائیں جبکہ تمام زمین اس کی مِلک ہے کوئی خاص زمین ملک و تصرف کے لئے مقرر نہیں اور نہ ہی عبادت کے لئے کوئی خاص محل معین ہے کہ فلاں مکان پر نماز جائز ہے اور فلاں پر نہیں۔ پھر اے کافرو! مسجد حرام یا مسجد اقصیٰ سے روکو گے تو ہم کسی دوسرے مقام پر نماز ادا کر لیں گے کیونکہ ہمارے لیے روئے زمین مسجد مقرر کی گئی ہے۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا جس طرف منہ پھیرو گے وہی تمہارا قبلہ ہے۔

حل لغات: وَلّٰی قبیل اضداد سے ہے۔ وَلّٰی بمعنی سامنے کو منہ کیا اور بمعنی پیچھے منہ پھیر۔

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یعنی وہاں پر وہی قبلہ کی جہت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا اور اسی سے راضی ہے کیونکہ اس کی طرف منہ کرنا کسی خاص مسجد یا مکان کے ساتھ مخصوص نہیں یا ثم سے اس کی ذات یعنی حضور علمی مراد ہے۔ اس لحاظ سے فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جز بول کر کل مراد لینا مجازاً ہے۔ اب معنی یوں ہوگا کہ جس طرف بھی منہ کر کے نماز پڑھو گے مجھے وہاں پاؤ گے۔ یعنی اس ذات تک پہنچنے کے لئے کسی مقام کی محتاجی نہیں کیونکہ وہ ذات نہ جوہر ہے نہ عرض، اسے کسی ایسے مکان کی ضرورت نہیں کہ جس میں وہ سمائے۔ جب اس کے لئے مکانیت ممتنع ہے تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس کا علم جمیع جہات اور مکانات کو محیط ہے۔ یعنی وہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے اسی لیے ان کی جزا بھی وہی دے گا۔

حدیث شریف میں ہے: ''تم اپنی رسی زمین کی تہ تک پھینکو تو اللہ تعالیٰ کی ذات وہاں بھی موجود ہوگی'' یعنی اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے۔ مطلب یہ کہ تمہاری رسی اس کے علم سے باہر نہیں ہوگی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تو مکانیت سے پاک ہے کیونکہ وہ تو مکانات کو پیدا کرنے سے بھی پہلے ہے۔ (کذا فی المقاصد الحسنہ)

ف: اَیْنَ ہمیشہ مکانیت میں استعمال ہوتا ہے یہاں بھی ایسے ہی ہے اور وہ تُوَلُّوْا کی وجہ سے منصوب ہے۔

اَیْنَمَا میں لفظ ما زائدہ ہے۔ صرف تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ اور ثَمَّ ظرف مکان یعنی هُنَاكَ (وہاں پر) کے معنی میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے: لَمَّا قَرُبَ مِنْ هٰهُنَا بَعُدَ ثَمَّ وهنا (جب وہ اس مکان کے قریب ہوا تو وہاں سے بعید ہو گیا)

ترکیب: وَجْهُ اللّٰهِ مبتدا مؤخر ہے اور لفظ ثَمَّ خبر مقدم ہے اور جملہ محلاً مجزوم ہے اس لیے کہ شرط کی جزا واقع ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ اللہ تعالیٰ مالک اور خالق ہونے کے لحاظ سے تمام اشیاء کو محیط ہے یہ جملہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کا تتمہ ہوگا۔ اسی طرح وسعت سے مراد وسعتِ رحمت بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اس معنیٰ پر مشتمل نہیں کہ عبادت اور صلوٰۃ صرف بعض مساجد سے مخصوص ہو، بلکہ جہاں چاہو زمین کے ہر گوشے پر عبادت اور نماز ادا کر سکتے ہو۔ تمام زمین تمہارے لئے سجدہ گاہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ شرعی احکام میں وسعت دیتا ہے اپنے بندوں کو ایسے امور پر مجبور نہیں فرماتا کہ جن کی ادائیگی ان کے لئے مشکل ہو۔ اس سے صرف بندوں کی سہولت مقصود ہے تاکہ وہ بآسانی عباداتِ الٰہی بجالائیں۔ قبلہ کی جہت بھی آسانی میں شامل ہے یہ عموم ہم نے لفظِ واسع کی وجہ سے سمجھا ہے۔

ف: حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ نے اسماء الحسنیٰ کی شرح میں فرمایا ہے: اَلْوَاسِع، "سِعَة" سے مشتق ہے۔ یہ وسعت کبھی وسعتِ علم سے منسوب ہوتی ہے جب کسی کی وسعت علمی معلوماتِ کثیرہ کو محیط ہو اور کبھی وسعت الی الاحسان اور وفورِ نعمت کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ لیکن علی الاطلاق واسع ذاتِ حق ہے اور بس۔ کیونکہ جب اس کے علم کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی معلومات کا کنارہ نہیں ملتا۔ بلکہ وہ دریاؤں کو روشنائی بنا کر اس کے کمالات تحریر کیے جائیں تو دریا ختم ہو جائیں گے مگر کمالات ختم نہ ہونے پائیں گے اگر اس کے احسانات اور انعامات پر غور کیا جائے تو بھی اس کے مقدرات کا کوئی حساب نہیں اور مخلوق میں جس کی وسعت کو دیکھو کوئی نہ کوئی انتہا ضرور ہے لیکن اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے جس کی کوئی انتہا نہ ہو اسی کو وسعت لائق ہے۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ علی الاطلاق ذاتِ واسع وہی اللہ تعالیٰ ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ ہر وسیع سے وسیع تر ہے اور ہر وسیع اوسع سے تنگ ظرف نظر آئے گا اور پھر جو وسعت کسی کنارہ تک ٹھہر جائے اس پر زیادتی مقصود ہے اور ہمارا رب تعالیٰ ایسا ہے کہ نہ تو اس سے کوئی اور اوسع ہے اور نہ ہی زیادتی تصور میں آسکتی ہے۔ بندہ اپنے عرفان میں جتنی ترقی بھی کر لے تاہم اپنی وسعت علمی کے مطابق محدود رہے گا بندہ کو چاہئے کہ اخلاق میں اتنی وسعت دکھائے جس میں فقر اور حاسدوں کا غیظ و غضب اور غلبہ حرص اور دیگر بری عادات کی گنجائش نہ ہو اسے بھی (مظہر) واسع کہا جاسکتا ہے۔ لیکن پھر

بھی محدود ہوگا۔ واسع مطلق صرف وہی حق تعالیٰ ہے۔ مثنوی شریف میں ہے ۔

اے سگ گرگیں زشت از حرص وجوش | پوستن شیر را بر خور مپوش
غرہ شیرت بخواہد امتحاں | نقش شیر و بانگ و اخلاق سگاں

ترجمہ: اے گندگی کے کتے حرص وہوس سے بھرپور شیر کی کھال مت پہن، شیر کا دھوکا تجھ سے امتحان لے گا کیونکہ تیری شکل شیروں کی اور آواز وعادات کتوں کی ہیں۔

عَلِیۡمٌ بندوں کی مصلحتیں اور اعمال اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں یہ تہدید اً فرمایا تا کہ بندہ عبادت میں سستی اور کمی نہ کرے۔ پھر اس میں نیک لوگوں کو خوشخبری بھی ہے کہ انہیں یقین ہوگا کہ جس کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ انہیں ہر وقت جانتا ہے۔

ربط: یہ آیت وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ الخ سے مرتبط ہے۔ اب معنی یہ ہوا کہ اے مومنو! اللہ تعالیٰ کے شہر وسیع ہیں اللہ تعالیٰ کی مساجد کو خراب کرنے والوں کی تخریب تمہیں عبادت سے نہیں روک سکتی۔ کیونکہ جس طرف بھی منہ کر کے نماز ادا کرو گے خدا کی ذات موجود ہوگی۔ فلہٰذا تمہاری عبادت ہر طرف منہ کرنے سے منظور ہوگی۔

شانِ نزول: حضرت مجاہد اور حسن فرماتے ہیں: جب آیت قَالَ رَبُّكُمُ ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ (تمہارا رب فرماتا ہے کہ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا) نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ سے کہاں دعا عرض کریں۔ اس پر یہ آیت: وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ الخ یعنی جس جہت جاؤ گے اللہ تعالیٰ موجود ہوگا۔ اسے کسی جہت اور تحیز کی محتاجی نہیں۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ جہت اور تحیز سے پاک ہے تو پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: ۱۔ تمام انبیاء اور اولیاء علیٰ نبینا وعلیہم السلام نے دعا کے وقت ہاتھ اٹھائے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے رحمت کے خزانے آسمانوں میں ہیں۔ کما قال: وَفِی السَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ (جن باتوں کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے اور تمہارا رزق آسمانوں میں ہیں) اور فرمایا:

وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ (کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم ہر شے کو اندازے سے معلوم کر کے نازل کرتے ہیں) نیز عرشِ معلی صفات رحمانیہ کے استقرار کا مرکز ہے۔ اسی لیے

دعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا جاتا ہے اے آقا! مجھے اسی خزانہ سے عطا فرمادے۔

حکایت: حضرت امام الحرمین قدس سرہٗ ایک بڑے بزرگ کے مہمان ہوئے وہاں بڑے بڑے علماء بھی مدعو تھے اور عوام بھی۔ ان میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور عرض کی: حضرت! میرا ایک عقدہ حل فرمایئے۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مکانیت سے تنزیہ پر کون سی دلیل ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی (رحمٰن عرش پر اپنے شان کے لائق مستوی ہے) اس پر حضرت امام صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مکانیت سے تنزیہ کی دلیل حضرت یونس علیہ السلام کا قول ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں عرض کیا:
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ٭ۖ اِنِّیۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ (تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بیشک میں ظالموں میں سے ہوں)
سب لوگ متعجب ہوئے کہ تنزیہ پر یہ دلیل کیسی؟ میزبان نے عرض کیا: حضرت! اس کی وضاحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا: اسی مجلس میں ایک فقیر محتاج ایک ہزار روپے کا مقروض ہے اس کا قرض ادا کرو پھر اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ میزبان نے قبول کرلیا۔ آپ نے فرمایا: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج بہت بلندیوں پر تشریف لے گئے تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا احصی ثناء علیک انت علی نفسک" (میں تیری تعریف کب بیان کرسکتا ہوں جیسے کہ تو نے اپنی تعریف فرمائی ہے) اور حضرت سیدنا یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ کے اندھیروں اور دریا کی تہ کے اندر پڑھا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ الخ دونوں حضرات اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوئے اور یہ خطاب حضوری ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی مکان میں نہیں

حدیث شریف: میں ہے: حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (تواضعاً) فرمایا: "مجھے یونس علیہ السلام پر فضیلت مت دو کیونکہ انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اسی ذات کے جلووں کو دیکھا جسے میں نے عرش کے وراء الورا میں دیکھا" اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سمجھایا کہ مجھے اور یونس علیہ السلام کو ذات حق کے جلوے نظر آئے۔

شان نزول: بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی طعن و تشنیع پر نازل ہوئی۔ جب کعبہ مکرمہ کی تبدیلی کا حکم ہوا۔ مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ساتھ مکہ کی

طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا تا کہ یہودیوں کی تالیف قلوب ہو اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تصدیق کریں۔

اس پر دوسرے لوگ بھی اسلام میں جلد شامل ہو جائیں گے۔سولہ ماہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے لیکن دل کی تمنا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمائے کیونکہ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اور اول القبلتین بھی وہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا آپ مسجد بنی سلمہ میں ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے ابھی دو رکعت پڑھی تھیں کہ ارشاد ہوا: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیجئے) اس حکم پر نماز میں ہی اپنے رخ مبارک کو پھیر دیا۔اسی لیے اس مسجد کا نام مسجد القبلتین پڑ گیا۔جب پھرنے کا حکم نازل ہوا تو اس میں بعض لوگ مرتد ہو گئے۔مسلمانوں کے لئے یہ ایک بڑی آزمائش تھی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ

(ہم نے قبلہ نہیں بنایا جس پر تم ہو صرف اس لیے تا کہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی تابعداری کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹتا ہے اور یہ سخت ہے مگر ان لوگوں پر آسان ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی)

اے اللہ! ہمیں ہدایت نصیب فرما اور اپنے دین پر ثابت قدم رکھ اور کافروں پر فتح و نصرت نصیب فرما۔

سبق: مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مضبوطی سے عمل کرے جیسے اس کا حکم ہو۔سر تسلیم خم کرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔عقلِ عاجز کو ان کے حکم کے سامنے جھکا دے اور فہم قاصر کو اس میں دخل نہ بنائے۔رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرسہ سے آداب حاصل کرے کہ جب بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا تو ادب سے سر جھکا دیا۔یہ نہیں سوچا کہ کیوں ایسا ہوا ہے پھر جب تک حکمِ ربانی نہیں ہوا چون و چرا کو گنجائش نہ دی بلکہ ارشادِ ربانی کے منتظر رہے۔اللہ تعالیٰ

نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم فرمائی کہ جس طرح آپ چاہتے تھے ویسا ہی کیا بلکہ آپ کو تمام انبیاء علیہم السلام کا سرتاج بنادیا۔

ف: تحویلِ قبلہ کا معاملہ دو گروہوں کو شاق گزرا اور دونوں ہی ذات حق سے محجوب تھے۔

پہلا گروہ وہ تھا جنہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ جب بھی بیت اللہ سے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا تھا یہی مقام مکاشفہ سے عروج کی صورت تھی۔ یعنی آپ کو مقامِ قلب سے مقامِ مشاہدہ (جسے عروج کہا جاتا ہے) کا عروج ہوا۔ پھر ان کا گمان تحویلِ قبلہ کو بعد القرب اور نزول بعد العروف سمجھ بیٹھے اور انہیں بدگمانی ہوئی کہ پہلے والا مرتبہ اشرف تھا۔ وہ (معاذ اللہ) ضائع ہو گیا اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ان کا یہ خیال تھا کہ اب تحویل قبلہ سے آپ اپنے عروف مرتبہ سے گر گئے۔ اس بدگمانی سے ان پر تحویلِ قبلہ شاق گزرا اور اسلام کی دولت سے محروم ہو گئے۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ وہ صورت ہے جسے رجوع الی مقام القلب کہا جاتا ہے۔ جو دعوت کے لئے حالت تمکین میں نصیب ہوتی ہے۔ بلکہ اسی کا نام مشاھدۃ الجمع فی عین التفصیل اور مشاھدۃ التفصیل فی الجمع ہے۔ اسی مقام تک پہنچ کر بندہ نہ وحدت کے ساتھ کثرت سے محجوب ہوتا ہے اور نہ کثرت کے ساتھ وحدت سے محجوب ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ تھا جنہیں اپنے اعمال سے پیار تھا۔ انہیں تحویل قبلہ کا راز معلوم نہیں تھا انہیں گمان تھا کہ تحویل قبلہ سے ہماری عبادت ضائع ہو گئی اور جن کا ازلی بخت یاور تھا وہ کسی گمان میں نہ پھنس سکے اس پر انہیں راہِ راست نصیب ہوا اور توحید ذاتی محمدی کے شرف سے مشرف ہو گئے۔

اے اللہ! ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں سے بنا اور انبیاء و مرسلین کے ساتھ محشر میں اٹھا۔

تفسیر صوفیانہ اہل تاویل حضرات فرماتے ہیں کہ وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ سے مراد عالم نور و ظہور ہے کہ جس جہت کو نصاریٰ نے قبلہ سمجھا ہوا ہے ان کا قبلہ تو دراصل اس کا باطن چاہیے تھا اور عالمِ ظلمت و مستورہ ہے جسے یہود نے اپنا قبلہ سمجھا ہے ان کا قبلہ خود درحقیقت اس کا ظہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو سمجھایا کہ تم جس جہت کی طرف متوجہ ہو گئے جائز ہے اس لیے کہ وہ متجلی وانور روشن ہے کیونکہ جب وہ اپنے جلوے تمہارے قلوب پر ظاہر فرماتا ہے تو وہ جلوہ اس کا صفتِ جمالیہ سے ہے جو تمہیں مشاہدہ اور فانی

ہونے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ لیکن جب تم اس سے دور ہو جاتے ہو اور درمیان میں پردہ آ جاتا ہے تو یہ صفتِ جلالیہ ہے جو تمہیں بحالتِ بقا بعد الفنا نصیب ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے تم جہاں توجہ کرو گے وہاں ہی اللہ تعالیٰ کے جلوے ہوں گے کیونکہ اس کے سوا تو ہے بھی کچھ نہیں۔ حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

میانِ کعبہ و بت خانہ ہیچ فرقے نیست ہر طرف کہ نظر میکنی برابر اوست

ترجمہ: کعبہ و بت خانہ میں کوئی فرق نہیں جہاں سے دیکھو گے وہی نظر آئے گا۔

سبق: بندہ کو وہ مقام حاصل ہو جائے کہ نہ وہ حق سے محجوب ہو اور نہ حق اس سے محجوب ہو۔ اس کیفیت میں تمام پردے ہٹا دیے جاتے ہیں۔ اسے صوفیہ کرام کی اصطلاح میں مقام جمع الجمع اور بقا کہا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ تجلی عینی سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت شیخ بہ افتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل کے لئے آگ حاصل کرنیکی غرض سے کوہِ طور پر پہنچے تو انہیں پہلے یہ حکم ہوا اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ دیکھئے یہاں سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو ربوبیت کے جلوے دکھائے گئے بعد ازاں فرمایا:۔

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ۝ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ (اے موسیٰ! میں نے آپ کو اپنے لئے چن لیا۔ اب وحی سنیے۔ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میری ہی عبادت کرنا) اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا جلوہ دکھایا بعد ازاں بھی ذات کے جلوؤں سے نوازا پھر حکم فرمایا کہ اب جاؤ فرعون کی رہبری کرو۔ موسیٰ علیہ السلام اہل و عیال کی پرواہ کئے بغیر سیدھے فرعون کے پاس پہنچے۔ جب آپ رسالت کا پیغام لے کر ملکِ مصر میں داخل ہوئے آدھی رات تھی۔ فرعون کے دروازے پر اپنے عصا سے دستک دی تا کہ تعمیلِ ارشادِ خداوندی میں تاخیر واقع نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ دروازہ کی دستک سے ہیبت کے مارے فرعون کی داڑھی سفید ہوگئی۔ جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو کہا: تو ہمارا پروردہ نہیں ہے؟ ایک عرصہ تک ہمارے ہاں رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، میں وہی ہوں۔ اسی لیے تو میں تیرا حق ادا کرنے آیا ہوں کہ سب سے پہلے تجھے ہی دعوتِ حق دوں۔ اس بات کو سن کر فرعونیوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔ آپ نے اپنا عصا نیچے پھینکا تو وہ بڑا اژدھا بن گیا جو سب کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ تو سب نے موسیٰ علیہ السلام سے پناہ کی التجا کی۔ آپ نے ان کو امان دے دی۔ اس معجزہ کے پیشِ نظر فرعون تو مومن ہونا چاہتا تھا لیکن ہامان بد بخت نے اسے روکے رکھا۔

فرعون کو دعوتِ حق دے کر آپ وہاں پہنچے جہاں اپنے اہل وعیال کو چھوڑ آئے تھے۔ دیکھا کہ آپ کی اہلیہ جَن چکی ہیں۔ قدرت نے ان کی حفاظت کے لئے بھیڑیے مقرر فرما دیے۔ بھیڑیاں کی نگرانی سے کسی کا بھی وہاں سے گزرنا ممکن نہ تھا۔

سبق: سبحان اللہ! قادر قدیر کی کیا ہی نرالی شان ہے۔

فضیلتِ حنفیت: ہمارے امام اعظم (سیدنا ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ) نے بہ ذاتِ خود اپنے مسلک کی اشاعت کا کبھی ارادہ نہ فرمایا لیکن حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ابوحنیفہ! اس مذہب کو خوب پھیلاؤ۔'' یہ حکم آپ کو عالمِ رؤیا میں ہوا۔ حالانکہ خود امام صاحب اس سے دور رہنا چاہتے تھے۔ آپ کی دلیل ہمارے حنفی مذہب کی حقانیت کے لئے شاہد وعادل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود حکم فرمائیں۔ اس کے وصول الی الحقیقۃ میں کسی قسم کا وہم تک نہیں ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہٗ ساری ساری رات عبادت میں مشغول رہتے تھے ایک دن کعبہ میں ہی ہاتف سے سنا کہ اے ابوحنیفہ! تو نے میرے دین کے لئے مخلصانہ خدمات انجام دیں اور میری معرفت کا حق ادا کر دیا فلہٰذا میں نے تجھے اور تیرے مذہب پر چلنے والوں کو بخش دیا۔ (کذا فی عین العلم للشیخ محمد بلخی)

مسئلہ: بعض عارفین سے منقول ہے کہ انسانوں کا قبلہ کعبہ مکرمہ، آسمان والوں کا قبلہ بیت المعمور، کروبیوں کا قبلہ کرسی اور حاملین عرش کا قبلہ عرشِ معلی ہے۔ سب کا مقصودِ اعظم ذاتِ حق ہی ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَقَالُوا اور کہا: **شانِ نزول:** جب یہود نے کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح نصاریٰ نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور کفار نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ بیٹیاں ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ قَالُوا کی ضمیر ان تینوں کی طرف لوٹتی ہے۔ یہود ونصاریٰ نے صراحۃً اور مشرکین نے اشارۃً کہا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ یعنی یہود ونصاریٰ کی طرح یہ لوگ کہتے ہیں اور جو کچھ یہ جاہل کہا کرتے ہیں یہ یہود ونصاریٰ بھی ان کے شریک ہیں۔ اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا

حل لغات : اتخاذ یا تو بمعنی الصنع والعمل کے ہے۔ اس معنی پر صرف ایک مفعول کی طرف متعدی ہو گا یا بمعنی تصبیر کے ہے۔ (جسے دو مفعول چاہیے) اس معنی پر یہاں پر اول محذوف ہو گا۔ عبارت یوں ہو گی: اتخذ ای صیراً. یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ بنایا اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض مخلوق سے اور فلاں فلاں کو اولاد بنایا ہے۔ (معاذ اللہ) یہ بات ہرگز نہیں کیونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد یا متبنیٰ بناتا ہے اور نہ ہی اس کی شان ہے کہ کسی کو بیٹا بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تنزیہ بیان کی۔ سُبۡحٰنَهٗ

حل لغات : سُبحَان دراصل سَبَحَهٗ، سبحاناً تھا۔ اگر سبحان" کو بمعنی تسبیح کا مصدر قرار دیا جائے۔ یعنی سبحان کو بمعنی تنزیہ کہا جائے تو اب مطلب یوں ہوا کہ وہ باری تعالیٰ اس سب سے بھی منزہ ہے۔ جو اولاد کا مقتضی ہو۔ یعنی وہ اس کی طرح محتاج ہے کہ زندگی میں اس کی اعانت کرے اور مرنے کے بعد اس کے قائم مقام ہو اور اس سے بھی منزہ ہے کہ اسے ولدیت کا تقاضا ہے یعنی تشبیہ سے کیونکہ ولد اپنے والد کی جنس سے ہو گا پھر اللہ تعالیٰ کے لئے کس طرح ولد کا ہونا صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کی مثل کوئی شئے ہو حالانکہ اس کی مثل کوئی شئے نہیں۔

مولانا روم قدس سرہٗ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں:

لم یلد ولم یولد است اوز قدم ۔۔۔ نے پدر دارد نہ فرزند و نہ عم

ترجمہ: وہ قدیم سے لم یلد ولم یولد ہے نہ اس کا باپ ہے نہ بیٹا نہ چچا۔

بَلۡ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ

ربط: ان کے قول مذکور کی تردید اور ان کے قول کے فساد کا بیان ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ باطل لوگوں کے قول سے اعراض کرنا بھی ان کے قول کی تردید ہے اور وسیط میں ہے:

بَلۡ ای لَیۡسَ الۡاَمۡرُ الخ ۔ یعنی جس طرح وہ گمان کرتے ہیں اس طرح نہیں۔ اب معنی یہ ہوا کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے جس میں عزیر و عیسیٰ اور ملائکہ علیہم السلام بھی ہیں۔

خلاصہ : یہ ہوا کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی اولاد نہیں۔

كُلٌّ سب کے سب جو زمین میں ہے، ذوی العقول یا غیر ذوی العقول لَّهٗ اللہ تعالیٰ کے لئے قٰنِتُوۡنَ فرماں بردار ہیں۔ اس کی مشیت و تکوین سے کوئی شئے ممتنع نہیں اور ہر وہ شئے کہ جس کی بھی شان ہو کہ وہ ایک

مخلوق ہو تو وہ اپنے خالق واجب بذاتہ کی ہم جنس نہیں ہوا کرتی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے لئے اولاد نہیں۔ کیونکہ بیٹے کا حق ہے کہ وہ اپنے بیٹے کا ہم جنس ہو۔

سوال: پہلے ان تمام کو غیر ذوی العقول سے تعبیر فرمایا اور اب انہیں قَانِتُوْنَ فرما کر ذوی العقول سے تعبیر کیا جارہا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ان عقلمندوں کی تحقیر مطلوب ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کر رہے ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

حل لغات: بَدِيْعُ بمعنی مُبْدَع" اور مُبْدَع" اسے کہتے ہیں جو کسی شئے کو اس طرز میں پیدا کرے جس کی پہلے کوئی مثال نہ ملے اور اِبْدَاع "بمعنی اِخْتِرَاعُ الشَّیْءِ الخ یعنی کسی شئے سے دفعۃً پیدا کرنا۔ یعنی نہ ان کا پہلے کوئی مادہ موجود ہو نہ اس کے پیدا کرنے میں کوئی مدت گزرے اور بدعتی کو بھی مُبْدِع" اس لیے کہتے ہیں کہ جس طرح بدعت ہے اس کی نظیر ارباب شرع میں نہیں ملتی یا آیت کا یہ معنیٰ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ پہلے معنیٰ کے اعتبار سے اَبْدَعَ سے ماخوذ ہوگا اور اضافت معنوی ہوگی۔ دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے بَدَعَ سے ماخوذ ہوگا۔ جبکہ کسی شکل میں فوقیت اور دل لبھانے والا حسن ہو۔ اب اضافت لفظیہ ہوگی یہ ان کے برے قول کی دوسری تردید ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ والد ولد کا عنصر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ولد اس کے مادہ سے اثر گیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو علی الاطلاق مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ اثر لینے دینے سے پاک ہے۔ نتیجہ نکلا کہ وہ کسی کا والد نہیں۔ علاوہ ازیں جب وہ آسمان و زمین کو بغیر کسی مادہ کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو وہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کرنے پر کیوں نہ قادر ہوگا۔

وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا جب کسی شئے کے متعلق ارادہ کرتا ہے۔

حل لغات: قَضَاء" بمعنی احکام، یعنی کسی شئے کو کسی شئے کے سہارے کے بغیر مضبوط کرنا۔

جب وہ ہر شئے پر قادر ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کرنے پر کیوں قادر نہیں۔

فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ بیشک اللہ تعالیٰ جس شئے کو فرماتا ہے" ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے۔ جس میں کسی قسم کا توقف نہیں ہوتا اور نہ ہی انکار ہوتا ہے۔ یہ دونوں کَانَ تامہ ہیں بمعنی اَحْدَثَ فَيَحْدُثُ یعنی فرماتا ہے ہو جا

تو وہ ہو جاتی ہے۔

عقیدہ : اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اشیاء کے وجود کا تعلق کُن سے متعلق ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق وایجاد اور تکوین سے متعلق ہے۔ یہ ازلی صفت ہے۔ کُن کا مطلب ہے کہ صرف اتنا کہنے سے اللہ تعالیٰ اشیاء کو پیدا کرتا ہے جس میں کسی قسم کی تاخیر نہیں یہ اس کی کمال قدرت کی علامت ہے۔

یہ کسی کے علم میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اشیاء سے تعلق کس طرح ہے اس کی بحث نہیں چھیڑنی چاہیے اور نہ ہی خالق کی کیفیت سے بحث کرنی چاہیے اور نہ ہی بعد از موت کے عذاب سے بحث کرنی چاہیے۔ اسی طرح کے اور بہت سے مسائل ہیں۔ کیونکہ یہ دقیق اسرار ہیں۔

مسئلہ : وہ لوگ دو باتوں سے گمراہ ہوئے:

☆......اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کرنے سے۔ ☆......یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے اولاد منتخب فرماتا ہے۔

حدیث قدسی: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''بنو آدم میری تکذیب کرتے ہیں (یعنی مجھے کذب کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات اس کے شایانِ شان نہیں) اور پھر مجھے گالیاں دیتے ہیں (یہ بھی اسے لائق نہیں تھا) میری تکذیب تو یوں کرتے ہیں کہ ان کا گمان ہے کہ میں انہیں مرنے کے بعد اٹھانے پر قادر نہیں، اور ان کی گالیاں یوں ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے حالانکہ میں اس بات سے منزہ ہوں کہ اولاد وازواج اپنے لیے بناؤں'' یہ گالیاں اس لیے کہ ولد بمعنیٰ جز کا کُل سے نکالنا اور یہ ترکیب کو چاہتا ہے اور ہر مرکب محتاج ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے۔

سوال: جس طرح اس کے لئے اولاد کی نسبت کرنا گالیاں ہیں اسی طرح اس کے لئے مرنے کے بعد لوٹانے کی قدرت سے انکار بھی گالیاں ہیں۔ کیونکہ کسی شئے پر قادر نہ ہونا عجز کی علامت ہے اور اس کے لئے عجز کی نسبت کرنا بھی گالیاں ہیں۔ پھر ایک کو گالیوں سے اور دوسرے کو تکذیب سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیوں؟

جواب : قیامت میں دوبارہ لوٹانے کی نفی سے اس کی صفتِ کمال کی نفی ہوتی ہے اور اس کے لئے اولاد کی نسبت ایک صفت نقصان ثابت کرنا ہے۔ پھر یہ قاعدہ ہے کہ شتم تکذیب سے زیادہ فحش ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے جھوٹ کی نسبت نبی علیہ السلام پر جھوٹ کی نسبت سے زیادہ بُرا ہے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ مجھ پر جھوٹ کی نسبت عام آدمیوں کی طرح نہیں۔

یعنی مجھ پر جھوٹ کی نسبت بہت بڑا گناہ ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات مستثنیٰ ہے کیونکہ حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنے سے قواعدِ اسلام کو مٹانا اور شریعت واحکام میں فساد ڈالنا ہے۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''جو شخص میری طرف جھوٹ کی نسبت کرتا ہے وہ جہنمی ہے''

مسئلہ: پہلی شریعت میں اللہ تعالیٰ کو باپ کہہ لینا جائز تھا۔ اسی طرح کسی بڑے کو الٰہ کہنا بھی جائز تھا۔ یہاں تک کہ یوں بھی کہہ دیتے کہ باپ ربِ اصغر اور اللہ تعالیٰ ربِ اکبر۔ مقصد یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے پیدا کرنے میں سببِ اول ہے اور باپ پرورش کے لحاظ سے سببِ آخر ہے۔ اسی اعتبار سے باپ بیٹے کا من وجہ معبود ٹھہرا۔ معبود بمعنیٰ مخدوم سمجھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو رب کہنے کے جواز سے جاہلوں نے سمجھ لیا کہ یہ اس کے محبوب بندے طبعی ولادت کے لحاظ سے اس کی اولاد ہیں۔ اس کے بعد اندھی تقلید سے بعد والوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کرنی شروع کر دی۔

مسئلہ: چونکہ جاہلوں کو ایک شرعی مسئلہ سے غلط فہمی ہوئی اس لیے اب مصلحتاً اللہ تعالیٰ کو باپ کہنے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو انبیاء کہنے سے روکا گیا ہے بلکہ اس کے قائل کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ خواہ اس کی ولادت سے ولادتِ سببیہ مراد ہو یا ولادتِ طبعیہ۔ تاکہ غلط عقیدے کی جڑ سرے سے ہی کاٹ دی جائے۔

مسئلہ: اللہ تعالیٰ کسی کو حبیب یا خلیل بنائے اسے اللہ تعالیٰ کا حبیب یا خلیل کہا جائے تو جائز ہے کیونکہ محبت کے الفاظ سے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں پیدا ہو سکتی۔

☆......ان کی کتاب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی:

وَلَّدْتُکَ وَاَنْتَ نَبِیّ" (میں نے تجھے پیدا فرمایا اور تو میرا نبی ہے)

لیکن یار لوگوں نے ولّدتک کی لام کو مخفف کر کے پڑھا اور لام کی شد کو بالکل اڑا دیا تاکہ معنیٰ یہ ہو جائے کہ میں نے تجھے بیٹا بنا دیا (معاذ اللہ) کیونکہ لام مشدد سے تولید مشتق ماننا پڑتا ہے۔ جس کا معنیٰ ہے کہ پیدا کرنا۔

☆......نَبِیّ" میں ''ی'' کو ''ن'' کی جگہ اور ''ن'' کو ''ب'' کی جگہ پر قلب مکانی کر کے پڑھا، جس کا نبی کی

بجائے بُنَیّ (میرا بیٹا) کا معنیٰ بن جائے۔(تعالی اللہ عما یقول الظالمون)

☆......ایک وحی یوں تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب فرمایا: یَا اَحْبَارِیْ وَیَا اَبْنَاءَ رُسُلِی (اے میرے علماء اور میرے رسولوں کی اولاد) انہوں نے احباری کے بجائے احبائی اور اَبْنَاء رُسلی کی بجائے یا ابنائی پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ کماقال: وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبّ ہیں) پھر فرمایا: قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (ان سے پوچھیے اگر ایسی بات ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے، بلکہ تم بشری مخلوق ہو)

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ حدود و جہات سے منزّہ ہے اور ازواج بنین و بنات سے پاک ہے نہ اس کی کوئی مثل ہے زمین میں نہ آسمان میں۔

سبق: مومن پر لازم ہے کہ وہ ٹیڑھا پن اور گمراہی اور برے اعمال اور گندے اقوال سے بچتا رہے اور ہر صبح و شام توحید کا پابند رہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اندر شرکِ خفی کو بھی نہ گھسنے دے۔

حدیث شریف: اگر امیر کو معلوم ہو جائے کہ ذکرِ الٰہی میں کیا فائدے ہیں تو امیری کو اور تاجر اپنی تجارت کو ختم کر دے۔ اسے صرف اس کی ایک بار تسبیح (سبحان اللہ) کہنے کے ثواب کو تقسیم کیا جائے تو اس دنیا کو دس دنیا بنایا جائے تو اس کی تسبیح کا ثواب ہر ایک کو پہنچے گا۔

حدیث شریف: مومن کے تین مضبوط قلعے ہیں:

☆......ذکر اللہ ☆......قرأۃ القرآن ☆......مسجد شریف

ف: مسجد سے اس کی نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے خواہ اس کے گھر میں ہو یا باہر۔ لیکن عبادت میں صدق اور اخلاص ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اس کی عبادت کی جھلک مُلک و ملکوت میں نمایاں ہو۔

حضرت مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

ہست تسبیحت بخار آب وگل مُرغ جنت شد ز نفخ صدقِ دل

ترجمہ: تیری تسبیح آب و گل کا بخار ہے صدقِ دل کا پھونک بہشت میں مرغ بنے گا۔ (یعنی بہترین کھانے)

اے اللہ! ہمیں یقین کے درجہ تک پہنچا اور ہمارے لیے تمکین کے مقامات میں سے کوئی مقام تیار فرما۔ آمین۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مشرکین عرب (جو حقیقۃً جاہل ہیں) ایک اہل کتاب (جو عمداً جاہل بننے والے ہیں) کہتے ہیں ان سے علم کی نفی عدمِ انتفاع کی وجہ سے ہے کیونکہ علم سے مقصود عمل ہوتا ہے۔

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ ترکیب: لَوْلَا تخصیص کے لئے ہوتا ہے اور تخصیص کے حروف جب ماضی پر داخل ہوتے ہیں تو اس وقت توبیخ اور کسی فعل سے روکنا ای لم یفعل اور مضارع میں فاعل کو فعل کی طلب پر ابھارنا مقصود ہوتا ہے اور نیز فعل پر ابھارنا بھی بمعنی امر کے ہوتا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ بالمشافہ گفتگو کیوں نہیں فرماتا۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جیسا کہ ملائکہ کے ساتھ بلاواسطہ کلام کرتا ہے۔ یا ہمارے ہاں فرشتہ کیوں نہیں بھیجتا تاکہ اس فرشتہ کے واسطہ سے ہمارے ساتھ کلام فرمائے کہ واقعہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ جیسا کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اسی طریقہ سے کلام فرمایا۔ یہ قول جہلاء بطور تکبر کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہم بھی ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کی طرح معظم بالشان ہیں۔ جب ہم ان کی طرح ہیں تو یہ کلام کا اختصاص ان کے ساتھ کیسا۔

اَوْ تخییر کے لئے ہے۔ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ یا ہمارے پاس کوئی ایسی حجت آئے جو آپ کی صداقت پر دلالت کرے۔ یہ بھی ہٹ دھرمی تھی ورنہ یہ قرآن اور دیگر معجزات کیا معمولی دلائل ہیں۔

ف: جحود انکار مع علم کو کہتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ نفس (جو حقیر ترین ہے) کو اشرف سمجھ کر ان آیات بینات کی اہانت کر رہے تھے جو سب سے عظیم الشان تھیں كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ سابقہ امتیں بھی یونہی کہا کرتیں۔ چنانچہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً اور لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ اور نصاریٰ کہتے تھے: هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ وغیرہ وغیرہ۔

ف: كَذٰلِكَ قَالَ پھر مِّثْلَ قَوْلِهِمْ میں دو تشبیہیں ہیں۔

☆......تشبیہ المقول بالمقول مؤدیٰ و ماحصل میں۔

☆......تشبیہ القول بالقول لغیر رؤیۃ میں۔

غرض پر) اور کَذٰلِكَ منصوب المحل اور قَالَ کا مفعول ہے مِثْلَ قَوْلِهِمْ اور مفعول مطلق ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی: قال الکفار الامم الماضیہ۔

یعنی گزشتہ امتوں کے کفار بھی انکی طرح کہا کرتے تھے جس طرح یہ کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک تشبیہ دوسری تشبیہ سے بے پرواہ نہیں کرتی۔

تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ان کے اور گزشتہ لوگوں کے قول سے وجہ تشبیہ کی وجہ تعلیل بیان کرنے میں ان کے ولد آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے دل میں اگر کفر وقسوۃ اور اندھا پن، بے وقوفی اور عناد گھر کر جائے تو زبان سے بھی تعلل اور تباعد عن الایمان کا پتا چلتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

مرد پنہاں بود بزیر زبان چوں بگوید سخن بداننش

خوب گوید لبیب گویندش زشت گوید سفیہ خوانندش

ترجمہ:

☆...... انسان زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے جب بولتا ہے تب معلوم ہوتا ہے۔ ☆...... خوب بولے تو اسے دانا سمجھتے ہیں غلط بولے تو اسے بیوقوف کہا جاتا ہے۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ انہیں ہم نے حجت بیان کردی کہ ان کو اب یقین ہے کہ واقعی ان کا کوئی معبود ہے۔ جیسا کہ اہلِ عرب کہتے ہیں: سبحان من صغر البعوض الخ۔ (وہ ذات پاک ہے جس نے مچھر کو چھوٹا کر کے اور ہاتھی کو بڑا کر کے پیدا کیا) اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیزیں پہلے حجت نہ تھیں اب حجت ہوگئیں بلکہ ہمیشہ حجت ہیں۔

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو یقین کے طالب ہیں، طلب کرتے ہیں۔

ف: یقین علم سے ابلغ اور مؤکد ہوتا ہے اور ایسا جازم ہوتا ہے کہ اس میں شک کا احتمال نہیں ہوتا اور ایسا ثابت ہوتا ہے کہ شک ڈالنے سے زائل نہیں ہوتا اور وہ واقع کے بھی مطابق ہوتا ہے۔ پس ایقان کا طلب الیقین مجازی معنیٰ ہے۔ جیسا کہ مسبب بول کر سبب کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ طالبانِ یقین کے لئے دلائل قائم کرنا کوئی بڑی بات نہیں تا کہ اسی یقین کو ان دلائل سے حاصل کریں۔ البتہ اسے مجاز پر محمول کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ معنیٰ مذکور کے یقین کرنے والا دلائل کے قائم کرنے اور آیات کے بیان کرنے کا محتاج نہیں ہے۔ اس معنیٰ پر اسے تحصیل حاصل کا ارتکاب کرنا ہوگا

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ ہم نے آپ بھیجا دریں حال کہ آپ بِالْحَقِّ حق سے مؤید ہیں۔اس سے حجت آیات مراد ہے۔ان کو حق سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اشیاء حق کی طرف لے جانے والی ہیں۔بَشِیْرًا دریں حال کہ آپ اس شخص کو جو آپ پر ایمان لائے اسے ان چیزوں کی خوشخبری سنائیں کہ جنہیں نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور نہ ہی کسی کے وہم میں ہوں۔

وَّنَذِيْرًا اسے ڈر سنائیں جو آپ کے ساتھ کفر اور آپ کی نافرمانی کرے۔معنیٰ یہ ہے کہ آپ کی شان یہ ہے کہ آپ دلائل و معجزات سے انہیں دعویٰ رسالت کے صدق کے اظہار کے بعد آپ پر ضروری نہیں کہ آپ انہیں ایمان اور احکام قبول کرنے پر مجبور کریں صرف آپ انہیں خوشخبری اور ڈر سنا کر دعوتِ حق دیجئے۔ان کے کفر وعناد پر اصرار کرنے سے آپ کا کوئی نقصان نہیں۔کیونکہ احوال ذی الحال کے اوصاف ہوتے ہیں اور اوصاف موصوف سے مقید ہوتے ہیں۔

وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ جو ایمان نہیں لاتے،ان کے متعلق آپ سے سوال نہیں ہوگا کیونکہ ان کا انجام جہنم ہے۔

ف: جحیم: ایک سخت گرم مکان کا نام ہے۔ایک قرأت میں بفتح التاء ہے اور لام کی جز نہی کے لئے ہے یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوین کی دعائے خیر سے روکا جا رہا ہے۔جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ کاش میرے والدین سے وہ نہ ہوتا جو ان سے ہوا۔نبی علیہ السلام کے والد مومن تھے۔

عقیدہ: اسلاف میں اختلاف رہا ہے کہ نبی علیہ السلام کے والدین کافر ہو کر مرے یا مسلمان ہو کر۔

دوسرا قول راجح اور صحیح ہے۔دلائل یہ ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف کفر کی گرد وغبار سے پاک ہے۔اگرچہ قریش میں بتوں کی پرستش عام تھی لیکن خلیل علیہ السلام کی دعا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ بتوں کی پرستش کے مرتکب نہیں ہوئے۔دوسری آیت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے: وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرک سے دور تھے۔تو پہلے قول والے لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کو جب حکم ہوا کہ آپ مومنوں کو خوشخبری اور کافروں کو ڈر سنایئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کی سزائیں سنائیں۔اندریں اثناء

ایک مرد کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا: یارسول اللہ! میرے والدین کہاں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم میں۔ اس سے وہ شخص غمگین ہوا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا: غم نہ کھا اس لیے کہ میرے اور ابراہیم علیہ السلام کے والدین بھی تو جہنم میں ہیں۔ اس پر وَلَاتُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ آیت نازل ہوئی یہ آیت لَاتَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ کی طرح ہے۔ یہ قول صاحب تیسیر کا ہے۔

تحقیقی قول: بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے والدین ماجدین ناجی ہیں۔ یہی قول امام قرطبی کا ہے (اور یہی صحیح ہے) امام مذکور نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو آپ قصبۃ الحجون سے گزرے تو آپ غمگین ہو کر آنسو بہانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی سے اترے اور فرمایا: اے حمیرا (عائشہ رضی اللہ عنہا) ذرا رکیے۔ میں وہاں ٹھہر گئی۔ آپ تادیر وہاں ٹھہرے رہے۔ آخر آپ تبسم فرماتے ہوئے واپس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ یہاں پہلے غمگین ہوئے، گریہ فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر میرے بھی آنسو بہ نکلے۔ لیکن جب آپ لوٹے ہیں تو مسرور و متبسم، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کو دیکھا تو رو دیا۔ میں والدہ کی قبر پر گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ! میری والدہ کو زندہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا اور انہوں نے میرا کلمہ پڑھا۔

ف: مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اللہ تعالیٰ نے آپ کے والد، والدہ، چچا ابوطالب اور دادا عبدالمطلب کو زندہ کیا اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا۔

حضرت حافظ شمس الدین دمشقی علیہ الرحمہ نے فرمایا: ؎

حبا اللّٰه النبی مزید فضل ۔۔۔ علی فضل وکان به رؤفا

فاحیا امه وکذا ابا ۔۔۔ لایمان به فضلا لطیفا

فسلم فالقدیم به قدیر ۔۔۔ وان کان الحدیث به ضعیفا

ترجمہ : ☆...... اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بڑا فضل کیا اور وہ ان کے لئے بڑا رحیم ہے۔☆...... ان کی خاطر ان کی والدہ اسی طرح والد کو زندہ کیا تاکہ آپ پر ایمان لائیں یہ بہت بڑا فضل ہے۔☆...... مان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ اس امر پر قادر ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ حدیث ضعیف سے ثابت ہے۔

مسئلہ : الاشباہ والنظائر میں ہے کہ جو بھی کفر پر مرے اس پر لعنت بھیجنا جائز ہے مگر حضور علیہ السلام کے والدین پر لعنت نہ کی جائے کیونکہ ان کا زندہ ہو کر اسلام لانا (حدیث سے) ثابت ہے۔ (کذا فی مناقب الکردی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ایمان لانا:۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے والدین کی قبروں پر بہت گریہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر خشک درخت کھڑا کر دیا اور فرمایا: اگر یہ درخت سبز ہو گیا تو ان کے ایمان کی نشانی ہے اور اگر خشک رہا تو ان کے کفر کی علامت ہے۔ خدا کی شان وہ درخت سبز ہو گیا۔ وہ دونوں حضرات قبر سے باہر نکلے۔ یہ حضور علیہ السلام کی دعا مبارک کا نتیجہ تھا۔ وہ زندہ ہوتے ہی حضور علیہ السلام پر ایمان لا کر اپنی قبروں میں واپس چلے گئے۔

ف: حضرت شیخ شہیر با فتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں یہی قول صحیح ہے کیونکہ آپ کے والد ماجد کا نام عبداللہ تھا اور لفظ اللہ کسی بت کا نام نہیں تھا کیونکہ کہ لفظ اللہ تعالیٰ کے مخصوص علم میں سے ہے۔ جاہلیت میں ان بتوں کے نام لات وعزیٰ وغیرہ تھے۔

ف: ان حضرات کا زندہ ہونا نہ عقلاً ممتنع ہے نہ شرعاً۔ کیونکہ قرآن شریف میں بنی اسرائیل کے مقتول کا زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتانا ثابت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مردے زندہ فرمائے۔ جب یہ ثابت ہے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے زندہ ہو کر اسلام لانے پر کون سا اشکال ہے۔ بلکہ یہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید لطف و کرم کی دلیل ہے۔

سوال: حدیث شریف میں ہے کہ حضور علیہ السلام ایک روز اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر تشریف لے گئے خود بھی خوب روئے اور ساتھ والوں کو بھی رلایا۔ پھر فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کے استغفار کی اجازت

چاہی تو مجھے روکا گیا، پھر میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت چاہی تو قبر کی زیارت کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبور کی زیارت کیا کرو وہ موت یاد دلاتی ہے۔

جواب: یہ حدیث مذکورہ احادیث سے پہلے یعنی حجۃ الوداع کے موقعہ کی ہے اور آپ ہر گھڑی بڑے درجات کو پہنچتے رہے یہاں تک کہ وصال شریف تک بڑے درجات آپ نے طے فرمائے۔ ممکن ہے یہ درجہ بھی اسی اثناء میں حاصل ہوا ہو۔

سوال: جب کافر کا ایمان موت کے معائنہ کے وقت غیر قابلِ قبول ہے پھر مرنے کے بعد ایمان لانا کیسا قبول ہوسکتا ہے۔؟

جواب: معائنہ موت کا ایمان خوف کی وجہ سے ہوتا ہے اسی وجہ سے نہ قابلِ قبول ہے البتہ موت کے بعد زندہ ہونے میں خوف کا ہے کا۔ چنانچہ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ آیتِ قرآنی سے بھی ثبوت ملتا ہے۔

اصحابِ کہف کا بیان:۔

حدیث شریف: اصحاب کہف علیہم الرحمۃ آخر زمانے میں اپنی قبور سے اٹھائے جائیں گے اور وہ حج پڑھیں گے اور وہ اسی امت میں شمار ہوں گے۔ یہ ان کی شرافت وکرامت سے ہوگا۔

دوسری مرفوع حدیث میں ہے کہ حضرت امام مہدی علی نبینا وعلیہم السلام کے مددگاروں میں سے بھی اصحاب کہف ہوں گے اور جو کچھ اصحاب کہف اس زندگی میں عمل کریں گے انکے اعمال نامے میں لکھا جائے گا اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام کے والدین کی تقدیر میں یہ لکھا ہو کہ ان کی عمر اتنی ہوگی لیکن وقت سے پہلے انہیں موت دی جائے گی پھر ان کی بقایا عمر اسی لحظہ میں شمار ہوگی جس میں وہ زندہ ہو کر نبی علیہ السلام پر ایمان لائے اور ان کا ایمان لانا اصحاب کہف کے اعمال کی طرح ان کے لئے اعمال نامے میں شمار ہو۔ یہ فاصلہ جو ان کے مرنے اور پھر اٹھنے تک کا ہے صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وکرامت کے لئے ہو تو کچھ بعید نہیں جیسے اصحاب کہف کو اس مدت کے لئے مؤخر کر کے زندہ کیا گیا صرف ان کی شرافت وکرامت کے پیش نظر ہے تا کہ وہ حضور علیہ السلام کے امتی ہونے کے شرف سے مشرف ہوں۔

[illegible] کے متعلق توقف کا ہے۔

چنانچہ مقاصدِ حسنہ میں حضرت حافظ شمس الدین دمشقی علیہ الرحمہ کا شعر مذکور نقل کر کے فرمایا کہ اس مسئلہ پر میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔لیکن میرا مسلک اس میں یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان وکفر کے متعلق توقف بہتر ہے۔

ف: حضرت قاضی ابوبکر ابن العربی علیہ الرحمہ مالک مسلک کے امام ہیں سے سوال ہوا کہ آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو حضور علیہ السلام کے آباؤ اجداد کے متعلق کہتا ہے کہ وہ جہنمی ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایسا شخص ملعون ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (بیشک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا وآخرت میں ملعون بنایا ہے) اور حدیث شریف میں ہے: **لا توذوا الاحیاء بسبب الاموات** (زندہ لوگوں کو ان کے مردوں کی وجہ سے ایذا نہ دو)

ف: حضرت امام رستغنی علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو آپ کا سارا جسم سیاہ ہو گیا۔پھر جب آپ زمین پر اترے تو اس کے بعد آپ کو نماز اور روزے کا حکم ہوا۔آپ نے نماز اور روزہ ادا فرمایا پھر آپ کا جسم سفید ہو گیا۔کیا اس کا یہ قول صحیح ہے؟

آپ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں ایسے قول نہ کہے جائیں کہ جن میں ان کا عیب نقص ظاہر ہوتا ہو۔ہم ان کے متعلق خاموشی پر مامور ہیں کیونکہ ان کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بلند ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "جب میرے صحابہ کا ذکر تمہارے سامنے نقص وعیب کے ساتھ آئے تو تم خاموش رہو" جب ہمیں حضور علیہ السلام کے صحابہ کے متعلق کفِ لسان کا حکم ہے تو پھر انبیاء علیہم السلام کے متعلق بطریقِ اولیٰ ہے کہ خاموشی سے کام لیں۔

مسئلہ: مسلمان پر لازم ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو امور خلل اور عیب پر دلالت کریں ان پر زبان درازی نہ کرے۔کیونکہ یہ مسائل ایسے اعتقادیات سے نہیں کہ جن سے کوئی فائدہ ہو۔زبان کے

حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ جس میں نقص وعیب کی بات ہو زبان کو بند رکھا جائے۔ خصوصاً ایسی باتیں جن کا عوام میں پھیلنے سے ایسا خطرہ ہو کہ پھر ان کا سنبھلنا مشکل ہو جائے۔ یہ وہ بیان شافی ہے جو میں نے مختلف کتابوں سے چن کر عرض کر دیا ہے اور ہر مسئلے کی نظیر بھی پیش کر دی ہے۔ (الحمد للہ تعالیٰ وحدہٗ)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہودیوں کے اسلام کے داخلہ میں طمع کرنے سے روکا ہے۔ کیونکہ انہوں نے حضور علیہ السلام کو ان کی ملت سے راضی ہونے پر معلق کیا ہے کہ ہم اس شرط پر ایمان لائیں گے اور یہ ایسی شرط ہے کہ بالکل ناممکن بلکہ اس کا وجوہ بھی ممتنع ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ آپ سے راضی نہیں پھر آپ کی ملت کی اتباع کیسے کر سکتے ہیں۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ آپ سے یہود راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ یہودی نہ ہوں اور ان کے قبلہ (جو کہ مغرب ہے) کی طرف منہ کر کے نماز ادا نہ کریں۔ اسی طرح نصاریٰ بھی آپ سے راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ نصرانی نہ ہوں اور ان کے قبلہ یعنی مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا نہ کریں۔

سوال: ملة کو واحد کر کے کیوں استعمال کیا گیا ہے؟

جواب: کفر وملت ایک شئے ہے یہ ان کے قول کی حکایت ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم آپ سے راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ہماری ملت کی فرمانبرداری نہ کریں اور مدعی تھے کہ صرف ان کی ملت میں ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: قُلْ ان کی تردید بطریق قلب کے ہے۔ یعنی اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! انہیں فرمایئے! اِنَّ هُدَى اللّٰهِ بیشک صرف اسلام ہی هُوَ الْهُدٰى سیدھے راستے کی طرف لے جانے والا ہے۔ نہ وہ جس کی طرف تم بلا رہے ہو۔ اس لیے کہ وہ ملت زائغہ (ٹیڑھی) اور نری خواہشِ نفسانی ہے۔ جیسے کہ یہ قول اشارہ کرتا ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ یعنی ان کی ملت زائغہ جو ان کی خواہشاتِ نفسانیہ سے صادر ہونے والے ہیں جنہیں پہلے ان کی ملت فرمایا جس کی طرف وہ خوش ہو کر چلتے ہیں درحقیقت وہ راہ جو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی زبانِ قدس کے ذریعہ سے بیان فرماتا ہے یہی ملت ہے جسے انہوں نے بالکل تبدیل کر دیا۔

حل لغات: اَهْوَآءَ هوی کی جمع ہے۔ وہ شہوات داعیہ جو گمراہی کی طرف بلائے۔ یہ اس نام سے اس لیے

موسوم ہے کہ اپنے صاحب کو دنیا میں برے امر اور آخرت میں دوزخ ھاویہ کی طرف کھینچ لے جانے والی ہے

سوال: اَهْوَآءَهُمْ کی بجائے هَوَائهُمْ کیوں نہ فرمایا؟

جواب: تنبیہ فرمائی کہ ہر ایک کی خواہش اپنی اپنی، اور پھر ہر ایک کی خواہش دوسرے کی خواہش کی غیر تھی اور پھر ہر ایک کی خواہش کی کوئی انتہا نہیں تھی اس لیے خبر دی کہ ان میں سے کوئی بھی راضی نہیں جبکہ ہر ایک کی خواہش کی اتباع نہ کرو گے۔

ف: شروع راہ کو ملت اس لیے کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے اسے اپنی امت کے لئے ظاہر کر کے لکھا ہے جیسا کہ دین کو دین اس لیے کہتے ہیں کہ جس راہ کا طریقہ مقرر ہے اس کی بندے اطاعت کرتے اور اس کی حکمت کے تابع ہوتے ہیں اور اس کا نام شریعت بھی اس لیے ہے کہ گویا وہ پیاسوں کی جائے ورود ہے۔ جو اپنے ثواب اور رحمت کے شفاف پانی کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ میں خطاب حضور علیہ السلام کو ہے۔

سوال: ادھر تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں اور جانتا ہے کہ یہ حضرات نافرمانی کرنے والے نہیں۔ نہ اس کے حکم کے خلاف ورزی کرتے ہیں نہ ہی نہی کا ان سے ارتکاب ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کا معصوم ہونا واجب ہے اس تقریر کے مطابق وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ کا خطاب امت کو ہو نہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

جواب: کسی کو کسی کے عمل کا مکلف بنانے اور اس کو کسی فعل سے ڈرانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ذات میں ایسے قوی آلات موجود ہوں کہ جن پر تکلیف و تعذیر کا توقف ہے۔ چونکہ وہ باتیں ان میں محتملاً یا متصوراً پائی جاتی ہیں اسی لیے ان کو خطاب کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

خلاصہ: یہ کہ انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا اور پھر اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم دینے میں منافات نہیں کیونکہ ان باتوں میں امکان ذاتی تو ہے اور ایسی بات تکلیف و تعذیر کے لئے شرط ہے۔

بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ بعد ازاں آپ کے پاس قرآن کا علم ہے۔ یہ جملہ جَآءَكَ کی ضمیر سے حال ہے۔

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ سے آپ کا کوئی مِنْ وَّلِیٍّ دوست نہیں ہوگا جو آپ کو نفع پہنچائے۔ وَلِیٍّ ولی سے مشتق

ہے۔ بمعنی قرب۔

وَلَا نَصِیْرٍ اور نہ آپ کا کوئی مددگار ہوگا جو آپ سے عذاب کو دفع کر سکے۔ وَلِیٍّ اور نَصِیْرٍ کے مابین عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ کیونکہ ولی مدد کرنے سے کمزور پڑ جاتا ہے اور نصیر کبھی غیر واقف ہونے کے باوجود مدد کرتا ہے۔ گویا کہ وہ مدد کیے جانے والے کا بہت قریبی ہے اسی لیے ان کو ایک جگہ جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔ مِنْ وَّلِیٍّ محلاً مرفوع مبتدا اور مَالَكَ اس کی خبر مقدم ہے اور مِنْ اتصال کے لیے ہے اور مِنَ اللّٰہِ منصوب المحل ہے اس لیے حال ہے کہ یہ صفت تو نہیں بن سکتا اس لیے کہ مِنْ وَّلِیٍّ سے مقدم ہے اور صفت اپنے موصوف سے مقدم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کا صفت بنا ممتنع ہوا۔ جیسے لعزة موحشا طلل قدیم . اس میں موحشا کو حال تو بنایا جا سکتا ہے لیکن صفت نہیں بن سکتا۔

ربط : جب ان لوگوں کا بیان ہوا جو حضور علیہ السلام کی نبوت سے تکبر اور حبِ ریاست کو ترک کر کے اقرار کیا اور اس میں ان کا صرف رضائے الٰہی اور ثوابِ آخرت مقصود ہے اور خطوطِ نفسانیہ فنا کر کے آخرت کی نعمتوں کے طلب گار ہوئے تو اب ان کا ذکر فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی اس سے حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی مراد نہیں یہ لوگ یہودی تھے لیکن دولتِ اسلام سے نوازے گئے۔

سوال : کتاب صرف ان کو تو نہیں دی گئی تھی بلکہ جنہوں نے نبی علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر دیا تھا ان کے پاس بھی تو کتاب تھی پھر ان کی تخصیص کیسی؟

جواب : چونکہ انہوں نے اس کی کتاب پر عمل کیا تو گویا صرف کتاب انہیں ہی ملی جنہوں نے عمل بھی نہ کیا ان کو ملنا نہ ملنا برابر ہے۔ (کتاب سے مراد تورات ہے)

یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اس کتاب کا حق ادا کر کے پڑھتے ہیں۔ یہ جملہ منکرین نبوت کے مقابلہ میں ہے کہ وہ کتاب کی تحریف وترمیم کرتے ہیں۔

ف: معانی والفاظ کے لحاظ سے ان میں بڑی عجیب مناسبت ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب کی تحریف کرتے ہیں اور یہ اس پر عمل اور (جو کچھ اس کے اندر ہے) اس پر تدبر کرتے ہیں۔ یہ جملہ اٰتَیْنٰهُمُ کی منصوب ضمیر سے یا الْكِتٰبَ

سے حال مقدر ہے اس لئے کہ کتاب کے بھیجنے کے وقت یہ لوگ تلاوت کرنے والے نہیں تھے اور حَقَّ تِلَاوَتِهٖ صفت ہے اور اس کا موصوف مصدر محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی: **یتلونہ تلاوۃ حق تلاوتہ**

مولانا کواشی مرحوم فرماتے ہیں کہ: حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کا منصوب ہونا مفعول مطلق کے لحاظ سے ہے۔ اب عبارت یوں ہوگی تِلَاوَةً حَقًّا۔

اس لیے قاعدہ نحو یہ ہے کہ مصدر کی صفت کو اس پر مقدم کر کے مضاف کیا جائے تو اس کا منصوب ہونا مفعول مطلب کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے ضَرَبْتَ اَشَدَّ الضَّرْب. اشد کا منصوب ہونا مفعول مطلب کے لحاظ سے ہے۔

اُولٰٓئِكَ وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی ہے اور وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ہے۔ یعنی وہ اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ محرفین کی طرح نہیں ہیں کہ ان کو اپنی کتاب پر ایمان نہیں۔ کیونکہ اس فعل کی بناء اپنے مبتدا پر ہے اگرچہ اسم ظاہر حصر کا فائدہ دے رہا ہے جیسے اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ میں ہے۔ جو ان کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یہی لوگ خسارہ میں ہیں یعنی وہ ایمان کی بجائے کفر کا ارتکاب کر کے ہلاکت میں گرنے والے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ

اے اولادِ یعقوب یاد کرو احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ

اس زمانے کے سب لوگوں پر بڑائی دی تمہیں بڑائی دی۔ اور ڈرو اس دن سے کہ کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو گی

شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور نہ اسکو کچھ لے کر چھوڑیں اور نہ کافر کو کوئی سفارش نفع دے اور نہ ان کی مدد ہو۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے

اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

والا ہوں عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ

اور (یاد کرو) جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے مرجع اور امان بنایا اور

مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ

ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم و اسمٰعیل کو

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ

کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو طواف والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع و سجود والوں کے لئے۔ اور جب

قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ

عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب اس شہر کو امان والا کر دے اور اسکے رہنے والوں کو طرح طرح

مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ

کے پھلوں سے روزی دے جو ان میں سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور فرمایا جو

كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ

کافر ہو تھوڑا برتنے کو اسے بھی دوں گا پھر اسے عذاب دوزخ کی طرف مجبور کردوں گا اور وہ بہت بری

الْمَصِيْرُ ۝۱۲۶ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ

جگہ ہے پلٹنے کی۔ اور جب اٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی بنیادیں اور اسمٰعیل

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا

یہ کہتے ہوئے اے رب ہمارے! ہم سے قبول فرما بیشک تو ہی ہے سنتا جانتا۔ اے رب ہمارے اور کر ہمیں

مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا

تیرے حضور گردن رکھنے والا اور ہماری اولاد میں سے ایک امت تیری فرمانبردار اور ہمیں

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۱۲۸ رَبَّنَا

ہماری عبادت کے قاعدے بتا اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع۔ اے رب ہمارے

وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ

اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۲۹

انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انہیں خوب ستھرا فرمادے بیشک تو ہی غالب حکمت والا۔

تفسیر عالمانہ

يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہارے اوپر انعام کیا ہے۔ منجملہ ان انعامات کے تورات بھی ہے۔

اور نعمت کا ذکر کرنا شکر سے ہوتا ہے اور اس کے شکر مع جمیع مافیہ کا نام ایمان ہے اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنا بھی ایمان میں شامل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی ضروریاتِ ایمان میں سے ہے اور ایمان کی ضروریات سے اور یاد کرو۔ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ یعنی میں نے تمہارے ہم عصروں سے تمہیں برگزیدہ کیا۔

وَاتَّقُوْا اگر تم ایمان لاتے تو ڈرو۔ یَوْمًا اس دن کے عذاب سے اور وہ یوم قیامت ہے۔ لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا اس کا مادہ جزی عنی هذا الامر یجزی ہے جیسے کہا جاتا ہے: قضی عنی یقضی یہ دونوں ہم وزن اور ہم معنیٰ ہیں۔ یعنی ادا نہیں کرے گا اس دن کوئی نفس عَنْ نَّفْسٍ دوسرے سے شَیْئًا اس کے حقوق سے جو اس پر لازم ہوئے ہیں۔ کوئی شئے یعنی نہیں ادا کرے گا۔ وہ نفس کہ اس پر کوئی شئے نہیں ہے۔ اس حقوق سے جو دوسرے پر لازم ہیں۔ یعنی ایک نفس کو دوسرے کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔ یعنی اس سے کسی تکلیف کو رفع نہیں کر سکے گا۔ ہاں اگر اس پر کوئی حق ہو تو وہ ضرور لیا جائے گا۔ اس کی نیکیوں سے لے کر جو حقوق اس پر لازم ہوں گے اسے دیا جائے گا۔

حدیث شریف: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس پر کسی بھائی کے حقوق ہوں۔ عزت سے یا کوئی اور حق اس دن سے پہلے پہلے اس وقت تمہارے پاس درہم ہوں گے نہ دنیا۔ اس کی نیکیاں ہوں تو وہ اس سے لیکر اس صاحب کو دی جائے گی۔ اگر اس کے کوئی گناہ ہوں گے اس کے گناہ اسے کو دیئے جائیں گے۔ وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا یعنی نفس اولی سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ عَدْلٌ یعنی فدیہ۔ عَدْلٌ بفتح العین وہ ہے جو کسی شئے کے قیمتاً مماثل ہو اگر چہ اس کی جنس سے نہ ہو اور عدس بالکسری وہ ہے۔

حل لغات: کسی شئے کی جنس اس لیے وزن اور جسم میں مساوی ہو۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ نہ تو اس سے فدیہ لیا جائے گا جو اسے نار سے نجات دلائے اور نہ ہی اس وقت وہ حاصل ہو سکے گا جو اسے دے کر نجات پا سکے اور فدیہ کو عدل سے بھی اسی لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس سے وہ نجات کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کے مساوی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: "فداہ" وہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کوئی شئے دے کر اپنے آپ کو چھڑا لے۔

وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اگر چہ نفس اولی نفس کی شفاعت کرے تو بھی اسے شفاعت نفع نہ دے گی۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے روک سکیں گے۔

دنیاوی چار چیزیں ایسی ہیں جو عذاب سے بچنے کی سبب ہیں:

☆......طاقتور دوست اور مددگار کہ اپنی طاقت کو استعمال کر کے اسے عذاب سے بچالے۔

☆......کسی کے حق کے بدلے میں فدیہ دے۔☆......یا خود ایسی طاقت رکھتا ہو جس سے عذاب سے بچ سکے

☆......کسی کو کوئی سفارش کر کے چھڑالے۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کے لئے ان سب کو غیر مفید بتایا ہے کہ وہاں کفار کے حق میں طاقت استعمال ہو نہ فدیہ اور نہ سفارش۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

قیامت کہ نیکاں باعلی رسند	زقعر ثریٰ بہ ثریا رسند
تراخود بماند سراز ننگ پیش	کہ گردت برآید علم ہائے خویش
برادر زکارِ بداں شرم دار	کہ درروئے نیکاں شوی شرمسار
دراں روز کہ فعل پرسند وقول	اولوالعزم راتن بلرزد زہول
بجائے کہ دہشت خورد انبیاء	تو عذر گناہ راچہ داری بیا

ترجمہ:

☆......قیامت میں کہ لوگ اعلیٰ مراتب پائیں گے تحت الثریٰ سے بلندیوں تک پہنچیں گے۔

☆......تیرا سر رسوائی سے نیچے ہوگا اور تیرے اردگرد عمل حاضر ہوں گے۔

☆......اے بھائی! برے کاموں سے شرم کر اس لیے کہ نیکیوں کے سامنے شرمسار ہوگا۔

☆......قیامت میں فعل وقول کی پرسش ہوگی کہ بڑوں بڑوں کو لرزہ ہوگا۔

☆......وہاں انبیاء علیہم السلام پر رعب ہوگا تیرے گناہ کا کوئی عذر ہے تو لے آ ئے تو بہ کر۔

ف: بنی اسرائیل کا قصہ ان دو آیتوں سے شروع فرمایا ہے پہلی آیت میں نعمت کی تذکیر اور دوسری میں اپنے عذاب سے ڈر کا بیان فرمایا ہے اور پھر انہی دو آیتوں پر ان کے قصہ کو ختم فرمایا تا کہ ان کی نصیحت میں مبالغہ ہو اور انہیں معلوم ہو کہ قصہ سنانے کا مقصد صرف یہی ہے نہ کچھ اور۔

مسئلہ : وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ میں اشارہ ہے کہ اہل ہوااور اہل بدعت (سیئہ) کی صحبت سے کنارہ کشی کی جائے۔ان کے اقوال وافعال کے اتباع سے کلی احتراز ہو۔

حدیث شریف : حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص کسی قوم کے افعال واقوال کا تابع ہے قیامت میں اس کا حشر انہی سے ہوگااور انہی کے ساتھ اس کا حساب ہوگا۔اگر چہ ان کے تمام کردار کا پابندہ بھی نہ ہو۔

مسئلہ : حدیث شریف میں ہے جو کسی معصیت کے موقعہ پر پہنچا لیکن اسے دلی نفرت ہے تو اسے اس فعل میں شریک نہیں سمجھا جائے گا۔

مسئلہ: کسی فعل میں اگر چہ شرک نہیں لیکن اس فعل پر خوش ہے تو اسے شریکِ کار سمجھنا چاہیے۔

مسئلہ : کسی گناہ کی مجلس میں حاضری کا یہ معنیٰ ہے کہ اتفاق سے وہاں چلا گیا یا کسی ضرورت کے پیش نظر وہاں جانا پڑا یا اتفاقاً اس کے سامنے گناہ کی مجلس قائم ہوئی جس کا دفعیہ اس کے بس میں نہیں تو وہ معذور ہے اور اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا اور عمداً شریکِ مجلس ہونا ممنوع ہے۔اسلاف کا طریقہ تھا کہ وہ اہل لہو ولعب کی مجالس سے کنارہ کشی فرماتے اور اہل ہویٰ اور اہل بدعت (سیئہ) کی اتباع سے دور بھاگتے تھے۔

حکایت : کسی نے حضرت ابن المبارک علیہ الرحمہ کو ان کی موت کے بعد خواب میں دیکھا کر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیا کیا؟ آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے سامنے تیس سال کھڑا کر دیا اور سخت زجر وتوبیخ کی، صرف اس وجہ سے کہ ایک دن میں نے گمراہ بدعتی کو نظرِ شفقت سے دیکھا۔اس سے اندازہ لگایئے کہ ان لوگوں کا جو بے دینوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے ہیں۔

مسئلہ : جب کہ مذاہب کا اختلاف اور شر وفساد کا زور ہو تو اس وقت حضور علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنا سو شہیدوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

حدیث شریف : حضور علیہ السلام نے فرمایا: میری امت پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ میری سنت پرانی ہو جائے گی لیکن بدعات کا دور دورہ ہوگا۔جو شخص اس وقت میری سنت پر عمل کرے گا وہ غریب یعنی ان نظروں میں اجنبی سمجھا جائے گا اور وہ ان کی مجلس کے لائق نہ ہوگا فلہٰذا وہ اسے علیحدہ کر دیں گے اور جو بدعات (سیئہ) پر عمل

کرے گا اس کے ساتھ پچاس یا اس سے بھی زائد ہو جائیں گے۔

مسئلہ : صحبت کا دوسرے پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

عدوی البلید الی الجلید سریعة　　　والجمر یوضع فی الرماد فیخمد

ترجمہ : بیوقوف کی بیوقوفی دانا پر جلد اثر کرتی ہے، جیسے انگارے کو راکھ میں رکھو وہ بجھ جاتا ہے۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

نخست موعظہ پیر مجلس حرفست　　　کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

ترجمہ : بزرگ کا ایک کلمہ بہترین وعظ ہے، وہ یہ کہ ناجنس ساتھی سے کنارہ کرو۔

تفسیر عالمانہ

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس کی تفسیر سریانی میں تو وہ ہے جو مذکور ہے اور عربیۃ میں سے ہے وہ جو ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ بمعنیٰ اب رحیم۔

سہیلی فرماتے ہیں: بہت بار عربی وسریانی میں اتفاق ہو جاتا ہے یا لفظاً متقارب ہو جاتے ہیں جیسے ابراہیم کی تفسیر اب رحیم ہے۔ چونکہ وہ بچوں سے رحمت فرماتے بنا بریں اس نام سے موسوم ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ جو بچے اہل اسلام کے صغر میں مرجاتے ہیں وہ قیامت تک ان کی کفالت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی زوجہ محترمہ کے سپرد ہوتی ہے۔

ف: تذکرۃ الموتی میں ہے کہ ان کا نام ابرم تھا۔ پھر اس میں ہا بڑھائی گئی۔ اور ''ہا'' سریانی لغت میں تفخیم وتعظیم کے لئے آتی ہے۔ رَبُّهٗ کی ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے اور مفعول لفظاً مقدم ہے۔ اگرچہ رتبۃً مؤخر ہے اور تقدیم محض اہتمام کی وجہ سے ہے تاکہ ذہن میں اس کا شوق اور طلب رہے کہ آزمانے والے کون ہیں یعنی یاد کرو جب کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی۔ ذکر سے مقصود حوادثات سے ایک واقعہ کا یاد کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ وقت اس پر شامل ہوتا ہے۔ پس جب اسے حاضر کرنے کی طلب کی تو وہ اپنی تفاصیل سمیت حاضر ہو گیا گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

حل لغات : ابتلاء بمعنیٰ اختیار آزمائش یعنی جس سے آزمائش مقصود ہے، ان کے سامنے ایسے فعل یا ترک فعل کا حکم پیش کرنا کہ جو نہایت مشکل ہوتا ہے کہ اس کے متعلق معلوم ہو جائے کہ فرمان بجالاتا ہے یا نہ۔ عموماً آزمائش اس سے ہوتی ہے جسے امور کے انجام سے خبر نہ ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہو کر بندوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے؟

جواب: اس کے لئے لفظ کا اطلاق مجازاً ہے۔ بایں معنیٰ کہ بندے کو دو امروں میں سے ایک امر کا اختیار دے کر ظاہر کرتا ہے کہ بندہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی رضا پہ چلتا ہے۔ گویا اس کی آزمائش صرف بندہ کی خاطر ہے کہ اس نے میری رضا جوئی کی ہے تو خبردار رہیے ورنہ مزہ دیکھیے، مثلاً اللہ تعالیٰ ابلیس کے کفر کو جانتا تھا لیکن لعنتی اس وقت کیا جب ان نے اپنی خواہش پر عمل کیا۔ جب تک اس سے لعنت کا موجب امر سرزد نہ ہوا اسے لعنتی نہیں بنایا۔

بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ کَلِمَات، کلمہ کی جمع ہے۔ وہ لفظ جو کسی معنیٰ مفرد کے لئے موضوع ہو۔ اب کلمات سے الفاظ منظومہ مراد ہوں گے۔ لیکن کبھی مجازاً انہی الفاظ کے معانی پر بھی بولے جاتے ہیں کیونکہ دال، مدلول کی آپس میں کوئی کوئی نسبت ضرور ہوتی ہے اور متضافیان دو امروں کو کہا جاتا ہے۔ جو وجود تعقلی میں برابر ہوں۔ جیسے تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا میں ہے کہ کلمہ بمعنیٰ قبضہ و حکمت اور فرمایا: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ یعنی انہیں اچھے طور ادا کیا کم و بیشی کے بغیر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دن میں جب بھی کسی کی آزمائش ہوئی تو صرف ابراہیم علیہ السلام ہی کامیاب ہوئے کہ انہوں نے حکم کی پوری تعمیل فرمائی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی فضیلت کا بیان فرمایا: اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى یعنی وہ معانی جو کلمات سے ظاہر ہوئے ہیں انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پورا کیا۔

ف: کلمات کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں:

۱:۔ وہ دس اعمال جو سنت ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دس عادات جو ان کی شریعت میں فرض تھیں وہ ہماری شریعت میں سنت ہیں۔ ان میں سے پانچ سر میں ہیں:

☆...... کلی کرنا۔ ☆...... ناک میں پانی ڈالنا۔ ☆...... مانگ نکالنا۔

☆...... مونچھیں کٹوانا۔ ☆...... مسواک کرنا۔

اور پانچ دیگر بدن میں ہیں:

☆...... ختنہ کرنا۔ ☆...... زیر ناف کے بال مونڈنا۔ ☆...... بغلوں کے بال اکھیڑنا

☆...... ناخن کترنا۔ ☆...... استنجا کرنا یعنی بول و غائط کے مقام کو پانی سے دھونا۔

مذکورہ سنتوں میں سے بعض کی تشریح:۔

☆...... مانگ نکالنا: یعنی سر کے بالوں کو دو حصے کرنا، کیونکہ مشرکین کی عادت تھی کہ وہ اپنے بالوں میں تفریق کرتے تھے اور اہل کتاب سدل کرتے۔ یعنی بالوں کو پیشانی پر لٹکاتے اور انہیں بکری کے بالوں کی طرح کرتے۔ یعنی پیشانی کے بالوں کی مانند اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عموماً اس امر میں کوئی حکم نازل نہ ہوتا تو اہل کتاب کی موافقت فرماتے۔ اس احتمال سے کہ شاید یہ حکم منزل من اللہ ہو۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نازل ہو کر مانگ نکالنے کا حکم سنا گئے۔

ف: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بال رکھوانا عام تھا لیکن چند بار بال کٹوائے بھی تھے۔

امام غزالی فرماتے ہیں: ہمارے زمانہ میں بال لٹکانا مکروہ ہے کیونکہ یہ شعار علویوں کا ہے۔ اگر وہ علوی نہ ہوگا تو التباس پڑ جائے گا۔

مسئلہ: حیات الذخیرہ میں ہے کہ چوٹی رکھنا حرام ہے کیونکہ لوگ چوٹی رکھوانے میں طرح طرح کے غلط خیالات وتوہمات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حکایت: ایک شخص نے اپنے بچے کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لایا۔ اس کے بچے کا آدھا سر مونڈا ہوا تھا اور آدھا باقی تھا۔ حضرت نے اس شخص کے قتل کرنے کا حکم دیا، لیکن اس نے توبہ واستغفار کی جس پر حضرت نے اسے معاف فرمادیا۔

ف: حضرت شیخ المعروف بافتادہ آفندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اس قتل سے حقیقی قتل مراد نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو ایسا فعل کرے گا وہ قتل کا مستحق ہوگا۔ اس مسئلہ کی نظیر حکایت ہے۔

گستاخِ نبوت کا واقعہ:۔

☆......حضرت قاضی ابو یوسف کی مجلس میں ذکر کیا گیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کدّ و شریف کو محبوب سمجھتے تھے۔ ایک شخص نے کہہ دیا کہ کدّ و مجھے پسند نہیں، تو ابو یوسف علیہ الرحمہ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا لیکن اس نے توبہ واستغفار کی۔ تب ابو یوسف نے اسے معاف فرمادیا۔

☆......مونچھوں کے بال کترنا، انہیں مقراض سے کتروانا چاہیے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ قبل صلوٰۃ اپنی مونچھیں کترواتے تھے۔

مسئلہ : امام نووی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس میں مختار مذہب یہ ہے کہ مونچھیں اتنی کتروائے کہ ہونٹ کا ایک کنارہ ظاہر ہو اور ابرو کی طرح ہو جائے۔

مسئلہ : احیاء العلوم میں ہے کہ سبالہ چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں، یعنی مونچھوں کے دو کنار چھوڑنا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ و دیگر صحابہ کرام علیہم الرضوان یونہی کیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ سبالہ تو منہ کو ڈھانپتا ہے اور نہ ہی اس میں طعام کا بقایا رہ سکتا ہے۔

مسئلہ : دار الحرب میں مجاہد کے لئے جیسے ناخنوں کا بڑھانا مندوب ہے اسی طرح مونچھوں کا بڑھانا بھی مندوب ہے اگرچہ ان دونوں کا کاٹنا فطرتی امر ہے اس لیے کہ دشمنوں کو یہ ہیبت زیادہ ہیبت ناک نظر آتی ہے۔

مسئلہ : مونچھوں کا کاٹنا مستحب ہے۔ حدیث شریف میں ہے: مونچھیں کاٹو اور داڑھی بڑھاؤ۔

ف: العفو بمعنیٰ کاٹنا اور اعفاء بمعنیٰ بڑھانا اور اپنے حال پر چھوڑنا۔

داڑھی کے فضائل و مسائل:۔

مسئلہ : داڑھی کا مونڈنا قبیح بلکہ حرام اور مثلہ ہے۔ جیسے عورتوں کے سر کے بال مونڈنا ان کے حق میں مثلہ ہے۔ ایسے عورتوں کو مردوں کے مشابہ ہونا حرام ہے۔

اسی طرح مردوں کے لئے داڑھی منڈوانا ان کے لئے مثلہ اور عورتوں سے تشبیہ اور زینت کو ضائع کرنا ہے۔

مسئلہ : فقہاء فرماتے ہیں کہ داڑھی اپنے وقت میں سنگار ہے اور اسے مونڈنا حسن کو پورے طور پر ضائع کرنا ہے اور ملائکہ یوں تسبیح پڑھتے ہیں: سبحان من زین الرجان بلحیتھ الخ (پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھی سے مزین کیا اور عورتوں کو زلفوں سے)

ف: کشاف میں لکھتے ہیں کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ الخ میں وہ مرد مراد ہیں جو داڑھی اور پگڑیوں والے ہیں۔

مسئلہ : نصاب الاحتساب میں ہے کہ اگر داڑھی ایک بالشت سے زائد ہو جائے تو زائد کو کٹوا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام طول و عرض میں اپنی ریش مبارک کٹوا دیتے تھے۔ جب ایک بالشت سے

زائد ہو جاتی، کیونکہ زیادہ لمبی داڑھی پیدائشی صورت کو بگاڑ دیتی ہے۔

مسئلہ : سفید بال اکھیڑنا مکروہ ہے جیسا کہ آج کل بعض لوگ کرتے ہیں صرف اس خیال پر کہ بڑھاپا نہ ہو اور جوانی ہی جوانی نظر آئے۔

حافظ شیرازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

سواد نامہ موئے چوں طے شد بیاض کم نہ شود گر صد انتخاب رود

ترجمہ : چہرے کے بال سیاہ کی جب منزل طے ہوگئی اس کی جڑ سفید رہے گی خواہ اسے ہزاروں سیاہ خضاب لگایا۔ گوان کے اوپر والے حصہ کو سیاہ کر لیا جائے لیکن اصل تو سفید رہے گا۔ اس اعلیٰ میں کیا بھلائی ہے کہ جس کا اصل فاسد ہو۔

☆......ختنہ کرنا یعنی ذکر سے زائد ٹکڑا گوشت کا کاٹنا۔

مسئلہ : جمہور علماء کا خیال ہے کہ یہ سنن مؤکدات سے ہے اور فطرتاً اسلام میں وہ درجہ رکھتا ہے کہ مردوں کے لئے اس کتاب کے ترک میں کوئی گنجائش نہیں ہاں اگر لڑکا ختنہ شدہ پیدا ہو۔

ف : تمام انبیاء علیہم السلام ختنہ شدہ اور ناف بریدہ پیدا ہوئے۔ یہ ان کے لئے کرامات ہے، سوائے ابراہیم علیہ السلام کے کہ انہوں نے قدوم شہر میں اپنا ختنہ خود کیا۔

ف : بالتخفیف و التشدید ہر دونوں پڑھنا جائز ہے۔ آپ ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت اپنا ختنہ خود کیا تو اس وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال یا اسی سال تھی اس لیے آپ نے اپنا ختنہ خود کیا تا کہ سنت جاری ہو۔

مسئلہ : بچہ جب تک حدِ بلوغ کو نہ پہنچے ختنہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ ختنہ طہارت کے لئے ہے اور قبل از حدِ بلوغ اس پر طہارت کا حکم نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بچہ جب دس سال کا ہو جائے، بعض کہتے ہیں کہ جب نو سال کا ہو، بعض کہتے ہیں کہ دس اور سات کے مابین ہونا چاہیے۔

مسئلہ : دس سال تک ختنہ نہ کرنا مکروہ ہے۔

ف : اس کی میعاد بتانے میں امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے توقف فرمایا ہے۔

مسئلہ : علماء فرماتے ہیں کہ مرد اگر چہ بڑی عمر میں مسلمان ہو تب بھی ختنہ کرنا مستحب ہے اگر چہ اسی سال کا ہو۔

مسئلہ : حضرت امام حسن بوڑھے کو ختنہ کی اجازت نہ دیتے اور فرماتے کوئی حرج نہیں اگر اس کا ختنہ نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کی گواہی رد کرتے۔ اور نہ اس کی ذبح کردہ شئے کو اور نہ ہی اس کی نماز وحج کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیتے۔ ابن عبدالرب فرماتے ہیں: علماء اسی قول پر عمل کرتے رہے۔

۴۔ ناخن کٹوانا اور قلامہ بالضم ناخن کا وہ ٹکڑا جو کاٹ کر پھینکا جاتا ہے۔

مسئلہ : ناخن کٹوانا مستحب ہے کیونکہ جب کی حالت میں غسل کرتے وقت بوجہ میل کچیل کے کسی وجہ سے پانی اس کے اندر نہیں پہنچ سکے گا اس بنا پر وہ ہمیشہ جب رہے گا۔

مسئلہ : جنبی کے جسم پر سوئی برابر کوئی حصہ رہ جائے تو وہ بدستور جب ہے جب تک کہ تمام جسم نہ دھل جائے۔

حدیث شریف : جس نے اپنے ناخن جمعہ کے دن کاٹے تو اللہ تعالیٰ اگلے جمعہ بلکہ اس سے تین روز اوپر بلا سے محفوظ رکھے گا۔

حدیث شریف : جو چاہتا ہے کہ فقر اور آنکھ کی شکایت سے محفوظ رہے تو اسے چاہیے کہ عصر کے بعد خمیس کے دن اپنے ناخن کاٹے۔

ف : مقاصد حسنہ میں ہے ناخن کاٹنے کی کیفیت اور اس کے تعین یوم کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہیں ملتی اور شعر جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، باطل ہے۔ وہ یہ ہے:

تقليمک الاظفار فيه سنة وادب ۔۔۔ يمينها خوابس يسارها او خسب

حدیث شریف : جو شخص اپنے ناخن مختلف طور کاٹتا ہے تو اس کی آنکھ میں درد اور بیماری نہیں ہوگی۔

ف : یہ بہت سے ائمہ کا قول تو ہے لیکن احادیث کی روایات سے نہیں ملا، ہاں حافظ شریف ومیائی اس بات کو اپنے مشائخ سے بیان فرماتے ہیں اور اس طریق کو امام احمد مستحب قرار دیتے ہیں۔ (انتهى كلام المقاصد الحسنه)

مسئلہ : امام نووی فرماتے ہیں کہ ناخن کٹوانے میں مستحب یہ ہے کہ پہلے ہاتھوں کے ناخن کاٹے جائیں بایں طور کہ پہلے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی پھر درمیان والی پھر بنصر پھر انگوٹھا، پھر دائیں ہاتھ سے پہلے بنصر خنصر پھر بنصر، یہاں تک کہ انگوٹھا تک ترتیب وار چلائے۔ پھر سیدھے پاؤں کی خنصر سے شروع کر کے

ترتیب وار چلاے جائے۔ یہاں تک کہ بائیں کنج بنصر ختم کرے۔ (یہی تقریر امام غزالی کی احیاء العلوم میں ہے)

حدیث شریف: "نقوا براجمکم" اپنے براجم کو صاف رکھو۔ براجم انگلیوں کے جوڑوں اور ان عقود کو کہتے ہیں جو ان کے پٹھوں میں ہے کہ جن میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے۔

براجمہ کی جمع برجمہ بضم الباء و الجیم اور ان کے مابین راساکن پر جوڑ کے عقدہ کی پشت کو کہا جاتا ہے۔ عقدہ کی پیٹھ کا نام برجمہ ہے اور عقدہ تین کے مابین کا نام راجبہ جس کی جمع رواجب ہے۔ یعنی وہ ان پٹھوں کے قریب ہے یعنی انگلیوں کی گانٹھ۔ پس ہر انگلی میں دو براجم اور تین رواجب ہیں سوائے انگوٹھے کہ اس میں صرف ایک برجمہ اور دو رواجب ہیں۔

ف: ان کی صفائی کا حکم اس لیے ہوا کہ جنابت باقی نہ رہے۔ کیونکہ میل کچیل پانی اور چمڑہ کے مابین ہو جائے گی (کذافی تفسیر القرطبی)

حدیث شریف: مجاہد فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے چند روز رک گئے۔ جب آئے تو آپ نے فرمایا: "رکنے کی وجہ کیا تھی۔" انہوں نے عرض کی کہ ہم کیسے حاضر ہو سکتے ہیں جب کہ آپ کے ہاں نہ تو ناخن کاٹے جاتے ہیں اور نہ مونچھیں اور نہ ان کے جوڑوں کو صاف کیا جاتا ہے اور نہ ہی مسواک کرتے ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی: نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔

قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ **ربط:** گویا کہا گیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے کلمات کی تکمیل کی تو اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا جواب ملا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابراہیم ہم نے آپ کو لوگوں کا امام بنا دیا ہے۔

اِمَامًا یعنی تیری ان عادتوں میں لوگ آپ کی پیروی اور صالحین آپ کی اقتدا کریں۔

ف: ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ کے نبی تھے اور قیامت تک تمام لوگوں کے پیشوا ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وغیرہ وغیرہ۔ اسی لیے تمام اہل ادیان آپ کی تعظیم پر متفق ہیں اور حضور علیہ السلام کی تمام امت اپنی نمازوں کے آخر میں کہتے ہیں: اللّٰھم صل علی محمد و علی ال محمد الخ۔

ف: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ جب ہم نے اللّٰھم صل علی محمد و علی ال محمد

کہا تو ہمیں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کی طرف وہ رسول بھیجیں جو رحمۃ للعالمین ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي۔ پس تمہارا ان کے لئے کیا تحفہ ہے۔ تو ہم نے کہا کما صلیت علی ابراھیم الخ پھر ہم نے غور کیا کہ یہ احسانات سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو ہم نے عرض کی: انک حمید مجید۔ تاکہ اس کے احسانات کی شکر گزاری ہو جائے۔

حکایت: خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک بڑا لمبا چوڑا باغ دیکھا جس کے ہر درخت پر لکھا ہوا تھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جبریل علیہ السلام سے اس کے متعلق دریافت کیا: تو جبریل علیہ السلام نے تمام ماجرا سنایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا اللہ! میرا نام امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر چلا دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے امتِ مصطفویہ علی صاحبہا والتحیۃ والسلام کو نماز میں درود بھیجتے وقت ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجنے کا حکم دیا۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي کہا ابراہیم علیہ السلام نے اور میری اولاد سے بھی۔ اس کا عطف جَاعِلُكَ کے کاف پر ہے اور مِنْ تبعیضیہ اور جاعل کے متعلق ہے۔ یعنی میرے اللہ! میری اولاد سے بھی امام بنادے تاکہ لوگ ان کی اقتدا کریں۔ اصل میں اجعل ہونا تھا لیکن ادب کی رعایت کر کے صیغہ امر استعمال فرمایا تاکہ بے ادبی نہ ہو اور بعض کی تخصیص اسی لیے کہ بدیہی بات ہے کہ سب تو امامت کے لائق نہیں، کیونکہ یہ محال ہے کہ سارے کے سارے امام بن جائیں اگرچہ سارے حق پر ہوں۔

(ذریۃ) مرد کی نسل کو کہتے ہیں۔ کبھی آباؤ ابناء پر استعمال کیا جاتا ہے مرد ہو یا عورتیں، چھوٹے ہو یا بڑے۔ زکریا علیہ السلام کی دعا میں ہے: رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (اے اللہ! مجھے نیک لڑکا عطا فرما)
وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ یہاں ذریۃ سے مراد ان کے آباء ہیں جو کشتی میں سوار ہوئے۔ کبھی ذریۃ کالفظ واحد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

قَالَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جملہ مستانفہ ہے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ میرے عہد کو ظالمین حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ تیری اولاد میں سے بعض مومن ہوں گے بعض کافر۔ پھر وہ کیسے نبوت و امامت وخلافت کو حاصل کر سکیں گے۔

جس امامت کا میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے اسے وہ حاصل کریں گے جو ظلم سے بری ہوں نہ کہ ہر ایک مسلمان ہو یا نہ۔ کیونکہ امام تو ظلم کو روکنے کے لئے ہوتا ہے۔ پھر جب وہ خود ظالم ہو تو امامت کیسے کرے گا۔ جیسے مثال مشہور ہے: من استرعی الذئب انفتح الظلم ۔ (بھیڑیئے کو بکریوں کا چرواہا بنانا ظلم ہے)

ف: معتزلہ نے یہاں سے دلیل پکڑی ہے کہ فاسق نہ امامت صغریٰ کے لائق ہے اور نہ ہی کبریٰ کے۔ اس لیے اسے نماز میں امام نہ بنایا جائے۔ اہل سنت اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہاں ظالم سے مراد کافر ہے۔

مسئلہ: امام ظالم کے ظلم پر صبر کرنا اس کی بغاوت سے افضل ہے کیونکہ اس کی بغاوت میں نقصِ امن اور خونریزی اور بد معاش گروہ کی چابکدستی اور لوٹ مار اور فساد فی الارض کا خطرہ ہے۔

مسئلہ: آیت سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے اور بعد کو معصوم ہوتے ہیں۔

ف: ابن شیخ اپنے حواشی میں لکھتے ہیں: ''اس مسئلہ یعنی عصمۃ انبیاء علیہم السلام میں بحث ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیت کا مدادل ہے کہ ظالم جب تک ظالم ہے امامت کا اہل نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی وقت اس سے غلطی ہو جائے اور پھر وہ تائب بھی ہو گیا تب بھی امامت کے لائق نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ظلم جو ہے وہ اسے امام بننے کے لئے مخل ہے کیونکہ امامت کا مقصد یہ ہے کہ زمین کو فساد سے خالی کیا جائے اور لوگوں کی عزت و آبرو اور مال و جائیداد کی مفسدین اور شرارتی لوگوں سے حفاظت کی جائے۔ بخلاف اس کے جس سے پہلے کسی زمانہ میں غلطی ہوئی تو وہ اس مقصد کے لئے مخل نہیں۔ کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہوتا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں''

مسئلہ: حضرت شیخ افتادہ آفندی قدس سرہ فرماتے ہیں: ولد الزنا کو بھی امامت سپرد نہ کی جائے فرمایا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے اور اس کا شکر کرتا ہوں کہ میں وہ ہوں جسے ماں نے جنا اور اس نے کبھی ماں باپ کی نافرمانی نہیں کی۔

حضرت مولانا الہدائی قدس سرہ فرماتے ہیں: مولیٰ تعالیٰ نے میرے اوپر بھی یہی فضل فرمایا ہے۔

سخاوی مقاصد حسنہ میں فرماتے ہیں: حدیث شریف میں ہے کہ ولد الحرام بہشت میں ہرگز نہیں جائے گا۔ اگر یہ صحیح ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے باپ کی طرح عمل کیا تو تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ

حدیث اپنے ظاہری معنیٰ پرمحمول نہیں یا اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص زنا کا ارتکاب کرتے کرتے مرے اور اسے ولدالزنا کہنا مجاز ہے۔ جیسے مشاہدین کو ولد الصحف اور بہادروں کو ولد الحرب اور مسلمانوں کو ولد الاسلام کہا جاتا ہے۔

آیت سے ثابت ہوا کہ جسے اللہ تعالیٰ یہ مرتبہ امامت عطا فرمائے اسے چاہیے کہ وہ حرج کش اور اپنے نفس کو طاعت الٰہی میں لگادے۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

چوں یوسف کہ درصلاح وتمیز بسے سال باید کہ گردد عزیز

یوسف علیہ السلام جیسی صلاح وتمیز ہو تو پھر بھی کئی سالوں کے بعد ہی شاہی میسر آئے گی۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ یعنی یاد فرمایئے، اے پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم! اس وقت کو جب ہم نے کعبہ معظمہ کو بنایا۔ مَثَابَةً جائے رجوع۔ لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا حجاج اور عمرہ کرنے والوں کے لئے جو اس سے جدا ہو کر پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ یعنی اس کی طرف وہ لوگ لوٹتے ہیں یعنی وہ زائرین جو کئی بار کعبہ شریف کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ پھر ان جیسے اور آتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا وفد یا اس کے زائرین کہا جاتا ہے۔

الناس: میں الف لام عہد ذہنی ہے۔ لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا یعنی امن کا مقام کیونکہ مشرکین حرم کے ساکنین کو کچھ نہ کہتے بلکہ ان کا عقیدہ تھا یہ بیت، اللہ کا گھر ہے اور اس کے ساکنین اہل اللہ ہیں یعنی اس کے اہل بیت یہاں تک کہ کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو حرم شریف میں دیکھتا تو بھی اسے کچھ نہ کہتا۔ البتہ اس کے باہر والے کو ضرور پکڑ لیتے یہ طریقہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چلا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس تک بدستور جاری رہا۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ بیت اللہ شریف حاجی صاحب کو عذاب آخرت سے امن میں رکھتا ہے۔ اس حیثیت سے کہ اس کے پہلے گناہ معاف نہیں ہوتے۔ (کذافی حواشی ابن الشیخ)

لیکن روایت ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مزدلفہ میں قبول فرمائی۔ یہاں تک کہ امت کے ایک دوسرے حقوق قتل و دیگر مظالم بھی معاف فرمادیئے۔ (کذافی الکافی وتفسیر الفاتحہ للفناری وغیرهما)

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى یعنی اور ہم نے یہ بھی حکم دیا: اِتَّخِذُوْا یہ عبارت بارادہ قول ہے تا کہ انشائیہ کا عطف خبریہ پر لازم نہ آئے۔ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى یعنی بنالو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ۔ اس میں مِنْ تبعیضیہ ہے اور مقامِ ابراہیم اس پتھر کا نام ہے جس میں آپ کے قدم کا نشان ہے یا وہ جگہ ہے جہاں پر آپ کھڑے ہو کر لوگوں کو حج کی طرف بلایا یا وہ جگہ ہے جہاں آپ کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر فرماتے رہے جسے آج مقامِ ابراہیم کہا جاتا ہے یہ وہی پتھر کی جگہ ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو مکہ کی جگہ میں بٹھا گئے تو عرصہ گزرا واپس تشریف نہ لائے اور ان کے پاس قبیلہ جرہم اترا اور ان کے ہاں قیام پذیر ہوئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کی ایک عورت سے نکاح کیا اور حضرت ہاجرہ فوت ہو گئیں ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بی بی سارہ سے ان کے ملنے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے فرمایا: بیشک تشریف لے جائیں لیکن ان کے ہاں قیام مت فرمانا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر پہنچے وہاں ان کی زوجہ کو دیکھ کر پوچھا: تیرا شوہر کہاں ہے؟ اس نے کہا: شکار کو گیا ہے۔ ان کی عادت تھی کہ حرم کے باہر عموماً شکار کو جاتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس بی بی سے فرمایا کہ کیا مجھے کچھ کھلا سکتی ہو۔ اس نے کہا: میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ پھر پوچھا: گزر اوقات کیسی ہے؟ اس نے کہا: تنگ اور پریشان ہیں۔ (بہت شکایت کی) آپ نے فرمایا: جب تیرا شوہر واپس آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اس عورت کو طلاق دے دے۔ کیونکہ وہ عورت ان کے لائق نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چلے گئے۔ بعد ازاں اسماعیل علیہ السلام تشریف لائے اور اپنے باپ کی خوشبو پائی۔ اپنی عورت سے پوچھا: میرے گھر میں کون تشریف لائے تھے۔ اس نے حقارت بھرے طرز سے کہا: ایک بوڑھا مرد آیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کم وبیش الفاظ استعمال کیے۔ ان کے اوصاف بھی بتائے۔ آپ نے پوچھا: کچھ اور بھی فرمایا: اس نے کہا ہاں، وہ تمہیں سلام بھی کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ اپنے گھر کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ آپ نے فرمایا: وہ تو میرے ابا جان تھے اور مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تجھے طلاق دے دوں تم اپنے میکے چلی جاؤ میں نے تجھے طلاق دے دی ہے۔ پھر آپ نے اس قبیلہ سے دوسری عورت نکاح کر لیا۔ حضرت ابراہیم

علیہ السلام چند روز ٹھہر کر اپنی بیوی سارہ سے اجازت طلب فرمائی تا کہ اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات کر آئیں۔ بی بی نے پھر بھی وہی شرط فرمائی کہ جائیں بڑی خوشی سے لیکن ان کے ہاں ہرگز نہ ٹھہرنا۔ اب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر تشریف لائے اور ان کی زوجہ سے فرمایا کہ تیرا شوہر کہاں ہے؟ اس نے کہا: وہ شکار کو گئے ہیں۔ چنانچہ دودھ اور گوشت لائی۔ آپ نے فرمایا: وجہ معاش کیسی ہے؟ عرض کی: اچھی اور الحمد للہ فراخدستی ہے۔ ان کے لئے برکت کی دعا کی۔

ف: اگر وہ بی بی گندم یا جَو کی روٹی یا کھجور لاتیں تو زمین میں یہ اشیاء بکثرت ہوتیں۔ عرض کی: حضور! نیچے اتریئے، آرام فرمایئے اور سر مبارک دھوئیں، لیکن آپ نہ اترے پھر بھی پتھر سامنے لائی اور سیدھی جانب رکھ دیا۔ آپ نے صرف اپنا قدم اس پر رکھا۔ لیکن بدستور سوار رہے اور اپنے سر کی دائیں جانب دھوئی۔ پھر اس بی بی نے دوسری طرف پھیر کر دائیں جانب دھوئی۔ اس وجہ سے اس پتھر پر آپ کے قدم مبارک کے نشان باقی رہے اور روانگی کے وقت فرمایا: اپنے شوہر کو میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ کو مستقیم رکھیں۔ جب اسماعیل علیہ السلام واپس آئے اپنے باپ کی خوشبو پائی۔ بیوی سے پوچھا کون آئے تھے؟ بیوی نے کہا: ایک بزرگ تشریف لائے تھے جو نہایت حسین اور نہایت خوشبودار اطیب انسان تھے اور مجھے ایسے ایسے کلمات ارشاد فرمائے اور اپنا سر مبارک بھی دھویا اور یہ ان کے قدم مبارک کا نشان ہے۔ اسماعیل علیہ السلام نے کہا: وہ میرے والد ماجد تھے اور چوکھٹ سے مراد تو ہے اور مجھے حکم فرما گئے ہیں کہ میں تجھے ہمیشہ کے لئے اپنی رفیقہ حیات بناؤں۔

ف: یہی کیفیت انبیاء و اولیاء کی ہے کہ جب انہیں کوئی ستاتا ہے تو وہ اس کے لئے رحمت کی دعا مانگتے ہیں۔ دیکھئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا: کہ اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، کیونکہ وہ میری شان سے بے خبر ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین خون کے آنسو برساتے جب کہ نفس کی شرارتوں کو دیکھتے اور ہمیشہ حضور علیہ السلام سے نفس کی غلط راہ رویوں سے نجات پانے کی دعا کرواتے رہتے تھے اور دائماً ظاہری باطنی صفائی میں لگے رہتے تا کہ عذابِ مہین سے نجات نصیب ہو اور سب سے بڑا عذاب یہ سمجھتے کہ کہیں ہمیں فراق میں مبتلا کیا جائے۔

تعمیر کعبہ کا واقعہ:۔

چند روز ٹھہر کر پھر تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے تیر اندازی فرما رہے تھے۔ جب ابا جی کو دیکھا تو وہی کیا جو بیٹا باپ سے کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حکم دیا ہے۔ کیا تو میرے ساتھ تعاون کر سکتا ہے؟ اسماعیل علیہ السلام نے عرض کی: ہاں، ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یہاں پر ایک گھر تیار کروں۔ چنانچہ پھر اس کی تعمیر شروع کر دی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر سر پر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام انہیں تعمیر میں لاتے۔ جب بنا کچھ اونچی ہوئی تو اسماعیل علیہ السلام یہی پتھر لائے جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر بنا کرتے تھے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر وغیرہ دیتے رہے۔ اور دونوں حضرات پڑھتے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

دور سے پکارنا اور حج کا اعلان:۔

جب کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حج کا اعلان فرمائے۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا اللہ! کسے ندا دوں؟ حالانکہ آگے پہاڑ ہیں اور آدمی بھی سامنے کوئی موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارا کام اعلان کرنا ہے پہنچانا میرا کام ہے۔ ابراہیم علیہ السلام ابوقبیس پہاڑ پر چڑھے تو یہی پتھر بھی اونچا ہو گیا۔ طوفان کے دنوں ابوقبیس میں ہی اسے رکھا گیا۔ چنانچہ جتنا ابراہیم علیہ السلام اونچے ہوتے گئے یہ پتھر بھی اونچا ہوتا گیا یہاں تک کہ تمام پتھروں سے اونچا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے زمین کو دسترخوان کی طرح سمیٹ دیا پھر اعلان کیا: اے لوگو! تمہارے رب نے تمہارے لیے گھر تیار کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس کا حج کرو۔ یہ اعلان سن کر تمام لوگوں نے (جو اپنے آباؤ امہات کے اصلاب وارحام میں تھے) جواب دیا: جس نے ایک بار جواب دیا اسے ایک بار حج نصیب ہوا جس نے دس بار جواب دیا اسے دس بار نصیب ہوا وغیرہ وغیرہ۔

حدیث شریف: رکن اور مقام یواقیت جنت کے یاقوت ہیں اور اگر کفار و مشرکین ہاتھ نہ لگاتے تو ان کے

نور سے مشرق و مغرب چمک اٹھتے (یہاں پر حجراسود اور مقام سے یہ پتھر جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف کی تعمیر کے وقت کھڑے ہوئے تھے) مراد ہے۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ یعنی ہم نے انہیں تاکیدی حکم دیا اور وصیت فرمائی۔

حل لغات: عہد بمعنیٰ امر وصیت۔ جیسا کہا جاتا ہے: **عهد اليه اى امره ووصاه** ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ اور اسمٰعیل کو اسماعیل اسی لیے کہتے ہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام دعا مانگتے تو کہتے: اسمع یا ایل اور "ایل" بمعنیٰ اللہ۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو آپ اسی نام سے موسوم ہوئے۔

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ یعنی میرے گھر کو بتوں اور پلیدیوں اور جو اس کے لائق نہیں پاک کرو۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اس کی حفاظت کرو اور اس کے اردگرد کوئی گندی چیز کھڑی نہ ہونے دو۔

سوال: طہارت کا حکم کیوں ہوا حالانکہ کعبہ خود طاہر تھا؟

جواب: اس سے برقرار رکھنا مقصود ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا: وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ انہیں نجاست سے پاک ہونے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ وہ تو خود ہی طاہرات ہیں۔ یہ ایسے ہے جیسے درزی کو کہا جاتا ہے کہ قمیص دراز رکھنا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس سے تنگی ہٹا دے بلکہ مراد یہ ہے کہ ابتداءً اسے فراخ رکھنا۔

لِلطَّآئِفِيْنَ اس کے اردگرد کے زائرین کے لئے وَالْعٰكِفِيْنَ یعنی وہ جو اس کے مجاور ہیں یعنی اس کے نزدیک ٹھہرے رہتے ہیں اور باہر نہیں جاتے اس سے حرم شریف کے مقیم لوگ مراد ہیں اور طائفین سے وہ مسافرین مراد ہیں جو مکہ کی زیارت کے لئے باہر سے آتے ہیں۔

سوال: طواف کی ان کے لئے کیوں تخصیص ہے؟

جواب: اس لئے کہ وہ میقات سے احرام کی حالت سے آئے تھے۔ اس زیادہ عمل کی وجہ سے ان کا نام خصوصیت سے لیا گیا۔

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ نمازی لوگ۔ رکع، راکع کی اور سجود، ساجد کی جمع ہے۔ کیونکہ قیام و رکوع و سجود نماز کی ہیہات سے ہیں۔

سوال: ان کے مابین عطف کیوں ترک کیا گیا؟

جواب: رکوع وسجود ذاتاً وزماناً قریب ہیں۔اسی اتحاد کی وجہ سے عطف ترک کیا گیا ہے۔

حدیث شریف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی ایک دن میں ایک سو بیس رحمتیں کعبہ پر نازل ہوتی ہیں۔ساٹھ طواف کرنے والوں کے لئے اور چالیس نمازیوں کے لئے اور بیس دیکھنے والوں کے لئے۔

مسئلہ: بیت کی طہارت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جمیع بیوت کو پاک رکھا جائے کہ جس طرح کعبہ کی طہارت ونظافت ضروری ہے اسی طرح تمام گھروں کو۔

سوال: صرف کعبہ کو ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: وہاں پر سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا اسی بنا پر اسی کا نام لیا۔

حکایت: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں ایک شخص کی اونچی آواز سنی۔اسے فرمایا: تجھے پتہ نہیں تو کس متبرک مقام پر ہے؟

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ اے ڈرنے والوں کے صاحب اور مرسلین کے رفیق! اپنی قوم کو فرما دو کہ جب میرے کسی گھر آئیں تو انہیں چاہیے کہ اس وقت ان کے دل صاف اور زبانیں سچی اور ہاتھ ستھرے اور فروج طاہر ہوں اور ایسے وقت میرے کسی گھر میں نہ آئیں جبکہ ان کے پاس اندھیریوں میں سے کوئی اندھیری ہو کیونکہ ایسی حالت میں آئے گا تو جتنی دیر وہاں ٹھہرا رہے گا میری اس پر لعنت رہے گی۔یہاں تک کہ اس اندھیری کو دور نہ کرے۔(یعنی اس سے توبہ نہ کرے) جب صحیح حالت میں حاضری دیتا ہے تو میں اس کے کان ہوتا ہوں جن سے سنتا ہے اور آنکھ ہوتا ہوں جن سے دیکھتا ہے اور وہ میرے خالص دوستوں اور اولیاء سے ہے اور کل قیامت میں انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین کی معیت میں میرے قریب ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ جس گھر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا وہ دراصل قلب مومن ہے۔اس کی صفائی کا یہ مطلب ہے کہ اسے غیر اللہ سے متوجہ ہونے سے بچائے۔کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت کا مرکز ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است　　از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

کعبہ یاد خلیل آزر است　　دل نظر جلیل اکبر است

ترجمہ:

دل ہاتھ میں کرو کہ وہ حج اکبر سے ہزاروں کعبہ سے ایک دل بہتر ہے۔

کعبہ کو خلیل کی بنا ہے اور دل جلیل کی نظر گاہ ہے۔

بنابریں اسے صاف رکھنا ضروری ہے یہاں تک کہ اس پر انوار وتجلیات اور اسرار رحمانیہ کا نزول ہو اور ساتھ ہی اسے سکون ووقار نصیب ہوگا۔ جب بندہ اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو حقیقی سجدہ ورکوع سے مشرف ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی اور خصوصی رازداری سے نوازا جاتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ یاد کیجئے اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جب کہ ابراہیم نے دعا مانگی اور کہا: اے رب! اجْعَلْ هٰذَا کر دے اس گھر کو۔ هٰذَا کا مشار الیہ مکان ہے یعنی حرم شریف۔ بَلَدًا اٰمِنًا امن والا شہر۔ اس کو اہل قحط وتکلیف اور خسف ومسخ اور زلازل اور جنون وجذام وبرص اور دیگر تکالیف (جو عام شہروں میں اترتی ہیں) سے محفوظ رکھ۔ یہ باب انسب سے ہے۔ یعنی وہ شہر جو امن کی طرف منسوب ہے جیسے لفظ لابن دودھ والا اور تامر کھجور والا۔ کیونکہ ان کا موصوف ماخوذ کی طرف منسوب ہے۔ گویا لابن کو لبنی (دودھ والا) اور تامر کو تمری کھجور والا کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اسناد حقیقی ہے اور یہ معنیٰ ہے کہ اس شہر کے اہل امن والے ہیں۔ یہ اسناد مجازی ہوگا کیونکہ امن حقیقتاً اہل بلاد کی طرف منسوب ہوا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ مکان کو اسی سے ملابست ہے بنابریں اس کی طرف منسوب ہونا بھی جائز ہے۔

ابراہیم علیہ السلام جب پہلی بار مکہ میں تشریف لائے تو یہی دعا مانگی۔ کیونکہ جب سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ صاحبہ کو جو مکہ میں ٹھہرا کر اپنے ملک شام کو واپس روانہ ہونے لگے تو بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے پوچھا کہ آپ ہمیں کس کے سہارے اس جنگل سنگستان میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب یہ کہا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؟ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ہاں، بی بی نے کہا: اب میں راضی ہوں کیونکہ وہ کریم مجھے کہیں ضائع نہیں کرنے والا۔ ان سے الوداع کر کے کداوادی پر ٹھہرے اور کہا: رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ الآیۃ۔

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ اور انہیں ثمرات عطا فرما۔ ثمرات ثمرہ کی جمع ہے۔ یعنی کھانے کی چیزیں جو زمین اور درخت سے نکلتی ہیں۔ اس سے طعام اور میوہ جات مراد ہیں۔

سوال: صرف ثمرات کا سوال کیوں؟

جواب: کیونکہ طعام معہود تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔ لیکن میوہ جات نادر ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کے اہل کے لئے امن اور اسی فراخی کا سوال کیا جس سے عیش اچھا اور دائمی ہو۔ ان کی اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔

اعجوبہ: مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو ثمر دار بستیوں کو فلسطین سے نقل کرنے کا حکم دیا۔ جبریل علیہ السلام انہیں اٹھا کر لائے اور کعبہ کے اردگرد سات پھیرے لگا کر تین مراحل تک مکہ سے دور رکھا وہ یہی طائف شریف ہے۔ اسی لحاظ سے اسے طائف کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے مکہ شریف میں ثمرات بکثرت ہوتے ہیں اور نیز مختلف مقامات سے بھی میوہ جات آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں ایک دن میں سردیوں اور گرمیوں کے میوہ جات مل جاتے ہیں۔

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یہ اَهْلَهٗ سے بدل ہے۔ یعنی وہ نعمتیں کہ صرف مومنین کو عطا ہوں۔ قال اللّٰہ تعالیٰ: قَالَ وَمَنْ كَفَرَ اس کا عطف محذوف ہے۔ یعنی ارزق من آمن ومن کفر۔ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رزق کا قیاس امامت پر فرمایا۔ اس لیے صرف مومنین کے لئے سوال کیا۔

جب پہلے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے امامت کو ان کے لے خاص فرمایا: کما قال: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ میں نے اپنی اولاد کے لئے امامت کا عرض کیا، تو سب کے بجائے بعض کو اجازت ہوئی۔ اسی طرح رزق بھی شاید سب کے لئے نہ ہو تو آپ نے مَنْ اٰمَنَ کی قید لگائی تا کہ سوال میں بے ادبی نہ ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ رزق کو رحمت رحمانیہ سے تعلق ہے اور اسی لیے یہ مومن و کافر سب کو ملے گا۔ بخلاف امامت اور پیشوائی کے کہ وہ خاص لوگوں کو نصیب ہوگی۔

فَاُمَتِّعُهٗ پھر اس کے لئے عام کردوں گا تا کہ وہ دنیا کی تمام لذتوں کو حاصل کرلے۔ پھر قیامت میں اس پر حجت قائم کی جائے گی۔ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ لیکن یہ نفع اندوزی چند دنوں تک ہوگی۔ کیونکہ دنیا چند روزہ ہے اور آخرت کی نعمتیں تو بے پایاں ہیں۔ اسے اس سے کیا نسبت بنا بریں کافر اس سے جتنا ہی نفع اٹھائے بہت

تھوڑا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دنیوی نعمتیں اگرچہ کتنی ہی ہوں لیکن آخرت کی نعمتوں کی نسبت بہت تھوڑی ہیں۔
قَلِیۡلًا صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی: امتعہ زمانا قلیلا اور یہ قلیل مدت کافر کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔

پھر میں اسے جہنم کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔ اضطرار لغت میں انسان کو ایسی شئے کی طرف کھینچ لے جانا جو اسے نقصان پہنچائے۔ عرف میں اضطرار یہ ہے: کسی کو کفر پر مجبور کرنا۔ جب کہ وہ کفر نہ کرے۔ یعنی اسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہو۔ لیکن اسے مجبور کر دیا جائے کہ کفر کرو نہ کرو گے قتل کر دیئے جاؤ گے۔ کفر و قتل میں سے ایک انسان امر کو اختیار کرنے سے کفر پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن کفار کو یہ بات پسند ہے کہ عذابِ نار کو اختیار کر رہے ہیں۔ جو ان کے نزدیک ایمان لانے سے آسان نظر آتا ہے اب اس مقام پر کفار کے لئے اضطرار کا استعمال مجازی ہوگا۔ اس معنیٰ پر کہ یہ امر ان پر لازم ہو رہا ہے اور ان پر ایسا چسپاں کیا جا رہا ہے کہ اب اس سے بچنا مشکل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یُسۡحَبُوۡنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ اس دن جہنم میں منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب میں انہیں کوئی دخل نہیں ہوگا ہاں، انہیں مضطرین بمعنیٰ مختار کہا جائے تو بجا ہے کہ کفر کو انہوں نے اپنے اختیار سے کیا۔ بنا بریں انہیں جہنم میں دھکیلا جائے گا۔ اس معنیٰ پر تشبیہا انہیں مضطرین کہا گیا۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے کفر کی وجہ سے عذابِ نار میں مضطر کی طرح کھینچا۔ اس لحاظ سے کہ انہیں دی ہوئی نعمتوں کو ضائع کر دیا جواب سوائے جہنم کے داخلے کے انہیں کوئی چارہ نہیں۔
وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ بہت برا ہے ان کا ٹھکانہ۔ اس میں مخصوص بالذم محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی: بئس المرجع الذی یرجع الیہ ۔ الخ۔ یعنی ان کا بہت برا ٹھکانا ہے جہاں وہ جا کر اقامت کریں گے۔ اس سے مراد جہنم یا عذاب ہے۔

ف: بندہ کو یہاں دنیا فانی میں چند روز مہلت دی گئی ہے۔ مہلت کو دیکھ کر مہمل ہو کر نہ رہے کیونکہ یہاں کے اعمال کے مطابق وہاں جزا و سزا ملے گی۔ اے برادر! دنیا کی جگمگی تجھے دھوکہ میں نہ ڈال دے اطاعت کرو گے تو فائدہ ہوگا۔ معصیت کرو گے تو عذاب ہوگا۔ دنیا کا ٹھاٹھ کچھ آخرت میں بلندی درجات کا سبب نہیں بنے گا۔
حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

بمہلتی کہ سپہرت دہد زراہ مرد   ترکہ گفت کہ آں زال ترک دستان کفت

ترجمہ : وہ مہلت جو تجھے زمانہ نے بخشی ہے راہ سے نہ ہٹ تجھے کیا ہے کہ وہ مکروفریب والی تیرے ہاتھ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (ہم ایسی مہلت دیتے ہیں کہ انہیں علم ہی نہیں)

حکایت: حضرت سہیل تستری علیہ الرحمہ اس آیت کا معنیٰ یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہم بندے کو نعمتیں دیکر مہلت دیتے ہیں پھر وہ ان کا شکر کرنا بھول جاتا ہے جب وہ نعمتوں میں غرہ ہو کر اپنے مالک کو پورے طور پر بھول جاتا ہے پھر ہم اس کی گرفت کرتے ہیں۔

سبق: سمجھدار کو چاہیے کہ دنیا کی رنگینیوں کو دیکھ کر دھوکہ میں نہ آجائے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا کسی شئے پر خوشی نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا باقی سب فنا ہے مٹنے والی شئے سے دل لگانا کچھ دانائی کا کام نہیں۔ نہ ہی یہ عقل وفہم اور عرفان ہے۔

سوال : اللہ تعالیٰ عاصیوں کو دنیا میں کیوں مہلت دیتا ہے؟

جواب : بندوں کو گناہوں کے باوجود مہلت اس لیے دیتا ہے تا کہ بندوں کو پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کو عفو واحسان زیادہ پسند ہے بہ نسبت گرفت اور انتقام کے۔

سبق: اس سے بندے معلوم کریں کہ وہ کریم وشفیق ومحسن ہے۔ یہ مسئلہ یوں سمجھ میں آئے گا کہ ایک شخص کا ایسا اعلان ہو کہ میری ضیافت کو جو قبول کرے گا اس کی میں عزت کروں گا وہ میرا یوں اعلان کرے کہ جو میری ضیافت کے لئے آئے اس کی عزت کروں گا جو نہیں آئے گا اسے سخت سزا دوں گا پہلے نسبت دوسرے کا احسان اور شفقت اور کرم زائد سمجھا جائے گا۔ بلاتمثیل یوں سمجھئے کہ ادھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں ضیافت کا یوں اعلان فرمایا: وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی بہشت کی دعوت دیتا ہے۔ ادھر اپنے نبی علیہ السلام کے ہاتھ میں تلوار دیدی اور فرمایا جو بھی میری ضیافت قبول نہ کرے اس کی گردن اڑادو۔

سبق : دانا کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کر کے اپنے مالک کی طرف لوٹے اور دل سے ہی لوٹے مجبور ہو کر نہیں، کیونکہ وہی مقصود اعظم اور وہی دل کا حقیقی قبلہ ہے۔ تمام قافلے اسی کی طرف پہنچیں گے۔

تفسیر صوفیانہ اس آیت میں بلا سے مراد صورہ جسمانیہ اور کعبہ سے مراد قلب ہے اور طواف حقیقی یہ ہے کہ قلب بارگاہِ ربوبیت کا طواف کرے۔ یہ بیت اللہ جو ظاہری طور پر اس ملک میں ہے، اسی بارگاہ کے لئے ہے جس کا آنکھوں سے مشاہدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ عالم ملکوت میں ہے۔ جیسے انسان کی ظاہری شکل عالم شہادت میں مثال ہے۔ اس قلب کی جس کا آنکھوں سے مشاہدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ عالم غیب ن شئے ہے اور عارفین کو طواف قلبی حقیقی نصیب ہوتا ہے۔ جن کے متعلق مشہور ہے کہ کعبہ ان کی زیارت کے لئے حاضر ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے: **ان اللّٰہ عباد الطوف بھم الکعبۃ** (بیشک اللہ تعالیٰ کے بعض ایسے بندے ہیں جن کا خود کعبہ طواف کرتا ہے) ایک صرف کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہے ایک وہ ہے جو رب کعبہ کا طالب ہے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

حکایت: ایک بزرگ حج کو روانہ ہوئے ان کے صاحبزادے نے پوچھا: ابا جی کہاں کا ارادہ ہے؟ بزرگ نے فرمایا: بیت اللہ کی زیارت کا۔ صاحبزادے نے خیال کیا کہ جو کسی کے گھر کو دیکھتا ہے تو لامحالہ وہ گھر کے مالک کو بھی ملے گا صاحبزادے نے کہا: مجھے بھی ساتھ لے چلئے۔ بزرگ نے فرمایا: تو اس کا اہل نہیں۔ صاحبزادہ رونے لگا مجبوراً اسے ساتھ لے جانا پڑا۔ جب میقات میں پہنچے، تو احرام باندھا۔ لبیک پکاری اور حرام میں داخل ہوئے جب بیت اللہ نظر آیا تو لڑکے نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر مر گیا۔ بزرگ رونے لگا، ہائے! میرے لڑکے کو کیا ہو گیا۔ بیت اللہ سے آواز آئی تو گھر کو دیکھنے آیا تھا تو نے اسے دیکھ لیا اور وہ گھر والے کا طالب تھا۔ وہ گھر والے کو ملنے گیا ہے۔

اسی اثناء میں بچہ غائب ہو گیا۔ اس پر ہاتف نے آواز دی وہ لڑکا کسی مکان میں ہے نہ زمین پر اور نہ بہشت مین بلکہ اسے وہاں پہنچایا گیا ہے جہاں مالک حقیقی کا ٹھکانہ ہے۔

سبق: جو بھی ان جہالت کی پابندیوں سے بچ گیا۔ اس کا قبلہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ پھر وہ جمیع کائنات کا قبلہ بن جاتا ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام ملائکہ کرام کا قبلہ ٹھہرے۔ کیونکہ وہ فرشتوں کے لئے وسیلہ حق ہے اس لیے ان پر

جلال و جمال کا جامہ تھا۔

حضرت شیخ سعدی عطار علیہ الرحمہ منطق الطیر میں فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ گفت آدم غیر نیست	کور چشمی و ترا ایں سیر نیست
شد نفخت فیہ من روح آشکار	سرّ جاناں گشت برخاک استوار
از دمِ حق آمدی آدم توئی	اصل کرّمنا بنی آدم توئی
قبلہ کل آفرینش آمدی	پائے تا سر عین بینش آمدی

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آدم غیر نہیں تو اندھا ہے اس کا تجھے علم نہیں۔

۲۔ نفخت فیہ من روحی صاف بتلا رہا ہے محبوب کے اسرار خاک کے رنگ میں ہیں۔

۳۔ حق کے دم سے آیا ہے تو ہی آدم ہے کرّمنا بنی آدم اصل میں تو ہی ہے۔

۴۔ تمام کائنات کا قبلہ تو ہی تو ہے سر سے پاؤں تک تم سراسر بینائی ہو۔

یا اللہ! ہمیں عین تک پہنچا اور جدائی سے نجات دے۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ **سوال**: مضارع کیوں استعمال ہوا ہے حالانکہ واقعہ تو ماضی میں ہوا؟

جواب: یہ حال واقعہ کو وجہ سے ہے گویا ابھی واقع ہو رہا ہے اور مخاطب کے تصور میں ایسے ہوا کہ ابھی میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

حل لغات: اَلْقَوَاعِدَ بقاعدہ کی جمع ہے۔ دراصل صفت ہے اور بمعنی ثابتۃ" کے ہے۔ پھر بوجہ غلبہ اسم ہو گیا یہاں تک کہ اب اس کے ساتھ موصوف مذکور بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی مقدر مانا جاتا ہے اور لفظ قعود دراصل اس ہیت کو کہتے ہیں جو قیام کے بالمقابل ہے اب استعارۃً استقرار پر بولا جاتا ہے۔ اس تشبیہ سے کہ دونوں حالت انتقال ونزول کے مباین ہیں۔

ترکیب: مِنَ الْبَیْتِ، اَلْقَوَاعِدَ سے حال ہے اور مِنْ ابتدائیہ ہے نہ کہ بیانیہ کیونکہ مِنَ الْبَیْتِ کے بجائے البیت

نہیں کہا جاسکتا۔

سوال: رفع بمعنی کسی شئے کو زمین سے علیحدہ کر کے زمین سے بلند و بالا کیا جائے اور اساس تو ہمیشہ زمین پر مستقر ہوتا ہے اب رفع کا کیا مطلب؟

جواب: رفع اساس سے مراد اس پر بنا کرنا اور بِنا علی الاساس مراد لے کر رفع کو استعمال کیا گیا، کیونکہ بنا کو نچائی کی ہیت سے نقل کر کے اونچائی کی ہیت میں لے جاتے ہیں۔ اب رفع کا حقیقی معنیٰ مل گیا۔

سوال: بیت کا اساس تو ایک تھا لیکن قواعد جمع سے کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب: اس کے اجزاء کے اعتبار سے گویا اس کا ہر ایک جزا اپنے مافوق کے لئے اساس تھا۔ اب معنیٰ یہ ہے کہ یاد فرمایئے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کو جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی بنیاد کو بلند فرمایا۔

وَاِسْمٰعِیْلُ اور انکے بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے۔

ف: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔

۱۔ اسماعیل ۲۔ اسحٰق۔ ۳۔ مدین۔ ۴۔ مدائن۔

ف: اس کا عطف ابراہیم پر ہے۔

سوال: اسے مفعول سے کیوں موخر کیا گیا ہے حالانکہ اس کا عطف فاعل پر ہے تو اسے مفعول سے مقدم ہونا چاہیے؟

جواب: اس میں اشارہ ہے کہ رفع بیت میں اصل ابراہیم تھے اور اسماعیل ان کی فرع۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر دیتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی بنا کرتے۔

تاریخ کعبہ: رفع اساس جس پر کعبہ کی بنا کی گئی دلالت کر رہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے وجود مسعود سے پہلے کعبہ کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے آ کر اس پر تعمیر فرمائی۔ لیکن اختلاف یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی بنیاد کس نے رکھی۔؟

بعض کہتے ہیں: فرشتوں سے سب پہلے اس کی بنیاد ڈالی۔

چنانچہ مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو انہوں نے کہا: مفسد اور خونریز کو پیدا کر رہا ہے۔ ہم تیری تسبیح وتقدیس کے لئے کافی نہیں؟ اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہوا تو انہوں نے اس کے عرش کے پاس آ کر پناہ لی اور اس کے ارگرد سات بار طواف کیا تا کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور فرمایا کہ میرا زمین پر ایک گھر تیار کرو۔ اس کے قریب آ کر جس بنی آدم پر میں ناراض ہوں گا پناہ مانگے گا اور جس طرح تم نے میرے عرش کا طواف کیا ہے وہ اس کا طواف کرے گا جس سے میں راضی ہو جاؤں گا۔ اس حکم کے بعد ملائکہ نے اسی بیت اللہ کو تیار کیا۔

ف: بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر ایک بیت تیار کرایا ہے جس کا نام بیت المعمور ہے اس کا نام ضراح ہے ملائکہ کو حکم فرمایا کہ زمین میں اس کے مقابل اس کی قدر اس جیسا کعبہ تیار کرلو۔

ف: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سب سے پہلے کعبہ کی بنیاد آدم علیہ السلام نے رکھی۔ پھر طوفانِ نوح سے وہ تعمیر مٹ گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کا نشان بتایا۔

چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اترے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! زمین پر جا کر ایک گھر تیار کرو اور اس کے ارد گرد طواف کرو اور وہاں پر مجھے یاد کرو۔ جیسے فرشتگان کو میرے عرش کے گرد دیکھتے ہو۔ آدم علیہ السلام حکم سن کر روانہ ہوئے ان کے لئے زمین لپیٹ لی گئی اور جنگل قبض کر لیے گئے۔ جہاں پر قدم رکھتے وہاں آبادی ہو جاتی۔ یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کی جگہ تک پہنچ گئے۔ جبریل علیہ السلام نے زمین پر اپنے پر مارے جس سے ساتویں نیچی زمین تک اس کی بنیاد کا نشان نظر آنے لگا اور فرشتوں نے ایک پتھر لایا جس کو ستر آدمی بھی نہ اٹھا سکیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر پانچ پہاڑوں سے کی۔

۱:۔ طور سینا۔ ۲:۔ طور زیتا۔ ۳:۔ لبنان جو شام میں ایک پہاڑ ہے۔ ۴:۔ جودی، جو جزیرہ میں ایک پہاڑ ہے۔
۵:۔ حراء جو مکہ میں ہے جس کی بنیاد چوڑی رکھی گئی اور پتھروں سے بھر دی گئی تھی۔ یہ تھی آدم علیہ السلام کی بنا۔

ف: بعض روایات میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے مقام کو زمین سے دو ہزار سال قبل پیدا فرمایا جو اس وقت سفید جھاگ کا ٹکڑا پانی پر تھا۔ اس سے زمین کو بچھایا گیا۔ جب آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو انہیں وحشت

ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف شکایت پیش کی۔ اللہ تعالیٰ نے بیت المعمور (جو اس کے یاقوت بہشت کے یواقیت سے تھا اس کے دو باب زمرد اخضر کے تھے باب شرقی، باب غربی) کو اس بیت کی جگہ پر رکھ کر فرمایا: اے آدم! ہم نے تمہارے لیے اس بیت کو آسمان سے اتارا ہے۔ اس کا طواف کرو جیسے میرے عرش کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور اس کے قریب نماز پڑھئے۔ جیسے میرے عرش کے قریب پڑھی جاتی ہے۔ بعد ازاں ایک پتھر نازل فرمایا جو پہلے سفید تھا اب زمانہ جاہلیت کی حیض والی عورتوں کے ہاتھ لگانے سے سیاہ ہو گیا ہے۔ آدم علیہ السلام مکہ کی طرف زمین ہند سے پیدل روانہ ہوئے۔ آپ کی رہبری کے لئے ایک فرشتہ مقرر کیا جو انہیں راستہ بتاتا تھا۔ (امام مجاہد سے پوچھا گیا کہ آپ سوار ہو کر کیوں نہ آئے؟ آپ نے فرمایا: اس وقت کون سی سواری تھی جو آپ کو لے آتی)

آپ کے ایک قدم کی مسافت تین دنوں کے سفر کے برابر تھی۔ آپ مکہ میں آئے حج کے مناسک ادا کیے۔ جب فارغ ہوئے تو ملائکہ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آدم علیہ السلام! آپ کا حج مبرو ہے ہم نے آپ کی پیدائش سے پیچھے دو ہزار سال پہلے اس کا حج کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے ہند سے مکہ تک چالیس پیدل حج کئے تھے اسی طرح وہ اور دیگر مومنین (ان کی اولاد سے) طوفان نوح تک طواف کرتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے چوتھے آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ جہاں ہر یوم ستر ہزار فرشتے حاضر ہوتے (جنہیں پھر حاضری کا موقعہ نہ ملتا) اور جبریل علیہ السلام کو بھیج کر حجرِ اسود کو جبل ابی قبیس میں چھپانے کا حکم دیا گیا تا کہ وہ غرق ہونے سے محفوظ رہے پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہ مقام خالی رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی بنا کا حکم فرمایا کہ جس میں وہ رہ کر اس کی یاد کریں۔

اللہ تعالیٰ سے عرض کی: الٰہی! مجھے اس مقام کی رہبری فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے سکینہ کو بھیج کر ان کی رہبری کی۔ (سکینہ الحجوج کو کہتے ہیں جس کے دونوں سرے سانپ کی طرح ہوتے ہیں) پھر ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جہاں یہ سکینہ ٹھہر جائے وہاں کعبہ کی بنیاد رکھنا۔ آپ اس کے پیچھے چل پڑے۔ یہاں تک کہ وہ سکینہ اس بیت اللہ والے مقام پر آ کر رک گئی اور گھومنے لگی جیسے ڈھال گھیرا مار کر گھومتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام سے عرض کی: اسی جگہ پر قبلہ کی بنیاد رکھئے۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر کا کام شروع کر دیا تھا۔

یہاں تک کہ جب حجر اسود والے مقام پر پہنچے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا: کوئی سفید کا خوشنما پتھر لائیں اور یہاں نشان کے طور پر رکھ دیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام ایک خوشنما سفید رنگ کا خوشنما رنگ کا پتھر لے آئے۔ لیکن آپ نے فرمایا: اسے بھی زیادہ کوئی اور ہو تو بہتر ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کی تلاش میں نکلے تو ابوقبیس نے پکار کر عرض کی: اے ابراہیم علیہ السلام میرے پاس ایک امانت ہے وہ لے جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک شاندار بہشت کا یاقوتوں میں سے ایک یاقوتی پتھر موجود ہے۔ اور اسے حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے اپنے ساتھ لے آئے۔ جیسے بعض روایات میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بیت المعمور کو نیچے اتارا تو اس کے ساتھ بھیجا تھا۔ جیسے اس کی تفصیل گزری ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اسی مقام پر رکھا۔ پھر جب تعمیر کچھ بلند ہوئی تو ایک مربع شکل کا بادل اترا جس کا ایک سر تھا اس نے ندا دی کہ میری صورت کے مطابق ہی اس کی تعمیر کیجئے۔ یہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کی تفصیل۔

گھوڑا پہلے وحشی جانور تھا:۔

مروی ہے کہ جب باپ بیٹا دونوں کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سواری کا گھوڑا انعام میں عطا فرمایا در اصل یہ گھوڑا پہلے دوسرے وحشی جانوروں کی طرح جنگلی جانور تھا۔

ف: مروی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کعبہ مکرمہ کی تعمیر کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تمہیں اپنے خزانوں میں سے ایک خزانہ عطا فرماؤں گا۔ پھر جب تعمیر مکمل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو فرمایا: کہ پہاڑوں کی طرف جایئے وہاں دعا مانگیے۔ آپ پہاڑوں میں گئے لیکن انہیں نہ دعا مانگنا معلوم ہوا اور نہ خزانہ کا پتہ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک دعا سکھائی۔ جب آپ نے دعا مانگی تو تمام دیارِ عرب گھوڑے آپ کے پاس آگئے اور آپ کے قبضہ قدرت میں دے دیے گئے۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے فرمایا:

”اے لوگو! ان گھوڑوں کو سواری بناؤ اور گھاس کھلاؤ، ان میں بڑی برکتیں ہیں اور تمہارے یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وراثت سے تمہیں عطا ہوئے ہیں“

گھوڑے کو عربی بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ایک تو اسماعیل علیہ السلام کو ان کے لئے دعا کا حکم دیا گیا تھا دوسرا یہ کہ عربی کی نسبت عربہ (بفتحتین) کی طرف ہے اور عربہ بمعنی باحۃ العرب کیونکہ اسماعیل علیہ السلام نے عرب میں پرورش پائی تھی۔

ف: ابراہیم علیہ السلام سریانی میں بولتے اور اسماعیل علیہ السلام عربی میں۔ لیکن ایک دوسرے کی بولی سمجھ جاتے۔ ایک دوسرے کی بولی بول نہیں سکتے تھے۔

کعبہ کی تعمیر ثالث: قریب کی تعمیر کعبہ کا واقعہ تو مشہور ہے اور سانپ کا واقعہ بھی مشہور ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ قریش نے جب کعبہ کی تعمیر کا ارادہ کیا تو ایک سانپ اس کی تعمیر میں حائل ہوا وہ کعبہ کی پرانی عمارت کو ڈھانے نہ دیتا تھا۔ تمام قریش جمع ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر عرض کرنے لگے:

''یا اللہ! تو جانتا ہے کہ ہم تیرے گھر کو سنگارنا چاہتے ہیں سوائے اس کی زیبائش کے ہمارا اور کوئی ارادہ نہیں۔ اگر تو اس سے راضی ہے تو ہمیں توفیق دے ورنہ جیسے تو چاہے ہم راضی ہیں''

چنانچہ ان کی دعا مستجاب ہوء۔ آسمان سے ایک موٹے سے پرندے کے اترنے کی آواز انہوں نے سنی۔ دیکھا کہ وہ پرند چیل سے کچھ بڑا ہے۔ اس کی پیٹھ سیاہ اور پیٹ اور پاؤں سفید ہیں۔ اس نے سانپ کے سرے کو چنگل میں دبایا اور اوپر لے اڑا۔ قریش دیکھتے رہے کہ اس کی دُم بہت چوڑی تھی۔ اس نے اس سانپ کو پہاڑوں میں جا پھینکا۔ اس پر قریش نے پرانی عمارت کو منہدم کر دیا اور نئے سرے سے تعمیر شروع کر دی۔ وادیوں سے پتھر اٹھا اٹھا کر بیس گز اونچی عمارت تیار کر دی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ:۔

زہری سے مروی ہے کہ جب وہ رکن یمانی کے مقام پر پہنچے تو ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا کہ حجر اسود کو وہاں رکھنے کی ہر قبیلہ کی خواہش تھی تا کہ یہ برکت انہیں حاصل ہو۔ آخر طے پایا کہ جو اس کوچہ سے سب پہلے گزرے گا اسی کو فیصلہ کا حاکم ٹھہرایا جائے گا۔

چنانچہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا۔ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو

درست ماننے کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حجر اسود کو ایک بڑے کپڑے پر رکھ دو اور اس کپڑے کو قبیلے کا سردار پکڑے یوں قبیلوں کے سردار سے اس مقام کے قریب لے آئیں۔ چنانچہ وہ اس فیصہ پر راضی ہو گئے۔ جب سب سے اسے اٹھا کر دیوار کے قریب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے دست مبارک سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا۔

ف: بعض روایات میں ہے کہ قریش کے رکن میں ایک کتاب سریانی لغت کی ملی۔ لیکن اسے وہ پڑھنا نہیں جانتے تھے ان میں ایک یہودی عالم سریانی لغت کو جانتا تھا۔ اس نے پڑھا تو لکھا تھا ہوا پایا: کعبہ کا مالک میں اللہ ہوں۔ میں نے کبعہ اس وقت پیدا کیا جب زمین و آسمان بنائے اور سورج چاند پیدا کیے اور میں نے اس کی حفاظت کے لئے سات فرشتے مقرر کیے ہیں وہ اس وقت اس سے ہٹیں گے جب اس کی آخری تعمیر ہوگی یہ اپنے اہل کے لئے مبارک اور اس کا پانی اور دودھ مبارک ہے۔

ف: حضرت ابو جعفر فرماتے ہیں کہ عمالقہ اور جرہم اور ابراہیم کے زمانے میں مکہ کا دروازہ زمین پر تھا قریش نے اسے اونچا کیا۔

حدیث شریف: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے دیوار کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ بھی کعبہ کے حکم میں ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، پھر میں نے عرض کیا کہ قریش نے کعبہ کے اندر کیوں نہ داخل کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ میں نے پھر کہا: اس کا دروازہ اونچا کیوں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تیری قوم قریش کی کارگزاری ہے۔ اگر ان میں زمانہ جاہلیت کے تاثرات نہ پائے جاتے تو میں ان کے اس دروازہ کو توڑ کر زمین کے برابر کر کے اس کے دو دروازے مقرر کر دیتا۔ ایک بجانب مشرق، دوسرا بجانب غرب۔ اور حجر اسود کی طرف سے چھ اور بڑھاتا۔ چونکہ قریشیوں نے اسی طرح تعمیر کی تو میں بھی اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ تھی تعمیرِ ثالث کی تفصیل۔

تعمیر رابع:۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اہل شام سے جنگ کی۔ ان کی زیادتیوں سے

کعبہ کی تعمیر کچھ جل گئی۔ تو آپ نے اسے گرا کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق کعبہ از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس کے دو دروازے رکھے گئے۔ ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے باہر نکلتے۔ حجرِ اسود کے قریب سے چھ گز کا اضافہ کیا۔ اس سے قبل کعبہ معظمہ کی لمبائی اٹھارہ گز تھی۔ حجرِ اسود کی طرف سے تعمیر میں اضافہ کی وجہ سے اب طول میں کچھ کمی آ گئی۔ نو گز کم ہو گئے۔

تعمیرِ خامس:۔ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو حجاج ظالم نے ان کی تعمیر کردہ عمارت کو گرانے کا حکم دیا جتنا اضافہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا وہ ختم کر کے پہلی تعمیر قریش کی طرح کی عمارت تیار کرائی اور مغربی دروازے کو بند کرا دیا۔

تعمیر سادس:۔

مروی ہے کہ ہارون الرشید کو خیال گزرا کہ حجاج ظالم کی تعمیر کو گرا کر کعبہ کی تعمیر ویسے ہی کرائے جس کی خبر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے انہیں دی کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ معظمہ یوں تعمیر کرایا تھا۔ حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کام کا مشورہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اے ہارون! تجھے رب کعبہ کی قسم! ایسا نہ کر۔ کیونکہ اس طرح ہر آنے والا بادشاہ عمارت کو منہدم کر کے پہلے کے خلاف تعمیر کرتا رہے گا یوں کعبہ معظمہ ایک مذاق بن کر رہ جائے گا اور لوگوں کے دلوں سے اس کی ہیبت نکل جائے گی۔

تعمیر کعبہ دس بار:۔

کہتے ہیں کہ کعبہ کی تعمیر دس بار ہوئی: ا:۔ تعمیر ملائکہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے۔ ۲:۔ تعمیر آدم علیہ السلام۔ ۳:۔ آپ کی اولاد میں سے شیث علیہ السلام۔ ۴:۔ ابراہیم علیہ السلام ۵:۔ عمالقہ۔ ۶:۔ جرہم ۷:۔ قصی بن کلاب۔ ۸:۔ قریشِ مکہ۔ ۹:۔ عبداللہ زبیر رضی اللہ عنہ ۱۰:۔ حجاج بن یوسف۔

ف: تعمیر کا مطلب یہ ہے کہ اس کی دیواروں کو درست کیا جاتا، نہ کہ اس کی اصل مکانیت کو۔

قولِ دیگر: حافظ سہیلی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

سارے زمانے میں اس کی تعمیر صرف پانچ بار ہوئی۔ پہلی بار حضرت شیث علیہ السلام نے کی۔

تعمیر کعبہ پندرہ بار:۔

حدیث شریف: پانچویں تعمیر ان پندرہ تعمیروں میں سے ہے جو اس سے پہلے ہو چکی تھیں۔ سات بار ان میں سے آسمانوں میں یوں ہوئی کہ ساتویں تعمیر اس کے عرش تک پہنچی۔ پھر ساتویں بار زمین تک اترنے کی تھی۔ جس کا نچلا حصہ زمین میں اور اوپر والا عرش کے نیچے بیت المعمور میں ہے۔ لیکن جہاں جہاں اس کی تعمیر ہوتی رہی وہاں اس کے ایسے ہی حرم مقرر ہوئے جیسے یہاں اس کا حرم شریف ہے۔ ان ساتوں میں سے کوئی ایک گرے تو ساتوں گرتے گرتے اس کو بھی گرا دیں گے۔ جیسے زمین پر اس کی تعمیر کی جاتی ہے ویسے ہی آسمانوں میں بھی۔ اسی طرح محدث کازرونی علیہ الرحمہ نے اپنے مناسک میں ذکر فرمایا ہے۔

حدیث شریف: میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عرش آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش سے پہلے پانی پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا چلائی جس سے پانی متحرک ہوا تو اس کے اندر سے اس کعبہ معظمہ کے مقام سے لکڑی ظاہر ہوئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک قبہ ہے۔ اس کا حدود اربعہ اس بَیْتُ اللّٰہ کے مطابق تھا جیسے آج ہمارے ہاں موجود ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ نے زمین کو بچھانے کا حکم دیا وہاں سے زمین پھیلتی گئی۔ اسے پھر پہاڑوں کی میخوں سے مضبوط کر دیا گیا۔ پہاڑوں میں سے سب سے پہلے ابوقبیس کو رکھا گیا۔ اسی لیے مکہ مکرمہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے۔

ف: حضرت کعب فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر اس طریق سے فرمائی جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ ان دونوں کی تعمیر قدیمی تعمیر کے مطابق تھی۔ یعنی ملائکہ کی تعمیر پانی پر۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام جب کعبہ تعمیر کر رہے تھے کہ تو یہی کہتے تھے: رَبَّنَا اے ہمارے رب تَقَبَّلْ مِنَّا ہم سے قبول فرما۔

مسئلہ: دعا وغیرہ منجملہ ان قربتوں اور طاعتوں سے ہے کہ تَقَبَّلْ تکلفات کے افعال سے ہے کہ ہمارا عمل تو ناقص ہے مگر تو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما اور قبول اس استعمال میں نہیں آتا۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہم اپنے

عمل میں عجز وانکساری اور قصور کا اعتراف کرتے ہیں۔

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ بیشک تو تمام مسموعات کو سنتا ہے منجملہ ان کے ہماری اس دعا وتضرع کو بھی تو سننے والا ہے۔ تو تمام معلومات کو جانتا ہے۔ منجملہ ان کے ہماری نیتیں بھی، جو ہمارے اعمال میں پائی جاتی ہیں۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے کسی حکم میں کمی تو کوئی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے فرمان کی تعمیل میں پوری ہمت سے کام لیا ورنہ وہ اتنی جرأت کب کرنے والے تھے کہ اسے نہایت کھلے الفاظ سے اور دل کی گہرائیوں سے کیسے کہتے کہ تو ہی سن رہا ہے اور تو ہی جانتا ہے۔

مسئلہ : آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی بندہ مامور بہ کی تعمیل سے فارغ ہو جائے اور اپنی وسعت کے مطابق اس میں خلوص سے حکم کی تعمیل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع کا اظہار کرے تا کہ اس سے وہ عمل قبول ہو جائے اور اس کے منہ پر نہ مارا جائے اور اس کی تمام کوششیں ضائع نہ ہو جائیں۔

مسئلہ : کچھ ضروری نہیں کہ ہر عمل اگرچہ بڑی کوشش سے کیا جائے وہ قبول ہو جائے کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ حضرات اس قسم کی دعا نہ مانگتے۔ کیونکہ قبول کرنا نہ کرنا اس ذات کے ارادہ مقدسہ پر منحصر ہے۔ اس پر کوئی شئے واجب نہیں۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ یعنی اے رب! ہمیں اپنا مخلص بنا دے۔ مسلم سے وہ شخص مراد ہے جو اپنی ذات اور نفس کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے خالص کر دے۔ یعنی جسم وجان اور زبان ودل سے عجز وزاری کا اظہار کرے اور اس کی تعظیم جیسی کسی اور کی نہ کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ میری ذات وصفات وافعال ہر لحاظ سے اللہ کی ملک ہیں۔ وہی ان کا خالق ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں۔ یا یہ معنیٰ ہیں کہ یا اللہ! ہمیں اپنا فرماں بردار بنا کہ ہم اپنے مقدور بھر تیری رضا کے سوا اور کوئی کام نہ کریں۔ تیرے احکام کی ادائیگی میں حجت بازی سے کام نہ لیں۔

قاعدہ: جب لفظ اسلام کے بعد سلام آئے تو وہاں اسلام بمعنیٰ فرمانبرداری اور رضا طلبی مراد ہوتی ہے۔

سوال: جب وہ دونوں حضرات اس دعا کے وقت نہایت درجہ کے فرمانبردار مخلصین تھے تو پھر دعا مانگنے کا کیا معنیٰ؟

جواب: اخلاص وتوجہ کی زیادتی اور اس پر ثابت قدمی مطلوب تھی۔ اس سے لوگوں کو تعلیم بھی ہے کہ اپنے ایمان پر

ثابت قدمی کی دعائیں مانگیں۔ کیونکہ وہ حضرات جبکہ ہر طرح سے معصوم اور مصئون و مامون تھے لیکن ثابت پھر بھی ثابت قدمی کی دعا مانگ رہے ہیں تو ماوشما کہاں! باوجودیکہ ہم ہر طرح سے معرضِ نقصان میں ہیں۔ پھر اس فرماں برداری پر ثابت قدمی بھی مقصود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دعا مستجاب ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نار گلزار بن گئی اور اسماعیل علیہ السلام ذبح ہونے سے بچ گئے۔

وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت کو اپنی فرمانبردار بنا تاکہ وہ تیری عبادت میں مخلص ترین ثابت ہوں۔

سوال: صرف اولاد کے لئے دعا مانگنے کا کیا معنیٰ، حالانکہ ایسے حضرات کے ظرف تو وسیع ہوتے ہیں بالخصوص انبیاء علیہم السلام کہ ان کو ہر عام و خاص کو اپنی دعا میں شامل کرنا چاہیے۔

جواب: ا:۔ شفقت کے لحاظ سے اولاد کو ترجیح دی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا اولاد کی تخصیص سے اپنے ثواب میں اضافہ مقصود تھا۔

حدیث شریف: جو شخص اپنی ایسی اولاد چھوڑ جائے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت گزار ہو اسے قیامت تک اس کے ثواب سے ثواب ملتا رہے گا۔

۲:۔ بظاہر اس میں اولاد کی تخصیص ہے لیکن درحقیقت یہ دعا سب کو شامل ہے اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد کی اصلاح عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے۔ گویا یوں دعا کی ہے: یا اللہ! ہماری بعض اولاد کی اصلاح عوم کی اصلاح کا ذریعہ بنا۔

سوال: اولاد میں سے بعض کی تخصیص کیوں؟

جواب: ان کو معلوم تھا کہ ان کی اولاد میں سے بعض نیک ہوں گے بعض بد۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

ف: اللہ تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ عالمِ دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوں۔

ا:۔ افاضل۔ ۲:۔ اوساط۔ ۳:۔ اراذل۔

افاضل:۔ تو وہ اولیاء اللہ ہیں جو اس کی اطاعت میں ہر ساعت سرگرم ہیں۔

اوساط:۔ وہ جنہیں آخرت کا خوف ہے، گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں تو جہنم کے خطرہ سے اور نیکی کرتے ہیں تو بہشت کی لالچ میں۔

اراذل:۔ وہ ہیں جو شب وروز دنیوی امور میں منہمک ہیں جنہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔وہ اسی کوشش میں ہیں کہ دنیا کے کاروبار خوب چلیں اور اسباب فراوانی سے ہوں۔

ف: دنیا کی تعمیر تین چیزوں سے ہے:

ف: دنیا کی تعمیر تین چیزوں سے ہے:

۱:۔ زراعت وباغبانی۔ ۲:۔ حمایت وحرب۔ ۳:۔ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان کی نقل وحرکت۔ جو بھی ان تینوں کاموں میں الجھ گیا اسے آخرت بالکل یاد نہیں رہے گی۔جو دنیاوی مشاغل میں اس قدر پھنس گیا کہ آخرت کو بھلا ہی دیا تو یوں سمجھو کہ اس نے جہالت کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔اسی لیے عربی مقولہ ہے: لولا الحمقی لخربت الدّنیا (اگر احمق دنیا میں نہ ہوتو دنیا خراب ہوجائے) مثنوی شریف میں ہے:

ایں جہاں ویراں شدے اندر زماں | حرصہا بیروں شدے از مردماں
ایں عالم اے جانِ غفلت است | ہوشیاری ایں جہاں رافت است
ہوشیاری زاں جہاں است وجواں | غالب آید پست گردد ایں جہاں
ہوشیاری آفتاب وحرص وخ | ہوشیاری آب وایں عالم وخ

ترجمہ: ۱:۔ یہ جہاں برباد ہوجاتا اگر لوگوں کے دلوں سے حرص نکل جاتی۔

۲:۔ یہ جہاں سراسر غفلت ہے ہوشیاری اس عالم کے لئے آفت ہے۔

۳:۔ ہوشیاری سے جہان جوان ہے، غالب آئے گی تو جہان ویران ہوگا۔

۴:۔ ہوشیاری آفتاب ہے اور حرص یخ، ہوشیاری پانی ہے اور جہان میل کچیل۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا مناسک، منسک کی جمع ہے۔ منسک بفتح السین و کسرھا یعنی ہمیں منسک کے مقامات دکھا اور ہمارے مقدرات کی خبر دے۔یعنی ان مقامات کی اطلاع دے جہاں حج کے افعال ادا کیے

جاتے ہیں۔یعنی وہ مواقیت جہاں سے احرام باندھا جاتا ہےاور وہ جگہ جہاں عرفات میں ٹھہر کر دعا کی جاتی ہے اور طواف اور صفا و مروہ اوران کے مابین سعی کی جگہ اور رمی جمار وغیرہ۔یامناسک سے یہاں صرف حج کے افعال مراد ہیں نہ کہ اس کے مقامات۔بایں معنیٰ کہ منسد مصدر میمی ہونہ کہ اسم مکان اوراس کا جمع ہونا باعتبار مختلف انواع کے ہےاور اَرِنَا عــرفنا ہے کیونکہ افعال حج کی آنکھ سے نہیں دیکھے جاتے بلکہ قلب کی آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں۔اور نسک اللہ تعالیٰ کی عبادت کو کہتے ہیں۔اب حج کے افعال میں استعمال ہوا ہے۔اسی لیے حج کے افعال نہایت مشقت بھرے ہیں کہ تکلیف اور جدوجہد کے بغیر ادا نہیں ہوسکتے۔ وَتُبْ عَلَيْنَا جو صنعار یا خلاف اولیٰ ہم سے سرزد ہوا اس کی توبہ قبول فرما، یا ہماری اولاد سے جو کبائر واقع ہوئے ہیں ان کی توبہ قبول فرما۔یہ جملہ آپ نے کسی تفسیر سے کہا ہے یا اپنی اولاد کی رہبری کے لئے فرمایا ہے کیونکہ جب انہوں نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو یہ مقصد مدِّنظر رکھا تھا کہ لوگوں کو نیکی کا طریقہ معلوم ہو جائے اور انہیں پتہ چل جائے کہ اس گھر کے متعلق جتنے افعال واعمال کیے جائیں گے سب میں مقصدِ اعلیٰ گناہوں سے بچنے اوران سے توبہ کرنے کے طریقے بتائے جائیں گے۔

اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ بیشک تو توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔توبہ کا لغوی معنیٰ ہے رجوع کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہو تو بمعنیٰ بندہ کی توبہ قبول کرنا اوراس میں اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق اور گنہگاروں کے دل میں رجوع الی اللہ کی توفیق ڈالنا اوراس کے ظاہری اعضاء کو طاعات کی زینت بخشنا بعد اس کے کہ اس نے انہیں گناہوں اور غلطیوں سے ملوث کردیا ہے۔

ف: تواب مبالغہ کا صیغہ ہے۔اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ یہ فعل اس سے بکثرت ہوتا ہے اور اپنے بندوں کے گناہ کثرت سے معاف کرتا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ اے اللہ !ان میں بھیج یعنی ہماری اولاد کی جماعت امتِ مسلمہ میں سے رَسُوْلًا مِّنْهُمْ انہی کے نفسوں میں سے۔ مِنْهُمْ کی قید بڑھانے سے یہ فائدہ ہے کہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان میں کوئی رسول تشریف لائے اوران کی اولاد میں سے نہ ہو۔ان دونوں کی اولاد میں سے سوائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی اور تشریف نہیں لایا یہ ان کی دعا کی قبولت کی نشانی ہے۔

ف: مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی وقت فرمادیا کہ ہم نے تم دونوں کی دعا قبول فرمائی ہے۔ چنانچہ تمہاری منشاء کے مطابق آخر الزماں نبی علیہ السلام تشریف لائیں گے۔

حدیث شریف: ''میں اس وقت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتم النبین لکھا جا چکا ہوں جبکہ آدم علیہ السلام اپنے گارہ میں تھے اور میں تمہیں اپنی اول امر کی خبر دیتا ہوں، تمہیں معلوم ہو کہ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں سے آیا ہوں اور میں وہی ہوں جس کی خوشخبری حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سنائی تھی اور میں وہی نور ہوں جبکہ میری والدہ ماجدہ نے مجھے جنتے وقت دیکھا کہ اس نور کی وجہ سے شام کے محلات روشن ہو گئے'' اور دعوتِ ابراہیم سے مراد یہی دعا ہے جو آیت میں مذکور ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ بنی اسماعیل میں ایسا ہی نبی بھیجے۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ ان پر تیری آیات پڑھیں۔ یعنی انہیں تیری توحید اور اپنی نبوت کی تبلیغ کریں جو تو انہیں حکم فرمائے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور انہیں ان کے نظریہ کی قوت کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ وَالْحِكْمَةَ اور حکمت اور ایسے اعمال کہ جن سے معارف حق سے ان کے نفوس مکمل ہوں اس سے احکامِ شریعت مراد ہیں۔

ف: حضرت ابن رد ید فرماتے ہیں کہ جس کلمہ سے نصیحت نصیب ہو اور وہ عمل جو عزت کی طرف لے جائے اور برے اعمال سے روکے وہی حکمت ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ ان کی قوتِ عملیہ کے مطابق ان کا تزکیہ فرمائیں۔ یعنی انہیں شرک کی غبار سے بچائیں اور گناہوں کی خرابیوں سے دور رکھیں۔ گناہوں کا صدور ترک واجبات یا برائیوں کے ارتکاب سے ہے۔

ربط: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دعائیں مانگ کر ان کو اللہ تعالیٰ کی ثنا پر ختم کیا۔

چنانچہ کہا: اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ بیشک وہ غالب ہے کہ جس پر کسی دوسرے کے غلبے کا امکان ہی نہیں بلکہ تو وہ ہے جس پر چاہے غلبہ کر سکتا ہے۔ الْحَكِيْمُ وہ حکیم کہ اس کا ہر کام حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ وہ سب پر غالب ہے اور باقی سب اس کے عاجز بندے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو خود ہی جانتا ہے اس کے سوا اور کون جانے، بلکہ بندے تو اپنی حقیقت سے بھی بے خبر ہیں۔

حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ شرح اسماء الحسنیٰ میں فرماتے ہیں عزیز'' وہ ہے جس کا ثانی ممتنع ہو اور اسی کے

آگے ہر حاجت پیش کی جائے۔ لیکن اس کی طرف پہنچنا مشکل ہو۔ جس میں یہ تین اوصاف نہ ہوں اسے عزیز کہنا ٹھیک نہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا ثانی ملنا مشکل تو ہوتا ہے لیکن وہ ایسی نہیں کہ ان کی طرف حاجات پیش کیے جاسکیں۔ جب وہ ایسے ہوتو ان کے وجود سے اتنے بڑے منافع بھی حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ اسی لیے انہیں عزیز کہنا مناسب نہ ہوگا۔ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی شان تو بہت بلند ہیں اور ان کے وجود سے فوائد بھی بہت حاصل ہوتے ہیں اور ان کی نظیر ملنا بھی مشکل ہے اور ان تک پہنچنا بھی دشوار، تاہم انہیں عزیز نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً سورج، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اسی طرح زمین ان دونوں (سورج اور زمین) سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں اور ان کی حاجت بھی ہے لیکن انہیں عزیز سے موصوف نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان کے مشاہدات کی طرف پہنچنا کچھ مشکل نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ مذکورہ تین امور ان کے لئے ضروری نہیں پھر ان میں کمال ونقص کا اعتبار بھی ہے۔ مثلاً قلتِ وجود کو دیکھئے کہ یہاں آخری وجود کا ورود نہ ہونے کے بعد کوئی عدد ہے ہی نہیں۔ پھر وہ ایسا واحد کہ اس کی نظیر ممتنع ہے اور وہ صرف باری تعالیٰ ہے اور بس۔ سورج بھی اگرچہ وجود میں ایک ہے لیکن اس کا ثانی پایا جانا دائرہ امکان میں ہے۔ اسی طرح وہ عزیز ایسا ہو کہ اس کی طرف ہر شے کا رجوع ہو۔ یہاں تک کہ ہر شے اپنے وجود اور بقا اور صفات کی وجہ سے اس کی محتاج ہو۔ یہ کمال صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے اس سے ثابت ہوا کہ مطلقاً عزیز وہی ذاتِ حق ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

ف: اس کے بندوں میں بھی بعض حضرات عزیز ہیں کہ جن کی طرف عام بندوں کو ان کی احتیاج ہے کہ وہ اپنے اہم امور میں ان کی خدمت میں اپنی حاجات پیش کرتے ہیں۔ خصوصیات حیاتِ خرویہ اور سعادات ابدیہ کے بارے میں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں قلیل ہیں جن کی طرف پہنچنا مشکل ہے اور یہ مرتبہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے اور ان کے مرتبہ کے قریب قریب وہ حضرات بھی ہیں جو ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں جیسے خلفاء راشدین اور ان کے وارثین اور ان کا یہ مرتبہ ان کے حسب استعداد ہوتا ہے۔ جتنا ارشاد خلق اور طاعاتِ حق میں تکلیف اٹھاتے ہیں اتنا ہی یہ شان ملتی ہے۔

ف: حکمت کا مطلب یہ ہے کہ اجل الاشیاء یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت اجل العلوم سے حاصل ہو اور اس ذات کی کنہ سے تو ادراک عاجز ہے اور ہی حکیم مطلق ہے جو اپنے اجل العلوم کو جانتا ہے اور اس کا اجل العلوم

علم ازلی اور دائمی۔ ہے کہ جس کا زوال ممتنع ہے اور وہ معلوم کے مطابق علم رکھتا ہے جس میں خفاء اور شبہ کا شائبہ تک نہیں اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔ مجازاً اور کو حکیم کہا جاتا ہے۔ جو صناعات کے دقائق سے واقف اور ان کی صنعت میں پختگی رکھتا ہو۔ لیکن کما صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔ ورنہ مجازی حکم میں کئی نقائص ہوتے ہیں۔

مسئلہ : جو صناعات کی حقیقت سے تو واقف ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے عرفان سے محروم ہو وہ بھی (شرعاً) حکیم نہیں کیونکہ وہ اجل اور افضل اشیاء کے عرفان سے خالی ہے۔ **مسئلہ** : حکمت اجل العلوم سے ہے۔

مسئلہ : حکمت معلوم کی قدر کے مطابق ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے کون زیادہ اجل ہو سکتا ہے۔

مسئلہ : جسے عرفان حاصل ہے (حقیقتاً) وہی حکیم ہے اگرچہ وہ رسمی علوم سے غیر واقف ہو اور بولنے میں اتنی مہارت نہ رکھتا ہو یعنی ولی اللہ۔

مسئلہ : بندہ کی معرفت کی نسبت کو اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کو جاننے کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔ کہاں بندہ کا عرفان اور کہاں خلاق کون و مکان کا اپنی ذات کا عرفان۔ باوجود اس کے یہ بندہ نفیس ترین عارف سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اسے ہی ہر بھلائی کا مرکز سمجھا جائے۔ کیونکہ جسے ایسی حکمت دی جاتی ہے وہ خیر کثیر کا مجمع ہوتا ہے۔ لیکن اسے عقل والوں کے سوا اور کون جانے۔ مگر جو اللہ تعالیٰ کا عرفان رکھتا ہو اس کا کلام عام حکماء کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا کلام تو عین حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ وقتی منافع کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اسے تو وہ چاہیے جو آخرت میں اسے نفع دے۔ چونکہ عوام کی نظروں میں رسمی حکماء کی باتیں مفید نظر آتی ہیں اور عارف کا کلام سمجھ نہیں آتا اسی لیے رسمی حکیم پر حکمت کا اطلاق کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے وہ منطقی کو بھی حکیم کہتے ہیں۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حکمت کا سرتاج خوف خدا ہے اور جو اپنے نفس کو حقیر سمجھے اور آخرت کے لئے ہر وقت تیار رہے اور جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کا تابع نہ بنائے وہ عاجز بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے وہ مانگتا ہے جو بالکل کچھ نہیں اور اعلیٰ بندوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔ نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت کرے۔ قناعت ایسا مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ صبر ایمان کا نصف ہے۔ یقین سارے کا سارا ایمان ہے" مذکورہ جملے حکمتیں ہیں اور ان کا عامل حکیم ہے۔

امام غزالی کی تقریر شرح اسماء الحسنیٰ یہاں ختم ہوئی۔

خلاصہ تفسیر: آیت میں اشارہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے میں حکمت میں ہے۔ وہ ایک ایسی مصلحت ہے جو انجام بخیر کی طرف پہنچاتی ہے کیونکہ ان حضرات کے صدقے ہی ظاہر و باطن سنورتا ہے اور عالم کا نظام انہی کی بدولت صحیح رہتا ہے مگر ان کے ورثہ اولیاء کاملین کو بھی ان کی تعلیم کے صدقے یہ مرتبہ حاصل ہے کہ وہ عوام کی صحیح رہنمائی کریں۔ عوام کو مرشد کی بیعت ضروری ہے تا کہ ان کے ذریعے منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کا مرشد شیطان ہوتا ہے۔ حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

عشق منہ بے دلیل راہ قدم — کہ من بخویش نمودم صد اہتمام نشد

ترجمہ: عشق میں رہبر کے بغیر قدم رکھنا میں نے اس کے لئے ہزاروں اہتمام کیے تو منزل پر پہنچا۔

مسئلہ: مرشد کامل اس کی رہبری کرتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ وہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ پھر وہ ایسی صفائی کرتا ہے کہ مرید کو غیر اللہ کی توجہات سے ہٹا دیتا ہے اور ایسے انفسیہ اور آفاقیہ کے اسرار سے واقف کراتا ہے تا کہ مرید کو اہلِ یقین کا درجہ نصیب ہو اور وہ بھی نعیم روحانی سے حظ وافر حاصل کر کے اولیاء اللہ کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ وَيُزَكِّيهِمْ کا اشارہ انہی سلوک کی منازل کی طرف ہے۔

سبق: سالک کو چاہیے کہ یہ اسباق یاد کرلے۔ یہ اس کے لئے بہت مفید ہیں۔

اے اللہ! ہمیں ان راستوں سے بچا جو تجھ تک پہنچنے سے روکیں کیونکہ ہر امید کی پناہ گاہ تیری درگاہ ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ

اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے سوا اس کے جو دل کا احمق ہے اور بیشک ضرور

اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

ہم نے دنیا میں اسے چن لیا بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى

جبکہ اس سے اس کے رب نے فرمایا گردن رکھ عرض کی میں نے گردن رکھی اس کے لئے جو رب ہے سارے جہان کا۔ اور اسی دین کی وصیت

بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ

کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو بیشک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے

الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ

چن لیا تو نہ مرنا مگر مسلمان۔ بلکہ تم میں کے خود موجود تھے

اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ

جب یعقوب کو موت آئی جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی

بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

پوجا کرو گے بولے ہم پوجیں گے اسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم و اسمٰعیل

وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ

اور اسحٰق کا ایک خدا اور ہم اس کے حضور گردن رکھے ہیں۔ یہ ایک امت ہے

قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا

کہ گزر چکی ان کے لئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم کماؤ اور ان کے کاموں کی تم سے

كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ

پرسش نہ ہوگی۔اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہوجاؤ راہ پاؤ گے تم فرماؤ بلکہ ہم تو

مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾ قُولُوا آمَنَّا

ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں سے نہ تھے۔ یوں کہو کہ ہم ایمان لائے

بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ

اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا ابراہیم واسمٰعیل واسحٰق

وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ

ویعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو عطا کیے گئے موسیٰ وعیسیٰ اور جو عطا کیے گئے

النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ

باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور

مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۶﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ

گردن رکھے ہیں۔پھر اگر وہ بھی یوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پاگئے اور اگر

تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ

منہ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا اور وہی سنتا

الْعَلِيمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ

جانتا ہے۔ ہم نے اللہ کی رینی لی اور اللہ سے بہتر کس کی رینی اور ہم اسی کو

عَابِدُونَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا

پوجتے ہیں۔ تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی اور ہماری

أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ

کرنی ہمارے ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ اور ہم نرے اسی کے ہیں۔ بلکہ تم یوں

تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ

کہتے ہو کہ ابراہیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب

وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ

اوران کے بیٹے یہودی یانصرانی تھے تم فرماؤ کیا تمہیں علم زیادہ ہے یا اللہ کو

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ

اور اس سے بڑھ ظالم کون ہے جس کے پاس اللہ کی طرف گواہی ہواور وہ اسے چھپائے اور خدا تمہارے

عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ

کوتکوں سے بے خبر نہیں۔ وہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا ان کے لئے ان کی کمائی

وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

اورتمہارے لئے تمہاری کمائی اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی۔

تفسیر عالمانہ وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ، مَنْ استفہامیہ ہےاس سے انکار وتقریع مراد ہے۔ یعنی مَنْ استفہامیہ وتقریعیہ ہے۔

ف: رَغِبَ کا صلہ جب لفظ فی آئے تو اس کا معنی ارادہ کرنا ہوگا۔ اگر اس کا صلہ عن آئے تو اس کا معنی ترک کرنا ہوگا۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین کو نہ ترک کرے اور نہ ہی اس کی شریعت وطریقت سے کوئی اعراض کرے۔ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ مگر جس نے اپنے نفس کو ذلیل وخوار کیا۔ نَفْسَهُ کا منصوب ہونا مفعول بہ کی وجہ سے ہے۔

شانِ نزول: حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو اسلام کی طرف بلایا اور فرمایا کہ توراۃ میں موجود ہے کہ میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک پیغمبر بھیجوں گا جس کا اسم گرامی احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا جو ان پر ایمان لائے گا وہ ہدایت پائے گا اور جو انکار کرے گا وہ ملعون ہوگا۔ سلمہ نے اسلام قبول کرلیا لیکن مہاجر نے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا قسم ہے اللہ کی ہم نے ابراہیم کو نبوت و حکمت میں تمام مخلوق سے چن لیا۔

وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ اس کا تعلق لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ سے ہے۔ یعنی وہ آخرت میں ان لوگوں سے ہیں جن کی صلاح و خیر اور ثبات علی الاستقامۃ کی شہادت دی گئی ہے اور جس شخص کی دنیا میں آخرت کے لئے چناؤ کی گواہی دی گئی ہو اس کی اتباع کی جانی چاہیے۔ اس کی اتباع سے سوائے اس بیوقوف کے کوئی اعراض نہیں کرے گا جو اصل خلقت کے لحاظ سے بے عقل ہے۔ وہ عمداً جاہلوں جیسے اعمال کرتا ہے اور اپنے اختیار سے اور اپنے نفس کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ جہالت کی وجہ سے اور نظر و تامل سے اعراض کر کے وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ الخ میں اس کے حسنِ خاتمہ اور اس کے وعدہ کی بشارت ہے ورنہ بہت سے لوگ ہیں جو پہلے وقت تو صالح رہے لیکن ان کا انجام برا رہا اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوئے۔ جیسے بلعم برصیصا، قارون وغیرہ۔

اِذْ قَالَ لَهٗ کی ظرف اور تعلیل ہے۔ جب اسے کہا: رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ اپنے دین کو اپنے رب کے لئے خالص کرو اور اس کے دین پر ثابت قدم رہو۔ یہ اس وقت ہے جب آپ نے غار سے نکل کر ستاروں اور سورج کو دیکھا تو ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اخلاص الہام فرمایا: قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں نے اس کے لئے اپنا دین خالص کیا۔ چنانچہ فرمایا: اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ الآیۃ۔ جس کا انہیں حکم دیا گیا اسے خلوص اور فرمانبرداری سے پورا کیا اور اپنے قول پر مستقل رہے اپنا جسم و جان اور مال و اولاد سب اسی کے سپرد کر دیا اور جب انہیں جبرئیل علیہ السلام نے سجدے میں گرتے دیکھا تو فرمایا: اگر کوئی حاجت ہو تو بتائیے۔ آپ نے فرمایا: اگرچہ ضرورت ہے لیکن تجھ سے نہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا تو پھر اسی سے سوال کیجئے۔ آپ نے فرمایا: اس کا علم میرے حال کو محیط ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ:۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ آپ کی ولادت نمرود بن کنعان کے زمانہ میں

ہوئی۔ نمرود پہلا بادشاہ ہے جس نے تاج سر پر رکھا اور لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم دیا۔ اس نے نجومی اور کاہن رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے خبر دی کہ اسی سال ایک لڑکا تیرے شہر میں فلاں طرف سے پیدا ہونے والا ہے جو اہلِ ارض کے دین کو تبدیل کر کے تجھے ہلاک کر دے گا اور تیرا ملک بھی چھین لے گا۔ نمرود نے سنتے ہی اسی سال شہر کی اس جانب کے تمام نومولود بچے ہلاک کرنے کا حکم دے دیا۔ جب ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کا وقت قریب ہوا تو آپ کی والدہ ماجدہ وہاں سے بھاگ کر ایک خشک نہر میں پہنچیں۔ اس خطرہ سے کہ شاید بچے کو ذبح کر دیا جائے۔ جب آپ پیدا ہوئے تو ماں نے ایک کپڑے میں لپیٹ کر حلفاء میں رکھ دیا۔ حلفاء ایک گھاس کا نام ہے جو پانی میں پیدا ہوتی ہے۔ جسے ترکی زبان میں حصیر قمشی کہتے ہیں۔ واپس آ کر آپ کے باپ کو اطلاع دی اور بتایا کہ بچہ فلاں جگہ پڑا ہے۔ انہوں نے وہاں جا کر بچے کو اٹھایا اور زمین میں ایک گڑھا کھود کر مکان کی طرح بنا کر ابراہیم علیہ السلام کو اس میں چھپا دیا تا کہ درندوں سے محفوظ رہیں۔ اور اس گڑھے کے اوپر پتھر رکھ دیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ روزانہ آ کر آپ کو دودھ پلا جاتیں۔ شباب وقوت کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک دن دیگر لڑکوں کی نسبت ایک ماہ کے برابر ہو جاتا تھا اور ایک ماہ سال کے برابر۔ آپ اس غار میں پندرہ ماہ یا سات یا اس سے زائد رہے۔ جب آپ اس غار میں نوجوان ہوئے۔ اپنی ماں سے پوچھا: میرا رب کون ہے؟ والدہ نے کہا: میں ہوں۔ آپ نے پوچھا: تیرا رب کون ہے؟ اس نے کہا: تیرا باپ۔ آپ نے فرمایا: اس کا رب؟ بی بی نے فرمایا: چپ رہو۔ اس کے بعد واپس چلی گئی۔ اور اپنے شوہر کو کہا کہ واقعی بات سچی ہوئی کہ جو بچہ اہل ارض کے دین کو تبدیل کرے گا وہ یہی ہے آپ کا سارہ گزشتہ واقعہ سنایا۔ پھر آپ کے باپ یعنی چچا آذر آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے انہیں فرمایا: تیرا رب کون ہے؟ کہا نمرود۔ آپ نے فرمایا: نمرود کا رب کون ہے؟ آذر نے آپ کے منہ پر طمانچہ دے مارا اور کہا: چپ ہو جاؤ۔ پھر رات ہوئی تو غار کے دروازے کے قریب ہو کر پتھر کے سوراخ میں سے آسمان اور اس کے مافیہا (یعنی ستاروں وغیرہ) کو دیکھ کر آسمان وزمین کی پیدائش میں تفکر کیا اور کہا: بیشک وہ ذات جس نے مجھے پیدا کیا مجھے روزی اور پانی عطا کیا میرا رب ہے۔ میں اس نے ماسوا کی پرستش ہرگز نہیں کروں گا۔ پھر آسمان کو دیکھ کر ستارے پر غور فرما کے سوچا کہ یہی میرا رب ہے۔ اسے دیکھتے رہے حتی کہ وہ غائب ہو گیا تو فرمایا: میں گم ہونے والے سے محبت نہیں کرتا۔ پھر چاند کو دیکھا پھر سورج کو۔ وہ بھی غائب ہو گئے تو آپ نے وہی فرمایا: جو ستاروں کے بارے میں فرمایا تھا۔

ف: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کو بعض نے اس کے ظاہر پر محمول فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ چونکہ اس

وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کی تلاش میں تھے اس لیے یہ کہہ دیا، بنا بریں ان کا یہ کہنا کوئی غلطی نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے توحید کی راہ کھول دی۔ از راہِ استدلال اس میں کوئی برائی نہیں۔ بعض نے فرمایا کہ آپ اس وقت بچے تھے اور بچے مرفوع القلم ہوتے ہیں لہٰذا ان کا یہ کہنا کفر نہ ہوگا۔ متاخرین نے ان تقریروں کا انکار کیا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ کلمات کفریہ ہیں تو پھر ان سے کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ وہ عقیدہ رکھیں کہ یہ ستارے وغیرہ خدا ہیں اور یہ عقیدہ ہمیشہ کفر ہے خواہ طفولیت کا دور ہو یا بعد کا۔ انہوں نے اس کا مطلب کچھ اور بیان کیا ہے۔ جس کی تفصیل امام محی السنۃ کی تفسیر سورہ انعام میں موجود ہے۔

خلاصہ تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کو پورے طور مانا اور وہ صحیح راستہ پر تھے۔ لہٰذا اب جو بھی ان کی اقتدا نہ کرے گا وہ احمق ہوگا۔ یعنی جیسے انہوں نے انفس و آفاق میں تفکر کیا ویسے کرنا چاہیے۔

کما قال تعالیٰ: وَفِیٓ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ

ف: سفاہت بمعنی جہالت وضعف الرائی۔ ہر سفیہ جاہل کرتا ہے کیونکہ جو غیر اللہ کی پرستش کرتا ہے اس جیسا احمق اور کون ہوگا اس نے یہ نہ جانا کہ ہم سب کا خالق اللہ ہے۔

ف: جس نے خود کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

ف: اخبار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرح وحی بھیجی کہ اپنے آپ کو عاجز و کمزور اور ضعیف سمجھ اور اللہ تعالیٰ کو قادر اور صاحب بقاء۔ مثنوی شریف میں ہے کہ:

چیست تعظیم خدا افروشتن	خویشتن را خاک وخواری داشتن
چیست توحید خدا آموختن	خویشتن در پیش واحد سوختن
ہست در ہست آں ہستی نواز	ہمچو مس در کیمیا اندر گداز
جملہ معشوق است عاشق پردہ	زندہ معشوقست وعاشق مردہ

ترجمہ: ۱۔ تعظیم الٰہی یہ ہے کہ اسے بلند سمجھا جائے اور خود کو خاک وخواری میں ملایا جائے۔

۲۔ توحید الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانا جائے اور اپنے آپ کو اس کے آگے جلا کر راکھ بنا دیا جائے۔

۳: اس کی ہستی میں ہمارے وجود کی وہی کیفیت ہے جیسے تانبہ کیمیا میں مل کر کیمیا بن جائے۔

۴: تمام عالم معشوق ہے عاشق صرف پردہ ہے زندہ تو صرف معشوق ہے اور عاشق تو مردہ ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ ربط: جب ابراہیم علیہ السلام خود کمال کو پہنچے تو دوسروں کو بھی اکمل بننے کی وصیت فرمائی۔

یعنی کسی کے سامنے وہ امر پیش کرنا جس میں قولاً و فعلاً بہتری ہو بطریق تفضل و احسان کے۔ خواہ وہ امر دینی ہو یا دنیوی۔

بِهَآ یعنی بملۃ جو وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ میں مذکور ہوئی ہے۔

اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ بعض کے نزدیک اپنی اولاد ذرینہ میں سے آٹھ افراد کو وصیت فرمائی۔

☆...... اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ۔ ☆...... اسحٰق علیہ السلام اور ان کی والدہ سارا۔

باقی چھ کو قطورا بنت یقطن کنعانیہ سے تھے اس کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام نے بی بی سارا کے انتقال کے بعد نکاح کیا اور چھ لڑکے پیدا ہوئے۔

☆...... مدین ☆...... مدائن ☆...... زمران

☆...... یقشان ☆...... یشبق ☆...... نوح

وَيَعْقُوْبُ مرفوع ہے اور اِبْرٰهٖمَ پر عطف ہے۔ یعنی یعقوب علیہ السلام نے بھی وصیت فرمائی تھی۔ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کے بارہ صاحبزادے تھے:

☆...... وبیل ☆...... شمعون ☆...... لاوی

☆...... یہودا ☆...... یستوخور ☆...... زبولون

☆...... زوانا ☆...... نفتوقا ☆...... کوزا

☆...... روشیر ☆...... بنیامین ☆...... یوسف

یعقوب علیہ السلام کی وجہ تسمیہ:۔

یعقوب کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ اپنے بھائی عیصو کے ساتھ جوڑا ہو کر ایک بطن سے پیدا ہوئے۔ عیصو نے عجلت کر کے پہل کی آپ اس کے پیچھے آئے۔ عقب بمعنی پیچھے آنا۔

واقعہ یوں ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی والدہ بیک وقت دو بچوں سے حاملہ ہو گئیں۔ جب حمل کی مدت پوری

ہونے کے بعد وضع حمل کا وقت مقرر قریب آیا تو یہ دونوں پیٹ کے اندر بول رہے تھے ان کی والدہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ایک دوسرے سے کہتے کہ پہلے مجھے راستہ دو میں باہر جاتا ہوں۔ ان میں سے ایک نے کہا: اگر تو نے مجھے راستہ نہ دیا تو میں ماں کے پیٹ کو چاک کر کے کمر کی طرف سے نکل جاؤں گا۔ دوسرے نے کہا: اتنی غلطی نہ کرو۔ پہلے تم ہی چلے جاؤ لیکن والدہ ماجدہ کی جان نہ گنواؤ۔ والدہ دونوں کی بات سن کر رہی تھی۔ پہلے پیدا ہونے والے کا نام عیصور کھا کیونکہ اس نے پیٹ میں نافرمانی کی تھی اور دوسرے کا نام یعقوب رکھا بوجہ پیچھے آنے کے۔ عیصو میں تو سختی اور شدت تھی۔ وہ دائما شکاری رہا۔ یعقوب علیہ السلام میں شفقت و نرمی تھی ہمیشہ کھیتی باڑی میں مصروف رہتے۔

فائدہ: بعض روایات میں آیا ہے کہ جیسے وہ دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئے اسی طرح ایک ہی دن فوت ہوئے اور بعض روایات میں آیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی ایک سو سینتالیس سال عمر تھی اور مصر میں انتقال ہوا آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ بیت المقدس میں دفن کیا جائے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے قریب یوسف علیہ السلام نے انہیں اٹھا کر حسب وصیت دفن کیا۔

یٰبَنِیَّ یہاں قول کا فعل مصریوں کے نزدیک محذوف ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یٰبَنِیَّ جملہ ہے اور جملہ سوائے افعال قلوب اور قول کے اور کسی فعل کا مفعول نہیں ہوتا۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ دین سے اسلام مراد ہے۔ کیونکہ تمام ادیان سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی دین پسندیدہ ہے اور اس کے نزدیک دین صرف یہی دین اسلام ہے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ تمہیں موت نہ آئے لیکن اس خیال میں: اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کہ تم مخلصین بالتوحید اور اپنے رب سے نیک گمان کرنے والے ہو۔ اس میں بظاہر موت سے نہی ہے لیکن حقیقت میں ترک اسلام سے نہی مطلوب ہے کیونکہ موت ان کے ہاتھ میں نہیں تھی۔

دراصل واقعہ یوں ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں کو اصنام پرستی میں مبتلا پایا۔ بنا بریں اپنی اولاد کو اسلام پر ثابت قدمی کی وصیت فرمائی کیونکہ ان کی موت کہ جس میں ثبات علی الاسلام نہ ہو اس موت میں کوئی خیر نہیں۔ کیونکہ ایسی موت سعادت مندوں کی موت نہیں ہے اس لیے کہ موت کے حقوق سے ایک حق یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا خلل نہ ہو۔

سوال: وصیت میں ملت کی خصوصیت کیوں، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کے خصائل میں سے تو یوں ہونا چاہیے کہ وہ تمام

لوگوں کو دین واسلام کی طرف بلائیں؟

جواب: اس طرف اشارہ ہے کہ امر اسلامی افضل ترین امور سے ہے کہ جس میں اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اپنے قریبی لوگوں کو وصیت فرما رہے ہیں جو کہ شفقت ومحبت اور ارادہ خیر کے زیادہ مستحق دلائل ہیں۔ علاوہ ازیں اپنی اولاد کی اصلاح عام لوگوں کی اصلاح کا موجب ہے کیونکہ متبوع اپنے جمیع احوال میں اچھا ہو جائے تو اس کے تابع بھی اچھے ہو جاتے ہیں

حدیث شریف: جب آیہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو حضور علیہ السلام نے اپنے اقارب کو جمع کر کے نصیحت فرمائی کہ اے بنی کعب بن لوی! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنی مرہ کعب! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنی عبد شمس! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنی عبد المطلب! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ کیونکہ میں تمہارے لیے کسی قسم کا مالک نہیں ہوں یعنی میں قادر نہیں ہوں کہ آخرت میں تم سے کوئی دفع کر سکوں اگر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے تو میں اس کی سفارش کروں گا جس کی مجھے اجازت ہوگی۔ مجھے ان کی سفارش کی اجازت نہ ہوگی جن کے لئے وہ عذاب دینے کا ارادہ کرے۔ یعنی کافر کے لئے۔

ف: یہ کلمات حضور علیہ السلام نے محض ایمان وعمل کی ترغیب کے لئے فرمائے ہیں تا کہ کوئی قرابت ورشتہ داری پر بھروسہ کر کے عمل صالح میں سستی نہ کرے۔ اسی لیے دین کے معاملہ میں وصیت ضرور کرنی چاہیے کیونکہ جب کوئی اہل شر سے مانوس ہوتا ہے تو اسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں اس میں بھی وہ عادت نہ آجائیں جن سے وہ جہنم کا ایندھن بن جائے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

نفس از ہم نفس بگیرد خوے	پُر حذر باشی از لقائے خبیث
باد چوں بر قضائے بدگزرد	سوئے بد گیرد از ہوائے خبیث

ترجمہ: ۱:۔ ایک نفس دوسرے نفس سے خصلت لیتا ہے لہٰذا خبیث انسان کے میل جول سے بچئے۔

۲:۔ ہوا جب بدبودار جگہ سے گزرتی ہے تو اس خبیث طرف سے بدبو لے کر جاتی ہے۔

ف: ابو عبید صوری نے اپنے بعض احباب کو لکھا کہ اگر تو نے اللہ تعالیٰ سے درازی عمر چاہی تو پھر تیرے اندر برے اعمال کی آرزو بھی پیدا ہو جائے گی اب سرے سے آرزو کو ہی دبا دے۔

مسئلہ: حال کی اصلاح ہو تو پھر حسنِ ظن بھی فائدہ دیتا ہے۔

ف: حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہت لوگ آرزو میں پھنسے رہتے ہیں یہاں تک کہ مرتے وقت نیکیوں سے خالی ہاتھ جاتے ہیں۔

مسئلہ: جو شخص یوں کہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت پر حسنِ ظن ہے وہ غلط کہتا ہے جبکہ اس کے اعمال برے ہوں۔ چنانچہ آیت وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ سے معلوم ہوتا ہے۔

یا اللہ! ہمیں مرنے سے پہلے علم و عمل کی توفیق عطا فرما۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ یہ حکم ان اہل کتاب کو ہے جو ابراہیم علیہ السلام سے رو گردان تھے اور اَمْ منقطعہ ہے جو بل اور ہمزہ کے ساتھ مقدر ہے۔ تیسیر میں فرمایا کہ اَمْ سے پہلے اگر ہمزہ استفہام نہ ہو تو وہ بمنزلہ استفہام کے ہوتا ہے اور یہ ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی کیا تم حاضر تھے۔ شُهَدَآءَ شہید کی جمع ہے بمعنی حاضر۔ معنی یہ ہوا کہ تم حاضر نہیں تھے اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ یعنی اس پر موت کے علامات و اسباب پائے گئے اور روح کے خروج کا وقت قریب آیا۔

شانِ نزول: جب یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ نہیں جانتے کہ یعقوب علیہ السلام کا جب انتقال ہوا تو اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت فرمائی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم ان کے وصال شریف کے وقت حاضر نہیں۔ تمہیں کیا خبر کہ انہوں نے کیا فرمایا۔ ورنہ تم ایسا دعویٰ نہ کرتے بلکہ ملتِ اسلام پر تمہیں حرص ہوتی۔

اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ، اِذْ حَضَرَ سے بدل ہے اور اس کا عامل شُهَدَآءَ ہے۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ یعنی میرے انتقال کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے۔ اس سے ان کی اسلام و توحید پر ثابت قدمی مقصود تھی۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام کا ارادہ عبادت سے عبادتِ مشروعہ کا نہیں تھا بلکہ یہ ارادہ فرمایا کہ تمہارا ہر عمل اس کی رضا کی خاطر ہو اور جو عمل اس کی راہ سے روکے اسے چھوڑ دو۔ گویا انہیں اس بات کی دعوت دی کہ اپنے اعمال میں سوائے اس ذات باری تعالیٰ کی رضا کسی کی خوشنودی کو جگہ نہ دو اور ان سے یہ خوف بھی نہ تھا کہ وہ بتوں کی پرستش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بلکہ اس خوف میں تھے کہ دنیوی امور میں منہمک ہو جائیں گے اسی لیے کہا جاتا ہے:

جو شے اللہ تعالیٰ کی راہ سے پھیر دے اس کا نام طاغوت ہے۔

اسی لیے فرمایا: وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ یعنی ماسوا اللہ کی خدمت کریں۔

مثنوی شریف میں ہے:

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　　نے قماش ونقرہ ومیزان وزن

ترجمہ: دنیا کیا ہے اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا نہ کھیل تماشہ نہ دنیا ودولت اور نہ عورت وغیرہ۔

قاعدہ: علامہ تفتازانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مَا عام ہے۔ یعنی ضرورت کے وقت ذوی العقول وغیرہ پر اس کا اطلاق جائز ہے۔ خواہ استفہام کے لئے ہو یا غیر استفہام کے لئے اور سب کو معلوم ہے کہ مَنْ ذوی العقول و العلم کے لئے آتا ہے۔ یہی فرق ہے مَنْ ومَا میں کہ مَنْ ذوی العقول کے لئے آتا ہے اور مَا غیر ذوی العقول کے لئے۔

یہاں علامہ کا کلام ختم ہوا۔ یہاں ان کی انکار کی تردید ہوگئی اور ان کے گمان کے خلاف بیان نکلا کہ یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی نہیں بلکہ توحید کی وصیت فرمائی تھی۔

قَالُوْا گویا کہا گیا کہ انہوں نے کیا جواب دیا۔ تو فرمایا: نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ہم اس معبود کی عبادت کرتے ہیں جس کے واجب الوجود ہونے پر اور اس کی الوہیت اور عبادت پر اتفاق ہے۔

سوال: حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس کے آباء میں کیوں گنا گیا ہے حالانکہ وہ تو یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے۔

جواب: ۱۔ جد کی وجہ سے تغلیباً انہیں بھی آبا میں شمار کیا گیا۔

جواب: ۲۔ چچا بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے جیسے خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے کیونکہ وہ دونوں ایک ہی تاگہ کے دانے ہوتے ہیں بوجہ اخوت کے، اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے عم الرجل صنو ابیه. (چچا بمنزلہ باپ کے ہے)

یعنی وہ ایک ہی ہیں۔ جیسے کھجور کے درخت ایک تنے میں ہوتے ہیں یہ بھی اسی طرح ہیں۔

اِلٰهًا وَّاحِدًا ایک ہی معبود کی پرستش کریں گے۔ اِلٰهًا وَّاحِدًا، اِلٰهَ اٰبَآئِكَ سے بدل ہے۔

سوال: اسے بدل بنانے سے کیا فائدہ؟

جواب: ۱۔ توحید کے متعلق پوری تصریح مقصود ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ان کا کوئی اور معبود ہوگا۔

جواب: ۲۔ اس وہم کا دفعیہ کہ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا معبود اور ہے اور ان کو کوئی اور ہے اس لیے کہ اِلٰهَ کو اٰبَآئِكَ سے مضاف اور پھر اسے منصوب پڑھنے سے اختصاص پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا اب یوں کہا گیا ہے کہ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ

سے ہماری مراد وہ ایک معبود ہے نہ کوئی اور۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہم اسی کو ہی مانیں گے۔ یہ جملہ نَعْبُدُ کے فاعل سے حال ہے۔ تِلْكَ امت مذکورہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم واسماعیل واسحٰق ویعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد جو اہل توحید تھے

اُمَّةٌ امت بمعنی مقصود، جیسے عہدہ بمعنی معہود ہے۔ جماعت کو امت اس لیے کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے دینی معاملہ میں انہیں مقصود سمجھتے ہیں اور شرعی امور میں انہی کی اقتدا کرتے ہیں۔ تِلْكَ مبتدا اور اُمَّةٌ اس کی خبر ہے۔ قَدْ خَلَتْ وہ بھی چل بسے۔ یعنی انہیں موت نے گھیر لیا اور اپنے عزیزوں سے بچھڑ گئے۔ اصل میں خَلَتْ بمعنی جنگل کے ایسے کونے میں چلے جانا جہاں کوئی ساتھی نہ ہو۔ قَدْ خَلَتْ، اُمَّةٌ کی صفت ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ انہیں وہ ملے گا جو وہ عمل کریں گے۔

سوال: مسند کو مسند الیہ پر کیوں مقدم کیا؟

جواب: صرف اس لیے کہ مسند مسند الیہ کے لیے محصور ہے یعنی انہیں صرف وہی ملے گا جو انہوں نے عمل کیا۔

وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ اور تمہیں وہی ملے گا جو تم عمل کر رہے ہو نہ کہ کسی دوسرے کا۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ان کے اعمال کی وجہ سے تمہارا مواخذہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا: لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا (ہمارے جرموں کے متعلق تم سے سوال نہیں ہوگا) (اس طرح مجرمین کہیں گے)

شانِ نزول: جب یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام تو یہودیت پر مرے ہیں اور انہوں نے مرتے وقت اپنی اولاد کو بھی یہودیت پر کاربند رہنے کی وصیت فرمائی تھی تو ان کا یوں رد کیا گیا۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ

پھر انہوں نے کہا ہاں بات اسی طرح ہے لیکن ہمیں فخر تو ہے کہ ہم ان حضرات کی اولاد سے ہیں اور ہمیں ان کی اس نسبت سے بہت فائدہ ہوگا۔ اس کا بھی رد ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نسب کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں اعمال صالح اور تقویٰ وطہارت کی ضرورت ہے۔

چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے بنو ہاشم! میرے ہاں اعمال لے کر آؤ جس کے پاس اعمال نہیں اسے نسب کوئی فائدہ نہیں دے گا۔"

یعنی جس نے توشہ آخرت تیار نہیں کیا، برائی میں وقت بسر کیا اور صالح اعمال کوئی نہ کیا تو نسب اسے کوئی فائدہ نہ دے گا لہٰذا نسب پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ کسی شاعر نے خوب فرمایا:

اتفخر باتصالک من علیّ — واصل البؤسة الماء القراح

ولیس بنافع نسب زکیّ — یُدَنِّسُهُ صنائعک القباح

ترجمہ: کیا تجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نسب کے اتصال کا فخر ہے ہر ایک کی اصل پانی ہے۔

پاکیزہ نسبت کوئی فائدہ نہ دے گی جبکہ اسے تیرے گندے کردار گرد آلود بنا چکے ہیں۔

ف: اگر چہ اولاد اپنے آباء سے نفع پاتی ہے لیکن نفخ صور کے بعد نسب کا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس پر فخر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ تو ایسے ہے جیسے کسی دوسرے کے اسباب پر فخر کا اظہار کیا جائے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اسے پاگل کہا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نیکی میں نیتِ خالص کا ہونا ضروری ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والی ہے۔

حدیث شریف: ایک طویل حدیث میں وارد ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے گزشتہ شب خواب میں ایک عجیب بات دیکھی، وہ یہ کہ میرے ایک امتی کے پاس ملک الموت تشریف لائے اور ان کی روح قبض کرنے لگے۔ وہ والدین کا فرمانبردار تھا۔ اس لیے اسے مہلت مل گئی۔ ایک دوسرے کو دیکھا کہ اس پر عذابِ قبر کا حملہ ہوا، وہ چونکہ وضوپ مداومت کرتا تھا اس لیے عذابِ قبر سے بچ گیا۔ ایک اور کو دیکھا جس پر شیاطین حملہ آور ہوئے وہ چونکہ ذکر اللہ کا عادی تھا اس لیے ان کے شر سے بچ گیا۔ ایک اور کو دیکھا جسے عذاب کے فرشتے ڈرانے لگے چونکہ وہ نمازی تھا اس لیے عذاب کے فرشتے دور ہو گئے۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ پیاس سے جاں بلب تھا اور میرے حوض سے بھی اسے ہٹا دیا گیا، وہ چونکہ روزے رکھتا تھا اس لیے روزہ نے آکر اسے جامِ طہور پلایا اور بالکل سیراب کر دیا۔ ایک اور منظر سامنے آیا۔ وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام حلقہ بنا کر تشریف فرما تھے میرا ایک امت ان کے قریب ہونا چاہتا تھا لیکن اسے دور بھگا دیا گیا تھا۔ چونکہ وہ غسلِ جنابت میں کبھی سستی نہیں کرتا تھا اس لیے عمل نے اسے پکڑ کر میرے قریب بٹھا دیا۔ ایک اور امتی کو میں نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور وہ اس حالت میں حیران

و پریشان ہے اس کا حج اور عمرہ اسے اجالے میں لے گئے اور وہ ہمیشہ کے لئے مسرور و مفروح ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور امتی کو دیکھا کہ وہ مومنین سے بولتا ہے لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتے اس کا صلہ رحمی کا ایک عمل آیا اس نے مومنین سے کہا بھائیو! اس سے کلام ضرور کرو۔ ایک اور کو دیکھا کہ جس کے منہ پر آگ چڑھتی ہے جسے وہ ہاتھ سے ہٹاتا ہے لیکن پھر بھی اس سے بچ نہیں پاتا۔ اس کا صدقہ آکر اسے بچالیتا ہے اور اس آگ کے سامنے پردہ بن کر اس کے سر پر چھتری کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک اور کو دیکھا کہ دوزخ کے فرشتے اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں لیکن اس نے امر بالمعروف ونھی عن المنکر کا عمل کیا تھا جس سے وہ بچ گیا اور یہ دونوں عمل اسے وہاں سے لے کر رحمت کے فرشتوں کی جماعت میں لے گئے اور ایک کو دیکھا کہ وہ گھٹنوں کے بل پڑا ہے اس کے اور اللہ تعالیٰ کے مابین پردہ ہے اور وہ دیدار الٰہی سے محروم ہے اس کا حسنِ خلق آیا اس نے اسے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دیا۔ ایک اور کو دیکھا کہ اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑا گیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا تھا اس لیے اس کے اسی خوف نے اس کا نامہ اعمال لے کر اس کے دائیں ہاتھ پکڑا دیا اور ایک کو دیکھا کہ اس کے اعمال نامہ کے ترازو میں نیکی کا پلڑا ہلکا ہے۔ تو اس کی وہ اولاد جو بچپن میں فوت ہوئی اس کے نیکی کے پلڑے میں بیٹھ گئی۔ جس سے اس کا نیکی کا پلڑا بوجھل ہو گیا اور ایک کو دیکھا کہ وہ جہنم کے کنارے تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ ڈرتا تھا اسی ڈرانے نے اسے بہشت کے دروازے پر پہنچا دیا۔

ایک اور کو دیکھا کہ اسے جہنم میں جھونکا جا رہا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گریہ کرتا تھا اس کے وہی آنسو آئے اور اسے جہنم سے بچا لے گئے۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ پل صراط سے گزر رہا ہے لیکن لرزہ طاری ہے قریب ہے کہ وہ گر کر جہنم رسید ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دنیا میں نیک گمان رکھتا تھا۔ اس نیک عمل کی وجہ سے لرزہ ختم ہو گیا اور پل صراط سے باسلامت گزر گیا۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ پل صراط پر گزر رہا ہے کسی وقت تو وہ مارنے لگ جاتا ہے اور کبھی چھلانگیں لگاتا ہوا جاتا ہے اور کبھی پل صراط سے چمٹ جاتا ہے اور گزر نہیں سکتا۔ اس کی نماز آئی اور اس کا ہاتھ تھام کر بسلامت پل صراط سے پار لے گئی۔ ایک اور کو دیکھا کہ وہ بہشت کے دروازے تک پہنچ گیا ہے لیکن اس کے آگے دروازے بند کیے جاتے ہیں۔ کلمہ شہادت آتا ہے بہشت کے دروازے کھلوا کر اسے بہشت میں لے جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی خلوص قلب سے کلمہ شہادت پڑھتا ہے وہ ضرور بہشت میں جائے گا۔

عرض کیا گیا: حضور! اخلاص کس طرح سے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچ کر رہنا۔

ف: اس طویل حدیث سے معلوم ہوا کہ اگرچہ نجات اللہ تعالیٰ کے فضل سے نصیب ہوگی لیکن اس کا دارومدار اعمال صالح پر ہے۔

مسئلہ: اگر برے عمل ہوں تو قرابت بھی کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

سوال: کسی شاعر نے کہا:

اِذَا طَابَ اَصْلُ الْمَرْءِ طَابَتْ فُرُوْعُہٗ

(جب کسی کی اصل اچھی ہے تو اس کی اولاد بھی اچھی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسب سے فائدہ حاصل ہوگا۔

جواب: یہ شعر ضابطہ کے طور پر نہیں بلکہ اکثریت پر مبنی ہے کیونکہ وہ مالک مُردے کو زندہ سے اور زندہ کو مردے سے زندہ فرماتا ہے۔ کسی نے کیا خوب فرمایا:

اصل را اعتبار چنداں نیست ۔۔۔ روئے تر گل ز خار خنداں نیست
می زغورہ شود شکر از نے ۔۔۔ عسل از نحل حاصلت بقے

ترجمہ: اصل کا کوئی اعتبار نہیں گل کا چہرہ کانٹے سے خوش نہیں۔
شراب نچوڑ (انگور وغیرہ) سے اور شکر نے سے بنتی ہے شہد مکھی کی قے سے حاصل ہوتا ہے۔

ف: اگربتی بھی ایک لکڑی ہے لیکن اس سے خوشبو مہکتی ہے اگرچہ وہ بھی درخت ہے لیکن خوشبو کی وجہ سے اس کی لکڑی تمام لکڑیوں سے فائق ہوگئی۔ چونکہ اس میں اس کی استعداد ہے اسی لیے اتنا بڑا مرتبہ حاصل کر کے اپنے ابنائے جنس سے ممتاز ہوگئی۔ ایسے ہی مشک کا حال ہے کہ وہ بھی خوشبودار ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو اپنے اصل عہدے کو سنبھال سکیں۔ اسی طرح بالعکس ہو جاتا ہے کہ باپ اگرچہ فاسق ہوتا ہے لیکن بیٹا بلند پایہ متقی۔ اس کا اندرونی فساد بیٹے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اصل اچھی ہو تو کچھ ضروری نہیں کہ فرع بھی اسی طرح ہو۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ فرع اصل کے مطابق ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کیسے تھے اور ان کے دو صاحبزادے ہابیل اور قابیل کیسے ہوئے۔ اسی طرح تاقیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى

شانِ نزول: مدینہ کے یہود اور نجران کے سرداروں کے متعلق نازل ہوئی۔ یعنی یہود کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ۔ کیونکہ ہمارے نبی موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جو افضل الانبیاء ہیں۔ اور ہماری کتاب تورات ہے جو تمام کتابوں سے افضل ہے اور ہمارا دین بھی تمام ادیان سے افضل اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ساتھ کفر کیا اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ نصرانی ہو جاؤ کیونکہ ہمارے نبی عیسیٰ علیہ السلام تمام نبیوں نے افضل ہیں اور ہماری کتاب انجیل جو افضل الکتب ہے اور ہمارا دین بہترین ہے۔ انہوں نے بھی موسیٰ علیہ السلام اور تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ساتھ کفر کیا۔

تَهْتَدُوْا امر کا جواب ہے۔ یعنی اسی طرح ہو جاؤ تو گمراہی سے ہدایت پالو گے۔

قُلْ اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بطریق تردید کے فرمایئے کہ جو تم کہتے ہو ہم نہیں ہوں گے۔ بَلْ بلکہ ہم تو ہوں گے مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ ابراہیم علیہ السلام کی ملت و دین پر۔ اھل یہاں مضاف محذوف ہے۔ فرماؤ کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے فرمانبردار ہوں گے۔ حَنِیْفًا ہر باطل دین سے ہٹ کر دین حق کی طرف رجوع کرنے والے اور یہودیت و نصرانیت سے دور رہنے والے۔ یہ مضاف الیہ سے حال ہے یعنی ابراہیم سے جیسے اس عبارت میں رأیت فی وجہ ھند ھندہ کے منہ کو دیکھنا سے دیکھنا ہے۔ یہاں پر حال مفعول یا مضاف بمعنی ملت کی ہیئت بیان کرتا ہے۔ حَنِیْفًا کو مذکر لایا گیا ہے۔ ملت کو دین سے مؤول کر کے، کیونکہ وہ دونوں ذاتی طور پر متحد ہیں اگرچہ اعتبار اً مختلف۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وہ مشرکین سے نہیں تھے۔ یہ جملہ بطور تعریض کے ہے اور انہیں ان کے دعویٰ کے بطلان کا پتا دیتا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے فرمانبردار ہیں تو پھر شرک کیوں کرتے ہو۔ وہ تو مشرک نہیں تھے تم عزیر اور مسیح علی نبینا وعلیہما السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔

مسئلہ: آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی فرمانبرداری کا حکم ہے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور اولیائے ملت رضی اللہ عنہم انہی کی ملت پر ہیں۔

قُوْلُوْٓا اے مومنو تم انہیں کہو۔ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے۔ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا اور اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوا۔

سوال: آیت میں قرآن کو امت کی طرف کیوں منسوب کیا گیا ہے؟

جواب: امت اپنے نبی علیہ السلام کے تابع ہوتی ہے، تابع اور متبوع کا ایک ہی حکم ہوتا ہے۔

وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ اور ان صحیفوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے اور ان احکام پر بھی ایمان ہے جو وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ حضرت اسماعیل، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب علیہم السلام پر نازل ہوئے۔

وَالۡاَسۡبَاطِ اور جو کچھ ان کی اولاد پر نازل ہوا اس پر بھی ہمارا ایمان ہے۔

اسباط سبط کی جمع ہے او سبط دراصل اس درخت کو کہتے ہیں جس کی بہت سی ٹہنیاں ہوں اور یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد مراد ہے۔ وہ بارہ تھے۔ انہیں اسباط اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان ہر ایک کی اولاد کثرت سے ہوئی اور سبط پوتے کو کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے لئے اسباط کا اطلاق ایسے ہے جیسے عرب کے لئے قبائل کا اطلاق ہوتا ہے اور شعوب عجم کے لئے یعنی وہی قبیلے جو ماں باپ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اسباط میں انبیاء علیہم السلام تھے ان پر صحیفے بھی نازل ہوئے۔

سوال: صحیفے تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اترے پھر اسباط کی طرف صحف کی نسبت کیسی؟

جواب: چونکہ وہ حضرات سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے صحائف پر عمل کرتے ان کی طرف نسبت کا جواب وہی ہے جو وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا میں گزرا۔ یعنی تابع اور متبوع کا ایک ہی حکم ہوتا ہے۔

وَمَآ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى اور ہمارا ان کتابوں پر ایمان ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئیں یعنی تورات و انجیل پر۔

سوال: اس آیت میں اسباط کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا نام خصوصی طور پر کیوں لیا گیا؟

جواب: چونکہ نبی علیہ السلام کی گفتگو یہود و نصاریٰ سے تھی، اور وہ ان کے پیروکار تھے اس لیے ان کو مخصوص کر کے بیان کیا گیا۔

وَمَآ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ اور ہمارا باقی نبیوں پر نازل شدہ کتب پر ایمان ہے خواہ ان کا ذکر قرآن میں ہے یا نہیں۔

مِنۡ رَّبِّهِمۡ ترکیب میں حال کے مقام پر ہے جو ایک محذوف ضمیر سے واقع ہے۔ اصل عبارت یوں تھی:

وما اوتی النبیون منزلاً علیهم من ربهم لانفرق بین احد منهم۔

لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ہم کسی ایک نبی علیہ السلام میں فرق نہیں کرتے سب پر ہمارا ایمان ہے۔ یہودیوں کی طرح

نہیں کہ بعض انبیاء پر ایمان لائیں اور بعض کے ساتھ کفر کریں اور ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ہمارے پاس سب پر ایمان لانے کی دلیل موجود ہے۔ کیونکہ ہمیں ان کی خبر ایسے نبی علیہ السلام نے دی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی تائید سے معجزات کا صدور ہوا ہے۔ اگر ہم بعض انبیاء سے کفر کریں تو پھر اپنے نبی علیہ السلام کے خلاف ہو جائیں اور ایسا ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہ جملہ امنّا سے حال واقع ہوا ہے۔

سوال: ایمان لانے کی بات تو کتابوں کے بارے میں ہو رہی تھی اب انبیاء علیہم السلام میں فرق کرنے کا کیا مطلب؟

جواب: جب ان کی کتابوں پر سب کا ایمان ہے تو ان کی ذات میں تفرقہ کا کیا معنی۔ اس لیے واجب ہوا کہ تصریح ہو جائے کہ جس طرح ہمارا ان کی کتابوں پر ایمان ہے اسی طرح ان کی ذات پر بھی ہے اور ایک کے انکار سے سب کا انکار لازم آتا ہے۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ہم سب اسی اللہ تعالیٰ کے لئے گردن جھکانے والے ہیں۔ یعنی حال یہ ہے کہ ہم اس ذات کے لیے مخلص اور یقین رکھنے والے ہیں۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا اگر یہود و نصاریٰ ایمان لے آئیں۔ بِمِثْلِ مَآ مثل اس دین کے اٰمَنْتُمْ بِهٖ جس کے ساتھ تم ایمان لے آئے ہو۔ یہ تعجب و تبکیت کے باب سے ہے۔ یعنی مخالف کو الزام دے کر اور اسے حق کے لئے اعتراف کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ معاملہ کو کچھ ڈھیلا کر کے اس کے جھگڑے کی راہ بند کرنا ہے۔ یہ لفظ مثل زاید کے ہے۔ کیونکہ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے اور اللہ تعالیٰ پاک ہے نہ ہی دینِ اسلام کا کوئی مثل ہے۔

فَقَدِ اهْتَدَوْا بیشک راہ حق کی طرف ہدایت یافتہ اور حقیقت کو پہنچ جائیں گے اور نہ تم ہدایت پا گئے ہو اور تمہارے مابین اتحاد و اتفاق ہو گیا ہے۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا اگر جس طور کہ بیان ہوا ہے اس سے روگردان ہو بایں طور کہ اس میں کسی قسم کا خلل پیدا کردیں کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض سے کفر کریں جیسا کہ ان کا طریقہ ہے۔

فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ یعنی وہ خلاف عظیم میں حق سے بالکل دور ہیں اس سے ازالہ تو ہم کیا گیا ہے کہ شاید ان سے اتحاد کا یہ معنی ہے کہ بعض باتوں کو وہ مان جائیں تو پھر تم ان سے مل جاؤ۔ ایسا ہرگز نہ ہو بلکہ جب تک وہ تمام اسلام کی باتوں کا اعتراف نہ کرلیں تم ان سے ملنے کا نام تک نہ لو۔ فِیْ شِقَاقٍ خبر اور هُمْ مبتدا ہے اور فِیْ شِقَاقٍ، هُمْ کی ظرف بھی ہے اور هُمْ، فِیْ شِقَاقٍ کا مظروف ہے۔ بطور مبالغہ کے ایسا کیا گیا کہ وہ اتنے شریر ہیں کہ اختلاف ان پر سوار ہے۔ یہ هُمْ مُخَالِفُوْنَ سے زیادہ بلیغ ہے۔ شقاق شق سے مشتق ہے بمعنی جانب۔ گویا ایک گروہ دوسرے گروہ کی جانب دوسرے

کنارے پر ہے بوجہ عداوت کے۔ اور شِقَاقٍ کی تنکیر بتاتی ہے کہ ان سے موافقت کا صدور ممتنع ہے کیونکہ ان کا کام جدا وقتال ہی ہے۔ اور بس۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور اہل اسلام کو خوش فرمایا کہ ان کو نصرۃ اور غلبہ کا وعدہ فرمایا اور تائید واعزاز کا ارشاد فرمایا۔

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ" کا سین تاکید کے لئے ہے جو دلالت کرتا ہے کہ جو وعدہ دیا گیا وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ چنانچہ فرمایا: پس عنقریب تمہاری ان سے کفایت کرے گا۔

حل لغات: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ" کی دونوں ضمیریں منصوب المحل ہیں اس بنا پر کہ یہ دونوں یکفی کا مفعول بہ ہیں جیسے کہتے ہیں: کَفَاهُ مَسْئُوْنَةً" کِفَايَةً. اگرچہ اس کا استعمال متعدی بیک مفعول سے ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے: کَفَاکَ الشَّیْءُ۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کا ایفا فرمایا کہ بنو قریظہ کو قتل کرایا اور بنی نضیر کو شام کی طرف جلا وطن کیا اور جزیہ وذلت نجران کے نصاریٰ کو دی۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ اور وہ سمیع وعلیم ہے۔ وعدہ کے ایفا کی طرف اشارہ ہے پھر اس کی تاکید بھی ہے۔ کیونکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سنتا ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا دین غالب ہو تو وہ تمہاری توبہ قبول کر کے تمہیں اپنے مقصود تک پہنچائے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ **حل لغات**: الصبغ: جس سے کپڑا رنگا جائے۔ اور صبغ مصدر ہے۔ اور صبغۃ بروزن فِعْلَة" ہے نوع وحالت کے لئے ہے الصبغ سے جیسے جلسۃ جلس یعنی وہ حالت جس پر رنگ واقع ہو اور صبغۃ آیت ہذا میں مستعار ہے اس فطرت سے جس پر لوگوں کو پیدا کیا۔ خلقت سلیمہ (کہ جس سے انسان ایمان ودیگر عبادات کی استعداد حاصل کرتا ہے) کو کپڑے سے اس لیے تشبیہ دی گئی کہ جیسے رنگ زیب وزینت کا سبب ہے ویسے ہی یہ فطرت بھی روحانی زیب وزینت کا سبب ہے۔ اصل عبارت یوں تھی نصبغنا اللہ صبغۃ (ہم نے اس کو ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے) کہ اس کی استعداد دے حق اور ایمان کو قبول کرتا ہے۔ صبغۃ مصدر اور مفعول مطلق مؤکد لنفسہ ہے کیونکہ یہ اپنے عامل مقدر سے مل کر اپنے ہی جملہ مقدرہ کا مضمون بن جاتا ہے۔

اٰمَنَّا بِاللّٰہِ اور اس کے سوائے مصدری معنی کے اور کوئی معنی نہیں بنتا کیونکہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان میں اسی استعداد کی

بناپر ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان میں پیدا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعے وہ ایمان کے نور سے آراستہ ہوئے ہیں۔

اس کا معنی یوں بھی ہوسکتا ہے کہ طَهَّرَنَا اللّٰهُ تَطْهِيرًا یعنی ہم نے انہیں پورے طور پر پاک کیا اس لیے کہ ایمان کفر کی تمام غلاظتوں سے پاک کرتا ہے۔ مشاکلت کی وجہ سے اسے صِبْغَةَ سے تعبیر کیا گیا ہے اس لیے کہ وہ شئی اسی غیر کی صحبت میں ہے یا تو وہ غیر محقق طور پر مذکور ہو یا مقدر ہو اور مقدر بھی مذکور کے حکم میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس پر قرینہ دلالت کرنے والا ہوتا ہے یا جیسے دو اسموں کے مابین جاری ہوتا ہے اسی طرح دو فعلوں کے مابین جاری ہوتا ہے۔ جیسے تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ۔ اللہ تعالیٰ پر لفظِ نفس کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جبکہ وہ نفس کے لفظ کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے۔ اسی طرح فطرت کو صبغۃ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ نصاریٰ کے صبغۃ کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے کہ وہ ساتویں دن اپنے بچوں پر رنگ ڈالتے، بجائے ختنہ کرنے کے۔ کیونکہ مسلمان اپنے بچوں کا ختنہ کرتے ہیں اور وہ اپنے بچوں پر پیلا رنگ ڈالتے ہیں۔ وہ اسے معمودیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پانی میں غوطہ دینے کا اگرچہ ذکر نہیں۔ چونکہ ان کا فعل ہی ایسا تھا اس لیے وہ مذکور ہے قرینہ حالیہ سے معلوم ہو رہا ہے اور پھر آیت ان کے رد میں نازل ہوئی ہے کہ تمہارا رنگدار کرنا بے سود ہے۔ اصل میں رنگ اللہ تعالیٰ کا چاہیے کہ وہ اپنے بندوں کو پاک کرتا ہے نہ کہ بچوں کو معمودیہ (حنا) میں ڈبو دینے سے۔ معمودیہ ایک پانی کا نام ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام نے غسل فرمایا۔ انہوں نے اسے دوسرے پانی میں ملا دیا تھا جب بھی کسی کو رنگدار کرتے تو اس میں دوسرے پانی کی ملاوٹ سے غوطہ دیتے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مبتدا خبر میں یا استفہام انکاری ہے۔ یعنی کون زیادہ اچھا ہے۔ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً، صِبْغَةً منصوب اور اَحْسَنُ سے تمیز ہے۔ مبتدا سے منقول ہے۔ اصل یوں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صِبْغَةً سے اور کون زیادہ احسن ہے۔ یہ تفصیل صبغتین میں ہے نہ کہ فاعلین میں۔ اب معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صِبْغَةً سے اور کون زیادہ احسن ہوسکتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کو ایمان سے رنگدار کرکے انہیں کفر کے رنگ سے پاک کرتا اور شرک سے بچاتا ہے۔ بنابریں اس سے کوئی اور زیادہ احسن نہیں ہوسکتا۔

وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ اور ہم اسی کے لئے ہی عبادت گزار ہیں۔ یعنی اس ذات کے لئے جس نے ہمیں نعمتوں سے نوازا۔ اس کی شکر گزاری کے لئے بلکہ تمام نعمتوں کی وجہ سے ہم اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ظرف کی تقدیم، اس کی اہمیت اور فواصل کی رعایت کی وجہ سے ہے۔ اس کا عطف اٰمَنَّا پر ہے اور یہ امر قُوْلُوْٓا کے تحت ہے۔ جب بندے کا کام عبادت گزاری ہے

تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے نفس کو اچھے رنگ سے رنگ کر معزز کیا اور جملہ عیوب سے دور رکھا۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

صبغۃ اللہ نام آں رنگِ لطیف　　　لعنۃ اللہ بوئے ایں رنگِ کثیف [1]

ترجمہ: صبغۃ اللہ اس لطیف رنگ کا نام ہے اور لعنۃ اللہ اس رنگِ کثیف کی بدبو ہے۔

تفسیر صوفیانہ

وَنَحْنُ لَهُ عٰبِدُوْنَ میں اشارہ ہے کہ عارفین صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی عبادت کرتے ہیں۔

زبور میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا جو میری عبادت محض اس لیے کرتا ہے کہ میں اسے جنت دوں اور دوزخ سے بچاؤں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں بہشت و دوزخ کو پیدا نہ کرتا تو وہ میری عبادت ہی نہ کرتا۔

ف: عابد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھ کر صرف اس کی رضا طلبی کے لئے عبادت کرے اور بس۔ عبادت درجہ میں عبودیت سے کم ہے اور عبودیت عبودۃ سے کم ہے۔ کیونکہ جو اپنے مالک پر روح کو قربان کر دے اس کا نام عبودۃ ہے اور عبادۃ یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کی مرضی میں نفس کو قربان کرے۔ اس لحاظ سے عبادت کا درجہ عبودۃ سے کم ہوا۔

حضرت سہیل بن عبداللہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

عبادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک چار چیزوں پر عمل نہ کیا جائے:

۱۔ بھوک　　۲۔ ننگ　　۳۔ فقر　　۴۔ ذلت

---

[1]: مطبوعہ پارہ پر اشعار غلط اور ادھورے ہیں صحیح یوں ہیں: ؎

کوگل دنگ از برون مرد را　　　از درون چوں رنگ سرخ و زرد را

رنگ ہائے نیک از خُم صفاست　　　زشتان از سیاہابہ جفاست

صبغۃ اللہ نام آں رنگِ　　　لعنۃ اللہ بوئے ایں رنگِ کثیف

ترجمہ: ۱۔ کسی کا وہ گل رنگ جو باہر سے نظر آتا ہے دراصل اندرونی سرخ و زرد رنگ کا نتیجہ ہے۔

۲۔ مٹکا صاف ہو تو رنگ بھی صاف ہوگا، گندے رنگ دراصل غلط کرداری کی وجہ سے ہیں۔

۳۔ صبغۃ اللہ اس لطیف رنگ کا نام ہے لعنۃ اللہ اس کثیف رنگ کی بدبو ہے۔ اویسی غفرلہٗ۔

حضرت شیخ ابوالعباس علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بندے کے لئے چار ضروری اوقات ہیں۔

۱:۔ طاعت ۲:۔ معصیت ۳:۔ نعمت ۴:۔ مصیبت

ان سب میں عبودیت کا حق ہے۔حق تعالیٰ بحکم ربوبیت ان میں سے اپنا حق چاہتا ہے۔ جسے نعمت نصیب ہو اس کے لئے شکر کرنا ضروری ہے اور اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے قلبی فرحت کا اظہار کرے۔اگر مصیبت آئے تو صبر کرے ۔بندے کو چاہیے کہ اپنی عبادت کی ادائیگی میں سستی نہ کرے تا کہ بلند درجات حاصل ہوں۔

مثنوی شریف میں ہے:

کافرم من گرزیاں کردست کس — دورہ ایمان طاعت یک نفس

سرشکستہ نیست ایں سر رامبند — یک دو روزہ جہد کن باقی بخند

تازہ کن ایمان نہ از گفت زبان — اے ہوا راتازہ کردہ درنہاں

تاہوا تازہ است ایمان تازہ نیست — کیں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

ترجمہ: ۱:۔میرے نزدیک وہ کافر ہے جو ایمان اور طاعت میں پل بھر بھی نقصان کرتا ہے۔
۲:۔یہ سرشکستہ نہیں اس کا سر بند کر ایک دو دن کوشش کر پھر زندگی بھر خوشی سے گزار۔
۳:۔ایمان کو صرف زبان سے نہیں حقیقی طور تازہ کر تو اندر سے خواہشات سے پُر ہے۔
۴:۔جب تک خواہشاتِ نفسانی تازہ ہیں ایمان تازہ نہیں ہو سکتا یہ خواہشات تو ایمان کی نورانیت کا تالہ ہیں۔

حکایت: حضرت سری سقطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

میں بیس سال خلقِ خدا کے تجسس میں رہا۔صرف ایک ہی بندۂ خدا مجھے ملا۔وہ جامع مسجد بغداد میں جمعہ کا خطبہ دیتا تھا۔میں نے کہا: مجھے اس ضعیف پر بڑا تعجب ہے کہ اپنی بڑی طاقت کی نافرمانی کرتا ہے۔جب کل صبح ہفتہ کے دن میں صبح کی نماز ادا کی تو ایک نوجوان آیا اور اس کے پیچھے چند سوار تھے جن آگے آگے حسین نوجوان لڑکے اور وہ خود بھی سواری پر تھا میرے قریب آکر سواری سے اترا اور پوچھا سری سقطی کہاں ہیں؟ میرے ساتھیوں نے میری طرف اشارہ کیا مجھے السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا اور کہا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے اس ضعیف سے تعجب ہے جو اپنے قوی کی نافرمانی کرتا

ہے اس سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میں نے کہا: تمام ابن آدم سے بہت کمزور اور کون ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمام بڑی قوت والوں سے قوی ہے۔ ابن آدم اپنی کمزوری کے باوجود اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ یہ سن کر اس نے ایک درد بھری آہ سے کہا کہ بھلا بتاؤ مجھ جیسے گناہوں میں غرق شدہ کے گناہ معاف کر دے گا۔ کہا اے سری سقطی! آپ کو معلوم ہو کہ میں بڑا مجرم و گنہگار ہوں اور مجھ پر حقوق العباد ت لاتعد ادو ولا تحصیٰ ہیں۔ اب میں کیا کروں۔ میں نے کہا: جب تیرا ارادہ اسی ذات کو راضی کرنے کا مکمل ہو جائے گا تو وہ تیرے حقدار سے تیری معافی کرا کے تجھے بخش دے گا۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ کے بندے کے جب حقدار جمع ہوں گے تو ان کے لئے ایک فرشتہ آ کر کہے گا اس بندہ کو کچھ نہ کہو تمہارے معاملے اللہ تعالیٰ کے سپرد ہو گئے۔

سرّی سقطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں جب میں نے اسے یہ حدیث سنائی تو وہ بندہ خدا رونے لگا اور کہنے لگا۔ اب مجھے اللہ تعالیٰ سے ملنے کا راستہ بتایئے۔ میں نے اسے کہا اگر سالکین کا راستہ چاہتے ہو تو دن کو روزے رکھو اور رات کو جاگو اور گناہوں کو چھوڑ دو اور اگر تجھے ولیوں کا راستہ چاہیے تو مخلوق سے علیحدگی اختیار کر کے صرف اللہ تعالیٰ کے ہو جاؤ۔ یہ بات سن کر وہ خوب رویا اور اس کا رومال آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ مجھ سے فارغ ہو کر اہل و عیال چھوڑ کر چین اور قرار ختم کر کے گورستان میں رہنے لگا۔ نہایت مغموم و محزون رہتا اور اسی حالت میں فوت ہو گیا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ ریشمی لباس میں نہایت فخر و ناز سے بہشت میں ٹہل رہا ہے اور مجھے دیکھ کر کہنے لگا: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں نے پوچھا: کیسی گزری؟ کہا: مجھے اللہ تعالیٰ نے مرتے ہی بہشت میں داخل فرمایا اور گناہوں کا نام تک نہیں لیا۔

تفسیر عالمانہ

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا حل لغات: المحاجة: بمعنی مجادلہ و دعویٰ حق ماور اس پر جانبین سے ہر ایک کی دلیل قائم کرنا۔ ہمزہ انکار و توبیخ کے لیے ہے۔

شانِ نزول: اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام ہم میں سے اور ہمارے دین پر تھے اور ہمارا دین سب سے پہلے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! یہود و نصاریٰ سے فرمایئے کہ تم ہمارے ساتھ مجادلہ و مخاصمت کرتے ہو۔ فی اللہ اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں۔ اور دعویٰ کرتے ہو کہ ہمارا دین حق ہے یعنی یہودیت

نصرانیت، پھر اس پر دخولِ جنت اور ہدایت کی امید رکھتے ہو۔ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى اور کبھی کہتے ہو: كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى

وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ حالانکہ جھگڑے کی کوئی بات ہی نہیں کیونکہ وہی ہمارے اور تمہارے جملہ امور کا مالک ہے۔

وَلَنَآ اَعْمَالُنَا ہمارے لیے نیکی ہے جو اس کے امر کے موافق ہے۔ وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ تمہارے لیے تمہاری بُرائی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف ہے، پھر کیوں دعویٰ کرتے ہو کہ تم اولیٰ ہو۔ وَنَحْنُ لَهٗ اور ہم اللہ تعالیٰ کے لئے مُخْلِصُوْنَ اس کی عبادت میں مخلص ہیں کہ ہم سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی کی طلب نہیں۔ پس تم کیسے دعویٰ کرتے ہو اور اپنے مذہب کی حقیقت پہ کیوں جھگڑتے ہو اور اس کے سبب دخولِ جنت کی امید کیوں رکھتے ہو اور لوگوں کو اس کی طرف کیوں بلاتے ہو حالانکہ اصل میں تم مشرک ہو۔ اخلاص: یعنی عمل کر شرک و ریاء سے پاک رکھنا۔ در اصل اخلاص کا معنی ہے اپنے فعل کو مخلوق کے ریاء سے پاک رکھنا۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ: اَمْ ہمزہ کا عوض ہے جو کہ اَتُحَآجُّوْنَنَا میں ہے امر کے مقام میں واقع ہے۔ اب مطلب یوں ہوا کہ تم دو امروں میں سے کسے پسند کرتے ہو یا ت حجت اور دلیل مضبوط پیش کرو کہ واقعہ تم حق پر ہو جیسے کہ تمہارا گمان ہے یا یہ مانو کہ تم اندھی تقلید میں پھنسے ہوئے ہو اور خواہ مخواہ انبیاء علیہم السلام پر افترا بازی کرتے ہو۔ اور یہ کہتے پھرتے ہو کہ بیشک ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام یہود و نصاریٰ تھے۔

اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ اسباط یعنی یعقوب علیہ السلام کے پوتے یعنی ان بارہ صاحبزادوں کی اولاد۔

زجاج فرماتے ہیں کہ اسباط اسحٰق بمنزلہ قبائل کے ہے۔ یعنی اسحٰق علیہ السلام کی اولاد کو سبط اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو قبیلہ کہتے ہیں۔

كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تم کہتے ہو کہ وہ حضرات یہود و نصاریٰ تھے۔ (معاذ اللہ) اور ہم ان کے مقتدی ہیں آیت میں ان دونوں باتوں کا انکار ہے اور ان کو توبیخ ہے۔ یعنی اے یہود و نصاریٰ! ان انبیاء علیہم السلام کے لئے ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جبکہ تو تورات و انجیل کے نزول سے پہلے گزر چکے ہیں۔ جب وہ تم سے پہلے گزر چکے ہیں تو پھر وہ کیسے یہود و نصاریٰ تھے اور تم کیسے ان کے مقتدی ہوئے۔

قُلْ ءَاَنْتُمْ استفہام تقریر وتوبیخ کے لئے ہے۔ اَعْلَمُ کیا تم ان کے دین کو زیادہ جاننے والے ہو۔ اَمِ اللّٰہُ یا اللہ تعالیٰ زیادہ علم والا ہے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ اور کون زیادہ ظالم ہے۔اس میں یہ بات ہے کہ تم میں سے کوئی زیادہ ظالم نہیں۔ استفہام بمعنی نفی ہے۔ مِمَّنْ کَتَمَ چھپاتا ہے۔یعنی اس سے کون زیادہ ظالم ہے جو حق چھپاتا ہے۔ شَھَادَۃً شہادت کو جو ثابت ہے۔ عِنْدَہٗ جو اس کو معلوم ہے۔ مِنَ اللّٰہِ یعنی اللہ سے گواہی چھپانے والا بہت بڑا ظالم ہے۔ عِنْدَہٗ اور مِنَ اللّٰہِ دونوں صفتیں ہیں۔ان کا موصوف شہادت ہے۔یعنی ایسی شہادت جو اسے معلوم ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے صادر ہونے والی ہے۔یعنی اے کتاب! تم شہادت کو جانتے ہو اور تمہیں حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہی صادر ہونے والی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کو اولاد (علیہم السلام) پکے سچے مسلمان تھے اور اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری کتاب میں بیان فرمائی ہے جسے تم چھپاتے ہو اور حقیقی گواہی کے خلاف ظاہر کرتے ہو۔اس لحاظ سے تم میں سے اور کون زیادہ ظالم ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی تکذیب کی جرأت کرتے ہو۔جبکہ اس نے کچھ کہا اور تم کچھ اور اس کے خلاف بیان کرتے ہو اور اظلمیت کو مطلق کتمانِ شہادت سے معلق کیا گیا ہے۔اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص حق کو عمداً مخفی رکھتا ہے اس کی سزا اتنی زیادہ ہے کہ دائرہ بیان سے باہر ہے۔ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کردار سے بے خبر نہیں ہے۔

حدیث شریف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کبیرہ گناہوں سے ہے شرک اور جھوٹی گواہی اور شہادت کو چھپانا۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" کہ جو حق کو چھپاتا ہے اس کا دل آثم ہے۔"

یعنی اس کا دل مسخ ہو جائے گا) (نعوذ باللہ من ذالک)

تِلْكَ اُمَّةٌ یعنی انبیاء علیہم السلام کی جماعت۔ قَدْ خَلَتْ گزری ہے موت کے ذریعے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ ان کے لئے وہ اعمالِ صالح ہیں جو انہوں نے کیے ۔ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ اور تمہارے لیے جو تم کر رہے ہو۔ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی کوئی کسی سے نہ پوچھا جائے گا ہر ایک اپنے عمل سے سوال کیا جائے گا۔پھر اسے جزا دی جائے گی۔

سوال: آیت کا تکرار کیوں ہے؟

جواب: مبالغہ ہے ان کی تردید میں کہ تم اپنے آباء کے کردار کی وجہ سے فخر کر رہے ہو بے جا ہے انہیں ڈرسنایا جا رہا ہے کہ تم اپنے اعمال کا محاسبہ کرو ورنہ تمہیں اپنے نسب کا تعلق کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ اس لیے کہ جب نفخ صور ہوگا اس کے بعد تو نسب ختم ہی ہو جائے گا۔

حکایت: ہارون الرشید حج سے فراغت کے بعد چند روز کے لئے کوفہ میں مقیم ہوا، جب ہو باہر نکلا تو اسے راستے میں بہلول مجنون ملے انہوں نے بآواز بلند تین بار کہا: اے ہارون الرشید! ہارون الرشید نے تعجباً پوچھا: کون ہے جو مجھے پکار رہا ہے؟ لوگوں نے کہا: بہلول مجنون۔ ٹھہر کر حکم دیا کہ پردہ ہٹا دو۔ اس کی عادت تھی کہ لوگوں سے با پردہ ہو کر کلام کرتا تھا۔ اس نے بہلول سے کہا: کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ بہلول نے جواب دیا: جانتا ہوں، تو وہ ہے کہ اگر کوئی مشرق میں ظلم کرے اور تو مغرب میں ہو تو تب بھی تجھ سے اللہ تعالیٰ اس کے متعلق پوچھے گا۔ ہارون الرشید نے کہا: تو میرا حال کیسے جانتا ہے؟ بہلول نے کہا: میں تیرے حال کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس میں ہے کہ ابرار جنت میں ہوں گے اور فجار جہنم میں۔ ہارون الرشید نے کہا: ہمارے اعمال کس طرح ہوں گے؟ بہلول نے کہا: اللہ تعالیٰ متقین کے اعمال قبول فرماتا ہے۔ ہارون الرشید نے کہا: ہماری قرابت جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کا کیا حال ہوگا؟ بہلول نے کہا: جب نفخ صور ہوگا تو تمام حسب نسب منقطع ہو جائیں گے۔

ہارون الرشید نے کہا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کہاں جائے گی؟ بہلول نے کہا: اس دن شفاعت نفع نہیں دے گی مگر اللہ تعالیٰ جس کے متعلق اجازت دے گا اور جس سے وہ راضی ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اعمال صالح میں خلوص ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے اعمال کو قبول کرے گا۔

جنید قدس سرہٗ فرماتے ہیں: کہ اخلاص اور بندہ کے مابین راز ہے کہ فرشتے کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ اسے لکھ سکے۔ نہ ہی شیطان کو خبر ہوتی ہے کہ اسے خراب کر سکے۔

مسئلہ: فضیل فرماتے ہیں کہ عمل کو لوگوں کی خاطر ترک کرنا بھی ریاء ہے اور لوگوں کی خاطر عمل کرنا شرک ہے لیکن اخلاص دونوں کو خلاصی دیتا ہے۔

مسئلہ: تاتار خانیہ میں ہے کہ شروع تو کی خلوص سے لیکن بعد میں ریاء کا دخل ہوا تو وہ ریاء نہیں۔ ریاء یہ ہے کہ اگر لوگوں سے علیحدہ ہوتا تو نماز نہ پڑھتا۔

مسئلہ : لوگوں کے سامنے ہوتا ہے تو نماز اچھی کر کے پڑھتا ہے لیکن تنہائی میں ایسا نہیں کرتا تو اسے نفس صلوٰۃ کا ثواب ملے گا لیکن احسان کا درجہ اسے نصیب نہیں ہوگا۔

حکماء فرماتے ہیں اس شخص (جو ریاء کی طاعت کرتا ہے) کی مثال ایسی ہے جو بازار کی طرف اپنا دامن کنکریوں سے پُر کر کے نکلتا ہے تو لوگ دیکھ کر کہتے ہیں: دیکھئے اس کا دامن بھرا ہوا ہے نا اسے اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ صرف لوگوں کی باتیں ہی سنتا رہے گا اور بس۔

حدیث شریف: میں ہے کہ اپنے اعمال کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کو قبول کرتا ہے جو صرف اسی کے لیے کیے جائیں اور یوں بھی نہ ہو کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ اور صلہ رحمی کی خاطر ہو۔ اللہ تعالیٰ سے اس میں کوئی ثواب نہیں۔

مشارق الانوار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے لعنت کرتا ہے جو غیر اللہ کی خاطر ذبح کرتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: غیر اللہ کے لیے ذبح کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خاطر ذبح کیا جائے۔ مثلاً بت کے لیے یا موسیٰ علیہ السلام وغیرہ کے لئے۔

مسئلہ : شیخ ابراہیم مرادوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ بادشاہ کے استقبال کی خاطر اس کی تقریب کے لیے ذبح کرتے ہیں اہلِ بخارا کا فتویٰ ہے کہ وہ حرام ہے کیونکہ یہ بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ میں داخل ہے۔

امام رافعی فرماتے ہیں کہ یہ حرام نہیں کیونکہ یہ تو صرف خوشی کی خاطر ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے بچے کی ولادت میں عقیقہ کی خوشی میں ذبح کیا جاتا ہے اور یہ حرام نہیں ہے۔ اسی پر مسلمانوں کے افعال کو نیکی پر محمول کرنا چاہیے تا کہ وہ کفر سے بچ جائیں اور ان کے اعمال ضائع نہ ہوں کیونکہ موحد کا مطمح نظر مولا کی رضا اور اس کی عبادت ہی ہوتی ہے۔ جس طرح بھی جو عبادت میسر ہو۔

(اللّٰھم اعصمنا من الزلات) (اے اللہ! ہمیں لغزشوں سے محفوظ رکھ)

تحقیق اویسی غفر لہٗ۔

الحمد للہ امام رافعی علیہ الرحمہ نے صدیوں پہلے وہی فرمایا جو آج امام احمد رضا قدس سرہٗ فرما رہے ہیں اور مخالفین بادشاہ کی دعوت والے قول کی آڑ میں مسلمانوں کی بہت سی نیکیاں برباد کا فتویٰ بلکہ انہیں مشرک گردان رہے ہیں۔ اس موضوع

پر مفصل بحث فقیر کی کتاب "فیصلہ حق و باطل" میں بقدر ضرورت یہاں عرض ہے۔

مخالفین کی تقریر:۔ جس طرح بادشاہ کی دعوت میں بادشاہ کی خوشنودی سے جانور حرام ہو گیا ایسے ہی میلا گیارہویں، پیر کا بکرا اور دیگر وہ اشیاء جس میں پیروں، فقیروں کی خوشنودی کو دخل ہوا گرچہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی آیا ہو جیسے بادشاہ کی دعوت وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ سے ہے۔

جواب :۱۔ بادشاہ کی دعوت کا قول مرجوح ہے۔ راجح قول فقہ حنفی میں امام رافعی علیہ الرحمہ کا قول ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے اور اس کی علت بھی واضح فرمادی جو روحِ اسلام کے عین مطابق ہے اور مرجوح قولِ اسلامی اصول کے بھی خلاف ہے کہ مسلمان کی نیت پر حملہ کے علاوہ بدظنی اور محبوبانِ خدا سے رابطہ جوڑنے کے بجائے توڑنے والی بات کرتے ہیں مخالفین ان سے رشتہ توڑ چکے ہیں وہ توڑنے والی بات کریں تو انہیں سلامت۔

جواب :۲۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام کی خوشنودی و رضا کو بادشاہ کی خوشنودی پر قیاس، قیاس مع الفارق ہے اس لیے کہ رضائے مصطفیٰ اور رضائے اولیاء عین رضائے خدا ہے۔ اسی کو ہم عین اسلام سمجھتے ہیں اور مخالفین اسے شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم اپنے فتویٰ کے مطابق حق پر ہیں اور مخالفین منافقین کے نقشِ قدم پر کہ وہ بھی رضائے مصطفیٰ سے روگرداں ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ فرمائی۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اور وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ان کا یہ فتویٰ غلط بھی ہے کہ غیر اللہ کی رضا جوئی و خوشنودی کی طلب شئے کو حرام کر دیتی ہے۔ تو پھر مہمان نوازی بھی حرام ہو اور فقرو مساکین اور غرباء و مسلمین کو خوش کرنا حرام اور ماں باپ، استاذ، مرشد اور دیگر جملہ اہلِ اسلام کو خوش کرنا حرام ہو بلکہ روحِ اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ

دل بدست آور کہ حج اکبر است

لیکن مخالفین اسلام کی روح کو مجروح کرتے ہیں کیونکہ منافقین کے وارث جو ہیں۔

عبارتِ فقہاء کرام کا جواب: جن فقہاء کرام نے بادشاہوں کی دعوت کا کہا ہے وہ ان کے دور کے مطابق ہے کہ ظالم بادشاہ جہاں جاتے غرباء و مساکین کے اوپر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے کہ ان کی دعوتوں پر غرباء و مساکین کے جانور ظلماً پکڑ کر دعوتیں اڑائی جاتیں ایسے ظالموں کی دعوت کے جانوروں کا فتویٰ حرمت ہو تو مبنی برصواب ہے نہ کہ صلاح الدین ایوبی اور عالمگیر اور نور الدین اور سلطان محمود علیہم الرحمہ جیسے بادشاہ جو بظاہر امیر لیکن درحقیقت فقیر (ولی اللہ) تھے۔

جوابِ استدلال:۔ آیت وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ سے ان کا استدلال ایسے غلط ہے۔ جیسے وہ خود غلط ہیں۔ فقیر نے اس

آیت کی تشریح اسی تفسیر "فیوض الرحمٰن ترجمہ روح البیان" کے پارہ نمبر ۲ کے حاشیہ میں لکھ دی ہے۔ یہاں بقدر ضرورت حاضر ہے۔

یہ آیت قرآن مجید میں چار جگہ ہے۔ تمام جگہوں میں الفاظ کے تقدم وتاخر کا فرق ہے۔ مطلب ایک ہے فقیر (پارہ ۶ رکوع ۵ (کنز الایمان) امام احمد رضا خان قدس سرہٗ کے ترجمہ وتفسیر سمیت مختصر عرض کرتا ہے آیہ مبارکہ یوں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ

تم پر حرام ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا۔

ف: اصل مطلب یہی ہے جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ نے جملہ تفاسیر ومباحث کا خلاصہ نچوڑ پیش کرتے ہوئے "کنز الایمان" میں لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہے "جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا" اور یہی معنی عقل ونقل کے مطابق ہے اس لیے کہ اس میں ان مشرکین کا رد ہے جو جو بوقتِ ذبح "بسم اللات والعزیٰ" پکارتے تھے لہٰذا اس کے بالمقابل بوقتِ ذبح بسم اللہ اللہ اکبر کی تعلیم دی گئی۔

یہی مفہوم ومطلب قرنِ اوّل سے تاحال کے جملہ محققین ومفسرین (صحابہ، تابعین تبع تابعین وغیرہم) نے بیان فرمایا۔ جن کے اسماء گرامی اور چند عبارات فقیر نے پارہ نمبر ۲ کی تفسیر آیت ہٰذا میں نقل کیے ہیں لیکن افسوس کہ مخالفین کسی کی بھی نہیں مانتے

تحریفِ قرآن:۔ مخالفین کے تراجم وتفاسیر (نام نہاد) پڑھیں تو وہ آیت قرآنی وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ میں تحریف کر کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام سے منسوب مثلاً میلاد شریف اور عرس وگیارھویں پر چسپاں کر کے حرام ٹھہراتے اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان پر چونکہ غیر اللہ کا نام دیا گیا ہے اس لیے یہ حرام ہے۔ (لا حول ولا قوۃ الا باللہ)

حال آنکہ: آیہ مبارکہ کا مذکورہ مفہوم بیان کرنا اس کی معنوی تحریف کے مترادف ہے کیونکہ اس کا اگر "بوقت ذبح کے نام کا اطلاق واستعمال ہوتا ہے تو کیا منکرین گیارھویں ان سب کو حرام قرار دیں گے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر صرف گیارھویں ہی کو کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کیا یہ محض بغض وعناد کا مظاہرہ نہیں ہے؟

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے استاذ محترم حضرت ملا جیون علیہ الرحمہ صاحب نور الانوار وتفسیر احمدی کی تحقیق وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے تحت اختصار کے باوجود بہت جامع وقول فیصل ہے۔ فرماتے ہیں "اس کا معنی یہ ہے کہ جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے مثلاً لات وعزیٰ وغیرہ (جیسا کہ مشرکین کا طریق تھا) لیکن اگر بسم اللہ اللہ اکبر کہنے

اور جانور لٹانے سے پہلے یا ذبح کے بعد غیر اللہ کا نام لے تو کوئی حرج نہیں جیسا کہ "ہدایہ" میں مذکور ہے۔ اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اولیاء کے ایصال ثواب کے لئے جو گائے کی نذر مانی جاتی ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں اہل اسلام کا دستور ہے تو یہ حلال وطیب ہے۔ اس لیے کہ بوقتِ ذبح اس پر غیر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ اگرچہ پہلے اس نام کی نذر مانی گئی ہے۔

(تفسیرات احمدیہ پارہ ۲، صفحہ ۲۹)

معلوم ہوا کہ صاحب "تفسیر احمدی" وغیرہ مفسرین و محققین کی وہی تحقیق ہے جسے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے "کنز الایمان" میں نقل کیا ہے۔ نیز نذر اولیاء کا سلسلہ پہلے سے مسلمانوں میں جاری ہے۔ مزید تحقیق و تفصیل فقیر کی تفسیر اویسی اور کتاب "فیصلہ حق و باطل" میں ہے۔

ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی غفرلہٗ

پارہ اول کی کی تفسیر کا ترجمہ بہ شب بدھ بتاریخ ۱۶ محرم ۱۳۸۲ھ دس بج کر پچیس منٹ پر ختم ہوا

مطالعہ گاہ مدرسہ منبع الفیوض حامد آباد

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے

كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ

جس پر تھے تم فرما دو کہ پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے جسے چاہے

اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا

سیدھی راہ چلاتا ہے اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے کیا تمہیں سب امتوں میں

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا

افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ

جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ

اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لیے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے

مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى

اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور بیشک یہ بھاری تھی مگر ان پر جنہیں

الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اللہ نے ہدایت کی اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہارا ایمان اکارت کرے بیشک اللہ آدمیوں

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ

پر بہت مہربان رحم والا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا

اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو اور وہ جنہیں کتاب ملی ہے ضرور جانتے ہیں

الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۴﴾

کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ ان کے کرتوتوں سے بے خبر نہیں۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا

اور اگر تم ان کتابیوں کے پاس ہر نشانی لے کر آؤ وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے

أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ

اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرو اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع نہیں

اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ

اور (سننے والے کے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور

الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۵﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ

ستم گار ہوگا۔ جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی

أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۴۶﴾

اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے اور بیشک ان میں ایک گروہ جان بوجھ کر حق چھپاتے ہیں۔ (اے سننے والو)

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۴۷﴾

یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو) تو خبردار تو شک نہ کرنا

تفسیر عالمانہ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ عنقریب وہ لوگ کہیں گے جن کے عقل کمزور ہیں مِنَ النَّاسِ اس سے وہ منکرین مراد ہیں جو تغیر قبلہ کو اچھا نہ سمجھتے یعنی منافقین، یہود اور مشرکین ان کو بے عقل اس

لیے کہا گیا کہ وہ دین ابراہیم سے روگرداں تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ابراہیم کے دین سے وہ روگردانی کرتا ہے جو ذلیل النفس اور جاہل نابکار ہے۔

سوال: واقعہ کے وقوع سے پہلے خبر دینے کا کیا فائدہ؟

جواب: تاکہ وہ واقعہ کے وقت پریشانی کا اظہار نہ کریں۔ کیونکہ جو واقعہ اچانک ہو اس سے طبیعت سخت پریشان ہو جاتی ہے اور دستور ہے کہ ضرورت سے پہلے تیار رہنا دشمن کے فساد ڈالنے کو زیادہ روکتا ہے بہ نسبت عین موقعہ کی تیاری کے تیر پھینکنے سے پیشتر ہی تیر پر تیر لگایا جاتا ہے نہ کہ عین موقعہ پر۔ یہ مثال عرب میں اس وقت دی جاتی ہے جب کہ ضرورت سے پہلے سامان تیار کرایا جائے۔

مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا، مَا استفہامیہ انکاریہ مرفوع المحل مبتداء ہے اور وَلّٰىهُمْ اس کی خبر ہے جملہ يَقُوْلُ کی وجہ سے محل النصب ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں: تَوَلّٰى عَنْ ذَالِكَ یعنی انصرف اور کہتے ہیں: وَلّٰى غَيْرَهٗ يعنى صَرَفَهٗ۔

ف: قبلہ دراصل انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جو اس کے آمنے سامنے ہو شرع میں منقول ہو کر اس جہت کو کہا جاتا ہے جس کی طرف انسان منہ کر کے نماز پڑھے۔ قبلہ مقابلہ سے ماخوذ ہے اور قبلہ کو اسی لیے قبلہ کہتے ہیں کہ نمازی اس کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے۔

ف: آیت کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کو کون سی شئے نے اس جہت یعنی بیت المقدس سے پھیرا ہے کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کی طرف منہ کرنے لگ گئے ہیں۔

حدیث شریف: مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد یہود کی تالیف قلوب کے لئے تقریباً سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کا قبلہ نفخ صور تک کعبہ شریف کو ٹھہرا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب منکرین کو کیا جواب دینا چاہیے تو حکم ہوا کہ قُلْ آپ فرما دیجئے: لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ تمام امکنہ اللہ تعالیٰ کے ملک اور تمام جہتیں اس کے تصرف میں ہیں کوئی شے ذاتی طور مستحق نہیں کہ وہ خود قبلہ بن جائے کہ اس کے سوا کوئی اور قبلہ بھی بن سکے اور یہ جہات اس لیے قبلہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم میری عبادت کے لئے ان کی طرف منہ کرو۔ اس کی

مرضی اپنی قدرت وتصرف کے تحت جس کی طرف منہ کرنے کا حکم دے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ جس طرح چاہے جیسے چاہے حکم دے۔ مخلوق کے لئے تو خالق کا فرمان ماننا اور اس کی اطاعت کرنا ہی ہے اور بس اسے کیا ضرورت ہے کہ سوال کرتا پھرے اس کا حکم اس طرح کیوں ہوا اور یہ مامور اسی طرح کیوں ہے اسے تو فرمانبرداری کرنی ہے۔ اسے علل واغراض سے کیا مطلب؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ احکام وافعال اغراض وعلل کا محتاج نہیں۔

یہود ونصاریٰ کی ایک غلطی: یہود نے بیت المقدس کی غربی جانب قبلہ اپنی خواہش کے مطابق بنایا ہوا تھا ان کو حکم ربانی تو ہوا نہیں ان کا اپنا یہ خیال تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غربی جانب شرف وحی وکلام حاصل ہوا کما قال تعالیٰ: مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلٰى مُوسَى الْأَمْرَ بنا بریں ہمارا قبلہ اسی جانب زیادہ موزوں ہے اور نصاریٰ نے بیت المقدس کی مشرقی جانب کو قبلہ اختیار کیا۔ اس لیے کہ وہ یہ خیال رکھتے تھے کہ بی بی مریم (علٰی نبینا وعلیها السلام) جب شہر سے نکلیں تو بیت المقدس کی شرقی جانب گئیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا اور مومن صرف اللہ کی اطاعت سمجھ کر اور اس کا فرمان مانتے ہوئے قبلہ کعبہ کی جانب منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور اہل اسلام اپنی طرف سے کسی جہت کا یقین نہیں کرتے اور یہ قبلہ خلیلی بھی ہے اور اسے مولد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف بھی حاصل ہے۔

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ سیدھے راہ کی طرف جسے چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے یعنی بیت المقدس کی طرف اور کبھی کعبہ کی جانب۔ اسے استقامت سے اس لیے موصوف کیا گیا ہے کہ یہ حکمت ومصلحت پر مشتمل ہے۔

ف: بعض ارباب حقیقت فرماتے ہیں کہ یہود نصاریٰ ومنافقین کو بیوقوف اس لیے کہا گیا کہ دین واسلام کی حقیقت نہ سمجھنے سے ان کے عقول پر پردے آگئے ہیں۔ اگر انہیں حق سمجھنے کا کچھ حصہ نصیب ہوتا تو مومنوں کی طرح مخلص ہوتے اور اگر ان کے عقول صحیح وسالم ہوتے تو وہ آیات سے صحیح استدلال کرتے اور تحویل قبلہ کا انکار بھی اس لیے کر بیٹھے کہ وہ خود جہت کے پابند تھے اور انہیں توحید کی معرفت نہ تھی کہ کل جہات اسی ذات کے لئے ہیں۔

عارف جامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

جہاں مرآت حسن شاہد ماست   فشاہد وجہہ فی کل ذرات

ترجمہ: یہ جہاں ہمارے محبوب کا آئینہ ہے اسی لیے عارف ہر شے سے اسی کا مشاہدہ کرتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ یہ اشارہ متقدم کے مفہوم کی طرف ہے۔ جس طرح ہم نے تمہیں راہِ مستقیم کی ہدایت بخشی اسی طرح جَعَلْنٰكُمْ ہم نے تمہیں بنایا۔

سوال: كَذٰلِكَ میں کاف خطاب مفرد کا اور جَعَلْنٰكُمْ میں جمع کا اس کی کیا وجہ ہے حالانکہ ہر دونوں میں مومنین مراد ہیں؟

جواب: یہاں صرف حاضر و غائب کا فرق بتایا ہے۔ اُمَّةً وَّسَطًا یعنی ہم نے تمہیں پسندیدہ امت بنایا۔ چونکہ اوسط ہر لحاظ سے محفوظ ہوتا ہے اور چونکہ اطراف اسے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں اسی لیے وہ ہر دکھ و تکلیف سے بچا رہتا ہے۔

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ تا کہ تم لوگوں پر قیامت میں گواہی دو کہ واقعی رسل علیہم السلام کو احکام الٰہی پہنچا چکے۔ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا تم پر گواہی دیں۔

سوال: جب شاہد کی شہادت سے ضرر مقصود ہو تو اس وقت علیٰ سے متعدی ہوتا ہے اور جب اس کی شہادت سے نفع مطلوب ہو تو اس وقت لازم سے متعدی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: شَهِدَ لَهٗ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی صفائی بیان فرمائیں گے اور ان کی شہادت کی اہلیت بتائیں گے تو یہ شہادت ان کے مفید ہوگی۔ بہتر یوں تھا کہ کہا جاتا: وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ لَكُمْ شَهِيْدًا۔

ف: بخلاف امت کی شہادت کے کہ امم کو اس امت کی شہادت سے ضرر ہوگا اسی لیے وہاں پر شہدا کے بعد علیٰ کا آنا اپنے محل میں ہے۔

جواب: الشهيد بمعنی الرقيب المطلع ہے۔ اس بنا پر اس کا علیٰ سے متعدی ہونا صحیح ہے۔ شهيد الرقيب والمطلع کے معنی کو اس لیے متضمن ہے کہ کسی کی صفائی یا عدالت بیان کرنے میں ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کے حال سے مطلع ہو۔ کیونکہ وہ اگر ان کے کردار سے بے خبر ہے تو پھر تزکیہ و عدالت اور صفائی کا کیا معنی اگر وہ اس کی صفائی و عدالت سے واقف ہے تو اس کی صفائی بیان کرے گا ورنہ خاموشی اختیار کرے گا۔

سوال: عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا میں "صلہ" یعنی عَلَيْكُمْ مقدم کیوں ہے؟

جواب: کیونکہ ان کی عدالت و تزکیہ کی شہادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص ہے اگرچہ آپ

دیگر انبیاء علیھم السلام کی تبلیغ کی شہادت اور منکرین کی تکذیب کے بھی شاہد ہیں لیکن امت کی تعدیل وتزکیہ صرف آپ نے ہی فرمایا ہے گویا یہ حصر حقیقی ہے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو ایک جگہ جمع فرما کر امم سابقہ کے کفار کو فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی حکم سنانے والا آیا تھا وہ انکار کرتے ہوئے کہیں گے یا اللہ ہمارے پاس نہ تو کوئی بشیر آیا اور نہ نذیر پھر اللہ تعالیٰ انبیاء علیھم السلام سے پوچھیں گے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ انبیاء علیھم السلام کہیں گے یا اللہ کفار جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم نے تیرے احکام مکمل طور پر پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیھم السلام کو فرمائے گا اپنی صفائی کے گواہ پیش کرو۔ حالانکہ اسے خوب معلوم ہے صرف حجۃ قائم کرنے کی بناء پر ایسے ہوگا۔ انبیاء علیھم السلام کی گواہی کے لئے امت محمد یہ علی صاحبہ السلام حاضر ہوگی اور گواہی دے گی کہ واقعی یا اللہ انبیاء علیھم السلام تیرے احکام اپنی امتوں کو پہنچا چکے۔

امم سابقہ کے کفار کہیں گے یا اللہ انہیں کیسے معلوم ہوا یہ تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ امت محمد یہ علی صاحبہ السلام سے سوال کیا جائے گا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا تو وہ عرض کریں گے کہ یا اللہ تو نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور ان پر کتاب نازل فرمائی اس میں انبیاء علیھم السلام کی تبلیغ کا ذکر بھی تھا اور تو اپنی بات میں صادق ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے۔ آپ سے امت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ آپ بھی اپنی امت کی صفائی پیش فرمائیں گے اور ان کے صدق کی گواہی دیں گے اس کے بعد کفار کو داخل ہونے کا حکم صادر ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ ارباب حقیقت فرماتے ہیں کہ امت کا لوگوں پر شہادت دینے کا معنی یہ ہے کہ امت کو ادیان سابقہ کے حقوق پر نور توحید کی وجہ سے آگاہی حاصل تھی اور ان کو ہر دین کے حقوق کا علم تھا اور ان کے باطل کو بھی جانتے تھے۔ لیکن وہ باطل کو حق سے تعبیر کرتے حالانکہ وہ حق نہیں بلکہ وہ ان کے نفوس کے مخترعات ہیں جسے دین کی تحقیق نصیب ہوا سے تمام ادیان کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ خصوصا دین اسلام جسے حق اعظم کہا جائے تو بجا ہے۔

ف: حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کا معنی یہ ہے کہ رسول کو ہر دیندار کے دین کا علم ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے دین کی حقیقت کیا ہے اور اس حجاب کو بھی جانتے ہیں کہ جس سے وہ اپنے دین کے کمال

سے محجوب ہے اور آپ اپنی امت کے گناہوں کو اور ان کے ایمان کی حقیقت کو اور اعمال کو نیکیاں ہوں یا برائیاں اور ان کے اخلاق اور نفاق کو خوب جانتے ہیں۔[1] اور آپ کی امت کو نبی علیہ السلام کے نور کے صدقہ تمام امت کے گذشتہ امور بخوبی معلوم ہیں۔

ف: بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو آخر الامم بنایا ہے صرف اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو شرف بخشنے کی بنا پر ہے کیونکہ اگر ہم ان سے پہلے ہوتے تو ہمیں قبروں میں ان کا انتظار کرنا پڑتا جیسے اب وہ قبروں میں ہمارے لئے منتظر ہیں نیز ہم اس لئے آخر میں آئے تا کہ قیامت میں ان کے گواہ بنیں۔ یہ بھی ایک ہماری شرافت کی دلیل ہے اور اس امت کی بزرگی صرف یہی ایک دلیل کافی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے علماء کرام کے متعلق فرمایا: عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء جیسے ہیں۔

حکایت: امام راغب اصفہانی علیہ الرحمہ محاصرات میں تحریر فرماتے ہیں کہ صاحب حزب البحر نے فرمایا کہ ایک روز میں مسجد اقصیٰ میں سو رہا تھا کہ خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ مسجد اقصیٰ کے باہر حرم شریف کے وسط میں ایک تخت بچھایا گیا اور بڑی مخلوق جمع ہو رہی ہے۔ میں نے پوچھا یہ جماعت کون ہے؟ مجھے کہا گیا یہ انبیاء اور رسل علیہم السلام کی جماعت ہے۔ یہ اس لئے جمع ہو رہے ہیں تا کہ حضور سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حسین حلاج سے جو غلطی شرعی واقع ہوئی اس کے بارہ میں سفارش کریں۔ جب میں نے تخت کو دیکھا تو اس پر صرف ہمارے نبی پاک شہ لولاک سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں اور دیگر سادات انبیاء علیہم السلام جیسے ابراہیم و موسیٰ و نوح علیہم السلام نیچے زمین پر تشریف فرما ہیں۔ میں وہاں پر ٹھہر گیا اور ان کے پیارے کلام سننے کا منتظر ہو گیا۔ اس مجمع انبیاء علیہم السلام میں حضرت موسیٰ علیہم السلام بولے اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر عرض کیا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام جیسے ہیں آپ ان میں ایک تو ہمیں دکھائیں۔ ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ ہیں۔

[1]: کذا قال الشاہ عبد العزیز الدھلوی فی تفسیرہ فتح العزیز فی ھذا المقام۔

حضرت موسیٰ علیہم السلام نے امام غزالی سے ایک سوال کیا۔ امام غزالی نے اس کے دس جواب دیئے۔
حضرت موسیٰ علیہم السلام نے فرمایا کہ سوال کے مطابق جواب ہونا چاہیے میں نے سوال تو ایک کیا ہے لیکن آپ نے دس جواب دیئے۔ امام غزالی نے عرض کی: حضور! یہی اعتراض تو پہلے آپ پر وارد ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے پوچھا تھا: وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى (تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ) آپ کو جواب میں صرف کہنا تھا ھِیَ عَصَایَ (یہ میرا عصا ہے) لیکن آپ نے بڑا طویل جواب دیا۔ امام شاذلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے نبی سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند قدر اور شان وشوکت کو دیکھ رہا تھا۔ سبحان اللہ! آپ اکیلے ہی تخت پر ہیں اور دیگر انبیاء خلیل وکلیم اور عیسیٰ علیہم السلام نیچے ہیں۔ ابھی میں اس حال میں تھا کہ کسی نے میرے سینہ پر پاؤں مارا جس سے میں جاگ اٹھا۔ امام بوصیری علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے:

فَانْسُبْ اِلٰى ذَاتِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ

وَانْسُبْ اِلٰى قَدْرِهٖ مَاشِئْتَ مِنْ عَظَمٍ

اَللّٰهُمَّ يَسِّرْ لَنَا شَفَاعَتَهٗ

ترجمہ: آپ کی بزرگی کے لئے جتنا چاہو بیان کرو آپ کی قدر ومنزلت جتنا دل چاہے ظاہر کرو۔ اے اللہ! ہمیں آپ کی شفاعت نصیب فرما۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ، اَلْقِبْلَةَ، جَعَلْنَا کا مفعول اوّل ہے۔ اَلَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا یہ جَعَلْنَا کا مفعول ثانی ہے اور الجھۃ موصوف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی: الجهة التي كنت عليها۔ اس سے مراد کعبہ ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر مامور تھے اور کعبہ شریف مکہ معظمہ میں ہے پھر جب آپ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو آپ کو اس پتھر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا جو بیت المقدس میں تھا اور اس مقام سے ملائکہ آسمان کی طرف چڑھتے پھر چند روز بعد کعبہ شریف کی طرف حکم دیا گیا۔ اب معنی یہ ہوا کہ ہم نے آپ کو جس طرح کا حکم دیا ہے یعنی وہ جہت کہ جس کی طرف آپ نے متوجہ ہونا ہے ہم نے آپ کو صرف اس لیے لوٹایا ہے۔

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ تا کہ ہمیں معلوم ہو کہ کون حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ اور کون اپنے گٹوں کی طرف پھر جاتا ہے عقب قدم کی طرف کو کہتے ہیں اور گٹوں کی

طرف لوٹنا ارتداد سے استعارہ ہے اور دین سے باطل کی طرف پھر جانا مقصود ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ ہمارا علم مظاہر رسول اور مومنین پر ظاہر ہو جائے اور واضح ہو جائے کہ ان میں صادق الاسلام کون ہے اور متردد کون۔ جو کہ معمولی سبب سے دین سے ہٹ جاتا ہے اور اس کا ایمان کمزور پڑ جاتا ہے اس کا معنی ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے قبل نہیں جانتا تھا اور اب جان لیا ہے کیونکہ وہ تو ازل سے جانتا ہے اور ان کے تمام حالات جو کسی وقت بھی واقع ہونے والے تھے تمام کو جانتا تھا اسی طرح ہر وہ شخص جوان حالات کو جانتا ہے اسے بھی یہ علم ظاہر ہوتا ہے۔

ف: اس تقریر کے موافق ہے جو کہا جاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین جان لیتے ہیں اس لیے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے کیونکہ وہ اس کے خواص اور اس کے قرب والے ہیں (الحمد للہ یہی اہل سنت کہتے ہیں اور یہی ہمارا عقیدہ ہے اویسی غفرلہ) یہ مطلب امام قاشانی کا اختیار کردہ ہے جو انہوں نے تاویلات میں بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے اس مطلب کے ماسوا کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ف: اِلَّا لِنَعْلَمَ میں علم بمعنی معرفت ہے اب معنی یہ ہوا کہ اس کی معرفت ہو کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرتا ہے علم کو معرفت لینے سے مفعول ثانی کی ضرورت نہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کو معرفت سے موصوف نہیں کیا جاتا اَللّٰہُ عَارِف " نہیں کہا جا سکتا جب ایسے ہے تو پھر یہاں پر لِنَعْلَمَ بمعنی لِنَعْرِفَ کیسے مانا جائے؟

جواب: اللہ تعالیٰ معرفت سے اس وقت موصوف نہیں مانا جاتا ہے جب کہ معرفت کا معنی اِلَّا دَرَاکَ بمسبوق بالعدم کیا جائے۔ اگر معرفت بمعنی ادراک مطلق ہو کہ اسے دوسرے مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی اس وقت اللہ تعالیٰ پر معرفت کا اطلاق جائز ہے۔

ف: مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ کے فاعل سے حال ہے یعنی ہم معلوم کر لیں کہ کون اہل ایمان سے علیحدہ ہوتا ہے۔

وَاِنْ كَانَتْ یعنی قبلہ موحولہ لَكَبِيْرَةً سخت اور ثقیل ہے اس کے لئے جو قبلہ منسوخ سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ انسان کو ہر وہ بات سخت محسوس ہوتی ہے جس سے متوجہ ہو کر پھر اس سے توجہ ہٹائی جائے۔

ف: ان مخففہ میں من المثقلہ ہے اور اس کا اسم محذوف ہے یعنی القبلہ اور لام جو لَكَبِيْرَةً " پر داخل ہے یہ لام فارقہ مابین ان نافیہ اور ثقلیہ کے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں واقع ہے۔ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۔

اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ ہاں ان لوگوں پر یہ ثقیل نہیں ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے احکام کے حکم کی طرف انہیں راہ دکھائی ہے اور انہیں عرفان دیا ہے کہ جن احکام کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مکلف بنایا ہے ان میں کوئی حکمت مضمر ہے اگرچہ انہیں ان احکام کی حکمت معلوم بھی نہ ہو سکے۔ پھر بھی انہیں یقین ہوتا ہے سعادت مندہ وہ ہے جو اپنے رب حکیم کے احکام کی فرمانبرداری کرے اور وہ بڑا بد بخت ہے جو اپنے رب حکیم کی بے فرمانی کرے اس کے بعد بیان فرمایا کہ وہ لوگ اس ثابت قدمی اور فرمانبرداری پر اجر و ثواب کے مستحق ہیں اور ان کا کوئی عمل ضائع ہونے والا نہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ نہیں کہ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ تمہاری ثابت قدمی اور اس تصدیق کو ضائع کرے جو کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کو مانا اور ان میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کرتے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ بیشک اللہ تعالیٰ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رؤف سے متعلق ہے لَرَءُوْفٌ لوگوں کے لئے بڑی رحمت والا ہے کہ انہیں اس قبلہ کعبہ کی طرف منتقل فرمایا ہے جو ان کے لئے یہی زیادہ مناسب رہے رَّحِيْمٌ رحم کرنے والا ہے کہ ایمان کی وجہ سے ان کے گناہ بخشا اور انہیں رزق دیتا ہے۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

فرو ماندگاں را برحمت قریب   تضرع کناں را بدعوت مجیب

(عاجزوں کو اپنی رحمت کے لحاظ سے قریب اور عاجزی کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے)

حکایت: سیدنا داؤد علی نبینا وعلیہ السلام کے زمانہ میں ایک بڑا ظالم کافر تھا اسے گرفتار کر کے سولی پر چڑھایا گیا۔ عشاء کے وقت اسے سولی پر چھوڑ کر تمام لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور یہ اکیلا سولی پر چھوڑ دیا گیا اس نے اپنے معبود باطلہ کو پکارا لیکن کوئی جان رہائی نہ ہوئی پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے نہایت زاری اور انکساری سے عرض کیا کہ الٰہ العالمین مجھے اس پھانسی سے نجات دے۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا اس نے اپنے معبودوں کو پکارا انہوں نے اس کی کیا مدد کرنی تھی اب وہ مجھے پکار رہا ہے مجھے اس کے حال پر رحم آتا ہے اسے بآرام سولی سے اتار کر زمین پر پہنچایئے۔ چنانچہ جبریل علیہ السلام نے حکم بجالایا صبح کو لوگ آئے دیکھا تو باعافیت اور زندہ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے

اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے الہ العالمین ماجرا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو بندہ میرے سامنے عاجزی وانکساری کرے مجھے اس کے حال پر رحم آتا ہے اس نے عاجزی کی میں نے اس کی عاجزی سے اسے چھوڑ دیا ہے اگر میں ایسے نہ کرتا تو پھر میرے اور اس کے باطل معبودوں میں کیا فرق رہتا۔

تفسیر صوفیانہ ایک جماعت تحویل قبلہ کے وقت مرتد ہوگئی اس کی وجہ وہی تھی کہ ان کا تعلق ماسوی اللہ سے تھا اور فنا فی اللہ نہیں تھے اور اس قضا پر راضی نہ ہوئے جوان پر آنے والی تھی انہیں میلان الی الباطل نے گھیر لیا اور گمراہی کے سیلاب میں بہہ گئے اور وہ لوگ جو ازل سے سعادت مند تھے نہ وہ بیت المقدس کے خوگر تھے اور نہ ہی انہیں کعبہ سے غرض تھی بلکہ وہ تو اپنے مالک حقیقی کے عاشق تھے۔ اسی لیے مشیت ایزدی نے انہیں ارتداد سے بچالیا اور ارادہ الٰہی کی شہد سے نوازے گئے جس سے انہیں دائمی سرور وصفا نصیب ہوا۔ حضرت صائب مرحوم نے فرمایا:

مہیانے فنا از علائق نیست پروانے　　　نیندیش غبار آنکس کہ دامان بر کمر دارد

(فانی فی اللہ کو علائق کی پرواہ نہیں ہوتی اسے گرد کیا پہنچے گی جس کا دامن غبار سے اونچا ہو)

حکایت: سیدنا ابوالقاسم جنید بغدادی قدس سرہٗ کو لوگوں نے عشق حقیقی میں دیکھ کر سمجھا کہ وہ یا تو مریض ہیں یا مجنون ہوگئے ہیں۔ اس لیے انہیں ہسپتال میں داخل کرادیا۔ ان کے معتقدین زیارت کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے عرض کی ہم آپ کے غلام ہیں۔ آپ نے سنتے ہی انہیں پتھر مارے جس سے وہ لوگ آپ سے بھاگے اور کہنے لگے کہ آپ پر جنون کا غلبہ ہے۔ آپ نے سن کر فرمایا کہ دعوی محبت کا کرتے ہو اور تمہارا عمل اس کے برعکس ہے کیونکہ محب تو وہ ہوتا ہے جو محبوب کی ہر دی ہوئی تکلیف کو دل وجان سے قبول کرے۔

ف: انبیاء کرام علیہ السلام واولیاء عظام کے ہاں مصائب حلوہ سے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں اسی لیے وہ صبر ورضا کا جام پی لیتے ہیں اور مشکلات ومشاہدات کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور حال وقال سے توحید اور ذکر حق میں مشغول رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ غیر اللہ کی طرف التفات حتی کہ طعام کے لقمہ اٹھانے کو بھی عبث اور مانع سمجھتے ہیں اسی لیے وہ حضرات فنا وبقاء سے اپنے اعلیٰ مقاصد پر فائز المراد ہوتے ہیں۔

حکایت: سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام نے جب کہا: رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ

تو مجھے فانی جسم میں نہیں دیکھ سکے گا۔ صبر کیجئے تا کہ میں آپ کو بقا عطا کروں پھر مجھے دیکھ لینا اے موسیٰ دس سال تو نے شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائی ہیں کیا صرف چالیس دن کی عبادت سے مجھے دیکھنا چاہتا ہے اس کے بعد انہیں اللہ تعالیٰ نے چن لیا اور جو کچھ عنایت کرنا تھا عطا فرما دیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام واپس لوٹنے لگے تو راستہ میں ایک بہت بڑے اونچے پہاڑ کو دیکھ کر متعجب ہوئے کہ یہ پہاڑ کہاں سے آ گیا۔ پہاڑ بولا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تم میرے اندر بکریاں چراتے تھے آپ کے سر پر ٹوپی ہوتی تھی اور تمہارے ہاتھ میں عصا ہوتا تھا اب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی رسالت سے اور کلام سے نوازا ہے اور مجھے بھی اپنے فضل و کرم سے بلند و بالا بنا دیا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ وَاتِّبَاعِ رَسُوْلِكَ الْكَرِيْمِ وَاهْدِنَا اِلٰى كَعْبَةِ ذَاتِكَ وَالا نجذاب اِلَيْكَ وَالْوُصُوْلُ اِلٰى مُشَاهَدَتِكَ آمين يا رب العالمين بِحُرْمَةِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ. صلى الله عليه وعلى آله اجمعين.

ترجمہ: اے اللہ! ہمیں سیدھے راستہ پر چلا اور اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نصیب فرما اور اپنی ذات کے کعبہ کی توجہ عطا فرما اور اپنی طرف میلان اور اپنے مشاہدہ تک پہنچنے کی توفیق نصیب فرما۔

اس سے ثابت ہوا کہ جہاں محبوبانِ خدا کا گزر ہوتا ہے وہ جگہ اور وہ مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبارک و مقدس بن جاتا ہے اگرچہ ہمیں اس کا علم نہ ہو لیکن حقیقت میں نگاہوں میں اس کے متبرک ہونے میں شک نہیں اور جہاں ان کا مستقل قیام ہو اس کی بلندی شان کا کیا کہنا (اویسی غفرلہ)

اس آیت سے حدیث **كلهم يطلبون رضائي وانا اطلب رضاك يامحمد (صلى الله عليه وسلم)** جس کا ترجمہ امام اہلسنت مجدد دین و ملت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے:

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم — خدا چاہتا ہے رضائے محمد (ﷺ)

آیت خداوند کریم سے اعلیٰ حضرت بریلوی قدس سرہٗ کے شعر مذکور کی تائید ہوئی اور یہ شعر ہے **كلهم يطلبون رضائي الخ** کا ترجمہ۔ اگرچہ یہ روایت سند میں ضعیف ہو تب بھی باصطلاح محدثین معناً صحیح ہوگی اس لیے کہ اصول حدیث کا مسلمہ قانون ہے کہ جو روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہو اگر اس کا معنی آیت قرآن یا کسی دوسری صحیح حدیث سے مؤید و موثق ہو جائے تو وہ روایت معنیً صحیح کہلاتی اور حدیث مذکورہ آیت مذکورہ کے علاوہ

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (عنقریب تیرا رب تمہیں اتنا عطا فرمائے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے) سے موثق ہے اور احادیث مبارکہ تو اس بارہ میں بکثرت ہیں۔ چند مندرجہ ذیل ہیں۔

خصائص کبریٰ میں ہے کہ:۔

۱:۔ حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محمد راضی نہیں ہوگا جب تک اس کی امت کا ایک آدمی بھی دوزخ میں رہے گا۔

۲:۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں راضی نہیں ہوں گا جب تک میرا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوگا'' (تفسیر نیشاپوری حاشیہ طبری جلد ۱۲، صفحہ ۱۰۹)

۳:۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی آیت مذکورہ کے تحت یہی مروی ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ ان کا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوگا۔

(تفسیر در منثور جلد ۶ صفحہ ۳۶۱ از امام سیوطی علیہ الرحمہ)

سبحان اللہ! کیا مقام ناز و شان محبوبیت ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے حبیب کریم کو اتنا عطا فرمانے کا وعدہ فرماتا ہے کہ حبیب راضی ہو جائیں اور حبیب پاک رحمت خداوندی وا پنی شان محبوبیت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ میں راضی نہ ہوں گا جب تک ایک امتی بھی دوزخ میں رہے۔

۴:۔ سیدنا حسان صحابی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی شان محبوبیت کی بناء پر حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا ہے کہ آپ ہر عیب سے مبرا پیدا کئے گئے ہیں۔ كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ۔ گویا کہ جیسا آپ نے چاہا آپ کے خالق نے ویسا ہی آپ کو بنا دیا ہے۔

۵:۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی حضور کی بارگاہ میں اسی طرح عرض کی کہ مَا اَرٰى رَبَّكَ اِلَّا يُسَارِعُ فِىْ هَوَاكَ۔ یارسول اللہ! میں آپ کے رب کو نہیں دیکھتی مگر حضور کی خواہش پورے کرنے میں جلدی و شتابی کرتا ہوا۔ (بخاری شریف جلد ۳ صفحہ ۲۴۵)

۶:۔ بروز حشر بھی اسی شان محبوبیت درجائے مصطفیٰ کا یوں مظاہرہ ہوگا کہ جب حبیب اپنے رب کریم کے حضور سربجد[illegible] گے تو رب کریم فرمائے گا:

یا محمد ارفع راسک قل تسمع سل تعطہ اشفع تشفع

اے محمد اپنا سر سجدہ سے اٹھاتو جو کہے گا سنا جائے گا جو مانگے گا دیا جائے گا جو شفاعت کرے گا قبول ہو گی۔

(مسلم شریف جلد ا صفحہ ۱۰۹)

۷:۔ یہاں تک کہ رب کریم کو اپنے حبیب کریم کی رضا اتنی مطلوب ہے کہ بعض دفعہ رب کریم نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ فرمایا۔ فرماتے ہیں: اِنَّ رَبِّیْ اِسْتَشَارَنِیْ فِیْ اُمَّتِیْ مَاذَا اَفْعَلُ بِهِمْ

(الحدیث امام احمد، بن عساکر، عن حذیفہ رضی اللہ عنہم)

ترجمہ: بیشک میرے رب نے میری امت کے بارے میں مجھ سے مشورہ طلب فرمایا کہ میں ان کے ساتھ کیا کروں۔

سبحان اللہ! شان محمدی و مقام محمدی اور رضائے مصطفیٰ کی کیا بات ہے مگر جن بے دین اور گستاخ لوگوں کا عقیدہ باطلہ ہو کہ نبی کریم ہمارے جیسا بشر ہے ان کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجئے۔ رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا اور ان کی خواہش کچھ نہیں چلتی وغیرہ۔ ذالک من الخرافات۔ ایسے بدنصیبوں کو شان محمدی و رضائے مصطفیٰ کے جلووں کی کیا خبر۔

آنکھ والا تیرے جلووں کے نظارے دیکھے ۔۔۔ دیدکور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے

۸:۔ حدیث یطلبون شیخ محقق علامہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے نقل فرمایا کہ خداوند کریم فرماتا ہے:

"اے محمد! سب میری رضا کے طالب ہیں اور میں تیری رضا کا طالب ہوں" **(تکمیل الایمان صفحہ ۲۲)**

شیخ عبدالرحمٰن صفوری نے علامہ ابن جوزی سے نقل کیا ہے کہ "بیشک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی فرمائی کہ اے محمد! سب میری رضا چاہتے ہیں اور میں تیری رضا چاہتا ہوں" **(نزہۃ المجالس جلد ۲ صفحہ ۱۳۵)**

۹:۔ مولوی ثناء اللہ امرتسری کے استاذ مولوی محمود حسن اور ان کے استاذ پیر مولوی رشید احمد گنگوہی کے فتاویٰ کا سوال و جواب ملاحظہ ہو۔

سوال: ایک روایت بطور حدیث قدسی کے اس ملک میں مشہور ہے۔ بعض علماء کو دیکھا ہے کہ خطبہ میں بھی پڑھتے ہیں یہاں تک کہ تکمیل الایمان تصنیف شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ میں بھی مندرج ہے"

کلهم یطلبون رضائی وانا اطلب رضاک یامحمد صلی اللہ علیہ وسلم

جواب: اس کی صحت و سند بندہ کو معلوم نہیں اور اس کے معنی آیت۔ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی کے لئے

جائیں تو معنی صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رشیدیہ مکمل صفحہ ۴۷)

۱۰:۔امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ نے بھی مذکورہ روایت والفاظ نقل فرمائے ہیں اور لکھا ہے کہ انہ تعالیٰ یفعل کل مایرضاء الرسول (کہ اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو اس کا رسول چاہتا ہے) (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۱۰۶)

۱۱:۔حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم قیومی نے لکھا ہے کہ حدیث قدسی میں آیا ہے اطلب رضاک یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (مکتوبات خواجہ صفحہ ۳۷)

امام نسفی نے روایت نقل فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلیم اللہ اور حبیب اللہ میں فرق پوچھنے پر رب تعالیٰ نے فرمایا: الکلیم یعمل برضا مولاہ ۔ والحبیب یعمل مولاہ برضاہ ؛

ترجمہ : کلیم اپنے مولا کی رضا پر عمل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی رضا کو پورا فرماتا ہے۔ (نزہۃ المجالس جلد ۲ صفحہ ۱۳۵)

۱۲:۔ملا علی قاری علیہ الرحمہ الباری نے خلیل وحبیب میں فرق نقل کیا ہے کہ خلیل کا فعل اللہ کی رضا کے لئے ہوتا ہے اور اللہ کا فعل اپنے حبیب کی رضا کے لئے ہوتا ہے۔ والحبیب یکون فعل اللہ برضاہ۔

(مرقات شرح مشکوٰۃ جلد ۵ صفحہ ۳۲۹)

قَدْ یہ لفظ جب مضارع پر داخل ہوتا ہے تو بمعنی تقلیل کے لئے آتا ہے اور کبھی تکثیر کے لئے لیکن بطریق استعارہ بوجہ مجانست مابین الضدین کے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ نَرٰی لفظاً مضارع اور معنی ماضی تلاوت کے لحاظ سے متاخر اور معنی کے لحاظ سے مقدم ہے اس لیے کہ قصہ تحویل قبلہ کی اصل بنیاد یہی ہے اب معنی یہ ہوا کہ ہم نے مشاہدہ کیا اور معلوم کیا تَقَلُّبَ وَجْهِكَ آپ کا بار بار منہ پھیرنا اور آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھنا فِی السَّمَآءِ آسمان یعنی ہماری طرف وحی کے انتظار میں۔

تفسیر عالمانہ

شان نزول: حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دل ہی دل میں خیال فرما کر اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے تھے کہ ان کا نماز کے لئے کعبہ کی طرف منہ پھیرا جائے کیونکہ وہ آپ کے داداجان سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ اور اقدام القبلتین ہے۔ علاوہ ازیں اہل عرب کی دعوت الی الاسلام کے لئے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ انہیں اس قبلہ پر فخر اور اسی کو اپنی پناہ گاہ مانتے تھے اور اس کی زیارت کے لئے بار بار حاضر ہوتے اور اسی کا طواف کرتے اسی سے یہودیوں کی مخالفت بھی مطلوب تھی کہ

وہ کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادھر تو ہماری مخالفت پہ تلے ہوئے ہیں اور ادھر ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اگر ہم نہ ہوتے تو انہیں معلوم نہ ہوتا کہ کس طرف منہ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے اسی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا نہیں چاہتے تھے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا: وددت ان اللہ صرفنی عن قبلۃ الیھود الی غیرھا۔

ترجمہ: یعنی میں چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ یہود کے قبلہ سے میرا رخ پھیر کر کسی دوسرے قبلہ کی طرف متوجہ فرمادے۔

جبریل علیہ السلام نے عرض کی میں آپ کی طرح ایک اللہ کا عبد ہوں اور آپ کی اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی عزت ہے آپ خود ہی اپنے رب سے عرض کیجئے یہ کہہ کر جبریل علیہ السلام آسمان کی طرف چلے اور حضور علیہ السلام نے آسمان کی طرف آنکھیں لگا دیں۔ اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل کوئی نیا پیغام لائیں۔ یعنی جس کا میں نے عرض کیا ہے اس پر جبریل علیہ السلام یہی آیت لائے۔

ف: قرآنی احکام میں سب سے پہلا ناسخ ومنسوخ یہی حکم ہے کہ پچاس نمازوں سے پانچ ہوئیں۔ پھر تحویل قبلہ کا نسخ ہوا کہ کعبۃ اللہ سے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا اور یہ نسخ مکہ معظمہ میں ہوا۔ اس سے مشرکین کی آزمائش مطلوب تھی یہ بھی ان کے بعد جب کہ نمازی کو حکم تھا کہ جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اس کے بعد پھر بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم ہوا اور وہ بھی مدینہ طیبہ میں اس سے یہود کا امتحان مقصود تھا۔

(کذا فی التفسیر الفاتحہ للمولیٰ الفناری)

فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً یعنی بخدا ہم تجھے وہی قبلہ عنایت فرمائیں گے یا ہم تمہیں اس طرف منہ کرنے کی قدرت دیں گے یہ مشتق ہے ولیتہ کذا ای صیرتہ والیا اور ولی الرجل ولایعہ سے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کوئی کسی سے قدرت پائے یا اس کا معنی یہ ہے کہ تجھے کر دیں گے اسی سمت کی جانب جس کے تم قریب ہونہ کہ بیت المقدس کی سمت کی جانب یہ مشتق ہے۔

قُرِبَهٗ وَدَنَا مِنْهُ وَاَوْلَیْتُهٗ اِیَّاهُ اَیْ اَدْنَیْتُ۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کو کسی کے قریب کر دیا جائے۔

تَرْضٰىهَا جس قبلہ سے آپ راضی ہوتے ہیں یہ محبت واشتیاق سے مجاز ہے کیونکہ حضور علیہ السلام بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے غصہ میں نہیں تھے اور نہ ہی اسے مکروہ سمجھتے اور نہ ہی اس سے ناراض تھے۔ اب تَرْضٰىهَا کا معنی ہوگا تُحِبُّهَا وَتَشُوْقُ اِلَيْهَا یعنی آپ اس قبلہ کی محبت اور اس کا اشتیاق رکھتے ہیں نہ اس لیے کہ اس سے آپ کی نفسانی خواہش یا طبعی غرض ہے بلکہ مقاصد دینیہ کی وجہ سے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے موافق ہے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اپنا چہرہ اس طرف کیجئے جو کعبہ کی طرف کے قریب ہے۔ وجہ سے یہاں پر تمام بدن مراد ہے کیونکہ مکلف پر ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام بدن کو قبلہ کی طرف متوجہ کر دے نہ صرف اپنا چہرہ۔

سوال: چہرہ کی تخصیص کس لیے؟

جواب: چونکہ چہرہ بدن کا اصل ہے اور قاعدہ ہے جب متبوع کا ذکر آجائے تو توابع خود بخود مذکور ہو جاتے ہیں

ف: مسجد حرام سے متبادر وہی بڑی مسجد مراد ہوتی ہے جس میں کعبہ مکرمہ ہے اور حرم سے وہ مقام مراد ہے جس میں جنگ وجدل حرام ہے یا اسے اس لئے حرام کہتے ہیں کہ ظالموں پر حرام ہے اور ان کے لئے ممانعت ہے کہ وہ اس مقام پر ظالمانہ تصرف کریں۔

سوال: لفظ کعبہ کی بجائے مسجد حرام کا نام کیوں لیا گیا؟

جواب: اس طرف اشارہ ہے کہ نماز کے لئے کعبہ کی جہت ہی کافی ہے اور یہی مذہب حنفیہ اور شافعیہ کا ہے کیونکہ جو بعید ہے اسے کعبہ کے عین کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا حرج بلکہ ناممکن ہے بخلاف قریب کے وہ عین کعبہ کی طرف توجہ کرتا ہے۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ یعنی زمین کے جس مقام پر بھی تم گزر رہے ہو، دریاؤں میں یا جنگلوں میں، مشرق میں یا مغرب میں، جب بھی تم نماز کا ارادہ کرو تو فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ اس کی طرف تم اپنے چہرے پھیر دو۔ کیونکہ نفخ صور تک تمہارا وہی قبلہ ہے اس میں جمیع مومنوں کو حکم دیا گیا ہے بعد اس کے کہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا

مسئلہ: آیت کے عموم سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم تمام بندوں کو ہے خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی۔ اس میں امت کو تنبیہ ہے کہ نبی علیہ السلام کی متابعت سب پر لازم ہے۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بیشک وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے ہیں اہل کتاب کے ہر دو گروہ یعنی یہود ونصاریٰ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ تاکہ انہیں معلوم ہو کہ کعبہ کو قبلہ بنانا الحق

حق ہے۔ثابت ہے مِنْ رَّبِّهِمْ ان کے رب کی طرف سے اس لیے ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں گے پہلے وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے پھر ان کا رخ پھیر کر کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوگا۔

مِنْ رَّبِّهِمْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے نہ کہ اسے رسول علیہ السلام نے اپنی طرف سے اختراع فرمایا ہے۔یہ اس لئے کہ ان کا گمان تھا کہ یہ حکم نبی علیہ السلام نے اپنی طرف سے دیا ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو۔یہ خطاب تمام مسلمانوں اور یہود کو ہے اس میں مسلمانوں کو ثواب اور بہترین جزا دینے کا وعدہ ہے اور یہودیوں کو ان کے عناد پر تہدید ہے۔ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ اور اگر آپ اہل کتاب کو تمام آیات لا کر دیں یعنی کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کے متعلق جو کہ حق ہے برہان قاطع پیش کریں مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ تو وہ آپ کے قبلہ کی عناد مکابرۃ تابعداری نہیں کریں گے اور یہ ایک مخصوص گروہ کے حق میں ہے جنہیں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہیں ورنہ بعض ان میں ایسے بھی تھے جو ایمان لائے اور قبلہ کی اتباع بھی کی جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ اور نہ ہی آپ ان کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے ہیں ان کے طمع کو پورے طور ختم کرنا مقصود ہے جبکہ وہ اسی امید میں تھے کہ حضور علیہ السلام ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آئیں گے اور کہتے تھے کہ اگر نبی علیہ السلام ہمارے قبلہ پر ثابت رہے تو ہم سمجھیں گے جس نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم منتظر تھے وہ یہی ہے اس لئے انہیں طمع تھا کہ حضور علیہ السلام بیت المقدس کی طرف رجوع فرمائیں گے۔ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ اور نہ ہی ان کے بعض ایک دوسرے کے تابع ہونے والے ہیں اس لئے کہ یہود کا قبلہ بیت المقدس کا پتھر اور نصاریٰ کا قبلہ مطلع الشمس ہے۔ ان کے آپس کے توافق کی امید نہیں جیسے ان کا آپ کے ساتھ موافق ہونا ناممکن ہے کیونکہ ہر گروہ اپنے خیالی قبلہ پر مضبوط ہے۔پھر ان میں جو حق پر ہے وہ موقف سے کیسے ہٹ سکتا ہے جبکہ اس کے پاس اپنے خیالی دلائل وبراہین ہیں اور باطل تو اپنے غلط ارادوں سے ہٹ سکتا ہی نہیں اس لئے جبکہ وہ عناد سرکشی میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ۔اور اگر تم ان کی خواہشات کی تابعداری کرو گے۔

ف: اَهْوَآءَ ھوی کی جمع ہے، بمعنی ارادہ ومحبت یعنی اگر آپ ان کے ارادوں کی بایں طور موافقت کریں کہ ان

کے قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھیں تا کہ وہ خوش ہو کر آپ پر ایمان لائیں۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ بعد اس کے کہ آپ نے وحی سے معلوم کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قبلہ یہی کعبہ ہے۔ اِنَّكَ اِذًا بیشک تم اس وقت یہ "اذاً" جواب و جزء کا کہلاتا ہے اِنَّ کے اسم اور اس کی خبر کے درمیان کی تاکید و تقریر جوان کے مابین نسبت ہے کے لئے واقع ہوا ہے لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ بہت بڑے ظلم کے ارتکاب کرنے والوں سے ہو جاؤ گے یہ جملہ شرطیہ فرضیہ ہے اس میں قبلہ کعبہ کے لئے برانگیختہ کرنا اور حق پر ثابت قدم رکھنا مقصود اور سامعین کو لطف و کرم کا اظہار بھی ہے اور انہیں خواہشات نفسانی سے دور رہنے کی تلقین بھی اس لئے کہ جب یہ بات ایسی ذات سے کی جا رہی ہے کہ اس سے ایسے امور کا صدور ممتنع ہے اور نہ ہی ان کی یہ شان ہے کہ وہ منہی عنہ کا ارتکاب کریں بلکہ ان سے بغرض المحال ایسا معاملہ کیا جا رہا ہے تو پھر اس کا کیا حال ہوگا جو برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تازہ کن ایمان نہ آن گفت زبان　　اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

اے دل میں خواہش نفسانی پر دل لگانے والے ایمان کو تازگی کے اسباب تلاش کیجئے اور صرف زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں بنے گا حقیقی طور جدوجہد کیجئے اس لئے کہ جب تک خواہش نفسانی زندہ رہے گی ایمان کی تازگی نصیب نہیں ہوگی۔ خواہش کو بند کرو تو ایمان کا دروازہ کھلے گا)　تا ہوا تازہ است ایمان　　کیں ہوا اخیر قفل آں دروازہ نیست

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ جنہیں ہم نے کتاب دی یعنی فہم و ذکا عطا کیا اس سے ان کے علماء مراد ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے ہیں كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں یعنی حضور اکرم کی رسالت پر کسی قسم کا شک و شبہ نہیں تھا۔

سوال: اَبْنَآءَ کی تخصیص کیوں جب کہ اولاد میں بچیاں بھی تو ہوتی ہیں؟

جواب: بچے بہ نسبت بچیوں کے زیادہ مشہور و معروف ہوتے ہیں علاوہ ازیں بچے آباء کے ساتھ اکثر ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کے قلوب کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

سوال: كَمَا يَعْرِفُوْنَ کی بجائے اَنْفُسَهُمْ کیوں نہ فرمایا اس لئے کہ انسان کو اپنے نفس کی معرفت بہت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت دیگر اشیاء کے۔

جواب: امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں انسان اپنے آپ کو بہت بڑی مدت کے بعد پہنچانتا ہے

بخلاف اپنی اولاد کے انہیں پیدا ہوتے ہی پہچان لیتا ہے۔
وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ اور بے شک ایک گروہ اس سے ان کے اکابر مراد ہیں حق سے انہیں عناد تھا لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ وہ حق چھپاتے ہیں حالانکہ انہیں علم ہے کہ حضور اکرم اور اللہ کا قبلہ ہے ان کے سوا باقی وہ حضرات جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے وہ حق کو ظاہر کرتے ہیں اور اسے چھپاتے نہیں ہاں وہ جہال جو ان میں ہیں نہ انہیں کتاب کی معرفت ہے اور نہ ہی کتاب کے احکام کا علم اسی لئے انہیں اظہار سے واسطہ اور نہ چھپانے سے تعلق۔ وہ تو صرف اپنے آباء کے کفر میں محض مقلد ہیں اَلۡحَقُّ جس پر آپ ہیں اے محمد وہ حق ہے مِنۡ رَّبِّكَ تیرے رب کی طرف سے یہ الحق کی خبر ہے۔ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ نہ ہو جاؤ شک کرنے والوں میں سے مثلاً شک ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا نہ بظاہر یہ خطاب تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کہ وہ شک میں مبتلا نہ ہوں اور شک سے روکنے سے یقین اور طمانیت قلب مقصود ہے۔

تفسیر صوفیانہ امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ انہیں پوشیدہ حسد اور سوا اختیار کرنے مکابرہ پر ابھارا جب کہ انہیں معلوم ہوا کہ ہماری شان و شوکت چھنی جائے گی اسی طرح ہر وہ شخص جو نفس کے ظلمات میں غوطہ زن ہو جب کہ وہ چہرے سے حیا کی چادر ہٹا دیتا ہے تو اس پر کسی قسم کی علامت اثر نہیں کرتی اور نہ اسے انہیں خرابیوں سے کوئی بات دور کر سکتی ہے۔

ف: حضرت الشیخ الشہیر با فتادہ آفندی فرماتے ہیں:۔ ہمارے نزدیک انسان کے تین مراتب ہیں۔
☆......مرتبہ التقلید یہ عوام کا مرتبہ ہے۔ ☆......مرتبہ التحقیق والایقان یہ مجتہدین کو حاصل ہوتا ہے جیسے ائمہ اربعہ اور وہ حضرات جو ان کے ہم پلہ ہوں۔ ☆......مرتبہ المشاہدہ والعیان یہ کاملین کا مرتبہ ہے جو اہل سلوک ہیں انہوں نے فرمایا جس کا نفس گندی عادات سے پاک نہیں ہو سکتا اسے معارف الہیہ نصیب نہیں ہو سکتے اگرچہ وہ علم وعقل کے مراتب میں کتنا ہی با کمال کیوں نہ ہو دیکھئے شیطان نے بوجود عقیل اور صاحب علم ہونے کے تکبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی بے فرمانی کی اس کے دل میں یہی کبر اور حسد تو تھا ہی کہ جس کی وجہ سے مارا گیا یہی حال تھا اہل کتاب کا قبلہ اور حضور نبی کریم ﷺ کے بارے میں حسد و کبر کی وجہ سے مارے گئے اور مبنی بر ازالہ شبہ مخالفین تھا نہ انہیں علم نے فائدہ دیا اور نہ ہی فہم و معرفت نے ان کی اندرونی خباثت نے انہیں ذلیل و خوار کیا اس لئے ضروری ہے کہ انسان تزکیہ نفس اور قلب کی صفائی اور استقامت فی باب الحق میں کوشاں رہے یہاں تک کہ اسے یقین نصیب ہو۔

حکایت: یونس نے اپنے شیخ کی تیس سال نہایت صدق نیت سے خدمت کی اور ان کے ہر حکم کی تعمیل میں پورا

اترا یہاں تک کہ ان کے لنگر کے لئے لکڑیاں اٹھاتے اٹھاتے اس کی پیٹھ پر ورم آگئے باوجود اس کے کہ ایسی تکلیف کسی کے سامنے بیان تک نہ کی ان کے شیخ کی ان پر نظر کرم بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھیوں پر یہ بات گراں گزری از راہ حسد کہنے لگے کہ یہ شیخ کی خدمت صرف اس لئے کرتا ہے شیخ کی لڑکی سے اسے محبت ہے اور یہی بات اپنے شیخ تک پہنچادی۔ جب شیخ نے سن پایا تو ایک دن حضرت یونس لکڑیوں کا گٹھڑا لے کر آئے تو شیخ نے فرمایا لکڑیوں کا گٹھڑا کیسا ہی موزوں ہے اے یونس! اس نے عرض کیا یا حضرت اس دربار میں ٹیڑھے کو حاضری کب نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی اس درگاہ کے لائق ہے اور ساتھیوں نے اس پر بوجہ حسد کے ایسے کلمات تراشے تھے کہ جب یونس اتنا بہت سخت کام سرانجام دیتا ہے تو ان کو سوائے اس کے کہ وہ کہتے بلکہ انہیں سمجھ نہ آیا یا ڈر ہے کہ یونس کا جواب صرف ان کی رہبری سمجھا کہ الزام تراشی سے شیخ کے ہاں حضرت یونس کی عزت میں کمی واقع ہوجائے گی لیکن شیخ کے سوال سے حضرت یونس نے بہترین جواب دیا تو شیخ کا دل مطمئن ہوگیا اگرچہ مخالفین کے ازالہ شبہ کی وجہ سے تھا ورنہ شیخ کو تو یونس کے حالات معلوم تھے انہیں اس پر ذرہ برابر بھی بدگمانی نہ تھی۔ اس لئے کہ مرشد اپنے مرید کے حالات غیر کی مدح ذم سے نہیں جانتا بلکہ اس کے خلوص ونفاق کو براہ راست جانتا ہے شیخ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح حضرت یونس سے کردیا اور فرمایا میں نے اس لئے یونس سے نکاح کردیا ہے تاکہ اس کے ساتھی اپنے قول میں جھوٹے ثابت نہ ہوں اور نہ ہی اپنی بات کی وجہ سے شرمسار ہوں۔ صاحبزادی بھی ایسی باکمال تھی کہ جب قرآن شریف پڑھتی تو اس کی آواز سے چلتا پانی ٹھہر جاتا اور یونس بھی ایسا باادب واقع ہوا کہ تازیست صاحبزادی کو ہاتھ نہ لگایا اور کہتا کہ میں کس لائق کہ اپنے شیخ کی صاحبزادی کے قریب جاؤں۔

مسئلہ: سالک کے لئے ضروری ہے کہ طبیعت کے تقاضوں کو ترک کرے اور بقدر کفایت قناعت پذیر رہے کھانے کے امور ہوں یا پینے کے اپنی طبیعت کے خواہشات میں مفید نہ رہے بھلائی اسی میں ہے کہ خواہشات کی مخالفت کرے۔

مسئلہ: نفس کی تربیت اس طرح ہوتی ہے کہ اسے مال واولاد کی محبت سے دور رکھے کیونکہ یہ دونوں نفس کے لئے فتنہ ہیں جتنا زائد ہوں گے اسی قدر نفس کو کبر میں مبتلا کریں گے ان کی زیادتی سے ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ نفس انہیں راہ حق میں صرف کرے بلکہ ان کو جمع کرنے کی فکر میں رہے گا اور وہ اسے کبر میں مبتلا کرنے کے معین

ثابت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ

مسئلہ : جب تک طبیعت ونفس اصلاح پذیر نہیں ہوں گے سالک اپنے مطلوب کو کبھی نہیں پا سکے گا۔

نکتہ : حج کی ادائیگی میں اسی طرف اشارہ ہے کہ حاجی جب تک بدن کے آرام وقرار اور مال کو راہ حق میں قربان نہیں کرتا اپنے مقصود کو نہیں پہنچتا اسی طرح ذات حق کا طالب جب تک ماسوی اللہ سے فارغ نہیں ہوتا اور اس کی توجہ ذات بحث میں فنا نہیں ہوتی اسے مشاہدہ نہیں ہوتا اور جب کلی طور پر فانی ہو جاتا ہے پھر مشاہدات سے بقا پاتا ہے۔

مسئلہ : اسی طرح نماز کی کیفیت کا حال ہے کہ نماز میں مسجد حرام کی بجائے ذات حق مستغرق ہو جائے کیونکہ بارگاہ صمدیہ کے لئے ایک مثال ہے کہ اس کی طرف توجہ سے مطلوب ذات حق کی طرف ہونا ہے ورنہ درحقیقت اس کی توجہ کے لئے طرف کی کوئی قید نہیں صرف ظاہری طور کعبہ کی طرف متوجہ ہونا ادب ملحوظ خاطر ہے کہ اس کا حکم اسی طرح ہے اس لئے اس کی ہر شئے میں حکمت ومصلحت ہے قاعدہ ہے جو قیود سے چھوٹا اس نے ذات معبود کو پا لیا پھر فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کے تجلیات اس پر متجلی ہو جائیں گے اور ظاہر مظہر کا ہر طرح سے مشاہدہ کرے گا۔

عاشقی دیدا ز دل پر تاب ۔۔۔ حضرت حق تعالیٰ اندر خواب

دامنش را گرفت آں غمخور ۔۔۔ کہ ندارم من از تو دست گر

چوں بر آمد زخواب خویش درویش ۔۔۔ دید محکم گرفتہ دامن خویش

(کسی عاشق الٰہی کو خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوئی تو اس عاشق نے اللہ تعالیٰ کا دامن مضبوط پکڑ کے عرض کیا کہ اے اللہ کریم میرا تو تیرے سوا کوئی غمخوار نہیں اسی اثناء میں بیدار ہوا تو اپنا دامن پکڑے ہوئے تھا)

ترجمہ : مبارک ہے اسے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے اور اسے اس کے کسی حکم پر اعتراض نہیں اس سے اسے انقباض سے ایسا چھٹکارا ملے گا کہ اپنی ہستی کو بھی بھلا دے گا اور باقی باللہ ہو کر کمالات سے فائز المرام ہوگا۔

اے اللہ ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں سے بنا تاکہ ہمیں بھی یہی مرتبہ اور درجہ علیاء نصیب ہو اور ہمیں ان راہوں پر چلا جو دنیا وآخرت کے خیالات دل سے بھلا دینے والے ہوں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۗ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ

اور ہر ایک کے لئے توجہ کی ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتا ہے تو یہ چاہو کہ نیکیوں میں اوروں سے آگے نکل

بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٤٨﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

جائیں تم کہیں ہو اللہ تم سب کو اکٹھا لے آئے گا بیشک اللہ جو چاہے کرے۔ اور جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا

کرو اور وہ ضرور تمہارے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ

تمہارے کاموں سے غافل نہیں اور اے محبوب! تم جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ

اور اے مسلمانو تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو کہ لوگوں کو تم پر

لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي

کوئی حجت نہ رہے مگر جو ان میں ناانصافی کریں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہ اس لئے ہے کہ میں

وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ

اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ۔ جیسا ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں

يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم

تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور کتاب اور پختہ علم سکھاتا ہے اور تمہیں وہ تعلیم فرماتا ہے

مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

جس کا تمہیں علم نہ تھا۔ تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا اور میرا حق مانو اور میری ناشکری نہ کرو۔

تفسیر عالمانہ وَلِكُلٍّ اور ہر امت کے لئے وہ مسلمان ہوں یا یہود نصاریٰ وِجْهَةٌ قبلہ اور جہت ہے۔ هُوَ وہی اپنے اپنے قبلہ کی طرف مُوَلِّيهَا منہ پھیرنے اور توجہ کرنے والا ہے۔

ف: ادیان مختلفہ میں ہر ایک گروہ کا اپنا قبلہ ہے جو ہر ایک کا قبلہ اس کے دوسرے اور غیر اور مختلف ہے۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ پس تم اے مسلمانوں نیکیوں کی طرف سبقت کرو یہاں الیٰ کو حذف کر کے الْخَيْرَاتِ کو منصوب پڑھا گیا اور اس سے خیرات کے جمیع اقسام مراد ہیں یہ وہ امر قبلہ سے متعلق ہے۔ کسی ایسے امر سے کہ جن سے سعادت دارین حاصل ہو۔ اب معنی یہ ہوا کہ ہر ایک گروہ کا اپنا قبلہ ہے کہ جس کی طرف منہ کر کے عبادات الٰہی بجالاتے ہیں اور ایسے مضبوط ہو کر کے اس سے منہ ہٹا کر قبلہ حق کی طرف منہ کرنے کا نام تک نہیں لیتے۔ اگرچہ آپ انہیں ہر قسم کے دلائل دے کر سمجھائیں کہ قبلہ تو تمہارا کعبہ ہے لیکن پھر بھی نہیں مانیں گے۔ یہ بات ہے تو تم نیک افعال مثلاً خیرات کی طرف سبقت کرو۔

ف: خیرات ان امور کو کہا جاتا ہے جن کا حکم اللہ سے ہو اور ان لوگوں کے پیچھے نہ لگو۔ جو تمہارے لیڈروں کو اپنے گھڑے ہوئے خواہشات نفسانی کے تقاضوں پر تیار ہوئے۔ ان کا نام یہ ہے۔ کہ وہ حق کے خلاف ورزی کرے یعنی وہ لوگ احکام خداوندی کو پس پشت ڈال کر شر اور فساد کی پیروی میں لگے رہتے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے تو صرف فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ فرمایا ہے کہ تم نے مفہوم مخالف کیوں بیان فرمایا ہے۔ جب کہ احناف کے نزدیک ناجائز ہے۔

جواب: حق کے پس پشت ڈالنے سے لازماً گمراہی ہی حاصل ہوگی۔ اس لئے ہم نے بھی مطلب بیان کیا ہے اس کا نام مفہوم مخالف نہیں بلکہ اسے اجمال کی تفصیل کہتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ بعض اہل حقیقت نے فرمایا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر وہ قوم جو ہمارے غیر کے ساتھ مشغول ہو اور اس کی توجہ ہمارے غیر سے ہو تو عارفین کا وہ گروہ تم ہمارے غیر سے ہٹ کر ہمارے ساتھ مشغول ہو جاؤ کیونکہ تمہارے مرجع اور مطمح نظر صرف ہماری ذات ہے اور بس چنانچہ فرمایا کہ أَيْنَ مَا یعنی جہاں بھی تَكُونُوا اور تم اور تمہارے دشمن ہوں گے۔ يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا تم سب کو اللہ تعالیٰ محشر میں جزا وسزا کے لئے جمع فرمائے گا۔ اس کے بعد حق باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔

مسئلہ : اس آیت میں اہل طاعت کو وعدہ اور گناہ گاروں کو وعید سنائی گئی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے اسلئے وہ تمہارے مارنے اور زندہ کر کے جمع کرنے پر قادر ہے۔ وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ جس مکان یا شہر سے نکل کر تم سفر کو جاؤ فَوَلِّ وَجْهَكَ تو تم نماز کے لئے اپنا منہ پھیرو شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مسجد حرام کی طرف اس لئے کے سفر وحضر میں توجہ الی الکعبہ کے لئے حالت اختیار میں فرق نہیں پڑتا بلکہ حالت سفر کا وہی حکم ہے جو حالت اقامتہ فی البلد کا ہے وَاِنَّهٗ اور بے شک وہ معمور بے معنی تحویل القبلہ الی الکعبہ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ حق ہے میرے رب سے یعنی وہ ثابت اور حکمت ایزدی کے موافق ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ غافل نہیں اس سے تم جو عمل کرر ہے ہو۔ پھر تمہیں اس کی بہت اچھی جزاء دے گا۔

مسئلہ : اس آیت میں مومنین کو جزاء کا وعدہ ہے وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ اور جہاں سے تم نکلو یعنی اپنے سفروں اور جنگلوں میں وہ قریب منزلیں ہوں یا دور کی فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ پس اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیرو اور جہاں بھی تم ہو اپنے موطنوں یعنی زمین کے کناروں پر مقیم ہو یا مسافر اور نماز پڑھنے لگ جاؤ۔ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ تم اپنے چہروں کو پھیر دو اپنے اپنے مقامات پر شَطْرَهٗ اسی مسجد حرام کی طرف۔

سوال :: اس جملہ کو یعنی تحویل قبلہ اور مسجد حرام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو مقرر لانے کا کیا فائدہ۔

جواب : چونکہ قبلہ کے مسئلہ کو اہمیت حاصل ہے اور اس کے منصوب ہونے کے شبہات اور فتنوں اور شیطانی عملوں کا خطرہ تھا۔ اسی لئے حکم ایزدی کا تقاضہ ہوا۔ کہ اسے بار بار ذکر کیا جائے تا کہ مذکورہ خرابیوں کا وہم دفع ہو ویسے یہ دونوں موقعوں میں عجیب وغریب فوائد بھی حاصل ہوئے جو ہر ایک اپنے اپنے مقام پر مستقل حکمت کو لئے ہوئے ہے۔ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ تا کہ لوگوں کی تمہارے اُوپر حجت نہ ہو اور یہ جملہ فَوَلُّوْا اسے متعلق ہے۔ اب معنی یہ ہوا کہ بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف منہ پھیرنے سے یہودیوں کا اعتراض دفع ہو گیا وہ کہا کرتے کہ تورات میں لکھا ہے کہ آخر زمان نبی ﷺ کا قبلہ کعبہ ہو گا لیکن اس کے برعکس بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ لہذا یہ وہ آخر زمان نبی ﷺ نہیں اور اس سے عرب کا اعتراض بھی اُٹھ گیا ہے۔ وہ کہتے کہ جب یہ نبی ﷺ ملت ابراہیمی کے مدعی ہیں تو پھر ان کے بتائے ہوئے قبلہ کی مخالف کیوں کرتے ہیں۔

ف : عَلَیْكُمْ ترکیب میں حُجَّةٌ سے محلا منصوب واقع ہے۔

سوال: اسے حُجَّۃٌ کی صفت کیوں نہیں بنایا جاتا۔

جواب: قاعدہ ہے کہ صفت ہمیشہ اپنے موصوف سے مؤخر ہوا کرتی ہے اور یہ حجتہ سے مقدم ہے۔ لہذا وہ وجہ امتناع تقدیم الموصوف حجتہ کی صفت نہیں بنایا جا سکتا۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ مگر ان میں وہ لوگ جو ظالم ہیں یہ جملہ النَّاسِ سے مستثنیٰ ہے اب معنی یہ ہوا کہ حجت صرف ان یہودیوں کے حق میں ہے جو ان میں ضدی ہیں اور کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے قبلہ بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو صرف اس لئے قبلہ بنایا کہ انہیں اپنی قوم کے دین کی طرف جھکاؤ ہو گیا اور اپنے شہر کی محبت نے انہیں مجبور کیا ہے کہ اگر انہیں حق پرستی کا خیال ہوتا تو یہ قبلہ انبیاء کو ہرگز نہ چھوڑتے اسی طرح بعض اہل مکہ جو ان میں آپ کے دشمن تھے انہوں نے بھی حضور علیہ الصلوۃ و السلام کو معلون ٹھہرایا کہ اب ان پر حق ظاہر ہوا کہ اپنے آباء کی طرف واپس لوٹے ہیں اُمید ہے اب عنقریب اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ آئیں گے۔

سوال: ایسے بھی کلمات کو اللہ تعالیٰ نے حُجَّۃٌ سے کیوں تعبیر فرمایا کیوں کہ حُجَّۃُ اللّٰہِ ایک مقدس کلمہ ہوتا ہے اور ان معاندین کے اقوال تو **افحش الاباطیل** تھے۔

جواب: ۱۔ ان کے ایسے گندے اقوال حُجَّۃٌ سے تعبیر کرنا مجازاً ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اپنی باتوں کو قوی سمجھ کر انہیں حُجَّۃٌ کے طور پر پیش کرتے جیسے ہمارے دور میں تم بد مذہب اپنے غلط عقائد اور مراسم پر دلائل کر کے انہیں حُجَّۃٌ سے تعبیر کرتے۔

جواب: ۲۔ ان کی گندگی باتوں کو حجتہ سے تعبیر کرنا تہکما ہے (جیسے کفار کو ڈرانی خبر سنا کر اسے بشارت سے تعبیر کیا گیا ہے) فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ بس ان سے نہ ڈرو اپنی توجہ کو کعبہ کی طرف ہٹانے میں اور نہ ہی وہ تم پر غالب ہو سکتے ہیں اس لئے ان کی ملعن و تشنیع تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں دے سکتی وَاخۡشَوۡنِیۡ اور مجھ سے ڈرو اور میرے احکام کی فرمان برداری کر کے اور میرے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو جس میں تمہاری بہتری ہو گی۔ میں اس کا تمہیں حکم دے کر تمہاری مدد کروں گا۔ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡكُمۡ تاکہ میں تمہارے اُوپر اپنی نعمتوں کو مکمل کروں یہ جملہ ایک محذوف امر کی علت ہے۔ یعنی میں نے قبلہ کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم اس لئے دیا ہے تاکہ میں اپنی نعمتوں کو تمہارے اُوپر مکمل کروں اس لئے کہ وہ بہت بڑی جلیل القدر نعمتیں ہیں۔

مسئلہ : ہر وہ اوامر و تکالیف جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بندے پر وارد ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر بندے کا قبلہ کی طرف متوجہ ہونا اسی طرح اگر چہ وہ نعمتیں ظاہر ہوں تو ان کی ادائیگی سے بندے کو ثواب ملتا ہے۔

سوال : قبلہ ابراہیمی کو بنانے میں کون سی نعمت ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نعمت سے تعبیر فرمایا ہے۔

جواب : قوم عرب اپنے تمام معاملات اور رسومات کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے ان کو بجالا کر فخر محسوس کرتے جب انہیں قبلہ ابراہیمی سے ہٹا کر بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا تو اسے انہوں نے ایک حادثہ سمجھا۔ حالانکہ اس میں ایک مصلحت تھی۔ پھر جب انہیں قبلہ ابراہیمی کا حکم ہوا تو انہوں نے اسے ایک عظیم نعمت تصور کیا۔

ف : جتنی نعمتیں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوتی ہیں۔ دو قسم کی ہیں، ا۔ عطائی ۲۔ کسبی عطائی جیسے صحۃ البدن و صلامتہ الا عضاء (وغیرھما) اور کسبی جیسے ایمان عمل صالح اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانا اور اس کی گمراہی سے بچنا ان سب جملہ امور سے بندے کو سعادت دارین نصیب ہوتی ہے۔

وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ امید رکھو کہ تم ہدایت پالو گے یعنی میرا ارادہ ہے کہ میں تمہیں ملت حنفیہ کے شعائر اور دین قیم کے شرائع کی طرف ہدایت دوں۔ جیسے ہم نے تم میں سے رسول بھیجا یہ جملہ ماقبل سے متصل ہے۔ تاکہ میں تمہارے اُوپر تمام نعمت کروں عمل قبلہ کہ بارے میں حضور علیہ السلام کو تم میں سے بھیج کر۔

ف : یہاں رسول سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اس لئے کہ انہیں کی جنس میں سے رسول بھیجنا یہ ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کا کوئی نعمت مقابلہ نہیں کر سکتی يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا ہماری آیات یعنی قرآن مجید تلاوت کریں گے۔

وَيُزَكِّيكُمْ یعنی تمہیں تیار فرمائیں گے۔ ایسے اعمال کے لئے کہ جن کی بدولت تم گناہوں کی گندگی میل سے جو کہ نفس پر ہوتی ہے۔ دھل کر پاک اور صاف ہو جاؤ گے۔ کیونکہ رسل کرام علی نبینا و علیہم السلام کا کام ہے کہ عوام کو دعوت دیں اور ان کو ایسے اعمال کے لئے تیار کریں جن کی وجہ سے ان کے نفوس کو شرک و معاصی سے صفائی نصیب ہو اور عوام کو صفائی طہارت پہلی ہی ملاقات سے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک بار بار ان کے فیض و برکات کی طلب میں ان کی صحبت سے بازیاب نہ ہوں وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ اور وہ تمہیں کتاب سکھائیں گے یعنی وہ تمہیں قرآن کے معنی و اسرار و شرائع اور احکام کی تعلیم دیں گے۔ انہیں وجوہ مذکورہ کی وجہ سے قرآن کو نور اور

ہدایت سے موصوف کیا جاتا ہے۔

ف: حضور نبی علیہ الصلوٰۃ السلام ان کے سامنے قرآن پڑھتے تا کہ وہ قرآن کے نظم اور اس کے الفاظ یاد کر لیں اور اہل اسلام کی زبانوں پر باقی رہ کر تحریف تصحیف سے محفوظ اور قیامت تک معجزہ ہو جائے۔

مسئلہ: قرآن پاک کی تلاوت اندرون نماز اور خراج از نماز ہر طرح سے عبادت اور قرب الٰہی کا سبب ہے لیکن ضروری ہے کہ جو اس کے حقائق اصرار کے جاننے کی بھی کوشش کی جائے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ہدایت اور نور حاصل ہو وَالْحِكْمَةَ حکمت اصبت فی الاقول و العمل کو کہتے ہیں اور حکیم وہی ہوتا ہے جس میں دونوں باتیں پائی جائیں۔ کذاقال الامام حکمت الشئی رددته عالا یعینه سے مشتق ہے۔ یعنی میں نے اسے ایسی باتوں سے روک دیا ہے۔ جو اس کے لئے غیر مفید ہیں۔ چونکہ حکمت عقل کو جہل اور خطا سے روکتی ہے۔ اسی لئے نام سے معصوم ہوئی۔

ف: قرآن پر عمل کرنا موقوف ہے۔ اس کے معنی سمجھنے پر اور معنی موقوف ہیں الفاظ کی پہچان اور تزکیہ ان سب کا خلاصہ ہے اور اس کا دارومدار قرآن پاک پر عمل کرنے پر موقوف ہے۔

سوال: جب تزکیہ کا حصول ان سب کے بعد ہوتا ہے تو پھر اسے سب سے پہلے ذکر کیوں کیا گیا۔

جواب: ان میں سے سب سے پہلے تصور تزکیہ کا ہی آتا ہے اسی لئے اسے سب سے پہلے ذکر کیا گیا وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ اور تم کو سکھائیں وہ امور جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

سوال: امام راغب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ اس کا مفہوم الکتاب الحکمۃ ہی ادا ہو گیا ہے۔

جواب: اس جملہ سے وہ علوم مراد ہیں جو انبیاء کرام علی نبینا علیہم السلام کی زبانوں سے از جہۃ وحی صدور ہوتے ہیں ان میں عقلیات کو کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا اگر ان کو علوم کلیات و جزیات بھی حاصل ہوتے ہیں تو اسی وحی کے ذریعے ہی [1] **ف**: اور الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ سے مراد وہ علوم ہیں جن کے حصول میں عقل کو دخل ہو۔

سوال: لفظ وَيُعَلِّمُكُمْ کا تکرار کیوں؟

---

[1] اسی لئے ہم اہلسنت انبیاء علیہم السلام کو دین و دنیا کے علوم کا عالم مانتے ہیں اور وہابی دیوبندی اسے شرک سے تعبیر کرتے ہیں اس کی تفصیل فقیر کی کتاب "آئینہ دیوبند" میں دیکھئے۔

جواب : تا کہ تنبیہ ہو جائے کہ پہلے علوم سے یہ علوم منفرد ہیں ان کا ان مذکورہ علوم سے کوئی واسطہ نہیں۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ پس تم مجھے یاد کرو اطاعت سے جیسے حضور ﷺ نے فرمایا۔ من اطاع الله فقه ذکر الله و ان قلت صلوته و صیامه قراته القرآن و من عصی الله فقد نسی الله و ان اکثرت صلوته قراته القرآن

(جو اللہ تعالیٰ کا مطیع ہے وہ اسے بہت یاد کرتا ہے اگرچہ اس کی نماز روزہ اور تلاوت جیسی عبادات بہت تھوڑی ہوں اور وہ اللہ تعالیٰ کا بے فرمان ہے جو اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتا اگرچہ اس کی نماز اور تلاوت قران بہت زیادہ ہوں)

اَذْكُرْكُمْ میں تمہیں یاد کروں گا یعنی ثواب اور لطف اور احسان اور خیر و برکت بہت زیادہ عطا کر کے سعادت کے دروازے کھول دوں گا۔

سوال : ذکر کہتے ہیں ایسی بات کے ادراک جو مسبوق النسیان ہو اور اللہ تعالیٰ تو نسیان سے منزہ اور پاک ہے

جواب : یہاں اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا اطلاق مجازاً ہے۔

جواب : ۲۔عباد کے ذکر کے بعد اس کی مشاکلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر مستعمل ہوا۔ وَاشْكُرُوْا لِيْ اور میرا شکر ادا کرو اور اس کے کہ میں نے تمہارے اوپر انعامات کئے ہیں ذکر بالطاعۃ کا نام شکر ہے اور اس میں خصوصیات کے ساتھ شکر کا حکم اسی لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر انعامات و احسانات ہیں۔ فلہذا اسی کا شکر کریں نہ کسی غیر کا۔

ف : صاحب تیسیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا فَاذْكُرُوْنِيْٓ میں قولی عبادات کا حکم ہے اور " واشکروالی " میں عملی عبادات کا۔

سوال : امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شکرت الزید و شکرت زید یعنی باب شکر کے بعد لام صلہ واقع ہو تو کیا معنی ہو گا۔ اگر وہ بلا واسطہ متعدی ہو تو پھر کیا مفہوم ہو گا۔

جواب : جب شکر کا باب بواسطہ لام ہو تو اس وقت مطلب یہ ہے کہ کسی نے تیرے اوپر احسان کیا ہے اسی احسان کو مدنظر رکھ کر تو نے اسی کی تعریف کی اور جب یہ بلا واسطہ متعدی ہوا تو اس وقت مقصود یہ ہے کہ قطع نظر اس کے احسانات کے اس کی ذات کو مدنظر رکھ کر اس کی تعریف کی گئی ہے اسی لئے یہ بات جب بلا واسطہ متعدی ہو تو زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

سوال : جب شکر بلا واسطہ لام بلیغ ہے تو پھر یہاں متعدی بواسطہ لام سے کیوں مستعمل ہے جبکہ یہ غیر بلیغ ہے۔

جواب : اس طرف اشارہ ہے کہ اس کی ذات کی کنہہ سے ادراک عاجز ہے بلکہ اسکی نعمتوں کا شمار بھی ناممکن ہے چنانچہ فرمایا۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

(یعنی اگر اس کی نعمتیں گنو تو شمار نہیں کرسکو گے اس لئے بندوں کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اس کا شکر کرنا ہے تو اس کی بعض نعمتوں کو مدنظر رکھو وَلَا تَكْفُرُوْنِ اور کفران نعمت نہ کرو اس کی نعمتوں کی ناشکری اور نافرنی کر کے)

سوال : جب یہی مفہوم وَاشْكُرُوْا لِيْ میں ادا ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد تَكْفُرُوْنِ کے ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب : اگر صرف وَاشْكُرُوْا لِيْ ہو تو تَكْفُرُوْنِ نہ لایا جائے تو وہم باقی رہتا ہے کہ اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کو مدنظر رکھ کر ایک بار شکر کیا تو گویا اس نے شکر کا حق ادا کرلیا۔ حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ اس کی کسی نعمت کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح وَلَا تَكْفُرُوْنِ کے ذکر کے ساتھ " واشکرولی "کو لانا بھی ضروری ہوا اسی لئے کہ صرف وَلَا تَكْفُرُوْنِ سے اتنا سمجھا جاسکتا ہے کہ بندے کو چاہیے کہ قبیح فعل سے بچتا رہے اس سے اچھے افعال کی ترغیب کا مفہوم نہیں سمجھا جاسکتا ہے حالانکہ بندے کو جہاں برائی سے بچنا ضروری ہے وہاں نیکی کا خوگر ہونا بھی ضروری ہے۔ چونکہ ان دونوں کا ذکر اہمیت رکھتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو بیان فرمایا ہے۔

جواب : ۲۔ وَلَا تَكْفُرُوْنِ میں تنبیہ ہے کہ شکر کا ترک بھی کفران ہے۔

سوال : وَلَا تَكْفُرُوْنِ کی بجائے ولا تکفرولی کیوں نہیں فرمایا۔ جیسے وَاشْكُرُوْا لِيْ فرمایا ہے؟

جواب : کفران ذات کا زیادہ قبیح ہے بہ نسبت کفران نعمت کے۔ کیونکہ نعمت کی ناشکری کی معافی ہوسکتی ہے لیکن ذات کا کفران کبھی نہیں بخشا جائے گا۔

(کذافی تفسیر الراغب الاصفہانی)

نکتہ : اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والثناء کو فضل وقوت وکمال بصیرت میں بنی اسرائیل سے برگزیدہ بنایا ہے چنانچہ انہیں فرمایا يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ یعنی انہیں ایسی نعمت کے یاد کرنے کا حکم دیا ہے جو ان کے ذہنوں سے نکل چکی تھی کہ اس کے ذکر کے واسطہ سے منعم حقیقی کو یاد کریں لیکن امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کو حکم ہے کہ وہ خود عین ذات کو یاد کریں تاکہ ثابت ہو جائے ان میں بنی اسرائیل سے قوت ب بصیرت بہت زیادہ ہے حضرت صائب نے فرمایا۔

در سر ہر خادم طینت نشہ منصور نیست ہر سفالے را صدائے کاسہ فغفور نیست

ترجمہ۔ ہر سر میں منصور کا نشہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر پیالے کا فغفور کا پیالہ کہا جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ذکر کبھی زبان سے ہوتا ہے اور کبھی دل سے اور کبھی دیگر اعضاء سے اللہ تعالیٰ کی تحمید و تسبیح و تمجید اور تلاوت قرآن لسانی ذکر ہے قلبی ذکر کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ ان دلائل پر تفکر جو اللہ کی ذات وصفات پر دلالت کرتے ہیں اور وہ اعتراضات جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر وارد ہوتے ہیں ان کے جوابات سوچنا۔

۲۔ ان دلائل کا تفکر جو بندوں کو مکلف بنائے و دیگر احکام اور لوامر ونواہی اور وعدہ وعید کے کوائف پر دلالت کرتے ہیں جب انہیں مکلف ہونے کی کیفیت معلوم ہو جائے گی اور پتہ چل جائے گا کہ اس عمل کے ارتکاب پر وعدہ اور دوسرے عمل کے اجتناب کی نہی میں کیا کیا حکمتیں مضمر ہیں تو اسے ان کی ادائیگی میں آسانی ہو جائے گی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے اسرار میں تفکر یہاں تک کہ عالم کا ذرہ ذرہ عالم قدس کے لئے صاف وشفاف شیشہ ہو جائے جب وہ اس آئینہ پر نگاہ ڈالے تو اس کی آنکھ عالم جلال کو دیکھ لے اور یہ وہ مقام ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

ذکر اعضاء :۔ یہ ہے کہ تمام اعضاء ان اعمال میں مستغرق ہو جائیں کہ جن کا انہیں حکم دیا گیا ہے اور ان افعال سے اجتناب کریں جن سے انہیں روکا گیا ہے۔

نکتہ : اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نماز کو بھی ذکر قلب دیا ہے کما قال اللہ تعالی فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کے ذکر یعنی نماز کی طرف دوڑ کر آؤ۔ مذکورہ بالا۔ تقریر کی بنا پر فَاذْکُرُوْنِیْ کا حکم جمیع طاعات پر مشتمل ہوگا۔

حدیث شریف :۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا اُذْکُرُوْنِیْ بِطَاعَتِیْ ایسے اجمالی طور بیان فرمایا تا کہ طاعات کے جمیع اقسام اس میں شامل ہو جائیں۔

حکایت:۔ حضرت لقمان علی نبینا علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا۔ جب تم ذکر کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ اس لئے کہ تم عالم دین ہو تو تجھے تیرا علم نفع دے گا اور اگر تو جاہل ہے تو تجھے وہ تعلیم دیں گے اگر ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت برسے گی تو تجھے بھی اس سے حصہ نصیب ہوگا اگر تمہارا گزر ایسی قوم سے ہو جو ذکر الٰہی سے محروم ہیں تو ان کے پاس نہ بیٹھنا اگر تم عالم دین ہو تو تیرا علم اسے نفع نہ دے گا اگر تم جاہل ہو تو الٹا اس کی صحبت سے جہل اور گمراہی میں اضافہ ہوگا۔ بلکہ جب ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا۔ تو تم بھی اس کے ساتھ بیٹھنے سے مارے جاؤ اے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ذکر کرنے والوں سے بنا۔

صحبت صالح ترا صالح کند　　　صحبت طالح ترا طالح کند

نیک کی صحبت تجھے نیک بنائی گی　　　برے کی صحبت تجھے برا بنائے گی

اسی لئے ہم اہل سنت بد مذاہب کی یاری دوستی سے عوام بلکہ خواص کو سختی سے روکتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یاد آنے کے بعد ظالموں کے پاس مت بیٹھو اور رسول اکرم ﷺ نے بد مذاہب سے دور رہنے کی یوں تاکید فرمائی۔

ان مرضوا فلا تعودوھم وان ماتوا فلا تشھدوھم ان لقیتموھم فلا تسلموا علیھم (ابن ماجہ)

اگر بیمار ہوں تو ان کی تاع پرسی نہ کرو اگر مر جائیں تو ان کے نماز جنازہ میں شرکت نہ کرو اگر ملیں تو انہیں سلام نہ کرو

الحمد للہ یہی طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا چنانچہ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے لکھا کہ:

کان داب الصحابۃ و من بعدھم من المؤمنین فی جمیع الازمان فانھم کانوا یقاطعون من حاد اللہ و رسولہ مع حاجتھم الیہ والو وار ضاء اللہ تعالیٰ علی ذالک

(مرقات شرح مشکوٰۃ ج ۱۰ ص ۲۹۰)

یعنی صحابہ کرام اور ان کے بعد والے ہر زمانہ کے ایمان والوں کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفوں، دشمنوں کے ساتھ بائیکاٹ کرتے رہے۔ حالانکہ ان ایمانداروں کی دنیاوی طور پر ان مخالفوں کی احتیاط بھی ہوتی تھی۔ لیکن وہ مسلمان خدا تعالیٰ کی رضا کو اس پر ترجیح دیتے ہوئے بائیکاٹ کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو اپنی رضا جوئی کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک اللہ صابروں

الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ

کے ساتھ ہے۔ اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ

بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمہیں خبر نہیں۔ اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے

الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَ

کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں

الثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ

اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا صبر والوں کو۔ کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ

تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا۔ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی درودیں

مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ اِنَّ الصَّفَا

اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔ بیشک صفا

وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا

اور مروہ اللہ کے نشانیوں میں سے ہیں تو جو اس گھر کا حج یا عمرہ کرے

جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ

اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کے پھیرے کرے اور کوئی بھلی بات اپنی طرف سے کرے تو

اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ

اللہ نیکی کا صلہ دینے والا خبردار ہے ۔ بیشک وہ جو ہماری اتاری ہوئی روشن باتوں

وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ

اور ہدایت کو چھپاتے ہیں بعد اس کے کہ لوگوں کے لئے ہم اس کتاب میں واضح فرما چکے

يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا

ان پر اللہ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ۔ مگر وہ جو توبہ کریں اور سنواریں

وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ

اور ظاہر کریں تو میں ان کی توبہ قبول فرماؤں گا اور میں ہی ہوں بڑا توبہ قبول فرمانے والا مہربان ۔ بیشک

الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ

وہ جنہوں نے کفر کیا اور کافر ہی مرے ان پر لعنت ہے اللہ

وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ

اور فرشتوں اور آدمیوں سب کی ۔ ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہو

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ

اور نہ انہیں مہلت دی جائے ۔ اور تمہارا معبود ایک معبود ہے

لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾

اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا مہربان

تفسیر عالمانہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ان امور میں مدد مانگو جو تم نے ادا کرنے ہیں اور جن کا تم کو ترک کرنے کا حکم ہے بِالصَّبْرِ صبر کے ساتھ امور پر جو نفس پر شاق ہیں جیسے گناہوں اور نفس کی لذتوں سے بچنا وَالصَّلٰوةِ اور نماز کے ساتھ کہ یہ ام العبادات اور معراج المومنین اور رب العالمین کی محبوب عبادت ہے۔

حدیث شریف :۔ مروی ہے کہ حضور ﷺ کو جب کوئی غم لاحق ہوتا تو آپ نماز پڑھتے اس کی دلیل کے لئے یہی آیت تلاوت کرتے۔

سوال: صبر و نماز کی تخصیص کیوں جب کہ خدا تعالیٰ کی دوسری عبادات بھی ہیں؟

جواب :صبر باطنی عبادات میں بدن کے لئے بہت سخت ہے جیسے ظاہری طور نماز بدن پر سخت ہے کیونکہ وہ نماز کسی قسم کی طاعات مثلاً ارکان و سنن و مستحبات اور خشوع و خضوع اور توجہ و سکون و دیگر جملہ ان عبادات شاقہ (کہ جن کی نگرانی سوائے توفیق ایزدی کے ناممکن ہے) کا مجموعہ ہے کہ جن کی ادائیگی سوائے توفیق ایزدی کے ناممکن ہے۔

سوال : حضرت عصام الدین نے فرمایا صبر کو (جو کہ منزلہ ترک کے ہے) اور صلوۃ (جو کہ بمنزلہ فعل کے ہے) پر مقدم کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: اس لئے کہ صبر بمنزلہ تخلیہ کے ہے صلوۃ بمنزلہ تحلیہ (زیورات وغیرہ سے شے کو سنوارنا) کے ہے اور تخلیہ (خرابیوں سے اس کو پاک کرنا) ہمیشہ تحلیہ سے مقدم ہوا کرتا ہے۔

نکتہ : یہی وجہ ہے کہ کلمہ توحید میں نفی پہلے ہے۔

سوال : ارکان اسلام میں صرف نماز پر کیوں اکتفا کیا گیا؟

جواب : آیت میں خطاب صرف مومنین کو ہے اور یہ دونوں فعل بعد از ایمان تمام مومنین میں مشترک ہیں۔ کیوں کہ ہر گناہ سے بچنا (جسے صبر سے تعبیر کیا گیا) ہر مومن پر فرض ہے اور نماز بھی اسی طرح ہے۔ بخلاف زکوۃ کے وہ صرف صاحب نصاب پر فرض ہے اور حج صرف اصحاب استطاعت پر اور روزہ صرف کھانے پینے کی خواہشات سے روکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے مدد کرنے اور دعا قبول کرنے میں۔

ف: معیت کا معنی ہے ولایت دائمہ جس میں پورے طور نصرت و اجابت دعا ہو۔

سوال: معیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تابع ہے اور صابرین متبوع اور ایسا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے؟

جواب: وہ لوگ جو حقیقی صبر کرنے والے ہیں وہ اس معنی پر متبوع ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایسے لوگوں کی باتوں کو نہیں ٹالتا اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں۔

ف: حضرت عصام الدین اپنی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ صابرین اللہ تعالیٰ کے ذکر کو کبھی نہیں بھلاتے بخلاف صبر سے محروم لوگوں کے کہ ان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے ذکر الٰہی سے غافل ہو جائیں تو اسے دنیا کے حزن و ہوا سے بھر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ تمام دنیا اسکے حوالے کی جائے تب بھی اس کا جی نہیں بھرے گا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ تو فرمایا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُصَلِّیْنَ کیوں نہیں فرمایا حالانکہ دوسرے مقام پر فرمایا وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اس میں نماز کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے لیکن یہاں پر نماز کو کوئی اہتمام نہیں دیا گیا۔

جواب: اپنے مقام پہ ثابت ہے کہ نماز صبر سے اشرف و اعلیٰ ہے کیونکہ نماز صبر سے جدا ہو سکتی ہے لیکن صبر نماز سے جدا نہیں ہوتا اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت صابرین کے ساتھ بیان فرمائی تو اس سے ثابت ہوا کہ جب وہ صابرین کیساتھ ہے تو نماز والوں کے ساتھ بطریق اولیٰ ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہو کیونکہ ادنیٰ کے ذکر سے اعلیٰ کا ذکر خود بخود ہوتا ہے دوسری آیت اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ میں صبر کے ذکر نہ کرنے میں تنبیہ ہے کہ نماز مرتبہ میں صبر سے اشرف و افضل ہے۔

تفسیر صوفیانہ

بہت بڑے دکھ سر پر اٹھا لینا اور جزع و اضطراب نہ کرنا یہ ذریعہ ہے ہر بھلائی کے حصول کا اور ہر فضیلت کا اصل ہے اور توبہ کا پہلا درجہ بھی ہے کہ انسان گناہوں سے بچ جائے اور زہد کا پہلا درجہ یہی ہے کہ مباحات سے بھی دور رہنا ہے اور ارادہ کا اوّل صبر اور ماسوی کی طلب ہے اسی لئے حدیث شریف میں ہے حضور علیہ الصلوۃ و السلام نے فرمایا ایمان کے شعبوں میں سے صبر ایسے ہے جیسے جسم میں سر اور فرمایا صبر کا کل فضیلت ہی فضیلت ہے جو شخص بھی صبر سے آراستہ ہو گا اس کو طاعات پر عمل اور برائیوں سے

رکنا آسان ہوگا اسی طرح نماز کا حال ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ یعنی نماز برائیوں سے روکتی ہے۔

صبر کن حافظ بسختی روز و شب　　عاقبت روزے بیابی کام را

ترجمہ: اے حافظ شب و روز کی سختیوں پر صبر سے کام لے اسلئے کہ صبر کی برکت سے ایک دن منزل مقصود کو پالوگے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو جمع کرے گا تو ایک منادی اعلان کرے گا کہ اہل فضیلت کہاں ہیں یہ سن کر کچھ لوگ دوڑتے ہوئے بہشت تک پہنچیں گے انہیں ملائکہ کی ملاقات ہوگی فرشتے پوچھیں گے اے لوگو تم بہشت کی طرف تیز دوڑے جارہے ہو اس کی وجہ کیا ہے وہ کہیں گے ہم اہل فضیلت ہیں وہ پوچھیں گے تمہاری فضیلت کی وجہ یا ہے؟ کہیں گے کہ ہمارے اوپر ظلم ہوتا تو ہم صبر کرتے جب ہمارے ساتھ زیادتی کی جاتی تو ہم معاف کردیتے اس پر انہیں کہا جائے گا بہشت میں داخل ہوجاؤ ایسے نیک عمل والوں کا بہترین اجر بھی ہے اس کے بعد منادی پکارے گا کہاں ہیں اہل صبر اس پر بہت سے لوگ بہشت کی طرف تیز دوڑتے ہوئے جائیں گے ان سے پوچھا جائے گا تم کون ہو کہیں گے ہم صبر کرنے والے ہیں ان سے پوچھا گیا تم نے کن باتوں پر صبر کیا وہ جواباً کہیں گے ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرتے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے دور رہتے تھے اس پر انہیں کہا جائے گا بہشت میں داخل ہوجاؤ اس کے بعد منادی اعلان کرے گا کہاں ہیں وہ لوگ جو ایک دوسرے سے صرف اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرتے تھے اس پر بہت سے لوگ بہشت کی طرف تیز بھاگتے ہوئے جائیں گے ان کی ملائکہ سے ملاقات ہوگی ان سے فرشتے پوچھیں گے تم کون لوگ ہو وہ کہیں گے ہم ہیں وہ صاحبان جنہوں نے آپس میں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کی تھی اس پر فرشتے کہیں گے تمہاری آپس کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے کیوں تھی وہ کہیں گے ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرتے اور بہشت میں داخل ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔　(کذا فی نزھۃ القلوب)

تفسیر عالمانہ

شان نزول: وَلَا تَقُوْلُوْا آیت شہدائے بدر کے حق میں نازل ہوئی اور وہ کل چودہ افراد تھے۔ چھ مہاجرین اور آٹھ انصار یعنی جو لوگ بدر میں شہید ہوئے تو لوگ کہتے تھے کہ

افسوس کہ وہ لوگ مردہ ہوگئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور نہ کہو لِمَنْ يُّقْتَلُ ان لوگوں کے لئے جو شہید کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں یہ بات کہ فلاں مر گیا اور وہ دنیا کے عیش اور اس کی لذتوں سے محروم ہو گیا۔

ف: قتل حیوانی زندگی کی نقیض کو کہتے ہیں۔

فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اس سے مراد جہاد ہے کیونکہ یہی اللہ تعالیٰ کے ثواب اور رحمت کا ذریعہ ہے۔ اَمْوَاتٌ یعنی شہیدوں کو مردہ نہ کہو بَلْ اَحْيَآءٌ یعنی وہ زندوں کے حکم میں ہیں۔ یعنی ان کے اعمال کا ثواب منقطع نہیں ہوتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرتے مارے گئے ہیں پھر جب تک دین دنیا میں باقی ہیں جو بھی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید کیا جائیگا اسے ثواب ملتا رہے گا۔ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ لیکن تم نہیں جانتے کہ ان کی زندگی کا (اس عالم برزخ میں) کیا حال ہے اس میں اشارہ ہے کہ شہداء کی حیات کا علم ان حواس ظاہرہ (جو اس کے ساتھ ہیں) معلوم نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک روحانی امر ہے جس کا ادراک نہیں ہوسکتا ہاں وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوسکتا ہے۔ (اسے ہم اہلسنت علم غیب سے تعبیر کرتے ہیں)

عقیدہ:۔ آیت سے معلوم ہوا کہ ارواح جواہر قائم بنفسہا ہیں۔ یعنی جن باتوں کو حواس جسمانی معلوم کر سکتے ہیں یہ ان کے مغائر ہیں اور روح موت کے بعد بھی باقی رہ جاتا ہے اور اس کے اندر ادراک ہوتا ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ (اسی پر سماع موتی اور بعد وصال اولیاء اللہ سے استمداد وغیرہ کے مسائل حل ہوتے ہیں دیکھئے تفسیر اویسی حصہ اول)

سوال: حیات روحانیہ تو سب کی لذت اور درد والم کو محسوس کرتی ہے پھر یہاں شہدا کی تخصیص کیوں؟

جواب: ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خصوصی قرب نصیب ہوتا ہے ان کو بہ نسبت دوسروں کے مزید رونق اور کرامت حاصل ہوتی ہے اور قاعدہ ہے کہ جو شخص بھی کسی بہت بڑے اونچے مرتبہ والے کے مرتبہ کو نہ پاسکے تو اس کو کالعدم سمجھا جاتا ہے اسی طرح شہداء کے مراتب کو نہ پہنچنے پر دوسروں کو کالعدم قرار دے کر صرف شہداء کو زندہ قرار دیا گیا۔ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى یعنی دوزخ میں نہ مرے گا نہ زندہ ہوگا۔

عقیدہ: انسانی نفس یعنی اس کی ذات روح مخاطب اور وہی مکلف اور وہی اوامر و نواہی کا مامور اور نواہی حق سے روکے ہوئے ہے جو روح جسمانی اور لطیف ہے اور اسی ظاہری بدن محسوس میں سرایت کئے ہوئے ہے جیسے

آگ کوئلے میں اور گلاب کا پانی پھول میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ جس کی طرف ایک بات کرتے وقت کہتا ہے ''انا'' میں ہوں۔ حقیقتاً انسان وہی ہے اور وہی ولی اور وہی نبی ہے اسی کو اعمال کا ثواب ملے گا اسی کو عذاب ہوگا وہی صلب آدم علیہ السلام میں تھا جب کہ انہیں ملائکہ نے سجدہ کیا۔ وہی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں بلیٰ کہا۔ وہی خواب میں جسم سے نکل کر سیر کرتا ہے اور وہی خواب دیکھتا ہے اور اسی باتوں سے خوش ہوتا ہے اور غم والی باتوں سے غمگین ہوتا ہے اور اگر اسے اللہ تعالیٰ روک لیتا ہے تو وہ رک جاتا ہے اور جسم کثیف جسے بدن سے تعبیر کیا جاتا ہے روح کے تابع ہوتا ہے اور روح سلطانی کا مرکز قلب صنوبری ہے اور روح حیوانی کا مرکز دماغ ہے اسی لئے وہ اس کے مظاہرین میں زیادہ قوی ہے اور روح حیوانی اسی مخصوص ہیکل میں روح سلطانی کے تعلق کے بعد حادث ہوا ہے یہ روح حیوانی روح سلطانی کے انوار کا عکس ہے تاکہ وہ افعال کا مبداء ہو سکے کیونکہ حیات ایک غیبی امر ہے اور زندہ شئے میں پوشیدہ اسے صرف آثار وعلامات سے معلوم کیا جاسکتا ہے جیسے حس وحرکت علم ارادہ وغیرہ اور یہ روح حیوانی پر چکر لگاتا رہتا ہے جب تک یہ بخار باقی ہے تو حیات قائم ہے اور جب یہ ختم ہو جاتا ہے اور روح بدن سے اضطراری طور خارج ہو جاتی ہے یہی حقیقی موت ہے۔

ف: جیسے روح بدن سے اضطراری طور خارج ہو جاتی ہے اسی طرح اختیاری طور بھی اور وہ واپس لوٹتی ہے جب چاہتی ہے اسے صوفیا کرام کی اصطلاح میں انسلاخ کہتے ہیں۔

عقیدہ: اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ روح جسم لطیف ہے اور اسی ہیکل محسوس کا مغائر ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ روح کیا ہے اسرار برزخ اور احوال قبر بھی معلوم ہوئے اور ثابت ہوا کہ قبر کا عذاب وثواب جسمانی ہے اور قبر رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النِّيْرَان (یعنی قبر بہشت کے باغات میں سے ایک باغیچہ ہے اور جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے کہ مسئلہ حق ہے)

عقیدہ: شہدا کی حیات برزخیہ ہے وہ اس میں اسی حال کے مطابق نعمتیں پاتے ہیں کہ یعنی وہ ملائکہ کی طرح اجسام لطیفہ اور وہ اس وقت موجود اور زندہ ہیں۔

ف: علامہ فناری تفسیر الفاتحہ میں لکھتے ہیں کہ وہ ہر نعمت جو صدیقین اور شہداء وصالحین برزخ میں پاتے

ہیں وہ خیالی ہیں اسی طرح ہر وہ عذاب جو جہنمیوں کو ملتا ہے وہ بھی خیالی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جب نفخ صور ہو گا تو تمام مخلوق اس وقت اُٹھے گی تو ہر ایک اپنی برزخ کی ہر بات کو محسوس کرے گا کہ گویا وہ خواب میں تھا جیسے نیند سے جاگ اٹھتا ہے اسے خواب کی باتیں خیالی معلوم ہوتی ہیں اسی طرح جب انسان مرتا ہے اسے برزخ کی طرف منتقل کرنے میں اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نیند سے اُٹھنے والے کو خواب کی بات محسوس ہوتی ہے کیونکہ حیات دینا اس کے لئے بمنزلہ خواب کے تھی جب عالم آخرت میں اٹھے گا تو اسے برزخ اور حیات دنیا اسے نیند ہی محسوس ہوں گی۔ حقیقی بیداری تو وہی ہے جو کہ آخرت میں اٹھ کھڑا ہو گا۔

ف : اسئلہ الحکم میں ہے کہ برزخ اور آخرت کے جملہ امور دنیا کے کسی ایک امر سے بھی مناسبت نہیں رکھتے تا کہ اسے مثال دے کر سمجھایا جا سکے ارواح کو بعد الموت نعمت اور عذاب حسی و جسمانی نہیں بلکہ وہ ایک معنوی شئے ہوں گے۔ البتہ اجسام کو ارواح میں نعمت حسی و معنوی دونوں نصیب ہوتی ہیں۔

حکایت: حضرت حافی رحمۃ اللہ علیہ کو وصال کے بعد خواب میں دیکھ کر کہا گیا کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش کر آدھی جنت عطا فرما دی۔

ف : اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ نعمتیں جو روح کے لائق تھیں وہ روح کو دی گئیں یہ انکے لئے آدھی بہشت تھی اور بہشت کا دوسرا آدھا حصہ وہی ہے جو انہیں (حشر میں اٹھا کر) بہشت میں داخل کیا جائیگا اس طرح سے اس کے بہشت کے دوسرے حصہ کی تکمیل ہو گی۔

ف : مردہ موت کے بعد برزخ میں کھانے پینے کو ایسے محسوس کرتا ہے جیسے خواب میں نیند والے کو کھانے پینے کا احساس ہوتا ہے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

حدیث شریف : نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کے ہاں رات گزارتا ہوں وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے اسی طرح برزخ میں ہو گا کہ میت اللہ تعالیٰ سے ایسی غذا پاتا ہے جس کا ہمیں احساس نہیں ہوتا البتہ میت کو محسوس ہوتا ہے۔

سوال: نبی زندہ اور غیر نبی (نیند والے) میں کیا فرق رہا؟

جواب: نبی علیہ السلام بھوکے سوتے جب بیدار ہوتے تو پیٹ کھانے سے پر پاتے یعنی سیر ہوتے ہیں اور

غیر نبی خواب میں نیند میں کھاتا پیتا تو ہے لیکن جب جاگتا ہے تو بدستور بھوکا ہوتا ہے۔

سوال: اولیاء اللہ (تعالیٰ) تو خواب میں کھاتے پیتے ہیں لیکن جب اُٹھتے ہیں تو بھوک محسوس نہیں کرتے۔

جواب: چونکہ اولیاء اللہ وارث نبی کریم ﷺ ہوتے ہیں اسی لئے وہ کھانے پینے کا وہ اثر پاتے ہیں تو وہ نبوت کی وارثت کی وجہ سے ہے جس کا انہیں وارث بنایا گیا کیونکہ سچا خواب نبوت کے چھیالیسویں حصے سے ہے بہت سے اولیاء اللہ کے واقعات (مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے) کہ جو کچھ وہ خواب میں کھاتے پیتے ہیں تو جب اُٹھتے ہیں تو اس طعام و مشروب کی خوشبو اپنے منہ سے پاتے ہیں اور جو کچھ کھاتے ہیں اس سے سیر ہو کر اُٹھتے ہیں یہ نبوت کی وارثت کی دلیل ہے۔

ف: فرمان نبوی کہ اَلَسْتُ کَهَیْئَتِکُمْ میں تمہاری طرح نہیں ہوں یہ باعتبار اغلب الحال کے ہے نہ باعتبار کل کے

نتیجہ: شہدا کا نعمتوں کا برزخ میں حاصل کرنا ایسے ہے جیسے ولی اللہ کا خواب میں نعمتوں کا پانا ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو کیونکہ جس جسم سے بحث کی جارہی ہے وہ جسم لطیف ہے اور وہ بھی لائق ہے اسے برزخ میں اس مرتبہ کے مطابق نعمتیں دی جاتی ہیں خواہ انہیں خیالی نعمتوں سے تعبیر کیا جائے یا معنوی سے یا جسمانی سے مراد لطیف ہے کثیف اور دنیا میں جسم کثیف کو وہ نعمتیں چاہیں جو کثیف ہوں نہ غیر۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا بہشت میں شہدا کیساتھ بھی کسی دوسرے کا حشر ہوگا آپ نے فرمایا ہر وہ شخص شہیدوں کے ساتھ اُٹھے گا جو دن ورات یعنی چوبیس گھنٹوں میں موت کو چوبیس بار یاد کرتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ اس شخص کے متعلق گمان بھی نہ کرو جو جہاد میں اللہ تعالیٰ کے جلال کی تلوار سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید کیا گیا ہے وہ مردہ ہیں اگرچہ ان کے وجود کے اوصاف فانی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ اپنے موجد کے شہود کے ساتھ زندہ ہیں جسے فنا فی اللہ اور بقا باللہ نصیب ہو جاتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کبھی تجلیات جلال کے سطوات سے فنا کرتا ہے اور کبھی اسے الطاف و جمال کے نفحات سے زندہ کرتا ہے بے شک وہ لوگ ریاض الجمال کی سیر کرتے ہیں لیکن تم ان کے احوال کو نہیں جانتے اور نہ ہی

[illegible]

ف: امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ان کے اجسام فنا ہو جاتے ہیں لیکن ان کے ارواح کو بقا ہوتی ہے۔

ف: شیخ جنید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس کی زندگی اپنے نفس تک محدود ہوتی ہے اس کی موت روح کے نکل جانے کو کہتے ہیں اور جو اپنے رب کی ذات کی وجہ سے زندہ ہے تو وہ حیات طبع سے منتقل ہو کر اصلی حیات کی طرف لوٹ جاتا ہے اس کی حقیقی حیات یہی ہے۔ مثنوی شریف میں ہے۔

میکند دندان بدرا آں طبیب   تا رہد از درد و بیماری حبیب

پس زیادہ تہا دروں نقصا ست   مر شہیداں را حیات اندر فنا ست

گر یکے سر را ہبر واز بدن   صد ہزاراں سر برآرد در زمن

حلق ببریدہ خورد شربت ولا   خلق ازالا رستہ مردہ در بلا

ترجمہ: گندے دانت ڈاکٹر نکال دیتا ہے تاکہ بندے کو درد والم سے نجات نصیب ہو یہ زیادتیاں اس کے اندرونی حصے سے ہوئیں ورنہ ظاہر ہے شہیدوں کی حیات فنا میں ہے اگر کسی کو شہادت دے کر اس کا ایک سر کاٹ لیتا ہے تو فوراً اسے سینکڑوں سر نصیب ہو جاتے ہیں شہید سر کٹوا کر دوستی حق کے شربت پیتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ محذوف کا جواب ہے یعنی اللہ کی قسم تمہارے ساتھ آزمائش کئے ہوئے لوگوں جیسا معاملہ کریں گے (اس کے بعد دیکھا جائے گا) کیا تم بلا پر صبر کرتے ہو تقدیر کے سامنے سر جھکاتے ہو یا نہ کیونکہ آزمائش جو ہر نفس کے لئے کسوٹی ہے اس میں ظاہر کر کے دکھا دیں گے کہ تم میں سے مطیع کون ہے اور نافرمان کون اس کا معنی یہ نہیں کہ پہلے ہم نہیں جانتے تھے اور اب جانیں گے بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ تھوڑے سے دشمنوں کے خوف سے۔

سوال: خوف اعداء کو تھوڑا کیوں فرمایا؟

جواب: اعداء کے نقصان سے ان سے حفاظت ہزار درجے بہتر ہے اور تھوڑی سی وَالْجُوعِ بھوک یعنی قحط وغیرہ۔

سوال: ابھی تو ان پر بھوک واقع نہیں ہوئی تھی پھر قبل از وقت اس کی خبر کیوں دی گئی؟

جواب: تاکہ ان کے نفوس پہلے سے تیار رہیں اور اس پر صبر کرنا آسان ہو کیونکہ اچانک تکلیف بہ نسبت انتظار

کے بعد زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ اس کا عطف شیء پر ہے تمہارے تھوڑے سے مال بھی گھٹا کر یعنی چوری اور لوٹ مار اور بادشاہوں کے ظلماء مال چھیننے اور اس کے ہلاک کرنے اور گھاٹے میں ڈالنے سے تمہاری آزمائش کریں گے وَالْاَنْفُسِ اور نفسوں کو گھٹانے سے قتل اور موت اور مرض اور بڑھاپا مراد ہے وَالثَّمَرٰتِ یعنی آمائش ہوگی انگوروں کے ثمرات کے چلے جانے اور درختوں کو گرمی سردی پہنچا کر اور ایسے ہی ہوا اور رنڈی بھیجنے سے اسی طرح دیگر آفات ہیں۔

ف : کبھی نقص ثمرات تعمیرات کے ضیاع سے ہوتا ہے جہاد کی وجہ سے۔

مسئلہ : حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں اَلْخَوْفِ سے خوف الٰہی اور الْجُوْعِ سے صیام رمضان اور وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ سے زکوٰۃ صدقات اور الانفس سے امراض اور الثمر ات سے اولاد مراد ہے۔

جواب : قاعدہ ہے جب توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس وقت یہی معنی مراد ہوتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے تَابَ اللّٰهُ يَتُوْبُ بمعنی قبول التوبۃ جو کہ مغفرت کے معنی کو متضمن ہے یعنی جس نے توبہ کی اس سے اللہ تعالیٰ نے عذاب کو ہٹا دیا۔

وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ اور میں توبہ قبول اور رحم کرنے والا ہوں یعنی توبہ کرنے اور رحمت بھیجنے میں بہت زیادہ فضل و کرم کرتا ہوں۔

ربط : جب اللہ تعالیٰ نے زندہ ملعونوں کا ذکر فرمایا تو انکے ساتھ ان لوگوں کا ذکر بھی فرما دیا جو مرے ہوئے ملعون ہیں چنانچہ فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جن لوگوں نے کفر کیا یعنی اپنے کفر پر مصر رہے اور کتمان حق کے پیچھے لگ رہے لیکن توبہ نہ کر سکے وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اور مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے یعنی اپنے کفر پر اصرار کرتے رہے اور اپنی اسی حالت کفریہ سے بدل نہ سکے۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ان پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے یعنی وہی لوگ لعنت کے مستحق ہیں زندگی میں اور موت کے بعد بھی اور وہ حضرات جو ان پر لعنت کرتے ہیں وہ

اہل ایمان ہیں کیونکہ النَّاسِ درحقیقت اہل ایمان ہی ہیں اس لئے کہ انسانیت سے یہی حضرات نفع اٹھانے والے ہیں اور کافر تو جانوروں کی طرح بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا کوئی اعتبار نہیں یا النَّاسِ سے عام لوگ مراد ہیں اس لئے کہ قیامت میں کافر بھی ایک دوسرے پر لعنت کریں گے پھر ان پر فرشتے لعنت کریں گے پھر باقی لوگ اسی طرح ظالمین ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔

مسئلہ: جب ظالم پر کوئی لعنت کرتا ہے حالانکہ لعنت کرنے والا خود بھی ظالم ہو تو گویا وہ اپنے آپ پر لعنت کرتا ہے خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے کیونکہ جب وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جائیں گے۔ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا یہ نیا جملہ ہے ان پر کثرت سے عذاب من حیث الکیف کا بیان ہے جب کہ اس سے پہلے کثرت عذاب من حیث الکم کا بیان تھا۔ یعنی نہ ان سے عذاب اٹھایا جائے گا اور نہ ہی ہلکا کیا جائے گا وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ اور نہ ہی وہ مہلت دیئے جائیں گے ینظرون الانظار سے مشتق ہے یعنی الامہال مہلت دینا و التاجیل معیاد مقرر کرنا یعنی نہ انہیں لوٹنے کی مہلت ہوگی اور نہ توبہ کا موقعہ دیا جائے گا اور نہ ان کی معذرت قبول کی جائے گی۔ یا معنی یہ ہے کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوتا رہے گا۔

ف: جب ہم کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ اس میں ہم اقرار کرتے ہیں کہ تمام ملک اسی کا ہے وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اور ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں اس میں ہم اقرار کر رہے ہیں۔ کہ ہم نے ایک دن فنا ہونا ہے۔

سوال: رجوع الی اللہ کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مکانیت وجہت ہو حالانکہ وہ مکانیت وجہت سے پاک ہے۔

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ وہاں حاضر ہوگا جہاں سوائے اس مالک کے کسی کا حکم نہیں چلے گا اور وہ دار آخرت ہے کہ اس میں سوائے اللہ کے کسی کا حکم نہیں نہ حقیقۃً نہ ظاہراً بخلاف دار دنیا کے کہ اس میں ظاہری طور بعض کو کچھ نہ کچھ حاصل ہے۔

ف: مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے میں چند فائدے ہیں۔

۱۔ بندہ اس کلمہ کے پڑھنے سے لغویات سے بچ جائے گا۔

۲۔ جب دوسرا اس سے پڑھتا ہوا سنے گا تو وہ اس کی تقلید کرے گا تو اس کو بھی ثواب ملے گا اور اس کو بھی۔

۳۔ جب زبان سے یہ کلمہ پڑھے گا تو قلب پر حسن اعتقاد کا اثر یعنی تقدیر ربانی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا خیال اترے گا کہ دیتا بھی وہی ہے اور لیتا بھی وہی۔

نکتہ : اس کی وجہ یہ ہے کہ مصیبت پر بندے کا دل گھبرا جاتا ہے اور اس کے لئے ایسے کلمہ کی ضرورت ہے جو اسے قضاو قدر کے سامنے جھکانے کا ادب سکھائے۔

حدیث شریف: میں ہے جب بھی مصیبت کسی بندے کو پہنچتی ہے تو کہتا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اللّٰهم اجرنی من مصیبتی و اخلف لی خیرا منها ان کلمات کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت کا بڑا اجر اور نعم البدل عنایت فرماتا ہے۔

ف : مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنا صرف امت محمدیہ علی صاحبا الصلوۃ السلام کو نصیب ہوا ہے ورنہ اگر کسی کو اس کلمہ کے کہنے کی اجازت ہو تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہوتی۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی گمشدگی پر کہا تھا۔ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ

مسئلہ: مصیبت کے وقت صرف زبان سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنا ہی نہیں بلکہ قلبی طور ماننا ضروری ہے زبان سے یہ کلمات کہے اور دل سے انکی تصدیق کرے مثلاً یہ تصور کرکے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے اور جتنا احکامات کا اسے مکلف بنایا ہے ان کو سر تسلیم کرکے فرمانبرداری کرنا اور قضا کو پورے طور پر ماننا یعنی جو کچھ دیتا اور لیتا ہے سب اسی کی تقدیر ہے جس نے ملک و ملک اللہ تعالیٰ کا مانا پھر کسی کی کیا مجال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے چھین سکے اور اس کی تقدیر نہ مانے اور یقین کرے کہ جو کچھ عالم ملک میں ہے وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کا ہے اسے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرے کہ جو کچھ لے لیا ہے وہ تو کچھ بھی نہیں اور جتنی بندے کے لئے نعمتیں باقی رکھی ہیں وہ اتنی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔

ف :مبشر به محذوف ہے جس پر اس کا قول اُولٰٓئِكَ کرتا ہے اس سے وہ صابرین مراد ہیں جو اوصاف مذکورہ کے موصوف ہیں۔

عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ ان پر رحمتیں نازل ہوں۔ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ان کے رب کی طرف سے اور رحمت نازل ہو۔

سوال: صَلَوٰتٌ کو جمع اور رَحۡمَةٌ کو واحد کیوں؟

جواب۱: ان کی کثرت اور تکرار کی طرف اشارہ ہے۔

جواب۲: رَحۡمَةٌ کی تنوین نے جمع کے صیغے لانے سے مستغنی کر دیا ہے۔

جواب ۳: بندے کو جتنا رحمت عنایت ہوتی ہے اس سے دنیا کے نقصانات دفع کئے جاتے ہیں اور صلوت سے آخرت کے جمیع برکات وعنایات مراد ہیں۔

ف: صَلَوٰتٌ وَرَحۡمَةٌ کو جمع کرنے میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت غیر منقطع ہے اب معنی یہ ہوا کہ رحمت کے جمیع فنون سب ان کے مالک امور کی طرف اور وہی انہیں کمالات تک پہنچانے والا ہے جو ان کے لائق ہیں۔

سوال: اس سے یعنی صَلَوٰتٌ وَرَحۡمَةٌ کو جمع کرنے میں تکرار لازم آتا ہے اور یہ نامناسب ہے۔

جواب: صَلَوٰتٌ سے مراد مدح وثنا اور تعظیم مراد ہے اور رحمت سے لطف واحسان اس طریق سے تکرار لازم نہیں آتا۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ یہی لوگ حق وصواب کے ہدایت پانے کے ساتھ مخصوص ہیں اس کے لئے انہوں نے مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے سامنے سر جھکایا۔

حدیث شریف: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں آسمان سے نیچے گرائے جانے کو پسند کر سکتا ہوں لیکن یہ گوارہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے متعلق کہوں کہ کاش کہ یہ واقع نہ ہوتی۔

ردشیعہ: وہ تکالیف جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچیں ان پر صبر کرنا ضروری ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ عادل حکیم کی طرف سے پہنچتا ہے۔ اس میں عدل اور حکمت ہوتی ہے اس عدل وحکمت کا تقاضہ یونہی تھا۔ اس بناء پر بندہ کو اس پر راضی ہونا واجب ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ سوائے حق کے کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

مسئلہ: اگر ظالموں کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کرنا واجب نہیں بلکہ ہر ممکن اس کے لئے مدافعت کرنا ضروری ہے بلکہ لڑنا ممکن ہو تو لڑے اگر ایسی صورت میں مارا گیا تو شہید ہوگا۔

ف: ابتلاء وآزمائش تصفیہ قلوب کا سبب ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جتنی مجھے ایذاء دی گئی اتنی کسی اور نبی کو نہیں دی گئی۔ یعنی جیسے میرے لئے صفائی قلوب کے اسباب بنائے گئے کسی نبی کے لئے نہیں بنائے گئے۔

ف: عاشق صادق کی نگاہ میں وفاء جفا برابر ہے جیسے حضرت صائب نے فرمایا۔

صائب شکایت از ستم مار چوں کند ہر جا کہ عشوہ ہست وفاء وجفا یکست

(صائب اپنے دوست کے ستم کی کیوں شکایت کرے اس لئے کہ محبوبوں کے ہاں اشارے ہوتے ہیں وہاں وفا و جفا برابر سمجھا جاتا ہے)

حدیث شریف: حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے جد رسول خدا ﷺ سے سنا آپ فرمایا کرتے اے میرے بیٹے قناعت کو لازم پکڑو۔ لوگوں سے مستغنی ہو جاؤ گے اور فرض کی ادائیگی میں کمی نہ کرو۔ تمام لوگوں سے زیادہ عابد رہو گے۔ اے میرے بیٹے بہشت میں ایک درخت ہے اسے شجرة البلوی کہا جاتا ہے اور قیامت میں جب اہل آزمائش کو بلایا جائے گا۔ تو نہ تو ان کے لئے حساب کا دفتر کھولا جائے گا اور نہ ہی ان کے لئے ترازو رکھا جائے گا ان پر موسلا دھار بارش کی طرح اجر وثواب برسایا جائے گا اس کے بعد یہ آیت پڑھتے۔ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر وثواب عنایت ہو گا۔

ف: صبر کے متعلق اور مضامین نہ ہوتے تو صرف ایک سلیمان علیہ السلام کے پرندہ کی حکایت کافی تھی۔

حکایت: حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ایک پرندہ تھا جو بہت خوش آواز تھا اور اس کی صورت بھی بڑی اچھی تھی۔ ایک شخص نے اسے ہزار درہم میں خریدا اس کے پنجرے کے قریب آ کر اس کا ہم جنس ایک آواز دے کر اُڑ گیا اس کے بعد وہ پرندہ بولنے سے خاموش ہو گیا۔ اس مرد نے اس پرندہ کی شکایت حضرت سلیمان سے کی۔ آپ نے فرمایا پرندے کو میرے پاس لاؤ جب وہ حاضر کیا گیا تو آپ نے پرندے سے فرمایا کہ تیرے مالک کا تیرے اوپر حق ہے جب کہ اس نے تجھے بھاری قیمت دے کر خریدا ہے لیکن تو آج کل خاموش ہے پرندے نے عرض کی اے اللہ کے نبی علیہ السلام میرے مالک سے فرمائیں کہ اب وہ مجھے قید سے رہا کر دے میں جب تک پنجرے میں ہوں ہرگز نہیں بولوں گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اس کی کیا وجہ ہے۔ پرندے نے عرض کی میرا چیخنا چلانا اپنے وطن اور اولاد کے فراق کی وجہ سے تھا لیکن میرے ساتھی پرندے نے مجھے سمجھایا کہ تجھے قید صرف تیری خوش آوازی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ جب تک تو اپنی آواز کو دبائے گا نہیں تیری

نجات ناممکن ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندے کے مالک کو فرمایا سنا تو نے وہ کیا کہتا ہے اس شخص نے کہا اے اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام واقعی میں نے اسے اس کی آواز کے لئے محبوس کیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندے کے مالک کو ہزار درہم دے کر اس کو چھوڑ دیا وہ پرندہ اُڑتا ہوا خوش آواز سے پڑھتا جا رہا تھا۔ سبحان اللہ من صورنی فی الھوا طیر نی فی القفس صبرنی پاک وہ ذات جس نے مجھے حسین بنایا اور ہوا میں اُڑنے کی طاقت بخشی اور پنجرے میں مجھے صبر کی توفیق بخشی۔ اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا جب تک پرندہ جزع فزع کرتا رہا محبوس رہا اور جب اس نے صبر کیا اسے نجات ملی۔

تفسیر صوفیانہ دراصل اس میں اشارہ ہے اوصاف نفس کے فنا کی طرف بندہ جب تک اضطراری موت اختیار نہ کرے وہ حیات حقیقیہ کی طرف نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی شریف میں فرمایا ہے۔

دانہ باشی مرغانت برچنید غنچہ باشی کودکانت برکنند

ترجمہ: دانہ ہوگا تو تجھے پرندے کھاجائیں گے غنچہ بنے گا تو تجھے لڑکے کاٹیں گے۔

ہر کہ داد حسن خود درام زمراد صد قضائے بد سوائے او رونہاد

تن قفس شکاست وتن شد خار جاں درفریب داخلان وخارجاں

ترجمہ: جو اپنے حسن کو بکاؤ کا مال بناتا ہے تو اس کی طرف ہزاروں مصیبتیں آتی ہیں جسم دیکھنے والوں کا پنجرہ ہے۔ اسی لئے یہ ہر ایک کے فریب میں پھنس جاتا ہے۔

حضرت الشیخ الشہیر با فتادہ آفندی قدس سرہ نے فرمایا انانیت کی نفی نہایت ضروری اور وجود عارضی کو بحر الوجود الحقیقی ہیں فنا کرنا واجب ہے تاکہ مقصود حاصل ہو یعنی روحانی تکمیل ہو۔ حضرت صائب نے فرمایا۔

ترک ہستی کن کہ آسودا ست از تارج سیل

ہر کہ پیش از سیل رخت خود ابروں از خانہ ریخت

ترجمہ: ہستی کا وہم بھی ختم کر ڈالو اسی لئے سب سے آسودہ تر وہی ہے جو سیلاب کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنا سامان محفوظ جگہ پر لے جائے۔

ف: حضرت الشیخ افتادہ آفندی قدس سرہ نے فرمایا کہ مراتب سے عبور کرنا چاہیے اور عبور کا محل ایک مرتبہ ہے جسے وادی الحیرۃ کہا جاتا ہے اس میں سالک اپنے مطلوب کو جانتا تو ہے لیکن پہنچ نہیں سکتا پھر اسی وادی حیرۃ وحرارت سے چکر لگاتا ہے اس حرارت سے وہ اپنی انانیت کو جلا دیتا ہے۔

ف: اسے وادی حیرت اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہاں پر سالک حیران سا ہو جاتا ہے پھر نہ تو وہ آگے جا سکتا ہے اور نہ پیچھے آ سکتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اللھم زدنی حیرہ اے اللہ میری حیرت میں اضافہ فرما۔ اسی حیرت کی طرف اشارہ ہے بہت سے سالکوں کو یہ مرتبہ نصیب ہی نہیں ہوتا جب تک مرشد کامل رہبری نہ کرے اس کا عبور بالکل ناممکن ہے اے اللہ ہمیں اسماء وصفات کی تجلیات کے لئے تیار فرما اور اپنی ذات کے مشاہدات کے پیالے عطا فرما۔ آمین۔

تفسیر عالمانہ

اِنَّ الصَّفَا مکہ معظمہ کی ایک پہاڑی کا نام ہے۔

سوال: اس پہاڑی کو صفا کیوں کہتے ہیں۔

جواب: چونکہ اس پر سیدنا آدم صفی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بیٹھے تھے۔ ان کے لقب شریف صفی اللہ کی وجہ سے اس کا نام الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ ہے یہ ایک پہاڑی کا نام ہے جو کہ مکہ معظمہ میں ہے۔

سوال: مروہ کو مروہ کیوں کہتے ہیں؟

جواب: اس پر بی بی حوا علیہا الصلوٰۃ والسلام بیٹھی تھیں۔ امرأۃ آدم کی نسبت سے اس کا نام مروہ پڑ گیا۔

مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ کے شعائر سے ہیں شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ بمعنی علامت یعنی صفا مروہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی علامات سے ایک علامت ہے کیونکہ یہ ہر دونوں حجاج کے ٹھہرنے اور دوڑنے اور قربانی کرنے کے مقامات ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اطاعت کا نشان بنا دیا تا کہ ہم انہیں دیکھ کر مخصوص عبادت کریں۔

ف: مروی ہے کہ صفا پر ایک بت تھا مرد کی صورت میں جسے اساف کہا جاتا۔ اسی طرح مروہ پر بھی ایک بت تھا عورت کی صورت میں اسے نائلہ کہا جاتا اسلام کے تشریف لاتے ہی انہیں ہٹا دیا گیا۔

شان نزول: بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ دونوں ایک مرد اور عورت تھی انہوں نے کعبہ میں زنا کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی صورتیں مسخ کر کے پتھر کر دیا پھر یہاں رکھ دیئے گئے تا کہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو جب بہت بڑا

عرصہ گزرا تو ان کی پرستش ہونے لگی جاہلیت کے لوگ کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تو انہیں تعظیم کے طور پر ہاتھ لگاتے جب دور اسلام شروع ہوا تو تمام بت توڑ دیئے گئے ان میں یہ صفاء مروہ والے بت بھی تھے۔ مسلمانوں کو صفاء مروہ کی سعی کا حکم ہوا تو ان کو یہاں صفاء مروہ پر جانے سے نفرت ہوتی صرف انہی بتوں کی وجہ سے۔ کیونکہ صحابہ کرام ہر فعل جاہلیت سے کراہت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ ان کے مابین طواف کرنا چاہیے اور فرمایا یہ تو شعائر اللہ ہے۔

نکتہ : صفاء مروہ کے مابین دوڑنے کا حکم صرف اس لئے مشروع ہوا تاکہ بی بی ہاجرہ کی یاد تازہ ہو چنانچہ ان کی حکایت مشہور ہے جب انہیں اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پیاس نے تنگ کیا تو بی بی صاحبہ یہاں پر دوڑتیں اور پہاڑ پر چڑھ کر دعا مانگتیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بدولت چشمہ زمزم کھولا اور انکی دُعا قبول فرمائی اور قیامت تک بندوں پر ان کے مابین دوڑنا اور پہاڑوں پر چڑھنا اور وہاں دُعا مانگنا عبادت بنا دیا۔

حدیث شریف : یہ ہے صفا مروہ بہشت میں دو دروازوں کا نام ہے دو مقام ایسے ہیں جن کے درمیان دُعا مستجاب ہو جاتی ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان ستر ہزار نبیوں کے مزارات ہیں اور ان کے درمیان دوڑنے سے ستر غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ اور وہ جو حج یا عمرہ کرے۔

ف : الحج لغت میں قصد کو کہتے ہیں جو عمرہ معنی زیارت اور ان دونوں میں قصد و زیارت ہوتی ہے اسی لئے اس نام سے موسوم ہوئے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ پس اس پر کوئی گناہ نہیں۔

ف : جُنَاحَ کا اصل جنح بمعنی مال عن العقد والخیر الی الشر ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کوئی اپنے ارادہ سے بدل جائے اور خیر سے شر کی طرف جھک جائے أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا یہ کہ ان دونوں کا طواف کرے۔

ف : طواف کے ہر چکر سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور یہ اس لئے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خیال گزرا کہ ان کے چکر لگانا گناہ نہ ہو جب کہ ہم جاہلیت میں بھی طواف کے ایسے چکر لگاتے تھے۔

سوال : اس سے ثابت ہوا کہ یہ طواف واجب نہیں حالانکہ حنفیہ کے نزدیک یہ طواف واجب ہے۔

جواب : ایسی عبادت وجوب کے لئے بھی مستعمل ہوتی ہے۔

ف : اَنْ یَّطَّوَّفَ (بقانون علم صرف ان طوف ہوا)

سوال :تفعل کے باب میں کون سی حکمت ہے جب کہ مجرد کے باب سے بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا تھا۔

جواب: چونکہ تفعل کے باب میں تکلف ہوتا ہے اس لئے اس میں یہ حکمت ہے کہ طواف کرنے والے کو چاہئے کہ اس عمل میں جد و جہد کرے اور اپنی کوشش کو اس میں صرف کرے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا جو اپنے طور پر نیکی کرتا ہے تَطَوَّعَ اصل میں اپنے طور پر فعل کو کہتے ہیں نہ کہ کسی کے مجبور کرنے سے گویا کہا گیا کہ جس نے کوئی عمل کیا یا طاعت گزار ہو کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا۔ تطوّع فعلاً کو متضمن ہے یا متعدی بنفسہٖ ہے یا تبرع کے معنی میں ہے جیسے کہا جاتا ہے طاع یطوع ای یتبرع اب معنی یہ ہوا کہ جو شخص اس عمل کو جو اس پر فرض نہیں محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کی وجہ سے بجالاتا ہے اس معنی پر خیرا کا منصوب بنزع الخافض ہوگا اصل عبادت یوں تھی من تطوع تطوعا بخیر ، فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ بے شک بندوں کا شکر قبول کرنے والا ہے یعنی انہیں ان کے عمل کی جزا دینے والا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ شاکر جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی اللہ تعالیٰ کو ان کے نیک عمل پر جزا دینے والا مستعمل ہے۔

ف: حضرت ابن التمید اپنے حواشی میں فرماتے ہیں کہ جب شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو رضی عن العبد کے معنی میں آتا ہے اور ثواب دینا تو رضا کو لازم ہے۔ اس طرح شکر کی ملزوم ہوئی۔ پس شکر مجازاً معنی رضی ہوگا۔ پھر رضا سے معنی ثواب دینا میں مجاز ہوگا۔ اس طرح شکر بمعنی ثواب دینے کے مجاز دوسرے مرتبہ پر ہوگا۔

عَلِيْمٌ عبادت گزار کی عبادت کو جانتا ہے اور اس کی نیت کو بھی۔

مسئلہ: آیت میں نفلی طاعات کی ایسے ترغیب دی گئی ہے جیسے فرائض پر ترغیب دی جاتی ہے۔

سبق: اندازہ کیجئے کہ جو صرف ایک نفلی عبادت کی بھی اللہ تعالیٰ جزا دیتا اور اسے جانتا ہے تو پھر ایک سے زائد نفلی عبادات کا کیا کہنا۔

حکایت: حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سال میں حج کے لئے گیا مجھے خیال گزرا کہ اب کی بار جبل عرفات سے لوٹ کر آئندہ حج کے لئے حاضر نہیں ہوں گا۔ (مشاہد عرفات کی دھوپ سے آپ کو

تکلیف پہنچی ہوگی) یہی خیال میرے دل میں تھا کہ میں نے حجاج (حاجیوں) میں دیکھا کہ ان میں ایک بوڑھا جو عصا کے سہارے چل رہا تھا مجھے وہ غور سے تھوڑی دیر دیکھتا رہا میں نے السلام علیکم عرض کیا تو انہوں نے جواباً وعلیکم السلام یا سفیان ارجع عما نویت (اے سفیان اپنے دل کے ارادے کو بدل دیجئے) میں نے کہا سبحان اللہ آپ کو میری نیت کا علم کیسے ہوا۔ انہوں نے فرمایا میرے رب نے مجھے بتایا ہے میں نے اس کے بعد پینتیس حج پڑھے۔ میں پینتیسویں حج کے لئے جبل عرفات میں کھڑے ہو کر حاجیوں کے ٹھٹھہ جانے والوں کو دیکھ کر متفکر ہوا کہ یا اللہ میرا اور ان سب حاجیوں کا حج قبول ہوتا ہے یا نہیں اسی تفکر میں میرا سارا دن گزر گیا یہاں تک کہ حجاج جبل عرفات مزدلفہ کی طرف لوٹنے لگے ان میں کوئی بھی باقی نہ رہا رات ہونے لگی میں اسی فکر میں وہاں سو گیا۔ نیند میں دیکھتا ہوں قیامت قائم ہوگئی ہے اور لوگ حساب و کتاب کے لئے میدان حشر میں جمع ہونے لگے اور سب کے اعمال نامے اڑ کر ہاتھوں میں پہنچنے لگے اور عملوں کی ترازو نصب کی گئی اور پل صراط بچھائی گئی بہشت و دوزخ کے دروازے کھلنے لگے میں نے جہنم کی آواز سنی وہ کہہ رہی تھی اے اللہ میری گرمی اور سردی سے حاجیوں کو بچا۔ اللہ تعالیٰ سے ندا آئی اے جہنم ان کے غیر کے متعلق اپنے لئے ہی سوال کر کیونکہ حجاج تو تیرے اندر آ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ انہوں نے جنگلوں کی پیاس اور گرمی برداشت کی۔ اس وجہ سے قیامت کی گرمی سے حفاظت ہے اور انہیں شفاعت کرنے کا بھی حق دیا گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے میری رضا کو اپنے نفسوں اور اموال پر ترجیح دی۔ حضرت شیخ سفیان ثوری فرماتے ہیں اس کے بعد مجھے جاگ ہوئی اور میں نے شکرانے کا دوگانہ پڑھا اور سو گیا اس کے بعد خواب میں اسی طرح دیکھا اس پر مجھے خیال گزرا نہ معلوم مجھے یہ بات رحمٰن سے دکھائی دیتی ہے یا شیطان سے مجھے آواز دی گئی کہ یہ بات حق سے دکھائی دیتی ہے اس کے بعد حکم ہوا ہاتھ پھیلایئے میں نے ہاتھ پھیلائے تو میرے ہاتھ پر ایک پرچہ لکھا ہوا رکھا تھا اس میں یہ مضمون تھا کہ جو بھی میدان عرفات میں ٹھہرے گا اور بیت اللہ شریف کی زیارت کرے گا اسے اپنے گھر والوں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ حضرت شیخ سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں نے اس پرچے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا حضرت شیخ موصوف فرماتے ہیں اس کے بعد میرا کوئی سال بغیر حج کئے نہیں گزرا یہاں تک کہ اس وقت میں ستر حج پڑھ چکا ہوں۔ (کذافی زھرۃ الریاض)

الاشباہ و النظائر میں ہے کہ سرائے اس لئے بنوانا کہ اس سے لوگ نفع اٹھائیں گے حج ثانی سے افضل ہے اور نفلی حج صدقہ ونافلہ سے افضل ہے اور حج فرض نفلی حج سے افضل ہے اور نفلی حج صدقہ ونافلہ سے افضل ہے حج فرض والدین کی اطاعت سے افضل ہے بخلاف نفلی حج کے کہ اس سے والدین کی اطاعت افضل ہے دولتمند کا حج تنگدست کے حج سے افضل ہے کیونکہ تنگدست کا حج تو کعبہ میں جا کر فرض ہوگا اور باقی آنا جانا اس کا نفلی ہوگا بخلاف تونگر کے کہ اس کا حج اس پر ابتداءً فرض ہے تو اس کا آنا جانا بھی فرضی عبادات میں شامل ہوگا۔

سبق: عاقل کو چاہیئے کہ وہ بیت اللہ کی طرف جائے اور زیارت کعبہ کی کوشش کرے اگرچہ مالی حالات نامساعد ہوں جب ارادہ کرے گا تو مالی حالات بھی سازگار ہو جائیں گے کیونکہ اصلی بات تو توجہ القلب الی جانب الغیب ہے نہ صرف جسمانی ڈھانچے کی جدوجہد، حضرت مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں۔

میل تو ئے مغیلانست وریگ   تو چہ گل چینی زخار مردہ ریگ

ترجمہ: تیرا خیال صرف درختوں (کیکر وغیرہ) اور ریت میں ہے پھر اور کس طرح ان خاروں سے پھول حاصل کرسکتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات قاشانیہ میں ہے کہ صفات سے وجود القلب اور مردہ سے وجود النفس مراد ہیں اس لئے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے دین کے علامات سے ہیں قلب کے مناسک یہ ہیں۔

۱۔ یقین ۲۔ توکل ۳۔ رضا ۴۔ اخلاص

اور نفس کے مناسک یہ ہیں۔

۱۔ صبر ۲۔ شکر ۳۔ ذکر ۴۔ فکر

جس نے بیت اللہ کا حج بڑھا تانی کل ذات سے تو وہ وحدۃ ذاتیہ کے مقام تک پہنچ کر حضرت الٰہیہ میں داخل ہوا یا عمرہ کیا یعنی تو حید صفات اور انوار تجلیات الجمال والجلال کے ذریعے سے مقام مشاہدہ تک پہنچ کر بارگاہ حق کی زیارت کی پس اس وقت اس پر گناہ نہیں کہ ان دونوں کا طواف کرے یعنی ان دونوں مقامات کی طرف لوٹ کر ان کے درمیان چکر لگائے لیکن ان کے وجود تکوینی کو مدنظر رکھ کر بلکہ ان کی حقیقت پر توجہ کر کے کیونکہ ایسا کرنا بہت بڑا نہ وجود موہوبی حقانی جو کہ تمکین کے وقت فنا کے بعد حاصل ہوتا ہے اس لئے گناہ کی نفی

کی گئی ہے کیونکہ اس وجود میں وسعت ہے بخلاف اول کے کہ اس میں اتنی وسعت نہیں پس جس نے نفلی عبادت خود بخود کی یعنی جو کسی کے ساتھ بھلائی کرتا ہے یا تکمیل و تعلیم وارشاد اور شفقت خلق سے مقام قلب میں اور باب اخلاق وطرف بروتقوی اور ضعفاء ومساکین کی معاونت اور شفقت مخلوق میں تحصیل الہم میں مقام نفس میں لیکن سلوک کے کمال حاصل کرنے کے بعد جس نے کسی کے ساتھ بھلائی کی اللہ تعالیٰ بندوں کی طاعت قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے یعنی ان کے عمل پر ان کو مزید ثواب عطا فرماتا ہے اشیاء میں یہ باب تکوین وابتداء اور فترت میں سے نہیں بلکہ باب تصرف میں سے۔

یا خفی الذات محسوس العطاء	انت کالریح و نحن کالغبار
انتا کالماء و نحن کالرجباء	یختفی الریح و غیره جهار

ترجمہ: اے وہ ذات جو خود تو پوشیدہ ہے لیکن تیری عطائیں محسوس ہیں تو پانی کی طرح ہے اور ہم پانی کی چکی کی طرح ہیں تو ہوا اور ہم غبار کی طرح ہیں اور ہوا پوشیدہ رہتی ہے لیکن اسکی غبار کھلی فضاء میں نظر آتی ہے۔

تفسیر عالمانہ

شان نزول: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ یہ آیت یہود کے لیڈروں اور ان کے علماء کی مذمت میں نازل ہوئی یا ہر اس آدمی کے لئے جو دین کے احکام میں سے کسی شئے کو چھپاتا ہے یہی مطلب زیادہ قریب ہے کیونکہ لفظ عام اور عموم سبب خاص کو منع نہیں کرتا الکتمان کے اظہار کو قصداً ترک کرنا باوجودیکہ اس کے اظہار کی ضرورت ہو اس کے اظہار کا سبب حاصل بھی ہو حق چھپانے کے کئی طریقے ہیں۔

۱۔ اصلی بات کو پوشیدہ رکھنا۔

۲۔ اصل شئے کو زائل کر کے اس کے قائم مقام کسی دوسرے شے کو بیان کرنا اور یہودیوں کا کتمان حق یہی تھا کہ وہ حضور ﷺ کے اوصاف شریفہ بیان نہیں کرتے تھے۔

مَآ اَنْزَلْنَا جو ہم نے نازل کیا مِنَ الْبَيِّنٰتِ دلائل سے جو نبی اکرم ﷺ کے فضائل مبارکہ اور مسئلہ رجم اور تحویل قبلہ اور حرام وحلال پر وضاحت کے ساتھ دلالت کرنے والے ہیں۔ وَالْهُدٰى اور ہدایت سے یعنی ایسی آیات جو کہ حضور نبی پاک ﷺ کے مناقب شریف اور آپ کی اتباع اور آپ پر ایمان لانے کی طرف رہبری کرنے والی ہیں۔ مِنْ اس کا تعلق يَكْتُمُوْنَ سے ہے بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ بعد اس کے ہم نے اسے واضح اور ملخص کر کے بیان

فرمایا لِلنَّاسِ تمام لوگوں کو نہ صرف حق کو چھپانے والوں کے لئے فِی الْكِتٰبِ کتاب یعنی توریت میں اور ان کے دلائل وغیرہ کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دلائل وغیرہ ایسے واضح ہیں کہ انہیں ہر ایک سمجھ سکتا ہے ان میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا۔

ف : حضرت ابن الشیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنے حواشی میں لکھتے ہیں کہ الْبَيِّنٰتِ سے مراد وہ کتابیں ہیں جو انبیاء کرام علی نبینا علیہم السلام پر نازل ہوئیں ان میں عقلی دلائل کو کسی قسم کا دخل نہیں اور الہدی میں عقلیہ و نقلیہ ہر قسم کے دلائل شامل ہیں الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ میں دونوں باتوں کا اتحاد لازم نہیں آتا ممکن ہے یہ عطف محض تغایر اللفظین کی بناء پر ہو کیونکہ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ جیسے جملۃ التنزیل سے ہوتا ہے ایسے ہی فائدہ ملخصہ کے طور پر بھی آتا ہے تا کہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

اُولٰٓئِكَ یعنی جن لوگوں کی یہ صفت ہے يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ ان پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے اور انہیں دھتکارتا ہے یعنی انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے بوجہ ان کے حق چھپانے کے يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ان سب پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں یعنی جن سے لعنت کرنا صادر ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر وہ حضرات بددعا کرتے ہیں جیسے ملائکہ کرام اور تمام اہل ایمان انس و جان۔

مسئلہ : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب کسی پر لعنت کی جائے اگر لعنت کرنے والا اور جس پر لعنت کی گئی ہے ان دونوں میں کوئی لعنت کا مستحق نہیں تو پھر وہی لعنت ان یہودیوں پر لوٹتی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے اوصاف مبارکہ کو چھپاتے تھے۔

مسئلہ : لعنت کرنے والوں سے جانور اور موذی مراد ہیں جو کہ نافرمان لوگوں پر لعنت کرتے ہوئے یوں عرض کرتے ہیں۔ اے اللہ تعالیٰ بنی آدم کے ان نافرمانوں پر لعنت بھیج جن کی نحوست سے ہمیں بارش سے محروم رکھا گیا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مگر وہ لوگ جنہوں نے حق چھپانے سے توبہ کر لی۔

ف : یہ استثناء متصل ہے اور مستثنیٰ يَلْعَنُهُمُ کی ضمیر ہے وَاَصْلَحُوْا اور انہوں نے اصلاح کی۔ یعنی جن باتوں میں فساد ڈالا تھا اب ان کی اصلاح کر لی کیونکہ توبہ کے بعد یہ ہوتا ہے کہ جن باتوں میں فساد ڈالا ان کی اصلاح

کر لی جائے مثلاً دین میں ایسا شبہ پیدا کیا کہ جس سے فساد عقیدہ کا خطرہ ہے اب اس پر ضروری ہے کہ اس شبہ کو دور کرے اسی طرح حق کو چھپانے والے پر ضروری ہے کہ توبہ کے بعد حق کو واضح طور پر بیان کرے یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَبَیَّنُوْا سے یعنی ظاہر کر دیا وہ امر جو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں میں بیان فرمایا تا کہ ان کی توبہ مکمل ہو جائے۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ یہ توبہ قبول نہیں ہوتی جب تک وہ عمل بجا نہ لائے جو کرنے کے لائق اور جس کا ترک کرنا ضروری ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ یہی وہ لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور ان پر رحمت کرتا اور ان کے گناہ معاف کرتا ہوں۔

سوال: توبہ کے معنی میں تم نے قبول اور رحمت و مغفرت کہاں سے نکال لئے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ جب کسی کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کیا تم میرے بندے کے بچے کو فوت کر آئے ہو۔ عرض کرتے ہیں ہاں پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم میرے بندے کے دل کا ثمر توڑ آئے ہو عرض کرتے ہیں ہاں پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ کیا کہتا ہے عرض کرتے ہیں وہ تیری حمد کر کے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھتا تھا پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کے لئے بہشت میں محل تیار کرو اور اس کا نام رکھو بیت الحمد۔

تفسیر صوفیانہ اہل معرفت فرماتے ہیں کہ مطالبات غیب یا حال سے یا نفس سے یا اقارب سے یا قلب سے یا روح سے ہیں جو حال کو قبول کر لیتا ہے تو اسے نجات کے درجات نصیب ہوتے ہیں جو نفس ومال سے قبول کرتا ہے تو اسے درجات ملتے ہیں اور اقارب کی موت پر صبر کرتا ہے تو اس کو نعم البدل کے علاوہ قرب الٰہی نصیب ہوتا ہے اور جس نے روح کو قربان کرنے سے دریغ نہ کیا اسے دائمی وصال نصیب ہوتا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَبَشِّرِ رسول پاک ﷺ کے علاوہ انہیں خطاب ہے جن کو خوشخبری دینے کی صلاحیت ہو گی۔ اس میں صبر کی عظمت وجلال کا پتہ چلتا ہے کیونکہ صبر ایک عظیم الثواب عمل ہے اور

یہ انبیاء واولیاء کے بہترین خصائل میں سے ایک خصلت ہے پھر اس کا عامل مستحق ہے کہ اسے ہر ایک خوشخبری سنائی جائے۔

الصّٰبِرِیْنَ مصائب پر صبر کرنے والوں کو الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ وہ لوگ جنہیں مصیبت پہنچتی ہے الاصابة خطاء کی نقیض کو کہتے ہیں ہر وہ شئے جو مومن کو ایذا دے مصیبت ہے۔

ف : مصیبت دراصل الوصول کو کہتے ہیں مثلاً کہتے ہیں مصیبت ہر اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان کو پہنچے حضور علیہ السلام نے فرمایا کل لشئی یوذی المومن فھو له مصیبته ہر وہ شے جو انسان کو ایذا دے وہ اس کے لئے مصیبت ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو تیر پہنچے قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے بندے ہیں۔

مسئلہ : بندہ خود جو اس کے ہاتھ میں ہو وہ سب اس کے مولیٰ کا ہے مولیٰ کی مرضی چاہے وہ بندے کے ہاتھ میں باقی رکھے چاہے اس سے لے لے پھر ہم اس کی اپنی شئے کو واپس لینے پر کیوں روئیں بلکہ ہمیں صبر کرنا چاہیے اگر ہم زندہ رہے تو وہی سب کچھ دے گا اگر مر گئے تو ہم اس کی طرف جانے والے ہیں کیونکہ ہم نے اس کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے پاس ہمارا ثوب ہے اسی لئے ہم اس کے ہر حکم پر راضی ہیں جو کچھ ہمیں وہ عطا فرمائے وہ اس کا فضل ہے اور کریم ہے عطایا واپس لینے میں اسے ضرورت بھی نہیں اگر اس نے واپس لیا ہے تو یہ بھی ہمارے لے ذخیرہ بنائے گا۔عذاب ہوگا ان کی ہر دوسری حالت پہلی حالت سے بہت زیادہ ہوگی انہیں عذاب سے نہ مہلت دی جائے گی اور نہ ہی کسی ایک لحہ کے لئے فرصت ہوگی کہ استراحت کرسکیں۔یا تــنـظـرون نظر سے مشتق ہے۔بمعنی انتظار یعنی انہیں کسی قسم کا انتظار نہ ہوگا کہ وہ عذر کرسکیں۔یا نظر بمعنی رویہ ہے اب معنی یہ ہوا کہ ان پر نظر رحمت نہیں ہوگی۔

سوال : انہیں نار جہنم میں ہمیشہ کیوں رکھا جائے گا؟

جواب : کیونکہ اپنے کفر پر انکی نیت دائمی تھی اور وہ عزم بالجزم رکھتے تھے کہ وہ اپنی بت پرستی پر منہمک رہیں گے جب تک وہ زندہ رہیں گے بت پرستی کو نہیں چھوڑیں گے بدیں وجہ ان کے لئے دائمی عذاب مقرر کیا گیا۔

ف : جہنم کے طبقات اور ان پر عذاب مختلف طور سے ہوں گے جتنا کفریات میں انہماک زیادہ اتنا عذاب زیادہ کیونکہ کفار کی نیات مختلف تھیں جیسے اعمال کے تفاوت سے بہشت کے درجات مختلف ہوں گے۔

ف : تادیب یعنی ادب سکھلانا حکمت ربانی کے لئے ضروری ہے جب کہ کفار نے ذات باری تعالیٰ کے حق میں بڑے عقیدے گھڑے تو انہیں بہشت کی نعمتوں سے محروم اور جہنم میں دائمی طور پر رکھ کر ادب سکھا گیا کسی نے کیا خوب فرمایا۔

سفیاہ نرابو تادیب نافع　　　جنونا نرا چو شربت گشت واقع

(بیوقوفوں کو سزا فائدہ پہنچاتی ہے جیسے پاگلوں کو دوائی)

سوال: یہود کے اس فعل کو کتمان حق وغیرہ اور حب ریاست سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟

جواب: اس لئے کہ انہیں خطرہ تھا کہ وہ اپنے عوام سے وظائف لیتے تھے وہ بند نہ ہو جائیں حالانکہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا یہ فعل جہنم سے نہیں بچائے گا۔

حکایت: حدیث شریف میں ہے کہ زمانہ سابق میں ایک مومن اور کافر شکار کو گئے کافر تو اپنے بتوں کا نام لے کر مچھلی پکڑ لیتا اور مسلمان اللہ کا نام لیتا لیکن مچھلی ہاتھ نہ لگتی۔ آخر اسی طرح ہوتا رہا شام کے وقت مسلمان کو صرف ایک مچھلی میسر ہوئی وہ بھی چھلانگ لگا کر پانی میں چلی گئی مومن خالی ہاتھ واپس لوٹا اور کافر تو بورے بھر کر لایا۔ اس پر مسلمان کے ساتھ رہنے والے کراما کاتبین فرشتوں کو افسوس ہوا اور حیران ہوئے بارگاہ حق میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا اس مومن کی رہائش گاہ کو ملاحظہ کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب مومن کی بہشت میں اتنی بڑی شان ہے تو دنیا میں اسے کچھ ہاتھ نہ آنا اس کا نقصان نہیں۔ اسی طرح کافر کا مسکن جہنم میں دکھایا اور فرمایا کہ اسے مچھلیوں وغیرہ کا ڈھیر جمع کر لینا کوئی فائدہ نہ دے گا۔ جب کہ اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔

(کذا فی شرح الخطب)

نرگس اندر خواب غفلت یافت بلبل صد وصال　　　خفتہ نابینا بود دولت بہ بیداراں رسد

ترجمہ: نرگس خواب غفلت میں سوتی رہی لیکن بلبل نے بیداری سے مزے لوٹے سونے والا اندھے کی طرح ہے بیدار رہنے والے ہی دولت پا لیتے ہیں۔

سبق: (گناہ کے مرتکب کو اگر معلوم بلکہ یقین ہو جائے کہ گناہ کی سزا ایسے ایسے ہے تو وہ کبھی گناہ کے قریب بھی نہ پھٹکے جیسے کسی کو صرف گمان ہو کہ اس سوراخ میں سانپ ہے تو وہ کبھی اس سوراخ میں ہاتھ نہ ڈالے گا)

مسئلہ: یہود کے علماء نے جب اپنے علم سے عملی نفع نہ اٹھایا تو خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے اور ان پر لعنت بھیجے۔

مسئلہ: خانہ میں مذکور ہے کہ کوئی قوم اپنی غلطیوں کی وجہ سے نہیں ماری جاتی بلکہ وہ اپنے لیڈروں کی غلطیوں سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

تفسیر صوفیانہ صرف شیخ الشہیر بافتادہ آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بعینہ یہی حال پیری مریدی کے متعلق ہے کہ مریدوں کی تباہی و بربادی کا دارومدار پیر و مرشد پر ہے کہ جب تک پیر و مرشد راہ ہدایت پر ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کے مرید کو بھی گمراہی سے بچاتا رہتا ہے اس لئے کہ کسی قوم کا مصائب میں مبتلا ہو جانا اس کے لیڈر کی نحوست کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ف: مروی ہے کہ شجرہ ممنوعہ پہلے پہلے بی بی حوا نے کھایا لیکن اس وقت اس پر کسی قسم کا عتاب نازل نہ ہوا لیکن جب حضرت آدم علیہ السلام نے کھایا تو پھر زجر و توبیخ ہوئی۔

سبق: افسوس ہے ارباب حکومت پر کہ وہ اپنے آپ کو تباہی میں ڈال رہے ہیں۔ کہ ان کا ظلم عوام پر بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ دیکھ لینا وہ عنقریب یقیناً جہنم میں جائیں گے اور انہیں مفارقت و جدائی کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کی رحمت سے انہیں محروم رکھا جائے گا۔ اللھم احفظنا (اے اللہ ہمیں بچا)

تفسیر عالمانہ وَاِلٰهُكُمْ یہ خطاب عوام کو ہے یعنی تمہاری عبادت کا مستحق اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ایک ہی ہے وہ اپنی الٰہیۃ میں واحد لاشریک ہے کسی دوسرے کو الٰہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہی معبود ہے اور پس یہ مبتدا کی خبر ہے اور اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کی صفت ہے کیونکہ فائدہ اسی پر مرتب ہوتا ہے کیونکہ اسے اس صفت کے بغیر ہیت لاتا جاتا تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کے لانے میں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں کہ جملہ وحدانیت کی تقریر ہے اور اس کے وہم کو زائل کرنے کے لئے ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ عالم میں اور بھی معبود ہے لیکن وہ عبادت کا مستحق نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی ذات کو پورے طور سمجھ لو اور ہمیشہ صرف اسی کی عبادت کرو اس کے غیر سے کسی قسم کی اُمید نہ رکھو اور نہ اس کے سوا کسی سے ڈرو پس اس کی عبادت کرو اور مستثنیٰ اسم سے بدل ہے لیکن لا علی المحل کیونکہ اس کا محل تو رفع ہے علی الا بتداء اور اس کی

خبر محذوف ہے یعنی دراصل عبادت "لاالٰہ الا کائن لنا موجود فی الوجود الا اللّٰہ "تھی۔

قاعدہ: اسم دو قسم کے ہیں۔ ۱۔ اسم ظاہر ۲۔ اسم ضمیر

اور کلمہ ھو اسم ضمیر ہے اس سے ثابت ہوا کہ کلمہ کا ضمیر ہونا اس کی اسمیت کے منافی نہیں۔

تفسیر صوفیانہ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ نے تفسیر کبیر میں ثابت فرمایا کہ ھو کی ضمیر (ہر رنگ میں راضی) کی حیثیت رکھتی ہے اور محققین فرماتے ہیں کہ ھو اسم بحث ہے کیونکہ ہر وہ ذات احدیث پر دلالت کرتی ہے وہ ان کے نزدیک اسم محض ہے وہ اسم ظاہر ہو یا ضمیر اسی لئے اسے عالم الھو یہ کہتے ہیں الف ولام کو ملا کر اس قاعدہ کو یاد کر لے تجھے بہت نفع دے گا۔

مثنوی شریف میں ہے۔

از ھوا کے ہوی بے جام ھو ‏ اے زھو قانع شد بانام ھو

ہیچ نامے بے حقیقت دیدہ ‏ باز کاف ولام گل گل چیدہ

اسم خواندی رو مستمی را بجو ‏ نہ ببالا دان نہ اندر آب جو

ترجمہ: ہوا ہے ہو کے جام کے بغیر صرف لفظ ھو سے ہونے والے اس کی حقیقت کی تلاش کرو اس لئے کہ کوئی نام حقیقت کے بغیر نہیں ہوتا تو صرف لفظوں پہ خوش رہے حقیقت کو نہیں پہنچے ہو۔اے بھائی جہاں کسی نام کو دیکھا ہے تو اس کے مسمی کو ڈھونڈو وہ نہ اوپر نہ نیچے بلکہ ہر جگہ

گرز نام حرف خواہی بگذری ‏ پاک کن خود راز خود ہیں یکسری

ہم چو آن زاہنی بے رنگ شو ‏ در ریاضت آئینہ بے زنگ شو

خویش را صافی کن از اوصاف خود ‏ تا بنی ذات پاک صاف خود

بنی اندر دل علوم انبیاء ‏ بے کتاب و بے معید و اوستا

علم کان جلوہ زھو بے واسطہ ‏ آن نیابجو رنگ ما شطہ

ترجمہ: اگر صرف نام پر اکتفا کرتے ہو تو بے کار رہو گے تمہیں اپنے آپ سے فارغ ہو کر اس کام کو ہاتھ لگاؤ لوہے کی طرح بے رنگ کر ایسے حرج کش بن جاؤ جیسے شیشہ کو تکلیف ہوتی ہے خودی کے اوصاف اپنے سے دور

کر دیا اس کے بعد تجھے ذات حق صاف نظر آئے گی اس کے بعد تیرے دل میں انبیاء علیہم السلام کے علوم آجائیں گے اور ان کے حصول کے لئے نہ استاد کی ضرورت نہ کتاب کی جو علم ہو کے واسطہ کے بغیر حاصل ہو وہ سنگار نے والے کے رنگ کی طرح دائمی نہیں ہوتا۔

الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ رحم کرنے والا مہربان یعنی وہ تمام نعمتوں کا مالک ہے خواہ وہ نعمتیں اصولی ہوں یا فرعی اس صفت کا صرف وہی مستحق ہے کیونکہ اس کا ماسوایا نعمت ہے یا منعم علیہ اس سے ثابت ہوا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کا مستحق نہیں ہے جب کوئی عبادت کا استحقاق نہیں رکھتا تو وہ معبود نہیں ہو سکتا الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ اس کی روحانیت کی حجتہ ہے۔

نسخہ روحانی: اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں حضور سرور عالم ﷺ سے فرماتے سنا کہ یہ دو کلمے اسم اعظم ہیں۔ ۱۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۲۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے

الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ

لے کر چلتی ہے اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے جلا دیا اور

بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ

زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان و زمین کے بیچ

السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

میں حکم کا باندھا ہے ان سب میں عقل مندوں کے لئے ضرور نشانیاں ہیں اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنالیتے ہیں

اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا

کہ انہیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں اور کیسے ہو اگر دیکھیں ظالم وہ

اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ

وقت جب کہ عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے آئے گا اس لئے کہ سارا زور خدا کو ہے اور اس لئے کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے جب

تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ

بیزار ہوں گے پیشوا اپنے پیروؤں سے اور دیکھیں گے عذاب اور کٹ جائیں گی ان سب کی ڈوریں

الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا

اور کہیں گے پیرو کاش ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم ان سے توڑ دیتے جیسے انہوں نے

مِنَّا كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

ہم سے توڑ دی یونہی اللہ انہیں دکھائے گا ان کے کام ان پر حسرتیں ہو کر اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔

تفسیر عالمانہ شان نزول اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کعبہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت تھے جب کفار نے یہ آیت یعنی اِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ سنی تو متعجب ہوئے ہو کر کہنے لگے کہ یک معبود سب کو کیسے اکتفا کر سکتا ہے اگر محمد ﷺ اپنے دعویٰ توحید کے لئے کوئی ایسی دلیل دیں جس سے ہم سمجھیں کہ وہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یعنی بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے میں یعنی انہیں نئی طرف میں بنانے میں جو کہ یہ دونوں اپنی اپنی شان میں ہیں اور ان کے اندر جو عجائبات اور عبرتیں اور عجیب وغریب صنعتیں تیار فرمائی ہیں جن کے ادراک سے عقول عاجز ہیں۔

سوال: السَّمٰوٰتِ کو جمع اور وَالْاَرْضِ کو واحد کیوں لایا گیا؟

جواب: آسمان مختلف الاجناس ہیں بخلاف زمین کے کہ وہ ایک جنس ہے۔

ف: ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

جواب ۲: ایک آسمان کا فلک دوسرے کے خلاف ہے بخلاف زمین کے کہ اس میں یہ باتیں نہیں کیونکہ سب مٹی کی ہیں۔

ف: ابن التمجید اپنے حواشی میں لکھتے ہیں کہ ہر آسمان کا محدب دوسرے آسمان کی مقعر مافوق کو مس کرتا ہے بخلاف نانویں آسمان عرش الٰہی کے کہ اس کا محدب کسی فلک کی مقعر نافوق کو مس نہیں کرتا کیونکہ اس کے بعد ہمارے نزدیک غیر متناہی خلاء و بعد ہے حکماء فرماتے ہیں نہ اس میں خلاء ہے اور نہ ملا۔

عقیدہ: اس کے متعلق ہونا چاہیے العلم عند اللہ یعنی ان کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ اور شب و روز کے مختلف ہونے میں یعنی ان کے ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنے جانے میں بایں طور کہ ان میں ایک جاتا تو دوسرا آتا ہے مثلاً ایک آئے گا اور دوسرا اس کے چلے جانے کے بعد آئے گا ان کے اختلاف سے ظلمت و نور کی زیادتی ونقصان مراد ہے۔

وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ اور کشتیوں کے دریاؤں کے اندر جاری ہونے میں یہاں تک کہ کشتیاں دریا کی تہ میں نہیں چلتیں باوجود یہ کہ کشتیاں ثقیل و کثیف ہیں اور پانی لطیف و خفیف ہے پھر ان کا آنا جانا ایک قسم کی ہوا سے ہے۔

ف : آیت میں الفلک جمع ہے تجری اس کے لئے صیغہ مونث کا بوجہ جمع تباویل الجماعۃ ہے۔

بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ ساتھ اس کے کہ لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اس میں ما موصولہ ہے اور البناء مصاحبت کی ہے اور جملہ محلاً منصوب تجوی کے فاعل سے حال ہے اب عبارت یوں ہوگی۔

تجری مصحوبۃً باالاعیان و المعانی "الخ "یعنی کشتیاں جاری ہوتی ہیں اور اعیان و معانی کے مصاحب ہو کر اور یہ وہ کشتیاں ہیں کہ لوگوں کو نفع دیتی ہیں بایں طور کہ لوگ ان پر سوار ہو کر اور بوجھ اُٹھا کر نفع پاتے ہیں اس معنی پر یہ کشتیاں اپنے سوار کو نفع پہنچاتی ہیں کیونکہ وہ ان کے ذریعے اپنی تجارت سے نفع پاتے ہیں اطرح وہ بھی نفع پاتے ہیں جن کی طرف کشتیوں پر سوار ہو کر ان کے لئے سامان لے جا رہے ہیں اس لئے یہ کہ محمول الیہ یعنی جس کے لئے سامان لیا جا رہا ہے بما محمل الیہ یعنی جو شئے اٹھا کر لے جا رہی ہے سے نفع پائے گا وَمَا یعنی ان چیزوں میں جو کہ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں سے نازل کیا ہے یہ معنی ابتداغایت کے لئے ہے یعنی آسمان کی جہت سے من ماء پانی سے یہ من بیانیہ ہے اس لئے کہ جو شئے بھی آسمان سے نازل ہوتی ہے وہ عام پانی ہو یا شے اور آسمان سے مراد یا فلک ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بارش اولاً آسمان سے اترتی ہے اس کے بعد بادل سے یا اس سے بلندی کی جہت مراد ہے خواہ وہ آسمان ہو یا بادل کیونکہ ہر وہ شئے جو انسان کے سر پر اوپر ہے اسے عرف میں آسمان کہا جاتا ہے۔ اسی عرف کی وجہ سے ہے کہ مکان کی چھت کو سماء البیت کہا جاتا ہے۔

فَاَحْيَا بِهِ اس کا عطف وَمَآ اَنْزَلَ پر ہے یعنی اترنے والے پانی کے ذریعے سے زمین کو بارونق فرمایا ہے الْاَرْضَ زمین کی مختلف انگوریاں اور پر بہار پھول ان کے علاوہ جو زمین پر مختلف قسم کے درخت ہیں بَعْدَ مَوْتِهَا اس کے ویران ہونے کے بعد یعنی اسکی کھیتی ختم ہونے کے بعد جب کہ درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں جس وقت کہ ان پر خشکی کا غلبہ ہوتا ہے جیسا کہ اسکی طبیعت کا تقاضا ہے۔

ف : حضرت الشیخ اپنے حواشی میں فرماتے ہیں جب زمین کو انگوریوں کے نکلنے کے اسباب ملتے ہیں تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

سوال : ایسے حیوان کی زندگی سے کیوں تشبیہ دی گئی ہے؟

جواب: اس لئے کہ جیسے حیوان کو زندگی ملنے پر حسن اور رونق بڑھ جاتی ہے ایسے ہی جب زمین کو قوت اور انگوریوں کے مختلف انواع حاصل ہوتے ہیں تو زمین کی زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔

وَبَثَّ فِيهَا اور زمین میں پھیلائے ہیں مِن كُلِّ دَآبَّةٍ ہر قسم کے جانوروں میں سے

ف: دَآبَّة ہر اس حیوان کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول۔ اس جملہ کا عطف فا حیا پر ہے۔ ان دونوں کی مناسبت ظاہر ہے کہ زمین کو بارش سے زندگی ملے گی تو ہیج سے پھل پھول پیدا ہوں گے اور انہیں پر حیوان وغیرہ کی زندگی کا دار و مدار ہے۔

وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ اور ہواؤں کے چلنے میں اس کا عطف مَآ اَنْزَلَ پر ہے یعنی ہواؤں کے اپنے اپنے مقامات سے چلنے میں باد صبا ہو یا باد شمالی۔ غربا ہو یا جنوبا اور ان کی کیفیات میں مثلاً گرم اور سرد ہو کر اسی طرح ان کے احوال میں کہ زوردار ہو کر یا نرم نرم ہو کر اور ان کے آثار میں کہ عقیم ہو کر یا مفید ہو کر۔

ف: بعض نے فرمایا ہے کہ تَصْرِيفِ الرِّيَاحِ کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ان ہواؤں کو رحمت اور کبھی ان کو عذاب بنا دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لشکر:۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہوا اور پانی اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں۔

ف ۱۔ ریح کو ریح اس لئے کہتے ہیں کہ یہ نفوس کو راحت پہنچاتی ہے۔

۲۔ حضرت وکیع بن جراح فرماتے ہیں کہ اگر ہوائیں نہ چلیں اور مکھیاں نہ ہوں تو دنیا بدبو سے بھر جائے۔

۳۔ شریح قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہوائیں بیمار کو تندرست اور تندرست کو بیمار بنانے کے لئے چلتی ہیں۔

۴۔ یہی چار ہوائیں بادل کے بارش میں کام آتی ہیں۔

ا۔ صبا بادل کو ابھارتی ہے۔

ii۔ باد جنوبی بادل کو بارش لانے کی قدرت دیتی ہے۔

iii۔ باد غربی اس کے اندر نفع پیدا کرتی ہے۔

iv۔ بادشمالی بادل کو منتشر کرتی ہے۔

۵۔ ہواؤں کی اصولی ہوائیں بھی چار ہیں۔

i۔ بادشمالی جو شمال کی طرف سے آتی ہیں۔

ii۔ جنوبی اس کی بالمقابل کو کہا جاتا ہے۔

iii۔ بادصبا جو کہ از جانب مشرق چلتی ہے۔

iv۔ بادبور اس کی بالمقابل کا نام ہے۔

۷۔ ہر وہ ہوا جو دو ہواؤں کے چلنے کے درمیان سے چلے اسے نکباء (ٹیڑھی چلنے والی) کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ ان چاروں کے چلنے کے مقام سے روگردانی کر کے چلتی ہے۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہوا آٹھ قسم کی ہے چار رحمت کی چار عذاب کی۔ رحمت کی چار یہ ہیں۔

i۔ الناشرات یہی بہت بڑی خوش ہوائیں ہیں۔

ii۔ المبشرات جو بادل کو ابھارتی ہیں۔

iii۔ اللوقح یہ درختوں کے اندر پھل پیدا کرتی ہیں۔

iv۔ الذاریات یہ مٹی وغیرہ اڑاتی ہیں۔

اور عذاب کی چار یہ ہیں۔

i۔ الصرصر

ii۔ العقیم۔ یہ دونوں جنگلوں میں ہوتی ہیں۔

iii۔ العاصف

iv۔ القاصف یہ دونوں دریاؤں میں ہوتی ہیں العقیم یہ وہ ہے کہ درختوں اور بادل وغیرہ میں کسی قسم کا فائدہ نہیں ہونے دیتی۔ العاصم ہر وہ تند ہوا جو خیمے اکھیڑ دیتی ہے۔

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ اس کا عطف تَصْرِيفِ الرِّيحِ پر ہے یعنی وہ بادل جو اللہ کے حکم سے مذلل و منقاد ہو کر

چلتے ہیں یہ اسم جنس ہے اور اس کا واحد سحابۃ آتا ہے۔

ف: سحاب کو سحاب اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خلا میں جلدی سے چلتا ہے گویا کہ وہ کسی شے کو کھینچتا چلا جا رہا ہے بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ یہ باعتبار لفظ کے سحاب کی صفت ہے اور کبھی اس کے معنی کا اعتبار کر کے صفت جمع لائی جاتی ہے جیسے (سحابا ثقالا) ثقالا بمعنی لا ینزل الارض ولا ینکشف یعنی ایسا بادل جو نہ زمین پر اترے اور نہ کھلے حالانکہ بادل کا طبعی تقاضا ہے کہ وہ ان دونوں میں کوئی ایک ضرور ہو یعنی نزول وانکشاف یا اس لئے کہ وہ لطیف وخفیف ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ آسمان پر چڑھ جائے اگر وہ کثیف ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ وہ زمین پر گرے۔

لَاٰيٰتٍ اِنَّ کا اسم ہے اس پر لام داخل ہوئی ہے اس لئے کہ وہ اپنے اسم سے مؤخر ہو کر آیا ہے اگر وہ اپنے مقام پر ہوتا تو اس پر لام داخل نہ ہوتی اور اس کا نکرہ تفخیم کے لئے ہے کما ھی یعنی وہ بہت بڑی آیات جو اس کی قدرت قاہرہ اور حکمت باہرہ اور اور رحمت واسعہ پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ یہ اوصاف تقاضا کرتے ہیں کہ الوہیت صرف اسی ذات حق کے ساتھ مخصوص ہو لِّقَوْمٍ یہ محلا منصوب ہے کیونکہ یہ آیات کی صفت اور اس کا متعلق مخصوص ہے يَّعْقِلُوْنَ یہ محلا وقوع اس لئے کہ قوم کی صفت ہے یعنی یہ آیات ایسی قوم کے لئے ہیں جو ان میں تفکر کرتے اور انہیں عقول وقلوب کی آنکھوں سے دیکھتے اور ان سے عبرتیں حاصل کرتے ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظمت اور اس کی روشن حکمت پر دلالت کرتی ہیں۔ ان اشیاء سے اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے اور انہی وجوہ سے اسے واحد لاشریک لہ مانا جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: اس میں مشرکین کی جہالت پر تعریض ہے۔ جنہوں نے نبی اکرم ﷺ سے ایسی دلیل مانگی تھی جو وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کی تصدیق کرتی ہو ان آیات کو بیان فرما کر ایک طرف توحید کی دلیل دی گئی دوسری طرف کافروں کی بے وقوفی پر مہر ثبت کی گئی اس لئے کہ اگر انہیں عقل ہے تو مذکورہ بالا دلائل کافی ہیں۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا خرابی ہو ہر اس شخص کو جو یہ آیات پڑھتا ہے تو اسے تھوک دیتا ہے یعنی اس کی حقیقت پر غور نہیں کرتا۔

ف: لفظ المج حدیث مذکور میں واقع ہوا ہے لغت میں تھوک وغیرہ منہ سے پھینکنے کو کہتے ہیں۔

سوال: مج جب خود متعدی ہے تو پھر اسے حدیث شریف میں باء کے ساتھ کیوں استعمال کیا گیا۔

جواب: یہاں پر رمی کے معنی کو متضمن ہونے کی وجہ سے باء متعدی کیا گیا ہے یعنی اس کے عدم اعتبار و عدم اعتبار کی وجہ سے اس لئے کہ جس نے ان آیات میں تفکر کیا تو گویا اس نے پورے طور محفوظ کرلیا اور گویا اس نے منہ سے سے باہر نہ پھینکا۔

تفسیر صوفیانہ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ رتبہ کے لحاظ سے توحید کی یہ سب سے پہلی آیت ہے یعنی سب سے قدیم توحید از جہت حق ہے نہ ہماری جہت سے کیوں کہ ہماری جہت کے لحاظ سے توحید کا پہلا رتبہ توحید الافعال کا ہے اور توحید از جہت حق یہی توحید الذات بھی کہتے ہیں توحید الذات کے بعد مقام توحید الصفات کی طرف نزول فرمایا۔ چنانچہ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ سے معلوم ہوتا ہے اس کے بعد توحید الافعال کی طرف تا کہ توحید الافعال سے اس کی ذات کے متعلق استدلال کیا جاسکے چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

(کذافی العا و یلات القا شانیہ)

مزید تشریح: انسان کے حق میں جو صفت الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ کے نتائج ہیں وہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ میں بیان فرماتے ہیں یعنی ان اشیاء کے پیدا کرنے کی ایک حکمت یہ ہے کہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی آیات کی مظہر ہو اور یہ ظاہر ہے کہ جو آیات ان اشیاء میں امانت کے طور رکھی گئی ہیں ان سے کوئی خاص مرتبہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کا فائدہ انسان کی طرف لوٹتا ہے اس لئے کہ حضرت انسان سب کچھ سمجھتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اس سے ثابت ہوا کہ تمام عالم حضرت انسان کی تبعیت میں پیدا کیا گیا ہے کیونکہ تمام عالم آیات حق کا مظہر ہے اور آیات انسان کی ذات کا آئینہ ہیں اور انسان معرفت حق کا خاص مظہر ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وما خلقت الجن و الانس الا یعبدون ای یعرفون یعنی عبادت بمعنی معرفت ہے اگر یہ انسان معرفت حق کے لئے نہ ہوتا تو اسے پیدا بھی نہ کیا جاتا اور یہ عالم حضرت انسان کے لئے نہ ہوتا تو اسے ہرگز نہ بنایا جاتا جیسا کہ حدیث قدسی میں فرمایا۔

لولاک لما خلقت الکون اے محبوب ﷺ اگر آپ نہ ہوتے تو میں اس عالم کو پیدا نہ فرماتا اس سے معلوم ہوا کہ تمام عالم ایک آئینہ ہے کہ جس میں کمال حق اور اس کے جلال کی آیات کا ظہور ہوتا ہے انسان

جمال وجلال کی آیات کو آئینہ عالم میں مشاہدہ کرتا ہے اور انسان ایک ایسا آئینہ ہے کہ اس میں آئینہ عالم جو اس
ظل پر ہوتا ہے کا ظہور ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

حدیث شریف: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی یہی تحقیق ہے کہ انسان کا نفس اپنے رب کے
جمال کا آئینہ ہے اور انسان کے سوا کوئی ایسا نہیں جو آئینہ حق کے ساتھ مرآۃ عالم کو بھی دیکھے اور اپنے آئینے کو بھی
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا۔

سبق: سالک پر لازم ہے کہ ذکر حقیقی کے ذریعے مقصود اصلی کی طرف پہنچے کیونکہ توحید اغیار اور باطل کو مٹاتی ہے۔

حکایت: نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو حصین سے پوچھا کہ آج کل تو کتنے معبودوں کی پرستش کرتا ہے۔ عرض
کی سات معبودوں کی ان میں سے چھ زمین میں ہیں اور صرف ایک آسمان پر۔ آپ نے پوچھا انہیں کیسے رغبت
ومحبت سے پوجتا ہے عرض کی جو آسمان میں ہے آپ نے فرمایا۔ بس وہی تجھے کافی ہے پھر فرمایا! اگر تم مسلمان ہو
جاؤ تو میں تجھے ایسے کلمات سکھاؤں گا کہ تجھے ہمیشہ فائدہ دیتے رہیں گے۔ جب وہ مسلمان ہوئے تو عرض کی یا
رسول اللہ ﷺ مجھے وہ دو کلمات سکھایئے جن کا آپ نے وعدہ فرمایا آپ نے فرمایا وہ کلمات یہ ہیں۔
اللھم الھمنی رشدی واعذنی من شر نفسی اے اللہ مجھے میری ہدایت بنا دے اور مجھے نفس کے شر سے بچا

تفسیر عالمانہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ماسوا
کو معبود بناتے ہیں۔ **من دون** میں من ابتداالغایۃ کے لئے ہے اور **دون** دراصل ظرف
مکان ہے لیکن یہاں پر مجازاً بمعنی غیر کے مستعمل ہوا ہے اور اتخاذ بمعنی الصنع والعمل کے ہے اور وہ یہاں پر ایک
کی طرف متعدی ہوا ہے اور اس کا مفعول اَنْدَادًا ہے اس سے مراد بت ہے اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے ہم
مثل تھے یا اس لئے کہ وہ اپنے ظن فاسد کی بناء پر انہیں اللہ تعالیٰ کا ہم مثل مانتے یعنی ان سے ہی نفع اور نقصان
کی امید رکھتے اور اپنی ضروریات انہیں پیش کرتے اور ان سے ہی قربت کے متلاشی رہتے تھے۔

ف: اس سے معلوم ہوا کہ يُحِبُّوْنَهُمْ میں ضمیر عقلاء کی اسی لئے ہے کہ وہ مشرکین اپنے غلط خیال اور فاسد گمان
کے تحت انہیں عقلاء سمجھ کر ان سے ذوی العقول جیسا معاملہ کرتے یا اس لئے کہ ضمیر ذوی العقول سے ان کے وہ

لیڈر مراد ہیں کہ جن کی وہ اطاعت کرتے تھے۔

فائدہ صوفیانہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ دونوں تقریروں سے ایک اور تقریر بہتر ہے وہ یہ کہ انداد اً سے ہر وہ شے مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کردے اس تقریر پر یہ معنی ان دونوں سے عم ہے اس لئے صوفیاء اور عارفین فرماتے ہیں کہ ہر وہ شئے جو تیرے دل کو ذکر الٰہی سے غافل کردے۔ اس سے سمجھنا چاہئے کہ ہم نے اپنے دل میں نفسانی خواہشات اللہ تعالیٰ کے شریک کو بٹھایا ہوا ہے اس تقریر کی تائید اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ سے بھی ہوتی ہے۔

اَنْدَادًا يُحِبُّوْنَهُمْ یہ جملہ انداداً کی صفت ہے یعنی ان بتوں کی تعظیم وتکریم کرتے اور ان کے سامنے جھکتے اور ان کی اطاعت ایسے کرتے ہیں جیسے محبوب کی اطاعت کی جاتی ہے كَحُبِّ اللّٰهِ یعنی ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر مانتے ہیں طاعت و تعظیم میں اس تشبیہ سے مقصود صرف وہ وصف ہے جو قوت وضعف پر دلالت کرتا ہے لیکن اس سے مراد معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کا شریک ماننا ہے۔

سوال : اگر وہ معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر شریک مانتے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے قرار کا کیا معنی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

جواب : معبودوں کو جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے برابر کا شریک تعظیم وعبادت میں مان لیا تو اب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کسی قسم کا فائدہ نہیں دے گا۔

سوال: دانہ کو محبت سے کیا نسبت؟

جواب: حب القلب سے قلب کی خلط مراد ہے اور اسے دانہ سے قوی مشابہت ہے بایں معنی کہ دانے میں منشاء مبداء کا مادہ ہے اور قلب میں بھی آثار عجیبہ کے جمع رکھنے کا اثر ہے اسی لئے یہ لفظ اس کے لئے استعارہ کیا گیا ہے پھر اس سے مجاز محلان القلب کے معنی میں آتا ہے کیونکہ قلبی میلان اس پر اثر انداز اور اس کے اندر راسخ ہوتا ہے۔

مسئلہ :محبۃ العبد کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے مطیع بندے کی تعظیم واکرام اور اسے طاعت کی توفیق دینے اور اسے گناہوں سے بچانے کا ارادہ رکھے اس کے بعد بندوں کی محبت کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اور ایمان والے اللہ تعالیٰ سے بہت محبت کرتے ہیں بہ نسبت کفار کے جو کہ وہ اپنے معبودوں سے محبت کرتے ہیں کیونکہ اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ سے محبت غیر منقطع ہے بخلاف بت کے پجاریوں کی بتوں سے مٹ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب انہیں مصائب وشدائد ستاتے ہیں تو وہ اپنے بتوں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ وَرَاَوُا الْعَذَابَ اور جب کہ عذاب دیکھیں گے اس میں واؤ حالیہ ہے اور لفظ قد یہاں پر محذوف ہے یعنی اپنے تابعداروں سے عذاب کو دیکھتے ہی بیزار ہو جائیں گے۔

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ اس کا عطف تبرا پر ہے اور ان سے ان کے اسباب منقطع ہو جائیں گے۔

سوال: معطوف ومعطوف علیہ کے درمیان میں جملہ حالیہ لانے کا کیا فائدہ؟

جواب : تاکہ ان سے بیزاری کی علت پر تنبیہ ہو یعنی ان سے وہ واسطے اور ذرائع ٹوٹ جائیں گے کہ جن سے وہ ایک دین پر تھے اسی طرح ان کی رشتہ درایاں اور محبت کی تعلق داریاں اور ایک دوسرے کی اتباع واستباع ختم ہو جائے گی اور باء بہم میں بمعنی عن ہے جیسے اللہ کے ارشاد گرامی میں ہے کہ فاسئل به خبیر اای نسئل عنه یہ باء سببیہ ہے اب معنی یہ ہوگا بسبب کفر کے یعنی ان کے آپس کے وہ تعلقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے اس اُمید میں تھے کہ انہیں نجات نصیب ہوگی یا یہ باء تعدیہ کی ہے یعنی **قطعتهم الاسباب** جیسے کہ ہے تصرقت **بهم الطريق** میں ہے بمعنی **فرقتهم الطريق** كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا جیسے آج وہ ہم سے بیزار ہو گئے یہ کاف منصوب المحل ہے اس لئے کہ یہ صفت ہے اور اس کا موصوف مصدر محذوف ہے كَذٰلِكَ یعنی ان کو خوفناک حالات دکھانا یعنی ان پر عذاب کا نزول اور ان کا ایک دوسرے سے بیزار ہونا يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ انہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسرتیں اور ندامتیں بنا کر دکھائے گا الحسرة بمعنی شدة المندامت والکمد کو کہتے ہیں اور کمد بمعنی دل کا دکھ یعنی وہ باتیں کھل کر سامنے آجائیں گی جو ان کے دلوں کی جلن اور دکھ اور درد میں اضافہ کریں گی اور وہ اپنی حسرت میں نادم اور رسوا رہ جائیں گے جیسا کہ جانوروں میں ایک کمزور جانور کی حالت ہوتی ہے جبکہ اس کی قوت وطاقت نے جواب دے دیا ہو تو اب اس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ دراصل الحسر الکشف کو کہتے ہیں اور ہر اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو اپنی مطلوبہ شئے سے محروم ہو اور ندامت لازم ہو جائے اگر رویت بصری ہے تو حسرات اعمالهم سے حال واقع ہے اب معنی یہ ہوگا کہ وہ

اپنے اعمال حسرتوں سے نہ دیکھیں گے اور گر رویت قلبی مراد ہے تو حسرات یری کا تیسرا مفعول ہے اور علیھم یا تو حسرات کے متعلق ہے اور اس کا مضاف محذوف ہے یعنی وہ اپنی کوتاہی سے حسرت کریں گے یا اس کا تعلق محذوف ہے اور یہ اپنے متعلق سے مل کر منصوب ہوگا اور حسرات کی صفت ہوگی ای حسرات مستولیہ علیھم یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگ کر آ جاتے اور یہ بھی ہوتا کہ ایک عرصہ تک کسی بت کو پوجتے جب کوئی دوسرا نہیں اچھا لگتا تو پہلے بت کو چھوڑ کر دوسرے کی پرستش میں لگ جاتے۔

اعجوبہ : باہلہ قبیلہ کے لوگوں نے خس سے بت تیار کیا لیکن قحط سالی کے دوران اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا گئے۔

وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوٓا اور اگر جان لیں یہ لوگ جنہوں نے معبودان باطلہ کو اپنا معبود بنا کر ایک غیر مستحق کو اس کے غیر مقام میں رکھ کر ظلم کیا۔ إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ جب کہ اس عذاب کو دیکھیں گے جو قیامت میں ان کے لئے تیار کیا گیا ہے یہاں رویۃ بالعین مراد ہے أَنَّ الْقُوَّةَ بے شک قوت اور غلبہ وقدرت لِلّٰهِ جَمِيعًا سب کی سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جمیعا جملہ سے حال واقع ہے اور جملہ یری کے دو مفعول کے قائم مقام ہے وَأَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے اس کی عطف وَأَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ پر ہے ایسی تاکید سے معاملہ کو سخت بتانے اور امر کو خوفناک بنانے میں مبالغہ مطلوب ہے اس لئے کہ اختصاص القوۃ بباری تعالیٰ اس کا مقتضی نہیں کہ خواہ مخواہ وہ سخت بتانے اور امر کو خوفناک بنانے میں مبالغ مطلوب ہے اس لئے کہ یہ بھی تو ہے کہ وہ معاف فرمادے باوجود کہ اس کو قدرت ہے اور لو کا جواب محذوف ہے اب عبارت یوں ہوگی لو علم ھؤلاء اگر انہیں نے یعنی جنہوں نے شرک کر کے ظلم کا ارتکاب کیا ہے علم ہوتا کہ تمام قوت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے ثواب اور عذاب دینے میں ہر شے پہ قادر ہے (نہ کہ معبودان باطلہ) اور اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ظالموں کو کتنا سخت عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے جب کہ وہ قیامت میں عذاب کو دیکھیں گے تو بتوں کی پرستش سے نادم ہوتے اور نفرت کرتے اور جیسے اب وہ اپنے بتوں کو سمجھتے ہیں اس سے دور جاتے إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا یہ إِذْ يَرَوْنَ سے بدل ہے تبری بمعنی تخلص اور لعفی و التعصل کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے یعنی ہر اس چیز سے (کہ جس کے ساتھ رہنے سے طبیعت کو نفرت ہو) دور اختیار کریں گے

مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا ان لوگوں سے جنہوں نے ان کی تابعداری کی یعنی ان سے جن کی تابعدار اور وہ اپنے تابعداروں کے سامنے اعتراف کریں گے کہ جن باتوں کا ہم دنیا میں دعوی کرتے ہیں اسی طرح کفر کے مختلف اطوار اور گمراہی کی طرف بلاتے تھے۔ اب وہ ہمارے تمام دعاوی اور امور باطل ہو گئے یہاں تک کہ وہ لیڈر اپنے تابعداروں کے ساتھ نہ صرف بیٹھنے سے نفرت کریں گے۔ حسرتیں غالب ہوں گی اس لئے کہ وہ نیکیاں جو انہوں نے کیں کفر کی وجہ سے ضائع ہو جائیں گی اس کے بعد وہ حسرت کریں گے اس پر جو وہ نیکیاں ان سے ضائع ہوں گی اور ان پر ان کے کردار کی ڈائری کھل جائے گی حسرت کرتے ہوئے کہیں گے کاش کہ ہم یہ عمل نہ کرتے۔

ف : حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہیں بہشت دکھائی جائے گی وہ بہشت کو اور اس کے اندر کے مکانات دیکھیں گے تو افسوس کرتے ہوئے کہیں گے کاش ہم بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے پھر انہیں کہا جائے گا کہ یہ محلات تمہارے تھے لیکن چونکہ تم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اس لئے اب تمہارے محلات مومنوں پر تقسیم کر دیئے گئے ہیں یہ اس وقت کہا جائے گا جب کہ وہ ندامت و حسرت کریں گے۔

وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ اور وہ جہنم سے ہرگز نہیں نکلیں گے اس لئے کہ وہ اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

حدیث شریف: میں ہے دوزخیوں کو دوزخ کی طرف دھکیلا جائے گا۔ تو دوزخ ان کے ہر عضو کو چمٹ جائے گی کوئی عضو بھی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا ایک طرف دوزخی سانپ ڈنس لگائے گا۔ دوسری طرف فرشتہ چابک مارے گا پھر وہ جہنم میں دھنس جائے گا پھر جب وہ جہنم سے سر باہر نکالے گا تو اسی طرح پھر فرشتہ چابک مارے گا اور جب اس کا چمڑا جہنم کی آگ سے سڑ جائے گا تو از سر نو تیار ہو جائیگا۔ کما قال تعالیٰ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ جب ان کے چمڑے پک جائیں گے تو پھر ان کے دوسرے چمڑے تبدیل کر دیں گے تاکہ عذاب چکھیں، اس پر کوئی کافر پیاسا ہو کر پانی مانگے گا تو اسے گرم پانی دیا جائے گا۔ جب وہ گرم پانی اس کے منہ کے قریب لایا جائے گا تو پانی ایسا گرم ہوگا کہ اس کے چمڑے کو ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اس کے باوجود کافر پانی منہ میں ڈالے گا تو پانی کی گرمی سے اس کی داڑھیں اکھڑ جائیں گی جب وہ پیٹ میں پہنچے گا تو اس کی آنتیں گل سڑ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی اور چمڑا ادھیڑ ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اسی طرح انہیں جہنم کی سزا ملے گی اس پر وہ نہ مریں گے نہ جئیں گے اور نہ ہی انہیں جہنم سے نکالا جائے گا۔

حدیث شریف: حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں حکم فرمائے گا کہ جس نے اپنے نفس کو بتوں کے لئے جلایا تھا وہ خود بتوں سمیت دوزخ میں داخل ہو تو وہ دوزخ میں نہیں جائیں گے صرف اس خطرہ سے کہ انہیں تو دوزخ کے عذاب میں ہمیشہ رہنا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کفار کے سامنے اہل ایمان کو فرمائے گا۔ تم اے مسلمانو جہنم میں داخل ہو جاؤ اہل ایمان سنتے ہی جہنم میں چھلانگ لگا دیں گے اس پر عرش الٰہی کے نیچے سے آواز آئے گی۔

اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اولاً ان سے محبت کرتا ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے محبت کی گواہی دی محبت میں کامل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ

تفسیر صوفیانہ جو شخص ازل سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا اہل نہیں تھا اسے عزت و محبت اصنام کی طرف دھکیل دیتی ہے اسے محبت ماسوی اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے نفسانی محبت کے سپرد کیا جاتا ہے تو وہ اصنام میں سے ہوائے نفس کی محبت میں پھنس جاتا ہے جیسے کفار میں سے کوئی لات کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کی عبادت میں مصروف تھا کوئی اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر گویا ان کی پرستش میں لگا رہتا اور قاعدہ ہے کہ اولاد اموال اور ازواج کی محبت کی اللہ تعالیٰ کی محبت سے روکتی ہے اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے وہ ماسوی اللہ کی محبت کو عداوت سمجھتا ہے جیسے حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ اور جو بھی ازل سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا اہل تھا تو اسے عنایت ربانی نے اپنی طرف کھینچا تو اس پر جلوہ حق متجلی ہوا جس سے اس محبت کے آثار اس کے قلب کے آئینہ پر منعکس ہو جاتے ہیں پھر اسے ماسوی اللہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہتا کیونکہ ایسی محبت عالم وحدیث سے ہوتی ہے اس لئے کہ وہ غیر کی شرکت کو قبول نہیں کرتی دشمنوں نے فانی محبت سے بتوں سے محبت کی اور اللہ والوں نے باقی اور ربانی سے محبت سے اللہ تعالیٰ سے محبت کی بلکہ انہوں نے اپنے جمیع اجزا فانی اور باقی سے اللہ تعالیٰ سے محبت کی اللّٰھم اوصلنا الی حقیقۃ المحبۃ و ایقین التمکین اے اللہ ہمیں محبت اور یقین و تمکین کی حقیقت تک پہنچا۔ آمین

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا

اے لوگو! کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور شیطان کے قدم پر

خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ

قدم نہ رکھو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں یہی حکم دے گا

وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾ وَإِذَا قِيلَ

بدی اور بے حیائی کا اور یہ کہ اللہ پر وہ بات جوڑو جس کی تمہیں خبر نہیں۔ اور جب ان سے

لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ

کہا جائے اللہ کے اتارے پر چلو تو کہیں بلکہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا

أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ

کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت۔ اور کافروں کی

الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ

کہاوت اس کی سی ہے جو پکارے ایسے کو کہ خالی چیخ و پکار کے سوا کچھ نہ سنے

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا

بہرے، گونگے، اندھے تو انہیں سمجھ نہیں۔ اے ایمان والو کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں

مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾

اور اللہ کا احسان مانو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ

اس نے یہی تم پر حرام کیے ہیں مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور

بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ

جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا تو جو ناچار نہ ہو یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ

تو اس پر گناہ نہیں اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ وہ جو چھپاتے ہیں اللہ کی اتاری کتاب

الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ

اور اس کے بدلے ذلیل قیمت لے لیتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں

بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ

اور اللہ قیامت کے دن ان سے بات نہ کرے گا

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى

اور نہ انہیں ستھرا کرے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ

اور بخشش کے بدلے عذاب تو کس درجہ انہیں آگ کی سہار ہے۔ یہ اس لئے کہ

اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ

اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری اور بیشک جو لوگ کتاب میں اختلاف ڈالنے لگے

لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

وہ ضرور پرلے درجے کے جھگڑالو ہیں۔

تفسیر عالمانہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ شان نزول: یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے اوپر بہترین خوراک و پوشاک کو حرام قرار دیا اے لوگو! كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ کھاؤ

اس سے جو زمین میں ہے یعنی اس کے ہر ان اجزاء کو جو کھانے کے اقسام میں سے ہیں کیونکہ زمین کے تمام اجزاء کو نہیں کھایا جاتا۔ حَلٰلًا یہ اسم موصول سے حال ہے یعنی در آں حالیکہ وہ شئے جو حلال ہو۔ حلال ہر اس شئے کو کہا جاتا ہے جس سے رکاوٹ کی ہر عقد ہٹ جائے طَیِّبًا ہر شک وشبہ سے پاک ہو یہ حَلٰلًا کی صفت ہے حلال ہر اس شئے کو کہا جاتا ہے جسے شرع اچھا سمجھے اور اچھی ہر وہ شئے ہے جسے طبع مستقیم چاہے یعنی اس سے طبیعت کو لذت حاصل ہے۔

وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ الخطوہ بالفتح المرۃ من نقل القدم یعنی قدم کو ایک بار اٹھانا اور بالضم ہو تو چلنے والے کے ہر دونوں قدموں کے بعد ومسافت کے معنی میں ہوگا مثلاً کہا جاتا ہے اتبع خطواتہ ووطی علی عقبہ بیشک وہ تمہارا دشمن ہے وَّلَا تَتَّبِعُوْا یہ شیطان کی دشمنی کی علت ہے یعنی شیطان تمہارے ساتھ کھلی دشمنی رکھتا ہے اور یہ صاحب بصیرت کو معلوم ہے ہاں جو خواہشات کی طرف ابھار کر غلط ارادوں اور گندی لذتوں کی طرف لے جاتا ہے۔

ف: مُّبِیْنٌ "ابان" سے مشتق ہے بمعنی "بان فظہر" لیکن امام واحدی فرماتے ہیں کہ "ابان" خود متعدی ہے اب معنی یہ ہوگا کہ شیطان نے تمہارے لئے دشمنی ظاہر کردی۔ جب کہ اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے بہشت سے نکالے جانے کا سبب بنا اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بے شک وہ تمہیں حکم دیتا ہے یعنی وسوسہ ڈالتا ہے۔

سوال: شیطان کے وسوسہ کو امر سے کیوں تشبیہ دی ہے؟

جواب: شیطان وسوسہ ڈال کر انسان پر مسلط ہو جاتا ہے گویا یہ اس کا حکم وامر ہے شیطان کے وسوسہ کو قبول کرنے اور اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ گویا یہ اس کا مطیع ہے اس سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ شیطان کے تابع فرمان ہیں۔ عقل وفکر کی دنیا سے گئے گزرے ہو گئے اس سے ان کے عقل کی کمزوری اور ان کی شان کی کمی کی طرف اشارہ ہے۔

بِالسُّوْٓءِ سوء ہر اس خرابی کو کہتے ہیں جس کا انجام برا ہو پھر اس ہر گناہ پر اطلاق ہوتا ہے وہ اعمال جوارح سے ہوں یا قلوب سے کیونکہ ان ہر دونوں کے افعال انسان کو دکھ اور غم پہنچانے میں اشتراک ہے وَالْفَحْشَآءِ عطف

الخاص علی العام کے قبیل سے ہے یعنی انواع معاصی میں زیادہ قبیح اور بہت زیادہ براس معنی پر زنا اور بخل وغیرہ فواحش میں داخل ہیں اسی طرح ہر قبیح گناہ فاحش ہے۔

ف: لغت کی اصل وضع میں اَلْفَحْشَآءِ مجاورۃ القدر فی کل شئی کو کہتے ہیں۔

ف: قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سوء اور فحشاء میں بحسب المفہوم فرق ہے ورنہ ذاتی طور وہ ایک ہیں۔

سوال: گناہ کو سوء کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: اس لئے کہ گناہ بندے کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے اور فحشاء کو کلی اسی لئے فحشاء کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کو قبیح کر دیتا ہے اور ان دونوں یعنی سوء و فحشاء سے معصیت کو موصوف کرنا زید عدل کی طرح مبالغہ ہے۔

وَاَنْ تَقُوْلُوْا یعنی شیطان تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم افترا کو کرو عَلَی اللّٰهِ اللہ پر بانیطور کہو کہ فلاں فلاں شے کو اللہ نے حرام کیا یا فلاں پر حرام کیا ہے مَالَا تَعْلَمُوْنَ وہ جو تم نہیں جانتے کہ نا معلوم اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یا نہ یہ شیطان کے قبائح سے قبیح تر ہے اس لئے کہ ان اوصاف سے اللہ تعالیٰ کو موصوف کرنا جو اس کی شان کے لائق نہیں بہت بڑا گناہ جیسے اَلْفَحْشَآءِ گناہوں کے انواع سے بہت قبیح ہے اسی طرح یہ۔

سوال: ہمیں شیطان ان برائیوں کا کیسے حکم دیتا ہے جب کہ نہ ہم اس کو دیکھتے ہیں اور نہ اس کا کلام سنتے ہیں اسی طرح اس کے وسوسہ کا کیا معنی یا اس کا ہمارے دل میں پہنچنا کیسی بات ہے؟

جواب: اس کا ایک خفی کلام ہے جسے صرف قلب سنتا ہے اور سنتے ہی قلب اور طبع اس کی طرف جھک جاتی ہے بعض نے کہا کہ وہ بنو آدم کے اندر گھس جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جسم لطیف ہے جاتے ہی وسوسہ یعنی روی افکار نفس پر ڈالتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ

حدیث شریف: حضور نبی اکرم ﷺ کی دعاؤں سے ایک دعا یہ بھی تھی اللھم اعمر قلبی من وساوس ذکر کواطرو عنی وساوس الشیطن اے اللہ میرا قلب اپنے ذکر کے افکار سے معمور اور میرے قلب سے شیطان کے غلط افکار دور فرما دے۔

شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے مراتب ستہ:۔ آکام المرجان میں ہے کہ شیطان انسان کو کچھ باتوں میں

مبتلا کرتا ہے۔

☆...... سب سے پہلے انسان کے لئے یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کفر و شرک اور نبی پاک ﷺ کی عداوت میں مبتلا ہو جائے جب شیطان ابن آدم پر اس کاروائی میں کامیاب ہو جاتا ہے تو شیطان اپنی جدو جہد کی تھکان اتارتا ہے اس لئے کہ وہ منزل مقصود کی آخری منزل تک پہنچ گیا ہے اور یہی اس کا پہلا کام ہے جو انسان پر کر گزرتا ہے اور اس کے لئے سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔

☆...... اگر کوئی اس کے اس حملہ سے بچ جاتا ہے تو پھر اس بدعت (سیہ) کی طرف کھینچ لانے کے در پے ہوتا ہے اور یہ مشغلہ اس کے لئے دیگر فسق و فجور اور معاصی سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اس لئے کہ فسق و فجور و دیگر معاصی کی توبہ منظور ہو جاتی ہے لیکن بدعت کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ بدعتی اپنی اس بدعت سیہ کو حقیقت صحیحہ یقین کر کے اس کا دائمی طور پر مرتکب رہتا ہے جس کی وجہ سے اسے توبہ نصیب نہیں ہوتی۔

☆...... جب شیطان کسی سے بدعت (سیہ) کے ارتکاب سے عاجز آ جاتا ہے کہ باوجود سعی بسیار کے وہ شخص بدعت سیہ نہیں کرتا تو اسے گناہ کبیرہ کرنے پر مجبور کرتا ہے اور گناہ کبیرہ کے کئی اقسام ہیں ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب سہی۔

☆...... جب کوئی کبیرہ گناہ بھی نہیں کرتا تو اس کے متعلق صغیرہ گناہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ چند صغائر کے اجتماع سے گناہ کبیرہ بن جاتا ہے۔

ف: یاد رہے کہ گناہ کبیرہ مہلک شئے ہے چنانچہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ وایاکم ومحقرات چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچو اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص جنگل میں کسی مقام پر اترے تو اس نے اپنی ضروریات کے لئے پہلے چھوٹی لکڑیاں جمع کی اس سے آگ جلائی اور اپنا طعام وغیرہ پکایا دیکھیں ان چھوٹی لکڑیوں سے ہی بڑی آگ تیار ہوئی اسی طرح صغائر کی کیفیت ہے کہ اس سے انسان کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔

☆...... جب کوئی انسان شیطان کے صغائر گناہ کرانے سے بچ جاتا ہے تو اسے مباح فعل میں مشغول کرتا ہے وہ صرف اس خیال پر کہ اس میں ثواب نہیں تو گناہ بھی نہیں لیکن اسے معلوم ہے کہ اس کا عذاب تھوڑا ہے کہ وہ ایک ثواب کی نعمت سے محروم ہو گیا۔

☆...... اگر اس سے یہ بھی نہ ہوتو اسے افضل عمل سے محروم کر کے فاضل عمل میں مشغول کرتا ہے اسی طرح فاضل عمل سے مفضول میں شیطان کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انسان کو سستی وغفلت کی عادت پڑ جاتی ہے مثلاً افضل کو چھوڑ کر فاضل کو لے گا تو مرتبہ گھٹ گیا۔ اسی طرح فاضل کو چھوڑ کر مفضول کو لے گا تو بھی مرتبہ کم ہو گیا اس کے بعد سستی سوار ہوگئی مشقت سے گھبرانے لگا مثلاً جسے سو رکعت پڑھنے کی عادت ہے اسے ایک دوگانہ بڑی بات نہیں لیکن جب مشقت سمجھ کر سو کی بجائے ایک دوگانہ پڑھا تو شیطان کو گمراہ کرنے کا موقع مل گیا اس کے بعد اسے عبادت سے نفرت کے مواقع ڈھونڈے گا پھر مشقت کے خطرے کے بعد نفرت میں مبتلا ہو گا جس سے شیطان اپنا کام بنالے گا یعنی انسان کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

شیطان کی تخلیق کا موجب: شیطان کو صرف اس لئے پیدا کیا گیا تا کہ نیک اور بد میں امتیاز ہو حضرت انبیاء علیہم السلام کو پیدا کیا گیا تا کہ نیک لوگ ان کی اقتدا کریں اور ابلیس کو پیدا کیا تا کہ بدبخت اس کی پیروی کریں اس طرح سے نیک اور بد کے درمیان امتیاز ہو گا ابلیس جہنم اور اختلافات کا رہبر اور دلال ہے اور اس کا سامان دنیا ہے جب اس نے اسے تمہارے سامنے پیش کیا تو کفار نے اپوچھا اس کا ثمن کیا ہے شیطان نے کہا اس کا ثمن ہے دین یعنی دنیا لو اور دین چھوڑ و انہوں نے دین دے کر دنیا لے لی۔ زاہدوں نے دنیا دے کر دین کو حاصل کیا اور طالب دنیا نے دینا کو تو لے لیا لیکن دین کو نہ چھوڑا انہوں نے ابلیس سے کہا کہ تمہیں تو کچھ دنیا چکھنے کے لئے دیجئے اس سے کہہ دیتا ہوں لیکن کوئی شے میرے پاس گروی رکھوں انہوں نے کہا ہماری آنکھیں اور کان حاضر ہیں شیطان نے دنیا کے طالبین سے آنکھیں اور کان گروی رکھ کر دنیا صرف چکھنے کے لئے دے دی یہی وجہ ہے کہ طلب دنیا دنیوی باتوں کے سننے اور اس کی زیب و زینت کا عاشق ہوتا ہے اسلئے کہ اس کی آنکھیں اور کان شیطان کے ہاں گروی ہیں جب اس نے یہ دونوں چیزیں اس سے قبض کرلیں تو اب اہل دنیا نہ تو اللہ والوں سے دنیا کی مذمت سن سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے قبائح دیکھ سکتے ہیں بلکہ اس کے انہماک میں مست اور اس کے عجائبات اور اسباب میں پھنسے رہتے ہیں۔

حدیث شریف: میں ہے تجھے جس سے محبت ہو جاتی ہے پھر اس سے عیوب دیکھنے سے اندھا اور نقائص سننے سے بہرہ ہو جاتا ہے۔

سبق: دانا پر لازم ہے کہ دنیا کو ترک کرے اور اس سے روگردانی کر کے اس سے صرف لقمہ حلال حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

مسئلہ: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حلال لقمہ وہ ہے کہ جس کے متعلق قیامت میں پرسش نہ ہو اور پرسش ہر اس عمل کے لئے نہیں ہوگی جس کے بغیر انسان کا گزارہ نہ ہو۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی ضرورت کی اشیاء عنایت فرماتا ہے مثلاً کپڑا کہ بند ڈھانپ سکے اور روٹی کہ جس سے پیٹ کی بھوک مٹا سکے اور گھر پرندے کے گھونسلے کی طرح بنائے کہ جس میں زندگی بسر کر سکے عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ نمک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے آپ نے فرمایا نمک کے متعلق بھی قیامت کے روز سوال ہوگا جب کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے۔

تفسیر صوفیانہ حلال وہ ہے جس کا کھانا اللہ تعالیٰ نے مباح فرمایا اور طیب وہ ہے جس میں خلق خدا کے حقوق کا اشتباہ نہ ہو اور نہ ہی اس میں حظ نفس کو دخل ہو اس سے معلوم ہوا کہ ہر طیب حلال ہے لیکن ہر حلال طیب نہیں اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ طیب ہے اور صرف طیب پاک اشیاء کو قبول کرتا ہے کہ جن میں نہ تو عیب ہو نہ اس میں غیر کے حق کی ملاوٹ ہو اور یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حلال نہیں کہا جاتا بخلاف اس کے کہ اسے کہا جاتا ہے ان اللہ طیب جیسے حدیث شریف میں گذرا

مسئلہ: جو شخص حلال کمائی کھانے کی عادت کرتا ہے اسے طاعت الٰہی کے لئے آسانی نصیب ہوتی ہے اور شیطان کے وساوس سے محفوظ ہو جاتا ہے لقمہ حلال کا عمل صالح کا مغز ہے۔

علم وحکمت زائد از لقمہ حلال	عشق ورقت اید از لقمہ حلال
چو ز لقمہ تو حسد بینی و دام	جہل وغفلت زائد آنرا دان حرام
ہیچ گندم کاری و جو بر دھد	دیدہ اش پے کہ کرہ خر دہد
لقمہ تخمست برش اندیشہا	لقمہ بحر و گوہرش اندیشہ
زائد از لقمہ حلال اندر دہاں	میل خدمت عزم رفتن آن جہاں

علم وحکمت لقمہ حلال سے پیدا ہوتی ہے عشق کی رقت بھی لقمہ حلال لیں نصیب ہوتی ہے لقمہ سے حسد ومکر اور جہل وغفلت پیدا ہو

سمجھو وہ لقمہ حرام ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ گندم بوئی جائے اور جو پیدا ہوں یہ بھی کبھی کہیں نہیں دیکھا گیا کہ گھوڑے کے نطفہ سے گدھا پیدا ہو لقمہ بیج ہے اور اس کا ثمر فکرات یا لقمہ دریا ہے اور اس کے موتی تفکرات (نیک یا بد) لقمہ حلال منہ میں ہوتا ہے تو اس کی برکت سے آخرت کے امور کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: حلال رزق کے اسباب تلاش کرنا انبیاء علی نبینا وعلیھم السلام کی سنت ہے۔

فوائد کسب حلال: کسب حلال کے بہت سے فائدے ہیں۔

☆..... اصل مال پر زیادتی جب کہ اس مال کو تجارت وزراعت اور باغات بونے میں خرچ کرتا ہے پھر اس میں صدقات ہی صدقات نصیب ہوتے ہیں مثلاً اس سے پرندے وغیرہ کھائیں گے۔

☆..... لغویات وبکواسات سے حفاظت ہوتی ہے جب کہ کمانے والا اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے۔

☆..... کسر نفسی اور نفس بہت سی غلطیوں کے ارتکاب سے بچ جاتا ہے۔

☆..... کسب حلال فقر سے امان کا ذریعہ ہے وہ فقر جو کہ دارین میں روسیاہ بنانے کا سبب ہے۔

☆..... جب بھی کوئی مزدور نیک مزدوری کے لئے چلتا ہے تو دو نگران فرشتے کہتے ہیں۔ بارک اللہ لک فی حرکاتک اللہ تعالیٰ تیرے جانے اور آنے اور کاروبار میں برکت دے اور تیرے ان معاملات کو تیرے لئے بہشت میں ذخیرہ بنائے۔ نگران ملائکہ اور آسمان وزمین کے فرشتے آمین کہتے ہیں۔

مسئلہ: سب سے افضل کسب جہاد ہے اس کے بعد کھیتی باڑی اس کے بعد صنعت۔

تفسیر عالمانہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ شان نزول: یہ آیت مشرکین عرب اور کفار قریش کے حق میں نازل ہوئی جب انہیں قرآن اور اللہ تعالیٰ کے باقی احکام کا حکم دیا گیا تو انکار کرے۔ صرف یہ بات کہہ کر کہ ہمیں آباؤ اجداد کی تقلید کافی ہے آیت کا معنی یہ ہوا کہ جب مشرکین کو نصیحت وارشاد کے طور کہا جاتا ہے کہ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ اس پر عمل کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا یعنی کتاب اللہ پر عمل کرو یعنی جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حلال فرمائیں انہیں حلال اور جنہیں اس نے حرام کیا انہیں حرام سمجھو قَالُوا بَلْ یہ بل عاطفہ ہے اس کے متصل جو جملہ واقع ہے اس کا عطف اس جملہ محذوفہ پر ہے جو اس سے پہلے ہے نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا بلکہ ہم اس کی تابعداری کریں گے جس پر پایا عَلَيْهِ آبَاءَنَا اپنے آباؤ اجداد کو وہ بتوں کو معبود بناتے اور طیبات کو

حرام قرار دیتے رہے وغیرہ وغیرہ اس لئے کہ وہ ہم سے بہتر جانتے تھے اس لئے ہم اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کو نہیں چھوڑ سکتے۔

سبق: اے عقلمندو ذرا دیکھو تو سہی ان احمقوں کو کہ حق کا کیا جواب دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار و تعجب کا ہمزہ اور واؤ حالیہ سے تردید کرتے ہوئے فرمایا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ چونکہ ہمزہ صدارت اور واؤ اوسط کلام کا تقاضا کرتی ہے اسی لئے واؤ اور ہمزہ کے درمیان ایک جملہ لایا گیا تاکہ ہمزہ کی صدارت بحال رہے اب آیت کا معنی یہ ہوا کیا وہ اپنے آباؤ اجداد کی تابعداری کرتے ہیں۔ اس حال میں کہ ان کے آباؤ واجداد لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا دین کی کوئی بات بھی نہ جانتے ہوں اس لئے وہ تو صرف دنیا کی باتیں جانتے ہیں وَّلَا يَهْتَدُوْنَ اور نہ ہی وہ حق اور صواب کی طرف راہ پا سکتے ہیں۔ یعنی یہ تو نہایت ہی قبیح اور سخت غلط معاملہ ہے کہ جسے نہ کوئی عقل ہو اور نہ ہی طریق حق کی طرف راہ پا سکتا ہو اور نہ ہی کوئی صحیح بات اسے نصیب ہو تو اس کی تابعداری کی جائے وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور کافروں اور ان کی داعی الی الحق کی مثال كَمَثَلِ اس راعی کی ہے الَّذِيْ يَنْعِقُ جو آواز دیتا ہے عرب کا مقولہ ہے ینعق الراعی ولاموذن [1] عین مہملہ کے ساتھ ہو تو بمعنی صوت اور عین معجمہ کے ساتھ کہا جاتا ہے نغق الغراب اب يَنْعِقُ کا معنی ہوا صوت یعنی آواز دیتا ہے بِمَا لَا يَسْمَعُ ساتھ اس کے کہ وہ نہیں سنتا جیسے بہم یعنی وہ استماع کا ادراک بھی نہیں رکھتا اِلَّا دُعَآءً یعنی صرف آواز کو سنتا ہے وَّنِدَآءً وہ صرف زجر و توبیخ کو سمجھتا ہے سوائے اس کے اسے اور کوئی سمجھ نہیں ہوتی نہ ہی اسے کچھ یاد رہتا ہے بخلاف عاقل کے کہ اسے سمجھ بھی ہوتی ہے اور وہ اس کا جواب بھی دیتا ہے۔

دعا و ندا میں فرق: دعا قریب کے لئے ہوتی ہے ندا بعید کے لئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ندا دعا سے اہم ہے اور آیت مذکور میں تشبیہ مفرق ہے کافر کے داعی کو ناحق سے اور کافروں کے نفس کو بہائم منعوت بہا سے اور کفار کے داعی کو ناحق کی آواز سے (جو جانوروں کو آواز دیتا ہے) سے تشبیہ دی گئی ہے اب آیت کا معنی یوں ہوگا۔ کہ اے محمد ﷺ آپ کا کفار کو وعظ کرنے اور دعوت الی اللہ دینے اور پھر ان کا ہدایت نہ پانے کی مثال اس داعی کی ہے جو بکریوں کو آواز دیتا ہے اور ان سے کلام کرتا ہے اور انہیں کہتا ہے کھاؤ پیو اور چرو۔ حالانکہ وہ اس کی کوئی بات

[1] : بمعنی کوے نے کائیں کائیں کی۔

بھی نہیں سمجھتیں ایسے یہ کفار جانوروں کی طرح ہیں کہ وہ نہ آپ کی کوئی بات سمجھتے ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی۔ صُمٌّ وہ بہرے ہیں یعنی وہ حق سننے سے بہرے ہو چکے ہیں بُکْمٌ اور گونگے ہیں اس معاملہ میں کہ جس کی طرف انہیں بلایا جائے وہ اسے قبول نہیں کرتے عُمْیٌ اور وہ نابینا ہیں کہ وہ دلائل سے روگردان ہیں۔ گویا وہ انہیں دیکھتے ہی نہیں۔

ربط: جب انہیں ایسے لوگوں سے تشبیہ دی گئی جو ان تینوں (کلام سمع اور بصر) سے محروم ہیں اور ان کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان تمیز کر کے حق کو اختیار کیا جاتا ہے اب اس تشبیہ پر تفریع کرتے ہوئے فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ پس وہ عقل نہیں رکھتے یعنی اس لئے کہ اکتساب حق نظر و استدلال سے ہوتا ہے اور جو شخص بہرے اور اندھے کی طرح ہو جائے کہ نہ دلائل دیکھے نہ سنے تو پر وہ کیسے حق پر استدلال کر سکتا ہے اسی لئے کہاوت بن گئی۔ من فقد حسا فقد فقد علما جو حس کھو بیٹھتا ہے وہ دولت علمی سے محروم ہو جاتا ہے۔

ف: آیت میں اصلی عقل کی نفی نہیں کیونکہ اس کا بالکلیہ نفی دم کی صلاحیت نہیں رکھتا اور قیامت تک انہیں وعظ فائدہ بھی نہیں دے گا کیونکہ ان لوگوں کے کان استماع حق سے مسدود اور ان کے اذہان قبول سے رکے ہوتے ہیں شیخ سعدی قدس سرہ نے کیا خوب فرمایا۔

فہم سخن چوں نکند مستمع — قوت طبع از متکلم مجو

فسحت میدان ارادت بیار — تا بزند مرد سخن گوی گو

ترجمہ: سننے والا اگر سخن فہمی کی استعداد نہیں رکھتا تو اس سے بولنے والے کا کیا قصور اے مخاطب تمہی اپنے ارادات کو بلند کرو تا کہ نصیحت کرنے والا کھلے دل سے نصیحت کر سکے یعنی عقل عزیزی سے حق کو حاصل نہیں کرتے۔

تفسیر صوفیانہ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ میں اشارہ ہے کہ برے اسلاف سے منہ موڑنا چاہیے اور اہل بدع سیئہ کی اتباع سے دور بھاگنا ضروری ہے اس لئے کہ وہ طریق حق میں سے کسی شے کو نہیں جانتے بلکہ وہ صحرائے دنیا کی محبت میں حیران و سرگردان پھرتے ہیں ان کا دعویٰ تو ہوتا ہے کہ اہل علم ہیں حالانکہ انہیں علم کی بو تک نصیب نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے علوم کو مال اور جاہ و جلال کا ذریعہ سمجھتے ہیں اہل طلب کیلئے وہ رہزن ڈاکو ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بعض آسمانی کتب میں فرمایا کہ اس کے متعلق مت پوچھ جسے جب دنیا

نے مخمور و مسحور کر ڈالا کیونکہ وہ تو میرے بندوں کے لئے رہزن اور ڈاکو ہیں ہاں جسے جادہ حق اور شریعت کا راستہ نصیب ہے اسے طریقت کے مقامات کے راستے معلوم ہوتے ہیں ان کی اقتداء جائز ہے وہی اس کے اہل ہیں کہ ان کو حقیقت کی طرف راہ ملتا ہے نہ وہ جو کہ مدعی ہیں کہ انہیں آباؤ سے یہ وراثت ملی ہے انہیں راہ ہدایت سے کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا اور نہ ہی اقتداء کے لائق ہیں۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

چوں کنعانرا طبیعت بے ہنر بود — پیمبر زادگی قدرش نیفزود

ہنر بنما اگر داری نہ گوہر — گل از خاراست و ابراہیم از آزر

ترجمہ: جب کنعان بن نوح کی طبیعت بے ہنر تھی پیغمبر زادگی سے اسکی قدر و منزلت بڑھ نہ سکی ہنر دکھا اگر کچھ تیرے پاس ہے نیا دولت دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں دیکھئے گل کانٹے سے اور ابراہیم علیہ السلام آزر کی برادری سے پیدا ہوئے ہیں۔

تاویلات نجمیہ کی صوفیانہ نفیس تفسیر: عالم ارواح میں میثاق کے وقت کافروں کی مثال ایسی تھی جب اللہ تعالیٰ الست بربکم فرمایا تو انہوں نے اس آواز کو ایسے سنا جیسے جانور کو آواز دینے والا آواز دیتا ہے تو وہ کچھ نہیں سنتے تھے کیونکہ وہ آخری صف میں تھے اس لئے کہ اس وقت ارواح بہت بڑے لشکر میں بٹے ہوئے تھے اس وقت ان کی چار صفیں تھیں صف اول حضرت انبیاء کرام علی نبینا علیہم السلام کی صف دوئم حضرات اولیاء عظام رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تیسری صف مومنین کی چوتھی کافروں کی۔ اس وقت وہ ذرات حاضر کئے گئے جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تھے ہر ذرہ کو اپنی روح کے بالمقابل کھڑا کیا گیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا الست بربکم حضرات انبیاء کرام علی نبینا علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کی مکمل آواز بلا واسطہ سنی اور اس کے جمال کے انوار کا بلا حجاب مشاہدہ کیا اسی وقت وہ نبوت و رسالت اور مکالمہ اور وحی کے مستحق ٹھہرے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ اعلم حیث یجعل رسٰلتہ اللہ تعالیٰ جس سینے کو موزوں دیکھتا ہے وہاں رسالت رکھتا ہے اولیا کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور اس کے جمال کے انوار کا حجاب اروح انبیاء علیہم السلام کے انوار سے مشاہدہ کیا اسی لئے انبیاء کرام علیہم السلام کی تابعداری کے لائق ٹھہرے اور متابعت کے حقوق کی ادائیگی کی بدولت کلام الہام اگرچہ حجاب سے ہی کے مستحق ہوئے اور مومنین نے بھی حق کا خطاب

سنا لیکن حضرات انبیاء اولیاء کے حجاب کے واسطہ سے اسی لئے وہ ایمان بالغیب سے نوازے گئے اور حضرت انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو قبول کیا جب انہیں جبریل اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی رسالت کے پردے سے پیغامات الٰہی پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا نے مانا اور اطاعت کی اس تقریر کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ یعنی حجاب کے واسطہ سے اولیاء سے کلام کرتا ہے اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا بھیجتا ہے مومنین کے لئے جب کافروں نے تین پردوں سے کلام سنا تو ان کی مثال ایسے ہوگئی جیسے کوئی آواز دے رہا ہو۔ ایسی چیز کو کسی کی پکار کو سنتا ہی نہیں ان بے چاروں کو کمال حق کے انوار کا ذرہ بھر بھی مشاہدہ نہ ہوا اور نہ ہی وہ کلام حق کو کچھ سمجھ سکے ہاں انہیں مومنین کے ذرا سے حجاب کی آڑ میں ہلکی ہلکی آواز سنی گئی تو اس بناء پر اپنے آباؤ اجداد کی غلط تقلید میں پھنس گئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا اور فرمایا فَاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ پھر جب ان کی ارواح اجسام سے متعلق ہوئی اور حواس کے میل کچیل اور قویٰ سے ملے اور صفات حیوانیہ کی ظلمات سے تاریکی میں پڑے اور حیوانی عادتوں اور شیطانی اخلاق کی عادت ڈالنے پر ان کے دلوں پر غفلت کا دھبہ چھا گیا اور لذت جسمانیہ میں منہمک ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ اس لئے اب وہ دعوت انبیاء علیہم السلام کو سماع قبول سے بہرے اور حق کی بات اور توحید کے اقرار سے گونگے اور آیات معجزات کے دیکھنے سے اندھے ہیں اس لئے اب وہ ہمیشہ ہمیشہ تک کچھ نہیں سمجھتے کیونکہ اپنے عقول کی چمک کو غفلت کے دھبہ سے خراب کر دیا اور انوار روحانی کے فیوضات سے محروم ہو گئے۔ حضرت صائب نے فرمایا :۔

چرا از غیر شکایت کنم کہ ہچو حباب ہمیشہ خانہ خراب خویشتم

ترجمہ: میں غیر سے کیوں شکایت کروں میری مثال حباب کی ہے کہ اس کا خانہ خراب اس کی اپنی ہوا نے کیا ہے۔

مثنوی شریف میں ہے۔

گرچہ ناصح را بود صد داعیہ پند را اذنے بباید واعیہ

تو بصد تلطیف پندش می دہی او ز پندت میکند پہلو تہی

یک کس نامستمع ز استیز و درد صد کس گوینده را عاجز کند

زانبیا ناصح ترو خوش لہجہ تر | کے بود کہ رفت ومشاں درحجر
زانچہ کوہ وسنگ درکار آمدند | می نشد بد بخت را بکشادہ بند
آنچناں دلہا کہ بدشاں مادمہ | نقشاں شد بل اشد قسوہ

ترجمہ: اگر ناصح کو نصیحت کے کئی اسباب حاصل ہوں لیکن اس کی نصیحت کے لئے بھی حق کو قبول کرنے والا کان ضروری ہے جب نہ ماننے والے کان ہوں تو اسے کتنا بہتر کرو وہ ہرگز نہ مانے گا۔

سبق: دانا پر ضروری ہے کہ رضائے الٰہی کے راستہ پر چل کر اپنے حال کا تدارک کرے اور گذشتہ زندگی پر ندامت کا اظہار کرے یہ محقق کامل کی ترتیب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے عام انسان اپنے رب سے محجوب ہوتا ہے اور اس کا پردہ یہی غفلت ہے اور فضل ربانی کے بغیر یہ غفلت دور نہیں ہو سکتی ہاں اس کے ہٹانے کے اسباب بھی ہیں اور اس کا علاج سوائے تجربہ کار حکیم کے اور کوئی نہیں کر سکتا اور وہ حکیم مرشد کامل ہے جب یہ غفلت قلب سے ہٹ جاتی ہے اور غیب کے علاقہ کی طرف قلب کا دریچہ کھل جاتا ہے تو سالک توحید کا اقرار تحقیقاً کرتا ہے نہ تقلیداً اس وقت ان کی توحید تفریداً ہوتی ہے اس کے بعد اس کا معاملہ برعکس ہو جاتا ہے بایں معنی کہ محبوب کے ماسوی کی خبروں سے وہ بہرا اور حقیقت سے راز کے افشاء سے گونگا اس دار فانی میں اغیار کے دیکھنے سے اندھا ہو جاتا ہے اے اللہ ہمیں غلط تقلید سے بچا کر حقیق توحید تک پہنچا دے تو حمید و مجید ہے۔

تفسیر عالمانہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا اے ایمان والو رزق کھاؤ مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ان حلال رزقوں سے جو ہم نے تمہیں عطا کیا۔

سوال: آیت میں حلال کی قید کیوں لگائی گئی؟

جواب: مَا رَزَقْنٰكُمْ عام ہے حلال ہو یا حرام اور اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ حلال وحرام رزق کا رازق وہی ہے لیکن مومن کو حکم ہے کہ صرف حلال رزق کھائے یا طیبات سے لذیذ اشیاء مراد ہیں کیونکہ مَا رَزَقْنٰكُمْ کا رزق شامل ہے لذیذ ہو یا ناپسندیدہ۔

ف: حضرت ابن الشیخ فرماتے ہیں یہی معنی اس مقام کے لئے مناسب بلکہ اولیٰ ہے اس لئے کہ وہ اشتباہ سے پاک ہے اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ مقام مقام انسان ہے اس نے لذائذ بطور احسان عنایت فرمائے ہیں اور شکر

منعم منان کا بھی انہیں لذائذ ضروری ہے۔

ف : طیب کے تین مراتب ہیں۔ ۱۔ طبعی طور لذیذ ۲۔ شرعا مباح ۳۔ وضعا پاک

تفسیر صوفیانہ آیت میں ارشارہ ہے کہ قسم وقسم کے میوہ جات سے نفع اٹھاؤ اس لئے کہ وہ طیبات ہیں۔ لیکن اس کا ترک افضل ہے تا کہ سالک اپنے مرتبہ سے گر نہ جائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا

ف : کل طیبات کے امر میں دو فائدے ہیں۔

۱۔ ان طیبات کا کھانا امر الٰہی کی تعمیل ہو نہ کہ طبعی طور پر تا کہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہوں اور نور شریعت کی برکت سے طبیعت کی تاریکی کے حجاب ہٹ جائیں۔

۲۔ طیبات کو امر الٰہی کی وجہ سے کھائیں اور ثواب پائیں۔

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرو اس پر کہ اس نے تمہیں طیبات عنایت فرمائے اور یہ چیزیں تمہارے لئے حلال فرمائیں شکر، ظاہری اور باطنی اعضا کو اسی پر صرف کرنا جن کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔

مسئلہ : یہ امر وجوبی ہے استحبابی نہیں اس لئے کہ عاقل پر واجب ہے کہ یوں اعتقاد رکھے کہ وہ ذات کہ جس نے اسے پیدا کیا اور پھر لاتعداد ولاتحصی نعمتوں سے نوازا وہ نہایت درجہ کی تعظیم کا مستحق ہے اور اسے زبان اور دیگر اعضاء سے ظاہر کرے۔

تفسیر عالمانہ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو یعنی اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے اور صرف اسی کو عبادت کا مستحق سمجھتے ہو تو اس کا شکر کرو کیونکہ ایمان تو شکر کو واجب قرار دیتا ہے بلکہ یہ شکر ایمان کے شرائط میں سے مثلاً کوئی شخص کہے مجھے تیرے ساتھ محبت ہے تو وہ اسے کہتا ہے ان کنت لی محبا فافعل کذا اگر تجھے میرے ساتھ محبت ہے تو تم ایسے کر کے دکھلاؤ اس جملہ میں صرف شرط اسی لئے داخل کرتا ہے تا کہ محب کو اس کے حکم کردہ امر کی ادائیگی میں جوش آجائے اور ظاہر ہو جائے کہ محبت کی علامت ایک یہ بھی ہے کہ محبوب کے حکم کی تعمیل کی جائے۔

ف : یہ بھی یاد رہے کہ یہ ان شرائط میں سے نہیں کہ انتفاء شرط سے مشروط کی نفی ہو اس لئے کہ اگرچہ بندہ عبادت

نہیں کرتا تب بھی اس پر شکر لازم ہے۔

قدسی حدیث شریف: میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا انس وجن کا عجیب معاملہ ہے کہ ان کا خالق میں ہوں لیکن وہ میرے غیر کی پرستش کرتے ہیں اور انہیں رزق میں دیتا ہوں لیکن شکر میرے غیر کا کرتے ہیں۔ حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

مکن گردن از شکر منعم بپیچ — کہ روز بہ پسیں سر برآری ہیچ

ترجمہ: ایسا نہ کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردن پھیر تیرے حکم سے بھی کوئی شئے گردن نہیں پھیرے گی۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر مردار کو حرام کیا الْمَيْتَةَ وہ جانور جو ذبح کے لائق تھا۔ لیکن ذبح کے بغیر مر گیا۔

مسئلہ: عرف کی رو سے ٹڈی اور مچھلی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں مثلاً کوئی کہے فلاں نے مردار کھایا تو یہ دونوں یعنی مچھلی اور ٹڈی ذہن میں آئیں گی بھی نہیں۔

مسئلہ: شرعاً عادت کا اعتبار نہیں ہے مثلاً کوئی قسم کھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا اس کے بعد مچھلی کھائی تو حانث نہ ہوگا اگرچہ اس نے حقیقۃً گوشت کھایا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا تاکہ تم تازہ گوشت کھاؤ۔

مسئلہ: مردار کی تحریم سے اس کے کھانے اور اس کے دودھ پینے اور اسے بیچ کر نفع اٹھانے کی حرمت مراد ہے کیونکہ احکام شرعیہ کا تعلق افعال سے ہوتا ہے نہ کہ اعیان سے۔ وَالدَّمَ اور بہتے ہوئے خون کو حرام فرمایا۔

مسئلہ: جگر اور تلی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں باعتبار عرف کے اس لئے وہ دونوں حلال ہیں۔

وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ اور خنزیر کے گوشت کو حرام کیا۔

مسئلہ: اہل اسلام کا اجماع ہے کہ خنزیر نجس العین ہے اس لئے کہ اس کے جسم کے جمیع اجزء حرام ہیں۔

سوال: جب خنزیر کے تمام اجزاء حرام ہیں تو پھر صرف گوشت کا نام کیوں لیا گیا۔

جواب: حیوان سے نفع اٹھانے کی سب سے اعلیٰ چیز گوشت ہے نیز حیوان کے اجزاء کا اصل یہی ہے جب اصل کا ذکر ہو جاتا ہے تو فرع اس میں خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور حرام کیا اللہ تعالیٰ نے وہ جو پکارا ہے غیر اللہ کے لئے یعنی حرام کیا گیا ہے جو کہ بتوں کے لئے ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہے۔

ف: اہلال کا اصلی معنی رفع الصوت ہے اور بت کے بچاریوں کے عادت تھی کہ جب بتوں کے لئے جانور ذبح کرتے تو ان کے نام لے کر آواز کو بلند کرتے اور کہتے باسم الات والعزی پھر اس طرح سے ان کی ایسی عادت بن گئی کہ ہر ذبیح کو مہل کہا جاتا اگر چہ وہ ذبح کے وقت بسم اللہ جہر سے نہ بھی کہتا۔

مسئلہ: علماء کرام فرماتے ہیں کہ کوئی مسلمان کسی جانور کو ذبح کرے اگر چہ اس پر بسم اللہ بھی پڑھے لیکن اس کا ارادہ تقرب الی غیر اللہ یعنی غیر اللہ سے ثواب اور قربت کا طالب ہو تو وہ شخص مرتد خارج از اسلام اور وہ ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔

مسئلہ: اہل کتاب کا ذبح کیا ہوا جانور ہمارے لئے حلال ہے۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ اہل کتاب کے طعام تمہارے لئے حلال ہیں۔

مسئلہ: جب یہ اہل کتاب جانور پر غیر اللہ کا نام لے تو وہ حرام ہے وہ اس آیت کے حکم سے خارج ہے اس لئے کہ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ عام ہے اور یہ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ خاص ہے اور علم تفسیر کا قاعدہ ہے کہ خاص کو حکم میں عام سے مقدم کیا جاتا ہے۔

اضافہ اویسی: اس آیت کو لے کر ہمارے دور کے معتزلہ دیو بند وغیرہ طرح طرح کے مغالطے ڈالتے ہیں صاحب روح البیان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اگر چہ وضاحت فرمادی لیکن ناظرین کے لئے چند اور حوالہ جات حاضر ہیں۔ تا کہ مزید تسکین وتسلی ہو یاد رہے کہ یہ آیت قرآن پاک میں چار مقامات پر وارد ہوئی۔

☆...... پ۲ ع ۵ ☆...... پ۱ ع ۵ ☆...... پ۵ ع ۵ ☆...... پ۱۴ ع ۲۱

ان آیات کا مفہوم متقدمین نے جس طرح بیان فرمایا ہے وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں مزید تحقیق کے لئے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجدد دین وملت سیدنا الحاج علامہ امام اہلسنت مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہ کی تصانیف اور امام الاولیاء، مقدام العلماء اعلیٰ حضرت سیدنا پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہ کی کتاب اعلاء کلمۃ اللہ کا مطالعہ کیجئے۔ فی الحال چند حوالے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ مفردات راغب اصفہانی (صفحہ ۵۶۶ مطبع مصر)

وما اهل به لغير الله اى ماذكر عليه غير اسم الله وهو كان ينبع لاجل الاصنام

(وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ یعنی وہ جس پر غیر نام خدا ذکر کیا گیا یہ وہ جانور ہے جو بتوں کیلئے ذبح کیا جاتا تھا)

وما اهل به لغير الله الذى اى ذبح على اسم غير ولا هلا رقع الصوت

وكانوا ايرفعونه عند الذبح لالهتم

(وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ یعنی جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا اور اہلال کا معنی آواز بلند کرنا ہے اور مشرکین اپنے معبودوں کے لئے ذبح کرنے کے وقت آواز بلند کرتے تھے)

۲۔ تفسیر مدارک تحت آیت مذکوہ بالا

وما اهل به لغير الله اى ذبح الاصنام فذكر عليه غير اسم الله واصل الاهلال رفع الموت

رفع به الصوت المنم وذالك ولك قول اهل الحاهليه باسم الات والعزى

(وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ یعنی جو بتوں کے لئے ذبح کیا گیا اس پر غیر نام خدا ذکر کیا گیا اور اصل میں اہلال آواز بلند کرنا ہے یعنی اس کے ساتھ بت کے لئے آواز بلند کی گئی اور یہ اہل جاہلیت کا بنام لات وعزی کہلاتا تھا لات وعزی مشرکین کے بتوں کے نام ہیں ان کے لئے جو جانور قربانی کرتے تھے ان کو بنام لات وعزیٰ کہہ کر ذبح کرتے تھے۔

۳۔ تفسیر لباب التاویل (صفحہ ۱۱۵ ج ۱)

وما اهل به لغير الله يعنى ماذبح الاصنام والطو اغيب واصل الاهلال رفع الصوت

وذالك انهم كانوا يرفعون اصواتهم بزكر الههم اذاذبحوا لها

(وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ یعنی جو بتوں اور باطل معبودوں کے لئے ذبح کیا گیا اہلال اصل میں آواز بلند کرنا ہے اور یہ بات یوں ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے ذکر کے ساتھ آوازیں بلند کرتے جس وقت کہ ان کو ذبح کرتے تھے)

۴۔ تفسیر کبیر (صفحہ ۱۴۰ ج ۲)

وما اهل به لغير الله يعنى ماذبح الاصنام وهو قول مجاهد وضحاك وقتاده وقال

ربيع انس وابن زيد يعنى ماذكر عليه غيرا سم الله وهذا لقول اولى الله اشد مطابقه

(وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ جو بتوں کے لئے ذبح کیا گیا ہو یہ قول مجاہد وضحاک وقتادہ کا ہے ربیع ابن انس اور ابن زید نے کہا یعنی وہ جس پر غیر نام خدا ذکر کیا گیا ہو اور یہ قول اولیٰ ہے کیونکہ اس میں مطابقت لفظی زیادہ ہے)

۵۔ تفسیر علامہ ابی السعود (صفحہ۲۱ج۲)

وما هل به لغير الله رفع به الصوت عند ذبحه الصنم

(وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ یعنی وہ چیز جس کو بت کے لئے ذبح کرنے کے وقت آواز بلند کی گئی ہو)

ان تمام تفاسیر سے ثابت ہوا کہ وقت ذبح جس جانور پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اس کا کھانا حرام ہے مشرکین عرب بتوں کی قربانی کے جانور وقت ذبح غیر خدا کا نام لیتے تھے اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو وہ حلال ہے اگر چہ عمر بھر اس کو غیر نام سے پکارا ہو مثلاً یہ کہا زید کی گائے، عبد الرحمٰن کا دنبہ، عقیقہ کا بکرا، ولیمہ کی بھیڑ مگر وقت ذبح بسم اللہ اللہ اکبر کہا ہو اللہ، اللہ کے سوا کسی اور کا نام نہ لیا گیا ہو تو وہ حلال طیب ہے اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل نہیں اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ اور نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا اور بے شک یہ حکم عدولی ہے تو جس پر اللہ کا نام لیا گیا اور وہ نام خدا پر ذبح کیا گیا اس پر اللہ کا نام لیا گیا اگر تم اس کی آیتیں مانتے ہو اس کے بعد ارشاد فرمایا وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اور تمہیں کیا ہوا کہ اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

۵۔ تفسیر احمدی (مطبوعہ کلکتہ صفحہ۴۰)

وما اهل به لغير الله بهٖ ذبح به لاسم غير الله مثل لات وعزى واسماء الانبياء وعزى ذالك فان افر دبه اسم غير الله او ذا كر معه اسم الله اطفا بان يقول باسم الله ومحمد رسول الله بالجر حرم الذبيحته وان ذكر معه مرصولا لا معطوفا بان يقول باسم الله محمد رسول الله كره ولا يجرم وان ذكر مفعولا بان يقول قل السميه وقبل ان يضبح الذبيحه اوبعد الاباس به هكذا فى الهدايته من هاهنا علم ان البقره المندورة فلا اولياء كما هو لارسم زماننا حلال طيب لانه لم ينكر اسم غير الله عليها وقت الذبح وان كانو ا ينذرونها له

(وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ غیر خدا کے نام پر ذبح کیا گیا ہو مثلاً لات وعزیٰ وغیرہ بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو یا انبیاء علیہم السلام وغیرہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو تو اگر تنہا غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا یا اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ عطف کر کے دوسرے کا نام ذکر کیا اس طرح باسم اللہ ومحمد رسول اللہ کہا لفظ محمد کے جر یعنی زیر کے ساتھ عطف کر کے تو ذبیحہ حرام ہے۔

اور اگر نام خدا کے ساتھ ملا کر دوسرے کا نام بغیر عطف کے ذکر کیا مثلاً یہ کہا باسم اللہ محمد رسول اللہ تو مکروہ ہے حرام نہیں اور اگر غیر کا نام خدا ذکر کیا اس طرح کہ بسم اللہ کہنے سے پہلے اور جانور کو لٹانے سے قبل یا اس کے بعد غیر کا نام لیا تو اس سے کچھ مضائقہ نہیں ایسا ہی ہدایہ میں ہے یہ اس سے معلوم ہوا جو گائے اولیاء کے لئے نذر کی جاتی ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں رسم ہے وہ حلال طیب ہے اس لئے کہ اس پر وقت ذبح غیر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اگرچہ ان کے لئے نذر کرتے ہوں)

ان عبارات سے روز روشن کی طرح معلوم ہو گیا کہ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے اس ذبیحہ کی حرمت ثابت ہوتی ہے جس کو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور وقت ذبح غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو اس کے علاوہ کوئی اور چیز یہ آیت حرام نہیں کرتی نہ فقیر والا آم جس پر ہمیشہ فقیر کا نام لیا جاتا ہے اور نہ کوئی اور چیز جو کسی کے نام سے مشہور ہو نہ وہ ذبیحہ جس پر ذبح سے قبل یا بعد غیر خدا کا نام ذکر کیا گیا جو حتیٰ کہ اگر ذبح میں خاص قربانی کے دن یہ کہا جائے کہ پہلے عبدالرب کی گائے ذبح ہوگئی پھر عبدالکبیر کی پھر رسول بخش کی اور اس کے بعد وہ گائیں صرف بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر ذبح کی جائیں تو وہ حلال ہیں۔ قربانی مقبول ہے اور ایسے اطلاقات احادیث میں بکثرت ملتے ہیں لہٰذا فاتحہ دینا وصدقات وخیرات وغیرہ کو وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل کرنا قرآن کریم کے معنی کی تبدیلی اور تمام تفاسیر معتبرہ کی مخالفت ہے۔ اویسی غفرلہ۔

فَمَنِ اس مَن کے متعلق احتمال ہے کہ شرطیہ وموصولہ ہو اضْطُرَّ پس وہ شخص جو محتاج اور مجبور ہو جائے اس شئے کے کھانے پر جسے اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا کہ سوائے اس حرام کے اور کوئی شے میسر نہ ہو تو پھر کھا پی لے۔

ف: اضطرار کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شئے کو عمل میں نہیں لائے گا تو زندہ نہیں بچ سکے گا اس کا کوئی عضو تلف ہو جائے گا۔

غَيْرَ اس غیر کا منصوب ہونا بنانے حال ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب وہ الا کے قائم مقام کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس وقت وہ غیر حالیہ ہوتا ہے اگر وہ الا کے معنی کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس وقت وہ استثنائیہ ہوگا۔

اگر ان دونوں کے لائق نہیں تو وہ غیر صفت کا معنی دے گا۔ اور یہاں پر فعل محذوف کا فاعل ہے جو کہ اضطر کے بعد محذوف ہے اصل عبارت یوں تھی فمن اضطر احدام بن الی تناول شئی من ھذا المحرمات یعنی پس جس شخص کو ان حرام اشیاء کو عمل میں لانے پر ایک دو امروں سے مجبور کر دے ان دونوں میں سے ایک یہ کہ اسے سخت بھوک لاحق ہو اور اسے اس حرام شئے کے سوا اور کوئی ایسی شئے نہ ملے کہ جس سے قوت لایموت ہو

سکے دوسرا یہ کہ اس حرام شئے کے عمل میں لانے سے جبر کیا جائے لیکن شرط یہ ہے کہ کھاتے وقت بغاوت کرنے والا نہ ہو۔ دوسرے مجبور و مضطر پر۔ مثلاً کسی دوسرے مضطر کو بھی اس شئے کی ضرورت ہے لیکن یہ اس سے چھین کر اپنی زندگی بچالے حالانکہ دوسرا اسی حالت میں مرجائے۔ یہ بالکل حرام ہے کیونکہ دوسرے کو بھوکا مار دینا اور خود زندہ بچ جانا اچھا نہیں۔

وَلَا عَادٍ اور نہ ہی حد سے متجاوز کرنے والا ہو عاد، عدو سے مشتق ہے بمعنی کسی امر کا حد سے بڑھ جانا اور اس سے تجاوز کر جانا جب کہ اس امر کے متعلق حد مقرر کی گئی ہو یعنی کھاتے وقت بھوک کی جب ضرورت پوری ہو جائے تو اس کی حد سے تجاوز نہ کرے۔

مسئلہ: حرام شئے بوقت اضطرار اتنا کھائے کہ جس سے جان بچا سکے یعنی معمولی طور پر بھوک رفع کرے۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ شدید ضرورت کے وقت حرام شئے کو عمل میں لائے بے شک اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ ہے اس لئے کہ جس نے بوقت اضطرار کھایا رَّحِيْمٌ ہے اس کے رخصت دینے پر۔

سوال: اس آیت میں باقی محرکات کا ذکر کیوں نہیں ہوا؟

جواب ۱: یہ آیت حصر کے لئے نہیں بلکہ کفار کی غلط روی کے نمونے بیان کئے جو کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھ کر کھا جاتے تھے مثلاً مردار کو کھاتے ہوئے کہتے کہ جسے تم خود مارتے ہو وہ حلال ہے اور جسے اللہ تعالیٰ مار دے وہ کیوں حلال نہ ہو اسی طرح دم منسوخ پی جاتے اور خنزیر اور بتوں پر ذبح کئے ہوئے جانور کھا جاتے اللہ تعالیٰ نے ان کی حلال کردہ اشیا کو حرام کر کے واضح فرمایا۔

خلاصہ جواب: یہ قصر اس معنی پر ہے کہ جن اشیاء کو وہ حلال سمجھتے تھے یہ قصر مطلق نہیں۔

جواب ۲: بعض نے اس سوال کا جواب یوں دیا ہے کہ مَیْتَہ کے لفظ میں المتردیہ بھی داخل ہے یعنی وہ جانور جو کنوئیں یا پانی میں یا اوپر سے نیچے گر کر مرجائے اور المنخنقہ یعنی وہ جانور جس کا گلا گھونٹ کر مارا جائے اور الموقوذۃ یعنی وہ جانور جو لکڑی سے مارا جائے اور المنخنقہ وہ جانور جسے دوسرے جانور نے سینگ مار کر مارا ہو اور وہ جسے درندہ کھا جائے اور جس پر عمداً بسم اللہ ترک کی جائے وغیرہ وغیرہ سب المَیْتَۃ کے حکم میں داخل ہیں۔

مسئلہ: حلال جانور کی دس چیزیں مکروہ ہیں۔

۱۔ خون ۲۔ غدود ۳۔ قبل ۴۔ دبر ۵۔ ذکر

۶۔ دونوں خصیے ۷۔ پتہ ۸۔ مثانہ ۹۔ پیٹھ کی ہڈی۔ ۱۰۔ تلی

خون تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ اور باقی اس لئے کہ یہ تمام خون سے بنتے ہیں۔

حدیث شریف: شیخ الشہیر ما فتادہ آفندی قدس سرہ نے فرمایا حضور ﷺ نے حلال جانور کی تلی کبھی نہیں کھائی اور نہ ہی گردہ اور نہ ہی تھوم اگرچہ ان کے کھانے سے رکا بھی نہیں بہتر یہی ہے کہ یہ اشیاء نہ کھائی جائیں تا کہ آپ کی تابعداری صحیح معنی پر نصیب ہو۔

ف: بعض لوگ کہتے ہیں کہ پتہ نہ کھانے کی ایک وجہ یہ ہے کہ منی خروج کرتی ہے تو سب سے پہلے اسی پتے میں پہنچ کر پھر یہاں سے خارج ہوتی ہے اور تلی نہ کھانے کیوجہ یہ ہے کہ یہ جہنمیوں کا کھانا ہے۔

(کذافی واقعات والھدائی قدس سرہ)

مسئلہ: حرام شئے سے علاج جائز نہیں اگرچہ اس کے استعمال سے شفا ممکن بھی ہو اگر حرام شئے کو استعمال نہیں کیا اور مر گیا تو گنہگار نہیں ہوگا۔ کیونکہ حرام شئے کے استعمال سے شفا ظنی ہے یقینی نہیں اس لئے ممکن ہے کہ اسے اس شئے کے استعمال کے بغیر بھی شفا ہو جائے۔

مسئلہ: الاشباہ و النظائر میں ہے کہ نجاستوں اور شراب سے مریض کا علاج کرنا جائز ہے بہ بنائے احد القولین.

مسئلہ: قاضیخان میں ہے کہ نجاسات وغیرہ سے علاج کرنا نا جائز ہے اور قاضیخان نے اس کو مختار بتایا۔

مسئلہ: طبیب کو غیر کے ستر کو دیکھنا علاج کی خاطر جائز ہے اسی طرح بیگانی عورت اور مخصوص اعضاء کو بھی۔

مسئلہ: خانیہ میں تصریح فرمائی ہے کہ پیاسے کو بحالت اضطرار شراب بقدر ضرورت پینا جائز ہے۔

سوال: حضرت صدر الشہید رحمۃ اللہ فرماتے ہیں الا سعشفاء بالحرام یعنی حرام شئے سے علاج کرنا حرام ہے۔

جواب: یہ ان کا ضابطہ کلیہ نہیں نہ وہ اپنے اطلاق میں ہے کیونکہ حرام شئے سے علاج کرنا اس وقت حرام ہے جبکہ ہمیں معلوم نہ ہوا کہ اس سے شفا ہوگی یا نہ لیکن جب ہو اس علاج سے شفا ضرور ہوگی تو حرام نہیں مگر اس میں

شرط ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں ہے تب جائز ہے۔

سوال: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ان اللہ لم یجعل شفاؤ کم فیما حرم علیکم بے شک اللہ تعالیٰ نے حرام اشیاء میں تمہاری شفا مقدر نہیں فرمائی۔

جواب: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہی مطلب ہے کہ جس بیمار کے متعلق معلوم ہو کہ اس کا علاج حلال شئے سے ہو سکتا ہے تو پھر اس وقت حرام شئے سے علاج کرنا حرام ہے اس لئے کہ اس وقت حلال سے روگردانی کر کے حرام شئے کی طرف رجوع کرنا لازم آتا ہے اور وہ ناجائز ہے البتہ جب یقین ہو کہ اس بیماری کا علاج اسی حرام شئے سے ہے تو پھر بامر مجبوری حرام شئے سے علاج کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: تہذیب میں ہے کہ جس کی بیماری لاعلاج ہو اور اسے کوئی مسلمان طبیب بتائے کہ تیری شفا پیشاب یا خون پینے میں ہے تو اسے پیشاب یا خون پینا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مباح شئے میں اس کا عوض اور بدل نہ مل سکے۔ (کذافی شرح چهل حدیث لعلامه الروم ابن اکمال رحمة الله تعالیٰ)

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہ ظاہری اشیاء حرام فرمائی ہیں اسی طرح تمہارے لئے چند باطنی امور بھی حرام فرمائے ہیں وہ ہیں غیر اللہ کے مشاہدات مثلاً المَیْتَۃَ سے مراد دنیا سے ہے دم سے شہوات نفسانیہ۔

حدیث شریف: حضور کریم ﷺ نے فرمایا ان الشیطان لیجری فی ابن ادم مجری الدم بے شک شیطان ابن آدم خون کے مجاری میں ہے اس لئے کہ اگر خون میں شہوات پوشیدہ نہ ہوتیں تو شیطان کو انسان کے گمراہ کرنے کی طاقت نہ ہوتی اس لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا دو مجاری الشیطان بالجوع کی گذرگاہوں کو بھوک سے بند رکھو اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک شہوات کے غلیظ مادہ کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے اور الخنزیر میں خواہشات نفسانیہ کی طرف اشارہ ہے۔ نفس کی خنزیر سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ خنزیر میں چار گندی عادتیں ہیں۔ ۱۔ حرص ۲۔ لالچ ۳۔ کمینہ پن ۴۔ ظاہری حیثیت کا مجسمہ اور یہی عادات نفس میں پائی جاتی ہیں وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے وہ عبادات اور قربات الٰہی کے اعمال مثلاً خیرات بدحیہ و مالیہ مراد ہیں جو بغیر خلوص کے ادا کئے جائیں۔ اور ان سے رضائے الٰہی مطلوب نہ ہو بلکہ ریا اور سمعہ مقصود ہو۔

فَمَنِ اضْطُرَّ الخ یعنی مجبور ہو جائے حاجت نفسانیہ کی ضروریات کی وجہ سے یا امر شرعی سے یعنی وہ امور جو اس نے بطور وجوب کے قائم کر لئے ہیں وقت مجبوری انہیں عمل میں لائے لیکن غیر باغ یعنی دنیا کے حرص اور اس کے جمع کرنے سے بطریق حلال کے یا حرام کے پاک وصاف اور نہ ہی شہوات سے حرام کی طرف جھک کر اور حفوظ نفس فی الحلال و الحرام کی طرف متوجہ ہو کر اور نہ ہی طاعات وخیرات، سنن ہوں یا بدعات حسنہ، میں ریا کرتا ہو وَلَا عَادٍ دینوی ضروریات میں قناعت کی حد سے آگے بڑھ کر اور حد قناعت یہ ہے کہ کھائے اتنا کہ سدرمق ہو اور پہنے ایسا کہ صرف ستر عورت ہو فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اس پر کوئی گناہ نہیں یعنی اس شخص پر جو ان شرائط کا پابند ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بخشتا ہے عالمین کے گناہ آثار رحمت سے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ انوار رحمت سے قائم اور اوصاف رحمت سے موصوف ہو کر اس میں فانی ہو گئے ہیں۔

تاویلات نجمیہ کی صوفیانہ نفیس تفسیر: الغفور و الغفار وہ ہے جو حسن وجمال کو ظاہر کرے اور قباحتوں و گناہوں کو چھپائے یعنی بندہ کے تمام گناہ جو اس سے صادر ہوتے ہیں دنیا میں انہیں چھپائے اور آخرت میں انہیں معاف فرمادے اور بندے کو اس اسم سے فیوض و برکات ملنے کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے عیوب چھپا کر درگزر کرے۔

حدیث شریف: حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے مسلم بھائی کے عیوب ڈھانپتا ہے یوم قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کے عیوب چھپائے گا۔

مسئلہ: غیبت کرنے والا اور دوسروں کے عیوب تلاش کرنے والا اور برائی کا بدلہ برائی سے دینے والا اس اسم کے فیوض و برکات سے محروم ہوگا ہاں وہ شخص اس صفت غفوری سے موصوف ہو سکتا ہے جو خلق خدا کے عیوب چھپاتا ہے اور اس کی نیکیاں بیان کرتا ہے۔

حکایت: سیدنا عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مردہ کتے کے قریب سے گزرے جس کی ہڈیوں سے دماغ باہر نکلنے کو آجاتا آپ نے ساتھیوں سے فرمایا کتے کی بدبو کتنی خراب ہے آپ نے فرمایا اس کتے کے دانت کتنے عجیب ہیں۔

سبق: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس طرح سے تنبیہ فرمائی کہ شے گندگی کیوں نہ ہو لیکن ہمیں اس کی گندگی سے آنکھ چرا کر اس کی بھلائی کو دیکھنا چاہیے (کذافی شرح اسماء الحسنی الامام الغزالی قدس سرہ)

تفسیر عالمانہ اِنَّ الَّذِیْنَ شان نزول: یہ آیت یہود کے علماء کے حق میں نازل ہوئی جن کو یہ امید تھی کہ وہ نبی آخر الزماں ﷺ جن کی خوشخبری تورات میں ہے ان کی قوم سے ہوں گے لیکن جب حضور ﷺ تشریف لائے اور وہ عربوں میں بنی ہاشم اور قریشیوں سے ظہور پذیر ہوئے تو انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کے اوصاف اور تعریف کی تقریریں تورات میں بدل لیں جب ان کے چیلے تورات میں حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی سیرت وصورت کو دیکھتے تو برعکس پاتے اس لئے وہ آپ کی اتباع کی بجائے مخالفت پر تل گئے تا کہ ان کے جاہ جلال میں آنچ نہ آئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اِنَّ الَّذِیْنَ بے شک وہ لوگ یَکْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْکِتٰبِ چھپاتے ہیں وہ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا کتاب میں سے یہ حال ہے عائد محذوف سے انزلہ اللّٰہ حال انہ من الکتب اس سے مراد ہی تورات ہے جو حضور ﷺ کی نعت پر مشتمل تھی۔ وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ اور حضور علیہ السلام کی نعت چھپانے کے عوض خریدتے ہیں ثَمَنًا قَلِیْلًا تھوڑا ثمن یعنی اپنے سے کم مرتبہ لوگوں سے دنیا کی حقیر اشیاء یعنی کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرتے ہیں اُولٰٓئِكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ یعنی وہ لوگ ہیں جو نہیں کھاتے اپنے پیٹ میں سوائے نار کے آخرت میں تو نار کا کھانا ظاہر ہے کہ آخرت میں آگ کے انگارے ان کے پیٹ میں بھر دیئے جائیں گے اور دنیا میں ان کے نار کھانے کا معنی یہ ہے کہ نار میں جہنم کے انگارے کھانے کے سبب کو کھاتے تھے اس لئے کہ اپنے سے کم مرتبہ لوگوں سے جو کچھ لیتے رہے وہ جہنم کے انگاروں کا سبب بن کر انہیں جہنم میں کھینچ لے گیا۔

ف: اس پر نار کا اطلاق از قبیل اطلاق المسبب علی المسبب کے ہے اور فِیْ بُطُوْنِهِمْ کا معنی یہ ہے کہ ان کے پیٹ بھر دیئے جائیں گے اکل فی بطنہ و اکل فی بعطنہ بطونھم کے ذکر سے مقصود اسے متعلق بنانا ہے یَاْكُلُوْنَ کا کے اکل کا محل اور قرار گاہ وہی پیٹ ہے پھر جب کہ بعض بطو نھم نہیں فرمایا بلکہ فِیْ بُطُوْنِهِمْ فرمایا ہے تو اس سے مقصود یہی ہے کہ ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہوں گے اس میں مبالغہ ہے کہ وہ گویا پیٹ پر سہارا کر کے نہیں کھاتے بلکہ اسے کھلا رکھ کر کھاتے تا کہ وہ پورے طور پر بھر جائے۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ قیامت میں غضب ناک ہو کر کلام کرے گا۔

سوال: اس میں کفار سے اللہ تعالیٰ کے کلام کی نفی ہے حالانکہ دوسرے مقام پر اثبات کما قال تعالی فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ وغیرہ

جواب: آیت وَلَا يُكَلِّمُهُمْ میں کلام کی بالکلیہ نفی نہیں بلکہ ایک قسم کے غضب سے کنایہ ہے کیونکہ عرف کا قانون ہے کہ کسی سے کلام نہ کرنے کا معنی ہے ناراضگی کا اظہار اور بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو مغضوب علیہ سے اعتراض کرتے اور ان سے ہمکلام نہیں ہوتے اور کسی سے راضی خوشی کے وقت اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مہربانی اور لطف و کرم سے۔

وَلَا يُزَكِّيْهِمْ اور وہ ہی انہیں صاف اور ستھرا کرے گا یعنی ان کی تعریف نہ کرے گا اور نہ ہی ان کو قیامت میں گناہوں سے صاف و ستھرا کرے گا جیسے مومنین کی مغفرت فرما کر انہیں گناہوں سے پاک اور ستھرا کرے گا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اور ان کے لئے عذاب دردناک ہوگا یعنی دائمی درد و الم کے حقدار ہوں گے اُولٰٓئِكَ یعنی ہولوگ جو کتاب اللہ کو ثمن قلیل لے کر بیچنے والے تھے وہ قلیل ثمن لینے والے نہیں تھے اَلَّذِيْنَ اشْتَرَوُا جنہوں نے خریدا جیسے دنیا میں خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا ہے الضَّلٰلَةَ گمراہی کو وہ گمراہی کہ جس کا خریدنا بالکل ناممکن ہے بِالْهُدٰى ہدایت کے عوض۔

ف: ہدایت بظاہر ایسی شے نہیں کہ اس پر کوئی دنیا کی شے (اگر بہت ہو) خرچ کر کے لیا جاسکے وَالْعَذَابَ اور عذاب عذاب کے یعنی انہوں نے عذاب خریدا اور یہ بھی ایسی شئے نہیں کہ اسے دنیوی اعتبار سے خریدا جاسکے بِالْمَغْفِرَةِ مغفرت کے عوض وہ مغفرت کہ جس کے حصول کے لئے لوگ بڑی رغبت رکھتے ہیں فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (پس کس چیز نے انہیں جہنم پر صبر دلایا ہے) یعنی وہ کون سا امر ہے جو انہیں اہل نار کے اعمال پر کشاں کشاں لے جا رہا ہے جب کہ وہ راہ ہدایت چھوڑ کر گمراہی کے راستوں پر چل رہے ہیں اور نار سے مراد اس کا سبب ہے ان کے آپس کی ملابست کی وجہ سے نار بول کر اس کا سبب مراد لیا گیا ہے اور یہ تعجب بندوں کی طرف راجع ہے یعنی بندوں کو تعجب میں ڈالا گیا ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ تو تعجب سے پاک ہے اور نہ اس کی شان ہے کہ تعجب کرے کیونکہ تعجب تو جہل سے ہوتی ہے قاعدہ ہے کہ تعجب نفس کو اس لئے لاحق ہوتی ہے کہ نفس سے شئے کا سبب مخفی ہوتا

اور وہ اپنے نظائر کے خلاف آتا ہے اس لئے نفس کو تعجب لاحق ہے اور رب تعالیٰ ایسے معاملہ سے پاک ہے۔

ذٰلِكَ کا سبب یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے بِاَنَّ اللّٰهَ کتب مطلق کو اتارا بِالْحَقِّ حق کے ساتھ یعنی اس حال میں کہ وہ کتاب منزل من اللہ حق کے ساتھ متلبس ہے پھر لامحالہ جو بھی تکذیب کر کے حق کو چھپا کر جہل و گمراہی کی سواری پر سوار ہو کر چھوڑے گا تو وہ جہنم کے عذاب میں مختلف طریق سے مبتلا ہو گا۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ اور بے شک وہ لوگ جنہوں نے کتاب کے بارے میں اختلاف کیا یعنی جنس کتاب کے متعلق اختلاف یوں کیا کہ اس کتاب اللہ کے بعض مضامین پر ایمان لایا اور بعض سے کفر کیا یا اس کتاب سے مراد تورات ہے اس کا معنی بھی یہی ہو گا کہ وہ کتاب تورات کے بعض مضامین پر ایمان لائے اور بعض کے ساتھ کفر کیا مثلاً ان آیات پر ان کا ایمان نہیں تھا جو حضور نبی اکرم ﷺ کی تعریف پر مشتمل تھیں یا آپ کی تشریف آوری کے متعلق تھے۔ یا الکتاب سے قرآن مجید مراد ہے کہ کافروں نے کفر کیا بامعنی کہ بعض کہتے تھے کہ یہ شعر بعض نے کہا یہ جادو ہے بعض نے کہا یہ کہانت ہے لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ البتہ وہ بہت بڑے اختلاف میں ہیں یعنی ایسا اختلاف جو حق اور صواب سے بعید اور بہت بڑے عذاب کا موجب ہے۔

مسئلہ: ان آیات سے بہت بڑی وعید ہے ہر اس شخص کے لئے جو کسی دنیاوی یا غلط حرص کی وجہ سے حق کو چھپاتا ہے۔

سبق: علماء کرام کو چاہیے کہ وہ کتمان حق کی خرابیوں سے بچیں جب وہ حق کو جانتے ہیں تو پھر اسے کیوں چھپاتے ہیں۔

کتمان حق کے اسباب: بادشاہوں اور امراء وزراء اور ارباب دنیا سے حق چھپانے کے چند وجوہ ہوتے ہیں۔

☆ ......خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ مرتبہ چھن نہ جائے جس پر وہ ہے اور وہ قدر و منزلت کم نہ ہو جائے جو ان کی طرف سے اسے حاصل ہے۔

☆ ......ان حضرات کے احسانات کی وسعت حق گوئی سے باز رکھتی ہے۔

☆ ......وہ حضرات خود ان کے ساتھ جب دنیا اور دنیا جمع کرنے کی حرص و ہوا وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں اب

شرم کے مارے انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔

☆...... چونکہ ماکول ومشروب اور ملبوس ومرکوب اور مکانات اور دیگر زیب وزینت مثلاً مکانات کے اندر بہترین برتن ودیگر از وسامان جمع کرتا اور خدام کی خدمات اور داریوں کے مشاغل وغیرہ میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ انہیں حق گوئی کا موقع نہیں ملتا انہی وجوہ سے حق گوئی سے چشم پوشی بلکہ ان سے بسا اوقات کھانے پینے کی خاطر غلط باتیں تقویت کے طور کہہ دیتے ہیں۔

ف: وہ نار حرص اور شہوت اور حسد کے انگارے کھا رہے ہیں جو کہ ان کے دلوں پر جا کر انہیں جلا دیتے ہیں اور یہ امور ان کی نیکیوں کو ایسے کھا جاتے ہیں جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

تفسیر صوفیانہ ہر وہ بندہ کہ جس سے وہ عمل اور فعل وقول صادر ہو جو خلاف شرع ہوتا ہے وہ انگارے کی طرح اس پر اثر کرتا ہے جسے وہ جہنم کی آگ میں دھونس دیتا ہے اس وجہ سے فوراً ہی اس کے قلب کو جلا کر راکھ بنا دیا جاتا ہے اسی طرح جس بندے سے نیکی سرزد ہوتی ہے تو اس پر بھی وہ انگارے کی طرح اثر کرتی ہے جسے وہ محبت کی آگ میں دھونس دیتی ہے جس کا اثر قلب پر اس وقت بھی ظاہر ہوتا ہے (اور ایسا کہ اس کے قلب کو ہر محبوب جو اللہ تعالیٰ کے ماسوا ہو) کو جلا دیتی ہے پھر جیسے نار سعیر کہ وہ قلب میں صفات اور اخلاق حمیدہ کو جلا دیتی ہے اسی طرح یہ ماسوی اللہ کو جلا دیتی ہے پھر وہ آگ کو فوراً کھانے لگ جاتے ہیں۔

سوال: مَا يَاكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ کیوں فرمایا؟

جواب: اس لئے کہ ان کا فساد باطن میں تھا اس لئے ان کو عتاب بھی ہوگا۔

سوال: لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کیوں فرمایا؟

جواب: اس لئے کہ عالم دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام چھپایا اور حق کی بات ظاہر نہ کی اسی لئے اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہ کرے گا تاکہ برائی کی سزا برائی سے ہو۔

سوال: انہیں صاف وستھرا کیوں نہیں کیا جائے گا؟

جواب: تزکیہ نفس انسان کے لئے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ بصدق النیۃ اور تہذیب الاخلاق بآداب شریعت کی وجہ سے مقدر ہوا جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے روگردانی کی تو پھر ان کا تزکیہ نفس کیسا؟

ف: روگردانی کرنے والے علماء تھے جنہوں نے دنیا کے اظہار حق جیسی نعمت کو بیچ ڈالا اور حق تعالیٰ پر خلق کو ترجیح دی اور افضل جہاد سے روگردانی کی۔

حدیث شریف: افضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جابر ظالم باشاہ کے سامنے حق کہنا بہت بڑا جہاد ہے۔

مسئلہ دلائل: دلائل اور براہین قائم کرنا جہاد اکبر ہے بخلاف تلوار اور نیزوں کے ساتھ جہاد کرنے کے کیونکہ یہ جہاد اصغر ہے۔

نسخہ روحانی: کتمان حق کا دارومدار حب دنیا پر ہے اور قاعدہ ہے دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔

بے عمل علماء حفاظ کی سزا کا نمونہ:۔

قیامت کے دن قرآن پاک کے بے عمل حفاظ کو دوزخ کی آگ تیزی سے گرفت کرے گی بہ نسبت بتوں کے پجاریوں کے۔ حفاظ عرض کریں گے یا اللہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمیں سخت سزا مل رہی ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا عالم اور جاہل میں فرق ہے جو شخص دین دے کر دنیا خریدتا تھا اسے وہ سودا گھاٹے میں پڑا جس کی سزا آج مل رہی ہے اور ایسا شخص ہمیشہ شیطان کے جھگڑے میں معاون رہتا ہے۔

حکایت: کسی شخص نے شیخ ابو مدین سے پوچھا کہ شیطان کو ہمارے سے کیا شکایت ہے؟ شیخ نے فرمایا وہ تمہارے آنے سے پہلے تھا جب کہ اسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ میری شکایت کریں گے وہ کہتا ہے میرا کام تو صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا کا مالک بنا دیا مجھ سے جو بھی میری دنیا چھینتا ہے تو میں اس وقت تسلی اور آرام سے نہیں بیٹھتا جب تک اس سے اس کا ایمان نہ چھین لوں۔

سبق: مبارکبادی کا مستحق ہے ہر وہ انسان جو دنیا اور اس کی زیب و زینت سے ہاتھ دھو بیٹھا اور دنیا کے گورکھ دھندوں سے جی چرا گیا۔ حضرت سکندر ذوالقرنین کا ایک ایسی قوم پر گذر ہوا جنہوں نے دنیا کو ایک لخت طلاق دے دی اور اپنے گھروں کے دروازے گورستان کی طرف کر دیے اور خوراک کے لئے ساگ اور پتوں پر گزارہ

بنالیا اور صرف طاعت الٰہی میں مصروف تھے حضرت سکندر نے ان کی سردار کے طرف پیغام بھیجا کہ تمہیں سکندر ملنا چاہتا ہے انہوں نے کہا ہمیں سکندر کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر خود سکندر ان کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی تمہارے پاس سونا چاندی کیوں نہیں۔ انہوں نے کہا ہمارے ہاں ان کا کوئی طالب نہیں۔ پھر وہ ہمارے پاس کیوں ہو اور نہ ہی دنیا کسی کا پیٹ بھر سکتی ہے اس لئے ہم نے اہل قبور سے دوستی جوڑ لی ہے تا کہ ہم کسی وقت بھی موت نہ بھولیں اس کے بعد ان نیکوں کے سردار نے ایک کھوپڑی نکالی اور سکندر کو کہا یہ سر ایک بادشاہ کا ہے جو رعایا پر ظلم کرتا تھا اور دنیا کے تمام اسباب اس کے پاس موجود تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اسے موت کے گھاٹ اُتارا تو اس پر گناہوں کی سزا کے سوا کچھ بھی نہیں اس کے بعد دوسری کھوپڑی دکھائی اور کہا یہ اس بادشاہ کا سر ہے جو رعایا سے عدل وانصاف کرتا تھا اور رعایا کے لئے بڑا شفیق تھا لیکن موت نے آنا تھا آ گئی۔ مگر اب وہ بہشت کی خوش فضاؤں میں گزار رہا ہے۔ اور اکے درجات بھی بہت بلند ہیں اس کے بعد اس اللہ والے نے سکندر کے سر پر ہاتھ رکھ پوچھا بتایئے تیرا سر ان دونوں میں سے کونسا ہے یہ بات سن کر سکندر رو پڑے اور عرض کی حضرت جی مجھے اپنے پاس رہنے کی عرض قبول کیجئے میں آپکو اپنی بادشاہی لکھ دیتا ہوں بلکہ وزارت عظمیٰ کا قلمدان آپ کے سپرد کرتا ہوں اللہ والے نے کہا تو یہ ذوالقرنین نے کہا کیوں حضور، اس اللہ والے نے فرمایا کہ تمام لوگ تیرے صرف اس لئے دشمن ہیں کہ تیرے پاس جاہ وجلال اور مال واسباب ہے اور یہ سب کے سب میرے دوست ہیں کہ میرے پاس جاہ وجلال اور مال واسباب نہیں۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

در گوشہ قناعت نان پارہ دینہ　　　　در پیش اہل معنی بہتر از صد خزینہ

ترجمہ: اہل حقیقت کے نزدیک قناعت کے گوشہ میں باسی روٹی کا ٹکڑا سو خزانوں سے بہتر ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ

ہاں اصل نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب

وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

اور پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں

وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ

اور راہ گیر اور سائلوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں

وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور جہاد کے وقت یہی ہیں جنھوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ

اے ایمان والو! تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو آزاد

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ

کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت تو جس کے لئے اس کے بھائی

اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ

کی طرف سے کچھ معافی ہوئی تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا، یہ تمہارے رب

تَخْفِيفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ

کی طرف تمہارا بوجھ ہلکا کرنا ہے اور تم پر رحمت تو اس کے بعد جو زیادتی کرے اس کے لئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ

دردناک عذاب ہے۔ اور خون کا بدل لینے میں تمہاری زندگی ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ

اے عقلمندو کہ تم کہیں بچو۔ تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے

تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا

اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر جائے اپنے ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لئے موافق دستور یہ واجب ہے

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ

پرہیزگاروں پر۔ تو جو وصیت کو سن سنا کر بدل دے اس کا گناہ انہیں

عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ

بدلنے والوں پر ہے۔ بیشک اللہ سنتا جانتا ہے۔ پھر جسے اندیشہ ہوا

مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۗ

کہ وصیت کرنے والے نے کچھ بے انصافی یا گناہ کیا تو اس نے صلح کرادی اس پر کچھ گناہ نہیں

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر عالمانہ لَيْسَ الْبِرَّ ہر وہ نیک عمل جو عامل کو بہشت میں لے جائے اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ یعنی اے اہل کتاب نماز میں تم اپنے مونہوں کو پھیر دو قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ مشرق

اور مغرب کی طرف۔یعنی ان کے مقابلہ میں یہ ظرف مکان ہے اَنْ تُوَلُّوْا اور لَیْسَ الْبِرَّ کی خبر مقدم کی وجہ سے منصوب ہے اور اَنْ تُوَلُّوْا ہوا اور اسم موخر ہے۔

سوال: اَنْ تُوَلُّوْا کو اسم موخر اور البر کی خبر مقدم بنانے میں کیا حکمت ہے باوجود یہ کہ اَلْبِرَّ معرف بالام اسم بن جاتا ہے اس لئے کہ اسے ضمیر سے مشابہت ہے کہ جس طرح ضمیر نہ موصوف بن سکتی ہے اور نہ صفت اسی طرح اَلْبِرَّ اموول با لمصدر بھی۔فلہٰذا اس کا اسم ہونا زیادہ اہم ہے۔

شان نزول: جب حضور کریم ﷺ نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ شریف کو قبلہ بنایا تو یہود و نصاریٰ چہ میگوئیاں کرنے لگے اپنے اس گمان فاسد پر کہ نیکی تو اس کا نام ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے عبادت کی اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور فرمایا نیکی اس کا نام نہیں کہ جس نظریے پر تم ہو اب بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم منسوخ ہو گیا اور منسوخ الحکم پر عمل کرنا نیکی نہیں۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ لیکن نیک وہ ہے جو نیکی کے لئے اہتمام اور جدوجہد کرے یعنی یہاں پر ہو گا مضاف محذوف ہے۔

سوال: مضاف محذوف ماننے کی کیا حکمت ہے۔

جواب: لٰكِنَّ کا اسم اسمائے معانی سے ہے اور خبر اسمائے اعیان سے ہے اگر مضاف محذوف نہ مانا جائے تو اسم کا خبر محمول ہونا ممتنع ہو جاتا ہے بنابریں مضاف ماننا پڑا۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ یعنی نیکی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو کہ جس میں شرک کا شائبہ بھی نہ رہے جیسے یہود نصاریٰ کا غلط عقیدہ ہے کہ حضرت عزیر علی نبینا علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔

سوال: ایمان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر پہلے کیوں لایا گیا؟

جواب: یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا جمیع کمالات علمیہ وعملیہ کا اصل ہے۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی قیامت کے دن پر ایمان ہو اس لئے کہ اس میں اعمال کی جزا دی جائے گی اور وہ لامحالہ واقع ہونے والا ہے نہ یہود و نصاریٰ کے گمان فاسد پر کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف چند دن جہنم میں ڈالا جائے گا اور ہمارے آباء یعنی انبیاء علیہم السلام ہماری سفارش فرمائیں گے۔

سوال: آخرت پر ایمان لانے کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کو کیوں ذکر کیا گیا؟

جواب: آخرت پرایمان لانا اللہ تعالیٰ نے متفرع ہے اس لئے کہ جب تک ہم یقین نہ کریں کہ وہ عبادت کا مستحق ہے اور وہ تمام ممکنات پر قادر ہے اس وقت تک ہمیں بعث ونشر یعنی قیامت پرایمان لانا ناممکن ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پرایمان لانا اس بات کا محرک وموجب ہے کہ اس کی رحمت پر امید اور اس سے خوف کر کے اس کی عبادت کی جائے اور جن امور سے اس نے روکا ہے ان سے بچا جائے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةِ تمام ملائکہ پرایمان ہو۔ اس طریق پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں نہ وہ مرد ہیں نہ عورتیں اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اللہ تعالیٰ اور انبیا علیہم السلام کے مابین واسطہ ہیں یعنی القائے وحی اور انزال کتب پر مامور ہیں یہود نے غلطی کھائی کہ وہ جبریل علیہ السلام کے لئے کہتے کہ وہ ان کے دشمن ہیں وَالْكِتٰبِ یعنی کتابوں پرایمان ہو یہاں الکتاب جنس کتاب مراد ہے یعنی فرقان حمید اور یہود نے اپنی عادت کے مطابق قرآن مجید کو کتب الٰہیہ نہیں مانا اگرچہ انہیں دلائل سے سمجھایا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے لیکن انہوں نے یہ قبول کرنے سے انکار کر دیا وَالنَّبِيّٖنَ اور تمام انبیاء علیہم السلام پرایمان ہو بایں طور کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کی طرف بھیجے جاتے اور حق پر قائم امر ونہی اور وعدہ وعید بتانے میں سچے ہوتے ہیں ہمارا سب پر بلاتفریق ایمان ہے لیکن بنی اسرائیل کی بدقسمتی کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو شہید کر ڈالا اور نبی اکرم ﷺ کی نبوت سے انکار کر دیا۔

سوال: ملائکہ اور کتب پرایمان لانا انبیاء علیہم السلام پرایمان لانے کے بعد کا عقیدہ ہے لیکن یہاں ان دونوں کو نبیوں پرایمان لانے سے پہلے ذکر کر دیا گیا۔

جواب: صرف اس بات کا لحوظ رکھ کر کہ وجود میں ملائکہ اور کتب پہلے ہیں اس لئے کہ ملائکہ کرام پہلے وجود میں آئے پھر ان کے واسطہ سے کتابیں نازل ہوئیں بعد میں انبیاء علیہم السلام نے دعوت حق کے احکام سنائے۔

عقیدہ: جو امور پانچ مذکور ہوئے انہیں دین کے اصول اور عقائد کے قواعد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَاٰتَى الْمَالَ اور جس نے مال یا صدقہ اپنی کمائی سے دیا عَلٰى حُبِّهٖ یہ اتــی کی ضمیر سے حال ہے اور حبہ کی ضمیر مال کی طرف لوٹتی ہے اب عبارت یوں ہوگی واتی المال کانه اعلی حب المال یعنی باوجود مال سے محبت ہے تب بھی اللہ تعالیٰ کے نام پر دیتا ہے۔

حدیث: حضور علیہ السلام نے فرمایا جب آپ سے پوچھا گیا الصدقة الافضل یعنی کونسا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا۔

تو تیہ وانت صحیح شیح فامل العیش وتخشی الفقر ولا تمهل حتی اذا بلغت الحلقوم قلت بفلاں کذاوغلان کذاوقد کان بفلان یعنی مال اس وقت خرچ کیا جائے جب کہ تجھے صحت ہو اور بخل دامن گیر ہو جس میں تجھے عیش کی خواہش اور فقر کا خطرہ ہو اور اسے اس انتظار تک نہ چھوڑے رکھے یہاں تک کہ روح حلق سے نکل رہی ہو اور تم کہہ رہے ہو کہ فلاں فقیر کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو اور میں نے فلاں کو اتنا دینا تھا۔

شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

پریشان کن امروز گنجینہ چست	کہ فردا کلیدش نہ در دست تست
کنوں بر دست نہ ہر چہ ہست	کہ فردا بدنداں گزی پشت دست

ترجمہ: آج ہی اپنا خزانہ جلد خرچ کردے اس لئے کہ چند روز کے بعد اس خزانہ کی چابی تیرے ہاتھ میں نہ ہوگی جو کچھ ہے آج ہی اپنے ہاتھ پر رکھ کر خرچ کردے اس لئے کہ کل کو پریشانی سے ہاتھ کو چبائے گا۔

اتی کا مفعول بہ ہے بد لا لته الحال

سوال: دوسرے مستحقین پر اسے کیوں مقدم کیا گیا ہے؟

جواب: اس لئے کہ دوسرے مستحقین سے اسے ترجیح حاصل ہے۔

حدیث: حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا۔ عام مسلمانوں پر صدقہ کرنے سے ایک ثواب اور اپنے عزیز رشتہ دار کو صدقہ دینا دوہرا ثواب ہے اس لئے کہ اس میں صدقہ کے علاوہ صلہ رحمی کا ثواب بھی شامل ہے۔

حدیث: افضل الصدقة علی ذی الرحم الکاشح بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے عزیز رشتہ دار کو دیا جائے

وَالْيَتٰمٰى یتیم سے وہ یتیم مراد ہے جو مفلس ہو نہ کہ دولت مند۔

سوال: یتیم کو دوسرے مستحقین پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟

جواب: اس لئے کہ وہ یتیم جو صغیر ہو اور پھر فقیر بھی تو ضرورت کے لحاظ سے دیگر مستحقین سے زیادہ محتاج ہے۔

وَالْمَسٰكِيْنَ مسکین کی جمع ہے مسکین دو قسم ہے ایک وہ جو کسی سے کچھ نہ مانگے اور یہاں بھی یہی مراد

ہے دوسرا وہ جو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرے اور یہ دوسرا مسکین سائلین کے زمرہ میں داخل ہے مسکین لفظ ساکن کا مبالغہ ہے چونکہ مسکین کو اپنی ضرورت کی مقدار کے لئے لوگوں کے ہاں سکون ملتا ہے اس لئے اسے مسکین کہا جاتا ہے۔

وَابْنَ السَّبِيلِ یعنی وہ مسافر جو اپنے مال سے بعید ہو چونکہ مسافر سفر کا التزام رکھتا ہے بنا بریں اسے ابْنَ السَّبِيلِ کہا جاتا ہے جیسے ڈاکو کو ابن الطریق اور بوڑھے کو ابن اللیالی اور پانی کے پرندے کو ابن الماء کہا جاتا ہے ضعیف یعنی مہمان کو بھی ابْنَ السَّبِيلِ کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ راستہ کو طے کرکے آتا ہے گویا اس سے پیدا ہوا

حدیث شریف: حضور سرور عالم ﷺ فرماتے ہیں **من کان یومن باللّٰہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ** جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے۔

حدیث شریف: اور فرمایا اگر **اکرموا الضیف ولو کان کافر** مہمان کی عزت کرو اگرچہ کافر ہو۔

وَالسَّآئِلِينَ یعنی وہ لوگ جنہیں ضرورت سوال پر مجبور کرے۔

حدیث شریف: **السائل حق و لو جاء علی ظہر فرسہ** سائل کا تم پر حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

نہ خواہندۂ بر در دیگراں شکرانہ خواہند از درمراں

(تم دوسروں کے دست نگر نہیں ہو اس لئے کہ بطور شکر یہ سائل کو اپنے دروازے سے خالی نہ لوٹا)

وَفِي الرِّقَابِ گردنیں آزاد کرانے میں یعنی مکاتبین کی معاونت کرکے رقاب، رقبہ کی جمع ہے دراصل رقبہ گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں جو راقبہ سے مشتق ہے اس لئے کہ جگہ قوم کے منتظر رقیب کی انتظار گاہ ہے جب کہا جائے کہ **اعتق اللّٰہ رقبۃ** اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انتظار کے بعد اسے عذاب سے خلاصی دی بعض مفسرین فرماتے ہیں یہاں پر وہ عبد مراد ہیں جنہیں دولت مند لوگ آزاد کرانے کے لئے خریدتے ہیں بعض کہتے ہیں وہ قیدی مراد ہیں جنہیں دولت مند رقم دے کر قید سے چھڑاتے ہیں یہی وہ مقامات ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے حسب الحکم اپنی جائیداد تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کی جاتی ہے لیکن یہود نے ان مصارف میں بھی

خیانت کی کہ لوگوں کے ناحق مال کھائے اسلام کی حقیقت کے دلائل لوگوں سے چھپائے اور لوگوں سے معمولی رقم لے کر دین کو بیچا جیسے کہ ان کی عادت تھی کہ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں سے مال لیا کرتے وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ اور فرض نماز ادا کرے۔ اس کا عطف مــن کے صلہ یعنی اٰمَنَ و وَاٰتَی پر اور یہود اس کے برعکس لوگوں کے نماز اور زکوٰۃ سے روکتے ہیں۔ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ دے یعنی مذکورہ مصارف پر مال خرچ کرے۔

سوال: فرضی صدقہ کو نفلی صدقہ سے کیوں مؤخر کیا؟

جواب: ان لوگوں پر خرچ کرنے کی ترغیب میں مبالغہ کیا گیا ہے پہلے زکوٰۃ کے مضاف کا ذکر کیا اب وجوب ادا کا ذکر ہے۔

وَالْمُوْفُوْنَ اس کا عطف مَنْ اٰمَنَ پر ہے دراصل عبارت یوں تھی ومن اوفو . بعهدهم یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنے والے ہیں یعنی اس کے اوامر و نواہی یا منتیں پوری ادا کرنے والے ہیں اِذَا عَاھَدُوْا یعنی ان کے اور اللہ تعالیٰ کے یا ان کے اور لوگوں کے مابین وعدے ہیں جو وعدہ کرتے ہیں تو پورا کرتے ہیں یا جب منت مانتے ہیں تو اسے ادا کرتے ہیں اور جو بات کرتے ہیں تو سچ بولتے ہیں اور جب کسی کی امانت رکھتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔

حدیث شریف: ومن اعطى عهدالله ثم نقضه فالله ينظر اليه یعنی جو اللہ تعالیٰ کا عہد دے کر توڑ دیتا ہے قیامت میں اللہ تعالیٰ اس پر نظر عنایت نہیں فرمائے گا۔

حدیث شریف: ومن اعطى ذمته رسول الله عليه وسلم ثم فالنبی خصمه يوم القيمة جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ دے کر دھوکے کرتا ہے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ کا نبی اس سے جھگڑے گا یہود نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑا اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَاَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ یعنی تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ مثنوی شریف میں ہے۔

چوں درخت آدمی و بیخ عہد ۔۔۔ بیخ را تیمار می باید الجہد

عہد فاسد بیخ بوسیدہ بود ۔۔۔ در ثمار و لطف ببریدہ بود

شاخ و برگ نخل گرچہ سبز بود ۔۔۔ چوں تبہ شد بیخ سبزے نیست بود

ورندارد برگ وسبز و بیخ چست　　　　عاقبت بیروں کند صد برگ وبست

ترجمہ: آدمی درخت اور اس کا عہد بمنزلہ جڑ کے ہے جڑ کو مضبوط کرنا لازم ہے جب عہد کمزور ہو سمجھو جڑ کمزور ہے تو درخت بے کار پھر اسے سوائے کاٹنے کے چارہ نہیں ہوتا کوئی کجھور سر سبز تازہ ہو لیکن جب اس کی جڑ کھوکھلی ہو جائے تو اسے کاٹ لیا جاتا ہے اگر پتے سبز اور جڑ سوکھ جائے تو اس درخت کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔

وَالصّٰبِرِیْنَ یہ مدح کے طور منصوب ہے یعنی یہاں لفظ اعنی محذوف ہے اور اس کا درحقیقت معنوی طور مَنْ اٰمَنَ پر عطف ہے تا کہ صبر کی فضیلت پر تنبیہ ہو اب عبارت یوں ہوگی الذین صبرو فی البأساء یعنی وہ لوگ فقر وشدۃ میں صبر کرنے والے ہیں وَالضَّرَّآءِ اور مرض وتکلیف میں وَحِیْنَ الْبَاْسِ یہ الصّٰبِرِیْنَ کی وجہ سے منصوب ہے یعنی وقت الشدۃ و الباس بمعنی سختی خصوصاً جنگ کی سختی دراصل بامطلق شدۃ کو کہتے ہیں اور پھر حِیْنَ کے اضافہ سے اس طرف اشارہ ہے کہ جنگ کا خوف کبھی کبھی ہوتا ہے اور پھر جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اہل کتاب اس وصف میں بھی ناقص ہیں کہ انہیں جنگ سے نہایت درجہ کا خوف ہوتا ہے اور بے حد بزدل ہیں۔

خلاصہ تفسیر: اہل کتاب نے تحویل قبلہ کے بعد ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ نیکی صرف مشرق مغرب کی طرف منہ کرنے کا نام ہے اور کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے قبلہ کو منسوخ کرنے سے نیکی کا کام نہیں کیا گویا انہوں نے نیکی کا دارومدار استقبال قبلہ کو سمجھ رکھا تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا نیکی صرف استقبال کا نام نہیں نیکی کے لئے دوسرے ارکان بھی ہیں فلہذا تمہیں چاہیے کہ جہاں استقبال قلب کو نیکی سمجھتے ہو وہاں دوسرے ارکان کو بھی عمل میں لاؤ۔

اُولٰٓئِکَ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین میں سچ کہا اور حق کی تابعداری کی اور نیکی میں جدوجہد کی تو ان کو حالات کی تبدیلی نقصان پہنچاتی ہے اور نہ ہی حالات کے بدلنے سے اپنے حال کو بدلتے ہیں الَّذِیْنَ صَدَقُوْا اور یہی لوگ ہیں جو کفر اور دیگر تمام رذیل کردار سے بچتے ہیں۔

سوال: اُولٰٓئِکَ کا تکرار کس لئے؟

جواب: تا کہ معلوم ہو کہ ان لوگوں کی شان بلند ہے۔

سوال: درمیان میں ھم ضمیر لانے کا کیا فائدہ؟

جواب: تا کہ اشارہ ہو جائے کہ تقویٰ صرف انہی اوصاف سے موصوف ہونے کا نام ہے۔

تفسیر صوفیانہ یہ آیت تمام کمالات انسانیہ کی جامع ہے اور اس کے کمالات کو صراحۃً اور ضمناً تمام پر دلالت کرنے والی ہے۔

ف: معلوم باد کہ کمالات انسانیہ جو کثیر اور ان کے مختلف شعبہ جات ہونے کے با وجود صرف تین چیزوں میں منحصر ہیں۔ ۱۔ اچھا معاشرہ ۲۔ اعتقاد صحیح ۳۔ تہذیب نفس

مَنْ اٰمَنَ تک پہلے کی طرف اور النَّبِیّٖنَ تک دوسرے کی طرف اور اَقَامَ الصَّلٰوۃَ تک تیسرے کی طرف اشارہ ہے اسی لئے صحت ایمان اور اعتقاد کی وجہ سے انہیں صدق سے (جامع صفت ہے) اور خلق سے حسن معاشرہ اور حق سے نیک معاملہ کی وجہ سے انہیں تقویٰ سے موصوف کیا گیا۔

حدیث شریف: حضور علیھم السلام نے فرمایا من عمل بھذا الایۃ فقد استکمل الایمان جس نے اس آیت پر عمل کیا اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔

ف: ہمارے شیخ البقا اللہ تعالیٰ با لسلامۃ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں مجھے دل میں القاء ہوا کہ مرد کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہترین اخلاق تسلیم و رضا ہیں اور خلق سے بہترین معاملہ عفو سخا ہے۔

ف: مال کی محبت نفس کی عادت سے ہے اور جملت اخلاق رویہ میں شمار ہوتی ہے اسی لئے کہا گیا یعنی صبر شکر سے افضل ہے۔

حدیث شریف: قیامت میں عالی شاکر کو لایا جائے گا اور اسے شکر گزار لوگوں کی طرح جزا دی جائے گی پھر صابر انسان کو لایا جائے گا اور اسے اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ انعام تجھے عطا کر رہا ہوں۔ تو اس کا شکر ادا کر اس لئے کہ میں نے تجھے مصیبت میں مبتلا کیا تو تو نے صبر کیا میں تجھے دوگنا اجر دیتا ہوں اس کے بعد اسے شکر گزار لوگوں کا اجر دیا جائے گا۔

ف: حقیقت یہ ہے کہ تہذیب النفس توحید بطریق المخصوص سے حاصل ہوتی ہے جیسے کہ ایمان توحید شہادت سے۔

تفسیر عالمانہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى یہ خطاب مومنین کے آئمہ کو ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے امام یا اس کے قائم مقام پر واجب فرمایا ہے کہ وہ قصاص کے حدود قائم

کرے اصل عبارت یوں تھی۔ یاایھا الائمۃ یعنی اے آئمہ تم پر قصاص کے حدود قائم کرنا فرض ہے جب کہ ولی الدم اس کا مطالبہ کرے یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خطاب قاتلین کو ہو۔ اب معنی یوں ہوگا کہ اسے عمداً قتل کرنے والو تمہارے او پر اپنے نفسوں کا حدود کے لئے پیش کر دینا واجب ہے جب کہ تم سے ولی الدم اس کا مطالبہ کرے یہ اس لئے کہ قاتل کو قصاص سے روگردانی درست نہیں اس لئے کہ یہ حقوق العباد میں سے ہے بخلاف زانی اور شرابی کے کہ وہ حدود سے روگردانی کریں تو کر سکتے ہیں اس لئے کہ وہ حقوق اللہ کے گمراہ ہیں۔

ف: قصاص یہ ہے کہ انسان کے ساتھ اسی طرح کیا جائے جس طرح اس نے کیا اگر کسی کو قتل کیا تو اسے قتل کیا جائے اگر کسی کی آنکھ نکالی تو اس کی بھی آنکھ نکالی جائے۔ وغیرہ وغیرہ دراصل قصاص برادری اور مماثلت **فی الانفس والاطراف والاعضاء** کو کہا جاتا ہے **قتلی قتیل** کی جمع ہے اور فی سببیہ ہے فِی الْقَتْلٰی میں اسی سبب قتل الْقَتْلٰی جیسے کہ حدیث شریف میں ہے **ان امرأۃ دخلت النار فی ھرۃ ربطھا بسبب ربطھا ایاھا** یعنی ایک عورت دوزخ میں جائے گی ایک بلی کی وجہ سے کہ اس نے اسے باندھ رکھا تھا۔ یہاں فی سببیہ ہے اور وقف لفظ الْقَتْلٰی پر بہتر ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ یہ دونوں مبتدا خبر ہیں یعنی آزاد آدمی آزاد آدمی کی طرح ماخوذ اور مقتول ہے وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی

شان نزول: عرب کے دو قبیلوں کے زمانہ جاہلیت کے قصاص یوں تھے کہ ان میں ایک دوسرے پر فوقیت و فضیلت حاصل تھی اس بناء پر آپس میں معاہدہ کر رکھا تھا فوقیت والے کے عبد کے عوض میں آزاد اور عورت کے عوض مرد اور ایک مرد کے عوض دو کو قتل کیا جائے جب اسلام کا دور آیا تو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہی فیصلہ پیش کیا تو مذکورہ آیت نازل ہوئی گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپس میں عدل و انصاف قائم کرو۔

ف: اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ حصر کے لئے نہیں کہ قصاص صرف دو آزاد مردوں یا دو عورتوں پر ہی جاری ہو۔ بلکہ اس سے ہر دیت ثابت ہو رہی ہے کہ مذکورہ لوگوں پر بھی قصاص واجب ہے قطع نظر جس کے کہ اس میں دیگر اقسام کی طرف اشارہ ہے یا نہیں اس لئے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی یہ مستقل جملہ ہے اور اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ جملہ مذکورہ کے جزئیات میں سے ایک جزو ہے اور قاعدہ ہے کہ جملہ کے بعض جزئیات کا ذکر اس کے باقی جزئیات کی نفی نہیں کرتا بلکہ ممکن ہے کہ یہ تخصیص کسی اور فائدے کے لئے ہو کہ جس میں اس کے باقی اقسام کی نفی مقصود نہ ہو اور وہ

فائدہ یہی ہے کہ زمانہ جاہلیت کی بری رسم مٹ جائے کہ وہ ایک قبیلے کے آزاد کی بجائے دوسرے قبیلہ کے آزاد کو قتل کرتے وغیرہ اس میں اس بات کی بھی نفی نہیں کہ حر و عبد اور مرد عورت کے مابین قصاص جاری نہ ہو بلکہ اس میں اس سے روکا گیا ہے کہ قاتل کی بجائے غیر قاتل سے قصاص نہ لیا جائے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ اور امام ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عبد کا آزاد سے اور کافر کا مومن سے قصاص لیا جائے اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ یعنی ہم نے ان پر فرض کیا تھا کہ نفس کا نفس کے عوض قصاص ہے اس آیت میں عموم ہے مومن کافر آزاد اور حر کی کوئی تخصیص نہیں اور قاعدہ ہے کہ سابقہ شرائع کے احکام کے لئے جب ناسخ نہ ملے تو احکام ہماری شریعت میں بھی جاری رہتے ہیں فلہٰذا یہ حکم بھی ہم پر جاری ہوگا دورے یہ کہ مسلمان کی شان ہے کہ وہ ایک کے خون کی پاسداری کرے۔ تیسرا یہ کہ تفاصل فی النفس ہے اس لئے شرع نے حکم دیا ہے کہ اگر جماعت نے ایک کو قتل کیا تب بھی جماعت پر قصاص واجب ہے چوتھا یہ کہ قصاص مساوات کو چاہتا ہے تا کہ جان و مال کی حفاظت ہو۔

مسئلہ: امام شافعی و امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مومن کو کافر کے عوض قتل نہیں کراتے چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

خذو ا بدلی هذالغزال فانه	زمانی بسمهی معلیهه علی عمد
و لا نقتلوا اننی انا عبده	وفی ملهبی لایفتل الحر بالعبد

ترجمہ: اسی غزال کو میرے خون کے عوض پکڑو کہ جس نے عمداً اس کی آنکھوں کے پردوں نے مجھے قتل کیا ہے لیکن اسے قتل مت کرنا اس لئے کہ میں اس کا عبد ہوں اور میرا مذہب ہے کہ حر کے عوض قتل نہیں کیا جاتا۔

پس وہ شخص مَنْ سے مراد قاتل ہے خواہ من شرطیہ ہو یا موصولہ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ اس جملہ کی دونوں ضمیریں قاتل کی طرف مرجوع ہیں شَیْءٌ یعنی معافی کا کچھ تھوڑا سا حصہ۔

سوال: شَیْءٌ مرفوع کیوں ہے؟

جواب: عُفِيَ کے فاعل کا قائم مقام ہے اس لئے کہ شئے مصدر کے حکم میں ہے اب عبارت یوں ہوگی۔

سوال: عُفِيَ تو فعل لازم ہے پھر میں کا مفعول کیسا؟

جواب: فعل لازم کا مفعول مطلق آتا ہے بنا بریں ہم نے شئیٌ کو مصدر کے معنی میں کر کے فاعل کے قائم مقام بنانا پڑا جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَۃٌ یعنی صور کو پھونکا جائے گا۔ یہاں پر نُفِخَ السیر وشئی تاویلاً نائب فاعل ہے۔

ف: شئی میں اس طرف اشارہ ہے کہ قاتل سے جب تھوڑا سا حصہ معاف کیا جائے یا مقتول کے ورثا میں سے کوئی ایک اپنا حق معاف کر دے تو قاتل سے قصاص معاف ہو جائے گا البتہ دیت ادا کرنی پڑے گی۔

قاعدہ: لفظ عفی ذنب اور جانی کی طرف متعدی ہوتا ہے پھر جب یہ ذنب کی طرف متعدی ہو تو ذنب پر عن داخل ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ اور جب جانی کی طرف متعدی ہو تو جانی پر لام داخل ہوگا جیسے عفوت لفلاں۔ جانی کو معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے جنایت کا موجب چھوڑ دیا جائے یہاں پر جنایت کا موجب قصاص ہے گویا یوں فرمایا گیا ہے جب قاتل کو اس کا وارث یعنی مقتول کا بھائی معاف کر دے خواہ مکمل معافی ہو بایں طور کہ تمام ورثا مقتول کے حق کا مطالبہ نہ کریں خواہ معافی غیر مکمل ہو کہ بعض ورثا معاف کریں اور بعض کا مطالبہ ابھی قائم ہو ان ہر دونوں صورتوں میں قاتل سے قصاص ساقط ہو جائے گا۔

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ قصاص کی صلح مالی پر ہو یعنی قاتل مقتول کے ورثا کو مال دے کر راضی کر کے اپنے سے قصاص ساقط کرائے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے ولی الجنایۃ کو بھائی سے کیوں تعبیر فرمایا؟

جواب: تاکہ اسے قاتل کے لئے اخوت کا تصور آئے اور اس پر نرمی کرے اور اس میں لطیف اشارہ ہے کہ قتل جیسے بڑے گناہ سے بھی اخوت اسلام باقی رہتی ہے اس میں معتزلہ کی بھی تردید ہو گئی وہ کہتے ہیں کہ انسان کبیرہ گناہ کرنے سے خارج از ایمان ہو جاتا ہے۔

فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ یہ خبر ہے اس کا مبتداء محذوف ہے دراصل عبارت یوں تھی و اذا حصل شئی من العفو بطل الدم بعفو البعض فالامر اتباع بالمعروف یعنی جب قاتل کو معاف کیا جائے یا بعض ورثا کی وجہ سے اس سے قصاص ساقط ہو جائے تو مقتول کے ورثا پر لازم ہے کہ نیکی کا اتباع کریں یعنی مقتول کے ولی پر لازم ہے کہ قاتل سے صلح کے وقت جائز طور پر مطالبہ کرے اس کے ساتھ تنگی و تلخی سے پیش نہ آئے اور جب معا

ملہ صلح پر طے ہو تو شئے زائد کا مطالبہ نہ کرے۔

وَاَدَآءٌ اِلَیۡهِ بِاِحۡسَانٍ اس میں معفو عنہ یعنی قاتل کو تنبیہ ہے کہ مال کو احسان و مروت کے طور ادا کرے یہ یعنی قاتل پر لازم ہے کہ معاف کرنے والے مال کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے اور نہ ہی کھوٹا مال دے اور نہ ہی اسے ستائے کہ اس کا معاف کرنا اس پر عظیم احسان ہے کہ اس نے اس کی جان بچائی ذٰلِكَ تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ یعنی معاف کرادینا اور قصاص کے عوض دیت ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی اور توسیع ہے اور و رحـمـة کمال مہربانی ہے کہ نہ ہی تو علی الاطلاق معافی کا حکم دیا اور نہ ہی مطلقا دیت لینے کا حکم صادر فرمایا بلکہ ہمیں تین امور میں سے ایک کا اختیار بخشا۔ ا۔ قصاص ۲۔ دیت ۳۔ معافی اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں صرف قصاص ہی واجب تھا تاکہ قاتل و مقتول کا پورا انصاف ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں معافی کا حکم تھا اور یہ فضل و احسان پر مبنی تھا لیکن ہماری شریعت میں ہر تین امور کو روا رکھا گیا ہے کہ اگر مقتول کے ورثا کا دل ٹھنڈا یوں ہوتا ہے کہ قاتل کو مقتول کے عوض قتل کیا جائے تو قصاص لازم اور اگر مقتول کے ورثا قاتل پر نرمی کرنا چاہیں تو دیت واجب ہے اگر مقتول کے ورثا کرم و احسان کا مظاہرہ کریں تو سرے سے قاتل کو معاف ہی کر دیں فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِكَ جو شخص معاف کر دینے کے بعد کسی قسم کی زیادتی کرے مثلاً قاتل کی بجائے اس کے کسی عزیز کو قتل کر دے یا خود قاتل کو قتل کر دیا جائے فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ پس اس کے لئے اس زیادتی کی وجہ سے دردناک عذاب ہے دنیا میں تو قلت کا قصاص لے کر اور آخرت میں جہنم کی آگ کا عذاب ہے۔

شان نزول: زمانہ جاہلیت میں عادت تھی کہ قاتل سے دیت لے کر اسے معاف کر دیا جاتا اور اسے ہر طرح سے مطمئن کرا کے جب بھی موقعہ ملتا تو اسے قتل کر دیتے پھر مال اس کے ورثا کو لوٹا دیتے۔

وَلَكُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوةٌ یعنی اس قسم کے حکم یعنی قصاص میں بڑی زندگانی حاصل ہوگی چنانچہ زمانہ جاہلیت کی رسم تھی کہ ایک کے عوض جماعت کو قتل کر دیتے جیسے مہلل بن ربیعہ نے اپنے بھائی کے عوض میں قلب قبیلہ کو مار ڈالا یا یوں ہوتا کہ قاتل کے بجائے کسی دوسرے کو قتل کر دیا جاتا تو اس کے فتنہ کی آگ بھڑک اٹھتی اس سے ان کا اختلاف لڑائی جھگڑا طول پکڑ جاتا یہاں تک کہ اسلام تشریف لایا تو قصاص شروع فرمایا جس سے ان

لوگوں کو چین نصیب ہوا جوان کے لئے ایک بڑی زندگانی ہے کیونکہ جب قاتل کو معلوم ہوگا کہ اگر میں کسی کو قتل کروں گا مجھے اس کے عوض قتل کر دیا جائے گا تو وہ کسی دوسرے کو قتل کرنے سے رک جائے گا اسی طرح دوسروں کو بھی عبرت ہوگی اسی وجہ سے قصاص دونفوس یا بہت زیادہ نفوس کی جان بچ جائے گی۔

ف : یہ کلام فصاحت و بلاغت کمال اعلیٰ درجہ کا رکھتا ہے اس حیثیت سے کہ ایک شئے کو اپنی ضد کے قائم مقام کھڑا کیا گیا بایں طور کہ ایک کا تحقق دوسرے کو مٹا دے مثلاً قصاص حیوۃ کو ختم کرنے کا نام ہے لیکن باوجود اس کے حیوۃ کا سبب ہے نیز قصاص کو حیوۃ کا ظرف بنا کر ظرف حقیقی سے تشبیہ دی گئی ہے بایں طور کہ ظرف جب مظروف کو جاری ہوتا ہے تو مظروف کو ہر طرح کے فساد و نقصان سے محفوظ کر لیتا ہے اسی طرح قصاص (ظرف) نے ظروف (حیوۃ) کو ہر طرح کی خرابیوں سے بچالیا اس طریق سے قصاص حیوۃ کے لئے ظرف ہے اس سے کلام کی لطافت واضح ہوگئی کہ شئے کی ضد کو اس کا حامی و حافظ بنایا یہ بلاغت کے طریق میں سے ایک احسن طریقہ ہے۔

يَاُولِي الْاَلْبَابِ ایسے عقل والوں کہ جن کی عقل پر ایک غلط خیال و وہم کے اختلاط سے محفوظ ہے ان کو اس لئے ندا فرمائی کہ ان کو غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے قصاص کا حکم دے کر کسی عجیب حکمت سے ارواح و نفوس کو بچالیا **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** تا کہ تم اہل تقوی کا عمل یعنی قصاص پر محافظت اور اس کا یقین کے ساتھ حکم دو یا قصاص کے خوف سے دوسرے کو قتل کرنے سے بچ جاؤ اس میں ناحق قتل کرنے کے فعل سے خوف دلایا گیا ہے اس لئے کہ حقوق العباد میں سب سے بڑا گناہ ناحق قتل کرنا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے سب سے بڑا حق نماز ہے۔

حدیث شریف: قیامت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقتول حاضر ہوگا ایک ہاتھ پر اپنا سر لئے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں قاتل کی گردن میں کپڑا ڈالا ہوگا اور اس کی رگیں خون سے بہہ رہی ہوں گی دونوں اللہ تعالیٰ کے حضور میں ٹھہرے ہوں گے مقتول عرض کرے گا یا اللہ اس نے مجھے مار ڈالا تھا اللہ تعالیٰ قاتل کو جھڑک دے کر فرمائے گا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ پھر اسے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

ف: گناہ تین قسم ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے بندے کے متعلق جیسے زنا اور لواطت اور غیبت اور بہتان۔

مسئلہ: اگر اس کا گلہ کیا ہے لیکن اس کو معلوم نہ ہو جب اس کو معلوم ہو جائے اور گلہ کی اس سے معافی لے اور

اس گناہ سے توبہ کرلی ہو تو امید ہے شاید اللہ تعالیٰ اسے بخش دے۔

مسئلہ: زانی نے کسی شخص کی عورت سے زنا کیا ہو اگر اس کا شوہر زندہ ہے اور اس نے معافی بھی نہیں دی تو اللہ تعالیٰ زانی کو ہرگز نہیں بخشے گا اس لئے قیامت میں زانی کا خصم بندہ ہے ہاں اگر زانی توبہ کرے اور وہ شخص اس زانی کو معاف بھی کردے تو اللہ تعالیٰ بخش دے گا۔

مسئلہ: زانی اس شخص سے اس طرح معافی حاصل کرسکتا ہے مثلاً کہے جو تیرے حقوق میرے اوپر ہیں وہ معاف کردے وہ کہے کہ میں نے معاف کردیئے اسے **صلح المعلوم علی الجھول** کہتے ہیں اور یہ جائز ہے اور یہ طریقہ صرف اسی امت سے خاص ہے سابقہ امتوں کے گناہ معاف نہیں ہوسکتے تھے جب تک کہ اپنے گناہوں کی تفصیل نہ سنائی جاتی اللہ تعالیٰ کے حقوق بندے پر جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی توبہ کا مطلب یہ ہے کہ اس نماز کی قضا دے یا کفارہ (اسقاط کیا جائے) کیونکہ اس قسم کی توبہ کا معنی یہ ہے کہ جو عمل کو ترک کیا ہے اسے عمل میں لائے جب تک اسے عمل میں نہ لائے گا تو گویا اس نے توبہ ہی نہیں کی بندے کے بندے پر حقوق مثلاً اس کا مال غصب کرے یا اسے ضرب ستم کرے یا اسے قتل کردے اس میں توبہ قبول نہیں ہوتی جب تک خصم معاف نہ کرے یا اتنی نیکیاں کرے کہ قیامت میں خود اس کی آپس میں صلح کرادے کیونکہ جب بندہ سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو اگر اس پر بندوں کے حقوق ہوتے ہیں اولاً تو اسے چاہیے کہ ارباب حقوق کو ان کے حقوق لوٹا دے اگر حقوق نہ لوٹا سکا تو اگر اللہ تعالیٰ اس کی بخشش کا ارادہ فرمائے گا تو اس خصم کو بلا کر اس کے سامنے شاندار بلڈنگ کھڑی کردے گا بندہ عرض کرے گا یا اللہ یہ بلڈنگ کس کی ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو اس کو حاصل کرسکتا ہے اس کا ثمن صرف یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کو اپنے حقوق معاف کردے عرض کرے گا یا اللہ میں نے اپنے حقوق اپنے اس بھائی کو معاف کردیئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر دونوں بہشت میں چلے جاؤ۔

تفسیر صوفیانہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہارے لئے فرض کیا ہے کہ کسی کو قتل کرنے پر قصاص ہے جس طرح اپنے ذمہ کرم فرمایا ہے کہ جس شخص سے میں محبت کرتا ہوں تو اسے قتل کردیتا ہوں اور جسے قتل کرتا تو اسے ہم کلامی کا شرف بخشتا ہوں مثنوی شریف میں ہے۔

گر بکیے ررا ہبر واز بدن ۔ صد ہزاراں سر برآرو درزمن

اقتلونی یا ثقاتی لائما | ای فی قتلی حیاتی دوائما
ان فی موتی حیاتی یافتی | لم افارق موطنی حتی متی
شیر دنیا جوید اشکار و برگ | شیر مولی جوید آزادی و مرگ
چونکہ اندر مرگ بیند صد وجود | ہمچو پروانہ بسوزاند وجود

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ جب تمہارے ایک کے کو موت آئے تو تمہارے اوپر فرض ہے یعنی جب موت کے آثار و نشانات پائے جائیں مثلاً سخت بیماری ہو اور کوئی تکلیف ہو اس لئے کہ موت کے وقت تو وصیت کی طاقت مفقود ہو جاتی ہے اِذَا کا عامل کتب کا مولول ہے کیونکہ کتاب بمعنی ایجاب ہے اس لئے کہ ایجاب موت کے حاضر ہوئے وقت نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق مکلف کے ساتھ ہوتا ہے گویا یوں کہا گیا اللہ تعالیٰ کا ایجاب اور اسکا اقتضا تمہارے لئے متوجہ ہوا توجہ ایجاب اور اس کے تعلق کو۔

نکتہ: کتب سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ بات ازل سے لکھی جا چکی ہے۔

اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اگر خیر چھوڑ جائے یعنی مال قلیل یا کثیر مال کثیر کو کہا جاتا ہے فلاں ذو مال یعنی فلاں مال کثیر کا مالک ہے یہ استعمال قلیل مال کیلئے نہیں آتی۔

حکایت: مرتے وقت ایک مرد نے وصیت کا ارادہ کیا تو بی بی عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے پوچھا تیرا کتنا مال ہے عرض کی تین ہزار آپ نے پوچھا تیرے عیال میں کتنے فرد ہیں عرض کی چار آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ تَرَكَ خَيْرًا یعنی بہت مال چھوڑے اور تیرا یہ مال بہت تھوڑا ہے فلہٰذا یہی مال اپنے ورثا کیلئے چھوڑ کر جا۔

ف: اصل میں خیر اس شئے کو کہتے ہیں جس کی طرف طبائع راغب ہوں اور وہ نافع بھی ہو کیونکہ یہ شر کی ضد ہے۔

ف: اخوان الصفا کتاب میں فرمایا کہ خیر ہر اس فعل کو کہا جاتا ہے جو مناسب وقت میں ہو کہ اس وقت اس کا ہونا لائق مناسب ہے اَلْوَصِيَّةُ کتب کا نائب فعل ہے ای فرض الایصاء یعنی وصیت فرض کی گئی ہے۔

لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ والدین اور ان رشتہ داروں کے لئے جو وراثت کے حق دار ہیں یا نہ بِالْمَعْرُوْفِ یہ مال ہے یعنی وصیت عدل کے طور پر ہو تو ثلث سے زائد اور نہ ہی صرف دولت مند کیلئے کہ فقیر کا نام تک نہ لے

شان نزول: اہل جاہلیت کی عادت تھی کہ وصیت دور کے رشتہ داروں کے لئے کرتے صرف ریاء اور شہرت اور فخر کے پیش نظر اور قریب رشتہ دار اگرچہ نہایت مفلس اور غریب ہوتے تو اپنی وصیت سے انہیں محروم رکھتے اللہ تعالیٰ نے ان کی بری رسم کا پہلو تبدیل فرمایا کہ والدین کے ساتھ ان رشتہ داوں کیلئے وصیت کرو جو قریبی ہوں اس میں صلاح وحکمت کا واضح پہلو ان کے سامنے رکھا۔

ف: یہ حکم آیت میراث سے منسوخ ہوگیا جو سورۃ النساء میں موجود ہے یہ حکم کسی قریبی یا بعیدی رشتہ دار کے لئے وصیت جاری نہ ہوگی۔

مسئلہ: اگر وصیت کرے تو قریبی بعیدی سب کو مد نظر رکھے لیکن جسے وراثت کا حق حاصل ہے اس کے لئے وصیت جاری نہ ہوگی۔

حقًا ای لازمًا (مفعول مطلق ہے) اصل عبارت یوں تھی (احق ھذا لوصیۃ حقا) عَلَى الْمُتَّقِينَ یعنی یہ وصیت ان لوگوں پر واجب کرتا ہوں جو مال کو ضائع کرنے اور قریبی رشتہ داروں کو محروم کرنے سے بچتے ہیں یعنی اے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہو تو اس عمل کو نہ چھوڑو۔

سوال: ابن الشیخ اپنے حواشی میں فرماتے عَلَى الْمُتَّقِينَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف متقین کو ہے حالانکہ اجماع سے ثابت ہے کہ تمام واجبات وتکالیف (امور) متقین وغیر متقین سب پر واجب ہے۔

جواب: حقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ سے مراد ہے کہ یہ حکم ہر اس شخص پر واجب ہے جو تقوی کے نشانات وطہارت کا عاشق اور اس کے حصول میں کوشاں اور اس کو اپنا مشغل سمجھتا ہے اس لحاظ سے ہر ایک کو یہ حکم شامل ہوگا۔

حقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ پس وہ شخص جو وصیت کو تبدیل کرے۔

سوال: وصیت مونث ہے اور ہو ضمیر مذکر ہے۔

جواب: وصیت مؤول بہ ایصاء ہے یعنی وصیت کے بجائے غیر وصیت جو شرع کے خلاف بتاتا ہے مشہور یہی ہے کہ وصیت کا تبدیل کرنا وصی مختصر جس پر موت کے آثار ہیں یا گواہ کا کام ہے وصی تو اس معنی پر کہ وہ ناجائز طور پر وصیت لکھے یا تقسیم کے وقت غلط طریقہ اختیار کرے اور گواہ بامعنی کہ وہ شہادت غلط دے یا اسے سرے سے بیان نہ کرے۔

ف: یہ تبدیلی تمام لوگوں سے سرزد ہونے کا امکان ہے کہ وصیت کا مال مستحق کو نہ دیں اس معنی پر آیت عام ہوگی اور ہر ایک کو یہ حکم شامل ہوگا۔

بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ سننے کے بعد یعنی جب انہیں یہ حکم پہنچا اور اس کی اسے تحقیق ہو چکی فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ یعنی یہ گناہ صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اس وصیت کو تبدیل کیا کیونکہ انہوں نے ہی خیانت اور خلاف شرعی امر کا ارتکاب کیا یہ گناہ موصی یعنی وصیت کرنے والے میت پر نہیں وہ ایسے گناہ سے بری ہے اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ بے شک وہ اللہ سمیع ہے وصیت کرنے والے اور وصیت تبدیل کرنیوالے کو جانتا ہے۔ اس کے ثواب و جزا وغیرہ کو کہ وہ قیامت میں ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا دے گا فَمَنْ خَافَ پس وہ شخص جو خوف کرتا اور جانتا ہے یہاں لازم کا ملزوم پر اطلاق ہے مِنْ مُّوْصٍ یعنی اس شخص سے کہ جس نے وصیت کی ہو سکتا ہے کہ اس کا متعلق خَافَ ہو کیوں کہ یہ من ابتدائیہ عارضی کے لئے ہے اور اس کا متعلق محذوف اور جَنَفًا سے حال ہو۔

سوال: اسے مقدم کیوں کیا گیا؟

جواب: دراصل یہ جَنَفًا کی صفت تھی لیکن چونکہ صفت اپنے موصوف سے مقدم نہیں ہو سکتی اور حال ذوالحال سے مقدم ہو سکتا ہے اس لئے اسے مقدم کیا گیا۔

جَنَفًا یعنی وصیت میں خطا کر کے حق سے روگردانی کرے اَوْ اِثْمًا یعنی یا عمداً حق سے روگردانی کریں یعنی یا تو وصیت کرنے والا وصیت کے مقام کو بھول کر وصیت کر دے یا وصیت کی مقدار کو بڑھا دے یا ایسے شخص کے لئے وصیت کرے جس کے لئے اسے وصیت جائز نہیں۔

فَاَصْلَحَ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وصیت کرنے والا ہو کیونکہ وصیت کو اس سے زیادہ تعلق ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے صرف وصی مراد نہ لیا جائے بلکہ ہر وہ شخص جس سے میت کی وصیت کے متعلق فساد کا دفعیہ حاصل ہو خواہ وہ ولی ہو یا والی یا وصی خواہ وہ نیکی کا حکم دے یا وہ مفتی ہو یا قاضی یا وارث بَيْنَهُمْ یعنی موصی لهم یعنی اس کے والدین اور اس کے اقربا کے مابین اصلاح کرے یعنی میت کی وصیت کو تبدیل کر دے لیکن شرع کے مطابق بَيْنَهُمْ اس تبدیلی کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ اس میں باطل کو حق کی طرف

لانا مطلوب ہے اور یہ جائز ہے بخلاف پہلی بات کے کہ اس میں حق کی تبدیلی تھی اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اس میں صلح کے لئے رب کا وعدہ ہے اور اثم کی وجہ سے مغفرت کا ذکر کیا گیا یہ وہ فعل ہے جو لفظاً اثم ہے ہاں بعض تبدیلیاں گناہ ہوتی ہیں اور یہ تبدیلیاں وہ ہیں جو حق کو باطل کی طرف پھیر دیں یہ ظاہرہ طور پر حقیقۃً اثم نہیں کیونکہ خیر کی طرف تبدیلی گناہ نہیں ہاں صرف لفظاً اثم ہے۔

مسئلہ: وصیت کرنا مستحب ہے کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اس لئے کہ انسان اپنی امیدوں کا فریب خوردہ ہے یعنی اسے مدت طویل کی ہمیشہ ہی امید رہتی ہے اور عمل سے ہمیشہ کوتاہی کرتا رہتا ہے پس جب اسے موت دکھائی دیتی ہے اور سمجھتا ہے کہ اب میں نہیں بچنے والا تو وہ اپنے مال کو کسی جائز جگہ خرچ کرنے کی فکر کرتا ہے تا کہ اگر وہ اس حالت میں مر بھی جائے تو مال کے بارے میں اس کا مقصد پورا ہو اور اگر اسے موت چھوڑ دے تو پھر بھی مال کو اپنے مقصد پر خرچ کر سکے۔

حدیث شریف: **ان اللّٰہ تصدق علیکم بثلث اموالکم فی اخر اعمارکم زیادۃ لکم فی اعمالکم تفعلونھا حیث شئتم** بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہاری آخری عمروں میں تمہارے تہائی اموال کو تمہارے اوپر صدقہ فرمایا ہے تا کہ تم اپنے اموال کو بڑھا کر اس وصیت کے مال کو جہاں چاہو خرچ کرو۔

ثبوت اسقاط: ہر نماز اور ہر روزے کے لئے گندم کا نصف صاع وصیت کرے اسی لئے ہر وتر کے لئے بھی نصف صاع ضروری ہے اسی طرح رمضان اور نذر کے روزہ کا حکم ہے۔ **(کذا فی تفسیر الشیخ)**

مسئلہ: جس شخص پر حج یا کفارہ فرض ہے تو اسے وصیت کرنا ضروری اگر واجب نہیں تو پھر وصیت کرنے میں مختار ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

مسئلہ: اپنے خصما اور قرضداروں کو راضی کرنے کے لئے وصیت کرے۔

حکایت: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہونے لگا تو فرمایا جب میں مر جاؤں تو فلاں کو میرے غسل کا کہنا جب ان کا انتقال ہو گیا تو اسی شخص کو بلایا گیا تو اس نے آتے ہی کہا امام صاحب کا وصیت نامہ دکھاؤ اسے وصیت نامہ دکھایا گیا تو اوپر تھا کہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر ستر ہزار دینار قرض ہے اس شخص نے کہا کہ اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور امام صاحب نے بھی غسل سے یہی مراد لی تھی اور میرے غسل دینے کا بھی یہی

مطلب ہے۔

حدیث شریف: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قال من لم یومن لم یؤذن له فی الکلام مع الموتی قیل یارسول اللہ وھل تتکلم الموتی قال نعم ویتزاورون حضور سرور دو عالم ﷺ سے مروی ہے آپ نے فرمایا جو وصیت کر کے نہیں مرتا تو اہل اموات سے اسے کلام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ عرض کیا گیا اہل اموات آپس میں ہم کلام ہوتے ہیں آپ نے فرمایا ہاں بلکہ وہ تو ایک دوسرے کی ملاقات کو بھی جاتے ہیں۔

ف: امام صاحب بعض آئمہ عظام سے نقل کر کے فرماتے ہیں کہ ارواح دو قسم ہیں۔

۱۔ انعام والے ۲۔ عذاب والے

عذاب والے تو عذاب میں مبتلا ہیں۔ انہیں نہ تو کہیں جانے دیا جاتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کی ملاقات کو جاتے ہیں اور انعام والے کو کسی قسم کی رکاوٹ نہیں وہ ملاقات کے لئے آتے جاتے ہیں اور ملتے ملاتے ہیں اور دنیا میں آ کر دنیا کے معاملات کو دیکھتے ہیں اور جو باتیں اہل دنیا سے ہوتی ہیں ان کا مشاہدہ کرتے ہیں ہر روح ہر اس شخص کے ساتھ رہتی ہے جو شخص اس کے عمل کے مشابہ ہوتا ہے اور یہ رفاقت عالم برزخ میں بھی ثابت ہے اور درالجزاء میں بھی اور ہر مرد ان تین داروں میں مقام پر اس کے ساتھ رہتا ہے جس سے اسے محبت ہے۔

سبق: دانا کو چاہیے کہ وہ نیک بزرگوں کی صحبت اختیار کرے رات دن اسی مشغلہ میں گزارے مال ومنال میں مغرور نہ پھرے اور نہ ہی عمر بھر اللہ کے ذکر سے غافل رہے کیونکہ یہ دنیا فانی ہے اور جو بھی اس میں آیا وہ فنا ہو کر رہا پھر چاہیے کہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں ہو صائب نے فرمایا۔

دوسرائے غافلاں طول امل دانی کہ چیست آشیاں کردست ماری درکبوتر خانہ

ترجمہ: غفلت کی سرائیں تمہیں معلوم ہے کہ لمبی آرزوئیں کیا ہیں یہ سانپ ہیں جنھوں نے کبوتر دلیں میں رہائش رکھ لی ہے

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ غنیا پر وصیت فرض ہے مال دینے کے لحاظ سے اور اللہ والوں پر کی وجہ سے دولتمند تو اپنی آخری عمر میں تہائی مال کو وصیت کر لیتے ہیں لیکن اللہ والے ابتداء سے ہی تمام ماسوی اللہ سے فارغ ہو جاتے ہیں اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ جب تمہارے کسی ایک کا دل اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہو اور صفات طبیعہ حیوانیہ سے ارادۂ موت کے گھاٹ اتر جائے جیسا کہ حضور علیہ السلام

نے فرمایا موتو قبل ان تموتو بمعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ اور خیر وشر کو خیر باد کہہ دے اور دنیا و عقبیٰ کے گورکھ دھندے سے فارغ ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے والدین کے لئے وصیت کرے یعنی روح علوی جسم اور سفلی کے لئے اس لئے کہ روح اور جسم کے اجتماع سے نفس کا تولد ہوا اور اقربین کے لئے یعنی قلب اور سر اور باقی خواہشات بشریہ کو ترک کی وصیت کرے یعنی ان کے مشارب کو خواہ مشارب روحانیہ باقیہ ہوں یا مشارب فانیہ نیکی کی وصیت کرے لیکن حد اعتدال پھر اسراف پر مشتمل ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا بعثت لرفع العادات وترک الشھوات یعنی بری عادت اور ترک شہوات کو ہٹانے کے لئے مبعوث ہوا ہوں اور فرمایا لاتمم مکارم الاخلاق میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں تاکہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں بایں طور کہ تمام مشارب کو چھوڑ کر ایک مشرب کو اختیار کیا جائے اور تمام محبوبوں سے ہٹ کر ایک محبوب بنایا جائے اور تمام مذاہب کو ترک کر کے ایک مذہب کو اختیار کیا جائے حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ یعنی جو شرک خفی سے بچنے والے ہیں ان پر یہ مجموعہ احکام واجب ہے اسی لئے فرمایا عَلَى الْمُتَّقِينَ ، عَلَى الْمُسْلِمِينَ یا عَلَى الْمُؤْمِنِينَ نہیں فرمایا کیونکہ وہ اہل ظواہر میں اور متقین اہل بواطن اور حضور علیہ السلام نے دل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تقوی یہاں ہے۔

ف: جیسے قرآن مجید اہل ظواہر کے لئے نازل ہوا ہے اسی طرح اہل بواطن کیلئے بھی کما قال علیہ السلام ان للقرآن ظھرا وبطنا یعنی قرآن کے ظاہری احکام بھی ہیں اور باطنی بھی ظاہری احکام تو اہل ظواہر کے لئے ہیں اور ان میں بعض احکام منسوخ نہیں یعنی اگر چہ اس کے ظاہر حکم میں منسوخ کا حکم ہے لیکن اہل بواطن کے لئے کوئی نسخ نہیں ہوتا بلکہ ان میں بدستور مواعظ و اسرار و حقائق موجود ہوتے ہیں حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ متقی پر اس لئے واجب ہے کہ وہ لوگ متقین والی ہدایت سے مختص ہیں جیسے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ خلاصہ یہ کہ اہل حق کے لئے وصیت کا حکم منسوخ نہیں۔

(کذافی تاویلات نجمیہ)

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے کہ

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ

کہیں تمہیں پرہیزگاری ملے۔ گنتی کے دن ہیں تو تم میں جو کوئی بیمار یا سفر میں ہو

عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ

تو اتنے روزے اور دنوں میں اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں

مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

ایک مسکین کا کھانا پھر جو اپنی طرف سے نیکی زیادہ کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے زیادہ بھلا ہے

تَعْلَمُونَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ

اگر تم جانو۔ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کے لئے ہدایت اور رہنمائی

مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ

اور فیصلہ کی روشن باتیں تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے

مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ

اور جو کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں

بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

چاہتا اور اس لئے کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بولو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور کہیں تم حق گزار ہو

تَشْكُرُونَ ۝ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا

اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں دعا قبول کرتا ہوں

دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ

پکارنے والے کی جب مجھے پکارے تو انہیں چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں۔ روزوں کی راتوں میں

الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ

اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا وہ تمہاری لباس ہیں اور تم ان کے لباس اللہ نے جانا کہ

اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ

تم اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے تھے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف فرمایا تو اب ان سے

بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ

صحبت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھا ہو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے ظاہر ہو جائے

الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ

سپیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے (پو پھٹ کر) رات آنے تک روزے پورے کرو

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ

اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجد میں اعتکاف سے ہو یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جاؤ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

اللہ یوں ہی بیان کرتا ہے لوگوں سے اپنی آیتیں کہ کہیں انہیں پرہیزگاری ملے۔ اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ

بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ

اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لئے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھا لو

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

جان بوجھ کر۔

تفسیر عالمانہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو

ف: اہل لغت کہتے ہیں کہ صرف یا محبوب کی ندائے محبت کے لئے ایّھا محبوب کی تنبیہ محبوب کے لئے اور لفظ آمنو المحبوب کی شہادت محبوب کے لئے آتا ہے۔

ف: حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ سے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ کا ارشاد سنائی دے تو غفلت کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اس لئے اس کے بعد یا تو وہ کسی امر کے لئے مامور فرمائے گا یا کسی برے عمل سے روکے گا۔ حضرت جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حرف ندا کی لذت عبادت کی تکلیف کو دور کرتی ہے اور اس میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ محب کو چاہیے کہ اپنے محبوب کا ہر حکم مانے خواہ وہ فرمائے کہ اپنے آپ کو آگ میں ڈال دے تو محب کو چاہیے کہ فوراً آگ میں چلا جائے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ یعنی تمہارے اوپر ماہ رمضان کا روزہ فرض ہے کیونکہ اس کے بعد فرمایا اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ اور فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ اور اس سے قبل فرمایا شَهْرُ رَمَضَانَ

روزہ کے اصطلاحی معنی: ☆......اہل شرع کے نزدیک دن کو کھانے پینے اور جماع سے باز رہنے کا نام ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں نیت بھی روزہ کی ہو اور روزہ میں ان رکاوٹوں میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان اشیاء کو نفس خوب چاہتا ہے اس کی مخالفت کی بنا پر ان اشیاء سے روکا گیا یہ عوام کا روزہ ہے ☆......خواص کے نزدیک تمام منہیات سے رکنے کا نام روزہ ہے ☆......اخص الخواص کا روزہ ترک ماسوی اللہ کا نام ہے كَمَا كُتِبَ جیسے فرض کیا گیا۔

ترکیب کما: منصوب ہے اس لئے کہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے دراصل عبارت یوں تھی کتب کتابا کالنا مثل ما کتت اور ما مصدریہ ہے یا الصیام سے حال ہے اور اس وقت ما موصلہ ہوگا اب عبارت یوں گی کتب علیکم الصیام شبھابا الذی کتب تمہارے اوپر ان لوگوں کی طرح روزہ فرض ہے۔

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور اوپر ان لوگوں کے جو تم سے پہلے تھے یعنی دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں یعنی سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اس میں حکم کی تاکید اور اس کی

ترغیب اور نفوس کو خوش کرنا ہے اس لئے کہ روزہ ایک مشقت بھری عبادت ہے اور قاعدہ ہے کہ جب مشقت بھری عبادت عام ہو جائے تو وہ آسان معلوم ہوتی ہے اس کی ادائیگی میں ہر ایک کو رغبت ہوتی ہے۔

ف: یہ شبہ اصل روزہ میں ہے نہ کہ اس کی مقدار میں اور نہ ہی وقت کے تعین میں کیونکہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں ایام بیض کے روزے فرض تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عاشورا کے روزے فرض تھے اور یہ بھی ہے کہ تشبیہ میں من کل الوجوہ برابری نہیں ہوتی جیسے ہم دعا میں کہتے ہیں اللھم صلی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم اسی طرح انکم سترون ربکم کالقمر لیلۃ البدر میں تشبیہ رؤیت کی رؤیت سے ہے کہ مری کی مری سے۔

ف: مری صیغہ مفعول از رؤیت ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم گناہوں سے بچو اس لئے کہ روزہ شہوت کو توڑتا ہے۔

حدیث: یا معشر الشباب من استطاع منکم الباۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفروج ومن لم فعلیہ الصوم فان الصوم لہ اے نوجوانو! تم میں سے جس کی طاقت زوروں پر ہو تو اسے چاہیے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح سے آنکھ برائی سے بچ جاتی ہے اور فرج زنا سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جسے نکاح کی طاقت نہیں تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ روزہ صرف اسی لئے مقرر کیا گیا ہے۔

ف: اشباب شباب کی جمع ہے شباب اسے کہتے ہیں جو بالغ ہو جائے اور تیس سال کی عمر کو نہ پہنچے۔

(کذا قال النووی)

ف: الباۃ بمعنی بیاہ اور نکاح کرنا یہ للباء فی المنزل سے ماخوذ ہے یعنی گھر تیار کر دینا کیونکہ جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہ اسے گھر تیار کر دیتا ہے۔ الوجاء خصی ہونے کی ایک قسم ہے وہ یہ کہ کسی کے خصیے کی رگوں کو ست کیا جائے لیکن خصیوں کو کچھ نہ کیا جائے یہ بھی تشبیہ کی بناء پر ہے کہ جس طرح خصی ہونے سے شہوت کا اندفاع ہو جاتا ہے اسی طرح روزہ رکھنے سے شہوت نفسانیہ کمزور پڑ جاتی ہے۔

ف: حدیث میں امر وجوب کے لئے ہے کیونکہ روزہ کا حکم اس وقت ہے جب کہ شہوت کا غلبہ ہو جیسے یا شباب سے معلوم ہوتا ہے یعنی نوجوان اپنی فطری صحیح سالم عادت سے تجاوز کر جاتا ہے۔

روحانی نسخے: علماء کرام فرماتے ہیں کہ شہوت چند ایک چیزوں سے ست پڑ جاتی ہے۔

۱۔ دن کا روزہ رکھنا ۲۔ رات کو نماز کے لئے کھڑا ہونا۔ ۳۔ شہوت بھری اشیاء کو چھوڑ دینا۔

۴۔ شہوانی اشیاء کا تصور دل سے مٹا دینا۔ ۵۔ نفس امارہ کو شہوانی خیالات سے دور رکھنا۔

سوال: اگر کوئی شخص سوال کرے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو باوجود یکہ روزہ رکھتے ہیں رات کو نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور کھانا پینا بھی ترک کرتے ہیں لیکن شہوت نفسانیہ کا شکار ویسے ہی رہتے ہیں اس کا کیا علاج ہے؟

جواب: یہ بیماری دراصل اس کی شہوت کی وجہ سے ہے جو اس کے اندر گھسی ہے اس کے چند علاج ہیں۔

☆...... نفس کو غم والم کی خبروں میں ہر وقت جگائے رکھے۔

☆...... موت کا ذکر ہر وقت سامنے رکھے۔

☆...... نفس کو سمجھائے کہ موت کا وقت بالکل قریب ہے تو کب تک یہ خرابیاں کرتا رہے گا۔

☆...... آہستہ آہستہ آرزوئے نفس کو گھٹاتا جائے۔

☆...... نفس پر عبادت واطاعت کے ذریعے کنٹرول کرے۔

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ یعنی دن نہایت قلیل اور گنتی کے ہیں یعنی جو مال گنتی کا ہوا سے گنا جاتا ہے اور جو مال ان گنت ہوا سے ایسے ہی ڈالا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر زندگی بھر کا روزہ فرض نہیں فرمایا اور نہ ہی کثیر التعداد روزے واجب فرمائے ہمارے لئے تخفیف اور رحمت بہ نسبت دوسری امتوں کے سہولت فرمائی اور ایاما کا منصوب ہونا فعل محذوف کی وجہ سے ہے۔ جو اس کا ماقبل یعنی صیاما دلالت کرتا ہے یعنی دراصل عبارت یوں تھی صوموا ایاما الطریق تو اتسع کے مفعول قرار پائے گا۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا پس تم میں سے جو مریض ہو یعنی ایسا مریض کہ اسے روزہ نقصان پہنچائے یا روزہ کے ہوتے اسے نقصان ہو۔ **اَوْ عَلٰى سَفَرٍ** یا سفر میں ہو علی سفر سے تعبیر میں اس طرف اشارہ ہے کہ گویا مسافر سفر پر ہوتا ہے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ دن کے کسی حصہ میں سفر کا آغاز کرے تو روزہ رکھے کیونکہ اس لئے اس سے

سوار ہونے کا مفہوم ادا نہیں ہوتا بلکہ وہ سفر سے ایک قسم کی علابست حاصل ہوئی اور رخصت اس وقت ہے جب کہ ہر طرح سفر پر سوار ہونے کا مفہوم حاصل ہو۔ آیت میں لفظ استعارہ تبعیہ ہے کہ سفر اور مسافر کی سواری اور سوار سے مشابہت دی گئی ہے جس طرح سوار اپنی سواری پر جیسے چاہے تصرف کرے اسی طرح مسافر بھی اپنے سفر کو جس طرح چاہے استعمال کرے اس معنی کی دلالت کی وجہ سے اسم سے عدول کیا ورنہ فرماتے او مسافو کیونکہ اس میں وہ مفہوم نہیں جو عَلٰی سَفَرٍ میں سوار ہونے کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔

فَعِدَّةٌ پس گنتی چاہے یعنی کہ مرض اور سفر کے دن گن کے دور سے ایام میں روزے رکھے فَعِدَّةٌ سے ہے بمعنی معدودہ وہ جماعت جو لوگوں میں شمار ہوا سے عدت کہتے ہیں۔

مِنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یعنی اس کے سفر اور مرض کے ایام کے بغیر چاہے مسلسل قضا کرے یا غیر مسلسل آیت کا مطلب یہ کہ تندرست لوگوں پر ان گنی کے ایام میں روزے فرض ہیں باقی رہے بیمار اور مسافر سو وہ ان ایام کے بغیر بعد میں جب چاہیں قضا کرلیں وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ اور اوپر ان لوگوں کے کہ جنہیں طاقت ہے اکثر مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے وہ لوگ مراد ہیں جو تندرست اور مقیم ہیں لیکن ابتدائے اسلام میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اختیار دیا تھا کہ چاہے روزہ رکھیں چاہے فدیہ دیں تا کہ ان کو دکھ نہ ہو کیونکہ اس سے قبل ان کی روزہ رکھنے کی عادت نہ تھی پھر یہ آیت منسوخ ہو گئی اور لازم کیا گیا کہ جب ہی رمضان کا مہینہ ہو روزہ رکھنا فرض ہے اس آیت کی ناسخ یہ آیت ہے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ یعنی جن لوگوں کے پاس رمضان شریف کا مہینہ آجائے تو ان پر لازم ہے کہ روزے رکھیں فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ یعنی ایک مسکین کا فدیہ گندم سے ایک صاع اور گندم کے سوا پورا صاع ادا کرنا ہوگا۔ فدیہ جزاء کے معنی میں ہے دراصل فدیہ کہتے ہیں کسی کا قائم مقام ہو کر بدل بن جانا شیخ کی تفسیر میں ہے۔ مطیق اطاق فلان سے ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب اس فلاں سے طاقت چھن جائے یہاں ہمزہ سلب کے لئے ہے یعنی وہ لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے یعنی یہی وہ لوگ تھے کہ جوانی کے وقت تو انہیں روزہ رکھنے کی طاقت تھی لیکن اب بڑھاپے میں انہیں طاقت نہیں رہی۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا پس وہ شخص جو احسان کرتا ہے ساتھ بھلائی کے پھر فدیہ کا اضافہ کر دیتا ہے یا نیکی کا کوئی عمل کرتا

ہے فَهُوَ پس وہ نیکی خَیْرٌ لَّہٗ اس کے لئے بہتر ہے۔ خیر مطوع میں تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ایک مسکین پر ایک اور مسکین کا اضافہ کرے یعنی ایک کی بجائے دو مسکینوں یا اس سے زائد کو طعام دے۔

۲۔ مسکین واحد کو قدر واجب سے زائد دے۔

۳۔ فدیہ بھی دے اور روزہ بھی رکھے یہ سب کی سب بھلائی ہی بھلائی ہے۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ مصدر مرفوع بالا بتدا ہے یعنی اے مسافر اور وہ لوگ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے خَیْرٌ لَّکُمْ تمہارے اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فدیہ سے بہتر ہے اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ روزے کے کتنے بڑے فضائل ہیں اس جملہ کا جواب محذوف ہے اس کے واضح طور پر ظاہر ہونے کی وجہ سے وہ محذوف اخترتموہ ہے یعنی تم اسے اختیار کرتے۔

مسئلہ :الاشباہ میں ہے کہ سفر میں روزہ افضل ہے ہاں جب اسے خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے بہت تکلیف ہو گی یا اس کے دوست اس کے زادراہ میں شریک ہیں لیکن نہیں رکھتے تو پھر روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔

سوال: مسافر کو روزہ رکھنا افضل کیوں ہے؟

جواب: اس لئے کہ روزہ رکھنا عزیمت ہے اور نہ رکھنا رخصت اور عزیمت پر عمل کرنا افضل ہے۔

سوال: حدیث شریف میں ہے حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لیس من البر الصیا فی السفر سفر میں روزہ رکھنا نیکیوں میں سے نہیں اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے۔

جواب: یہ حدیث شریف محمول ہے اس معنی پر جب کہ سفر میں روزہ نقصان دیتا ہو یہاں تک کہ اسے مرجانے کا خطرہ ہو جائے۔ (کذافی شرح الجمع الا بن الملک)

مسئلہ: روزے کی معافی ہر اس شخص کو ہے جسے نماز قصر کی اجازت ہے یعنی تین شب و روز کا سفر جو بہ تحقیق اعلیٰ حضرت سیدنا احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہ ساڑھے ستاون میل ہے یہی قول امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے مذہب کے مطابق ہے۔

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ماہ رمضان کے روزں کا حکم اس لئے دیا کہ بندے کو سال کی گنتی کے مطابق ثواب

نصیب ہو اور یہ اس کا وعدہ ہے کما قال مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اور ماہ کامل تیس دنوں کا ہوتا ہے اس حساب سے تین سو روزوں کا ثواب ملا۔ پھر اس کے ساتھ ماہ شوال کے چھ روزے ملا لئے گئے جو ساٹھ روزے بنے اس طرح بندے کو سارے سال کے تین سو ساٹھ روزے نصیب ہوئے۔

مسئلہ: کسی ماہ کے ایک دن کی کمی سے روزوں کی کمی نہیں کی جاتی۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم ﷺ نے اپنی زندگی مبارک میں کل آٹھ ماہ رمضان کے روزے رکھے ان میں پانچ روزے انتیس دنوں کے اور تین تیس دنوں کے۔

ف: رمضان کے روزے کا حکم نبوت کے پندرہ سال اور ہجرت کے تین سال بعد ہوا۔

ف: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور سرور عالم ﷺ نے اظہار نبوت کے بعد کلمہ شہادت کا اعلان فرمایا جب اس کی مکمل تصدیق ہوگئی تو پھر نماز کا حکم فرمایا جب اس کی تصدیق ہوگئی پھر زکوٰۃ کا اعلان فرمایا جب اس کی تصدیق ہوگئی پھر روزے کا اعلان فرمایا جب اس کی تصدیق ہوگئی پھر حج کا اعلان فرمایا جب اس کی تصدیق ہوگئی پھر جہاد کا اعلان فرمایا اس کے بعد دین مکمل ہوگیا۔

ف: فقرا کی وجہ سے دولتمندوں پر سب سے پہلے روزے کا حکم طہمورث بادشاہ کے زمانے میں فرض ہوا جو بنی آدم کے بادشاہوں میں تیسرا بادشاہ ہو گزرا ہے۔

روزے کی فرضیت کا سبب: روزے کی فرضیت کا سبب یوں ہوا کہ بادشاہ طہمورث کے زمانے میں سخت قحط پڑا اس نے دولتمندوں کو حکم فرمایا کہ غروب شمس کے بعد ایک ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور دن کو سارا دن بھوکے رہیں تاکہ فقرا کے حال پر شفقت کا موقع ملے اور دولت مندوں کے دن کا طعام فقراء کو نصیب ہو اور پھر اس سے عبادت الٰہی بجالا کر اس کے سامنے تواضع وانکسار کا اظہار کریں۔

فائدہ روحانیہ: روزہ رکھنے سے انسان جسمانیت کے تاریک وتنگ گوشہ (جسے نشأۃ ثانیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) سے خارج ہو کر ملکوت السمٰوٰت میں داخل ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ کوئی بھی ملکوت السمٰوٰت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ولادت نہ ہو بلکہ مجاہدہ صوم تو مشاہدہ ربانی کا

بہترین رابطہ ہے اسی کی طرف (حدیث قدسی کا بھی اشارہ ہے) روزہ میرے لئے اور میں ہی اسے جزا دوں گا یعنی میں ہی اس کی جزا ہوں نہ اس میں زیادتی ہوگی اور نہ کمی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے زیارت کی رؤیت کو بھوک سے متعلق فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے خطاب فرمایا کہ تجوع ترانی بھوکے رہو تب مجھے دیکھو گے۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا۔

ندارند تن پروراں آگہی　　　که پر معده باشد ز حکمت تہی

ترجمہ: تن پرور شہوت پرستوں کو کسی قسم کی آگاہی نصیب نہ ہوگی اس لئے جو پیٹ بھر کر کھائے گا وہ حکمت سے محروم رہے گا۔

سوال: روزے کو حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا گیا؟

جواب: روزہ دار ریا سے پاک ہوتا ہے اس لئے کہ وہ ایک مخفی فعل ہے سوائے خدا تعالیٰ کے اسے کوئی نہیں جانتا لیکن شرط یہ ہے کہ بندہ روزہ کے وقت اپنے قلب اور سر اور روح کو ماسوی اللہ سے پاک رکھے اور خواص کے ہاں حقیقی روزہ بھی یہی ہے۔

حضرت مولانا روم قدس سرہ نے فرمایا۔

ہر کرا دارد ہوسہا جان پاک　　　روز بیند حضرت وایوان پاک

(**ترجمہ**: جو اپنی روح کو خواہشات سے پاک رکھتا ہے وہ بہت جلد ذات حق کا مشاہدہ کرلے گا)

تفسیر صوفیانہ جیسے ظاہر کا روزہ ہوتا ہے اسی طرح باطن کا بھی ہوتا ہے اور باطن کا خطاب اشارہ کرتا ہے یہ کہ مومن کے قلب روح کا روزہ یہ ہے کہ بندہ کو انوار الحضور مع اللہ کا شہود حاصل ہو قلب کا صوم یہ ہے کہ قلب معقولات کے مشروں کے حصول سے رک جائے اور روح کا روزہ یہ ہے یہ روح روحانیت کے مشاہدات سے دور رہے اور سر کا روزہ یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے شہود سے محفوظ ہو جو صرف کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ سے رکا ہوا ہے اس کے روزے کی انتہا صرف یہ ہے کہ رات آئے گی اور وہ خوش ہوگا اور جو غیر اللہ سے رکا ہوا ہے اس کے روزے کی انتہا مشاہدہ حق ہے۔

حدیث شریف: حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا صوم الرویعہ و الفطر و الرؤیعہ اس کا مطلب حقیقۃً یہ ہے رؤیت سے مراد مشاہدہ حق ہے یعنی روزہ رکھو تو صرف مشاہد حق کی آرزو کے لئے اور افطار کرو تو مشاہدہ حق کی تمنا میں روزے دار کو چاہیے کہ وہ ظاہر اور باطن ہر طرح کا روزہ رکھے مثلاً زبان کا روزہ جھوٹ اور فواحش اور غیبت سے اور آنکھ کا روزہ یہ ہے کہ غفلت اور شک وشبہ سے بچے اور کان کا روزہ یہ ہے کہ مناہی وملاہی کے سننے سے محفوظ رہے اسی طرح باقی اعضاء کا قیاس کیجئے۔ مثلاً نفس کا روزہ ہے کہ وہ غلط تمنا اور حرص وشہوات سے بچے اور قلب کا روزہ یہ ہے حب دنیا اور اس کے نقش ونگار میں نہ پھنسے اور روح کا روزہ یہ ہے کہ وہ آخرت اور اس کی لذات کے نشہ میں نہ رہے اور سر کا روزہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے وجود واثبات کو معوم کرے کَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ میں اشارہ ہے کہ وجد انسان کے اجزاء جسمانیہ روحانیہ کی ترکیب سے قبل مشارب وغیرہ سے روزہ دار تھے۔ جب جسم روح سے متعلق ہوا تو ارواح کی امداد سے جسم اور روح کو حظوظ حیوانیہ ونفسانیہ کی آرزو پیدا ہوئی اس کے بعد جسم کے قالب کے حواس کی وجہ سے روح کو مشارب حیوانیہ وروحانیہ کی ضروریات محسوس ہوئیں اس پر اللہ تعالیٰ نے روزہ فرض فرمایا جیسے کہ وہ عالم ازل میں روحانیت میں فرداً فرداً ان پر روزے کا حکم تھا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم مشارب مرکبات سے بچ جاؤ اور روزے رکھ کو شراب طہور کی استعداد کے ساتھ اور ان مشارب سے افطار کریں جن کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پلائے گا جب کہ انہیں شراباً طہوراً سے نواز کر انہیں پورے طور پاک کردے گا یہ شراب حظوظ حیوانیہ روحانیہ کی آلائش سے پاک کردے گا۔ جیسا کہ فرمایا۔ وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا تمہارے متعلق پاک کرنے کا ارادہ ہے پھر جب بندے کے حظوظ کی تمنا کا ستارہ گم ہوگا تو مطلع بقائے ربانی سے شمس لقاء طلوع فرمائے گا اس وقت ایفائے وعدہ ہوگا جو حضور علیہ السلام نے روزہ داروں کے لئے فرمایا للصائم فرحتان روزے دار کو دو خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔ ۱۔ افطار کے وقت ۲۔ دیدار ربانی کے وقت۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو گنتی کی قلت کی خوشخبری سنائی یعنی اے میرے بندو! تمہارے روزہ رکھنے کے ایام تو بالکل معمولی اور گنتی کے ہیں۔ لیکن تمہارے روزوں کے ثمرات ان گنت ہیں پس روزے کا نام سن کر گھبراؤ نہیں۔ (کذا فی التاویلات نجمیہ)

تفسیر عالمانہ شَهْرُ رَمَضَانَ یہ مبتداء اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے اس کے ذکر سے بندے کو رمضان

شریف کی فضیلت اور اس کے علو مرتبہ پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور اشارہ ہے اس طرف کہ یہ مہینہ دوسرے مہینوں سے خصوصی شان رکھتا ہے کہ اس کا روزہ فرض فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ اس آیت سے مراد ماہ رمضان ہے اور روزے کی فرضیت فَلْيَصُمْهُ سے فرمائی۔

سوال: ماہ کو شہر کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: اس کی شہرت کی وجہ سے جب شروع ہوتا ہے تو سب کے ہاں مشہور ہو جاتا ہے۔

حل لغات: رمضان رمض کا مصدر ہے بمعنی احتراق شہر کو رمضان کی طرف مضاف کر کے مجموع کو علم اور غیر منصرف مانا جاتا ہے اس میں دو سبب ہیں معرفہ اور الف نون زائدتان رمضان کو رمضان اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھوک اور پیاس کی وجہ سے جگر کمزور اور جل جاتا ہے اس وجہ سے کہ روزوں سے گناہ جھڑ جاتے ہیں یا اس وجہ سے کہ جب اس ماہ کے نام رکھنے کی باری آئی تو اس وقت سخت گرمی تھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مہینوں کے اسماء لغات قدیمہ سے منقول ہوئے ہیں پھر جس ماہ کے نام رکھنے کی باری آئی تو جو موسم تھا اس کے مطابق اس کا نام رکھا گیا ماہ رمضان کے نام کی باری آئی تو موسم گرما تھی جیسے ربیع الاول والآخر کا نام رکھتے وقت موسم بہار تھا اسی طرح جمادی الاولی والاخری کی باری آئی تو پانی کے جم جانے کا موسم تھا۔

ف: رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک نام ہے اب شہر اس کی طرف مضاف ہے اسی لئے مروی ہے **لاتقولوا وخاء رمضان و ذهب رمضان** نہ کہو کہ رمضان آیا اور گیا بلکہ کہو ماہ رمضان آیا اور گیا اس لئے کہ رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء سے ہے۔

الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن پاک نازل ہوا یعنی پہلے ایک بارگی بیت العزۃ (جو کہ آسمان دنیا میں واقع ہے) میں نازل ہوا اس کے بعد تیئس سال کی عمر میں آہستہ آہستہ نازل ہوتا رہا جیسے مشیت ایزدی کا تقاضا ہوتا۔

حدیث شریف: حضور نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ صحف ابراہیم علی نبینا و علیہ السلام رمضان المبارک میں نازل ہوئے اور توارت رمضان المبارک کی چھٹی تاریخ کو نازل ہوئی اور انجیل تیرہ تاریخ رمضان میں نازل ہوئی اور قرآن پاک چوبیس رمضان کو نازل ہوا قرآن قرء سے مشتق ہے بمعنی الجمع کیونکہ قرآن پاک

میں علوم الاولین وآخرین جمع ہیں۔

هُدًى لِّلنَّاسِ یعنی وہ قرآن نازل ہوا ہے اس کا حال یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے اعجاز وغیر کے ذریعے جو لوگوں کو سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى اور اس کا یہ حال ہے کہ اس میں آیات واضحات ہیں جو ان سے حق کی طرف راہ دکھاتا ہے اور حق و باطل کے مابین فرق کرتا ہے اس اعتبار سے کہ اس میں حکمتیں اور احکام ہیں۔

ف: ہدایت دو اقسام کی ہیں۔ ۱۔ جو بالکل واضح اور کھلی ہو۔ ۲۔ اتنی واضح اور کھلی نہ ہو۔ پہلی قسم دوسری سے افضل ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی جنس عمومی طور بیان فرمائی اسکے بعد جو اشرف واعلیٰ کا ذکر فرمایا بلکہ اس میں مبالغہ فرمایا گویا کہا گیا ہے کہ وہ قرآن ہدایت ہے بلکہ کھلی اور واضح ہدیت ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی عبادت میں انتہا درجے کا مبالغہ ہے کیونکہ یہ مرتبہ ثالث میں ہے (یعنی ادنیٰ سے اوسط پھر اعلیٰ) اس کا عطف بینات پر از قبیل تشریف ہے۔

فَمَنْ یہ فاء تفریع وترتیب کی ہے شَهِدَ پس وہ جو حاضر ہو اسکا استعمال وہاں ہوتا ہے جو کسی کو کسی شہر یا گاؤں میں اقامت حاصل ہو مِنْكُمُ الشَّهْرَ شہر کا منصوب ہونا علی الظرفیہ ہے فِی الشَّهْرِ یہ مفعول بہ نہیں اس لئے کہ مقیم ومسافر شہر میں حاضر ہوتے فَلْيَصُمْهُ پس چاہیے کہ اس میں روزہ رکھے اس میں حرف جار محذوف ہے اصل عبارت فلیصم فیہ تھی اور حرف جار کے بغیر پہچانے میں اتساع مطلوب ہے اور شاہد سے عاقل و بالغ وتندرست مراد ہے کیونکہ صبی مجنوں اگر چہ موضع میں حاضر ہوں تب بھی ان پر روزہ فرض ہے اس سے روزہ رکھنا یا نہ رکھنا یا اس کے بدلے فدیہ دینے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اور وہ شخص جو مریض ہو اگر چہ مقیم یعنی گھر میں ہو اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا سفر میں ہو اگر تندرست ہو یہاں پر علی بمعنی فی ہے۔ قاعدہ ہے کہ حروف جارہ ایک دوسرے کے قائم مقام کھڑے ہو سکتے ہیں۔

فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ پس گنتی کے اور دنوں میں یعنی ان اعذار کی وجہ سے یہ لوگ دوسرے دنوں میں روزے رکھ لیں۔

سوال: حرف تخیر یعنی حرف اور عاطفہ کو دوبارہ کیوں لایا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں جب تندرست مقیم اور مسافر اور مریض کے متعلق روزے رکھنے اور نہ رکھنے کا اختیار دے کر دوسری آیت میں اس حکم کو منسوخ فرمایا اگر صرف اسی منسوخ کے مضمون تک بات محدود رہتی تو حکم کی یکسانیت کا احتمال رہتا اس لئے ضروری ہوا کہ منسوخ کے بعد پھر مقیم و مسافر اور مریض کی وضاحیت ہوتا کہ معلوم ہو کہ ان احکام سابقہ میں بعض اپنے اصل پر ہیں۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق آسانی کا ارداہ فرماتا ہے اور دکھ کا ارادہ نہیں رکھتا یعنی یہ نہیں فرماتا کہ دکھ کے وقت بھی روزہ رکھو یعنی سفر اور مرض میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں بخشی یہ اس کی نہایت درجہ کی مہربانی اور بے حد درجہ کی رحمت ہے۔

ف: امام محمد بن علی الترمذی (صاحب نوادر الوصول) قدس سرہ فرماتے ہیں کہ الصوایک بہشت کا نام ہے کہ تمام آسانیاں اسی میں رکھی گئی ہیں اور الیسر ایک جہنم کا نام ہے جس میں ہر قسم کے دکھ رکھے گئے ہیں اب آیت کا معنی یوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں روزے رکھنے کا حکم دیتا ہے تاکہ تمہیں بہشت میں داخل کرے اور دوزخ سے بچائے۔

ف: ہمارے شیخ العلامہ الفضلی قدس سرہ اس آیت کی تفسیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے روزے رکھنے کے حکم میں تمہاری دارین کی سعادت کا ارادہ رکھتا ہے نہ کہ دارین کی بدبختی۔

ف: دنیا کی سعادت کی یہ معنی ہے کہ بندے کو ملکیت و روحانیت کی طرف ترقی اور یہ لفظ و معرفت کی جانب پہنچنا نصیب ہوتا ہے اور دنیا میں بدبختی کا یہ معنی ہے کہ انسان اپنی بشریت و حیوانیت میں محدود رہے اور اوصاف طبعیہ و انسانیہ میں مقیدر ہے اور یسر یعنی آخرت کی سعادت کا یہ مطلب ہے کہ اسے جنت و نعمت اور قرب وصال اور رؤیت حق نصیب ہو اور آخرت کی بدبختی کا یہ معی ہے کہ اسے جہنم اور اس کے عذاب اور اور اس کے مختلف درکات نصیب ہوں۔

تفسیر صوفیانہ

شیخ نجم الدین قدس سرہ اپنی تاویلات نجمیہ میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے یسر کے ساتھ عسر کا ارادہ رکھتا ہے بمعنی کہ تعمیل ارشاد میں بندے کو اس کا انتظار بھی نہ ہو کہ مجھے اس کی وجہ سے عسر نجات ملے گی۔ (گویا نیکی کر اور دریا میں ڈال کا مصداق بن جائے) ہاں اس آسانی

کے خیال میں رہے کہ جس سے دکھ ٹل جاتے ہیں تو کوئی حرج نہیں اس لئے کہ جب دانا کو طبیب کڑوی دوائی مرض کی تکلیف کی وجہ سے پلاتا ہے (جو ہی دوائی تندرستی لانے والی ہوتی ہے) تو دانا دوائی پیتے ہوئے دوا کے کڑوا پن کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نگاہ اس کڑواپن سے تندرستی کی چاشنی پر لگی ہوتی ہے اسے دوائی کے کڑواپن کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قوت وہمت سے کڑوی دوائی پی جاتا ہے۔ حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

وبالست داون بر بخور قند　　　که داروئے تلخش بوسود مند

زعلت مداری خرومند بیم　　　چو داروئے تلخت فرستد حکیم

(بیمار کو میٹھا کھلانا نقصان دہ ہے اس لئے کہ اسے کڑوی دوائی مفید ہے بیماری سے
دانا کو خوف نہیں کرنا چاہئے جب حکیم کڑوی داوئی دے تو فوراً پی لینی چاہئے)

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اور تا کہ تم اپنی گنتی پوری کرو یعنی اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے واجب کرنے کے بعد گنتی کی رعایت اس لئے دی ہے تا کہ تم سفر یا مرض کی وجہ سے جتنے دن تم نے روزے نہیں رکھے اتنی مقدار دوسرے دنوں میں مکمل کرلو۔ چنانچہ فرمایا فعدة ای فعلیکم عدة ما افطر تم وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ اور تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو یعنی ہم نے جو تمہیں روزوں کی قضا کا حکم (جو منا یام اخر سے معلوم ہو رہا ہے) دیا مطلق ہے خواہ وہ مسلسل رکھو یا مختلف ایام میں تا کہ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرو حمد کرتے ہوئے عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ جس پر اس کے کہ اس نے تمہیں ہدایت بخشی ہے یہاں پر ما مصدریہ ہے ای علی هدا یه ایا کم ۔۔۔۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں تکلیف سے عہد برا ہونے کے لئے سیدھے راستے بتائے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یعنی ہم نے تمہیں سفر اور مرض میں روزے نہ رکھنے کا حکم فرمایا تا کہ تم شکر کرو اس نعمت کا زبان اور قلب اور بدن سے۔

احادیث شریفہ

حدیث شریف ۱۔ میں ہے کہ جس نے تین چیزوں کی حفاظت کی وہ یقیناً ولی اللہ ہے اور جو ان تینوں کو ضائع کردیتا ہے۔ یقین جانو وہ اللہ کا دشمن ہے۔

۱۔ نماز　۲۔ روزہ　۳۔ جنابت کا غسل

حدیث شریف ۲۔ اللہ تعالیٰ کی تمام بہشتیں چار آدمیوں کی مشتاق رہتی ہیں۔

۱۔ رمضان کے روزے رکھنے والا ۲۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنے والا ۳۔زبان کی حفاظت کرنے والا۔ ۴۔ بھوکے ہمسایوں کو کھانا کھلانے والا۔

ف: اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کے تمام گناہ بخش دیتا ہے جو روزہ افطار کراتا ہے خواہ اس نے وہ گناہ پاؤں سے چل کر کیے یا ہاتھوں یا آنکھوں سے کیے اور کانوں سے سنے اور زبان سے کیے یا اس کے قلب سے صادر ہوئے

حدیث شریف: جب قیامت میں اللہ تعالیٰ اہل قبور کو قبروں سے اُٹھنے کا حکم دے گا تو اللہ تعالیٰ ملائکہ کو فرمائے گا کہ اے رضوان میرے روزے داروں کو آگے چل کر ملو کیونکہ وہ میری خاطر بھوکے پیاسے رہے اب تم بہشت کی خواہش کی تمام اشیاء لے کر ان کے پاس پہنچ جاؤ اس کے بعد وہ رضوان زور سے پکار کر کہے گا اے جنت کے غلمان و ولدان نور کے بڑے بڑے تھال لاؤ اس کے دنیا کے ریت کے قطرات اور بارش کی بوندوں کے اور آسمان کے ستاروں اور درختوں کے پتوں کے برابر میوہ جات اور کھانے پینے کی لذیذ اشیاء جمع کر کے روزہ داروں کے سامنے رکھ دی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا جتنا مرضی کھاؤ پیو یہ ان روزوں کی جزاء ہے جو تم نے دنیا میں رکھے۔

ایک عجیب الخلقت فرشتہ: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شب معراج سدرۃ المنتہیٰ پر ایک فرشتہ دیکھا جسے میں نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا اس کے طول و عرض کی مسافت لاکھ سال کے برابر تھی اس کے ستر ہزار سر تھے اور ہر سر میں ستر ہزار منہ اور ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں اور ہر سر پر ستر ہزار نورانی چوٹی تھی اور ہر چوٹی کے سر پر بال میں لاکھ لاکھ موتی لٹکے ہوئے ہر ایک موتی کے پیٹ پر لکھا ہوا ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور اس فرشتے نے اپنا سر اپنے ایک ہاتھ پر رکھا ہے اور دوسرا ہاتھ اس کی پیٹھ پر ہے اور وہ حظیرۃ القدس یعنی بہشت میں ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتا ہے تو اس کی خوش آواز سے خوشی سے عرش الٰہی کانپ جاتا ہے میں نے جبریل امین علیہ السلام سے ان کے متعلق پوچھا تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ وہ فرشتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا تھا پھر میں نے کہا اس کی لمبائی چوڑائی کہاں سے کہاں تک ہے؟ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے بہشت میں ایک چراگاہ بنائی ہے اور یہ اسی میں رہتا ہے اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ آپ کے اور آپ کی امت کے ہر شخص کے لئے تسبیح پڑھے جو روزہ رکھتے ہیں حضور علیہ الصلوۃ

والسلام نے اس فرشتہ کے آگے دو صندوق دیکھے اور ہر صندوق پر ہزار نورانی تالہ تھا میں نے پوچھا اے جبریل علیہ السلام یہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا اس فرشتہ سے پوچھئے میں نے اس سے پوچھا یہ صندوقیں کیسے ہیں اس نے کہا اس میں آپ کی روزہ رکھنے والی امت کی برأت کا ذکر ہے آپ کو آپ کی امت کے روزہ رکھنے والوں کو مبارک ہو۔

مسئلہ: ہر عمل میں نیت ضروری ہے خصوصاً روزہ میں؟

مسئلہ : نیت کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم دل سے جانتا ہو کہ آج میرا روزہ ہوگا اور یہ تقریباً رمضان کی ہر رات خیال ہی ہوتا ہے۔

سوال: روزہ میں نیت کو کیوں ضروری قرار دیا گیا؟

جواب: کھانے پینے وغیرہ سے رک جانا کبھی عادتاً اور کبھی بھوک کے نہ ہونے کی بناء پر اور کبھی مرض کی وجہ سے اور کبھی ریاضت کی بنا پر اور کبھی عبادت کے طور پر ہوتا ہے اس لئے ضروری ٹھہرا کہ نیت کر لے تا کہ خالص عادت متعین ہو۔

مسئلہ: یہ نیت ہر روز کے لئے علیحدہ شرط ہے کیونکہ ہر دن کا روزہ ایک علیحدہ فرض ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جو شخص روزہ رکھ کر توڑ دے تو وہی روزہ ٹوٹے گا یہ نہیں کہ اس کے تمام روزے خراب ہو گئے بخلاف تراویح کے کہ اس میں تمام کے لئے ایک ہی نیت کافی ہے کہ وہ تمام (بیس رکعات) گویا ایک ہی نماز ہے یہی صحیح تر ہے۔

مسئلہ: روزے رمضان کی نیت دوپہر سے پہلے ہو سکتی ہے اگر کھانا پینا نہ ہو تو روزہ ہو جائے گا۔

سوال: احادیث تو اس کے خلاف ہیں؟

جواب: وہ احادیث مبارکہ جو اس کے خلاف آئی ہیں ان میں فضیلت کی نفی ہے کہ جو رات کو روزہ کی نیت نہیں کرتا اس کا روزہ نہیں یعنی اس کو روزہ کی فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ جیسا کہ شریعت کا قاعدہ مشہور ہے۔

مسئلہ: قضا اور کفارات اور نذر مطلق میں رات کو نیت ضروری ہے کیونکہ ان امور کے لئے اوقات متعین نہیں اسی لئے ضروری ہے کہ رات کو نیت کی جائے تا کہ دوسرے اعمال کی مزاحمت ہو سکے۔

مسئلہ: جو کہا گیا ہے کہ رمضان کے روزے کی نیت دوپہر سے پہلے جائز ہے اس سے نصف النہار مراد ہے

یعنی صبح صادق سے لے کرضحوہ کبریٰ یعنی چاشت کے وقت تک اس وقت سے پہلے نیت کا ہونا ضروری ہے تا کہ اکثر وقت اس کا روزہ میں گزرے اس میں کل کا حکم ہوگا یہاں تک کہ اگر کسی نے اس کے بعد نیت کی تو وہ روزہ نہ ہوگا لیکن اس کا اکثر وقت روزہ کی نیت سے خالی گزرا ہے اس میں اکثریت کے غلبہ کا اعتبار کیا گیا ہے۔

مسئلہ: تراویح میں احتیاط اسی میں ہے کہ ان میں تراویح یا قیام اللیل یا سنتہ الوقت یا قیام رمضان کی نیت کرے۔

مسئلہ: تراویح سنت مؤکدہ ہے اسی پر خلفاء راشدین نے مواظبت فرمائی ہے۔

حدیث شریف: حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر رمضان کے روزے فرض فرمائے ہیں اور میں تمہارے لئے اس کی راتوں کا قیام سنت مقرر کرتا ہوں۔

سوال: حدیث مذکورہ سے تو تراویح کا سنت ہونا ثابت ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اے نعمة البدعة هذا یعنی رمضان کی راتوں میں قیام اچھی بدعت ہے فرما کر بدعت کہا ہے (بدعت اور سنت میں تضاد ہے)

جواب: حضور کریم ﷺ نے تراویح چند راتیں پڑھ کر پھر ترک کر دیں آپ نے ان پر مواظبت نہیں فرمائی اور نہ ہی ان کے لئے لوگوں کو جمع فرمایا البتہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی مواظبت فرمائی اور ان کے لئے لوگوں کو جمع بھی فرمایا اسی ہیئت کذائیہ کی بناء پر انہوں نے اسے بدعت سے تعبیر فرمایا اور گر وہ بدعت بھی ہے تو بدعت محمودہ ممدوحہ وحسنہ ہے اور بدعت حسنہ سنت کے منافی نہیں ہوتی۔

(كذافي تفسير القرطبي جلد اول، تحت قوله تعالى بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

فضائل رمضان: حضور نبی اکرم ﷺ رمضان المبارک کی تشریف آوری سے اپنے صحابہ کرام کو خوشخبری سناتے ہوئے فرماتے تمہارے ہاں ماہ رمضان آیا اور یہ ماہ بہت بڑی برکت والا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اس کے روزے فرض فرمائے ہیں اور اس ماہ میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو باندھ دیا جاتا ہے اور اس ماہ میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار ماہ سے افضل ہے جو اس کی برکت سے محروم ہو گیا اس جیسا محروم دنیا میں نہیں ہوگا۔

مسئلہ: بعض لوگوں نے اس حدیث سے مسئلہ استنباط کیا ہے کہ خوشی کے وقت ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرنا اسی حدیث سے ثابت ہے جب کہ بعض مقامات پر رواج ہے کہ رمضان شریف کی تشریف آوری کے

وقت ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے ہیں امام سخاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ مقاصد حسنہ میں لکھتے ہیں کہ مہینوں اور عیدوں کی آمد پر مبارک باد پیش کرنا لوگوں کی عادت ہے ورنہ کوئی مسئلہ نہیں۔

حدیث شریف: حضرت ابن عباس مرفوعاً روایت فرماتے ہیں کہ بھائی کو حج کی واپسی پر ملو اور اسے کہو تقبل اللہ منا ومنک اللہ تعالیٰ ہم تم سب سے قبول فرمائے۔ یہ بھی ایک خوشی پر مبارک باد ہے۔

حدیث شریف ومسئلہ: مرفوع حدیث میں ہے کہ ہمسایہ کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ اس کو خوشی کے وقت مبارک باد پیش کرو اور اس کے غم کے وقت اس کے پاس تعزیت کے لئے جائے اور وہ بیمار ہو جائے تو اس کی طبع پرسی کرے۔

مسئلہ: روزے کے مستحبات میں سے ہے کہ اپنے ظاہری اعضاء کو گناہوں سے بچائے اور خواطر باطنہ کی نگرانی کرے اور اللہ تعالیٰ کا قرب ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء کو ترک نہ کرے۔

ف: حضرت شمس الدین وارانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ میں دن کو روزہ رکھوں اور رات کو حلال لقمہ سے افطار کروں مجھے زیادہ محبوب ہے کہ رات دن نوافل پڑھتے گزاروں۔

تفسیر صوفیانہ شمس توحید پر حرام ہے کہ بندے کے قلب پر حرام کا لقمہ اثر کرے خصوصاً روزے کے افطار کے وقت سالک کو چاہیے کہ حرام لقمے سے اجتناب کرے اس لئے کہ یہ دین کے لئے زہر قاتل ہے۔

مسئلہ: ہم اہل اسلام کی تین عیدیں ہیں۔

☆......عید الافطار اور یہ طبعی عید ہے۔

☆......عید الموت جب کہ خاتمہ ایمان پر ہو بہت بڑی عید ہے۔

☆......عید التجلی آخرت میں تو پھر تمام عیدوں سے بہت بڑی عید ہے۔

حدیث شریف اور مسئلہ: امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں اور اس روایت کی تصحیح بھی فرمائی

حضرت زید بن حارث سے مروی ہے کہ جس نے روزہ دار کو کھانا کھلایا تو اسے روزہ دار کے روزہ کا ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے روزہ میں کمی آئے۔

حکایت: حضرت امام حافظ حماد بن لمہؒ رمضان کی ہر رات میں پچاس آدمیوں کو روزہ افطار کراتے تھے جب عید الفطر کی رات آئی تو پچاس آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ پوشاک عنایت فرمائی اسی لئے انہیں ابدال اولیا میں شمار کیا جاتا ہے۔

حدیث شریف: حضرت امام سیوطی جامع صغیر میں اور امام سخاوی نے مقاصد حسنہ میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا کہ میری امت کے ہر زمانہ میں پچاس برگزیدہ انسان اور چالیس ابدال ہوتے ہیں نہ ان پچاس میں کمی آتی ہے اور نہ ہی ان چالیس میں۔ جب ان میں سے کوئی ایک فوت ہوتا ہے تو اس کے عوض دوسرے کو مقرر کیا جاتا ہے تاکہ تعداد مکمل رہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی حضور ہمیں ان ان کے اعمال سے آگاہ کیجئے۔ آپ نے فرمایا وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو معاف کرتے ہیں اور انہیں جو تکلیف پہنچا تا ہے تو وہ ان کے ساتھ احسان کرتے اور اسی پر راضی ہوتے ہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوتا ہے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ جس نے بھوکے کو کھانا کھلایا اور ننگے کو کپڑا پہنایا اور مسافر کو پناہ دی تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی تکالیف سے محفوظ رکھے گا۔

حکایت: حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ فقراء اور طلبائے اسلام پر ہر سال لاکھ درہم خرچ فرماتے اور حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے فرماتے اگر تم لوگ نہ ہوتے تو میں کبھی تجارت نہ کرتا اور ساتھ ہی انہیں یہ فرماتے اے طالب علمو! دنیا کے کسی معاملہ میں مشغول نہ ہونا صرف طلب علم میں بسر کرو تاکہ تمہاری ضروریات پورا کرنے میں کافی ہوں۔

حکایت: حضرت یحیٰ برمکی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ پر ہر ماہ ہزار درہم خرچ کرتے اور حضرت یحیٰ برمکی کے لئے حضرت سفیان سر سجدہ میں رکھ کر یوں دُعا کرتے اے اللہ تعالیٰ یحیٰ نے دنیا میں میری

ضروریات کا ذمہ اٹھایا ہے تو آخرت میں اسے اپنے ذمہ لے لے۔ جب یحییٰ برمکی کا انتقال ہوا تو انہیں بعض دوستوں نے خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیسی گزری انہوں نے کہا حضرت ابوسفیان کی دعا سے میری بخشش ہوگئی۔ حضرت صائب مرحوم نے فرمایا۔

تیرہ روزان جہانرا بچراغے ادریاب   تاپس ازمرگ تراشمع مزارے باشد

ترجمہ: ان کمزور لوگوں کو تاریکیوں میں تلاش کرو جو روزی سے عاجز ہیں ان کی برکت سے تیری قبر روشن ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی کتاب کے مقتضی اور اپنے خطاب کے مدلول کے مطابق بنائے (آمین)

تفسیر عالمانہ

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ، **ربط:** اس مضمون کا سابق سے ربط یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ماہ رمضان کے روزے رکھنے اور اس کی گنتی کی حفاظت کا حکم فرمایا اور ساتھ اس کی راتوں کے جاگنے اور ان میں عبادت کرنے کی ترغیب فرمائی کہ ان ایام میں بندے اس کی عظمت و بڑائی بیان کریں اور اس کا شکر ادا کریں تو اس کے بعد اس آیت کو ذکر کیا تا کہ بندوں کو معلوم ہو کہ رب تعالیٰ ان کے حالات سے باخبر اور ان کے ذکر و شکر پر مطلع اور ان کی باتوں کو سنتا ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرتا اور ان کے اعمال کی انہیں جزا دینے والا ہے۔

شان نزول: اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ حضور سرور عالم ﷺ سے ایک عربی نے سوال کیا کیا ہمارا رب تمہارے قریب ہے تا کہ ہم اس سے مناجات کریں یا بعید ہے تا کہ اسے پکار کر معروضات پیش کریں اس کے جواب میں فرمایا کہ مجھ سے میرے بندے جب بھی کوئی بات عرض کرتے ہیں تو میں ان کے سوال کی اجابت بہت جلد کرتا ہوں۔

فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اے پیارے حبیب ﷺ میرے ان بندوں کو فرما دیجئے کہ میں تمہیں علم کے لحاظ سے قریب اور محیط ہوں۔

ف: اس میں اللہ تعالیٰ کے علمی کمال کی تمثیل ہے کہ وہ کریم بندوں کے تمام افعال و اقوال کو جانتا ہے اور ان کے تمام احوال پر مطلع ہے جیسے کوئی کسی کے قرب مکانی کے لحاظ سے قریب ہوتا ہے۔

ف: اس اعتبار سے قرب کا لفظ استعارہ تبعیہ تمثیلیہ ہوگا۔

سوال: یہاں پر قرب حقیقی یعنی قرب مکانی کیوں مراد نہیں لیا جاتا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے قرب مکانی ممتنع ہے کیونکہ اگر وہ کسی مکان میں ہو تو پھر وہ سب کے ساتھ قریب نہ ہو گا اس لئے کہ اگر وہ عرش کے حاملین کے قریب ہو گا تو اہل زمین سے بعید ہو گا اور اہل مشرق کے قریب ہو گا تو اہل مغرب سے بعید ہو گا اسی طرح بر عکس۔

حدیث: حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اپنی آوازوں کو پست کرو اس لئے کہ تم کسی بہرے اور غیب کو نہیں پکار رہے بلکہ جسے تم پکارتے ہو وہ تو سمیع اور قریب اور تمہارے ساتھ ہے۔

مسئلہ: یہ باعتبار مشارب مقامات کے ہے ورنہ اہل غفلت کے لئے تو ذکر بالجہر مناسب ہے تا کہ دل کا نشہ دور ہو اور حضور قلب کے لئے ذکر خفی مناسب حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

دوست یک نزدیکتر از من بمن ‌ ‌ ‌ ‌ ویں عجب تر کہ من از وے دورم

ترجمہ: دوست تو میرے نزدیک تر ہے لیکن افسوس کہ میں اس سے دور ہوں۔

اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ دُعا مانگنے والا جب مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

ف: اس میں قرب مجازی کی تقریر ہے یعنی جہاں اللہ تعالیٰ کے لئے کیف قرب کو قرب مکانی سے تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ علم معانی میں ہے کہ مستعار منہ کے مناسبات کو مستعار لہ کے لئے ثابت کرنا جس سے استعارہ کی ترشح بلکہ اس مستعارہ کو ثابت کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

مسئلہ: اس آیت میں دُعا مانگنے والے کو اجابت دُعا کا وعدہ ہے۔

سوال: ہم نے بہت سے دُعا مانگنے والوں کو دیکھا کہ باوجود یہ کہ دُعا میں عجز و انکسار کرتے ہیں لیکن ان کی دُعا قبول نہیں ہوتی۔

جواب: یہ آیت مطلق ہے اور دوسری جگہ مقید اور قاعدہ ہے کہ مطلق مقید پر محمول ہوتا ہے چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ اب آیت کا معنی یوں ہوا کہ میں بندے کی دُعا قبول کرتا ہوں اگر چاہوں ورنہ نہیں۔

دُعا کی شرائط: دُعا کی قبولیت کے لئے چند شرطیں ہیں۔

۱۔ مشیت ایزدی ۲۔ قضاء وقدر کی موافقت ۳۔ کسی محال بات کا سوال نہ ہو۔ ۴۔ اس کے لئے دُعا کی قبولیت مفید بھی ہو۔

ف : اجابت کا معنی ہے جیسے کوئی مانگے ویسے دینا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا سوال پورا کرتا اس کی دعا قبول کرتا اور مجبور لوگوں کی ضروریات کی کفایت فرما تا ہے۔

فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي بندوں کو چاہئے کہ وہ میری بات کو مانیں یعنی جب میں انہیں ایمان واطاعت کے لئے بلاؤں تو وہ اسے قبول کریں جیسے میں ان کی بات مانتا ہوں جبکہ وہ اپنے مقاصد کے لئے مجھے پکار تے ہیں۔

ف : استجابه و استجاب له و اجابه ایک ہی ہیں یعنی بندے کے سوال کو ختم کر کے اپنے مقصد تک پہنچانا۔ یہ دراصل الجوب سے ہے بمعنی کاٹنا **وَلْيُؤْمِنُوا بِي** ایمان پر ثابت قدم رہنے کا امر ہے حضرت ابن الشیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہا الاستجابته بمعنی الانقیا دو الاسلام اور ایمان قلب کی صفت ہے۔

نکتہ : استجابت کو ایمان پر مقدم کرنے میں اشارہ ہے کہ کورونق ونورانیت نصیب نہیں ہوتی جب تک پہلے طاعات وعبادات ادا نہ کی جائیں۔

نکتہ : اس جملہ کی فا میں اشارہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تیری دُعا قبول کرتا ہوں باوجود یہ کہ بے پرواہ اور غنی ہوں پھر اے میرے بندے تو بھی میرے بلانے پر سر جھکا دے اور میرے کہنے پر چل باوجود یہ کہ ہر لحاظ سے تو میرا محتاج ہے سبحان اللہ کیسا ہی کرم ہے اس کریم کا کہ اپنے بندے کو اپنے پاس کیسے محبت اور پیار سے بلاتا ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ انہیں رشد کی امید میں رہنا چاہئے رشد بمعنی ہدایت پانا دنیا کی مصالح ہوں یا آخرت کی اب آیت کا معنی یوں ہوگا کہ بے شک انہوں نے جب اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کیا اور ایمان لائے دین دنیا کے مصالح سے ہدایت پا گئے کیونکہ ہدایت پانے والے کے یہی علامات ہیں۔

مسئلہ : دکھ کو ٹالنے کے لئے دعا مانگنا مذموم ہے اہل شریعت بھی یہی کہتے ہیں اور اہل طریقت بھی کیونکہ دُعا نہ مانگنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مقابلہ کرنے کے مترادف اور دکھ درد کو سر پر رکھنے کا دعویٰ کرنا مثنوی شریف میں ہے۔

تا فرود آید بلا بے دافع چوں بنا شد واز تفرع شافع

ترجمہ: دافع کے بعد بلائل جائے جب زاری جیسا شافع نہ ہو۔

مسئلہ: عوام اور مبتدی الکون کو اسباب کی تلاش ضروری ہے اور اوسط درجہ کے سالکوں کو توکل مناسب ہے اور کاملین کے احوال کی تو کوئی انتہا نہیں ان کے لئے اسباب اور توکل برابر ہیں۔

حکایت: مروی ہے کہ سیدنا ابراہیم علی نبینا علیہ السلام کو جب نار میں ڈالا جا رہا تھا حضرت جبریل علیہ السلام ان کو ہوا میں اُڑتے ہوئے یعنی آگ میں پہنچنے سے پہلے ملاقی ہوئے اور عرض کی حضرت کوئی ضرورت ہو تو فرمایئے آپ نے فرمایا تمہارے ہاں مجھے ضرورت نہیں ہے جبریل علیہ السلام نے عرض کی تو اللہ تعالیٰ سے عرض کیجئے آپ نے فرمایا وہ میرے سوال کو جانتا ہے میں اسے کیوں عرض کروں۔

ف: دراصل یہ مقام کامل و مکمل حضرات کا ہے جو انانیت سے فارغ ہیں بلکہ وجود کے متعلقات سے بھی جدا یعنی ہر حال میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہیں اے سالک ذرا غور کر تو کس حال میں ہے تجھے اللہ تعالیٰ سے عفو اور مغفرت مانگنی چاہیے۔

حدیث شریف: حضور نبی اکرم ﷺ لوگوں کو ان کے اپنے مراتب کی مقدار کے مطابق گفتگو فرماتے ہیں اس لئے اعرابی سے فرمایا۔

حدیث شریف: ایک اعرابی حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اپنے اُونٹ کو باندھے بغیر حاضر ہوا صرف اس خیال سے کہ یہ بھی توکل ہے آپ نے فرمایا اُونٹ کو باندھو اور اس کے بعد اللہ پر توکل کرو۔

شرح الحدیث: اس حدیث میں حضور علیہ الصلوۃ السلام نے اعرابی کو اونٹ کا باندھنا ہی توکل فرمایا جب کہ اس نے اونٹ کو چھوڑ کر چلے آنے کو توکل سمجھا اس پر حضور نبی پاک ﷺ نے اعرابی کو توکل پر برانگیختہ کیا جیسے پرندوں کی حالت ہے کہ وہ توکل کے عامل ہیں اور انہیں روزی کی تنگی نہیں۔

ف: توکل کا یہ معنی ایسے ہے جیسے قضاء وقدر پر تو ایمان ہے لیکن تسکین وتسلی کی نعمت سے محروم ہے۔

ف: اجابت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ایسا وعدہ کرے جس کا خلاف محال ہے۔

حل اشکال: جس نے دُعا مانگی لیکن فوراً اجابت نہ ہوئی تو اس کے چند وجوہ ہوتے ہیں بندے کو یقین رکھنا

چاہیے کہ دُعا قبول تو ضرور ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسے منہ مانگی بات ملے اس لئے کہ منہ مانگی بات کا نام اجابت نہیں اور نہ ہی منہ مانگی بات کو اجابت کہا جاتا ہے بلکہ اجابت اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے جو بندے کے مناسب حال پر اس کا کام کر دیتا ہے۔

ف: اجابت دعا کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ عرض کرے اے میرے رب اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے لبیک۔ حاضر ہوں اے میرے بندے تو کیا کہتا ہے یہ وعدہ مانگنے والے اور ہدایت پانے والے اور توجہ کرنے والے کے لئے ہوتا ہے اور دُعا کی اجابت کا یہی معنی ہے کہ بندے کا مقصد پورا کر دیا جائے اور اسے اس کی مراد تک پہنچایا جائے اور یہ کبھی جلد تر ہوتا ہے اور کبھی دیر بعد اور کبھی آخرت میں۔

ف: کبھی اجابت دُعا یوں ہوتی ہے کہ اس کی مانگی شئے کی بجائے اور شئے عنایت کی جائے اجابت صرف ایک وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔

حدیث شریف: مسلمان کی دُعا صرف چھ وجہوں سے رد ہوتی ہے۔

۱۔ گناہ کی دُعا مانگے ۲۔ یا اس سے قطع رحم لازم آتی ہے۔

۳۔ اس کی دُعا کو اعمال نامہ میں ثواب بنا کر اس کے لئے ذخیرہ بنایا جاتا ہے۔

۴۔ اجابت اللہ تعالیٰ کی مشیت سے مفید ہوتی ہے جیسا کہ گزرا ہے۔

۵۔ اس اجابت کو بندے کے قبول کرنے سے مشروط فرمایا ہے چنانچہ گزرا۔

۶۔ اجابت دُعا کے لئے چند شرائط اور آداب ہیں جو دراصل دُعا کے قبول ہونے کے اسباب ہیں جو انہیں مکمل کرے گا تو وہ اہل اجابت سے ہوگا جو ان میں ایک میں خلل کرے گا تو وہ اہل اعتدا سے ہوگا یعنی حد سے گزرنے والوں سے ہوگا اور نہ ہی وہ جواب کا مستحق ہوگا اور وہ اسباب جو عوام سے متعلق ہوں ان کی تو کوئی حد اور حساب نہیں اور ان کے ذکر میں بہت طوالت ہے یہاں پر انہیں لکھا نہیں جا سکتا اور ان میں بعض خواص سے تعلق رکھتے ہیں جو چند ایک یہ ہیں۔

تزکیہ صفائی: اس لئے کہ دُعا مانگنے والے کیلئے صفائی کا ہونا ضروری ہے دعا مانگنے والے کو چاہیے کہ پہلے اپنے بدن کو صاف کرے یعنی لقمہ حلال سے اصلاح کرے اس لئے کہا کہ دعا آسمان کی کنجی ہے لیکن اس کنجی کے دندانے

لقمہ حلال ہے۔

حدیث شریف: کوئی بہت بڑا لمبا سفر کر کے مسافری میں ہاتھ پھیلا کر اگرچہ بال بکھرتے ہوئے اور غبار آلودہ ہوتے ہوئے عرض کرتا ہے اے میرے رب میرا کام بنا دے لیکن اس کا کھانا پینا اور لباس حرام کا ہوتا ہے اور اس کی غذا حرام کی ہوتی ہے۔ پھر اس کی دُعا قبول کیسے ہو۔

حکایت: کوفہ میں ایک جماعت ایسی تھی جن کی ہر دعا مستجاب ہوتی جب بھی کوئی حاکم کوفہ میں آتا اس کے لئے بددعا کرتے تو وہ ہلاک ہو جاتا حجاج بن یوسف ظالم نے ان کے لے ایک تدبیر کی جب کہ مروان کی طرف سے وہ کوفہ کا حاکم بنا تو ان تمام حضرات کو دعوت دی جب وہ دعوت کھا بیٹھے تو کہا اب میں ان کی بددعا سے محفوظ ہو گیا اس لئے کہ اب ان کے پیٹ میں حرام کا طعام داخل ہو گیا ہے چنانچہ ایسے ہی ہوا۔

سبق: سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو اوصاف بشریہ اور اخلاق ذمیمہ سے پاک وصاف رکھے اس لے کہ دعا کی اجابت کو اوصاف بشریہ وغیرہ روکنے والے ہیں اسی طرح قلب کو بھی تعلقات انسانیہ جو انسانی وروحانی طریق سے متعلق ہوتے ہیں اسے پاک رکھے قلب کو اذکار سے صاف کرے اور اسے اخلاق حمیدہ کے نور سے نورانی بنائے اس لئے کہ یہ اجابت کے اسباب ہیں اور انہیں کے ذریعے سے دُعا بارگاہ الٰہی میں پہنچتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ اور روح کو التفات الی غیر اللہ کی میل وکچیل سے دھوئے تا کہ الطاف ربانی کے نفحات کو حاصل کر سکے اور سر کو شرک کی آلائش سے بچائے بایں طور کہ سر کو دعا کے وقت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ رکھے اور صرف طلب بھی حق کی ہو اور غیر حق کو سر میں جگہ نہ دے۔ تا کہ اس کی دُعا قبول ہو اور خائب خاسر ہو کر نہ لوٹے چنانچہ حدیث قدسی میں ہے خبردار جو مجھے طلب کرتا ہے وہ مجھے ضرور پالے گا اور جو میرے غیر کا طالب ہے وہ مجھے ہرگز نہیں پا سکے گا۔

ف: اللہ تعالیٰ نے اپنی اجابت کا وعدہ کیا ہے جو اسے دُعا سے طلب کرتا ہے چنانچہ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

خلاف طریقت بود کاولیاء　　　تمنا کنند از خدا جز خدا

(**ترجمہ:** یہ خلاف طریقت ہے کہ اولیاء اللہ غیر اللہ کی تمنا کریں)

سبق: جو شخص بھی ان شرائط میں سے کسی ایک کو چھوڑے گا وہ اجابت کو ہرگز نہیں پا سکے گا جیسے ارکان نماز میں سے کی ایک رکن کو چھوڑ دے تو نماز قبول نہیں ہوتی ہاں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے بندے کے ہر نقصان اور کمی پورا کرے تو وہ علیحدہ بات ہے۔

مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا فضل بندے کے اعمال سے مقدم ہے کیونکہ وہ سوال کئے بغیر بھی دیتا ہے سوال کرنے پر تو عطا کرتا ہے۔

ف: دُعا دو اقسام کی ہیں۔ ۱۔ نیت دُعا سے دُعائیہ کلمات کہنا۔ ۲۔ دُعائیہ کلمات صرف زبان سے بولنا جو دُعا کی نیت سے کلمات کہتا ہے تو اس کے لئے تمام آسمانوں کے دروازے کھل جاتے اور اسکی دُعا عرش معلی تک پہنچ جاتی ہے اور صرف دُعائیہ کلمات منہ سے نکلتے رہیں تو وہ دعا آسمانوں تک نہیں پہنچتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت نہ ہو۔

ف: تفسیر فاتحہ میں امام فناری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دعا کے وقت تصور اور حضور قلب کو دعا کی قبولیت میں بڑا اثر ہے خود سرور عالم ﷺ اس پر عمل کرتے اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ عنہ کو اس پر ترغیب دلائی جب کہ انہیں دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا اور وہ دعا یہ ہے اللھم اھدنی و سددنی مجھے راہ ہدایت پر سیدھا چلا اور فرمایا اے علی رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں ہدایت سے ہدایت طریق کا خیال رکھنا اور ایسی راہ کے تصور میں بیٹھے جیسے تیر سیدھا ہوتا ہے۔

ف: اس سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ عنہ کو دعا کے وقت ان دونوں باتوں کی خصوصی ہدایت فرمائی۔

نکتہ: انبیاء مرسلین اور اولیاء کاملین اور پھر ان جیسے اور بزرگوں کی دعاؤں کی قبولیت میں یہی راز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دعا مانگتے وقت توجہ خاص اور ندا کا ہونا شرط اولین ہے جس نے دعا کے وقت خصوصی توجہ رکھی اور دعا کے وقت اس کا نگاہ اولین و آخرین کے طریقوں پر لگی ہو۔ خصوصاً اس وقت دعا مانگے جب اسے دعا مانگنے کا حکم ہے تو بفضلہ تعالیٰ اس کی دعا قبول ہو جائے گی اور جو شخص بلاتے وقت ارادہ تو زید کا رکھتا ہے لیکن گفتگو دوسرے سے کرے اس کا مقصد حاصل نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو ملامت کرے جب کہ اللہ کو دعا کی اجابت کے طریق سے نہ

پکارے وہ اس وجہ سے کہ اسکا یہ خیال اس کے تصورات کے صفات سے پیدا ہوا ہے جو اس کی حالت پر غالب ہو گیا ہے۔ یاد رہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے میں اگرچہ خطا کر رہا ہے تو اسے بھی کسی ایک وجہ سے فائدہ حاصل ہو گا۔ مجتہد مخطی کو اجر و ثواب ملتا ہے اسے محروم نہیں رکھا جاتا۔

حدیث شریف: رسالہ قشیری میں لکھتے ہیں کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس بندے سے محبت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کو فرماتا ہے کہ اے جبرئیل علیہ السلام میرے بندے کی ضرورت کو چند دن کے لئے تاخیر کی جائے کیونکہ مجھے بندے کی دعا پیاری لگتی ہے اور جس بندے سے غصہ ہو تو اس کے لئے جبرئیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے جبرئیل علیہ السلام جلدی پوری کر دو اس کی آواز مجھے پسند نہیں ہے۔

حکایت: بغداد میں ایک وقت سخت قحط واقع ہوا تو بادشاہ نے صرف اہل اسلام کو استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ حکم سے تمام مسلمان شہر سے نکل کر استسقاء کی دعائیں پڑھتے رہے لیکن بارش نہ ہوئی اس کے بعد بادشاہ نے صرف یہود کو حکم دیا کہ اب وہ بارش کے لئے دعا کریں چنانچہ جب یہودیوں نے دعا کی تو بارش ہوگئی اس سے بادشاہ حیران ہو گیا علما کرام کو بلا کر اس کے متعلق پوچھا کہ ماجرا کیا ہے مسلمان دعا مانگیں تو قبول نہ ہو اور یہود مانگیں تو فوراً قبول ہو جائے۔ یہ عقدہ علماء سے حل نہ ہو سکا۔ حضرت سہیل بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور فرمایا اے بادشاہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کی وجہ سے ہم مسلمانوں سے محبت کرتا ہے اور اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں راہ ہدایت بخشی وہ ہماری دعا مانگنے اور تضرع وزاری سے پیار رکھتا ہے اسی لئے ہمارے دینے میں تاخیر فرماتا ہے اور چونکہ یہودیوں سے ناراض ہے اور ان پر اس کی لعنت برتی ہے اس لئے ان کی دعا مانگنے پر انہیں دینے میں جلدی کرتا اور دروازے سے ہٹاتا ہے۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے فرمایا دنیا کا نظام چار چیزوں پر ہے۔

۱۔ علماء کرام کے علم پر۔

۲۔ بادشاہوں کے انصاف پر۔

۳۔ دولت مند کی سخاوت پر۔

۴۔ فقرا کی دعاؤں پر بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگے اس کے اسماء الحسنیٰ کے صدقے سے اوراد عیہ ماثورہ کی برکت سے اور وہ ادعیہ ماثورہ جو نیک لوگوں سے منقول ہیں اور لائق ہے کہ اپنی دعا میں انبیاء واولیاء وصالحین کو وسیلہ بنائے۔ دعا کے لئے چند ایسے مقامات ہیں جہاں قبولیت یقینی ہے۔

☆......کعبۃ اللہ ☆...مساجد ثلاثہ یعنی بیت اللہ۔ بیت المقدس۔ مسجد نبوی کو دیکھتے وقت۔☆......سورہ انعام کے جلالتین کے مابین ☆......طواف میں ☆......ملتزم کے وقت ☆......بیت اللہ کے اندر ☆......زمزم کے نزدیک ☆......زمزم کا پانی پیتے وقت ☆......صفا پر ☆......مروہ پر ☆......سعی میں ☆......مقام ابرہیم کے پیچھے ☆......عرفات میں ☆......مزدلفہ میں ☆......منیٰ میں ☆......تینوں دن کنکریوں کو پھینکتے وقت ☆......حضرات انبیاء کرام علی نبینا علیھم الصلوۃ و السلام کے مزارات کے نزدیک۔

ف: بعض نے کہا سوائے ہمارے نبی کریم ﷺ کے مزار کے باقی کسی نبی علیہ السلام کے مزار کے نزدیک دعا مانگنا صحیح نہیں یہ قول ضعیف ہے۔

ف: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مزار کعبہ کی چار دیواری کے اندر ہے لیکن یقین نہیں۔

اولیاء کرام کی مزارات پر دعا مستجاب ہوتی ہے۔ اہل اللہ کے نزدیک چند شرائط ادا کرنے پر اولیاء اللہ کے مزارات پر دعا یقیناً مستجاب ہوتی ہے اور وہ شرائط صرف اللہ والے جانتے ہیں اللھم افض علینا من برکات الصالحین (اے اللہ ہمارے اوپر نیک لوگوں کی برکات نازل فرما)

تفسیر عالمانہ

اُحِلَّ لَكُمْ

سوال: فاعل کے قائم مقام پر ظرف کی تقدیم کیوں؟

جواب: شوق دلانے کی وجہ سے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس چیز کا ذکر پہلے کرتا تھا اسے موخر کیا جائے تو نفس ان کے لئے منتظر اور شائق رہتا ہے پھر اس کا ذکر آتا ہے تو دل پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے یعنی تمہارے لئے حلال یعنی مباح کیا گیا ہے۔

لَيْلَةَ الصِّيَامِ روزے کی رات میں یہ وہ رات ہے کہ جس کی صبح کو اٹھتے ہی بندہ روزہ دار ہوتا ہے

الرَّفَثُ بمعنی قول فحش اور قبیح بات۔ بولنا اور عرف میں نام ہے اس بات کا جو عورتوں کے سامنے میل وجول وغیرہ کی گفتگو کی جائے پھر کنایہ ہوتا ہے جماع سے کیونکہ جماع نہیں ہوتا مگر تفریح سے کہ جس کے لئے لائق ہوتا ہے کہ اسے الفاظ فاحشہ سے کنایہ کیا جائے۔

ف: حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رفث ایسا جامع کلمہ ہے کہ جو عمل بھی مرد اپنی عورت سے کرے وہی الرَّفَثُ کہلائے گا مثلاً اشارہ یا بوسہ لینا وغیرہ اِلٰى نِسَآئِكُمْ

سوال: رفث تو ہمیشہ جاء سے متعدی ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے رفث بالمراۃ اور یہاں الیٰ کے ساتھ کیوں؟

جواب: رفث الفضاء کو متضمن ہے اور افضاء الی سے متعدی ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ یہاں افضی سے مراد جماع ہے۔

شان نزول: ابتدائے اسلام میں دستور تھا کہ روزہ میں شام کے وقت افطار کا کھانا پینا جماع وغیرہ حرام ہو جاتا جب عشاء کی نماز تک جائز تھا یا جب تک نیند نہ آتی اس کے بعد کھانا پینا جماع وغیرہ حرام ہو جاتا جب عشاء کی نماز پڑھی جاتی یا کوئی سو جاتا تو اس کے بعد اس پر کھانا پینا اور جماع وغیرہ آئندہ شام تک حرام ہو جاتا۔

ایک روز سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ نے نماز عشاء کے بعد اپنی عورت سے جماع کر لیا جب غسل کیا تو رونے لگے اور اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے حضور سرور عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ تعالیٰ کی طرف معذرت کرتا ہوں اور اپنے گناہ کی معافی چاہتا ہوں اس لئے کہ میں عشاء کی نماز کے بعد گھر گیا تو میں نے اپنی عورت کو دیکھا اس سے ایک عجیب خوشبو صادر ہوئی مجھ سے رہا نہ گیا آخر جماع ہو گیا حضور علیہ السلام نے فرمایا اے عمر یہ بات تیرے لائق نہ تھی اور اس پر چند آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسی غلطی کا اعتراف کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

نکتہ: حضرت عمرؓ کی یہ غلطی تمام اُمت کے لئے رحمت بن گئی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ یہ نیا جملہ ہے اس میں اپنی عورتوں کے ساتھ میل جول کی حلت کا سبب بیان کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ میل جول رکھ کر اور اکٹھے رہ کر بچ جانا بہت مشکل ہے۔

سوال: عورت مرد کا اور مرد عورت کا لباس کیوں؟

جواب۱: گاہے دونوں بوقت نیند ننگے ہو کر اور گلے لگا کر سوتے ہیں۔

جواب ۲: یا بوقت جماع ایک دوسرے پر مشتمل ہونے کی وجہ سے

جواب ۳: یا اس لئے کہ ایک دوسرے کا حال چھپانے

جواب ۴: یا اس لئے کہ ایک دوسرے کو غلط کاری سے بچاتے اور ایسی خرابیوں سے ایک دوسرے کو محفوظ رکھتے ہیں کہ جن کا صدور ان سے نامناسب ہے۔

حدیث شریف: جس نے نکاح بیاہ وغیرہ کر لیا اس نے اپنے دین کا دو تہائی حصہ بچا لیا۔

جواب بطرز دیگر: آیت کا مطلب یہ ہے تم اپنی عورتوں کا سکون ہو اور وہ تمہارا سکون ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اور یہ بھی مشاہدہ ہے کہ جتنا مرد عورت کو آپس میں سکون ملتا ہے ایسے کسی اور شئے سے نہیں سکون نصیب ہوتا بشرطیکہ ان کی آپس میں محبت اور سلوک اچھا ہو ورنہ پناہ بخدا۔

عَلِمَ اللّٰهُ نے ازل سے جان لیا **اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ** بے شک تم اپنے نفسوں کے ذریعے خیانت کرو گے یعنی اپنے نفسوں کی خیانت کرو گے بامعنی کہ اپنے نفسوں پر ظلم کر کے اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کرتے ہو پھر رمضان کی راتوں میں جماع کر کے اپنے نفس کے ثواب کو گھٹاتے ہو اور **الخیانۃ** امانت کی ضد ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اوامر و نواہی سے نواز کر احسان فرماتا ہے لیکن جب بندے پوشیدگی میں گناہ کرتے ہیں تو وہ گویا اپنے آقا کی خیانت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا **لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ**

حضرت صائب نے فرمایا۔

تراگوہر دل کردہ اند امانتدار روروامانت حق نگاہ دار محتسب

(اے انسان تجھے دل کا گوہر دے کر اللہ تعالیٰ نے اپنا امانت دار بنایا ہے فلہٰذا تم اس امانت کی خوب حفاظت کرو)

فَتَابَ عَلَيْكُمْ اس کا عطف علم پر ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرتا ہے اور جو گناہ تم سے سرزد ہوئے ہیں۔ انہیں معاف فرماتا ہے **وَعَفَا عَنْكُمْ** یعنی گناہ کے نشانات تمہارے سے مٹاتا ہے **فَالْئٰنَ** یعنی اب جب کہ اس کی

حرمت منسوخ ہو چکی یہ ظرف ہے اس کے قول بَاشِرُوْھُنَّ کے الاٰن اصل میں یہ فعل ہے بمعنی حان اب زمانہ حاضر کا نام بن گیا ہے اس کے بعد اس پر الف لام تعریف کا داخل ہونے لگا اور اس کی اصلی فتح اپنے مقام پر باقی رہی والمباشرہ لغت میں چمڑے کو چمڑے سے چمٹانے کو کہتے ہیں اب جماع سے کنایہ ہے چونکہ جماع میں چمڑے سے چمڑے کا چمٹانا لازمی امر ہے۔

ف: اس کے تمام توابع اس میں داخل ہیں۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ کتاب اللہ حدیث رسول اللہ کی ناسخ ہو سکتی ہے جب کہ کھانا پینا و جماع حدیث سے ثابت ہوا اور اگر اس کا ثبوت پہلی شریعتوں سے ہو تو پھر یہ نسخ اس قانون میں داخل نہ ہوگا۔ جیسے بعض کا مذہب ہے۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ اور اسے طلب کرو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اولاد لوح محفوظ میں مقدر فرمائی ہے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ جماع کرتے وقت یہ نیت ہو کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد بنائے اور نسل انسانی میں اضافہ ہو۔

نکتہ: شہوت کی تخلیق اور نکاح کی مشروعیت میں ایک حکمت یہی ہے یعنی اولاد بڑھے اور نسل انسانی میں اضافہ ہو نہ صرف شہوت رانی۔

حدیث شریف: نکاح کر کے نسل انسانی بڑھاؤ اور انسانی افراد کی کثرت کرو تا کہ میں تمہاری وجہ سے قیامت میں امتوں پر فخر کر سکوں۔

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا اس کا عطف بَاشِرُوْھُنَّ پر ہے حَتّٰى يَتَبَيَّنَ یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ تمہارے لئے سفید دھاگہ اس سے مراد وہ سفیدی ہے جو صبح صادق کے آغاز میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ باریک دھاگے کی طرح ابتداء پھیلتی ہے مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ کالے دھاگے سے رات کی وہ سیاہی مراد ہے جو دن کے غروب کے بعد سپیدی میں مل کر آسمان میں پھیل جاتی ہے اس لئے کہ جب صبح صادق کا آغاز ہوتا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا سفید دھاگہ افق آسمان میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں شک نہیں کہ صبح صادق کے وقت رات

کی سیاہی سپیدی میں ملی ہوئی ہوتی ہے ایسے معلوم ہوتا ہے گویا سیاہی سفیدی میں ہے اور سفیدی سیاہی میں اس لئے کہ صبح کا نور رات کی اندھریوں کو چیر کر نکلتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے دو دھاگوں یعنی سفید اور سیاہ دھاگے سے تشبیہ دی ہے مِنَ الْفَجْرِ یعنی صبح کے عمود کا اشتقاق یہ من بیانیہ ہے۔

سوال: الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ کا بیان تو کر دیا الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ کا بیان کیوں نہیں کیا؟

جواب: الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ کے بیان سے ضمن الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ کا بیان بھی ہو گیا اصل عبارت یوں تھی حتی یتبین لکم الخیط الا بیض من الفجر من الخیط الاسود من الیل امور ثلاثہ مذکور یعنی۔ ا۔ مباشرہ ۲۔ اکل ۳۔ شرب کے لئے غایت ہے۔

مسئلہ. جماع کو صبح صادق سے تھوڑا پہلے جائز رکھنے سے ثابت ہو کہ اگر غسل میں تاخیر ہو تو کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ: اس طرح اس شخص کے روزے میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا جو صبح کو جب ہو کر اٹھتا ہے اس لئے کہ جب صبح صادق سے تھوڑا پہلے جماع کرنا جائز رکھا گیا تو پھر اس کے بعد غسل کا موقع بھی نہیں ملے گا لامحالہ ثابت ہوا کہ صبح کے بعد جب کو غسل کرنا جائز ہے ورنہ ایسے شخص کو صبح صادق سے اتنی دیر پہلے جماع کرنا حرام ہو جسے صبح صادق سے پہلے غسل کرنے کا موقعہ نہ ملے اور یہ کلمہ حتی کے استعمال کے خلاف ہے۔

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ یعنی نہار (دن) کے تمام اجزاء میں کھانے پینے اور جماع پس رک جاؤ إِلَى غایت کے لئے ہے اللَّيْلِ یعنی رات کے داخل ہونے کے وقت تک اور سورج کے غروب کے بعد رات شروع ہو جاتی ہے اور تمام بمعنی شئے کو مکمل طور پر ادا کرنا۔

حدیث شریف: میں ہے جب رات آئے اور دن چلا جائے اور سورج پورے طور چھپ جائے تو اب روزہ دار اپنا روزہ افطار کرے۔

نکتہ: رات کے جانے اور دن کے آنے کے سورج کے چھپ جانے میں یہی نکتہ ہے کہ روزہ افطار کرنا ہوگا جب کہ سورج پورے طور پر چھپ جائے تاکہ کوئی گمان نہ کرے کہ سورج غروب ہوا یا نہ۔ سورج کے غروب کے متعلق جب پورا اطمینان ہو جائے پھر روزہ افطار کرے۔

نکتہ: اس کی دوسری وجہ ایک اور بھی ہے وہ یہ کہ کسی وقت وادی میں ہو اور سورج نظر نہیں آتا اسے ضرورت

ہے کہ سورج کے یقینی گم شدگی کی کوئی دلیل ملے اس کے لئے یہی بتایا گیا کہ سورج کے چھپ جانے کا پورا اطمینان کر لے۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے کی نیت دن کو بھی کر سکتے ہیں۔

مسئلہ : صوم وصال کی کراہت بھی یہاں سے معلوم ہوئی پہلے مسئلہ کی وجہ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے صبح صادق تک کھانے پینے جماع کی اجازت بخشی ہے تو روزہ کی نیت اس کے بعد ہوگی اور وہ دن کی گھڑی ہے اب عبارت یوں گی اتموا اثم ابتدو ا ثم بالصوم و اتمو اا لی اللیل یعنی مکمل کر کے پھر روزے کو شروع ہو جاؤ اور اسے رات تک مکمل کرو اس سے نتیجہ نکلا کہ روزے کا حکم فجر کے بعد ہوگا روزہ صرف کھانے پینے سے رک جانے کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ نیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ دوسرے مسئلہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کی غایت رات بتائی ہے اور قاعدہ ہے کہ غایته الشئی مقبططوہ یعنی شئے کی غایت شے کے اختتام پر ہوتی ہے جب روزہ رات کے ابتدائی حصہ میں بتایا گیا تو اس کے بعد روزہ نہ رکھنے کا حکم ہوا یہی ہم کہتے ہیں کہ صوم وصال نہ ہونا چاہیے بعض نے فرمایا کہ رات روزہ کے وجوب کی انتہا کا نام ہے جب رات داخل ہو جائیگی روزے کا وجوب نہیں رہے گا بہر حال رات کی گھڑیوں میں روزہ نہ ہونا چاہیے اس سے یہ ثابت نہیں کہ صوم وصال مکروہ ہے اس لئے ان جیسے اوامر سے یعنی بَاشِرُوْهُنَّ اور کلو او اشربوا اباحته اور رخصت کے لئے ہیں وجوب کے لئے نہیں اس سے صوم وصال کی نفی کا ثبوت نہیں۔

ربط: گمان پڑتا تھا کہ اعتکاف کا حال بھی روزہ کی طرح ہوگا بمعنی کہ مباشرت یعنی اپنی عورت سے جماع دن کو تو حرام ہو لیکن رات کو جائز۔ اس کی وضاحت فرمائی کہ اعتکاف والے کو جس طرح دن کو جماع حرام ہے اس طرح رات کو بھی چنانچہ فرمایا وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ اور عورتوں سے جماع نہ کرو وَاَنْتُمْ جب کہ تم لوگ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ جب کہ تم اعتکاف کی نیت سے مساجد میں ٹھہرے ہوئے ہو۔

مسئلہ: اعتکاف شریعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے تقرب کے لئے مسجد میں ٹھہرنے کو کہتے ہیں اور یہ شرائع قدیمہ سے ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ

شان نزول: یہ آیت اس شخص کے حق میں نازل ہوئی جو مسجد میں اعتکاف بیٹھتا لیکن جب اسے جماع کی

خواہش ہوتی تو مسجد سے نکل کر اپنی عورت سے جماع کر لیتا ہے اور غسل کر کے مسجد میں لوٹتا اس آیت کے بعد مسلمان اعتکاف کی حالت میں جماع سے رو کے گئے۔

مسئلہ: معتکف پر جماع حرام ہے بلکہ جماع سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: لفظ مساجد سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسجد میں اعتکاف بیٹھنا جائز ہے لیکن جامع مسجد میں افضل ہے تا کہ اسے جمعہ کے لئے کہیں جانا نہ پڑے۔

مسئلہ: اعتکاف افضل الاعمال ہے جب کہ خالص نیت سے ہو اس لئے کہ اس میں قلب ماسوی اللہ سے فارغ ہو جاتا ہے۔

نکتہ: حضرت عطاء رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں معتکف اس شخص کی طرح ہے جسے کسی سے کوئی کام نہ ہو اور وہ جا کر اس کے دروازے پر بیٹھ جائے اور کہے کہ یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک میرا کام پورا نہ ہو اسی طرح معتکف بھی اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہے اے الہ العالمین میں تیرے دروازے سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میرے گناہ بخش نہ دیئے جائیں۔

حدیث شریف: میں ہے کہ جو شخص کسی بھائی کے کام کے لئے جاتا ہے گویا وہ بیس سال اعتکاف بیٹھا رہا یعنی بیس سالہ اعتکاف کا ثواب ملے گا۔

فضائل اعتکاف: ☆...... جو شخص صرف ایک دن اعتکاف بیٹھا ہے اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں حائل کی جائیں گی ہر خندق کے درمیان کی مسافت ایسی ہے جیسے مشرق و مغرب کے مابین کی مسافت۔

☆......لوگوں سے تنہائی میں اور خلوت میں رہنے کے بڑے فوائد ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے لوگوں کے غلط رویوں سے بچ جاتا ہے اور لوگ اس سے۔☆...... نفس کشی نصیب ہوتی ہے۔☆......دنیا سے اعراض کا سبق ملتا ہے۔☆......اعتکاف طریق صدق اور اخلاص کا پہلا باب ہے۔☆......اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا قرب حاصل ہوتا ہے۔☆......توکل علی اللہ۔۸۔قناعت پر راضی رہنا نصیب ہوتا ہے قاعدہ جو شخص لوگوں سے میل جول رکھتا ہے وہ معشیت میں تکلف کا شکار ہو جاتا ہے اسے پھر حرام و حلال کی تمیز نہیں رہتی جس کی وجہ سے ہلاکت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔☆......تنہا رہنے والا لوگوں کے لڑائی جھگڑے سے بچ جاتا ہے۔

☆...... بہت بڑے گناہوں میں مبتلا نہیں ہوتا جو کہ عام طور پر لوگوں کے اختلاط سے صادر ہوتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ حضرت الشیخ الشہیر بافتادہ آفندی قدس سرہ نے فرمایا کہ اس امر سے بچ جانا جس میں حرام معمولی سا اشباہ ہو اور زبان کو لغویات سے روکنا اور لوگوں کے میل جول سے دور رہنا اسے ہم تصوف کہتے ہیں چلہ کشی میں بھی یہی بات ہوتی ہے کہ کثرت کے تخیلات سے ہٹ کر وحدت میں محو ہو جانا اور خلوت کا مقصد عظیم بھی یہی بات ہے اور کثرت میں ان باتوں کا حصول تو اعلیٰ درجہ ہے اس لئے کہ جو بھی خلوت میں ہوتا ہے لوگوں کے میل جول سے بچ جاتا ہے لیکن ان کی خدمات سے محروم ہوتا ہے ہم تو حضور نبی اکرم ﷺ کے طریقے پر ہیں اور ان کے صحابہ کرامؓ کا بھی یہی طریقہ تھا اسی لئے حضور نبی کریم ﷺ نے کسی چلہ کشی کا طریقہ متعین نہیں فرمایا بلکہ آپ کا طریقہ یہی تھا کہ رمضان المبارک کے آخری دس دن اعتکاف میں گزارتے ہاں یہ چلہ کشی کا طریقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا۔ چلہ کشی کرنے والوں نے اپنے طریقے کا استدلال اسی آیت سے کیا ہے۔ (ذافی و اقعات الھدای قدس مرہ)

تفسیر عالمانہ تِلْكَ یہ احکام آیت صیام سے لے کر یہاں تک مذکور ہوئے حُدُوْدُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں۔

ف: حُدُوْد حد کی جمع ہے دو چیزوں کے درمیان کی آڑ کو حد کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اپنے احکام حدود مشروع فرمائے تا کہ وہ حق و باطل کے درمیان آڑیں بنیں اور اس لئے کہ ان کی حدود کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت اور ان حدود سے تجاوز کرنے سے بچ جائے۔

فَلَا تَقْرَبُوْهَا پس ان حدود کے قریب بھی نہ جاؤ نہ یہ کہ ان سے آگے تجاوز کر جاؤ۔

ف: بندے کو اس آڑ (جو حق و باطل کے درمیان واقع ہے) کے قریب پھٹکنے سے روک دیا تا کہ باطل سے دور رہے نہ یہ کہ ان حدود سے آگے قدم رکھے۔

حدیث شریف: میں ہے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر شئے کی آڑ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی آڑ کا مطلب یہ ہے کہ اسکے روکے ہوئے امور کے قریب نہ جائے جو شخص بھی اس آڑ کے قریب پھٹکتا ہے پھر لامحالہ وہ اس کے اندر چلا جاتا ہے فَلَا تَقْرَبُوْهَا، فَلَا تَقْرَبُوْهَا سے زیادہ مبالغہ ہے۔

ربط: جب اللہ تعالیٰ نے ان مختصر الفاظ میں روزے کے مکمل احکام بیان فرمائے اور یہ بیان کافی وافی ہے تو اس کے بعد فرمایا کَذٰلِكَ اس طرح یعنی ایسا بیان جسے تم نے پڑھا اور سنا جو کہ وافی اور واضح ہے۔

ف: یہ کاف محل نصب میں ہے اس اعتبار سے کہ مصدر محذوف کی صفت واضح ہوئی ہے۔

یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ اللہ تعالیٰ اپنی آیات لوگوں کو بیان فرماتا ہے۔

ف: آیات دین کے دلائل اور احکام کے نصوص کو کہا جاتا ہے بیان کی عظمت ظاہر کرنے سے بندوں کو ہدایت دینا اور ان پر رحمت کرنا مقصود ہے۔ تقوی کے تین مرتبے ہیں۔

۱۔ شرک سے بچنا ۲۔ معاصی وسیات سے ۳۔ شہوات سے بچنا۔ اس کے بعد پھر فضول باتوں سے بچنے کی کوشش کرے۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے اوامر کی مخالفت سے ڈرو۔

حدیث شریف: میں ہے کہ بندہ متقین کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ معمولی فضول بات سے نہ بچے اس خوف سے کہ کہیں کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔

سیدنا شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ترا آنکہ چشم ودہاں داد و گوش اگر عاقلی در خلافش مکوش

چو پاک آفریدت بہش باش و پاک کہ ننگ است ناپاک رفتن بخاک

(**ترجمہ:** تجھے جب تک اللہ تعالیٰ نے آنکھ منہ اور کان عطا فرمائے ہیں اگر تم عاقل ہو تو اس کے خلاف کوشش مت کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہوش کے ساتھ اور پاک پیدا فرمایا تو نہایت شرم کی بات ہے کہ تم ناپاک ہو کر قبر میں جاؤ)

یعنی ان حدود تک رک جاؤ۔

مرو زیر بار گنہ اے پسر حمال عاجز بود در سفر

مکن عمر ضائع بافسوس وحیف کہ فرصت عزیز است والوقت سیف

(**ترجمہ:** قبر میں گناہوں کا بوجھ اٹھا کر مت جا اس لئے کہ بوجھ اٹھانے والے سفر میں تنگ ہو جاتے ہیں افسوس وحیف کے ساتھ)

عمر ضائع نہ کرو فرصت کو عزیز سمجھو اس لئے کہ وقت تلوار کی طرح تمہاری زندگی کاٹتا جارہا ہے۔ اللہ ہم سب کو اہل یقظہ و یقین سے بنائے آمین۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اور آپس میں باطل سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ یعنی آپس میں ایک دوسرے کا اس طریقے سے مال نہ کھاؤ کہ جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی اور نہ ہی اس طریق سے مباح فرمایا جیسے۔☆......غصب کرکے ☆......چھین کر ☆......چوری کرکے ☆...... جھوٹی قسم کھا کر ☆...... قماری بازی کے ذریعے سے ☆......رشوت لے کر ☆...... کاہن کے پاس جا کر ☆......سرود بجا کر ☆......نوحہ کرکے ☆......غلط حیلوں سے ☆......اور خیانت کر کے مختلف طریقوں سے اسی طرح سینما وغیرہ کی کمائی اور بلیک وغیرہ کی کمائی وغیرہ وغیرہ۔

ف: بَيْنَكُمْ منصوب علی الظرفیۃ ہے لَا تَاْكُلُوْٓا کے متعلق ہے اب معنی یوں ہوا کہ ایک دوسرے کو لینا دینا صرف ایک دوسرے کو کھانے کے لئے ہو۔

مسئلہ: آیت میں صرف کھانے کی اشیاء مراد نہیں بلکہ اسباب باطلہ کے ذریعے سے جتنے معاملات ہوں سب حرام ہیں اسے کھانا عرف عام میں بولا جاتا ہے لیکن اس سے ہر قسم کے تصرفات مراد ہوتے ہیں علاوہ ازیں ان امور میں مقصود اعظم کھانا ہوتا ہے اس لئے اس کا نام لیا گیا۔

بِالْبَاطِلِ بھی فعل مذکور کے متعلق ہے لَا تَاْكُلُوْٓا کے یعنی اموال کے باطل کے سبب نہ کھاؤ۔

شان نزول: ان دو شخصوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی جن کا آپس میں زمین کا جھگڑا تھا ان دونوں کو خیال ہوا کہ جھوٹی قسم کھا کر زمین پر قابض ہو جائیں چنانچہ دونوں حضور سرور عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے انہیں نصیحت کے طور پر فرمایا کہ سن لو میں تمہاری طرح بشر ہوں میری طرف اللہ تعالیٰ سے وحی آتی ہے تم لوگ میرے پاس فیصلے کے لئے آتے ہو اور تم میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ چالاکی سے حجت قائم کر لیتے ہیں اور میں بھی ان کی حجت پر فیصلہ کر دیتا ہوں اور اس کے ساتھی سے مال لے کر اس کی حجت کے مطابق اس کے قبضہ میں دے دیتا ہوں کیونکہ میں تو ویسے ہی فیصلہ کروں گا جیسے تم سے سنوں گا لیکن یاد رکھو جس کے لئے میں ظاہری طور پر فیصلہ کروں اور حق دوسرے بھائی کا ہو تو پھر

یوں سمجھ لو کہ آگ کا ٹکڑا اسے دے رہا ہوں وہ دونوں حضور نبی کریم ﷺ کی نصیحت سن کر رو پڑے اور ہر ایک کہنے لگا حضور میں اپنی یہ زمین اپنے بھائی کو دینا چاہتا ہوں حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جاؤ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ الٰہی کی حاضری کو سامنے رکھ کر قرعہ اندازی کرلو اس طرح ایک دوسرے کو اپنا حق حلال کرو۔ [1]

حدیث شریف مذکور کے بعض مشکل الفاظ کی تشریح: الحسن الحجتہ اقوام بھا واقدر علیھا من صاحبہ یعنی خصم کی دلیل مان کر مال اس کے قبضہ میں دے دوں اور اس کے ساتھی چھین کر مال کا مالک بنا دوں التوحی قصد الحق یعنی توحی بمعنی حق کا ارادہ کرنا الاستھام، الاقتراع یعنی قرعہ اندازی۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ قاضی کو اپنے علم پر فیصلہ نہ کرنا چاہیے چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے۔

مسئلہ: سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف اموال و مالک تک محدود رکھتے ہیں کہ ظاہر پر فیصلہ کرنا جائز ہے لیکن عقود النکاح اور اس کا فسخ اس سے مستثنیٰ ہوں گے اس کے مکمل مسائل و دلائل فقہ کی کتاب استقصاء میں ہیں۔

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ اور انہیں احکام کی طرف نہ لٹکاؤ اس کا عطف منی عنہ پر ہے یعنی وَلَا تَأْكُلُوا پر اسی وجہ سے یہ ناہیہ مذکورہ کی وجہ سے مجزوم بواسطہ حرف عطف کے اور یہ الادلاء سے ہے بمعنی الالقاء اور ضمیر بھا کی اموال کی طرف لوٹتی ہے ساتھ مقدر کرنے مضاف کے ہے جیسے وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ میں (باء زائدہ) ہے اب معنی یہ ہوا کہ اموال کے معاملات کو نہ لٹکاؤ اور فیصلہ نہ لے جاؤ احکام کی طرف۔

لِتَأْكُلُوا تاکہ تم کھاؤ حکام کی طرف فیصلہ لے جانے سے فَرِيقًا ایک حصہ کو اور بعض اموال سے مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ لوگوں کے مالوں سے گناہ کے سبب سے یہ باسببیہ ہے لِتَأْكُلُوا کے ساتھ متعلق ہے یعنی بسبب اس کے

---

[1] ایسی احادیثوں سے وہابیوں دیوبندیوں نے غلطی کھائی کہ وہ نبی علیہ السلام کو اپنے جیسا بشر سمجھنے لگے حالانکہ حقیقت مسئلہ کی یہ کہ حضور علیہ السلام کی حقیقت بشر نہیں اگرچہ ظاہر میں ہماری طرح بشر ہیں ہمارا اور ان کا اختلاف حقیقت کے متعلق ہے ہم کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کی حقیقت نور ہے اور وہ اسے بشریت کی حقیقت کہتے ہیں۔ مزید تفصیل فقیر کی کتاب نور و بشر میں دیکھئے۔

جو گناہ کو واجب کر دے جسے شہادۃ الزور جھوٹی قسم اور صلح کرانا جب کہ معلوم ہو کہ جسے مال دلایا جا رہا ہے وہ ظالم ہے اور جس سے مال لیا جا رہا ہے وہ حق پر ہے بعض نے اس کا معنی یوں کہا ہے کہ ان کے فیصلے ایسے حکمرانوں کی طرف لے جاؤ جن کا کام ظلم اور رشوت لے کر غلط فیصلہ کی عادت ہو وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ حالانکہ تم جانتے ہو کہ بے شک تم باطل پر ہو۔

مسئلہ: گناہ کو گناہ جانتے ہوئے اس کا ارتکاب بہت زیادہ قبیح ہے اور اسکے مرتکب کو توبیخ زیادہ ضروری ہے۔ **ف**: دنیا میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔

☆...... حلال ☆...... حرام ☆...... مشتبہ

حرام سزا کا مستحق بناتا ہے اور مشتبہ عتاب کا سبب بنتا ہے اور حلال ثواب کا موجب ہوتا ہے۔

حضرت حکیم سنائی فرماتے ہیں۔

ایں جہاں بر مثال مردار است کرگساں اندوں ہزار ہزار

ترجمہ: یہ جہاں مردار کی مثال ہے اس میں بے شمار گدھ ہیں

ایں مرا نزا ہمی زند مخلب وان مریں را ہمی زند منقار

آخر الامر بگذرند ہمہ واز ہمہ باز ماند ایں مردار

ترجمہ: کوئی گدھ اسے چنگل مارتی ہے تو کوئی اسے اپنی چونچ سے کھاتی ہے تمام کھا کر چلی جاتی ہیں لیکن وہ مردار جوں کا توں پڑا ہوتا ہے۔

سبق: دانا کو چاہیے کہ وہ حقوق العباد اور ظلم کے معاملات سے اجتناب کرے۔

حکایت: نوشیرواں جب فوت ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق اکے جنازے کو اٹھا کر گلی کوچوں اور شہر بازار جنگل اور دیہات میں پھرایا گیا اور اعلان ہوتا رہا کہ جس کا کوئی حق نوشیرواں پر ہو تو وہ آ کر شاہی خزانے سے لے باوجود کافی دیر تک اعلانات ہونے کے بعد کوئی ایک بھی نہ آیا کہ جس نے کہا ہو کہ نوشیرواں کے پاس میرا کوئی حق ہے۔

حکایت: حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک مجوسی نے قرضہ دینا تھا آپ اس سے قرضہ وصول

کرنے کے لئے اس کے گھر تشریف لے گئے جب اس کے گھر کے قریب پہنچے تو آپ کے جوتے کو نجاست لگ گئی آپ نے جوتا جھاڑا تو نجاست مجوسی کے مکان کو جا لگی آپ حیران تھے کہ اگر نجاست رہنے دیتا ہوں تو مجوسی کا مکان بدزیب ہوتا ہے اگر نجاست کو کھرچ دوں تو نجاست کے ساتھ مکان کی دیوار کی مٹی بھی ساتھ نکل کر نیچے گرے گی یہ بھی مجوسی کی حق تلفی ہے آپ نے مجوسی کو بلایا مجوسی کی لونڈی آئی آپ نے اسے فرمایا مجوسی کو کہو کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ بلا رہے ہیں مجوسی نے سمجھا شاید قرضہ مانگنے کے لئے تشریف لائے ہیں اسی فکر میں باہر آتے ہیں معذرت کرنے لگا آپ نے فرمایا معذرت چھوڑیے مجھے اس مخمصے سے بچایئے کہ نجاست دیوار کو لگ گئی ہے اسے کیسے پاک کیا جائے مجوسی کے دل پر اس واقعہ کا گہرا اثر ہوا کہنے لگا حضرت میں اپنے دل کو کفر کی نجاست سے پاک کرتا ہوں فوراً کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

سبق: سیدنا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے جب معمولی سے ظلم سے احتراز کیا تو مجوسی کو آپ کے اس نیک عمل کی برکت سے سعادت ابدی نصیب ہوئی ورنہ ہمیشہ کی بے دینی کی خرابی میں رہتا۔

حکایت: ایک نصرانی اپنی عورت کو گدھے پر بٹھا کر کہیں جا رہا تھا مسلمانوں کے گاؤں سے اس کا گذر ہوا تو وہاں کے ایک بے حیا نے گدھے کی دم کاٹ دی جس سے گدھا تڑپنے لگا اور نصرانی کی عورت گر پڑی اور اس بچاری کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ حاملہ تھی اس حادثہ سے اس کا حمل بھی گر گیا نصرانی نے وقت کے قاضی سے فریاد کی قاضی رشوت خور تھا۔ اس نے اسی ظالم مسلمان کو کہا اس نصرانی کا گدھا لے جا جب تک گدھے کی دم اس پیمانہ پر نہ ہوگی گدھے کو تم اپنے پاس رکھو اور عورت کو بھی اپنے قبضہ میں لے لو جب تک حاملہ ہو کر اتنے ماہ کا حمل نہ ہو اور اسی طرح جب تک اس کی عورت کے دونوں ہاتھ صحیح اور درست نہ ہو جائیں نصرانی کو واپس نہ دینا نصرانی نے رو کر کہا مسلمانو! کیا تمہاری شریعت پاک کا یہی حکم ہے نصرانی آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہنے لگا اے اِلٰہ العٰلمین! تو حلیم تو ہے ہی لیکن میرے صبر کا جام چھلک پڑا ہے یہ قاضی کا فیصلہ ہے سراسر ظلم ہے تو ہی فیصلہ فرما اے عاجزوں کو دیکھنے والے اور مظلوموں کی مدد کرنے والے خدا۔ نصرانی کی فریاد آسمان کی چھت کو چیرتی ہوئی بارگاہ حق میں پہنچی اور داد انصاف لائی کہ قاضی رشوت خور کی شکل فوراً گدھے کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔

سبق: اس واقعہ سے دو سبق حاصل ہوئے۔ ا۔ قاضی رشوت خور ظلم کی اعانت کی وجہ سے ایک بڑے عذاب

میں مبتلا ہوا۔ ۲۔ ظلم سے بچنا ضروری ہے اگر چہ مظلوم کا ر ہو کیونکہ کافر کی دعا بھی کبھی قبول ہو جاتی ہے۔

تفسیر عالمانہ آیت میں اشارہ ہے کہ اموال اقوام نفس کی مصالح کی خاطر پیدا کئے گئے ہیں اور نفوس کو مراسم عبودیت کی ادائیگی کیلئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ تا کہ معلوم ہو جائے کہ اموال ونفوس صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی تصرف نہیں کر سکتا وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ خواہش نفسانی اور حرص وشہوت اور غفلت میں پھنس کر اموال نہ کھاؤ ہاں حق اور قناعت اور تقویت علی الطاعة اور قیام بالعبودیت کو مدنظر رکھ کر کھاؤ۔

وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ یہاں پر حکام سے مراد نفس امارہ ہے لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ تا کہ ایک حصہ اموال سے کھاؤ اور وہ اموال جو عبادت کی استعانت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں بِالْاِثْمِ سے دنیا کا پھنس، پھنساؤ اور غفلت مراد ہے یعنی اموال کو گناہ پر مدد دینے کی خاطر نہ کھاؤ جیسے حیوانات اور بہائم نری غفلت میں رہتے ہیں تم ان کی طرح نہ ہو جاؤ اگر ایسا طریقہ کرو گے تو پھر تمہارا ٹھکانا اور رہنا سہنا جہنم میں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور کھانے پینے میں ایسے مست نہ ہو جاؤ جیسے جانور کھانے پینے میں مست ہیں وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کے انجام کو جانتے ہوئے بھی لاعلمی میں گزار رہے ہو۔ (کذافی التاویلات النجیمه)

اس کا انجام برا نکلے گا انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے لئے آخرت کیلئے نیک انجام کا ہر وقت خیال رکھے بلکہ میرا تو مسلمانوں بھائیوں کو یہی مشورہ ہے کہ اس آرزو میں مست ہوتے رہو کہ مرنے کے بعد مصطفیٰ ﷺ کا دیدار نصیب ہو صحابہ کرام کا یہی مشغلہ تھا صرف دو واقع ملاحظ ہوں۔

۱۔ حضرت خالد بن صفوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کام کاج سے فارغ ہو کر بستر پر سونے کے لئے آتے تو (ان کا وظیفہ یہ تھا) حضور ﷺ اور آپ کے مہاجر وانصار صحابہ کا نام لے لے کر ان کی یاد میں روتے اور کہتے میرا سب کچھ وہی ہیں میرا دل (ہمہ وقت) انہی کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے لیکن ہجر وفراق کی گھڑیاں لمبی ہوتی جارہی ہیں اے میرے رب میری روح کو جلد قبض فرما لے (تا کہ میں ان سے جاملوں) انہی حسین یادوں میں محویت کے عالم میں سسکیاں لیتے لیتے سو جاتے۔

۲۔ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے

میں مروی ہے ایک رات آپ نے ایک گھر میں دیکھا کہ چراغ جل رہا ہے اور ایک بوڑھی خاتون اون کاتتے اشعار پڑھ رہی ہے۔ محمد پر اللہ کے تمام ماننے والوں کی طرف سے سلام ہو اور آپ کے تمام متعلقین کی طرف سے بھی آپ ﷺ راتوں کو اللہ کی یاد میں کثیر قیام اور سحری کے وقت آنسو بہانے والے تھے۔ ہائے افسوس اسباب موت متعدد ہیں کاش مجھے یقین ہو جائے کہ روز قیامت مجھے آقا ﷺ کا قرب نصیب ہو سکے۔ یہ اشعار سن کر حضرت فاروق اعظم کو اپنے آقا کی یاد شدت سے آئی جس پر وہ زار و قطار روئے اور دروازے پر دستک دی۔

خاتون نے پوچھا کون ہے۔ آپ نے کہا عمر بن الخطاب خاتون نے کہا رات کے ان اوقات میں عمر کو یہاں کیا کام؟ آپ نے فرمایا اللہ تجھے جزا و خیر دے دروازہ کھولا اور آپ کے پاس بیٹھ گئے اور کہ کہ جو اشعار تو پڑھ رہی تھی ان کو دوبارہ پڑھ اس نے جب دوبارہ اشعار پڑھے تو آپ خوب روئے۔ (اویسی غفرلہ)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا

تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں تم فرما دو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے اور یہ کچھ بھلائی نہیں کہ گھروں میں

الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا

پچھیت توڑ کر آؤ ہاں بھلائی تو پرہیز گاری ہے اور گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ

اس امید پر کہ فلاح پاؤ۔ اور اللہ کی راہ میں لڑو ان سے جو تم لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ

اللہ پسند نہیں رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو۔ اور کافروں کی جہاں پاؤ مارو اور انہیں نکال دو جہاں سے

مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ

انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور ان کا فساد تو قتل سے بھی سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو

الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ

جب تک وہ تم سے وہاں نہ لڑیں اور اگر تم سے لڑیں تو انہیں قتل کرو کافروں کی یہی سزا ہے

الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ

پھر اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ

فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹۳﴾

باقی نہ رہے اور ایک اللہ کی پوجا ہو پھر اگر وہ باز آئیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ

ماہ حرام کے بدلے ماہ حرام اور ادب کے بدلے ادب ہے جو تم پر زیادتی کرے اس پر زیادتی کرو

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ

اتنی ہی جتنی اس نے کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو

وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ

اور بھلائی والے ہو جاؤ بیشک بھلائی والے اللہ کے محبوب ہیں۔ اور حج اور عمرہ اللہ کے لئے پورا کرو پھر

اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ

اگر تم روکے جاؤ تو قربانی بھیجو جو میسر آئے اور اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی

الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ

اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے پھر جو تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہے تو بدلہ دے

مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۫ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى

روزے یا خیرات یا قربانی پھر جب تم اطمینان سے ہو تو جو حج سے عمرہ ملانے کا فائدہ اٹھائے

الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ

اس پر قربانی ہے جیسی میسر آئے پھر جسے مقدور نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے

سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي

اور سات جب اپنے گھر پلٹ کر جاؤ یہ پورے دس ہوئے یہ حکم اس کے لئے ہے جو مکہ کا رہنے والا نہ ہو

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے

ع ۸

تفسیر عالمانہ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ [ا] شان نزول: معاذ بن جبل انصاری اور ثعلبہ بن غنم انصاری نے عرض کیا! یا رسول اللہ ﷺ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی کیا وجہ ہے کہ پہلے دھاگے کی طرح ہوتا ہے پھر بڑھتا ہوا مکمل ہو کر گھٹنے لگ جاتا ہے یہاں تک کہ آخر میں اس طرح کا ہو جاتا ہے جیسے پہلی شب کا تھا ایک ہی حالت پر کیوں نہیں رہتا اللہ تعالیٰ نے یہی آیت اتاری کہ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں۔

حل لغات: اَهِلَّةِ ہلال کی جمع ہے ہلال بمعنی پہلی رات سے تیسری رات تک چاند کی روشنی۔

سوال: ہلال کو ہلال کیوں کہتے ہیں؟

جواب: چونکہ پہلے دوسری راتوں میں چاند کو دیکھ کر آواز بلند کرتے ہیں چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں استھل الصبی یہ اس وقت بولتے ہیں جب نومولود بچہ پیدائش کے وقت چیخ مارے اور کہتے اھل القوم بالحج یہ اس وقت بولتے ہیں جب حج کے ایام لوگوں کو تلبیہ پڑھتے ہوئے سنتے۔ قل اے محبوب محمد عربی ﷺ فرمایئے ھی یعنی چاند کا گھٹنا بڑھنا اوقات ہیں۔

حل لغات: مواقیت وقت سے مشتق ہے۔

ف: وقت اور مدت اور زمان میں فرق یہ ہے کہ مدت فلک کی حرکات کا امتداد از مبدا تا منتہا کا نام ہے اور زمان ان گھڑیوں کو کہا جاتا ہے جو ماضی حال استقبال میں منقسم ہیں اور وقت اس زمانہ کو کہتے ہیں جو کسی امر کے لئے فرض کیا گیا ہو۔

لِلنَّاسِ لوگوں کے لئے یعنی ان امور کے لئے چاند گھٹتے بڑھتے ہیں جو ان کی ضروریات اور مصالح اور معاملات اور حج کے لئے یعنی وہ امور جو اوقات مخصوصہ سے متعلق ہے۔

[ا]: اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر سائل میں استعداد نہ ہو تو اس کے سوال کے مطابق جواب نہ دینا لاعلمی اور عدم اختیار کی دلیل نہیں جیسے یہاں ہے کہ سائلوں نے تو سوال کیا ہے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا لیکن جواب مطابق نہیں اس لئے کہ اس کا گھٹنا بڑھنا علم ہیئت سے متعلق ہے اور اس کا استعداد عوام میں کہاں اسی لئے جواب کے طرز کو بدل دیا اسی قاعدہ پر ہم سینکڑوں سوالات وہابیہ کا جواب دیتے ہیں کہ جہاں حضور ﷺ نے سوالات کے جوابات مطابق نہیں دیئے وہاں بھی استعداد کی کمی یا کوئی اور مصلحت ہوگی۔ (اویسی غفرلہ)

سوال: جب پہلے بتایا گیا ہے کہ چاند کا گھٹنا بڑھنا انسان کو ان اوقات کے بتانے کے لئے ہے جو اسے اپنی ضروریات و معاملات کی وجہ سے متعلق ہیں اور حج بھی منجملہ انہیں سے ہے پھر اسے علیحدہ ذکر کرنے کا کیا معنی؟

جواب: قاعدہ عاتہ الورود ہے کہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہوا کرتا ہے دوسرا اس سے تنبیہ بھی مقصود ہے کہ حج باقی امور سے فضیلت رکھتا ہے اس لئے کہ حج ایک ایسی مخصوص عبادت ہے کہ اس کی ادائیگی مخصوص اوقات میں ہوتی ہے اور قضاء ہو جائے تو اس کی ادائیگی بھی ان مخصوص اوقات کے بغیر نہیں ہو سکتی بخلاف باقی عبادت کے کہ ان کی ادائیگی میں خصوصی اوقات کی کوئی پابندی نہیں خلاصہ کلام یہ ہوا کہ چاند صرف تمہارے مصالح اور ضروریات کی وجہ سے گھٹتا بڑھتا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ چاند جتنا سورج کے قریب ہوگا اتنا نورانیت میں گھٹ جائے گا اور جتنا دور ہوگا اتنا اس کی نورانیت زیادہ ہوگی جیسا کہ فن ہیت میں مفصلاً مذکور ہے۔

ف: تفسیر تیسیر میں ہے کہ سورج ایک ہی حالت پر رہتا ہے اس لئے کہ اس سے صرف عوام کو روشنی پہنچانا اور اس سے لوگوں کے مصالح کا قیام مقصود ہے اور چاند گھٹتا بڑھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی انسانی ضروریات و معاملات کے متعلق فرمایا ہے اور وہ معاملات ضروریات پورے نہیں ہو سکتے جب تک کہ چاند میں اسی طرح تغیر و تبدیل نہ ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے چاند کو ایسے ہی بنایا ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا اور نیکی نہیں کہ تم گھروں کی پچھلی طرف سے آؤ۔

شان نزول: انصار کی عادت تھی کہ جو مرد حج یا عمرے کا احرام باندھتا تو وہ باغ اور گھر اور حویلی کے دروازے سے داخل نہ ہوتا اگر اس کا گھر مٹی کا ہوتو بجائے دروازے کے گھر کے پچھلے جانب سے نقب لگا کر داخل ہوتا اور وہاں سے نکلتا یا مکان کی پچھلی طرف سیڑھی لگا کر مکان کے اوپر چڑھ کر آتا جاتا اگر اس کا مکان خیمہ نما ہوتا تو پھر خیمے کی پچھلی جانب سے آمد و رفت ہوتی بہر حال ان کا یہی طریقہ تھا کہ احرام سے فراغت پر گھر کی پچھلی طرف سے آنا جانا ہوتا تھا گھروں کے عام دروازوں سے آنا ان کے لئے حرام تھا اسی طریقہ کو وہ اپنے لئے نیکی سمجھتے تھے تمام اہل عرب کا یہی طریقہ تھا سوائے حمس کے یعنی قریش کا طریقہ اور تھا اس گمان پر کہ احرام کے وقت اپنی تمام عادت کو بدلنا چاہیے اس لئے انہوں نے احرام کے دوران اپنی عادات کو لباس اور خوشبو وغیرہ کے بارہ میں بدل دیا وہ کہتے تھے ہم اپنے گھروں کے دروازوں سے ہرگز داخل نہیں ہوں گے جب تک اللہ تعالیٰ کے گھر

داخل نہ ہولیں ۔ ان میں بعض تو ایسے تھے کہ انہیں احرام کی حالت میں مکان کی چھت کے سایہ تلے بیٹھنا گوارہ نہ تھا اور نہ وہ پنیر بنا کر کھاتے اور نہ ہی ان دنوں بکریوں کے بال کاٹتے اور یہ باتیں اپنی طرف سے گھڑلی تھیں انہیں کسی شریعت سے یہ امر معلوم نہیں ہوئے ان کی ان غلط عبادتوں کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ سختیاں جو تم نے احرام کی حالت میں مقرر کر رکھی ہیں نہ نیکی ہے اور نہ ان سے قرب الٰہی نصیب ہوسکتا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ لیکن نیک وہ ہے مَنِ اتَّقٰى جو ڈرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء اور خواہشات نفسانی سے بچنے کا نام نیکی ہے صرف احرام کی حالت میں گھروں میں پیٹھ کی طرف آنے کو نیکی نہیں کہا جاتا۔

ربط: کشاف میں سوال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مضمون کو سابق مضمون سے کیا رابطہ ہے پھر اس کا خود جواب دیتے ہیں کہ جب انہیں ان کے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے سوال کا جواب بتایا گیا اور چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی حکمت بھی بتائی گئی ویسے ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل بہت بڑی حکمتوں کا حامل ہوتا ہے اور اس میں بندوں کے لئے کئی مصلحتیں مضمر ہوتی ہیں اس لئے ان کو حکم ہوا کہ سوال کو چھوڑ دو اور غور کرو کہ احرام کے دوران گھروں میں دروازوں سے نہ آنا کوئی نیکی ہے حالانکہ وہ کوئی نیکی نہیں ۔ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا حالت احرام اپنے گھروں میں دروازوں کی طرف سے آؤ کیونکہ اس کے برعکس دروازوں کی بجائے پیٹھ کی طرف سے آنا کوئی نیکی نہیں وَاتَّقُوا اللّٰهَ اس کے احکام کو تبدیل اور اس کے افعال پر اعتراض کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو ۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم نیکی اور ہدایت پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔

دوسرا شان نزول: حضرت حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی عادت تھی کہ جن کا سفر کا ارادہ ہوتا یا کسی کام کو سفر کے لئے جانا ہوتا یا کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ جب تک اپنی منزل مقصود تک نہ پہنچتا مکان کے دروازے سے نہیں بلکہ اس کی پیٹھ سے آتا۔

تیسرا شان نزول: قریش اور قبائل عرب کی عادت تھی کہ جس کا سفر کا ارادہ ہوتا یا کسی کام کو جاتا او ر نا کام ہو کر لوٹتا تو اسے بدفال سمجھ کر بجائے مکان کے دروازے سے داخل ہونے کے اس کی پیٹھ سے آتا اللہ تعالیٰ نے انہیں اس غلط روی سے روکا اور فرمایا کہ بدفالی کوئی نیکی نہیں بلکہ حقیقی نیکی وہ ہے جو غیر اللہ سے نہیں ڈرتا اسے بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہے۔

حکایت: جاحظ نے فرمایا کہ ابراہیم بن یار جو نظام کے نام سے مشہور معروف ہیں بدفالی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اس نے کہا کہ میں ایک دفعہ بہت بھوکا ہوا یہاں تک کہ میں مٹی کھانے لگا تب بھی بھوک ستاتی رہی میں نے سوچا یہاں کسی آدمی کو ملوں جو مجھے طعام کھلائے میں اس ارادہ پر اہواز کی طرف روانہ ہوا۔ (اہواز فارس کے شہروں سے ایک شہر ہے) میرا کوئی وہاں واقف نہ تھا اور نہ ہی میرے پاس کوئی ایسی شئے تھی جس سے اس پریشانی کو دور کر سکتا۔ آگے چلا تو دریا کا کنارا ملا لیکن کشتی نہیں کہ اسے پار کر سکوں اسے میں نے بدفالی پر محمول کیا آگے دیکھا ایک کشتی ہے جس کے اندر سوراخ ہے یہ دوسری بدفالی ہوئی میں نے اس کے ملاح کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام دیوزادہ ہے فارسی لفظ ہے جسے عربی میں شیطان کہا جاتا ہے یہ تیسری بدفالی تھی آخر میں اس کشتی پر سوار ہو گیا۔ جب ہم دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچے تو میں نے چیخ کر پکارا یا حمال اے بوجھ اٹھانے والے مزدور میرا سامان لے جا اس وقت میرے پاس پرانا لحاف اور ایک ضروری سامان تھا جس مزدور نے مجھے جواب دیا وہ (اعور) کانا تھا میں نے کہا یہ چوتھی بدفالی ہے ارادہ ہوا اب یہاں سے واپس لوٹ جاؤں اسی میں سلامتی ہے لیکن چونکہ آچکا تھا اس لئے ارادہ ہوا کہ کسی سے کم از کم اپنا مقصد تو ظاہر کروں جب میں نے کسی سے کہا کہ میں کئی روز سے بھوکا ہوں یہاں تک کہ بھوک کے مارے مٹی کھا رہا ہوں اب میں موت کے گھاٹ اتر چکا ہوں اس کے بعد میں ایک سرائے میں چلا گیا لیکن حیران تھا کہ اب کیا کروں ابھی اس حال میں تھا کہ جس گھر میں تھا اس کا دروازہ کھٹکا میں نے کہا تو کون ہے اس نے کہا میں تجھے بلانے آیا ہوں میں نے کہا میرا نام ابراہیم بن سیار ہے نظام کے نام سے معروف ہوں اس کے بلانے پر مجھے یہ خیال گزرا کہ یہ کوئی دشمن ہے یا بادشاہ کا قاصد ہے میں نے دروازہ کھولا اس نے کہا مجھے تیرے بلانے کے لئے ابراہیم بن عبدالعزیز نے بھیجا اور انہوں نے فرمایا ہے اگرچہ ہم اور آپ بعض باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہمیں حقوق الاخلاق والحرنہ کی ادائیگی ضروری ہے ہم نے تمہاری داستان سنی اور تمہارا در بدر کی ٹھوکریں کھانا ہمیں ناگوار گزرا ہے اس لئے ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم تمہاری ضروریات کی کفالت کریں اب اگر آپ یہاں ہمارے ہاں ایک یا دو ماہ قیام فرمائیں تو آپ کی زندگی بھر کی کفالت کے متعلق کچھ سبب بنا لیں گے اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو لیجئے یہ تیس دینار ہیں انہیں اپنی ضروریات پر خرچ کیجئے اور تشریف لے جایئے آپ کی معذوری ہے ہمیں انکار نہیں میں

نے سوچا کہ اس وقت تک بہت سی پریشانیاں لاحق ہیں فلہذا واپس جانا مناسب ہے اس لئے کہ مجھے اس سے قبل تین دینار تک میسر نہیں ہوئے اب بفضلہٖ تعالیٰ تیس دینار ملے ہیں بہت کافی ہیں زیادہ کا حرص کیوں اور گھر اور بال بچوں سے جدا ہوئے کافی وقت ہوا ہے زیادہ دیر ٹھہرنا نا مناسب ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ بدفالی نہایت ہی مذموم ہے ورنہ مجھے اتنا مال اور سہولت میسر نہ ہوتی۔ (کذافی شرح رسالۃ الزیر بن زیدون)

سبق: اس سے ثابت ہوا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض امور طبع ناگوار گذرتے ہیں لیکن ان میں بہت بھلائی ہوتی ہے۔

حکایت: شیخ وقت کے دور میں قحط پڑا انہوں نے اپنے طلباء کے لئے قرعہ اندازی فرمائی کہ کس کام میں بھلائی ہے چنانچہ ان کے ایک کے نام ڈاکہ زنی کا قرعہ پڑا وہ طالب علم چل پڑا۔ اس کا ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے واسطہ پڑا وہ ان کے ساتھ ایک تاجروں کے گھر میں نقب زنی کرنے لگا بعد فراغ کے ڈاکوؤں نے تاجروں کو قید کر کے اس شخص کو کہا جا کر انہیں ذبح کر دے اس کے دل میں خیال گذرا کہ انہیں مارنے میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ یوں چاہیے کہ انہیں چھوڑ دوں اور ہتھیار لے کر ڈاکوؤں کو قتل کر دیا جائے تاکہ آئندہ ہمیشہ تک ڈاکہ زنی کی لعنت ختم ہو جائے چنانچہ انہیں تمام ماجرا سنایا تاجروں نے اس کے مشورہ کو قبول کر لیا وہ لوگ ڈاکوؤں کے پاس پہنچے وہ غفلت کے نشہ میں چور چور تھے ان پر یکبارگی حملہ کر دیا انہوں نے ڈاکوؤں پر قابو پا لیا انہوں نے ماجرا پوچھا تو اس نے کہا کہ میں فلاں بزرگ کا شاگرد ہوں ڈاکوؤں نے کہا اب ڈاکہ زنی سے ہماری توبہ ہے ہمیں اپنے شیخ کے پاس لے جایئے ہم تمام گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور لوٹا ہوا مال و اسباب بھی واپس کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی کیا گیا وہ ڈاکو سب کے سب شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہو گئے اور ان کے غلاموں اور شاگردوں میں شمار ہوئے۔

سبق: سالک کو چاہیے کہ ہر معاملہ میں صبر اور سکون سے کام لے تاکہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو۔ حضرت صائب فرماتے ہیں۔

چوں سرو در مقام رضا استادہ ام آسودہ خاطرم ز بہار و خزاں خویش

(**ترجمہ:** سرو کی طرح مقام رضا پہ با آرام کھڑا ہوں اب نہ مجھے بہار سے خوشی ہے اور نہ خزاں کا خطرہ)

تفسیر صوفیانہ

وَلَيْسَ الْبِرُّ میں اشارہ ہے کہ ہر شئے کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے کہ اس شئے تک اس سبب کے بغیر پہنچنا ناممکن ہوتا ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا فَاَتْبَعَ سَبَبًا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے کا ایک ذریعہ اور سبب ہے اور اس کا نام تقویٰ اور تقویٰ لفظ ایسا جامع ہے کہ اعمال ظاہرہ باطنہ اور جملہ مامور بہا پر عمل کرنے اور تمام منہی عنہا سے بچنے اسی طرح قلوب کی صفائی اور سرائر کا مراقبہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

فائدہ: مراتب تقویٰ میں جتنا مرتبہ بندے کو نصیب ہوتا ہے اتنا قدر وہ بارگاہ ربوبیت تک باریاب ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا علیکم بتقوی اللہ فانہ جماع کل خیر تقوی حاصل کرو اس لئے کہ وہ تمام نیکیوں کا جامع ہے اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ نیکی اسے نہیں کہا جاتا کہ مکانوں کی پیٹھ سے آؤ یعنی شئے کے سبب کے بغیر شئے کو حاصل کرو کہ اعمال ظواہر کو پابندی سے ادا کرو اور تقویٰ کا دامن چھوڑ کر ان اعمال کے بواطن کی پرواہ نہ کرو بلکہ نیک وہ ہے جو تقوی کا عامل ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ آیت کا معنی یہ ہے کہ بندہ فرمانبرداری میں ایسا منہمک ہو کہ اس سے نافرمانی کی بو تک نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرے کہ کبھی بھولنے کا نام نہ لے اور شکر گزار ایسا ہو کہ اسے ناشکری کا وہم نہ ہو وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا یعنی امور کو ان کے اسباب سے حاصل کرو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منزل مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ بتایا ہے وہ یہ کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو یعنی ماسوی اللہ سے دور ہو جاؤ ایسے ہے جیسے کہا جاتا ہے فلان تقی بترھیہ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب ڈھال کو سامنے رکھ لیتا کہ دشمن کے حملوں سے بچ جائے بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے مولیٰ سے ہی ڈرے اور اس کی پناہ کو اپنی پناہ سمجھے اور اسی کو اپنا ملجا و ماوی مانے اور اسی کی طرف رجوع ہو اور بس جیسے حضور اکرم ﷺ کی عادت کریمہ تھی آپ فرمایا کرتے اعوذ بک منک اے اللہ تعالیٰ تیری مدد سے تیرے ماسوی سے پناہ مانگتا ہوں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ اپنے مالک قدوس کی اعانت سے نفوس قدسیہ کی ہلاکتوں سے چھٹکارا پاؤ۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ

وَقَاتِلُوْا اور جہاد کرو فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے راستہ کے لئے اور اس کے اعزاز میں آیت میں سبیل اللہ اور اللہ کا دین مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا کا

راستہ یہی ہے الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ اور لوگوں سے جو تمہارے ساتھ لڑتے ہیں یعنی قریشیوں سے یہ آیت اس حکم سے پہلے کی ہے جو کہ تمام مشرکین سے جہاد کرنے کا حکم نازل ہوا یعنی ان لوگوں سے جو تمہارے ساتھ لڑتے ہیں یعنی لوگوں سے جہاد کرو جو تمہارا مقابلہ کرتے اور جو تمہیں دین کے راستے سے روکتے ہیں۔

ف: جہاد کے متعلق مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے یہی آیت نازل ہوئی جب یہ آیت اتری تو حضور نبی کریم ﷺ صرف ان سے جہاد کا حکم دیتے جو ان کا مقابلہ کرتے یا جو آپ کے دینی امور میں آڑے ہوتا جو آپ کا نہ مقابلہ کرتا اور نہ ہی آڑے آتا تو اس کے مقابلہ کا حکم نہ فرماتے اگرچہ کفار کا ہر معاملہ آپ سے لڑائی اور دین سے روکاٹ کا تھا چنانچہ روایت ذیل اس مضمون کی تائید کرتی ہے۔

شان نزول: حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضور سرور عالم ﷺ اپنے صحابہ کرام کو لے کر مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ میں صرف عمرہ کے لئے تشریف لے گئے آپ کا تشریف لے جانا ذیقعدہ ۶ ہجری میں ہوا۔ اس وقت آپ کے ساتھ کل تعداد ایک ہزار چار سو اصحاب کی تھی آپ نے مکہ شریف کو جاتے ہوئے حدیبیہ میں قیام فرمایا حدیبیہ ایک مقام کا نام ہے جو مکہ معظمہ کے قریب ہے یہاں پر پانی کی فراوانی اور درختوں کی کثرت تھی لیکن مشرکین نے آپ کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روک دیا آپ یہیں پر ایک ماہ قیام فرما رہے اور مشرکین سے چند شرائط پر صلح فرمالی وہ شرائط یہ تھیں ہم اس سال واپس لوٹ جاتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ سال مدینہ طیبہ سے بیت حرام کی زیارت کے لئے آ کر عمرہ کریں گے یہ شرائط مشرکین کی طرف سے تھیں آپ نے قبول فرمالیں اور اپنے ارادہ مبارک کو بدل کر واپس لوٹنے کا ارادہ فرمایا لیکن صحابہ کو یہ بات ناگوار تھی کہ مشرکین سے شہر حرام اور حرم شریف میں لڑیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقَاتِلُوْا الخ یعنی جب میرا حکم ہے تو پھر شہر حرام اور حرم کا ڈر کیوں۔

وَلَا تَعْتَدُوْا حد سے نہ بڑھو یعنی حرم میں جب کہ تم احرام باندھ کر آؤ تو جنگ وجدال کا آغاز تمہاری طرف سے نہ ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا یعنی ان کے لئے بھلائی کا ارادہ نہیں رکھتا وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ انہیں قتل کرو جہاں بھی ملیں حرم ہو یا حل یعنی غیر حرم خواہ ماہ حرام ہو اس کیلئے کہ حرم اور ماہ حرام کی توہین کا آغاز انہیں سے ہوا ہے پھر تم بھی اتنا قدر ان کے ساتھ کرلو۔

حل لغات: ثقف دراصل الحذق فی ادرک الشئی علما کان او عملا کو کہتے ہیں یعنی شئے کو علماً یا عملاً پورے طور پر پالیتا اور یہ غلبہ کے معنی کو متضمن ہے۔

وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ اور انہیں وہاں سے نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا یعنی مکہ معظمہ سے اس لئے کہ مشرکین نے اہل اسلام کو ابتدائے اسلام میں مکہ معظمہ سے نکالا تھا پھر فتح مکہ کے موقع پر حضور علیہ السلام نے مکہ معظمہ سے ہر اس شخص کو نکال دیا جس نے اسلام سے روگردانی کی۔

حل لغات: دراصل فتنہ کہتے ہیں سونے کو آگ پر ڈالنے کو تا کہ آگ کے جوش سے اس کے اندر کھوٹ دور ہو جائے اب اس کا استعمال ہر اس اسم پر ہوتا ہے جو آزمائش کا سبب ہو اس لئے کہ اس کو سونے کو آگ پر رکھنے سے مشابہت ہے یعنی وہ محبت و مشقت پھر فعل کہ جس سے انسان کی آزمائش کی جائے مثلاً اسے اپنے وطن سے نکال دینا وغیرہ۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ اور آزمائش قتل سے زیادہ سخت ہے کہ اس کی تکلیف دائمی ہے اور نفس کو اس کی مشقت ہر لحاظ سے ستاتی رہتی ہے یہ جملہ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ سے تعلق رکھتا ہے تا کہ اس کے مضمون کا تتمہ بن کر کفار کو مکہ معظمہ سے نکالنے پر برانگیختگی کا سبب بنے اب معنی یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تمہارا کفار کو مکہ معظمہ سے خارج کرنا ان کے قتل سے آسان نہیں بلکہ قتل کرنے کے بجائے انہیں مکہ معظمہ سے نکالنا زیادہ سخت ہے یہ بہترین سزا ہے کہ ان کے کفر پر اصرار کرنے اور تمہارے ساتھ ان کا مقابلہ بازی سے۔

ف: کسی دانا سے پوچھا گیا کہ موت سے بھی کوئی اور شئے زیادہ سخت ہے؟ اس نے فرمایا ہاں وہ امر موت سے زیادہ سخت ہے کہ جس کی وجہ سے موت کی تمنا کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وطن سے نکالنے کی آمائش سے تعبیر فرمایا ہے اس لئے کہ اس میں موت کی آرزو کی جاتی ہے۔

ف: دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیت وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ سے تعلق رکھتی ہے اب اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مشرکین کو حرم میں قتل کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ اے مسلمانو! اس کی کچھ پرواہ نہ کرو کہ مشرکین کو ہم حرم میں قتل کر رہے ہیں اس میں حرج ہی کیا ہے جب کہ میرا حکم ہے فلہذا جہاں بھی وہ تمہیں ملیں انہیں قتل کر دو کیونکہ انہوں نے کون سی کمی کی ہے انہوں نے تمہیں حرم شریف میں قتل کرنا روا رکھا اور پھر تمہیں مکہ

معظمہ کی حاضری سے روک دیا یہ امور بہت بڑے ہیں یہ انہیں حرم میں قتل کرنے سے۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی تم مسجد حرام کے قریب مشرکین کے قتل کرنے کا آغاز نہ کرنا حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْهِ جب تک کہ وہ حرم میں جنگ کرنے کا آغاز نہ کریں اور یہ جملہ صرف اسی مقام پر جنگ کی کیفیت کے ساتھ مخصوص ہوگا ورنہ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ کا حکم عام ہے فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ اگر وہ لوگ اس مقام یعنی بیت اللہ شریف میں بھی تمہارے ساتھ لڑنے لگ جائیں فَاقْتُلُوْهُمْ تو تم بھی ان کے ساتھ لڑو یہ پرواہ نہ کرو کہ بیت اللہ تو امن کی جگہ ہے ہم کیسے لڑیں اس لئے کہ یہاں کی لڑائی کا آغاز اور بیت اللہ کی ہتک کا سلسلہ مشرکین نے شروع کیا ہے فلہٰذا اب وہ سخت سے سخت عذاب کے مستحق ہیں اور عذاب کی ایک صورت یہ ہے کہ تم انہیں جہاں پاؤ مار ڈالو کَذٰلِكَ یعنی اس جزا کی مثل یہ کاف محل الرفع بالا بتداء سے ہے جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ کفار کی جزا ہے یعنی ان کے ساتھ وہی کیا جائے جو انہوں نے اپنے غیروں سے کیا فَاِنِ انْتَهَوْا پس اگر وہ جنگ سے یا کفر سے رک جائیں اس سے معلوم ہوا کہ ان سے جنگ روک دینے سے یہ ثابت نہیں ہو تا کہ اب وہ مغفرت کے مستحق ہو گئے ہیں چہ جائے کہ انہیں رحمت کا مستحق ٹھہرایا جائے فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ہے ان کی گزشتہ غلطیاں بخش دے گا۔ وَقٰتِلُوْهُمْ اور مشرکین سے جنگ کرو حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ یہاں تک کہ نہ پایا جائے یا نہ باقی رہے فِتْنَةٌ یعنی شرک ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔

مسئلہ: بت پرست کو اسلام پیش کیا جائے اگر بت پرستی سے پورے طور پر تائب ہو کر اسلام قبول کر لیں تو درست ورنہ اسے قتل کر دینا جائز ہے۔

وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ اور ہو جائے دین خالص اللہ تعالیٰ کے لئے شیطان کو اس میں ذرا بھر بھی کچھ نصیب نہ ہو فَاِنِ انْتَهَوْا پس اگر وہ شرک کرنے سے اور تمہارے جنگ کرنے سے رک جائیں فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ پس نہیں تجاوز مگر ظالمین پر یعنی جو لوگ شرک کرنے سے رک گئے ہیں ان کو کچھ نہ کہو کیونکہ ایسی سختی اس پر ہونی چاہیے جو کفر وغیرہ کا ارتکاب کرتا ہے ظلم صرف ظالم پر کیا جائے اس سے تجاوز نہ کیا جائے اس جملہ میں نفس جزا کو محذوف کر کے اجزا کی علت کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ علت حکم کو مستلزم ہے اسی لئے علت بول

کر حکم سے کفار کیا گیا ہے گویا یوں کہا گیا فان انتھوا فلا تعدوا علیھم اس لئے کہ عدوان ظالموں کے ساتھ خاص ہے اور چونکہ شرک کرنے سے رکنے والے ظالمین نہیں ہیں فلہذا ان پر عدوان بھی نہ ہو۔

سوال: کفار کو جن امور سے سزا دی جائے گی اس سے عدوان اور ظلم سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ اس کے ساتھ جو کچھ کیا جائے گا وہ سراسر حق اور عدل و انصاف پر مبنی ہو گا کیونکہ وہ ظلم کی سزا ہے۔

جواب: صرف لفظی مشارکت کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا جزآء سیئۃ سیئۃ مثلھا اس آیت میں برائی کی سزا کو سیئہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تفسیر عالمانہ

الشھر الحرام حرام کے مہینے عوض بنتے ہیں بالشھر الحرام حرام مہینوں کے اللہ تعالیٰ کی معظمات کی ہتک اور توہین ہے جسے مشرکین نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو ذیقعدہ میں بیت اللہ شریف کی زیارت سے روکا۔

شان نزول: حضور نبی کریم ﷺ اپنے معاہدے کے مطابق دوسرے سال یعنی ساتویں سن ہجری کو عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لائے جب حرم شریف میں داخل ہوئے تو مشرکین نے تیروں اور پتھروں کا نشان بنایا صحابہ کرام ان کی جوابی کاروائی سے خاموش رہے تھے کہ ماہ حرام اور حرم شریف میں انکا کیا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور فرمایا ماہ حرام ماہ حرام کے عوض ہو گیا اور بیت اللہ کی ہتک اور توہین اس کا بدلہ بن جائے گی بے فکر ہو کر تم بھی تیر چلاؤ۔

وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ یعنی جو بھی اللہ تعالیٰ کی معظمات کی ہتک کرتا ہے جیسی معظمات ہوں وہ ماہ حرام ہو یا حرم شریف اس کا بدلہ لینا جائز ہے اس لئے ان عظمات کی رعایت اس وقت ضرور ہے جو ان کی رعایت کرتا ہے اور اس کے ساتھ رعایت ضروری ہے جو ان کی رعایت نہیں کرتا پھر ان کی ہتک کرتا ہے تو تم بے شک ان کا بدلہ لے سکتے ہو اس کے ساتھ وہی کر سکتے ہو جیسے اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔

مسئلہ: زیادہ واضح یہ ہے کہ حرمات سے حرمت مراد ہے اور حرمت ہر وہ شئے کہ جسکی محافظت ضروری ہو خواہ وہ نفس ہو یا عرض یعنی جس سے قصاص کے احکام جاری کئے جاسکیں۔

آیت کا خلاصہ: یہ ہوا کہ اے مسلمانو! جس طرح مشرکین نے تمہیں مکہ شریف کی حاضری سے روکا جو

جنگ کرنے کا پیش خیمہ اور ماہ حرام کی توہین ہے تو تم بھی ان کے ساتھ اسی قدر کرلو اور ان پر جبراً قہراً داخل ہو جاؤ اور اگر وہ اس سال بھی تمہیں قضاء العمرہ جنگ وغیرہ کر کے روکتے ہیں تو تم بھی انہیں بے شک قتل کرو چنانچہ فرمایا۔

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ پس جو بھی تمہارے اوپر ماہ حرام میں جنگ کر کے زیادتی کرتا ہے فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ پس تم بھی اس پر اتنا کرو جتنا قدر اس نے تمہارے اوپر زیادتی کی ہے یعنی جزا مماثلت کے طور پر تاکہ انہیں تجاوز کرنے کی سزا حاصل ہو یہ تجاوز بمنزلہ قصاص کے ہوگا اسی طرح اس کی حرم شریف اور ماہ حرام میں اجازت دی گئی لیکن اسی قدر کہ جس قدر مشرکین کاروائی کریں ورنہ ابتداء تو ویسے ہی حرام ہے بلکہ ظلم عظیم ہے یہی مراد اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی ہے چنانچہ فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ اللہ سے ڈرو اور یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔

ف: معیت سے قرب معنوی مراد ہے اس کی تائید یوں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نگرانی کرتا ہے ان کے امور میں انہیں قدرت اور فتح ونصرت دیتا ہے۔

حدیث شریف: مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ اسی سال مکہ معظمہ میں آئے اور ہمیشہ بیت اللہ شریف کا طواف کیا قربانیاں بھی کیں لیکن مشرکین نے آپ سے شرط کرلی تھی کہ آپ تین دن قضا العمرہ کے بعد واپس چلے جائیں حضور نبی پاک ﷺ نے بی بی میمونہ بنت حارثؓ سے نکاح کیا تھا آپ چاہتے تھے یہاں مکہ معظمہ میں قیام فرمائیں تاکہ صحابہ کرام کو دعوت ولیمہ دی جائے لیکن مشرکین آپ کو مکہ سے تشریف لے جانے کا مطالبہ کرر ہے تھے اور کہتے کہ آپ نے معاہدہ فرمایا تھا وہ پورا کریں چنانچہ آپ ایفائے عہد کے مطابق مکہ سے چل پڑے اور مقام سرف پر پہنچ کر بی بی کے لئے صحابہ کرام کو دعوت ولیمہ دی اور وہاں پر رسم بیاہ ادا فرمائی اور مندرجہ ذیل تقریر فرمائی۔

فوائد اور جامع تقریر نبوی ﷺ: اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں ہمیں جنگ کرنے کا حکم فرمایا تاکہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان خرچ کرنے والے مدعی کا دعوی ظاہر ہو اسی طرح ہمیں مال خرچ کر کے زکوۃ کا حکم ہے تاکہ اس مدعی کو جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعوی کرتا ہے معلوم ہو جائے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرنا محبت الٰہیہ کا معیار

ہے کیونکہ انسان جبلی طور حیات اور مال کی محبت میں مبتلا ہے اس لئے قطعی طور جنگ اور زکوٰۃ فی سبیل اللہ سے آزمائش کی گئی تا کہ مدعی کا دعوی سچا یا جھوٹا ثابت ہو۔ کیونکہ ہر ایک اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعوی کرتا ہے جہاد کے حکم میں ایک راز یہی ہے

ف: سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا سب سے بہترین خصلت شجاعت وسخاوت ہے اور یہ دونوں جڑوان کی طرح ہیں یعنی ہر بہادر سخی بھی ہوتا ہے۔

ف: حضرت عبداللہ بن عمر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اچھا کلام کرنا، بھوکے کو طعام کھلانا، اور السلام و علیکم کی عادت ڈالنا پھر پوچھا گیا مسلمانوں میں افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا اچھا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ ہوں پھر عرض کیا گیا کون سی نماز بہتر ہے آپ نے فرمایا جس نماز میں قیام لمبا ہو پھر پوچھا گیا بہترین صدقہ کون سا ہے آپ نے فرمایا جس کی آمدنی قلیل ہو اور خرچ زائد ہو پھر اللہ تعالیٰ کیلئے خرچ کرے آپ سے عرض کیا گیا کہ کون سا ایمان افضل ہے آپ نے فرمایا صبر اور مروت پھر سوال ہوا کون سا جہاد افضل ہے فرمایا وہ کہ جس کی سواری ماری جائے اور خود بھی لت پت ہو جائے پھر سوال ہوا کون سی گردن آزاد کرانا افضل ہے آپ نے فرمایا وہ جو قیمت کے لحاظ سے مہنگی ہو۔

ف: جہاد دو اقسام کے ہیں: ۱۔ ظاہری ۲۔ باطنی۔ ظاہری تو یہ ہے کہ کفار و مشرکین سے لڑنا باطنی نفس وشیطان کی مخالفت کرنا یہ جہاد ظاہری جہاد سے زیادہ سخت ہے کیونکہ کافر بھی اپنے ارادہ سے باز آ جاتا ہے مثلاً جنگ سے یا صلح کر کے یا مر جائے گا یا مال دے کر جان چھڑا جائے گا ان وجوہ سے کوئی نہ کوئی وجہ اس کے مقابلہ میں پیش آئے گی لیکن شیطان تو جب تک کسی کے دین کو برباد نہیں کر لیتا ان کی جان نہیں چھوڑتا۔

مثنوی شریف میں ہے۔

اے شہان کشتیم باخصم بروں	ماند خصمی زو بتر در اندروں
کشتن ایں کار وہش نیست	شیر باطن خرہ خرگوش نیست
سل شیری دان کہ صفات شکست	شیر آنست کہ خو دار شکند

ترجمہ: عزیزو! ہم اپنے ظاہر دشمنوں سے بہت بڑے ہیں لیکن باطنی دشمن اندر میں ہیں اور وہ بہت برا ہے اس دشمن کو مارنا معمولی کام نہیں اور وہ تو ایک بہت بڑا شیر ہے فلہٰذا بہادر وہ ہے جو اندر والے شیر کو مار ڈالے۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات قاشانیہ میں ہے وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ان لوگوں سے جہاد کرو جو شیطان اور نفس امارہ کے حامی بن کر تمہارے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں وَلَا تَعْتَدُوا جنگ کرنے میں حد سے نہ بڑھو نفس کے حقوق کی کمی کر کے اسے یک لخت نہ مٹا دو کہ جس سے وہ اپنی حدود پر قائم نہ رہ سکے پھر اس سے قصور وفتور اور کوتاہی سرزد ہو اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اس لئے کہ یہ لوگ ظل محبت اور وحدت جو کہ دراصل عدل ہے خارج ہیں وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ یعنی انہیں یکسر مٹا دو اور انہیں ان کی خواہشات سے روکو وہ خواہشات ان کی روح ہیں جہاں بھی ہوں وَاَخْرِجُوهُمْ اور انہیں مکہ صدر سے نکالو جب کہ وہ حملہ کریں مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوكُمْ جیسے انہوں نے تمہیں بقعہ نفس میں اتارا اور مقر قلب سے تمہیں دور پھینکا ہے۔

وَالْفِتْنَةُ فتنہ سے ان کی خواہشات کی پرستش اور لذات وشہوات کے بتوں کی عبادت مراد ہے اور زیادہ سخت ہے بہ نسبت خواہشات وجڑ سے نکالنے اور خواہشات کو یکسر ختم کرنے سے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارا محنت اور بلا میں مبتلا ہونا جب کہ ان کا حملہ ہوتا ہے تمہارے لئے زیادہ سخت ہے قتل سے جو کہ اسے مارنے اور بالکل مٹانے سے کیونکہ درد والم کا ضرر بہت زیادہ ہے وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مسجد الحرام کے ہاں انہیں قتل نہ کرو یہاں مسجد حرام سے مقام قلب یعنی حضور قلبی کے وقت ان سے لڑائی نہ کرو جبکہ وہ تو جہات کے موافق ہو جائیں کیونکہ وہ تمہارے سلوک کے لئے تمہارے معین ومددگار ہیں حَتّٰى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ یہاں تک کہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں یعنی تمہارے سلوک کے مطالب میں تمہارے ساتھ جھگڑیں اور تمہیں حیات قلب اور دین حق سے کھینچ کر مقام نفس کی طرف پہنچا دیں اور ان کے دین سے ان کے بچھڑے کی پرستش مراد ہے وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے ان کے جھگڑے اور ان کے اسباب کی طرف کھینچ لے جانے اور خواہشات کی پرستش ہے وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ پھر سب کا سب اللہ کا دین ہو جائے

تمام توجہات کو جناب قدس کی طرف پھیرنا اور ان خواہشات کو راز الٰہی کے حصول کیلئے توجہ حق میں صرف کرنا تا کہ شیطان اور نفسانی خواہشات کو کسی قسم کا حصہ نہ ہو پس اگر وہ رک جائے ان پر کوئی زیادتی نہ کرو ہاں تجاوز ان پر ہونا چاہیے جو حد سے بڑھنے اور تجاوز کرنیوالے ہیں۔

حضرت شیخ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ کی صوفیانہ تقریر:۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ الخ میں اشارہ ہے کہ وہ جو تمہارے نفس کی سستی اور اس کی خرابیوں سے اور اوراد وظائف میں کمی واقع ہوئی تو اس کے پورے کرنے میں کوشش کرو مہینے کی غلطیاں مہینوں سے اور دن کی دن سے گھڑی کی گھڑی سے اور وقت کی وقت سے اور اوراد کی وارراد سے غرضیکہ جو اعمال فوت ہوئے ان کی قضا کرو اور ہر ایک کے حقوق ادا کرو نفس کی کوئی بری عادت بھی جب غلبہ پا جائے تو اس کی ضد سے علاج کرو مثلاً بخل کی عادت ہو تو سخاوت کی عادت ڈالو اور غیظ و غضب کی عادت ہو تو حوصلہ سیکھو حرص کا غلبہ ہو تو ترک ارادات کرو شہوات غالب ہیں نفس کو ریاضت و مشقت میں ڈالو اسی طرح تمام امور کو سمجھئے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ حد سے بڑھتے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف مدنظر رکھو اور یہ بھی ہے کہ کثرت مجاہدات سے نفس کو ہلاک نہ کر ڈالو وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کو نفس کی شرارت کو دبانے میں مدد دیتا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو انفاق بمعنی مال کو ضروریات میں خرچ کرنا اور سبیل سے مراد دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے ثواب اور علیہ رحمت کی طرف پہنچائے۔

مسئلہ: ہر وہ امر جو اللہ تعالیٰ نے اعزاز دین اور اس کے قائم کرنے کی خاطر خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے وہ تمام اس آیت میں داخل ہیں خواہ وہ حج کا معاملہ ہو یا عمرہ کا جہاد کفار کے امور ہوں یا صلہ رحمی کے متعلق ہو۔ مساکین اور فقرا کے ضعفا کی مدد کرنا ہو یا اہل و عیال اور آل و اولاد کے حقوق کی رعایت غرضیکہ قرب الٰہی میں خرچ کے جو معاملات ہیں وہ تمام اس آیت میں داخل ہیں۔

ف: پہلے اللہ تعالیٰ نے نفس سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے اس کے بعد خرچ کرنے کا۔ اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ خرچ کرو اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اور انہیں پورے طور روکے نہ رکھو۔

وَلَا تُلْقُوْا یہ القاء سے مشتق ہے بمعنی شئے کو ایسے مقام پر پھینکنا جہاں پر وہ نظر آ رہی ہو عرف میں ہر پھینکنے پر بولا جاتا ہے یہ الٰی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے متضمن بمعنی الانتہاء بِاَیْدِیْکُمْ مفعول بہ ہے اور یہ باء زائدہ ہے کیونکہ اعلیٰ کا فعل بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاَلْقٰی مُوْسٰی عَصَاہُ ہاں اَلْقٰی بِیَدِہٖ وہاں مستعمل ہوتا ہے جہاں شر کا معنی مطلوب ہو۔

ف: آیت میں ایدی سے مراد نفوس ہیں کیونکہ ید نفوس کو مستلزم ہے تمام اعضا سے صرف ید کی تخصیص اسی لئے ہے کہ نفس کو ید لازم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر اعمال ہاتھ کے ذریعہ سے صادر ہوتے ہیں اب معنی یہ ہوا اپنے نفسوں کو نہ پھینکو۔

اِلَی التَّهْلُکَۃِ فضول خرچی کر کے اور معاش کے اسباب کو ضائع کر کے ہلاکت میں یہ آیت دوسری آیت کی نظر ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا یا یہ معنی ہے کہ اے لوگوں! اپنے نفسوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو غزوات میں رک کر اور جنگ کی ضروریات میں خرچ کر کے کیونکہ اس طرح سے تمہارے دشمن کو تقویت ملے گی اور وہ تمہارے اوپر مسلط ہو جائے گا۔ اس ترجمہ کی تائید حدیث شریف سے ہوتی ہے یعنی مندرجہ ذیل سے۔

شانِ نزول: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دین اسلام کو غلبہ دیا وار اپنے رسول کریم ﷺ کی مدد فرمائی تو ہم آپس میں سوچنے لگے کہ ہم اپنے اہل و عیال مکہ میں چھوڑ آئے اور ہمارے مال و اسباب بھی وہاں رہ گئے اب بفضلہٖ تعالیٰ اسلام ہر جگہ پھیل گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی مدد کی ہے اگر ہم واپس اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کی طرف لوٹ جائیں وہاں جا کر قیام کریں اور جو ہمارے سے ضائع ہوا اس کو واپس قبضہ میں کر کے اس کی اصلاح کریں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مقولہ مہاجرین کی گفتگو کی نقل ہے ورنہ ان کا کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے وہ تو انصاری تھے یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ پر خرچ کرو اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف یعنی ایسے اسباب میں جو تمہاری ہلاکت کا سبب بنیں مثلاً یہ خیال آ جائے کہ کاش ہم اپنے وطن میں مقیم رہتے اور مال اسباب کی نگرانی کرتے اس سے جہاد تمہارے سے رک جائے گا۔

حکایت: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کو سننے کے بعد جہاد فی سبیل اللہ میں زندگی بسر کی یہاں تک کہ آخری لمحات بھی آپ کے مسافری اور جنگ میں ختم ہوئے جب آپ کا وصال ہوا تو اس وقت قسطنطنیہ کی جنگ لڑائی جاری تھی سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بزمانہ خلافت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں قسطنطنیہ میں لڑتے لڑتے فوت ہوئے [1] وہاں ہی آپ کو دفن کیا گیا یعنی آپ کو قسطنطنیہ کے قلعہ کے نیچے دفنایا گیا اور وہاں کے لوگ آپ کے مزار شریف پر حاضری دے کر آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا وسیلہ بنا کر اپنی حاجات پوری کراتے ہیں (اس سے وہابی دیوبندی سوچیں کہ مزارات کی حاضری اور انہیں قضاء حاجات کا وسیلہ بنانا تمہارے نزدیک شرک کیوں؟)

حدیث شریف: میں ہے جو شخص مرجائے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ کا خیال تک نہ ہو تو وہ منافقت کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔

وَاَحْسِنُوْا اور احسان کرو یعنی فقراء پر کرم واحسان کرو اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے۔

حکایت: مروی ہے کہ جب حجاج عراق کا حاکم مقرر ہوا تو ہر روز ہزار دستر خوان طعام کا تیار کرتا اور ہر دستر خوان پر دس آدمی کھانا کھاتے اور لوگوں کو دعوت کا اعلان کرتا اس کی دعوت پر لوگ بکثرت جمع ہوتے حجاج نے ایک دن کہا اے لوگو! اب کے بعد سورج میرا قاصد ہے یعنی سورج کے طلوع ہوتے ہی کھانا کھانے آجایا کرو اور جب سورج غروب ہو تو شام کا کھانا بھی میرے ہاں آکر کھاؤ۔ اسی طرح ہوتا رہا ایک دن لوگ بہت کم جمع ہوئے حجاج نے پوچھا آج لوگ تھوڑے کیوں جمع ہوئے ایک مرد نے کہا تو نے لوگوں کو یہاں کی حاضری سے بے پرواہ کر دیا ہے اس لئے کہ لوگوں کے گھروں میں آپ کی طرف طعام پہنچ جاتا ہے حجاج نے کہا تیری اس

---

[1]: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ۵۲ھ میں ہوا چونکہ اس غزوہ کی قیادت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہوئی اسی لئے مفسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کا نام لکھا ہے اور خود امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں قسطنطنیہ کی پہلی جنگ لڑی تھی۔ اسی لئے مفسر سے ایسا تسامل ہوا اور قسطنطنیہ میں قیادت یزید محل نظر اور تفصیل طلب ہے۔ (اُویسی غفرلہ)

اطلاع دینے کا شکریہ اللہ تعالیٰ تجھے خوش رکھے۔

سبق: باوجود یہ کہ حجاج بہت بڑا ظالم تھا لیکن دیکھئے اس کا لوگوں پر کتنا احسان اور فضل و کرم تھا۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

کرم کن کہ فردا کہ دیوان نہند　　　منازل بمقدار احسان نہند

(**ترجمہ**: سخاوت کیجئے اس لئے کہ کل قیامت میں ہر ایک کو مراتب احسان و مروت کے مطابق عطا ہوں گے)

حکایت: ہدائی حکایت کرتے ہیں کہ چند ایک سوار قبیلہ بنی اسد اور قیس یعنی نعمان حاتم کو ملے اور وہ سخاوت میں بہت بڑا مشہور تھا آنے والے لوگوں نے کہا کہ اے حاتم تیری سخاوت کا بڑا شہرہ ہے لوگوں نے تیری طرف خط بھیجا ہے اگر اجازت ہو تو پیش کیا جائے حاتم نے کہا کیوں نہیں اسدیوں نے نابغہ کے اشعار پڑھ کر سنائے جب اشعار پڑھ لئے تو کہنے لگے کہ ہمیں شرم آتی ہے کہ آپ سے کوئی سوال کریں صرف ایک ضرورت درپیش ہے وہ یہ کہ ہمارے ساتھی کی سواری گم ہو گئی ہے اگر ازراہ عنایت عطا فرمادیں تو زہے کرم۔ حاتم نے اپنی سواری پیش کردی اور کہا اسے لے جائیں گھوڑی لے کر چلے تو لونڈی نے گھوڑی کا بچہ کپڑے کے ساتھ باندھا لیکن وہ بچہ لونڈی کا کپڑا لے کر اپنی ماں کے پیچھے بھاگا۔ لونڈی نے ہر چند کوشش کی لیکن وہ بچہ گھوڑی کے پیچھے بڑھتا رہا حاتم کو معلوم ہوا تو پکار کر کہا اے بھائیو! جو شئے تمہارے پیچھے آ رہی ہے وہ تمہاری ہے یعنی گھوڑی اور اس کا بچہ بلکہ لونڈی بھی میں نے تمہیں دی۔ (کذافی شرح رسالہ ابن زید و ن الوزیر)

حکایت: حضور سرور عالم ﷺ جب معراج پر تشریف لئے گئے جہنم کے طبقات کو ملاحظہ فرمایا تو انمیں ایک جہنم کا طبقہ دیکھا جس میں ایک مرد ہے جسے آگ نہیں لگتی آپ نے پوچھا اسے آگ مس کیوں نہیں کرتی جبریل علیہ السلام نے عرض کی یہ حاتم طلائی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی جود و سخا کی وجہ سے جہنم کی آگ سے دور رکھا ہے۔ (کذافی انیس الوحدۃ و جلیس الخلوۃ)

حدیث قدسی: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اے عیسیٰ علیہ السلام اگر تم چاہتے ہو کہ تم آسمان پر ملائکہ مقربین کے ساتھ لڑتے رہو تو شفقت میں سورج کی طرح ستر عیوب میں رات کی طرح اور تواضع میں زمین کی طرح اور حوصلہ میں مردہ کی طرح اور سخاوت میں جاری نہر کی طرح ہو جاؤ۔

تفسیر صوفیانہ اہل حقیقت فرماتے ہیں اور یہی قول غایت ہی احسن ہے کہ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنی ارواح کو خرچ کرو وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ اور اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ پڑو کہ تم شہادت فی سبیل اللہ سے رک جاؤ دراصل یہی شہادت حیات ابدیہ ہے اور اگر قوت کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے اور نیکی کرو اپنے نفسوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کر کے جو اس نے تمہارے نفسوں کو تم سے خریدا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے۔

مرگ بے مرگی بود مارا حلال	برگ بے برگی بود مارا نوال
ظاہر مرگ و بباطن زندگی	چوں مراسوئے اجل عشق وہواست
زانکہ نہی از دانہ شیریں بود	تلخ راہ خود نہی حاجت کی شود
دانہ کش تلخ باشد مغز د پوست	تلخی و کروہش خود نہی اوست
دانہ مردں مراشیریں شداست	بل ہم احیا پے من آمدست

ترجمہ: بقا کی موت ہمارے لئے حلال ہے بے سامانی ہمارا سامان ہے اسلئے کہ ایسی موت ظاہراً موت لیکن حقیقتاً بقا ہوتی ہے اسی طرح بے سروسامانی بظاہر ذلت اور بباطن خوش منظر ہے میرے اجل کی منزل عشق ہے لَا تُلْقُوْا کی نہی ہمارے لئے بھی اسی لئے ہے اس لئے کہ نہی کا ذائقہ بہت بڑا میٹھا ہے اگر تلخ ہوتا تو اس کے لئے نہی نہ ہوتی جو شئے کڑوی ہو اس کی وہی تلخی نہی ہے بہشت کا دانہ میٹھا ہے اس لئے وہیں جا کر ہر کس زندہ ہوگا۔

تاویلات نجمیہ کی صوفیانہ تقریر: تاویلات نجمیہ میں ہے وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنے اموال اور نفوس کو خرچ کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں ساتھ روک دینے بیچ کے سپرد کرنے سے اس طرح تم ہلاک ہو جاؤ کہ تمہیں اس کا ثمر نہیں ملے گا اور وہ ثمر بہشت ہے اور حد سے بڑھ کر یعنی جہاد سے کوئی ایک مجاہد بھاگ جائے وَاَحْسِنُوْا اور اپنے نفسوں کے ساتھ نیکی کرو انہیں شہوت کی آگ سے بچا کر اور اپنے قلوب کے ساتھ غفلتوں کے زنگ سے محفوظ کر کے اور اپنی روحوں کے ساتھ تعلقات کے حجابات سے بچا کر اور اپنے اسرار کے ساتھ مکونات کے ملاحظہ

سے حفاظت کر کے اور مخلوق کے ساتھ ان سے اذیات دفع کر کے اور ان پر احسانات کر کے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اظہار عبودیت ماموراتِ ومنہیات میں اور دکھ دینے والی چیزوں اور بلیات سے صبر کر کے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور راحت دینے والی اشیاء سے شکر کر کے اور تمام حالات میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اور جزئیات و کلیات کے تمام امور اس کی طرف سپرد کر کے اور تمام احکام ازلیہ میں تسلیم اور اس کے اولیات کے فیصلوں پر رضا اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ قدیم کے سامنے اپنے جمیع نئے ارادوں کو فنا کر کے اسی ذات کو مدنظر رکھ کر اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ بے شک اللہ تعالیٰ ان نیکوں سے محبت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بوصف مشاہدہ نیکی کرتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ حج اور عمرہ کو پورا کرو۔

مسئلہ: حج اس شخص پر فرض ہے جو حج کے راستہ پر خرچ کرنے کی طاقت رکھتا ہو امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک عمرہ سنت ہے۔

مسئلہ: عمرہ اس پر واجب ہوتا ہے جب کوئی اپنے اوپر واجب کر دے جیسے نفل اس وقت واجب ہوتی ہے جب شروع کر دے اب معنی یہ ہوا کہ جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک کو شروع کرے تو وہ اسے تمام کرے۔

مسئلہ: فقہاء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتداءً کسی شئے کو شروع کرنا واجب نہیں لیکن جب شروع ہو جائے تو اس کا اتمام اس پر واجب ہے۔

لِلّٰہِ سے متعلق ہے اور یہ لام مفعول کی ہے یعنی تمام حج اور عمرہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ہو۔

شان نزول: اس میں وجہ تحقیق یہ ہے کہ اہل عرب حج کو اس لئے جاتے تھے کہ وہاں اجتماع ہوگا ایک دوسرے سے ملیں گے بازاروں کا چکر لگائیں گے یہ حج اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں تھا نہ ہی اس کی اطاعت اور نہ ہی اس میں قرب الٰہی نصیب۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم حج کو جاؤ صرف اس غرض پر کہ اللہ تعالیٰ کا فرض حق ادا کریں گے اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ حج اور عمرہ کے ارکان اور شرائط اور ان کے دو جمیع اور افعال جو شرعاً مشہور ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مشروع فرمایا ہے صرف اسی کو راضی کرنے کے لئے مکمل کرو ان میں کسی قسم کا خلاف نہ ہو صرف عبادت سمجھ کر ادا کرو ان میں کسی قسم کی غلط نیت نہ ہو مثلاً تجارت کا خیال اسی طرح

دیگر دنیوی امور کے ارادے اور حلال مال سے خرچ کرو۔ حج کے ارکان پانچ ہیں۔

۱۔ احرام ۲۔ عرفات میں ٹھہرنا ۳۔ طواف ۴۔ سعی بین الصفاء والمروہ

۵۔ سر کے بال منڈوانا کٹوانا

ف: حج کے رکن کا مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ ادا نہ ہو حج کی دولت نصیب نہ ہوگی واجب وہ ہے کہ جو کسی غلطی سے ترک ہونے پر دینی پڑے۔ سنن حج کی وہ ہیں کہ جنکے ترک سے کوئی شئے لازم نہ آئے۔

عمرہ کے لئے بھی یہی تین امور ہوتے ہیں عمرہ کے ارکان چار ہیں۔

۱۔ احرام ۲۔ بیت اللہ شریف کا طواف ۳۔ سعی بین الصفاء و المروہ ۴۔ حلق

حج کے دو تحلل ہیں اور تحلل کے اسباب تین ہیں ۱۔ دسویں کے دن جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنا

۲۔ طواف زیارت ۳۔ حلق۔ جب ان تینوں میں سے دو ادا ہو جائیں تو احرام سے فراغت ہوگی۔ ان میں تیسرے کی ادیگی دوسرا تحلل ثابت اور پہلے سے تمام روکے ہوئے افعال مباح ہو جاتے ہیں یعنی وہ روکاوٹیں جو احرام کی حالت میں سوائے اپنی عورت کے ساتھ جماع کے پھر دوسرے سے اپنی عورت سے جماع بھی جائز ہوگا تمام امت کا اجماع ہے کہ حج اور عمرہ کی تین اقسام ہیں۔ ۱۔ افراد، ۲۔ تمتع ۳۔ قرآن، افراد حج کی صورت یہ ہے کہ افراد کی نیت سے احرام باندھے اس کی فراغت کے بعد حل سے یعنی مواقیت وحرم کے درمیان سے عمرہ کرنے۔

۱۔ کی صورت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے اور اس کے تمام مناسک ادا کر کے چھوڑ دے پھر حج کا احرام مکہ شریف سے باندھے اور حج کے ایام میں مناسک ادا کرے۔

۲۔ کی صورت یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں اکٹھا ہی احرام باندھے اور نیت کے وقت دونوں کا ارادہ کرے پھر حج کے مناسک۔

۳۔ ادا کرنے سے عمرہ کے بھی ادا ہو جائیں گے کیونکہ حج اور عمرہ کے ایک ہی مناسک ہیں اور بالعکس نہیں یعنی حج کے مناسک عمرہ کے نہیں بلکہ حج کے مناسک عمرہ کے مناسک سے زائد ہیں اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ عمرہ کا احرام باندھ کر پھر اس میں حج کا احرام داخل کر دے لیکن طواف سے پہلے کر سکتا ہے بعد میں حج کا احرام

داخل کردے لیکن طواف سے پہلے کر سکتا ہے بعد میں نہیں اس وجہ سے اسے قارن کہا جائے گا۔ اگر کسی نے حج کا احرام باندھا پھر عمرہ کا بعد تو اس طریق سے عمرہ کا احرام منعقد نہ ہوگا۔ احناف کے نزدیک قرآن تمتع اور افراد سے افضل ہے۔

حدیث شریف: حج کے ساتھ عمرہ کو ملاؤ اس لئے کہ دونوں افلاس اور گناہ کو ایسے مٹاتے ہیں جیسے لوہار کی بھٹی لوہے اور چاندی اور سونے کے رنگ کو کاٹتی ہے۔

مسئلہ : حج مبرور کی جزا بہشت ہی ہے۔

فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ اگر تم روکے جاؤ حج اور بیت اللہ شریف تک پہنچنے سے بوجہ مرض یا دشمن یا عجز یا خرچ ختم ہونے یا سواری نہ ہونے سے یا کسی اور عوائق سے احرام کے بعد حج وعمرہ میں سے کسی ایک کی ادائیگی سے۔

مسئلہ : سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ حکم عام ہے یعنی تمام لوگوں کے لئے ہے اگر چہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہے جو اس وقت دشمن کی وجہ سے حج وعمرہ سے روکے گئے لیکن اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ پس جو آسان ہو جس طرح تجھے آسانی ہو مِنَ الْهَدْيِ قربانی سے یہ مِنْ تبعیضیہ یا بیانیہ ہے یعنی دار الخلیفہ قربانی کا بعض ہو یا کل حصہ ھدی ھدیتہ کی جمع جیسے ثمر ثمرہ کی جمع ہے یعنی ہر وہ شئے جو اللہ تعالیٰ کی قربت کے لئے جانوروں کی قسم دی جائے اس کا ادنیٰ درجہ بکری کا ہے۔ درمیانہ گائے اور سب سے اعلیٰ اونٹ ہے اور اسے اس لئے ہدی کہتے ہیں کہ یہ عرض ہے بندے کی اس عبادت کا جو بندہ اپنے مولیٰ تعالیٰ کی طرف یعنی بیت اللہ شریف بھیجتا ہے۔

مسئلہ: اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ محرم کو جب روک دیا جائے اور چاہتا ہے کہ وہ احرام سے فارغ ہو جائے تو اسے چاہیے جس طرح اسے آسانی ہو اونٹ یا گائے یا بکری جہاں روکا گیا یعنی جس جگہ روکا گیا ہے وہاں انہیں ذبح کرے یہ امام شافعی کا مذہب یہ احناف کے نزدیک اس قربانی کو حرم شریف میں بھیج دے اور بھیجے ہوئے کے ہاتھ میں نشانی دے تا کہ وہ حرم میں پہنچ کر اس کی قربانی خیرات کرے جب اندازہ لگائے کہ اب میری قربانی حرم شریف میں پہنچ کر ذبح ہوگئی تو اب احرام سے فارغ ہو جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ یعنی احرام سے فراغت نہ پاؤ سر کے بال منڈوا کر حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ یہاں تک کہ قربانی اپنی جگہ تک پہنچ جائے یعنی یہاں تک کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ بھیجی ہوئی قربانی حرم شریف میں اس جگہ تک پہنچ گئی ہوگی جہاں جا کر قربانی کو ذبح کیا جاتا ہے۔

المحل (بکسر الحا) الحایل سے مشتق ہے بمعنی النزول اس کا اطلاق زمان و مکان ہر دونوں پر ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے محل الدین قرضہ ادا کرنے کے وجوب کا وقت اور محل الهدی یعنی وہ جگہ جہاں قربانی کو ذبح کیا جائے اور وہ ہم احناف کے نزدیک حرم شریف ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ اس قربانی کے ذبح کی جگہ عزت والا گھر ہے۔

مسئلہ: یہ حکم ہر قسم کے حاجی کے لئے ہے مفرد ہو یا متمتع یا قارن اور اسی طرح عمرہ کرنے کے لئے بھی یعنی اسے یہ جائز نہیں کہ وہ قربانی کی جگہ پر پہنچنے سے پہلے سر منڈائے۔

مسئلہ: احرام کے بعد سر منڈانا سر کتروانے سے افضل ہے۔

مسئلہ: صرف چوتھائی حصہ سر کا منڈانا بھی جائز ہے لیکن سالم سر منڈوانا افضل ہے تاکہ حضور اکرم ﷺ کی اقتدا نصیب ہو اور یہ مسئلہ حق کے متعلق ہے۔

مسئلہ: حج کے علاوہ حضور نبی اکرم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ سر کے بال نہیں منڈواتے تھے گنتی کے چند ایک بار منڈوایا بھی تھا لیکن اکثر اوقات سر مبارکہ کے بال رکھوائے [1]

مسئلہ: سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے بال اکثر منڈوایا کرتے جب سے حضور نبی کریم ﷺ سے سنا کہ ہر بال کے بن میں جنابت ہے فَمَنْ یہ مَنْ شرطیہ ہے اور موصولہ بھی كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا پس وہ جو مریض ہو یعنی اسے ایسا مرض ہے جو ادائیگی فرض کیلئے احرام کے وقت حرج پیدا کرتا ہے مَرِيضًا، كَانَ کی خبر اور مِنْكُمْ حال ہے یہ دراصل صفت ہے لیکن مقدم واقع ہوا ہے اسی کے لئے اب اسے محلاً منصوب حال قرار دیا جائے أَوْ بِهٖٓ أَذًى یا

---

[1]: وہابی دیوبندی وغیرہ ایک طرف تو سنت پر عمل کرنے کے مدعی ہیں لیکن سر کے بالوں کے دشمن ہیں اس سے ان کی محمد بن عبدالوہاب کی سنت سے پیار کی محبت ٹپکتی ہے تفصیل کے لئے فقیر اویسی کی کتاب الاحادیث النبویہ فی علامات الوھابیہ میں ہے۔ (اویسی غفرلہ)

اسے درد ہے جو ہونے والا ہے من راسه اس کے سر سے یعنی سر میں زخم ہو جاویں یا سر میں جوئیں پیدا ہو جائیں یا سر کا درد ہو اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ حج کرنے والا اپنے احرام میں ثابت ہے سر نہ منڈائے یہاں تلکہ اس کی قربانی ذبح کی جائے ہاں سر کے بال منڈانے کے لئے اگر مجبور ہو کہ سر کے بال منڈائے بغیر چارہ کار نہیں فَفِدْيَةٌ تو اس پر فدیہ لازم ہے مِّنْ صِيَامٍ روزہ سے یعنی اس پر تین دن کے روزے واجب ہیں أَوْ صَدَقَةٍ یعنی صدقہ دینا یعنی چھ مسکینوں کو صدقہ دے ہر مسکین کے لئے نصف صاع گندم کا ہونا چاہیے أَوْ نُسُكٍ بضمتين نسیکتہ کی جمع ہے بمعنی ذبیحہ اس کے تین درجے ہیں ا۔ اعلیٰ اونٹ ۲۔ متوسط گائے ۳۔ ادنیٰ (بکری) أَوْ تخیر کے لئے ہے فَإِذَا أَمِنتُمْ جب تمہیں خوف سے امن ملے اور تندرست ہو جاؤ اور وسعت میسر ہو جائے نہ کہ بندش ابھی تک موجود ہو فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ پس جو شخص کہ تقرب الی اللہ کا نفع پالے عمرہ سے قبل نفع اٹھائے تقرب الی اللہ یعنی حج سے اس کے مہینوں میں یا وہ شخص جو کہ عمرہ کے احرام سے فراغت پا کر احرام کے ممنوعات کے مباح ہونے سے نفع پائے حتی کہ وہ حج کا احرام باندھ سکے فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ پس جو آسان ہو قربانی سے یعنی اس پر دم ہے جسے وہ آسانی سے ادا کر سکے بسبب تمتع کے اس سے تمتع کی قربانی مراد ہے۔

مسئلہ: سیدنا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ وہ قربانی ہے جو دسویں کے دن کی جاتی ہے اور اس کے گوشت کا حکم عید کی قربانی جیسا ہے۔

فَمَن لَّمْ يَجِدْ پس وہ شخص کہ جسے قربانی میسر نہیں فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ تو اسے تین دن روزے رکھنے چاہیں۔ صیام مصدر ہے اپنے ظرف کی طرف (معنی) مضاف ہے اگرچہ علی الاتساع لفظاً مفعول بہ ہے یعنی اسے تین روزے رکھنا ضروری ہیں فِي الْحَجِّ یعنی حج کے ایام میں اور اس کے مہینوں میں دو احراموں یعنی عمرہ اور حج کے درمیان۔

مسئلہ: یہ روزے چاہے متفرق کر کے رکھے چاہے پے در پے۔

مسئلہ: مستحب ہے کہ یہ روزے ساتویں آٹھویں اور نویں ذوالحج کو رکھے۔

مسئلہ: دسویں ذوالحج اور ایام تشریق یعنی ذوالحج کی گیارہ، بارہ، تیرہ کو روزہ رکھنا ناجائز ہے۔

وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ اور سات روزے رکھو جب تم واپس لوٹو یعنی جب اعمال حج سے فارغ ہو جاؤ۔

ف: اس پر رجوع کا اطلاق سبب بول کر سبب خاص کے ارادہ کے قبیل سے ہے یعنی رجوع سے واپس اور فارغ ہو جانا اور ہے اور یہ رجوع کے سبب ہیں۔

تِلْكَ وہ تین اور سات روزے عَشَرَةٌ کل میزان دس روزے ہوئے۔ ان کو علیحدہ ذکر کر کے پھر کل دس کی گنتی سے کیا فائدہ تا کہ کوئی وہم نہ کرے کہ واؤ بمعنی او کے ہے جیسے مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ میں واؤ بمعنی اور ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جیسے اس عدد کو اجمالاً معلوم کر لیا جائے اور قاعدہ ہے کہ دو ایک سے افضل ہے تیسرا فائدہ کہ اکثر اہل عرب حساب نہیں جانتے تھے عام طور پر عادت تھی کہ جو کوئی اپنے کسی ساتھی سے اعداد متفرقہ گفتگو کرتا تو اسے مجموعی طور حساب لگا کر گفتگو کرتا تا کہ اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ف: یہاں سَبْعَةٍ سے پورے سات مراد ہیں اس سے کثرت مراد نہیں اگر چہ اس کا استعمال ہر دونوں کے لئے ہوتا ہے کَامِلَةٌ، عَشَرَةٌ کی صفت موکدہ ہے کیونکہ کبھی وصف تاکید کے لئے بھی آتی ہے جب کہ موصوف اسی معنی کا فائدہ دیتا ہو جیسے اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ میں اور تاکید اس وقت مطلوب ہوتی ہے جب کہ اس حکم مؤکدہ میں اہتمام اور اس کی قطعیت مقصود ہو اور یہاں پر مؤکدہ یہ ہے کہ اس روزے میں عدد کی رعایت رہے اس کی اس لئے تاکید کی کہ اس کے اہم مقاصد سے یہ ہے کہ انہیں پورا کیا جائے اور انہیں ہرگز ترک نہ کیا جائے ذٰلِكَ یہ اشارہ ہم احناف کے نزدیک نفس تمتع کی طرف ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک تمتع کے حکم کی طرف ہے یعنی متمتع کو اگر قربانی میسر ہے تو اس پر قربانی لازم ہے اگر قربانی میسر نہیں تو اس پر روزے لازم ہیں ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہ اس کے لئے ہے جو مسجد حرام کے قرب و جوار کا نہیں حاضر بمعنی لازم ہے یعنی وہ جو کہ مکہ میں اقامت پذیر نہیں اہل سے شخص کے اخص لوگ مراد ہیں اہل کا ذکر اس لئے ہے کہ عموماً انسان جہاں بھی ٹھہرتا ہے تو اس کے اہل و عیال بھی ساتھ ہوتے ہیں۔

مسئلہ: جس شخص کا مسکن مواقیت کے اندر ہے اس کے لئے تمتع ہے نہ قرآن۔

مسئلہ: جو شخص بھی ان میں تمتع یا قرآن کی نیت کرے گا اس پر دم لازم آئے گی اور اس کا گوشت بھی نہیں کھا سکے گا۔

وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ اور سات روزے رکھو جب تم واپس لوٹو یعنی جب اعمال حج سے فارغ ہو جاؤ۔

ف: اس پر رجوع کا اطلاق سبب بول کر سبب خاص کے ارادہ کے قبیل سے ہے یعنی رجوع سے واپس اور فارغ ہو جانا اور ہے اور یہ رجوع کے سبب ہیں۔

تِلْكَ وہ تین اور سات روزے عَشَرَةٌ کل میزان دس روزے ہوئے۔ ان کو علیحدہ ذکر کر کے پھر کل دس کی گنتی سے کیا فائدہ تاکہ کوئی وہم نہ کرے کہ واؤ بمعنی او کے ہے جیسے مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ میں واؤ بمعنی اور ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جیسے اس عدد کو اجمالاً معلوم کر لیا جائے اور قاعدہ ہے کہ دو ایک سے افضل ہے تیسرا فائدہ کہ اکثر اہل عرب حساب نہیں جانتے تھے عام طور پر عادت تھی کہ جو کوئی اپنے کسی ساتھی سے اعداد متفرقہ گفتگو کرتا تو اسے مجموعی طور حساب لگا کر گفتگو کرتا تاکہ اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ف: یہاں سَبْعَةٍ سے پورے سات مراد ہیں اس سے کثرت مراد نہیں اگرچہ اس کا استعمال ہر دونوں کے لئے ہوتا ہے كَامِلَةٌ، عَشَرَةٌ کی صفت مؤکدہ ہے کیونکہ کبھی وصف تاکید کے لئے بھی آتی ہے جب کہ موصوف اسی معنی کا فائدہ دیتا ہو جیسے لِاِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ میں اور تاکید اس وقت مطلوب ہوتی ہے جب کہ اس حکم مؤکدہ میں اہتمام اور اس کی قطعیت مقصود ہو اور یہاں پر مؤکدہ یہ ہے کہ اس روزے میں عدد کی رعایت رہے اس کی اس لئے تاکید کی کہ اس کے اہم مقاصد سے یہ ہے کہ انہیں پورا کیا جائے اور انہیں ہرگز ترک نہ کیا جائے ذٰلِكَ یہ اشارہ ہم احناف کے نزدیک نفس تمتع کی طرف ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک تمتع کے حکم کی طرف ہے یعنی متمتع کو اگر قربانی میسر ہے تو اس پر قربانی لازم ہے اگر قربانی میسر نہیں تو اس پر روزے لازم ہیں ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہ اس کے لئے ہے جو مسجد حرام کے قرب و جوار کا نہیں حاضر بمعنی لازم ہے یعنی وہ جو کہ مکہ میں اقامت پذیر نہیں اہل سے شخص کے اخص لوگ مراد ہیں اہل کا ذکر اس لئے ہے کہ عموماً انسان جہاں بھی ٹھہرتا ہے تو اس کے اہل و عیال بھی ساتھ ہوتے ہیں۔

مسئلہ: جس شخص کا مسکن مواقیت کے اندر ہے اس کے لئے تمتع ہے نہ قرآن۔

مسئلہ: جو شخص بھی ان میں تمتع یا قرآن کی نیت کرے گا اس پر دم لازم آئے گی اور اس کا گوشت بھی نہیں کھا سکے گا۔

مسئلہ: مکہ شریف کے قرب وجوار کے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ حج کے مہینوں کے سوا وہ کسی دوسرے مہینہ میں عمرہ کریں اور افراد کا حج کریں صرف حج کے ایام میں۔

مسئلہ: قرآن اور تمتع صرف افاقیوں یعنی مکہ شریف سے دور رہنے والوں کے لئے ہیں ان کی قربانی کا حکم عام نسک کا ہے یعنی ایسے لوگ قربانی کا گوشت کھا سکتے ہیں۔

مسئلہ: امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے اہل حرم اور وہ لوگ مراد ہیں جنکی نماز قصر نہیں ہوتی۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ سے اس کے اوامر ونواہی کے محافظت کے بارہ میں خصوصاً حج کے مسائل میں ڈرو۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ اس کے لئے جو اس سے نہیں ڈرتا تا کہ اس کا علم اسے گناہ کرنے سے روکے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔

مرو زیر بارے گنہ اے پسر　　　که حمال عاجز بود در سفر

تو پیش از عقوبت در عفو کوب　　　که سودے ندارد فغان زیر چوب

(**ترجمہ:** اے عزیز گناہ کے بوجھ تلے جانے کی کوشش نہ کرو اس لئے سفر میں بوجھ تکلیف دیتا ہے سزا سے پہلے ہی اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لے اس لئے کہ لکڑی جب سر پر پڑتی ہے تو اس وقت آہ وفغاں کوئی فائدہ نہیں دیتی)

ف: جیسے اتمام الحج ظاہری طور ہوتا ہے اسی طرح باطنی طور پر ہوتا ہے۔

حکایت: بعض بزرگوں کا واقعہ ہے کہ وہ حج کو گئے جب حج سے فارغ ہوئے تو ساتھی سے پوچھا کیا ہم نے حج مکمل کر لیا حالانکہ اس طرح حج تو نہیں ہوتا کیا تم نے ذی الرمہ کا قول نہیں سنا۔

تمام الحج ان تقف المطایا　　　علی خرقا و واضعته اللثام

حل لغات: خرقا شاعر کی محبوبہ کا نام ہے واضعۃ لثام یعنی کھلے طور آمنے سامنے آجانا شاعر نے محبوبہ کے سامنے سواریوں کے کھڑے ہونے کو مناسک حج کہ وہ امور مراد لئے جن کے بغیر حج نا مکمل ہوتا ہے ترجمہ حج اس وقت مکمل ہوتا جب کہ ہمارے حج کے بعد ہمارا محبوب آمنے سامنے ہو۔

حقیقی حج: بزرگ کی بات حق ہے کہ جو کوئی حج کو جائے تو سفر طے کرتا ہوا جب بیت اللہ اور اس کے حرم میں

پہنچے تو وہ اپنی تمام خواہشات کو طے کرلے اور قلب کے تمام پردے اٹھ جائیں یہاں تک کہ مشاہدہ کے مقام میں پہنچ جائے اور حرم سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ کے کرم کے آثار آنکھوں سے ملاحظہ کرے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ عوام کا حج یہ ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کا قصد اور اس کی زیارت کا ارادہ رکھتے ہیں اور خواص کا حج یہ ہے کہ رب البیت اور اس کا شہود کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ سیدنا خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ یا اس شخص کی طرح کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا مقصد رکھے اور اس کی طلب میں رہے اور بالکلیہ اسی کی طرف متوجہ ہو اور اپنے نفس مال واولاد کو اس پر قربان کردے اور ماسوی اللہ کو اپنا دشمن سمجھے چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پورے پابند تھے یہی سب کے سب حقیقی حج کے مناسک ہیں اور اسی کے لئے انہیں اللہ تعالیٰ نے یہی وہ پہلا انسان پیدا کیا جس نے اللہ تعالیٰ کے گھر کی بنیاد رکھی اور اس کا طواف کیا اور حج بھی پڑھا اور پھر لوگوں کو حج کی دعوت دی اور طریقہ مناسک حج کا آغاز فرمایا۔

حبیب وخلیل کا فرق: حضرت ابراہیم علیہ السلام ظاہری اور باطنی حج کے جامع تھے اور یہ انہیں کا مقام تھا لیکن ان سے ہمارے نبی اکرم ﷺ کا مرتبہ مقام بلند وبالا ہے کیونکہ مقامات ومنازل اور احوال عطائے الٰہی پر منحصر ہیں۔ سلوک مقامات عطائے الٰہی کے بغیر بھی ممکن ہے لیکن مواجب ربانی سلوک المقامات کے بغیر نصیب نہیں ہوتے چونکہ حضرت خلیل علیہ الصلوۃ والسلام اہل مقامات سے تھے اس لئے کہا اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ اور چونکہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام اہل مواہب سے تھے آپ کے لئے کہا گیا سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ پھر چونکہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا حج حقیقی کی طرف جانا خود بخود تھا اس لئے انہیں ساتویں آسمان پر روک کے کہا گیا کہ اگر تم رک گئے ہو تو جو میسر ہوسکے قربانی دو چنانچہ انہوں نے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لئے پیش کیا اور ہمارے نبی پاک ﷺ نے حج حقیقی کی طرف خود بخود نہیں جانا تھا اس لئے انہیں کوئی رکاوٹ نہ ہوئی بلکہ انہیں کہا گیا اپنا حج اور عمرہ مکمل کرلو انہوں نے حج کو مکمل فرمایا بایں طور کہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوئے جیسے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ پھر آپ نے عمرہ کیا بایں طور

کہ آپ پر مقصود کے چاند شہود کے معزز مرتبہ سے منکشف ہو کر متجلی ہوئے اور وصال کے سورج سے عنائت محبت حاصل ہوئی پھر دو محبوں کے درمیان ہوا جو کچھ ہوا یا وہ جانے یا پھر یہ جانے پھر اللہ تعالیٰ نے وحی کو جیسے چاہا و اللہ اعلم کیا چاہا پھر آپ کو جلال کے پردوں سے حج اکبر کے دن حجۃ الوداع میں جبل عرفات کے قریب پکارا گیا کہ اے محبوب حج پورے طور پر ادا کر لو یہی اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا کی آخری حجت ہے۔

صوفیانہ وعظ: اے عزیز معرفت رب کے لئے ہر قلب صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ ہی ہر نفس خدمت ربانی کے لائق ہے اور نہ اچھا مال اللہ تعالیٰ کے خزانے کے لئے ہوتا ہے پس اے عزیز اپنے حال کو سنوارنے کی کوشش کیجئے اپنے مال کو خرچ کرنے کے لئے سخاوت کے خوگر بنو اگر تیرے پاس مال نہیں تو اس کی راہ میں نفس کو خرچ کرو بلکہ اگر تمہیں دونوں یعنی مال اور نفس کے خرچ کی توفیق ہے تو بسم اللہ کر کے دونوں کو ہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں لوٹا دے کیا تمہیں سیدنا ابرہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا واقعہ یاد نہیں کہ وہ اپنا مال مہمانوں پر کتنی محبت سے خرچ کرتے اور عشق میں آ کر اپنے آپ کو کیسے ہی آگ میں ڈال دیا آپ کی اس قربانی پر ملائکہ کرام دنگ تھے اسی وجہ ہی سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خُلت جیسے اعلیٰ مرتبہ پر فائز المرام فرمایا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا

حکایت: حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں میں ایک دفعہ مکہ شریف کی طرف روانہ ہوا تو راستہ میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ رات کے وقت سر آسمان کی طرف اٹھا کر عرض کر رہا ہے اے وہ ذات جو طاعات سے خوش ہوتی ہے اور کسی کے گناہ سے نقصان نہیں پہنچاتی مجھے وہ کردار عطا فرما جس سے تیری خوشی ہو اور میری وہ غلطیاں معاف فرما جو مجھ سے سرزد ہوئیں لیکن اس سے تیرا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ جب لوگوں نے احرام باندھا اور لبیک پکارنے لگے تو میں نے اسے کہا اے عزیز تم لبیک کیوں نہیں کہتے کہنے لگا اے شیخ میرا لبیک کہنا میرے ان گناہوں اور غلطیوں سے مجھے نہیں بچا سکتا جو مجھ سے سرزد ہوئیں مجھے خطرہ ہے کہ میں کہوں لبیک اور وہ جواب دے لا لبیک تو پھر کیا ہوگا اور ساتھ مجھے یہ بھی جواب دیا کہ میں تیری کوئی بات نہیں سنتا اور نہ ہی تیری طرف دیکھتا ہوں یہ کہہ کر وہ نوجوان وہاں سے چل پڑا اس کے بعد صرف منیٰ میں نظر آیا اور وہاں یہ کہہ

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ

حج کے کئی مہینے ہیں جانے ہوئے تو جو ان میں حج کی نیت کرے تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ

تذکرہ ہو نہ کوئی گناہ نہ کسی سے جھگڑا حج کے وقت تک اور تم جو بھلائی کرو اللہ اسے جانتا ہے اور توشہ لو کہ سب سے

خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۞ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ

بہتر توشہ پرہیزگاری ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو۔ تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا

تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

فضل تلاش کرو اور جب عرفات سے پلٹو تو اللہ کی یاد کرو

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ

مشعر حرام کے پاس اور اس کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت فرمائی اور بیشک اس سے پہلے تم

الضَّآلِّيْنَ ۞ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

بہکے ہوئے تھے۔ پھر بات یہ ہے کہ اے قریشیو! تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں اور اللہ سے معافی مانگو بیشک اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ

بخشنے والا مہربان ہے۔ پھر جب اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو

اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ

جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے زیادہ اور کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے

فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۞ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي

اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں

الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا

عذاب دوزخ سے بچا۔ ایسوں کو ان کی کمائی سے بھاگ ہے

وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ

اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔ اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں میں تو جلدی کرکے دو دن میں چلا جائے

فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا

اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو رہ جائے اس پر کچھ گناہ نہیں پرہیزگار کے لیے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو

أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

کہ تمہیں اسی کی طرف اٹھنا ہے۔ اور بعض آدمی وہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کی بات تجھے بھلی لگے

وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ

اور اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ لائے اور وہ سب بڑا جھگڑالو ہے۔ اور جب پیٹھ پھیرے

فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝

تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے اور اللہ فساد سے راضی نہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ ۚ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو اسے اور ضد چڑھے گناہ کی ایسے کو دوزخ کافی ہے اور وہ

الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ

ضرور برا بچھونا ہے اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے اللہ کی مرضی چاہنے میں اور اللہ بندوں

رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا

پر مہربان ہے۔ اے ایمان والو اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان

خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

کے قدموں پر نہ چلو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور اس کے بعد بھی بچ لو کہ

جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ

تمہارے پاس روشن حکم آچکے تو جان لو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ کاہے کے انتظار میں ہیں مگر

يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى

یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں اور فرشتے اتریں اور کام ہو چکے اور سب کاموں کی

اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

رجوع اللہ کی طرف ہے۔

تفسیر عالمانہ اَلْحَجُّ یہاں مضاف محذوف ہے ای وقتہ یعنی حج کا وقت اس لئے کہ حج ایک فعل ہے اور فعل اَشْهُرٌ نہیں ہوسکتا اشہر چند مہینے ہیں اور وہ یہ ہیں ۱۔ شوال ۲۔ ذیقعدہ ۳۔ ذوالحج کے دس دن ہیں یہ احناف کے نزدیک ہے۔

سوال: انہیں اَشْهُرٌ (جمع) سے کیوں تعبیر کیا گیا حالانکہ اشہر جمع ہے اور اس کے لئے کم از کم تین کا مکمل عدد ضروری ہے اور یہاں پر دو ماہ مکمل اور تیسرے کے دس دن ہیں۔

جواب: قاعدہ ہے کہ کبھی بعض کل کے قائم مقام آتا ہے نیز کبھی جمع کا اطلاق مافوق الواحد پر بھی ہوتا ہے وہ مہینے لوگوں کو معلوم اور معروف ہیں کیونکہ ان کا علم انہیں توارثاً چلا آرہا ہے پھر شریعت اسلامیہ نے بھی ان کی توثیق کردی یعنی جسے وہ پہلے جانتے تھے شریعت نے اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہ فرمایا بلکہ جوں کا توں رہنے دیا۔

سوال: حج کو انہی ایام میں متعین فرمانے کا کیا فائدہ؟

جواب: تاکہ معلوم ہوجائے کہ حج صرف انہی ایام میں ادا ہوسکتا ہے اور بس۔

مسئلہ: سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک احرام صرف انہیں مہینوں میں باندھا جاسکتا ہے اگر ان کے سوا کسی [illegible]

مسئلہ :امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک انہی مہینوں کے اندر احرام باندھنا حج کے شرائط میں سے ہے۔ پھر جیسے نماز کے لئے وقت سے پہلے وضو جائز ہے ایسے ہی حج کے اوقات سے پہلے احرام باندھنا جائز کیونکہ احرام بمنزلہ وضو کے ہے۔

سوال اہل عرب کہتے ہیں وقت الحج اشھر حج کا وقت وہی مخصوص مہینے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احرام وقت سے پہلے نہ ہو کیونکہ احرام حج کا جزو ہے۔

جواب اس مقولہ سے ثابت نہیں ہوتا کہ احرام وقت سے پہلے ناجائز ہے بلکہ اس مقولہ کا مقصد یہ ہے کہ حج کے مناسک اور دیگر امور انہیں ایام میں ادا کرنے چاہیں۔

مسئلہ :یہ تینوں مہینے ہی حج کے اوقات ہیں جس وقت بھی احرام باندھے جائز ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس آیت میں مہینہ کی ہر گھڑی کو حج کے اوقات سے مخصوص فرمایا ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ ان تمام دنوں میں حج نہیں ہوتا بلکہ مخصوص دنوں میں ہوتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ ان مہینوں میں احرام باندھنا تو بھی جائز ہے اور اس میں کسی قسم کی کراہت ہی نہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی مذہب ہے۔ **(کذلک هو الذی من الشیخ)**

فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ پس جس شخص نے انہی دنوں میں اپنے اوپر حج فرض کیا اس کے اوپر لبیک پکارنا اور قربانی کے جانور کی گردن میں چمڑے کا ہار باندھنا واجب ہے۔

سوال آپ نے یہاں سے سمجھ لیا کہ آیت میں لبیک پکارنا اور قربانی وغیرہ بھی فرض ہے؟

جواب: حج کے مناسک میں احرام باندھنا اور اس سے فارغ ہو جانا ہے اور اس میں نماز کی طرح صرف نیت ہی کافی نہیں جب تک کہ حج کے امور میں کوئی امر بجا نہ لائے اور وہ بھی لبیک پکارنا اور قربانی کے جانور کے گلے میں چمڑہ باندھنا ہی ہے اس سے معلوم ہوگا کہ حج کرنے والا اس کام کو شروع کر رہا ہے۔

ف تقلید الهدی بمعنی قربانی کے جانور کے گلے یا اس کے پاؤں میں چمڑہ وغیرہ باندھنا۔

فَلَا رَفَثَ پس جماع اور اس کے ماسوا وہ افعال جو جماع کے سبب بنتے ہیں جیسے بوسہ دینا اور آنکھوں ... نے چاہیے کیونکہ یہ امور احرام میں حرام ہیں ... کہ دنوں سے پہلے تو اس سے حج فاسد ہو

جاتا ہے اس کے بعد بھی قربانی واجب ہو جاتی ہے اور جماع کے اسباب یعنی بوسہ وغیرہ بھی حرام ہیں تا کہ ان کے ارتکاب سے جماع کا مرتکب نہ ہو جائے۔

مسئلہ: رَفَثَ اور اس کے ساتھ جو دیگر امور مذکور ہیں مثلاً فسوق اور جدال اگرچہ بظاہر بصیغہ نفی مذکور ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ ان امور میں سے کوئی امر واقع نہ ہوگا لیکن اس سے نہی مراد ہے اس لئے کہ اسے اپنے اصلی بمعنی نفی پر رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی خبر میں کذب واقع ہوگا اور وہ کذب سے منزہ و پاک ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ان امور میں اکثر کا حج کے دوران وقوع ہوتا ہے اس طرح نفی کو اپنے معنی پر رکھنا مناسب نہیں۔

سوال: پھر صاف طور پر نفی کا صیغہ کیوں نہیں لایا گیا۔

جواب: اس طریق سے مبالغہ ہوتا ہے یعنی نفی لا نہی مراد لی جائے تو مبالغہ ہو جاتا ہے اور یہاں بھی مبالغہ مطلوب تھا گویا مکلف انسان کو جب معلوم ہوا کہ مجھے ان امور سے روکا گیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف کو مدنظر رکھ کر ان امور سے اجتناب کرے گا اس کے بعد گویا اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ حج کے دوران ان امور کا کوئی بھی مرتکب نہیں ہوگا۔

وَلَا فُسُوْقَ اور نہ ہی ارتکاب کر کے حدود شرع سے باہر نکلنا چاہیے تلاش میں اس کے تمام انواع داخل ہیں یہاں تک کہ حج کے دوران گالیاں بکنا یا کسی دوسرے کو گندے اور برے القاب سے یاد کرنا سب ناجائز ہیں **وَلَا جِدَالَ** اور نہ ہی اپنے خادموں اور ساتھیوں اور برائی کرنے والوں سے لڑائی کرو اس لئے کہ لڑائی سے بغض و عداوت بڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت الفت کم ہوتی ہے۔

مسئلہ: دینی شرعی مسائل میں بحث کرنا وغیرہ جائز ہے خواہ بطریق مناظرہ کے بھی ہو۔

فِى الْحَجِّ حج کے دنوں میں۔

سوال: یہ امور حج کے علاوہ دیگر اوقات میں بھی حرام ہیں پھر حج کے ساتھ خصوصی طور پر ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟

جواب: تا کہ معلوم ہو کہ یہ امور دیگر اوقات میں نامشروع ہیں وہ دوران حج بہت زیادہ برے ہیں جیسے ریشم پہننا ویسے ہی حرام ہے لیکن نماز میں پہننا اس سے زیادہ اسی طرح نغمہ سرائی ویسے بھی ناجائز ہے لیکن قرآن میں اس سے اور زیادہ۔

ف: تطریب یعنی حروف میں ایسا الحان اور آواز نکالنا جو سرور اور گانے کے مشابہ ہو اور یہ قرآن میں حرام ہے۔

مسئلہ: قرآن مجید کو اچھے لہجہ سے اور اس کے قواعد کے ساتھ پڑھنا جائز ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ اپنی آواز کو قرآن پاک پڑھتے وقت اچھا بناؤ اس لئے کہ قرآن میں اچھی آواز بنانا قرآن پاک کے حسن کو بڑھاتا ہے اور اچھا لہجہ بنانا رقت قلبی اور دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا سبب ہے اور یہ امام ابوحنیفہ اور دیگر اسلاف رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منقول ہے۔

وَمَا یہ شرطیہ ہے تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ اور وہ جو تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے یعنی جو نیکی بھی بندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اس سے ثواب دینا مراد ہے۔

ف: تین گناہوں سے روکا ہے اور ہر نیکی کو حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے شر سے روکنے کے بعد نیکی کے ذکر میں کار خیر کی طرف برانگیختہ کرنا ہے۔

ف: اچھا کلام کرنا برے کلام کے عوض اور تقوی کا عمل فسق کے بدلے عوام سے موافقت اور اخلاق حسنہ جدال کے بجائے بہتر ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا یعنی میدان حشر اور آخرت کے لئے سامان تیار کرو برائیوں سے بچ کر فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی پس بہترین زادِ راہ پرہیز گاری ہے کہ طعام وغیرہ جمع کیا جائے۔

ف: اس میں تحقیق یہ ہے کہ انسان کیلئے دو سفر ہیں ۱۔ دنیا کا سفر ۲۔ دنیا سے کوچ کر جانے کا سفر۔

دنیا کے سفر میں بھی زادراہ ضروری ہے اور اس کا زادراہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی معرفت یہ ہے کہ بندہ ماسوی اللہ سے روگردانی کرے اور اس کی اطاعت میں مشغول رہے اور اس کے احکام پر پابندی کرے اور اس کی مناہی کی مخالفت کرے اور یہ زادِراہ اس مسافر کی زادِراہ سے افضل ہے جو دنیا کا مسافر ہے اس لئے کہ دنیا کا زادراہ چند روز کے دکھ سے بچاتا ہے اور آخرت کا زادراہ دائمی عذاب سے محافظت کرتا ہے علاوہ ازیں دنیا کا زادراہ فانی ہے اور آخرت کا زادراہ دائمی لذات کی طرف پہنچاتا ہے۔

شانِ نزول: اہل یمن کا طریقہ تھا کہ حج کے لئے روانہ ہو جاتے لیکن زادراہ ساتھ نہ لے جاتے اور کہتے کہ ہم تو متوکل الی اللہ ہیں اور یہ بھی کہتے کہ جب ہم بیت اللہ کو جا رہے ہیں تو پھر وہ ہمیں طعام کھلائے گا لیکن اس

طرح سے لوگوں پر بوجھ بن جاتے اور مکہ پہنچتے ہی لوگوں سے سوال کرنے شروع ہو جاتے بلکہ لوٹ گھسوٹ تک نوبت پہنچ جاتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا خرچ لے جاؤ یعنی جو کچھ طلب کرتے ہو اور اپنے وجوہ کو روک دو کیکر اور زیتون اور ستوں اور کھجور وغیرہ وغیرہ کے حصول سے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ لوگوں سے طعام نہ مانگو اور لوگوں کو تنگ نہ کرو اور ان پر بوجھ نہ ہو اس لئے کہ بہترین زادراہ سوال اور لوٹ گھسوٹ سے بچنا ہے۔

وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ اور مجھ سے ڈرو اے عقل والو! اس لئے کہ عقل کا خلاصہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں اور تقوی کی عادت ہو اس میں اللہ تعالیٰ نے تقوی کی ترغیب دی ہے اس سے مقصد اصلی وہی خود ذات حق ہے۔

ف: سالک کو چاہیے کہ ماسوی اللہ سے بالکل آزاد ہو جائے اور عقل جو خواہشات نفسانیہ کی خرابیوں سے محفوظ ہے کا تقاضہ بھی یہی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے صرف عقل والوں کو مخاطب فرمایا ہے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا گویا اسے عقل کی دولت نصیب نہیں۔

سبق: دانا پر لازم ہے کہ وہ عقل کو تمام غلط ملاوٹوں سے دور رکھے اور نفس کے تزکیہ میں لگا رہے اور اسے بلند مراتب اور اعلیٰ مناصب تک پہنچانے کی جدوجہد کرے کسی شاعر نے کہا۔

و لم ارنی عیوب للناس شیا   کنقص القادر ین علی التمام

ترجمہ: میں لوگوں میں سب سے بڑا نقص یہ پاتا ہوں کہ وہ اپنی تکمیل پر قادر ہونے کے باوجود پھر بھی کوتاہ ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

حضرت امام قدس سرہ فرماتے ہیں کہ انسان میں تین قوتیں رکھی گئی ہیں۔
۱۔ قوت شہوانیہ بہیمیہ ۲۔ قوت غضبیہ شیطانیہ ۳۔ قوت وہمیہ عقلیہ ملکیہ

ان تمام عبارات سے مقصود یہی ہے کہ یہ قوتیں مغلوب ہو جائیں اسی اعتبار سے فَلَا رَفَثَ میں قوت شہوانی بہیمیہ کو مغلوب کرنا اور وَلَا فُسُوْقَ میں قوت غضبیہ سبعیہ شیطانیہ کو دبانا مطلوب ہے قوت وہمیہ عقلیہ ملکیہ وہ قوت ہے کہ جس سے معصیت اور گناہوں پر غرور ہو جاتا ہے وَلَا جِدَالَ میں اشارہ ہے کہ قوت وہمیہ عقلیہ کو اپنے قابو میں رکھو یہ ایسی قوت ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال واحکام اور اسماء میں جھگڑنے پر ابھارتی ہے یہی قوت لوگوں کو آپس میں لڑاتی ہے اور فتنہ اور شرارت اور دنگا فساد اسی قوت کی وجہ سے ہوتے

ہیں چونکہ تمام شرور ان تین قوتوں میں محصور ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کا ارادہ رکھتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے نور وجلال کی طلب ہے اور اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کی لڑی میں منسلک ہونا چاہتا ہے تو اسے ان تین امور کے ارتکاب سے بچنا چاہیے۔

مسئلہ: اہل شرع فرماتے ہیں جسے پیدل چل کر حج کرنے کی طاقت ہے تو اس کیلئے پیدل چل کر جانا افضل ہے لیکن اس طرح سے ضعف وکمزوری ہو جاتی ہے اور بدخلقی کا مظاہرہ کرنے لگ جاتا ہے اسی عمل سے کوتاہی کر جاتا ہے تو اسے سوار ہو کر حج پڑھنا افضل ہے جیسے مسافر اور مریض کو روزہ رکھنا افضل ہے۔

حکایت: سیدنا ابوجعفر باقر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حج کرنے والے کا حج نامنظور ہے جب تک کہ وہ تین کام نہ کرے۔ (۱) پرہیز گاری جو اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچائے (۲) حوصلہ جو اللہ تعالیٰ کے غضب سے محفوظ رکھے (۳) جس کے ساتھ دوستی کرے اس کی صحبت اور دوستی کا حق ادا کرے مسافر کو ان تینوں چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے خصوصاً حج کے مسافر کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے جو بھی ان تینوں کو مکمل طور ادا کرتا ہے اس کا حج مکمل طور ادا ہوتا ہے ورنہ جتنی کوتاہی ہوگی اتنی ہی کم ہوگی۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا۔

از من بگو حاجی مردم گزائے را کو آستیں خلق بازاری درد
حاجی تو نیستی شتر است از برائے آنکہ بے چارہ خاری خوردہ باری برد

(**ترجمہ:** میری طرف سے اس حج کرنے والے کو کہو کہ تمہارا لوگوں کو ستا کر حج پڑھنا بے کار ہے تیرے سے تو وہ اونٹ بہتر ہے جو گھاس کھا کر لوگوں کے بوجھ سر پر اٹھاتا ہے)

ف: حج کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ساتھی اور اونٹ والے سے الوداعی سے پہلے ایک دوسرے کے حقوق بخشوا لیں مثلاً غیبت وشکوہ یا کسی دوسرے کی عزت پر حملہ کرنا یا کسی کا مال لینا اس لئے کہ ان باتوں سے بہت تھوڑے لوگ بچتے ہیں اور چاہیے کہ اپنے رفیق کو تعریف کے کلمات سے یاد کرلے اور ایسے ہی وہ شخص بھی اپنے آپ کو بچائے کہ جس کا عمل نامہ پاک ہے یعنی اس کے گناہ معاف کر دیے ہیں تا کہ وہ پھر گناہوں میں

مبتلا نہ ہو جائے۔

تقریر صوفیانہ: آیت میں اشارہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کی طلب کا قصد چند معلوم مہینوں یعنی اس ظالم دنیا میں ہو سکتا ہے اس کے بعد جب اجل ختم ہو گیا تو کوشش کوئی فائدہ نہیں دے گی جیسے حج کے مہینوں کے بعد حج کا ارادہ رکھنے والے کی جد و جہد کوئی فائدہ نہیں دیتی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا جیسے حج والوں کے لئے حج کے میقات ہیں کہ وہاں سے احرام باندھتے ہیں اسی طرح سالک کے میقات ہیں یعنی جوانی کے ایام یعنی بالغ ہونے سے چالیس سال کی عمر تک یہی مطلب ہے۔ اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ کے لئے مشائخ صوفیاء نے فرمایا کہ بعد الاربعین نادر یعنی اگر چہ اس کے ارادہ اور طلب کا ظہور چالیس سال کے بعد ہوتا ہے لیکن باجود ارکان کی تکمیل کے مقصد حقیقی کو پانا نادر ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو طلب وصدق فی الارادۃ چالیس سال سے پہلے ہوتی ہے ہاں وہ اسباب جو وصال الٰہی کے لئے متعین ہیں ان میں احتمال یہ ہے کہ وہ چالیس سال کے بعد ہوں کہ اس عمر میں اپنا مقصود حاصل ہو جائے بایں طور کہ اپنی کوشش پر انتہائی طور اس کے شرائط وحدود ادا کر کے اس کے حدود کے دائرہ میں رہ کر زور لگائے۔ خلاصہ یہ کہ جس نے شباب کی وقت کے طلب ضائع کر دی تو بڑھاپے میں منزل مقصود تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت افسوس کے ہاتھ ملنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنا دودھ بگاڑ دے اور پھر امید چھاچھ اور گھی کی رکھے۔

البتہ: بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ کی عبادت سے محروم نہ رہے اس عبادت سے اسے بہشت تو میسر ہو گی۔

حکایت: ایک اللہ کا بندہ جامع مسجد کے دروازہ پر کھڑا خلق خدا کا منظر دیکھ رہا تھا یہاں تک کہ مسجد لوگوں سے بھر گئی پھر اس سے کوئی جا رہا ہے کوئی آ رہا ہے وہ بندہ خدا کہتا تھا کہ یہ سب سے بہشت کی بھرتی ہے اللہ تعالیٰ کے ہمنشین کوئی اور لوگ ہیں۔ (کذا فی تاویلات نجمیہ)

ف: حضرت قاشانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حج کے وقت کے اوقات مقرر ہیں وہ یہی ہیں کہ بالغ ہونے سے چالیس سال کی عمر تک تین دور ہیں ہر زمانہ بمنزلہ ایک ماہ کے ہے پہلا دور نشو ونما کا دوسرا جوانی کا تیسرا

بڑھاپے کا اور وہ بعض ہے بہ نسبت پہلے دو دوروں کے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے گائے کے وصف میں یوں فرمایا لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ اس میں ان تین فرمانوں کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت حافظ شیراز قدس سرہ نے فرمایا۔

عشق وشباب ورندی مجموعہ مرادارست   چوں جمع شد معانی کوئے بیاں تواں زد

تفسیر عالمانہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ تمہارے اوپر کسی قسم کا گناہ نہیں جُنَاحٌ میں عن القصد کو کہتے ہیں اَنْ تَبْتَغُوْا یہ کہ ارادہ وار طلب کرو فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ اپنے رب کے فضل اور اس سے رزق کو اس سے مراد وہ نفع ہے جو تجارت میں ایام حج میں حاصل ہوتا ہے۔

شان نزول: یہ آیت ان لوگوں کے رد میں نازل ہوئی جو کہتے تھے کہ حج کے ایام میں تجارت کے معاملات سے حج نہیں رہتا اور نہ ہی اونٹ والے کو حج کا ثواب ملتا ہے۔

مسئلہ: حج کے ایام میں تجارت مباح ہے کسی قسم کا گناہ نہیں لیکن افضل یہ ہے کہ ان ایام میں تجارت نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اخلاص کا تقاضا یہی ہے کہ ان دنوں میں سوائے اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کے اور کوئی کام نہ ہو۔

حل لغات: اَفَضْتُمْ میں ہمزہ تعدیت کا ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے ای دفعتم انفسکم یعنی اپنے نفسوں کو عرفات سے نکالو لیکن غروب شمس کے بعد وہاں سے وقوف کے بعد رجوع کرو۔

ف: تفسیر تیسیر میں ہے کہ یہاں پر افاضہ کا معنی اجتماع الکثیر الذہاب والمیسر ہے یعنی واپس ہوتے اور چلنے میں کثیر اجتماع سے جانا۔

ف: عرفات جہاں حجاج ٹھہرتے ہیں اس جگہ کا علم ہے در حقیقت یہ جمع بلکہ یہ ان اسماء میں سے ہے کہ جس پر کوئی حرف خواہ مخواہ زائد کیا جائے اس کے معنی زیادتی کی وجہ سے معرفت کی خبر دینے کے لئے مبالغہ کیا گیا ہے۔

عرفات کی وجہ تسمیہ: عَرَفٰتٍ کو عَرَفٰتٍ نام رکھنے کی کئی وجہیں ہیں۔

۱۔ مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس جگہ کی تعریف سنائی تو انہیں اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا جب انہوں نے اس مقام کو جانا پہچانا تو اس کا نام عرفات پڑ گیا۔

۲۔ مناسک میں حضرت جبریل علیہ السلام نے عرفت کا دور تھا یعنی اسے بار بار ذکر کرتے ابراہیم علیہ السلام سے کہتے عرفت وہ کہتے عرفت اس بار بار کے تکرار سے اس کا نام عرفات ہوا۔

۳۔ مروی ہے کہ جب سیدنا آدم علیہ السلام کو بہشت سے نکالا گیا تو انہیں ہند میں اور بی بی حوا علیہا السلام کو جدہ میں رکھا گیا پھر یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہے آخر اسی مقام عرفات میں ان دونوں کی ملاقات ہوگئی اور وہ دن بھی عرفہ کا تھا ان کی ملاقات اور ایک دوسرے کو پہچاننے کی بنا پر اس مقام کا نام عرفات رکھا گیا ان کے علاوہ دیگر وجوہ بھی تفاسیر میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ ٹھہرنا عرفات میں ہی واجب ہے جیسا کہ افاضہ کی اضافت سے معلوم ہوتا ہے اور مامور بہ بھی وہی ہے جب تک عرفات میں حاضری نہ دی جائے اور اس میں آ کر ٹھہرا نہ جائے ادائیگی واجب نہیں ہوگی اس سے نتیجہ یہی نکلا کہ عرفات میں ٹھہرنا واجب ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ تلبیہ و تہلیل و تحمید اور ثناء و دعوات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ مشعر حرام کے ہاں اس سے قزح مراد ہے اور قزح ایک پہاڑی ہے جس پر امام کھڑا ہوتا ہے مغرب (کتاب) میں ہے کہ مئے قدہ مشعر حرام میں قزح پر ایک مقام ہے چونکہ اس پر اہل جاہلیت آگ جلاتے تھے اس لئے اسے میقدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

سوال: ذکر اللہ اور وقوف کے لئے اس مقام کی تخصیص کیوں؟

جواب: اس میں تنبیہ ہے کہ اگرچہ مزدلفہ کی ساری زمین پر کھڑے ہو کر ذکر اللہ جائز ہے لیکن افضلیت قزح پہاڑی کے قرب میں ہے۔

ف: اس میں منافات نہیں ہے کہ مزدلفہ کی ساری زمین بھی مراد ہو اور افضلیت قزح کی پہاڑی کے قرب میں ہے جیسے عرفات کی ساری زمین ٹھہرنے کے لئے لیکن جبل رحمت کے قرب میں ٹھہرنا افضل و اعلیٰ ہے اور المشعر بمعنی المعلم یعنی عبادت کرنے لے جاننے کی جگہ الشاعر یعنی العلامات شعار سے ہے بمعنی علامت

سوال: مشعر کو حرام سے کیوں موصوف کیا گیا؟

جواب: اس مشعر کی حرمت کی وجہ سے کہ جن امور سے روکا گیا ہے ان میں ان امور کے ارتکاب کو حرام کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰىكُمْ اور اللہ کو یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی ہے یعنی جیسے اس نے تمہیں ہدایت کی کہ اسے یوں یاد کیا جاتا ہے مثلاً اس کا بہت زیادہ ذکر کرنا لیکن علی وجہ الخیفتہ ایسے ذکر کرو کہ جس میں رغبت و ہیبت اور اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال کے مشاہدہ کی طلب ہو جیسے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ احسان یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو کانک تراہ جو حدیث میں کاف واقع ہے یہ کاف تشبیہ کا ہے اور اس سے مقصود محض تقلید ہے نہ کہ تشبیہ یعنی اسے یاد کرو اور اوپر ایسے طریق کے کہ جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی ہے جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی اس سے تم روگردانی نہ کرو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہا جاتا افعل کما علمتک ایسے کرو جیسے میں نے تمہیں سکھایا یعنی اس عبادت میں کاف تشبیہ کا نہیں بلکہ تقلید کا ہے۔

سوال: اس آیت میں ذکر اللہ کا تکرار کیوں یہ تو فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے؟

جواب: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ میں ذکر کرنے کا محل و مقام بتایا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہاں ذکر کے لئے یوں ٹھہرنا ہے اور اس میں ان مناسک کی تعلیم دی گئی ہے جو اس محل کے لائق ہیں دوسری یعنی وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰىكُمْ میں اس کے وجوب کا اظہار ہے کہ تم اسے ایسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی گویا ہدایت کے بدلہ میں تم اس کا ذکر کر کے اسکا شکرانہ ادا کرو اس میں ذکر کے وجوب اور اس کیف وکم کا بیان ہے۔

وَاِنْ محففه المتقله ہے اور یہ واؤ فارقہ ہے۔ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ اور بے شک اللہ تعالیٰ کی ہدایت پانے سے پہلے لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ تم گمراہوں میں سے تھے یعنی تم ایمان واطاعت سے لاعلم تھے۔

تفسیر صوفیانہ حضرت قاشانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان کو مقام نفس میں لسانی ذکر کی ہدایت دی پھر ذکر قلبی یعنی ذکر الافعال کی یعنی اس کی نعمتوں کا تصور پھر ذکر سر یعنی معاینۃ الافعال کی یعنی تجلیات وصفات کے علوم مکاشفہ کی پھر ذکر روح یعنی انوار و تجلیات الصفات کے انور کا مشاہدہ مع ملاحظہ نو الذات کی پھر ذکر نفی یعنی مشاہدہ جمال الذات میں بقاق الاثنینیۃ کی پھر ذکر ذات یعنی مشہود ذاتی کی کہ جس سے بندے اور ذات حق کے درمیانی حجابات اٹھ جائیں اور اگر چہ تم ان مقامات کی طرف ہدایت پانے سے پہلے ان اذکار کے طریقوں سے گمراہ تھے۔

تفسیر عالمانہ ثُمَّ اَفِیْضُوْا بندوں کو ذکر اللہ کا حکم ہوا جبکہ واپس لوٹیں پھر حکم ہوا لوٹیں وہاں سے جہاں سے بزرگ لوٹیں اس میں ثم کے لفظ سے دوسرے کو پہلے پر مرتب کیا چنانچہ فرمایا ثُمَّ اَفِیْضُوْا پھر لوٹو مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں یعنی عرفہ سے نہ کہ مزدلفہ سے۔

شان نزول: قریش مکہ اور ان کے خلفاء یعنی حمس مزدلفہ میں ٹھہرتے اور کہتے ہم اللہ والے اور حرم کے مکین ہیں ہم تو حرم سے نہیں نکلیں گے عرفات میں وہ لوگوں کے ساتھ ٹھہرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اس لئے کہ عرفات حل میں ہے باقی اہل عرب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اتباع میں عرفات میں ٹھہرتے جب دوسرے لوگ مزدلفہ سے واپس لوٹنے لگے تو وہ حمس بھی عرفات سے لوٹنے شروع ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں حکم فرمایا کہ وہ عرفات میں ٹھہریں اور عرفات سے ہی لوٹیں جیسے دیگر لوگ کرتے ہیں۔

ف: النَّاسُ سے حمس کے سوا تمام عربی مراد ہیں اور حمس دراصل احمس کی جمع ہے اور احمس بہادر مرد کو کہتے ہیں نیز سخت اور متصلب فی الدین والقتال کو کہا جاتا ہے اب قریش اور کنانہ و جذیلہ اور قیس کہ کہا جاتا ہے اس لئے کہ اپنے معاملات میں بڑے سخت اور مضبوط تھے ایام منیٰ میں سایہ کے نیچے نہیں بیٹھتے تھے اور نہ ہی انہی ایام میں گھروں میں دروازوں سے داخل ہوتے بلکہ جو انکا حلیف بنتا یا رشتہ ناطہ کرتا تو اس سے بھی یہی سلوک کراتے۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو ان غلطیوں کی جو تم نے زمانہ جاہلیت میں کیں حج کے مناسک کو تبدیل کر کے اور موقف کے بارے میں مخالفت کر کے اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ بے شک اللہ تعالیٰ نے بخشش مانگنے والوں کو بخشا بلکہ ان پر انعام فرماتا ہے اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ تمام لوگوں کو لے کر عرفات جا ٹھہریں۔

حدیث شریف: مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کرام کے سامنے اہل عرفات کو دیکھ کر خوشی کا اظہار فرماتا ہے اور فرماتا ہے اے ملائکہ میرے بندوں کو دیکھو کہ دور دور سے میلے کچیلے کپڑے پہن کر آئے ہیں تم گواہ ہو جاؤ میں نے ان کو بخش دیا ہے۔

حدیث شریف: شیطان کسی ایک دن بھی ذلیل وخوار اور پریشان نظر نہیں آتا جتنا کہ عرفات کے دن نظر آتا ہے اس کی وجہ وہی ہے کہ اس دن دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت موسلا دھار بارش کی طرح حجاج پر برستی ہے اور ان کے تمام بڑے بڑے گناہ معاف فرماتا ہے اور اس کا سبب صرف یہی ہوتا ہے کہ انہیں اسی دن عرفات میں ٹھہرنے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

حدیث شریف: سب سے بڑا گنہگار وہ ہے جو عرفات میں ٹھہرتے وقت گمان کرتا ہے کہ اس کے گناہ اللہ تعالیٰ بخش دے گا یا نہیں؟

مسئلہ: ایک حج بیس غزوات فی سبیل اللہ سے افضل ہے۔

فضائل حج: جو اونٹ پر سوار ہو کر حج پر جاتے ہیں اس اونٹ کو چالیس پشتوں تک برکت دی جاتی ہے اور جس پر سات بار حج کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر واجب ہے کہ اس اونٹ کے لئے بہشت کے باغیچوں میں چراگاہ بنائے اس فضیلت کی تائید ذیل کی حکایت سے بھی ہوتی ہے۔

حکایت: حضرت نہرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک آگ جلانے والا حمام کو گرم کرنے کے لئے کسی اونٹ کی ہڈیاں لے کر آیا اور انہیں آگ میں ڈال دیا تا کہ آگ بھڑک اُٹھے وہ خود کہتا ہے کہ میں نے جونہی آگ میں ڈالا تو وہ ہڈیاں باہر آ پڑیں دوبارہ میں نے انہیں ڈالا وہ باہر آ گئیں۔ تیسری بار میں نے انہیں آگ میں ڈالا وہ ہڈیاں میرے سینے کو چمٹ گئیں اور وہاں سے ایک غیبی ہاتفی آواز آئی کہ تیرے لئے افسوس ہے تمہیں معلوم نہیں کہ یہ ہڈیاں کس اونٹ کی ہیں جو مکہ شریف کی طرف بار ہا گیا اور اب انہیں آگ کیسے جلا سکتی ہے۔

سبق: جب حج کرنے والے کی سواری کی یہ شان ہے تو پھر حج کرنے والے کا کتنا مرتبہ ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ

فضلیت با لنسبہ الی العبد تین قسموں کی ہے۔

سوال: فضلیت کو با لنسبۃ الی العبد کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: نوع بہ نوع ہونا بندے کے احوال کے تغیر وتبدل کی وجہ سے ہوتا ہے حق کی صفات میں کسی صفت کو تغیر و

تبدل نہیں ہوتا ان تینوں اقسام میں سے پہلی قسم یہ ہے کہ اسے معاش تفسیر سے تعلق ہوگا جیسے مال جاہ اور غذا اسی طرح ضروری لباس اس افضلی کو رزق سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ فرمایا وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ دوسرا وہ جو بندے کے لئے اخروی مصالح سے تعلق ہو یہ دو اقسام کی ہے ایک وہ جسے اعمال بدن سے تعلق ہے بموافق شرع اور بمتابعت شارع اور شیطان شرارتی کے فساد اور جھگڑے سے بچ کر چنانچہ فرمایا یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا دوسرا یہ کہ اسے اعمال قبل اور تزکیہ نفس سے تعلق ہے یہ دو قسم پہلی یہ کہ اسے مواہب قربت سے تعلق ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا افضل کبیر سے قرب کبیر مراد ہے اس لئے کہ یہ دنیا و آخرت سے بہت بڑا ہے دوسرا وہ ہے کہ اسے مواہب وصلۃ سے تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ یہاں فضل عظیم سے مواہب وصلۃ مراد ہے اور یہی تمام اقسام سے اعظم ہے۔

ف: طلب میں ان تمام کا علیحدہ علیحدہ مقام ہے مثلاً وہ کہ جسے مصالح اخرویہ سے تعلق ہے جسے فضل الرحمۃ سے تعبیر کرتے ہیں اس کی طلب میں ترک الموجود و بذل المجہود کرنا پڑتا ہے اور بزل المجہود سے یہی سیر الی عرفات مراد ہے اور وہ جسے ذات اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے یعنی فضل المواہب اس کی طلب عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے اور عرفات کا اشارہ معرفۃ کی طرف ہے اور ارکان الوصلۃ سے یہی بہت بڑا رکن ہے اور وہ جسے مصالح دینویہ سے تعلق ہے یعنی فضل الرزق اس کی طلب کا مقام وفات المعرفۃ کے وقوف کی تکمیل کے بعد عند الرجوع منیٰ ہے۔

ف: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے دراصل عبارت یوں تھی اذا افضیتم من عرفات فلیس علیکم یہ اس لئے کہ سالک کا ابتدائی مقام یہ ہے ابتدا ترک دنیا کرے یعنی اس سے بالکل علیحدگی اختیار کرے اور اس کی درمیانی منزل یہ ہے کہ توکل و تفرید کو اپنائے اور اس کی آخری منزل یہی ہے کہ اسے معرفۃ و توحید کا مرتبہ نصیب ہو مصالح دینویہ میں بھی وہ بچ کر آخری منزل تک پہنچ سکتا ہے جسے قوت فی المعرفت حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے لئے اس کی ہمت بلند ہو ورنہ مشکل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے قلوب حب دنیا کی نجاست سے پاک وصاف کر کے الطاف خفیہ سے منور فرما دیتا ہے ایسے حضرات کے ہاں دنیا اور اسی کی شہوات کا کوئی اعتبار نہیں اور

نہ ہی آخرت کی نعمتوں اور اس کے درجات کی انہیں پرواہ ہوتی ہے وہ کسی چیز میں کوئی تصرف نہیں کرتے۔ ہاں ان کا تصرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کی ذات میں گم ہو کر اور صرف اسی کے لئے ہوتا ہے حظوظ النفس کے لئے نہیں بلکہ وہ جو کچھ تصرف کرتے ہیں مصالح دین کے پیش نظر اور دوسروں کو بھلائی پہنچانے کی غرض سے اور بس۔

(کذا فی التاویلات النجمیہ)

حضرت عارف رومی قدس سرہ فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس خود مگیر گرچہ یکساں در نوشتن شیر و شیر

شیر آں باشد مرد اور را خورد شیراں باشد کہ مردم راہ درد

ترجمہ: پاک لوگوں کا اپنے اوپر قیاس مت کر دیکھئے شیر شیر لکھنے میں یکساں ہیں

(دودھ) وہ ہے جو لوگ پیتے ہیں اور شیر وہ ہے جو لوگوں کو پھاڑتا ہے۔

اے اللہ ہماری ہمت صرف اپنے تک محدود رکھ۔ آمین۔

تفسیر عالمانہ فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ جب تم اپنی عبادات کو مکمل کرو جن کا تمہیں حج کے بارے میں حکم ہوا اور ان سے فارغ ہو جاؤ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ پس اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جیسے تم اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہو یعنی جاہلیت کی تمام عادات کو چھوڑ کر صرف اسلام کے طریقے اپناؤ اور اپنے رب کریم کے ذکر پاک میں مشغول ہو جاؤ۔

شان نزول: اہل عرب کی عادت تھی کہ موسم حج میں جب حج کے مناسک ادا کرتے تو مسجد اور جبل کے درمیان منیٰ میں ٹھہر جاتے اور پھر یہاں اپنے آباؤ اجداد کی تعریف کے پل باندھ دیتے اور ان کی کارگزاریاں بیان کرتے اس سے ان کا مقصد یہی ہوتا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی وجہ سے شہرت پالیں گے اور ان کی بدولت ہمارا نشان بلند ہوگا اللہ تعالیٰ نے ایسے غلط طریق سے روکا اور حکم فرمایا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی بزرگی اور اس کی ثنا کریں کیونکہ تمام بھلائی اس کے ذکر میں ہے اور تمام خیر اسی سے ہی ملتی ہے اور ان کے آباؤ اجداد تو اس کے بندے ہیں انہیں یہ مراتب اللہ تعالیٰ نے ہی عطاء فرمائے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

گر از حق نہ توفیق خیر رسد   کے از بندہ خیرے بغیرے رسد

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ کی نوازش نہ ہو تو کون کسی کو خیر و بھلائی پہنچا سکتا ہے۔

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا یہ مجرور ہے اور اس کا عطف ذکر پر ہے اسے مجاز ذکر بنایا گیا ہے یعنی اسے ایسے یاد کرو جیسے تمہارا ذکر تمہارے اباؤ اجداد سے متعلق ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت زیادہ ذکر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر تمہارے آباؤ اجداد کے ذکر پر غالب ہو۔

قاعدہ: افعل التفضیل کا قاعدہ ہے کہ اپنے مابعد کی طرف اس وقت مضاف ہوتا ہے جب کہ مابعد اس کے ماقبل کا ہم جنس ہو۔

جیسے کہا جاتا ہے وجھک احسن وجہ یعنی تیرا چہرہ تمام چہروں سے حسین و جمیل ہے اور جب افعل التفضیل کا مابعد ماقبل کا غیر ہو تو پھر اس کا مابعد منصوب ہوتا ہے جیسے زید افرہ عبدا اس مثال میں فراہت صرف عبد تک محدود ہے زید کا اس سے کوئی تعلق نہیں آیت میں اشد سے پہلے ذکر مذکور ہے وہ ذکر مذکور نہیں ہو سکتا جب تک اسے اشد ذکرا نہ کہا جائے۔

سوال: قیاس کا تقاضا تو یہی ہے کہ یہاں پر اشد کو مضاف اور ذکر کو مضاف الیہ بنایا جائے جیسا کہ تم نے قاعدہ لکھا ہے۔

جواب: یہاں پر ذکر کو ذاکر مجازاً قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذکر سے مراد ایسا ذکر جو انسان کا ذکر نہ کر پہلے ذکر سے منسوب کیا گیا۔

فَمِنَ النَّاسِ پس ایسے لوگ بھی ہیں جو حج پہ حاضری دیتے ہیں مَنْ يَّقُوْلُ جو کہتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کو حصول دنیا کا ذریعہ بناتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا ہمارے رب ہمیں صرف دنیا ہی میں عنایت فرما دے جو کچھ بھی دنیا میں دینا چاہتا ہے یعنی ہمیں دنیاوی مال و متاع چاہیے جیسے جاہ و غنا اور نصرت علی الاعداء اور یہ حظوظ نقد ہیں یہ مشرکین تھے جو ایام حج میں صرف دنیا مانگتے تھے وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ اور اسے آخرت میں کسی قسم کا حصہ حاصل نہیں ہوگا اس لئے کہ اس کا مقصد تو صرف حصول دنیا ہے کہ اس نے ایک اعلیٰ مقام پہ خسیس سے خسیس شئے مانگی ہے اس کو چاہیے تھا کہ آخرت کی دائمی نعمتوں کا سوال کرتا اور مانگتا کہ اے اللہ مجھے

آخرت کا وائی اور بہت بڑا ملک عطا فرما لیکن اس نے اس سے اعراض کیا ہے فلہذا اسے آخرت میں کچھ نہیں ملے گا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اور بعض ان میں وہ ہیں جو حج کی حاضری میں اس کے ذکر کے ساتھ دارین کی بھلائی کا سوال کرتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عنایت فرما یعنی صحت ووجہ معاش بقدر ضرورت اور بھلائی کی توفیق۔ تفسیر تیسیر میں ہے کہ لفظ الحسنہ جامع ہے ہر ان تمام بھلائیوں کو جو دارین میں نصیب ہوتی ہے۔

وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً اور آخرت میں بھلائی اس سے ثواب اور رحمت مراد ہے۔

ف: حضرت ابوالقاسم حکیم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حسنہ دنیا سے سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت اور حسنہ آخرت سے قبر سے خوشخبری دیا ہوا اٹھنا اور پل صراط سے آسانی سے گزرنا مراد ہے۔

وَّقِنَا اور ہمیں بچا عَذَابَ النَّارِ دوزخ کے عذاب سے۔

ف: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ حسنہ سے حسین وجمیل عورت اور آخرت سے حور مراد ہے اور عذاب النار سے بری عورت مراد ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

چوں مرد باشد زن خوب روئے   بدیدار او بہشت ست شوئے

ترجمہ: جس کی عورت حسین اور نیک ہو اسے دنیا میں بہشتی حور ملی۔

خلاصۃ التفسیر: خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بکثرت کرو اور اپنی دارین کی سعادت اسی سے مانگو۔

سوال: آیت میں اس کا ذکر کیوں چھوڑا گیا جو صرف آخرت کا طالب ہو۔

جواب: وہ طالب آخرت جسے دنیا کی کسی شئے کی حاجت نہ ہو ایسے لوگ عالم دنیا میں نہیں اور نہ ہی ایسے ہو سکتا ہے۔ (الا نادرا)

اُولٰٓئِكَ اس میں دوسرے گروہ کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ لوگ جو دنیا و آخرت کی بھلائی کے طالب ہیں اس لئے کہ پہلے گروہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ فرما کر ان کا ذکر ختم کر دیا تھا۔

نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا اس آیت میں مِّنْ تبعیضیہ ہے یعنی بہت بڑا عظیم حصہ ہے ان سے جو اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں اس سے وہ ثواب مراد ہے جسے ان کی نیکیوں کے منافع سے تعبیر کیا جاتا ہے یا مِنْ اَجْلِ کے معنی میں ہے ای مِنْ اَجْلِ مَا كَسَبُوا اس لئے کہ وہ لوگ اس ثواب حسن کے انہی اعمال کی وجہ سے مستحق ہوئے اس تقریر سے من ابتدائیہ ہوگا علت حکم کا مبدا ہوا کرتی ہے۔

ربط: اس کے بعد اپنی قدرت کی طرف اشارہ فرمایا موت سے ڈرا کر اور اعمال خیر کی طرف برانگیختہ کر کے چنانچہ فرمایا وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔

ف: حساب سے نفس جز مراد یہ جو کہ اعمال کی وجہ سے حاصل ہوگی اس لئے کہ حساب گرفت اور عطا کا سبب ہے اور سبب بول کر سبب مراد لینا جائز اور شائع و ذائع ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کثرت اور ان کے بکثرت اعمال کے باوجود ایک لمحہ میں حساب لے گا اس لئے کہ اسے ہاتھ کی گنتی اور قلب کی یادداشت اور نظر و فکر کی محتاجی نہیں ہے اسی لئے اے لوگو جس کی اتنی بہت شان ہے اس کی اطاعت میں کمی نہ کرو اور اس سے ڈرو یا یہ معنی ہے کہ قریب ہے قیامت قائم کر کے حساب لے گا۔

ف ۱: بعض متقدمین کے خطبات میں ہے کہ اب دنیا کے آخری لمحات ہیں اس کا صرف اتنا وقت رہ گیا ہے جیسے برتن سے پانی نکال لیا جائے تو اس سے چند قطرات ٹپک رہے ہوتے ہیں مومن کو ضروری ہے کہ وہ طاعات میں عجلت کرے اور نیکیوں کو عمل میں لائے اور ہر حال میں ذکر الٰہی میں مشغول رہے۔

ف ۲: سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایسے یاد کرو جیسے چھوٹا بچہ بچپن میں ماں باپ کو یاد کرتا ہے اور بار بار کہتا ہے ابا جی ابا جی وغیرہ اس لئے ہر مسلمان کا فرض یہ کہ وہ ہر وقت کہے یا رب یا رب۔

حدیث شریف ۱: حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کل قیامت میں لوگ سب سے زیادہ اس بندہ پر رشک کریں گے جو آمدنی میں کم اور کثیر الصلوٰۃ اور حسن العبادۃ ہوگا اور تنہائی میں اس کی اطاعت میں سرگرم ہو اور لوگوں کی نظروں میں اتنا اوجھل کہ لوگ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور اس کی آمدنی معمولی سی ہو اور وہ اسی پر خوش ہو پھر آپ نے اپنے ہاتھ مار کر فرمایا کہ اسی طرح اس کی موت آئے گی اور اس پر رونے والی بہت کم ہوں گی اور گھر کا ساز و سامان بھی بہت کم۔

حدیث شریف ۲: حضور نبی کریم ﷺ دعا میں اکثر فرمایا کرتے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

تفسیر صوفیانہ کہ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ یعنی جب تم تعلقات حقانیہ کے مناسک مکمل کرلو اور اہل کمال لوگوں کے مراتب علیا کو پہنچ جاؤ تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف نہ رہو اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے افکار و وظائف سے غفلت کرو پس اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جیسے تم طفولیت کے زمانہ میں اپنے آباء کو اپنی ضروریات کے لئے عجز و انکسار کی وجہ سے پکارتے تھے اور حالت رجولیت میں محبت کے لئے محبت و اشتیاق کی بناء پر فخر کر کے پس اللہ تعالیٰ کو یاد کرو اپنے آپ کو محتاج ظاہر کر کے اور اس کی ذات پر فخر و ناز کر کے کیونکہ ممکن ہے کہ بچہ اپنے متولی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے مستغنی ہو اور بڑا آدمی بھی غیر اللہ پر فخر کرے لیکن اللہ تعالیٰ کے بندے تو سوائے اپنے مالک کے نہ کسی کو حامی سمجھتے ہیں اور نہ دوست پس بعض اہل طالب اور اہل سلوک ایسے ہیں جو نفس کے حملہ اور اس کے دھوکہ و فریب کی وجہ سے کہ وہ اصل اور باکمال ہیں انہیں یہ بھول ہو گی اور حالات کے تبدل کی وجہ سے کہیں گے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً یعنی ان کے نفوس دنیا کی طرف مائل ہوں گے اور اصلی مقصد کو بھول جائیں گے اور طالب ناقص گمان میں مبتلا ہوگا جو کہ اجتہاد کی دولت سے محروم ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے طریق اور ریاضت نفس اور قلب کی نگرانی اور مراقبہ سر کو چھوڑ بیٹھے گا جس کی وجہ سے اس پر غلبہ نفس اور شہوات نفسانیہ کا حملہ ہوگا اور شیطان اسے زمین میں حیران کر کے پچھاڑ دے گا جہاں تک کہ اس جدائی اور فراق میں ڈال دے گا اس لئے آخرت میں اسے کوئی حصہ نصیب نہ ہوگا وَمِنْهُمْ اور بعض اہل وصول اور ارباب الفتوۃ ایسے ہیں جو کہتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے رب ہمیں ظاہری نعمتوں میں سے کوئی نعمت جیسے کشوف و مشاہدات و انواع القربات و مواصلات عطا فرما وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یعنی جدائی و مفارقت کی نار اور فرقت کی گرمی سے بچا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ ان لوگوں کے لئے (یعنی وہ جو واصل باللہ ہیں) بہت بھاری حصہ ہے مِّمَّا كَسَبُوْا اس وجہ سے کہ انہوں نے مقامات و کرامات حاصل کئے اور جو انہوں نے مانگا انہیں حسنات سے عطا ہوا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اللہ ہر گروہ سے جلد حساب لینے والا ہے۔ یعنی جو کچھ مانگتے ہیں انہیں عطا ہوتا یہ ان کے ارادوں کے مطابق اور ان ہی ہمتوں کے موافق۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ نمازوں اور قربانیوں کے ذبح اور رمی الجمار وغیرہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ گنتی کے دنوں میں یعنی ایام تشریق میں وہ قربانی کے بعد تین یوم ہیں پہلا ان کا ذوالحجہ کی گیارہویں کا دن ہے اسے یوم القر کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس دن لوگ منیٰ میں قرار پاتے ہیں دوسرا بارہویں کا دن یہ اسے یوم النھار لاول کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس دن لوگ منیٰ سے چلے جاتے ہیں تیسرا دن تیرھویں ذوالحج کا ہے اسے یوم النفر الثانی کہا جاتا ہے یہی ایام مع یوم النحر نمازوں کے بعد تکبیرات اور کنکریوں کے مارنے کے ہوتے ہیں۔

حدیث شریف: یوم عرفہ سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک ہر نماز کے بعد تکبیر کہو۔

سوال: انہیں معدودات سے کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب: اس لئے کہ وہ چند گنتی کے دن ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا دراھم معدودات ای قلیلته اسی طرح الایام المعلومات اللہ تعالیٰ کے قول وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ جو کہ سورہ حج میں واقع ہوا یہ ان ایام سے مراد ذوالحج کے ایام ہیں آخری دن ان کا یوم النحر ہے۔

ف: تفسیر کواشی میں ہے معدودات معدودہ کی جمع ہے اور ایام یوم کی جمع۔

سوال: اور قاعدہ ہے کہ مذکر کی صفت مؤنث نہیں ہوتی اس لحاظ سے یوم معدودہ نہیں کہا جائے گا یہاں پر قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ کہا جائے اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اس لئے کہ جمع مذکر و واحد مؤنث کے ساتھ موصوف ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے قول میں ہے۔ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

جواب: اسکی وجہ یہ کہ معدودات کو ایام کے لفظ پر جاری کیا گیا یعنی جمع کو جمع کے مقابلے میں مجازاً کہا گیا ہے۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ پس جو شخص عجلت کرے اور منیٰ سے نکلنے کا ارادہ کرے فِیْ یَوْمَیْنِ یوم النحر کے بعد مکمل دو دن ہیں۔

مسئلہ: انہی تین دنوں سے مکمل دو دن تو رمی جمار کے لئے گزارے پھر تیسرے روز صرف رمی جمار کر کے روانہ ہو جائے فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ اس تعجیل میں اسے کوئی گناہ نہیں۔ اس کے لئے اجازت ہے کہ پہلے چلا جائے۔

مسئلہ: سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس تیسرے روز میں طلوع فجر سے بے شک چلا جائے۔

خلاصۃ التفسیر: حج کرنے والے پر ضروری ہوتا ہے کہ ایام تشریق کی پہلی اور دوسری رات منیٰ میں گزارے اور انہی دنوں بعد زوال الشمس ہر روز شیطان کو اکیس کنکریاں مارے جو مجرہ عقبہ پر سات کنکریاں مارتا ہے اور یہاں پر رات نہ گزارنے کی اجازت صرف اس لئے دی گئی تا کہ مسافر لوگ رات کو باہر جنگلوں میں اپنے اونٹ چرا سکیں اسی طرح حجاج کو پانی پلانے والے لوگ آرام وسکون حاصل کر سکیں۔

مسئلہ: جو شخص چاہے کہ پہلے اور دوسرے دن کنکریاں مار لی ہیں اب تیسرے دن کی کنکریاں دوسرے روز اکٹھی مار لے اور اسی دوسرے روز منیٰ میں چلا جائے تو جائز ہے اس کے لئے شریعت پاک نے وسعت رکھی ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَلَآ اِثْمَ سے معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ: جو شخص ایام تشریق کے دوسرے روز کنکریاں سے فارغ ہو کر غروب شمس کے بعد منیٰ سے نہ جا سکا تو اب اس کے لئے ضروری ہے کہ اب منی سے نہ جائے بلکہ یہ تیسری رات یہاں گزارے یہاں تک کہ تیسرے روز کی کنکریوں سے فراغت پا کر پھر منیٰ سے نکلے۔

وَمَنْ تَاَخَّرَ اور وہ جو منیٰ کو مؤخر کر دے یہاں تک کہ تیسرے روز رمی جمار کر کے جائے زوال سے پہلے یا بعد کو پھر نکلے جب رمی جمار سے فارغ ہو جائے جیسے آج کل کیا کرتے ہیں۔ یہی امام شافعی اور امامین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا مذہب ہے فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ترخص کر ترک کی وجہ سے آیت کا معنٰی یہ ہے کہ حجاج تعجیل وتاخیر دونوں میں مختار ہیں۔

سوال: کیا تاخیر افضل نہیں پھر آپ نے کیوں کہا کہ حجاج تاخیر وتعجیل میں بااختیار ہیں۔

جواب: یہ اختیار فاضل اور افضل کی حیثیت سے ہے جیسے روزہ کے دنوں اختیار ہوتا ہے کہ وہ روزہ رکھے یا نہ رکھے لیکن اس کے لئے روزہ رکھنا افضل ہوتا ہے۔

سوال: اس میں فَلَآ اِثْمَ کا تکرار اور بار بار تصریح کیوں؟

شان نزول اور جواب: اہل جاہلیت کا رد کرنا مطلوب ہے کہ ان میں دو گروہ تھے ایک کا خیال تھا عجلت کرنے میں گناہ ہے ایک نہیں یہ کہتا کہ تاخیر میں گناہ ہے اللہ تعالیٰ نے دونوں کا رد فرمایا۔

لِمَنِ اتَّقٰى یہ خبر ہے اس کا مبتدا محذوف ہے اصل عبارت یوں تھی۔

یعنی وہ جو مذکورہ ہوا اختیار اور عجلت کرنے اور تاخیر کرنے والے کی نفی اس کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں رکھتا ہے یعنی یہ حکم مخصوص ہے اس کے لئے جو مناہی سے بچتا ہے کیونکہ حقیقۃً حاجی تو وہی ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے اور حج سے صحیح معنی میں نفع اٹھاتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ متقین سے محبت کرتا ہے اور انہیں کے اعمال قبول فرماتا ہے اور جو شخص گناہوں میں ملوث ہو کر حج ادا کرے اس کا حج قبول تو ہو جاتا ہے لیکن اسے ایسے حج سے فائدہ کوئی نہیں اگرچہ ایسے شخص کا فریضہ تو ادا ہو جائے گا لیکن حج کی روح اسے نصیب نہیں ہو گی اور وہ حج اسے نفع نہیں دے سکے گا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ حج کرتے وقت اور اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تمہارے اعمال کا تمہیں ثواب ملے ورنہ گناہ تو نیکیوں کو کھا جاتے ہیں جب قیامت میں اعمال تولے جائیں گے تو برائیاں نیکیوں پر غالب آ جائیں گی۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ اور جان لو کہ تم قیامت میں اپنے اعمال کی جزاء و سزا کے لئے جمع کئے جاؤ گے اس آیت میں تقویٰ کی تاکید ہے اور اس پر عمل کرانے کا سبب ہے اس لئے کہ جسے یہ ذہن میں آئے گا کہ میں نے قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کا حساب دینا ہے تو لازماً تقویٰ طہارت اور اس کے جمیع اسباب پر عمل کرنے کی جدوجہد کرے گا۔

ربط: حج کی فراغت کے بعد لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے اللہ تعالیٰ نے انہیں گناہوں سے روکا تاکہ حج کی حقیقت ضائع نہ ہو جائے۔

ف: حضرت ابو العالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حاجی قیامت میں حاضر ہو گا لیکن اس کے اعمال نامے میں کوئی گناہ لکھا ہوا نہیں ملے گا لیکن شرط یہ ہے کہ دوران حج اس نے طہارت و تقویٰ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہو اور حج کے بعد اپنی بقایا عمر میں بھی حتی الامکان کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو جب کہ حج کے دوران اس کے تمام گناہ بخش دیئے گئے۔

مسئلہ: حج مبرور کی علامت یہ ہے کہ حج کے دوران اسے دنیا کے ساتھ خس برابر بھی لگاؤ نہ ہو بلکہ اس کا دل آخرت میں لگ جائے جب ایسے طریق سے حج سے لوٹے تو اسے حج مبرور نصیب ہو گا اور گناہ سے مغفور ہو گا اور اس کی ہر دعا مستجاب ہو گی۔

نکتہ: حاجی کو واپسی پر استقبال کے حکم میں یہی راز ہے کہ اگر وہ حج مبرور کر کے آ رہا ہے تو اس کی دعا مستجاب ہو گی اس لئے جب اسے السلام علیکم کہا جائے گا تو وہ ملنے والے کے لئے دعا مانگے تو ملاقاتی کو اس کی مستجاب الدعوۃ سے وافر حصہ نصیب ہو گا۔

حکایت: حج مبرور کی ایک کہانی بڑی مشہور ہے وہ یہ کہ حضرت ابرہیم بن ادہم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھی کے ساتھ حج سے واپس لوٹے جو وہ بھی بڑا نیک تھا اور اس کی رفاقت بلخ سے ہوئی۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رفیق کی کیفیت ہو گئی کہ وہ دنیا کو سہ طلاق دے چکا ہر وقت آخرت کے امور میں محو اور اپنے تمام مِلک مُلک مال کو چھوڑ کر اہل و عیال اور خویش و اقارب سے علیحدگی اختیار کر چکا اور اپنے شہر سے دور کہیں جنگلوں میں گزارنے لگا اور مزدوری کر کے گزر اوقات کرتا کھیتی باڑی کرتا کبھی باغات کی نگرانی کرتا وغیرہ وغیرہ۔

سبق: بہترین اور نیک انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ قدیم کو نہ توڑے سالک کو چاہیے کہ جب نفس اسے اللہ تعالیٰ کا وعدہ توڑنے کا کہے تو اسے جواب دے مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ یعنی ایسی غلطی سے پناہ مانگتا ہوں اس لئے کہ میرے رب نے مجھے بڑی شان بخشی ہے۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

نقض میثاق و شکست توبہا — موجب لعنت شود در انتہا

چو ترازوئے تو کثر بود دغا — راست چوں چوبی ترازوی جزا

(**ترجمہ**: میثاق کی خلاف ورزی اور توبہ توڑنے سے لعنت نصیب ہوتی ہے۔
اگر آج تم اپنے ترازو کو غلط رکھتے ہو تو کل قیامت میں تمہارا حال برا ہو گا۔

حکایت: کسی بزرگ کا واقعہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب میں حج سے فارغ ہو کر گھر آیا تو نفس امارہ نے مجھے بُرائی کی طرف ابھارا ہاتف غیبی کی آواز میرے کانوں میں سنائی دی کہ افسوس ہے ابھی تو تو حج سے واپس آیا ہے اور پھر ایسی غلطی اس طریق سے مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسی غلطی سے بچا لیا اور بفضلہٖ تعالیٰ اس وقت تک گناہوں

سے محفوظ ہوں۔

سبق: بعض گناہ بندے کے لئے دیدارِ حق سے حائل ہو جاتے ہیں جب کہ بندہ صرف اعمال پر بھروسہ کرے اور اُنہی پر اعتماد رکھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے غافل ہو جائے۔

حکایت: بعض ترک حضرت شیخ الاسلام احمد لا نافقی الجامی قدس سرہ کی صحبت سے باریاب رہتا اور اس کی گدی کے اوپر ڈھال کی طرح نور چمکتا دکھائی دیتا تھا اتفاقاً حج پر چلا گیا واپس لوٹا تو وہ نور اس سے جاتا رہا حضرت الشیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا پہلے تیرے دل میں عجز و انکسار اور تواضع و عاجزی بہت تھی اب تیرے اندر غرور آ گیا یہ تو نے حج پڑھتے ہی دھوکہ کھایا اور سمجھا ہے کہ اب میں کچھ اور ہو گیا ہوں اس لئے تو اس بلند مرتبے سے گر گیا اب وہ نور تیرے سے چلا گیا ہے اس لئے اب وہ نظر نہیں آتا۔

سبق: حاجی کے لئے خصوصاً ضروری ہے کہ حج کی واپسی سے اللہ تعالیٰ کے منہیات سے بچتا رہے اور صرف رزقِ حلال پر اکتفا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف پاک شئے کو قبول کرتا ہے۔

حکایت: ایک صاحب حج کر کے واپس لوٹے تو راستہ میں اسے اجل آ پہنچی اسے ساتھیوں نے قبر میں دفن کر دیا دفن کرنے کے بعد یاد آیا کلہاڑا قبر میں رہ گیا چنانچہ اس کی قبر کھودی گئی اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے دو ہاتھ اور پاؤں کلہاڑے سے باندھے گئے ہیں۔ اس کے متعلق پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ اس نے حرام مال سے حج پڑھا تھا یعنی ایک ساتھی کا مال چرایا تھا اب اسی چرائے ہوئے مال سے حج پر گیا تھا۔

سبق: حدیث شریف میں ہے جو شخص حلال کمائی سے حج کو جاتا ہے تو اس کے ایک ایک قدم پر ستر ستر نیکی لکھی جاتی ہے اور ستر ستر گناہ معاف ہوتے ہیں اور ستر ستر مرتبے بلند ہوتے ہیں اسی طرح خالصہ کتاب میں مذکور ہے

مسئلہ: اگر کسی کو اپنے مال پر کسی قسم کا اشتباہ ہو تو وہ دوسرے کسی دوست سے قرضہ لے اور اپنا مال اپنے قرض کی ادائیگی میں دے۔ (یہ ایک شرعی حیلہ ہے)

حکایت: حضرت ابوالقاسم الحکیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عادت کریمہ تھی کہ وہ بادشاہوں سے نذرانے و تحائف منظور نہ فرماتے اگر اتفاقاً ان کا کوئی مال آپ کے ہاں پہنچتا اور آپ اسے اپنی ضرورت میں صرف کرنا

چاہتے ہیں تو اسی قدر کسی دوست سے قرض لیتے اور بادشاہ کا دیا ہوا مال اسی قرضہ میں دے دیتے۔

مسئلہ: حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالی علیہ سے بادشاہوں سے بادشاہوں کے وظائف کا مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے وہی طریقہ بتایا جو صرف ابولقاسم رحمۃ اللہ تعالی علیہ کا تھا۔ (کذافی حزانئہ الفتاوی)

تفسیر عالمانہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ اور ہر وہ انسان جس کا قول ظاہری طور تم کو اچھا لگتا ہے اور تم بھی اچھا اور مستحسن سمجھتے ہو اعجاب کہتے ہیں ہر اس اچھے اور مستحسن عمل کو جسے ظاہراً بہت اچھا سمجھا جائے اور دل اس کی طرف میلان رکھے اور اسے بہت بہتر ماننا پڑے لیکن اس کی حقیقت معلوم نہ ہو سکے۔

ف: حضرت امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں کہ تعجب اس حیرت کو کہتے ہیں کہ جو انسان کو بوقت جہل کسی سبب سے عارض ہو امام موصوف رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں کہ اعجاب کی حقیقت مجھے اس طرح معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے ظہور کا سبب ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یہ قول سے متعلق ہے یعنی تمہیں اس کی تقریر پر خوشی لگتی ہے کہ بایں معنی کہ اسے دنیا سے تعلق ہے اور اس کا تمہارے سے دعوی محبت کا اظہار بھی صرف حصول دنیا کی خاطر یہ اسی بناء پر اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اسکا قول اچھا لگتا ہے اس کی حلاوت فصاحت کی وجہ سے وہ بھی صرف دینوی لحاظ سے ورنہ آخرت میں تو اس کے کلام کا کذب اور قبح ظاہر ہو جائے گا۔

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ اور کہا جاتا ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں اللہ تعالی شاہد ہے کہ میرے دل میں آپ کی محبت ہے اور اسلام کا میں شیدائی ہوں اور یہی میرا قلبی کلام ہے جس کی ترجمان میری زبان ہے یعنی میری زبانی بات میرے قلب کے موافق ہے وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ یعنی وہ مسلمانوں کی عداوت اور ان کے ساتھ دشمنی میں ان کے ساتھ جھگڑالو ہے۔ خصام قتال و جدال کی طرح مصدر یہ اور یہ اضافت بمعنی فی کے ہے اور لد بمعنی شدۃ الخصومۃ۔

شان نزول: یہ آیت شریف ابن اخنس بن شریف ثقفی کے حق میں نازل ہوئی اور وہ ویسے بھی حسین و جمیل اور شیریں کلام انسان تھا حضور اکرم ﷺ سے محبت کا دم بھرتا تھا۔

عقیدہ: محبت کا دم بھرنا اور خلوص کا دعوی کرنا لیکن اس میں صحیح طور موافقت نہ ہو صرف منافقت ہی منافقت ہو

تو یہ ملاحدہ اور نادقہ کا شیوہ ہے ورنہ محب اور اصلی مسلمان وہ ہے جو وہی کرے جس پر اس کا محبوب راضی ہو۔
ایک شاعر کہتا ہے۔

تعصی الالہ وانت تظہر حبہ ہذا العمری فی الفحال بدیع

توکل حبک صادق الاطعتہ ان الصاحب لمن احب مطیع

ترجمہ: اپنے معبود کی نافرمانی کرتا ہے اور پھر اسکی محبت کا اظہار کرتا ہے واللہ قسم ہے یہ عجیب بات ہے کہ اگر تو محبت میں سچا ہوتا تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محب وہ ہوتا ہے جو اپنے محبوب کا مطیع ہو۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہ نے فرمایا۔

بصدق کوش کہ خورشید زاید ازنفست کہ از دروغ سیہ روئے گشت صبح نخست

وَاِذَا تَوَلّٰی اور جب واپس لوٹتا اور آپ کی مجلس سے ہٹتا ہے یا اس کا مطلب یہ کہ جب وہ غلبہ اور کسی طرح کی حکومت پاتا ہے تو سَعٰی فِی الْاَرْضِ بمعنی قدموں کے چلنے میں بہت تیزی کرنا یعنی دوڑنا کبھی عمل اور کسب میں کوشش کرنے کے لئے استعارہ کیا جاتا ہے۔

سوال: سعی ہر وہ معنوں میں زمین میں ہوتا ہے پھر اس کے بعد فی الارض کے لانے کا کیا مطلب۔

جواب: اس طریق سے فساد کے لئے مبالغہ ہو جائے گا اس لئے کہ عرض کا لفظ عام ہے اپنے جمیع اجزاء کو اور قاعدہ ہے کہ ظرف اپنے تمام مظروف کو حاوی ہوتا ہے اب مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص زمین کے جس حصہ سے گزرتا ہے تو وہیں فساد ڈالتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ اس عبارت سے اس کی مراد فساد ہی فساد ہے۔

لِیُفْسِدَ فِیْهَا یہ سعی کی علت ہے یعنی وہ اس لئے جھگڑا کرتا ہے تا کہ زمین میں فساد ہو وَیُهْلِكَ اہلاک سے مشتق ہے۔ بمعنی اضاعت یعنی ہلاک کرنا الْحَرْثَ کھیتی وَالنَّسْلَ اجناس حیوان سے جو شئے بھی مادنی سے پیدا ہوا سے نسل کہا جاتا ہے جیسے نسل ینسل یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شئے کسی سے منفصل ہو کر خارج ہو۔

ف: حرث ونسل اگرچہ دراصل مصدر ہیں لیکن یہاں مفعول کے معنی ہیں اس لئے کہ اولاد اپنے والدین کی نسل ہوتی ہے یعنی بچہ اپنے والدین سے منفصل ہو کر نکلا اور یہ ایسے ہی جیسے ثقیف میں اخنس (منافق) نے کہا جب کہ اس کے پاس رات گزاری تو ان کے جانوروں کو ہلاک کر ڈالا اور ان کی کھیتی کو جلا دیا اس لئے کہ اس کے اور

ثقیف کے درمیان عداوت تھی اسی طرح ظالم حکام کی عادت ہے کہ وہ اپنی رعایا پر ظلم کرتے ہیں ان کے بچے مروا دیتے ہیں وار ان کے اموال کو ضائع کرا دیتے ہیں یا یہ کہ ظالم پر ظلم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بارش بند کر دیتا ہے تو ان کی کھیتی اور نسل میں نقصان پڑ جاتا ہے۔

حدیث شریف: جب قیامت میں حاکم کو جہنم کی سیڑھی پر ڈالا جائے گا سیڑھی حرکت میں آجائے گی اور اس کی حرکت اس قدر ہو گی کہ جہنم کا جوڑ جوڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا اگر وہ حاکم عادل اور اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو گا تو اس سیڑھی سے با سلامت گزر جائے گا اور اگر وہ بے فرمان حاکم ظالم ہو گا تو وہ سیڑھی پھٹ جائے گی تو وہ ظالم حاکم جہنم کے اندر گر جائے گا اور پچاس سال کی مقدار جہنم کے گڑھے میں چلا جائے گا۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ اور اللہ تعالیٰ فساد کو دوست نہیں رکھتا بمعنی اس سے راضی نہیں اور اسے مبغوض رکھتا ہے بلکہ اس کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کا مبغوض ہے۔

سوال: اگر سوال کیا جائے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب فرمایا لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ حالانکہ وہ خود بھی تو اشیاء میں تغیر و تبدل فرماتا ہے یہی تو افساد کی حقیقت ہے۔

جواب: افساد کا لغوی معنی ہے اخراج الشئی من حلاتہ معھودۃ لا لغرض صحیح یعنی اچھی شئے کو غرض فاسد کے لئے ظاہر کرنا اور اللہ تعالیٰ کے کسی فعل میں غرض فاسد نہیں بلکہ اس کا ہر فعل محمود ہے اور نہ ہی وہ کسی کو غرض فاسد کا حکم دیتا ہے اور نہ ہی اسے دوست رکھتا ہے اگرچہ ہم اپنی ظاہر بینی کے لحاظ سے کسی فعل میں غرض فاسد دیکھیں تو وہ ہماری اپنی نگاہ کا قصور ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ افساد کی نسبت اگر مخلوق کی طرف ہو تو اس میں غرض فاسد کا اعتبار ہو سکتا ہے اور جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس میں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَہٗ اور جب اس منافق و مفسد کو بطور وعظ نصیحت کہا جاتا ہے اِتَّقِ اللّٰہَ اللہ سے ڈرو اور اپنے گندے فعل و قول اور وہ فساد و نفاق جو تیرے سے سرزد ہوتا ہے اس سے باز آ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ تو اسے وہ عار روکتی ہے جو اس کے اندر ہے اور وہ جاہلیت کے رسومات معاصی و ماثم پر ابھارتے ہیں جن سے روکا گیا ہے۔

مسئلہ: اس میں رد ہے اس واعظ جو چاپلوسی اور عناد کے درپے رہتا ہے یہ اس محاورہ سے ہے جو اہل عرب کہتے ہیں اخذتہ کذا یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کسی کو کسی فعل پر انگیختہ کیا جاتا ہے اور اس پر اس کی لزومی

بات کا اظہار کیا جائے اس میں با تعدیہ کی ہے اس فعل کو مابعد کے ساتھ ملانے کے لئے جو اس کے ماقبل میں ہے۔

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی ایسے بندے کی سزا اتنا کافی ہے کہ وہ جہنم میں دائمی طور داخل ہوگا اور یہ خلود اس فعل کی سزا ہے جو اس نے ارتکاب کیا ہے اس میں وعید شدید ہے وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ یہاں قسم محذوف ہے دراصل عبارت یوں ہے واللہ بئس الفراش جھنم بخدا برا بچھونا جہنم ہے۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے فرمایا سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو کہے اللہ تعالیٰ سے ڈر اور وہ شخص اسے جواب میں کہے تو اپنا کام کر۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا اللہ سے ڈرو آپ نے یہ الفاظ سنتے ہی اپنا چہرہ زمین پر رکھ دیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ عمل اللہ تعالیٰ کے سامنے عبودیت کے اظہار کے لئے کیا۔

ربط: آیت بالا میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو اپنے دین کو دنیا کی طلب میں صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ اور بعض لوگ وہ ہیں جو اپنے نفس کو بیچتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں۔

سوال: آیت میں نفس کے بیچنے کا کیا معنی؟

جواب: بندہ جب نماز روزہ اور حج و جہاد اور زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے اپنے نفس کو خرچ کرتا ہے اور اس اطاعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ثواب کو حاصل کر لیتا ہے تو گویا اس طریق سے اللہ تعالیٰ کے یہاں نفس بیچ کر اللہ تعالیٰ کے ثواب کو پایا۔ گویا اس نے اپنے نفس کو بیچا اس کے عوض جو اسے اللہ کی طرف سے ثواب اور فضل نصیب ہوا۔

اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب کر کے وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے رؤف ہے اسی لئے اپنے بندوں کو تقویٰ کا مکلف بنایا ہے اور ان کو ثواب کے لئے امور کی تابعداری کا حکم فرماتا ہے۔ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نفوس و اموال خریدتا ہے حالانکہ تمام اشیاء اس کی ملک اور اس کا اپنا حق ہے اور پھر یہ ہے کہ بندوں کے نفوس و اموال لے کر اپنا بے بہا فضل اور بے پایاں رحمت عطا فرماتا ہے۔

شانِ نزول: حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ سے ہجرت کر کے نبی اکرم ﷺ کی طرف مدینہ منورہ کو جارہے تھے اس وقت آپ کی عمر ایک سو سال تھی آپ کے پیچھے مشرکین آدھمکے آپ کے ساتھیوں کو مشرکین نے آتے ہی قتل کر دیا حضرت صہیب کے پاس تیروں کا کشکول تھا اور آپ چوٹی کے تیرانداز تھے اور تیر بھی نشان پر لگتا تھا آپ نے کہا اے قریشیو سن لو میری تیراندازی اور نشانہ پر تیر لگانا میرا خاصہ ہے فلہٰذا میرے پاس جتنے تیر ہیں ایک ایک تیر تمہارے ایک ایک کے دل پر ضرب کاری لگے گا اور تیر ختم ہو جائیں گے تو میرے پاس شمشیر براں ہے اس سے تمہارے بقایا کا صفایا کروں گا اب تم جو چاہو کر لو اور میرا واپس لوٹ کر تمہارے پاس رہنا تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں اور سن لو میں بوڑھا آدمی ہوں میں نے چندروز کے بعد مرنا ہی ہے اور میرے پاس بہت مال ہے جو مکہ میں میرے گھر مدفون ہے تم واپس چلے جاؤ میں وہ مال تمہیں دیتا ہوں لیکن مجھے مدینہ جانے دو اور میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور اس مرتے دم تک رجوع نہیں کر سکتا۔ انہوں نے حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات مان لی ان کا مال کفار نے لے لیا اور آپ مدینہ طیبہ کی طرف چل پڑے جب حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ طیبہ میں پہنچے تو سب سے پہلے آپ کی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات ہوئی تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مبارک دی اور فرمایا تجارت میں بہت نفع ہوا۔ حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا وہ کیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت مذکور کے نزول کا واقعہ سنایا اس سے حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت خوش ہوئے۔

ف: یہاں پر یَشْرِیْ بمعنی یشتری یہ اس لئے کہ اس میں ظاہر کے مطابق خرید وفروخت ہوئی ہے کیونکہ حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا نفس بچا لیا۔

تفسیر صوفیانہ مومنین اپنے اختیار سے اپنے نفوس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں ان کا ثمن انہیں بہشت نصیب ہوتی ہے لیکن اولیاء اللہ تعالیٰ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو انہیں ثمن ملتا ہے۔ یعنی رضائے الٰہی عام مومنین اور اولیاء اللہ کے احوال میں بہت بڑا فرق ہے۔

سبق: سالک کو لازم ہے کہ اوطان بشریت سے نکل کر اپنی خودی سے اجنبی بن جائے بلکہ اپنے اقران سے

بیگانہ ہو جائے یہاں تک کہ وہ مجاہد حقیقی اور شہید معنوی کے درجہ تک پہنچ جائے اس لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا: غریبوں کو مبارک ہو یہاں پر غریب سے یہی سالک مراد ہے ان احادیث میں اشارہ ہے کہ سالک کو چاہیے کہ مخلوق سے منقطع ہو کر خالق سے تعلق جوڑے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ سالک عوام کی عادات و شہوات کے معاملات میں مخالفت کرے۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا اے انس جہاں تک تم سے ہو سکے باوضو رہا کرو اس لئے کہ جب ملک الموت روح قبض کرتے ہیں اور جو شخص باوضو ہو تو وہ شخص شہیدوں میں شمار ہوتا ہے لیکن یہاں پر وضو سے انقطاع عن الخلق الی الحق مراد ہے یعنی ماسوی اللہ سے فارغ ہو کر مرے۔ جیسے تصوف کے قانون میں نماز سے اتصال باللہ مراد ہے۔

حدیث شریف: حضور علیہ الصلوۃ و السلام نے فرمایا وضو پر مداومت کرو اس سے رزق میں وسعت پیدا ہوتی ہے جب ظاہری وضو ظاہری رزق کی وسعت کا سبب ہے تو پھر باطنی طہارت سے معارف والہامات وردات کیوں نہ نصیب ہوں۔ اس سے قبل زندہ ہو کر حیاۃ طیبہ نصیب ہوتی ہے اور نفس اپنے اوصاف رذیلہ کے ساتھ مٹ جاتا ہے یہ صرف اسے نصیب ہوتا ہے جسے جہاد حقیقی سے کوئی اثر حاصل ہو۔ قاعدہ ہے جو شخص نفس کی قیود سے چھوٹ جاتا ہے تو موت اس کے اپنے اختیار میں ہو جاتی ہے اور وہ دائمی طور پر زندہ رہتا ہے۔
مثنوی شریف میں ہے۔

اے بسا نفس شہید معتمد مردہ در دنیا و زندہ می رود

(ترجمہ: بہت سے اعلیٰ درجہ کے شہیدوں کو ظاہری طور موت آتی ہے لیکن درحقیقت وہ زندہ ہوتے ہیں)

سبق: بندے پر فرض ہے کہ وہ خلق سے عروج کر کے حق تک پہنچے نفس کی تمام ضروریات و حاجات سے بچ کر حق کے غنائے تام کو حاصل کرے یہی ہے تحصیل کل الخیرات و دفع کل الافات جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جاتا ہے تو اس کے جمال کو پالیتا ہے پھر اس کے جلال کے مشاہدات میں غرق ہو جاتا ہے بلکہ راز حق کا رازدان بن جاتا ہے چنانچہ فرمایا قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ سالک کی پہلی منزل ترک الاولا، تیسری منزل ترک النفس ہے پہلی منزل طے کرنے پر سالک کو توحید الافعال کے جلوے نصیب ہوتے ہیں دوسری منزل سے توحید

الصفات تیسری منزل سے توحید الذات اور یہی منزل تمام منازل سے اعلیٰ ہے۔

سبق: دانا کو ضروری ہے کہ وہ ذکر اللہ کی کثرت کرے کیونکہ ذکر اللہ تصفیہ قلوب بلکہ اس کا مصقلہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اور سالک کو سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اسے اپنا مطلوب حاصل ہو جائے اے اللہ ہمیں مفلحین سے بنا۔

تفسیر عالمانہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اے لوگو جو صرف زبان سے کلمہ پڑھتے ہو یہ اس وقت ہے جب کہ خطاب منافقین کو ہو ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ یعنی پورے طور ظاہری و باطنی طور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔

ف: اسلم بمعنی استسلام و اطاعت ہے اور وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ کی ضمیر سے فاعل ہے اور یہ حال بمعنی عموم (جو کہ جمع کے صیغہ میں ضمیر ہے) کی تاکید کرتا ہے یہ ایسے ہے جیسے کہا جاتا ہے قام القوم کافۃ بمنزلہ قاموا کلھم کے ہے۔

ف: کافۃ وقاطبۃ وعامۃ کی تا تانیث کی ہیں اگرچہ دراصل یہ تا تانیث پر دلالت کرتی یہاں پر تا تانیث اس لئے داخل ہو گئی تاکہ ان الفاظ کو بمعنی کل جمیع کے منقول ہو یا معنی یہ ہے کہ فالقوم کافۃ یعنی اسلام میں کلی طور داخل ہو جاؤ اس میں غیر کو مخلوط نہ کرو۔

شان نزول: اس تفسیر کی تقریر کے مطابق اہل کتاب کے اہل اسلام مراد ہیں کیونکہ اس کی عادت تھی کہ وہ اسلام میں داخل ہو کر پھر بھی اپنے بعض پرانے مسائل کی رعایت کرتے تھے جیسے کہ مروی ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ساتھی تورات کے بعض مسائل کے پابند تھے مثلاً ہفتہ کی تعظیم اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کی تحریم اسی طرح دیگر اشیاء بھی جس سے دور رہنا اسلامی طور مباح سمجھتے تھے اگرچہ ان کے دین میں اشیاء واجب تھیں اور وہ اسی طرح اس پر ثابت رہے جب کہ حلت کے معتقد تھے صرف طبعی طور ان کو عمل میں لانے سے وحشت کرتے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ تورات بھی اللہ کی کتاب ہے فلہذا ہمیں اجازت بخشے تاکہ ہم اسے رات کی نماز میں پڑھا کریں اس پر انہیں حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو امور منسوخ ہو گئے ان سے تم کسی پر بھی عمل نہ کرو اگرچہ ان میں بعض امور سے تم مانوس ہو تب انہیں ترک کرنا پڑے گا اور ان

کے ترک سے وحشت بھی نہ کرو اس لئے کہ حق سے وحشت کیسی بلکہ وہ تو شیطان کو خوش کرنا ہے چنانچہ فرمایا۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ قدموں کی درمیانی مسافت کو کہتے ہیں یعنی ان راستوں پر نہ چلو جو شیطان کے ہیں اور نہ ہی ان کی اطاعت کرو جو کہ وہ اپنے ٹیڑھے راستوں کی طرف تمہیں بلاتا اور گندے وسوسے ڈالتا ہے اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے وساوس کے ذریعے تمہارے اسلام میں رخنہ ڈالے فَاِنْ زَلَلْتُمْ اگر تم ڈگمگا جاؤ گے زلل دراصل قدم کے پھسلنے کو کہا جاتا ہے اور عرف میں حق اعتقاد اور صحیح عمل سے روگردانی کو کہتے ہیں اب معنی یہ ہوا کہ حق سے بھٹک کر علماً عملاً حق سے تجاوز کر جاؤ گے۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ بعد اس کے تمہارے پاس دلائل آئے اَلْبَیِّنٰتُ بمعنی حج یعنی دلائل وشوائد اس پر موجود ہیں جو تم اپنے داخل فی الاسلام ہونے پر دعوی کرتے ہو فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے شک اپنے امر پر غالب ہے تمہارے انتقام سے عاجز نہیں حَكِیْمٌ حکیم ہے حق ہی کا انتقام لیتا ہے۔

مسئلہ: آیت میں غلط کاروں کے لئے زجر وتوبیخ ہے خصوصاً ان کو جو داخل فی الاسلام ہو کر پھر عملاً واعتقاداً مذبذب تھے آیت کا محاورہ ایسے ہے جیسے باپ بیٹے کو کہے انت عصیتنی وانت عارف بی وبشمرہ اگر تو میری نافرمانی کرے گا پھر تو مجھے جانتا ہے کہ میں اپنے مخالف سے کیا کرتا ہوں یہ اس سے بلیغ ہے جب کہ زجر وتوبیخ کو صراحۃً ذکر کیا جائے۔

مسئلہ: جیسے آیت میں وعید ہے اسی طرح اس میں وعدہ کریمہ بھی ہے جیسا کہ لفظ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم وہ ہوتا ہے جو اچھے اور برے امور کی تمیز رکھے جیسے حکیم برے کو سزا دیتا ہے اس طرح اس سے امید رکھی جاتی ہے کہ وہ اچھے کو انعام واکرام سے نوازے بلکہ یہ اس کی حکمت کے لائق اور اس کی رحمت کے زیادہ قریب ہے۔

هَلْ یَنْظُرُوْنَ یہ استفہام بمعنی نفی ہے اور نظر بمعنی انتظر ہے اب معنی یہ ہوا کہ جو دخول فی الاسلام کے تارک اور شیطان کا پیروکار ہیں وہ نہیں انتظار کر رہے اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر آئے یہاں مضاف محذوف ہے ای عذاب اللّٰہ کیونکہ اللہ آنے جانے سے پاک ہے اس لئے کہ ان دونوں کو حرکت و سکون مستلزم ہے کیونکہ یہ دونوں حادث ہیں اور قاعدہ ہے کہ جس پر حرکت وسکون صادق آسکیں وہ حادث اور مخلوق ہوا کرتا ہے حالانکہ ان سب کو خالق وہی اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ قدیم کی شان میں مستحیل ہے کہ وہ مخلوق کی

صفات سے موصوف ہو۔

حکایت: سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال ہوا کہ زمین وآسمان پیدا کرنے سے پہلے اللہ کہاں تھا آپ نے فرمایا اس کی ذات کے متعلق مکان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب کہ وہ مکان سے پاک ہے جیسے زمین وآسمان کی پیدائش سے پہلے تھا اب بھی ویسے ہی ہے۔ (الآن کما کان)

عقیدہ: اس آیت اور اس طرح کی دیگر آیت میں متقدمین کا عقیدہ ہے کہ ہمارا ان آیات کے ظاہر پر ایمان ہے اور باطن کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں اس لئے کہ ایک معنی متعین کرنے پر اللہ تعالیٰ کی مراد کے خلاف خطا ہوگا اسی لئے ان میں سکوت اولیٰ ہے لیکن متکلمین کا خیال ہے ان جیسی آیات میں تاویل لازمی ہے ہر آیت میں علیحدہ علیحدہ مطلب لینا ہوگا۔

فِیْ ظُلَلٍ سایوں میں جو کہ ہونے والے ہیں ظل ظلة بادل سے ظلل، ظللة کی جمع ہے جو شئے بھی اوپر سایہ کے طور ہوا سے عربی میں ظلة کہتے ہیں (انعمام) سفید رنگ اور رقیق بادل کو کہا جاتا ہے اور غمام کو اس لئے غمام کہتے ہیں کہ غمام بمعنی چھپانا اور چونکہ بادل سورج اور آسمان کو چھپا دیتا ہے اس لئے اس نام سے موسوم ہوتا ہے اور بادل کو اس وقت ظللعه کہا جاتا ہے جب کہ وہ مجتمع اور تہ بہ تہ ہو اب ظل من الغمام کا مطلب ہوا متفرق قطعات جس کا ہر قطعہ نہایت ہی کثافت وعظمت کے ساتھ ہو اس اعتبار سے ہر قطعہ ظلة ہوگا۔ **وَالْمَلٰٓئِکَةُ** اور ان کے ہاں فرشتگاں آئیں اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے امر لانے کے وسائط ہیں بلکہ حقیقۃً عذاب لانے بھی وہی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اب تمہارے ہاں دلائل مکمل ہو چکے ہیں اب سوائے عذاب کے تمہارے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں۔

سوال: انہیں بادل میں عذاب کیوں نہ نازل ہوا جیسے یونس علیہ السلام اور عاد اور شعیب علیہ السلام کی قوموں پر بادل میں عذاب آیا۔

جواب: دراصل بادل میں رحمت (بارش) کا گمان ہوتا ہے۔

قاعدہ: جب اس شئے سے خلاف توقع عذاب نازل ہو تو زیادہ ڈراؤنا اور خوفناک ہوتا ہے اس لئے وہ شر جو ہمارے گمان کے خاف ہو تو وہ زیادہ ہی غم میں ڈالتا ہے جیسے خلاف توقع کسی سے بھلائی حاصل ہو تو اس میں

بہت زیادہ سرور ہوتا ہے اور پھر شر میں اس طریق سے زیادہ غم کیوں نہ لاحق ہو یہی وجہ ہے کہ سابقہ امم کے لئے صاعقہ گھبراہٹ میں ڈالنے والی کو شدید ترین عذاب قرار دیا گیا جب کہ انہیں بادل سے صرف بارش کی امید تھی لیکن خلاف توقع ان پر عذاب آ گیا اس لئے اہل تفکر و تدبر پر آیت وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ کا سمجھنا مشکل ہو گیا اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جن اعمال میں بہت سخت منہمک تھے اور اس خیال میں تھے کہ اعمال سے ہمیں بہت بڑی جزا ملے گی۔ لیکن ان کی توقع کے خلاف انہیں سزا ملی کیونکہ ان کا گمان یہی تھا کہ یہ ہماری نیکیاں ہیں حالانکہ وہ برائیاں تھیں جب ان پر معاملہ برعکس ظاہر ہوا تو گھبرائے۔

حکایت: حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ یہی آیت پڑھی اور اس میں تدبر و تفکر کیا تو آہ آہ کرتے وفات پا گئے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ان کے ہلاک کرنے کا معاملہ مکمل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ انہیں مٹا کر فارغ ہوا اس کا عطف يَاْتِيَهُمُ اللّٰهُ پر ہے یہ بھی هَلْ يَنْظُرُوْنَ یعنی ان کی انتظار کے چیز میں داخل ہے

سوال: يَاْتِيَهُمُ اللّٰهُ الخ ماضی ہے مضارع سے ماضی کی طرف عدول میں کیا حکمت ہے۔

جواب: تاکہ حقیقت پر دلالت ہو گویا اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ معاملہ ہو چکا ہے۔

وَاِلَى اللّٰهِ صرف اللہ تعالیٰ نہ کہ غیر کی طرف تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ لوٹائے جاتے ہیں تمام مخلوق کے امور اور ان کے اعمال قیامت میں اللہ تعالیٰ ان کے مابین فیصلہ فرمائے گا ثواب اور عذاب دینے والا صرف وہی ہے۔

سبق: مومن پر لازم ہے کہ وہ فرمانبرداری میں ہی گزارے اور نافرمانی سے بچتا رہے اور خواہشات نفسانیہ اور شیطان کی پیروی سے کنارہ کش رہے۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے اللہ نے میری امت کے متعلق مجھے فرمایا کہ میں ان سے شیطان کو دور بھگاتا ہوں لیکن وہ الٹا میری نافرمانی اور شیطان کی تابعداری کرتے ہیں۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

کجا سر برآریم ازیں عار و ننگ	کہ با او بصلحیم و با حق بجنگ
نظر دوست نادر کند سوئے تو	چو در روئے دشمن بود روئے تو
ندانی کہ کمتر نہد دوست پائے	چو بیند کہ دشمن بود در سرائے

(ترجمہ: ہمارے شرم سے سر جھکے ہوئے ہیں کہ شیطان سے ہماری صلح اور حق سے جنگ ہے تیرا دوست تجھے کس طرح نظر شفقت سے دیکھے جب تیری توجہ اس کے دشمن کی طرف ہے تجھے معلوم ہے کہ دوست اس گھر میں نہیں آتا جہاں اس کا دشمن قیام گزیں ہو)

سبق: انسان کی سب سے بڑی عبادت اپنے شیطان کے دور رکھنے اور نفس کو ملامت کرنے میں ہے۔

حکایت: ایک شخص نے مسلسل چالیس سال روزے رکھے اسے ایک ضرورت درپیش تھی اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جو قبول نہ ہوئی اس پر اس نے اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ساری تیری ہی نحوست ہے اس کے اس عمل سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا اے میرے نبی علیہ السلام اس بندہ کو بلا کر فرمایئے کہ تیرا نفس کو زجر توبیخ اور ملامت کرنا میرے نزدیک چالیس سال کے روزوں سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

خورندہ کہ خیرے برآید ز دست ٭ بہ از صائم الدہر دنیا پرست

(اس روزہ دار دنیا پرست سے وہ روزہ نفلی نہ رکھنے والا بہتر جو دوسروں کو خیر اور بھلائی سے نوازتا ہے)

تفسیر صوفیانہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا اس کا معنی عام بھی ہے اور خاص بھی عام تو یہی ہے کہ یہ خطاب عام مومنین کو ہے یعنی جتنے لوگ اس آیت پر ایمان لائے اب معنی یہ ہوا کہ اے لوگو اسلام کے ظاہری اور باطنی شرائط کے ساتھ اسلام میں داخل ہو جاؤ اسلام کے مجملہ شرائط میں سے ایک وہ ہے جو حضور علیہ السلام نے فرمایا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے اہل اسلام کو سلامتی ہو اور مومن وہ ہے کہ جس کے شر سے اہل ایمان کو امن ہو اور معنی خاص یہ ہے کہ آیت میں خطاب خاص ہے یعنی اس میں حضرت انسان کے تشخص اور اس کے جمیع اجزا ظاہرہ و باطنہ کو خطاب ہے اس لئے انسان پر لازم ہے کہ اپنے ہر عضو کو اسلام میں داخل کرے مثلاً آنکھ کو دیکھنے کے اسلامی عمل میں اور کان کو سننے اور منہ کو کھانے اور فرج کو شہوات اور ہاتھ کو پکڑنے اور پاؤں کو چلنے میں مشغول رکھے اور ان اعضاء کا اسلام میں داخل کرنے کا معنی یہ ہے کہ ہر ایک عضو امر الٰہی میں بجالانے اور نواہی سے بچنے میں چست و چالاک ہو بلکہ جہاں تک ہو سکے لایعنی امور سے دور رہیں اور جو امور قابل عمل ہیں ان کے بجالانے کے درپے ہیں۔ یاد رہے کہ اجزاء ظاہرہ کو شرائع

اسلام میں داخل کرنا تو منافق کو بھی حاصل ہے مقصد تو یہ ہے کہ اجزاء باطنہ کو شرائع اسلام میں داخل کیا جائے اور وہ یہ کہ دشمنان اسلام کے سامنے سینہ سپر ہو جائے اور کامل اکمل بزرگوں کے مراتب تک پہنچنے کی جدوجہد کرے باقی رہا نفس کے اسلام میں داخل ہونے کا معنی وہ یوں ہے کہ نفس اپنے صفات ذمیمہ کے کفر سے توبہ کرے اور اپنی من بھاتی باتوں کو یک لخت طلاق دے دے اور عبادت الٰہی میں مطمئن نظر آئے تا کہ اسے بھی اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں اور مخلصین میں شمولیت کا استحقاق حاصل ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْ خطاب فرمایا یہ اور قلب کا اسلام میں داخل ہونے کا معنی یہ ہے کہ اسے نفس کے اخلاق رذیلہ سے پاک وصاف رکھے اور اسے روحانی اخلاق وعادات سے سنگارے اور روح کا اسلام میں داخل ہونے کا معنی ہے کہ اسے اخلاق الٰہی سے متصف کیا جائے اور احکام الٰہیہ سے متصف کیا جائے اور احکام ازلیہ کے سامنے سر جھکانے کی عادت ڈالی جائے اس پر تصرف جذبات الٰہیہ کا دباؤ ڈال کر ماسوی اللہ کے تعلقات اور ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے سے دور رکھا جائے اور اسلام میں داخل ہونے کا معنی یہ ہے کہ بندہ فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہو جائے وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ یعنی شیطانی سیرت اور اس کے طریقے جیسے حق کا انکار اور تکبر کو نہ اپنائے کیونکہ یہ اسلام کے نقیض ہیں اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ تمہاری عداوت اس کے دل میں راسخ ہو چکی ہے فطرتی طور تم اور وہ ایک دوسرے کے مخالف ہو وہ تمہارے نور فطرتی کو نہیں مانتا بلکہ وہ خود بھی ناری الخلقت ہے اس لئے چاہتا ہے کہ تم بھی اس کی طرح بھٹک جاؤ نوری نہ ہو وہ تمہارا دوست نما دشمن ہے۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ جب کہ تمہارے پاس افعال الصفات کے تجلیات کے دلائل آ چکے ہیں۔ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ وہ عزیز ہے اس لئے کہ اپنی اس بلندی مرتبہ کی وجہ سے اپنی طرف کسی ذلیل اور کمینے کو راہ نہیں دیتا جو نہایت کمزور اور اہمیت اور ضعیف النظر ہو حَكِیْمٌ وہ ایسا حکیم ہے کہ وہ اپنی عزت کے پردوں کے قریب جسے چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے هَلْ یَنْظُرُوْنَ نہیں انتظار کرتے مگر اللہ تعالیٰ انہیں جلوہ دکھائے صفات قہریہ کے سایوں میں جو وہ بھی منجملہ ان صفات کے تجلیات سے ہیں جو ذات کے شمس کو چھپاتی ہیں یعنی قوی سماویہ کے ملائکہ اور لوح محفوظ میں ان کے ہلاک کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے فانی فی اللہ بن کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

(کذا فی التاویلات النجمیہ)

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ

بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے کتنی روشن نشانیاں انہیں دیں اور جو اللہ کی

اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ

آئی ہوئی نعمت کو بدل دے بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ کافروں کی

كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا

نگاہ میں دنیا کی زندگی آراستہ کی گئی اور مسلمانوں سے ہنستے ہیں اور ڈر والے

فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ

ان سے اوپر ہوں گے قیامت کے دن اور خدا جسے چاہے بے گنتی دے۔

النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۪

لوگ ایک دین پر تھے پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے

وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا

اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری کہ وہ لوگوں میں ان کے اختلافوں کا فیصلہ کردے

فِیْهِؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ

اور کتابوں میں اختلاف انہیں نے ڈالا جن کو دی گئی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس

الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۚ فَهَدَی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ

روشن حکم آچکے تھے آپس کی سرکشی سے تو اللہ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سمجھا دی ہے جس میں جھگڑ رہے تھے

مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۱۳﴾

اپنے حکم سے اور اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھائے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ

کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر اگلوں کی روداد نہ آئی

خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ

پہنچی انہیں سختی اور شدت اور ہلا ہلا ڈالے گئے یہاں تک کہ

الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ

اٹھا رسول اور اس کے ساتھ کے ایمان والے کب آئے گی اللہ کی مدد سن لو بیشک اللہ کی مدد

قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ

قریب ہے۔ تم سے پوچھتے ہیں۔ کیا خرچ کریں تم فرماؤ جو کچھ مال نیکی میں خرچ کرو تو وہ

فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ

ماں باپ قریب کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور راہ گیر کے لئے ہے

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ

اور جو بھلائی کرو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔ تم پر فرض ہوا خدا کی راہ میں لڑنا

وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْــــًٔـا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى

اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور قریب ہے کہ کوئی بات

اَنْ تُحِبُّوْا شَـيْــــًٔـا وَّھُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

تمہیں پسند آئے اور وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

ع ۲۶ ۱۰

تفسیر عالمانہ

سَلْ یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے یعنی اے رسول پوچھیے یا یہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جو اس خطاب کا اہل ہے بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اے بنو اسرائیل اس سے وہ بنی اسرائیل مراد ہیں

جو حضور اکرم ﷺ کے زمانہ اقدس میں موجود تھے اور ان میں سے بھی وہ جواب سب کے سردار تھے کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ ہم نے ان کے آباؤ اسلاف کو کتنے عنایت فرمائے مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ان کے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے معجزات ظاہرہ۔

ف: اہل فہم کو معلوم ہے کہ معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ان کا ہاتھ سفید ہو جانا اور من وسلویٰ کا نازل کرنا وغیرہ وغیرہ اور آیات سے ان کی وہ کتابیں جو آپ کے دین اسلام کی شاہد ہیں۔

کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ یہ محلاً منصوب ہے یا مجرور اَعْنِی کو سَلْ کا مفعول ثانی ہے اس لئے کہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے پہلے کی طرف خود اور دوسرے کی طرف بواسطہ حرف جر یا عن یا باء سے جیسے کہا جاتا ہے سالته عن كذا و هكذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا کبھی حرف جر محذوف بھی ہوتا ہے اسی قاعدے کے اعتبار سے اٰتَیْنٰهُمْ کو منصوب اور مجرور ہر دونوں طرح پڑھنا جائز ہے اور لفظ کم کی تمیز مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ہے۔

قاعدہ: نحوی قاعدہ ہے کہ جب کم اور اس کی تمیز میں فاصلہ ہو تو مِنْ کا لانا احسن وافضل ہے جیسے یہاں ہوا۔

ف: یہ سوال تقریع وتبکیت کا ہے جیسے قیامت میں کفار سے سوال ہوگا تو وہ بھی تبکیتا ہوگا نیز معجزات کے آنے کی تقریر بھی ہے یہ کم استفہامیہ خبریہ ہے اس لئے استفہام مراد نہیں۔

وَمَنْ یُّبَدِّلْ تبدیل بمعنی تغير الشئ على غير ما كان عليه یعنی شئے کا اپنے اس حال سے بدل دینا جس پر وہ پہلے تھی یعنی وہ جو تبدیل کرتا ہے نِعْمَةَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یعنی اس کی آیات روشن اس لئے کہ یہی ہدایت کا اصل ہیں اور ہدایت ہی تمام نعمتوں سے افضل نعمت ہے اور ان کا نعمت کو تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو ان کے لئے اس لئے ظاہر فرمایا تاکہ یہی آیات ان کی ہدایت کا سبب بن جائیں لیکن انہوں نے ان آیات کو گمراہی کا سبب بنا لیا۔ انہی کی وجہ سے وہ کافر ہو گئے اور ان نعمتوں کے شکر کو چھوڑ دیا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ اس کے بعد انہیں وہ نعمتیں نصیب ہوئیں اور وہ انہیں پہچان بھی چکے۔

سوال: آیات کے لئے جائتہ سے تصریح کیوں کی ہے حالانکہ ان کی تبدیلی قبل از وقت ناممکن ہوتی ہے۔

جواب: اس طرف اشارہ ہے کہ کفار نے ان آیات کو تفاصیل سے جاننے کے باوجود تبدیلی میں کسی قسم کی کسر نہ

چھوڑی۔ فَإِنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے یہ من شرطیہ کے جواب کی علت ہے گویا پوچھا گیا کہ وہ دنیا وآخرت کے سخت عذاب دینے والا ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں قتل کرا کر عذاب دیا جیسے بنی قریظہ کا حشر ہوا اسی طرح انہیں جلا وطن کر دیا۔ جیسے بنونضیر کے ساتھ ہوا اور قیامت میں جہنم کی آگ میں عذاب دیئے جائیں گے۔

مسئلہ: حضرت ابن الجید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا نعمت کو لاعلمی میں تبدیل کرنا بھی جرم ہے اور عمداً تبدیل کرنا تو اس سے زیادہ گناہ ہے اس لئے ان علماء کو سخت سزا ملے گی جو علم ہوتے ہوئے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں بہ نسبت لاعلم اور جاہل لوگوں کے کیونکہ کبھی جہل کا عذر بھی قبول ہو جاتا ہے اگرچہ ہا ب التکا لیف میں عذر نا قابل قبول ہوتا ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کافروں کے لئے حیوۃ دنیا کی زینت دی گئی یعنی ان کی آنکھوں میں دنیا کی محبت حسین بنا دی گئی اور ان کے دل میں اس کی محبت راسخ کر دی گئی یہاں تک کہ اس محبت میں اندھے ہو گئے اور اس پر ٹوٹ پڑے ہیں اس کے غیر سے روگرداں ہیں۔

سوال: تزئین کو اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا گیا؟

جواب: اس کا خالق اور موجد وہی ہے خلق اور ایجاد کی نسبت کی حیثیت سے اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور ہے بھی ایسے ہی کہ کوئی شئے نہیں کہ جس کا خالق اللہ تعالیٰ نہ ہو وہ شیاطین ہو یا قوائے حیوانیہ دنیا میں جتنے ہی عجیب امور اور اچھی چیزیں ہیں سب کی سب عارضی طور پر جڑیں ہیں۔

وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا اور کفار مومنین فقراء سے ہنسی مذاق کرتے ہیں جیسے عبد اللہ بن مسعود اور عمار اور صہیب اور بلال اور خبیب وغیرہ رضی اللہ تعالی عنھم اجمعین اور انہیں رذیل سمجھتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ ان حضرات نے خواہ مخواہ ہی دنیا کی لذات کو ترک کیا اور عبادت سے اپنے نفوس کو نقصان میں ڈال رہے ہیں اور دنیا کی خوشیاں اور کرامات کو ترک کر رہے ہیں اس کا عطف زین پر ہے اور جملہ میں من ابتدائیہ ہے گویا تمسخر کا آغاز کفار کی طرف سے ہوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور فقر کو اختیار اقبول کیا۔

سوال: جب یہاں پر اطاعت اور اختیار فقر مراد ہے تو پھر اسے تقوی سے معنون کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: تا کہ اشارہ ہو جائے کہ اہل ایمان کا دنیا کا ترک اس کی خرابیوں کے ڈر سے ہے کہ وہ دنیا بہت سے دینی امور میں خلل ڈالتی ہے بلکہ جناب قدس تک پہنچنے نہیں دیتی اور اپنے میں ایسے مشغول کر دیتی ہے کہ لحہ بھر بھی یاد الٰہی کے لئے فرصت نہیں دیتی اس میں ایک اور اشارہ بھی ہے کہ ہاں قرب صرف اسے نصیب ہو سکتا ہے جو مومن متقی پرہیزگار ہو۔

فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی مومنین قیامت میں کفار سے مراتب میں بلند ہوں گے اس لئے کہ مومن اعلیٰ علیین میں ہوں گے اور کفار اسفل السافلین میں اس اعتبار سے مومنین کو کفار پر حقیقی فوقیت حاصل ہوگی یا کہ مومنین اکراماً و اعزازاً بہت بلند مرتبہ پر ہوں گے اور مشرکین نہایت ہی ذلت و خوار میں۔ اس تقریر پر یہ فوقیت مجازی ہوگی اور یوم منصوب ہے اس فعل استقرار سے جو متعلق ہے وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ اور اللہ دارین میں جسے جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے کثیر اور بے انداز اس لئے کہ اس ذات کو عطا کرنے میں شئے کے ختم ہونے کا کوئی خوف نہیں کیونکہ وہ غنی ہے اور اس کی مقدورات بھی لانہایت ہیں پھر وہ اپنی حکمت اور مشیت کے تحت وسعت فرماتا ہے چنانچہ بعض بندوں پر وسعت اس لئے ہوتی ہے کہ اسے چند روز مہلت مل جائے جیسے ہی کفار اور قارون اور ان جیسوں کو مہلت ملی اور ملتی رہتی ہے اور بعض لوگوں کو یہ وسعت کرامۃ نصیب ہوتی ہے جیسے اغنیاء مومنین سلیمان علیہ السلام اور ان جیسے دیگر حضرات ہے۔

حدیث شریف: میں ہے حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا میں بہشت کے دروازہ پر ٹھہر کر دیکھا کہ اس میں اکثر مساکین ہیں۔ پھر میں نے دوزخ کے اندر جھانکا تو اس میں اکثر عورتیں تھیں ادھر اچانک دوزخ کے دروازہ پر چند لوگ محبوس نظر آئے ان میں جو اہل نار تھے انہیں نار میں بھیجا گیا۔

حضرت حافظ شیرازی نے فرمایا۔

ازیں رباط دو در چون ضرور تست رحیل	رواق وطاق معیشت چہ سر بلند وچہ پست
نہست ونیست مرنجاں ضمیر وخوش دل باش	کہ نیست سرانجم ہر کمال کہ ہست
ببال وپر مرو از رہ کہ تیر پرتابی	ہوا گرفت زمانے ولے بخاک نشست

(**ترجمہ**: اس دو دروازے والی حویلی سے ہر ایک نے کوچ کرنا ہے خواہ کوئی بلند محلوں میں بسر کرے خواہ جھونپڑیوں میں فلہٰذا تمہیں اس میں خوشی دل ہو کر زندگی بسر کرنی چاہیے اس لئے کہ یہاں ہر کمال کو زوال ہے تم اس دنیا میں بلند پرواز بھی نہ کرو اس لئے کہ ہر بلند پرواز والے کو سختی سے تیر مار کر مٹایا جاتا ہے)

حکایت: سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام سفر کر رہے تھے آپ کے ساتھ ایک یہودی تھا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس تین سونے کے ٹکڑے تھے۔ وہ یہودی کو دے دیئے اور فرمایا نہیں محفوظ رکھنا بوقت ضرورت کام آئیں گے ان میں سے ایک قرص یہود نے صرف کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کو ضرورت محسوس ہوئی تو یہودی سے وہ قرص طلب کئے یہودی نے صرف دو قرص پیش کئے آپ نے فرمایا تیسرا قرص کہاں گیا یہودی نے کہا یہی تو تھے آپ خاموشی سے چل پڑے یہودی ساتھ تھا اثناء سفر میں یہودی نے آپ کے بڑے بڑے کمالات دیکھے اس پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام نے اسے قسم دے کر فرمایا اب بتایئے وہ تیسرا قرص کہاں ہے یہودی پھر بھی انکار کر گیا آگے چل کر تین سونے کی اینٹیں ملیں آپ نے یہودی سے فرمایا ایک اینٹ میری اور دوسری تیری اور تیسری اس کی جس نے قرص خرچ کیا یہودی نے کہا وہ قرص میں نے ہی خرچ کیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا اب میرے سے دفع ہو جب کہ تو نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے دیکھے اور قرص کھانے کا اقرار نہ کیا اب دنیا کے لالچ میں آ کر اقرار کر رہا ہے فلہٰذا تیرا اور میرا ساتھ نہیں نبھ سکتا آپ نے دو اینٹیں سونے کی یہودی کو دے دیں یہودی کو تین ڈاکو ملے انہوں نے یہودی کو قتل کر کے اینٹیں چھین لیں۔ ان تین ڈاکوؤں نے ایک کو طعام لینے کے لئے بھیجا جب وہ چلا گیا تو باقی دونوں نے مشورہ کیا کہ اسے آتے ہی قتل کر دیا جائے تا کہ اینٹیں ہم دونوں کو بچ جائیں طعام لینے والے نے خیال کیا کہ طعام میں زہر ملا دیا جائے جب وہ کھائیں گے تو مر جائیں گے اور اینٹیں میں ہی لے لوں گا جب وہ پاس لوٹا تو ان دونوں نے اسے قتل کر دیا اور بھوکے تھے طعام کو کھانے لگے اور طعام کھاتے ہی مر گئے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام لوٹے تو دیکھا یہودی اور تینوں ڈاکو مرے پڑے ہیں اور سونے کی اینٹیں بچ گئی ہیں آپ متعجب ہوئے جبریل امین علیہ الصلوۃ والسلام حاضر ہوئے اور سارا واقعہ سنایا۔

سبق: دانا کو چاہیے کہ وہ کثرت دنیا سے دھوکہ نہ کھائے اور نہ ہی اس کے جمع کرنے کا اہتمام کرے بلکہ اس دنیا

کی کھیتی میں نیک عمل کا بیج ڈالے تا کہ آخرت میں اس کا پھل اٹھائے اس لئے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے نیز دنیا داروں کو بھی چاہیے کہ کثرت دنیا کے غرور سے فقیروں کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں اور نہ ہی ان سے ٹھٹھہ مخول کریں۔

کیونکہ یہ کفار کا طریقہ ہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

چو منعم کند سفلہ را روزگار — نہد بر دل تنگ درویش بار

چو بام بلندش بود خود پرست — کند بول وخاشک بر بام پست

(ترجمہ: جب کسی کمینے کو اللہ تعالیٰ دولت بخشا ہے تو وہ غریبوں کو ستاتا ہے جب کسی نالائق کی چھت اونچی ہو تو وہ خس و خاشاک اپنے سے نیچے والوں پر ڈالتا ہے)

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے دل پر ملکوت کا دروازہ کھولتا ہے تو اسے ملک وملکوت کی آیات دکھاتا ہے اگر اس سے وہ بندہ مغرور ہوتا ہے اور اپنے اس کمال سے عجب کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کی مرادوں میں سے کسی مراد کو قبول کر لیتا ہے اس کی نحوست سے نفس کی موافقت اور اس کی رضا میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کر لیتا ہے پھر اسے اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں مبتلا کرتا ہے اس لئے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو بدلا اس لئے اس کے حال کو اللہ تعالیٰ بدل دیتا ہے اور اس سے دیا ہوا وہ کمال چھین لیتا ہے اس تقریر پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی تائید کرتا ہے (کمال قال)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ اللہ تعالیٰ کے شدت عذاب کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب گناہ صغیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر اس سے وہ تائب نہیں بلکہ اس پر اصرار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے گناہ کبیرہ کے ابتلاء کی سزا دیتا ہے نیز اس کے شدت عذاب کا ایک نمونہ یہ ہے کہ کافر کو حیوۃ دنیا کی زینت دی جاتی ہے تو وہ اس میں دھوکہ کھا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس پر حب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے پھر وہ ان ایمان والوں سے ٹھٹھہ مخول کرتا ہے فقراء سے دین کے پیشوا مراد ہیں اس کی علامت یہ ہے کہ اس عذاب میں مبتلا ہونیوالا اولیاء اللہ کی عیب چینی میں لگا رہتا ہے اور اولیاء اللہ کے ماننے والوں اور ان سے محبت کرنے والوں پہ طعن وتشنیع کرتا ہے (جیسے وہابیوں دیوبندیوں اور ان کی پارٹیوں کی عادت ہے) اس کا نتیجہ عنقریب وہ معلوم کر لیں گے۔ کہ وہ ظالم

کون سی کروٹ بدلتے ہیں اور وہ لوگ جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے وہ قیامت میں کافروں پر فوقیت رکھتے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اعلیٰ علیین کے درجات عنایت فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسفل سافلین کے درکات سے عذاب دیتا ہے جس کی نہایت ہی کوئی نہ ہو تو پھر اسے دینے سے کمی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے ہاں کوئی حساب ہوتا ہے۔

ف: بغیر حساب کا معنی اور بھی ہے وہ یہ کہ بندوں کو دنیا میں دنیا کو عطا فرماتا ہے حرام سے سزا اور حلال سے جزاء ہاں جو انہیں آخرت میں میں عطا کرے اس کا کوئی حساب نہیں۔ (کذافی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً تھے لوگ ایک ہی جماعت یعنی ایمان و اتباع حق میں حضرت آدم سے لے کر نوح علیہ السلام تک متفق تھے اور ان دونوں حضرات کے مابین بیس قرن گزرے ہیں اور اکثر کے نزدیک ہر قرن اسی سال کا تھا۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ پس اللہ تعالیٰ نے انبیا کرام کو بھیجا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ دلالت کرتا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ کرے مُبَشِّرِيْنَ خوشخبری سنانے والے ہیں اس پر جو ایمان لاتا اور اطاعت کرتا ہے وَمُنْذِرِيْنَ اور عذاب سے ڈرانے والے اسے جو نافرمانی کرتا ہے وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری یا معنی یہ ہے کہ ان ہر ایک کے پاس کتاب ہوگی کتاب سے خاص کتاب مراد ہے ان کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر ہر ایک کے پاس علیحدہ علیحدہ ہوگی بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان پر مطلقاً کتاب نازل ہوئی اس لئے کہ ان میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جن کے ہاں علیحدہ کوئی کتاب نہیں اتری تھی بلکہ وہ اپنے سابق انبیاء علیہم السلام کی کتابوں پر عمل کرتے اور کراتے۔

سوال: عمومی لحاظ سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ ہر نبی علیہ السلام کو علیحدہ علیحدہ کتاب ملی ہو اس لئے کہ ہم ضمیر کا تقاضا یونہی ہے۔

جواب: قاعدہ کہ ضمیر کی عوامی حیثیت سلب کر کے اسے مخصوص گروہ کی طرف سے راجع کیا جاتا ہے یہاں بھی ایسے ہی ہوا جیسا کہ مقام کا تقاضا ہے۔

بالحق حال ہے اس کتاب کا کہ وہ حق سے ملتبس اور عدل و صدق اس پر گواہی دیتا ہے لِيَحْكُمَ تا کہ

اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لوگوں کے درمیان اس حق میں کہ جس میں انہوں نے اتفاق کے بعد اختلاف کیا وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ اور انہیں اختلاف کیا اس میں اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ مگر ان لوگوں نے جو کتاب آسمانی دیئے گئے اور انہیں کتاب اسی لئے دی گئی تا کہ وہ اختلاف کو مٹائیں۔

سوال: اسے انزال کی بجائے ایتاء کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب: تا کہ تنبیہ ہو کہ یہ لوگ شروع میں احکام کتاب کے حق پر پورا یقین آسمانی کتب کی حقانیت پر پورے طور واقفیت رکھتے تھے اسے ایتاء سے بیان کیا گیا اور یہ مطلب انزال سے حاصل نہیں ہو سکتا یعنی ان لوگوں نے کتاب کے امور کو برعکس کر دیا کہ کتب اس لئے اتاری گئیں تا کہ ان کا اختلاف مٹ جائے الٹا انہوں نے اس اختلاف کو مضبوط اور راسخ کر دیا۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بعد اس کے ان کے پاس جنابت آئے لیکن ان کے باوجود ان میں اختلاف راسخ ہو چکا مَا اخْتَلَفَ سے متعلق ہے اور یہ جائز ہے جیسے عربی عبارات میں آتا ہے مثلاً ما قام الا زید یوم الجمعة یوم جمعہ کو قائم نہ رہا سوائے زید کے بَغْیًا بَیْنَهُمْ یہ مَا اخْتَلَفَ الخ کا مفعول لہ ہے یہ استثناء تینوں اشیاء سے متعلق ہے اصل عبارت یوں ہے وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ اِلَّا الَّذِیْنَ الـــخ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ مِنْ بَعْدِ الـخ و ماکان الا ختلاف الا للبغی یعنی ان کا اختلاف صرف بغاوت کی بنا پر ہے اور اس لئے کہ وہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہیں اور اس لئے کہ ان پر حسد اور ظلم سوار ہے جیسے قابیل نے ہابیل سے کیا اس نے ہابیل اس لئے قتل نہیں کیا کہ اسے حق معلوم نہیں تھا۔ بلکہ قتل کیا تو صرف حسد کی بنا پر جو اسے اپنے بھائی پر تھا اور یہ حسد کی بیماری ہر زمانہ میں ہوتی ہے اور یہ فعل ان کے سردار کا تھا اور عوام تو اس کے توابع تھے اور ان کا ہر فعل ان کے روساء کی طرف منسوب ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا اختلاف فی الحق دین کا ایک قدیمی معاملہ ہے۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت دی جو کتاب پر ایمان لائے لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ یہ یهدی کے متعلق ہے اور ما موصولہ ہے اب معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی طرف ہدایت دی جو اس میں انہوں نے اختلاف کیا مِنَ الْحَقِّ حق سے موصولہ کا بیان ہے باذنہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور امر اور آسان کر دینے اور لطف اور نیک ارادہ اور رحمت سے یہاں تک کہ انہوں نے نور توفیق کے ساتھ باطل سے حق کو دیکھ لیا۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور جسے اللہ چاہتا ہے سیدھی راہ پر چلاتا ہے اور پھر اسے گمراہی کی راہ پر چلنے نہیں دیتا۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ

ربط: یہ خطاب حضور اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہے سابقہ نبیوں سے اختلاف کا ذکر کر کے اب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے غلاموں کو خطاب فرمایا تا کہ ان کی بہادری بڑھے اور کفار کی مخالفت پر صبر کرنے میں ثابت قدمی کا درس سیکھیں کہ صبر کا انجام کامیابی ہی ہے۔

ف: یہ ام منقطعہ ہے اور اس میں لفظ بل اور ہمزہ مقدر ہے بعض نے کہا کہ یہ اس خبر سے جو پہلے بیان ہوئی ہے سے عارض ہے اور اس انکار کی طرف رجوع ہے جو ہمزہ استفہام سے مفہوم ہوتا ہے اب معنی یہ ہوا کہ تمہیں لائق نہیں کہ تم گمان کر دیا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانو! تم کیوں گمان میں مبتلا ہوئے۔

وَلَمَّا يَاْتِكُمْ اور حال یہ کہ تمہارے پاس نہیں آئی مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا ان لوگوں کی کہاوت جو تمہارے سے پہلے گزرے ہیں یعنی طریقہ ان لوگوں کا جو تمہارے سے پہلے گزرے ہیں مِنْ قَبْلِكُمْ تمہارے سے پہلے گزرے ہیں۔ یعنی انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھ جو مومنین تھے جیسے تم مبتلا ہوئے ہو اس طرح وہ لوگ بھی مبتلا ہوئے تھے اس میں قضیہ وشدۃ کی تمثیل مقصود ہے اگرچہ تمہیں ان کی طرح تکالیف ومصائب نہیں پہنچیں۔

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ سابقہ مضمون کا بیان ہے لیکن جملہ مستانفہ کی صورت میں گویا سوال ہوا کہ ان کی کہاوت کیا ہے اور ان کا عجیب حال کیسا ہے تو فرمایا پہنچا انہیں سخت خوف اور سخت فاقے وغیرہ وَالضَّرَّآءُ یعنی درد اور بیماریاں وَزُلْزِلُوْا اور انہیں جو سختیاں اور درد پہنچے ان کی وجہ سے وہ بہت زیادہ ہلائے گئے حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ یعنی ان کا معاملہ اتنا سنگین ہو چکا تھا کہ وہ اضطراب کے اظہار پر مجبور ہو گئے یہاں تک کہ رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے معاملات کو بہت ماننے والے ہوتے ہیں اور مومنین بھی جو صحیح طور پر رسول خدا ﷺ کے نقش قدم پر چلنے اور ان کے انوار کی چمک پانے والے ہوتے ہیں مَتٰى کب آئے گی نَصْرُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی وہ مدد جس کا اس نے ہمیں وعدہ دیا مدد طلب کرتے اور اس کی آرزو کے اظہار میں یہی کہتے کہ ان کو دکھ اور تکلیف اٹھاتے بڑی مدت گزر گئی ویسے بھی دکھ اور درد کا وقت اگرچہ تھوڑا ہو طویل محسوس ہوتا ہے اسی لئے مدد الٰہی کو دیکھ کر انہوں نے کہا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ خبر

دار بے شک اللہ تعالیٰ کی مدد قریب یہ چونکہ انہوں نے مدد مانگی اور جلد ملنے کی تمنا کی اس لئے کہ ان کی تمنا پوری کرنے پر نہ صرف فرمایا بلکہ وعدہ پورا کر کے دکھایا یعنی میں اپنے دوستوں کا مددگار ہوں اور میری مدد ان کے قریب ہے یہ اس لئے فرمایا کہ جب وعدہ ہو گیا تو وہ پورا ہو کر رہے گا یہ بھی گویا سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ مدد الٰہی قریب ہے یا بعید اس پر فرمایا۔ اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ الخ

سوال: آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ سوال کا جواب ہے؟

جواب: قرینہ بتاتا ہے وہ قرینہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مدد الٰہی قریب ہے قرب کی خبر دینا پتہ دیتا ہے کہ اس سے کسی کے سوال کا جواب دینا ہے۔

سوال: ممکن ہے کہ سوال اصل مدد کے بارے میں ہو؟

جواب: اگر اصل مدد کے بارے میں سوال ہوتا تو عبارت اس طرح نہ ہوتی اور یہ عبارت اس سوال کے مطابق بھی نہیں حالانکہ سوال اور جواب کی عبارت میں تطابق ضروری ہے۔

تقریر دلپذیر: آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب تک انسان خواہشات نفسانیہ اور لذات دنیویہ نہیں چھوڑے گا اور شدائد وریاضات پر صبر نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ تک پہنچنا مشکل ہے چنانچہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

فلک مشام سے خوش کند بوئے مراد　　　　که خاک معرکہ باشد عبیر و عنبر او

(ترجمہ: فلک اس کو بامراد ہے جو مصائب وتکالیف کو اپنے لئے راحت جان سمجھے)

حکایت وحدیث: حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کفار ومشرکین کی تکالیف پیش کیں۔ آپ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے سے پہلے امتوں کو بہت بڑی سخت تکالیف دی جاتیں تب بھی وہ اپنے دین سے نہ ہٹے انہیں ایسے عذاب میں مبتلا کیا جاتا کہ ان کے مرد کے سر پر آرہ رکھا جاتا تو اس کا جسم دو ٹکڑے ہو جاتا اور کسی کے سر پر لوہے کا کنگھا رکھا جاتا تو ہڈیاں گوشت اور پٹھے علیحدہ علیحدہ ہو جاتے پھر بھی اپنے دین پر جمے رہتے ہمارے اس امر یعنی اسلام پر احسان فرمائے گا کہ تمہارا سوار صنعاء سے حضر موت تک اکیلا چلا جائے گا اس وقت اسے سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کا

خوف وخطرہ نہ ہوگا اور ایک وقت آئے گا کہ بکری کو بھیڑیئے سے کوئی خوف نہ ہوگا لیکن تم ہر معاملہ میں عجلت کرتے ہو گذشتہ دور میں نبی جو اپنی امت کے لئے مبعوث ہوتے تو انہیں جب مصائب وتکالیف کا سامنا ہوتا تو کہتے مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی۔

ف: حضور نبی اکرم ﷺ کو بھی ایک موقع ایسا درپیش ہوا وہ فتح مکہ سے پہلے آپ کو تکالیف ومصائب پہنچے آپ نے یوم احزاب میں جب کہ آپ کے صحابہ کرام کے صبر کا جام لبریز ہوا اور آپ کو بھی طرح طرح کی تکلیفیں پہنچیں تو اللہ تعالیٰ سے فتح ونصرت کی دعا مانگنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے بہترین ہوا بھیجی اور کفار کے مقابلہ کیوقت اپنا لشکر لینے ملائکہ کرام کو بھیجا جس کی وجہ سے کفار ومشرکین کو شکست ہوئی۔

ف: حضور نبی کریم ﷺ کی منجملہ تکالیف وشدائد کے ایک خندق کا موقع بھی ہے جب کہ مسلمانوں کی سخت سے سخت تکلیف کے علاوہ شدید خوف اور سردی اور رزق کی تنگی اور مختلف قسم کے دکھ پہنچے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ) بہر حال انہیں جو دکھ اور مصائب یہود ونصاریٰ سے پہنچے اور جتنی تکلیفیں انہیں منافقین ومشرکین وغیرہ سے پہنچیں کہ ہر ممکن مسلمانوں کو پریشان کرنے کی کوشش کی جاتی خصوصاً مکہ مکرمہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا دور بہت بڑا پرفتن تھا لیکن ان حضرات نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا ان حضرات کے ان واقعات سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیے ان کی طرح ہمیں بھی اسلام کی راہ میں درد وآلام میں صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے۔

سبق: ہمارا زمانہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ جیسے آلام ومصائب سے کم نہیں جب کہ ہمیں اسلامی روایات پر عمل کرنے کی وجہ سے عوام سے قسم قسم کی طعن وتشنیع سنائی دیتی ہے۔ ہمیں ان کی طعن وتشنیع سے صبر کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ مصائب وآلام سب سے زیادہ حضرات انبیاء کرام علیھم السلام پر ہوتے ہیں ان کے بعد ان کی اتباع میں اولیاء اللہ کو پھر اسی طرح جتنا ہی قرب نبوت سے ہوگا اتنا قدر مصائب وآلام پہنچیں گے کسی نے فرمایا۔

غبار لازمہ آسیاء بود صائب — اماں ز حادثۂ آسمان چہ می خواہی

(ترجمہ: چکی پر غبار کا ہونا لازمی ہے اور تم بھی ایسے ہو تو آسمان کے مصائب سے پناہ مانگنے کا کیا معنی)

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ شریف میں ہے کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (الآیۃ) جتنی گندی عادت انسانوں میں پائی جاتی ہیں یہ سب ان کے لئے عارضی ہیں اس لئے کہ جب روز میثاق میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ایمان واسلام کی گواہی دی تھی تو سب کے سب نیک اور برابر تھے اور جب پیدا ہوئے تو فطرت انسانی پر تھے یعنی ان میں برائی تھی۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔

جواب ۱: کفر کسی کی تقلید سے حاصل ہوتا ہے اور ایمان حقیقی ہوتا ہے اسے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جواب ۲: اصلی ابوین ستارے اور اربع عناصر ہیں ان کی وجہ سے اسلام کو بھی عارضی کہا گیا خلاصہ یہ کہ بچہ اپنے ماں باپ کی تربیت پر چلتا ہے ان کی تربیت سے جادہ حق اور صراط مستقیم سے بھٹکتا ہے اگرچہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ہادی مطلق کی ہدایت سے عصمت ہوتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لئے فرمایا وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى معلوم ہونا چاہیے کہ ہر ایک کے لئے سعادت شقاوت کی تقدیری کتاب ہوتی ہے چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی بھی ایسا نہیں جسے کتاب میں نہ لکھ دیا جاتا ہو کہ وہ اہل جنت سے ہے یا اہل نار سے اور اسے لکھا جاتا ہے کہ یہ سعید ہے یا شقی صحابہ کرام نے عرض کی تو پھر ہمیں اس لکھی ہوئی تقدیر پر بھروسہ کرنا چاہیے عمل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ نے فرمایا عمل کی بڑی ضرورت ہے اس لئے کہ جو بھی کسی کی اہلیت رکھتا ہے اسے اس کے عمل کی توفیق ملتی ہے جو اہل شقاوت سے ہوتا ہے وہ اہل شقاوت کے اعمال میں منہمک ہوتا ہے اور اگر وہ اہل سعادت سے ہوتا ہے تو نیک اعمال کی طرف لگا رہتا ہے۔

سبق: سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ ترک وتجرید کرے اور فقر وفقیری کے شدائد کو نبھائے یہاں تک کہ اسے جمال الٰہی کی جنت اور دار القرار کا داخلہ نصیب ہو اس پر انہیں جواب میں طویل مدت نہیں رہنا پڑے گا۔ اور کثرت جہاد سے صبر کا پہاڑ مشاہدہ جمال اور ذوق وصال سے حائل نہ ہوگا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کی تجلی کے ساتھ نفوس کے صفات کے قلع قمع کے لئے مع قوت صبر اور اس پر حوصلہ کرنے کے جوان کا محبوب انہیں کہتا اور ان کے لئے ارادہ کرتا ہے یہاں تک کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچی تو ان کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور جمال الٰہی کے انوار روشن ہوتے ہیں۔

جیسے حضرت خواجہ غلام فرید قدس سرہ نے فرمایا ۔

کھولی عشق کلید وے ہر وقت یار تے دید وے

(یعنی عشق کی چابی نے پردے ہٹائے تو اب میری نگاہ ہر وقت یار پہ ہے) (اویسی غفرلہ)

تفسیر عالمانہ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اپنے اموال میں سے کون سی چیز کو خرچ کریں۔

شان نزول: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ نبی کریم ﷺ نے صدقہ دینے کی ترغیب دلائی تو عمر بن جموع (جو بہت بڑا آدمی تھا) نے سوال کیا اور اس کا بہت بڑا مال تھا۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فرمایئے اے پیارے رسول ﷺ بھلائی میں سے جو بھی خرچ کرو گے یہ خرچ کا بیان ہے۔

سوال: مال کو خیر سے کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب: مال کا حق یہ ہے کہ اسے خیر میں خرچ کیا جائے اس اعتبار سے وہ مال سب کا سب خیر ہی خیر ہے فَلِلْوَالِدَيْنِ پس اولاً ماں باپ پر۔

سوال: یہ جواب سوال کے مطابق نہیں سوال تو انہوں نے کیا تھا کہ اپنے اموال میں سے کونسا مال خرچ کریں جواب دیا گیا مصرف کے متعلق؟

جواب: مال کے خرچ کرنے کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ اس کا مصرف صحیح نہ ہو۔

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى اور وہ لوگ جو رشتہ میں زیادہ قریب ہیں اور یتامی بشرطیکہ وہ محتاج بھی ہوں وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اور مساکین ومسافرین۔

سوال: اس میں سائلین اور گردن آزاد کرنے کا ذکر نہیں حالانکہ وہ بھی اموال کا مصرف ہیں۔

جواب ۱: چونکہ ان کا ذکر دوسرے مقامات پر آچکا ہے اسی پر اکتفا کیا گیا۔

جواب ۲: اگلے مضمون کے عموم کے تحت یہ بھی شامل ہیں چنانچہ فرمایا وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ اور وہ جو تم عمل میں

لاتے ہو خیر سے یہ تمام نیکی کی مصارف کو شامل ہے۔

فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ یعنی جو بھی خیر کا کام کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کو جانتا ہے اور اس کا ثواب دیتا ہے۔

مسئلہ: اس آیت میں والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی علی سبیل التطوع ہر ذی حاجت کی حاجت پوری کرنے کی ترغیب ہے۔

ف: یہ آیت زکوٰۃ اور اس کے مصارف کے منافی نہیں جو دوسرے مقام پر فرمایا اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اس کا تفصیلی بیان دسویں پارہ میں آرہا ہے۔ فرض کیا گیا ہے عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ تم پر جہاد یعنی تمام کفار (حربی) کے ساتھ جہاد کرنا تمہارے اوپر فرض ہے۔

مسئلہ: جمہور کے نزدیک جہاد فرض کفایہ ہے جیسے نماز جنازہ اور سلام کا جواب دینا فرض کفایہ ہے وَهُوَ حالانکہ وہ جہاد کُرْهٌ لَّکُمْ تم پر شاق ہے اور تمہاری طبیعتیں اس سے کراہت کرتی ہیں۔

فائدہ: کرہ مصدر ہے بمعنی کراہت۔

سوال: اسے مصدر کے ساتھ کیوں لایا گیا؟

جواب: مبالغہ مطلوب ہے گویا یہ جہاد فی نفسہ کراہت ہے اس لئے کہ لوگ اس سے سخت کراہت کرتے ہیں اور اس کی کراہت طبیعتوں کی نفرت کی وجہ سے ہے اس لئے کہ مال کا خرچ کرنے کے علاوہ نفس کو مشقت میں ڈالنا پڑتا ہے اور روح اس سے اکتا جاتی ہے اور اس کا مطلب نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کراہت کی اور طبعی کراہت مذموم نہیں بلکہ اس میں عبودیت کا معنی متحقق ہو جاتا ہے جب کہ اس پر حکم شرع مان کر عمل کیا جائے تاکہ باوجود یہ کہ طبیعت نفرت کرتی ہے لیکن پھر بھی عمل کیا جا رہا ہے۔

مسئلہ: اسے اعتقادی صورت میں مکروہ سمجھنا منافقین کا کام ہے۔

وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا بہت سی چیزوں کو تم مکروہ سمجھتے ہو اس سے وہ امور مراد ہیں جن میں تکالیف اور مشقت و منجملہ ان کے جہاد بھی ہے وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ اور حالانکہ اس میں تمہاری بھلائی ہے اس کے لئے جہاد میں دو بھائیوں میں سے ایک کا ہونا لازمی ہے۔ فتح و نصرت اور اس پر حصول مال غنیمت، شہادت اور اس پر جنت۔

قاعدہ: کلمہ عَسٰی بمعنی لعل ہے اس کی نسبت بندوں کی طرف ہو تو بمعنی ترجی یعنی امید رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو بمعنی ترجیۃ بمعنی امید لانا۔

وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا اور بہت سی چیزوں سے تم محبت کرتے ہو اس سے وہ تمام امور لذیذہ مراد ہیں جن سے روکا ہے۔ منجملہ ان کے جہاد بھی ہے۔ وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ اور اس میں تمہاری خرابی ہے اس لئے اس میں ایک تو غنیمت اور اجر و ثواب سے محروم ہو جاؤ گے دوسرا تمہارے اوپر دشمنوں کو غلبہ ملے گا اور پھر وہ تمہارے شہر کو تباہ و برباد کریں گے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں تمہاری دینی اور دنیوی بھلائی ہے اسی لئے تمہیں اس کا حکم دیتا ہے۔ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور اسے تم نہیں جانتے اسی لئے تو تم اس سے کراہت کرتے ہو۔

مثنوی شریف میں ہے۔

مالتصوف قال و جدان لفرح   فی فوادی عند ایتان الترح

جملہ ور زنجیر بیم و ابتلاء   میروند ایں راہ بغیر اولیاء

(**ترجمہ**: تصوف کیا ہے قلبی فرحت جو روحانی سرور سے نصیب ہوتی ہے یہی تصوف ہے دنیا میں ہر ایک خوف و ہراس میں مبتلا ہے سوائے اولیا کرام کے) یعنی مقلد تو بارگاہ حق تک اضطرار سے پہنچتا ہے لیکن ولی اللہ کو یہ اضطرار نہیں۔

ف: سیدنا ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خلق خدا کو چھ چیزوں سے تباہی و بربادی پہنچتی ہے۔

۱۔ عمل کے لئے نیت کی غلطی

۲۔ بندے جب اپنے جسموں کو شہوات میں ڈال دیں۔

۳۔ باوجود یہ کہ جانتے ہیں کہ آخر مرنا ہے لیکن آرزو اور حرص و ہوا میں مبتلا ہو جائیں۔

۴۔ خالق کی مرضی پر مخلوق کی رضا کو ترجیح دیں۔

۵۔ خواہشات نفسانیہ سے پیار اور سنت نبویہ علی صاحبہا السلام کو پس پشت ڈال دیں۔

۶۔ اسلاف کی معمولی غلطی پر اپنی ضروریات کے لئے دلیل بنائیں لیکن ان کے مناقب اور اچھے اعمال کی پیروی نہ کریں۔

سبق: دانا پر لازم ہے کہ وہ اپنے نفس اور طبیعت کے ساتھ جہاد کرے تاکہ اس سے خواہشات و شہوات اور

بدعات دور ہوں اور اس کے دل پر کتاب وسنت کی محبت غلبہ کرے۔

حکایت: سیدنا ابراہیم الخواص رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں جبل لکام میں تھا دیکھا کہ انار پر بہت سے بھڑ جمع ہیں میری خواہش ہوئی کہ میں بھی اس سے کچھ لے لوں چنانچہ آگے چل کر ایک انار اٹھایا اور اسے چیرا تو وہ کھٹا نکلا اسے چھوڑ کر میں آگے چلا تو ایک مرد کو زمین پر پڑا ہوا دیکھا کہ اسے بھڑ چمٹے ہوئے ہیں میں نے کہا السلام علیک اس نے کہا وعلیک السلام یا ابراہیم میں نے پوچھا جناب آپ نے مجھے کیسے پہچانا انہوں نے فرمایا من عرف اللہ لا یخفی علیہ شی جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوتی ہے اس سے کوئی چیز او جھل نہیں ہوتی میں نے کہا جب اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کا اتنا بڑا مرتبہ ہے تو اس سے سوال کیوں نہیں کرتے تا کہ وہ آپ کو ان بھڑوں سے بچائے انہوں نے فرمایا تم کیوں نہیں اس سے سوال کرتے کہ وہ تمہیں انار کی شہوات نفسانی سے بچائے پھر فرمایا یاد رکھیے کہ انار کی ڈنس کا درد انسان کو آخرت میں محسوس ہوگا اور بھڑ کے ڈنس کا درد صرف دنیا میں ہوتا ہے اس ولی اللہ کو اس حال میں چھوڑ کر چلا گیا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

مبر طاعت نفس شہوت پرست   کہ ہر ساعتش قبلہ دیگر است

کند مرد نفس امارہ خوار   اگر ہوشمندی عزیزش مدار

(**ترجمہ:** نفس شہوت پرست کا کہنا مت مان اس لئے کہ نفس کا ہر لحظہ نیا قبلہ ہوتا ہے نیک بخت مرد وہ ہے جو نفس امارہ کو ذلیل وخوار رکھتا ہے تمہیں بھی اگر عقل ہے تو نفس سے پیار مت کرو)

تفسیر صوفیانہ تاویلات قاشانیہ شریف میں ہے کہ تمہارے اوپر نفس وشیطان کا مقابلہ کرنا فرض ہے اور یہ تمہارے لئے مکروہ محسوس ہوتا ہے یعنی اندرائن سے زیادہ کڑوا اور شیر کے حملہ سے بھی زیادہ حملہ محسوس کرتے ہو حقیقی جہاد یہ ہے کہ وجود مجازی کو درمیان سے ہٹا دیا جائے اسلئے کہ یہ عبد اور رب تعالیٰ کے درمیان آڑ ہے جیسا کہ منقول ہے کہ تیرا وجود خود گناہ ہے پھر اس سے دیگر اور گناہ کیا ہوگا اس طرح حضرت منصور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا۔

بینی و بینک انی قد یز حمنی   فارفع بجودک لمی من البین

(ترجمہ: اے اللہ میرے اور تیرے درمیان میں خود حجاب ہوں براہ کرم مجھے درمیان سے ہٹادے)

اور بہت سی چیزوں کو تم مکروہ سمجھتے ہو حالانکہ اس میں تمہاری بھلائی ہے اس لئے کہ وہی وجود خواہشات اور لذات کے درمیان حجاب ہے اس سے جو اسی کے اندر خیر کثیر اور لذت عظیمہ روحانیہ ہے یہی شدت شریعہ الا نقضاء حقیر سمجھی جاتی ہے بہ نسبت اسی خیر باقی اور لذت سرمد کے اور بہت سی چیزوں سے تم محبت کرتے ہو یعنی لذات جسمانیہ اور تمتعات نفسانیہ سے اور وہ تمہارے نفس کے لئے بری ہیں کہ وہ نفس لذات روحانیہ سے محروم ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کراہت نفوس میں اور راحت قلوب میں رکھی گئی ہیں اور تم نہیں جانتے ہو کہ حیات قلوب نفوس کو ہٹانے میں ہے اور حیات نفوس قلوب کے مٹانے میں ہے جیسے کسی نے کہا ہے۔

اقتلو نی یا ثقا تی ۔ ان فی قتلی حیاتی

(ترجمہ: اے میرے دوستو! مجھے مارڈالو اس لئے کہ میری دائمی زندگی میری موت میں ہے)

مثنوی شریف میں ہے۔

خنجر شمشیر شد ریحان من مرگ من شد بزم ونرگسدان من

(ترجمہ: میری ریحان خود میری خنجر و شمشیر ہے میری بزم ونرگستان ہی میری موت ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ

تم سے پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنے کا حکم — تم فرماؤ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ

اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس پر ایمان نہ لانا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس میں بسنے والوں کا نکال دینا

اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ

اللہ کے نزدیک یہ گناہ اس سے بھی بڑے ہیں اور ان کا فساد قتل سے سخت تر ہے اور ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے

حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ

یہاں تک کہ تمہارے دین سے پھیر دیں اگر بن پڑے اور تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے

دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

پھر کافر ہوکر مرے تو ان لوگوں کا کیا اکارت گیا دنیا میں

وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

اور آخرت میں اور وہ دوزخ والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا۔ وہ جو

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ

ایمان لائے اور وہ جنہوں نے اللہ کے لئے اپنے گھر بار چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے وہ رحمتِ الٰہی

رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ

کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں

قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ

تم فرماؤ کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ دنیوی نفع بھی اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ

اور تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں تم فرماؤ جو فاضل بچے اسی طرح اللہ تم سے آیتیں

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ

بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم دنیا اور آخرت کے کام سوچ کر کرو۔ اور تم سے یتیموں کا

الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

مسئلہ پوچھتے ہیں تم فرماؤ ان کا بھلا کرنا بہتر ہے اور اگر اپنا ان کا خرچ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں

يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اور خدا خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ

بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اور شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک مسلمان نہ ہو جائیں اور بیشک مسلمان لونڈی

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ

مشرکہ سے اچھی ہے اگرچہ وہ تمہیں بھاتی ہو اور مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ

اور بیشک مسلمان غلام مشرک سے اچھا ہے اگرچہ وہ تمہیں بھاتا ہو وہ

اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ

دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم سے اور اپنی آیتیں

اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے کہ کہیں وہ نصیحت مانیں۔

۲۷ ع ۵ ۱۱

تفسیر عالمانہ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ آپ سے حرام کے مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔

شان نزول: مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بدر کی جنگ سے دو ماہ قبل جمادی الاخری میں بھیجا جب کہ آپ مدینہ تشریف لائے ان کے ساتھ آٹھ حضرات (مہاجرین میں سے) بھیجے وہ آٹھ حضرات یہ تھے۔

۱۔ سعید بن ابی وقاص الزہری ۲۔ عکاشہ بن محصن الاسدی

۳۔ عتبہ غزوان اسلمی ۴۔ ابو حذیفہ بن ربیعہ

۵۔ سہیل بن بیضا ۶۔ عامر بن ربیعہ

۷۔ واقد بن عبداللہ ۸۔ خالد بن بکیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم

ان کے امیر یعنی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک تحریر لکھ کر فرمایا اس تحریر کو لے کر اللہ تعالیٰ کے نام سے چلئے لیکن اسے کھول کر نہ دیکھنا دو یوم کے بعد اسے کھولنا جب کہیں آرام کے لئے اترو اور اس کا مضمون اپنے تمام ساتھیوں کو سنا دینا اور اس میں جو حکم مکتوب ہو اس پر عمل کرنا لیکن اپنے ساتھیوں کو اس پر مجبور نہ کرنا جس کی مرضی آئے تیرا ساتھ دے جو نہ چاہے وہ مختیار ہے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ تحریر لے کر چل پڑے اور حسب الارشاد دوسرے روز وہاں جاکر کھولا جہاں آرام کے لئے ٹھہرے اس میں لکھا ہوا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم اما بعد فر علی بر کة اللہ لمن تبعک من اصحابک

حتی تنزل بطن نخلة فترصد بھا عیر قریش لعلک ان تاتینا منھا بخیر

(اللہ کا نام لے کر چلئے یہاں تک کہ جب بطن نخلہ (مقام کا نام) میں پہنچو تو وہاں

قریش کا قافلہ ملے گا امید ہے اس میں تم بھلائی لے کر واپس لوٹو گے)

جب حضرت عبداللہ نے تحریر پڑھی تو کہا سمعا و طاعة مجھے یہ حکم بدل و جان قبول ہے اپنے ساتھیوں سے کہا اب تمہاری مرضی میرے ساتھ چلو ورنہ تمہیں اختیار ہے مجھے روکا گیا ہے کہ میں تمہیں اس امر پر مجبور کروں جو چاہو ورنہ واپس جانا ہے تو میری طرف سے اجازت ہے یہ کہہ کر چل پڑے اور آپ کے ساتھی بھی آپ کے

ساتھ ہو لئے کوئی ایک بھی پیچھے نہ رہا یہاں تک کہ مقام قرع (حجاز میں ایک مقام کا نام ہے جسے بحران کہا جاتا ہے) تھوڑی دیر کے لئے بیٹھے یہاں حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اونٹ گم ہو گئے یہ دونوں ان کی تلاش کرنے لگے اس وجہ سے یہ بچھڑ گئے لیکن باقی حضرات حضرت عبداللہ بن جحش کے ساتھ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ بطن نخلہ میں پہنچ گئے بطن نخلہ (مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان واقع ہے) یہ حضرات جب یہاں پہنچے تو ان کے ساتھ قریش کا قافلہ بھی پہنچ گیا یہ لوگ طائف سے کشمش اور گندم اور دیگر تجارتی سامان لے کر آرہے تھے وہ بھی یہاں بطن نخلہ میں آرام کے لئے اترے ان میں عمر بن الحضرمی اور حکیم بن کیسان مولی ہشام بن المغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ مخزومی تھے جب انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے غلاموں کو دیکھا تو گھبرا گئے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ مشرکین ہمیں دیکھ کر ڈر گئے ہیں فلہذا اپنے میں سے کسی ایک کا سر مونڈ دو اور وہ ان کے پیچھے پڑ جائے چنانچہ ان حضرات نے حضرت عکاشہ کا سر مونڈا اور وہ ان مشرکین کو جھانک کر دیکھنے لگے تو انہوں نے کہا کوئی خطرہ نہ کرو یہ اپنا آدمی ہے اور یہ واقعہ جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ کو ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسے جمادی الاخرۃ سمجھ کر یہ کاروائی کر رہے تھے۔ حالانکہ رجب کا چاند چڑھ گیا تھا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے مشورہ کیا کہ اگر رات تک معاملہ چھوڑ دو گے تو رجب کا چاند چڑھ جائے گا اور اس میں جنگ حرام ہے فلہذا ابھی وقت ہے اس سے جو کاروائی کرنی ہے کر لو چنانچہ حضرت واقد بن عبداللہ السہمی نے عمر بن الحضرمی کو تیر مارا وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا مشرکین میں ہجرت کے بعد یہ پہلا مقتول ہے پھر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو قید کر لیا اسلام میں سب سے پہلے یہی قیدی ہیں جنہیں مسلمانوں نے قید کیا نوفل اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ گیا تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا۔ صحابہ کرام قافلہ اور قیدیوں کو لے کر بارگاہ رسالت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں حاضر ہوئے اس پر قریش نے شور مچایا کہ حضرت محمد ﷺ نے ماہ حرام میں جنگ کو حلال کیا اب تو دنیا سے امن اٹھ گیا اور ان کی وجہ سے معاش تنگ ہو جائے گی کوئی بھی اپنی معاش کے لئے باہر نہیں جا سکے گا کیونکہ یہ لوگ شہروں میں پھیل جائیں گے اور ناحق قتل کریں گے۔ قریش نے ان مسلمانوں کو ستانا شروع کر دیا جو مکہ میں رہتے تھے اسی قافلہ کے بدلہ میں بلکہ وہاں کے لوگوں کو شہید کرنا

شروع کر دیا اور ان کے مال بھی چھینے اور کہا کہ اے صحابیو! تم نے ماہ حرام کو حلال کر دیا اور خود تم نے ہی اس میں ہمارے لوگوں کو مارا اور لوٹا (یعنی وادی نخلہ میں صحابہ کرام نے) پھر ہم کیوں نہ تمہیں ماریں اور لوٹیں یہ بات حضور نبی کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ نے حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں سے فرمایا کہ میں نے تمہیں ماہ حرام میں لڑائی کے لئے نہیں بھیجا تھا آپ نے فرمایا اب قافلہ اور قیدیوں کے بارے میں توقف کرو یعنی مال کو تقسیم کرو اور نہ ہی قیدیوں کو کچھ کہو اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرو جو حکم ہوگا اسی پر عمل ہوگا حضرت عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو پریشانی ہوئی اور حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ہم نے ابن حضرمی کو دن میں مارا پھر شام کو چاندر جب کا دیکھا یہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم نے یہ معاملہ رجب میں کیا ہے یا جمادی الاخری میں۔ غرض یہ معاملہ لوگوں کے لئے بہت بڑی پریشانی کا موجب بن گیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے قافلہ کا سامان منگوا کر پانچواں حصہ نکالا اور باقی حضرت عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا اور یہ اسلام میں سب سے پہلا مال غنیمت ہے۔

واقعات

۱۔ اہل مکہ نے اپنے دو قیدیوں کو چھڑانے کے لئے فدیہ بھیجا۔ آپ نے فرمایا جب تک ہمارے دو اصحاب حضرت سعید اور عتبہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) واپس نہیں آئیں گے ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ واپس نہ آئے تو ہم قتل کر دیں گے۔ جب وہ دونوں حضرات آ گئے تو آپ نے فدیہ لے کر ان دونوں مشرک قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

۲۔ ان میں حضرت حکم بن کیسان تو مسلمان ہو گئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر باش رہے یہاں بئر معونہ کے موقع پر شہید ہوئے لیکن عثمان بن عبداللہ مکہ کی طرف لوٹا اور کافر ہو کر مرا۔

۳۔ اور نفل احزاب کی لڑائی میں کفار کی طرف سے گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کی خندق میں چھلانگ لگائی تا کہ انہیں شکست دے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے گھوڑے سمیت خندق میں دبا دیا اور وہیں گھوڑے سمیت مر گیا مشرکین نے حضور نبی کریم ﷺ سے اس کی لاش قیمتاً مانگی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: خذہ فانہ خبیث

الجیفته و الدیته اس لے جاؤ خبیث کو اس کی لاش بھی مردار ہے اور اس کی دیت بھی۔

خلاصہ تفسیر: اے پیارے حبیب ﷺ آپ سے مسلمان تو مسئلہ معلوم کرنے کی بنا پر سوال کرتے ہیں لیکن کفار بوجہ سرکشی اور ضد کے پوچھتے ہیں ماہ حرام کے بارے میں یعنی رجب کے متعلق۔

ف: ماہ حرام کو اس لئے حرام کہا جاتا ہے کہ اس ماہ میں جنگ کرنا حرام ہے۔

قِتَالٍ فِيْهِ الشَّهْرِ سے بدل الاشتمال ہے اس لئے کہ ماہ حرام قتال کو بھی مشتمل ہے قل اے پیارے حبیب ﷺ ان کے سوال کے جواب میں فرمایئے قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ اس میں جنگ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا گناہ ہے قتال مبتدا ہے اور اس کی خبر کبیر ہے۔

سوال: نکرہ مبتدا نہیں ہوسکتا اور یہاں قتل نکرہ مبتدا کیسے کیا گیا؟

جواب: جب نکرہ موصوف ہو تو وہ نکرہ مبتدا بن سکتا ہے یہاں یہ نکرہ لفظ فیہ کی وجہ سے موصوف ہے۔

مسئلہ: اکثر اہل علم کے نزدیک یہ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ سے منسوخ ہے۔

وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ صد مبتدا اور مابعد کے عمل کی وجہ سے موصوف ہے اگر چہ نکرہ ہے لیکن اس تاویل سے مبتدا ہوتا ہے جائز ہوا اب معنی یہ ہوا اور اس کا اسلام سے روکنا جو کہ بندے کو اللہ سے ملاتا ہے وَكُفْرٌۢ بِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اس کا عطف سبیل اللہ پر ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکنا بھی کفر کے افراد میں ہے۔

سوال: یہ عطف احسن نہیں کیونکہ اس طرح سے اجنبیت پیدا ہوتی ہے؟

جواب: اس طرح کے عطف سے معطوف علیہ اور معطوف میں اجنبیت ہے ہی نہیں کیونکہ دونوں کا مفہوم ایک ہو جاتا ہے مثلاً کہا جائے منع المسلمین عن دخول مکعه و زیاده بیت اللہ دخول اور زیارت ایک ہی بات ہے اس اعتبار سے عطف صحیح ہوا۔ (اگر چہ تفسیری)

وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ یعنی مسجد حرام کے اہل ان سے نبی کریم ﷺ اور مومنین مراد ہیں منہ یعنی مسجد حرام سے۔ اس کا عطف کفر یہ پر ہے۔

سوال: تمام اہل اسلام کو مسجد حرام کا اہل کیوں قرار دیا گیا کیونکہ اہل عرف میں اس کو کہا جاتا ہے جو وہاں کا

مکین ہو اور تمام اہل اسلام تو مکہ کے مکین نہیں تھے۔

جواب: دلالت التزامی کے لحاظ سے وہ بھی مکہ کے مکین ہیں کہ اہل اسلام کہیں بھی ہوں تب بھی ان پر مسجد حرام کی ادائیگی واجب ہے اور پھر وہ بالاخر اس کے مکین ہی ہوں گے کیونکہ عاقبت اہل اسلام کی مسجد حرام میں ہی ہے اس لئے اس کا نام عاقبت ہے اور کفار کو اس کا اہل نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ ان کی مسجد حرام کی مکانیت عارضی ہے۔

اَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ سابقہ جملہ بوجہ عطف کے مبتدا ہوا اور یہ جملہ ان سب کی خبر ہے یعنی مذکورہ بالا چار امور گناہ اور بدانجام کے لحاظ سے بہت بڑے ہیں بہ نسبت ابن الحضرمی کو ماہ حرام میں مسلمانوں کے قتل کرنے سے کیونکہ ماہ حرام میں قتل کرنا کسی وقت تو حلال ہوسکتا ہے لیکن کفر کا تو کسی وقت بھی حلال ہونے کا امکان نہیں اس لئے کہ مسلمانوں نے اس وقت ماہ رجب کا ہونا نہ سمجھا تھا اور وہ اس تاویل کی وجہ سے ماہ حرام میں قتل کر بیٹھے اور یہی ان کے لئے جواز کی دلیل ہے اور کفر تو کسی وجہ سے بھی تاویل کی گنجائش نہیں رکھتا۔ وَالْفِتْنَةُ یعنی وہ امور جن کے کفار مرتکب ہوئے مثلاً مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکالا اور شک میں مبتلا ہیں اور لوگوں کو اسلام سے روکتے ہیں یہ فتنہ ابتداء بھی ہے اور بقاء بھی اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ بہت سنگین امر ہے ابن الحضرمی کو ماہ حرام میں قتل کرنے سے۔

ف: جب آیت اتری تو حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ مکرمہ کے رہنے والے مسلمانوں کو کہا کہ اگر کفار تمہیں ماہ حرام میں جنگ کرنے کی عار دیں تو انہیں یہی کہو کہ تم کفر میں مبتلا ہو اور تم نے اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور اب مسلمانوں کو بیت اللہ شریف کی زیارت سے روکتے ہو۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ اس آیت میں کفار کے مسلمانوں کی عداوت میں مستحکم ہونے اور فتنہ پر مصر رہنے کا بیان ہے یعنی اے مسلمانو! کفار تمہارے ساتھ لڑائی پر تلے رہیں گے حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ تاکہ تمہیں دین حق سے پھیر کر اپنے باطل دین کی طرف لے جائیں۔ اِنِ اسْتَطَاعُوْا اس میں اشارہ ہے کہ وہ اپنے دین پر بڑے مضبوط اور ثابت قدم ہیں گویا کسی کے سوال پر یہ جواب دیا گیا ہے سوال یہ کہ یہ بات کیسے ہوسکتی ہے اس کا جواب مثال کے طور پر یوں ہے کہ کوئی کسی سے کہے اگر تو میرے اوپر قابو پالے تو جو مرضی آئے کرنا۔ جب اسے

یقین ہو کہ نہ وہ میرے اوپر قابو پاسکے گا اور نہ ہی وہ مجھے کچھ کہہ سکے گا۔

ف: اس میں مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے کہ تم یقین رکھو کہ تمہارے دشمن تم پر غالب نہیں ہو سکیں گے (بشرطیکہ تمہارے اندر اسلام کے اطوار موجود ہوں)

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ ادغام نہیں کیا گیا اور اس کی دوسری دال کو ساکن پڑھا جائے اور اس کی فتح بھی جائز ہے جب کہ پہلی دال میں ادغام کیا جائے اور فتح اس لئے کہ یہ اخف الحرکات ہے اور الارتداد بمعنی ہٹنا۔ اس میں ارتداد سے ڈرایا گیا ہے یعنی جو بھی یہ عمل ان کے گمراہ کرنے اور اغواہ کرنے سے کرے فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ وہ دین اسلام کی طرف نہ لوٹے اور اسی حالت میں یعنی کافر ہو کر مرے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا موت سے پہلے اگر ارتداد سے توبہ کر کے لام داخل ہو جائے تو بھی اس کا اسلام قبول ہے۔

فَأُولٰٓئِكَ یعنی وہ لوگ جو موت تک اپنے ارتداد پر رہے۔ حَبِطَتْ باطل اور لاشی ہو گئے۔ اَعْمَالُهُمْ ان کے وہ اعمال جو انہوں نے بحالت اسلام کئے اور ایسے کہ پھر ان کا حصول ناممکن ہے فِي الدُّنْيَا یعنی دنیا میں ایسے کہ ان کا مارنا قتل کرنا اس کے ارتداد کی وجہ سے اور مسلمانوں سے موالات ختم اور نہ ہی وہ اس کی مدد کریں اور نہ ہی وہ اس کی تعریف کریں گے اور نہ ہی ان کے ساتھ نکاح و بیاہ کا سلسلہ ہوگا اور اہل اسلام کے ساتھ وراثت کے حقوق بھی ضائع وغیرہ وغیرہ یعنی وہ احکام جو مرتد اور اس کے اہل و عیال اور مال و اسباب پر جاری ہو سکتے ہیں دنیا میں اس پر تمام جاری ہوں گے وَالْاٰخِرَةِ یعنی آخرت میں ثواب اور حسن انجام سے محرومی کیونکہ مرتد کی عبادت جب دنیا میں اس لائق نہ تھی کہ قبول ہو پھر اس ثواب آخرت میں کیسا فلہٰذا آخرت میں ثواب اور حسن انجام سے محروم۔

فائدہ: حبط اعمال سے نفس اعمال کا ابطال مراد نہیں کیونکہ وہ تو اعراض ہیں اور ان کی حقیقت یہ کہ وہ ہوئے اور مٹے اور مسلم ہے کہ اعدام المعدوم محال (معدوم کو مٹانا محال ہے) بلکہ وہی مراد ہے جو ہم نے پہلے عرض کیا کہ ارتداد ایمان کے ثواب اور اس کے ثمرات کو ضائع کر دیتا ہے اور بس۔

مسئلہ: آیت کا بظاہر تقاضا یہ ہے کہ ثبوت احکام مذکورہ یعنی آخرت و دنیا میں حبط اعمال کے لئے وفات کے

وقت ارتداد شرط ہے اس بناء پر وہ شخص دائمی طور پر جہنم میں رہے گا اگر اس ارتداد کے بعد پھر اسلام قبول کرے تو اسے حبط شدہ اعمال کا ثواب نہیں ملے گا اسی لئے امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے استدلال فرمایا ہے کہ ارتداد سے سابقہ اعمال کا اعادہ نہیں ہوتا اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور ارتداد سے پہلے جو فرائض ادا کئے اب ارتداد پر وہ سب ضائع ہو گئے فلہٰذا اسے دوبارہ ان کی قضا کرنی چاہیے اس طرح حج کے متعلق مسئلہ ہوگا۔

ف: ارتداد اعمال کو ضائع نہیں کرتا ہاں وہ شخص اسی حالت یعنی ارتداد میں فوت ہوا تو پھر اس کے اعمال ضائع ہوں گے اور حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ارتداد مطلقاً حبط اعمال کرتا ہے اگرچہ وہ بعد میں مسلمان ہو جائے کیونکہ آیت وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ کے عموم کا تقاضا یونہی ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے دو مسئلہ ثابت ہوئے۔ ۱۔ متکلمین کہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے لئے شرط ہے کہ بوقت وفات ان دونوں میں سے ایک کا ہونا لازمی ہے ان کے نزدیک وہ شخص کافر ہے جسے وقت وفات ایمان نہیں۔ اسی طرح وہ شخص مومن ہے جسے بوقت وفات دولت ایمان حاصل ہوتی ہے۔ ۲۔ کسی شخص نے نماز پڑھی پھر معاذ اللہ مرتد ہو گیا پھر ابھی نماز کا وقت باقی ہو تو پھر مسلمان ہو گیا امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک اس نماز کا اعادہ نہیں اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اس شخص پر نماز کا اعادہ ضروری ہے اسی طرح حج وغیرہ کا مسئلہ ہے۔

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ وہی لوگ جہنم والے ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ دوسرے کافروں کی طرح ان کو بھی دائمی طور پر جہنم میں رہنا ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ مومن کے لئے ضروری ہے کہ اعمال صالحہ میں مشغول رہے اور ان برائیوں سے بچے جو ارتداد کا سبب بنتی ہیں دراصل ارتداد کا سبب یقین کا معدوم ہونا ہے ورنہ شیطان اور مشرک موحد کے قریب تک نہیں پھٹکتے کیونکہ موحد تو برزخ وقیود کے گورکھ دھندوں سے آزاد ہے اور وہ اپنے معبود حقیقی سے واصل ہے۔

ف: عمل صالح وہ ہے جس میں صرف اور صرف رضائے حق مطلوب ہو اور بس کیونکہ اس کے ماسوا کے ارادہ سے عبادت فاسد ہوتی ہے اس سے صاحب عمل کا کوئی فائدہ نہیں۔

حضرت حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

فردا کہ پیشگاہ حقیقت شود بدید　　　شرمندہ رہونے کہ عمل برمجاز کرد

(**ترجمہ**: کل قیامت میں ہر حقیقت ظاہر ہو جائے گی اس وقت وہ شرمندہ ہوگا جو مجاز کے رہ پر چلتا ہے)

مسئلہ: بہترین نیکیوں میں سے توحید ہے کیونکہ یہ سب نیکیوں کی سرتاج ہے اس لئے اس کی بھر تول بھی نہیں ہوگی۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا **کل حسنته تعملاها توزن یوم القیمته الاشهادة ان الااله الاالله** ہر نیکی جسے بندہ عمل میں لاتا ہے اسے قیامت میں تولا جائے گا سوائے کلمہ شہادت کے اس لئے جو بھی اُسے خلوص دل سے پڑھتا ہے اگر اسے میزان میں ایک طرف اور ساتوں آسمان زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے کو دوسری طرف رکھا جائے تو کلمہ توحید کا پلڑا بھاری ہوگا۔

ف: تمام اعمال صالحہ سے نور ایمان میں اضافہ ہوگا انسان کو چاہیے کہ اعمال صالح اور اطاعت الٰہی اور معارف حقیقہ کا مشغل رکھے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا عرفان تمام عبادات سے افضل ہے حضور **علیہ الصلوٰۃ والسلام** سے سوال ہوا **ای الاعمال افضل** آپ نے فرمایا **اعلم باللہ** عرفان الٰہی آپ سے عرض کیا گیا کہ ہم آپ سے عمل کا عرض کرتے ہیں اور آپ علم کا بتاتے ہیں آپ نے فرمایا **ان قلیل العمل ینفع مع العلم وان کثیر لا نفع مع الجهل** علم ہو تو تھوڑا عمل بھی مفید ہے اگر عمل زیادہ ہو اور جہالت کا غلبہ ہو تو اتنا مفید نہیں ہاں یہ اس وقت حاصل ہو جب کہ باطن کی صفائی توحید کے صیقل سے کی جائے باقی رہا اذ کا کا انواع سو وہ صرف اولیاء اللہ ہی جانتے ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے۔

ذکر حق کن بانگ غولاں را بسوز　　　چشم نرگس را ازیں کرگس بدوز

(**ترجمہ**: اللہ تعالیٰ کا ذکر کر کے غولوں کی آواز کو جلا دے نرگس کی آنکھ کو گدھ سے سی دو)

حکایت: حضرت شیخ حسن محمد بن السراج فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں ابلیس کو دیکھا کہ وہ ننگا پھر رہا تھا میں نے اسے کہا تجھے لوگوں سے

شرم نہیں آتی شیطان نے کہا اگر یہ انسان ہوتے تو میں انہیں گیند بنا کر نہ کھیلتا حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے پوچھا بتائیے انسان کون ہیں۔ شیطان نے کہا انسان وہ لوگ ہیں جو شونیزی میں جنہوں نے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا وار میرے دل کو جلا کر راکھ بنا دیا جب میں ان کے پاس وسوسہ ڈالنے کے لئے گذرتا ہوں تو وہ مجھے اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اشارہ کرتے ہیں اور ان کے ذکر کے نور سے میرا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے حضرت جنید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نیند سے جاگا اور جاتے ہی رات کو فوراً شونیزی کی طرف چلا گیا میں مسجد میں گیا تو وہاں صرف تین آدمی موجود تھے اور انہوں نے اپنے سروں کو پھٹے پرانے کپڑوں سے ڈھانپا ہوا تھا جب انہوں نے مجھے محسوس کیا ان میں سے ایک نے اپنا سر باہر نکالا اور کہا اے ابوالقاسم (حضرت جنید کی کنیت ہے) آپ وہی ہیں کہ جو بات آپ سے کی جاتی یہ آپ اسے سن کر قبول کر لیتے ہیں۔

سبق: ان کے جہادنی اطاعت اللہ کو اور ان کے باطنی صفائی پر غور کیجئے کہ انہوں نے اپنے دل سے ماسوا اللہ کو ہٹا دیا تھا دراصل یہی اسلام حقیقی سے موصوف ہیں فقیر ناظم ھذہ اللورد یعنی صاحب روح البیان قدس سرہ فرماتے ہیں مجھے میرے شیخ نے فرمایا حضور علیہ السلام کی حدیث شریف بدا غریبا وسیعود غریبا کا معنی یہ ہے کہ اسلام سے مراد یہی اسلام حقیقی ہے ایسا صاحب اسلام کبھی مرتد نہیں ہو سکتا اور ان کا غریب ہونا یہ ہے کہ کوئی ساتھی نہیں۔

مثنوی شریف میں حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ **حکایت**

بود گبرے در زمان بایزید — گفت ورا یک مسلمان سعید

کہ چہ باد گر تو اسلام آوری — تا بیابی صد نجات و سروری

گفت ایں ایمان گر ہست اے مرید — آنکہ دارد شیخ عالم بایزید

مومنم و ایمان آرم در نہاں — گر چہ مہرم ہست محکم بر دہاں

باز ایمان خود گر ایمان شما است — نے بداں میلستم و نے مشتہاست

آنکہ صد میلش سوئے ایمان بود — چوں شما را دیدزاں فاتر شود

زانکہ نامے بیند و معنیش نے — چوں بیاباں را مفازہ گفتے

(خلاصہ: حکایت یہ ہے کہ کسی نے ایک کافر سے کہا تم مسلمان ہو جاؤ اس نے کہا اگر مومن بایزید جیسا ہو تو میں مومن ہوں اگر مومن تمہارے جیسے ہوں تو میرا اسلام کو سلام اس لئے کہ تمہارے اندر اسلام کی خوشبو تک نہیں)

تفسیر عالمانہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شان نزول: یہ آیت حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی جب کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت میں انہیں خوشخبری سنائی کہ انہیں اس بات کا غم تھا کہ نا معلوم ہمارے لئے کیا سزا مقرر ہوتی ہے جب کہ ہم نے ماہ حرام میں جنگ کی لیکن فضل و کرم ہوا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے مژدہ سنایا تو پھر وہ لوگ اس طمع میں پڑ گئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ثواب نصیب ہوگا چنانچہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا یارسول اللہ! یہ تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ جو کچھ ہم نے کیا اس پر ہمیں سزا نہیں لیکن یہ تو بتایئے کہ ہمیں اس پر کوئی اجر و ثواب بھی ہوگا کیا ہم طمع کر سکتے ہیں کہ ہمارا یہ سفر جنگ کے ثواب اور اطاعت میں لکھا جائے گا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کے خیال کے مطابق نازل ہوئی کیونکہ وہ مومن بھی تھے اور مہاجر بھی اور وہ اس جنگ کی وجہ سے مجاہد بھی ٹھہرے اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ وہ اپنے ایمان پر مستحکم رہے اور مرتد نہ ہوئے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا اور وہ لوگ جو اپنے منال اور اہل سے جدا ہو گئے وَجٰهَدُوْا (المجاهده) بمعنی اپنی تمام طاقت کو صرف کرنا یعنی وہ لوگ جو مشرکین سے لڑتے ہیں فی سبیل اللہ کے راستے میں اس کی اطاعت سمجھ کر اس کے دین کو بلند رکھنے کے لئے اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ وہی اس کی امید رکھتے ہیں جو انہیں کامیابی کے مبادی ہیں رَحْمَتَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب اور نہ ہی ان کے اعمال حبط ہوں گے جیسے مرتدین کے عمل حبط ہو گئے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے ان کی رجا تو ثابت فرمائی ہے اس سے کامیابی کا ثبوت تو نہیں ملا؟

جواب: سب کو معلوم ہے کہ اجر و ثواب کا حصول اعمال پر منحصر نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا اپنا فضل و کرم ہے اس سے یہ ثابت ہوتا کہ انہیں کامیابی بھی حاصل نہیں۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی بہت مغفرت فرماتا ہے اگرچہ ان سے بہت زیادہ کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔ رَحِيْمٌ ایسا رحیم کہ ان کا اجر و ثواب وافر اور بکثرت عنایت فرمایا ہے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے

فرمایا کہ اس سے حضور نبی کریم ﷺ کے پسندیدہ لوگ مراد ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے اہل رجاء فرمایا ہے کیونکہ اصول ہے کہ من رجا طلب ومن خاف ھرب جو امید کرتا ہے وہ طلب کرتا ہے اور جو خوف کرتا ہے وہ بھاگتا ہے۔

حکایت: حضرت ابو عمر بیکندی رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک دن ایک کوچہ سے گزرے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ ایک نوجوان کو اپنے محلہ سے باہر نکال رہے ہیں اس لئے کہ وہ بڑا مفسد تھا اور اس نوجوان کی ماں اس پر رو رہی تھی لوگوں سے کہا لوگو! اسے آج میری وجہ سے چھوڑ دو آئندہ اگر غلطی کرے تو تم جانو تمہارا کام جانے نوجوان کو چھڑا کر حضرت ابو عمر اپنے کام کو چلے گئے چند روز بعد اسی محلہ سے گزرے تو اس بڑھیا کے رونے کی آواز سنی آپ نے سمجھا شاید اسی نوجوان سے غلطی ہوئی اور لوگوں نے اسے نکال دیا ہوگا اس پر بڑھیا رو رہی ہے آپ نے بڑھیا کا دروازہ کھٹکایا اور نوجوان کا حال پوچھا بڑھیا نے کہا میرا وہی نوجوان بیٹا فوت ہوگیا ہے آپ نے فرمایا اس کی موت کیسے واقع ہوئی ہے بڑھیا نے عرض کیا جب اسے موت نزدیک ہوئی تو اس نے کہا ماں جی میری موت کی خبر ہمسایوں کو نہ دینا کیونکہ میں نے انہیں عمر بھر ستایا اور اب وہ میری موت پر مجھے گالیاں دیں گے اور نہ ہی جنازہ پر آئیں گے لیکن اتنا ضرور کریں کہ جب مجھے دفن کرلو تو یہ میری مہر ہے اسے میرے ساتھ دفن کر دینا اور دفن کی فراغت کے بعد میرے لئے دعا کریں میں نے اس کی وصیت کو پورا کیا اس کی مہر پر لکھا ہوا بسم اللہ الرحمن الرحیم جب میں اس کی قبر سے فارغ ہو کر اٹھی تو قبر کے اندر سے آواز آئی میرا بیٹا کہہ رہا تھا اماں جی آپ چلے جاؤ کیونکہ اب میں رب کریم کے سامنے حاضر ہوگیا ہوں۔ (یعنی بخشا گیا ہوں)

کسی نے خوب فرمایا ہے۔

بہ بہانہ می دہد بہانے دہد (یعنی کسی خاص سبب سے معاف کر دیتا ہے وہ قیمت لے کر نہیں بخشا)

حکایت: حجاج بن یوسف پر جب موت کا وقت قریب آیا تو کہتا تھا اللّٰھم اغفرلی فان الناس یزعمون انک لاتفعل (اے اللہ مجھے بخش دے لوگوں کا میرے متعلق گمان ہے تو مجھے نہیں بخشے گا مگر مجھے امید ہے کہ تو کریم ہے اس لئے مجھے تیری رحمت کی امید ہے) حجاج واسطہ (وہ ایک شہر جو اس نے خود بنایا تھا) میں سن ۹۵ میں فوت ہوا اس کی موت کے دن کا نام لوگوں نے عرس العراق رکھا (اس لئے کہ اس کی موت تمام عراق کے لئے نجات کا سبب بنی) پہلے

اس کی موت کا کسی کو علم نہ تھا آخر اس کی لونڈی محل پر چڑھ کر روتی ہوئی کہتی تھی الا ان مطعم الطعام ومفلق الھام مات طعام کھانے والے لگر لوگوں کی کھوپڑیاں اڑانے والا (دینی قتل عام کرنے والا) مر گیا جب اسے دفن کیا گیا تو ایک شخص اس کی قبر پر کھڑا ہو کر کہتا تھا اللھم لاتحرمنا شفاعته الحجاج اے اللہ ہمیں حجاج کی شفاعت سے محروم نہ فرما وہاں ایک شخص نے قسم کھائی اگر حجاج بخشا گیا تو میری عورت کو طلاق ہے (کیوں کہ وہ بڑا ظالم تھا کسی کو اس کی بخشش کی امید نہ تھی) حضرت طاؤس سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وما اظنھا الاطلقت اللہ تعالیٰ جسے چاہے بخش دے میرا گمان ہے کہ تیرے اس جملے سے تیری عورت مطلقہ ہو گئی پھر یہی فتویٰ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا جا تو اپنی عورت کو لے جا اور اس سے ازدواجی زندگی گزار اگر حجاج جہنم میں جائے تو تمہیں اس سے کون سا نقصان ہے۔

سبق: اس سے مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ہے اپنے بندوں کے گناہ بخش دیتا ہے خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں۔

نصیحت: امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ یہی تین باتیں یعنی ایمان مہاجرت جہاد مراد لی گئی ہیں کیونکہ مہاجرت نصیب نہیں ہوتی جب تک ایمان نہ ہو اور شہوات کے ترک کا نام جہاد ہے جسے یہ تینوں مراتب حاصل ہو جائیں اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہو۔

تفسیر صوفیانہ

ہجرت دو اقسام کی ہیں۔ظاہری، باطنی۔ظاہر کا حکم تو منقطع ہو گیا جب کہ فتح مکہ ہوئی جیسا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لاھجرۃ بعد الفتح یعنی فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں اور معنوی ہجرت یہ ہے کہ نفس کی خواہشات کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ تک پہنچنا قلب کے کعبہ کو فتح کی وجہ سے یعنی اسے خواہشات نفسانیہ اور شرک کے بتوں سے خالص کر لینا ایسی ہجرت قیامت تک جاری رہے گی جہاد دو قسم کے ہیں۔

۱۔اصغر یعنی کفار کے ساتھ لڑائی کرنے کا نام جہاد اصغر ہے۔ ۲۔اکبر یعنی نفس کے ساتھ جہاد کرنے کا نام جہاد اکبر ہے اس کا نام اکبر اور پہلے کا نام اصغر اس لئے ہے کہ پہلے سے ظاہر کی اور دوسرے سے باطن کی اصلاح

ہوتی ہے اور باطن کی صفائی ظاہری صفائی کے لحاظ سے سخت تر ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے جہاد سے جنت و رحمت اور دوسرے سے مشاہدہ حق اور جمال مطلق کی زیارت نصیب ہوتی ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ پہلے شہادت اور دوسرے سے صدیقیت نصیب ہوتی ہے اور صدیقیت شہداء سے مرتبہ کے لحاظ سے اعلیٰ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدیقوں کو پہلے اور شہدا کو بعد میں ذکر فرمایا ہے جب بندہ جہاد اکبر کر کے نفس کی اصلاح کرتا ہے (جو کہ کبریت احمر سے زیادہ نفیس ہے) تو اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرتا ہے اور اسے نقصان نہیں پہنچاتا۔

حکایت: ایک شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی بہت خدمت کی اور ایک دن اس نے بزرگ سے عرض کی کہ مجھے اسم اعظم سکھایئے بزرگ نے فرمایا کیا تجھے اس کی اہلیت بھی ہے اس نے عرض کی ہاں جی۔ بزرگ نے فرمایا شہر کے دروازہ پر جو واقعہ درپیش ہو دیکھ کر مجھے سنایئے وہ شخص شہر کے دروازہ کے کنارے جا کر بیٹھ گیا دیکھا ایک بوڑھا لکڑیاں کا گٹھر گدھے پر لادے ہوئے آرہا ہے ایک سپاہی آیا اور لکڑیوں کا لدا ہوا گدھا چھین لیا اور اسے دو چار چابک بھی رسید کر دیے۔ جب وہ شخص اسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا شیخ نے ماجرا پوچھا تو سارا واقعہ سنایا بزرگ نے فرمایا اگر تجھے اسم اعظم معلوم ہوتا تو اس سپاہی سے کیا کرتا تو اس نے کہا اگر مجھے اسم اعظم معلوم ہوتا تو میں اس کی برکت سے بددعا کر کے اسے تباہ و برباد کرتا بزرگ نے فرمایا جس لکڑہار کو تو نے مار کھاتے ہوئے دیکھا وہ شخص ہے جس نے مجھے اسم اعظم سکھایا ہے اور اسم اعظم اس شخص کو سکھایا جاتا ہے جو مصائب کے وقت صبر کرے اور خلق خدا سے دکھ اٹھا کر ان پر شفقت کرے۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

مکن تا توانی دل خلق ریش — وگر میکنی میکنی بیخ و خویش

(ترجمہ: جب تک تمہارے میں طاقت ہے کسی کا دل نہ دکھا اگر کسی کا دل دکھاتا ہے تو اپنی جڑ کاٹتا ہے)

نسخہ روحانی: قلت کلام۔ اصلاح نفس کے لئے بہترین علاج ہے جیسے مکلف غذا کو طبیعت کے لئے نافع سمجھا جاتا ہے اصلاح نفس سے قلب کی صفائی نصیب ہوتی ہے۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

طفل جاں از شیر شیطاں باز کن　　بعد از انش با ملک انبار کن

تا تو تاریک وطو تیرہ　　وانگہ با دیولعیں ہمشیرہ

لقمہ کو نورا فزود وکمال　　آں بود آوردہ از کسب حلال

روغنی آید چراغ ما کشد　　آب خوانش چوں چراغی را کشد

(**ترجمہ**: روح کو شیطان کے دودھ سے دور رکھو اس کے بعد اسے اپنے ملک اسے شریک بناؤ جب تک تم تاریک اور طول اور ظلمات میں ہو اس وقت تک دیولعین کے ساتھ تم ساتھ ہو کسب حلال کا لقمہ نور اور کمال بڑھاتا ہے)

تفسیر عالمانہ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ روغن سے ہی ہمارا دیا روشن ہوتا ہے دیا بجھادے تو اسے روغن مت کہو بلکہ وہ پانی ہے۔

شان نزول: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے کسی قوم کو حضور نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرامؓ سے بہتر نہیں دیکھا کہ انہوں نے کل تیرہ مسلموں کے متعلق اپنے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا اور وہی سب کے سب قرآن پاک میں ہیں اور وہ سب کے سب ان کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے نافع ہیں۔

شراب الخمر یعنی شراب پینے کے متعلق سوال کرتے ہیں جیسا کہ جواب کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حلت وحرمت اور گناہ وثواب مکلفین کے افعال کے عوارض سے ہیں ورنہ اشیاء کے ذوات بداعیاں میں کوئی گناہ نہیں۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ شراب کے بیع وشراء کے علاوہ جملہ امور اس کی حرمت میں شامل ہو گئے جن میں تصرف شرعی کو دخل ہے یعنی وہ جملہ امور جو غیر مشروع ہیں۔

ف: الْخَمْرِ، خمرہ کا مصدر ہے بمعنی ستره یعنی اسے ڈھانپنا شراب کو خمر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اسے انگور سے نچوڑا جاتا ہے پھر وہ جوش مارتا ہو جب سخت ہو جاتا ہے پینے والے کی عقل وتمیز کو مخمور (مستور) کر دیتا ہے بوجہ مبالغہ اسے خمر کہا گیا گویا کہ وہ خود بہتر ہے جیسے کہ سکر (گنا) کو رس کہا جاتا ہے کہ وَالْمَيْسِرِ یعنی آپ سے میسر کے متعلق سوال کرتے ہیں میسر یسر کا مصدر میمی ہے جیسے موعد و مرجع مصدر میمی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے

ایسرته ای فمرته یعنی میں نے اس سے قمار بازی کی یا یہ تویسر سے مشتق ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے بلا تکلف مال حاصل ہوتا ہے یا یسارء سے ماخوذ ہے اس لئے کہ اسی کے لئے مال حاصل کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: میسر سے قمار وشطرنج وغیرہ جا کے جمیع اقسام شامل ہیں یہاں تک کہ کھیل جولڑ کے اخروٹ کے کھیلتے ہیں وہ بھی اس کی حرمت میں شامل ہیں قُلْ فِيهِمَآ یعنی شراب اور خمار کے کاروبار اوراس کے استعمال میں اثم کبیر بڑا گناہ ہے اس لئے شراب عقل کو سلب کر لیتا ہے اور عقل دین و دنیا کا قلب ہے اور یہ دونوں شراب وقمار مال اسباب کو ضائع کرنے والے ہیں۔ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ اور لوگوں کے اس میں منافع بھی ہیں۔

شراب کے فائدے

۱۔ سرور و مستی ۲۔ شراب کے بیوپار میں مال کا حصول اس کے ذریعے بہت سا مال جمع کیا جا سکتا ہے۔ ۳۔ اس میں کمزور کو تقویت ملتی ہے ۴۔ طعام ہضم کرتا ہے۔ ۵۔ قوت باہ میں مدد کرتا ہے ۶۔ غمگین کو خوشی دلاتا ہے ۷۔ بزدل کو بہادر بناتا ہے ۸۔ بخیل کو سخی کرتا ہے۔

۹۔ جسم کے رنگ کو نکھارتا ہے ۱۰۔ بچے کو بولنے پر قدرت دیتا ہے ۱۱۔ ارادے بلند کرتا ہے۔

قمار کے فائدے

۱۔ بلا تکلف مال و دولت حاصل ہوتی ہے ۲۔ فقراء کو نفع پہنچاتا ہے اس زمانہ کے قمار باز گوشت و دیگر اشیا خرید کر محتاجوں پر تقسیم کرتے تھے۔

حکایت: امام واقدی فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی مجلس میں کوئی قمار باز سو اونٹ حال کرتا تو وہ عوام میں تقسیم کر دیتا اس سے اسکا بڑا چرچا ہوتا۔

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا اور ان کا گناہ ان کے منافع سے بہت بڑا ہے۔

شراب کے نقصانات

۱۔ آپس میں بغض و عداوت بڑھتی ہے ۲۔ اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے۔ ۳۔ آدمی کو بے حوصلہ اور اتنا بیوقوف احمق بنا دیتا ہے کہ بسا اوقات شرابی اپنے پیشاب سے لکھنے لگ جاتا ہے اسی طرح ٹٹی اور قے سے لہولہب اس کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ (کذا ذکرہ ابن ابی الدنیا)

حکایت: حضرت ابن ابی الدنیا کا ایک شرابی کے پاس سے گزر ہوا وہ اپنے پیشاب کے ساتھ کھیل رہا تھا اور اسے ہاتھ میں لے کر وضو کرنے والے کی طرح اپنے منہ پر مل رہا تھا اور کہتا تھا الحمد للہ الذی جعل الاسلام نورا و الماء طھورا شکر ہے اس ذات کا جس نے اسلام کو نور اور پانی کو پاک کرنے والا بنایا۔

قمار کے نقصانات

جس کسی کا مال بغیر کسی کاروبار کے چلا گیا تو وہ اپنے بالمقابل کا جانی دشمن بن جاتا ہے اور اس کی دشمنی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ اپنے بالمقابل کو زک نہیں پہنچاتا اسے چین نہیں آتا۔

فائدہ تفسیر یہ: مفسرین فرماتے ہیں کہ شراب کے متعلق چار آیات پے در پے نازل ہوئیں وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اس پر اہل اسلام انگور وغیرہ سے شراب وغیرہ نچوڑ کر پیتے تھے اس وقت یہ ان کے لئے حلال تھا اس پر حضرت عمر حضرت معاذ اور دیگر صحابہ رضی اللہ تعالی عنھم نے عرض کی یا رسول اللہ فرمایئے شراب کیوں حلال ہے؟ جب کہ یہ عقل کو سلب کرتا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ اس سے بعض حضرات نے اسے پینا چھوڑ دیا اور کہتے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں جب کہ اس کے اندر بہت بڑا گناہ ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دعوت دی اور انہوں نے شراب پی اس پر انہیں نشہ طاری ہو گیا نماز کا وقت تھا ان میں ایک نے نماز پڑھائی تو پڑھنے لگے قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ یعنی لا کو چھوڑ دیا جس سے کفر لازم آتا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى اس سے اکثر نے شراب پینا چھوڑ دیا اور کہتے ہم ایسا عمل کیوں کریں جو ہماری نمازوں میں خلل ڈالے لیکن بعض اس کے بعد بھی پیتے رہے لیکن رات کو عشا کی نماز کے بعد پی لیتے جس کا صبح سے پہلے نشہ اتر جاتا پھر نماز صبح کے بعد پیتے جس کا ظہر تک نشہ اتر جاتا ایک دن عتبان بن مالک نے ان کی دعوت میں اونٹ کے سر کا گوشت پکایا انہوں نے گوشت کھا کر شراب پیا تو مخمور ہو گئے اس پر فخر کرتے ہوئے اشعار پڑھنے لگے سعد نے ایسے اشعار پڑھے جس میں انصار کی ہجو اور اپنی قوم کی تعریف کی اس پر ایک شخص نے اونٹ کی ہڈی اٹھا کر سعد کے سر پر ماردی جس سے سعد کا سر پھٹ گیا سعد حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انصاری کی شکایت کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا مانگی اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیا یا اللہ شراب کے متعلق واضح راہبری فرمایئے

اس پر آیت اتری اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ جو کہ سورہ مائدہ میں موجود ہے جس کا آخری جملہ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ہے حضرت عمر نے کہا فانتھینا یارب ہم شراب خوری سے رک گئے۔

فوائد شراب نوشی

ف: شراب کی مکمل تحریر غزوہ احزاب کے چند دن بعد سن ۸ ہجری میں ہوئی۔ حضرت قفال فرماتے ہیں کہ شراب کی حرمت اس ترتیب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ قوم عرب شراب خوری کی خوگر ہے اور اس سے انہیں بہت بڑے منافع ہوتے تھے اگر انہیں یکبارگی روکا جاتا تو انہیں شاق گذرتا اس لئے اس ترتیب سے شراب کی حرمت تدریجاً اور نرم حقوق سے ہوئی۔

ف: جب شراب کی حرمت مکمل طور پر نازل ہوئی تو اس کے بعد تمام شراب ضائع کر دیئے گئے۔

حکایت: حضرت ابن عمر نے فرمایا ہم سب شراب کے بڑے بڑے مٹکے لے کر راستہ پر چلے ہم میں سے بعض نے مٹکے راستے میں توڑ دیے اور بعض نے مٹکے گارے میں بہادیے مدینہ کی گلیاں کوچے بڑی دیر تک شراب سے موسلار دھار بارش کی طرح بہتے رہے۔ شراب کا رنگ گلی کوچوں میں بکھرا ہوا تھا اور شراب کی بو سارے شہر میں پھیل گئی عرب میں اس دن سے کوئی دن زیادہ عجیب تر نہیں ہوا اور نہ ہی شراب سے کوئی اور سخت آرڈر ہوا۔

حدیث شریف: حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کو جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی چار خصلتیں بڑی پسند آئی ہیں جن کے وہ زمانہ جاہلیت میں بھی پابند رہے اور اسلام میں بھی حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا وہ کون سی چار خصلتیں ہیں۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ان کے متعلق مطلع نہ فرماتا تو میں ہرگز ظاہر نہ کرتا وہ چار خصلتیں یہ ہیں۔

۱۔ میں نے شراب کبھی نہیں پی اس لئے کہ وہ عقل کو سلب کرتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ عقل تیز ہو۔

۲۔ میں نے بت کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ نہ نفع دیتے ہیں نہ نقصان۔

۳۔ میں نے زنا بھی نہیں کیا صرف اپنے اہل پر غیرت کی بناء پر اس لئے کہ جس طرح میں غیر عورت سے

زنا کروں اسی طرح میرے اہل سے بھی کوئی کرے تو۔

۴۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اس لئے کہ اس کے اندر خسیس پن ہے۔

حکمت: حضرت عمر بن اوہم جو بنی تمیم کے سادات سے ہیں شراب کی مذمت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ عقل اگر خرید و فروخت کی شئے ہوتی تو دنیا میں کوئی شئے نہ ملتی جو اس کے بدلہ میں دی جاتی لیکن تعجب ہے اس بیوقوف پر جو پیسے دے کر حماقت خریدتا اور اس اپنے سر کے اندر ڈالتا ہے (یعنی شراب پی کر مال ضائع کر کے عقل کھو دیتا ہے پھر اسے قے کرتا ہے اور اپنے دامن پر بیٹ کر دیتا ہے)

ف: حضرت علی کرم اللہ وجهه الکریم فرماتے ہیں اگر کسی کنوئیں میں شراب کا قطرہ ڈال دیا جائے پھر کنوئیں پر مکان تیار ہو اور اس پر اذان کا کہا جائے تو میں اس منارہ پر ہرگز اذان نہیں دوں گا اسی طرح کسی دریا میں شراب کا ایک قطرہ ڈالا جائے پھر وہ دریا خشک ہو جائے اور اس میں گھاس اگ جائے تو میں اس گھاس میں اپنے جانور کو ہرگز نہیں چراؤں گا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه فرماتے ہیں اگر میری انگلی شراب میں پڑ جائے تو وہ میرے ہاں واپس نہیں آئے گی۔ یعنی میں اسے کاٹ ڈالوں گا یہی حقیقی ایمان اور تقوی ہے۔

سبق: مسلمان کو چاہیے کہ دل میں شراب پینے کا خیال تک نہ لائے چہ جائیکہ اسے خریدے۔

مسئلہ: شراب خور سے قطع تعلق رکھے تاکہ اس کے ساتھ میل جول سے کہیں شراب نہ پی بیٹھے یا کم از کم اس کے قطرات تو اس کے جسم پر پڑیں گے اس طرح سے ایک پلید اور نجس شئے اسے لگ گئی۔

حضرت حسین واعظ کاشفی فرماتے ہیں۔

ترا ترسا ہمی گوید کہ اے مومن مخور بادہ ترا رحمان ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوہ

بمانی شهد و شکر را برائے گفتہ ترسا نے مانی زنا پاکی برائے گفتہ رحمان

ف: بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنه فرماتے ہیں کہ جس نے اپنی لڑکی شراب خور کے نکاح میں دی گویا اس نے اپنی لڑکی کو زنا میں جھونک دیا اس لئے کہ شراب خور مستی میں اسے طلاق دے گا جس کا اسے علم نہیں ہو گا پھر وہ اس سے وطی کر کے زنا کا مرتکب ہوتا رہے گا۔

مسئلہ: متولی کو چاہیے کہ اپنی لڑکی اور بہن وغیرہ کا نکاح فاسق سے نہ کرے اور نہ ہی ایسے سے جو جرائم کا

مرتکب ہوتا ہے۔

مسئلہ: شراب کا سرکہ بنانا جائز ہے اگر علاج کے لئے ہو مثلاً گرم پانی یا نمک یا روٹی ڈال کر اس اعتبار سے شراب کا سرکہ بنانا مکروہ نہیں۔

حدیث شریف: میں ہے خیر خلکم خل خمرکم تمہارے لئے بہترین وہ سرکہ ہے جو شراب سے تیار ہوتا ہے۔

قمار کی تحقیق: عربی میں میسر قمار کو کہتے ہیں اور قمار باز کو یاسر کہا جاتا ہے دراصل میسر اونٹ کے متعلق ہوتا تھا کیونکہ عرب کے اہل ثروت اونٹ کو خرید لیتے تھے لیکن قیمت ادا نہ کرتے تھے صرف اس نیت پر وہ قمار میں غلبہ پالیں گے۔

ف: جس پر وہ اونٹ واجب ہو جاتے اس کے اونٹ لے کر ذبح کر لئے جاتے اور ان کے دس حصے ہوتے بعض کے نزدیک اس کے اٹھائیس حصے ہوتے پھر اس کو دس تیروں پر حصہ بناتے ان تیروں کو ازلام و اقلام کہا جاتا ہے ان میں سات وہ ہیں جن کے حصص متعین تھے۔

۱۔ القد۔ ہر اس کا ایک تھا ۲۔ التوام اس کے دو حصے۔ ۳۔ الرقیب۔ اس کے تین حصے۔
۴۔ الحس۔ اس کے چار حصے ۵۔ النافس۔ اس کے پانچ۔ ۶۔ المسبل۔ اس کے چھ۔ ۷۔ المعلی اس کے سات حصے۔

تین ایسے ہیں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا وہ تین یہ ہیں۔

۱۔ المیخ ۲۔ المسفیح ۳۔ الوعد۔ پھر ان تیروں کو ایک کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹتے اس کا نام رہابہ ہوتا اس ہر ایک کو معتبر آدمی کے ہاتھ پر رکھ دیتے جس کے نام وہ تیر نکلتا وہی متعین حصے اس کو دیے جاتے اور جس کے نام ان تینوں میں سے کوئی نکلا جس کا کوئی حصہ متعین نہیں اسے کچھ نہ ملتا بلکہ ان اونٹوں کے مطابق قیمت ادا کرتا اور ان اونٹوں کا گوشت فقراء پر تقسیم کیا جاتا اور خود اس سے نہ کھاتے اس پر انہیں بڑا ناز تھا اور جو اس میں داخل نہ ہوتا اس کی مذمت کرتے اور اسے البرم کہتے اس کا معنی ہوتا لئیم بد بخت یعنی (عدیم المروۃ والکرم) یہ وہ قمار ہے جو عرب میں رائج تھی جس سے مسلمانوں کو روکا گیا۔

مسئلہ: اس میں اختلاف ہے کہ کیا قمار سے وہی مخصوص قمار مراد ہے یا اس کے دیگر تمام انواع جیسے نرد شطرنج وغیرہ۔

حکایت: ایک مرد نے کسی سے شرط لگائی کہ اگر اتنے انڈے (کثیر المقدار) کھا جائے تو اس کی شرط یہ ہے کہ اسے اتنے اتنے دراہم دنانیر ملیں گے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ ناجائز ہے اس لئے کہ یہ قمار ہے۔

مسئلہ: حضرت ابن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جس بات میں شرط لگائی جائے وہی قمار ہے

حدیث شریف: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا وایاکم وهاتین الکعبتین المشؤمتین فانهما من میاسیر العجم حضور نبی کریم ﷺ کی مراد اس سے نرد اور شطرنج ہے اور وہ دونوں حرام ہیں۔

سوال: گھوڑ دوڑ اور اونٹ بھگانا اور تیر اندازی بھی تو ایک قسم کی کھیل ہے پھر یہ کیوں جائز ہے؟

جواب: یہ امور جنگی ضروریات ہیں فلہٰذا خص عنه البعض کے قبیل سے ہیں اسی لئے جائز ہیں۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

کہن گشتی و ہمچناں طفلی	شیخ بودی و ہمچناں شابی
تو ببازی نشستہ درچپ و راست	میرسد تیر چرغ پرتابی
جائے گرچہ جست بر معصیت پیر	کہ تو کردک ہنوز لعابی

(**ترجمہ**: تم بوڑھے ہو گئے لیکن تاحال تیرا مزاج بچوں کا سا ہے کھیل کود کے لئے دائیں بائیں بیٹھا رہتا ہے لیکن اچانک تجھے موت کا تیر پہنچے گا ایسے بوڑھے کی اس معصیت پر رونا چاہیے جب کہ اس کی بچوں کی سی طبیعت ہے)

تفسیر صوفیانہ: آیت میں اشارہ ہے کہ جیسے ظاہر کی شراب مختلف اجناس جیسے کھجور اور زبیب اور مختلف اناج جیسے گندم اور جو اور جوار سے بنتا ہے اسی طرح باطن کا شراب بھی مختلف برائیوں سے تیار ہوتا ہے مثلاً غفلت و شہوت، ہوا و ہوس اور حب دنیا اس طرح کے اور بھی یہ وہ شراب ہے جس نے انسانی عقل اور حواس مخمور ہو جاتے ہیں اور اس میں گناہ بھی بڑا ہے اس لئے کہ ہر نشہ دینے والی شے حرام ہے اور

[1]: یعنی ان دونوں منحوس سے بچو اس لئے کہ یہ دونوں عجمیوں کی قمار ہیں۔

قاعدہ ہے کہ جو شئے نشے دے اس کا قلیل وکثیر حرام ہوتا ہے کہ وہ فعل کہ جس سے قلوب وارواح اور اسرار مخمور ہوتے ہیں وہ واردات کا شراب ہے جو ساقی تجلی الصفات کے ہاتھوں مشاہدات کے پیالوں سے نصیب ہوتا ہے جو بہ نفوس پر وار ہوتا ہے تو قلب مست ہو جاتا ہے اور ایسے وجد میں شرشار ہوتا ہے جو وحدت کے ملک سے حاصل ہوتا ہے اس سے ارواح شہود عن الوجود اور اسرار و جمال کے غمزوں کے ذریعے ملاحظہ کمال سے پاتے ہیں ایسا شراب لوگوں کے لئے منافع اور حلال ہے بہت بڑا تعجب ہے کہ بعض ایسے ہیں جنہیں شراب وجود نشہ دیتا ہے اور بعض کو ساقی کا مشاہدہ ہوتا ہے جیسے کسی عربی شاعر نے کہا۔

فاسکر القوم ودر کاس   وکان من المدیر

(**ترجمہ**: لوگ پیالہ کے دور سے مخمور ہوئے جو دراصل ساقی کی نگاہ کا نشہ تھا)

مثنوی شریف میں ہے۔

ما اگر قلاش اگر دیوانہ ایم   مست آں ساقی وآں پیانہ ایم

مست می شیار بنود ورنشور   مست حق تا ید بخود تا نفخ صور

جرعہ چوں ریخت ساقی الست   برسرایں خاک شد ہر ذرہ مست

جوش کرد آں خاک ما زاں جوشیشم   جرعہ دیگر کہ بس کموشیشم

(**ترجمہ**: ہم اگر چہ تنگدست اور دیوانے ہیں لیکن ازلی شراب اور اس کا پیانہ اور ساقی سے ہم مست ہیں شراب ازلی کا مست بھی ہوش میں نہیں آئے گا اس لئے کہ حق کا مست نفخ صور تک بے خبر رہے گا شراب ازلی کا جب ایک گھونٹ عالم دنیا پر ہو تو اس سے دنیا کا ذرہ ذرہ مست ہے جب اس کے نشہ میں زمین کو جوش ہوا تو ہم دسرے گھونٹ کی خواہش میں کوشاں ہیں)

شراب کے پیالوں سے روگ دانی کا بہت بڑا گناہ ہے بہ نسبت ہدایت کے ہزار سال نفع کی طلب کے جیسے شراب کے نشے میں نماز ممنوع ہے اسی طرح غفلت کا نشہ وصال یار سے ماجب ہے اور میسر کا گناہ قمار کے نشانوں سے ہے اور یہ ان دیار کے شعار سے ہے کہ جس کا راستہ حیلوں کی طرف جاتا ہے جن میں اسرار عملی دھوکے اور قولی فحش و گناہ ہی ہیں اور یہ بزرگوں کے نزدیک بہت بڑا گناہ اور نیکوں کی عادات سے بہت دور ہیں باقی رہا اس کا نفع اس میں سوائے عدم التفات الی الکونین اور نقش العافین کے فردانیۃ بنقش الکعبتین کے صرف کرنے کے اور کچھ نہیں لیکن ان کا گناہ عوام کے لئے زائد ہے خواص کے نفع سے اور عوام خواص سے زائد

ہیں بلکہ خواص بالکل تھوڑے ہیں۔ (کذا فی التاویلات النجیمہ)

تفسیر عالمانہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ خرچ کریں یہ سوال جس طرح خرچ کی ہوئی شئے کے متعلق ہے اسی طرح اس کی مقدار کے متعلق بھی ہوسکتا ہے۔

شان نزول: جب قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ اتری تو عمر بن الجموح نے سوال کیا کہ کتنا خرچ کروں تو فرمایا قُلِ الْعَفْوَ فرمایئے اے میرے پیارے حبیب محمد ﷺ خرچ کرو جو زائد ہو۔

ف: عفو جہد کی نقیض کو کہتے ہیں اور جہد بمعنی مشقت جو یسر و سہولت کی نقیض ہے گویا کہا گیا ہے وہ خرچ ہو تجھے میسر ہو اور آسانی سے ہوسکے ایسا نہیں کہ تمہارے اوپر اس کا خرچ کرنا بارگراں ہو۔

قاعدہ: لعفمن المال سے کہا جاتا ہے کہ جس کا خرچ کرنا آسان ہو اور الجھلمن المال وہ ہے جس کا خرچ کرنا مشقت ہو اور آسانی سے وہ مال خرچ کیا جاتا ہے جو نفس اور اہل وعیال اور جن لوگوں کو خرچ دینا ضروری ہو ان کی ضرورت پر خرچ کیا جائے كَذٰلِكَ اس طرح یعنی مثل اس کے کہ بیان کیا گیا ہے عفو جہد سے زیادہ مناسب ہے۔

ف: كَذٰلِكَ کا کاف محل نصب میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے۔

سوال: کاف واحد کیوں ہے حالانکہ خرچ کرنیوالے تو لا تعداد و لا تحصی ہیں؟

جواب: انہیں ایک گروہ یا فریق یا قوم یا وہ اسم جو لفظاً مفرد اور معناً جمع ہے قرار دیا گیا ہے۔

یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے وہ آیات بیان کرتا ہے جو احکام شرعیہ پر دلالت کرتی ہیں۔

ف: آیات کے ساتھ تمین کا ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا نازل کرنا ابتدا واضح طریق اور روشن مدلول سے ہے نہ یہ کہ وہ پہلے مشتبہ و ملتبس تھیں پھر انہیں واضح کیا گیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تاکہ تم دنیا و آخرت کے امور میں تفکر کرو پھر ان سے جو چیزیں تمہارے لئے مناسب ہیں انہیں باقی چھوڑ دو اسی طرح وہ چیزیں جو تمہیں دنیا میں آسانی دیں اور آخرت میں نجات دیں ان کو حاصل کرو اور جو تمہیں آخرت میں نقصان دیتی ہیں ان سے دور رہو۔

ف: امام بغوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ امر دنیا و آخرت کے آیات بیان کرتا ہے تاکہ تفکر کرو کہ

دنیا کو زوال اور فنا ہے اس لئے اس سے کنارہ کش رہو اور آخرت کو بقا ہے پس اس میں رغبت کرو۔

مسئلہ: اس آیت میں صدقہ دینے کی فضیلت ہے بشرطیکہ مال زائد از حاجات ضروریہ ہو

حکایت و حدیث: ایک شخص حضور سرور عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مرغی کے ایک انڈے برابر سونا لایا جو اسے بعض غزوات میں مال غنیمت سے حاصل ہوا اور عرض کی حضور! یہ مال صدقہ ہے اور آپ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں لیکن یہ بھی آپ کو معلوم ہو کہ گھر میں بس یہی تھا جو حاضر کر دیا آپ نے سنتے ہی اس سے چہرہ مبارک پھیر لیا پھر وہی شخص آپ کے دائیں جانب حاضر ہوا اور وہی کلمات دہرائے جو اس نے پہلے عرض کئے لیکن آپ نے اس سے چہرہ مبارک پھیر لیا پھر وہی شخص آپ کی بائیں جانب حاضر ہوا آپ نے غصہ کے لہجہ میں فرمایا! مجھے دیجئے آپ نے اس سے وہی سونا لیتے ہی ایسے زور سے زمین پر دے مارا کہ اگر اس شخص کو لگتا تو پھٹ جاتا یا زخمی ہو جاتا پھر فرمایا تم لوگ سالم مال لے کر صدقہ کے لئے پیش کر دیتے ہو پھر بھیک مانگنے لگ جاتے ہو جان لو صدقہ اس وقت دو جب تمہارے پاس وافر مال ہو اب اپنا یہ سونا لو ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں لفظ عفو میں اشارہ ہے کہ بندہ مال خرچ کرتے وقت اس کا نشان دل سے بالکل مٹا دے یعنی بطیب خاطر کرے اس لئے کہ عفو کا حقیقی معنی ہے **محو طمس** (مٹانا) زائد مال سے بقدر کفایت خرچ کرنا خواص کا طریقہ ہے باقی رہے خاص الخالص ان کا طریقہ ایثار ہے ان کا کام بھی یہی ہے کہ وہ اپنے نفس پر دوسرے کو ترجیح دیں اگرچہ انہیں فاقہ انہیں فاقہ کی مشقت اٹھانی پڑے یہاں تک کہ جب تک اپنا مال اللہ تعالیٰ کے راہ نہیں لٹاتے انہیں قرار نہیں آتا اگرچہ ان کا دوسرا ساتھی دولتمند ہو لیکن اسے ضرورت ہو تو وہ اس کی دولت مندی کو نہیں دیکھتے آخر مال اس پر خرچ کر ہی دیتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

حدیث شریف: سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں ایک دفعہ مجھے بہت سا مال حاصل ہوا مجھے خیال گذرا کہ ہمیشہ مجھ سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سبقت لے جاتے ہیں اس دفعہ ان سے بڑھ جاؤں گا چنانچہ میں

نے اپنے تمام مال کے دو حصے کئے آدھا مال گھر رکھ لیا اور آدھا بارگاہ رسالت میں حاضر کیا تاکہ صدقہ کروں حضور نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے پوچھا اے عمر اپنے بال بچوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آدھا مال ان کے لئے رکھ کر آیا ہوں اس کے بعد آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا انہوں نے عرض کی ابقیت لھم اللہ ورسولہ حضور میں ان کے لئے اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ کر آیا ہوں اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آئندہ میں کبھی بھی ان سے سبقت لے جانے کا ارادہ نہیں کروں گا اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تمہارے مابین ایسے ہی فرق ہے جیسے تمہارے دونوں کے کلام میں فرق ہے۔

ف: اس سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر فضیلت کا مسئلہ معلوم ہوا۔

قاعدہ: یہ ضروری نہیں کسی کو ہر کسی پر ہر لحاظ سے فضیلت ہو بلکہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے اعتبار سے افضل پر فضیلت حاصل ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ کامل ہر طرح سے یعنی من کل الوجوہ کامل نہیں ہوتا اس لئے کہ تقدم تأخر کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے (لیکن یہ عقیدہ تو اجماعیہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فاروق رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں)

حضرت الشیخ الشہیر بافتادہ قدس سرہ نے فرمایا کہ حضرت صدیق پر معرفت اور عمر پر شریعت اور حضرت عثمان پر طریقت اور حضرت علی پر حقیقت غالب تھی اگرچہ چاروں مراتب میں یکتا تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، حضرت امام حسین واعظ کاشفی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ما یہ توفیق کرم کردنست — گنج یقین ترک دام کردن است

زاد رہ مرگ زنان داون است — زندگی عشق ز جاں داون است

(**ترجمہ**: توفیق الٰہی کا کام کرم کرنا ہے یقین کا کام یہ ہے کہ اسے دام کا خیال نہ ہو موت کا زاد راہ مساکین کو کھانا کھلانا ہے عشق کی حیات جان قربان کرنے میں ہے)

مسئلہ: عوام کی سخاوت مال خرچ کرنا اور خواص کی سخاوت روح کرنا ہے لیکن ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں۔

ہست جوانمر د درم صد ہزار — کار جو یا جاں فشد آنست کار

حکایت: حضور نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کو صدقہ کی فضیلت کی ترغیب دی تو لوگ حسب استطاعت مال خرچ

کرنے لگے۔ حضرت ابوامامہ حضور نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھے تھے وہ صرف لب ہلانے لگے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا کہہ رہے تھے جب تم لب ہلا رہے تھے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ مال خرچ کر رہے ہیں اور میرے پاس مال نہیں تھا میں بھی کچھ خرچ کرتا پھر دل میں پڑھتا تھا سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر آپ نے فرمایا یہی کلمات تیرے ثواب کے لئے بہترین ہیں اس لئے کہ تو ایک بار (چار سیر) سونا اللہ تعالیٰ کی راہ پر خرچ کرتا۔

تا زندہ ایم ذکر بش درزباں ماست یادش و مونس جان وروان ماست

(**ترجمہ**: جب تک ہم زندہ ہیں اس کا ذکر ہماری زبان پر جاری رہے گا اس کی یاد ہماری جان و دل کی انیس و مونس ہے)

ف: مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے سبحان اللہ کہی وہ آدم صفی اللہ علیہ الصلوۃ والسلام ہیں وہ اس طرح جب کہ ان میں روح پھونکی گئی تو یہی کلمہ ان کے منہ سے نکلا پھر فرمایا جو شخص بھی یہ کلمہ کہتا ہے اسے آدم علیہ السلام جیسی فضیلت ہوگی۔

ف: سب سے پہلے جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ نوح نجی علیہ السلام ہیں جب کہ انہوں نے طوفان اور اس کی شدت کو ملاحظ فرمایا تو یہی کلمہ کہا پھر فرمایا جو شخص اسے پڑھتا ہے تو اسے بہت سی فضیلت اور نوح علیہ السلام جیسا ثواب ملتا ہے۔

ف: جس نے سب سے پہلے اللہ اکبر پڑھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جب کہ انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ یعنی دنبہ کو دیکھا جو شخص یہ کلمہ کہتا ہے تو اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فیوضات سے فیض نصب ہوتا ہے۔ اے اللہ ہمیں ذاکرین وشاکرین سے بنا۔ (آمین یارب العالمین)

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى آپ سے یتیموں کے اموال سے اپنے اموال ملانے کے متعلق سوال کرتے ہیں اس لئے

تفسیر عالمانہ کہ قاعدہ ہے کہ جب بھی کسی شئے کے متعلق سوال ہوتا ہے تو اس سے وہ شئے مراد ہے جو مقاصد میں سے اہم ہو اور مال سے مال لانا ان کے نزدیک اہم مقابلہ تھا۔

شان نزول: جب یہ حکم نازل ہوا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا تو مسلمانوں نے یتامی کو اپنے سے علیحدہ کر دیا بلکہ اپنے ساتھ کھلانے سے بھی احتراز کرتے یہاں تک کہ کسی کے گھر کوئی یتیم ہوتا تو اس کے لئے

ایک علیحدہ کمرہ تیار کرنا پڑتا اور اس کا طعام بھی علیحدہ پکتا اس طرح سے انہوں نے یتامی کو بالکلیہ علیحدہ کر دیا طعام میں قیام میں وغیرہ وغیرہ بلکہ وہ طعام جو یتامی کے لئے پکتا ان کے کھانے سے جتنا وہ صاحبان کھا لیتے باقی جو بچتا اسے ڈر کے مارے کوئی نہ کھاتا اسی طرح پڑا خراب ہو جاتا یہ کام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شاق گذرا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم سب کے پاس مکانات نہیں کہ یتامی کو علیحدہ علیحدہ ٹھہرائیں اور نہ ہی سب کے ہاں طعام وغیرہ کا انتظام ہو سکتا ہے تو یہ آیت اتری۔

قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ اے میرے محبوب محمد ﷺ فرمایئے کہ ان کا ساتھ نبھانا ان کی اور ان کے اموال کی اصلاح کرنا خَيْرٌ اس سے اچھا ہے کہ انہیں اپنے سے دور رکھو اور ان کے ساتھ مل کر نہ رہو بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ ان پر نظر عنایت رہے۔

ف: اصلاح مصدر ہے اس کا فاعل محذوف ہے یعنی مصلح اور مصلح کہ یعنی یتیم کو مال کی افرت اور کثرت حاصل ہو گی۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ اور اگر تم ان کے ساتھ ایسا گذارہ کرو اس میں ان کا فائدہ ہو تو فَاِخْوَانُكُمْ تمہارے دین کے بھائی ہیں اور یہ نسبی علاقہ سے بہت زیادہ قوت رکھتا ہے اور بھائیوں کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ ایک دوسرے کی اصلاح اور انہیں نفع پہنچایا جائے۔

مسئلہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مخالفت کا یہ معنی ہے کہ تم یتیم کی کھجور اور دودھ وغیرہ اور اس کے برتنوں میں کھاؤ اور وہ تمہاری کھجور اور دودھ وغیرہ اور تمہارے برتنوں میں کھائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ضرورت کی مقدار کے مطابق ہو بلکہ اس سے بھی کم حد سے زائد نہ ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ

مسئلہ: حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس آیت سے مسئلہ کا استخراج ہو سکتا ہے کہ عام طور پر سفروں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کھانا کھایا جاتا ہے یعنی اگر بقدر ضرورت اپنے ساتھی سے کھاتا ہے تو جائز ہے ورنہ حرام اس لئے کہ عام طور پر ہم سفروں کی عادت ہے کہ کبھی برابر برابر مال ایک دوسرے کے پاس جمع رکھتے ہیں اور کبھی ان میں کمی بیشی بھی ہوتی ہے اس میں اگر ساتھی کے قلب و

کثرت کے خرچہ پر راضی ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز اس لئے کہ جب اس میں یتامی کے لئے وسعت رکھی گئی ہے تو باقی تو بطریق اولی جواز کے حقدار ہیں اگر اس کا جواز یونہی ثابت نہ کیا جائے تو لوگوں پر معاملات تنگ ہو جائیں گے۔

مسئلہ: مخالطت کا مسئلہ مصاہرت یعنی رشتہ ناطہ کے مسئلہ پر قیاس کیا گیا ہے صورت مسئلہ یوں ہے کہ کسی کو اپنی لڑکی کا نکاح کرے انس ومحبت کے اضافہ کی نیت پر انہیں اپنے ساتھ ملالے اور اسی طرح اپنے تمام برادری میں ان کے رشتہ ناطہ و دیگر معاملات کے مراسم جاری کردے صرف اس ارادہ سے کہ ان سے وحشت دور ہو اور انہیں غیرت کا خیال تک نہ رہے۔ یہی حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے۔

سوال: علم کے باب کو دو مفعول چاہئیں اور یہاں متعدی بیک مفعول ہے۔؟

جواب: یہاں علم معرفت کے معنی کو متضمن ہے اسی لئے کہ متعدی بیک مفعول ہے۔

الْمُفْسِدَ اس فسادی کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو یتیم کے مال خراب اور برباد کر دیتا ہے مِنَ الْمُصْلِحِ اور اس مصلح کو بھی جانتا ہے جو یتیم کے مال کے منافع کے درپے رہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں کہ تم میں فسادی کون ہے اور مصلح کون وہ تو ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ فلہٰذا تم ایسی غلطیوں سے بچو اور اصلاح کے سوا باقی اقدام نہ کرو۔

سوال: مصلح سے مفسد کو پہلے کیوں ذکر کیا گیا؟

جواب: مزید تہدید مطلوب ہے یعنی تاکہ مفسد کو تنبیہ ہو کہ جو غلطی میں کرتا ہوں اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

سوال: علم کے باب کے بعد مِنْ کیوں آتا ہے؟

جواب: علم تمیز کے معنی کو متضمن ہے اور تمیز کے بعد مِن آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جانتا ہے جو یتامی کے اموال کو اپنے اموال میں ڈال کر خرابی ڈالتے ہیں بلکہ اسے میں نمایاں کرتا ہوں اس سے جو یتامی کے متعلق اصلاح کا ارادہ رکھتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ اور اگر اللہ تعالیٰ تمہیں تکلیف میں ڈالنا چاہے (اعنات) بمعنی کسی کو ایسے مکروہ امر میں مبتلا

کرنا جو امر کو بجالانے کی طاقت نہ رکھتا ہو چنانچہ فرمایا لَاَعْنَتَكُمْ تمہیں مشقت میں ڈالے۔العنت بمعنی مشقت یعنی جب تمہیں مشقت میں ڈالا جائے تو تم اس کو بجالانے کی طاقت نہیں رکھ سکو گے عربی میں کہا جاتا ہے عنت فلان یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ کوئی ایسے معاملہ میں پھنس جائے کہ جس میں اس کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہو اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے تمہارے مشقت میں ڈالنے پر حَكِيْمٌ وہی فیصلہ فرماتا ہے جو اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔

ف: اس سے لفظ لو کا قاعدہ ثابت ہوا کہ اس کا کام ہے کہ وہ مقدم کی نفی کرے جسے منطقی کہتے ہیں۔

یتیم پروری کے فوائد: یتیم پروری وہ کرتے ہیں جو فطرۃ کریم ہوتے ہیں ویسے بھی ان پر نظر عنایت رکھنے میں بہت بڑے فائدے ہیں منجملہ ان کے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص یتیم کے سر پر رحم کرتے ہوئے ہاتھ رکھتا ہے تو یتیم کے جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے سے گزریں گے اسے اسی قدر ثواب ملے گا اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کل قیامت میں تین شخصوں کو عرش الٰہی کے نیچے جگہ ملے گی۔ ا۔ وہ عورت کہ جس کا شوہر فوت ہو کر چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جائے اس عورت کو نکاح کرنے کی ضرورت بھی ہے اور اسے نکاح کے لئے کہا بھی جاتا ہے لیکن وہ چھوٹے بچوں پر ترس کھا کر نکاح نہیں کرتی بلکہ بچوں کی تربیت میں لگی رہے بشرطیکہ پاک دامنی سے گذارے اور کہے کہ میں یتامیٰ کی پرورش میں ہی زندگی بسر کروں گی یہاں تک کہ یہ بچہ جوان ہو جائے یا اس پر موت آجائے یا میں مرجاؤں۔ ۲۔ دوسرا وہ شخص جو بہترین اور اعلیٰ سے اعلیٰ طعام پکا کر صرف یتیم کو بلا کر کھلائے۔ تیسرا وہ جو صلہ رحمی کرے ان کے رزق وعمر میں برکت دی جاتی ہے اور اسے مرنے کے بعد عرش الٰہی کے نیچے جگہ دی جائے گی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ یتیم سے شفیق باپ کی طرح اور بیوہ کے ساتھ شوہر سا سلوک اور مسافر کے لئے بہترین دوست کی طرح گزارا کرو پھر میں بھی تمہارے ساتھ نیک سلوک کروں گا حضرت حافظ شیرازی قدس سرہ نے فرمایا۔

تیمار غریباں سبب ذکر جمیلست
جاناں مگر ایں قاعدہ در شہر شما نیست

(ترجمہ: غریبوں کی غم خواری ایک بہتر طریقہ ہے لیکن اے محبوب شاید تمہارے ملک میں یہ رواج نہیں)

حدیث شریف: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں اور یتیم کی تربیت کرنے والا یعنی وہ شخص جو یتیم کی

ضروریات پوری کرتا ہے اپنے مال سے یا یتیم کے مال سے (یتیم اس کا قریبی رشتہ دار ہو یا نہ) وہ ان دونوں انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے ان دونوں انگلیوں یعنی سبابہ اور وسطی کی طرف اشارہ کر کے یعنی یتیم کی پرورش کرنے والا بہشت میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ہوگا۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ جس مرتبہ پر حضور نبی پاک ﷺ ہوں گے اسی مرتبہ پر وہی ہو۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

چو بینی یتیمے سر افگندہ پیش مدہ بوسہ بر روئے فرزند خویش

الا تا نگرید کہ عرش عظیم بلرزد ہمی چو بگرید یتیم

(**ترجمہ**: جب کوئی یتیم تمہارے ہاں موجود ہو تو تم اپنے بیٹے کو بوسہ مت دو خبردار یتیم نہ رونے پائے اس لئے کہ جب یتیم روتا ہے تو عرش الٰہی کانپ جاتا ہے)

مسئلہ: انسان کو چاہیے کہ یتیم کے حقوق میں کسی ایک حق میں کمی نہ کرے اور اس کے مال میں سے ایک رتی کے برابر نہ کھائے اور نہ ہی اس پر ظلم کرے اور نہ تشدد۔

حکایت: رستم بن زال اسفندیار سے کشتی لڑا لیکن اسے قابو نہ پا سکا باوجود یہ کہ اس سے قوت میں زائد تھا بلکہ الٹا ہر بار اسفندیار سے مار کھاتا اور اسفندیار کا جسم مچھلی کے چھلکے کی طرح تھا اس میں کوئی شئے اثر نہ کرتی تھی رستم نے اپنے باپ سے مشورہ لیا اس کے باپ نے فرمایا تم اس پر غلبہ نہیں پا سکو گے ہاں یوں کیجئے کہ ایک تیر بنایئے جس کے دو پر ہوں اور انہیں اسفندیار کی آنکھوں میں چبوئیں تب کہیں کام بن سکتا ہے چنانچہ رستم نے ایسے ہی کیا اور وہی تیر اسفندیار کی آنکھ میں مارا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا دراصل یہ سزا اسفند کو ایک یتیم کو ستانے کی وجہ سے ملی چنانچہ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اسفندیار نے جوانی میں ایک یتیم بچے کو لکڑی ماری تھی تو اس سے اس یتیم بچے کی آنکھ نکل پڑی وہ یتیم رو پڑا اور وہ لکڑی لے کر باغ میں گاڑ دی ایک عرصہ کے بعد وہ لکڑی ایک درخت بنا رستم نے اس درخت سے ہی اپنا تیر تیار کیا اور وہی تیر اسفندیار کی آنکھ میں پہنچا جس طرح اس یتیم کی آنکھ نکالی تھی اسی طرح ہی اس کی آنکھ نکالی گئی۔

مسئلہ: یتیم کی ایسی پرورش کرے جیسے اپنے بچے کی تربیت کی جاتی ہے ورنہ اس کے متعلق قیامت میں سوال

ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ یتیم کی اصلاح میں جدوجہد کرے۔

یتیم کو آداب سکھانا

تربیت کی کئی قسمیں ہیں۔ ا۔ وعید اور ڈرسنانا ۲۔ مارنا ۳۔ بعض ضروریات کے منافع سے روکنا۔ ۴۔ یتیم کو عطیات دینا۔ ۵۔ اس کے ساتھ احسان کرنا اس لئے کہ انسان کی طبیعتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو سختی اور شدت سے نرم ہوتے ہیں الثاان کے ساتھ نرمی اور احسان کرنا انہیں نقصان دیتا ہے اور بعض اس کے برعکس ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے حدود اور تعزیزات مقرر فرمائے تا کہ بندوں کو سرزنش ہو اور برائیوں سے بچ جائیں احرار کو بادشاہوں سے آدب سکھائے اور ممالیک اور اولاد کو بزرگوں اور والدین سے۔

مسئلہ: ادب سکھانے والے کو ادب سکھانے سے ثواب ملتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا اور حدیث شریف میں ہے کہ تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب کے سب سوال کئے جاؤ گے اپنی رعیت سے۔

تفسیر صوفیانہ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ میں اشارہ ہے کہ سالک کو چاہیے کہ وہ اکیلا کھانے کی عادت نہ بنائے بلکہ لوگوں سے مل کر کھانا کھائے اس لئے کہ شرور کا بنیاد اکیلا کھانے میں ہے۔

حدیث شریف: اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ پسندیدہ وہ طعام ہے جس میں ہاتھوں کی کثرت ہو عوارف میں ایسے ہی مذکور ہے اور مصابیح میں مذکور ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم کھاتے ہیں لیکن سیری نہیں ہوتی آپ نے فرمایا شاید تم کیلے کھاتے ہو عرض کی ہاں آپ نے فرمایا اب جمع ہو کر کھایا کرو۔

حکایت: کسی صاحب لطیفہ نے کسی صاحب نوادر کو کہا کہ آپ نے فلاں کے ساتھ صبح کا کھانا کھایا ہے اس نے کہا نہیں البتہ میں صبح کے وقت گزر رہا تھا تو وہ صبح کا کھانا کھا رہا تھا اس سے پوچھا گیا تمہیں کیسے معلوم ہوا اس نے کہا مجھے یوں معلوم ہوا کہ اس کے لڑکے بندوق اور تیر لے کر آسمان کے خلا میں پرندوں کے مارنے کے لئے خالی فائر کر رہے تھے۔

حکایت: بخیل سے پوچھا گیا تمہارے نزدیک سب سے بہادر کون ہے اس نے کہا ہر وہ شخص جو کسی کھانے کے وقت ڈاڑھ سے طعام چبانے کی آواز سنتا ہے لیکن اس کا جگر ٹکڑے نہیں ہوتا۔

حدیث شریف: جو کسی مومن کی مہمانی کرتا ہے گویا اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو مہمانی دی اور جو مسلمان کو مہمان دیتا ہے گویا اس نے حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہ السلام کو مہمان بنایا۔

(کذافی الرسالتہ العلیہ لحسین الواعظ)

تفسیر عالمانہ وَلَا تَنكِحُوا بفتح التا یعنی نکاح نہ کرو الْمُشْرِكَاتِ حربی مشرک عورتوں سے۔ اس لئے کہ کتابیات [1] اگرچہ مشرکات ہیں لیکن جمہور کے نزدیک ان کے ساتھ نکاح جائز ہے انہوں نے سورہ مائدہ کی آیت وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ سے استدلال کیا ہے اور قاعدہ ہے کہ سورہ مائدہ سب کی سب محکمہ ہے اس میں کوئی آیت بھی منسوخ نہیں۔ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی تصدیق کریں۔

شان نزول: مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کو مکہ شریف بھیجا تا کہ وہ چپکے چپکے مسلمانوں کو مکہ شریف سے لائیں آپ، مکہ معظمہ پہنچے آپ کے ہاں عناق عورت (کافر) حاضر ہوئی اور اس سے زمانہ جاہلیت میں آپ کو عشق تھا اس نے کہا اے مرثد میرے ساتھ خلوت کیجئے اب میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور اسلام ایسی باتوں سے روکتا ہے اس نے عرض کیا نکاح کر لوں گی لیکن حضور علیہ السلام سے مشورہ کر لوں آپ نے حضور علیہ السلام سے مشورہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ اور مومنہ لونڈی باوجود یہ کہ اس کے وہ بوجہ لونڈی ہونے شان میں کمی ہے لیکن خَيْرٌ وہ بہتر ہے دین ودنیا کے لحاظ سے مِّن مُّشْرِكَةٍ مشرکہ عورت سے باوجود یہ کہ اس کے پاس مال اور حریت کی شرافت بھی اسے حاصل ہے اور شان میں رفیع المنزلتہ ہے وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ اگرچہ وہ مشرکہ عورت اپنے حسن وجمال اور مال واسباب نور نسب کی شرافت کے علاوہ اس کے پاس تمام زیب وزینت کے سامان ہیں اور وہ تمہیں اپنے حسن وجمال میں پھنسا لے اور یہ واؤ حالیہ ہے اور حال کے معنی کے باوجود عاطفہ بھی ہے اس لئے کہ اس کا مدخول حال محذوف ہے۔

[1]: لیکن دور حاضر میں اس کے ساتھ نکاح نہیں چاہیے کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں لیکن حقیقتاً دہریہ۔ اویسی غفرلہ

کیونکہ اصل عبارت یوں ہے۔ خیر من مشرکتہ علی کل حال ولو فی هذه الحال یعنی وہ مومنہ عورت ہر حال میں مشرکہ عورت سے بہتر ہے اگر چہ وہ اس حال میں ہو جس کا ذکر اوپر آیا ہے اس ترکیب سے تمام احوال کا احاطہ مقصود ہے۔ (کذافی تفسیر الکواشی)

ف: یہاں پر لو بمعنی ان ہے اسی طرح ہر اس مقام پہ لو بمعنی ان ہوگا جہاں اس کا مابعد ماضی اور اس کا جواب اس سے مقدم ہو اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ اگر چہ تمہیں مشرک عورت اپنے حسن و جمال میں پھنسا لے لیکن تمہارے لئے عورت مومنہ کئی درجہ بہتر ہے۔

وَلَا تُنْكِحُوا بضم التاء الا نکاح سے مشتق ہے الْمُشْرِكِيْنَ یعنی کفار وہ بت پرست ہوں یا کوئی اور نئی مشرکین کو اپنی عورتیں مومنات نکاح میں نہ دو خواہ وہ آزاد ہوں یا لونڈیاں حَتّٰى يُؤْمِنُوْا یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں یعنی وہ تمام کفریہ امور ترک کریں۔

ف: ابن الشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حواشی میں فرمایا اے مسلمانو اپنی چھوٹی لڑکیاں یا جوان کے حکم میں ہیں اور وہ تمہاری ولایت میں ہیں اسی طرح چھوٹی مومنہ بالغہ عورتیں کفار سے نکاح نہ کریں۔

ف: ولا تنکحوا تغلیب الذکور علی الاناث کے قبیل سے ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

ف: ابھی تک مشرک کا حکم باقی ہے کہ مومنہ عورت کا کسی قسم کے کافر کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ ولعبد مومن اور مومن غلام باوجود یہ کہ اس میں ملوکیت کی کمی ہے خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ مشرک سے بہتر ہے اگر چہ اس میں آزادی کی شرافت ہے وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ اگر چہ وہ مال و جمال اور نیک خصال کی وجہ سے تمہیں اچھا لگے وہ جو مذکور ہوئے مشرکین اور مشرکات سے يَدْعُوْنَ بلاتے ہیں انہیں جوان کے ساتھ گذارتے اور ساتھ رہتے ہیں اِلَى النَّارِ جہنم کی طرف یعنی ان اعمال کی طرف بلاتے ہیں جو جہنم کی طرف لے جاتے ہیں جیسے کفر و فسق۔

مسئلہ: کافر و مشرک مرد و عورت سے اجتناب ضروری ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ رہنا چاہیے اور نہ دوست چاہیے۔ وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیا یعنی مومن یہاں پر مضاف محذوف ہے اس کے قائم مقام پر مضاف الیہ کو رکھا گیا ہے تا کہ اولیاء اللہ کی عظمت کا اظہار ہو۔ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بلاتا ہے بہشت مغفرت کی طرف یعنی حق کے اعتقاد اور عمل صالح جو کہ بہشت و مغفرت پہنچانے والے ہیں کی طرف بلاتے ہیں اور وہی

ایسے تعلق کے حقدار ہیں بِاِذْنِہٖ یہ یَدْعُوْا کے متعلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ بلاتا ہے اور حالانکہ اس کی توفیق سے ملتبس ہے منجملہ اس کے مومنین کی رہبری ہے جو کہ وہ خیر و رحمت سے ملے ہوئے ہیں اور ان کا نصیحت کرنا بھی وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ اور اپنے آیات بیان کرتا جو کہ عجیب احکام اور بہترین حکمتوں پر مشتمل ہیں لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ لوگوں کے لئے تا کہ نصیحت حاصل کریں اور معلوم کریں جو اس کے اندر ہے تا کہ (جس کی طرف بلائے جاتے ہیں) کامیاب ہو جائیں یعنی بہشت و مغفرت نصیب ہو۔

سوال: آیت میں تذکّر کیوں کہا گیا؟

جواب: اس طرف اشارہ ہے کہ وہ امر ایسا واضح ہے کہ اس میں تفکر کی ضرورت نہیں جیسے سابقہ انبیاء علی نبینا و علیہم السلام کے احکام میں تفکر کی ضرورت ہوتی تھی۔

مسئلہ: آیت میں کفار کے ساتھ دوستی و تعلق سے روکا گیا ہے اور مومنین سے محبت و الفت و دوستی کی ترغیب دی گئی ہے۔

مسئلہ: مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ مشرکہ عورت کے مال و جمال کو دیکھ کر حیران نہ ہو اس لئے کہ مسلمان عورتوں میں بعض اس جیسی ہوتی ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر بھی تو مومن خواہ مخواہ کیوں جہنم خریدتا ہے۔

مسئلہ: محیط میں ہے کہ کوئی مسلمان نصرانیہ کے حسن و جمال کو دیکھ کر دل میں آرزو کرے کہ کاش وہ نصرانی ہوتا تا کہ اس سے نکاح کر لیتا اس آرزو کی وجہ سے وہ کافر ہو جائے گا علاوہ ازیں اس کی حماقت بھی ہے اس لئے کہ اس جیسی حسین و جمیل اسلام میں بھی بیشمار ہیں یہ آرزو اسے جہنم کی طرف لے گئی کیونکہ اس سے نکاح مشکل تھا جب تک ایک جنس نہ بنتا چنانچہ اس کی علت قرآن مجید میں موجود ہے اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً اس لئے مشہور ہے کہ گندی طبیعتیں ہی گندی دنیا کی لالچ کرتی ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ کسی نے کیا خوب کہا۔

ہمہ مرغاں کنند با جنس پرواز کبوتر با کبوتر باز با باز

(**ترجمہ**: ہر مرغ اپنے ہم جنس کی طرف پرواز کرتا ہے کبوتر کبوتر کے ساتھ اور باز باز کے ساتھ)

ف: زمخشری کے اس بلاغت بھرے قول کو سراہا گیا ہے چنانچہ اس نے کہا **لا تعرض لمجالسۃ الا بمجانسۃ**

یعنی اس پر ہرگز راضی نہ ہونا جب تک تیرا انیس تیرا ہم جنس نہ ہو کیونکہ سب سے بڑا عذاب یہی ہے کہ انسان کا رفیق غیر جنس ہو۔

تفسیر صوفیانہ اسائتہ الحکم میں ہے کہ عادات کے اختلاف کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ عالم شہادت میں ملاقات سے پہلے عالم ارواح میں ارواح کو ارواح سے آپس میں روشناسی ہوئی جسے نیک روح سے تعارف ہوا سے ازل سے نیکی نصیب ہوئی اسی وجہ سے بعض میں نیکی کی عادت ہوتی ہے اور بعض میں بری عادت اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی ہم جنس سے تعلق جوڑے وہ ہم جنس از جہت جسمانیہ ہو یا از جہت روحانیہ لیکن یاد رہے کہ جہت جسمانیہ کا کھچاؤ مٹی کی طرف ہوگا اور جہت روحانیہ کا روحانیہ کی طرف سے جو کہ روز اولین کی مناسبت سے ایک دوسرے سے تھی۔ حضرت امام سخاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ مقاصد حسنہ میں فرماتے ہیں۔ حدیث الارواح جنود مجندۃ تمام ارواح ایک بڑا لشکر تھے جسے ایک دوسرے سے اس وقت تعارف ہوا وہ آج ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور جنہیں ایک دوسرے سے روشناسی نہ ہوئی ان کا زندگی بھر آپس میں اختلاف رہا۔

شان ورود: اس حدیث کے ورود کے متعلق سیدنا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ مکہ معظمہ میں ایک عورت تھی جس کا کام تھا کہ وہ قریش کی عورتوں کو ہنساتی تھی جب عورتوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو وسعت بخشی تو وہ بھی مدینہ شریف آ گئی میں نے اس عورت کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں مہمان ہوئی تو کہا گیا کہ وہ فلاں عورت کے ہاں مہمان ٹھہری اور وہ بھی ہنسانے والی مشہور تھی۔ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ فرماتی ہیں حضور سرور عالم ﷺ تشریف لائے تو فرمایا کہ فلاں ہنسانے والی عورت مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آئی ہے ہم نے کہا ہاں جی آپ نے فرمایا پھر وہ کہاں مہمان ہوئی ہم نے کہا مدینہ طیبہ کی فلاں عورت جو یہاں مدینہ طیبہ میں عورتوں کو ہنساتی ہے آپ نے فرمایا الحمد للہ ان الارواح جنود مجندۃ الخ

کسی شاعر نے کہا ہے۔

بینی و بینک فی المحبۃ نسبتہ	مستورۃ عن سر ھذا لعالم
نحن اللذان تحابت ارواحنا	من قبل خلق اللہ طینتہ آدم

(**ترجمہ**: تیرے اور میرے مابین محبت کے بارے میں ایک نسبت ہے جو اس عالم سے پوشیدہ ہے ہم وہ ہیں جو روحیں آپس میں محبت کرتی تھیں جب کہ ابھی اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کا گارا بھی نہیں بنایا تھا)

حضرت حسین کاشفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

جاذب ہر جنس را ہم جنس داں — جنس بر جنس است عاشق جادواں

تلخ با تلخاں یقین ملحق شود — کے دم باطل قرین حق شود

طیبات آمد بسوئے طیبین — الخبیثات للخبیثین است ہم نشیں

(ترجمہ: ہم جنس کو ہم جنس کھینچتا ہے اس لئے کہ ہم جنس اپنے ہم جنس کا عاشق ہے کڑوے کو یقینا کڑوے سے الحاق ہوتا ہے باطل ایک گھڑی کے لئے بھی حق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا طیبات کو طیبین کی طرف میلان ہوتا ہے اور خبیثات کو خبیثین سے تعلق ہے)

تفسیر صوفیانہ عقول میں بھلائی کا میدان اور برائی سے نفرت طبعی طور ہے اس لئے دانا پر لازم ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرے وہ شخص بڑی سمجھ رکھتا اور اپنے مال سے باخبر ہوتا ہے تو جو لوگ حق سے دور ہوتے ہیں وہ ان سے علیحدگی اختیار کر لیتا اور برائی کے داعی سے نفرت کرتا ہے عجم کے بعض اہل قربت بزرگوں نے فرمایا اللہ بس باقی ہوس۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا اور مقربین وہ ہیں جو مَا فِی الْاَرْضِ کے باوجود کو فانی سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ماسوی ذات حق کے وہ کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اپنے مولیٰ سے ماسوی اس کے اوپر کچھ نہیں مانگتے اور نیت اور عمل کے لحاظ سے بہتر سے بہتر ہوتے ہیں اور یہی سیدھا راستہ ہے اے اللہ ہمیں ہماری ہدایت کی باتیں الہام فرما اور ہمیں اپنے نفس کے شر سے بچا اس لئے کہ تو مجیب الدعوات ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا

اور تم سے پوچھتے ہیں حیض کا حکم تم فرماؤ وہ ناپاکی ہے تو عورتوں سے الگ رہو

النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ

حیض کے دنوں اور ان سے نزدیکی نہ کرو جب تک پاک نہ ہولیں

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

پھر جب پاک ہولیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا بیشک اللہ

يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪

پسند کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور پسند رکھتا ہے ستھروں کو۔ تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں

فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

تو آؤ اپنی کھیتیوں میں جس طرح چاہو اور اپنے بھلے کا کام پہلے کرو اور اللہ سے

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا

ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اس سے تمہیں ملنا ہے اور اے محبوب بشارت دو ایمان والوں کو۔ اور ایمان والوں کو

اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ

اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو کہ احسان اور پرہیزگاری اور لوگوں میں صلح کرنے کی

النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِىْٓ

قسم کرلو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ اللہ تمہیں نہیں پکڑتا ان قسموں میں جو بے ارادہ

اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

زباں سے نکل جائیں ہاں اس پر گرفت فرماتا ہے جو کام تمہارے دلوں نے کئے اور اللہ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ

بخشنے والا علم والا ہے۔ وہ جو قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے کی انہیں چار

اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا

مہینے کی مہلت ہے پس اگر اس مدت میں پھر آئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور چھوڑ دینے کا ارادہ پکا

الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ

کرلیا ہے تو اللہ سنتا جانتا ہے۔ اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رہیں

بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ

تین حیض تک اور انہیں حلال نہیں کہ چھپائیں وہ جو اللہ نے ان

اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ

کے پیٹ میں پیدا کیا اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہیں

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ

اور ان کے شوہروں کو اس مدت میں اندر ان کے پھیر لینے کا حق پہنچتا ہے اگر ملاپ چاہیں

مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ

اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

تفسیر عالمانہ

سوال: تین وَیَسْئَلُوْنَکَ واؤ کے ساتھ ہیں اور باقی واؤ کے بغیر اس کی کیا وجہ ہے۔

جواب: دراصل لوگوں نے ان تینوں کے متعلق یک وقت سوال کیا اور اس کے ماسوا

کے متعلق متفرق اوقات میں سوال کئے اسی لئے انہیں واؤ کے ساتھ اور باقیوں کو واؤ کے بغیر ذکر کیا گیا ہے۔

عَنِ الْمَحِيْضِ یہ مصدر ہے جیسے ''محی اور میت'' مصدر ہیں اور حیض وہ گندی الائش ہے جو عادت کے طور رحم سے خارج ہوتی ہے یعنی آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

فائدہ: سوال میں ابہام تھا لیکن جواب میں پوری تفصیل کی گئی ہے اس لئے کہ ان کے سوال کا منشاء یہ تھا کہ حیض کی حالت میں عورتوں سے اختلاط جائز ہے یا نہ قُلْ هُوَ اَذًى فرمایئے اے حبیب ﷺ وہ اذی ہے یعنی حیض ایک ایسی شے ہے جسے طبیعت کو نفرت ہوتی ہے اور وہ اسے ایذاء دینے والی ہے یعنی بحالت حیض عورتوں سے قربت کرنے سے طبعی نفرت اور کراہت بھی ہے اور موجب ایذاء بھی۔

شان نزول: مروی ہے کہ اہل جاہلیت اپنی عورتوں کو بحالت حیض اپنے گھروں سے نکال دیتے تھے اور نہ ہی ان کے ساتھ کھاتے پیتے مجوس اور یہود کی عادت تھی اور اسی رسم پر قائم رہے یہاں تک کہ ابو الدحداح (صحابہ کرام میں سے تھا) نے سوال کیا یارسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنی عورتوں سے حیض کی حالت میں ہمبستری کریں یا نہ اس کے سوال پر یہ آیت نازل ہوئی۔

فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ، اَلْمَحِيْضِ یہاں پر اسم مکان ہے اس لئے کہ فرج سے ہی حیض ظاہر ہوتا ہے یعنی حیض کے دوران عورتوں کے جماع سے پرہیز کرو۔

شان نزول: مروی ہے کہ اہل اسلام نے ظاہری طور پر عورتوں سے علیحدگی اختیار کر لی اس لئے کہ عورتوں کو اپنے گھروں سے نکال دیا چند اعرابیوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ سخت سردی ہے اور کپڑوں کی کمی ہے اگر ہم ان کو کپڑے دیتے ہیں تو تمام کنبہ ہلاک ہوتا ہے اور اگر ہم خود استعمال کرتے ہیں تو حیض والی عورتیں ہلاک ہوتی ہیں آپ نے فرمایا جب وہ حیض کی حالت میں ہوں تو تم صرف جماع سے روکے گئے ہو یہ نہیں کہ عجمیوں کی طرح حیض والی عورتوں کو گھروں سے نکال دو اسلام میں میانہ روی کا ایک مسئلہ یہ ہے اور یہود حیض والی عورتوں کو گھروں سے نکال دیتے تھے اور نصاری حیض کی پرواہ کئے بغیر ان سے جماع کرتے تھے اسلام میں فرمایا گیا کہ نہ بالکل حیض والی عورتوں کو گھروں سے نکالو اور نہ ہی ان سے جماع کرو۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ اور نہ ہی ان سے جماع کرو حَتّٰى يَطْهُرْنَ یہاں تک کہ حیض سے پاک ہو جائیں

یعنی ان کا حیض پورے طور ختم ہو۔

مسئلہ: سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عورت کے حیض کے ایام دس پورے ہوں تو اس سے جماع کرنا جائز ہے اگرچہ عورت غسل کر سکے اور دس دنوں سے کم مدت میں حیض ختم ہو تو جماع نہ کرے یہاں تک کہ حائضہ غسل کرلے اور اس پر نماز کا وقت گزر جائے۔

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ پس جب وہ نہالیں اس لئے کہ تطہر بمعنی اغتسال ہے فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ پس ان کے پاس آجاؤ جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے یعنی عورت کے ساتھ جماع کرو اس مقام پر جو تمہارے لئے حلال ہے یعنی قبل میں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ گناہوں سے توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ اور پاک رہنے والوں سے بھی محبت کرتا ہے یعنی فواحش اور طبع سے نفرت والی اشیاء سے تنزہ کرتے ہیں جیسے حائضہ کا جماع اور قبل کے بغیر دوسرے مقام میں وطی کرنے سے نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں یعنی وہ کھیتی کی جگہ ہیں۔

ف: عورتوں کے اندر نطفہ ڈالنے کو زمین کے اندر بیج ڈالنے سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ ان دونوں کو آپس میں مشابہت ہے۔ بامعنی کہ ہر دونوں میں ایسا مادہ پایا جاتا ہے جو کہ اصل مقصود ہے۔

ف: حرث اور زرع میں فرق یہ ہے کہ حرث کو بیج ڈالنے اور زمین کو اس لئے تیار کرنے اور مرع بیج کے اگانے اور پھر انگوری کی نگرانی وغیرہ کرنے کو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ کفار کے لئے حرث اور زرع کی نفی کی ہے۔ فَاْتُوْا اپنی کھیتی کے پاس آؤ۔

ف: عورتوں کو کھیتی سے اور ان سے جماع کرنے کو اتیان تعبیر کیا گیا ہے اَنّٰى شِئْتُمْ الـی یہاں پر بمعنی کیف ہے یعنی جیسے اور جس طرح اور جہت سے چاہوں بعد اس کے کھیتی اور وطی کی جگہ ایک ہو اس لئے کہ دبر کھیتی کی جگہ نہیں ہے اَنّٰى شِئْتُمْ کے عموم میں مکانات کا عموم مراد نہیں کہ عورتوں کو دبر میں بھی وطی کرنا جائز ہے البتہ یہ عموم کیفیات میں ہو سکتا ہے اور کیفیات کے عموم پر اس آیت کا شان نزول بھی دلالت کرتا ہے۔

شان نزول: مروی ہے کہ یہودیوں کا گمان تھا کہ جو شخص اپنی عورت سے قبل میں پیچھے کی طرف سے جماع کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ یہودیوں کی یہی بات حضور سرور عالم ﷺ کو پیش کی گئی تو یہی آیت نازل ہوئی اور عقد نکاح

سے یہی مقصود ہے کہ عورت کھیتی کی جاہ ہے اور اس کے کھیتی کی جگہ پر جیسے ہی اور جس طرح سے جماع ہو جائز ہے۔

لواطت کی مذمت

حدیث شریف: لعنتی ہے جو اپنی عورت کی دبر میں وطی کرے۔

مسئلہ: عورت کی دبر میں وطی کرنا لواطت صغریٰ ہے اور مرد سے دبر وطی کرنا لواطت کبریٰ ہے۔

مسئلہ: حضرت امام نے فرمایا جس نے کسی بے ریش لڑکے کو شہوت کے طور بوسہ دیا گویا اس نے اپنی ماں سے ستر بار وطی کی اور جس نے اپنی ماں سے زنا کیا گویا اس نے ستر باکرہ عورتوں سے زنا کیا اور جس نے ستر باکرہ عوتوں سے زنا کیا گویا اس نے ستر ہزار عورت سے زنا کیا۔

مسئلہ: لواطت کی سزا تعزیر ہے اور اسے جیل خانہ میں محبوس کیا جائے یہاں تک کہ توبہ کرے اور صاحبین کے نزدیک اسے زانی جیسی حد لگانی چاہیے یعنی سو کوڑا اور اگر وہ شادی شدہ نہیں ہے اگر شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کرنا لازمی ہے۔

وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ اور اپنے نفسوں کے لئے اعمال صالحہ مقدم کرو یعنی وہ ثواب جس کا تمہیں وعدہ کیا گیا ہے وہ اللہ کے ہاں اس دین کے لئے ذخیرہ محفوظ ہے جس دن کہ تمام محتاج ہوں گے اور عورتوں کے ساتھ جماع کرنے پر اس قید میں بھی نہ پھنسو کہ ان سے شہوت رانی مقصود ہے بلکہ اس ارادہ سے جماع کرو کہ شرع کا جو اس میں مقصود ہے یعنی اولاد پیدا کرنا تمہارا بھی وہی مقصود ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرو گناہوں سے اجتناب کر کے یعنی وہ امور جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ اور یقین کرو کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہو مُلٰقُوْهُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہاں پر مضاف کا حذف ضروری ہے ایملا قوا جزائتہ یعنی اللہ تعالیٰ کی جزاء سے تم ملنے والے ہو اس دن کے لئے ایسا زادراہ تیار کرو کہ جس سے تمہیں شرمساری نہ ہو۔ وَبَشِّرِ اور اے میرے محبوب محمد ﷺ خوشخبری سنایئے الْمُؤْمِنِيْنَ مومنین کو یعنی ان لوگوں کو جو اوامر و نواہی کے مخاطب ہیں اور وہ انہیں سن کر بدل و جان قبول کرتے ہیں اور جس کا انہیں حکم ہے اس پر بطیب خاطر عمل کرتے ہیں انہیں کرامت اور دائمی نعمتوں کی خوشخبری سنادو کہ۔

دار امان خانہ ایمان بنشیں ایمن باش — کہ امان باید ت البتہ مرد زیں مسائمن

(ترجمہ: ایمان کے امن خانہ میں اطمینان سے بیٹھو اگر امن چاہتے ہو تو اس امن خانہ سے باہر قدم مت رکھو)

ف: اس کی علامت یہ ہے کہ جس بندے کا ایمان گناہوں سے روکے اور نیکی کی رغبت دے تو سمجھو ایسا مؤمن خوشخبری کا مستحق ہے اور اگر اس کا ایمان نہ اسے برائی سے روکتا ہے اور نہ ہی اطاعت الٰہی میں دلچسپی دلاتا ہے تو وہ خوشخبری کا حق نہیں رکھتا اس لئے کہ وہ ایمان کے رہنے کی جگہ نہیں کیونکہ ایمان ایسے مقام پر نہیں ٹھہرتا جہاں اس کے رہنے کی جگہ صاف ستھری نہ ہو یعنی گناہوں سے منزہ اور پاک نہ ہو۔ وَاعْلَمُوٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ میں اشارہ ہے کہ سالک پر لازم ہے کہ وہ اپنے مرجع اور انجام کو یاد کرے اور کوشش کرے ان چیزوں کے حصول کی جو اسے نفع پہنچائیں یعنی اعمال صالحہ اور گھٹیا درجہ ہے کہ عمل آخرت کے لئے میسر ہوں اور بلند مراتب فضل مقاصد اور اعلیٰ مطالب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کما قال تعالی ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ وہ اسلئے کہ عمل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے کئے جاتے ہیں نہ کہ جنت کی طلب کے لئے اور نہ ہی دوزخ سے بچنے کے لئے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ عورتوں کے لئے حیض مقرر کیا گیا ہے یہ ان کے ایمان کا نقصان ہے اس لئے کہ یہ روزے نماز کی حقیقت سے مانع ہے جو کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا موجب ہے اور یہ روزے کی حقیقت سے مانع ہے اور یہ مشتہیات نفس سے روکتا ہے اور جیسے حیض فرج سے نکلنے کا نام ہے اسی طرح خواہشات بھی صفات بشریہ کے غلبات اور حاجات انسانیہ کو کہا جاتا ہے خواہشات نفسانیہ کے غلبہ سے روحانی صفائی مکدر ہو جاتی ہے اور اذی پہنچتا ہے بزرگوں نے فرمایا کہ خواہشات نفسانیہ کا ایک قطرہ روحانی صفائی کے دریا کو مکدر کرتا ہے اس لئے حقیقۃً نفس کو نماز روزہ سے روکا گیا ہے اگرچہ وہ بظاہر ان میں مشغول ہو۔

ف: مومنین کے تین طبقات ہیں۔ ۱۔ عوام ۲۔ خواص ۳۔ خاص الخاص عوام چونکہ اہل غیب سے ہیں ان کے لئے ہم شکل لوگوں میں ٹھہرنے کی اجازت ہے جب کہ علی وصف الاذن ہو ان کے لئے کہا گیا ہے نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ اور خواص چونکہ وصف حضور سے موصوف ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے ہم مثل لوگوں میں گذرایں اور ان کے لئے کہا گیا ہے قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ اس کے بعد وہ لوگ تفرید کے راہ چلتے ہیں یہاں تک کہ

کعبہ توحید تک پہنچ جاتے ہیں اور خاص الخاص وہ حضرات ہیں جو حق تک پہنچتے اور حقیقت کے ملنے والے ہوتے ہیں خلافت حق سے عالم حقیقت میں ماسوی اللہ کے متصرف ہوتے ہیں یہی مردان حق کہلاتے اور اللہ تعالیٰ کے قرب میں بیٹھنے والے ہوتے ہیں ان کی عورتیں ماسوی اللہ ہیں انہیں کہا جاتا ہے یہ ماسوی اللہ تمہاری کھیتی ہے اور اس کے پاس جس طرح چاہو آؤ یہ حضرات انبیاء کرام اولیاء علی نبینا و علیهم السلام و رحمۃ اللہ علیہم ہیں پس جیسے ایک قوم کے لئے دنیا آخرت کی کھیتی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے دنیا و آخرت دونوں کھیتی باڑی ہیں ان میں جو چاہیں بیج بوئیں جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ یہ لوگ وہی چاہتے ہیں جو اللہ چاہتا ہے اس لئے کہ ان کی مشیت کا انحصار اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے اور ان کی قدرت کا تصرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ہے وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے نفع کے لئے کرتے ہیں نہ کہ اپنے نقصان کے لئے بلکہ یہ وہی شئے مقدم کرتے ہیں جس کی تقدیم کا انہیں حکم ہے اور وہی چیز مؤخر کرتے ہیں جس کا انہیں تاخر کا حکم ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ یعنی اے اللہ تعالیٰ کے خواص ولی و دنیا و آخرت کی کھیتی میں تصرف کرنے والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ کو ملنے والے ہو اللہ تعالیٰ سے تمہیں کوئی شئے آڑ نہیں بنتی اور مؤمنین کو خوشخبری دو کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کو ملنے والے ہیں اگر اللہ تعالیٰ سے ڈریں یعنی خواص اولیا کا مرتبہ مومنین کو آسانی سے میسر ہوتا ہے جب کہ وہ اس کی طلب میں جدوجہد کا حق ادا کریں۔

حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

جمال یار ندارد حق نقاب و پردہ ولے　　　غبار رہ بنشاں تا نظر توانی

(**ترجمہ**: جمال یار پر کسی قسم کا پردہ نہیں ہے تم اپنے سے غبار کو دور کرو تا کہ تم دیدار پا سکو)

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ

تفسیر عالمانہ

شان نزول: مروی ہے کہ بشر بن نعمان انصاری نے اپنی عورت کو طلاق دے دی اور یہ حضرت عبداللہ بن رواحہ کی بہن تھیں پھر بشر بن نعمان کا ارادا ہوا کہ ان سے نکاح کریں اور حضرت عبداللہ نے قسم کھائی تھی کہ اب بشر بن نعمان سے علیک سلیک ختم اور نہ ہی اس سے سلام و کلام ہوگا اور نہ ہی اپنی بہن کے بارے میں ان کے ساتھ صلح کریں گے جب انہیں کہا گیا کہ آپ کی بہن کے ساتھ بشر بن نعمان دوبارہ شادی کرنا

چاہتے ہیں تو انہوں نے یہی فرمایا کہ اب میں قسم کھا چکا ہوں کہ اپنی بہن کا نکاح دوبارہ بشر بن نعمان سے نہیں کروں گا اور میں اپنی قسم پر پختہ ہوں اس سے کسی طرح حانث نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حل لغات: عُرْضَةً بمعنی معروض نام ہے اس شئے کا جو کسی شئے کے آگے عارض ہو یعنی وہ شئے جو آگے کی بجائے اس حیثیت سے کہ وہ حاجز و مانع بن جائے یہ مشتق ہے عرض العود علی الاناء سے یعنی لکڑی کو برتن میں ڈال کر اس کا اسے سترہ بنایا اس حیثیت سے کہ اسے برتن یا جس کی طرف توجہ کی جاری ہے سے عاجز و حائل بنایا جائے اب آیت کا ترجمہ یہ ہوا جس پر کہ تم قسم کھاتے ہو انواع خیر سے جیسے پاک دامنی اور پرہیزگاری کا اظہار اور اصلاح کرنا یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے نام کی قسم کھانے کو آڑ نہ بناؤ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا اس سے مانع نہیں یہاں پر قسم کھانا مجاز مرسل ہوگا اس خیرات سے کہ جس پر قسم کھائی جارہی ہے۔

سوال: محلوف علیہا یعنی جس پر قسم کھائی جارہی ہے اسے یمین (قسم کھانے) سے کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب: اس لئے کہ قسم کو اس سے تعلق ہے۔

ترکیب: لایمدنکم عرضعه سے متعلق ہے اور اس کا اس سے معولیت کا تعلق ہے نہ کہ علیت کا کیونکہ عرضہ وہ ہے جو کسی شئے کو عارض اور وہ شئے اس سے معرض ہو یعنی وہ شئے جسے تم کسی دوسری کے آگے مقدم کرو تو پہلی شئے اس دوسری شئے کے آگے ہو اب مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم کو ایسی شے نہ بناؤ جو عارض اور وہ محلوف علیہ یعنی بر اور خیر کے آگے واقع اور وہ قسم شئے کی ادائیگی سے مانع ہو۔ اَنْ تَبَرُّوْا بیان ہے اَیْمَانِکُمْ کے لئے یعنی اَنْ تَبَرُّوْا ان امو کے لئے عطف بیان ہے جس پر قسم کھائی جارہی ہے۔ یعنی بر و تقویٰ اور اصلاح کے لئے۔

وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ اور اللہ تمہاری قسم کو سنتا ہے اور عَلِیْمٌ تمہاری نیات کو جانتا ہے یہاں کہ تم قسمیں کھانا چھوڑ دو صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم اور اس کے اجلال و اکرام کی وجہ سے جو کہ تم اسے اپنی دینویہ اغراض پر استعمال کرتے ہو اور وہ تمہارے قلوب و نیات کو جانتا ہے بلکہ اس پر پورے طور محافظت کرو جس کا مکلف بنائے گئے ہو۔ مثنوی شریف میں ہے۔

از پے آں گفت خود را حق سمیع	تا بندی لب ز گفتار شنیع
از پے آں گفت خود را حق بصیر	کہ بود دیدویت ہردم نذیر

از پے آں گفت خود را حق علیم　　　　تا نیندیشی فسادے تو زبیم

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اس لئے سمیع فرمایا ہے تا کہ تم اپنی زبان کو بری باتوں سے روکو اور اس نے اپنے آپ کو بصیر اس لئے فرمایا ہے کہ تمہیں دیکھنے کے متعلق اس کا خوف ہو اور اس نے اپنے آپ کو علیم اس لئے فرمایا ہے تا کہ تم فساد کے اندیشے سے پاک وصاف رہو)

تفسیر صوفیانہ آیت عام ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی قسم اس لئے کھاتا ہے کہ وہ کسی سے احسان نہ کرے اور نہ ہی گناہوں سے بچے اور وہ کام کرے جو اس کا جی چاہے اور نہ ہی لوگوں کے درمین صلح وصفائی کرائے جب کہ ان کے مابین بغض وعداوت پھیلے گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارا ہر معاملہ خیر اور بھلائی ہے اس سے تمہاری قسم مانع نہیں پس اگر تم قسم کھاؤ تو پہلے اسے سوچ لیا کرو اور نیکیاں یعنی احسان وتقوی اور اصلاح مابین الناس کا معاملہ کرو پس ایسے نہ کہو کہ قسم کھا کر کہو کہ ہم یہ کام اس لئے نہیں کرتے کہ اس پر قسم کھا چکے ہیں اگر ہم یہ کام کریں تو ہم اپنی قسم میں حانث ہو جائیں گے اس لئے انہیں چاہیے کہ ایسے مواقع پر حانث ہو جائیں کیونکہ ان کا حانث ہونا فعل بر واحسان سے یعنی وہ کہ جس سے احسان وتقوی اور اصلاح مابین الناس سے تعلق رکھتا ہے۔

حدیث شریف: حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا جس نے قسم کھائی اور وہ جانتا ہے کہ اس کے غیر میں بھلائی ہے تو اسے چاہیے کے قسم کا کفارہ دے اور وہ کرے جس میں بھلائی ہے۔

مسئلہ: کام پہلے کرے کفارہ بعد کو ادا کرے۔

مسئلہ: یہ جائز نہیں ہاں حانث ہونے کے بعد کفارہ بالاتفاق واجب ہے۔

مسئلہ: اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک بھی حانث ہونے سے پہلے کفارہ نا جائز ہے۔

مسئلہ: شرعۃ کتاب میں کہ اہل شرع فرماتے ہیں کہ قسم کھا کر اپنے سامان کو رواج نہ دو قسم سچی ہو یا جھوٹی اس لئے کہ اگر وہ جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ یمین غموس ہے اور کبیرہ گناہ ہے اور کبیرہ گناہ ملک کو تباہ کرتا ہے اور سچی قسم سے اللہ تعالیٰ اس کے سامان کیلئے اچھا سبب تو بنائے گا لیکن تجارت کو فروغ دینے کے لئے سچی قسم کھا کر اس نے برا کیا کیونکہ دنیا خسیس ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک رفیع الشان اور رفیع الشان کو ایک خسیس شئے کے لئے

بلاضرورت سبب بنانا بہت برا ہے۔

نکتہ: جس کی ہر چھوٹی بڑی بات پر قسم کھانے کی عادت بن جائے تو اس کی زبان قسم کھانے پر مجبور ہو جائے گی جس کی وجہ سے قسم کی قدر و منزلت اس کے دل سے اٹھ جائے گی اس اعتبار سے جھوٹی قسم کا کھا جانا اس کے لئے کوئی بری بات نہ سمجھی جائے گی اور اصل غرض کے لئے جو قسم سے مطلوب تھا وہ مقصود ہو جائے گا۔

حدیث شریف: بہت بڑی خرابی ہے اس تاجر کے لئے جو اپنے تجارتی کاروبار کے ہر معاملہ میں کہتا ہے اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ کی قسم۔

مسئلہ: بستان العارفین میں ہے کہ اپنے سامان کی ترویج کے لئے درود پڑھتا ہوا کہے کہ یہ بہتر سامان ہے وہ اس سے برا کرتا ہے۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تاجر لوگ بہت برے فاجر ہیں عرض کی گئی اس کی وجہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے تو بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے آپ نے فرمایا یہ لوگ اس لئے فاجر ہیں کہ یہ سامان بیچتے ہوئے جھوٹی قسم کھاتے ہیں اس وجہ سے گنہگار ہو جاتے بلکہ بات بات پر جھوٹ بولتے ہیں۔

مسئلہ: اللہ تعالیٰ کو کسی قسم کی قسم نہ دے مثلاً یوں نہ کہے واللہ لیفعلن اللہ کذا اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ تعالیٰ ایسے ہی کرے گا۔

مسئلہ: اگر ولی اللہ مذکورہ بالا قسم اللہ تعالیٰ کو پیش کرے تو اللہ تعالیٰ اس قسم میں ولی اللہ کو حانث نہیں ہونے دیتا بلکہ اس قسم میں اسے سچا بنا دیتا ہے تاکہ ولی اللہ کی عظمت کا اظہار ہو۔

حکایت باکرامت: حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک دن کہیں جا رہے تھے تو راستہ میں آپ کو ایک مزدور درویش پڑا ملا آپ نے اسے ہوش میں لا کر پوچھا کیا ہوا اس نے کہا میرا گدھا گم ہو گیا ہے اور میرے گھر کا ساز و سامان صرف وہی گدھا تھا حضرت ابو حفص کھڑے ہو گئے اور کہا وعزتک لا اخطوا خطوۃ مالم نرد حمرا اے اللہ مجھے تیری عزت کی قسم میں یہاں سے ایک قدم نہیں بڑھوں گا جب تک اس شخص کا گدھا واپس نہیں لوٹے گا ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی دیکھا تو گدھا سامنے ہے۔

(کذا فی شرع المشارق)

تفسیر عالمانہ

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسم سے تمہارا موخذہ نہیں کرے گا۔

فائدہ: لغو وہ کلام ہے جو درجہ اعتبار سے ساقط ہو جائے مثلاً کہا جاتا ہے لغو یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی باطل کلام بولے فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ تمہاری قسموں میں۔

ف: ایمان یمین کی جمع ہے بمعنی قسم اسے اس معنی میں دو جہتوں سے مستعمل کیا گیا ہے ۱۔ یمین بمعنی سیدھا ہاتھ چونکہ اہل عرب کی عادت تھی کہ جب کسی سے معاہدہ کرتے تو قسم کھاتے وقت ایک دوسرے کو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے اسی مناسبت سے اسے یمان کہا گیا۔ ۲۔ یمین بمعنی قوت اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ اور ہم نے اسے مضبوطی سے پکڑا اس لئے کہ قسم کھانے والا فعل کے کرنے یا نہ کرنے کی مضبوطی کی بناء پر قسم کھاتا ہے۔

یمین لغو وہ ہے کہ نہ اس میں عقد ہو اور نہ قصد مثلاً ب کسی معاملہ میں اللہ کی قسم کھا کر اقرار یا انکار کرے اور اس کا گمان ہو کہ وہ اپنے فعل میں سچا ہے حالانکہ معاملہ برعکس ہے خواہ وہ معاملہ جس پر قسم کھاتا ہے زمانہ ماضی کا ہو یا کوئی یا اسی قسم پر نہ گناہ ہے اور نہ کفارہ یہ حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لغو یمین اسے کہا جاتا ہے جو زبان سے بلا قصد کوئی لفظ نکل جائے مثلاً کہے لا واللہ دبلی واللہ اسی طرح وہ الفاظ کہ جن سے کلام کو موکد کیا جاتا ہے جن میں قسم کھانے کا دل میں خیال تک نہیں گزرتا یہاں تک کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ میں نے تجھے بیت الحرم میں قسم کھاتے دیکھا تو وہ اس کا انکار کر جائے آیت کے دو معنی ہیں ایک ان میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا تمہارے اس گمان پر کہ تم اپنی قسموں میں سچے ہو۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ لیکن تمہاری گرفت کرے گا المواخذۃ اخذ سے ہے یہاں پر بمعنی معاقبت کے ہے۔ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اس پر کہ تمہارے قلوب اس کے مرتکب ہوئے اور اس قسم کا طریقہ یہ ہے کہ جان بوجھ کر خلاف واقعہ کے قسم کھانے اسے یمین غموس کہا جاتا ہے۔

سوال: اسے غموس کیوں کہتے ہیں؟

جواب: اس لئے یہ قسم کھانے والے گناہ میں غوطہ دیتی ہے اب معنی یہ ہوا کہ تمہیں یمین لغو پر کوئی گناہ نہیں اور نہ

ہی کفارہ اس لئے کہ اس میں تمہاری نیت نہیں البتہ جس قسم پر تمہاری نیت ہے اور قصداً قسم کھاتے ہو تو اس پر تمہیں کفارہ لازم ہے۔

ف: تفسیر تیسیر میں ہے کہ آیت آخرت کے مواخذہ کے متعلق ہے اور اسی مواخذہ سے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ میں مواخذہ کفار مراد ہے لیکن کفارہ کا مواخذہ صرف یمین معقودہ میں ہے خلاصہ یہ کہ دونوں آیتیں مواخذہ کے بارہ میں مختلف ہیں۔

الْاَيْمَانَ اور اللہ غفور ہے بایں معنی کہ تمہاری غلطی کو معاف کر دیتا ہے مثلاً یمین لغو پر تمہارا مواخذہ نہیں فرماتا باجود یہ کہ یمین بھی قابل گرفت تھی اس لئے کہ لاپرواہی سے قسم کھائی گئی حَلِيْمٌ حلیم ہے کہ مواخذہ میں عجلت نہیں فرماتا۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ مواخذہ سے معاقبت مراد ہے ایجاب الکفارہ اس لئے کہ مغفرت اس میں ہو سکتی ہے جس میں کفارہ نہ ہو نہ یہ کہ جس پر کفارہ لازم ہو اور اس کی مغفرت فرمائے۔

فائدہ: الحلیم و الصبور میں فرق ہے صبور وہ ہے جس کسی امر سے نفرت نہ کرے اور نہ ہی اس پر غیظ و غضب طاری ہو اور نہ ہی وہ کسی پر طیش اور عجلت پر انتقام لیتا ہے باوجود یہ کہ قدرت اور بڑی قدرت کا مالک ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا بندے کا حلیم کی صفت سے فائدہ اٹھانا ظاہر ہے اور ایسا علم بندے کے بہترین اوصاف سے شمار ہوتا ہے۔

حدیث شریف: مسلمان مرد کو حوصلہ سے روزہ دار اور شب بیدار کا ثواب نصیب ہوتا ہے۔ جناب حسین واعظ الکاشفی مرحوم فرماتے ہیں۔

علم با حلم حال روئے بود   علم بے حلم خاک کوئے بود

بردباری چو زینت خراست   ہر کرا حلم نیست زیوراست

(**ترجمہ**: علم حلم کے ساتھ ہو تو وہ علم مفید ہے علم بے حلم ہو تو وہ خاک ہے بردبار ایسے ہے جیسے گدھے پر زیور یعنی بردباری انسان کے عیب چھپا دیتی ہے جسے حوصلہ نہیں سمجھو بے زیور ہے)

یمین کے اقسام: یمین کے تین اقسام ہیں۔

☆...... حسین کاشفی نے فرمایا کہ علماء فرماتے ہیں کہ کوئی عمدہ قسم کھائے تو اس پر کفارہ ہے اسے یمین منعقد کہتے ہیں۔

☆...... اس نے جو قسم کھائی ہے اگر اسے زمانہ ماضی سے تعلق ہے اور قسم کھانے والا واقعہ کو جانتا بھی ہے لیکن قسم اس کے خلاف کھاتا ہے تو اس پر صرف گناہ ہے اور وہ بھی کبیرہ لیکن اس پر کفارہ نہیں یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالی علیہ کا مذہب ہے کیونکہ کبائر پر کفارہ نہیں ہوتا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر کفارہ واجب ہے۔ اسے یمین غموس کہتے ہیں۔

☆...... اگر قسم کھانے والا واقعہ سے بالکل بے خبر ہے اور قسم کھاتے وقت اپنے موقف کو سچا سمجھ کر قسم کھاتا ہے حالانکہ معاملہ برعکس ہے لیکن اسے اس کا علم نہیں تو اس میں کسی قسم کا کفارہ نہیں اور اسے یمین لغو کہا جائے گا امام ابوحنیفہ کے نزدیک لیکن امام شافعی اسے یمین غموس کہتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ اس قسم میں بھی کفارہ ہے۔

مسئلہ: قسم اللہ تعالی کی یا اس کے اسماء میں سے کسی ایک اسم کی یا اس کی صفت میں سے کسی صفت کی ہونی چاہیے مثلاً اللہ تعالی کی قسم میں یوں کہے والذی اصلی لہ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کی میں نماز پڑھتا ہوں یا یوں کہ والذی نفسی بیدہ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔

مسئلہ: اس کے اسماء سے قسم کھانے کی صورت یوں ہے واللہ والرحمن ونحوہ مجھے اللہ کی قسم، مجھے رحمٰن کی قسم وغیرہ وغیرہ۔

مسئلہ: جو شخص غیر اللہ کی قسم کھائے مثلاً کہے والکعبۃ وبیت اللہ ونبی اللہ مجھے کعبہ اور اللہ کے گھر اور نبی علیہ السلام کی قسم یا اپنے باپ کی قسم کھائے وغیرہ وغیرہ تو وہ شرعی قسم نہ ہوگی اور نہ ہی اس سے کفارہ واجب ہے ایسی قسم مکروہ ہے۔

مسئلہ: حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ایسی قسم کھانے والے کے لئے مجھے خوف ہے کہ وہ گنہگار نہ ہو جائے۔

حدیث شریف: جو شخص غیر اللہ کی قسم کھاتا ہے تو وہ اللہ تعالی کے ساتھ دوسرے کو شریک ٹھہراتا ہے۔

شرح: اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص اگر غیر کی قسم کھا کر اس کی تعظیم کا اعتقاد رکھتا ہے تو اس

نے محلوف بہ کو اللہ تعالیٰ کا اس قسم میں شریک ٹھہرالیا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص تھی (نہ کہ مطلقاً مشرک ہوا)۔

مسئلہ: اگر اس کا اس قسم میں تعظیم مقصود نہیں اور نہ ہی محلوف بہ کو معظم بالشان رکھ کر قسم کھاتا ہے تو کوئی حرج نہیں مثلاً سبقت لسانی یا بطریق عادت کے کہتا ہے لاوابی وغیرہ وغیرہ تو مشرک نہیں۔

مسئلہ: علی رازی مرحوم فرماتے ہیں جو شخص قسم کھاتے وقت کہتا ہے بحیاتی وبحیاتک وغیرہ مجھے اپنی تیری زندگی کی قسم ہے وغیرہ وغیرہ تو ایسے شخص کے متعلق مجھے خطرہ ہے کہ وہ کافر نہ ہو جائے۔

مسئلہ: اگر ایسے کلمات عوام کی زبان زد نہ ہوں اور انہیں مسئلہ کا علم ہو تو ایسے قسم کھانے والے کو مشرک کہا جا سکتا تھا اس لئے کہ قسم صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور بس۔

مسئلہ: اسلام سے برأت کی قسم نہ کھائے اگر وہ سچی قسم اس طریق سے کھاتا ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ اسلام کی دولت سے محروم ہو جائے گا اگر جھوٹی قسم اس طریق کی کھائی تو اس کے لئے کفر کا خطرہ ہے۔

حدیث شریف: جو شخص جھوٹی قسم غیر ملۃ الاسلام کی کھاتا ہے تو وہ جیسے کہتا ہے ویسے ہی ہو گا۔

شرح: حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص یوں کہے کہ اس نے اگر یہ کام یونہی کیا تو وہ یہود ہو جائے گا تو جیسے وہ کہہ رہا ہے ویسے ہی وہ کا یعنی وہ کافر ہو جائے گا یہی امام شافعی کا معمول ہے ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کافر نہ ہو گا اس حدیث کو انہوں نے تہدید پر محمول فرمایا ہے۔

مسئلہ: اگر صورت مذکورہ کو ماضی زمانہ سے متعلق کیا مثلاً کہا اگر اس نے یہ فعل کیا ہو تو وہ یہودی ہو حالانکہ وہ فعل اس نے کیا تھا تو اس صورت میں احناف کا اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ وہ شخص کافر نہ ہو گا اگرچہ جانتا ہے کہ یہ صورت قسم کی ہے۔

مسئلہ: ہاں اگر صورت مذکورہ میں اسے معلوم ہے کہ ایسے کلمات کہنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے پھر بھی وہ کلمات استعمال کرتا ہے تو کافر ہو جائیگا کیونکہ کفر پر راضی ہوا یہی حدیث شریف کا صحیح محمل ہے اور اسی پر اکثر کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: فتاوی بزازیہ میں ہے کہ صورت مذکورہ میں فتوی اس پر ہے کہ وہ یمین ہے اس پر کفارہ واجب ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ جو قول ظاہر بلا قصد اور ارادہ زبان پہ جاری ہو جاتا ہے اور اس کا

باطن سے کوئی تعلق نہیں تو اسے اگرچہ شر سے کوئی تعلق نہیں لیکن خیر سے بھی اسے امید نہ رکھنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو زبان سے کچھ اور دل سے کچھ چنانچہ فرمایا:

یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ اسی طرح جو شخص زبان پر جو کچھ چلاتا ہے اس پر اس کا دل بھی شاہد ہے لیکن عمل اس کے خلاف ہو تو اسے بھی اللہ تعالیٰ نے غلط کار کہا ہے چنانچہ فرمایا کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ اگر ایسی بات بولنے والے کا مقصد صرف یہ ہو کہ اتہام سے بری ہو جاؤں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے وسعت رکھی ہے چنانچہ فرمایا لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ اسی طرح ہی مجبوری کے وقت کفریہ کلمات بولنے پر معاف فرماتا ہے چنانچہ فرمایا اِلَّا مَنْ اُکْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا دل بمنزلہ زمین کے ہے اور اعضاء بمنزلہ ان ہتھیاروں کے ہیں جو کھیتی باڑی کے لئے ہوتے ہیں اور اعمال و اقوال بمنزلہ زمین کے ہیں جو شخص ایسے عمل بجالاتا ہے اس کا معمولی طور قلب پر اثر اترتا ہے اگرچہ بقدر مثقال ذرہ کے تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کے اعمال کو ضائع نہیں ہونے دیتا اس لئے کہ وہ قلیل کو کثیر اور صغیر کو عظیم بناتا ہے اگر اس کے اعمال ظاہری سے قلب پر معمولی شر اثر انداز ہوتا ہے تب بھی اپنے لطف و احسان سے اس بندے سے مواخذہ نہیں فرماتا بلکہ حوصلہ فرماتا ہے اس کی توبہ قبول کر کے اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ (کذافی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ، الایلاء بمعنی قسم کھانا ایلا دراصل علی سے مستعمل ہوتا ہے لیکن چونکہ ایسے افعال بعد کے معنی کو متضمن ہوتے ہیں اس لئے ان کا صلہ من آتا ہے اب معنی یوں ہوا کہ ان لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں کو دور رکھتے ہیں قسمیں کھا کر تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ چار ماہ کا انتظار ضروری ہے تَرَبُّصُ مصدر ظرف کی طرف مضاف ہے اس لئے کہ ظرف میں وسعت ہے کہ وہ ظرفیت کے باوجود مفعول بہ کا بھی کام دے چنانچہ کہا جاتا ہے بینهما مسیرة یوم ای مسیرة فی یوم انہیں چاہیے وہ اس مدت تک انتظار کریں کہ نہ رجوع کریں اور نہ طلاق دیں۔

مسئلہ: ایلاء کی صورت یہ ہے کہ مرد عورت سے کہے کہ میں چار ماہ تک تیرے قریب نہیں آؤں گا اسے چار ماہ کی یا زائد کی قید لگائے بہر حال مہینوں کی قید ضروری ہے یا یوں کہے کہ میں تیرے قریب نہ آؤں گا یعنی کسی قسم کی

قید نہ لگائے۔

مسئلہ: ایلاء دو حکم ہیں ۱۔ حکم الحنث ۲۔ حکم البر۔ حکم الحنث میں کفارہ ضروری ہے مدت ایلا میں اگر اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائی تو جزا لازم ہوگی اگر اس قسم کا طلاق وعتاق سے مقید کیا ہو تو نذر معین ہوگی اگر اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائی اگر قسم ثانی سے ہو تو اس میں ایلاء کی مدت گزرنے کے بعد طلاق بائنہ واقع ہوگی۔

مسئلہ: ایلاء کی مدت کم از کم چار ماہ ہے اگر عورت آزاد ہو اگر عورت لونڈی ہو تو دو ماہ گزرنے کے بعد وہ لونڈی بائنہ ہو جائے گی۔

ف: حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اہل جاہلیت کے نزدیک ایلاء بھی طلاق کی ایک قسم ہے حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ اہل جاہلیت کے ہاں عورتوں کو دکھ پہنچانے کا ایک طریقہ یہی ایلاء بھی تھا مثلاً کوئی شخص اپنی عورت کو نہ تو خود اپنے پاس رکھنا چاہتا اور نہ وہ چاہتا کہ کوئی دوسرا اس سے نکاح کرے تو قسم کھاتا کہ وہ اپنی عورت سے ہمیشہ ہمیشہ تک جماع نہ کرے گا اس کے بعد سے چھوڑے رکھتا وہ عورت اس طرح سے نہ غیر شادی شدہ سمجھی جاتی ہے اور نہ ہی شادی شدہ ابتدائے اسلام میں بھی اس پر عمل کرتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کی برکت سے عورتوں سے یہ عظیم ضرور دور فرما دیا اور مرد کے لئے ایلا کی مدت متعین کر دی تا کہ اس مدت کے اندر وہ سوچ بچار کر سکے اس کے بعد چاہے تو اپنی عورت کو پاس رکھے اور چاہے اسے طلاق دے۔

فَاِنْ فَآءُوْ پس اگر وہ جماع کریں اس سے جوانہوں نے قسم کھائی ترک جماع کی تو فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس رجوع کا گناہ بخش دیتا ہے یہ بھی توبہ کی طرح ہے کہ اس کے خلاف عمل کرنا گناہ ہے اس لئے کہ ایلاء سے عورت کو ضرر پھر جب اس سے رجوع کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ دراصل کسی شئے کا دل سے ارادہ کر کے اسے کر گزرنے کو کہتے ہیں اب معنی یہ ہوا کہ جب وہ طلاق دینے پر تل جائیں اور پختہ ارادہ کر لیں کہ اس مدت کے اندر اپنی عورت سے ہرگز ہرگز جماع نہ کریں یہاں تک کہ مدت گزر جائے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ بے شک اللہ ان کی طلاق کو سنتا اور ان کی غرض کو جانتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ دونوں آیتوں کی تحقیق میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندے کو یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کا حق ضائع نہیں کرتا جب عورت کی زبان بولنے سے کوتاہ ہو جائے کہ

وہ اپنے مرد کی قید میں آجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے امور کا متولی ہو جاتا ہے زوج کو چاہیے کہ یا تو اس سے گزارہ اچھا کرے یا طلاق دے دے یہاں تک کہ مرد اگر عورت سے اچھا گزارہ کرے تو فبہا ورنہ اس کی وجہ سے مرد کو سخت گرفت ہوگی اس لئے کہ سالک کو ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کے حقوق کی رعایت میں اہتمام کرے۔

نکتہ: چار ماہ کی قید میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ کہ جنین یعنی پیٹ میں نطفے کے ٹھہرنے کے بعد بچے کا روح سے تعلق چار ماہ کے بعد ہوتا ہے چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ان احدکم یجمع خلقه فی بطنی امه اربعین یوم بے شک نطفہ ماں کے پیٹ کے اندر چالیس دن میں جمع کیا جاتا ہے۔

شرح: یہاں یجمع بمعنی یحزر و یقر ہے یعنی تمہاری پیدائش کے مادہ کو اکٹھا کرتا اور ایک جگہ جمع فرماتا ہے فی بطن امه ای فی رحمها یہاں پیٹ بول کر رحم مراد لی گئی ہے جیسے عام طور عرب کا دستور ہے کہ کل بول کر جز مراد لیتے ہیں۔

ف: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللّٰه تعالی عنه فرماتے ہیں کہ جب نطفہ رحم میں قرار پکڑتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ اس سے بچہ پیدا کرے تو نطفہ کے پہنچتے ہی وہ عورت کے جسم کے ذرہ ذرہ کے اندر پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ ناخنوں اور بال بال کے نیچے تک پھیل جاتا ہے اس حالت میں چالیس دن گزار دیتا ہے پھر وہ خون بن کر رحم میں اترتا ہے یہی مطلب ہے جمع کرنے کا جو کہ حدیث شریف میں واقع ہوا۔ پھر خون کا لوتھڑا ہو جاتا ہے جسے قرآن نے علقہ سے تعبیر کیا ہے اور وہ اس حالت میں بھی چالیس دن گذارتا ہے اس کے بعد وہ گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے اتنا قدر کہ اسے دانتوں میں دے کر چبایا جا سکے جسے قرآن میں "مضغه" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ روح پھونکنے کے لئے ایک فرشتہ بھیجتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ صورت کشی یعنی نفخ روح تیسرے اربعین (چلہ) کے بعد ہوتا ہے اس وقت فرشتے کو چار کلمات لکھنے کا حکم ہوتا ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں ویومر باربع کلمات کلمات یعنی فرشتے کو ان چار چیزوں کے لکھنے کا حکم ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پہلے مقدر فرمایا ہے اس کا عطف قولہ تکون علقه پر ہوگا جو حدیث شریف میں واقع ہے اس لئے کہ ان چار کلمات کی کتابت دوسرے چلہ میں ہوتی ہے ویکتبه رزقه اور اسے بصیغہ مجہول بھی پڑھا گیا ہے اور بصیغہ

معلوم بھی یعنی اس کا رزق لکھتا جاتا ہے اور اس کا اجل بھی اور اجل کا اطلاق انسان کی تمام زندگی پر آتا ہے اور یہی مراد ہے ویسے انسان کی آخری زندگی کو بھی اجل کہا جاتا ہے اس استعمال سے اللہ تعالیٰ کا قول اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ اس کے بعد عمل لکھا جاتا ہے کہ یہ بد بخت ہے کہ اس کی عادت اہل نار کی ہوگی یا لکھا جاتا ہے کہ وہ سعید نیک بخت ہوگا یعنی کہ اس کی فطرت اہل جنت کی ہوگی۔

ف: بد بخت کو نیک بخت سے اس لئے مقدم کیا گیا کہ اکثریت بدبختوں کی ہے۔ (کذا قال القاضی)

ف: کتابت سے مراد یہ ہے کہ ان امور کو فرشتہ کے سامنے ظاہر کیا گیا ورنہ تقدیر ربانی کا لکھا جانا تو اس سے مدت پہلے ہے اس مختصر تمہید کے بعد جاننا چاہیے کہ جس سالک سے اثناء سلوک میں کوئی ایسی خرابی واقع ہو جو اسے نقصان دہ ہے یعنی اس سے نفس کو ملال ہو اور طبع کو نفرت تو شیخ یا سالک کے ساتھیوں پر واجب ہے کہ اس سے جدائی اختیار نہ کریں بلکہ اس کی بہتری کے لئے اسے مدد دیں تا کہ وہ اپنے حقیقی امور میں نفع یاب ہو سکے اور اس کے رجوع کے لئے چار ماہ کا انتظار کریں اگر وہ شخص طلب صدق اور رعایت حق صحبت کی طرف رجوع کرلے اور اس غلطی سے استغفار کرے جو اس سے سرزد ہوئی ہے پھر چابک دستی سے اپنے ارادوں میں دوبارہ کام کرے تو یہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے درگزر کریں اس لئے کہ یہ ایسی چراگاہ ہے کہ جسے صرف کمزور لوگ ہی حاصل کر سکتے ہیں اور ایسا چشمہ ہے کہ جس پر یہ لوگ اترتے ہیں جو نہایت ہی غافل قسم کے ہیں اور یہ وہ دروازہ ہے جسے وہ کھٹکا سکتے ہیں اور اس در پر ٹھہرے رہتے ہیں بلکہ یہ ایسی شراب ہے جس کا مزہ صرف عارفین کو نصیب ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا غنا ہے جسے صرف عشاق ہی سنتے ہیں اگر یہ لوگ چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد کی منکوحہ کو طلاق دے دیں اور پھر جدائی کے گناہ پر اصرار کریں تو پھر انہیں حق کی رسی کو تھامنا پڑے گا اللہ تعالیٰ ان کی گفتگو کو سنتا اور ان کے حال کو جانتا ہے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا:۔

نہ درمیان ما را وفا و عہد بود	جفا کردی و بد عہدی نمودی
ہنوز گر سر صلحت باز آئی	کزاں محبوب تر باشی کہ بودی

(ترجمہ: ہمارے درمیان وفا کا معاہدہ تھا لیکن تو نے خلاف عہد کر کے ہم پر ظلم کیا اگر اب تمہیں صلح کا خیال ہے تو ہم حاضر

ہیں صلح کے بعد تم پہلے کی طرح محبوب بلکہ اس سے بھی محبوب تر ہو گے)

حکایت: اپنے وقت کے شیخ حضرت ابو عبد اللہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا وہ فرما رہے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ کے ملنے کی راہ جانتا اور اس پر چلتا ہوا واپس لوٹتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ ایک ایسے عذاب میں مبتلا کرے گا کہ کسی کو عالمین میں ایسا عذاب نہیں دیا ہو گا۔

(کذافی الواقح الانوار القد سیہ فی مناقب العلماء و الصوفیاء)

تفسیر عالمانہ

وَالْمُطَلَّقٰتُ ان سے وہ آزاد عورتیں مراد ہیں جو مدخول بہا ہیں اور جنہیں حیض آتا ہے ورنہ غیر مدخولہ عورتوں کی کوئی عدت نہیں ہوتی اور وہ عورتیں جنہیں صغر سنی یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہیں آتا ان کی عدت تو مہینوں کی گنتی پر ہوتی ہے اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔

مسئلہ: لونڈیوں کی عدت دو قرو دو ماہ۔

حل لغات: تطلیق لغت میں قید ہٹانے کو کہا جاتا ہے یعنی وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کی رسیوں سے آزاد کی گئی ہیں یَتَرَبَّصْنَ یعنی چاہئے کہ وہ عورتیں انتظار کریں۔ بِاَنْفُسِهِنَّ یہ با تعدیہ کی ہے یعنی اپنے نفسوں کو برانگیختہ کریں انتظار پر یا یہ کہ وہ اپنے آپ کو انتظار کرنے والی بنائیں ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کی جمع ہے کلام عرب میں واضداد میں سے ہے کبھی طہر کے لئے اور کبھی حیض کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور مشہور یہی ہے کہ یہ دونوں معنی اس کے لئے حقیقت ہیں جیسے شفق کی سرخی اور سپیدی دونوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے سیدنا ابو حنیفہ اور آپ کے متبعین کا مذہب ہے کہ یہاں پر قرء بمعنی حیض ہے اس لئے کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے عورت کی عدت کو فروء کی بجائے مہینوں کو عدت قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ پھر جب کہ اس عورت سے حیض کی حیثیت مرتفع ہوئی تو اس کی اصلی حالت لوٹی اس سے ثابت ہوا کہ قروء بمعنی حیض ہے۔

مسئلہ: حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ سے استدلال کیا ہے کہ قرء بمعنی طہر ہے اس لئے کہ لِعِدَّتِهِنَّ کی لام وقت کے لئے ہے اور عدت کا وقت صرف طہر ہی ہو سکتا ہے اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کا حکم فرمایا اور طلاق حیض میں ممنوع ہوتی ہے احناف کا جواب اس کے متعلق یہ ہے کہ فَطَلِّقُوْهُنَّ

بعدتھن معنی ہے فطلقوھن مستقلا لعدتھن یعنی ان عورتوں کوطلاق دو درآں حالیکہ وہ عورتیں اپنی عدت کے وقت کی طرف متوجہ ہونے والی ہوں اوران کی عدت یہی تین حیض ہیں اب مطلب یہ ہوا کہ انہیں طلاق واقع ہوگی تو وہ اپنی عدت کی طرف رجوع کریں گی اور عدت کی گنتی میں شروع ہو جائیں گی آیت کا معنی یہ نہیں کہ انہیں طلاق عدت میں واقع ہوا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت مطلقہ کی عدت تھوڑی ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ کے نزدیک بہت بڑی ہے یہاں تک کہ جس نے اپنی عورت کوطہر میں طلاق دی تو عورت کی عدت وہی طہر اور باقی دوطہر ہوگی اگرچہ طلاق والے طہر کے بعد فوراً ہی اس عورت کو حیض شروع ہو جائے اور جب تیسرا حیض شروع ہوگا تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی اور حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ کے نزدیک جب تک کہ وہ تیسرے حیض سے فارغ نہ ہولے اس کی عدت ختم نہیں ہوگی اگر اسے طہر کی حالت میں طلاق دی گئی ہے اور اگر اسے حیض کی حالت میں طلاق دی گئی ہے تو اسے چوتھے حیض کو ختم کرنا ضروری ہے تب اس کی عدت ختم ہوگی۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ اوران کے لئے حلال نہیں کہ وہ چھپائیں مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ جو اللہ تعالی نے ان کی رحموں میں پیدا فرمایا یعنی حمل یا حیض کو چھپالیں مثلاً یوں کہ میں حاملہ یا حائضہ نہیں ہوں حالانکہ وہ حائضہ ہوتا کہ زوج کا حق باطل ہو اولاد سے یا اسے رجعت کا حق نہ ملے یہ اس وقت ہے جب کہ عورت چاہے کہ وہ جلدی اپنے شوہر سے گلوخلاص کرے اس لئے کہ وہ حمل کو چھپاتی ہے تاکہ طلاق کے بعد اسے وضع حمل کا انتظار نہ کرنا پڑے اور بسا اوقات ایسے خوف سے حمل گر بھی جاتے ہیں یا حمل اس لئے چھپاتی ہیں تاکہ اس کا شوہر اپنے بچہ کی لالچ میں شفقت پر رجوع کرلے اس طرح سے عورت کی تمنا پوری نہ ہو یا حیض کو اس لئے چھپاتی ہے تاکہ اسے دوسری طلاق جلد حاصل ہو اس لئے کہ طلاق السنۃ کا قاعدہ ہے کہ وہ طہر میں واقع ہوگی ہے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اسے معاملات میں عورت کا قول معتبر ہے اثبات ہو یا نفی۔

اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اگر وہ اللہ تعالی اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں یعنی عورتیں مذکورہ بالا غلطی کا ارتکاب نہیں کرسکتیں اس لئے کہ جب وہ اللہ تعالی اور یوم آخرت پر ایمان لا چکی ہیں تو ان سے ایسے امور کا صدور اس کے منافی ہے۔

مسئلہ: اس میں عورتوں کے لئے سخت وعید ہے۔

مسئلہ: یہ حکم عام ہے خواہ وہ عورت مومنہ ہو یا کافرہ ایمان کی قید اتفاقی ہے۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ بعول۔ بعل۔ کی جمع ہے اور بعلۃ عورت کو کہتے ہیں دراصل بعل سردار اور مالک کو کہا جاتا ہے مرد کو اس لئے بعل کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی عورت کے معاملات میں خود کفیل ہوتا ہے گویا کہ وہ اپنی عورت کا مالک اور مرب ہے اور البعولته میں تا تانیث الجمع کی ہے اس لئے کہ جمع بمعنی الجماعة مونث کے حکم میں ہے اور تاء تانیث کی تاکید کی وجہ سے ہے۔

مسئلہ: طلاق کے بعد بھی زوج کو بعل کہا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعد طلاق بھی مرد کا نکاح باقی ہے اور اس کے لئے حلت ثابت ہے۔

ف: هن کی ضمیر مطلقات کے افراد کے لئے ہے اس لئے کہ هن عام ہے جو جمیع مطلقات کو شامل ہے خواہ وہ طلاق رجعی ہو یا بائنہ۔ لیکن بائنہ طلاق میں شوہر کا کوئی حق نہیں ہوتا نہ نکاح میں نہ رجعت میں۔

اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ وہ شوہر زیادہ حقدار ہیں نکاح اور ان کی طرف رجوع کرنے کے متعلق فِیْ ذٰلِكَ یعنی انتظار کے زمانہ میں اس لئے کہ شوہر کو رجعت کا حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک کہ عورت عدت میں ہو جب عدت ختم ہو جائے تو رد اور رجعت ختم یہاں پر احق افعل التفضیل بمعنی اسم فاعل ہے اب معنی یہ ہے کہ مرد اپنی عورت کے رد اور رجعت کے حقدار ہیں اس لئے کہ یہاں پر افعل التفضیل کا معنی نہیں ہو سکتا کیونکہ عورتوں پر مردوں کے سوا اور کسی کا حق نہیں۔

مسئلہ: طلاق وغیرہ میں صرف مردوں کا حق ہے۔ عورتوں کو اس میں انکار یا اقرار کی کوئی گنجائش نہیں اگر مرد طلاق دے کر رجوع کرنا چاہے تو عورت کا انکار غیر معتبر ہے اِنْ اَرَادُوْٓا اگر مرد رجوع کرنا چاہیں اِصْلَاحًا آپس میں اصلاح اور احسان و مروت نہ کہ عورتوں کو نقصان دینے کا جیسے دور جاہلیت میں کرتے تھے۔

شان نزول: زمانہ جاہلیت میں عادت تھی کہ جب کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دیتا جب عورت کی عدت قریب الاختتام ہوتی تو وہ عورت سے رجوع کر لیتا پھر اسے طلاق دے دیتا پھر رجوع کر لیتا اس طرح سے اس کی عدت لمبی ہو جاتی اور اس کا مقصد بھی یہی ہوتا کہ کسی طرح عورت کی عدت طویل ہوتا کہ اسے ضرر پہنچے۔

مسئلہ: عورت مطلقہ رجعی کے رجوع کو حرف شرط سے ذکر کرنا ضروری نہیں کہ رجوع صرف اصلاح نیت سے ہوسکتا ہے بلکہ ضرر دینے کی نیت سے اگر رجوع کرے تو وہ بھی جائز ہے اسے اصلاح سے مشروط کرنے میں اصلاح کی ترغیب اور ضرر دینے سے زجر و توبیخ مطلوب ہے۔

ربط: جب اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عورتوں کو طلاق دینے کے بعد رجوع کرنے سے مقصود صرف اصلاح ہو نہ کہ عورتوں کو ضرر دینا اب بتانا چاہتے ہیں کہ مرد و عورت کے ایک دوسرے پر حقوق کیا ہیں چنانچہ فرمایا وَلَهُنَّ اور ان مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں مِثْلُ الَّذِىْ جیسے ان کے لئے عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ عورتوں پر حقوق ہیں ساتھ نیکی کے بالمعروف اور لَهُنَّ کا ایک ہی متعلق ہے یعنی استقرار دراصل عبارت یوں تھی استقر لھن بالمعروف حقوق الزوجین میں وہ حقوق داخل ہیں جسے شرع نے انکار نہیں کیا لوگوں کے عادات بھی اس میں شامل ہیں عورتوں کو ایسی باتوں کا مکلف نہ بنایا جائے جنہیں ان کا ضرر اور مردوں کا فائدہ ہو۔

مسئلہ: زوجین کو ایک دوسرے سے نفرت نہ ہونی چاہیے اور دونوں حقوق کے درمیان وجہ مماثلت صرف وجود واستحقاق المطالبہ ہے نہ اتحاد فی جنس الحقوق مثلاً عورت پر مرد کا حق ہے کہ زوج سے حق مہر وصول کرے اور اس سے نفقہ اور مسکن حاصل کرے لیکن مرد عورت سے یہ امور حاصل نہیں کر سکتا جنس حقوق میں مرد اور عورت برابر ہیں۔

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اور مردوں کا عورتوں پر درجہ ہے یعنی مرد کا عورت پر زیادہ حق ہے اور اسے عورت پر فضیلت ہے اور مرد کی عورت پر فضیلت عقل اور دین اور ان امور جو ان سے متفرع ہو سکتے ہیں کی وجہ سے ہے اور اس میں کسی قسم کا شک بھی نہیں اور وہ فضیلت جو اس مقام کے مناسب اس کے دو وجوہ ہیں ا۔ مرد مستحق ہے اس بات کا کہ وہ عورت سے افضل ہے اور اس سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے جو عورت کا اس پر حق ہے اس لئے کہ وہ مرد اپنی عورت کا مالک ہے اور اس کے نفس پر حق رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ عورت نفلی روزے نہیں رکھ سکتی جب تک کہ مرد کی اجازت نہ ہو اور نہ ہی مرد کے گھر سے مرد کی اجازت کے بغیر نکل سکتی ہے اور مرد عورت کی طلاق پر قدرت رکھتا ہے اور جب طلاق دے دے تو اس کے رجوع پر قادر ہے عورت چاہے نہ چاہے عورت ان جملہ امور میں کسی ایک امر کی بھی مالک نہیں اس کا حق مرد پر اتنا ہے کہ وہ اس سے حق مہر وصول کرے اور نان ونفقہ

اور مسکن حاصل کرے اور مرد اس کے ضرر کے در پے بھی نہ ہو ۲۔ یہ وہ حق ہے جو زجاج نے فرمایا جیسے مرد کو نکاح سے عورت سے لذت حاصل ہوتی ہے اسی طرح عورت کو بھی لذات نصیب ہوتی ہیں عورت کے لئے نفقہ مرد پر ضروری ہے اور اس کے جملہ امور کا انتظام بھی یہ فضیلت اس وجہ سے ہے کہ مرد نے اپنی عورت کے حقوق اپنے ذمہ لگائے ہیں اور یہ رحمت اور احسان کا موجب ہے جیسے حق مہر کی ادائیگی اور نفقہ اور گھر میں ٹھہرانا اور عورت سے تکالیف دور رکھنا اور اس کی ضروریات پوری کرنا اور جمیع آفات سے حفاظت کرنا۔

حدیث شریف: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے اس لئے کہ اللہ تعالی نے مرد کے عورت پر بڑے حقوق مقرر فرمائے ہیں اللہ تعالی فرماتا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ اس سے معلوم ہوا کہ عورت پر مرد کے حقوق زائد ہیں۔

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ اور اللہ تعالی قدرت رکھتا ہے اس پر کہ جو بھی اس کے احکام کی مخالفت کرے اس سے بدلہ لے حکیم ایسا حکیم ہے کہ اس کی شریعت کئی اسرار و رموز اور حکمتوں اور مصلحتوں کی حاوی ہے۔

زوجیت کے مقاصد نامکمل رہتے ہیں جب تک کہ ہر دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت نہ کریں اور ہر دونوں کا خیال رہے کہ ہم نے دوسرے کے احوال کی اصلاح کرنی ہے۔ مثلاً ۱۔ طلب النسل ۲۔ تربیت اولاد ۳۔ ہر دونوں کے معاشرہ کی اصلاح کا خیال ۴۔ گھر کی حفاظت ۵۔ گھر کی چیزوں کی اچھی تدبیر بنانا ۶۔ ایک دوسرے کے معاملات میں سیاسی طور پر معاملہ کا سلجھانا اسی طرح وہ جملہ امور جو شرعاً مستحسن اور عادت کے موافق ہیں۔

حدیث شریف: جهاد المراة حسن التبعل یعنی عورت کا جہاد یہ ہے کہ وہ اپنے مرد کے حقوق میں شاطر و چالاک ہر عربی کا مقولہ ہے امرلۃ حسنۃ التبعل یہ اس وقت بولتے ہیں جبکہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ گزارنے میں بہتر کارکردگی میں مشہور اور گھریلو امر سنوارنے میں بے مثل ہو۔

مسئلہ: مرد کے عورت پر حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے مرد کے سامنے زیب و زینت کے ساتھ پیش ہو۔

حکایت: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا میں اس لئے زیب وزینت سے رہتا ہوں کہ میری عورت میرے لئے زیب وزینت کے ساتھ رہتی ہے اور یہ بھی حکم ربانی ہے چنانچہ فرمایا۔ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف.

حکایت: ایک شخص نے کہا میرے گھر میں کبھی شر اور فساد داخل نہیں ہوا ایک دانا نے فرمایا تو یہ عورت تیرے گھر میں کیسے داخل ہوئی یعنی عورت بھی شر ہے تو پھر تو کیوں کہتا ہے کہ میرے گھر میں شر داخل نہیں ہوا۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالی نے فرمایا

دلارام باشد زن نیک خواہ ولے از زن بد خدایا پناہ

(ترجمہ: خدا کرے عورت محبوب اور خیر خواہ ہو ورنہ بری عورت سے پناہ بخدا)

کسی دوسرے شاعر نے کہا۔

عصمت زن را بمقام جمال جلوہ حرامست مگر با حلال

(ترجمہ: حسن وجمال کے ساتھ عورت کو عصمت ضروری ہے ایسی عورت کو حلال امر کے ساتھ دوسروں کے سامنے مکر کا جلوہ حرام ہے)

حکایت: بنی اسرائیل میں ایک نیک مرد تھا اس کی عورت تھی اس کے ساتھ اس کی بڑی محبت تھی اللہ تعالی نے اس نیک کے ہاں پیغام بھیجا کہ تیرے لئے میں نے تین خصوصی دعائیں قبول کر لی ہیں مانگ لے جو تیری مرضی ہو اس نے اپنی عورت سے کہا میری ضروریات تو بہت ہیں اور اللہ تعالی نے صرف تین دعائیں قبول کرنے کا فرمایا ہے اب میں کیا کروں عورت نے کہا دعائیں مانگ لے دو اپنے لئے اور ایک میرے لئے اس نے کہا تیرے لئے کیا حاجت مانگوں عورت نے کہا میرے لئے یہ مانگئے کہ میں حسین وجمیل ہو جاؤں کہ میرے جیسی اور کوئی دنیا میں حسین وجمیل نہ ہو اس نے پہلے یہی دعا مانگی چنانچہ وہ عورت ایسی حسین وجمیل ہوگئی کہ اس کے حسن وجمال سے گھر روشن ہو گیا اس حیثیت کو دیکھ کر عورت گھر سے باہر جانے لگی مرد نے پوچھا یہ کیا اس نے کہا اب میں تیرے لائق نہیں رہی اب تو میں کسی بادشاہ کے یہاں گزاروں گی کیونکہ میں اپنے اس حسن وجمال

کو تیرے جیسے کے ہاں رہ کر ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ مرد نے اسے سختی سے روک لیا بادشاہ کو اس عورت کے حسن و جمال کا شہر پہنچا تو اس نے اپنے نوکروں وغیرہ کو بھیج کر اس عورت کو اس مرد سے جبراً پکڑ لیا کہا یا اللہ اب میری باقی دو دعائیں ایک تو یہ اس عورت کو بندریہ بنادے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو بندریا بنا دیا بادشاہ نے اسے واپس اس مرد کے ہاں بھیج دیا جب وہ عورت اس حال میں اپنے شوہر کے پاس پہنچی تو مرد نے کہا اے اللہ اسے ویسے ہی بنادے جیسے پہلی تھی اس مرد کی وہی تین مستجاب دعائیں ویسے ہی ضائع گئیں نہ تو اس مرد کو ان سے کوئی فائدہ ہوا اور نہ ہی اس کی عورت کو۔

مسئلہ: مطلقہ عورتوں کو حکم ہے کہ عدت گزاردیں اس میں اشارہ ہے کہ اس عدت سے صحبت کا حق ادا کریں اگرچہ یہ جدائی (طلاق) مرد سے واقع ہوئی ہے لیکن عورت کے لئے ضروری ہے کہ اسی مقام پر رہ کر عدت کے ایام گزارے تاکہ صحبت کا حق پورے طور پر ادا ہو سکے۔

تفسیر صوفیانہ اس سے اہل حق کو معلوم ہوا کہ عبودیت پر ربوبیت کے حقوق کیسے ہیں اللہ تعالیٰ ہر طرح سے اپنے بندے پر فضل و کرم سے مہلت ہی مہلت عطا فرماتا ہے اور اس پر قسم قسم کے انعامات کرتا ہے اگرچہ بندے کی طرف سے نالائقی وار غلط کاری کا صدور ہوتا ہے لیکن وہ کریم اپنے فضل و احسان کو ترک نہیں فرماتا اور اسے مہلت دے کر ثابت فرماتا ہے کہ تو جفا کئے جا اور ہم وفا کئے جائیں گے اپنی وفا واحسان کی وجہ سے جلد تر بندے کی گرفت نہیں کرتا تاکہ وہ مہلت لے کر اس مدت کیا اندر اپنی غفلت سے بیدار ہو اور اپنے دل میں ندامت کر کے محبت حق کی طرف متوجہ ہو اس سے فرقت کی محنت میں اس لئے مبتلا کیا ہے تاکہ وہ کسی وقت نادم ہو کر راجع الی اللہ اور اصل مقصود سے بہرہ ور ہو گویا اسے اس ابتلاء میں کہا گیا ہے اے دروازہ کھٹکھٹانے والے پہلے تو اپنے حضور میں حاضر ہو کر ہم سے اپنی کامیابی کی دعا مانگ اسی طرح تجھے ہماری بارگاہ کی حاضری نصیب ہوگی۔

الطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

یہ طلاق دو بار تک ہے پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمہیں روا نہیں کہ جو کچھ عورتوں کو دیا

شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

اس میں سے کچھ واپس لو مگر جب دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدیں قائم نہ کریں گے پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں ٹھیک انہی حدوں پر نہ رہیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں

فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ

اس میں جو بدلہ دے کر چھٹی لے عورت سے یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو وہی

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا

لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے پھر وہ دوسرا اگر اسے طلاق دیدے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا

تو ان دونوں میں کچھ گناہ نہیں کہ پھر آپس میں مل جائیں اگر سمجھتے ہوں کہ اللہ کی حدیں نباہیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں بیان کرتا ہے

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ

دانش مندوں کے لئے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی میعاد آ لگے تو اس وقت تک یا بھلائی کے ساتھ روک لو یا

سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ

نیکی کے ساتھ چھوڑ دو اور انہیں ضرر دینے کے لئے روکنا نہ ہو کہ حد سے بڑھو اور جو ایسا کرے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے

وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ

اور اللہ کی آیتوں کو ٹھٹھا نہ بنالو اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور جو تم پر کتاب

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

اور حکمت اتاری تمہیں نصیحت دینے کو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے

۲۸ ع ۷ ۱۲

تفسیر عالمانہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ یعنی وہ طلاق رجعی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ یعنی دو دفعہ اس لئے کہ یہ متفرق طور پر ہوگا کیونکہ جو شخص کسی کو دو درہم دیتا ہے اس کے لئے جائز نہیں کہ کہا جائے اس نے دو بار دیا ہے یہاں تک کہ وہ اسے دو درہم دے تب مرتان (دو دفعہ) کا محاورہ صادق آئے گا

مسئلہ: حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک دو یا تین یکبارگی طلاق واقع کرنا حرام ہے انہیں سنی الوقوع تو کہا جا سکتا ہے لیکن سنی الایقاع نہ کہا جائے گا۔

مسئلہ: مرد کو دو طلاق دینے کے بعد رجوع کا حق حاصل ہوتا ہے (اگرچہ تجدید نکاح کی ضرورت ہے) لیکن جب وہ دو طلاق کے بعد تیسری طلاق دے گا تو اب سے رجعت کا حق نہ ہوگا اور نہ ہی یہ عورت اس کے لئے حلال ہو سکتی ہے جب تک کہ حلالہ نہ ہو۔

ف: اگرچہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ جملہ خبریہ ہے لیکن معنی امر ہے یعنی یہ جملہ انشائیہ ہے اس لئے کہ اگر اسے اپنے ظاہر پر باقی رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم میں خلاف امر واقع ہوتا ہے اس لئے کہ کبھی ایقاع الطلاق علی وجہ الجمع بھی ہوتا ہے اس طور سے اللہ تعالیٰ کی خبر میں خلاف واقع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہر خبر خلاف لینے کذب سے منزہ ہوتی ہے گویا اس جملہ سے امر مراد ہے گو در اصل عبارت یوں ہے۔ فطلقوھن مرتین ای دفعتین فامساک ان دو طلاقوں کے بعد حکم ہے انہیں بند رکھنا بِمَعْرُوْفٍ ساتھ نیکی کے وہ یہ کہ عورت کو طلاق کے بعد اس سے رجوع کرلے لیکن ضرر کا ارادہ نہ ہو بلکہ اصلاح اور حسن معاشرہ کے ارادہ پر اَوْ تَسْرِيْحٌ یا چھوڑ دینا بِاِحْسَانٍ ساتھ احسان کے بایں طور کہ رجوع کا معاملہ ترک کردے عدت کے ختم ہونے پر اور احسان فی التسریح کا مطلب یہ ہے کہ اس چھوڑ دینے کے بعد اس کے حقوق مالیہ پورے ادا کرے اور طلاق کے بعد اس کا برائی سے ذکر نہ کرے اور نہ ہی لوگوں کو اس سے نفرت دلائے۔

مسئلہ: تمام حکم اس باب میں یہ ہے کہ جب آزاد مرد اپنی عورت کو بعد دخول ایک یا دو طلاقیں دیں مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی عورت کی رضا کے بغیر ہی رجوع کرلے لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ وہ عورت اپنی عدت میں ہو۔

مسئلہ: اگر اس کے ساتھ اس کی عدت میں رجوع نہیں کرسکا یہاں تک کہ اس کی عدت ختم ہوگئی اس کو قبل دخول طلاق دے دی یا عورت سے خلع کر لے تو اس کے ساتھ تجدید نکاح ضروری ہے اور وہ بھی عورت کی اجازت پر موقوف ہے یا اس کا ولی اجازت دے۔

مسئلہ: اگر اسے تین طلاقیں دی ہیں تو اس عورت سے نکاح جائز نہیں جب تک کہ حلالہ نہ ہو یعنی وہ عورت عدت گزارے عدت گزارنے کے بعد کسی مرد سے نکاح کرے پھر وہ اپنی مرضی سے طلاق دے پھر اس کی عدت گزرے پھر عورت کی مرضی سے نکاح لے۔

مسئلہ: غلام کے نکاح میں لونڈی ہو تو اسے دو طلاق دینے سے حلالہ ضروری ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: طلاق کی گنتی میں مرد کا اعتبار ہے امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ کے نزدیک یہی وجہ ہے کہ عبد حرہ عورت سے نکاح کرے تو اس پر تین طلاقیں واقع ہونگی اگر آزاد مرد لونڈی سے نکاح کرے تو اس پر دو طلاقیں واقع ہوگی۔ وَلَا يَحِلُّ

شان نزول: مروی ہے کہ جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی سلول اپنے شوہر ثابت بن قیس سے محبت کرتی تھی حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی میرے اور میرے شوہر کی نہیں بن رہی اس کا سر میرے سر کے موافق نہیں یعنی آپس میں طبعی موافقت نہیں اور یہ بھی ہے کہ نہ مجھے اس کے دینی معاملہ میں اعتراض ہے اور نہ ہی کسی عادت سے اس کے ساتھ بغض ہے لیکن مجھے اس کے ساتھ ایسا بغض ہوا کہ اب مجھے ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے کسی وقت کفر میں مبتلا نہ ہو جاؤں واقعہ یوں ہوا کہ میں عدت گزار رہی تھی تو ایک دفعہ میں نے اپنے خیمہ سے اسے دیکھا تو اس کی صورت بہت سیاہ اور قبیح نظر آئی اور قد و قامت میں بہت چھوٹا اور شکل میں قبیح ترین نظر آیا اس پر آیت نازل ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وہ مرد سے نہیں گزار سکتی تو اسے چاہئے کہ اپنے شوہر کو کچھ مال دے کر طلاق حاصل کر لے یعنی خلع کر لے چنانچہ اس کے بعد جمیلہ نے اپنا وہ باغ جو اسے حق مہر ملا تھا ثابت بن قیس کو واپس لوٹا دیا اور یہ بھی اس وقت جب کہ ثابت بن قیس نے جمیلہ سے ایسی باتیں سنی تو حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جمیلہ کو فرمائیں مجھے وہ باغ واپس لوٹا دے جو میں نے حق مہر میں دیا ہے اسے میں طلاق دیدوں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے جمیلہ کو کہا کیا خیال ہے۔ جمیلہ نے عرض

کی یارسول اللہ ﷺ مجھے منظور ہے بلکہ میں تو اس سے اور بھی کچھ زائد دینے کے لئے تیار ہوں آپ نے فرمایا صرف پانچ باغ کافی ہیں زائد کی ضرورت نہیں آپ نے ثابت بن قیس کو فرمایا باغ لے کر طلاق دے دے اس نے جمیلہ کو باغ لے کر طلاق دے دی۔

ف: اسلام میں یہ پہلا خلع ہے

ف: لَکُمْ کا خطاب جیسے عوام کو ہے ایسے ہی حکام کو بھی تاکہ اللہ تعالیٰ کے قول فَاِنْ خِفْتُمْ کے مطابق اس لئے کہ یہاں پر عوام کی طرح حکام بھی مراد ہیں۔

سوال: حکام کو داخل کرنے کا کیا معنی کہ وہ مال لینے والے اور نہ دینے والے۔

جواب: چونکہ وہ دینے اور لینے کا حکم نافذ کرتے ہیں جب کہ ان کے پاس فیصلہ جات جاتے ہیں گویا اب وہی دینے اور لینے والے ہیں اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ یعنی ان عورتوں سے لے لو طلاق کے مقابلہ میں وہ مال جو تم نے انہیں حق مہر میں دیا ہے شَیْئًا معمولی سی چیز مراد ہے چہ جائیکہ بہت بڑا مال دیا ہو اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ مگر یہ کہ زن وشوہر خوف کریں اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ یہ کہ حقوق زوجیت کی رعایت نہیں کرسکیں گے۔ اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ استثنا مفرغ ہے۔ان یخافا محلاً منصوب اور مفعول ہے اسی وجہ سے یہ عام محذوف سے مستثنیٰ ہے عبارت یوں تھی۔ **ولا یحل لکم ان تاخزو السبب من الاسباب شیا الا بسبب خوف عدم اقامته حدو داللّٰه** پس اگر تمہیں خوف ہوا اے حاکمو اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ یہ کہ وہ حدود اللہ کی پابندی نہیں کریں گے یعنی وہ حقوق جو نکاح کی وجہ سے ان پر مقرر ہوئے ہیں۔یہ قرآن اور طرز روشن سے معلوم ہو جاتا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ پس ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ عورت اپنے مرد کو کچھ دے کر اپنی گلوخلاصی کرالے یعنی جو کچھ عورت اپنے مرد کو خلع کا بدل دیتی ہے نہ ہی مرد کو گناہ ہے کہ وہ اپنی عورت کا مال لے کر اسے طلاق دیتا ہے اور نہ ہی عورت کو مال دے کر طلاق لینا گناہ ہے یہ اس وقت ہے جب کہ عورت کی طرف سے زیادتی ہو کہ وہ مال دے کر طلاق لے اس لئے کہ عورت کو منع کیا گیا ہے کہ وہ بلاوجہ مال ضائع نہ کرے۔

مسئلہ: اگر زیادتی مرد کی طرف سے ہو تو جائز نہیں کہ وہ عورت سے مال لے کر طلاق دے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا

مسئلہ: مرد کے لئے چاہئے کہ اس کے ساتھ ایسے امور نہ برتے کہ جس سے وہ عورت طلاق لینے پر مجبور ہو جائے اور کچھ مال دے کر طلاق لے کیونکہ اس طرح سے مرد کو روکا گیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء میں فرمایا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ یعنی انہیں تنگ نہ کرو تاکہ جو کچھ تم نے انہیں دیا اس کا بعض مال واپس لے لو۔

مسئلہ: فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ کے عموم سے معلوم ہوا کہ عورت کا مرد سے خلع کرنا جائز ہے خواہ وہی مال واپس لوٹا دے جو مرد سے حق مہر میں لیا ہے خواہ اسے زائد دے یا اس سے کم کر کے اسی پر جمہور فقہا متفق ہیں۔

مسئلہ: آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ خلع صرف اس وقت جائز ہے جب کہ غصہ میں ہو یا مرد اور عورت کا گزارہ بظاہر ناممکن ہو لیکن جمہور مجتہدین فرماتے ہیں کہ خلع ہر طہر سے جائز ہے خواہ ان کا گزارہ خطرہ میں ہو یا نہ ہو۔

ترکیب: اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ کے لئے ضروری ہے کہ یہ استثناء منقطع ہو جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا میں استثناء منقطع ہے اِلَّا خَطَـًٔا کا معنی لکن ان قتل خطاء فدیتہ مسلمتہ الی اھلہ۔

مسئلہ: امام بغوی نے فرمایا مرد عورت سے زیادتی ہو یا نہ ہو ہر حالت میں خلع جائز ہے لیکن زیادتی نہ ہو تو اس وقت خلع مکروہ ہے اس لئے کہ اس میں بلاوجہ قطع تعلق کرنا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کی مغبوض ترین حلال طلاق ہے۔

تِلْكَ یعنی وہ احکام جو مذکور ہوئے حُدُوْدُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے حدود ہیں اس کے اوامر و نواہی فَلَا تَعْتَدُوْهَا پس ان سے مخالفت کر کے یا ان احکام کو چھوڑ کر حدود سے تجاوز نہ کرو وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ اور جو اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی لوگ حد سے بڑھنے والے هُمُ الظّٰلِمُوْنَ وہی ظالم ہیں یعنی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں اس لئے کہ وہ نفسوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ناراضگی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

مسئلہ: جب عورت تمام غلط کاریوں سے بری الذمہ اور پاک دامن ہو تو مرد پر لازم ہے کہ ایسی عورت سے اچھا معاشرہ رکھے اور اس کی سخت کلامی پر صبر کرے اور اس کی معمولی غلطیوں سے چشم پوشی کرے اور حضور نبی کریم ﷺ کی عادات مبارکہ کے مطابق عمل کرے حضور نبی کریم ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ احسن

سلوک رکھتے تھے۔

مسئلہ: عورتوں کے ساتھ نیک معاشرہ رکھنا اور ان کی معمولی غلطیوں کی چشم پوشی کرنا بھی اچھے اخلاق سے شمار ہوتا ہے بلکہ ایسے شخص کو ایسے صبر پر مجاہدین فی سبیل اللہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

حکایت: مروی ہے کہ ایک عابد اپنی عورت سے اچھا معاشرہ رکھتا تھا یہاں تک کہ فوت ہوگئی اسے کہا گیا کسی دوسری عورت سے نکاح کر لیجئے اس نے انکار کر دیا ایک عورت نے کہا میرے ساتھ ضرور نکاح کرو تاکہ میرا جی خوش ہو لیکن وہ عابد نہ مانا اس کے بعد اس عابد نے کہا میں نے اپنی عورت کی وفات کے بعد شب جمعہ کو دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور لوگ ہوا میں اترتے اور اوپر کو بھی چڑھتے ہیں اور اسی طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے جاتے ہیں جب ان میں کسی ایک کی نگاہ میرے اوپر پڑتی تو وہ اپنے پیچھے والے کو دیکھ کر کہتا ہے یہی ہے وہ بد بخت دوسرا اس کے پیچھے والا کہتا ہے ہاں تیسرا کہتا ہے یہی ہے یہی ہے مجھے ان سے ماجرا پوچھنے سے ڈر لگتا جب آخری آدمی میرے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں نے پوچھا کون ہے بد بخت جسے یہ لوگ بار بار کہتے اور ایک دوسرے کی تصدیق کر رہے ہیں اس نے کہا تم ہی ہو میں نے کہا وہ کیوں اس نے کہا وہ اس لئے کہ اس سے قبل ہم تیرا عمل مجاہدین فی سبیل اللہ کے ساتھ لے جاتے لیکن ایک ہفتہ سے ہمیں حکم ہے کہ ہم تیرا عمل مخالفین کے ساتھ لے جائیں اس کی وجہ پس معلوم نہیں اسے احساس ہوا کہ یہ نحوست نکاح کرنے کی ہے چنانچہ اٹھتے ہی کہا میرا نکاح کرو چنانچہ دیکھا گیا کہ اس کے بعد اس کے پاس دو عورتیں نکاح میں بیک وقت ہوتیں۔ حضرت کاشفی لکھتے ہیں کہ

مردگمان مبر بزور ست و بزدلی ۔۔۔ با نفس اگر جہاد کنی مرد کاملی

(**ترجمہ**: جوانمردی زور اور بزدلی سے نہیں بلکہ نفس سے جہاد کبھی جاتی ہے فلہذا جوانمرد ہے جو نفس سے جہاد کرتا ہے)

اور یہ ایک دوسرے کے بعد حاصل جیسے کہا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بھی مرد میدان چاہیں اور کہا گیا ہے اگر تو طلاق دینا چاہتا ہے تو اپنے نفس کو طلاق دے۔ کسی نے خوب کہا

ہر کہ زن نفس شوم را داد طلاق ۔۔۔ نقش بنود بزید ایں نیلی طاق

از زمانہ نفس قدم بیروں نہ ۔۔۔ تا روحت کز نسیم وصل اسشاق

(ترجمہ: جو بھی نفس کو طلاق دیتا ہے تو اس کی شادی اس نیلی چھت کے نیچے نہیں بلکہ اوپر ہوگی نفس کی خرابیوں سے دور رہو پھر تمہیں روحانی ملک کی خوشبو سونگھائی جائے گی)

سبق صوفیانہ: جب تک تیرے نفس کی بڑھیا تیرے اندر کو پریشان اور تیرے قلب کو خراب کرتی رہے گی تو عروس یعنی تجلی روح نقاب کی وجہ سے نظر نہیں آئے گی اور نہ ہی وہ عروس تیرے مشاہدہ کے کمرے میں آئے گی اللہ تعالیٰ اس مرد پر رحم کرے جس نے اپنی قدر پہچانی اور وہ طریق حق سے متجاوز نہ ہوا۔

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اشارہ ہے کہ اہل سلوک حریم یار سے جدا نہیں ہوتے وہ حریم جو دوست شفیق اور نہایت ہی سچے دوست سے نصیب ہوتا ہے اسے تو صرف وہ ایک ہی حریم کافی ہو جاتا ہے وہ حریموں سے لاتعلق ہوتا ہے ہاں تجاوز کرتا ہے تو ایک یا دو بار پھر تیسری بار اسے حکم ہوتا ہے یا تو بندر کے ساتھ معروف کے یا چھوڑ دے ساتھ احسان کے یعنی صحبت رکھے تو بہتر سے بہتر یا چھوڑ دے تو احسن طریق سے جیسے حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک دو بار تو درگزر فرمایا لیکن تیسری بار فرمایا هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ اور وہ صحبت کہ جس میں تعظیم دوست نہ ہو اور بداخلاق سے زندگانی کی لذت کو ضائع کرنا اور عذاب کو خریدنے میں تضیع اوقات کی جائے تو ایسی صحبت طریقت سے اچھی ہے نہ شریعت میں پسندیدہ بلکہ طریقہ حق کے لئے سخت ترین مضر۔ اہل صحبت کے لئے ضروری ہے کہ جب اتفاقاً جدائی پڑ جائے تو یاران صحب سے کلی طور پر دل ہٹا نہ لیں اور نہ ہی دینی بھائیوں سے قطع تعلق کرلیں نہ ہی ان سے ہم عالیہ دے کر ان سے قلوب واپس نہ کرلیں اس لئے کہ ہبہ سے رجوع ہے جیسے قے کر کے پھر کھالی جائے ہاں اگر ان سے اللہ تعالیٰ کی حدود یعنی حقوق صحبت کی رعایت سے تجاوز کرنے کا خوف ہو اور تمہیں خطرہ ہو کہ وہ حدود اللہ تعالیٰ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے بایں طور کہ مقابلہ پر تل آئیں گو یا دینی حقوق میں سے کسی حق کو چھوڑ دیں گے تو ان پر گناہ نہیں رعایت حقوق کے لئے لذتوں میں سے اس کا فدیہ دیں یہ حظوظ و حقوق اللہ کے حدود ہیں حظوظ کے حاصل کرنے کے لئے ترک حدود کر کے حد سے نہ بڑھو۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ قدس اللہ تعالیٰ نفسہ الزکیۃ القدسیہ)

تفسیر عالمانہ

فَاِنْ طَلَّقَهَا پس اگر وہ مرد اپنی عورت کو دو طلاقوں کے بعد طلاق دے فَلَا تَحِلُّ لَهٗ تو وہ عورت اس مرد کے لئے حلال نہیں مِنْۢ بَعْدُ تین طلاقوں کے بعد نہ بطریق رجعت کے

اور نہ ہی تجدید نکاح سے حَتّٰی تَنْکِحَ نکاح کرے عورت زَوْجًا غَیْرَہٗ طلاق دہندہ کے غیر سے۔

سوال: ابھی غیر تو اس کا شوہر ہوا نہیں لیکن قرآن. نے اسے زوج سے تعبیر کیا اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: چونکہ جو شخص اس عورت سے نکاح کرے گا اور اس کا شوہر ہو جائے گا اس عمل کے انجام کے اعتبار سے اسے زوج کہا گیا۔

مسئلہ یہاں پر نکاح، بمعنی عقد نکاح نہیں بلکہ وطی رد ایہی معنی حضرت سعید بن المسیب نے وطی مراد لی ہے اور آیت کا لفظ بھی یہی شہادت دیتا ہے اس لئے وہ نکاح بمعنی وطی ہو تو عبارت یوں ہو گی تطاء المرا ۃ الزوج ایسا کلام عرب میں نہیں اس لئے کہ عورت موطوءۃ ہوتی ہے نہ کو وطی کرنے والی۔

سوال: آیت مطلق ہے تو نے اسے مقید کیوں کیا اس کی تقریر یہ ہے کہ آیت دلالت کرتی ہے کہ عورت شوہر اول کے لئے حلال نہیں جب تک کہ شوہر ثانی اس سے وطی نہ کرے اور ان دونوں کا اس عقد کے بغیر بھی نکاح ہو سکے اس کے ساتھ شوہر کا وطی کرنا ضروری نہیں لیکن تم ضروری سمجھتے ہو۔

جواب: تم نے آیت کو حدیث شریف اور اجماع امت سے مقید کیا یہ کہ جب تک اس عورت سے وطی نہ ہو تو وہ پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں جیسا کہ مروی ہے کہ رفاعہ کی عورت حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی رفاعہ نے مجھے مغلظہ طلاق دی ہے اس کے بعد میرے ساتھ عبدالرحمٰن بن زبیر نے نکاح کیا ہے اس کے پاس وہ شئے نہیں اور وہ نامرد ہے اور مجھے اس کی ضرورت نہیں اور اس کی قوت مردی کی طرف اپنا کپڑا پکڑ کر اشارہ کیا یعنی جیسے کہ کپڑا بے زور ہے ایسے ہی اس کی قوت مردی کا حال ہے آپ اس بات پر ہنس پڑے اور فرمایا کیا چاہتی ہو کہ تو اپنے پہلے شوہر یعنی رفاعہ کو واپس چلی جائے عرض کی ہاں آپ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تیری شہد نہ چکھ لے اور تو اس کی شہد نہ چکھ لے تو واپسی نہیں ہو سکتی۔

ف: حدیث شریف میں شہد چکھنے سے مراد جماع کرنا ہے اور شہد چکھنے کو جماع کی لذت سے تشبیہ دی ہے فَاِنْ طَلَّقَهَا پس اگر شوہر ثانی اس عورت کو دخول کے بعد طلاق دے دے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ تو شوہر اول اور عورت کو کوئی گناہ نہیں اَنْ يَّتَرَاجَعَآ یہ کہ دونوں عقد جدید سے رجوع کر لیں اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ اگر ان کے گمان میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے حدود سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے زن و شوہر کے

درمیان متعین فرمائے ہیں۔

سوال: اِنْ ظَنَّاۤ کی بجائے ان علما کیوں نہیں فرمایا؟

جواب: اس لئے کہ عوام کو امور کا انجام کار معلوم نہیں اور نہ ہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کل کیا ہوگا البتہ گمان کے طور پر کچھ باتیں معلوم کر لیتے ہیں۔ وَتِلْكَ ان احکام کی طرف اشارہ ہے جو ابھی مذکور ہوئے حُدُوْدُ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ احکام جو معین ہیں جن کی تبدیلی و تغیر اور مخالفت سے حفاظت کی گئی ہے یُبَیِّنُهَا اللہ تعالیٰ انہیں بیان کرتا ہے لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو اپنے مقتضی کے مطابق جانتے سمجھتے ہیں۔

سوال: یہاں پر علم والوں کو مخصوص کیا گیا ہے کیوں؟ باوجود یہ کہ قرآن کے احکام کی دعوت و تبلیغ عام ہے۔

جواب: ان احکام سے صرف اہل علم ہی نفع اٹھاتے ہیں باقی رہے جاہل وہ اولاً تو احکام کو یاد نہیں رکھتے اگر کچھ یاد ہوتا ہے تو اس پر عمل نہیں کرتے۔

نکتہ گفتن پیش کرفہماں زحکمت بیگماں   جوہری چند از جواہر پیش خراست رہاں

(**ترجمہ:** بدفہموں کو نکتہ کہنا ایسے ہے جیسے جوہرات گدھے کے سامنے ڈالے جائیں)

نکتہ: طلاق مغلظہ کے لے حلالہ کی شرط سے اس عورت سے نکاح کافی نہیں جب تک اس کے ساتھ شوہر ثانی جماع نہ کرے اس میں حکمت یہ ہے کہ عموماً مرد کی غیرت اجازت نہیں دیتی کہ اس کی عورت کے ساتھ کوئی دوسرا جماع کرے اس غیرت کی بنا پر وہ طلاق دینے سے رکتا رہے گا یہ اس وقت ہوگا جب اس کے ذہن میں آئے گا کہ عورت کو طلاق دوں گا تو میری عورت کے ساتھ غیر جماع کرے گا طلاق سے نفرت کا یہی بہت بڑا سبب ہے اور غیرت کے ابھارنے کا بھی اس لئے شرط لگائی گئی ہے کہ جب تک دوسرا شوہر اس مطلقہ مغلظہ سے جماع نہ کرے پہلے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی۔

مسئلہ: حلالہ کی شرط پر نکاح کرنا اور کہنا کہ حلالہ کر کے طلاق دے دینا اکثر کے نزدیک یہ نکاح فاسد ہے لیکن امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک جائز ہے مگر مکروہ۔

مسئلہ: اگر اس شرط کو دل میں رکھ کر زبان پر نہ لائیں اور حلالہ کے بعد طلاق ہو جائے تو بلا کراہت جائز ہے

مسئلہ: شرح الزیلعی میں ہے اگر عورت کو خوف ہو کہ یہ شوہر ثانی میرے ساتھ نکاح کر کے حلالہ کے بعد بھی

طلاق نہ دے گا تو اس کے ساتھ نکاح کرتے وقت یوں کہے کہ میں تیرے ساتھ نکاح کرتی ہوں لیکن طلاق کا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا کہ جب چاہوں گی طلاق لے لوں گی اور اس مرد نے قبول کر لیا تو ایسی شرط لگانا جائز ہے۔

مسئلہ: اسی شرح الزیلعی میں ہے کہ لطائف الحیل میں سے ایک حیلہ یہ ہے کہ عورت مطلقہ مغلظہ کسی چھوٹے عبد سے نکاح کر لے کہ جس کا آلہ تناسل حرکت کرتا ہے جب اس سے وطی کرا لے تو اسے قیمۃً خرید لے اب وہ اس کا مالک ہو جائے گا تو ان دونوں کا نکاح خود بخود فسخ ہو جائے گا۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔لعن اللہ المحلل و المحلل لہ۔

حل لغات: المحلل (آیت اسم فعال بکسر اللام بصیغہ اسم فاعل) حلالہ کرنے والا (بفتح الام بصیغہ اسم مفعول) جس کے لئے حلالہ کیا جائے یعنی حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا جائے اللہ تعالی دونوں پر لعنت کرتا ہے (بکسر اللام) المحلل حلالہ کرنے والا اس سے دوسرا شوہر مراد ہے اور المحلل لہ (بفتح اللام) جس کے لئے حلالہ کیا جائے اس سے شوہر اول مراد ہے۔

سوال: ان دونوں کو لعنتی کیوں کہا گیا؟

جواب: محلل حلالہ کرنے والے پر تو لعنت اس لئے ہے کہ اس نے عورت سے جدائی کی نیت پر نکاح کیا حالانکہ نکاح میں استمرار و دوام ہوتا ہے اس محلل کی مثال (مانگے ہوئے) تیس کی ہے۔

ف: عربی میں تیس اس نر بکرے کو کہا جاتا ہے جو بکریوں کا گابھن کرانے کے لئے مانگ کر بکریوں میں چھوڑا جاتا ہے اور محلل لہ پر اس لئے لعنت ہے کہ وہ اس قبیح فعل کا سبب بنا اور قاعدہ ہے کہ سبب اور مسبب ہر دونوں جزا و سزا میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

ویسے لعنت سے مراد ان کی خاست کمینہ پن کا اظہار ہے محلل کی خساست بالمعنی ہے کہ وہ اس قبیح امر کا مرتکب ہوا حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا میں تمہیں تیس کا پتہ دوں یعنی محلل کی اسے حضور نبی کریم ﷺ نے مستعار تیس جیسی قبیح صفت سے موصوف فرمایا ہے اور محلل لہ کی خساست اور کمینہ پن یہ ہے کہ وہ ایسے فعل کا سبب بنا ہے جس سے اچھی طبیعتوں کو نفرت ہے کہ جب اس کی عورت دوسرے کے قبضہ میں آچکی پھر وہ اس کے لئے چاہتا ہے کہ وہ دوبارہ اس کے قبضہ میں آجائے اور وہ اس سے نفع اٹھائے یہ غیرت کے بھی خلاف ہے۔

ف: یہاں حقیقی لعنت مراد نہیں کونکہ یہ منصب رسالت کے خلاف ہے کہ اپنی امت کو لعنت جیسے قبیح صفت سے موصوف فرمائیں خود فرمایا میں لعنت کرنے والا ہو کر مبعوث نہیں ہوا۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ جب کوئی اپنے دوستوں کی صحبت کے حقوق میں ایک یا دو بار کوتاہی کرے تو درگزر کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ تیسری بار بھی اس کا مرتکب ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ اس نے جدائی اور مفارقت کے طریق کو اختیار کیا اور دوستی کے حقوق سے نکل گیا پس دوستوں کے لئے بھی لائق نہیں کہ ایسے لوگوں سے حقوق دوستی ادا کریں ایسا آدمی خائن ہے جو دوست کے ساتھ گزار رہا ہے اگر ایسا شخص اپنے کئے پہ نادم ہو اور اپنے دوست سے معافی چاہے اور اظہار ندامت کرے کہ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے تجھ سے علیحدگی کی ٹھان لی اب میں ان قبائح سے باز آیا اور آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ ساتھ رہ کر حق صحبت ادا کروں گا تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں اتفاق سے گزاریں بشرطیکہ انہیں گمان ہو کہ ہم شرائط عبودیت اور صحبت فی اللہ کے حقوق ادا کر سکیں گے جان لو کہ یہی ہیں اللہ تعالیٰ کی قربت کی راہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والے لوگوں کے طریقے انہیں اللہ تعالیٰ کبھی صراحۃً اور کبھی دلالۃً اور کبھی عبارت اور کبھی اشارات سے بیان کرتا ہے صرف ان حضرات کے لئے جو اشارات، کنایات کو جانتے اور اشارات کو سمجھتے ہیں۔

(کذافی التاویلات النجمیہ)

حضرت احمد بن خضر یہ فرماتے ہیں کہ حق کا راستہ واضح اور دلائل روشن ہیں اور داعی بھی اس کا زور زور سے سنا رہا ہے اس کے باوجود بھی اندھا پن ہے کہ اس راہ پر نہ چلا جائے یعنی امور مذکورہ کے باوجود بھی کوئی سیدھی راہ سے بھٹک جائے تو وہ اندھا ہے۔

حضرت حافظ شیخ شیرازی قدس سرہ فرماتے ہیں۔

وصل خرشید بشپرہ اعمی نرسد   کہ دریں آئینہ صاحب نظراں حیرانند

(ترجمہ: سورج کی روشنی اور چمک کا اندھے کو کیا پتہ اس شیشہ کی روشنی سے نظر والوں کو حیرانی ہے)

تفسیر عالمانہ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی عدت کے آخری ایام تک پہنچیں یعنی وہ وقت آجائے کہ عدت قریب

الاختتام ہے اس سے حقیق عدت کی انتہا مراد نہیں اس لئے کہ جب مطلق عورت کی عدت ختم ہو جائے تو مرد کو حق نہیں پہنچتا کہ اسے اپنے پاس روکے۔

شان نزول: یہ آیت اس انصاری شخص کے حق میں نازل ہوئی جسے ثابت بن یسارہ کے نام سے پکارا جاتا ہے جس نے اپنی عورت کو طلاق دے دی جب کہ اس کی عدت قریب الاختتام ہوئی تو اس سے رجوع کر لیا کچھ عرصہ کے بعد پھر اسے طلاق دے دی اس سے اس کا صرف عورت کو دکھ پہنچانا مقصود تھا تو یہی آیت اتری۔

فَاَمۡسِکُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ انہیں نیکی کے ساتھ روکو یعنی ان سے رجوع صرف اس نیت پر کرو کہ انہیں دکھ نہ پہنچاؤ المعروف سے مراد وہ عمل ہے جس سے عقل کو الفت حاصل ہو اور شرعاً و عرفاً و عادتاً اسے نفوس مستحسن سمجھیں یہاں اچھا معاشرہ مراد ہے اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ یا انہیں نیک طریقہ سے چھوڑ دو یعنی پورے طور پر چھوڑ دو یہاں تک کہ بلا تطویل ان کی عدت ختم ہو جائے وَلَا تُمۡسِکُوۡهُنَّ ضِرَارًا اور نہ ہی دکھ کے ارادہ پر ان کی عدت لمبی کر کے رجوع کرو یعنی اس عورت کو اپنے پاس بند رکھ کر نقصان دینا مقصود نہ ہو اس میں ضرار علت یا ضرار حال ہے بمعنی مضارین۔

سوال: اَمۡسِکُوۡهُنَّ بمعروف اور لَا تُمۡسِکُوۡهُنَّ میں بظاہر کوئی فرق نہیں اس لئے کہ کسی شئے کا حکم دینا اس شئے کی ضد سے روکنا ہوتا ہے پھر تکرار میں کیا فائدہ؟

جواب: اس امر میں نہ تکرار ہے اور نہ ہی مامور بہ کی فرمانبرداری ہر وقت مطلوب ہوتی ہے بلکہ اس سے کبھی مبالغہ مطلوب ہوتا ہے یہاں بھی وہی مبالغہ مطلوب ہے کہ مرد عورتوں کے ساتھ احسان و مروت کریں۔

لِتَعۡتَدُوۡا ضِرَارًا سے متعلق ہے کیونکہ اسے مقید کرنے سے ہی یہی مطلوب ہے یعنی ان کو اس لئے روکتے اور ان پر ظلم کرتے ہو کہ وہ طلاق لینے کے لئے فدیہ دینے پر مجبور ہو جائیں وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ اور وہ شخص جو مذکورہ امور مثلاً عورت کو اپنے پاس روکے رکھے (جو سراسر ظلم ہے) کا ارتکاب کرتا ہے۔ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ تو بیشک وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے یعنی عورتوں کو ظلم کا نشانہ بنا کر اپنے آپ کو ظلم میں ڈال رہا ہے وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو نہ بناؤ آیات سے یہی احکام مذکورہ مراد ہیں یا اللہ کی جمیع آیات مراد ہیں اور ان کا اس حکم میں داخل ہونا بھی ہے۔ هُزُوًا اللہ تعالیٰ کی آیات سے روگردانی اور ان پر عمل کرنے میں سستی دکھا کر ان سے ٹھٹھا نہ کرو۔

ف: اس نہی سے امر مقصود ہے اس لئے کہ اس کے مخاطب مومن ہیں اور مومن کی شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی آیات

سے ٹھٹھا کرے اب معنی یوں ہوا کہ اے مومنو! اللہ تعالیٰ کی آیات کو لینے اور ان پر عمل کرنے میں پوری کوشش کرو اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں پوری پابندی کرو۔

حضرت حکیم سنائی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

داشت ہست وکار بستن کو　　　　خنجرت ہست وصف شکستن کو

(ترجمہ: اپنی ہستی کا تصور باندھکر دنیا کے کاروبار میں پھنسنا کیا معنی جب خنجر تیرے پاس ہے تو پھر شکست کا تصور کیسا)

ربط: جب اللہ تعالیٰ نے امور تکلیفیہ کی نگہداشت اور ان پر عمل کرنے کی ترغیب دی اور ان سے سستی برتنے کی سزا سنائی تو انہیں اب انعامات عطا کرنے سے مؤکد فرماتا ہے اس لئے کہ جو ان پر کاربند ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا اور تمام حقوق کی ادائیگی میں پوری کرتا ہے چنانچہ فرمایا۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو یاد کرو جو ہونے والی ہیں عَلَيْكُمْ تمہارے اوپر کہ تمہیں اس راستہ کی طرف ہدایت دی جس میں تمہاری دینی دنیوی سعادتیں ہیں یعنی ان نعمتوں کو شکر سے قبول کر کے ان کے حقوق ادا کرو بعض نے اس کا یہ معنی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر انعام کو یاد کرو بایں طور کہ تمہیں اس نے عدم سے وجود بخشا پھر انسان بنا کر مرد پیدا فرمایا پھر عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت بخشی تا کہ تم ان کے ساتھ رہ کر سکون حاصل کرو پھر نکاح وطلاق ورجعت کے امور تمہارے قبضہ میں دیے اور تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں رکھی جیسے سابقہ امتوں پر تنگی رکھی تھی یہاں تک کہ انہیں صرف ایک عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دی جاتی اور عورت کو اس کے مرد کے فوت ہونے کے بعد اسے دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ اس کا عطف نِعْمَتَ اللّٰهِ پر ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ کتاب اور حکمت یعنی قرآن اور حدیث سے انہیں خصوصی طور پر ذکر کرنے سے ان کی شرافت کا اظہار مطلوب ہے يَعِظُكُمْ بِهٖ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی نصیحت کرتا ہے یعنی وہ جو تمہارے اوپر نازل فرمایا یہ انزل کے فاعل کی ضمیر سے حال ہے عبارت یوں تھی اذکروا نعمت اللہ وما انزل علیکم واعظا بہ لکم ومحفوظاً یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور وہ جو تمہارے اوپر نازل کیا وہ تمہارے لئے واعظ اور ڈرانے والا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس کے حقوق کی محافظت اور اس کے حقوق واجبہ کی ادائیگی کر کے۔

وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئے کو جانتا ہے اس سے کوئی شئے مخفی نہیں جو تم عمل میں لاتے ہو یا چھوڑتے ہو اس متقیو مختلف قسم کے عذاب سے تمہارا مواخذہ نہیں ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ کسی کو دکھ پہنچانا اسلام اور ایمان کے شعار میں نہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے شعار سے ہے چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا مومن وہ ہے کہ جس سے لوگ امن میں رہیں اور فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا سے دوسرے مسلمان سالم رہیں۔

مسئلہ :اچھا معاشرہ ویسے تو تمام مخلوق کے ساتھ ضروری ہے لیکن زن وشوہر کی خصوصیت رکھی گئی ہے کہ مرد کو چاہئے کہ عورت کے ساتھ اچھا معاشرہ رکھے نہ اسے ایذا دے اور نہ ہی اس پر غصہ کا اظہار کرے یہ عام مجمع کی بات یہ اور وہ بھی بطریق جھگڑا کے ورنہ تخلیہ یعنی تنہائی میں جس میں لڑائی جھگڑا کے لحاظ سے نہ ہو بلکہ صحبت کی ادائیگی حقوق کی بنا پر بطریق محبت کے اور اس میں حد سے تجاوز بھی نہ ہو اور جو شخص ان افعال یعنی اذیت اور دکھ پہنچانے اور تجاوز کر کے ظلم کرنے کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور اس لئے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ ظالم ومظلوم دونوں کو جزا دے گا کوئی کسی پر برائی کرتا ہے وہ سمجھے کہ میں اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہوں بلکہ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے کر اور مظلوم کی برائیاں ظالم کے پلڑے میں ڈال دے گا اور جو کسی پر احسان کرتا ہے وہ سمجھے کہ میں اپنے ساتھ نیکی کر رہا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ ظالم جو برائی کر رہا ہے وہ کسی دوسرے پر نہیں بلکہ در حقیقت وہ اپنے اوپر ظلم ڈھا رہا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

مکن تا توانی دل خلق ریش ۔۔۔ وگر میکنی میکنی بیخ خویش

(**ترجمہ**: جب تک تیرے امکان میں ہے کسی کا دل زخمی نہ کر اگر کرتا ہے تو اپنی جڑ کاٹ رہا ہے)

وَلَا تَتَّخِذُوۡٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے ٹھٹھا نہ کرو انہیں ظاہری طور پر پڑھو لیکن ان کے معانی میں تدبر نہ ہو اور ان کے اشارات کے سمجھے بغیر اور ان اسرار کے تحقق کے سوا اور ان کے حقائق کے تتبع کو چھوڑ کے اور ان کے انور سے نورانیت حاصل کرنے کی غرض نہ ہو اور ان کے مواعظ اور حکمتوں سے نصیحت نہ کی جائے۔

نکتہ : وعظ شاہین کی طرح ہے اور شاہین کی پکڑ زندہ پر ہوتی ہے نہ مردہ پر جس کا دل مر چکا ہو وہ قرآن سے اثر نہیں لے گا ہم پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ وہ دل مواعظ سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔

حدیث شریف : حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج تم اللہ تعالیٰ کی دلیل پر ہو یعنی ایسے بیان پر ہو کہ اس نے اپنا راستہ تمہارے لئے واضح طور پر بیان فرمایا ہے وہ ایسے ہی واضح رہے جب تک کہ تم میں سکراتوں کا ظہور نہ ہو ا۔ سکرات العین ۲۔ سکرات الجہل

حکایت : سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حج کے راستہ میں سواری گم ہوگئی آپ کو اس راہ پر ایک لڑکا ملا آپ نے اس سے پوچھا تو اس نے سواری کا پورا پتہ بتایا جب سواری مل گئی تو اس لڑکے نے حضرت حسن بصری سے سوال کیا کہ اے شیخ آپ کیا کھاتے اور پہنتے ہیں آپ نے فرمایا کہ روٹی کھاتا ہوں اور اون کا کپڑا پہنتا ہوں تاکہ شہوت نفسانی کا زور ٹوٹے۔ لڑکے نے کہا اے شیخ کھاؤ اور پہنو جو مرضی میں آئے لیکن حلال کے مال سے ہو، پھر لڑکے نے پوچھا آپ رات کہاں گزارتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جھونپڑے میں۔ اس نے کہا کسی پر ظلم نہ کرو پھر جہاں مرضی آئے گزارو حضرت حسن بصری نے کہا اگر تو لڑکا نہ ہوتا تو میں تجھ سے کچھ حاصل کرتا۔ اس پر وہ ہنس پڑا اور کہا آپ تو بہت بڑے غافل ہیں میں نے دنیا کی باتیں سنائیں ہیں تو تم قبول کرتے چلے گئے اور دین کی بات آئی تو تم میرے کلام سے نفرت کر رہے ہو اب گھر جاؤ تمہارا حج قبول نہیں۔

(اللہ اکبر وہ لڑکا اتنا بلند قدر ولی اللہ تھا کہ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے کامل کو جھڑک دیا)

شیخ سعدی قدس سرہ نے سچ فرمایا:۔

بزرگی بعقل است نہ بسال — بزرگی ایک اور شئے ہے بزرگی بڑی عمر کا نام نہیں (اویسی غفرلہ)

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

فرد باید کرد اندر گوش — در نوشتہ است پند بر دیوار

ترجمہ : نصیحت کو کان میں جگہ دو اگرچہ دیوار پر لکھی ہو

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو وان کی میعاد پوری ہو جائے تو اے عورتوں کے والیو انہیں نہ روکو اس سے کہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں

اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ

جبکہ آپس میں موافق شرع رضا مند نہ ہوجائیں یہ نصیحت اسے دی جاتی ہے جو تم میں سے

مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

اللہ او رقیامت پر ایمان رکھتا ہو یہ تمہارے لئے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے اور اللہ جانتا ہے

وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ

اور تم نہیں جانتے ۔ اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ

اس کے لئے جو دودھ کی مدت پوری کرنی چاہے اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا ہے

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا

حسب دستور کسی جان پر بوجھ نہ رکھا جائے گا مگر اس کے مقدور بھر ماں کو ضرر نہ دیا جائے اس کے بچے سے

وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا

اور نہ اولاد والے اس کی اولاد سے یا ماں ضرر نہ دے اپنے بچہ کو اور نہ اولاد والا اپنی اولاد کو اور جو باپ قائم مقام ہے اس پر بھی ایسا ہی واجب ہے

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

پھر اگر ماں باپ دونوں آپس کی رضا اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر گناہ نہیں اور اگر تم چاہو کہ

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

دائیوں سے اپنے بچوں دودھ پلواؤ تو بھی تم پر مضائقہ نہیں جب کہ جو دینا ٹھہرا تھا بھلائی کے ساتھ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ

انہیں ادا کردو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔ اور تم میں جو مریں

مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ

اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ

تو جب ان کی عدت پوری ہوجائے تو اے والیو! تم پر مواخذہ نہیں اس کام میں جو عورتیں اپنے معاملہ میں موافق شرع کریں

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ

اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔ اور تم پر گناہ نہیں اس بات میں جو پردہ رکھ کر

بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

تم عورتوں کے نکاح کا پیام دو یا اپنے دل میں چھپا رکھو اللہ جانتا ہے کہ

سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ

اب تم ان کی یاد کرو گے ہاں ان سے خفیہ وعدہ نہ کر رکھو مگر یہ کہ اتنی بات کہو جو شرع میں معروف ہے

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

اور نکاح کی گرہ پکی نہ کرو جب تک لکھا ہوا حکم اپنی میعاد کو نہ پہنچ لے اور جان لو کہ اللہ

يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

۳۰ ع ۱۴

تمہارے دل کی جانتا ہے تو اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ یہاں پر فَبَلَغْنَ کا بلوغ اپنے حقیقی یعنی انتہاء بے معنی میں ہے اس لئے کہ اس کے بعد نکاح کا ذکر ہے اور نکاح مکمل عدت ختم ہونے کے بعد ہو سکتا ہے فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ پس انہیں مت روکو العفل بمعنی الحبس و المنع اور کسی کو تنگ کرنا پہلے خطاب کی مخاطب ازواج ہیں اور دوسرے کے عورتوں کے متولی۔

شان نزول: مروی ہے کہ یہ آیت معقل بن یسار کے حق میں نازل ہوئی جب کہ اس نے اپنی بہن جمیلہ کو روکا تھا جب کہ وہ اپنے پہلے شوہر البداح بن عبداللہ بن عاصم کے پاس واپس جانا چاہتی تھی۔
القصہ عدت کے بعد اسے البداح نے دوبارہ نکاح کا کہا اور اس کی عورت جمیلہ بھی چاہتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے پاس چلی جائے تو یہ آیت اتری تو حضرت معقل نے کہا میری ناک گھس جائے میں اپنی ہمشیرہ کا نکاح کر دوں گا تا کہ میں اپنے رب کے فرمانبردار بندوں میں شمار ہو جاؤں گا اب معنی یہ ہوا کہ جب تم اے شوہر اپنی عورتوں کو طلاق دو تو اے عورتوں کے متولیو تم انہیں مت روکو۔

سوال: ایک ہی جملہ میں دو علیحدہ علیحدہ خطاب کیوں؟

جواب: اگر چہ ایسی عبارت اہل عرب کے ہاں نہایت ہی رکیک سمجھی جاتی ہے اس جملہ کے جواز کی تقریر یہ ہے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی علم حضوری میں حاضر ہے چونکہ وہ تمام مخلوق اس کے آگے بمنزلہ ایک ہی جماعت کے ہے اس لئے جملہ میں دو علیحدہ علیحدہ مخاطبوں کو خطاب کرنا جائز ہے جب کہ ایک مخاطب کے لئے توجیہ ہو اور دوسرے کے لئے کوئی اور۔

سوال: شوہر اول تو عدت کے اندر بھی نکاح یا رجوع کر سکتا ہے لیکن آیت میں واضح ہوتا ہے کہ اس کا نکاح بھی بعد انقضا عدت ہو۔

جواب: عورت کے متولیوں سے روکنے کی نہی ہے خواہ وہ شوہر اول کا نکاح عدت کے اختتام کے بعد ہو یا پہلے۔

سوال: عورت نکاح کی خود کفیل ہے جب کہ وہ بالغ ہے تو یہاں پر عورت کے متولیوں سے خطاب کیوں؟

جواب: اس میں عورتوں سے ضرر کا دفع کرنا مقصود ہے اگر چہ وہ خود بھی قادر ہیں کہ وہ اپنا نکاح جہاں چاہیں کریں لیکن انہیں اس سے احتراز کرنا چاہیے تا کہ ان پر علامت نہ ہو اور اپنے خیال پر عمل کرنے پر متولیوں سے

قطع تعلق نہ ہو۔

ف: بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں خطاب ازواج کو ہیں اس لئے کہ عام طور مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی عورتوں پر ظلم اور تکلیف ڈھاتے ہوئے مراسم جاہلیت کی بنا پر نہ عورتوں کو طلاق دیتے ہیں اور نہ ہی ان سے اچھا سلوک کرتے ہیں ان کے لئے یہ آیت اتری۔

اَنۡ یَّنۡكِحۡنَ یہ کہ انہیں نہ روکو جہاں چاہیں نکاح کریں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی اپنی کاروائی سے بھی نکاح ہو جائے گا اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں اس سے مراد ان کے وہ شوہر ہیں جنہوں نے انہیں طلاق دے دی اس لئے کہ زوجیت دو اعتباروں سے ہوتی ہے۔ ۱۔ پہلے تعلق کی وجہ سے اگرچہ اب وہ ان سے مطلقہ ہو گئی ہیں ۲۔ بعد کے تعلق کی وجہ سے کہ اب نکاح کر کے وہ عورتیں ان کی ہو جائیں گی اور دوسرے معنی کو لے کر ترجمہ یوں ہوگا کہ عورتیں جن سے چاہیں نکاح کرلیں اب نکاح کے بعد وہ مرد ان کے شوہر ہوں گے اِذَا تَرَاضَوۡا جب کہ وہ ایک دوسرے سے راضی ہوں یہ خطاب نکاح چاہنے والوں اور عوتوں کو ہے اور اَنۡ یَّنۡكِحۡنَ کے لئے ظرف ہے عبارت یوں ہوگی اَنۡ یَّنۡكِحۡنَ وقت التراضی وہ عورتیں نکاح کریں رضامندی کے وقت بَیۡنَهُمۡ ان کے مابین تَرَاضَوۡا کا ظرف ہے یہ رضامندی کے رسوخ واستحکام کا فائدہ دیتا ہے بِالۡمَعۡرُوۡفِ تَرَاضَوۡا کے فاعل سے حال ہے ای اذا ترضوا ملتبین بالمعروف یعنی جب کہ راضی ہوں اور دریں حال کہ ملنے والے ہیں ساتھ معروف کے عقد صحیح اور جائز طور حق مہر اور اچھے معاشرہ اور نیک عادل گواہوں سے المعروف وہ امر جسے شرع اچھا سمجھے اور عند المروۃ مستحسن ہو۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو غیر کفو میں اور مہر مثل سے کم میں نکاح کرنے سے روکنا عضل سے نہیں یعنی شرعاً ممنوع نہیں ذٰلِكَ گزشتہ مضمون کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ مضمون جو تمہیں سنایا گیا ہے اعضل (وغیرہ یعنی اے عورتوں کے متولیوں یعنی شوہرو)

سوال: خطاب واحد کے لئے ہے اور وہ جہاں مناسب نہیں اس لئے مخاطب تو جمع ہیں۔

جواب: تاویلاً جمع کو واحد قرار دے کر واحد کا صیغہ لایا گیا یا بتاویل کل واحد کے ہے یا محض کلام کو حاضر کی طرف متوجہ کرنا مطلوب ہے قطع نظر اس کے وہ واحد ہے یا جمع یُوۡعَظُ بِهٖ اس کی تمہیں نصیحت کی جاتی ہے یعنی اس سے

روکا جاتا ہے یا اس کا حکم دیا جاتا ہے مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جو ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر اس لئے کہ صرف مومن ہی اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے یا اس سے صرف نفع اٹھاتا ہے (ورنہ قرآن کا وعظ تو عام ہے) ذٰلِكُمْ قرآن سے نصیحت حاصل کرنا اور اس کے حکم کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اَزْكٰى لَكُمْ تمہارے لئے بہت زیادہ پاکیزہ اور بابرکت اور زیادہ نافع ہے اَزْكٰى زكى الزرع سے ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کھیتی نشو ونما کے دور میں ہو اس سے بندے کو ثواب کے استحقاق کی خوشخبری سنانا مطلوب ہے وَاَطْهَرُ زیادہ پاک ہے گناہوں کی میل وکچیل اور اس کی آلائش سے اور یہ افعل التفضیل کے صیغے ہیں ان کا مفضل علیہ محذوف ہونے کا قرینہ واضح اور معلوم ہے یعنی وہ مفضل علیہ محذوف من العضل ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ منع اور اصلاح اور تفصیل کو جانتا ہے وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور تم نہیں جانتے کیونکہ تمہارے علوم قاصر ہیں اس لئے کہ بندہ اگرچہ ان تکالیف کو اجمالی طور پر کچھ نہ کچھ جانتا ہے مگر تفصیل کو تو نہیں جانتا کیونکہ جن احکام کا حکم دیا یا روکا ہے اور پھر وہ بندوں کو بھی بیان کیا ہے انہیں تفصیلی طور وہی جانتا ہے۔

بر وعلم یک ذرہ پوشیدہ نیست ۔۔۔ کہ پنہاں و پیدا بنزدش یکسیت

(**ترجمہ**: اس کے علم کے آگے ذرہ برابر چیز کوئی شئے پوشیدہ نہیں کہ ظاہر وباطن اس کے ہاں برابر)

تفسیر صوفیانہ

اے اللہ کے بندو! اپنی رائے کو ترک کر کے ان کے فرمان کو بجالاؤ اور اس کے روکے ہوئے سے رک جاؤ اس کی مثال ایسے ہے جیسے باپ بیٹے کو بعض کھانے پینے کی اشیاء سے روکتا ہے جب کہ باپ کو معلوم ہے کہ یہ اشیاء بیٹے کے مزاج کے ناموافق ہیں اس سے باپ کو صرف بیٹے کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے کیونکہ جو کچھ باپ جانتا ہے بیٹا نہیں جانتا اس سے یقین کرنا چاہیے کہ جن امور کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں عمل کرنے کا حکم دیا ہے ان میں ہماری خیر ہے اور جن امور سے روکا ہے ان میں ہماری تباہی و بربادی ہے لیکن نصیحت سن کر قبول کرنا صرف اہل ودانش کو نصیب ہے۔

ف: حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نصیحت کرنا آسان ہے لیکن اسے قبول کرنا مشکل ہے اس لئے کہ جو شخص خواہشات نفسانیہ میں منہمک ہو اسے نصیحت کڑوے گھونٹ محسوس ہوتے ہیں اصلی وجہ یہ ہے قلوب کو مناہی برے اعمال محبوب ہوتے ہیں۔

ف: نصیحت سے صرف حقیقی مومن ہی نفع پاتا ہے اور حقیقی مومن وہ ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔

حدیث شریف: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا نیک بخت وہ ہے جو دوسرے سے نصیحت حاصل کرے۔

سبق: اے عوام تمہارے وعظ سننے کی مثال اس شخص جیسی ہے جیسے کہ مذکور ہے کہ ایک مرد نے پرندہ شکار میں پکڑا جب اسے ذبح کرنے بیٹھا تو پرندے نے کہا مجھے ذبح نہ کر میرے ذبح کرنے سے تجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا میں تجھے تین کام کی باتیں بتاتا ہوں شرط یہ ہے کہ انہیں سن کر مجھے چھوڑ دینا اس شخص نے پرندے کو اس شرط پر چھوڑنے کا وعدہ کیا پرندے نے کہا وہ تیں باتیں یہ ہیں۔

☆...... یقینی فائدہ کو ظنی فائدہ کی امید پر ترک نہ کرنا۔

☆...... جو شئے عادتاً محال ہو اس کے حصول میں کوشش کرنا۔

☆...... جہاں تیرا ہاتھ نہ پہنچے اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا۔

یہ نصیحت سن کر اس شخص نے پرندے کو چھوڑ دیا یہ پرندہ اڑنے لگا اور کہا ہمارے گھونسلہ میں ایک بہت بڑا جوہر ہے اسے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لے اگر تو اسے اٹھا لے گا تو اپنے جمیع احکام میں کامیاب رہے گا جب اس شخص نے گھونسلہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پرندہ گھونسلہ سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھ کر کہنے لگا اے فلاں تو بڑا احمق ہے کہ جلد ہی میری بتائی ہوئی نصیحتوں کو بھول گیا، میں تیرا یقینی فائدہ تھا اس امید پر کہ وہ تین فائدے معلوم ہو جائیں گے تو نفع پاؤں وہ تیرا ظنی فائدہ تھا مجھے چھوڑ دیا تو میری پہلی نصیحت پر عمل نہ کر سکا اور ادھر میرے گھونسلے کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے اس لئے دوسری نصیحت کو چھوڑ دیا ہے کہ میں نے کہا تھا کہ وہاں ہاتھ نہ بڑھانا جہاں تیرا ہاتھ نہ پہنچے اور میری تیسری نصیحت تھی کہ محال امر کی تصدیق نہ کرنا لیکن تو نے اسے بھی ترک کیا کہ میرے گھونسلے میں موتی جواہر کا ہونا مان لیا حالانکہ تو دیکھ رہا ہے کہ میرا گھونسلہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں ایک دانہ یا دو دانے مشکل سے سما جائیں گے چہ جائے اتنا بڑا موتی اور جواہر۔

حکایت: حضرت شفیق بلخی قدس سرہ ابتداز مانہ میں بہت بڑے تاجر تھے انگریزوں کے علاقوں میں تجارت کے لئے تشریف لے جاتے ایک دن ایک انگریز کے امیر نے پوچھا جناب شفیق بلخی تمہیں ہمارے ہاں آنے

جانے کے لئے کتنا عرصہ لگتا ہے آپ نے فرمایا تین ماہ ہوتے ہیں آپ نے فرمایا تین ماہ آتے ہوئے خرچ ہوتے ہیں اور تین ماہ جاتے ہوئے۔

سوال: جب عقد نکاح میں لباس وخوراک ہر دونوں ضروری ہیں کہ جب بھی عورت کو گھر میں لائے گا تو ہر دونوں کو یہ ضروری ہوں گی لیکن رضاع میں ان کی تصریح سے کیا فائدہ؟

جواب: عقد نکاح کے بعد اس وقت خوراک اور پوشاک دینا ضروری ہے جب وہ عورت جماع کرنے دے اگر جماع سے انکار کرے تو پھر نان ونفقہ ضروری نہیں اور یہ بھی ہے کہ کبھی بچے کی تربیت میں اپنا انہماک و اشتغال ہوتا ہے کہ عورت کو اپنے مرد سے جماع کا موقع بھی میسر نہیں ہوتا اس پر کسی کو وہم ہو کہ جب وہ عورت مرد کو جماع کا موقعہ نہیں دیتی تو اب نان ونفقہ کا کیا معنی تو اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا دودھ پلانے والی عورتوں کے لئے لباس وخوراک ضروری ہے خواہ وہ جماع کا موقع دے یا نہ۔ کذاقال الوحدی فی البسیط)

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا کسی نفس کو صرف اس کی وسعت پر تکلیف دی جائے۔

حل لغات: التکلیف یعنی واجب کرنا اور کسی امر کے مکلف بنانے کا یہ معنی ہے کہ کسی پر اس امر کا اثر ظاہر کرنا۔

ترکیب: وُسْعَهَا لَا تُكَلَّفُ کا مفعول ثانی ہے اس لئے کہ مکلف متعدی بدو مفعول ہوتا ہے گویا یہ جملہ دو سوالوں کا جواب ہے۔

سوال: یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورتوں کی ضروریات پوری کرنا مردوں پر کیوں ضروری ہیں دوسرا یہ کہ ان ضروریات کو مردوں کی ضروریات سے کیوں مقدم کیا گیا ہے تو اس کے جواب میں فرمایا لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کی ضروریات مردوں پر اس لئے ضروری ہیں کہ عورتیں ضعیف البیان ہیں اس لئے وہ اپنی ضروریات کے لئے کمائی کی قدرت نہیں رکھتیں دوسرا وہ اپنے ازواج کی خدمات میں لگی رہتی ہیں بنا بریں انہیں فرصت ہی کہاں کہ وہ کمائی کریں اسی بنا پر ان کی کفالت مردوں پر رکھی گئی تا کہ اسلام پر تکلف العاجز کا شکوہ نہ رہے اسی طرح دوسرے سوال کی تقریر ہے کہ کفالت میں کفایت بالمعروف کی قید بھی اس لئے ہے۔ تا کہ اسلام سے تکلیف العاجز کا شکوہ نہ ہو۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا ماں کو بچے کی وجہ سے دکھ نہ پہنچایا جائے۔

حل لغات: نہی ہے دراصل لَاتُضَارَرْ (بکسر الراء الاولی) تھا اس وقت اس کا فاعل یہی عورت یعنی وَالِدَةٌ ہوگا اور اگر (بفتح الراء الاولی) ہو تو پھر وَالِدَةٌ مفعول بہ ہوگا اور ضِرَارًا فعل سے مفعول بہ واقع ہوگا پہلی ترکیب کے لحاظ سے معنی یوں ہوگا کہ وہ عورت اس بچہ کو سبب بنا کر بچے کے والد کو نقصان نہ پہنچائے مثلاً یہ کہ وہ دودھ پلانے سے انکار کر دے تاکہ بچے کی وجہ سے اس کا باپ خوراک ولباس میں اضافہ کرے اس کے بعد دودھ پلائے گی ایسے عورت کو نہ چاہئے۔

وَلَامَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ اور نہ باپ بچہ کی وجہ سے ماں کو دکھ پہنچائے مثلاً عورت سے بچہ چھین لے باوجود یہ کہ عورت خود دودھ پلانا چاہتی ہے اور اسے اپنے بچے سے محبت بھی ہے بہرحال مرد کو لائق نہیں کہ وہ عورت کو بچہ کی وجہ سے دکھ پہنچائے اور نہ ہی عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کو بچہ کی وجہ سے تکلیف دے کر بچہ جنتے ہی جواب دیدے کہ میں اسے دودھ نہیں پلاسکتی۔ دونوں مطالب کا حال ایک ہے وہ یہ کہ ہر دونوں مرد اور عورت کو چاہئے کہ ایک دوسرے پر بچہ کی وجہ سے رنج وغصہ نہ کریں۔

سوال: اس جملہ میں بچہ دونوں کی طرف کیوں منسوب ہوا ہے حالانکہ پہلے تو صرف باپ کی طرف منسوب ہوا

جواب: تاکہ ان دونوں کو بچہ کی محبت اور ملاطفت ذہن میں اترے کیونکہ وہ ان کا اپنا جگر ہے غیر تو ہے نہیں پھر اس کی وجہ سے جھگڑنے کا کیا معنی دونوں پر حق ہے کہ اس پر شفقت کریں یا اس میں تنبیہ ہے کہ وہ بچہ اس کا مستحق ہے کہ تم دونوں مل کر اس کی اصلاح کرو یہ بالکل نامناسب ہے کہ اسے تم ضرر پہنچاؤ یا اس کی وجہ سے تمہیں ضرر پہنچے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ مرے تو اس کی وراثت کا حقدار یہی بچہ ہو کہ جسے اب دودھ پلانا ہے یعنی بچے کو دودھ پلانے کے لئے دودھ پلانے والی کی ضروریات وارث کو ادا کرنا واجب ہیں یہ اس وقت ہے جب کہ بچہ کا باپ نہ ہو تو پھر ہر وہ ذی رحم محرم خرچ ادا کرے کہ ان میں کسی ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت قرار دیا جائے تو نکاح جائز نہ ہوسکے اس سے ہر قسم کے وارث مراد نہیں خواہ وہ ذی رحم محرم ہو یا نہ بلکہ وہی مخصوص وارث مراد ہیں جس کو ابھی ہم نے کہا خواہ وہ مرد ہو یا عورت مِثْلُ ذٰلِكَ یعنی جتنا مقدار بچہ کے باپ پر عورت دودھ پلانے والی کا نان نفقہ اور لباس وخوراک کا خرچہ واجب ہے اب اس کے نہ ہونے پر وارث ادا کرے۔

مسئلہ: حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ آیت مدت استحقاق پر محمول ہے اس لئے کہ اجماع امت ہے کہ مدت رضاع تک باپ پر دودھ پلانے کی مزدوری دینا ضروری ہے اور وہ دو سال کی مدت مقرر ہے یہاں تک کہ اس کے بعد باپ کو مزدوری دینے پر مجبور نہ کیا جائے گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ (آلایۃ)

مسئلہ: اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دو سال کے بعد بھی حرام نہیں ورنہ حرام ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ کا کوئی فائدہ نہیں۔

مسئلہ: حرمت مصاہرۃ کا ثبوت اڑھائی سال کے اندر دودھ پینے پلانے سے ہوگا امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک اڑھائی سال کے بعد دودھ پینے پلانے سے حرمت ثابت نہ ہوگی اور دو سال کے بعد ان کے نزدیک حرمت نہ ہوگی اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔

مسئلہ: دو سال تک تکمیل بھی امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک شرط نہیں وہ بھی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے وہ اس لئے کہ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ دلالت کرتی ہے کہ دو سال سے پہلے وہ دونوں راضی ہو کر دودھ چھڑا لیں تو کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ: مرد پہلے دودھ چھڑانا چاہتا ہے لیکن عورت اس کی تکمیل دو سال چاہتی ہے تو مرد پر اس کا خرچہ دینا ضروری ہے۔

مسئلہ: اگر مدت رضاع سے پہلے ہی بچہ کا دودھ چھڑا لے اور بچہ اتنا قوی محسوس ہوتا ہے کہ اسے دودھ چھڑا دینے سے نقصان نہ ہوگا اور دودھ کے علاوہ طعام پر گزارا کر سکتا ہے تو عورت کو تکمیل مدت پر مجبور نہ کیا جائے گا ہاں اگر بچہ کو دودھ پیتا ہے لیکن عورت نے خواہ مخواہ ایسے ہی دودھ چھڑا دیا ہے تو اب جہاں بھی دودھ پئے گا حرمت نکاح ثابت ہو سکے گی یہی امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ (ذکرہ الزیلعی)

ف: جیسے اللہ تعالیٰ نے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ میں بچے کی ماں کو حکم دے کر بچہ کی رعایت فرمائی ہے اسی طرح بچہ کے باپ کو اس کی ماں کی بھی رعایت فرمائی تاکہ بچہ کی تربیت صحیح طور پر ہو مثلاً دودھ والی عورت کے لئے کہا کہ اس کا طعام اور لباس بچے کے باپ پر ضروری ہے جب کہ دودھ پلانے سے پہلے عقد نکاح کرتے وقت متعین

کیا جائے اور طعام ولباس بھی مقدار معین ہو اور کبھی عرف کی وجہ سے یہ شرط متعین نہیں ہوتی مثلاً کہہ دیا جاتا ہے
کہ جتنا تجھے خوراک اور لباس کی ضرورت ہوگی وہ میں ادا کروں گا اب اجرت کی تعین کی ضرورت ہی کیا ہے
جب وہ جملہ امور کا کفیل بن رہا ہے چنانچہ مذکورہ بالا مسائل کو یوں بیان فرمایا وَعَلَى الْمَوْلُودِ اور جس کے لئے بچہ
پیدا ہوا ہے یعنی باپ پر ضروری ہے۔

سوال: وَعَلَى الْمَوْلُودِ کیوں نہیں فرمایا؟ مختصر بھی ہے اور مقصد بھی ایک ہے؟

جواب: تاکہ معلوم ہو کہ اولاد صرف آبا کے لئے ہوتی ہے اگر ولد کا لفظ ہوتا تو اس سے یہ مقصد ظاہر نہ ہوتا اس
لئے اولاد باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

حکایت: مامون الرشید بن ہارون الرشید نے جب خلافت کا مطالبہ کیا تو اسے ہشام بن علی نے کہا کہ تم
خلافت کے حقدار کیسے ہو جب تو لونڈی کا بچہ ہے مامون نے جواباً کہا درست ہے لیکن حضرت اسماعیل علی
نبینا وعلیہ السلام بھی ہاجرہ لونڈی کے صاحبزادے تھے اور حضرت اسحاق علی نبینا وعلیہ السلام بی بی سارہ
عورت کے صاحبزادے تھے لیکن ساری خدائی کے آقا حضرت محمد ﷺ حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہیں اس
کے بعد مامون نے یہ اشعار پڑھے۔

لا تزرعين بفتى من ان يكون له ام من الروم او سوداء و عجماء

فانما امهات الناس او عية مستودعات وللا بناء آباء

(**ترجمہ:** کسی کو طعنہ مت لگاؤ کہ اس کی ماں روم کی نسل سے ہے یا سیاہ رنگ اور زشت رو اس لئے کہ مائیں تو صرف
بچوں کی حفاظت گاہ ہیں ورنہ اصل تو آباء ہیں لیکن میری ماں اگرچہ لونڈی ہے لیکن ہارون الرشید کا بیٹا تو ہوں) کسی نے کیا
خوب کہا۔

مکن زنہا اصل عود چوبست دودش کہ چو مشک و خوبست

رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ ان کا طعام اور لباس جب کہ اپنے بچوں کو دودھ پلائیں اسی طرح ہر دودھ پلانے والی
دائیاں جب کہ دودھ پلانے کے لئے متعین ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بچہ کی ہر طرح کی نگہداشت ان کے ذمہ
ہے اسی طرح طعام بھی کیونکہ کھانے کی بوجہ دودھ پلا سکے گی اس لئے دودھ غذا ہی سے پیدا ہوتا ہے چونکہ لباس

اور خوراک ہر دونوں حوائج ضروریہ سے ہے ان کا دینا ضروری ٹھہرا بِالْمَعْرُوْفِ ساتھ معروف کے یعنی جیسے حاکم مناسب دیکھے اور باپ بھی وسعت رکھتا ہو ماہ اسباب خریدنے پر پھر تین ماہ واپسی پر اور تین ماہ اسباب بیچنے پر اس انگریز نے کہا سال کے بارہ ماہ ہوتے ہیں اور یہ بارہ ماہ تو تو نے بیع و شرا پر خرچ کر دیئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے کونسا وقت باقی رہا انگریز کی بات حضرت شفیق کے قلب پر اثر کر گئی آپ نے یکبار تجارتی امور ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت شروع کر دی اور مرتے دم تک آپ اسی مشغلہ میں رہے۔

سبق: اگر توفیق ربانی کسی رفیق ہو تو بندہ منازل طے کر لیا کرتا ہے اگرچہ اس کے مقابلہ میں کئی آفات آئیں یہاں تک کہ وہ مقصود کو پالیتا ہے اگر وہ نفس کا بندہ بن جائے تو اسے نہ کسی کی نصیحت اثر کرتی ہے اور نہ ملامت۔

حدیث شریف: حضور اکرم ﷺ کی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ ہے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے سے منہ پھیرنے کی ایک علامت یہ ہے کہ بندہ غیر مفید کلام میں مشغول رہے۔

ف: جس بندے کا کوئی لمحہ خدا کی یاد کے بغیر گزرے اسے سخت سخت ندامت کرنا چاہئے اور جس پر چالیس گھڑیاں گزریں لیکن اس کی نیکی اس کی برائی پر غالب نہ ہو تو اسے جہنم کے لئے تیار رہنا چاہیے اہل علم کے لئے یہ نصیحت کافی ہے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

بگو آنچہ دانی سخن سودمند	وگر ہیچ کس نیاید پسند
کہ فردا پشیمان بر آرد خروش	کہ اوج چرا حق نہ کردم بگوش

(ترجمہ: اے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ارشادات گرامی کے نصائح کی نصیحت قبول کرنے کی توفیق عطا فرما۔ امین)

تفسیر عالمانہ وَالْوَالِدٰتُ اس سے تمام مائیں مراد ہیں خواہ وہ مطلقہ ہوں یا غیر مطلقہ کیونکہ یہ لفظ عام اور اس پر تخصیص کی کوئی دلیل بھی نہیں اس لئے اسے اپنے عموم میں رکھنا ضروری ہے خبر ہے لیکن بمعنی امر یُرْضِعْنَ یعنی ماؤں پر ضروری ہے کہ وہ دودھ پلائیں بمعنی پستان کو دودھ کے لئے چوسنا اَوْلَادَهُنَّ اپنی اولاد کو والد، ولد کی جمع ہے بچہ کو کہتے ہیں نر ہو یا مادہ اور یہ امر ندب کا ہے اور وہ اس لئے کہ بچہ کی تربیت کے لئے دودھ ماں کا ہی اچھا ہوتا ہے بہ نسبت دوسری کے دودھ کے اس لئے کہ ماں کی ممتا مشہور ہے دوسروں کی

شفقت ماں کی شفقت میں کالعدم ہے اور خدب کا حکم اس لئے کہ بچہ کو صرف اس کے دودھ پر مجبوری نہیں ہاں اگر مجبوری ہو مثلاً وہاں اس کی ماں کے بغیر اور کوئی دودھ پلانے والا نہ ہو صرف بچہ ماں کے دودھ کے بغیر اور کسی کا دودھ پیتا ہی نہیں یا والد دودھ پلانے کی مزدوری ادا نہیں کر سکتا تو اس وقت ماں پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے جیسے بھوک سے مرنے والے کے لئے ہر اس شخص پر واجب ہو جاتا ہے کہ اس کی خبر گیری کریں۔

مسئلہ: دودھ پلانے کے حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عورتیں سوائے اولاد کے قریبی رشتہ داروں کے اوروں سے نکاح نہ کریں اگر وہ مطلقہ ہیں اس لئے کہ نکاح کے بعد وہ اپنے شوہروں کی خدمت میں مشغول ہو جائیں گی تو وہ اپنے بچوں کی تربیت کا حق ادا نہیں کر سکیں گی علاوہ ازیں تربیت پانے والے پر عورت کے شوہر کی نظر شفقت بہت کم ہوتی ہے اس لئے اس پر خرچ وغیرہا میں تنگی کرے گا۔

حَوْلَيْنِ یہ حال المشی سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شے منقلب ہو جائے اور سال چونکہ وقت اول سے وقت ثانی کی طرف منقلب ہوتا ہے اس لئے اسے حول کہا جاتا ہے کَامِلَيْنِ مکمل دو سال حَوْلَيْنِ کو کَامِلَيْنِ کی صفت سے اس لئے مؤکد کیا ہے کہ کبھی حولین میں چشم پوشی کی جا سکتی ہے اس لئے کبھی حولین بول کر ایک سال کامل اور دوسرے سال کا بعض حصہ مراد لیا جاتا ہے اقمت عند فلاں حولین میں فلاں شخص کے ہاں فلاں مکان میں دو سال ٹھہرا لیکن وہاں وہ ایک سال کامل اور دوسرے سال کا بعض حصہ ٹھہرتا ہے اس اعتبار سے اسے کاملین کی صفت مؤکد کیا گیا تاکہ مجاز کا احتمال باقی نہ رہے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اس کے لئے جو دودھ پینے کی مدت مکمل کرنا چاہتا ہے یہ بیان اس کا ہے جس کی طرف دودھ پلانے کا حکم متوجہ ہو گویا پوچھا گیا کہ یہ حکم کس کے لئے ہے تو اس کے جواب میں کہا گیا یہ حکم اس کے لئے ہے جو دودھ پینے کی مدت کو مکمل کرنا چاہتا ہے مراد وہ دودھ پلانے والی مائیں ہیں یا ان کے ساتھ ان کے آباء بھی مراد ہیں۔

مسئلہ: حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک مدت رضاع دو سال چھ ماہ ہے اور صاحبین کے نزدیک صرف دو سال ہیں دونوں کا استدلال اسی آیت سے ہے۔

مسئلہ: مدت رضاع علی اختلاف القولین کے بعد دودھ پلانا غیر مباح ہے اس لئے کہ اباحت بوجہ ضرورت

کے تھی اس لئے کہ دودھ انسان کا ایک جزو ہے اور انسان کا ایک جز و دوسرے کے اندر ڈالنا مناسب نہیں اس لئے اتنی مدت تک مقدر کیا جائے جتنی ضرورت ہے۔

مسئلہ: دودھ پلانے والی عورتوں اور ذی رحم محرم عورتوں کا نان ونفقہ کا وجوب ہم احناف اسی آیت سے ثابت کرتے ہیں فَاِنْ اَرَادَا پس اگر ماں باپ ارادہ کریں فِصَالًا دودھ چھڑانے کا۔

ف: دودھ چھڑانے کو فِصَالًا سے اس لئے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس وقت بچہ کو اپنی ماں کے دودھ سے جدا کر کے دوسری غذاؤں کی طرف لگایا جاتا ہے یعنی جب بچہ کو مدت رضاع سے پہلے دودھ چھڑانے کا ارادہ کر لیں بشرطیکہ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وہ دونوں آپس میں اس بات پر راضی ہوں ان میں ایک کی رضا کافی نہیں اس لئے ممکن ہے۔ کہ دودھ چھڑانے سے بچہ کو تکلیف دینا مطلوب ہو مثلاً عورت دودھ پلانے سے تھک گئی ہے یا مرد خرچ دینے میں بخل کرتا ہے اور بسا اوقات قبل از وقت دودھ چھڑانے سے بچہ کو جسمانی تکلیف لاحق ہو جاتی ہے۔ وَتَشَاوُرٍ اور احوال کے متعلق پورے طور تفتیش وتحقیق کے بعد طے کیا اور اس پر دونوں متفق ہو جائیں۔

حل لغات: وَتَشَاوُرٍ مشورۃ سے مشتق ہے بمعنی استخراج الرای من المستشار جس سے مشورہ لیا جائے اس کی رائے کا اظہار۔

سوال: ماں باپ دونوں کی رائے کا متفق ہونا ضروری کیوں ہے۔

جواب: باپ کی رائے اس لئے کہ اسے ولایت حاصل ہے اور ماں کی اس لئے کہ وہ بچہ پر زیادہ شفقت رکھتی اور اس کے حال کو بہت اچھا جانتی ہے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا پس دونوں پر اس کے متعلق کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی حرج ہے جب کہ دونوں دودھ چھڑانے پر راضی ہوں جب کہ دونوں کی رائے متفق ہو گئی اور دونوں نے سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ اب بچے کی بہتری دودھ چھڑانے میں ہے اور بہت کم اتفاق ہوا ہے کہ اس معاملہ میں دونوں کی رائے میں خطا واقع ہو۔

مسئلہ: کلام یہ کہ جب دونوں ماں باپ بچہ کے متعلق اڑھائی سال یا دو سال سے کم میں چھڑانے پر راضی ہیں تو انہیں بچہ کے دودھ چھڑانے میں کوئی گناہ نہیں جب کہ دونوں بچہ کی بھلائی اسی میں سمجھتے ہیں فَاِنْ اَرَدْتُّمْ اور اگر تم اے بچہ کے اباء ارادہ رکھتے ہو اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا یہ کہ دودھ پلانے والی عورتوں سے دودھ پلانے کا

مطالبہ کرو اَوْلَادَکُمْ اپنی اولاد کے لئے۔

ترکیب: اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا کا مفعول ثانی محذوف ہے اس لئے کہ استرضاع بلاواسطہ بدو مفعول ہوتا ہے مثلاً اہل لغت کہتے ہیں رضع الولد امه بچے نے ماں کا دودھ پیا اور رضعت المراة ولدها ماں نے اپنے بچے کو دودھ پلایا و استرضعتها الولد اس عورت سے بچہ کے دودھ پلانے کا مطالبہ کیا پچھلا فعل بلاواسطہ متعد بدو مفعول کی طرف حرف جر کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے اس کا اصل اَوْلَادَکُمْ تھا یعنی جب تم اپنی اولاد کے لئے دودھ پلانے کے لئے دودھ پلانے والی کو بچوں کے دودھ پلانے کا کہو۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ تو تمہیں اس کا کوئی گناہ نہیں دودھ پلانے کا کہو۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ باپ کو حق پہنچتا ہے کہ غیر عورت کو دودھ پلانے کے لئے کہے اور بچہ کی ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اِذَا سَلَّمْتُمْ جب تم دودھ پلانے والی کے سپرد کرو مَّآ اٰتَیْتُمْ وہ جو تم انہیں دودھ پلانے کی اجرت دینے کا ارادہ رکھتے ہو یہ محاورہ وہی ہے جو دوسری آیت میں ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ یعنی یہاں نفس فعل مراد نہیں بلکہ اس فعل کا ارادہ مقصود ہے بالمعروف اس کا تعلق سَلَّمْتُمْ ساتھ ہے یعنی وہ شے انہیں دو جو شرعاً عرفاً اچھی اور مستحسن ہے۔

مسئلہ: یہ عطیہ دودھ پلانے کے لئے شرط نہیں کہ بلکہ ندبا و استحساناً کہ انہیں دودھ پلانے کے لئے کچھ دینا بہت مناسب ہے اس لئے دودھ پلانے کی مزدوری یا عطیہ عورتوں کو نقد اور دست بدستی دیا جائے تو بچوں کے دودھ پلانے میں انہیں آسانی ہوگی اور بچوں کی اصلاح و تربیت احسن طریق سے ہوگی۔

ف: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اَلْمَعْرُوْفِ سے مرد حلال کی کمائی سے دودھ پلانے والی مزدوری دی جائے اس لئے کہ دودھ پلانے والی اگر حلال کا رزق کھائے گی تو بچہ کو نفع ہوگا اور اس کی تربیت کے لئے زیادہ مفید ہوگا اہل حکمت کہتے ہیں فطرکا تقاضا ہے جو شخص کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو اس کے اخلاق کا اثر اسی بچہ پر پڑتا ہے اچھے اخلاق ہوں یا برے اسی لئے کہا گیا ہے کہ بچہ کو ایسی عورت کا دودھ پلانا چاہیے جو احسن الاخلاق اور صلاحیت کی مالک ہو اس لئے کہ بیوقوف اور غلط کار عورت کا دودھ بچے کے اخلاق پر برا اثر انداز ہوتا ہے جس کا ظہور کسی نہ کسی وقت ضرور ہوگا۔

حدیث شریف: دودھ عادات کو تبدیل کر دیتا ہے۔

حکایت: شیخ ابن محمد الجوینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے دیکھا کہ ان کے صاحبزادے امام محمد ابو المعالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ان کی والدہ کے بغیر کوئی دیگر عورت دودھ پلا رہی ہے آپ نے آتے ہی بچے کو اس عورت سے چھین لیا اور اس لٹا کر الٹا کر کے اس کے اندر جو دودھ داخل ہوا انڈیل دیا بلکہ بچے کے پیٹ کو مل کر اور منہ میں انگلی ڈال کر جتنا دودھ پیٹ کے اندر گیا تھا سب کا سب باہر نکال دیا اور فرماتے تھے کہ بچے کا مر جانا مجھے اتنا تکلیف دہ نہیں ہوگا جتنا کہ اس کی طبیعت بیگانی عورت کے دودھ سے بگڑنے کا غم ہوگا یہی وجہ تھی کہ جب امام ابو المعالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو کسی وقت مناظرہ میں تنگی محسوس ہوتی تو فرماتے کہ افسوس ابھی اس عورت کے دودھ کا بقایا میرے اندر موجود ہے ورنہ اتنی تنگی محسوس نہ کرتا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ مذکورہ احکام کی رعایت اور بچوں کے دودھ پلانے اور دودھ پلانے والی عورتوں کے حقوق کے بارہ میں اللہ سے ڈرو وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یقین جانو کہ بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے اس پر تمہیں جزا و سزا دے گا بعض نے کہا اس میں وعید اور تہدید ہے جیسا کہ اہل فہم سے مخفی نہیں۔

حضرت حسین کاشفی فرماتے ہیں۔

گر برہنہ برہ بروں آئی	زود در تہمت جنوں آئی
جامعہ ظاہری کہ نیست بیر	تو فصیحت شوی میان بشر
فکر آں کن کہ بے لباس ورع	چہ کنی در مقام ہول و فزع
خویشتن در لباس تقوی دار	تا شوی درد کون برخوردار

تفسیر صوفیانہ یہ آیت قواعد صحت کی تمہید اور احکام معاشرہ میں محاسن اخلاق کی عظمت بیان کرنے پر مشتمل ہے بلکہ مخلوق کے لئے جمیع انواع رحمت و شفقت کو حاوی ہے اس لئے کہ قاعدہ ہے جو کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔

حدیث شریف: حضور نبی پاک شہ لولاک ﷺ نے اس شخص کے لئے فرمایا جس نے کہا میں نے تو کبھی اپنی اولاد کو بوسہ نہیں دیا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر بد بخت سے رحمت چھین لیتا ہے۔

حدیث شریف: اولاد کی محبت نارِ جہنم کی آڑ ہے اور ان کو باعزت بنانے میں پل صراط سے باآسانی گزرنا نصیب ہوگا اور ان کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں نارِ جہنم سے برأت حاصل ہوگی۔

حدیث شریف: بندے سے چار خرچوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا۔

۱۔ ماں باپ پر خرچ کرنا۔ ۲۔ افطار ۳۔ سحری ۴۔ اپنے عیال پر

ف: نرمی و مہربانی ایسے امور ہیں جو فطرتاً ممدوح ہیں جس کی عوام و خواص تعریف کرتے ہیں چنانچہ حدیث شریف میں ہے حدیث شریف کا مضمون حکایت کی صورت میں مندرجہ ذیل ہے۔

حکایت: ایک عورت تھی بدکار اس نے ایک دن کتے کو گرمی میں ایک کنوئیں کے اردگرد پھرتے دیکھا کہ وہ پیاس کے مارے زبان باہر نکالے ہوئے تھا اس نے کنویں سے پانی نکال کر پیاسے کتے کو پلایا اللہ تعالیٰ نے اسے اس عمل پر بخش دیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس عورت نے اپنا موزہ اتار کر اسے اپنے دوپٹہ سے باندھ کر کنویں کے اندر پانی نکال کر پیاسے کتے کو پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔

سبق: توبہ کے بغیر بھی اہل کبائر کی بخشش ہو سکتی ہے یہی اہل سنت کا مذہب ہے دوسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ جو بھی کسی بھوکے محتاج کو کچھ کھلائے تو وہ ثواب کا مستحق ہے۔

تفسیر عالمانہ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ اور وہ جو تم میں فوت ہو جاتے ہیں یعنی ان کی روحیں موت کی وجہ سے قبض کی جاتی ہیں۔

ف: يُتَوَفَّوْنَ کی یاء کو فتح سے پڑھا جاتا ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے اجل اور عمروں کو ختم کر چکے ہیں۔

حل لغات: دراصل شے کو پورا اور مکمل کر لینے کو کہتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے توفی الشئی واسعر فاہ مردے پر اس کا اطلاق اس لئے ہے کہ اس نے اپنی عمر اور اجل کو پورا کیا ہے وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا اور اپنے پیچھے عورتیں چھوڑ جاتے ہیں۔

ف: ازواج، زوج کی جمع ہے منکوحہ پر زوج اور ازواج کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اکثر لفظ زوج مرد پر مستعمل ہوتا ہے اور عورتوں کے استعمال کی مثال قرآن پاک میں ہے اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ اور مرد کے لئے جمع ازواج

آئے گی اور عورت کے لئے زوجات يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ یہ باء تعدیہ کی ہے یعنی وہ اپنے نفسوں کو انتظار میں ڈالیں جب کہ ان کے شوہر فوت ہو جائیں یہ ترجمہ ہم نے اس لئے کیا ہے تا کہ مبتداء عائد کے بغیر نہ ہو اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا چار ماہ اور دس دن یعنی اتنی مدت کسی سے نکاح نہ کریں اور عشرہ کی تمیز محذوف ہے یعنی عشرۃ ایام اور عشر کی تانیث لیالی کے اعتبار سے ہے اس لئے کہ اہل عرب کے نزدیک تاریخ اعتبار راتوں سے ہے اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مہینہ کا آغاز رات سے ہوتا ہے اس لحاظ سے دن رات کا تابع ہے۔

نکتہ: متوفی عنہا عورت کی عدت چار ماہ دس دن اس لئے متعین ہوئی کہ پیٹ کے اندر اگر لڑکا ہے تو تین ماہ پر متحرک ہوگا اگر لڑکی ہے تو چار ماہ پر ان دونوں میں جو مدت تھی اسی کا اعتبار کیا ہے اور دس دن بڑھانے میں اس مدت کو مزید تقویت پہنچانا مطلوب ہے تا کہ یقین ہو جائے کہ عورت کو حمل نہیں اور وہ یقینی طور پر کسی سے نکاح کر سکتی ہے ویسے بھی دس دن بڑھانے کی ضرورت بھی پڑتی ہے کیونکہ ابتداء میں پیٹ میں رہنے والا بچہ ضعف کی وجہ سے معمولی سی حرکت کرے گا اور معمولی سی حرکت سے معلوم نہیں ہو سکتا۔

فائدہ: آغاز اسلام میں متوفی عنہا عورت کی عدت مکمل ایک سال تھی اس کے بعد اسی آیت سے وہ حکم منسوخ ہو گیا صرف حاملہ کے حکم کو باقی رکھا گیا کہ ان کی عدت وضع حمل کے بعد ختم ہو گی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ

مسئلہ: اگر متوفی عنہا لونڈی ہو اور ہو بھی منکوحہ تو اس کی عدت آزاد کی عدت کا نصف ہوتی ہے اور اسی پر اسلاف کا اجماع ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ کا خطاب مومنین کو ہے۔

ف: اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا کتابیہ کے لئے یہ عدت نہیں۔ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ پس جب کہ عدت ختم ہو جائے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ پس تمہیں کوئی گناہ نہیں یہ خطاب حکام اور نیک مسلمانوں کو ہے اس لئے کہ اگر عورت اس عدت کے اندر کہیں نکاح کرنا چاہیے تو یہ حضرات اسے روک سکتے ہیں اگر انہیں روکنے کی طاقت ہے ورنہ سلطان وقت کو درخواست دے کہ اس عورت کو روک دیں۔ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ اس معاملہ میں جو نفسوں کے بارہ میں کرتی ہیں مثلاً زیب و زینت اور نکاح کے طالبین سے میل جول اسی طرح وہ امور جو عورت کو عدت کے دوران ناجائز اور حرام ہیں بِالْمَعْرُوْفِ یہ فعلن کے فاعل سے مفعول ہے اب عبارت یوں ہوگی یعنی وہ عمل

کرتی ہیں دریں حال کہ ملانے والی ہیں اسی وجہ کو جس کا شریعت انکار کرتی ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ اور جو بھی تم عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل کو جانتا ہے اور وہ تمہیں جزا دے گا فلہٰذا ان کے خلاف عمل نہ کرو۔

ہر کہ عاصی شود بامر خدا! بیخ او ورا بکند قہر خدا

ف: اس آیت میں تربص سے تین چیزیں مراد ہیں۔

۱۔ عدت کے اندر نکاح نہ کرنا اور یہ فرض ہے۔ ۲۔ جہاں اس کا شوہر فوت ہوا یہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا کر عدت گزارنا الا بقدر ضرورت اور یہ واجب ہے۔ ۳۔ زیب وزینت نہ کرے۔

سوال: آیت تو مجمل ہے اس میں کہاں لکھا ہے کہ عورت فلاں کام نہ کرے اور گھر سے باہر نہ جائے اور زیب و زینت بھی نہ کرے۔

جواب ۱: عدت میں عورت کا نکاح نہ کرنا اجماع اسلاف سے ثابت ہے اسی طرح جہاں اس کے شوہر کی وفات ہوئی ہے وہاں عدت گزارنا اور گھر سے باہر نہ جانا الا بقدر ضرورت اسی طرح زیب وزینت بھی نہ کرے یہ تمام مسائل اجماع سے ثابت ہیں۔

جواب ۲: حدیث پاک سے ثابت ہے چنانچہ بی بی عائشہ وحفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی پاک ﷺ نے فرمایا جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے حلال نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زائد سوگ منائے ہاں اپنے شوہر کے لئے اسے چار ماہ دس دن کی اجازت ہے۔

سوال: عورت پر سوگ منانا کیوں ضروری ہے؟

جواب: وہ اس لئے کہ جب اسے عدت کے اندر نکاح کرنا حرام ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انہی ایام میں زیب وزینت سے پرہیز کرے تا کہ کوئی وہم نہ کرے کہ یہ نکاح کی طالبہ ہے علاوہ ازیں سوگ سے ظاہر ہوگا کہ واقعی اسے نعمت نکاح کے چھن جانے سے بہت سخت افسوس ہے اور وہ نعمت ایسی تھی کہ اسے ہر طرح کی تکلیف سے بچاتی تھی اور نان ونفقہ اور قیام وطعام کی ضروریات پوری کرتی تھی وغیرہ وغیرہ۔

مسئلہ: سوگ صرف تین دن ہوتا ہے البتہ تیسرے روز عورت کو چاہیے کہ خوشبو لگائے تا کہ سوگ تین یوم سے زائد از حکم کے جرم کا ارتکاب کر بیٹھے گی اور وہ اس کے لئے حرام ہے۔

مسئلہ : یہ بھی سنت میں شامل ہے کہ جاہلیت کی تمام رسوم کو مٹایا جائے تا کہ وہ مردوں کے لئے دامن پھاڑے اور چہروں پر تھپڑ اور بال نوچے جیسے جاہلیت کے دور میں اہل عرب کی عادت تھی اس طرح کپڑے پھاڑنا عجمیوں کی عادت تھی اور چیخ مار کر رونا اور نوحہ کرنا۔

حدیث شریف: میں ہے حضور نبی کریم ﷺ نے ایسے امور کے مرتکب سے برأت کا اظہار فرمایا ہے اور جاہلیت کے امور کا ارتکاب کرتا ہے لیکن ہمارے دور کے لوگوں کے اکثر شہروں میں عادت ہے کہ وہ ان عادتوں میں مبتلا ہیں خصوصاً عورتیں ان کی عادت ہے کہ وہ سیاہ لباس پہنتی ہیں کئی ماہ تک ایسے ہی کرتی رہتی ہیں بہت تھوڑے لوگ ایسے ملیں گے جو میت کی فوتیدگی کے بعد اچھے اور نئے کپڑے پہنتے ہوں ورنہ اکثر سیاہ اور پرانے کپڑے پہنتے ہیں ان سے پوچھا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو جواباً یہی کہتے ہیں کہ ماں مرگئی ہے باپ مرگیا ہے وغیرہ وغیرہ اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک رہتا ہے۔

شیعہ کی تردید: اسی طرح رافضیوں کی عادت ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کی مصیبت کے خون پر بہت غلو کرتے ہیں اور عاشورہ کے ایام حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے وصال کا ہر سال سوگ مناتے ہیں اور اس کا نام رکھتے ہیں اور ان ایام میں علاوہ مذکورہ خرابیوں کے اور زیادتیاں کرتے ہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہ کو غلیظ گالیاں بکتے ہیں اور یہ کام تو ان لوگوں کا ہوسکتا ہے جن پر اللہ تعالی کا غضب اور عذاب ہو اوہ لوگ گمراہ ہیں شیعوں نے گویا سوگ کی ممانعت کی احادیث سنی بھی نہیں ہیں اللہ تعالی ہدایت دے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ مومن کی موت اپنی عورت کی جدائی کیلئے اختیاری ہوئی اور یہ جدائی بہت بڑی طویل ہوتی ہے اسی طرح بندہ سالک کا حال ہے کہ اس کی موت بھی اس کے مابین غیر اختیاری ہوتی ہے پھر اس کی عدت وفاء کی تکمیل بھی مطلوب کے حصول پر موقوف ہے جب اس کا محبوب کرم فرمائے تو اسے وصال کی دولت سے نوازے چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ مومنین کو تسلی دی جارہی ہے تا کہ اسے شیطان کے وساوس مطلوب کی ملاقات کے اسباب سے منقطع نہ کریں مثلاً شیطان کا بہت بڑا وسوسہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کا

وصال تو ایک بہت امر ہے بلکہ وہاں تک پہنچنا تو ناممکنات سے ہے پھر اے سالک تو تو نہایت کمزور ہے اور اتنا دور دراز سفر اور تیری عمر تو کچھ بھی نہیں پھر کیسے وہاں پہنچ سکے گا اس پر مولیٰ تعالیٰ کا کرم پکار اٹھتا ہے کہ اے سالک گھبرایئے مت جو شخص مجھے تلاش کرتا ہے وہ مجھے ضرور پالیتا ہے اور تیرے جیسے بہت سے عشاق اب بھی میری طلب میں موجود ہیں (کذافی التاویلات النجمیه قدس الله تعالی لنفسه الزکیه القدسیه الرضیه)

تفسیر عالمانہ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ جب عورت کا شوہر فوت ہو جائے اور وہ عورت صاحب مال اور حسین وجمیل ہو اور اس میں بہت سی ایسی خوبیاں پائی جاتی ہوں جن کی وجہ سے اسکے نکاح کے لئے رغبت ہے تو پھر ان کے لئے گناہ نہیں کہ نکاح میں اشارہ وکنایہ سے کام لیں چنانچہ فرمایا فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ التعریض بمعنی افهام المعنی بالشی المتحمل له ولغیره کسی شئے کا مطلب ایسے طریق سے بیان کرنا کہ اس میں مطلوب کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم بھی ہوسکتا ہو۔

مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ الخطبته (بالکسر) بمعنی نکاح کی منگنی وبالضم بمعنی وہ کلام جو وعظ اور زجر پر مشتمل ہو خطاب سے ماخوذ بمعنی کلام مثلاً کہا جاتا ہے خطب المراة ای خاطبها فی امر النکاح یعنی فلاں نے عورت سے نکاح کی بات کی۔

ف: یہاں پر النِّسَاءِ سے مراد عورت منکوحة الغیر مراد ہے یا طلاق رجعی کے سوا کسی دوسری طلاق کی وجہ سے عدت گزار رہی ہے تو اسے صراحت کے ساتھ نکاح کا پیغام بھیجا ہے تو اس کی حق تلفی نہ کرے اس وقت اس عورت سے نکاح کا صراحۃً پیغام بھیجنا جائز ہے چنانچہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا تمہارے میں سے کوئی نکاح کا پیغام نہ بھیجے جب اس کے بھائی نے اس سے پہلے نکاح کی بات کی ہو۔

مسئلہ: اس سے قبل کسی نے نکاح کا پیغام بھیجا ہے تو اس کی حق تلفی نہ کرے اس وقت اس عورت سے نکاح کا صراحۃً پیغام بھیجنا ناجائز ہے چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے میں سے کوئی نکاح کا پیغام نہ بھیجے جب اس کا بھائی اس سے پہلے نکاح کی بات کر چکا ہو۔

مسئلہ: اگر کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیج کر پھر صراحۃً اس کے نکاح کی بات سے باز آجائے تو پھر ایسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجنا جائز ہے۔

مسئلہ: جس عورت کو نکاح کا پیغام تو بھیجا جا چکا ہے لیکن شک ہے کہ نامعلوم شخص نے اس کے ساتھ نکاح کا ارادہ ترک کر دیا ہے تا حال بدستور ہے تو ایسی عورت کو نکاح کے پیام کے متعلق اختلاف ہے بعض کہتے ہیں جائز ہے بعض کہتے ہیں ناجائز ہے۔

مسئلہ: اسی طرح وہ عورت جسے طلاق مغلظہ ہوئی یا جائز ہے بوجہ لعان یا تو اس کو نکاح کا پیغام بھیجنا اشارۃً کنایۃً جائز ہے یا نہ بعض کہتے ہیں جائز ہے اور بعض کہتے ہیں ناجائز ہے۔

مسئلہ: وہ عورت جو بائنہ ہوتی ہے لیکن شرعاً اس کے شوہر کے لئے روا ہو کہ وہ عدت کے اندر دوبارہ نکاح کرے مثلاً جس عورت سے خلع ہوا ہے یا جس عورت کا نکاح فسخ ہوا یہ بوجہ عیب کے یا نامرد ہونے کے تہمت سے یا مرد کی تنگدستی کے ثبوت پر تو اس وقت صرف اس عورت کو صراحۃً نکاح کا پیغام بھیجے یا کنایۃً ہاں اس کے شوہر کے غیر کو اجازت نہیں کہ وہ صراحۃً یا کنایۃً نکاح کا پیغام بھیجے کیونکہ وہ متعدہ ہے صرف زوج کو اس کے پیغام بھیجنے کا حق پہنچتا ہے اور وہ بھی صرف عدت تک اس کے بعد حکم تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ عورت رجعی طلاق کی عدت میں ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

تعریض کی چند صورتیں: تعریض کی صورت یہ ہے کہ مثلاً کہے کہ میں اچھے اخلاق کا مالک ہوں میں بہت زیادہ خرچ کرتا ہوں اور معاشرہ کے لحاظ سے میرے جیسا اور کوئی نہیں اسی طرح اپنے نفس کی خوب تعریف کرے (مگر نہایت مہذب اور شائستہ طریقہ سے) تا کہ اس عورت کو اس کے ساتھ نکاح کی رغبت ہو یا یوں کہے اے فلانی تیرے چاہنے والے بہت اور تیرے لئے بہت لوگ حرص رکھتے ہیں اسی طرح ایسے الفاظ استعمال کرے جس میں اس عورت کو محسوس ہو کہ وہ اس سے نکاح کا ارادہ رکھتا ہے تا کہ عدت گزارنے کے بعد وہ عورت کسی کو نکاح کا وعدہ نہ دے اگر اس سے نکاح کا ارادہ رکھتی ہے اور عدت اور نکاح کی تصریح نہ کرے مثلاً یوں نہ کہے کہ میرا ارادہ ہے کہ میں تیرے ساتھ نکاح کروں یا تیرے ساتھ میرا بیاہ یا تیرے ساتھ میری منگنی ہو جائے وغیرہ وغیرہ بہرحال جیسے متعدہ (عدت والی عورت کے) ساتھ عدت میں نکاح حرام ہے اسی طرح صراحت کے ساتھ اسے نکاح کی دعوت دینا بھی حرام ہے۔

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۔ **اَوْ اَكْنَنْتُمْ** کا مفعول بہ محذوف ہے اور وہ ضمیر ہے جو ما موصلہ کی طرف لوٹتی ہے جو کہ

فِيمَا عَرَّضْتُمْ میں یہ بمعنی یا تم ان کے ساتھ نکاح کرنے کو چھپاؤ اپنے دلوں میں کہ نہ اسے زبان پر لاؤ اور نہ ہی اسے اشارہ و کنایہ سے کچھ پوچھو۔

مسئلہ: پہلی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدت میں نکاح کے لئے اشارہ کنایہ مباح ہے لیکن تصریح حرام ہے اور اس آیت کے دوسرے جملہ یعنی اَوْ اَكْنَنْتُمْ سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح کی ضرورت کو دل ہی دل میں رکھے اس کا عزم ہو تو بالجزم ہو کہ عدت کے گزارنے کے بعد ضرور بالضرور اسی عورت سے نکاح کروں گا۔

هُنَّ عدت میں اشارہ کنایہ کے ساتھ نکاح کی اباحت بتا کر اب اس اباحت کی وجہ جواز بتاتے ہوئے فرمایا عَلِمَ اللهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ بے شک تم انہیں ضرور یاد کرو گے اور تمہیں چونکہ ان سے رغبت ہے اس لئے ان کے ساتھ بولنے سے رکو گے نہیں اس سے مقصود وہی ہے کہ تمہارے لئے عدت میں نکاح کی دعوت اشارہ کنایہ سے جائز ہے وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ، سِرًّا کا منصوب ہونا تو تُوَاعِدُوْهُنَّ کے دوسرے مفعول بہ ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ جملہ محذوفہ استدراک ہے جس پر سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ دلالت کرتا ہے یعنی انہیں یاد کرو اور بے شک انہیں اپنی رغبت کا اظہار کرو لیکن اس نے عدت ختم ہونے تک نکاح کا وعدہ نہ لو بلکہ جس قدر تمہیں رخصت دی گئی ہے اسی قدر اس پر اکتفا کرو مثلاً یہ کہ نکاح کے لئے صرف اشارہ و کنایہ سے کام لو اور صرف اسے دل ہی دل میں رکھو کیونکہ اس کا سبب وہی وطی ہے جس سے تم خوشی پاؤ گے اِلَّا اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا یہ استثناء مفرغ ہے مستثنی منہ وہ ہے کہ جس پر نہی دلالت کرتی ہے یعنی ان متعدد عورتوں سے کسی قسم کا وعدہ نہ لو ہاں وہ وعدہ لے سکتے ہو جس میں شرعاً کسی قسم کی قباحت نہ ہو یعنی جس میں وہ نکاح کا وعدہ بطریق تعریض و تلویح ہو وَلَا تَعْزِمُوْا یہ عزم سے مشتق ہے العزم عبارة عن عقد القلب علی فعل من الافعال قلبی ارادہ میں کسی فعل پر پختہ ارادہ کرنا یہ خود بخود بھی اور الی کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے۔

فائدہ لغویہ: انسان سے فعل کے صدور کے اسباب کے چند مراتب ہیں۔

۱۔ سانح ۲۔ خاطر ۳۔ تفکر ۴۔ ارادہ ۵۔ ہمت ۶۔ عزم ۷۔ ہمت نفس کے کسی امر پر جمع ہونا اور عزم اس امر کو کر گزرنے کا نام ہے۔

عُقْدَةَ النِّكَاحِ یعنی عقد نکاح کے لئے پختہ ارادہ نہ کرو کیونکہ عزم دلی ارادہ کو کر گزرنے کو کہتے ہیں اس کا نکاح

تعلق فعل سے ہوگا اور عقد النکاح کی اضافت بیانیہ ہے اس لئے کہ یہاں پر عقدہ بمعنی ربط المکلف اجراہ تصرف نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سے حاصل مصدر مراد ہے یعنی ارتباط شرعی جو کہ ارتباط شرعی جو کہ عاقدین یعنی زن وشوہر کے نکاح سے حاصل ہوگا۔

مسئلہ: اس میں نہی کی گئی ہے کہ عورت جب عدت گزار رہی ہو اس کے ساتھ نکاح نہ کرو۔

سوال: آپ نے نکاح کی نہی کہاں سے سمجھی جب کہ آیت میں صرف عزم نکاح کی نہ کا ذکر ہے؟

جواب: اس میں مبالغہ ہے کہ جب نکاح کا عزم ناجائز ہے تو نکاح تو بطریق اولی ناجائز ہے اور ویسے عزم فعل کے صدور سے مقدم ہوا کرتا ہے جب مقدم الشئی سے نہی کی گئی تو شئی کی نہی خود بخود ہوگئی کیونکہ قاعدہ ہے مقدمات الشئی کی نہی مستلزم ہے شئی کی نہی کو۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ یہاں تک کہ کتاب اپنی میعاد تک پہنچ جائے یہاں کتاب بر مکتوب یعنی فرض کیا ہوا حکم اب معنی یہ ہوا کہ عدت مقررہ اپنی آخری میعاد کو پہنچے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالی جانتا ہے وہ جو تمہارے نفسوں میں ہے یعنی وہ تمہارے ارادہ جو شرعاً ناجائز ہیں اور جان لو بے شک اللہ تعالی بخشنے والا ہے تمہارے ان ارادوں کو جو صرف خیال میں ہیں لیکن اللہ تعالی کے خوف سے عمل در آمد نہیں ہوا حلیم حوصلے والا ہے کہ سزا دینے میں جلد نہیں کرتا اس۔ لئے تم دلیل نہ پکڑو کہ جن امور سے تم روکے گئے اس کے ارتکاب پر سزا میں تاخیر کرتا ہے تو اس وجہ سے تمہارے لئے جواز نکل آتا ہے تمہارا یہ خیال غلط ہے فلہذا جن اوامر کا اللہ تعالی نے تمہیں حکم فرمایا ہے ان پر کاربند ہو جاؤ اور زندگی کو غنیمت سمجھ کر حکم الہی مانو اور اس پر عمل کرو ورنہ پھر پچھتاؤ گے جیسے کہ کوتاہی کرنے والے حسرت کرتے ہوں گے۔

چوں توانستم ندانستم چہ سود چوں بدانستم توانستم نبود

فائدہ: آیات میں اللہ تعالی نے اس شخص کو زجر و توبیخ فرمائی ہے جو خواہشات نفسانیہ اور شہوات کی طرف میلان رکھتا ہے اور پھر ان کی کسی طرح بھی رخصت شرعیہ نہیں۔

سبق: دانا پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالی کی خوشنودی کو اپنی خواہشات پر ترجیح دے اور آل واولاد اور جان اور عورت میں اگر کوئی مطلب ہو تو صرف اللہ تعالی کے لئے۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہے اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو جس کی طرف اس نے ارادہ کیا ہے غور کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے جزا کا ترتب ویسے فرمایا جیسے ان کی آرزو اور تمنا ہے اور ہر ارادہ کرنے والے کو وہی ثواب ملتا ہے جو اس کی قصد اور ارادہ ہے۔

تنبیہ: حدیث شریف میں دوبارہ دنیا کا ذکر نہیں فرمایا اس میں غور خوض کا سبق ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے نزدیک دنیا اتنی خیس و ذلیل ہے کہ اس کا ذکر کرنا بھی گوارہ نہیں کرتا اور حق یہ ہے کہ دنیا صرف لہو ولعب ہے گویا اس کا وجود نہیں غور کیجئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فھجرتہ الی ماھاجر الیہ فرما کر کیسی حکمت سے ماسوی اللہ سے دور رہنے کا درس دیا ہے۔

حدیث شریف: میں مزید تدبر کا مقام ہے کہ ایک ہی مقام پہ دنیا اور عورت کا ذکر فرمایا ہے باوجود یہ کہ ان دونوں کی آپس میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں لیکن حقیقت میں نکاح سے مخفی نہیں کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی ہر شئے کا مقصد اعلیٰ شہوت ہے یا مال شہوت کی طرف امراۃ سے اور مال کی طرف دنیا سے کنایہ فرمایا۔

سبق: حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ دنیا بلکہ ہر ماسوی اللہ سے علیحدگی اختیار کرے۔

ف: حضرت ابوسفیان دارانی قدس سرہ نے فرمایا جس نے تین چیزیں طلب کیں وہ دنیا کی طرف جھک گیا۔

۱۔ طلب معاش ۲۔ طلب تزوج عورت ۳۔ طلب قصص و کہانیاں

تفسیر صوفیانہ سالک کو چاہیے کہ علوم شرعیہ میں سے وہ علوم حاصل کرے جو حق و باطل کے مابین امتیاز پیدا کریں اور علوم رسمیہ اور فنون متداولہ سے بھی اتنا قدر پڑھے جتنا کہ حدیث و تفسیر کو سمجھنے کی تقویت نصیب ہو اس سے زائد جھگڑے میں نہ پڑے مثلاً فلسفیات یا دیگر دقیق علوم وفنون ہیں اس لئے کہ قدر ضرورت ہے زائد بلکہ حقیقت کی رو سے انہیں پڑھنا ممنوع ہے یہی اہل شریعت وطریقت کا اصول ہے اور یہ مبتدی کے احوال سے ہے اور اہل نہایت کی بات کچھ اور ہے اور یہ کہ سالک علوم ظاہر سے بھی اتنا مشغلہ رکھے جو ضرورت کے مطابق ہو ضرورت سے بڑھے گا تو حق سے محروم ہو جائے گا اس لئے کہ اس کے وظائف میں سے کہ وہ تنہار ہے اور انقطاع ماسوی اللہ کا عامل ہے اور کم کلام اس کا شیوہ ہے بلکہ کسی سے بات کرنا ہی

گوارہ نہ کرے اور باطل کو علائق سے فارغ رکھے اگرچہ وہ علائق علوم ہی کیوں نہ ہوں اپنے سے مشاغل خارجیہ وداخلیہ کو دفع کرے ومشاغل خصوصی ہوں یا عمومی لیکن یاد رہے کہ ان مشاغل کا بالکلیہ ترک کا حکم نہیں اور بلکہ ان مشغولیت غیر مقصود ہے نہ کہ جیسا کہ بعض جہال صوفیہ کا خیال ہے (نعوذ باللہ من ھذا) اس لئے کہ علم مطلقاً نور علی نور ہے اور سی سے سالک اپنی منازل طے کرتا ہے باقی رہے منتہی سالکین ان کے احوال کا تو کوئی کنارہ ہی نہیں نہ وہ کثرت کی وجہ سے وحدت سے محجوب ہوتے ہیں اور نہ ہی وحدت کی وجہ سے بلکہ وہ مقام اغیار سے پار ہوتے ہیں بلکہ عین مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں وہ جہاں نظر ڈالتے ہیں انہیں حق کا مشاہدہ ہوتا ہے بلکہ انہیں غیریت بھی حقیقت نظر آتی ہے ان کی نظروں میں حقیقت غیرت یکساں ہو جاتی ہے نہ صرف اعتبار بلکہ حقیقۃً حضور علیہ السلام نے عورتوں کو محبت کا اظہار فرمایا ہے وہ یہی محبت نہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں اس محبت کا راز مخفی خزانہ ہے اسے وہی جانتے ہیں جنہیں حضور سرور عالم ﷺ کی وارثت کبریٰ نصیب ہو۔

تنبیہ : فقری جامع ہذہ المجالس النفسہ یعنی مصنف روح البیان قدس سرہ کہتا (فرماتے ہیں) ہے کہ ہم نے یہ کلام اس لئے طویل کر دیا یہ تا کہ کوئی گمان نہ کرے کہ بعض صوفیانہ جنہیں جہال سے تعبیر کیا گیا ہے ان کے اقوال خرافات اور اباطیل ہیں بلکہ ان کا بھی کوئی محمل ہے ان میں بعض کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ہے ہاں وہ شخص معذور ہے جو یہ راستہ نہیں چلا جب وہ اس راہ پر آیا نہیں تو وہ اہل تحقیق وتدقیق کے تعارف میں کیسے واقف ہو سکتا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ

تم پر کچھ مطالبہ نہیں تم عورتوں کو طلاق دو جب تک تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو یا کوئی مہر مقرر کر لیا

فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ

ہو اور ان کو کچھ برتنے کو دو مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگ دست پر اس کے لائق حسب دستور کچھ برتنے کی چیز

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ

یہ واجب ہے بھلائی والوں پر۔ اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دیدی اور ان کے لیے کچھ مہر

لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ

مقرر کر چکے تھے تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے مگر یہ کہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں

النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا

نکاح کی گرہ ہے اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیز گاری سے نزدیک تر ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کو بھلا نہ دو بیشک اللہ

تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿٢٣٨﴾

تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔ نگہبانی کرو سب نمازوں کو اور بیچ والی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ

پھر اگر خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار جیسے بن پڑے پھر جب اطمینان سے ہو تو اللہ کی یاد کرو جیسا اس نے سکھایا

تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً

جو تم نہ جانتے تھے۔ اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لیے وصیت

لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ

کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ دینے کی بے نکالے پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس کا مواخذہ نہیں جو انہوں نے اپنے معاملہ میں

فِيۡٓ اَنۡفُسِهِنَّ مِنۡ مَّعۡرُوۡفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝ وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ

مناسب طور کیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے اور طلاق والیوں

مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ

کے لئے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر اللہ یونہی بیان کرتا ہے تمہارے لئے اپنی

اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝

آیتیں کہ کہیں تمہیں سمجھ ہو

تفسیر عالمانہ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں اس آیت میں جناح سے مراد حق مہر ہے یعنی تمہارے حق مہر کا مطالبہ نہیں اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡهُنَّ اگر تم ان عورتوں کو طلاق دے دو جب ان سے تم نے جماع نہیں کیا۔

ف: ابن الشیخ نے فرمایا کہ آیت میں کلمہ ما مصدریہ ظرفیہ ہے اور اس کا ظرف زماں محذوف ہے اصل عبارت یوں تھی اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً کہ ان کے لئے مقرر کردہ حصہ ادا کرو یہاں پر الا لازمنک او تعطینی حقی کی طرح بمعنی الا ان ہے یعنی ادا کروان کے لئے وہ جو عقد کے وقت حق مہر مقرر کی تھی خلاصہ یہ ہوا کہ کوئی مطالبہ نہیں حق مہر کا طلاق دینے والے پر جب کہ طلاق جماع سے پہلے ہو۔

مسئلہ: اگر حق مہر مقرر کر دی گئی ہو تو اس وقت نصف حق مہر ادا کرنا لازمی ہے۔

مسئلہ: جب عورت کے لئے حق مہر کی بالکل نفی کی گئی ہو تو اس عورت کے لئے متعہ چند کپڑے ہے نہ نصف حق مہر۔

مسئلہ: اگر جماع کے بعد طلاق دی گئی تو مہر دیکھا جائے گا یعنی اگر حق مہر مقرر کی گئی ہے تو کامل حق مہر ادا کرنا ہوگی اگر مقرر نہیں کی گئی تو پھر مثل کامل ادا کرنی ہوگی۔

وَمَتِّعُوْهُنَّ اس کا عطف مقدر فعل پر ہے اصل عبارت یوں تھی فطلقوهن ومتعوهن یعنی انہیں طلاق دے کر انہیں متعہ کی ادائیگی سے وحشت کا بدلہ دیا ہے۔

شرعی متعہ کی تفسیر: متعہ تین کپڑوں کا نام ہے ۱۔ درع یعنی وہ کپڑا ہے جو تمام بدن کو ڈھانپتا ہے۔
۲۔ ملحفہ وہ کپڑا جو عورت کو چھپالیتا ہے جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے ۳۔ خمار وہ کپڑا جو عورت کے سر کو چھپالیتا ہے یعنی دوپٹہ یہ کپڑے شوہر کے حال کے مطابق ہوتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عَلَى الْمُوْسِعِ یہ اوسع الرجل سے ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کی حالت وسعت پذیر ہو یعنی وہ شخص صاحب وسعت ہو کر دولت مند ہو جائے یعنی وہ شخص کہ جسے دنیوی وسعت حاصل ہو۔ قَدَرُهٗ اس کی طاقت اور امکان کے مطابق وَعَلَى الْمُقْتِرِ اور تنگدست پر۔ یہ اقتر الرجل سے ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کوئی محتاج اور تنگدست ہو تتر غبار کو کہتے ہیں یعنی مٹی کے ذرات قلیل آمدنی والے اور تنگدست پر بولا جاتا ہے قَدَرُهٗ اس کی طاقت وامکان کے مطابق اس سے نتیجہ نکلا کہ متعہ کا اعتبار مرد کے حال کے مطابق ہوگا نہ عورت کے حال کے مطابق وہ پانچ درہم سے کم اور نصف مہر مثلی سے زائد نہ ہو اس لئے کہ جو حق مہر ہو جائے وہ مہر مثلی پر فوقیت رکھتی ہے اور متعہ بھی مقرر کردہ مہر کے نصف سے زائد نہ ہو قدر بالسکون وبفتح تین ہر دونوں کا ایک ہی معنی ہے بعض کہتے ہیں کہ اگر بالساکن ہو تو مصدر ہے اگر متحرک ہو تو اسم مصدر ہے جیسے عدو عدہ اور مد و مدد اور قدر بالسکون بمعنی وسعت جیسے کہا جاتا ہے ینفق علی قدرہ یعنی وہ خرچ کرتا ہے اپنی طاقت وامکان کے مطابق اور بالتحریک بمعنی مقدار مَتَاعًا فعل مذکورہ کا مصدر یہ انبتکم من الارض نباتا کے قبیل سے ہے یعنی فعل مزید کے ابواب سے ہے اور مصدر مجرد کے ابواب سے یعنی نفع اٹھانے میں جو کچھ حاصل ہونے والا ہے بِالْمَعْرُوْفِ اس وجہ کے ساتھ جسے شریعت اور مروت نے مستحسن فرمایا حَقًّا یہ مَتَاعًا کی صفت ہے یعنی عورتوں کو نفع دینا واجب ہے عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ نیک لوگوں پر یعنی وہ لوگ جو اپنے نفسوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں نیکی کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔

فائدہ اصولیہ: ابن التجید فرماتے ہیں کہ مطلقہ عورتوں کے چار احوال ہیں۔
۱۔ طلاق سے پہلے اس عورت سے دخول نہیں ہوا اور اس کے لئے حق مہر مقرر بھی نہیں ہوئی۔
۲۔ اس سے دخول بھی ہوا ہے اور حق مہر بھی مقرر ہوئی ہے۔

۳۔اس سے دخول ہوا ہے لیکن حق مہر مقرر نہیں ہوئی ۔۴۔اس سے دخول نہیں ہوا لیکن حق مہر مقرر نہیں ہوئی ہے

ف: رفع الجناح سے مہر کی نفی مراد ہے وہ بھی مذکورہ بالا صورتوں میں سے صرف پہلی صورت میں اور باقی صورتوں میں حق مہر ادا کرنی پڑیگی اور پہلی صورت میں بھی حق مہر نہ تمام واجب اور نہ بعض اس لئے کہ مہر مثلی کو نصف نہیں کیا جاتا ہے کل حق مہر اس لئے نہیں کہ وہ غیر مدخول ہوتا ہے ہاں اس کے لئے متعہ ہے جیسے اللہ تعالی نے فرمایا ہے وَمَتِّعُوهُنَّ یہ ان کے حق میں ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی وہ عورتیں جو غیر مدخولہ بہا ہیں اور ان کی حق مہر متعین بھی نہیں ہاں جب ان کے لئے حق مہر مقرر ہو جائے تو اس وقت کامل حق دینی ہوگی نہ متعہ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً یعنی اگر انہیں طلاق دے دو جماع کرنے سے پہلے جب کہ نکاح کے وقت ان کے لئے تم نے مہر مقرر نہیں کی فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ پس ان کے لئے نصف مہر ہے اس کا جو تم نے مقرر کیا ہے۔

مسئلہ: اگر مرد عورت میں سے کوئی دخول سے پہلے فوت ہو جائے تو کامل حق مہر ادا کرنی پڑے گی جب کہ وہ متعین کر چکے ہیں اگر متعین نہیں ہوئی تو مہر مثلی کامل دینی ہوگی۔

اِلَّا اَنْ يَّعْفُوْنَ یہ استثناء ازعم الاحوال ہے یعنی پس ان کے لئے مہر مقرر کردہ شدہ کا آدھا حصہ ہے ہر حال میں ہاں اس وقت جب کہ وہ عورتیں حق مہر معاف کر دیں یعنی اگر مطلقہ عورتیں اپنی حق مہر معاف کر دیں پس اس وقت وہ حق مہر معاف ہو جاتی ہے اگر چہ اس سے قبل حق مہر واجب ہے اَوْ يَعْفُوَا الَّذِیْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے یعنی عقد نکاح کا مالک یعنی زوج چھوڑ دے وہ جو نکاح کی وجہ سے واجب ہوا تھا نصف مہر سے مکمل طور جیسا کہ عام عادت تھی ہے عزت واحترام کی بناء پر ہے اس لئے کہ جب مرد اپنی عورت سے اپنا حق معاف کر سکتا ہے تو عورت بھی اپنا حق معاف کر دے تو کیا حرج ہے۔

ف: اَلَّذِیْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے مرد زوج ہے کہ متولی اور عفو کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرد عورت کو حق مہر کامل طور پر دے آدھا حصہ تو اس لئے کہ اس پر واجب ہے اور دوسرا آدھا حصہ جو اس سے معاف ہو گیا تھا وہ بھی دے دے

سوال: عفو تو وہ شئے ہوتی ہے جو وجوب سے زائد ہو یہاں پر زائد از وجوب کا کیا معنیٰ؟

جواب: اہل عرب کی عادت تھی کہ نکاح کرتے ہی عورت کو مکمل حق مہر ادا کر دیتے لیکن از دخول طلاق مرد کو حق

پہنچتا کہ وہ آدھا حصہ واپس لے لے واپس لوٹانے کے وقت مرد عورت کو آدھا بچایا حصہ معاف کر دیتا اس بناء پر اسے عفو سے تعبیر کیا گیا وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی تقوی کی لام علت کی ہے جو کہ قرب عفو کی علت پر دلالت کرتی ہے اصل عبارت یوں تھی العفو اقرب من زحل التقوی یعنی عفو زیادہ قریب ہے تقوی کی وجہ سے اس لئے کہ اس وقت مرد کا کچھ مال لینا سمجھا جائے گا کہ گویا یہ عوض معوض عنہ کے بغیر لے رہا ہے یا یوں کہو کہ ترک مروت بھی تقوی کے خلاف ہے۔

حدیث شریف: مرد کے بخل پر اتنا دلالت کافی ہے کہ وہ کہے کہ میں حق کیوں چھوڑوں میں تو مکمل طور پر لوں گا۔

حکایت: اصمعی کی کہانیوں میں ہے کہ ایک اعرابی کسی قوم کے ہاں آیا تو انہوں نے پوچھا کہ بہتر کیا شئے ہے اعرابی نے کہا معاف کر دینا دوسرے پر احسان کر کے حق کا مطالبہ نہ کرنا کسی سے اپنا حق وصول کرنے سے بہتر ہے۔ (کذا فی المقاصد الحسنہ)

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ اور آپس میں اللہ تعالی کے فضل کو مت بھولو یہاں پر نسیان کا عین مراد نہیں کیونکہ وہ انسان کے امکان میں نہیں بلکہ نسیان سے ترک الفضل مراد ہے اب معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالی کے فضل کو نہ بھلاؤ اور فِیْمَا بَیْنَكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ مرد اپنی عورت کو مکمل طور پر ادا کرے اور عورت اپنے حق مہر کا مکمل حصہ حاصل کرے آیت میں زن و شوہر سب کو احسان و افضال پر برانگیختہ کرنا مطلوب ہے اور بَیْنَكُمْ ، لَا تَنْسَوُا کی وجہ سے منصوب ہے۔ حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

کسے نیک بیندہ بہر دو سرا ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ نیکی رساند بخلق خدا

ترجمہ: (دونوں جہانوں میں ہر وہ شخص نیکی دیکھے گا جو خلق خدا کو نیکی پہنچاتا ہے)

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ بے شک تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے جو کچھ بھی تفضل و احسان کرتے ہوا سے ضائع نہیں کرتا اور بصر اللہ تعالی کے حق میں عبارت ہے اس وصف سے کہ جس سے مبصرات کے اوصاف مکمل طور پر منکشف ہو جائیں اس سے واضح اور روشن تر ہے کہا گیا ہے ھو ادرک البصر یعنی بصر کا ادراک عام اس لئے کہ یہ ظاہری اشیاء تک محدود رہتا ہے۔

ف: انسان کو بصر سے دینی فائدے دو ہیں۔

ا۔اسے معلوم ہو کہ آنکھ اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ آیات اور عجائب الملکوت و السموت کو دیکھے اس کی نظر صرف عبرت کے لئے ہو۔

حکایت: حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے کہا گیا آپ جیسا کوئی اور بھی دنیا میں ہے آپ نے فرمایا ہاں وہ شخص کہ جس کی نگاہ عبرت کے اور اس کی خاموشی فکر اور فکر اور اس کا کلام ذکر کے طور ہو تو وہ میرے مثل ہے۔

۲۔اسے معلوم ہو کہ اس کی آنکھ اللہ تعالی کے دیکھنے اور سننے کی جگہ ہے پس اللہ تعالی کے دیکھنے اور سننے اور اس کی اطلاع کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے جو شخص غیر اللہ سے چھپ کر کام کرتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ وہ اللہ تعالی سے مخفی نہیں تو پھر وہ اللہ تعالی کی نگاہ کی حقارت کرتا ہے۔

ف: مراقبہ اسی طریق سے ہو تو ایمان کے ثمرات میں سے ہے وہ شخص جو جانتا ہے کہ اللہ تعالی میرے حال کو دیکھ رہا ہے پھر بھی گناہ کرتا ہے پھر اس جیسا خسارہ اور نقصان کسے حاصل ہو گا اور جسے گناہ کے وقت یہ گمان ہو کہ وہ مجھے نہیں دیکھ رہا تو اس جیسا کافر اور کون ہو گا۔ (کذا فی شرح الاسماء الحسنی الامام الغزالی قدس سرہ)

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ جب اپنے ہمجولیوں اور دوستوں اور اہل و عیال سے دنیوی لحاظ سے جدا رہنا کوئی گناہ نہیں تو پھر دینی مصلحت پر ان سے جدا ہونا کیسے گناہ ہو سکتا ہے بلکہ جب بیت اللہ کی زیارت کے لئے ان سے جدا ہونے پر تم مامور من اللہ ہو تو پھر اللہ تعالی کی زیارت کے لئے جدا ہونے پر تمہیں کیسے گناہ ہو سکتا ہے بیت اللہ کی زیارت کے لئے اہل و عیال اور وطن سے جدا ہونا واجب ہے لیکن اللہ تعالی کی زیارت کے لئے ارواح اور ابدان سے جدا ہونا واجب ہوتا ہے اور درگاہ میں پہنچنے سے پہلے اپنے نفس کو چھوڑ دو پھر آ ؤ اللہ تعالی نے فرمایا قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون اور متعوھن کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے چاہنے والے اور ارادتمند بہت ہوں اس کے لئے چاہیے کہ وہ اپنا مال اپنے قرباء اور احبا کو دے کر اللہ تعالی کی طلب میں جائے تا کہ انہیں مال کی لذت میں اس کی جدائی کا درد محسوس نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ جسے کسی شئے سے محبت ہوتی ہے تو اس سے جلدی سے جان چھڑانا مشکل ہے اور ان پر وہ مال ان کے قرب و بعد کی وجہ سے خرچ نہ کیا جائے بلکہ حکم الہی کے مطابق تقسیم کیا جائے جیسے علم میراث کا قانون ہے اس لئے کہ یہ حقیقی طور پر فوت ہو گیا ہے ولا تنسوا الفضل بینکم میں اشارہ کہ تقوی کی طرف دامن تھام لینا اللہ تعالی کے تقوی کا حق ادا

کرنا ہے اور تقوی یہ ہے کہ ماسوی اللہ کو بالکل ترک کر دے بلکہ ماسوا کی نفی اللہ تعالی کا وصال اتنا ہی اس کا قرب نصیب ہو گا وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اس دنیا میں اللہ تعالی کا فضل مت بھولو آخرت میں داخل ہونے اور اس میں پہنچنے کے بعد تو تمام فضل ہی فضل ہو گا۔ جیسے اللہ تعالی نے فرمایا۔ بے شک اللہ تعالی جانتا ہے جب تم اس کے فضل کو پاتے ہو یا اسے چھوڑتے ہو اور بے شک وہ دیکھنے والا ہے (کذافی التاویلات النجمیہ)

یہ قاعدہ ہمیشہ یاد رکھنے کا ہے کہ بندہ جب مخلوق کی طرف التفات کرتا ہے تو اس سے وہ نور ہٹا لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس پر مخلوق کے حالات منکشف ہو جاتے ہیں ورنہ اگر اس پر یقین کا نور کھل جائے جو کہ اسے اس علم کی طرف دے اس سے معلوم ہوا کہ دار آخرت دنیا سے بہتر اور جو کچھ اللہ تعالی کے پاس ہے وہ اعلی اور باقی رہنے والا ہے اور اسے یہ عین الیقین کی طرح نظر آئے بلکہ اسے ایسے دیکھے جیسے کسی شخص کو اپنے زیادہ قریب دیکھتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دنیا میں کون سی شئے اچھی ہے اور یہ بھی خبر ہو جائے گی کہ کس کو فنا ہے قاعدہ ہے کہ جو چیز آنے والی ہو وہ یوں سمجھو کہ وہ موجود ہے خصوصا جب کہ قرینہ بتا رہا ہے کہ دنیا کے احوال تبدیل ہو رہے ہیں اور اس کے رہنے والے فنا پا رہے ہیں۔

حدیث شریف: حضور نبی پاک ﷺ نے فرمایا بے شک جب کسی کے قلب میں نور داخل ہوتا ہے تو دل کھل کر روشن ہو جاتا ہے عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ کیا اس کی کوئی علامت ہے جس سے ہم معلوم کر لیں کہ واقعی یہ دل روشن ہے آپ نے فرمایا اس کی علامات یہ ہیں۔

۱۔ دار الغرور سے دوری ۲۔ دار الخلود کی طرف رجوع ۳۔ موت کے نزول سے پہلے تیار رہنا۔ اے اللہ ہمیں ان لوگوں سے بنا جو تیرے دیدار کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور انہیں تڑپ رہتی ہے کہ کسی طرح تیرے وصال کا لقمہ نصیب ہو۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ نمازوں پر محافظت کرو یعنی ان کے اپنے اوقات میں مداومت کر کے انہیں ادا کرو اور الصلوت سے دن اور رات کی پانچ نمازیں مراد ہیں جن کی گنتی آیا تو احادیث متواترہ سے ثابت ہوتی ہے اور اس آیت شریف کے اشارہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آگے فرمایا وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى اور وہ ہے جسے برابر کے دو عدد آگے پیچھے لگیں اور اس کا کم درجہ پانچ ہے اور تین کو یہ درجہ حاصل

نہیں اس لئے کہ اس کے آگے اور پیچھے دو عدد نہیں بلکہ ایک ایک یہ اور ایک عدد نہیں اس لئے کے عدد اسے کہتے ہیں جس میں دو طرفین آ کر جمع ہو سکیں اور دونوں طرفین اس سے دوگنی ہوں اور واحد کے آگے پیچھے کوئی طرف نہیں بلکہ کوئی شے بھی نہیں وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى اور درمیانی نماز پر یعنی جو ان دو کے درمیان واقع ہے الوسطی صفت مشبہ کا صیغہ ہے یعنی ان سب سے بڑی فضیلت والی یا افعل التفضیل کا صیغہ اوسط کی تانیث ہے اور اوسط الشی وہ ہوتی ہے جو کسی دوسری سے بہتر اور اعلیٰ ہو۔

الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی تفسیر ترجیح کے دلائل وفضائل: الوسطی سے صلوۃ العصر مراد ہے جو کہ نماز دن اور رات کی دو دو نمازوں کے درمیان واقع ہے۔

۱۔ خود حضور نبی کریم ﷺ نے بھی یوم الاحزاب میں اسی نماز عصر کے فوت ہونے پر کفار کے لئے فرمایا اللہ تعالی ان کی قبروں اور ان کے گھروں کو آگ سے بھر دے۔

۲۔ یہ وقت لوگوں کے کاروبار کا ہے کوئی اپنی تجارت میں کوئی اپنی ضروریات میں مصروف ہوتا ہے اس لئے ضروریات کو ترک کر کے اسے ادا کرنے میں بہت بڑی فضیلت ہوگی۔

۳۔ اسی وقت دن اور رات کے ملائکہ کا اجتماع ہوتا ہے۔

۴۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس سے عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا اس نے اپنے مال اور اہل وعیال سے نقصان اٹھایا اس کے اوپر خوف خدا نازل ہوگا جیسے وہ اپنے مال وعیال کے ضائع ہونے سے خوف کرتا ہے۔

ف: حدیث یوم الاحزاب سے اس پر حجت ہے جو کہتا ہے کہ صلوۃ الوسطی سے نماز عصر مراد نہیں۔

ف: بعض لوگ کہتے ہیں کہ جمعہ کی اجابت کی گھڑی کی طرح یہ نماز مخفی رازوں سے ایک راز ہے تا کہ لوگ اس کی ادائیگی میں جدوجہد کریں۔

سوال: سیدتنا بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا سے مروی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ نمازوں پر محافظت کرو اور صلوۃ وسطی اور صلوۃ وسطی اور صلوۃ العصر پر بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے عصر کی نماز مراد نہیں۔

جواب: اس میں احتمال یہ کہ الوسطی نماز عصر کا لقب ہے عصر کا لفظ اس کا نام ہے حدیث شریف میں حضور علیہ

السلام نے پہلے عصر کا لقب ذکر فرمایا ہے اس کے اس نام۔ (کذا فی شرح المشارق لا بن الملک)

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ اور اللہ تعالیٰ کے لئے قیام کرو نماز میں قٰنِتِیْنَ فرمانبردار ہو کر یہ قُوْمُوْا کے فاعل سے حال ہے ای ذاکرین له فی القیام یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرو نماز کے قیام میں اس لئے کہ قنوت کا لفظ نماز میں ذکر کو کہتے ہیں یا قٰنِتِیْنَ بمعنی خاشعین ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے۔

ف: مروی ہے کہ صحابہ کرام نماز میں کھڑے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کا خوف طاری ہو جاتا نہ وہ آنکھ کھولتے نہ ادھر ادھر دیکھتے اور نہ ہی نماز میں کنکریوں کو ہٹاتے اور نہ ہی دنیوی بات دل میں لاتے البتہ نسیان ایسے امور سرزد ہو جاتے ہیں نماز کے اختتام تک ان کی یہی کیفیت رہتی۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اگر تمہیں دشمن یا کسی کا خوف ہو فَرِجَالًا یہ حال ہے اور اس کا عامل محذوف ہے اصل عبارت یوں تھی وصلوا راجلین پس نماز ادا کرو پیدا ہو کر رجال، رجل کی جمع ہے جیسے صحاب صاحب کی جمع ہے اَوْ رُكْبَانًا یا سوار ہو کر رُكْبَانًا راکب کی جمع ہے جیسے فرسان فارس کی جمع ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب ہے کہ نماز پیدل یا سوار ہو کر پڑھنا جائز ہے جب ٹھہرنا ناممکن ہو جائے تو پھر جائز ہے اور جب اسے ٹھہرنا ممکن ہو تو پھر پڑھے ان کی دلیل یہی آیت فَاِنْ خِفْتُمْ ہے فَاِذَآ اَمِنْتُمْ جب تمہیں امن نصیب ہو اور خوف چلا جائے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ تو اللہ کو یاد کرو یعنی نماز پڑھو اس لئے کہ نماز ہی اللہ کا ذکر ہے چونکہ نماز کا معظم بالشان رکن ذکر الٰہی ہے اس لئے اسے ذکر الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

كَمَا عَلَّمَكُمْ جیسے اس نے تمہیں بتایا یعنی اس کا ایسے ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں تعلیم دی مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ جو تم نہ جانتے تھے یعنی نماز کی کیفیت تمہیں معلوم نہ تھی اس تشبیہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز اس طرح ہو جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کے موافق ہو اور اس عنوان سے بیان کرنے میں ایک راز یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کریں یا اُذْكُرُوا اللّٰهَ بمعنی اُشْكُرُوا اللّٰهَ یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو ان نعمتوں کے عوض میں کہ اس نے تمہیں احکام شرائع کی تعلیم دی کہ تم انہیں نہیں جانتے تھے منجملہ ان کے بوقت امن و خوف اقامۃ الصلوۃ ہے۔

نماز کا فلسفہ: نماز بمنزلہ مہمانی کے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ماننے والوں کے لئے پانچ وقت مہمانی کے طور مقرر فرمائے جیسے مہمانی میں مختلف قسم کے طعام چنے جاتے ہیں اور ہر طعام میں نرالی لذت اور نرالہ رنگ ہوتا

ہے اسی طرح نمازوں میں بھی مختلف قسم کے احکام مقرر کئے گئے ہیں کہ ان میں ارکان ہیں اور دیگر افعال مختلف بھی پھر ہر فعل میں نرالی لذت کے علاوہ گناہوں کا کفارہ بھی ہیں۔

حکایت: حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اے موسیٰ علیہ السلام چار رکعتیں ایسی ہیں جنہیں میرا محبوب (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت پڑھے گی (یعنی نماز ظہر کی چار رکعت) تو میں انہیں پہلی رکعت پر مغفرت فرماؤں گا اور دوسری رکعت میں ان کے نامہ اعمال کے پرچے کو میزان میں بھاری کردوں گا تیسری رکعت پر ان کے لئے فرشتوں کو ان کی بخشش کے لئے دعا مانگنے پر مامور فرماؤں گا جو ان کے لئے تسبیح پڑھیں گے آسمان اور زمین میں کوئی فرشتہ نہ ہوگا جو ان کے لئے بخشش اور تسبیح نہ پڑھیں، بخشش نہ مانگیں۔ اسے میں کبھی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا اور چوتھی رکعت پر ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دوں گا انہیں حوریں دیکھیں گی اے موسیٰ علیہ السلام چار رکعت اور ہیں میرا محبوب احمد ﷺ اور ان کی امت پڑھے گی یعنی (صلوٰۃ العصر) اس نماز کے پڑھنے والے مجھ سے جو مانگیں گے میں انہیں عطا کروں گا اے موسیٰ علیہ السلام تین رکعتیں اور ہیں جنہیں میرا محبوب احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت پڑھے گی (یعنی صلوٰۃ المغرب) جو انہیں پڑھے گا میں اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دوں گا اے موسیٰ علیہ السلام چار رکعتیں اور ہیں انہیں میرا محبوب محمد ﷺ اور ان کی امت پڑھیں گی یعنی (صلوٰۃ العشاء) وہ ان کے لئے دنیا مافیہا سے بہتر ثابت ہوں گی اور دنیا سے کوچ کریں گے تو گناہوں سے ایسے پاک اور صاف ہو کر جائیں گے گویا انہیں ماں نے ابھی جنا ہے۔

مسئلہ: جو شخص اذان سن لے تو اسے نماز با جماعت ترک کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اس لئے کہ وہ سنت مؤکدہ ہے اور اس کی بہت بڑی سخت تاکید آئی ہے یہاں تک کہ جس علاقہ کے لوگ نماز با جماعت ترک کرنے کے عادی ہیں ان کے ساتھ جنگ کرنا واجب ہے کیونکہ وہ شعار اسلام سے ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی ایک شخص ترک جماعت کی عادت کرے تو اس پر تعزیر لازم ہوگی اور اس کی گواہی بھی قابل قبول نہ ہوگی اسے نصیحت نہ کرنے کی وجہ سے اس کے ہمسائیگان اور موذن وامام بھی گنہگار ہوں گے۔

مسئلہ: منیۃ الفتاوی میں ہے جامع مسجد سے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے اگرچہ جامع

مسجد میں جماعت کی کثرت بھی ہو اور محلہ کی مسجد میں اگرچہ تھوڑے لوگ بھی ہوں کیونکہ محلہ کی مسجد کا اس پر حق ہے دوسری مسجد کی نہ کثرت جماعت فائدہ دے گی اور نہ لمبا سفر کر جانا اسے مفید ہے۔

مسئلہ: پہلی صف اور امام کے بالمقابل کھڑے ہونے میں بہت بڑا ثواب ہے۔

حدیث شریف: حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص صف اول اور امام کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے اس کے اعمال نامے میں سو نماز کا ثواب لکھا جائے گا اور جو شخص صف اول کی دائیں جانب کھڑا ہو اسے پچھتر نماز اور جو بائیں جانب کھڑا ہو اسے پچاس نماز اور جو باقی صفوں میں جہاں بھی ہو اسے پچیس نمازوں کا ثواب ملے گا (کذافی التفسیر)

مسئلہ: صف اول میں پہنچنے کے لئے لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر نہ جائے اگرچہ درمیان میں کوئی کشادگی بھی ہو۔

مسئلہ: گٹے سے گٹا (ٹخنہ) ملا کر کھڑے ہوں یہاں تک کہ ایک دوسرے کی گردنیں اور مونڈھے بالمقابل نظر آئیں

حدیث شریف: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا صفوں کو برابر رکھو اور ایک دوسرے کے بالکل قریب کھڑے ہو جاؤ اور گردنوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل بناؤ مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم میں شیطان کو تمہاری صفوں کے سوراخوں سے بکری کے بچہ کی طرح گھستا ہوا دیکھتا ہوں۔

شرح الحدیث: قوله الخليل بفتح الخاالمعجمة الفرجه یعنی سراغ قوله الحذف بفتحتى الى المهملة و الذال المعجمة العم اسود الصفار الحجازيته.

ترجمہ: (یعنی حجازی سیاہ بکریوں کا چھوٹا بچہ، کذافی التنویر، حقیقی نماز حضور قلب اور توجہ تام کا نام ہے)

کسی نے کیا خوب کہا۔

محراب ابروائی تو اگر قبلہ ام بنود ۔۔۔ کسے بر فلک برند ملائکہ نماز من

حکایت: حضرت شیخ ابو العباس الجوالقی ابتدائی دور میں بوری فروشی کا کام کرتے تھے ان کی خرید و فروخت سے گزارہ چلاتے تھے ایک دن چند بوریاں ادھار پر بیچیں لیکن وہ شخص چند بوریاں بھول کر وہاں چھوڑ گیا نماز کا

وقت ہو گیا حضرت شیخ نماز میں کھڑے سوچتے رہے کہ نا معلوم یہ کون چھوڑ گیا بعد از فراغت اپنے نوکر سے پوچھا کہ بوریاں کس کی ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے یہ کسے دی تھیں نوکر نے کہا آپ نماز پڑھتے رہے یا بوریاں بیچتے رہے یہ بات ان کے دل پر اثر کر گئی آپ نے تمام کاروبار ترک کر دیا اور بوریاں پہن کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے پھر وہ مرتبہ پایا کہ دنیا یاد کرتی ہے۔ چنانچہ کسی نے کہا۔

مردن بسعی و رنج بجائے رسیدہ اند　　　　تو بے ہنر کجا رسی از نفس پروری

تفسیر عالمانہ آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حفظ نماز کے متعلق بطور مبالغہ کے فرمایا ہے جو کہ دو کے درمیان معاملہ ہے چنانچہ فرمایا حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ یعنی اس نماز پر محافظت کرو جو میرے اور تمہارے مابین ہے جیسا کہ میں نے اپنے اور بندے کے درمیان نماز کو تقسیم فرمایا اس کا آدھا حصہ میرے لئے اور دوسرا آدھا حصہ بندے کے لئے ہے میرے بندے کے لئے وہ ہے جو مجھ سے مانگے اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تمہاری حفاظت کروں گا توفیق اور اجابت و قبول اور اس پر ثواب دینے سے اور تم نماز پر محافظت کرو صدق و اخلاص اور حضور قلب اور خشوع و خضوع اور عجز و انکسار کے ساتھ مناجات قلب کی محافظت کر کے اسی سے استعانت اور اسی سے ہدایت طلب کرو سکون و وقار اور تعظیم اور دوام شہود کے لئے اسی کو صلوۃ وسطیٰ کہتے ہیں اس لئے کہ وہ انسان کے وسط میں واقع ہے کیونکہ وہ روح اور جسم کے درمیان واسطہ ہے اسلئے اسے صلوۃ القلب کہا جاتا ہے اور جس نماز کی محافظت کا حکم ہے وہ یہی صلوۃ القلب ہے جس پر دائمی طور شہود نصیب ہو اس لئے کہ جسم تو کبھی ارکان نماز کے ظاہری مسائل پر محافظت کرتا ہے لیکن کبھی انہیں ترک بھی کر دیتا ہے اس لئے اسے محافظت کی صفت سے موصوف نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے حضور شہود کے وصف پر اس کے معانی کی محافظت کی جا سکتی ہے اس لئے کہ یہ قلب کی شان ہے کہ وہ اس طرح اس کی محافظت کرے جسے حضور و شہود کا حق ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ اس لئے کہ یہ ارباب القلوب کے اوصاف میں سے ہے کیونکہ وہ ہمیشہ نماز میں رہتے ہیں۔

(کذا فی التاویلات النجمیہ)

سبق: سالک کو چاہیے کہ وہ موت اور قبر میں داخل ہونے سے پہلے حضور کے حرم میں پہنچنے میں جلدی کرے

اس لئے کہ جس نماز میں کمی واقع ہو وہ کبھی منظور و مقبول نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ تعالی بڑا غیور ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ کائنات سے پورے طور پر روگردانی کرے تا کہ اسے نور ذات کا جلوہ نصیب ہو ورنہ اس پر اس شخص کی مثال صادق آئے گی جو عمر کی تلاش میں زید کو پکارتا ہے تو مرتے دم تک اسے کوئی جواب نہ ملے گا۔

حضرت شیخ سعدی شیرازی قدس سرہ نے فرمایا۔

آنکہ چوں پستہ دیدیش ہمہ مغز — پوست بر پوست بود ہمچو پیاز
پارسایاں روئے در مخلوق — پشت بر قبلہ میکنند نماز

اللہ تعالی سے توفیق کی درخواست ہے۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ اور وہ لوگ مرجاتے ہیں یہاں پر موت کے منہ کا لقمہ بننے والے کو میت کہا گیا ہے یہ مجاز ہے کہ شئے کا نام لے کر اس سے اس کا مال و دل مراد لیا گیا ہے اور مجازی معنی پر قرینہ یہ ہے کہ میت کو وصیت نہیں کرتا بلکہ زندہ یا زندگی کے آخری لحات والا وصیت کرتا ہے وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا اور اپنے بعد اپنی ازواج کو چھوڑ جاتے ہیں وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم ان کی ازواج کے لئے وصیت ہے یعنی وہ اپنی ازواج کو وصیت کریں یہ جملہ الَّذِينَ کی خبر ہے مَّتَاعًا یعنی اسباب کی وصیت کریں إِلَى الْحَوْلِ سال تک

یا یوں وصیت کریں کہ ان کی عورتوں تک سال تک نفع پہنچاؤ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ازواجھم سے حال ہے (ای غیر مخرجات) اب معنی یہ ہوا کہ ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو فوت ہونے والے ہیں کہ مرنے سے پہلے اپنی عورتوں کے لئے وصیت کر جائیں کہ ہماری موت کے بعد ہماری عورتیں ہمارے گھروں میں سال تک ٹھہری رہیں اور انہیں نان و نفقہ ملتا رہے اور انہیں گھروں سے باہر نہ نکالا جائے۔

شان نزول: یہ آیت طائف کے ایک شخص کے حق میں نازل ہوئی اس کا نام حکیم بن الحارث تھا جو طائف سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوا اس کی اولاد بھی تھی اور ماں باپ اور ایک زوجہ بھی اور وہ یہاں فوت ہو گیا تو اللہ تعالی نے یہی آیت نازل فرمائی حضور نبی کریم ﷺ نے اس کی وراثت اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد کو دے دی اور اس کی عورت کے لئے انہیں حکم دیا کہ سال بھر تک اسے خرچہ دیتے رہیں اور اسے اپنے زوج کے گھر سے

باہر نہ نکالیں اس عورت کو میراث سے کچھ نہ دیا۔

ف: ابتدائے اسلام میں عورت متوفی عنھا الزوج کی عدت ایک سال تھی ورثاء پر حرام تھا کہ متوفی عنھا الزوج کی عورت کو گھر سے باہر نکالیں اس عورت کے لئے طعام وقیام شوہر کے مال سے ضروری اور واجب تھا جب تک وہ گھر سے خود بخود نہ چلی کجائے البتہ اسے میراث سے اور کچھ نہیں ملتا تھا اگر وہ گھر سے چلی جاتی تو اس کا نان ونفقہ بھی ختم ہو جاتا اور مرد پر بھی موت سے پہلے وصیت کرنا واجب تھی یہاں تک کہ آیت میراث نازل ہوئی تو اللہ تعالی نے یہ حکم منسوخ فرمایا کہ اس کے لئے سال تک قیام وطعام واجب ہے بلکہ میراث سے چوتھائی حصہ ہے اگر زوج کی اولاد نہ ہو ورنہ آٹھواں حصہ آیت میراث سے قیام کا انتظام بھی منسوخ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ کا یہی مذہب ہے۔

مسئلہ: متوفی عنہا زوجہا کی سال تک کی عدت چار ماہ دس دن کے حکم سے منسوخ ہوگئی اگرچہ وہ تلاوت کے لحاظ سے مقدم ہے لیکن نازل ہونے کے لحاظ سے یہی آیت مقدم ہے فَإِنْ خَرَجْنَ پس اگر وہ عورتیں اپنے شوہروں کے گھر سے اپنے اختیار سے چلی جائیں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تو تمہارے اوپر اے ائمہ وحکام کوئی گناہ نہیں فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ اس میں جو وہ کرتیں ہیں نیکی جس سے شرع پاک انکار نہیں کرتی مثلاً زیب و زینت اور خوشبو لگانا وغیرہ اور سوگ ترک کر دینا اور نکاح کے خواہشمندوں سے بات چیت کے پیچھے لگی رہنا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائے اسلام میں شوہروں کے گھروں میں رہنا ان کے لئے ضروری نہیں تھا اور نہ سوگ واجب بلکہ انہیں ان امور پر اختیار تھا کہ شوہروں کے گھروں میں رہ کر نان ونفقہ لیں یا گھر سے چلی جائیں اور پھر نان ونفقہ کا کوئی مطالبہ نہ کریں۔ وَاللَّهُ عَزِيزٌ اور اللہ تعالی اپنے حکم کے اجراء پر اپنے مخالف کو سزا دینے پر غالب ہے حَكِيمٌ اپنے احکام کی رعایت اور اپنے بندوں کے امور کی مصلحتوں کے متعلق حکیم ہے۔ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ اور مطلقہ عورتیں خواہ مدخولہ ہوں یا غیر مدخولہ مَتَاعٌ نفع دینا یعنی مطلقہ عورتوں کو متعہ دو یہ عام ہے واجب ہو یا مستحب۔

مسئلہ: وہ مطلقہ مفوضہ لیکن اس سے دخول نہیں ہوا تو اس کے لئے متعہ واجب ہے ورنہ اسے (چند کپڑے) دینا مستحب ہے۔

فائدہ: پہلی آیت میں مَتِّعُوْهُنَّ سے معلوم ہوا تھا کہ متعہ دینا ملتبس و معروف ہے یعنی وہ جسے شرع و عادت مستحسن سمجھے۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ متقین پر ضروری ہے یعنی متقین کے لئے لائق ایسے ہی ہے یہ حکم وجوبی نہیں لیکن تقوی کے شرائط میں سے ہے کہ عورت سے بترع ہوتا کہ اس کے قلب کو تسلی ہو اور طلاق سے جو وحشت طاری ہوئی ہے وہ دور ہو جائے كَذٰلِكَ یہ اشارہ ان حکام کی طرف ہے جو پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مشروع فرمائے ہیں۔

ف: قاضی صاحب نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ عنقریب وہ اپنے بندوں کو وہ دلائل واحکام بیان فرمائے گا جن کے لئے وہ معاش اور آخرت کے لحاظ سے محتاج ہیں لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تمہیں معلوم ہو کہ ان میں کیا اسرار ہیں پھر ان کے لئے اپنی عقل کو عمل میں لاؤ اور ان کے موجبات کے مطابق عمل کرو۔

مثنوی شریف میں ہے۔

کشتی بے لنگر آمد مرد شد	کے ز باد کژ نیابد او حذر
لنگر عقلست عاقل را اماں	لنگرے دریوزہ کن از عاقلاں

تفسیر صوفیانہ

مطلقہ عورت جب طلاق کے معاملہ میں مبتلا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کی تسلی کے لئے متعہ (چند کپڑے) واجب فرمائے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مرید صادق جب اپنی طلب صادق میں دوست و اقارب اور رفیقوں کی جدائی اور مال دنیا اور اس کے مرتبہ سے فراق کی وجہ اور اپنے اوطان اور اس کے رہنے والوں سے ہجرت کر کے خواص عباد کے شہروں میں اور طلب فوائد کے لئے دکھ درد اٹھائے تو اللہ تعالیٰ اس پر احسان فرما کر اس کے درد والم کو دور فرماتا ہے اور اس کے قلب کو انا عند المنکسرة قلوبهم من اجلی میں ان قلوب کے قریب ہوں جو میرے وجہ سے منکسر ہوں گے متعہ سے جبر نقصان کرتا ہے یہی پریشان حال سالک کے لئے متاع معروف ہوتا ہے جسے وہ حاصل کرنے کے درپے ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے آیات قسم قسم الطاف اور ذیشان مہربانیاں ظاہر کرتا ہے تاکہ تم اس کے انوار الطاف سے کمالات الطاف کو سمجھ سکو۔

(كذا فی تاویلات النجمیہ)

سبق: عاقل کو چاہیے کہ وہ نہ تو دنیا کو دیکھے اور نہ اس کی رنگینیوں پر مست ہو بلکہ اس کے منافع اور اس کے

اغراض سے تیزی سے گزر جائے بلکہ طریق حق کے حصول کے لئے تکالیف کو سر پر اٹھائے تا کہ لذات ذات مطلق تک پہنچ سکے۔

حکایت: حضرت شفیق بلخی قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ انہیں تین دن تک طعام نہ ملا لیکن عبادت الٰہی میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آنے دیا جب عبادت میں بھوک کی وجہ سے ضعف ہونے لگے تو آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہنے لگے اے میرے رب مجھے طعام عنایت فرما جب دعا سے فارغ ہوئے تو ایک شخص کو دیکھا کہ وہ انہیں دیکھ رہا ہے جب حضرت نے انہیں دیکھ کر السلام علیکم کہا تو اس نے کہا اے شیخ میرے ساتھ چلئے تا کہ میں آپ کو طعام پیش کروں حضرت شفیق اس کے ساتھ چل پڑے اس نے حضرت شیخ کو اپنے گھر داخل کیا تو دیکھا کہ گھر میں مختلف قسم کے تختے ہیں اور ان پر قسم وقسم کے طعام چنے ہوئے ہیں اور دستر خوان کے قریب غلمان اور نوجوان لڑکیاں کھڑی ہوئی ہیں شیخ صاحب نے اس سے کچھ کھایا وہ شخص اس کے ساتھ کھڑا رہا جب حضرت شیخ طعام سے فارغ ہوئے تو باہر جانے کا ارادہ فرمایا اس شخص نے کہا اے شیخ کہاں جاتے ہیں آپ نے فرمایا مسجد میں اس نے عرض کی آپ کا نام کیا ہے آپ نے فرمایا شفیق اس نے عرض کی میں آپ کے والد گرامی کا غلام تھا مجھے انہوں نے تجارت کے لئے بھیجا اس دن سے آج تجارت سے واپس لوٹا ہوں لیکن آپ کے والد مرحوم فوت ہو چکے ہیں۔ حضرت شفیق اب یہ تمام مال آپ کا ہے آپ نے فرمایا اگر یہ لونڈیاں اور غلام میرے ہیں تو میں نے انہیں سبیل اللہ آزاد کیا اور یہ مال میرا ہے تو میں نے اسے تمہیں ہبہ کیا اسے لے جاؤ آپس میں تقسیم کرلو مجھے اس دولت کی کوئی ضرورت نہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روکے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

تعلق حجابست دبے حاصلی　　　چو پیوندہا بگسلی واصلی

سبق: دنیا ایک ایسا تعلق ہے خصوصاً دور حاضر میں اس لئے کہ یہ دور بڑا پرفتن ہے اس میں دنیا سے دور ہونے والا اس میں مشغول ہونے والے سے افضل ہے۔

حکایت: حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے بہشت کا شراب پیش کیا گیا اور عرض کی گئی کہ آپ اسے پی

لیں تو موت نہیں آئے گی آپ نے اپنے لشکر سے مشورہ لیا سب نے پینے کا مشورہ دیا صرف قنفد رہ گیا اس سے مشورہ لینے کے لئے گھوڑے اور بازی کو لینے کے لئے بھیجا اس نے آنے سے انکار کر دیا پھر کتے کو بھیجا وہ اس کے ساتھ چلا آیا آپ نے پہلے یہ پوچھا کہ تو گھوڑے اور بازی کے ساتھ نہیں آیا اور کتے کے ساتھ کیوں چلا آیا اس نے کہا گھوڑے اور بازی کے ساتھ اس لئے نہیں آیا کہ وہ دونوں پاؤں سے ننگے ہیں گھوڑا تو دشمن کے ساتھ بھی ہو لیتا ہے اور بازی بھی اپنے مالک کے غیر کی اطاعت کر دیتا ہے اور کتا باوفا ہے کہ اپنے مالک کے سوا کسی دوسرے کی بات نہیں مانتا اور اگر اسے مالک اپنے دروازہ سے ہٹائے تب بھی کہیں نہیں جاتا بلکہ بار بار اپنے مالک کے گھر لوٹتا ہے آپ نے فرمایا کیا بہشت کا شراب پی لوں اس نے کہا نہیں اس لئے کہ آپ کی دنیا کے قید خانے میں عمر بڑھ جائے گی عزت کی موت بھلی اس عیش سے جو قید خانے میں گزاری جائے۔

بہمہ حال ایسری کہ ز بندی بدہد   بہترش داں ز امیر یکہ گرفتار آید

آپ نے فرمایا بہتر کیا تو نے اس کے بعد آپ نے اس شراب بہشت کو دریا میں بہا دینے کا حکم فرمایا یہی وجہ ہے کہ اس روز سے دریا کا پانی میٹھا ہے۔

تزودمن الدنیا فانک راجل   وبادر فان الموت لاشک نازل

وان امرا قدعاش سبعین حجته   ولم تیزدو للمعاد الجاهل

ودنیاک ظل فاترک الحرص بعلما   علمت فان الظال لابدزائل

ترجمہ: دنیا میں آخرت کا سامان تیار کر اس لئے کہ یہاں سے تو کوچ کرنے والا ہے اور اس میں عجلت سے کام لے اس لئے کہ موت یقیناً آنے والی ہے اور بے شک اگر کوئی شخص ستر ہزار برس گزارے لیکن آخرت کا سامان تیار نہیں کیا تو وہ بہت بڑا جاہل ہے اور تجھے معلوم ہے کہ یہ دنیا تیرے سایہ کی طرح ہے اور یہ بھی تمہیں یقین ہے کہ سایہ آخر مٹ جاتا ہے۔ حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا۔

کہ اندر نعمتی مغرور غافل   گہے از تنگ دستی خستہ ریش

چو در سرا و ضرا حالت نیست   ندانم کے بحق پردازی از خویش

اے اللہ ہمیں موانع سے محفوظ فرمائیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ

اے محبوب! کیا تم نے نہ دیکھا تھا انہیں جو اپنے گھروں سے نکلے وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو اللہ نے ان سے فرمایا

لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ

مر جاؤ پھر انہیں زندہ فرمادیا بیشک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے

لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا

مگر اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔ اور لڑو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ

اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

اللہ سنتا جانتا ہے۔ ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسن دے

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ

تو اللہ اس کے لئے بہت گنا بڑھا دے اور اللہ تنگی و کشائش کرتا ہے اور تمہیں اسی کی

تُرْجَعُوْنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى

طرف پھر جانا۔ اے محبوب! کیا تم نے نہ دیکھا بنی اسرائیل کے گروہ کو جو موسیٰ کے بعد ہوا

اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ

جب اپنے ایک پیغمبر سے بولے ہمارے لیے کھڑا کردو ایک بادشاہ کہ ہم خدا کی راہ میں لڑیں نبی نے فرمایا

هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا

کہ کیا تمہارے انداز ایسے ہیں کہ تم پر جہاد فرض کیا جائے تو پھر نہ کرو بولے ہمیں کیا ہوا

لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ

کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں حالانکہ ہم نکالے گئے ہیں اپنے وطن اور اپنی اولاد سے

أَبْنَآئِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَ

تو پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا منہ پھیر گئے مگر ان کے تھوڑے اور

اللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظّٰلِمِينَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ

اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا بیشک اللہ نے طالوت کو

لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ

تمہارا بادشاہ بنا کر بھیجا ہے بولے اسے ہم پر بادشاہی کیونکر ہوگی اور ہم اس سے زیادہ

بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ

سلطنت کے مستحق ہیں اور اسے مال میں وسعت نہیں دی گئی فرمایا اسے اللہ نے تم پر چن لیا

عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ

اور اسے علم اور جسم میں کشادگی زیادہ دی اور اللہ اپنا ملک جسے چاہے دے

مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهِ

اور اللہ وسعت والا علم والا ہے اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا اس کی بادشاہی کی

أَنْ يَّأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

نشانی یہ ہے کہ آئے تمہارے پاس تابوت جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کا چین ہے اور کچھ بچی ہوئی

اٰلُ مُوسٰى وَاٰلُ هٰرُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ

چیزیں معزز موسیٰ اور معزز ہارون کے ترکہ کی اٹھائے لائیں گے اسے فرشتے بیشک اس میں بڑی نشانی ہے

إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۲۴۸﴾

تمہارے لئے اگر ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر عالمانہ الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم دیار، دار کی جمع ہے یعنی اپنے گھروں سے اگرچہ بظاہر یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جو بھی ان اہل کتاب واہل تواریخ کا قصہ سنے گا پھر بمقتضائے ظاہر الم تسمع قصتھم کہنا چاہیے تھا لیکن ان کے سماع کو بمنزلہ رویت کے قرار دیا گیا ہے اس بات پر تنبیہ ہے کہ ان کا واقعہ اتنا ظاہر اور مشہور ہے کہ گویا وہ آنکھوں کے آگے ہے اس لیے الم تر سے خطاب کیا گیا اس سے ان کے قصہ سے تعجب دلانا اور ذہنوں میں راسخ کرنا مطلوب ہے یعنی اس پر نفی داخل ہوئی اس کا اقرار کرنا مقصود ہے۔

ف: امام واحدی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ یہاں رویت سے رویت قلبی بمعنی علم مراد ہے۔

سوال: الم تر کو الیٰ سے متعدی کیا گیا ہے حالانکہ یہ باب تو متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے کیونکہ اس سے ادراک قلبی مراد لیا جاتا ہے۔

جواب: یہ اصول انتہاء کے معنی کو متضمن ہے اب معنی یوں ہوا الم ینتہ علمک الیھم کیا تمہارا علم ان کے واقعہ تک نہیں پہنچا اسی لیے اسے الیٰ سے متعدی کیا گیا ہے۔

قاعدہ: مفسرین فرماتے ہیں جہاں پر بھی قرآن پاک میں الم تر کا لفظ آیا ہے اور وہ واقعہ بظاہر حضور علیہ السلام نے معائنہ نہیں فرمایا تو وہاں پر یہی معنی مراد ہوگا اگرچہ بہ باطن وہ واقعہ حضور علیہ السلام کے پیش نظر ہوتا ہے۔

ف: تفسیر تیسیر میں ہے کہ الم تر بمعنی اعلم ذالک یعنی میرے محبوب ﷺ اس واقعہ کو جان لیجئے۔

ف: کواشی کی تفسیر میں ہے کہ اس میں معنی و جعب کا ہے اس لئے قاعدہ ہے کہ جب ہمزہ استفہام نفی یا استفہام پر داخل ہو تو اس وقت تقریر وایجاب کا معنی ہوتا ہے اب معنی یہ ہوا کہ آپ کو ان لوگوں کا واقعہ معلوم ہے جو اپنے گھروں سے نکلے تھے۔

ف: ابن الصمید اپنے حواشی میں فرماتے ہیں کہ الم تر کے لفظ سے کبھی وہ شخص مخاطب ہوتا ہے جس کو اس قصہ کا علم پہلے ہو اور کبھی وہ شخص مخاطب ہوتا ہے جسے اس کا علم پہلے نہ ہو مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے: الم تر الی فلان ای شئی فلاں کو تم نے نہیں دیکھا کہ وہ کیا شئے ہے اس سے اس کی ابتداً التعریف کرنا مطلوب ہوتی ہے۔

ف: اس کے مخاطب یہاں پر وہ لوگ ہیں جو اس کا حکم سنیں لیکن انہیں اس واقعہ کا علم خطاب سے پہلے تھا۔ مثلاً مورخین وغیرہ انہیں یہ واقعہ اللہ تعالیٰ نے یاد دلا کر عبرت دلائی ہے یا اس کا مخاطب ہر وہ ہے جسے اس کی رویت حاصل ہو سکے اس لئے کہ یہ واقعہ اتنا عام اور مشہور ہے کہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ اسے معلوم کر کے اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کرے تا کہ اسے عبرت حاصل ہو۔ وَهُمْ اُلُوْفٌ (الف کی جمع ہے) جو کہ یہ بھی منجملہ اسمائے عدد سے ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ لوگ گھروں سے نکلنے والے کل کتنے تھے اس کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس ہزار سے زائد تھے اس لیے کہ الوف جمع کثرت تھی اور قاعدہ ہے کہ دس ہزار اور اس سے کم پر الوف کا استعمال نہیں ہوتا۔ حَذَرَ الْمَوْتِ یہ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ کا مفعول لہ ہے یعنی وہ لوگ موت کے خوف سے اپنے گھروں سے نکلے۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ پس اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے فرمایا:

سوال: اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں مسند کیا گیا ہے؟

جواب: صرف ڈرانے اور دھمکانے کی وجہ سے اس لیے کہ قادر قہار اور مالک جبار کے قول کی شان کچھ اور ہے اور مخلوق کی کچھ اور۔ مُوْتُوْا مر جاؤ عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد فماتوا ہو (پس وہ مر گئے) جیسے قول باری تعالیٰ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر کے لوٹایا تا کہ وہ اپنی بقایا عمریں گزاریں اور سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنے کی یہ سزا ہے۔

ف: حضرت ابن العربی علیہ الرحمہ نے فرمایا یہ موت انہیں سزا کے طور طاری ہوئی اور یہ عام قاعدہ ہے کہ سزا کی موت کے بعد زندہ کیا جاتا ہے [1] لیکن حقیقی موت کے بعد پھر زندہ نہیں کیا جاتا۔

ف: حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ نے بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر موت طاری کر کے پھر انہیں بقایا زندگی گزارنے کے لئے زندہ فرمایا۔

واقعہ کی تفصیل: ان کے واقعہ کی تفصیل یوں ہے جسے مفسرین نے لکھا کہ وہ بنی اسرائیل کی ایک قوم تھی جو واسط کے دیہاتوں میں داوردان نامی گاؤں میں رہائش رکھتی تھی اس میں طاعون آیا جو ان میں اعلیٰ دولت اور دنیادار

---

[1] غوث اعظم رضی اللہ عنہ نے جس بڑھیا کے بیٹے کی بارات کشتی سمیت زندہ کر کے دکھلایا وہ اسی قسم کی موت تھی۔ تفصیل فقیر کے رسالہ "اماطتہ الاذی" میں ہے۔

قسم کے لوگ تھے طاعون کی وجہ سے چلے گئے لیکن غرباء اور عوام وہاں ہی قیام پذیر رہے جو نہ جا سکے ان میں اکثر طاعون کی وجہ سے مر گئے اور جو چلے گئے تھے انہیں کچھ نہ ہوا اور وہ صحیح سالم گھروں کو واپس لوٹے وہ غرباء اور عوام جو بچ گئے انہوں نے کہا ہمارے وہ صاحبان اچھے رہے جو گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے اب اگر طاعون آیا تو ہم بھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے اور وہاں جا کر بسیں گے جہاں وباء طاعون نہ ہوگا۔ چنانچہ پھر دوسرے سال طاعون آیا تو وہ غرباء اور عوام بھی گھروں کو چھوڑ کر چل نکلے اور دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں ڈیرہ جمالیا جب وہ پھر پورے طور پر اس وادی میں اتر چکے اور اب ان کا خیال تھا کہ ہم ہلاکت سے بچ گئے لیکن جونہی آرام وسکون کا سانس لیا تو ایک فرشتے نے اس وادی کے نیچے سے اور دوسرے نے اوپر سے آواز دی مرجاؤ! اس آواز سے بغیر کسی بیماری کے وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مشیت سے مر گئے۔ یہاں تک کہ ان کے جانور بھی جو ان کے ساتھ تھے وہ بھی مر گئے انہیں صرف آٹھ دن گزرے تھے کہ ان کے اجسام سوج کر پھوٹنے لگے اور بدبو پھیلنے لگی اس علاقہ کے لوگ انہیں دفنانے آئے لیکن عفونت کی وجہ سے انہیں دفن نہ کر سکے۔ چنانچہ یہ تجویز ہوئی کہ ان کے اردگرد چاردیواری کھڑی کر دی جائے تاکہ انہیں درندے نہ کھا سکیں۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا اس کے بعد ایک عرصہ گزرا جس میں ان کے اجسام گل سڑ گئے اور ہڈیاں چور چور ہو گئیں اس کے بعد ان پر وقت کے نبی بنام حضرت حزقیل بن یوزی علیہ السلام کا گزر ہوا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد تیسرے خلیفہ تھے جو بنی اسرائیل میں نبوت موسوی کے پیغام پہنچانے پر مامور تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد بنی اسرائیل کے لئے موسیٰ علیہ السلام کی خلافت میں یوشع بن نون نبی مقرر ہوئے پھر کالب بن یوحنا پھر حزقیل علیہ السلام انہیں ابن العجوز بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی والدہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ مجھے بچہ عطا ہو جب کہ وہ بوڑھی اور بالکل بانجھ ہو چکی تھیں اس کی دعا مستجاب ہوئی بڑھاپے میں بچہ پیدا ہوا حضرت حسن فرماتے ہیں کہ یہ وہی ذوالکفل علیہ السلام تھے اور ان کو اسی لیے ذوالکفل کہا جاتا ہے کہ وہ ستر نبیوں کے کفیل ہوئے ان کی وجہ سے انہیں قتل سے نجات ملی۔

ستر نبیوں کا واقعہ: واقعہ یوں ہوا کہ ستر نبیوں کے قتل پر یہود آمادہ تھے۔ حضرت ذوالکفل نے نبیوں سے کہا تم چلے جاؤ میں تمہارے عوض مارا جاؤں گا اور کہا تمہارے لئے میرا قتل کیا جانا میرے لئے بہتری ہے۔ چنانچہ

جب وہ چلے گئے تو یہود آ گئے ذوالکفل بیٹھے ہوئے تھے ان سے نبیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: واللہ اعلم وہ کہاں گئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ذوالکفل کو بھی یہودیوں کے قتل سے بچالیا۔

بنی اسرائیل کا بقایا واقعہ: جب حضرت حزقیل علیہ السلام کا ان مرے ہوئے لوگوں پر گذر ہوا ان کی کیفیت سے متعجب ہوئے اور بڑی دیر تک انہیں دیکھتے رہے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کو ان کے متعلق عجوبہ دکھائیں۔ عرض کی ہاں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ ان پر کھڑے ہو کر کہیں اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں فرماتا ہے کہ تم اکٹھی ہو جاؤ۔ آپ نے یہی کلمات کہے تو وہ ہڈیاں اوپر نیچے سے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئیں اور پھر مجسم بن گئیں۔ جن میں نہ خون اور نہ ہی ان پر گوشت تھا صرف خالی ڈھانچے پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہیں فرمایئے اے ارواح اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ان میں قائم ہو جاؤ۔ چنانچہ آپ کے اس طرح کہنے پر وہ سب لوگ زندہ ہو گئے اور زندہ ہوتے ہی کہنے لگے: [1]

سبحانک اللّٰھم وبحمدک لا الہ الا انت ۔ اس کے بعد ان میں اور ان کی اولاد میں آج تک وہی بو آتی ہے۔ پھر وہ لوگ زندہ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹے اور ایک عرصہ تک زندہ رہے۔ لیکن موت کے آثار ان کے چہروں سے نمودار تھے۔ وہ جب کپڑے پہنتے تو کفن کی طرح پرانے اور غبار آلودہ ہو جاتے یہاں تک کہ وہ پھر طبعی موت سے مرے۔

سبق: اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کو جہاد کے لئے بہادری دکھانی چاہیے اور شہادت کے اسباب میں درپے رہنا چاہیے یہ واقعہ توکل پر برانگیختہ کرتا ہے اور مسلمان پر لازم ہے کہ وہ سر تسلیم خم رہیں اس لیے کہ موت نے تو چھوڑنا نہیں جہاں بھی کوئی ہو موت سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر موت کے منہ میں جانا جہاد فی سبیل اللہ سے کم نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔ عَلَی النَّاسِ تمام لوگوں پر ان لوگوں کو اس لیے زندہ کیا گیا تا کہ وہ عبرت پکڑیں اور پھر سعادت عظمیٰ حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہیں اور وہ لوگ جو اس واقعہ کو سنیں انہیں عبرت اور غور وفکر کی جانب ہدایت ملے گی۔

---

[1] یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ مردوں کو زندہ اور حیات بخشنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے لیکن سبب اولیاء وانبیاء کرام علیہم السلام بنتے ہیں اور اسی سبب سے ہم مجازاً کہہ دیتے ہیں کہ اولیاء وانبیاء مردہ زندہ کرتے ہیں۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اہل اسلام تو اپنے عجز کے اظہار سے اور اہل کفر کر کے وَقَاتِلُوْا یہ خطاب حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے اور اس کا محذوف مقدر پر عطف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی۔ فاطیعوا وقاتلوا پس اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے جنگ کرو۔ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس کے دین کو بلند کرنے کے لئے یہ یقین کر کے کہ جنگ سے بھاگنے سے موت سے جان نہیں چھوٹے گی اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہو کر رہے گی پھر دو لذتوں میں سے کسی ایک سے محروم نہ ہو جاؤ۔

۱:۔ مدد الٰہی اور ثواب ۲:۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مر جانا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ اور یقین کرو بیشک اللہ تعالیٰ سَمِيْعٌ ہے۔ اس کی بات بھی سنتا ہے جو کسی دوسرے کی ترغیب سے جنگ پر حاضر ہوا اور اس کی بات بھی جو کسی دوسرے کی نفرت دلانے سے جنگ پر نہ جا سکا۔ عَلِيْمٌ جانتا ہے تمہارے وہ اعمال جو تم اپنے دلوں میں چھپاتے ہو اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ جنگ سے محروم رہنے والا جنگ پر کیوں نہ حاضر ہو سکا اور مجاہد کے جہاد اور اس کی غرض اور نیت کو بھی جانتا ہے کہ وہ جنگ پر حاضر ہوا تو کیوں اسے دینی مفاد مدنظر تھا یا دنیوی اس کی اگر دنیوی غرض ہے تو اسے اخروی ثواب نصیب نہ ہوگا۔

ف: اَلَمْ تَرَ الخ سے ان لوگوں کی مذمت کرنا مطلوب ہے جو اپنے گھروں سے نکل گئے پھر ان کی سزا ان کی موت مقرر فرمائی اور جس بات کو وہ اپنی نجات سمجھتے تھے ان کو ان کے لئے خسارہ اور نقصان بنا دیا۔

مسئلہ: اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ جنگ سے بھاگنا مکروہ ہے۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ طاعون آجائے تو توکل علی اللہ کر کے وہاں ثابت قدم رہنا بہت بڑا ثواب ہے۔

حدیث شریف: میں ہے طاعون سے بھاگنا جنگ سے بھاگنے کی طرح ہے اس حدیث سے ثابت ہوا کہ منہی عنہ فعل کا ارتکاب کرنا حرام ہے اور وہ کبائر سے ہے۔

حکایت: مروی ہے کہ عبد الملک طاعون سے رات کو سواری پر سوار ہو کر بھاگ نکلا اور ایک نوکر کو ساتھ لیا طاعون کے ڈر کے مارے سواری سے نہ اترتا تھا یہاں تک کہ نیند بھی سواری پر کرتا تھا۔ ایک دن اپنے غلام سے کہا: مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ اس نے کہا میں کون لگتا ہوں کہ آپ کو نصیحت کروں۔ اس نے کہا کچھ تو سنائیے اس

نے پھر بھی انکار کیا۔ عبدالملک نے کہا کوئی سنی سنائی بات سناؤ۔ غلام نے کہا میں نے سنا ہے کہ ایک لومڑی شیر کی خدمت کرتی تھی اور اس کے ذمہ تھا کہ وہ شیر کی نگرانی کرے اور ہر اس برائی کو روکے جو شیر کو نقصان دینے کے درپے ہو۔ لومڑی نے دیکھا کہ عقاب اوپر اڑ رہا ہے۔ لومڑی نے شیر کو کہا کہ کہیں آپ کو عقاب اٹھا کر نہ لے جائے۔ لومڑی نے یہ تدبیر کی کہ شیر کو پیٹھ پر اٹھا کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ شیر لومڑی کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور لومڑی اسے اٹھا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو کون روک سکتا ہے۔ جونہی عقاب نے نیچے نظر دوڑائی اسے وہی شیر نظر آیا اس نے ایک جھپٹ ماری اور شیر کو اٹھا چلا لومڑی روتی رہی اور کہتی تھی اسے ابو الحارث (شیر کی کنیت ہے) میں نے اپنا پورا زور لگایا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی تقدیر کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ زمین والوں سے تو میں تیری حفاظت کرتی تھی لیکن آسمان والوں کی حفاظت سے میں بے بس ہوں یہ کہانی سن کر عبدالملک نے اپنے غلام سے کہا اس نے مجھے بہترین نصیحت کی ہے۔ بس اب واپس لوٹتے ہیں۔

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ یہ کہانی سن کر عبدالملک اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہو گیا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

قضا کشتی آنجا کہ خواہد برد	وگر ناخدا جامہ بر تن درد
درآبیکہ پیدا نباشد کنار	غرور شناور نباید بکار

مسئلہ : تقدیر مبرم ہو کر رہتی ہے وہاں کوئی تدبیر کام نہیں دیتی۔

حدیث شریف: حضور علیہ السلام نے فرمایا: خطرہ تقدیر کو نہیں روکتا۔

مسئلہ : تقدیر معلق صدقہ وغیرہ سے ٹل جاتی ہے۔

حدیث شریف: حضور نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ اور صلہ رحمی عمروں کو بڑھاتے ہیں۔

فائدہ : بعض محققین فرماتے ہیں کہ مقدرات دو قسم پر ہیں:

۱۔ مخصوص بالکلیات۔ ۲۔ مخصوص بالجزیات التفصیلیہ۔

کلیات مخصوصہ بالاسنان وہ ہیں کہ جن کی حضور نبی کریم ﷺ نے خبر دی اور وہ چار ہیں۔

۱۔ روزی۔ ۲۔ عمر۔ ۳۔ اجل۔ ۴۔ سعادت وشقاوت۔

یہ امور تغیر پذیر نہیں ہو سکتے انہیں دعا بھی صدقہ کی طرح کوئی فائدہ نہیں دیتی ہاں بطریق فرض محال کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی کا رزق بڑھتا۔ صلہ رحمی کرنے والے کا بڑھتا اگر کسی کی عمر بڑھتی تو اس کی بڑھتی یہ اس وقت ہے جب کوئی حکمت بتانا مطلوب ہو۔ چنانچہ بطریق فرض محال کے اللہ تعالیٰ کی اولاد کا کہا گیا۔
قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ باقی رہے جزیات اور اس کے لوازم تفصیلیہ تو ان کے متعلق یہ ہے کہ کبھی ان کا ظہور ہو ہی جاتا ہے اور انہیں انسان کبھی پالیتا ہے جب کہ ان کے اسباب و شرائط پائے جائیں ان کے اسباب کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔

حکایت: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک دھوبی گزرا آپ کے پاس آپ کے خدام بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا اس دھوبی کو موت ظہر کے وقت واقع ہوگی اور اس کا جنازہ میرے پاس لانا لیکن ظہر کے وقت نہ مرا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حیران تھے کہ اس کی تقدیر کیوں بدل گئی۔ جب کہ میں نے اس کی تقدیر کو دیکھ کر کہا تھا اتنے میں حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے ان سے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ کیسے ہوا تم نے تو مجھے اس کی موت کی خبر دی تھی لیکن وہ مرا نہیں۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کی اس کی موت تین روٹیاں دینے کے صدقے ٹل گئی ہے۔

ف: اس تفسیر کے پہلے پارہ میں: فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا الخ اگر تمہیں کوئی دکھ درد پہنچے پھر تم سے کوئی آہ و فغان ہوئی تو یقین کرلو اللہ تعالیٰ تمہارے آہ و بکا کو سنتا ہے اور تمہارے حالات کو جانتا ہے۔

مسئلہ: یہ آیت ان لوگوں کے لئے تسلی کا سامان ہے جنہیں دکھ اور درد پہنچتے ہیں۔

کسی نے خوب فرمایا:

اذا ما تمنی روحا و راحۃ — تمنیت ان ان شکروا الیک وتسمع

ترجمہ: جب لوگ راحت و سرور طلب کرتے ہیں تو میں دکھ اور درد مانگتا ہوں کہ میرے دکھ و درد کے بعد میرے آہ و فغان کو تو ہی سنتا ہے۔

اے اللہ ہمیں ان لوگوں سے بنا جو تیری جناب میں بھاگ کر آتے ہیں اور ان کا صرف تیری طرف میلان ہے۔

تفسیر عالمانہ مَنْ استفہامیہ ہے اس میں صدقہ دینے کی ترغیب ہے اور یہ مبتدا ہے ذَا یہ اشارہ قرض دینے والے کی طرف ہے اور یہ مبتدا کی خبر ہے یعنی کون ہے وہ الَّذِیْ لفظ کی ذَا صفت ہے۔ یُقْرِضُ اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کو قرض دے۔ قرض دراصل کاٹنے کو کہتے ہیں۔ اسے قرض اس لیے کہا جاتا ہے کہ دینے والا اسے اپنے مال کا کچھ حصہ کاٹ کر دیتا ہے تاکہ اس کی طرف اتنا مقدار حاصل ہو اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا معنیٰ یہ ہے کہ آج ایسے عمل کرو کہ جن کا ثواب تمہیں آخرت میں نصیب ہو۔ قَرْضًا، یُقْرِضُ کا مصدر، بمعنیٰ اَقْرَاض مصدر مجرد بمعنیٰ مزید ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر آیا ہے: انبتکم من الارض نباتا ای نباتا۔ اس لحاظ سے قرضا بمعنی اقراضا ہوا یعنی قرض دینا۔ حَسَنًا یعنی وہ قرض جو اخلاص اور خوشی و رضا کو مقرون ہے۔

ف: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرض بمعنیٰ مقرض بمعنی المفعول اس اعتبار سے یہ یُقْرِضُ کا مفعول ثانی ہوگا اور حسن کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ قرض حلال اور طیب کمائی کا ہو کہ جس میں غیر کے مال کی ملاوٹ ہرگز نہ ہو۔

بعض نے کہا: کہ قرض حسن مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ کو کہتے ہیں اور اس قرض کے انواع سے ہے۔ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اس فعل کا منصوب ہونا ان مقدر کی وجہ سے ہے جو مؤولاً مصادر ہو کر اس کا قَرْضًا پر عطف ہوگا اور یہ معنیٰ یُقْرِضُ اللّٰهَ سے معنوی طور پر معلوم ہوا اس اعتبار سے مصدر کا عطف مصدر پر ہوا عبارت یوں بنے گی من ذالذی یکون منہ اقراض فمضاعفہ من اللہ یا منصوب ہے بالمعنی کہ وہ معنوی طور پر استفہام کا جواب ہے اس لیے کہ یہ استفہام اگرچہ لفظاً مقرض سے ہے لیکن معنیٰ اقرار سے ہے گویا یوں فرمایا گیا کوئی اللہ تعالیٰ کو قرض دے گا تاکہ اللہ تعالیٰ اسے دہرا دے۔ تضعیفہ کے عوض اس کی مثل یا اس سے کئی گناہ زائد دینا۔

اَضْعَافًا ضعف (دوہرا) کی جمع ہے۔ یضاعفہ کی ھُوَ ضمیر سے حال ہے یہ مبلغ حساب کے اوہام کو قطع کرنے کے لئے ہے۔ یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرمائے گا اتنا ہے کہ اسے سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا۔

بعض نے کہا کہ ایک کے عوض سات سو عنایت فرمائے گا نیکیوں کو دہرا کرنے میں ایک حکمت یہ ہے کہ کل قیامت میں جب اس کے حقوق العباد ادا کئے جائیں تو بندہ مفلس نہ رہ جائے اس لیے کہ کل قیامت میں حقوق العباد کی ادائیگی انہی تضعیفات (دوہری کی ہوئی) نیکیوں سے ہوگی نہ کہ اصل عبادات سے اس لیے کہ

تضعیف (دوہرا ثواب) تو اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہوگا اور اصل نیکی کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایک نیکی کے عوض ایک نیکی نصیب ہو۔

ف: امام بیہقی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ تضعیفات تو فضل الٰہی ہے اسے کسی کے عوض نہیں دیا جائے گا بلکہ بندہ کے لئے ذخیرہ بنا کر اسے دیا جائے جیسے اسے روزے کی نیکیاں احسان کے طور دی جائیں گی اور یہ رب کریم کا فضل وکرم ہے جو بندوں کو عنایت فرماتا ہے جب کہ بندہ بہشت میں داخل ہوگا تو اسے فضل ربانی نصیب ہوگا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؂

نکوکاری از مردم نیک رائے | یکے را بدہ می نویسد خدائے

کرم کن کہ فردا دیوان نہند | منازل بمقدار احسان نہند

ربط: جب بندوں کو راہ خدا میں نکلنے کا حکم فرمایا تو انہیں قرض دینے سے آسانی بتا کر انہیں خبر دی کہ یہ کام سوائے توفیق ربانی کے ناممکن ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ اور اللہ تعالیٰ کمی کرتا ہے بعض پر وَيَبْصُطُ فراخی کرتا ہے بعض پر یا کبھی کمی کرتا ہے یا کبھی فراخی کرتا ہے۔ جیسے کہ اس کی مشیت کا تقاضا ہوتا ہے جس میں بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں مضمر ہوتی ہیں۔ جب بندے کو اس کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا آسان محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ سب کا روزی رساں وہی ہے اس نے ہی مجھے وسعت بخشی ہے پھر جو کچھ دیا ہے اس کے متعلق مجھ سے سوال بھی ہوگا اور میرے مرنے کے بعد یہ مال ویسے ہی رہ جائے گا اگر میں کچھ راہ خدا میں دے دوں تو مجھے آخرت میں ثواب بھی وہی دے گا گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! جب تم جانتے ہو کہ وہی اللہ تعالیٰ روزی گھٹاتا اور بڑھاتا ہے اور یہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ اس کا عنایت کردہ ہے پھر بخل کیوں کرتے ہو تمہیں چاہیے کہ اسے قرض دو اور اس سے جو تمہیں عنایت فرمایا ہے اس کی راہ میں خرچ کرو اس کے برعکس بخل نہ کرو تا کہ وہ تمہارے ساتھ برعکس معاملہ نہ کرے کہ اب دولت مند ہو پھر وہ تمہیں تنگ دست بنا دے۔

نکتہ: روزی بڑھانے اور گھٹانے میں ایک نکتہ یہ ہے کہ وسعت رزق تاخیر سے ہوا کرتی ہے اس سے فقراء مساکین کو تسلی دینا مقصود ہے۔

تفسیر صوفیانہ امام غزالی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ۔القابض الباسط وہ ہے جو ارواح کو اجسام سے موت کے وقت قبض اور ارواح کو اجسام میں حیات کے وقت اور صدقات اغنیاء سے لے کر فقراء کو دلاتا ہے اور کمزوروں کی وجہ سے دولت مندوں کا رزق بڑھتا ہے یہاں تک کہ فقر و فاقہ ختم ہو جاتا ہے اور فقراء کا رزق تنگ کرتا ہے یہاں تک کہ جان لبوں پر آجاتی ہے اور قلوب کو قبض کرتا ہے یعنی ایسا تنگ کر دیتا ہے کہ اس کے لئے لاپرواہی اور بلندی وجلال منکشف ہو جاتے ہیں اور پھر قلوب کو کھول دیتا ہے یہاں تک کہ انہیں قرب نصیب ہو جاتا ہے اس کے فضل وکرم اور احسان اور جمال کا اور وہ کریم اپنے بندوں کے لئے قابض وباسط ہے اس کے وہ بندے جنہیں حکمتوں کے عجائبات الہام اور جوامع الکلم حاصل ہوتے ہیں پھر کبھی ان کے قلوب کو کھول دیتا ہے اور اس کی نعمتوں کو یاد کرتے اور کبھی ان کو تنگ کر دیتا ہے کہ انہیں جلال وکبریائی اور قسم قسم کے عذاب اور آزمائش اور دشمنوں کے انتقام سے ڈراتا ہے۔جیسے حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے کیا کہ کبھی ان کے قلوب کو عبادت کے حرص پر ابھارا اور نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرمائے گا کہ اپنی اولاد کو نار جہنم کے لئے تیار کیجئے وہ عرض کریں گے کتنا حکم ہوگا کہ ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے ایسی بات سن کر صحابہ کرام علیہم الرضوان کے دل مرجھا گئے یہاں تک کہ ان کا عبادت سے بھی جی نہ لگتا۔جب حضور علیہ السلام دوسری صبح کو تشریف لائے تو دیکھا کہ تمام صحابہ کرام علیہم الرضوان حزن وملال میں ہیں تو ان کے قلوب کو خوش کرنے اور انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم (یعنی امت محمدیہ) باقی امتوں میں سے ایسے ہوں گے جیسے مشک کے سیاہ دھبوں میں سفید نور۔

ف: حضرت امام قشیری علیہ الرحمہ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ قبض وبسط سالک کی دو حالتوں کا نام ہے جو بندے کی ترقی کا موجب ہیں۔خوف ورجاء کے قسم ہیں۔عارف باللہ بمنزلہ خوف ہوتا ہے جو مبتدی کو لاحق ہوتا ہے اور عارف باللہ کا وسط وہی ہے جو مبتدی کو رجاء سے حاصل ہوتا ہے۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر تمہیں ان اعمال کی جزا دے گا جو تم نے کیے بھلے یا برے۔ مثلاً بھلے کو جود وسخاوت کی عادت تھی تو بہشت اور اگر بخل کی عادت تھی تو دوزخ۔اسی کو وعید کہتے ہیں اس میں تنبیہ ہے اس دولت مند کو موت کے وقت اس سے تمام مال چھین لیا جائے تو اسے چاہیے کہ موت سے پہلے اس

مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے۔

حکایت: ایک مقام پر دولت مند اور فقراء جمع ہوئے۔ دولت مندوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہمارے درجات بلند فرمائے کہ لوگ ہم سے قرضہ لیتے ہیں۔ فقراء نے کہا ہمارے درجات بلند ہیں کہ وہ قرضہ جات ہمارے ہی لیے لیتے ہیں اگر ہم نہ ہوتے تو تم سے قرضہ نہ لیا جاتا اور قرضہ غیر سے بھی لیا جاتا ہے لیکن قرضہ صرف حبیب کے لئے لیا جاتا ہے۔

حدیث قدسی: اللہ تعالیٰ قیامت میں اپنے بندے سے فرمائے گا کہ میں نے تجھ سے طعام مانگا لیکن تو نے مجھے طعام نہ دیا۔ بندہ عرض کرے گا یا اللہ تجھے طعام مانگنے کی ضرورت کیوں ہے تو رب العزت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے طعام مانگا لیکن تو نے اسے محروم رکھا۔ اگر تو نے اسے طعام دیا ہوتا تو آج تو اسے میرے پاس پاتا۔

ف: قرض محتاج مانگتا ہے اللہ نے اپنے لیے قرض مانگنے کا ذکر فرمایا گویا اس سے اپنی ذات کو بمنزلہ محتاج کے بنا کر ایسے فرمایا جیسے حدیث شریف میں ہے کہ اے میرے بندے میں بیمار ہوا تو نے میری طبع پرسی بھی نہ کی میں بھوکا ہوا تو نے مجھے طعام بھی نہ کھلایا۔ یہ فقیر پر شفقت اور اس پر لطف کرنے کی وجہ سے ہے۔ اسے محققین تنزلات رحمانیہ سے تعبیر کرتے ہیں کہ بندے کی محبت اور اس کے جذبہ کی تکمیل ہو جائے جو کہ اہل شہود کو نصیب ہوتا ہے اور معلوم ہوا کہ جذبات الحق کا ایک جذبہ ثقلین کے عمل کے برابر ہوتا ہے۔ یہ وہی ہے جو عبد فقیر کو مشاہد اعیانیہ میں تنزلات کے مختلف اطوار سے جمال الرحمٰن کا جلوہ نصیب ہوتا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے:

روئے خوباں زینت زیبا شود	روئے احسان از گدا پید شود
پس ازیں فرمود حق در والضحی	بانگ کم زن اے محمد بر گدا
چوں گدا آئینہ جو دست ہاں	دم بود بر روئے آئینہ زبان

اللہ تعالیٰ اپنے کمال فضل اور کرم سے جو اس کا بندوں پر ہے مثلاً اس نے انہیں پیدا کیا اور انہیں اموال کا مالک کیا پھر ان کے نفوس اور اموال کو خرید اپھر انہیں چند روز کے لئے رعایت کے طور پر دیا پھر ان سے قرض

مانگ کر ان پر انہیں کرم بنایا پھر انہیں وہ جو خرچ کرتے ہیں بہت بڑے فضل واحسان کا مژدہ بہار سنایا تو عبد صادق وہ ہے جو اپنی ہمت کے مطابق سوال کرتا ہے اور جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کا سوائے ذات حق کے مشاہدہ کے اور کوئی مطالبہ نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ بھی بندے کو وہی دیتا ہے جو اس کی ہمت کا مطالبہ ہوتا ہے بلکہ اسے اس کے مطلوب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ عطا فرماتا ہے۔ باری تعالیٰ کے وہ عطایا ایسے مخفی ہیں جنہیں آج آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں جب دیکھیں گی تو ٹھنڈی ہوں گی اور اتنا وسعت کے ساتھ نصیب ہوں گی جن کا کوئی شمار نہیں یہ سب کچھ اس کا فضل واحسان ہے اور جن کا مطالبہ صرف دنیا ہے تو وہ متاع قلیل ہے پھر اسے وہ کثیر المقدار نعمتیں کب نصیب ہوں گی۔ اے اللہ ہمیں ان نعمتوں سے بہرہ ور فرما جو اپنے اولیاء کے قلوب کو نصیب فرماتا ہے اور ہمیں ان لوگوں سے بنا جو تیرے دیدار پر انوار کے لئے ترستے رہتے ہیں اور ان کا مقصد وحید صرف وہی ہوتا ہے۔

تفسیر عالمانہ اَلَمْ تَرَ کیا تو نے نہیں دیکھا یعنی تمہارا علم وہاں نہیں پہنچا اس جماعت کے قصہ کو کہ جن کا قصہ اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میرے بتانے سے آپ کو معلوم ہے اس قصہ کو پڑھ کر سن کر تعجب کیجئے کہ کیسے ہے وہ۔

ف: اَلْمَلَاِ ہر وہ جماعت جو مشورہ کے لئے ایک جگہ جمع ہوں اور انہیں املاء اس لیے کہا جاتا ہے کہ مشورہ میں وہ لوگ جمع ہوتے ہیں جو ان میں برگزیدہ ہوتے ہیں جو لوگوں کو اپنی ہیبت سے اور مجلسوں کو رونق سے بھر دیتے ہیں یہ لفظ جمع ہے لیکن اس لفظ کا کوئی واحد نہیں۔ جیسے لفظ قوم جمع ہے لیکن اس کے لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں۔

مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یہ مِنْ تبعیضیہ ہے۔ یعنی وہ ہونے والے ہیں بعض بنی اسرائیل ہے۔

ف: بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔

مِنْ یہ مِنْ ابتدائیہ اس کا متعلق وہی ہے جو پہلے حرف جارہ کا متعلق ہے۔ بَعْدِ مُوْسٰی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد۔ اِذْ قَالُوْا جب کہ انہوں نے کہا یہ اس مضاف سے منصوب جو ملائیں مقدر ہے اصل عبارت یوں تھی: الم تر الی قصۃ الملاء او حدیثھم حین قالوا. مقدر اس لیے مانا گیا ہے کہ تعجب ذوات سے نہیں بلکہ احوال سے ہوتی ہے۔ لِنَبِیٍّ لَّهُمُ اپنے نبی علیہ السلام سے۔ وہ حضرت شموئل علیہ السلام تھے مشہور اور زیادہ قوی یہی ہے۔ اِبْعَثْ لَنَا مَلِكًا ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیجئے جو ہمارا مقتدا ہو اور ہمیں جنگ کی

تدبیریں بتائے۔ نُّقَاتِلْ ہم اس کی سرپرستی میں کفار سے لڑیں۔اس کا مجزوم ہونا جواب کی وجہ سے ہے۔
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنے نبی علیہ السلام سے امیر مانگا۔جیسے ہمارے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ جنت کے وقت ایک امیر لشکر مقرر فرماتے کہ جس کی سرپرستی میں عام لوگ جنگ لڑتے۔

حدیث شریف: مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو حکم فرمایا کہ جب وہ سفر پہ جائیں تو اپنے لیے ایک امیر منتخب کرلیا کریں۔ قَالَ گویا کہا گیا ہے کہ ان کے مطالبہ پر اس نبی علیہ السلام نے کیا فرمایا تو اس پر جواب ملا کہ اس نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ: هَلْ عَسَيْتُمْ قریب ہے۔ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اگر تمہارے اوپر جنگ فرض کی جائے اور تمہارے مطالبہ کے مطابق ایک امیر بھی ہو عسی اور اس کی خبر کے درمیان جملہ معترضہ واقعہ ہے اور وہ جملہ معترضہ یہ ہے اَلَّا تُقَاتِلُوْا یہ کہ تم امیر لشکر کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کرو گے۔
ف: تفسیر کشاف میں ہے معنی یہ ہے کہ تم جنگ نہیں کرسکو گے اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ نبی علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے تھے کہ قریب ہے کہ تم جنگ نہیں کرسکو گے۔ بمعنی الرفع جبنکم عن القتال یعنی مجھے توقع یہ ہے کہ تم جنگ سے کنارہ کشی کرو گے اس معنی پر هَلْ داخل کیا گیا ہے۔استفہام کے طور پر اس امر سے کہ اس میں توقع ہے اور اس توقع میں وہ مصیب تھی جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ الخ میں فعل کا اثبات اور اس کی تقریر مطلوب ہے۔
قَالُوْا وَمَا لَنَآ اور استفہام انکاری ہے اور اس کی خبر لنا ہے یعنی انہوں نے کہا کہ کیا ہے ہمارے لئے اس میں کہ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ نہ کریں۔ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا حالانکہ ہم اپنے گھروں اور بیٹوں سے نکالے گئے ہیں۔یعنی حال یہ ہے کہ ہمیں وہ امر عارض ہوا ہے جو ہمارے اوپر جنگ واجب ہوچکی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ہمیں اپنے گھروں اور وطنوں اور بیٹوں سے نکالا یعنی انہوں نے اہل وعیال و اولاد سے ہمیں جلاوطن کیا۔
سوال: اَبْنَآء کو دِيَارِنَا کے بعد خصوصی ذکر کا کیا معنی ہے؟
جواب: جنگ کرنے کے اسباب میں مزید تقویت ہوگی۔

ف: وَقَدْ اُخْرِجْنَا الخ۔ یعنی انہوں نے ہمیں اپنے گھروں اور بیٹوں سے جلا وطن اور قید کر کے نکالا یہ باتیں قطعاً ذکر کی جاتی ہیں۔

سبب واقعہ: بنی اسرائیل کا اپنے نبی علیہ السلام سے سوال کرنے کا سبب یوں ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہوا تو بنی اسرائیل میں اپنی نیابت میں حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو چھوڑ گئے وہی ان کی نیابت ہیں۔ تورات کے احکام جاری فرماتے آخران کا وصال ہو گیا انہوں نے اپنی نیابت میں کالب علیہ السلام کو چھوڑا ان کا وصال ہوا تو پھر بنی اسرائیل میں ہزار ہا خرابیاں پیدا ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو پس پشت ڈال دیا بلکہ بت پرستی میں منہمک ہو گئے اور ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے الیاس علیہ السلام کو بھیجا اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات سناتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب کے سب بنی اسرائیل تھے اور تورات کے احکام کی تجدید کرتے یعنی کوئی نئی شریعت نہیں لاتے تھے۔ حضرت الیاس علیہ السلام کے بعد الیسع علیہ السلام آئے وہ بھی اپنی زندگی مبارک گزار کر راہی ملک بقا ہوئے۔ پھر بنی اسرائیل میں وہی خرابیاں شروع ہو گئیں۔ جو ان میں پہلے تھیں ان کی ان غلطیوں کی نحوست سے ان پر دشمنوں کا غلبہ ہونے لگا ایک شخص جوان پر غالب ہوا اس کا نام الباناتا تھا اور یہی قوم جالوت تھی جو بحر روم کے ساحل پر مقیم تھی اور بحر روم مصر و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ یہی عمالقہ کی اولاد تھی۔ جو عملیق بن عاد کی ایک نسل تھی۔ بہر حال یہ لوگ بنی اسرائیل پر غالب ہو گئے ان کی بہت سی جاگیروں کو قبضہ میں لے لیا اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو قید کر لیا اور ان کی اولاد کو غلام بنالیا اور بنی اسرائیل کے جتنے بادشاہ تھے ان کے تمام شہزادوں کو جیل میں بند کر دیا اور وہ چار سو چالیس تھے۔ ان لوگوں پر جزیہ مقرر کیا اور ان سے تورات چھین لی اور بنی اسرائیل کو قسم قسم کی تکالیف و مصائب اور پریشانیوں میں مبتلا کیا۔ ان میں کوئی نبی علیہ السلام تو تھا نہیں جو ان کی خامیوں کو دور کرتا بلکہ نبیوں کی اولاد میں سے بھی کوئی نہ رہا۔ سب کا رفتہ رفتہ وصال ہو گیا ہاں ایک بی بی ان میں حاملہ تھی اس بی بی تبرک سمجھ اس کی خدمت کو راحت اور رحمت سمجھا لیکن اسے ایک گھر میں محبوس رکھا کہ شاید اس سے لڑکی پیدا ہو تو ہم اس لڑکی کے بجائے کسی لڑکے کو اس کی طرف منسوب کر دیں گے تاکہ قوم کے بگڑے ہوئے حالات سنور جائیں اس لیے کہ بنی اسرائیل کی رغبت اس طرف تھی کہ

اگر کسی نبی کا لڑکا ہماری راہبری کرے تو ہم ان تمام غلطیوں سے تائب ہو جائیں۔ چنانچہ بی بی اس اثناء میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہی کہ مولا کریم مجھے فرزند عطا فرما تا کہ بنی اسرائیل کے معاملات سدھر جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بی بی کی دعا مستجاب فرمائی کہ اس بی بی کو بچہ پیدا ہوا اس نے اس کا نام شمویل رکھا اس محاورہ سے کہتی رہی سمع اللہ دعائی اس کا عبرانی لغت میں معنی اسماعیل ہوتا ہے اس نے سین کو شین سے تبدیل کر کے شمویل رکھا اور لغت عبرانی میں قاعدہ ہے کہ سین کو شین سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ جب وہ بچہ جوان ہوا تو بنی اسرائیل نے اسے بیت المقدس میں تورات سیکھنے کے لئے معلم کے پاس بٹھا دیا اور شمویل کی تمام ضروریات کی کفالت ان کے شیخ (جو ان کے علماء تھے) نے اٹھائی اور اسے اپنی ذمہ داری لے کر متبنّی بنا لیا۔ جب وہ بچہ بالغ ہوا تو حضرت جبریل علیہ السلام ان کے پاس تشریف لائے جب کہ وہ شیخ کے قریب آرام کر رہے تھے لیکن اسے کسی کی بات پر اعتماد نہ تھا سوائے اپنے شیخ کے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت شمویل کو اس شیخ کی آواز میں کہا اے شمویل! یہ آواز سنتے ہی شمویل اس شیخ کی طرف بھاگے اور کہا ابا جی مجھے کیوں بلایا ہے۔ شیخ نے سوچا کہ اگر کہوں میں نے نہیں بلایا تو اچھا نہیں کیونکہ اس طرح بچہ گھبرا جائے گا۔ شیخ نے فرمایا بیٹا بیٹھ جا۔ جا کر آرام کیجئے۔ شمویل علیہ السلام ان کے حکم سے جا کر سو گئے۔ جبریل علیہ السلام نے انہیں دوبارہ اسی طرح کہا: اے شمول۔ شمویل علیہ السلام نے پھر شیخ سے کہا آپ نے مجھے بلایا ہے۔ شیخ نے کہا جاؤ سو جاؤ۔ اگر دوبارہ بلاؤں تو جواب نہ دینا۔ چنانچہ جا کر سو گئے۔ لیکن بار سوم حضرت جبریل علیہ السلام حضرت شمویل علیہ السلام کے پاس کھلم کھلا حاضر ہوئے اور کہا آپ اس قوم کے نبی ہیں۔ آپ ان کے ہاں تشریف لے جایئے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکام سنایئے۔ جب وہ اپنی قوم کے ہاں آئے اور پیغام ربانی سنایا تو انہوں نے آپ کی تکذیب کی اور کہا تو نے اظہار میں عجلت کی ہے ابھی تیری نبوت کے اظہار کا وقت نہیں آیا۔ ہاں اگر آپ نبوت میں سچے ہیں تو ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر فرمایئے تا کہ ہم ان کی سرپرستی میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں کفار سے جنگ کریں یہی آپ کی نبوت کی نشانی سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے امور کا انتظام بادشاہوں کے سپرد تھا اور بادشاہ انبیاء علیہم السلام کے ماتحت بادشاہت چلاتے۔ بادشاہ دنیوی امور کا نظم و نسق کرتا اور نبی اس بادشاہ کی غلطیوں کی نگہداشت کرتا اور اس طرح اسے احکام الٰہی کے مطابق چلاتا اور بادشاہ کو یقین ہوتا کہ یہ حکم

جو مجھے نبی سے ملا ہے یہ حکم ربانی ہے وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ پس جب کہ ان پر جنگ فرض کی گئی یہ اس وقت فرض کیا گیا جب انہیں ان کے نبی شمویل نے ان سے سوال کیا تھا کہ کیا تم جنگ کرو گے؟ انہوں نے کہا ہاں اس پر اللہ تعالیٰ نے جنگ کا حکم دیا اور ان کے سوال کے مطابق ان کے لئے بادشاہ مقرر فرمایا۔ تَوَلَّوْا انہوں نے منہ پھیرا یعنی جہاد سے ہٹ گئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو ضائع کر دیا یہ نہیں کہ انہوں۔ نے ابتدا امر الٰہی سے روگردانی کی بلکہ بار بار دشمن کی تنگیوں اور تلخیوں کو دیکھا اور اب وہ ان کے دشمن ان کے سر پر تھے یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام کو اجمالاً بیان فرما دیا۔ اس لیے کہ ان کے قول و فعل میں منافات اور تبائن تھا۔ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ مگر تھوڑے ان میں یہ وہ تھے جنہوں نے طالوت کے ساتھ نہر کو عبور فرمایا اور صرف پانی کے ایک گھونٹ پر اکتفا فرمایا وہ تین سو تیرہ تھے اہل بدر کی گنتی کے مطابق۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے ان کے ظلم یعنی جنگ سے روگردانی کی وجہ سے وعید سنائی گئی ہے جب کہ ترک جہاد کر کے قول و فعل میں منافات و مباینت پیدا کر دی۔

ف: آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ قوم نے دل میں کچھ اور زبان پر کچھ یعنی منافقت کا مظاہرہ کیا اور جو چھپاتے تھے ان کا خلاف نکلا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا ظاہری دعویٰ کے نقد کو معنی کی حقیقت کو کسوٹی پر رکھا لیکن وہ اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے کہ اپنے دعویٰ پر دلیل قائم نہ کر سکے اور قاعدہ ہے کہ امتحان کے وقت انسان کی یا تو عزت ہوتی ہے یا ذلت۔

حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

خود بود گر محک تجربہ آمد بمیاں یا سیہ روئی شود ہر کہ درو غش باشد

تفسیر صوفیانہ یہی اہل سلوک وغیرہ کے مدعیوں کا حال ہے کہ اہل حقیقت نے انہیں جب خواہشات نفسانیہ کے مٹانے کی جنگ کا کہا تو وہ روگردان ہو کر کہتے کہ ہم کیسے جنگ کریں لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے بے فرمان ہوئے اور اس کے شہروں کو برباد کیا بلکہ اس کے بندوں پر ظلم برسایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے نور بجھایا اس کے برعکس ہوتا تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت نصیب ہوتی۔

مسئلہ: آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے تھوڑے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقَلِيْلٌ

عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ اور یہ ہر زمانے میں ہوتا ہے اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ اچھی شئے کم یاب ہوتی ہے اور قیمت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ہوتی ہے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

خاک مشرق شنیدہ ام کہ کنند   بچہل سالہ کاسہ چینی

صد بروزی کنند در بغداد   لاجرم قیمتش ہمی بینی

نکتہ: حق کی طلب اس لیے ہے کہ باوجود یہ کہ انس وجن صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ کیونکہ مقصود اعظم تو صرف حضرت انسان ہے اور وہ حاصل ہو گیا یا اس لیے کہ ہدایت یافتہ لوگ اگرچہ گنتی کے لحاظ سے تھوڑے لیکن شرف کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں۔ جیسا کہ مقولہ عرب مشہور ہے کہ: قلیل اذاعدو کثیر اذا شدوای اظہر واللقوۃ۔ لیکن وہ گنتی میں تھوڑے ہیں جب شمار کیے جاتے ہیں لیکن جب دشمن پر حملہ کرتے ہیں تو کثیر التعداد معلوم ہوتے ہیں۔

ف: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "سواد اعظم" وہی ہے جو حق پر ہو اگرچہ ایک ہو۔

ف: اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ سب کے سب اخلاص اور توجہ الی اللہ کی طرف لگ جاتے اگر اس طرح جو جائے تو وجہ معاش تنگ ہو جائے گی اسی لئے مشہور ہے: لولا الحمقی لخرجت الدنیا۔ اگر پاگل نہ ہوں تو دنیا ویران و برباد ہو جائے۔ حکمت ربانی کا یہی تقاضا ہے کہ جن دونوں ہاتھوں کو جس طرف منسوب کیا گیا ہے اس کا اسی طرح ظہور ہو ان میں ایک تو سعادت مندی کی طرف منسوب ہے جس میں رحمت وجنان ہے دوسرے میں قہر وغضب اور ان کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں اور دونوں بابرکت ہیں۔ لیکن ہر ایک کا حکم علیحدہ علیحدہ ہے۔ جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا دانا پر لازم ہے کہ وہ غضب کے اسباب سے احتراز کرتا رہے اور اپنے رب تعالیٰ کے کرم کا متلاشی رہے۔

ف: سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کا یہ گمان ہو کہ وہ جدوجہد کے بغیر بارگاہ حق تک پہنچ جائے گا وہ صرف آرزو کرنے والا ہے اور جس کا گمان ہو کہ جدوجہد سے پہنچے گا وہ مقصد پانے والا ہے۔ اے اللہ ہمارے اوپر اپنے فضل وکرم کے ڈول ڈال اور ہمیں اپنے تک اپنے ذریعہ سے پہنچا۔ (ارحم الراحمین)

تفسیر عالمانہ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ ان کے نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا یہاں نبی علیہ السلام سے مراد حضرت شمویل علیہ السلام ہیں جب قوم نے سوال کیا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر فرمایئے۔ جس کی سرپرستی میں ہم اپنے دشمنوں سے لڑیں ان کے اس سوال پر حضرت شمویل علیہ السلام ایک ڈنڈا اور ایک قرن لائے جس میں قدس کا تیل تھا اس میں انہیں حکم تھا کہ جو ان بنی اسرائیل کا بادشاہ ہوتا اس کا قد ڈنڈے کے برابر ہوگا اور جب وہ بادشاہ شمویل علیہ السلام کے پاس حاضر ہوگا تو یہی بنی اسرائیل کا بادشاہ ہے تو وہ تیل اس کے سر پر لگا دینا اور بنی اسرائیل پر اس کی بادشاہی کا اعلان کر دینا۔

حضرت وہب نے فرمایا کہ انہی دنوں میں حضرت طالوت کے والد کے اونٹ گم ہو گئے تو اس نے طالوت کو انہیں تلاش کرنے کے لئے نوکر دے کر بھیجا یہ دونوں حضرت شمویل علیہ السلام کے گھر سے گزرے تو غلام نے کہا اگر ہم اس نبی علیہ السلام کے پاس حاضر ہو جائیں تو بہتر ہے تا کہ وہ ہمیں اونٹوں کی خبر دیں اور دعا فرما دیں تو ممکن ہے ہمیں اونٹ مل جائیں۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت شمویل علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ بھی اونٹوں کی بات کر رہے تھے کہ اچانک وہی تیل جو قلعہ میں تھا جوش مارنے لگا۔ حضرت شمویل علیہ السلام اٹھے اور اسی ڈنڈے کو طالوت کے قد پر ناپا جو کہ اس کے قد کے عین مطابق ہوا۔ حضرت شمویل علیہ السلام نے طالوت سے فرمایا کہ اپنا سر میرے قریب کیجئے۔ طالوت نے اپنا سر حضرت شمویل علیہ السلام کے قریب کیا تو انہوں نے وہی قدس کا تیل ان کے سر پر لگایا اور فرمایا آج کے بعد تو ہی بنی اسرائیل کا بادشاہ ہو گیا اور یہ حکم میرے اللہ کا ہے اس نے مجھے فرمایا ہے کہ میں تجھے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دوں طالوت نے کہا اس کی علامت کیا ہے۔ شمویل علیہ السلام نے فرمایا اس کی علامت یہ ہے کہ جب تم لوٹو گے تو اونٹ مل چکے ہوں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا اس کے بعد شمویل علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بھیجا۔ طالوت عجمی لفظ اور غیر منصرف ہے اس لیے کہ معرفہ اور عجمہ ہے۔

مَلِكًا طالوت سے حال ہے یعنی یہ تمہارا بادشاہ ہے اب اس کی طاعت کرو اور ان کی سرپرستی میں دشمنوں سے لڑو۔ قَالُوْا وہ متعجب ہو کر کہنے لگے بلکہ انہیں اس سے انکار کر دیا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انہوں نے اس انکار سے اپنے نبی علیہ السلام کی تکذیب کی جس سے وہ کافر ہو گئے۔ بعض نے کہا کہ وہ مومن تھے انہوں نے

تعجب صرف اس لیے کیا تا کہ طالوت کو بادشاہ بنانے کی حکمت معلوم کریں۔ جیسا کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ، اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا اس کی ہمارے اوپر کیسے بادشاہی ہو سکتی ہے جب کہ وہ طالوت اس کا اہل نہیں۔ وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ ہم بہ نسبت اس کے بادشاہی کے زیادہ حقدار ہیں۔ اسے ہمارے اوپر بادشاہی کرنے کا کس طرح حق ہو سکتا ہے۔ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ اور نہ ہی اس کے پاس مال و ثروت کی کثرت ہے۔ اس لحاظ سے وہ ہمارا بادشاہ نہیں بن سکتا اور جب کوئی کوئی دوسرا مستحق ہو تو پھر یہ ہمارے اوپر بادشاہی کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ نیز جس شئے پر شاہی چلانے کا دارومدار ہے یعنی مال وہ بھی اس کے پاس نہیں اور مال ایسی شئے ہے کہ اس سے شاہی چلائی جا سکتی ہے۔ ورنہ مشکل ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نبوت مخصوص حضرات کے لئے مختص سمجھتے تھے۔ یعنی دین یعقوب کی اولاد میں ہے انہی میں سے حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام تھے اور بادشاہی یہودا ابن یعقوب کی اولاد سے انہی میں سے داؤد سلیمان علیہ السلام تھے اور طالوت ان میں کسی کی اولاد میں سے نہ تھے بلکہ وہ بنیامین بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور وہ لوگ بہت بدچلن ہو گئے تھے اور گناہوں کے ارتکاب میں ایسے سرگرم تھے کہ دن دہاڑے سر راہ عورتوں سے جماع کر لیتے تھے اس لیے یہ بات انہیں عقلاً نقلاً مستبعد نظر آئی لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کی زبان سے انہیں کہلوا دیا اس کے باوجود بھی انکار کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہو گیا اس لئے ان سے اللہ تعالیٰ نے بادشاہی چھین لی تھی اور مال و دولت بھی ان کے پاس نہ رہنے دیا اس کی اس بدکرداری کی وجہ سے ان کا نام سبط الاثم پڑ گیا اور حضرت طالوت معمولی سا کاروبار کرتے تھے مشہور ہے کہ وہ موچی اور نہایت تنگدست یا ماشکی یا مزدور تھے۔

قَالَ رد کرتے ہوئے نبی علیہ السلام نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ بیشک اسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر چن لیا اگر چہ نہ اس کا نسب اچھا ہے اور نہ اس کے پاس مال ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسری وجہ سے فضیلت بخشی ہے وہ یہ ہے کہ وَزَادَهٗ بَسْطَةً اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فراخی اور وسعت بخشی ہے علم میں یعنی اسے علم حاصل ہے جس کی وجہ سے بادشاہی چلا سکتے ہیں اور لوگوں کے حالات سے پورے طور واقفیت رکھتے ہیں اور جسم میں طویل القامت ہیں یعنی جسمانی طور بھر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان دو چیزوں کی وجہ سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے: ۱۔ علم

۔۲۔جسم۔ان دونوں وجوہ سے لوگوں کے دلوں میں اس کی ہیبت اور وجاہت ہوتی ہے۔حضرت طالوت کا سر دوسروں کی بہ نسبت موٹا تھا اور آپ کے کاندھے بھی چوڑے تھے یہاں تک کہ پورا ہاتھ دراز کرنے پر کہیں جا کر ان کے سر پر ہاتھ پہنچتا۔

ربط: جب بنی اسرائیل نے طالوت کی بادشاہی کو ناممکن سمجھا کہ نہ اسے نسبتی طور پر فضیلت حاصل ہے اور نہ ہی وہ مالدار ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بادشاہی ایک عطیہ ایزدی ہے جسے وہ چاہے عنایت فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اپنے فضل وکرم سے طالوت کو بادشاہ بنایا ہے اور وہ تمہاری ضروریات و مصلحتوں کو تم سے زیادہ جانتا ہے۔دوسرا اسے تبحر علمی نصیب ہے اس لحاظ سے وہ امور سیاست پر بہت زیادہ عبور رکھتا ہے اور جسمانیت میں بھی موزونیت رکھتا ہے اور جنگی مہارت میں بھی قابلیت کے مالک ہیں۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے اسے علمی و عملی خوبیوں سے نوازا ہے اس لیے وہ تمہارے اوپر بادشاہی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے چنا ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا فرماتا ہے اس لیے کہ وہ مالک الملک والملکوت ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کی مرضی ہے جسے چاہے جتنا چاہے عنایت فرمادے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے۔فقیر اور محتاج کو بہت کچھ دیتا اور غنی کرسکتا ہے۔ عَلِيْمٌ اسے سب کا علم ہے وہ شاہی کے لائق کو بھی جانتا ہے اور نااہل کو بھی۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بادشاہی سے اس لئے محروم فرمادیا کہ وہ لوگ ہچو ما دیگرے نیست کی بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے اور ان پر حضرت طالوت کی حالت سے تکبر کا بھوت سوار ہو گیا اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔اس عجب بیماری کی وجہ سے کہنے لگے کہ ہم بادشاہی کے حقدار ہیں اور طالوت کو ہمارے اوپر بادشاہی کرنے کی اہلیت ہی نہیں یہ حقارت کی نگاہ سے کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ طالوت ملک ومال سے فارغ ہے جب انہوں نے تکبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بادشاہی چھین لی۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

یکے قطرہ باراں زابرے چکید   خجل شد چو پہنائے دریا بدید

که جائیکه دریاست من کیتم گر او ہست حقا کہ من نیستم
چو خود را بچشم حقارت بدید صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بجائے رسانید کار کہ شد نامور لولوے شاہوار
بلندی ازاں یافت کو پست شد در نیستی کوفت تا ہست شد

اعجوبہ : زمخشری کے بلاغات سے ایک یہ ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ دو خبیثوں سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ لازماً خبیث ہوتا ہے۔ لیکن گوبر اور خون سے جو پیدا ہوتا ہے وہ طیب و طاہر ہے۔ یعنی دودھ۔

ف : یعنی مشاہدہ میں آیا ہے کہ زوجین خبیثین سے بچہ طیب پیدا نہیں ہوتا لیکن دودھ ایسی شئے ہے کہ یہ دو خبیثوں سے نکل کر پھر بھی طیب و نفیس ہے باوجودیکہ وہ گوبر اور خون کے درمیان سے نکل کر آتا ہے گوبر اور خون اس پر اثر انداز نہیں ہوتے نہ دودھ کے ذوق میں کمی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے رنگ میں خرابی۔ بلکہ دودھ ان کے درمیان سے نکلتا ہے تو نہایت لطیف و نظیف اور پینے والوں کو بہت ہی خوشگوار اور رچتا پچتا ہے۔

فائدہ : کہا جاتا ہے کہ دودھ کو اللہ تعالیٰ گوبر اور خون سے پیدا کرتا ہے حالانکہ یہ دونوں وہ دودھ کو محیط ہوتے ہیں لیکن دودھ اور ان کے درمیان قدرت نے ایک آڑ بنا رکھی ہے جو ان کے ایک دوسرے پر اثر نہیں ڈالنے دیتی نہ رنگ میں نہ ذائقہ میں اور نہ ہی بو میں بلکہ ہر ایک اپنی حالت میں خالص رہتی ہے۔

فائدہ : مشہور ہے کہ جب جانور گھاس کھاتا ہے تو وہ گھاس اس کے معدے میں جا کر ٹھہرتی ہے تو وہ اسے پکاتا ہے جب وہ تقسیم ہوتی ہے تو اس کا نچلا حصہ گوبر بن جاتا ہے اور درمیان میں دودھ کا مادہ ہوتا ہے اوپر والا حصہ سے خون کا مادہ بنتا ہے جگر ان سب پر حاوی ہے جو اپنے طور انہیں تقسیم کرتا ہے خون تو رگوں میں چلا جاتا ہے اور دودھ تھنوں میں اور باقی گوبر معدہ میں رہ جاتی ہے سبحان اللہ! کیسی عظیم قدرت کا مالک ہے اور لطیف اور نازک حکمت والا ہے یہ نکتہ اسے معلوم ہوتا ہے جو اس میں تامل کرتا ہے۔

فائدہ : انسان میں بھی دونوں مادے ہیں اصلاح کا بھی اور فساد کا بھی۔ کبھی اولاد میں اس کا مظاہرہ ہوتا ہے اگر ماں باپ اصلاح رکھتے ہیں تو اولاد پر اصلاح اثر کرتی ہے اور اگر معاملہ برعکس ہو تو اولاد بھی ویسے ہی ہوگی۔

فائدہ : دراصل امر ایجاد کا تعلق اظہار و ابطال پر ہے۔ آدم علیہ السلام کی اولاد اور ان کے دو صاحبزادوں

(ہابیل اور قابیل) کو دیکھئے۔ اسی طرح قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

نکتہ : دراصل بنی اسرائیل کی نگاہ طالوت کے ظاہر پر تھی اور اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت اس کے باطن پر تھی اور وہ اس بطون کے لحاظ سے بہت بڑا شریف النفس تھا اور اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت پتھر پر ہو جائے تو اسے جوہر بنا دیتی ہے۔ اگر کانٹے پر پڑ جائے تو اسے گلاب اور ریحان بنا دیتی ہے۔ معترض کو اس کے حکم سے روگردان نہیں ہونا چاہیے عاقل اگر ان میں بغور وفکر دیکھے تو اس میں باری تعالیٰ کا انصاف پائے گا اگر اس کی سمجھ سے بالاتر ہے تو اس کے لئے سکوت افضل ہے بلکہ یہ معاملہ حی وقیوم کی طرف سپرد کر دے اور یوں عرض کرے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ فرماتا ہے وہ حق ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اور ان کے نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا۔ یہ اس وقت جب کہ انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ہمیں طالوت کے بادشاہ ہونے کی علامت چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ طالوت کی بادشاہت پر کون سی علامت ہے۔ ان کے جواب میں فرمایا کہ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖ بیشک اس کی سلطنت کی علامت یہ ہے کہ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ تمہارے پاس تابوت آسمان سے آئے گی۔

حل لغات : اَلتَّابُوْتُ توب سے ہے۔ بمعنی رجوع اور اَلتَّابُوْتُ اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ ان میں اشیاء رکھی جاتی ہیں گویا وہ اشیاء کی امانت گاہ ہے اور وہ اشیاء جو ایک بار نکل گئیں پھر رہنے کے لئے اس میں آئیں اور اس کا مالک اس کی طرف رجوع کرتا ہے کہ جو اشیاء اس میں امانت کے طور رکھی تھیں وہ اٹھائے گا۔ اس سے تورات کی صندوق مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد بنی اسرائیل پر ناراضگی کی وجہ سے اسے آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ جب بنی اسرائیل کی نافرمانیاں حد سے بڑھ گئیں پھر جب انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے طالوت کی بادشاہت کی نشانی مانگی تو انہیں کہا گیا کہ ان کی بادشاہت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آسمان سے فرشتے لائیں گے اس صندوق کی حفاظت ملائکہ کرتے رہے۔ چنانچہ اسی طریق سے فرشتے صندوق لائے اور قوم وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی یہاں تک کہ وہ صندوق حضرت طالوت کے ہاں رکھ دی یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔

فائدہ : مورخین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک صندوق حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمائی جس میں

حضرات انبیاء علیہم السلام کی تصویریں تھیں۔ تمہیں اور وہ شمشاد کی لکڑی سے تیار کی گئی تھی اور تین ہاتھ لمبی اور دو ہاتھ چوڑی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں تادم زندگی پاس رہی پھر ان کے وصال کے بعد آپ کی اولاد میں وراثۃ چلی آئی یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچی اس کے بعد بنی اسرائیل کی وراثت میں دست بدست حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں پہنچی آپ اس میں تورات کے علاوہ اپنا ضروری سامان رکھتے تھے۔

ف: حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جنگ کے لئے تشریف لے جاتے تو اس صندوق کو آگے آگے رکھتے جس کی برکت سے بنی اسرائیل کو اطمینان اور سکون نصیب ہوتا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہو گیا پھر اس طرح بنی اسرائیل دست بدست لیتے دیتے رہے۔

اعجوبہ عجیبہ : بنی اسرائیل کا اگر کسی معاملہ میں جھگڑا ہو جاتا تو وہ اپنا فیصلہ اسی صندوق کے پاس لاتے تو وہ صندوق بول پڑتی اور ان کے مابین فیصلہ کر دیتی۔

مسئلہ وسیلہ جلیلہ: بنی اسرائیل جب کہیں جنگ کو جاتے تو اس صندوق کو اپنے لشکر کے آگے آگے رکھتے اور اس کو وسیلہ بنا کر دشمنوں پر فتح یاب ہوتے اسے فرشتے ہی لشکر کے اوپر اٹھاتے پھرتے تھے اور جنگ میں لے جاتے جب اس صندوق کے اندر سے آواز صادر ہوتی تو سمجھتے بلکہ یقین کرتے کہ فتح ہمارے حصہ میں ہے جب ان سے نافرمانی شروع ہوئی اور فساد برپا کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عمالقہ کو مسلط کر دیا۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے وہی صندوق چھین کر (معاذ اللہ) پیشاب اور گندگی میں دفن کر دی پھر جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنائے تو عمالقہ کو مصائب میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ ان میں جو بھی اس مدفونہ صندوق کی جگہ پر پیشاب کرتا بواسیر میں مبتلا ہوتا اور اس نحوست سے پانچ شہر ویران ہو گئے۔ اس سے کفار عمالقہ کی آنکھ کھلی یہ ساری نحوست اس صندوق کی بے حرمتی اور بے ادبی کی وجہ سے ہے۔ اس لیے انہوں نے اس صندوق کو نکالا اور جلدی اٹھا کر اسے دو بیلوں پر باندھ دیا اور انہیں وہاں سے روانہ کر دیا۔ ان بیلوں پر اللہ تعالیٰ نے چار فرشتے مقرر کر دیئے جو انہیں ہانکتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ حضرت طالوت کے گھر پہنچا دیا۔ جب بنی اسرائیل نے اپنے نبی علیہ السلام سے طالوت کی بادشاہت کی دلیل مانگی تو فرمایا کہ ان کی بادشاہت کی دلیل

یہ ہے کہ وہ صندوق جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے تمہیں وراثۃً ملی تھی وہ طالوت کے گھر میں ملے گی چنانچہ جب دیکھا کہ واقعہ صندوق حضرت طالوت کے پاس موجود ہے تب انہیں یقین ہوا کہ طالوت ان کا بادشاہ ہے۔

ف: اس تقریر پر اتیان کا لفظ مجازاً مستعمل ہوا ہے کیونکہ اسے لایا گیا تھا نہ کہ وہ خود بخود آئی تو اس کی طرف ان کی نسبت بطور مجاز کے توسعاً ہے جیسے کہا جاتا ہے: ربحت التجارة اور پہلی تقریر پر ریتان کا لفظ حقیقی معنیٰ میں مستعمل ہوا ہے۔

فِیْهِ یعنی اس صندوق کے آنے میں سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی تمہارے لئے سکون واطمینان ثابت ہونے والا رب سے ہے۔ تین معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔

۱۔ وہ شے بنی اسرائیل کو صندوق میں دی گئی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ریح ہے جو سکون دینے والی اور نہایت ہی اچھی جو دشمنوں کے دل میں رعب ڈال کر اپنی آواز سے ہلا دے جب کہ دشمنوں کا مقابلہ ہوتا تھا یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے معجزہ اور ان کے بادشاہوں کی کرامت بن کر ظاہر ہوئی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے بھیدوں میں ایک عجیب بھید ہے جو حکمت بن محدث (ولی اللہ) کی زبان پر ڈالی جاتی ہے جیسے فرشتے انبیاء علیہم السلام کے قلوب پر وحی ڈالتا تھا جو ان کے لئے ترویح الاسرار و کشف الاسرار ہوتا۔

۳۔ وہ واردات جو حضور نبی پاک شہ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک اور ان کے طفیل مومنین کے دلوں پر وارد ہوتے ہیں یہ واردات اور قوت اور روح کو جمع کرتی ہے جس کی طرف خائف انسان کو سکون اور حزین کو تسلی نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

ف: بعض نے فرمایا تابوت سے وہ علم اور اخلاص وذکر مراد ہے جس سے قلوب کو اطمینان ملتا ہے اور ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اس کا قلب علم اور وقار کا مقر بن جاتا ہے جو اس سے قبل اسے حاصل نہ تھا۔

وَبَقِيَّةٌ اور ہونے والا بقیہ۔ مِّمَّا یہ من تبعیضیہ ہے بعض اس میں سے جو کہ تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے چھوڑا وہ تورات والی تختی کے چند ٹکڑے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا (جو بہشتی مورد کے

درخت سے بنایا تھا) اوران کے کپڑے اور نعلین شریف اور ہارون علیہ السلام کی دستار مبارک اور تورات شریف کے چند آیات اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خاتم اور من یعنی وہ ترنجبین کی بوری جو بنی اسرائیل پر اتری تھی۔ جسے وہ وادی تیہ میں کھاتے تھے مراد ہے۔

ف: آل سے مراد ان حضرات کے اپنے نفوس مقدسہ ہیں یہاں آل کا لفظ زائد ہے یا ان کے ابناء یا اتباع مراد ہیں۔

تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اسے فرشتے اٹھاتے تھے یہ تابوت سے حال ہے یعنی طالوت کی بادشاہی کی علامت یہ ہے کہ اس کے لئے صندوق آئے گی تو اس کا جواب ملا کہ اسے فرشتے اٹھا کر لائیں گے۔

سوال: اس صندوق کو فرشتے اٹھا کر نہیں لائے اسمیں اگرچہ بعض روایتیں ہیں لیکن ہر دونوں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً پہلی روایت میں ہے کہ یہ صندوق خود بخود آسمان سے اتری تھی صرف ملائکہ اس کی حفاظت کرتے تھے دوسری روایت میں ہے اسے آسمان کی گاڑی پر رکھ کر دو بیلوں پر لایا گیا جنہیں فرشتے ہانکتے تھے۔

جواب: دونوں روایتوں کے لحاظ سے فرشتوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ اس صندوق کی حفاظت کرتے تھے اور قاعدہ ہے کہ جو بھی کسی شئے کے راستہ کی حفاظت کرتا ہے تو اسے اس شے کے اٹھانے سے موصوف کیا جاتا ہے اگرچہ اسے اٹھانے والا کوئی اور ہو۔ جیسے کہتے ہیں: حملت الامعد الی زید۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کوئی راستہ میں اس شے کی حفاظت کرے اگرچہ اسے اٹھانے والا کوئی اور ہو۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ ممکن ہے کہ یہ بنی اسرائیل یہ نبی علیہ السلام کے قول کا تتمہ ہو یا یہ نیا جملہ ہے اور خطاب اللہ تعالیٰ سے ہے یعنی اس تابوت میں **لَاٰیَةً** البتہ بڑی آیت تھی۔ **لَّكُمْ** جو تمہارے لیے دلالت کرتی طالوت کی بادشاہی اور تمہارے نبی علیہ السلام کے قول کی صداقت پر جب کہ انہوں نے فرمایا کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا بادشاہ بنایا بیشک یہ امر عادت کے مناقض ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اگر تم مومن ہو یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو تو اس کی یہ بات بھی سچ مانو کہ اس نے نبی طالوت کو تمہارا بادشاہ بنایا۔

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اشارہ ہے کہ بندے کی خلافت (بادشاہی) کی علامت یہ ہے کہ وہ قلب کے

صندوق پر کامیاب ہو جائے۔ جس میں رب تعالیٰ کی طرف سے سکینہ ہے۔ یعنی اپنے ایمان اور انس مع اللہ پر مطمئن ہونے والے اور وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ الخ سے مراد ذکر یعنی لا الہ الا اللہ کا عصا مراد ہے اور یہی کلمہ تقویٰ ہے اور یہ وہی سانپ ہے جس نے جب منہ کھولا تو فرعون نفس کے صفات کے تمام جادوگروں کے پھندوں کو ہڑپ کر دیا ذکر اللہ کے عصا کو قلوب کے صندوق میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جمال و جلال کے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھا جیسے حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کی صرف دو انگلیوں میں ہے صفت جلال سے اس فجور کا الہام فرمایا ہے اور صفت اکرام سے اس کا تقویٰ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا اور یہ بات نہ تو اللہ تعالیٰ نے ملک و مقرب کے ہاں امانت رکھی اور نہ اسے قبل کسی مرسل کو۔ پچھلی امتوں کے سکینہ اور حضور علیہ السلام کی امت کے سکینہ سے ان کے اولیاء و انبیاء کا حصہ نہیں تھا اگرچہ اس صندوق میں تورات کی بعض آیات رکھی ہوئی تھیں لیکن اس امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قلوب مبارک کے صندوق میں تمام قرآن پاک محفوظ ہے اور ان کے تابوت میں چند گھر ہوتے ہیں۔ جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام کی صورتیں ہیں اور ان کے قلوب کے صندوق میں چند خلوت خانے ہیں جن کے اندر سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی غیر کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ میں زمین پر سما سکتا ہوں اور نہ آسمان میں لیکن مومنین کے قلب میں سما جاتا ہوں جب روح انسان طالوت کے لئے میسر ہو یعنی جب اسے قلب ربانی کا تابوت دیا گا تو اس کو ملک و خلافت اور سر پر سلطنت عطا ہوائی اس پر صفات انسانی کی تمام اسباط نے اعتماد کیا اس کے بعد وہ انسان کامل غدار دنیا کی طرف نہ صرف غیر متوجہ ہوتا ہے بلکہ اس سے پورے طور پر علیحدہ ہو کر جالوت نفس امارہ کی لڑائی میں لگا رہتا ہے اور یہ صرف فضل الٰہی اور طریقت کی راہ چلنے اور حقیقت سے تمسک کرنے سے نصیب ہوتا ہے۔

رہ نیست روئے از طریقت متاب　　　بنہ کام و کامی کہ خواہی بیاب

ترجمہ: جو شخص چاہتا ہے کہ وہ سکینہ میں متجاوز ہو کر معرفت تک پہنچے تو اسے چاہیے کہ قلب کی صفائی کرے اس کے لئے معرفت الٰہی ہی قلب کے سکینہ کا نام ہے جیسا کہ قلب سکون کا موجب ہے۔

حکایت: حضرت ابو یزید رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا معرفت کیا شے ہے؟ تو آپ نے یہ آیت اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا

دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ تلاوت فرمائی۔ یعنی معرفت کی مثال ان بادشاہوں جیسی ہے جو کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں کے اہل غلبہ کو کمزور بناتے ہیں یعنی ان کے وہ حالات تبدیل کر دیتے ہیں جن پر وہ ہوتے ہیں اسی طرح جب واردات ربانیہ پر (جو کہ شہوات وخواہشات سے پر ہوتی ہیں) وارد ہوتے ہیں تو ان قلوب کو ردی اوصاف سے پاک وصاف کر دیتے ہیں۔ حضرت ابو یزید سے پوچھا گیا کہ آپ نے معرفت کو کیسے پایا تو آپ نے فرمایا پیٹ کو بھوکا کر کے اور بدن کو ننگا رکھ کر یعنی اچھے لباس سے محروم رکھ کر۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

باندازہ خور زاد اگر مردی — چنیں پر شکم آدمی یا خمی

ندارند تن پروران آگہی — کہ پر معدہ باشد زحکمت تہی

اے اللہ ہمیں ان رکاوٹوں سے بچا جو تیرے تک پہنچنے میں مانع ہوتی ہیں۔ (آمین)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ

پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر شہر سے جدا ہوا بیشک اللہ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے تو جو اس کا پانی پئے وہ میرا

مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا

نہیں اور جو نہ پئے وہ میرا ہے مگر جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے لے لے تو سب نے اس سے پیا مگر تھوڑوں نے

مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ کے مسلمان نہر کے پار گئے بولے آج ہم میں طاقت نہیں جالوت اور اس کے لشکروں کی

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً

بولے وہ جنہیں اللہ کا یقین تھا کہ بارہا کم جماعت غالب آئی ہے زیادہ گروہ پر

بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا

اللہ کے حکم سے اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔ پھر جب سامنے آئے جالوت اور اس کے لشکروں کے عرض کی اے رب ہمارے ہم پر

صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ

صبر انڈیل اور ہمارے پاؤں جمے رکھ کافر لوگوں پر ہماری مدد کر۔ تو انہوں نے ان کو بھگا دیا اللہ کے حکم سے اور قتل کیا

دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ

داؤد نے جالوت کو اور اللہ نے اُسے سلطنت اور حکمت عطا فرمائی اور اسے جو چاہا سکھایا اور اگر اللہ لوگوں میں بعض سے بعض کو دفع نہ کرے

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

تو ضرور زمین تباہ ہو جائے مگر اللہ سارے جہان پر فضل کرنے والا ہے۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

یہ اللہ کی آیتیں ہیں کہ ہم اے محبوب تم پر ٹھیک ٹھیک پڑھتے ہیں اور تم بیشک رسولوں میں ہو۔

تفسیر عالمانہ

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ پس جب طالوت اپنے لشکر کو لے کر شہر سے جدا ہوئے فصل دراصل فصل نفسہ کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ فاعل ومفعول کے لحاظ سے متحد ہے اس لیے یہ عموماً محذوف المفعول ہو کر آتا ہے یہاں تک کہ اب اتصال کے معنیٰ میں بمنزلہ فعل لازم کے ہو گیا ہے اب معنیٰ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے شہر سے جدا ہوئے بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر عمالقہ کی جنگ کے لئے اور جنود، جند کی جمع ہے بہت بڑے سخت لشکر کو کہا جاتا ہے جند سے ماخوذ ہے بمعنی وہ زمین جو سخت قسم کی ہو اور ہر قسم کی مخلوق کو جند (لشکر) کہا جاتا ہے۔

ف: مروی ہے کہ جب انہوں نے صندوق طالوت کے ہاں دیکھی تو اب انہیں اپنی فتح مندی کا پورا یقین ہو گیا اس لیے جہاد کی طرف تیزی سے روانہ ہونے لگے حضرت طالوت نے فرمایا کہ میرے ساتھ جنگ کے لئے بوڑھے مریض نہ چلیں اور نہ ہی وہ لوگ جو دوسروں کی خدمت میں مصروف ہیں اور نہ ہی تاجر اور نہ قرض دار اور نہ ہی وہ جس نے ابھی ابھی بیاہ کیا ہو اور پھر اپنی عورت سے پہلی رات بھی نہ گزار سکا ہو میرے ساتھ صرف نوجوان چلیں اور وہ بھی بطیب خاطر اور ہر دنیوی خیال سے فارغ ہو کر طالوت کے اس اعلان پر ان کے اپنے انتخاب پر اسی ہزار (80000) جنگی جمع ہو گئے اور وہ سخت گرمی کا موسم تھا اور راستہ بھی وہ اختیار کیا جس کے ہر سو جنگل ہی جنگل تھے جس میں پانی کی قلت تھی اس لیے انہوں نے پانی کا شکوہ کیا اور کہا دعا کیجئے تاکہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے نہریں جاری کرے۔

قَالَ اپنے شمویل علیہ السلام کی خبر دینے پر طالوت نے انہیں فرمایا کہ: اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرنے والا ہے۔ یعنی تمہارے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کی کسی سے آزمائش کی جاتی ہے آزمائش بھی اس سے ہوگی جس کی تم نے طلب کی ہے یعنی پانی سے یہ آزمائش اس لیے ہوئی کہ طالوت کو مخلص اور غیر مخلص کا علم ہو جائے تاکہ پھر اس غیر مخلص کو اپنے لشکر سے ہٹا دے اس لیے کہ قاعدہ ہے کہ اگر غیر مخلص لشکر میں موجود ہو تو مخلصین پر برا اثر پڑتا ہے پھر اس سے لشکر میں ضعف پڑ جاتا ہے جس کی نحوست سے شکست ہوتی ہے۔

آنکہ جنگ آرد بخون خویش بازی می کنند ۔۔۔ روز میدان آنکہ بگریزد بخون لشکری

(چنانچہ اس کے بعد سونے اور چاندی کی طرح نکھر گئے جیسا کہ سونے میں کھوٹ ملا ہوتا ہے تو ان میں آگ کی بھٹی سے نکھارا

جاتا ہے پھر خالص علیحدہ ہو جاتا ہے اور کھوٹ علیحدہ)

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ پس وہ شخص جو اس سے پئے گا یعنی اس نہر سے ابتداء پانی پئے گا بایں طور کہ منہ کے بل سے پانی پی لے الکرع لغت میں پانی کی جگہ پر منہ لگا کر پی لینا بغیر اس کے کہ اسے چلو میں یا برتن میں پیا جائے۔

فَلَيْسَ مِنِّي پس وہ مجھ سے یعنی ہماری جماعت مومنین کے گروہ سے نہیں اس تقریر پر مَنْ تبعیضیہ ہے۔ متکلم کی ضمیر پر داخل ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان اصحاب کو آپس میں قوت و طاقت اور باہمی اختصاص واتصال اور اتحاد کی وجہ سے وہ گویا ایک دوسرے کا جز ہیں یا یہ معنیٰ ہے کہ جو پانی پئے گا میرے ساتھ متحد نہیں اس معنیٰ پر یہ مـن اتصالیہ ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ میں مَنْ اتصالیہ ہے یعنی متحمل بالبعضالا خر و متحدو معه یعنی ان کا بعض دوسرے بعض کے ساتھ متصل اور اس کے ساتھ متحد ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ اور جو اس سے نہیں چکھے گا الـطـعـم یہاں پر بمعنی چکھنے کے ہے۔ لغت میں کسی چیز کو تھوڑا سا لینے کے لئے کہا جاتا ہے۔ طعم الشئی یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کھانے پینے کی چیز سے تھوڑا سا چکھ لے۔ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ بے شک وہ میرے سے ہے۔ یعنی وہ میرے اہل دین سے ہے۔

اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ ہاں جو اس میں سے ہاتھ سے صرف ایک چلو لے گا یہ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ سے استثناء ہے اس کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ کو درمیان میں لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس نہر کا پانی نہ پینا عزیمت ہے اور تھوڑا سا پی لینا رخصت ہے اور قاعدہ ہے کہ عزیمت کا بیان رخصت سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حل لغات: الغرفة بالضم نام ہے پانی کی اس مقدار کا جو چلو سے حاصل ہوتا ہے۔ (الغرف) پانی کو آلہ سے لینا جیسے چلو یا برتن دراصل الغرف بمعنیٰ القطع اور الغرفه بروزن العبته عمارت کے ایک حصہ کو کہا جاتا ہے اور اس کی الباء اختلاف سے متعلق ہے۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت طالوت کے حکم کی برکت یہ ہوئی کہ صرف اس ایک غرفہ انہیں اور آپ کی سواریوں اور آپ کے خدام کو مکتفی ہو کر باقی بچ رہتا۔ حضرت امام نے فرمایا ابن عباد کے قول میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ طالوت کو پانی پیتے وقت یوں اجازت ہوئی کہ آپ اس مہر سے یکبارگی جس طرح سے لے سکتے ہیں لے لیں اور بس اور ان کا وہی ایک بار لے لینا انہیں اور ان کی

سواریوں اور خدام کو کافی رہے گا اس لیے بچے ہوئے پانی کو پی کر باقی جو بچ جائے اسے ساتھ لے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس نہر سے تھوڑا سا پانی لے لیا پھر اس تھوڑے میں اتنی برکت ہوئی کہ اسے آپ اور آپ کی سواریوں اور خدام کو کافی رہا یہ اس زمانے کے نبی کے معجزات میں سے تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں تھوڑے سے پانی سے ایک بہت بڑے لشکر کو سیراب کرایا تھا۔

فَشَرِبُوْا مِنْهُ مگر ان میں تھوڑے (وہ تین سو تیرہ تھے) اصحاب بدر کی گنتی کے مطابق یعنی وہ جنہوں نے صرف ایک چلو پر اکتفا کیا اس لیے وہ سیر بھی ہو گئے اور جن لوگوں نے حضرت طالوت کی مخالفت کی وہ جونہی گھٹنوں کے بل پانی پینے لگے تو الٹا ان کی پیاس بڑھ گئی اور پانی پیتے پیتے ان کے ہونٹ سیاہ ہو گئے اور پیاس کی شامت میں نہر پر پڑے رہے اس طرح سے مخالف و موافق کی پہچان ہوئی طالوت ان مخالفین کو چھوڑ کر چلے گئے۔

نہ بے حکم شرع آب خوردن خطا است وگر خون بفتویٰ بریزی روا است

سبق: وہ لوگ اس لیے مردود ہوئے کہ وہ پانی اگرچہ انہیں حلال تھا لیکن اسے مخصوص طریق سے پینے کے خلاف کیا تو پھر وہ صرف مردود ہی نہ ہوئے بلکہ تھوڑی دیر کے بعد مر گئے۔ غور کیجئے اس کا کیا حال ہوگا جو کھانے پینے کی حرام اشیاء کو ہضم کر جاتا ہے پھر اس کی بات کیسے قبول ہو اور کیسے اسے کامل انسان سمجھا جا سکتا ہے؟

ف: مفسرین میں کسی کا خلاف نہیں کہ جنہوں نے نہر کو عبور کیا چنانچہ باری تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے معلوم ہوتا ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ پس جب کہ اس نے نہر کو عبور کیا۔ هُوَ اس طالوت نے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے وہ تھوڑے تھے جنہوں نے طالوت کا فرمان مانا اور ان کی مخالفت نہ کی اس امر میں جس کی طرف انہوں نے انہیں پیش کیا اس سے معلوم ہوا کہ ان کے ماسوا بے فرمان لوگ ایمان کی دولت سے محروم ہو گئے۔ یعنی اس طالوت کے ساتھ اس کا تعلق جَاوَزَهٗ سے ہے نہ کہ اٰمَنُوْا سے قَالُوْا کہا ان بعض نے جو طالوت کے ساتھ تھوڑے سے مسلمان رہ گئے اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو يَظُنُّوْنَ الخ میں ہیں پس مومن وہ تھے جو نہر کو عبور کر گئے۔ اس وقت یہ دو گروہ بن گئے ایک تو زندگی چاہتا اور موت سے کراہتا تھا ان کی طبع پر خوف و جزع غالب ہو گیا۔ دوسرا گروہ بہادر اور قوی القلب تھا انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وجہ سے موت کی پروانہ تھی قسم

اول وہی لوگ ہیں جنہوں نے کہا: لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُوْدِهٖ ہمیں آج جالوت اور اس کے لشکر کے لئے کوئی طاقت نہیں ہے۔ بمعنی ان کے ساتھ جنگ کرنے کی قوت نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ہمیں ان پر کوئی غلبہ ہو وہ اس لیے کہ جب انہوں نے جالوت کے لشکر کی کثرت وقوت کو دیکھا تو گھبرا گئے اس لیے کہ وہ ایک لاکھ جنگی ہتھیار سے لیس تھے دوسرا گروہ وہ تھا جنہوں نے بطیب خاطر طالوت کا ساتھ دینے کا دم بھرتے ہوئے کہا: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ الـــــخ قَالَ گویا کہا گیا کہ پھر ان کے مخاطب نے انہیں کیا کہا؟ تو جواب دیا گیا کہ کہا: الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ان لوگوں نے جنہیں یقین تھا کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی تائید کو ملنے والے ہیں۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بہت ساتھوڑا گروہ بہت بڑے گروہ پر غالب آجاتا ہے۔ یعنی بہت بار مٹھی بھر جماعت بہت بڑے لشکر پر غلبہ پا جاتی ہے۔ الفئۃ جماعت کو کہا جاتا ہے۔ وہ قلیل ہوں یا کثیر۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے آسان کر دینے کی وجہ سے اس لیے کہ جملہ امور کا دارومدار اس کی مشیت پر ہے اس لیے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوسکتا جس کی اللہ تعالیٰ مدد کرے اگرچہ وہ گنتی کے لحاظ سے تھوڑے کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح جسے اللہ تعالیٰ ذلیل کرے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا اگرچہ اس سے اسباب کثیر اور گنتی کے لحاظ سے اس کا بہت بڑا لشکر بھی ہو بنا بریں ہم بھی انشاء اللہ جالوت اور اس کے لشکر پر غالب ہو جائیں گے۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ دشمن پر غلبہ اور صبر کی توفیق بخشتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن سے مقابلہ ہوتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ حضرت امام راغب اصفہانی علیہ الرحمہ نے فرمایا قصہ میں دنیا اور اہل دنیا کی مثال دی گئی ہے۔ کہ جو شخص دنیا سے اتنی مقدار لیتا ہے جو اسے دنیوی ضروریات کو مکتفی ہوتا ہے تو وہ بچ گیا اور نجات پا گیا اور جو اس سے ضروریات سے زائد حاصل کرتا ہے وہ پیاس میں بڑھتا رہتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا نمک کی طرح ہے جو ضرورت سے زائد لیتا ہے اسے پیاس ستاتی ہے۔

حدیث شریف: میں ہے کہ اگر ابن آدم کے لئے دو وادیاں نہر سونے کی ہوں تو چاہتا ہے کہ تیسری بھی حاصل ہو ابن آدم کو صرف مٹی ہی بھرے گی یعنی وہ ہمیشہ دنیا کے حرص میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ مر جاتا ہے ہاں جو توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے یعنی اس حرص سے (جو کہ مذموم ہے) اسی طرح تمام برائیوں سے

توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔

نکتہ : حضور علیہ السلام نے فرمایا انسان لفظ نہیں اس میں اشارہ ہے کہ ابن آدم مٹی سے پیدا کیا گیا اور اس کی طبیعت میں ہے اور اس کا ازالہ ممکن ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس پر توفیق کی بارش برسائے۔

نتیجہ : غافل پر لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کو دنیا کی تمام اشیاء کو حاصل کرنے کے دکھ میں نہ ڈالے اس لیے کہ رزق مقرر کردہ اور تقسیم شدہ ہے۔

وحی ربانی: مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام سے فرمایا جو کچھ میں چاہتا ہوں تم بھی چاہتے ہو یا نہ۔ یاد رکھو جو میں چاہتا ہوں اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو میں تجھے وہ دوں گا جو تم چاہتے ہو اگر تم میری رضا پر راضی نہ ہو گے تو میں تمہیں تکلیف میں مبتلا کروں گا پھر وہی ہو گا جو میں چاہتا ہوں۔

ف: لوگوں کو جس نہر سے آزمائش کی گئی اس سے طبیعت جسمانیہ کا چشمہ مراد ہے جو حرص کر کے اس سے سیر ہو کر بہت زیادہ پیتا ہے تو وہ اہل حقیقت سے نہیں بلکہ اہل طبیعت سے اور شہوات کا پجاری ہے اور وہ شہوات میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ سے دور ہے۔ہاں جو متاع دنیا سے کنارہ کش رہتا ہے مگر اتنی مقدار جو ماکولات و مشروبات وملبوسات اور مسکن میں سے اسے ضرورت ہے وہ معافت ہے اگر دنیا سے اتنا تعلق رکھتا ہے جتنا اس کے جسم کی مجبوری ہے اس قدر کرتا ہے جتنا اس کا قوام ہے تو اولیاء اللہ سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ دنیا اور اس کی زینت نہر ہے جو ہمیشہ اس کے کنارہ پر رہے وہ زیادہ مطمئن رہے گا جو اس نہر کو عبور کرتا ہو اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا وہ کامیاب ہے لیکن ایسے لوگ عوام کی نسبت عشر عشیر ہوتے ہیں اور عوام تو گنتی سے باہر ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو قوت وقناعت نصیب فرمائے اور ہمیں اہل سنت کے عقائد سے جدا نہ کرے۔

حدیث شریف: مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی وصیت میں فرمایا کہ اے ابوہریرہ نیک لوگوں کے طریقے نہ چھوڑنا جب کہ قیامت میں لوگوں کو گھبراہٹ ہوگی لیکن وہ مطمئن ہوں گے اور جب کہ لوگ جہنم کی آگ سے پناہ مانگتے ہوں گے لیکن وہ اس وقت بے خوف خطرہ ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی وہ لوگ کون ہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔آپ نے فرمایا قرب قیامت میں میری امت میں وہ ہیں جن کا حشر حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوگا۔لوگ

جب انہیں دیکھیں گے تو سمجھیں گے کہ یہ انبیاء ہیں۔ کیونکہ ان کے وہی مراتب ہوں گے جو انبیاء علیہم السلام ہوں گے یہاں تک کہ میں پہچان کر کہوں گا کہ اے میرے امتیو! اے میرے امتیو! اس سے مخلوق کو معلوم ہوگا کہ یہ انبیاء نہیں ہیں۔ وہ جب وہاں چلیں گے تو ان کی رفتار بجلی یا ہوا کی طرح ہوگی اور ان کے انوار سے لوگوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بھی وہی عمل بتائیے تا کہ میں ان کی طرح ہو جاؤں۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ لوگ سخت راستہ پر چلنے والے ہیں انہوں نے بھوک کو اختیار کیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر طرح کی ناز و نعمت سے نوازا اور وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں زندگی گزارتے ہیں باوجود یہ کہ ان کے پاس ہر طرح کی بہترین پوشاک ہوتی ہے اور پیاسے رہتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پینے کے بہترین مشروبات عنایت فرمائے ہیں۔ صرف اس امید پر کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس حلال رزق کو استعمال کریں تو کل قیامت میں اس کا حساب کس طرح دیں گے وہ اہل دنیا کے ساتھ گزارتے ہیں ان کے جسم تو ان کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن وہ ان کے ساتھ ذرہ بھی مشغول نہیں ہوتے ان کی عبادت سے انبیاء علیہم السلام وملائکہ کو تعجب ہوگا انہیں مبارک باد۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: میری تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مجھ سے جلد ملائے اس کے بعد آپ ان کی ملاقات کے شوق میں روئے۔

اولیاء اللہ کے برکات اور ان کا وسیلہ

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اہل زمین پر عذاب بھیجنے کا ارادہ ہوتا ہے لیکن اپنے پیاروں کو دیکھتا ہے تو ان کی وجہ سے اہل زمین سے عذاب ہٹا لیتا ہے اے ابو ہریرہ تم ان کے طریقے کو لازم پکڑو۔

حضرت شیخ عطار قدس سرہٗ نے فرمایا:

درراہ مرداند از خویش نہان ماندہ	بی جسم وجہت کشتہ بے نام ونشان ماندہ
نکشان شریعت ہم دلشان حقیقت ہم	ہم دل شدہ وہم جان نہ ایں ونہ آن ماندہ

ان پر اللہ تعالیٰ کے سلام اور رحمت وبرکتیں ہوں اے اللہ ہمیں بھی ان سے بنا دے۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ وَلَمَّا بَرَزُوْا اور جب وہ ظاہر ہوئے یعنی طالوت اور ان کے ساتھ اہل ایمان ظاہر ہوئے اور

آگئے جنگ کے میدان کی زمین پر پہنچ گئے۔ لِجَالُوتَ وَجُنُوْدِهٖ جالوت اور اس کے لشکر کے لئے اور ان کی تعداد اور ان کی اپنے متعلق دشمنی کا معائنہ کیا اور یقین کیا کہ ہمارا بظاہر ان سے مقابلہ نہیں ہو سکے گا۔ قَالُوْا جب اہل ایمان کے دل قوی ہو گئے تھے تو کفار کی طعن و تشنیع سے عجز و انکسار کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرنے لگے :رَبَّنَآ وہ اپنی عبودیت کا اقرار اور اپنی اصلاح کی طلب کر رہے تھے اس لیے لفظ رب سے صرف یہی مفہوم ظاہر ہے۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا یہ افراغ الاناء کے محاورہ سے ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ برتن کو اس شئے سے خالی کر لیا جائے جو اس کے اندر ہو یعنی ہمارے اندر صبر ڈال دے یہ کمال واکثار سے استعارہ ہے۔

سوال: جب افراغ خود متعدی ہے پھر اسے علی سے متعدی کرنے کا کیا مطلب؟

جواب: افراغ میں طلب کا معنیٰ مقصود ہے اس لئے کہ صبر ان پر غالب اور ان کو ایسے شامل ہوتا ہے جیسے ظرف مظروف کو۔ صَبْرًا جنگ کی شدائد کی سختیوں اور تنگیوں کے موارد کے ہجوم کے وقت صبر کی توفیق عطا فرمانا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں وہ امور عطا فرما کہ جن کی وجہ سے ہم جنگ کی سختیوں اور قدموں کے ڈگمگانے کی پریشانیوں سے بچ جائیں۔ مثلاً قلوب کا مضبوط ہونا اور دشمنوں کے دلوں پر رعب چھا جانا اور دیگر وہ اسباب جن کی وجہ سے ہمیں فتح و نصرت نصیب ہو۔

ف: ثبات قدم سے اس کا کمال مراد ہے یعنی مقابلہ کے وقت رسوخ حاصل ہو اور اس وقت ہمارے قدم ڈگمگا نہ جائیں صرف ثابت قدمی ہی مطلوب نہیں۔ وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اور ہمیں کافروں پر فتح اور غلبہ عطا کر اور انہیں شکست دے۔

ف: دعا میں ترتیب بلیغ کی رعایت کی گئی ہے کہ پہلے انہوں نے اپنے قلوب کے لئے صبر کا سوال کیا اس لیے کہ جنگ کا دارومدار اسی پر ہے اس کے بعد انہوں نے ثابت قدمی کا عرض کیا جو صبر سے متفرع ہے اس کے بعد کفار پر فتح و نصرت کا سوال کیا جو اصلی مقصد تھا۔

فَهَزَمُوْهُمْ پھر جالوت کے لشکر کو طالوت کی جماعت نے بلا تاخیر شکست دے دی۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مدد و تائید سے اس سے معلوم ہوا کہ ان کی دعا قبول ہوگئی۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ اور جالوت کو داؤد علیہ السلام نے قتل کر دیا۔

جالوت کا تعارف: جالوت بہت بڑے سرکش اور عمالقہ کا سردار بلکہ ان کا بادشاہ تھا اور عملیقہ بن عاد کی اولاد سے تھا۔ بہت جنگجو اور بہت طاقتور تھا اور بہت بڑے بہادر لشکروں کو منٹوں میں شکست دے دیتا تھا اس کی لوہے کی تلوار السیفہ ایسی بھاری اور سخت تھی جس کا وزن تین سو رطل تھا اور طویل القامت اتنا کہ ایک میل تک اس کا سایہ پڑتا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا تعارف: حضرت طالوت کے لشکر میں ایشی نامی یعنی داؤد علیہ السلام کے والد گرامی منجملہ ان میں سے تھے جو طالوت کے ساتھ نہر سے عبور کر کے آئے تھے ان کے ساتھ صاحبزادے تھے ان میں سب سے چھوٹے حضرت داؤد علیہ السلام تھے اور بکریاں چراتے تھے اس لیے وہ ان میں شامل نہ تھے بلکہ اپنے گھر میں رہ گئے تھے۔

اشمویل علیہ السلام کا علم غیب: ۔ اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کے نبی یعنی حضرت اشمویل علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ داؤد بن ایشی ہی جالوت کو قتل کریں گے۔ فلہٰذا انہیں بلوا لیجیے۔ چنانچہ حضرت شمویل علیہ السلام نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بلایا اور شمویل علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں جالوت کو مارے گا فلہٰذا آپ جنت میں ہمارے ساتھ رہنا۔ حضرت داؤد علیہ السلام ان کے ساتھ ہو لئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور ایک پتھر کا واقعہ: ۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام جنگ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں آپ سے ایک پتھر مخاطب ہوا کہ اے داؤد مجھ کو اٹھا لیجیے میں وہی پتھر ہوں جس کے ذریعے حضرت ہارون علیہ السلام نے فلاں فلاں بادشاہ کو قتل کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے اپنے کشکول میں رکھ لیا اس کے بعد کچھ آگے چلے تو دوسرا پتھر بولا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیجیے اس لیے کہ میں موسیٰ علیہ السلام کا پتھر ہوں میری وجہ سے فلاں فلاں بادشاہ کو قتل کیا آپ نے اسے بھی اپنے کشکول میں رکھ لیا اس کے بعد تیسرا پتھر بولا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیجیے اس لیے کہ آپ میری وجہ سے جالوت کو قتل کریں گے آپ نے اسے بھی کشکول میں رکھ لیا آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ قذافہ سے ہی تیر مارتے تھے آپ اس قذافہ سے جسے بھی تیر مارتے تھے خواہ بھیڑیا ہو یا شیر یا چیتا تو ایک ہی وار سے اسکا خون ٹھنڈا کر دیتے تھے۔

جنگ کے حالات:

جب دونوں لشکر جنگ کے لئے آمنے سامنے ہوئے تو سب سے پہلے ہی جالوت سرکش میدان میں کودا اور اعلان کیا کہ آؤ میرے مقابلہ میں کون آتا ہے۔ اس کی ہیبت دیکھ کر کوئی بھی میدان میں آنے کی ہمت نہ کرسکا۔ اس پر جالوت نے کہا اے بنی اسرائیل اگر تم حق پر ہو تو میدان میں نکلو کیوں چھپے بیٹھے ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس غیر مختون کے مقابلہ کو جاتا ہے۔ سب کے سب خاموش ہو گئے۔ حضرت طالوت نے داؤد علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ ہی مقابلہ کیجئے اگر آپ کامیاب گئے تو میں اپنی لڑکی آپ کے نکاح میں اور آدھی بادشاہی دے دوں گا۔

مقابلہ کے لئے میدان میں تشریف لائے:۔

حضرت داؤد علیہ السلام پہلے ہی جنگ کے لئے تیار تھے صرف حکم کے منتظر تھے آپ نے جالوت کے اعلان جنگ کے لئے لبیک کہا اور تیاری کے لئے روانہ ہونے لگے تو حضرت طالوت نے انہیں اپنا شاہی گھوڑا دیا اور زرہ اور ہتھیار عنایت فرمائے آپ جنگی لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوئے میدان جنگ کے قریب جاکر اپنے بادشاہ کے پاس واپس لوٹے بادشاہ کے حواری کہنے لگے یہ جواب بھی جالوت کے رعب کی تاب نہ لاسکا اس لئے واپس لوٹ رہا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے آتے ہی فرمایا بادشاہ سلامت! اگر میرا اللہ تعالیٰ مجھے مدد نہ دے تو مجھے آپ کے ہتھیار کوئی فائدہ نہیں دیں گے۔ لیکن عام اختیار دیدے کہ میں جالوت کا مقابلہ جس طرح چاہوں کروں کچھ ضروری نہیں کہ میں تیرے ان ہتھیاروں سے لڑوں طالوت نے کہا جاؤ تمہیں عام اختیار ہے۔ جس طرح دل چاہے لڑتے رہو۔

جالوت اور داؤد علیہ السلام کا مکالمہ:۔

حضرت داؤد علیہ السلام پھر واپس میدان جنگ میں چلے گئے اور اپنے کشکول کو لے کر گلے میں ڈالا فلاخن (فلاخن کو پنجابی میں گوسا کہا جاتا ہے) لے کر جالوت کے مقابلہ کے لئے چل پڑے۔ مروی ہے کہ جالوت نے آپ کو دیکھتے ہی رعب ڈالنے کی کوشش کی وہ اس طرح کہ کہنے لگا کہ اے بیٹے مجھے تیری جوانی پر رحم آتا ہے لہٰذا تم واپس چلے جاؤ۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا غم نہ کھایئے انشاء اللہ میں ہی تجھے تباہ و برباد کردوں گا

جالوت نے کہا تجھے میں تیری فلاخن اور پتھر میں ایسے کھینچوں گا جیسے کتے کو کھینچا جاتا ہے۔داؤد علیہ السلام نے فرمایا تم ہی کتے سے ذلیل ترین ہو کر مرو گے۔ جالوت نے کہا میں تیرا گوشت زمین کے درندوں اور آسمان کے پرندوں کو کھلاؤں گا۔داؤد علیہ السلام نے فرمایا انشاء اللہ تعالیٰ میرا رب تجھے ایسے ہی کرے گا وہ بڑا قادر ہے۔

داؤد علیہ السلام کا جالوت کو قتل کر کے کھینچ کر طالوت کے سامنے لانا:۔

یہ گفتگو کرتے ہی حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے مکرر تینوں پتھر کشکول کرتے ہی حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے تینوں پتھر کشکول سے نکالے پہلے پتھر کو نکالا تو کہا بسم اللہ ابراہیم دوسرے پتھر کو نکالتے ہوئے کہا اسحٰق تیسرے پتھر کو نکال کر کہا بسم اللہ (یعقوب علی نبینا وعلیہم السلام)ان تینوں کو اپنی فلاخن میں رکھا خدا کی شان وہ تینوں خود بخود یکجان ہو گئے آپ نے فلاخن کا ڈورا ہاتھ میں لیا اور زور سے وہ پتھر جالوت کی طرف پھینکے۔اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم فرمایا وہ ہی پتھر لے کر اس کی تلوار کی نوک پر لگا تو اس کا زور دماغ کے اندر چلا گیا بلکہ دماغ کو چیرتا ہوا گدی سے باہر نکلا تو اس کے پیچھے کھڑے ہونے والے تیس جنگیوں کو مار ڈالا اللہ تعالیٰ نے کفار کو شکست دی جالوت زخم کی تاب نہ لا سکا نیچے گرا حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے کھینچتے ہوئے طالوت کے آگے لا پھینکا اس سے مسلمانوں کو بیحد خوشی ہوئی اور فتح ونصرت سے صحیح سالم اپنے شہر کو لوٹے۔

طالوت کا داؤد علیہ السلام پر حسد کرنا:۔

واپس لوٹتے ہی طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام سے حسب وعدہ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا اور آدھی بادشاہی بانٹ کر داؤد علیہ السلام کی مہر کا اجراء کر دیا۔اس سے عوام کا رجحان حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف ہو گیا۔ ہر وقت اس کی تعریف کرتے ان کے گن گاتے اور ان کی محبت کا دم بھرتے اس لئے طالوت کو حضرت داؤد علیہ السلام سے حسد ہو گیا اور ارادہ کر لیا کہ انہیں قتل کر دوں حضرت داؤد علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپ نے وہاں سے بھاگ کر ایک پہاڑ میں عبادت گزار لوگوں کی رفاقت میں زندگی بسر کرنا شروع کر دی اور بہت عرصہ یہاں پہ بسر فرمایا لیکن طالوت کو حسد کا بھوت ایک مدت تک سوار رہا اسے علماء وصالحین داؤد علیہ السلام کے قتل کرنے سے باز رہنے کی نصیحت فرماتے لیکن ہر ناصح کی گردن اڑا دیتا اس سے وہ اپنے ارادہ پر سرگرم ہو گیا جو بھی نصیحت کرتا اسے مار ڈالتا بلکہ اب عام آرڈر جاری کر دیا کہ جتنے ہی علماء اور داؤد علیہ السلام

کے خیر خواہ ہوں ان کو چن چن کر مار دو۔

طالوت کی توبہ اور شمویل علیہ السلام کا بعد وصال مدد کرنے اور وسیلہ بننے کا بیان:۔

ایک عرصہ تک طالوت یونہی کرتا رہا لیکن پھر اس کا نشہ اترا تو اپنے کیے پر نادم ہوا اور کہنے لگا ہائے میں نے کیا کیا رونے اور آنسو بہانے لگا رات دن بے قرار رہتا اور اتنا بے بس ہو گیا کہ اس کی زاری اور آہ و بکا پر لوگوں کو ترس آتا تھا ہر رات گورستان میں گزارتا اور روتے روتے اور دھاڑیں مارتے ہوئے کہتا کہ کوئی ہے جو بارگاہ حق میں میری توبہ قبول کرا دے یا مجھے خبر دے کہ تیری توبہ قبول ہو گئی۔ اس کی اتنی بہت بڑی زاری اور آہ و بکا کو دیکھ کر کسی نے کہا اے بادشاہ اب بھی اگر داؤد علیہ السلام کو قتل کرنے کی ہوس باقی ہے تو میں بتاؤں کہ داؤد علیہ السلام کہاں ہیں۔ اس نے کہا واللہ اب اگر مجھے داؤد علیہ السلام ملیں تو میں ان کی تعظیم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا بلکہ ان کا سچا پکا غلام بن کر رہوں گا اس عہد و پیمان کو باقاعدہ لکھا اور شاہی مہر لگا کر عام اعلان کر دیا اس کے بعد اس عورت کی خدمت میں حاضر ہوا جو اسم اعظم جانتی تھی اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور عرض کرنے لگا اے بی بی کیا تیرے علم میں ہے کہ میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا تیری توبہ ہرگز قبول نہیں ہو سکتی البتہ ایک تدبیر باقی ہے وہ یہ کہ اگر تمہیں کسی نبی علیہ السلام کا مزار شریف معلوم ہو تو ان کے مزار شریف پر حاضری دو اور وہاں سے ہی تمہاری نجات ہو سکتی ہے۔ طالوت اس بی بی کو لے کر حضرت شمویل علیہ السلام کے مزار شریف پر حاضر ہوا، بی بی نے وہیں جا کر نوافل پڑھے اور دعا مانگی اور ندا دی صاحب مزار کی امداد اس کی ندا سن کر حضرت شمویل علیہ السلام مٹی سے بال جھاڑتے ہوئے مزار شریف سے باہر تشریف لائے لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے کیا قیامت تو قائم نہیں ہو گئی۔ بی بی نے کہا یہ طالوت ہے آپ سے عرض کرتا ہے کہ اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ حضرت شمویل علیہ السلام نے فرمایا اے طالوت میرے بعد تو نے کیا کیا جب کہ میں نے تجھے کسی برائی کا سبق نہیں دیا۔ اس نے کہا حضرت نہ پوچھیے کہ آپ کے بعد میرے سے اتنے خطا سرزد ہوئے کہ جن کا شمار ناممکن ہے اب آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ مجھے درگاہ حق سے معافی دلوایئے آپ نے فرمایا آپ کے کتنے لڑکے ہیں۔ طالوت نے کہا میرے دس لڑکے ہیں۔ حضرت شمویل علیہ السلام نے فرمایا میں تیری توبہ کا کوئی علم نہیں رکھتا ہاں یوں ہو سکتا ہے کہ شاہی امور سے

فارغ ہو جا پھر تو اور تیرے تمام لڑکے اللہ کی راہ میں مارے جائیں اس کی صورت یہ ہے کہ تیرے ایک ایک لڑکے کو تیرے سامنے قتل کیا جائے تو ان سب سے آخر میں قتل کیا جائے۔ یہ کہہ کر حضرت شمویل علیہ السلام مزار میں چلے گئے۔ جب طالوت یہ سن کر واپس لوٹا تو ویسے ہی عمل کیا جیسے شمویل علیہ السلام سے سنا۔ طالوت مارا گیا تو اس کا قاتل فوراً حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاں پہنچا اور سمجھا کہ انہیں طالوت کی موت کی خبر سناؤں گا تو خوش ہو جائیں گے۔ لیکن آپ سنتے ہی ناراض ہوئے اور اس کی فوراً گردن اڑا دی اور فرمایا: اگر وہ مارا گیا ہے تو بتایئے باقی کون زندہ رہے گا طالوت کو چالیس سال بادشاہی کرتے ہوئے گزرے تھے آخر مارا گیا اس کے بعد بنی اسرائیل نے مل کر طالوت کا تمام شاہی خزانہ حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالے کر دیا اور انہیں اپنا بادشاہ چن لیا۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام نے طالوت کے بعد ستر سال تک بادشاہی کی۔

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ملک عطا فرمایا یعنی تمام بنی اسرائیل کی شاہی اور مشارق یعنی ارض مقدسہ اور اس کے مغارب کی۔

ف: داؤد علیہ السلام سے قبل کسی ایک نبی پر بادشاہی پر بنی اسرائیل کو اتفاق نہ ہوا وَالْحِكْمَةَ اور حکمت یعنی نبوت۔

ف: داؤد علیہ السلام نے قبل بنی اسرائیل میں کوئی ایسا نہیں گزرا جس کے پاس ملک اور نبوت دونوں ہوں یہ صرف داؤد علیہ السلام کا خاصہ تھا کہ انہیں نبوت اور بادشاہی ملی ورنہ اس سے قبل بادشاہی ایک قبیلہ میں اور نبوت دوسرے قبیلہ کے لئے ہوتی۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے گزرا ہے۔

ف: حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور نازل ہوئی اس کی ایک سو چوبیس سورتیں تھیں۔

ف: حضرت داؤد علیہ السلام وہ ہیں جنہوں نے کہا اما بعد! اس کو فصل الخطاب کہا جاتا ہے جو صرف داؤد علیہ السلام کو عنایت ہوا۔

وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ اور انہیں اللہ تعالیٰ نے وہ علم عنایت فرمایا جو وہ چاہتا مثلاً زرہ بنانا داؤد علیہ السلام لوہے کی زرہ بنا کر بیچتے تھے اور آپ کی وجہ معاش اپنی کمائی سے تھی آپ کو دوسری تعلیم اللہ تعالیٰ سے نصیب ہوئی کہ آپ پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اور پہاڑوں کی تسبیح جان لیتے تھے اسی طرح آپ کو خوش الحانی عطا ہوئی جو آپ سے قبل کسی کو نصیب نہ ہوئی کہ جب آپ زبور شریف پڑھتے تو پرندے آپ کے قریب ہو جاتے تھے اور اتنا قریب کہ

انہیں ان کی گردنوں سے پکڑا جاسکتا بلکہ پرندے آپ کی آواز کے عاشق تھے کہ جب بھی کہیں آپ کی آواز سنائی دیتی تو جمع ہو جاتے اسی طرح آپ کے پڑھنے سے پانی جاری ہو جاتا اور چلتی ہوئی ہوا رک جاتی۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ اور اگر اللہ تعالیٰ کا دفع کرنا نہ ہوتا۔ الدفع مصدر ہے اور اپنے فاعل کی طرف مسند ہے ای صرفہ یعنی اللہ تعالیٰ کا پھیرنا۔ النَّاسَ یہ الدفع کا مفعول بہ ہے۔ بَعْضَهُمْ ان کے بعض کو یعنی وہ لوگ جو شر اور فساد کرتے ہیں یہ بَعْضَهُمْ، النَّاسَ سے بدل البعض من الکل ہے۔

بِبَعْضٍ یعنی بعض کی وجہ سے جو انہی لوگوں سے ہیں جو ان فسادیوں کو اس سے رد کرتے ہیں جس پر ان کا عزم ہوتا ہے ساتھ اس کے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمایا۔ مثلاً ان کے عزائم میں سے ہے قتل کرنا وغیرہ۔ مذکورہ قصہ وغیرہ سے اندازہ کیجئے۔ بِبَعْضٍ مصدر سے متعلق ہے یعنی الدفع سے۔

لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ البتہ زمین میں فساد آجائے گا اور اس کے منافع باطل ہو جائیں گے اور اس کے مصالح معطل ہو جائیں گے مثلاً کھیتی اور نسل اور وہ تمام امور جن سے زمین آباد اور بہتر سے بہتر رہتی ہے۔ بعض نے کہا کہ اگر مومنین و ابرار کے ذریعہ و فجار کو دفع نہ کیا جائے تو زمین ہلاک ہو جاتی اور وہ خود بھی برباد ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ مومن کے طفیل کفار کو دور فرماتا ہے اور نیکوں کے ذریعے فاجروں کو دفع کرتا ہے۔

حدیث شریف: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک اللہ نیک مسلم کے صدقے اس کے چالیس ہمسائیگاں کے گھروں کو بلاؤں اور مصیبتوں کو دور فرماتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ الخ۔

دوسرے ان میں تنبیہ بھی ہے کہ بادشاہی بھی بہت بڑا امر ہے کہ اگر بادشاہی نہ ہو تو عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بادشاہی اور دین دونوں جڑواں ہیں اس میں ایک کے مٹنے سے دوسرے کا مٹ جانا لازمی امر ہے۔ کیونکہ دین ایک بنیاد ہے اور بادشاہی اس کی نگران جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ عمارت مٹ کر رہ جاتی ہے اور جس عمارت کا نگہبان کوئی نہ ہو تو وہ تعمیر ضائع ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے حالات دیکھئے کہ وہ اپنے نبی علیہ السلام کے بے فرمان رہتے ہیں اگر ان کے پاس ظاہری حکومت نہ ہوتی تو برباد ہو جاتے ہاں دونوں کے لئے مجاہدات کی ضرورت ہے۔ تا کہ عوام الناس کی زبان اور تلوار سے رہبری کی جائے

اس لیے ان کی ہدایت کے لئے انبیاء کرام تشریف لائے اور ان کے بعد ان کے خلفاء آتے رہے ان کی مقرر زندگی تک جہاد اور زبان کے ذریعے عوام الناس کی رہبری ہوتی رہی ان کے وصال کے بعد خلفاء دین کی زبان وجہاد کے ذریعے تبلیغ ہوتی رہی یہی بعض کو بعض سے دفع کرنے کا مفہوم ہے۔

ف: اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں کو بعض سے بعض دفع کرنا دو قسم ہے۔ ا۔ ظاہراً۔ ۲۔ باطناً۔

ظاہر کی چار قسمیں ہیں: ا۔ انبیاء۔ ۲۔ بادشاہ۔ ۳۔ وہ حکماء جو آیت کریمہ میں مذکورہ ہیں۔ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۴۔ واعظین انبیاء علیہم السلام کا غلبہ خواص انسانوں پر ہوتا ہے ان کے ظاہر پر بھی اور باطن پر بھی اور بادشاہ کا غلبہ تمام لوگوں پر صرف ان کے ظاہر پر ہوتا ہے باطن پر نہیں جیسا کہ بادشاہوں کا مقولہ مشہور ہے۔ **نحن ملوک ابدانهم لاملوک ادیانهم۔**

ہم ان کے بدنوں کے بادشاہ ہیں نہ کہ ان کے دین کے اور حکماء کی شاہی خواص پر ہوتی ہے نہ کہ عوام پر اور واعظین کی حکومت عوام کے بواطن پر ہوتی ہے نہ کہ ان کے ظواہر اور باطنی طور یوں ہے کہ سلطان العقل بہت ہی قباح سے بچالیتا ہے اور در حقیقت سلطان الظاہر کے التزام کا سبب یہی ہے۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ لیکن اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل والا ہے اس کی مقدار کا اندازہ ناممکن ہے۔ عَلَى الْعَالَمِينَ جہاں والوں کے لئے لیکن وہ باری تعالیٰ بعض کو بعض کے فساد سے روکتا ہے اس لئے زمین پر کسی قسم کا فساد نہیں اور جمیع عالم کے مصالح نظم ونسق سے ہو رہے ہیں اور امتوں کے تمام حالات صحیح طور پر چلتے رہے ہیں اور چل رہے ہیں۔

بہر حال اس کا فضل جملہ عالم کے لئے ہے عالم دنیا میں یوں ہے کہ وہ ہدایت واصلاح کا راہ دکھاتا ہے اور آخرت میں جنات ودرجات اور نجات وفلاح عنایت فرمائے گا یہ بھی اس کے فضل سے ہے کہ اپنے بعض بندوں سے دفع بلیات فرماتا ہے۔ جنہیں کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں جیسے انبیاء واولیاء علی نبینا وعلیهم السلام اور ان کے طفیل وہ حضرات جو ان صاحبان کی تابعداری کرتے ہیں۔ تِلْكَ یہ اشارہ سابقہ مضامین کی طرف ہے۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں افراد جو طاعون سے بھاگے طالوت کے بادشاہی اور اس کے لئے صندوق کا آنا اور اس کے مقابلہ میں سرکشوں کا شکست کھا جانا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت

کا قتل ہونا۔ اٰیٰتُ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جو اس کی طرف نازل ہوئے۔ نَتْلُوْھَا عَلَیْكَ ہم جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے آپ پر پڑھتے ہیں۔ بِالْحَقِّ یہ نَتْلُوْھَا کے مفعول بہ سے حال ہے یعنی درآنحالیکہ وہ متلبس ہے اس وجہ سے جو مطابق ہے اس کے کہ جس میں اہل کشاف کسی طرح شک نہیں کرسکتے اسی طرح اہل تواریخ کو بھی وہم وگمان نہیں ہوسکتا کیونکہ اسے اس کے موافق پاتے ہیں جو ان کی کتابوں میں موجود ہے۔

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اور بیشک آپ منجملہ ان رسولوں سے ہیں جو امتوں تک ہمارے پیغامات پہنچانے اور ہمارے اوامر واحکام کو جاری کرنے کے لئے تشریف لائے ورنہ آپ انہیں بغیر کسی تعارف اور سننے کے کیسے خبر دیتے ہیں۔

شانِ نزول: یہ ان کفار کے حق میں نازل ہوئی جو کہتے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں ہیں۔

ف: کسی نے خوب کہا ہے اس آیت کے ترجمہ میں:۔

الا اے احمد مرسل شود بہ مشکل از تو حل ۔۔۔ کنم وصف ترا مجمل توئی سلطان ہر مولے

شریعت از تو روشن شد طریقت ہم بمہر بن شد ۔۔۔ حقیقت خود معین شد زہے سلطان بے ہمتا

ترجمہ: یقیناً اے احمد مرسل صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ہی ہر مشکل حل ہوتی ہے آپ کے وصف میں مجملاً بیان کرسکتا ہوں اس لئے کہ آپ ہر آقا کے آقا ہیں شریعت آپ سے روشن ہوئی طریقت کو بھی برہان نصیب ہوا اے بے مثل آقا حقیقت آپ سے معین ہوئی ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ نفس امارہ جالوت ہے اس قوت وطاقت سے مقابلہ نہیں ہوسکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف عجز وانکساری کرکے اسے مدد کے لئے عرض کیا جائے کہ اے ہمارے رب ہمارے اوپر صبر ڈال اپنی اطاعت وعبادت کی فرمانبرداری کرنے میں اور تیری بے فرمانی سے بچنے میں اور ہمیں ثابت قدم رکھ سر جھکانے میں۔

سختی نرمی میں اور احکام قضاء کے ہجوم کے وقت دکھ اور سکھ میں اور ہماری کافروں پر مدد فرما اور وہ کافر ہمارے دینی دشمن ہیں عموماً اور خصوصاً نفس امارہ دشمن پر جو ہمارے دشمنوں سے بہت بڑا سخت دشمن ہے اور وہ ہے بھی

ہمارے دونوں پہلوؤں میں اگر یہ نداء رب الارض والسماء سے صدق وصفا اور امید ورجا کی بناء پر ہو تو اس پر قبول ہونا لازمی اور دشمنوں پر غالب ہو جانا ضروری ہے اسی لیے ایسے لوگوں نے اپنے دشمنوں کو شکست دے دی اللہ تعالیٰ کے اذن لیکنے اس کی مدد سے اس لیے کہ اس کا اپنے بندوں کے ساتھ مدد دینے کا وعدہ ہے اور ان کے بالمقابل لوگوں کو شکست دی پھر داؤد قلب نے جالوت کو مار ڈالا جب کہ اس نے حرص علی الدنیا اور رجوع الی العقبی اور نفس کے تعلق بالہوی کے تینوں کے لئے اور وہ تینوں ایک ہو گئے۔ یہ ان سب کا رجوع الی اللہ ہو گیا اور غیر اللہ سے توجہ ہٹالی تو اس نے انہیں تسلیم ورضا کی فلاخن پر رکھ کر نفس جالوت کو مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لطف وکرم کی ہوا تابع کر کے نفس کی خواہشات کے ناک پر وہ پتھر مارا تو فضول اشیاء اس کی گدی سے نکل گئیں اور اس کے ساتھ اس کی تمیں بری عادتیں مٹ گئیں اسی طرح سے نفس کے باقی لشکر کو شکست دی مثلاً شیطان اور اس کا تمام لشکر اور اللہ تعالیٰ نے اسے ملک اور حکمت سے نوازا۔ یعنی داؤد قلب کو خلافت الٰہیہ کی بادشاہی اور الہامات ربانیہ کی حکمت اور اسے جو کچھ چاہا حقائق قرآن اور اس کے اسرار واشارات بتا دیئے اور اگر لوگوں کا بعض سے دفع کرنا نہ ہوتا یعنی ارباب طلب کو واصل باللہ مشائخ کے ذریعہ دفع کرنا نہ ہوتا تو زبان حرب ہو جاتی۔ یعنی ان کی استعداد جو احسن تقویم سے تیار کی گئی ہے تاکہ دین قدیم کے کمالات کو حاصل کرنے کے لئے تیار رہے اور نفس اور اس کی بری عادات کے لشکر کہ جن کا مقابلہ کرنے کا عزم ہے کہ ارواح کے شہر ویران ہوں اور انہیں اچھے اخلاق حاصل نہ ہو سکیں اور ان کے ذوات وصفات مکدر ہو کر بہائم اور جانوروں کی صفات میں دھکیلے جائیں اور انہیں اس کے نچلے طبقات میں پہنچنا نصیب ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ عالمین کے لئے بڑے فضل والا ہے۔ یعنی یہ اس کا بہت بڑا فضل اور رحمت ہے کہ وہ طالبین کے سلسلہ کو متحرک رکھتا ہے اور ان کے قلوب میں مشائخ کاملین کے ارادوں کو الہام فرماتا ہے اور انہیں توفیق دیتا ہے کہ وہ مشائخ کی تربیت کے دامنوں کو مضبوطی سے تھام سکیں اور اپنی صفائی کے لئے مشائخ کے تصرفات کے سامنے سر جھکا سکیں اور انہیں صبر کی توفیق بخشا اور سکون دیتا ہے جب کہ ان کے اوپر تزکیہ نفس کی ریاضتوں اور مجاہدات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں اور مشائخ کو ان کی حالت درست کرنے کا اشارہ فرماتا ہے اور انہیں حکم ہوتا ہے کہ انہیں مخالفین کی تکالیف پر تقویت پہنچائیں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف یہ الطاف نہ ہوتے تو انہیں ہمیشہ تک

تزکیہ نفوس نصیب نہ ہوتا اور یہ اشارہ صرف اہل خیر کو حاصل ہوتا ہے اور بس اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تحقیق سے مخصوص فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آیات اللہ الخ یعنی انہی آیات کے ضمن میں حقائق و دقائق جنہیں ہم آپ پر محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے ہیں۔ یعنی ہمیں انہیں آپ کے ہاں حق کے ساتھ لینے حقیقت کے ساتھ جیسا کہ وہ ہے بتاتے ہیں۔ بیشک آپ رسولوں میں سے ہیں۔ یعنی ان حضرات سے ہیں جو ان مقامات کو عبور فرما چکے ہیں اور انہیں مقامات وکرامات کا انہیں مشاہدہ ہوا۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی یقین دہانی کرائی گئی ہے لیکن ان بد دماغوں کو جنہیں عناد اور ہٹ دھرمی سے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت سے انکار ور نہ انہیں انصاف پسند اور تعصب سے دور ہیں انہیں نہ صرف اعتراف ہے بلکہ وہ دلائل سے دوسروں کو آپ کی رسالت کی حقانیت بتاتے ہیں۔ چند حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔

باغی ادیب والٹیر:۔ میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ وہ لوگ جاہل اور ضعیف العقل ہیں جو محمد پر عیش پرستی اور راحت کوشی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ پادریوں، راہبوں، مجاور اگر ماہ جولائی میں رمضان آئے اور تم پر صبح چار بجے سے شام کے آٹھ تک کھانے پینے کی پابندی عائد کردی جائے اگر تم کو ہر قسم کی قمار بازی سے منع کر دیا جائے اگر تمہارے لیے شراب حرام کردی جائے اگر تم سے کہا جائے کہ اپنی آمدنی کا اڑھائی فیصد محتاجوں اور ناداروں میں تقسیم کردو اگر تم اٹھارہ عورتوں کی رفاقت کا لطف اٹھاتے ہو اور تم کو چودہ عورتوں سے یکدم محروم کر لیا جائے تو کیا ایمانداری سے کہہ سکتے ہو کہ ایسا مذہب عیش پسند ہے۔

فرانسیسی مترجم قرآن ڈاکٹر موسین:۔

روم کے عیسائیوں کو اس آواز کے سوا کوئی چیز قہر و ذلت سے نہیں نکال سکتی جو سرزمین عرب میں غار حرا سے بلند ہوئی اس آواز نے دنیا کو ایسا سیدھا سادھا اور پاک صاف مذہب سکھایا جس میں بقول فاضل محقق گاڈ فرہگنس نہ پاک پانی ہے نہ مورت نہ تقریر اور نہ سینٹ۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک ایسی کتاب دی جس کے نغمے فلاسفہ یونان کے نغموں سے کہیں بڑھ کر

ہیں جس کی ایک سورۃ کا بھی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جس کے اسرار کبھی ختم نہیں ہوتے اور جس کو مسلمان ادیب جب پڑھتا ہے تو سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور قیامت تک کے لئے اپنے لیے سرمایہ ناز سمجھتا ہے۔

(رسالہ بارول فرانس رومان)

مسٹر ہربرٹ وائل:۔ حضرت مسیح کے سو سال بعد جب عرب کے اخلاق کا معیار بہت گر گیا تھا۔ 30 اپریل 570ء کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ آپ نے بت پرستی کو مٹایا اور عرب کے وحشیوں کو تہذیب و تمدن کا سبق دیا۔ عام لوگ آپ کی دیانت اور سچائی دیکھ کر آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے آپ نے گمراہوں کو راہ راست پر ڈالا اور لوگوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کی۔ (گریٹ ٹیچر)

پروفیسر ہرگرونجے:۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نئے دین کے مدعی نہ تھے اور عیسائیت اگرچہ اسلام سے پہلے ہی یونانیوں، سمتیوں اور غلام و آزاد کی تفریق مٹا چکی تھی لیکن پیغمبر اسلام نے جس مجلس اقوام کی داغ بیل ڈالی اس نے تمام دنیا کے انسانوں کو اتحاد و اخوت کے ایک رشتے میں منسلک کر دیا اور اسے دیکھ کر تمام اقوام کو شرمندہ ہونا چاہیے۔

مسیحی مورخ ریورنڈ باسورتھ سمتھ:۔ اتفاق سے (اور اس اتفاق کی کوئی مثال نہیں ملتی) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی وقت میں تین چیزوں کی بنیاد رکھی قوم، سلطنت، مذہب اور ایک ایسا شخص ہونے کے باوجود جو لکھ پڑھ نہ سکتا تھا۔ آپ نے دنیا کو ایک ایسی کتاب دی جو ایک ہی وقت میں نظم بھی ہے قانون بھی ہے کتاب الدعا بھی ہے اور بشارتوں کا مجموعہ بھی ہے اور آج کے دن تک نسل انسانی کا چھٹا حصہ اس کے طرز تحریر حقانیت اور مقبولیت کو ایک زندہ معجزہ سمجھتا ہے۔

آمد سے پہلے:۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہل کتاب کو آپ کی نبوت و رسالت کا یقین تھا۔ ابونعیم شہر بن حوشب سے اور ابن عساکر رافع وغیرہ سے حضرت کعب احبار سے راوی ہیں کہ انہوں نے فرمایا: میرے باپ توراۃ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ موسیٰ علیہ السلام پر اتارا اس کا علم ان کے برابر کسی کو نہ تھا وہ اپنے علم سے کوئی شے مجھ سے نہ چھپاتے تھے جب مرنے لگے مجھے بلا کر کہا: اے میرے بیٹے! تجھے معلوم ہے کہ میں نے اپنے علم سے کوئی چیز تجھ سے نہیں چھپائی مگر وہاں دو ورق

روک رکھے ہیں ان میں ایک نبی کا بیان ہے جس کی بعثت کا زمانہ قریب آپہنچا۔ میں نے اندیشے سے تجھے ان دونوں ورقوں کی خبر نہ دی کہ شاید کوئی جھوٹا مدعی نکل کھڑا ہو اور تو اس کی پیروی کرے۔ یہ طاق تیرے سامنے ہے میں نے وہ اوراق رکھ کر اوپر سے مٹی لگادی ہے ابھی اس سے تعرض نہ کرنا نہ ابھی دیکھنا۔ جب وہ جلوہ فرما ہو اللہ تعالیٰ تیرا بھلا چاہے گا تو تو آپ ہی اس کا پیرو ہو جائے گا یہ کہہ کر وہ مر گئے۔ ہم ان کے دفن سے فارغ ہوئے مجھے ان اوراق کے دیکھنے کا شوق ہر چیز سے زیادہ تھا میں نے طاق کھولا۔ ورق نکالے تو کیا دیکھتا ہوں ان میں لکھا ہے؟ محمد رسول اللّٰہ خاتم النبین لانبی بعدہ مولدہ بمکۃ ومھاجرہ طیبۃ۔

محمد اللہ کے رسول ہیں سب انبیاء کے خاتم ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں ان کی پیدائش مکہ میں اور ہجرت مدینے کو۔

(صلی اللّٰہ علیہ وسلم)

ہندو مذہب: نہ صرف اہل کتاب بلکہ ہندو مذہب کے پیشوا بھی۔ (چند حوالے ملاحظہ ہوں)

ا:۔ وہ ہر مقدس اسم کا مربی۔ گرجدار انتہا درجہ کا تعریف کیا گیا۔ (محمد) قلعوں کا توڑنے، والا جوان، عقیل اور بے اندازہ قوت کے ساتھ پیدا کیا گیا تو نے اسے پتھر رکھنے والے۔ گوالا کے گایوں سے مالا مال گڑھے کو پھاڑا دیوتا دوڑتے ہوئے تیرے پاس آئے اور خوف سے آزاد ہو کر اندر کی شان بیان کی جو اپنی قوت سے حکومت کرتا ہے جس کے پاس ہزاروں کی تعداد میں عطیے آتے ہیں۔

(بھوشن پران چوتھا باب (سام دید محمد رشی کتاب))

۲:۔ اے دیوتا وسمبل گرام (مربستان) میں یہ کیشب (۱۳ بیویوں والا) پیدا ہوگا اور وشو ویشا نام (رسول اللہ) سے مشہور ہوگا اور دشنو کیرتی (عائشہ) اس کی چہیتی بیوی ہوگی۔ (مہابھارت) وہ رشی سمبل گرام (عربستان) میں پیدا ہوگا اس کی تیرہ بیویاں ہوں گی اور اس کی ایک چہیتی بیوی ہوگی جس کا نام عائشہ ہوگا۔ وہ رشی کرشن لیکا کے گرنتھ، انسانوں کو سنالے گا تو نند کل میں پیدا ہونے والے لوگ چاروں طرف سے ایک جگہ جمع ہو کر اس وشنو دیشا (رسول اللہ) برہمن کو پکڑ کر معہ اس کی بیوی کے ایک جگہ بند کر دیں گے وہ بے حد چالاک جہنمی ہوں گے۔

(بھونشن پرائن)

ف: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ بیویاں تھیں ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔حضرت خدیجہ۔۲۔حضرت سودہ بنت زمعہ۔۳۔حضرت عائشہ۔۴۔حضرت حفصہ بنت عمر۔۵۔حضرت زینت بنت خزیمہ الہلالیہ۔۶۔ام المساکین حضرت ام حبیبہ۔۷۔ام سلمہ ہندہ بنت ابوامیہ۔۸۔ام حکیم زینب بنت جحش۔۹۔جویریہ بنت الحرب الخزاعیہ۔۱۰۔صفیہ بنت الحی۔۱۱۔میمونہ بنت الحی۔۱۲۔حضرت ماریہ قبطیہ ۱۳۔اسماء بنت الکعب الجوینہ۔

آفتاب آید دلیل آفتاب۔

۳:۔کلکی پوران:۔کلیک کے آخر میں جب تمام لوگ وشنو کا نام بھول جائیں گے تب وشنو اوتار دنیا سے تمام گناہ معاف کرائے گا۔اس وقت سچا مذہب قائم ہوگا اور اس وقت کو سب جگ کہا جائے گا۔

۴:۔شری کرشن مہاراج کی پیش گوئی:۔

آخر زمانہ میں ایک اوتار سمبل دیپ میں پیدا ہوگا اور اس کی ماں کا امتی یا سمتی (آمنہ) ہوگا اور اس اوتار کے باپ کا نام وشنو داس (عبداللہ) ہوگا اور یہ اوتار پہاڑوں کے غاروں (غار حرا) میں پہلے عبادت کریگا۔ خدا اس کو وہاں سبق دے گا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ پھر اس کو خود اس کے ہی خاندان کے لوگوں سے تکلیف ہوگی۔جس کی وجہ سے مجبور ہو کر شمالی پہاڑوں میں (مدینہ) چلا جائے گا اس کے چار بھائی (چار یار، ابوبکر، عمر، عثمان، علی) ہوں گے جو اس کے دین دھرم (اسلام) کو تمام دنیا میں پھیلائیں گے اور اس کی ایک بہت خوبصورت سرخ رنگ کی چہیتی بیوی (عائشہ) ہوگی۔اے لوگو جب اس اوتار کا ظہور ہو تو تم اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دینا کیونکہ ہدایت اور نجات اسی کے پاس سے حاصل ہوگی۔

رنگ اللہ رسول محمد رکنگ برشیا اولا بوک دمیکا گنگ اللہ بوگنگ نیکا مکم۔ (شلوک نمبر ۶)

(اللہ رسول محمد رسولوں سے افضل ہے اللہ صرف واحد ہے وہ پاک اور بے عیب ہے)

۵:۔اشیا الانگ الکبھے متر ابرون رلجہ نید دود ہواجامی متر و والانگ گبر و والانگ رسول محمد گنگ برشیا اے للہ پرودھوا۔

(شلوک نمبر ۱)

(اللہ بہشتیوں کا دوست اور پانی کا راجہ ہے الا اللہ کے نام سے اللہ کو پکارو محمد رسول اللہ سب سے افضل ہیں۔اس دنیا میں ہر طرف اللہ ہی کی حکمرانی ہے)

۶۔ اللہ جگدیو ہوت اللہ سورجہ چندرہ شرف نکھترہ اللہ رشینگ شیدا اندر رائے پرب د مایہ پرم انت انتر یکھا۔

(شلوک نمبر ۷)

(نہایت گڑگڑا کر خدا کی عبادت کرو۔ اللہ چاند سورج ستاروں کا آفرینند ہے رشیوں کا بدھاتا ہے۔ حصول مال و دولت کے لئے اسی کو پکارو وہ ازلی ہے وہ ابدی ہے) (اتھر وید کا اللہ نیشد)

سوئبرتنا دینا دگارانتے پرکرنیستا بشنونا تگ تیو سدا بید شاشرے حشر بتا (سام وید)

جس بزرگ کے نام کا پہلا حرف ''م'' اور آخری ''د'' ہے جس کے پیرو گئو بھکھن کرتے ہوں وہی دید شاستر کی رو سے رشی ہے۔

بشارت احمد یہ:۔ مصنفہ عبدالرحمٰن چشتی میں بحوالہ مرات المخلوقات مصنفہ عبدالعزیز صاحب منقول ہے کہ شاہ عبدالحق صاحب کانپوری نے بمقام حیدر آباد مجھ سے بیان کیا کہ دو جوڑہ ندی کے کنارے جو رام پور اور بریلی کے درمیان بہتی ہے ایک ہندو عالم رہتا تھا جوانی کے دنوں میں علم رسمی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد رامپور سے واپس آتے ہوئے میں اس ہندو عالم کے پاس حاضر ہوا اور اس سے کہا کہ مجھے آپ سے کچھ دریافت کرنا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کوئی دینی بات دریافت کرنی ہے۔ اس نے فوراً ان لوگوں کو جو وہاں بیٹھے تھے اٹھا دیا اور مجھ سے کہا کہ اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کیا ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی کہیں ہمارے رسول کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر پایا جاتا ہے۔ اس نے کہا تم نوجوان ہو ممکن ہے اس راز کو مخفی نہ رکھ سکو اس لئے میں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کہا میں عہد کرتا ہوں کہ آپ جو کچھ بیان کریں گے اس کا ذکر جب تک آپ زندہ رہیں گے بجز اپنے استاد اور والد صاحب کے کسی سے نہیں کروں گا۔ اس نے عہد لے کر کہا: بہت بہتر تو سنو چوتھے وید میں تمہارے رسول کریم کا ذکر موجود ہے کہ کسی نے شری رام چندر جی سے پوچھا کہ کتنے درجات ہیں جن کو طے کر کے بندہ خدا سے واصل ہو جاتا ہے۔ شری رام چندر جی نے فرمایا چودہ درجے طے کرنے کے بعد بندہ خدا سے واصل ہو سکتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ کیا آپ نے چودہ درجے طے کر لیے ہیں۔ رام چندر جی نے فرمایا کہ نہیں میں نے ان چودہ درجوں کو طے نہیں کیا۔ اس نے پوچھا کیا آپ ان چودہ درجوں کو طے کرنا چاہتے ہیں؟ رام چندر جی نے فرمایا کہ نہیں میں طے کرنا نہیں چاہتا۔ ہم

اپنے موجودہ درجہ سے آگے نہیں بڑھیں گے۔اس نے پوچھا کہ آپ سے پہلے کون ایسا شخص گزرا ہے جس نے یہ چودہ درجے طے کر لیے ہوں؟انہوں نے فرمایا نہیں۔اس نے پوچھا کیا آپ کے بعد کوئی شخص آئے گا جو یہ سب درجات طے کر لے گا۔رام چندر جی نے فرمایا کہ ہاں آخر زمانہ میں ایک شخص ایسا آنے والا ہے جو یہ سب درجات طے کر لے گا۔اس نے پوچھا اس شخص کا نام کیا ہوگا؟آپ نے فرمایا:محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔اس نے پوچھا وہ کہاں پیدا ہوگا؟فرمایا وہ ایک پتھروں والے ملک میں پیدا ہوگا اور ہجرت کر کے کھجوروں والے شہر (مدینہ) میں بود و بوش اختیار کرے گا اور وہیں سے اس کا دین (اسلام) ساری دھرتی پر پھیلے گا اور جو کچھ وہ کہے گا وہی کرے گا جو اس دین کو لازم پکڑے گا وہ بیکنٹھ (بہشت) میں جائے گا جو ان کے دامن کو نہ پکڑے گا یا پکڑ کر چھوڑ دے گا (مرتد) وہ نرگ (دوزخ) میں جائے گا۔اس نے پوچھا اس شخص کا لباس کیسا ہوگا اور خوراک کیسی ہوگی؟آپ نے فرمایا اس کی خوراک دودھ، گوشت، شہد، سرکہ ہوگی۔پوشاک دھوت پٹکیا اور اپنے دین کو پھیلانے کے لئے برچھی تلوار کے ساتھ منکروں سے لڑے گا اور بد دعا سے ملک کو فتح نہیں کرے گا۔

۸:۔فتح پور سوہ (یوپی) کے ایک ہندو عالم ستیل نامی نے اس بیان کی تصدیق کی اور کہا پیدا کرنے والے نے اپنا سارا کمال اس دیوتا (اوتار) پر ختم کر دیا۔کوئی اوتار دیوتا اس سے پہلے اتنا با کمال نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔

۹:۔پارسی قوم کے نامہ شست سلمان لنسک:۔

۱۔جب ایرانی لوگ اپنے بادشاہ سے سرکشی اور مصلحتیں کی نافرمانی کریں گے تو اس وقت عرب میں ایک عظیم الشان انسان پیدا ہوگا۔

۲۔جس کے متبعین کے ذریعہ ایران کا تاج وتخت اور ملک ومذہب جاتا رہے گا۔

۳۔بت خانہ، آتش کدہ کی بجائے پیغمبر کا بنایا ہوا گھر بتوں سے خالی ہوگا نماز قبلہ رخ پڑھی جائے گی۔

۴۔اس عربی کے پیروکار شہر مدائن اور اس کے گرد و نواح طوس بلخ کے آتش کدوں اور بڑے بڑے مقامات پر قبضہ کر لیں گے۔

۵۔ایران کے مقدس لوگ اور دوسرے ممالک کے لوگ ان کی جماعت میں داخل ہو جائیں گے۔

(کتاب آتشا باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹)

خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی مبعوث کرے گا تم اس کی طرف کان دھرنا اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو خوب کہا۔ میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی اٹھاؤں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ سب ان سے بیان کرے گا اور ایسا ہوگا جو کوئی میرے کلام کو جو وہ میرے نام سے بیان کرے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔

خداوند آیا اور ان پر سعیر سے طلوع ہوا وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشین شریعت تھی۔

انبیاء علیہم السلام بھی فرما گئے:۔

حبقوق نبی کی پیش گوئی: خدا تیمان سے آیا اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے ظاہر ہوا۔ سلاہ اس کے جلال نے آسمانوں کو ڈھانپ لیا اور اس کی حمد سے زمین معمور ہوگئی۔ اس کی تجلی نور کی مانند تھی اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلیں اور اس میں اس کی قدرت مستور تھی۔ باد اس کے آگے چلی اور اس کے قدموں پر دہکتا ہوا انگارہ روانہ ہوا وہ کھڑا ہوا اور اس نے زمین کو لرزا دیا۔ اس نے نگاہ کی اور قوموں کو لرزا دیا۔ اس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا۔

قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے اور پرانی پہاڑیاں اس کے آگے دھنس گئیں۔ (باب ۳ آیت ۶،۲)

ملاکی نبی کی پیش گوئی:۔ خداوند تم سب جس کی تلاش میں ہو وہاں عہد کا رسول جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل ناگہانی آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے پھر اس کے آنے کے دن کون ٹھہر سکے گا اور جب وہ نمودار ہوگا کون ہے جو کھڑا رہے گا۔

حضرت سلیمان کی پیش گوئی:۔ وہ تو ٹھیک ہے محمد ہے میرا خلیل اور میرا حبیب یہی ہے اے دختران یروشلم (صحیفہ یرمیاہ) ان پڑھ کو کتاب دی گئی اٹھو قیدار پر چڑھو اور یورپ کے لوگوں کو ہلاک کرو۔

زبور کی پیش گوئی:۔ اے داؤد شمشیر حمائل کر اور لڑائی میں آ۔ یہاں تک کہ امت تیری طرف مخاطب ہو اور پیغمبر ہاشمی خلق کو ان کے زمرے سے اپنا مطیع کرے۔ (بحوالہ تذکرہ اکرام صفحہ ۱۸)

(صحف شعیب) میرا ایک بندہ ہے کہ مہر نبوت اس کے مونڈھوں کے درمیان میں ہے۔

(بحوالہ تذکرہ اکرام صفحہ ۱۹)

(انجیل برناس) جب فارقلیط مبعوث ہو جوان کا زمانہ پائے ایمان پائے۔

دانیال نبی کی پیش گوئی:۔

محمد تیری کمان میں خوب کھچاؤ پیدا ہوگا اور تیرے حکم سے تیر سیراب ہوں گے۔

(اجوبہ فاخرہ ھدایۃ الحیاری و الجواب الصحیح)

یوحنا کی پیش گوئی:۔ پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور دیکھا کہ ایک نقری گھوڑا اور اس کا سوار امانت دار (امین) اور سچا (صادق) کہلاتا ہے وہ راستی سے لڑتا ہے اور عدالت کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں آگ کے شعلہ کی مانند سرخ ہیں۔ اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اس کا کلام خدا کا کلام ہے اور وہ فوجیں جو آسمان میں صاف اور سفید کتانی لباس میں ہیں نقری گھوڑوں پر سوار اس کے پیچھے ہولیں۔ اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے کہ وہ اس سے قوموں کو مارے گا اور لوہے کے عصا سے ان پر حکمرانی کرے گا۔ اس کے لباس اور اس کی ران پر یہ نام بخط جلی لکھا ہوا ہے۔ ''بادشاہوں کا بادشاہ'' خداوندوں کا خداوند۔

حضرت یحیٰ کی پیش گوئی:۔ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور سیوی یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے۔ تو اس نے اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے پوچھا تو کون ہے کیا الیاس ہے۔ اس نے کہا کہ میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے (محمد) اس نے جواب دیا کہ نہیں پس انہوں نے کہا کہ پھر تو کون ہے۔ تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں۔ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے۔ کہا میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے کہ میں بیاباں میں ایک پکارنے والی کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔

بدمذہب کا اعتراف:۔

مہاتما بدھ کی پیش گوئی: نندا نے آخری وقت پوچھا کہ کیا آپ کے بعد ہماری رہنمائی کے لئے کوئی آئے گا؟ آپ نے جواب دیا اے نندا میں جاؤں گا تو مہابدھ (محمد) آئے گا اس کی تعلیمات پر ہونا وہ دنیا کا حقیقی نجات دہندہ ہوگا۔

۱۔ (یوحنا باب ۱۴، آیت ۱۵، ۱۷) اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا وکیل بخشے گا کہ ابد تک جو تمہارے ساتھ رہے گا۔ یعنی حق کی روح جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے اور نہ اسے جانتی ہے۔

۲۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن وکیل جو روح القدس ہے جسے میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا وہ سب تمہیں یاد دلائے گا اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور میرے پاس اس کا کچھ نہیں ہے۔

(یوحنا باب ۱۴، آیت ۲۵، ۱۳)

۳۔ انہوں نے مجھ سے بے سبب عداوت کی لیکن جب فارقلیط (وکیل) آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح حق جو باپ کی طرف سے نکلتی ہے وہ میری گواہی دے گا۔ (یوحنا باب ۱۵)

۴۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وکیل (فارقلیط) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں ملزم ٹھہرائے گا مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ لیکن جب وہ حق کی روح آئے گی تو تم کو حق کی راہ دکھائے گی اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہ کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی اور میرا اجلال ظاہر کرے گی

یہ شہادات اور پیش گوئیاں سب کی سب حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے علاقہ رکھتی ہیں ان سے بہترین شہادتیں ملنی غیر ممکن اور محال ہیں۔ ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں۔ ہر ملہم نے اپنے الہام کی رو سے اپنے متبعین کو آگاہ کیا کہ آخر زمانہ میں ایک ایسا نبی آ رہا ہے جو خاتم الانبیاء و خاتم الرسل ہو گا۔

انتباہ: یہ حوالہ جات حق کے متلاشی کے لئے مفید ہیں ضدی اور ہٹ دھرم فائدہ نہ اٹھائے تو اپنی قسمت پر ماتم کرے مزید تحقیق چاہیے تو فقیر کی کتاب "چہ جا محمد کا" اور "آدم تا ایندم" کا مطالعہ کریں۔

بفضلہ تعالیٰ ترجمہ تفسیر پارہ ۲ سے ۲۰ ربیع الآخر (شب جمعہ) ۱۳۹۳ھ میں فراغت ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عنوان	صفحہ
انتساب	۳
تعارف مترجم	۴
وجہ تالیف	۸
سبب ترجمہ ہذا	۹
روح البیان اور اس کا مصنف	۱۰
مختصر تفسیر روح البیان	۱۴
آغاز سورۃ فاتحہ	۲۱
عارف کا استعاذہ	۲۶
حدیث در حکایت ابلیس خبیث	۲۷
تحقیق اسم اعظم	۳۳
فضائل بسم اللہ شریف	۳۴
سورۃ فاتحۃ الکتاب	۳۶
شاہراہ سلوک	۴۰
رحمٰن اور رحیم میں فرق	۴۶
ربط بین الاسماء الخمسہ	۵۱
متفرقات عبادات کے اقسام	۵۷
نفس کے اوصاف چار ہیں	۵۹
استقامت کے فضائل	۶۵
فضائل آمین	۷۴
خلاصہ سورۃ فاتحہ	۷۸
آغاز سورۃ البقرہ	۷۹
حدیث جبریل	۹۳
فضائل و مسائل نماز	۹۹
صوفی کا وضو	۱۰۳
صوفی کی نماز	۱۰۴
شان خلفائے راشدین	۱۰۷
حل مشکل	۱۱۸
آغاز رکوع وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ بمع ترجمہ و تفسیر	۱۲۷
کذب کی مذمت	۱۵۴
مکالمہ جبریل و آدم نبینا و علیہم السلام	۱۷۰
قصہ معراج کا ایک حصہ	۱۷۸
گرج کے وقت کی دعا	۱۸۳
آغاز رکوع یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ ترجمہ مع تفسیر	۱۸۹
عجائبات دنیا	۱۹۳
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ کو	
ایک دلچسپ وعظ	۱۹۵
آغاز رکوع عربی مع ترجمہ و تفسیر وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ	۲۳۰
آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ	۲۳۳
میت کو خوشبو لگانے میں حکمت	۲۳۴
انسان کی ناف سے کتے کی پیدائش	۲۳۶
آدم کے جسم میں نو دروازے	۲۳۷
سجدہ میں ملائکہ کا قصہ	۲۳۸
نکاح کرنے کے فضائل و فوائد	۲۴۴
آدم علیہ السلام کی زمین پر پیدائش میں کیا حکمت تھی	۲۴۵
آدم حوا اور سانپ اور شیطان کے زمین پر اترنے کا	
واقعہ	۲۴۶
وسیلہ نبی علی صاحبہا السلام	۲۴۹
توبہ کی شرائط	۲۵۰
آغاز رکوع عربی مع ترجمہ و تفسیر یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا	۲۵۷
ایفائے عہد کی حق گوئی	۲۶۳
شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی ملاقات کا ایک واقعہ	۲۶۷
بعض نیاں میں فرق	۲۶۴
عالم بے عمل کی سزا	۲۶۵
علیم و حلیم میں فرق	۲۷۰
آغاز رکوع یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا عربی مع ترجمہ و تفسیر	۲۷۷
فرعون کی مختصر سوانح	۲۷۹
فرعون کے ظلم کا آغاز	۲۸۱
مولد یوسف علیہ السلام	۲۸۶

☆☆☆☆ فہرست فیوض الرحمٰن اردو ترجمہ روح البیان پارہ دوئم ☆☆☆☆

مضمون	صفحہ
سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ	۲
یہود ونصاریٰ کی ایک غلطی	۴
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ	۲۴
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا	۳۴
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	۴۳
اللہ تعالیٰ کے لشکر	۶۶
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر	۷۶
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ	۷۷
شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے مراتب	۷۹
فوائد کسب حلال	۸۲
دعا اور ندا میں فرق	۸۴
بے عمل علماء وحفاظ کی سزا کا نمونہ	۱۰۳
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا	۱۰۵
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر	۱۲۶
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	۱۲۷
روزہ کے اصطلاحی معنی	۱۲۸
روزے کی فرضیت کا سبب	۱۳۳
ایک عجیب الخلقت فرشتہ	۱۴۰
فضائل رمضان	۱۴۲
فضائل اعتکاف	۱۴۶
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ	۱۵۹
فوائد اور جامع تقریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۶۸
حبیب وخلیل کا فرق آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر	۱۸۰
اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ	۱۹۵
فضائل حج آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر	۱۹۸
سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	۲۱۱
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ	۲۳۵
شراب کے فوائد	۲۵۴
	۲۶۹
یتیم پروری کے فوائد	۲۸۲
یتیم کو ادب سکھانا	۲۸۴
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر	۲۹۰
وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ	۲۹۱
لواطت کی مذمت	۲۹۴
یمین کی اقسام	۳۰۲
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ	۳۱۵
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ	۳۳۰
شیعہ کی تردید	۳۴۸
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ	۳۵۵
شرعی متعہ کی تفسیر	۳۵۶
اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی تفسیر وترجیح کے دلائل وفضائل	۳۶۴
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا	۳۷۲
مسئلہ وسیلہ جلیلہ	۳۹۶
آغاز رکوع عربی، ترجمہ وتفسیر فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ	۴۰۱
اولیاء اللہ کے برکات اور ان کا وسیلہ	۴۰۷
جالوت کا تعارف	۴۰۹
اشمویل علیہ السلام کا علم غیب	۴۰۹
طالوت کی توبہ	۴۱۲
باغی ادیب والفیر	۴۱۸
ہندو مذہب	۴۲۰
شری کرشن مہاراج کی پیشن گوئی	۴۲۱
آفتاب آید دلیل آفتاب	۴۲۱
بشارت احمدیہ	۴۲۲
انبیاء علیہم السلام بھی فرما گئے	۴۲۴
بدمذہب کا اعتراف	۴۲۵
انتباہ	۴۲۶
اختتام پارہ دوئم	۴۲۶